UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224155
UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No. ۸۹۱۵ ن۳۰۵ Accession No. U.6034

Author نقوش

Title نقوش : مکاتیب نمبر مرتبہ محمد طفیل

This book should be returned on or before the date last marked below.

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

عصری ادب نمبر

شمارہ نمبر ۱۲۹

ستمبر ۱۹۸۲ء

مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو ۞ لاہور

قیمت : [redacted] روپے

لائبریری ایڈیشن ۱۰۰ روپے

ترتیب

تقریب "ادبی معرکے نمبر"

۱ -	صدارتی تقریر	جنرل محمد ضیاء الحق	۱
۲ -	خطبۂ صدارت (۲)	میر علی احمد تالپور	۵
۳ -	ادبی معرکے، ایک مبسوط تاریخ	جسٹس عطاء اللہ	۹
۴ -	اعتراف	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۸
۵ -	عجیب و غریب شخص	اشفاق احمد	۱۱
۶ -	طفیل صاحب	پروفیسر محمد عثمان	۱۳
۷ -	آج کا حاتم	ڈاکٹر سلیم اختر	۱۵
۸ -	ایک زندہ شخص	رحیم گل	۲۰

نعت

۱ -	نعت	عبدالعزیز خالد	۲۳
۲ -	نعت بحضور ختمی مرتبتؐ	حافظ لدھیانوی	۲۵
۳ -	غزالِ کنجِ حرمؐ	فضا ابنِ فیضی	۲۶
۴ -	زمزمۂ نعت	حفیظ تائب	۲۷
۵ -	بجنابِ رسالت مآبؐ	حفیظ تائب	۲۸
۶ -	نعت	قیوم نظر	۴۱۸
۷ -	نعت	شاذ تمکنت	۲۹
۸ -	اگر آپ نہ ہوتے	شاذ تمکنت	۳۰
۹ -	سفرِ مدینہ کے تاثرات	خاطر غزنوی	۳۱
۱۰ -	نعت	راجا رشید محمود	۳۲
۱۱ -	بزمِ قدس	راجا رشید محمود	۳۳
۱۲ -	نعت	صادق نسیم	۳۵
۱۳ -	نعت	عطاء الحق قاسمی	۳۷
۱۴ -	دلوں میں گھنٹیاں بجتی ہیں	حسن عباس رضا	۳۸

مقالے

۱ -	آرٹ، سیاست اور زندگی	احمد علی	۴۱
۲ -	مولانا ابوالکلام کا بے مثال اسلوبِ نگارش	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	۴۷
۳ -	ادیب کے فرائض	احمد ندیم قاسمی	۳۵۹
۴ -	مخطوطۂ دیوان ترقی	ڈاکٹر اکبر حیدری	۵۳
۵ -	تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول	ڈاکٹر جمیل جالبی	۱۶۱
۶ -	فنِ تاریخ گوئی اور اردو میں اس کی روایت	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۶۲

۷ -	تخلیق اور تخلیقی مسائل	ڈاکٹر سلیم اختر	۸۷
۸ -	سفرنامے کی فنی بحث	ڈاکٹر انور سدید	۱۱۱
۹ -	عہد محمد شاہ کی لسانی خصوصیات	ڈاکٹر ملک حسن اختر	۱۲۷
۱۰ -	فیض احمد فیض (ایک جائزہ)	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۳۶۵
۱۱ -	اقبال اور ہماری ثقافتی تشکیلِ نو	فتح محمد ملک	۸۲۶
۱۲	مسجدِ قرطبہ	منظور الٰہی	۸۱۲
۱۳ -	منٹو کے شاعر دوست	طارق عزیز	۸۰۶

طویل سلسلے

۱ -	گُل زمین کی تلاش میں	ابوالفضل صدیقی	۱۷۳
۲ -	روئیے	مسعود مفتی	۲۳۱
۳ -	۱۰۰ کروڑ	اسلم کمال	۲۷۵

طنز و مزاح

۱ -	عشقِ ثقافت	ثاقبہ رحیم الدین	۳۴۱
۲ -	اصلی اور نقلی ضمیر	صدیق سالک	۳۴۷
۳ -	ہمارے گھر چوری ہوئی	سید ضمیر جعفری	۳۵۰
۴ -	میری مطالعہ گاہ	فکر تونسوی	۳۵۳
۵ -	بڑھاپا	ارشد میر	۷۷۰

نظمیں، غزلیں

۱ -	بیاد والدۂ ماجدہ	عبدالعزیز خالد[1]	۳۷۷
۲ -	قطعہ	فیض احمد فیض	۳۸۴
۳ -	اِدھر نہ دیکھو	فیض احمد فیض	۳۸۵
۴ -	کسی لاعلاج رجائی نے یہ خبر چمن میں اُڑائی ہے	احمد ندیم قاسمی	۳۸۶
۵ -	مجھے دُکھ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پر و بال ہیں	احمد ندیم قاسمی	۳۸۷
۶ -	اُمید و بیم کے گیسو سنوارتے ہی رہے	معین احسن جذبی	۳۸۸
۷ -	ہمارا نالۂ شب کامیاب ہے کہ نہیں	معین احسن جذبی	۳۸۹
۸ -	نشانِ منزل	عطاء اللہ سجاد	۸۴۲
۹ -	گلیم و خرقہ، عبا و قبا سے لگتے ہیں	عطاء اللہ سجاد	۸۴۴
۱۰ -	چاند، برطھیا اور پتھر	قتیل شفائی	۸۴۵
۱۱ -	آہٹیں کام آئیں گی، پرچھائیاں کام آئیں گی	قتیل شفائی	۸۴۶
۱۲ -	دستک	ادا جعفری	۳۹۰
۱۳ -	اندھیری راہ میں مسافر کہیں نہ بھٹکا تھا	ادا جعفری	۳۹۱
۱۴ -	کوئی دیوار تو ہوگی، کوئی در تو ہوگا	غلام ربانی تاباں	۳۹۳
۱۵ -	سنگ و خشت کو تاباں بام و در نہیں کہتے	غلام ربانی تاباں	۳۹۴
۱۶ -	معاصرین کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ	ڈاکٹر گیان چند	۳۹۸

[1] حصۂ نظم میں کئی شعراء کی دو سے زیادہ تخلیقات شامل ہیں۔ مگر فہرست میں صرف دو کا ذکر ملے گا ——— بعض تخلیقات دیر سے ملیں، اس لیے ان کی بھی ترتیب صرف فہرست میں ملے گی۔ (ادارہ)

۱۷ -	اس انجمن کا جو نقشہ دکھائی دیتا ہے	ڈاکٹر گیان چند	۳۹۹
۱۸ -	نہ عشق کا نہ کوئی حسن کا فسانہ چلے	جگن ناتھ آزاد	۴۰۰
۱۹ -	گراں کو جوئے خوں سے گزرنے کا شوق تھا	جگن ناتھ آزاد	۴۰۱
۲۰ -	اک تمنا کہ سحر سے کہیں کھو جاتی ہے	شان الحق حقی	۴۰۵
۲۱ -	کیسے اظہارِ تمنا ہوگا	اقبال صفی پوری	۵۱۰
۲۲ -	ہزار چاہا، طبیعت گر نہیں مانی	شاذ تمکنت	۸۴۹
۲۳ -	یہ تجربہ بھی کروں، یہ غم بھی اٹھاؤں میں	مظہر امام	۵۱۱
۲۴ -	ترے خیال کا شعلہ تھما تھما سا تھا	مظہر امام	۵۱۲
۲۵ -	جاگتی آنکھوں سے جس دم خواب سے اُگنے لگے	ذوقی مظفر نگری	۴۰۷
۲۶ -	سکون کچھ تو ملا دل کا ماجرا لکھ کر	شہزاد احمد	۴۰۸
۲۷ -	زمیں اور آسماں اندھیرے میں گم ہیں سارے	شہزاد احمد	۴۰۹
۲۸ -	ہوا کو اور بھی کچھ تیز کر گئے ہیں لوگ	شاعر لکھنوی	۴۱۲
۲۹ -	اس کے گیسو	قیوم نظر	۴۱۹
۳۰ -	اس شہرِ برف آلود میں	قیوم نظر	۴۲۱
۳۱ -	دھرتی سے رشتہ مت توڑو	فارغ بخاری	۴۲۵
۳۲ -	مل گئے انھیں شاید نقشِ پا ہواؤں کے	فارغ بخاری	۴۲۸
۳۳ -	زباں ملے تو ہزار باتیں کہا کریں ہم	جمیل ملک	۴۳۰
۳۴ -	خدا سے ہم نے دو عالم خریدے	جمیل ملک	۴۳۵
۳۵ -	کبھی وصل و ہجر بھی زندگی، کبھی زندگی سے فراز تک	تابش دہلوی	۴۳۶
۳۶ -	منزل تلک ہیں نقشِ جبیں، نقشِ پا کے ساتھ	تابش دہلوی	۴۳۸
۳۷ -	اب ہے ٹوٹا سا دل خود سے بیزار سا	بشیر بدر	۴۳۹
۳۸ -	مسافر کے رستے بدلتے رہے	بشیر بدر	۴۴۳
۳۹ -	ننھے منے فرشتے	پرتو روہیلہ	۴۴۴
۴۰ -	ثانیۂ مارساں	پرتو روہیلہ	۴۴۵
۴۱ -	تکریمِ غم و سبو بہت ہے	محسن احسان	۴۴۶
۴۲ -	لفظ کاغذ پہ لکھا بار اذیت اُترا	محسن احسان	۴۴۹
۴۳ -	اپنے اندر کا آدمی نہ رہا	اختر ہوشیارپوری	۴۵۰
۴۴ -	تصویر میں رنگ بھر رہا ہوں	اختر ہوشیارپوری	۴۵۱
۴۵ -	تا ختمِ سفر گرمیٔ رفتار ملی ہے	محشر بدایونی	۴۵۴
۴۶ -	سکوت کیسا جب اس طرح روح جلنے لگے	محشر بدایونی	۴۵۵
۴۷ -	سرسوں، خواب، ہوا، تصویر	ظفر اقبال	۴۵۶
۴۸ -	دیکھنا ہے وہ مجھ پر مہربان کتنا ہے	ظفر اقبال	۴۵۷
۴۹ -	اپنے ہی کسی سائے سے ٹکرایا ہوں پھر بھی	احمد ظفر	۴۵۸
۵۰ -	موسمِ ہجر کے نام	احمد ظفر	۴۶۱
۵۱ -	قربتیں اور فاصلے	خاطر غزنوی	۴۶۲

۵۲	سنہرے خواب کا معمار	خاطر غزنوی	۴۶۴
۵۳	وقت کے لب پہ تبسم جو اُبھر آیا ہے	علی احمد جلیلی	۴۶۵
۵۴	اپنے گھر سے میرے گھر تک کچھ لمحوں میں آئیگا	غالب احمد	۴۶۷
۵۵	توڑ کے سارے درد سے رشتے، آنسو، آسان ہوئے	غالب احمد	۴۶۸
۵۶	نہاں سکوت کے پردے میں بھی صدا ہے کوئی	صادق نسیم	۴۶۹
۵۷	اس احتساب میں دونوں کی جگ ہنسائی نہ ہو	صادق نسیم	۴۷۱
۵۸	اس سوکھے ہوئے کھیت کی بے چین مراد و	سیف زلفی	۴۷۲
۵۹	کوئی گیتا، کوئی قرآن نظر آتا ہے	سیف زلفی	۴۷۶
۶۰	گم ہوتی ہوئی فصل شب ماہ نہ دیکھو	اسرار زیدی	۴۷۷
۶۱	آنے والی کل کی دے کر خبر گیا یہ دن بھی	اسرار زیدی	۴۷۸
۶۲	تزئینِ غم	احسن علی خان	۴۷۹
۶۳	نیلگوں وسعتِ گماں ہوں میں	احسن علی خان	۴۸۴
۶۴	چل پڑی پورب کی پھر خود ہوا دل ڈر گیا	بشیر احمد بشیر	۴۸۶
۶۵	شعلے، صلیبِ غم کے شرر بار کیا ہوتے	سید لیئن قدرت	۴۸۷
۶۶	ہے دل میں تو پھر حشر اٹھا کیوں نہیں دیتا	سید لیئن قدرت	۴۸۸
۶۷	آنکھوں میں رنگ جن کے دائم سجے ہوئے ہیں	ضمیر اظہر	۴۸۹
۶۸	تنہا تنہا، غمگیں غمگیں، چُپ چُپ، گم صُم رہتا ہوں	ضمیر اظہر	۴۹۰
۶۹	ہم عجب سلسلۂ سیر و سفر رکھتے ہیں	ناصر زیدی	۴۹۱
۷۰	تجھ کو یہ وہم ہے کہ وہ تیری نظر میں ہیں	ناصر زیدی	۴۹۲
۷۱	حُسنِ تخیل کا پیکر ٹھہرا	اکبر کاظمی	۴۹۳
۷۲	عکس اپنا مرے آئینہ دل پر نہ اُتار	اکبر کاظمی	۴۹۴
۷۳	ہجومِ شب میں گھری روشنی کو پہچانو	حزیں لدھیانوی	۴۹۵
۷۴	نیا شعور نئی منزلوں کا سُورج ہے	حزیں لدھیانوی	۴۹۶
۷۵	غم سے قریب تر تھا جو لمحہ خوشی کا تھا	مضطر اکبر آبادی	۴۹۷
۷۶	لکھتے ہوئے رکھو گے اگر سچ کا بھرم بھی	مضطر اکبر آبادی	۴۹۸
۷۷	سکوتِ شب سے کہ آوازۂ سحر سے ملے	راسخ عرفانی	۴۹۹
۷۸	شہر کا شہر پھرے آج اٹھائے پتھر	ڈاکٹر رشید انور	۵۰۰
۷۹	کانٹوں سی اس دُنیا میں وہ پھولوں جیسی	عطاء الحق قاسمی	۵۰۱
۸۰	آسماں ہے اپنی وحشت میں کسی گھر کی طرح	غلام حسین ساجد	۵۰۲
۸۱	یوں تو وہ کوئی کسر اُٹھا بھی نہیں رکھتے	اکبر حمیدی	۵۰۳
۸۲	اک خواب، مجسّم ہونے سے ویران ہوا	لطیف ساحل	۵۰۴
۸۳	مرے لہو کی تمازت ہے اور اکیلا میں	شوکت ہاشمی	۵۰۵

بیاد، جوش و فراق و دانش

۱	شاعرِ آفاق جوش ملیح آبادی	پروفیسر منظور حسین شور	۵۱۳

۲ -	بیادِ جوش ملیح آبادی	عبدالعزیز خالد	۵۱۴
۳ -	غزل کا سہاگ، فراق گورکھپوری	پروفیسر منظور حسین شور	۵۱۶
۴ -	بیادِ فراق گورکھپوری	عبدالعزیز خالد	۵۱۷
۵ -	جوش و فراق	جگن ناتھ آزاد	۵۱۹
۶ -	اقلیم سخن کا شہر یار	ذوقی مظفر نگری	۵۲۰
۷ -	بیاد احسان دانش	عبدالعزیز خالد	۵۲۱
۸ -	احسان دانش	جیلانی کامران	۵۲۳
۹ -	احسان صاحب	حافظ لدھیانوی	۵۲۷
۱۰ -	نثر احسان	کسریٰ منہاس	۵۳۴
۱۱ -	شخصیتِ دانش	ذوقی مظفر نگری	۵۵۸
۱۲ -	احسان دانش	محمد اسحٰق شور	۵۶۳

افسانے

۱ -	تنہائی	مجنوں گورکھپوری	۵۷۵
۲ -	ایک منزل کئی راستے	میرزا ادیب	۵۸۹
۳ -	آن پوری	ممتاز مفتی	۶۲۶
۴ -	روندے نین نمانے	منظور الٰہی	۶۳۵
۵ -	میموریل	شوکت صدیقی	۷۷۵
۶ -	بوم ریگ	بانو قدسیہ	۶۴۸
۷ -	طوفان	رحیم گل	۶۶۰
۸ -	گھوڑے کا کرب	ہرچرن چاولہ	۶۶۷
۹ -	ترمورتی	جمیلہ ہاشمی	۶۷۴
۱۰ -	آج — ۱۸	انور سجاد	۶۸۸
۱۱ -	سانگرہ کا کیک	اختر جمال	۶۹۱
۱۲ -	دل کا نوحہ	سائرہ ہاشمی	۴۹۶
۱۳ -	خوابوں کے جزیرے	پروین عاطف	۷۰۸
۱۴ -	آخری نذرانہ	حفیظ احسن	۷۲۷
۱۵ -	آبلہ پا	ریاض تاثیر	۷۴۲
۱۶ -	خودرو	عذرا اصغر	۷۵۷
۱۷ -	کاسنی	قیوم راہی	۷۶۱
۱۸ -	خدائی فیصلہ	منیر الدین احمد	۸۰۳
۱۹ -	رحیم گل [خاکہ]	محمد طفیل	۸۳۲

تبصرے

حافظ لدھیانوی کے قطعات	ڈاکٹر سید عبداللہ	۸۵۰
جنجو	ڈاکٹر سلیم اختر	۸۵۲
مجتبیٰ	ڈاکٹر محمد زکریا	۸۵۶

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

پرانے قصّے سُن رکھے تھے کہ بادشاہ اپنی رعایا سے یوں بھی مخاطب ہوتے تھے۔

"بول کیا چاہتا ہے؟"

"جہاں پناہ! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"مانگ لے جو کچھ مانگنا ہے۔"

"جہاں پناہ! بندہ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔"

"آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ تیری ہر آرزو پوری کی جائے گی۔"

"جہاں پناہ! اگر کچھ دینا ہے تو میری برادری کو دے دیجیے۔"

ایک رسالے کے مدیر نے عجب خواب دیکھا۔ وہ دیکھتا ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۱ کو پانچ بجے، جہاں کہ "ادبی معرکے نمبر" کا جلسہ برپا تھا۔ ملک کا ایک وزیرِ باتدبیر صدارت کر رہا تھا کہ محفل میں اچانک ملک کا بادشاہ آگیا۔ اُس وقت رسالے کا مدیر، وزیرِ باتدبیر کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا تھا کہ بادشاہ سلامت آکے رعایا میں بیٹھ گئے۔ یہ واقعہ پرانے قصّے کہانیوں جیسا تھا۔

پھر بادشاہ نے کہا "میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "میں اس شخص کا قدر دان ہوں۔ جو کہ اسٹیج پر بیٹھا ہے۔ میں یہی کہنے یہاں آیا ہوں۔"

رعایا پہلے حیران ہوگئی۔ پھر خوش ہوگئی۔

جب تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو اس سے ستاروں کے چلن میں فرق پڑتا ہے!

محمد طفیل

اِس شمارے میں

نقوش کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے تین سربراہانِ مملکت نے سراہا۔ توصیفی کلمات سے نوازا، زندہ ادب کا ترجمان قرار دیا۔ اعزاز یہ بھی ہے کہ اہلِ قلم کے ہر طبقہ نے اس کی کارگزاریوں کو سراہا۔ پھر ایک نسل نے نہیں دو نسلوں نے سراہا۔ وہ جو کل بوڑھے تھے، وہ جو آج جوان ہیں۔ اللہ تیرا شکر!

اللہ تیرا شکر!

جو لوگ ادب کو اپنی اپنی عینکوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ ادب کے ساتھ بھلائی نہیں کرتے۔ ادب کی مختلف روشوں کو، ان کی نمو کے مطابق پروان چڑھانے ہیں، جس کسی نے بھی اپنا رول ادا کیا۔ اُسی نے سچا رول ادا کیا۔ وہی مخلص ٹھہرایا جائے گا۔ باقی سب نادان دوست!

ہم یوں سوچتے ہیں۔ فلاں ادیب کا لہجہ تُند ہے یا فلاں ادیب دُنیا سے بے خبر، ادب کی بھول بھلیوں میں گم ہے یا فلاں ادیب، ادب میں مذہب کو داخل کر رہا ہے۔ یہ سب باتیں سنجیدہ غور و فکر کی حامل ہیں۔ ضرور غور کیجیے مگر ایک دوسرے کو بُرا بھلا نہ کہیے۔ کشادہ دلی کا ثبوت دیجیے۔ درست اور نادرست کا فیصلہ ادب خود ہی کرتا چلا آیا ہے۔ ہم فکرمند کیوں ہوں؟ ہمیں تو اپنے عہد کے ادب کو بلا تخصیص دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ہم خائن نہیں، امین ہیں!

ہم خائن نہیں، امین ہیں!

اس شمارے کے ٹائیٹل پر عصری ادب کا عنوان لکھا ہے۔ بے شک اس موضوع کو ذہن میں رکھ کر پرچہ ترتیب نہیں دیا گیا۔ لیکن اس میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ ملک کے نمائندہ ادیبوں کی تخلیقات ہیں۔ اس لیے میرے نزدیک یہ نمبر عصری ادب کے عنوان کی لاج رکھ سکتا ہے کیوں کہ عصری ادب حال کے حرفوں کی پُونجی ہوتا ہے۔

عصری ادب، حال کے حرفوں کی پونجی ہوتا ہے۔

کچھ لوگ کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ باتیں کرتے ہیں۔ خوش یہ بھی ہیں خوش وہ بھی ہیں۔ ہمارا شمار کس برادری میں ہوگا۔ ہمیں نہیں معلوم، کیونکہ ہم تو علم حاصل کرنے کے لیے چین کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔

کیونکہ ہم تو علم حاصل کرنے کے لیے چین کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں!

محمد نقوش



"ادبی معرکے نمبر" کی تقریب میں

جنرل محمد ضیاءُ الحق (صدرِ پاکستان)

مدیرِ نقوش جناب طفیل صاحب اور خواتین و حضرات ——— السلامُ علیکم

یہ نقوش کے مدیر محمد طفیل صاحب کی تقریب ہے جنھیں محمد نقوش بھی کہتے ہیں، آج کی تقریب کے میرِ محفل میر علی احمد تالپور ہیں۔ میں نے جب یہ سُنا کہ نقوش کے ادبی معرکے نمبر کے بہانے یہاں ایک ادبی معرکہ برپا ہے تو میں نے سوچا کہ ادھر کا نظارہ بھی کرتے جائیں۔ میں یہاں کوئی تقریر کرنے نہیں آیا، آپ حضرات سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے یہاں ادیبوں اور ادبی رسالوں خاص طور پر نقوش کی محبت کھینچ لائی ہے، میں اس محبت کے چند گھونٹ پی کر واپس چلا جاؤں گا۔ کیونکہ اسی شام مجھے اسلام آباد میں ایک اور محفل میں شرکت کرنی ہے اور اس اثنا میں صرف چند کلمات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہُوں۔

آپ سے میں معافی کا خواستگار ہُوں کہ محفل میں مخل ہوا ہُوں، یہاں میرزا ادیب اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ میرے آنے کی وجہ سے شاید اُنھیں زحمت ہوئی ہے جس کے لیے میں معافی چاہتا ہُوں۔ اس کے بعد میں چلا جاؤں گا۔ آپ نے باقی مقالے سُن کے جانا ہے کیونکہ نقوش نے آپ کو دعوت دی ہے۔ بعض حضرات نے بعد میں نقوش کی تعریف میں کچھ کہنا ہے، یا نقوش کی تنقید کرنی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے بہرہ ور نہیں ہو سکوں گا۔ لیکن میں آپ سے اس کی پہلے معافی چاہتا ہُوں۔ کیونکہ یہ نقوش کی تقریب ہے اس لیے مختصراً نقوش کے بارے میں اپنے تاثرات ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرے اپنے نقطۂ نگاہ سے نقوش ایک وزنی پرچہ ہے جس سے گلی سے لے کر قاری تک سبھی متاثر ہوئے ہیں۔ گلی اور اس کی برادری سے تعلق رکھنے والے عموماً نقوش کی عظمت کا اندازہ اُس کے حجم سے کرتے ہیں جبکہ پڑھے لکھے لوگ اس کی معنوی عظمت کی داد دیتے ہیں۔ میں نقوش کو ایک اعلیٰ پایہ کا عظیم ادبی پرچہ سمجھتا ہُوں جس کی نظیر مجھے پاکستان یا اس کے باہر نہیں ملتی۔ اس پرچے کی اپنے قارئین پر گرفت اتنی مضبوط ہے کہ جو کوئی ایک بار اس کا اسیر ہوا اُس نے کبھی اس کی گرفت سے نجات نہیں پائی۔ میں گزشتہ تیس سال سے خود اس کا اسیر ہُوں۔ نقوش کے زیادہ تر نمبر میرے پاس محفوظ ہیں، کچھ بعض حضرات لے کر غائب ہو گئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ چیز ضرور نظر آئی کہ وہ نقوش کے شیدائی ہیں اور جو کوئی نقوش کا کوئی نمبر اُدھار مانگ کر یا چوری کر کے لے جائے، میرے خیال میں اس پر چوری کی حد واجب نہیں ہوتی۔

نقوش کی شہرت کے ذمہ دار دو عناصر ہیں، ایک محمد طفیل، اور دُوسرے ان کے ترتیب دیے ہوئے لافانی نمبر، جن کی میرے ذخیرے کے مطابق تعداد تقریباً پندرہ ہے، ان میں سے ہر ایک نمبر اپنی جگہ سینکڑوں کتابوں پر حاوی ہے۔

ایک ایک نمبر اپنی جگہ سنگِ میل ہے، ایک ایک نمبر ہماری ادبی تخلیقات کا شاہکار ہے۔ میں دورِ حاضر کو نقوش کا عہدِ شباب سمجھتا ہوں۔ نقوش کو جوان کرنے میں طفیل صاحب بوڑھے ہو گئے۔ انھوں نے نقوش کے بچپن میں اس کی سرپرستی سنبھالی تھی اور اب اسے جوانی کی ایسی شاہراہ پر لے آئے ہیں کہ لوگ طفیل صاحب کی عمر کا اندازہ ان کے سن و سال سے نہیں نقوش کے معیار سے کرتے ہیں جب تک نقوش جوان ہے طفیل صاحب کو کوئی بوڑھا نہیں کہہ سکتا اور جب نقوش بوڑھا ہو گیا تو طفیل صاحب کی جوانی کا بھرم بھی ٹوٹ جائے گا۔

طفیل صاحب کا تازہ ادارتی معرکہ یعنی ادبی معرکے جس کی آج رونمائی ہو رہی ہے دو ضخیم جلدوں پر محیط ہے اس کے گرد پوش پر فکاہیہ خاکے دیکھ کر پہلے میں سمجھا کوئی ہلکی پھلکی چیز ہے۔ لیکن جب ان کا مطالعہ شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ ذاتی چپقلشوں سے قطع نظر اس تازہ نمبر میں اتنا پُرمغز مواد ہے کہ اسے بلا مبالغہ اُردو ادب اور زبان کی تاریخ کہا جا سکتا ہے میں یہ یادگار نمبر ترتیب دینے پر جناب طفیل صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے ادبی معرکے نمبر کے تمام مندرجات پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں، البتہ ایک چھوٹا سا نکتہ آپ کے غور و فکر کے لیے یہاں چھوڑنا چاہتا ہوں، یہ نکتہ اردو زبان سے متعلق ہے جس کے بارے میں زیرِ نظر شمارے میں طویل بحث کی گئی ہے۔ یعنی برِصغیر کے کسی علاقے نے اُردو زبان کی ترویج میں کیا کردار ادا کیا ہے اور کہاں کہاں اردو زبان میں کیا کیا نشیب و فراز آئے، میں سمجھتا ہوں کہ اب اُردو زبان کا مستقبل پاکستان کے ساتھ اور پاکستان کا مستقبل اس کی قومی زبان کے ساتھ وابستہ ہے ——— (تالیاں) جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ روایت سے تعلق توڑے بغیر اُردو کو پاکستانی ماحول کے مطابق پھلنا پھولنا ہے اور ہر زندہ زبان کی طرح متروک الفاظ سے اپنا دامن جھاڑ کر مقامی اثرات کو اپنے دامن میں جگہ دینا ہے۔ مجھے یہ سُن کر خوشی ہوتی ہے کہ گزشتہ چونتیس برسوں میں اُردو نے جو آہنگ اختیار کیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ وہ خالصتاً پاکستانی آہنگ ہے۔ یہ پاکستانی آہنگ ہماری پہچان اور تشخص کے لیے بڑا خوش آئند ہے حکومتِ پاکستان کی یہ خواہش اور کوشش ہے کہ اسی پاکستانی آہنگ سے آراستہ اردو زبان کو زندگی کے تمام شعبوں میں رائج کیا جائے جس کے لیے کئی اقدامات کیے جا رہے ہیں، میں پروپیگنڈہ کے الزام سے بچنے کے لیے یہاں ان اقدامات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا لیکن اگر یہاں تلقین شاہ صاحب موجود ہیں تو وہ میری نرد تائید کریں گے۔

میں نے جو بات اردو زبان کے حوالے سے کہی ہے وہی اردو ادب پر بھی صادق آتی ہے۔ یعنی پچھلے تیس پینتیس برسوں میں جہاں ہماری قومی زبان میں انفرادیت کا عنصر داخل ہوا ہے وہاں ہمارے ادب میں بھی قومی سوچ کے دھارے نمایاں ہونے لگے ہیں، میں کئی تخلیقات کے بارے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کے لکھنے والوں کے نام مٹا کر بھی انھیں کسی دوسرے ملک میں شائع کرا دیا جائے تو یہ تخلیقات خود گواہی دیں گی کہ ہمارا خالق پاکستانی ہے اور خالص پاکستانی ہے، مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قومی رنگ زیادہ سے زیادہ ادبی اور شعری شہ پاروں میں نظر آنے لگے گا۔ حکومتِ پاکستان ایسے مثبت اور پاکستانی ادب کی ہر طرح حوصلہ افزائی

کرنا چاہتی ہے، حکومت چاہتی ہے کہ ملک کے ادیب اور شاعر کسی جھجک یا کسی روک ٹوک کے بغیر ادب تخلیق کریں اور ملک کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ اس ضمن میں یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہوں یا اسے آپ ایک اعلان سمجھ لیجئے، پچھلے روز، ایک میرے رفیق ہیں اُن سے بات ہو رہی تھی تو انھوں نے کہا کہ ایک حضرت ہیں، میں نام اُن کا نہیں لوں گا اُنہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ اُنھوں نے اپنی کتاب چھاپی اور وہ کتاب سنسر سے بچ نہیں سکی اور انھوں نے جو بھی چھاپا ہے ماشاءاللہ ان کی داد دینی چاہیے۔ انھوں نے سنسر شدہ مواد کی جگہ خالی چھوڑ کر اس کو چھاپ دیا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ بھئی! کتابوں پر سنسر کب سے لاگو ہو گئی،..... کیونکہ اگر جسٹس منیر "جناح ٹو ضیا" چھاپ سکتے ہیں تو پھر یہ صاحب کیوں نہیں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے احمد ندیم قاسمی کے مقالوں پر کوئی سنسر نہیں، مجھے امید ہے نقوش بھی طفیل صاحب نے سنسر کے سامنے پیش نہیں کیا، جہاں تک ادب کا تعلق ہے آپ اسے اعلان سمجھ لیجئے آپ اسے حکومت کی پالیسی سمجھ لیجئے کوئی ان پر سنسر نہیں ہے۔ (تالیاں) ——— ادبی یا تخلیقی کتابوں پر کوئی سنسر نہیں، کیونکہ ادیب سوچوں کے بادشاہ ہوتے ہیں اور سوچوں پر پہرے بٹھانا ناممکن ہے اور ادیب تو ایک ایسا فنکار ہے جو پابندیوں کے باوجود اپنی بات کہنے کا ہنر جانتا ہے۔ اگر تخلیقی کام کرنے والا سنسر کی زد میں آجائے تو سمجھ لیجئے اس کا فن ناپختہ ہے، اُسے مزید دم پُخت کرنے کی ضرورت ہے، تخلیقی بھٹی سے نکلا ہُوا کھرا فن پارہ خالص سونا ہوتا ہے اور سونے کی کون قدر نہیں کرتا، لہٰذا آپ اپنی تخلیقی کانوں کا سونا تلاش کیجیے۔ جو چاہے لکھیے جس طرح چاہے لکھیے، البتہ اس بات کا خیال ضرور رکھیے کہ آپ کا ایک ملک ہے اور اس ملک کا ایک نظریہ ہے، اس ملک اور نظریے کے کچھ حقوق ہیں جنہیں پورا کرنا ہر شہری کا فرض ہے خواہ کسان ہو، خواہ وہ ادیب ہو، خواہ صنعت کار ہو، شاعر ہو، تاجر ہو، نقاد ہو، ضیاء الحق ہو یا حفیظ جالندھری ہو ——— (تالیاں) ———۔

قومی ادب اور آزادیِ اظہار میرا مرغوب موضوع ہے جس پر میں کافی دیر تک اظہارِ خیال کر سکتا ہوں، لیکن شاید آج کی تقریب کے لیے اس سے زیادہ ڈوز (DOSE) دینا جائز نہیں ہوگا۔

میں نقوش کے حوالے سے چند ایک اعلانات کرنا چاہتا ہوں، ایک یہ کہ اس سال سے ہر سال پچاس ہزار روپے پر مبنی ایک نقوش ایوارڈ دیا جائے گا ——— (تالیاں) ——— اس ایوارڈ کے مستحق وہ ادیب، وہ شاعر، وہ محقق، وہ نقاد، وہ دانشور ہوں گے جن کی نقوش میں مطبوعہ تحریر سب سے بہترین قرار دی جائے گی۔ اس ایوارڈ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی جائے گی جس میں دو ادیب اور دو سرکاری افسر یا اہل کار ہوں گے اور ایڈیٹر نقوش جناب محمد طفیل صاحب اس کمیٹی کے سیکریٹری ہوں گے۔

اگرچہ اس ایوارڈ کی تفصیلات کمیٹی طے کرے گی لیکن میرے ذہن میں اس کا خاکہ کچھ اس طرح آ رہا ہے کہ یہ ایوارڈ ادب کی معروف اصناف یعنی تخلیقی نثر، شاعری، تحقیق اور تنقید میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی سال بھر میں نقوش میں چھپنے والی بہترین نثری، شعری، تحقیقی یا تنقیدی تخلیق کے لیے چند ہزار روپے کا انعام۔ کمیٹی چاہے تو

ہر صنفِ ادب کے لیے پہلا، دُوسرا اور تیسرا انعام بھی دے سکتی ہے یا اگر وُہ چاہے تو اس کا کوئی اور طریقۂ کار اختیار کر سکتی ہے لیکن میری طرف سے یعنی حکومت کی طرف سے ہر سال پچاس ہزار روپے کی رقم نقوش کے ذریعے تخلیقی اور تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی پر خرچ ہو گی۔

دُوسرا اعلان نقوش کے اگلے نمبر کے لیے ہے، میں سمجھتا ہُوں کہ اس کا آئندہ نمبر تمام سابقہ نمبروں سے اعلیٰ، تمام پرچوں سے بہتر اور تمام شماروں سے بڑھیا ہو گا، کیونکہ جیسا کہ طفیل صاحب نے فرمایا کہ اگلا نمبر "رسولؐ نمبر" ہو گا۔ مجھے علم ہوا ہے کہ یہ نمبر کوئی دس ہزار صفحات پر مبنی ہو گا، دس بارہ جلدوں میں شائع کیا جائے گا، اس نمبر کی قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہو گی کہ اس کا موضوع دُنیا کی عظیم ترین شخصیت ہو گی، جس کا تعارف میرے بس میں نہیں، یعنی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی "رسولؐ نمبر" ——— طفیل صاحب تو یہ کام اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کر رہے ہیں، لیکن میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کارِ خیر میں ہم اُن کی دنیا بھی خراب نہیں ہونے دیں گے۔ میرا اُن سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے ذوق و شوق کے مطابق یہ نمبر ترتیب دیں اور کثیر تعداد میں یہ نمبر خریدنے کی میں ضمانت دیتا ہوں ——— (تالیاں)——— آخر میں، مَیں ایک چیز ذاتی طور پر کہنا چاہتا ہُوں، طفیل صاحب نے اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ کہا ہے کہ اُن کی اہلیہ اِس دفعہ حج پر گئیں، اور طفیل صاحب نے کہا کہ میں کیا چیز لے کر حج کرنے کے لیے جاؤں، میں اُن کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہُوں کہ وہ اگر اس سال نہیں گئے تو اگلے سال ضرور جائیں، رسولؐ نمبر چھپنے سے پہلے جائیں اور وہاں روضۂ رسولؐ پر کھڑے ہو کر کہیں کہ:

"یا رسولؐ اللہ! میں تو خالی ہاتھ آیا ہوں میری جھولی بھر دیجیے۔"

پھر نقوش کا رسولؐ نمبر نکالیے، پھر دیکھیے اس کے اندر کیا برکت ہو گی ——— پاکستان زندہ باد ——— (تالیاں)

تصاویر: صفحہ ۱، صدرِ مملکت اور مدیر نقوش۔ صفحہ ۹ صدرِ مملکت، ارشد میر جسٹس عطاء اللہ سجاد (مہمانِ خصوصی) میر علی احمد تالپور وزیر دفاع (صدر مجلس) مدیر نقوش۔ صفحہ ۱۰۵ پروفیسر احمد علی۔ صفحہ ۲۴۸ صدیق سالک۔ صفحہ ۲۹۳ احمد ندیم قاسمی۔ صفحہ ۳۰۰ احسان دانش۔ صفحہ ۴۴۸ مجنوں گورکھپوری۔ صفحہ ۵۷۰ فیض احمد فیض۔

صدارتی خطبہ

میر علی احمد تالپور

محترم مہمانِ خصوصی اور آنریبل جسٹس صاحب، طفیل صاحب، عالی مرتبت حاضرینِ محفل! سب سے پہلے میں طفیل صاحب کا شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے مجھے اس مجلس میں شمولیت کی دعوت دی۔ بات دراصل یہ ہے کہ طفیل صاحب کو داد دینا تھی۔ لہٰذا داد دینے کے لیے یہاں چلا آیا۔ یہ غلط بات ہوتی کہ کوئی اتنی بڑی تقریب کرے اور اُسے داد بھی نہ ملے۔

۱۹۶۲ء کی بات ہے کہ جب میں لاہور آیا تھا۔ ہمارے ایک مہربان دوست تھے اور ہیں۔ کسی بات پر ان کی بیگم صاحبہ سے اختلاف ہو گیا۔ بیگم صاحبہ بڑی ناراض ہوئیں۔ اُس وقت مجھے جعفر زٹلی کا یہ شعر یاد آیا ؎

جعفرا زود ازیں شہر بدر شو ورنہ ۔۔۔ ز تو گویند و گیرند تو دھڑا دھڑ بزن

اس پر میاں صاحب نے فرمایا۔ آج آپ کو یہ شعر کیسے یاد آگیا؟ میں نے کہا میاں صاحب اس کی کچھ وجوہ ہیں۔ آج یہاں حاضر ہونے کی بھی کچھ وجوہ ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس محفل کا حق ادا کر سکوں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم و ادب کے میدان میں طفیل صاحب کے جو ذاتی کارنامے ہیں۔ وہ اس قابل ہیں کہ اُن کی قدر کرنی چاہیئے۔ جو نہیں کرے گا۔ خود اس کا علم مشکوک ہو جائے گا۔

جو بات ابھی صدرِ محترم نے فرمائی ہے کہ اُن کے پاس کچھ نقوش کے رسالے تھے۔ جنھیں یا تو لوگ مانگ کے لے گئے یا چوری کر کے لے گئے۔ تو جناب! میرے پاس بھی نقوش کے متعدد نمبر ہیں۔ اگر طفیل صاحب اور دیں گے تو انھیں بھی بصد احترام قبول کروں گا۔ لیکن یہ بتا دوں کہ میں نے اُن نمبروں میں سے کسی کو ایک نمبر بھی نہیں دیا۔ میں اُن رسالوں کی بہترین جلدیں بندھواتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے مانگتا ہے تو میں اُن سے کہتا ہوں۔ یہ نمبر تمام بک اسٹالوں پر ملتے ہیں۔ لہٰذا ان پر دست درازی نہ فرمائیں۔

طفیل صاحب نے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ بڑی انوکھی چیزیں یکجا کر دیں۔ جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ مگر یہ زبان کہ جس میں طفیل صاحب کے کارنامے موجود ہیں۔ بڑی جان دار زبان ہے۔ اس زبان نے برِصغیر کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ زبان ہر حال میں زندہ رہے گی۔ چاہے اسے حاکموں کی سرپرستی ہو یا نہ ہو۔

آپ کے سامنے مثال موجود ہے کہ واگہہ بارڈر کے اُس پار ہر ممکن کوشش کی گئی کہ اس زبان کو پنپنے نہ دیا جائے۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ اُن کی فلموں کی زبان دیکھیں۔ اُن کی شاعری کی زبان دیکھیں۔ اُردو وہاں دندنا رہی ہے۔ زبان میں جو خود اپنے طور پر توانائی ہوتی ہے وہ اسے زندہ رکھتی ہے۔

ایک دوست نے ابھی اپنے ایک مقالہ میں فرمایا کہ طفیل صاحب کی تمام تر کوششیں کامیاب ہوئیں۔ میں بھی یہ بات مانتا

ہوں کہ ان کی نامتر کوششیں کامیاب ہوئیں۔ کوشش تو ہر انسان کرتا ہے مگر سب کی کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں۔ حج کے موقعہ پر جب لوگ منیٰ کے میدان سے واپس آتے ہیں تو وہ ایک دُعا مانگتے ہیں۔ اس دعا میں اور بہت سی باتیں ہیں لیکن ایک خاص بات جو میں آپ کو سُنانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اَللّٰھُمَّ سعیٌ مشکورٌ! اللہ تعالےٰ میری کوششوں کو ٹھکانے لگا دے۔ کوششوں کا ٹھکانے لگنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

طفیل صاحب بڑے خوش قسمت انسان ہیں کہ اُن کو ایسے مضمون نگار ساتھی ملے یا انھیں ایسے رفقا میسّر آئے کہ جنھوں نے ان کے خوابوں کو تابناک بنا دیا۔ میں طفیل صاحب اور اُن کے سارے رفیقانِ قلم کو مبارکباد دیتا ہوں، کیونکہ اتنے اور ایسے بڑے کام مشترکہ کوششوں ہی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔

طفیل صاحب کی بہت تعریف ہو گئی۔ اب میرے سامنے جو بزرگ حضرات بیٹھے ہیں۔ دو چار باتیں ان کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ یہاں حفیظ جالندھری صاحب بیٹھے ہیں۔ احسان دانش، میرزا ادیب اور احمد ندیم قاسمی بیٹھے ہیں، میرے پاس ان حضرات کی جو کتابیں ہیں۔ اُن کے پہلے ایڈیشن ہیں۔ پھر مجھے ان کے اشعار بھی یاد ہیں۔ حفیظ صاحب آپ کی کشمیر کے بارے میں جو نظم ہے۔ وہ مجھے پوری یاد ہے۔ مثلاً :۔

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنّت نشاں
ورنہ جنّت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنّت؟ چند حوریں، اک چمن دو ندیاں
خیر زاہد کی نگاہ سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں

عالمِ بالا پہ ہے پر تو یہی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

میرے پاس جناب میرزا ادیب کے صحرا نورد کے خطوط کا پہلا ایڈیشن ہے اور حضرت احسان دانش کا یہ شعر ؎

جو گزر رہی ہے دل پر کوئی ترجماں نہیں ہے
میرے دوستوں میں کوئی میرا چہرہ خواں نہیں ہے

اور جناب قاسمی صاحب مجھے آپ کا بھی ایک شعر یاد آگیا ہے ؎

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

ایک بات اور سُن لیں۔ ایک جگہ ہماری دعوت تھی۔ وہ لوگ غریب تھے۔ دوسرے اچھوت، اُنھوں نے کہا کہ جناب پہلی حکومتوں نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔ اب صرف آپ ہی لوگ ہیں جو کچھ کر سکتے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ سابقہ حکومتوں نے، اپنی عقل و فہم کے مطابق کام کیا۔ ہم لوگ اپنی عقل و فہم کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ کل کو کن کی سعی کو

مشکور گردانا جائے گا۔؟ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جس طرح ابھی صدر محترم نے فرمایا کہ کتابوں اور رسالوں پر کوئی سنسر نہیں ہے۔ اچھی بات ہے۔ اگر سنسر قائم بھی رہتا تو بات کرنے والے بات کر ہی جاتے تھے۔ میر صاحب بھی تو کہہ گئے ہیں:۔ ؎

سلیقہ شرط ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

طفیل صاحب یہ جو آپ نے انیس نمبر چھاپنے کی نوید سنائی ہے تو انیس کے بھی کچھ اشعار یاد آ رہے ہیں۔ ذرا غور سے سنیئے گا:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لیے

داند آنکس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اذان ہو رہی ہے۔ گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔ خدا تعالےٰ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے۔ میں آپ کی کرمفرمائی اور ذرہ نوازی کا نہایت ہی شکر گزار ہوں۔ السلام علیکم!

[نوٹ: میر صاحب محترم نے جو کچھ فرمایا، فی البدیہہ فرمایا۔ اس لیے مفہوم تو ان صفحات میں موجود ہے مگر ویسے خوبصورت فقرے ہاتھ نہ آئے۔]

اِعتراف

حفیظ جالندھری

ادبی معرکے نمبر کی بجائے، مَیں اسے شمارہ کہتا ہوں۔ دونوں کی دونوں جلدیں محمد طفیل کے طفیل مجھ پر نازل ہوئیں، مطالعہ میں آئیں۔ میرے دیدہ و دل نے یہ عنوان نیا دیکھا۔

ان میں سے چند ایک مضامین کسی زمانے میں میری نگاہ سے گذرے تھے۔ مجھے اس مجلسِ ادب نواز میں طولانی کہانی سنانا منظور نہیں ہے بلکہ صرف حیرت انگیز اعتراف ہے اور وہ اِعتراف یہ ہے کہ جستہ جستہ تنقیدیں، اعتراضات اور تردیدیں تو اپنی حیاتِ متعلقۂ شعروادب میں سامنے آئی تھیں یا جن ادبی رسائل اور اخبارات کا میں مدیر رہ چکا ہوں اُن میں بھی درج ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ایک جگہ ان کا جمع کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

میں نے انگریزی لٹریچر بھی پڑھا ہے۔ ہندی بھی پڑھی ہے۔ فارسی بھی پڑھی ہے۔ عربی سے بھی واقف ہوں۔ اُردو کو بھی کھنگالا ہے۔ اس لیے اعتماد سے کہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جس میں اتنے معرکۃ الآرا مضامین ایک جگہ جمع ہوں اور نہ میرے تصور میں کوئی ایسا مدیر، صحافی اور نقاد آیا جس نے اتنی مشقت اختیار کی ہو بلکہ اس کا اتنا محیط اور عجیب و غریب اظہار بھی کیا ہو۔

نقوش کے اتنے شمارے شائع ہو چکے ہیں کہ ان کا ذکر میرے فاضل دوست کر چکے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ہر نمبر کا ایک ایک حرف پڑھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نمبر نے مجھے از سرِ نو پیرِ مشوبیا آموز بنا دیا ہے۔ بیاسی برس کا بوڑھا ہوں، شاعری میرا میدان رہا ہے لیکن زیرِ مطالعہ شمارہ میں بزرگوں نے جس طرح سے اصلاحیں دی ہیں۔ اِس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں کہ اس طرح طفیل کے طفیل مجھے بھی از سرِ نو اپنی شاعری پر غور کرنے کا موقع مل گیا۔

اس کے بعد میں انھیں سلام کرتا ہوں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ دنیا میں اس سے بہتر نمبر کہ جس کو CRITICISM کہتے ہیں۔ یا جو ایسے مضامین کا اِحاطہ کرتا ہو۔ آج تک کسی نے پیش نہیں کیا۔

میں مبارک باد آپ ہی کو نہیں دیتا بلکہ اس قوم اور پاکستان کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ایسا کام کر دکھایا۔

ادبی معرکے - ایک مبسوط تاریخ

عطاء اللہ سجاد

آج شام کی تقریب محمد طفیل صاحب کے مجلّہ "نقوش" کی اُن دو جلدوں کے تعارف کے لیے منعقد کی گئی ہے جو "ادبی معرکے" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

موجودہ زندگی کی رواداری میں تحقیق و تفحص اور غور و فکر کا رجحان کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن سطحیت اور سہل انگاری کے اِس زمانے میں بھی محمد طفیل نے اپنے لیے ہمیشہ سخت کوشی کا رستہ اختیار کیا اور اردو ادب کی دنیا میں تجسّس اور تحقیق کی دقّت طلب روش جاری رکھی۔ انھوں نے اردو ادب کے ہر شعبہ میں خواہ اس کا تعلق نظم سے ہو یا نثر سے، افسانے سے ہو یا طنز و مزاح سے، ادبی شخصیات سے ہو یا کسی اور موضوع سے، تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا اور علم کے گہرے سمندر سے بے بہا موتی نکال کر انھیں اردو کے نگار خانے میں سجا دیا۔ میرے خیال میں اردو زبان کی ایسی ٹھوس، مربُوط اور مسلسل خدمت کی مثال دورِ حاضر میں شاذ ہی ملے گی۔

اُن کا تازہ ترین کارنامہ دو جلدوں میں ادبی معرکوں کی اشاعت ہے۔ مضمون کی وسعت کے پیشِ نظر اُنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے مختلف صُوبوں کے اُن دعاوی کا تجزیہ کیا ہے کہ اردو اُنھیں کے ہاں سے شروع ہُوئی۔ اِس سلسلے میں پنجاب، سندھ، بنگال، بہار، میسور، مدراس اور دکن میں اردو زبان کے آغاز اور اس کی ترویج کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اِن دعاوی کا تاریخی حوالوں سے موازنہ بھی کیا ہے۔ اِس موازنہ کا مجموعی تاثر جو قاری کے ذہن میں آتا ہے وُہ یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان کے مختلف گوشوں میں مختلف قوموں کے ارتباط اور اختلاط سے پیدا ہوئی اور پھر بنگال سے لے کر کشمیر تک اور تورخم سے لے کر کلکتے تک اپنی ہمہ گیری اور عوامی تائید سے پھیلتی گئی کوئی زبان جسے عوامی تائید حاصل ہو اور جو لوگوں کی زبانوں کو چاشنی بخشنے کی صلاحیت رکھتی ہو کسی خارجی تائید اور سرکاری امداد کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ عوامی تائید کا اثر ہے کہ آج ہندوستان میں جہاں اردو کو آزادی کے بعد بڑے صبر آزما مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے شمالی ہند میں ابھی تک اخبارات اور فلموں کی زبان اردو ہی ہے۔

محمد طفیل صاحب نے ادبی معرکے کی پہلی جلد میں تاریخی حوالوں سے اُن تحریکات کا ذکر بھی کیا ہے جو ۱۸۶۰ء سے اردو کو معدوم کرنے اور ہندی یا ہندوستانی کے نام سے سنسکرت زدہ ہندی کو رائج کرنے کے لیے شروع کی گئیں۔ لیکن اردو کی ہمہ گیری اور اس کے ایک زندہ زبان ہونے کا یہی ثبوت ہے کہ یہ تحریکات بعض اوقات سرکاری تائید کے باوجود بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ طفیل صاحب نے اُس تدریجی سفر کی روداد بھی تاریخ کے صفحات سے نکال کر آپ کے

سامنے رکھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نے فصاحت اور بلاغت کی راہوں میں صدیوں تک کس طرح سفر کیا اور کس طرح نئے نئے الفاظ عوامی ٹکسال سے نکل کر اس کے خزانوں کو معمور کرتے رہے۔

"ادبی معرکے" کی دونوں جلدوں میں زبان کی تاریخ اور اُس کی تدریجی ترویج واشاعت کے علاوہ قواعد، گرامر، تنقید و تقریظ، اصلاحِ سخن اور عروض کے متعلق بھی دستاویزی حوالوں اور شواہد سے نہایت اہم تاریخی اور علمی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن نہایت اہم مباحث کا بھی تذکرہ ہے جو زبان کے سلسلے میں پیدا ہوئے اور جن پر برعظیم کے ہندو اور مسلمان عمائدین نے اظہارِ خیال فرمایا۔ عمومی موضوعات پر اظہارِ خیال اور اس سلسلے میں ادبی معرکوں کے حوالے کے علاوہ اُن ادبی معرکوں اور مجادلوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو انفرادی طور پر ادبی شخصیتوں اور شعرا مثلاً انشاء اور مصحفی، اور ہمارے اپنے دور کے نزدیک اقبال اور اُن کے معترضین اور مولانا ظفر علی خاں اور ان کے حریفوں کے درمیان ہوتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ پرانے شعرا کی باہم آویزی اور چپقلش میں بعض اوقات ثقافت اور تہذیب کی حدوں سے تجاوز نظر آتا ہے لیکن یہ ادب بھی ہمارے ادب کا حصہ ہے اور اِس میں زبان کی کاٹ، طنز و مزاح اور تلمیحات اور استعاروں کے لطیف استعمال کا اپنا مقام ہے۔ اِس کے علاوہ یہ معرکے اُس زمانے کی ادبی زبان اور ادبی معرکوں کے پس منظر سے آشنا کرتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان دو نمبروں کی ترتیب و تدوین میں طفیل صاحب نے بے حد عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اردو زبان کی ایک مبسوط تاریخ مع اُن عوامل کے جو اِس کی ترویج واشاعت میں کارفرما تھے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اُن کے پہلے کارنامے ہی کیا کم تھے اور اُن کے نقوشِ تازہ بھی اپنے آپ میں پائندگی اور ہمیشگی لیے ہوتے ہیں۔

میں اُنھیں اپنی طرف سے اور آپ سب کی طرف سے اِس کارنامے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اُن کی کوششیں آئندہ بھی تابندہ تر اور پائندہ تر نقوش بساطِ اردو پر ثبت کرنے پر مرکوز رہیں گی۔

عجیب و غریب شخص

اشفاق احمد

ادبی معرکے نمبر پڑھ کر مجھے یہ پتہ چلا کہ ہمارے بزرگ بھی بفضل تعالیٰ ہم سے بہتر نہیں تھے۔ لڑائی جھگڑے، دھینگا مشتی، دُھول دھپّے کے فن میں گنی لوگ تھے اور اپنے علاوہ دوسروں کو احمق اور لکڑ سرا سمجھتے تھے ـــــ ان کے چہرے مُہرے وضع قطع میلے لباس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی ذات کے اندر ایک چیز ایسی ضرور موجود تھی جو خوراک اور غذا کے بغیر اور آکسیجن اور وٹامن استعمال کیے بنا سب سے زیادہ صحت مند، تنومند اور چیڑھی تھی اور وہ تھی ان کی انا اور ان کے نفس کی شوکت! حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے۔ ہمارے بھی ایک بہت پیارے، علم دوست، مرنجاں مرنج اور آزاد مرد قسم کے دوست للیانی میں رہتے ہیں۔ وہ صبح سویرے بس میں بیٹھ کر لاہور آتے ہیں اور سارا دن لائبریری میں گزار کر شام کی بس سے واپس گاؤں چلے جاتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی لگت بازی اور تعصب سے پاک ہیں کیونکہ وہ ہر ایک سے یکساں طور پر نفرت کرتے ہیں اور ان کو کسی کا کوئی کام پسند نہیں آتا۔ میں نے ان کا ذکر اطلاعاً کیا ہے کہ وہ بھی ایک بہت بڑا ادبی معرکہ ہیں گو محمد طفیل کو ابھی ان کی خبر نہیں ملی۔ ان کو یقین ہے کہ جن دو کتابوں کے نوٹس انھوں نے ہیروشیما کے بعد سے لے کر اب تک تیار کیے ہیں ان ہزارہا کتابوں سے بہتر ہیں جو احمق لوگ اب تک چھپوا چکے ہیں اور جن کو جاہل پبلشر بار بار شائع کر رہے ہیں۔

محمد طفیل ایک عجیب و غریب شے ہے جو ہر مرتبہ عجیب و غریب نمبر لے کر آجاتا ہے، سوائے اپنے اداریے کے ہر جگہ شرماتا لجاتا لچکتا بل کھاتا اپنا نمبر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے شرمیلا ٹیگور کا نام سُن کر ہمیشہ محمد طفیل یاد آجاتا ہے۔ لکھنا پڑھنا شانتی نکیتن ٹیگور کا سا اور باقی سب کچھ شرمیلا جیسا ـــــ جن دنوں میری اس کی بول چال تھی بلا واسطہ طور پر بہت کچھ اس سے پوچھ لیتا تھا۔ اب ہم دونوں اپنی اپنی عزت کے مورچے میں اُترے ہُوئے ہیں اور لام بندی کے سترہ سال گزارنے کے باوجود خندق سے باہر نہیں نکلتے ـــــ اگر میرا بس چلے تو اس سے پُوچھوں کہ تم یہ نمبر کس طرح سے نکالتے ہو؟ اور لوگ بھی نمبر نکالتے ہیں لیکن ان کے نمبروں میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو تمہارے نمبروں میں ہوتا ہے۔ جیسے سلاجیت اور پہاڑوں سے بھی نکلتی ہے لیکن چلاس کے پہاڑوں کی سلاجیت بیٹھنے ہی نہیں دیتی ـــــ کیا کوئی بہت بڑا ریسرچ سکالر یہ سارا سرمایہ چھوڑ کر مر گیا ہے اور اس کی کوٹھڑی کا بند راستہ اس علی بابا پر وا ہو گیا ہے یا سلیمانی ٹوپی والے جنوں اور موکلوں کو اس کام پہ لگا دیا گیا ہے کہ وہ اردو کی دُنیا سے ایسے دفینے کھود کر لاتے رہیں اور محمد طفیل کے جانماز تلے جمع کرتے رہیں کہ صبح نماز فجر کے بعد جب وہ دایاں کونہ اٹھائے تو کاتب کو فیڈ کرنے کے لیے سات دن کا

مواد وہاں رکھا ہو۔ یا پھر یہ سارے نمبر بکواس ہیں اور محمد طفیل نے اجتماعی نظر بندی کر کے ہم سب کو بھوندو بنا رکھا ہے۔ میں نے اس پر بڑا غور کیا ہے اور یہاں سے جانے کے بعد پھر غور کرنا شروع کر دوں گا لیکن مجھے اس گتھی کا ابھی تک ایک سرا بھی نہیں ملا۔ میں نے ایم۔اے اردو کے ایک ذہین طالب علم سے بھی پچھلے سال درخواست کی کہ وہ محمد طفیل نمبروں والے کے طریقۂ کارکردگی پر ایک مبسوط تھیسس لکھے اور پھر اس کو کتابی صورت میں شائع کرے۔ لیکن اس نوجوان نے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کیا کہ محمد طفیل چونکہ ابھی تک فوت نہیں ہوئے اس لیے ان پر تھیسس نہیں لکھا جا سکتا۔ یونیورسٹی نیم جاں لوگوں پر تھیسس لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ یہ مشکل مسئلہ کیونکر حل ہوگا۔ محمد طفیل تو اس راز کو اپنے ساتھ ہی فوت کر دا کے دم لیں گے۔

یوں تو نقوش کے ہر نمبر نے ایک نیا علم عطا کیا لیکن ادبی معرکے نمبر نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ پتہ یہ چلا کہ لکھائی پڑھائی، ادب اور شاعری، تنقید اور تحقیق بشر کو کسی ارفع سطح پر نہیں لے جاتیں بلکہ وہ بندے اور بشر کے مقام سے گر کر انسان بن جاتا ہے (یاد رہے کہ انسان کو قرآن اچھے معنوں میں یاد نہیں کرتا، جہاں بھی انسان کا ذکر آیا ہے تو ہیں آمیز انداز میں ہی آیا ہے)

تو معلوم یہ ہوا کہ اپنے تمامتر علم اور ادب اور فن کے باوجود انسان پتھر اور دھات کے زمانے کے انسان سے آگے نہیں بڑھا۔ وہی حرص، وہی طمع، ویسی ہی چالاکی، وہی عیاری، حسد، جلن، سینہ زوری، وہی چھوٹا پن، کمینہ پن اور خونخواری ——— لیکن یہ بھید نہ ہی کھلتا تو اچھا تھا۔ علم ادب شاعری فن کاری کا جو بھرم بنا ہوا تھا بھرم ہی رہتا تو کیا بُری بات تھی۔ لیکن طفیل کو تو کسی کا بھرم بھی پسند نہیں اپنے نمبر عزیز ہیں۔

طفیل صاحب

پروفیسر محمد عثمان

طفیل صاحب میرے دوست نہیں۔ اگرچہ میری ان کی بالمشافہ جان پہچان پچیس تیس سال پرانی ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں شخصیات نمبر شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا تو مجھے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی شخصیت پر لکھنے کی دعوت دی۔ میں ان کے خط اور خوشخطی دونوں سے متاثر ہوا۔ اُدھر ڈاکٹر برق کی شخصیت بھی مجھے لکھنے پر مسلسل اُکسا رہی تھی۔ چنانچہ مجھ سے ایک ایسا مضمون لکھا گیا جو چھپا تو دوستوں کے علاوہ دشمنوں نے بھی اُسے سراہا۔ دشمنوں میں برق صاحب کے زیادہ اور میرے کم شامل تھے۔ تاہم جب مضمون کا چرچا ہوا تو میرے دل میں برق صاحب اور طفیل صاحب کے لیے شکرگزاری کا نامعلوم سا جذبہ اُبھرا۔ برق صاحب نے دلچسپ مواد مہیا کیا تھا اور طفیل صاحب نے اسے خوبصورتی سے چھاپا تھا۔ اُن دنوں میں گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں پڑھاتا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور آ گیا۔ پھر ویسٹ پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ میں چلا گیا اور طفیل صاحب سے میری کبھی کبھار ملاقات ہونے لگی۔ اُدھر "نقوش" کے خاص نمبر یکے بعد دیگرے آنے لگے اور طفیل صاحب کی محنت اور ذوق کا نقش دلوں میں گہرا ہوتا چلا گیا۔

طفیل صاحب کو میں گلڈ کے جلسوں میں ملا ہوں۔ چند بار میری ان کی کسی ہوٹل یا نجی محفل میں ملاقات ہوئی ہے۔ دو ایک بار وہ میرے گھر تشریف لائے اور ایک بار میں نے ان کے ساتھ نیو مسلم ٹاؤن میں ان کا خوبصورت گھر دیکھا جو ابھی زیرِ تکمیل تھا۔ میں نے طفیل صاحب میں خود ساختہ انسان کی بہت سی خوبیاں دیکھیں اور خود ساختہ انسان کی خامیاں مجھے ان میں نظر نہ آئیں۔ خامیاں نظر نہ آنے کا سبب خود میری نظر کی کوتاہی بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس مختصر سی تحریر میں وہ کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں جو میں نے دیکھا۔ جو میں نہیں دیکھ سکا، وہ مجھے معاف کر دیا جائے۔

ایک روز میں اور طفیل صاحب شیزان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور وہ ادیبوں اور شاعروں کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس شخص میں اچھے اور پسندیدہ انسانوں کے لیے بڑی محبت اور گہری عقیدت ہے اور یہ محبت و عقیدت میرؔ و غالبؔ اور اکبرؔ و اقبالؔ کے لیے ہی مخصوص نہیں بلکہ اس میں قاسمی و فیض اور بیدی و کرشن چندر کا بھی وافر حصہ ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ طفیل صاحب اُن لوگوں کی بُرائی کرنے سے گریز کرتے ہیں جن سے ان کو اختلاف ہے۔ اور اُن لوگوں سے اپنی عقیدت و وابستگی کا کھُل کر اور قطعی اعتماد کے ساتھ اظہار کرتے ہیں جن سے ان کو محبت ہے۔ میں نے اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ طفیل صاحب محض شریف آدمی ہی نہیں بلکہ ان کے وجود کی بنیاد بڑی محکم اور پائیدار ہے۔ جس دل کے بیشتر گوشے عقیدت و محبت سے لبریز ہوں اور نفرت و حقارت کے لیے اس میں کوئی جگہ نہ ہو اس سے زیادہ مضبوط

بنیاد انسان اور کون ہوگا ؟

محنت اور لگن طفیل صاحب کی شخصیت کا خمیر ہے۔ محنت بے شمار لوگ کرتے ہیں۔ خود شاعروں اور ادیبوں میں ایسوں کی کمی نہیں، جو سراپا محنت ہوتے ہیں، سراپا لگن ہوتے ہیں۔ مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں بعض کو محنت نگل جاتی ہے، وہ دن رات محنت کرتے ہیں مگر اس محنت سے نکلتا کچھ بھی نہیں۔ وہ محنت میں ڈوبتے ہیں اور محنت ان کو لے ڈوبتی ہے۔ تھوڑے ایسے خوش قسمت ہیں جن کی محنت ٹھکانے لگتی ہے، جن کی لگن ان کے کام آتی ہے۔ طفیل صاحب ان خوش نصیبوں میں ہیں، جن کی محنت رائیگاں نہیں جاتی، جو محنت کے ساتھ قابلیت، مہارت اور دُور اندیشی کو اس طرح کام میں لاتے ہیں کہ کام کارنامہ بن جاتا ہے۔ طفیل صاحب نے 'نقوش' کے جو درجن بھر نمبر نکالے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص اس حیرت زدگی سے بچ نہیں سکتا کہ یہ کسی انجمن یا ادارے کا نہیں بلکہ ایک شخص کی محنت کا ثمر ہے۔ ہر نمبر کے لیے اتنے وقیع اور بلند پایہ مضامین کا لکھوانا اور انھیں یک جا کرنا، کتابت و طباعت کے ایسے خوبصورت معیار کو قائم رکھنا اور پھر پورے مواد کو ایسا حسین و جمیل پیکر عطا کرنا کہ خوش ذوق انسان دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ یہ عظمتِ کار، یہ مدبرانہ مہارت، یہ سلیقہ، یہ ہنرمندی اُردو رسائل کی تاریخ میں جتنی اور جیسی طفیل صاحب کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔

توازن ایک اور وصف ہے جس کے ذکر کے بغیر طفیل صاحب کی شخصیت کا بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کام اور آسائش کے درمیان طفیل صاحب نے کوئی مساوات قائم کر رکھی ہے یا نہیں، تاہم مراسم میں توازن اور دین و دنیا میں توازن ان کی زندگی سے عیاں ہے۔ مراسم میں توازن ان کی خاکہ نویسی سے ظاہر ہے اور دین و دنیا میں توازن ان کے کامیاب کاروبار اور ان کے گھر بار سے ثابت ہے۔ ایک انسان جی بھر کر خدمت کرے، کسی مشن میں جان کھپائے اور اس میں تحسین کا مقام پائے اور ساتھ ہی وہ بیوی بچوں کی صحیح و مناسب نگہداشت کرے، انھیں مکمل آرام و آسائش پہنچائے۔ اور محنت کے بَل پر افلاس کی ذلتوں اور تاریکیوں سے نکل کر تمول کی راحتوں سے ہمکنار ہو۔ یہ بات بظاہر معمولی نظر آتی ہے مگر ہے عظیم الشان اور لائقِ تحسین۔

فیروز سنز کے بانی مولوی فیروز الدین مرحوم ابتداً میں کاتب تھے۔ طفیل صاحب بھی آغازِ کار میں کاتب تھے۔ مگر ان دونوں نے بڑا نام کمایا۔ مولوی صاحب نے اشاعتِ قرآن، تصنیفِ اسلامی کے میدان میں نام پیدا کیا۔ طفیل صاحب نے اُردو ادب سے عشق فرمایا اور اس میدان میں جھنڈے گاڑے۔ مولوی فیروز الدین علی ہجویریؒ کے قدموں میں مزے کی نیند سو رہے ہیں۔ طفیل صاحب کو شاہ جمالؒ میں جگہ ملتی ہے یا نہیں، یہ سوال دوسرا ہے۔ مگر انھوں نے اپنے نام کے باقی رہنے کا جو بندوبست کیا ہے۔ وہ یقیناً ان کی آخری رسومات سے بے نیاز ہے۔ جب تک اُردو زبان و ادب زندہ ہے اور ادبی تحقیق کا دیا روشن ہے۔ طفیل کا 'نقوش' اور 'نقوش' کا طفیل زندہ و روشن ہے۔

آج کا حاتم

ڈاکٹر سلیم اختر

کتابوں کی الماریوں کی فصیل پر دو سورما ایک دوسرے پر قلم کے نیزوں سے حملہ آور ہیں۔ نیچے دو ڈشکرے دانت نکوسے رزم آرا ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں قلموں کی تلواریں تو دوسرے نے نقوش کے کسی خاص نمبر جیسی ضخیم اور تگڑی کتاب کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ الماریوں کی فصیل کے پیچھے سے دو خوفزدہ چہرے جھانک رہے ہیں جبکہ مینڈکوں جیسی سبز رنگت والے دو چھاپہ مار الماری کے پہلو اور نیچے سے اپنی چھپکلی جیسی گول گول آنکھوں سے میدانِ جنگ کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک نے مارے خوشی کے دانت نکال رکھے ہیں جبکہ دوسرے کی زبان کسی پیاسے جانور کی طرح منہ سے باہر نکل آئی ہے۔ قلم کی تلوار سے لڑنے والوں کے قدموں میں ان کے قلموں کی لاشیں ہیں جن میں سے ایک قلم کو تو قلم کی تلوار نے دو ٹکڑے کر دیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

میں "نقوش" کے "ادبی معرکے نمبر" کا سرِورق دیکھتا ہوں اور دیکھتا رہ جاتا ہوں یوں کہ یہ سرورق ایک آئینہ میں تبدیل ہو جاتا ہے ایسا آئینہ جس میں ادبی معرکہ بازوں کے نقوش مسخ مسخ سے نظر آتے ہیں اور محمد طفیل نے بھی ادبی معرکہ بازوں کے رن میں ہی مسخ مسخ نقوش سے "نقوش" کا یہ خصوصی نمبر ترتیب دیا ہے اگرچہ سرورق کی زینت بنے چہروں میں کسی زندہ یا مُردہ ادیب کے نقوش کی جھلک نہیں ملتی لیکن کمال ہے کہ اس کے باوجود ان عام چہروں کے پیچھے کسی نہ کسی معروف جنگجو ادیب کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے میں کسی کا نام نہیں لوں گا کہ یہ سرِورق بیشتر اصحاب کے لیے جُداگانہ انداز کا آئینہ ثابت ہو سکتا ہے اپنا چہرہ دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ ان چہروں میں اپنے دشمنوں کے نقوش کی تلاش کے لیے!

صاحبو! ادیبوں کا بھی عجب معاملہ ہے کہ سوتوں کی مانند لڑے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کسی نے دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ اس بات کو قرار دیا تھا کہ ایک کمرہ میں دو عورتیں خاموش بیٹھی تھیں۔ لیکن دنیا کی سب سے بڑی سچائی کی طرف کسی کی توجہ نہ گئی کہ ایک ادیب تنہا بھی خاموش نہیں بیٹھتا کہ ہر دم اپنی ذات سے مکالمہ جاری رکھتا ہے یہ مکالمہ جب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو انسانی سائیکی کے اس ڈرامہ کو جنم دیتا ہے جسے ہم تخلیق کا نام دیتے ہیں۔ اسی لیے تو تخلیق ہمیں اپنی خاص فضا میں یوں جذب کر لیتی ہے کہ الفاظ کی تال پر ہمارے اعصاب دل بن کر دھڑکتے ہیں جب تخلیق کی تال پر ہمارے اعصاب دھڑک اُٹھتے ہیں تو اس کے اعصاب پر کیا قیامت نہ بیت جاتی ہو گی جیسے بے خواب راتوں کا اجرِ عظیم تخلیقی صورت میں ملتا ہے، تخلیق سے لطف اندوز ہونے والا قاری کیونکہ تخلیق کار کی شخصیت سے غیر متعلق ہوتا ہے اس لیے وہ کبھی بھی

اس ہفت خواں کی شدت کا اندازہ نہیں لگا سکتا جسے تخلیق کی تکمیل کے دوران تخلیق کار کی سائیکی طے کرتی ہے، لیکن تخلیق کار تخلیقی عمل کے جبر اور کرب سے آشنا ہوتا ہے، اسی لیے تو اسے اپنی تخلیقات اسی طرح پیاری ہوتی ہیں جس طرح ماں کو ناک سڑسڑاتا اور بھنبھناتی مکھیوں میں گھرا بچہ بھی چاند کا ٹکڑا ——— ٹکڑا کیا بلکہ چودھویں کا چاند نظر آتا ہے۔ آپ نے دو پڑوسنوں کو بدتمیز بچوں کی خاطر یقیناً لڑتے دیکھا ہوگا۔ کچھ یہی عالم ادیب کا ہے کہ وہ بھی جگر گوشوں کے لیے ایک عالم سے لڑائی مول لے سکتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو آج محمد طفیل ۱۳۰۰ صفحات پر مشتمل یہ عظیم اور ضخیم نمبر مرتب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا اور وہ بھی اس دعویٰ کے ساتھ:

"تماشا یہ بھی ہے کہ دنیا کا ہر فرد دوسرے فرد کے خلاف ہے۔ یہ ہماری سرشت کا اقتضا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آپ ادیب اور شاعر ہیں تو معاملہ زیادہ سنگین ہوگا لیکن عام آدمی اور ادیب میں فرق ہوتا ہے (بشرطیکہ نیتوں میں ٹیڑھ نہ ہو) عام آدمی غصہ میں آکر اپنا اور دوسروں کا نقصان کرتا ہے، مگر ادیب غصہ میں آکر دوسروں کا بھلا کرتا ہے کیونکہ اس کی کٹار نہیں چلتی، قلم چلتا ہے، قلم کی انھی جولانیوں سے یہ نمبر آراستہ ہے۔ علمی موشگافیوں کی ضرب تقسیم بلکہ تفریق سے ادب کا بھلا ہوگیا، یہ میرا بیان ہے، یاد رہے کہ ایک اچھا آدمی بھی سارا دن اچھا نہیں رہتا، یہ بھی میرا ایقان ہے۔"

واضح رہے کہ یہ سطریں وہ شخص لکھ رہا ہے جسے ہم سب اچھا مرد سمجھتے ہیں بلکہ میں تو اسے ایک اچھا آدمی سمجھنا رہا ہوں جو سارا دن ہی اچھا رہتا ہو ——— ٹھیک ہے تو پھر اس کے لکھے کی روشنی میں میں اب اپنی رائے تبدیل کیے لیتا ہوں۔ محمد طفیل بظاہر بہت پولا پولا انسان ہے۔ لیکن مزاج آشنا احباب "نقوش" کے رقیبوں اور حسن کی تحریریں مسترد کیں ان ادیبوں کو اس امر کا اندازہ ہے کہ باہر کا یہ پولا انسان اندر سے کیل کی مانند سخت اور نوکیلا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ بالعموم زبان اور قلم کو نابو میں رکھتا ہے (صرف اپنے اداریوں میں AIRS لیتا ہے) اس لیے میں یہ سوچتا ہوں کہ کہیں یہ تو نہیں کہ اردو ادب کے عظیم ترین معرکوں اور معرکہ بازوں کے تذکرہ سے اس نے اپنی کسی خاص کجرو جبلت کا ارتفاع کر لیا ہو، ہو سکتا ہے وہ دن کے کسی بھی حصہ میں اچھا نہ رہتا ہو اور شاید اس لیے اپنے اندر کے چھپے جن کو "نقوش" کے نت نئے نمبروں کی بوتلوں میں بار بار مقید کرنے کے اسی عمل میں گرفتار ہو جس نے سستی فس کے کرب کو جنم دیا تو حاتم طائی کی مہمات کو!

محمد طفیل کی شخصیت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اس کی مدیرانہ شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور وہ اتنا اچھا بھی ہے کہ میں اس میں مزید اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور پھر اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ وہ محمد طفیل سے "محمد نقوش" بن گیا اور اس پر خوش بھی ہے "تو من شدم" کی اس سے بہتر مثال اور کہاں ملے گی! تاہم "نقوش" کے خاص نمبروں کے سلسلہ میں سامنے کی ایک بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ محمد طفیل نے خاص نمبر خواہ روایتی موضوعات پر نکالے، جیسے افسانہ، غزل، غالب، اقبال، میر اور انیس کے بارے میں خاص نمبر یا پھر غیر روایتی نمبروں کی

طرح ڈالی۔ جیسے لاہور، مکاتیب، آپ بیتی اور یہ تازہ ادبی معرکے نمبر۔ لیکن بہرصورت اس نے ایک کام ضرور کیا اور وہ یہ کہ بہترین مواد کو خوب صورت ترین انداز میں پیش کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی بڑھ کر اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس تمام مواد کی ترتیب اور پیشکش کے پیچھے بطور محرک ایک خاص سوچ والے ذہن کے خواب اور ان کے ساتھ ساتھ ایک خاص زاویۂ نگاہ بھی زیریں لہروں کی مانند موجیں مارتے نظر آتے ہیں۔ ہر ادبی پرچہ کی انفرادیت اس کے مدیر کی شخصیت اور زاویۂ حیات کا عکس ہوتی ہے اگر یہ نہیں تو پرچہ محض مقالات، افسانوں اور شاعری کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر قسم کی تخلیقی سوچ سے عاری محض مطبوعہ اوراق!

لڑائی جھگڑا کوئی اچھی بات نہیں اسی لئے تو میر، سودا، مصحفی اور انشا جیسے بزرگوں کی معرکہ آرائیوں کا چسکے لے لے کر تذکرہ کرنے کے باوجود قارئین کی اکثریت کا ان کے بارے میں معذرت خواہی پر مبنی رویہ بھی ملتا ہے لیکن بہ سب باتیں تو ہم آپ جیسوں کے لیے ہیں محمد طفیل کے لیے نہیں جس نے اس نمبر کو یوں مرتب کیا کہ ان ہی معرکوں کے حوالے سے ادب و لسانیات اور تحقیق و تنقید کے دقیق نکات اُجاگر کر کے رکھ دیے ہیں۔ چنانچہ اس امر پر پورے وثوق سے زور دیا جا سکتا ہے کہ اس نمبر میں پیش کردہ مواد کی روشنی سے اردو ادب کی تاریخ سے وابستہ لاتعداد اہم گوشے منور ہو گئے ہیں ایسے اہم گوشے جن سے ادبی مورخ صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ یوں دیکھیں تو اس نمبر کی رُو سے اردو ادب کی ترقی میں ادبی معرکوں نے نہ صرف بیحد اہم اور بیحد تعمیری کردار ادا کیا ہے بلکہ میں تو یہاں تک جانے کو تیار ہوں کہ اس نمبر کے ذریعہ محمد طفیل نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ادبی ترقی کے لیے معرکہ آرائی بے حد ضروری ہے، مگر وہ دشنامی دبستان کی معرکہ آرائی نہ ہو اور یہ وہ مقام ہے جہاں ادبی معرکہ کے محرک اور معرکہ باز کی نیت میں امتیاز بیحد ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بجوگوؤں کی مانند لڑائی کا باعث صرف اپنی ذات کی تشہیر ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر وہ مخالفانہ اندازِ نظر کے حامی کی کردار کُشی کے لیے ہے تو یہ کوئی قابلِ ستائش محرک نہیں اور بلاشبہ اس صورت میں ادیب، تخلیق کار کے منصب سے نیچے گر کر اس سطح پر آ جاتا ہے جہاں محلہ کی عورتیں اپنی اپنی دہلیز پر کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر اور حلق پھاڑ پھاڑ کر معرکہ آرا ہوتی ہیں اور یہ بھی طے کہ اس انداز کے لڑاکوں کی کسی بھی عہد میں کمی نہیں رہی۔ چنانچہ میر، سودا اور بقا کی ہجویات اور مصحفی کے خلاف انشا کے جلوس سے لے کر آج کے دشنامی دبستان تک اگرچہ اظہار کی بوقلمونی ملتی ہے لیکن محرک سب کا ایک ہی بے معنی:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور اس احساس سے جنم لینے والے تناخر کے احساس کی بنا پر مخالفین کی کردار کشی! اسی نے ہمارے ثقہ بزرگوں سے فحش ہجویات قلم بند کرائیں۔

ہجوگوئی کا نفسیاتی مطالعہ کریں تو اس سے وابستہ محرک میں نرگسیت کے علاوہ احساسِ کمتری کا پیدا کردہ مریضانہ فخر، عدمِ تحفظ کا احساس اور اس سے جنم لینے والی بے اعتمادی نمایاں نظر آتے ہیں (یقین مانیے یہ سب وزیر آغا کو

سامنے رکھ کر نہیں لکھا) لیکن اس ذاتی محرک کے برعکس شخصی معرکے بھی ملتے ہیں اور یہ ہے اصولوں کی جنگ اور نظریات کی لڑائی۔ یہ دراصل علمی بحث ہوتی ہے ایسی بحث جس کا محرک ادب سے وابستہ اصول وضوابط کی توضیح اور ناقص معلومات پر مبنی اغلاط کی نشان دہی ہوتی ہے اور اسی لیے ادب کی صحت مند نشوونما کے لیے یہ بیحد ضروری ہوتی ہے ایسے ہی معرکوں سے تحقیق وتنقید کو فروغ ملتا ہے۔ مسائل کے علمی خدوخال سنورتے ہیں اور تاریخ ادب کے مختلف ادوار میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ آپ تصور کیجئے اگر ہمارے بزرگوں نے ادب اور لسانیات کے مباحث نہ چھیڑے ہوتے اور پھر دوسرے بزرگوں نے انھیں چیلنج نہ کیا ہوتا تو آج اردو ادب اور زبان کی تاریخ محض "تذکروں" تک ہی محدود ہوتی۔

جہاں تک ادبی معرکے نمبر کا تعلق ہے تو اس میں دراصل محمد طفیل نے ان ادبی، لسانی اور تحقیقی معرکوں کو مدوّن کیا ہے جو خالص علمی تھے جن کا مقصد تحقیقی اغلاط کی نشان دہی تھا اور جن کے ذریعہ اردو تنقید اور تحقیق نے بلند معیار کی سند حاصل کی۔ چنانچہ فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی اردو ادب میں ان معرکوں کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ محمد حسین آزاد سے لے کر علامہ اقبال تک اور پھر اپنے دور میں جوش ملیح آبادی تک اردو ادب کی بیشتر قدآور شخصیات ہاتھ میں قلم کی تلوار تھامے علمی معرکوں میں مصروف نظر آتی ہیں اسی لیے یہ نمبر محمد طفیل کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس نمبر کے ذریعہ اس نے ثابت کر دیا کہ ادبی نظریات کی چھان پھٹک، علمی مسائل کی نوک پلک درست کرنے اور تحقیقات کے نام پر کی جانے والی موشگافیوں کو مسلمات بنانے کے لیے علمی معرکہ آرائی کتنی ضروری ہے اتنی کہ اس نمبر کی روشنی میں تو اردو ادب کی ترقی اور لسانی مباحث کا تنوع صرف ادبی معرکوں ہی کا مرہونِ منت قرار پاتا ہے اور اس لیے ہم ان معرکہ آراؤں کے ساتھ ساتھ اس نمبر کے مرتب کو بھی سلام کرنے پر مجبور ہیں۔

جب اس نمبر کے مطالعہ کے بعد میں طفیل صاحب سے ملا تو میں نے اس زبردست نمبر نکالنے پر مبارکباد دیتے ہوئے ان سے کہا:

"طفیل صاحب! آپ نے زبردست کام کر دکھایا، آپ نے اپنی ریت کو خوب نبھایا اور نقوش کے باقی نمبروں کی مانند یہ نمبر بھی بلاشبہ حوالہ کی چیز قرار پائے گا۔"

یہ سن کر محمد طفیل کے چہرہ پر خوشی سُرخی بن کر چھا جاتی ہے مگر وہ مسکراہٹ دبا کر میری طرف دیکھتا ہے تو زندگی بھر محنت کرنے والی آنکھیں کچھ یوں کہتی محسوس ہوتی ہیں کہ اگرچہ تعریف اچھی چیز ہے یہ مزید کام کرنے کی لگن پیدا کرتی ہے خواب دیکھنے کی سکت بیدار رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تھکے اعصاب کے لیے توانائی کا باعث بھی بنتی ہے تاہم ہم دونوں کی جب آنکھیں چار ہوتی ہیں تو وہ اپنے مخصوص، نرم اور تھکے تھکے لہجہ میں یوں گویا ہوتا ہے:

"اس کے باوجود ——— اس کے باوجود میں خاموشی سے اُٹھتا ہوں اور اپنی ایک اور نیکی کو دریا میں ڈال دیتا ہوں۔"[1]

یوں دیکھیں تو محمد طفیل ادبی جرائد کا حاتم قرار پاتا ہے کہ دنیائے ادب کے سوالوں کے جواب کی تلاش میں ہے اور

یہ سب ہم جیسے سُست منیر شامیوں کے لیے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ خود حاتم کو شہزادی سے وصل کی کوئی تمنا نہ تھی بس مہم جوئی کا لپکا اور نامعلوم کو معلوم کرنے کا سودا تھا۔ کچھ یہی عالم محمد طفیل کا ہے جس نے نقوش کے مختلف نمبروں کی صورت میں کئی ہفت خواں طے کیے اور ہر مہم میں کامیاب اور سُرخرو بھی ہُوا۔ یقیناً اس کے پاس کوئی سلیمانی سُرمہ ہے کہ دفینوں جیسے مخطوطے، گم شدہ مونیوں جیسے اشعار اور فراموش کردہ مقالات کھود نکالتا ہے یا پھر کوئی ایسی بُوٹی ہے جسے سُنگھا کر وہ ناقدین کو رام کر کے اپنے نمبروں کے لیے مقالات لکھوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے یقیناً اس کے پاس عمرو عیار کی زنبیل ہے شاید "نقوش" ہی اس کی زنبیل ہو جس میں سے وہ عجوبے نکال نکال کر آنکھیں خیرہ کرتا جاتا ہے، ہو سکتا ہے بچپن میں اسے کسی سفید پوش بزرگ نے بشارت دے کر اسم اعظم سکھا دیا ہو جبھی تو رخشِ کامرانی پر سوار چار آئینے سجائے نقوش کی منزلیں سر کرتا جاتا ہے۔

---

[1] "طلوع" میر تقی میر نمبر (نقوش ۱۹۷۹ء)

ایک زندہ شخص

رحیم گل

یہ فکشن ادبی معرکے نمبر کے حوالے سے ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ کرسیِ صدارت پر پاکستان کے وزیرِ جنگ بیٹھے ہیں!
میں نے وزیرِ دفاع یا ڈیفنس منسٹر اس لیے نہیں کہا کہ یہ دونوں کمزور لفظ ہیں ـــــ میر علی احمد تالپور جیسا مردِ دبنگ تو وزیرِ جنگ ہی ہو سکتا ہے!
میں محمد نقوش کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ معرکہ آرائی کی یہ محفل ایک معرکہ آفریں وزیر کی صدارت میں ہو رہی ہے۔
ادبی معرکہ نمبر مجھے کچھ دیر سے ملا ہے اس لیے میں نے اُسے جستہ جستہ پڑھا ہے۔ محمد طفیل نے اداریتی صفحے پر ایک خوب صورت فقرہ لکھا ہے:
"ایک بُرا آدمی بھی سارا دن بُرا نہیں رہتا، اور ایک اچھا آدمی بھی سارا دن اچھا نہیں رہتا۔"
مجھے محمد طفیل کی یہ دروں بینی بے حد پسند آئی۔
مجھے یاد ہے ۱۹۵۴ء میں جب میں لاہور فتح کرنے آیا تھا تو بیحد و حساب خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی کہ نقوش میں چھپوں۔
افسانہ لکھا، ڈاک کے سپرد کیا، ذاتی طور پر اس لیے نہ ملا کہ یہ دھان پان آدمی میرے پشتو لہجے سے بدک جائے۔
چھ ماہ گزر گئے، سال گزر گیا، نہ رسید ملی نہ افسانہ چھپا۔ میں ان دنوں جوان تھا اور پٹھان تھا۔ بس شکر خدا کا، محمد طفیل میرے ہاتھ سے بچ گیا!
مگر سرد جنگ شروع ہو چکی تھی، نقوش پڑھتا رہا، مگر محمد نقوش سے پرخاش جاری رہی۔ اُن کو خبر نہ تھی مگر میں مکے برساتا رہا۔ اِس سفید دیو، اِس ادبی دیو کو علم ہی نہیں تھا کہ ایک بونا اُس کی ٹانگ کھینچ رہا ہے۔
یہ یک طرفہ لڑائی تھی، میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہا تھا۔ بالکل اپنے دوست علی سفیان آفاقی کی طرح، جو آج کل امریکہ بھاگ گیا ہے اُن دنوں ہم اکٹھے کام کرتے تھے آفاقی ایک فلمی سنگر کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا، ایک دن پوچھا:
"تمہارے عشق کا کیا حال ہے؟"
بولے: "ففٹی پرسنٹ کامیاب!"
پوچھا: "کیا مطلب؟"
فرمانے لگے: "میں مکمل عاشق ہوں لیکن مخالف سمت سے لفٹ نہیں ملتی ظاہر ہے ففٹی پرسنٹ کامیابی ہے۔"

تو صاحبو ——— یہی کیفیت میری اور محمد نقوش کی لڑائی کی تھی۔ اِدھر سے تیر پر تیر چلتے رہے اُدھر سے نمبر پر نمبر چھپتے رہے۔ میری سزا یہ تھی کہ خود سُولی پر لٹکا رہا ——— اِتنے طویل عرصے میں تو لوگ محبت سے اُکتا جاتے ہیں نفرت کی لاش کون اٹھائے پھرتا!

بہرکیف ایک بات طے تھی، میں دل ہی دل میں اس ادبی دیو کا قائل بھی تھا ——— شاید میرے تحت الشعور میں ضرور کوئی ایسی بات تھی کہ یہ شخص پھلتا پھولتا رہے، ورنہ پٹھان ہونے کے ناتے میرا نشانہ ایسا کچا بھی نہیں تھا!

اور سچ بات تو یہ ہے کہ جسے زندہ رہنے کا ڈھنگ آتا ہو اُسے زمانہ نہیں مار سکتا۔ وہ شخص جو کھڑکی سے کوٹھی میں پہنچا معمولی آدمی نہیں تھا۔

پھر وہ دن بھی آیا جب میں نے ندیم صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر مضمون پڑھا، بہت تالیاں بجیں۔ محمد طفیل نے کہا:

"آپ کا مضمون سب سے اچھا تھا، میں اسے نقوش میں چھاپوں گا!"

تب میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں سچ ہی سچ تھا محمد طفیل نے ٹھیک لکھا تھا:

"ایک بُرا آدمی بھی سارا دن بُرا نہیں رہتا!"

محمد طفیل مجلسی آدمی نہیں ہے مجلس میں بیٹھ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے فن سے بھی نابلد ہے لیکن وہ اتنا عظیم منصوبہ باز ہے کہ وہ لوگ، جو چرب زبانی اور محفل آرائی میں ثانی نہیں رکھتے محمد طفیل کی منصوبہ بندی کے ہشت پہلو نتائج دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں ——— میں نے کسی مضمون میں محمد طفیل کو ادب کی ویل مچھلی کہا تھا۔ یہ ویل مچھلی ٹنوں گوشت، ٹنوں چربی اور ٹنوں کے حساب سے ادبی نوادرات سمیٹے ہوئے ہے!

لوگ کام نہیں کرتے مگر محفل جماتے ہیں، محمد طفیل کام کرتا ہے پھر محفل جماتا ہے۔ وہ گھوڑے کی طرح جُتا ہُوا ہے پچیس تیس برس سے دوڑ رہا ہے، صبح ہوئی شام ہوئی، دن ہوا رات ہوئی، کام کام کام! وہ مسلسل دوڑ رہا ہے، نہ تھکتا ہے نہ سانس لیتا ہے، منصوبہ بنتا ہے پروان چڑھتا ہے ——— لوگ ایک بار ہمالہ کی چوٹی سر کرتے ہیں اُس نے کئی بار ہمالہ کی چوٹی سر کی ہے۔

نقوش کے کیسے کیسے نمبر مرتب ہوئے، ایک سے ایک بڑھ کر، بے مثال، لاجواب، ناقابلِ فراموش ——— احباب سوچتے ہیں بس اب تھک جائے گا، رُک جائے گا، ختم ہو جائے گا۔ مگر وہ محمد طفیل کو نہیں جانتے۔

یہ دھیما سا آدمی، یہ دُبلا سا شخص اپنے میدان میں صرف ایک ہے، آٹھ کروڑ میں ایک ——— اُس جیسا دُوسرا نہیں ہے! وہ جستجو ہے، وہ تلاش ہے، وہ بنا لیتا ہے پا لیتا ہے، اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ گردِ کارواں کو دیکھتے رہ جاتے ہیں لوگ، سنگِ میل غائب ہو جاتا ہے نظروں سے۔ نشانِ منزل نہیں ملتا تو الفاظ کی سنگباری شروع کر دیتے ہیں۔

سرمایہ داری کا طعنہ، موڑ اور پریس کا طعنہ، کوئی نہیں سوچتا، محمد طفیل نے ڈاکہ نہیں ڈالا، محنت کی ہے، خون جلایا ہے، یہ دیا جو مسلسل جل رہا ہے خود اس کے اپنے لہو سے روشن ہے۔ معلوم ہوتا ہے اردو ادب میں رشک کا لفظ ہی نہیں لکھا گیا بس حسد ہی حسد ملا ہے ہمیں وراثت میں!

ذرا پیچھے کی طرف نظر دوڑائیے، انصاف کیجیے۔ اور اُس شخص کو پہچانیں جس نے اردو ادب کو افسانہ نمبر، غزل نمبر، خطوط نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، لاہور نمبر، ادب عالیہ نمبر، میر نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، پطرس نمبر، منٹو نمبر، شوکت نمبر اور اب 'ادبی معرکے نمبر' جیسی معرکۃ الآرا چیزیں دی ہیں۔

کوئی ہے —— کوئی کہہ سکتا ہے دُنیائے ادب میں کسی ایکلے شخص نے، کسی فردِ واحد نے اتنا کام کیا ہے! —— غالباً نہیں۔

میں سمجھتا ہوں اس نے آنے والی نسلوں کے لیے ادب کے مینار کھڑے کر دیے ہیں۔ اس کا تازہ ادبی معرکے نمبر ایسا نمبر نہیں جو دو چار نشستوں میں پڑھا جا سکے۔ نقوش کے دُوسرے نمبروں کا بھی یہی حال ہے کہ پڑھتے جاؤ، پڑھتے جاؤ، آگے بڑھتے جاؤ۔ نہ سڑک ختم ہو گی نہ سفر ختم ہو گا اور نہ نقوش کے نمبر ختم ہوں گے!

صرف ایک چیز ہے موت ——!

جو ہر چیز کو ختم کر دیتی ہے لیکن محمد طفیل کو موت بھی کچھ نہیں کہہ سکتی، یہ شخص کبھی نہیں مرے گا!

حاط حاطؐ

(زبور میں نامِ دلنوازِ حضورؐ ہے "حاط حاطؐ خالد")

عبدالعزیز خالد

تو برگزیدہ ترین فردِ نوعِ آدم ہے
ہو جس قدر بھی ثنا گستری تری کم ہے

ترے کمال کی ہر آن، آن بان نئی
ترے جمال کا ہر لحظہ تازہ عالم ہے

فروغِ صبحِ بہاراں ہے عارضِ تاباں
سیاہیِ شبِ دیجور جعدِ پُر خم ہے

ترا اشارۂ ابرو ہے مدِ موجِ طرب
تری نگاہِ کرم کیمیا ہے مرہم ہے

ترے حصار میں بے ساختہ کھنچا آئے
ہر ایک آہوئے رعنا کہ خوگرِ رم ہے

ہزار رنگ ترے، بیشمار انگ ترے
تُو برقِ ابر کا شعلہ ہے ابر کا نم ہے

تُو راست باز ہے ناقابلِ یقیں حد تک
براق و ساز ترا احمد، حمد پرچم ہے

جس آبخورے میں تو آبِ سادہ نوش کرے
اس آبخورے سے شرمندہ ساغرِ جم ہے

مرادِ سوختگاں، آرزوئے زندہ دلاں
ہر اہلِ درد کا تو غمگسار و محرم ہے

بٹھا کے پیچھے ابوبکرؓ کو کرے تو سفر
خجستہ دم ہے جو تیرا زمیل و ہمدم ہے

مسافرانِ رہِ حق کو تیرا نقشِ قدم
نوشتۂ طلبِ صادق و مصمم ہے

نصابِ مکتبِ انسانیت صحیفہ ترا
کہ اس کی قوتِ آدم گری مسلّم ہے

ترا کلام بہ سر کوبیٔ ابوجہلاں
مثالِ طیرِ ابابیل فوجِ اشرم ہے

ہمارے قولِ مزخرف ہیں عاطل و باطل
تری زباں سے جو نکلے وہ حرف محکم ہے

ہر ایک نکتے کو کرتا ہے کھول کر تو بیاں
ہے تہ بہ تہ ترا مضموں پہ غیر مبہم ہے

حسب نسب ہے تشخص نہ منصب و دولت
بذاتہٖ جو ہے قابل وہی مکرّم ہے

فلاح کا ہے وابستہ سعیِ پیہم سے
نشاطِ زیست کدو کاوشِ دما دم ہے"

خدائے پاک کی مانند بے مثیل و مثال
تو عظمتِ بشریت کا نقطۂ تم ہے

تری حدیث: عَلَی الْاَنْبِیَاءِ فُضِّلْتُ
سُراس بیاں کی صداقت کے سامنے خم ہے

سب انبیا سے موخر ہے گو تری بعثت
مقام و مرتبہ تیرا مگر مقدّم ہے

نزول جس کا ہُوا تجھ پہ وہ پیامِ حیات
بلا مبالغہ منشورِ امنِ عالم ہے

شبِ مکاشفہ روح القدس نے مجھ سے کہا
کہ اسمِ پاکِ محمدؐ ہی اسمِ اعظم ہے!

ہُوا میں فیضِ حضوری سے سرفراز نہ کیوں
یہی خلش ہے یہی رنج ہے یہی غم ہے

اگر اُصیل خُزاعی کرے سخن کوتہ
تو حرف زن کوئی عبدالمسیح و ایہم ہے

رسائی پر پروازِ پیکِ واہمہ ہیچ
مرے چراغِ تخیّل کی لاٹ مدھم ہے

بقدرِ شوق جو دم بھر سکے ترا خالدؔ
مجال و حوصلہ اس میں کہاں، کہاں دم ہے!

○

نعت بحضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم

حافظ لدھیانوی

دونوں عالم کے لیے رحمتِ یزداں تو ہے
شافعِ حشر ہے تو، ہادیٔ دوراں تو ہے

زیب دیتا ہے تجھے رحمتِ عالم کا لقب
جو ہے اللہ کا محبوب، وہ انساں تو ہے

تیرا ہر قول ہے سرمایۂ دین و ایماں
ہر ادا جس کی ہے فردوس بداماں تو ہے

کون ہے جس سے رہا ربطِ دل و جاں ایسا
جس سے رہتا ہے سدا ربطِ دل و جاں تو ہے

نغمۂ شوق میں کھل جاتے ہیں یادوں کے گلاب
روح میں جس کی ہے خوشبو وہ گلستاں تو ہے

یاد آتے ہیں شب و روز حرم کے منظر
روز و شب جس نے کیا لطف فراواں تو ہے

میں کسی حال میں مایوس نہیں ہو سکتا
مجھ کو معلوم ہے نزدیک دل و جاں تو ہے

محترم مجھ کو کیا تیری ثنا خوانی نے
میرے افکار کے پردے میں نمایاں تو ہے

ساتھ چلتے ہیں مرے ابرِ کرم کے سائے
جس کی رحمت کا مرے سر پہ داماں تو ہے

محورِ فکر و نظر ہے تری ذاتِ اقدس
مرے نغموں کا، مری زیست کا عنواں تو ہے

ظلمتِ شب سے کیا نورِ سحر کو پیدا
جانِ عالم کے لیے مہرِ درخشاں تو ہے

قلبِ مضطر کو ملی سوز کی دولت تجھ سے
میری پلکوں پہ ہوا جس سے چراغاں تو ہے

"سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی"
میرے ہر زخم کا، ہر درد کا درماں تو ہے

بن ترے کون کرے دل کی جراحت کا علاج
مونسِ خستہ دلاں، سوختہ جاناں تو ہے

تیری سیرت نے ہمیں نورِ بصیرت بخشا
جس سے تابندہ ہوا غمکدۂ جاں تو ہے

مرے ہر شعر میں ہے تیرے کرم کی خوشبو
ہو گیا جس سے معطر مرا دیواں تو ہے

ہے ترے نور سے معمورۂ عالم روشن
چمنِ دہر کا اک سروِ گلستاں تو ہے

رُخِ زیبا سے ہے زیبائی عالم کو فروغ
تجھ سے ہے رنگِ چمن حسنِ بہاراں تو ہے

گوشۂ چشمِ کرم سوئے غریبانِ حالاں
کشتیِ ملتِ بیضا کا نگہباں تو ہے

سر بسر لطف ہے محبوبِ خدا کا حافظ!
یہ کرم اُن کا ہے جو حافظِ قرآں تو ہے

○

غزالِ کُنجِ حرا

فضا ابن فیضی

تمام نشّہ و نکہت ، تمام شوخی و رَم
تمام غنج و لطافت ، تمام نزہت و نم
تمام لطفِ دل و جاں ، تمام مرہمِ غم
تمام فقرِ گلیمی ، تمام ناز و نعم
تمام شوکتِ فاراں ، تمام سطوتِ جم
تمام خوشبوئے رحمت ، تمام عطرِ حرم
تمام کوثر و طوبیٰ ، تمام عرش و اِرم
تمام حسن و بصیرت ، تمام رمز و حِکَم
تمام یُمن و سعادت ، تمام جُود و کرم
تمام دانش و عرفاں ، تمام لوح و قلم
تمام حرفِ بشارت ، تمام رُوحِ اُمم
تمام اُسوۂ حسنہ ، نظافتِ زمزم
تمام خُلقِ حمیدہ ، لطافتِ شبنم
تمام نورِ مجسّم ز فرق تا بقدم
سوادِ زلف میں امکان و عرش کا چم و خم
بیاضِ چہرہ پہ "اسریٰ" کی چاندنی ہے رقم

○

زتکیہ گاہِ عرب تا بہ کارگاہِ عجم
عجیب حُسن ہے نزدیک و دُور ، کیا کہیے
زمیں پہ بارشِ نور و سرور ، کیا کہیے
مہک اٹھا نفسِ عرش و طور ، کیا کہیے
محمدؐ عربی کا ظہور ، کیا کہیے
اُسی ظہور کے فانوس کا ہے وہ پرتو
کہ جس سے تیری مری کائنات روشن ہے
تمام پیچ و خمِ ممکنات روشن ہے
یقیں ہے زندہ ، ضمیرِ حیات روشن ہے

○

محمدؐ عربی ، وہ حبیبِ ربِّ جلیل
وہ سروِ قدس ، وہ دوشیزۂ دیارِ حرم
وہ نافہ دارِ سوت ، غزالِ کُنجِ حرا
وہ جس کی ذات ، رسالت کی آگہی کی دلیل
وہ جس کی ذات ، شعورِ الوہیت کا نشاں
وہ جس کے دم سے نرو تازہ کشتِ کون و مکاں
وہ جس کے لطف سے مربوطِ نظمِ سود و زیاں
وہ جس کی زندگی ، انسانیت کا درسِ جمیل
وہ جس سے لالہ چکاں ، سوزِ سینۂ جبریل
اسی شفق سے سحر ہو کہ رات روشن ہے
ابھی تلک نفسِ ششجہات روشن ہے
یہ میرے ہونٹ ہیں یا چاندنی کی قاشیں ہیں
بیاں سے اُس کے مری بات بات روشن ہے

○

خدا نے جس کو جلایا تھا اپنے ہاتھوں سے
وہی چراغ ہے روشن کفِ حرا پہ ہنوز
وہی نویدِ مسیحا ، وہی ندائے خلیل
بہ خطِّ جاں ہے رقم لوحِ ارتقا پہ ہنوز
بہارِ مسجدِ اقصیٰ کی چاندنی ہے وہی
بساطِ سبزۂ آغوشِ آمنہ پہ ہنوز
ہزاروں سیکڑوں صدیاں گزر گئیں لیکن
وہی ہے مہرِ ازل نامِ مصطفیٰ پہ ہنوز
اُسی کے وصفِ حمیدہ سے ہیں فروغ پذیر
یہ نقش ہیں جو مرے حرف و ماجرا پہ ہنوز
کہ ذکرِ پاک وہی ہے لبِ فضا پہ ہنوز

○

بنامِ پاک و مطہّر ، سلام اور درود
محمدؐ عربی پر ، سلام اور درود

○

زمزمۂ نعت

حفیظ تائب

وہ ہادیِ جہاں جسے کہیے جہانِ خیر — نسبت سے اُس کی میرا وطن ہے نشانِ خیر

وہ تابِ جاں، سحابِ کرم، انتخابِ حق — وہ شانِ فقر، آنِ تمدن، روانِ خیر

اُس کا پیامِ اُنس و مواخات روحِ دیں — اُس کا نظامِ عدل و مساوات جانِ خیر

وہ بارگاہِ ناز سے لوٹا بصد نیاز — لے کر برائے نوعِ بشر ارمغانِ خیر

کتنی عظیم بیعتِ رضواں کی شان ہے — فتحِ مبیں کے ساتھ چلا کاروانِ خیر

آلِ نبیؐ سفینۂ بحرِ حیات ہے — اصحاب ہیں نجوم سرِ آسمانِ خیر

یارب! جہاں میں دستِ خزاں ہے دراز تر (ق) محفوظ اس کے شر سے رہے گلستانِ خیر

فتنوں کی تیز دھوپ میں قایم رہیں حواس — خیر الامم کے سر پہ رہے سائبانِ خیر

تائبؔ نگاہِ رحمتِ عالم سے بن گیا
ہر مصرعِ ثنائے نبیؐ ترجمانِ خیر

○

بجنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

حفیظ تائب

وجد میں آدمؑ ہے اوجِ آدمیت دیکھکر
مصطفیٰؐ کا شیوۂ تکمیلِ سیرت دیکھکر

آپؐ کو مانا گیا سب سے بڑا تاریخ ساز
زیست کے ہر موڑ پر شانِ قیادت دیکھکر

گھر ابوسفیان کا ٹھہرا حصارِ عافیت
چرخِ حیراں تھا کمالِ عفو و رحمت دیکھکر

شمعِ ایماں ہر دلِ تاریک میں روشن ہوئی
چہرۂ اقدس پہ انوارِ صداقت دیکھکر

اہلِ دانش نے اُسے مانا ہے منشورِ حیات
شرعِ محبوبِ خدا کی جامعیت دیکھکر

سازِ دل سے نغمہ کی صورت اٹھی موجِ درود
عظمتِ کردار پر حق کی شہادت دیکھکر

ذہن میں رکھ آیۂ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ
بات کر طبعِ پیمبرؐ کی نفاست دیکھکر

بارگاہِ سرورِ دیں میں ہوئی درماں طلب
چشمِ تائبؔ گردشِ احوالِ اُمت دیکھکر

○

نعت

شاذ تمکنت

آئینہ دارِ نور سراپا تمہی تو ہو
پردہ خدا نے رکھ لیا، جلوہ تمہی تو ہو

کیا خوف ہو کہ شعلۂ دوزخ بلند ہے
ہم عاصیوں کی جنّتِ عقبیٰ تمہی تو ہو

ہر نامۂ سیاہ کو کملی میں ڈھانپ لو
ہم جس پہ مر مٹے ہیں وہ وعدہ تمہی تو ہو

جن کو کہیں جگہ نہ ملے، وہ ہمیں تو ہیں
جس نے ہمیں جگہ دی وہ دنیا تمہی تو ہو

لگتا ہے جیسے آج بھی مہتاب ہے دونیم
بدر و ہلال کا یہ نظارہ تمہی تو ہو

سچ ہے تمہارا سایۂ پیکر نہ تھا مگر
ہم سر برہنہ کب ہیں کہ سایہ تمہی تو ہو

احساں کے بعد تم نے نگاہیں جھکا تو لیں
اِس پردۂ حجاب میں آقا تمہی تو ہو

روضہ کی دید اپنی تمنائے بندگی
بندوں کی کیا خدا کی تمنا تمہی تو ہو

کاسہ ہے مختصر، اُدھر انعامِ بحر و بر
دامن ہے تنگ، دست کشادہ تمہی تو ہو

وہ کون ہے جو بڑھ کے خدا کو منائے گا
محشر کے اُس ہجوم میں تنہا تمہی تو ہو

ہے سر بسجدہ شاذ خدا کے حضور میں
اس سر میں جو بسا ہے وہ سودا تمہی تو ہو

○

نعت

شاذ تمکنت

اک وہم و گماں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے
ہم لوگ کہاں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے

کعبہ کو صنم خانہ بنائے ہوئے اب تک
ہم سجدہ کُناں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے

سات آسماں اِس طرح منوّر نہیں رہتے
سنسان مکاں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے

وہ حشر کے لمحات جواب سہل ہوئے ہیں
کیا سخت گراں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے

یہ کوثر و تسنیم یہ جنّت کے نظارے
مانندِ خزاں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے

ہر جلوۂ کثرت میں یہ وحدت کے قرینے
کس طرح بیاں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے

ہم آج ہیں کعبہ کی اذاں دہر میں اے شاذؔ
صحرا کی اذاں ہوتے اگر آپؐ نہ ہوتے

○

نعت

(سفرِ مدینہ کے تاثرات)

خاطر غزنوی

جاگتے میں بھی وہی ہے جو مرے خواب میں ہے
باریابی کا قرینہ ترے اسباب میں ہے

ایک جذبے کی نوازش سے چھڑا نغمۂ نعت
ایک احساسِ تپیدہ دلِ مضراب میں ہے

ریگِ صحرائے مدینہ کا مزا سجدوں میں
بہ جبیں کو مری احساس ہے کمخواب میں ہے

دل کہ دیوانہ ہوا جاتا ہے بے تابی سے
ذہن کہتا ہے کہ لذّت بڑی آداب میں ہے

بھول سکتا ہی نہیں روضۂ اطہر کی نماز
عیدِ نظّارہ مرے دیدۂ پُر آب میں ہے

جیسے سَو پھولوں کے ناموں کی الگ خوشبو ہے
یوں خطاب آپؐ سے قرآن کے ہر باب میں ہے

یا نبیؐ، ختمِ رُسل، شافعِ محشر، احمد
عشرتِ نطق و نظر آپؐ کے القاب میں ہے

آپؐ کے نُور میں یوں قیدِ شب و روز نہیں
جس طرح رنگِ تغیّر خور و مہتاب میں ہے

آپؐ کے در کی گدائی مرا معراجِ وقار
خوش رہے وہ جو غمِ شجرہ و انساب میں ہے

آفتاب آپؐ کے جلووں کا طلب گار رہا
پرتوِ حُسن کی حسرت دلِ مہتاب میں ہے

التجا رحم کی اللہ سے طفیل آپؐ کے ہے
کشتیِ ملّتِ بیضا رہِ سیلاب میں ہے

اُتنا اُتنا ہی مشرّف انھیں مولا! کر دے
جتنی جتنی بھی محبّت دلِ احباب میں ہے

○

نعت

راجا رشید محمود

نعتِ آقا سے ہے گویا اکتسابِ بزمِ قدس
مدح گوئے مصطفیٰؐ ہے بہرہ یابِ بزمِ قدس

ابجدِ تعلیم انساں حرفِ طٰہٰ ہو گیا
کھیلیے عصؔ اب ہے نصابِ بزمِ قدس

وہ کرم فرمائیں تو ملتی ہے جنت کی نوید
اور وہ چاہیں تو اٹھتا ہے حجابِ بزمِ قدس

مجتنبِ بزمِ پیغمبرؐ سے ہے جو بد نصیب
اس کی قسمت میں لکھا ہے اجتنابِ بزمِ قدس

رحمۃٌ للعالمینؐ کے فیض کی کیا بات ہے
رحمتِ انسانیت، شفقت مآبِ بزمِ قدس

حکمِ آقا پر عمل کرنے سے در جنت کے وا
ورد نامِ مصطفیٰؐ سے فتحِ بابِ بزمِ قدس

محفلِ ہستی انھی کے نور سے روشن ہوئی
ذکرِ پیغمبرؐ ہوا لبِ لبابِ بزمِ قدس

اس سے پھر قایم ہوا دنیا میں خوشبو کا نظام
تھا پسینہ آپؐ کا بوئے گلابِ بزمِ قدس

میرا ہر مصرع ہے ان کی مدح کا آئینہ دار
شعر ہیں لاریب میرے مستجابِ بزمِ قدس

آپؐ کے الطاف کا محمودؔ سے کیا ہو بیاں
نام لیوا آپؐ کا ہے باریابِ بزمِ قدس

○

نعت

راجا رشید محمود

ہم کو نصیب معرفتِ کبریا تو ہو
محکم تعلقِ شہِ ارض و سما تو ہو

عشقِ نبیؐ کی فصل وقارِ بہار ہے
مانوسِ قلب و ذہن کی آب و ہوا تو ہو

مشکل نہیں ہے شاہِ مدینہ سے رسم و راہ
لیکن گریز پائیِ حرص و ہوا تو ہو

قانونِ مصطفیٰؐ ہے ہر اِک مسئلے کا حل
اس راہ پر چلیں تو سہی، ابتدا تو ہو

ہر خوف سے کرے گا خدا اُس کو بے نیاز
حضرتؐ کے ساتھیوں کا کوئی ہمنوا تو ہو

حرفِ غلط ہوں رُوح و بدن کے سبھی مرض
حاصل درِ حضورؐ کی خاکِ شفا تو ہو

پھُوٹیں گی پھر تبخترِ انساں کی کونپلیں
پہلے ہماری رُوح میں نخلِ وفا تو ہو

آنکھیں ہوں مستنیر زیارت سے آپؐ کی
نوکِ مژہ سے اشکِ تمنّا بہا تو ہو

پائے گا بارگاہِ رسالت سے ہر مراد
محمودؔ کی طرح کوئی مدحت سرا تو ہو

نعت

راجا رشید محمود

محبوبِ کبریا کی مرے دل کو ہے لگن
حُسنِ ازل کی یاد میں ہے عشق نغمہ زن

پلکیں جو ابرِ عشقِ نبیؐ سے ہوں با وُضو
کِھل جائیں گے گلاب سرِ مزرعِ سخن

دل میں ہے ابتہاج و مسرت کی چاندنی
سرکار کے غلام کو کیا رنج کیا محن

مجھ کو نصیب ہو کبھی وُہ ساعتِ جمیل
جب روضۂ حضورؐ ہو آنکھوں میں ضَو فگن

ماہِ مدینہ قلبِ حزیں پر ہو عکس ریز
احساس کو نصیب ہو جبریلؑ کا چلن

ہے فکرِ ماسوائے نبیؐ وقت کا ضیاع
نعتِ حبیبؐ خالقِ ہر دو سرا ہے فن

روشن ہوئے ہیں مجھ پہ شفق رنگ راستے
ل پر پڑی ہے ماہِ مدینہ کی جب کرن

وابستگانِ خاکِ درِ مصطفیٰؐ کی خیر!
راضی ہوا ہے جن پہ مرا ربِّ ذوالمنن

آواز کو بلند کرے، کون ہے یہاں
پیشِ حضورؐ کس کو ہے یارائے دم زدن

وہ مطلعِ ازل ہیں، وہ ہیں مقطعِ ابد
محمودؔ اُن کی مدح مرا افتخارِ فن

○

نعت

صادق نسیم

میری آنکھوں میں ہے میرے سینے میں ہے
لوگ کیوں کہہ رہے ہیں مدینے میں ہے

شرحِ منشائے حق اُس کا کردار ہے حق کا میزان ہے حق کا معیار ہے
سب کا سالار بھی
اپنا سردار بھی
میری سرکار بھی

رنگ و بُو بھی نہیں رنگ و بُو میں بھی ہے بے کراں ہے مگر آب جُو میں بھی ہے
عرش پرواز بھی
حق کی آواز بھی
میرا دمساز بھی

وجہ تخلیقِ کون و مکاں بھی وہی میری جاں میری رُوحِ رواں بھی وہی
جلوۂ طُور بھی
آیۂ نور بھی
پاس بھی دُور بھی

عقل کی علم کی عشق کی انتہا سنگ ریزے بھی کرتے ہیں جس کی ثنا
رحمتِ ہر زماں
فخرِ ہر دو جہاں
قبلۂ عاشقاں

جس کو چاہے خدا کی رضا بخش دے حدِ امکاں سے بھی کچھ سوا بخش دے

دل کا درماں بھی ہے
جانِ عرفاں بھی ہے
خود ہی قرآں بھی ہے

سب سے برتر بھی ہے سب سے افضل بھی ہے سب سے اجمل بھی کامل بھی اکمل بھی ہے

وہ ہی شمس الضحیٰ
وہ ہی بدر الدجیٰ
وہ ہی خیر الورےٰ

میرا آقا بھی ہے میرا داتا بھی ہے میرا ملجا و ماویٰ و مولا بھی ہے

جانِ ہر دو سرا
شاہِ نوری قبا
اُس پہ سب کچھ فدا

میرا دل میرا دیں میرا ایمان بھی میرا ارمان، عنوان، پہچان بھی

آرزو بھی وہی
جستجو بھی وہی
چار سُو بھی وہی

میری پلکوں پہ اشکِ رواں دیکھ لو اور اشکوں میں اُس کو نہاں دیکھ لو

میری منزل بھی وُہ
میرا ساحل بھی وُہ
میرا حاصل بھی وُہ

لوگ کیوں کہہ رہے ہیں مدینے میں ہے
میری آنکھوں میں ہے میرے سینے میں ہے

نعت

عطاء الحق قاسمی

ہم اس کا نقشِ پا بھولے ہوئے ہیں
خداوندا! یہ کیا بھولے ہوئے ہیں

چلو پھر لوٹ جائیں اس طرف کو
جدھر کا راستہ بھولے ہوئے ہیں

اسے دیکھیں تو یاد آتا ہے ہم کو
کہ ہم تو مدّعا بھولے ہوئے ہیں

ہماری آنکھ شرمندہ ہے اس سے
کہ ہم رسمِ وفا بھولے ہوئے ہیں

سرِ ساحل ضرور اُتریں گے اِک دن
پرندے راستہ بھولے ہوئے ہیں

گھرے ہیں تنگناؤں میں کچھ ایسے
سمندر کی ہوا بھولے ہوئے ہیں

قسم ہم کو عطاؔ شیریں لبوں کی
بیاں کا ذائقہ بھولے ہوئے ہیں

○

دِلوں میں گھنٹیاں بجتی ہیں

حسن عباس رضا

لُغاتِ دہر کے ایک اک ورق سے
بولتے ہر لفظ کو
قرطاسِ سادہ پر اگر رکھ دُوں

میانِ ارض
بہتے پانیوں ،
شفّاف چشموں ،
قلزموں میں اپنے ایقاں کی
چمکتی روشنائی بھی اگر گھولوں ۔

لچکتے نرم پودوں ،
اور فلک چھُوتے درختوں کی
مہکتی ٹہنیوں سے
اک قلم مانگوں ۔

تو پھر بھی ہادیٔ برحق
ترا نامِ مبارک ،
اسمِ اعظم

میرے جیسے کم سخن،
بے نام شاعر سے کبھی لکھا نہ جائے گا۔

ثنا اُس نامِ اقدس کی
اگر چاہوں،
تو پھر بھی حیطۂ تحریر میں لانے سے قاصر ہوں۔

کہ وہ اک نام،
جس پر چاند صبحوں،
اور سجل شاموں کی سب روشن جبینوں نے
وفورِ شوق،
فرطِ عشق میں سجدے گزارے ہیں۔

کہ وہ اک نام،
جس کے وردِ پیہم سے
دلوں میں گھنٹیاں بجتی ہیں،
چہرے وجد سے گلنار ہوتے ہیں۔

کہ وہ اک نام،
جس سے عود و عنبر،
رات کی رانی،
گلاب و نرگس و نسرین کی مہکار آتی ہے۔

اُسی اسمِ مبارک
پیکرِ انسانیت ،
فخرِ دو عالمؐ کی عنایت ہے
کہ ایک اک لفظ میرا ،
آج دہلیزِ درِ فخرِ ذکاوت سر بسجدہ ہے
انھیں گویائی دیدے ،
اے مرے مولا ،
مرے آقا

○

آرٹ، سیاست اور زندگی

پروفیسر احمد علی

ہر مصنف اور خاص طور پر ہر تخلیقی مصنف کی تصانیف پر اُس کی روزمرہ کی زندگی اور بدلتے ہوئے حالات کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ حالات نہ صرف کارِ معاش کی دشواریوں، کھانے پینے کی ضروریات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ دماغی جد وجہد اور جذباتی زندگی سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ دراصل یہ سب مختلف چیزیں تخیل میں غلط ملط ہو کر ایک خاص صورت اختیار کر لیتی ہیں اور آرٹ کی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن زمانہ جدید کے تنقید نگاروں کی طرح اس اثر کے بیان میں نہ تو مبالغہ سے کام لینا چاہیئے اور نہ اس کو موڑ توڑ کر بیان کرنا چاہیئے، حالانکہ اس کو حذف کرنا بھی حقیقت سے گریز کرنا ہوگا۔

تخیلی حقیقت ہماری زندگی کی خارجی حقیقتوں سے اس قدر گہرا تعلق رکھتی ہے اس کو دراصل دوسرے کا جزو لاینفک سمجھنا چاہیئے۔ تخیل زندگی کی حقیقتوں کو بھلا کر محض ہوا میں پرواز نہیں کرتا۔ درحقیقت وہ خارجی اصلیت ہی سے طاقتِ پرواز حاصل کرتا ہے جس طرح کہ خوابوں میں زندگی کی حقیقتیں اپنی شکل بدل کے ہمارے دماغ پر اپنے رنگین عکس ڈالتی ہیں، اُسی طرح وہ تخیل میں سے ہوتی ہوئی نئے رنگ اور رُوپ اختیار کرتی، کٹتی، چھٹتی، گہری اور واضح ہوتی ہوئی دوسروں تک پہونچتی اور ان کے دل اور دماغوں کو تقویت بخشتی ہیں۔ تخیل بیکار چیزوں کو علیحدہ اور حقیقی جذبات کو صاف کر کے اصلیت کے جوہر میں پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف چیزوں کی مشابہتوں کو لے کر ایک دلکش طریقہ سے معہ آب وتاب اور ان کی شدت کے پیش کرتا ہے۔ ایک تخلیقی تصنیف اور اخبار نویسی میں یہی فرق ہے کہ تخلیق میں تخیل کا ہاتھ ہوتا ہے جو اس کو آرٹ کا درجہ بخش دیتا ہے اور اخبار نویسی یا رپورٹنگ تخیل سے پاک ہوتی ہے اور زندگی کو بعینہٖ پیش کرتی ہے اور جمالیاتی خوشی بخشنے سے قاصر رہتی ہے۔

ابھی تک تصنیف اور تخلیقی تصنیف کے فرق پر غور نہیں کیا گیا ہے نہ اسی بات پر ٹھنڈے دل سے توجہ کی گئی ہے کہ تصنیف پر زندگی کے جد وجہد کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس صدی کی تیسری دہائی میں زندگی کی خارجی حقیقتوں پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن کسی نے آرٹ اور تخلیق کے مسئلوں کا غور وفکر سے مطالعہ نہیں کیا۔ دراصل ہر عمدہ آرٹ زندگی کی حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے لیکن اُس کی تخلیق میں بہت سے ایسے جز شامل ہوتے ہیں جن کو ہر شخص آسانی سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے خاص دماغی نشتروں اور پھیلا دینے والے اور سمیٹنے والے آلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

کسی چیز کو بجستہ بیان کر دینا رپورٹنگ ہے۔ اس کے پوشیدہ جذبہ اور اثر کو دوسروں تک پہونچانا تخلیقی عمل ہے۔ کوئی چیز کسی ایک خبر سے نہیں بنتی اس کے اندر اور بہت سے عنصر شامل ہوتے ہیں۔ وہ بذاتِ خود وجود میں نہیں آتی بلکہ وجہ وسبب کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ وہ معلق اور ایک ہی لمحہ میں قائم رہ سکتی ہے، اُس کے اندر ماضی اور مستقبل، ازل اور ابد زیست وموت بھی شامل ہوتے ہیں۔ پھر وہ چیز نہ صرف اپنی بلکہ اپنے تمام جنس کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ آرٹ ایک چیز کے سب پہلوؤں کو مدنظر رکھتا ہے۔ گو اس میں

شک نہیں کہ وہ ان سب کو واضح نہیں کرتا۔ لیکن ان سب پہلوؤں کا احساس آرٹ میں بیک وقت موجود ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کے کارنامے ایک اور شخصیت کے اندر ہوتے اور تخیل کی رنگین وادیوں سے گزرتے ہوئے ہم تک پہونچتے ہیں۔ اس لئے ان میں کچھ تبدیلیاں ——— کچھ اضافہ اور کچھ کمی واقع ہو جاتی ہیں۔ اگر ان سب کا توازن درست ہوتا ہے تو اس نئی صورت میں وہ چیز ہم پر گہرا اثر کرتی ہے، اور نہ صرف خود متحرک ہوتی ہے بلکہ ہمارے اندر بھی حرکت پیدا کرتی ہے چنانچہ آرٹ ایک استعجاب کی کیفیت اور ہمارے اندر ایسا لطیف جذبہ پیدا کرتا ہے جس کا اثر تو محسوس ہم کرتے ہیں۔ لیکن اس کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ جس طرح ہم محبت کے پیدا کئے ہوئے لطیف جذبات کو محسوس کرتے ہیں۔

ایک چیز کے ایک ہی وقت میں مختلف پہلو بھی ہوتے ہیں یعنی سطحی بنیادی، فانی اور غیر فانی، حقیقی اور غیر حقیقی جب کوئی مصنف صرف سطحی اور فانی پہلوؤں سے واسطہ رکھتا ہے۔ تو تصنیف میں پائندگی نہیں آتی۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ چونکہ عام پڑھنے والے بھی اُس کے صرف سطحی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں وہ پڑھتے وقت اس تصنیف کو پسند کریں اور قابلِ تحسین قرار دیں لیکن وقت فانی چیزوں کا حامل نہیں ہوتا اور موجودہ حالات کے بدل جانے پر تصنیف کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی اور وہ بیجان ہو جاتی ہے گو فوری طور پر تھوڑے عرصہ کے لیے اس میں جذبات پر اثر کرنے کا مادّہ تھا اُسی طرح" جیسے "گلابی اردو" یا نیگو رکی وضع کی نثری نظمیں پیدا کرتی تھیں۔

"ترقی پسند" ادب کے بیشتر نمونہ زندگی کے محض فوری اور سطحی پہلو پیش کرتے رہے ہیں جو اس ہی کم عرصہ میں بے حرکت ہو گئے "ترقی پسند مصنفین" نے ایک قابلِ ستائش سیاسی نصب العین اپنی تحریک کے ذریعہ پیش کیا۔ لیکن وہ تصنیف کو تخلیق کا درجہ نہ دے سکے۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ رہی ہو کہ اُس کے بہت سے کارکن اور بانی مبانی ہماری زندگی کے اور اہم اور سیاسی مسئلوں میں گھر گئے اور ان کا لگاؤ ادب سے نہ رہا۔ اسی وجہ سے وہ غالباً ہمارے ادب کے تخلیقی پہلوؤں پر ویسی گہری نظر نہ ڈال سکے جو انہوں نے اُس کی خارجی حقیقتوں پر ڈالی تھی۔

سیاست کا مقصد ہمارے اندر قومی جذبات کو اُبھارنا اور سماجی ترقی کی ترغیب دلانا ہے۔ وہ اپنا اثر تجزیہ، حقیقت نگاری اور مقرری کے ذریعہ پیدا کرتی ہے۔ آرٹ کا تعلق زندگی کے گہرے اور پوشیدہ احساسات سے ہے۔ وہ ہمارے جذبات کو جگا کر حسن کی ترغیب دلاتا ہے اور اس کا تعلق تخیل سے زبان اور تالو کی طرح ہے تخلیقی تصنیف بھی زندگی کی کثیف، تکلیف دہ اور ڈراؤنی حقیقتوں سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا مقصد محض فوری نہیں ہوتا۔ اس کے پیش نظر نہ صرف زمانہ حال ہوتا ہے۔ بلکہ مستقبل بھی، نہ صرف اس کے ہم عصر بلکہ آنے والی نسلیں بھی۔ اسی واسطے آرٹ کے لیے ایک مقرر کی طرح چیخ چیخ کر کہنا کہ "اے بھائیو! زندگی بہت گندی اور تلخ ہے آؤ اس کو بدل ڈالیں"، اپنے مقصد کو رد کر کے اخبار نویسوں کی نقل کرنا ہوگا۔ کیونکہ پھر آرٹ اور سیاست میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ اس میں شک نہیں کہ آرٹ اور سیاست دونوں زندگی ہی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ایک، زندگی کے مستقل اور ہمہ گیر اثرات اور جذبات کو پیش کرتا ہے اور سیاست اُس کے بدلنے والے اور وقتی پہلوؤں کو اپنے فکر کا مقصد بناتی ہے۔ مثلاً اگر سیاست کھیتی باڑی کرنے کے مختلف اور بہتر طریقوں کی ترغیب دلاتی ہے یا زندگی کی اصلاح و درستی یا حکومت کرنے کے بہترین طریقہ سوچتی اور عمل میں لاتی ہے تو آرٹ فصل بونے

اور کاٹنے یا زندگی کے اور مختلف جذبات سے تعلق رکھتا ہے۔

کسان فصل بوتا اور کاٹتا ہے اور پھر کھلیان میں اناج بھر دینے کے بعد گانا نا چاہتا اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ دونوں حرکتیں ایک ہی چیز سے تعلق رکھتی ہیں یعنی فصل سے اور ایک ہی چیز سے پیدا ہوتی ہیں یعنی پیٹ بھرنے کی خواہش سے۔ لیکن ایک کا تعلق اُس کے عمل اور دوسری کا اُس کے جذباتی پہلوؤں سے ہے۔ لیکن جس طرح ہم ہل چلانے کے بجائے ٹریکٹر استعمال کرنے یا انفرادی طریقہ سے کھیتی باڑی کرنے کی جگہ مجموعی یا مساواتی طریقے کی ترغیب دلانے کو اور کھیتی باڑی کرنے کے کام یا اُس ناچ گانے کو جو کھیت جوتنا اور بونے کے جذبات سے پیدا ہوتے ہیں ایک ہی چیز تصور نہیں کر سکتے، اُسی طرح ہم سیاسیات یا کھیتی باڑی کو آرٹ نہیں کہہ سکتے، آرٹ کا ضروری یا غیر ضروری ہونا یا آرٹ کا کھیتی باڑی اور مزدوری کرنے کے مقابلہ میں کمتر یا برتر ہونا بالکل دوسری بات ہے لیکن ان دونوں کو ایک سمجھنا کج فہمی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آرٹ فرصت کی چیز ہے اور محنت و مزدوری کرنے والوں کو فرصت نہیں ہوتی۔ تو پھر اگر سیاست مزدوری کرنے والوں کو فرصت نہیں دلا سکتی تو اس کا فرض کیا ہوا؟ اور اگر سیاست مزدور پیشہ لوگوں کے دماغی اور ادبی معیار کو بلند کرنا نہیں چاہتی تو اُس میں اور سامراج میں فرق کیا رہا؟ ہر سوسائٹی اور ہر قوم کا ہمیشہ یہ نصب العین رہا ہے کہ وہ سوسائٹی کے افراد کے معیار کو بلند کرے اسی لئے ہر مہذب قوم اور دور میں آرٹ کا پایہ بلند رہا ہے۔ مصر و چین۔ یونان اور روما سے لے کر فرانس و ایران و ہندوستان کے خوشحال زمانوں پر نظر ڈالی جائے۔ ہر جگہ آپ کو اس بات کا ثبوت ملے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ان ممالک میں ایک جماعت دوسری کی بدولت ترقی کرتی اور پروان چڑھتی تھی۔ اب سب جماعتوں کے ایک ہو کر ترقی کرنے کا زمانہ آ رہا ہے۔ لیکن ترقی کا ثبوت اور انحصار ان کی مجموعی یعنی اقتصادی، معاشی، دماغی، ادبی اور تخلیقی ترقی پر ہوگا یہ کہنا بے معنی ہے کہ آرٹ چونکہ محض فرصت کی چیز ہے اس لئے بیکار اور صرف ایک افیونی کا خواب ہے، اور مزدور کو بس خوابوں اور حسن کی لذتوں کی طرف لے جاتا ہے، یا یہ کہ مزدور کو اس پر وقت صرف کرنے فرصت نہیں۔

ہر شخص آرٹسٹ نہیں ہو سکتا لیکن جس طرح ایک شخص مل بناتا ہے، دوسرا کھیت جوتتا ہے، تیسرا آٹا پیستا ہے، چوتھا ہوائی جہاز بناتا اور چلاتا ہے، یا ایک انجینئر ہوتا ہے، ایک پروفیسر، ایک ڈاکٹر اور ایک عطار، اسی طرح ایک مصنف، ایک موسیقی داں، ایک مصور، ایک تنقید نگار اور ایک آرٹسٹ بھی ہو سکتا ہے۔ ان سب کو بھی کام کرنے کی فرصت درکار ہے جس طرح مشین چلانے کے لیے فرصت ضروری ہے۔ جب ایک کسان دن بھر کھیت بو سکتا ہے تو ایک آرٹسٹ بھی اپنے آرٹ میں غرق رہ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ ہی ساتھ اوروں کے لئے بھی تخلیق کرتا ہے جس طرح مزدور اور کسان اُس کے لیے اور کام کرتے ہیں۔ جب مزدور، کسان، انجینئر، پروفیسر اور ہوا باز کی فرصت کا وقت ہوتا ہے تو وہ آرٹسٹ کے کارناموں سے لطف حاصل کرتے ہیں جس طرح کہ آرٹسٹ ان سب کی بنائی ہوئی چیزوں سے مستفید ہوتا ہے۔

عمارت اور آرائش عمارت کا سوال گمراہ کرنے والا ہے کیونکہ آرائش عمارت اور عمارت دونوں ایک ہی چیز کی پیداوار ہیں۔ کسان کھیت جوتتا اور بوتا ہے اور پھر گانا نا چاہتا ہے۔ تو کیا ناچ گانا پیٹ بھرنے کی خواہش اور خوشی کا اظہار نہیں؟ جس طرح جوتنے بونے

سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اسی طرح ناچ گانے سے بھی نہیں بھرتا۔ انسان کے جسم میں صرف پیٹ ہی نہیں ہے، دل دماغ اور ان میں جذبات اور حسیات بھی ہیں اور ان ہی کی بدولت انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے اور یہی ایک پست اور مہذب سوسائٹی میں تفریق کا باعث ہیں۔

فی زمانہ آرٹ کو گراتے اور فضول چیز تصور کرنے کا الزام سیاست اور ایک خاص قسم کی سیاست کے سر ہے۔ میرا مقصد سیاست کے خلاف جہاد کرنا یا اس کے فوائد اور اس کی ضروریات سے درگزر کرنا نہیں دراصل ہم کو صحیح سیاسی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے جو موجودہ زمانہ اور حالات میں صرف ایک روشن خیال اور غیر جانبدارانہ جماعت ہی کر سکتی ہے۔ لیکن سیاست کا کام سماج کی درستی کرنا اور اس کو ترقی دینا ہے۔ جس طرح ایک طبیب کا کام انجن چلانا نہیں ہے اسی طرح سیاست داں کا کام آرٹ کے گر سکھانا نہیں۔ چنانچہ تخلیقی تصنیف اور آرٹ بھی صرف سیاست کا دامن پکڑ کر فلاح و بہبود کو نہیں پہنچ سکتے۔ پائندگی کے لیے اور چیزیں بھی درکار ہیں سب سے اہم چیز حقیقت کے بنیادی اور غیر فانی پہلوؤں کو پیش کرنا ہے۔

رپورٹنگ کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ اخبار نویسی بھی لوگوں کو بیدار کرنے اور ان میں اعلیٰ قومی جذبات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ان کو تخلیقی آرٹ سمجھ لینا تہذیب اور کلچر کے معیار کو پست کرنا ہوگا تخلیقی آرٹ ہمارے اندر ایک جمالیاتی جذبہ پیدا کر کے سکون بخشتا ہے اور زندگی کے جس پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے، چاہے وہ حیات کا روشن پہلو ہو یا تاریک ایک شعاع پیدا ہوتی ہے جو ہر شے کو اُجاگر کر دیتی ہے۔

سیاست کا تعلق سماجی تحریک اور اقتصادی اور حکومت کے دیگر پہلوؤں سے ہے تخلیقی آرٹ کا تعلق انسان کے جذبات اور حسیات سے ہے۔ آرٹ کا تعلق شخصیت اور کیرکٹر سے ہے شخصیت وہ چیز ہے جو انسان میں اس کی روح اور دماغ کے گہرے احساسات سے پیدا ہوتی ہے۔ کیرکٹر۔ روایات اور اخلاقی تعلیم سے بنتا ہے۔ سیاسی تصنیف کردار کو محض ایک ڈھانچے کی طرح کسی خاص جماعت یا خیالات کے نمونوں یعنی TYPES کی حیثیت سے پیش کرتی ہے جو گوشت پوست کی جیتی جاگتی شکلیں اختیار نہیں کر پاتے۔ اس کا دار و مدار ایک ڈھرے پر ہے جس میں کوئی اصولی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ہر تصنیف ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی اور ایک سانچہ میں ڈھلی ہوئی نکلتی ہے جو کچھ فوری اثر تو پیدا کر دیتی ہے لیکن پھر ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا مقصد صرف آنا ہی ہوتا ہے۔ اور وہ ہم کو کوئی گہرا جمالیاتی سکون نہیں بخش سکتی۔ مثلاً ایک سیاسی مصنف بنگال کے قحط کے سطحی پہلوؤں پر غور کرے گا۔ اس واسطے کہ اُسے ایک فوری نتیجہ نکالنا اور سیاسی جوش پیدا کرنا ہے۔ وہ کم و بیش ان مسائل کو پیش نظر رکھے گا:

اسباب قحط، حکومت یا حاکم کا رویہ، امرا اور حکام کی بے حسی و سرد مہری، ساہوکاروں کا مصیبت زدوں کی حالت سے فائدہ اُٹھانا، بعض نیم حساس کھاتے پیتے لوگوں کا اُن کی حالت پر افسوس کرنا لیکن اوپری طریقہ سے، قحط کے مارے ہوؤں کی جاں کنی اور کرب کا نتیجہ۔ اس کے برعکس ایک تخلیقی مصنف قحط کے ساتھ ہی ساتھ موت، زندگی اور موت کی جنگ اور کرداروں کو بحیثیت انسانوں کے پیش کرے گا نہ کہ ایک سیاسی تحریک کی صورت میں۔ یہ اغلب ہے کہ وہ واقعات کے پیش آتے ہی ان کو آرٹ کی صورت میں نہ ڈھال سکے کیونکہ جب تک واقعات تجربہ بن کے ہمارے اندر نہ سما جائیں اور ہمارے حیات کا جزو لاینفک نہ بن جائیں وہ کبھی آرٹ کی صورت نہیں اختیار

کر سکتے۔ اس لیے ہم کو رپورٹنگ اور اخبار نویسی کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ ہماری زندگی میں اُن کی بھی مستقل جگہ ہے تاکہ وہ حکومت یا سماج کی بدعنوانیوں کی طرف توجہ دلاتے رہیں۔

آرٹ کے لیے NOSTALGIA یعنی اُس گہری خواہش اور چاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے تن من میں سما جائے جس طرح وطن سے دور گھر کی تڑپا دینے والی یاد۔ یا وہ جذبہ جو ہمارے اندر ایام گزشتہ کے لوٹ آنے کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ ایک اخبار نویس واقعات کو اُسی طرح پیش کر دیتا ہے جس طرح وہ ظہور میں آتے ہیں، ایک سیاسی مصنف بھی ان کو صرف لوگوں کے جذبات کو بھڑکانے کا ذریعہ بناتا ہے اور اپنی تحریر کو پُر اثر بنانے کے لیے اخبار نویس اور مقرر کی طرزوں کو استعمال میں لاتا ہے۔ واقعات اس کی زندگی کے گہرے احساس کا جز بن کر نہیں آتے، وہ اس کی زندگی کا ایسا تجربہ نہیں بنتے جو اس کو بدل دے اور بھلائے نہ بھولے، جو اس کی شخصیت کا ایک جز ہو جائے اور اس کے کیرکٹر کی ایک کڑی۔ وہ تو محض فوٹو گرافر کی تصویریں ہوتی ہیں جن میں ابدیت (UNIVERSALITY) نہیں ہوتی اور حقیقت کو بجنسہ ہماری آنکھوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ چونکہ وہ فضول اور بے کار چیزیں بھی ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ اس لیے اکثر اثر کرنے والی اصلیتیں کھو جاتی ہیں یا اُن پر نگاہ کم پڑتی ہے اور ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ جب تک کہ تصنیف زندگی کے غیر فانی جذبات اور پہلوؤں کو زندہ نہ کر دے وہ آرٹ نہیں بن سکتی۔ آرٹ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک تجربہ یا خیال ہم کو اپنے پنجوں میں اس طرح جکڑ لے کہ بغیر اُس کا اظہار کیے ہوئے ہم کو چین نہ آئے جس کے سوچنے کے دوران تخیل اپنا کام کر کے اُس کو ہر فضول چیز سے پاک اور دھو دُھلا کر صاف ستھرا اور لاجواب کر دے۔ بعض سیاسی قسم کی تصنیفیں بھی آرٹ کا مرتبہ حاصل کر سکتی ہیں لیکن اُسی وقت جب وہ فرقہ بندی کی حد سے گزر کر زندگی کے اہم اور ہمہ گیر مسائل سے تعلق رکھیں، اُن مسائل سے جو فوری نہیں بلکہ غیر فانی ہیں اور ہر زمانہ اور ہر قوم کے لیے یکساں اثر رکھیں، یہ اس وقت میرا تعلق افسانوی آرٹ سے ہے۔

محبت اور نفرت، انسانیت اور حیوانیت، زندگی اور موت کے مسئلوں کو کس طرح تصنیف میں پیش کیا جا سکتا ہے؟ یہ چیزیں آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، ہاتھوں سے چھوئی نہیں جا سکتیں۔ ہم تو صرف ان کے اثر سے واقف ہیں اور اس سے بھی پوری طرح نہیں۔ جو کچھ بھی اثر جذبات پر ہوتا ہے ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں۔ چنانچہ تصنیف میں بھی ہم صرف اُن کے اثر کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اُن جذبات اور اُن شکلوں کو استعمال کرتے ہیں جن کو سب سمجھ سکیں۔ ہم دنیا میں رہتے ہیں اور ہمارے گرد و پیش اور زمین و آسمان پر وہ صورتیں اور چیزیں ہیں جنھیں گو ہماری عقل تسلیم کر لیتی ہے لیکن پھر بھی ہم ان کو حیرت اور حسرت سے دیکھتے ہیں۔ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہم کو کچھ صحیح علم نہیں۔ انسانی تجربہ میں وسعت بھی ہے اور تنگی بھی۔ تو کیا ہم ان چیزوں کے بارے میں لکھنے سے گریز کریں؟ اگر زندگی ایک حقیقت ہے تو کیا موت حقیقت نہیں؟ قحط اور غلامی، بھوک اور افلاس کیا موت سے کم نہیں؟ کیا یہ ہم کو موت کی آغوش میں نہیں لے جاتے؟ جب تک ہم زندہ ہیں زندگی کے مسائل میں اُلجھے رہتے ہیں۔ جب مر جائیں گے تو کون سی چیزیں ہم کو پریشان کریں گی؟ اس میں شک نہیں کہ موت بعد کی چیز ہے لیکن زندگی پر نظر رکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ موت اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

تصنیف تخلیق انسانی تخلیق کی طرح جذبے، خوشی اور رنج سے بھری ہوتی ہے۔ جس طرح ایک بچہ اپنے وجود سے پہلے اپنے والدین کے ذہنوں میں محض ایک دھندلا سا خیال ہوتا ہے لیکن پھر دو اشیا کے ملنے پر ایک نئی صورت اور ہئیت اختیار کر کے احساسات و جذبات ملنے

ہوئے گوشت کے پتلے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اُسی طرح سے آرٹ بھی خارجی حقیقت اور تخیل سے مل کر ہمارے لیے زندگی کا رموز اور حیرت کا آئینہ بنتا ہے، اور اُس میں زندگی کے وہ سب جذبات جھلکتے ہیں جو ہم کو متحیر و مستعجب کرتے اور جمالیاتی سرور سے بھر دیتے ہیں۔

آرٹ بقول بکین کے قدرت اور انسان کا میل ہے۔ قدرت میں سب اجزا موجود ہوتے ہیں اور ایک آرٹسٹ اُن میں سے ضروری چیزوں کو چھانٹ کر اور یک جا کر کے ایک ایسی چیز تیار کرتا ہے (چاہے وہ تصویر یا تصنیف یا موسیقی ہو) جو انسان کے دماغ اور حسن کے جذبہ کو مطمئن کر کے خوشی بخشتی ہے۔ یہ کام رپورٹنگ، اخبار نویسی یا سیاست انجام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ سیاست میں ڈوب جانے کی وجہ سے ترقی پسندی نے ہمارے سامنے تخلیقی و ادبی ترقی کا کوئی گہرا معیار پیش نہیں کیا۔ اس کی آورد CONTRIBUTION غیر اضافی تھی۔ اُس نے ہم کو صرف ماضی اور ماضیِ قریب کے ادب کی تاریکی سے نکلنے اور زندگی کے قریب آنے کی ترغیب دلائی، لیکن ہم کو آگے نہ بڑھا سکی کیونکہ اُس کے نظریے ادبی نقطۂ نظر سے محدود تھے۔ اس لیے ترقی پسندی کی تحریک صرف ایک خاص سیاسی جماعت سے منسوب ہو کر رہ گئی اور تخلیقی مصنفوں اور آرٹسٹس پر کوئی دیرپا اثر نہ کر سکی۔

زندگی اور موت و زیست کے مسئلے بہت وسیع ہیں اور ایک محدود حلقے میں بند نہیں کئے جا سکتے۔ زندگی کو محض ایک جماعت کے نقطۂ نظر سے کامل اور وسیع طور پر نہیں دیکھا جا سکتا اُسی طرح سے جس طرح ہم سارے عالم اور ارض و سما کو صرف ایک ستارہ پر نگاہ جما کر نہیں سمجھ سکتے۔ ترقی کا مطلب آگے بڑھنا ہے۔ صرف ایک جگہ پر کھڑے ہو کر زندگی کو دیکھنا نہیں ہے آرٹ اور رپورٹنگ یا پروپیگنڈا میں بڑا فرق ہے۔ اب تک ہمارے ہاں اس حقیقت پر غور نہیں کیا گیا ہے۔

یہ مسائل اتنے سہل نہیں کہ کسی خاص خیالات کے پیمانے سے ناپے جا سکیں۔ ان کو سمجھنے کے لئے درد اور گہرے تجربے کی ضرورت ہے۔ محض مشاہدہ سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ مشاہدہ صرف ظاہر سے تعلق رکھتا ہے اور تجربے کے لیے باطن کے احساس کی ضرورت ہے۔

سیاست بدلتی رہتی ہے۔ ایک دور آتا ہے اور ایک دور جاتا ہے لیکن زندگی اور آرٹ جو زندگی کے باطنی اور ہمہ گیر جذبات کو ظاہر کرتا ہے اُسی طرح قائم رہتے ہیں۔

انسانیت کا ابتدائی دور ختم ہو گیا، لیکن نغمۂ سلیمانی، گیتا اور قول اللہ اُسی طرح اب بھی ہمارے دلوں کو سرور بخشتے ہیں۔ جاگیرداری نظام مٹ چکا لیکن قصۂ الف لیلہ ابھی تک ہماری زندگی کے پوشیدہ جذبات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسی طرح ہر دور اور زمانے کے ادبی کارنامے ابھی تک زندہ ہیں اور حیات جاودانی رکھتے ہیں دورِ سرمایہ داری دم توڑ رہا ہے لیکن اس کے تخلیقی نمونے زندہ رہیں گے۔ اشتراکیت کی آمد آمد ہے لیکن یہ بھی ایک دن ختم ہو جائے گی۔ مگر آرٹ اور زندگی کا دور دورہ اُسی طرح قائم رہے گا۔ اس واسطے ہم آرٹ کو سیاسی کوزوں میں بند نہیں کر سکتے اور نہ ہم زندگی کی عظمت اور بڑائی کو کم کر سکتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کا بے مثال اسلوبِ نگارش

ڈاکٹر سیّد محمّد عبداللہ

سیاسیات میں مولانا ابوالکلام سے کسی کو لاکھ اختلاف ہو، ان کی علمی عبقریت اور ادبی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ صرف اسلوبِ نگارش ہی کو لے لیجئے اور غور کیجئے تو کہنا یہی پڑتا ہے کہ ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم۔ مگر ابوالکلام ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس کے ہر پہلو کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ آئینے کے پایاب میں اُتری ہیں سپاہیں۔ 'تذکرے' سے 'غبارِ خاطر' تک ہر منزل پر ایک نیا جہانِ معنی آباد ہے۔ بظاہر ابوالکلام کے اسلوب کے ہم کم سے کم پانچ روپ دیکھتے ہیں جو ان کے مختلف ادوار کی تحریروں میں منعکس ہیں۔ ان میں سے ہر روپ میں کمال و جمال کے انداز مختلف سہی عبقریت کا عکس ہر جگہ یکساں ہے۔

اسلوب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسلوب صاحب اسلوب کے باطن کا آئینۂ چہرہ نما ہوتا ہے۔ لیکن ہم جب اسلوب کو شخص کا آئینہ کہتے ہیں تو اس سے مراد اس شخص کا صرف خارجی روپ ہی نہیں ہوتا بہت کچھ اور بھی ہوتا ہے اس کے اکتسابات ذاتی و موروثی، اس کا ماحول (اس کے عہد جملہ ہنگامہ ہائے رزم و بزم سمیت) اس کے ہمراہ ہوتا ہے اور ان سب پر محیط وہ موہبت عظمیٰ بھی ہوتی ہے جسے عبقریت کہتے ہیں اور یہ وہ شے ہے جس کے سرچشموں میں عمریں صرف کر دیجئے تب بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان کا منبع کہاں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک اَمر ربّی یا اسرار ایزدی ہے جسے دیکھا تو جاسکتا ہے مگر اس کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔

بہر صورت ابوالکلام جو کچھ بھی تھے ان کا اسلوب بے مثال تھا جس کے خصائص علامہ اقبال کے ایک شعر سے اچھی طرح واضح ہو سکتے ہیں اور شعر یہ ہے:

گزر جا بن کے سیلِ تُند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اور ہم میں سے ہر شخص کو معلوم ہے کہ اظہار کا یہ سیلِ تُند رَو ابوالکلام کی ان تحریروں میں جو دورِ دعوت و عزیمت کے ایام شباب میں لکھی گئی تھیں سب سے زیادہ موّاج ہے مگر بعد کی تحریروں میں بھی اس کی قدرے لطیف لہریں موجود ہیں اور آخر میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جس میں صریرِ خامہ میں جوئے نغمہ خواں کا سا آہنگ سنائی دیتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جس میں نظر بندیوں کے دریچوں میں انہوں نے اپنے "حبیب مکرم" کو صبح کی دلآویزیوں کا پیغام پہنچایا، اسے بعض نقادوں نے "شبنمی رومانیت" سے تعبیر کیا ہے جبکہ 'تذکرہ' اور 'الہلال' کی تحریروں کو دودِ آشفتگی و شوریدگی کی یادگار کہا ہے۔ جس میں پیغام کی گونج کے ساتھ ساتھ مصنف کا شعورِ ذات، اپنی انتہا تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ 'نقدِ ابوالکلام' کے مصنف جناب رضی الدین احمد نے اسے ابوالکلام کا انانیتی رنگ کہا ہے مگر یہ اصطلاح کچھ بدمزہ سی ہے اس لیے میں اسے احساسِ منصب کی طُغیانی کہنا پسند کرتا ہوں۔

اس موقعہ پر احساس منصبی کے معنی یہ ہیں کہ ابوالکلام کے باطن میں یہ شعور بدرجہ افراط موجود تھا کہ وہ ایک بہت بڑے نصب العین کے لئے پیدا کیے گئے ہیں جس کی ان میں صلاحیت بدرجہ یکتائی موجود ہے۔

بنا بریں ابوالکلام کا اسلوبِ نگارش (ان کی خطابت سمیت) دعوت و عزیمت کے ایک علمبردار کا اسلوب تھا۔ دعوت و عزیمت اسلام کی دینی تاریخ کا جانا پہچانا لفظ ہے اور یہ ان دینی مجاہدین کے لیے استعمال ہوتا رہا جنہوں نے اپنی زندگیاں باطل رسوم و عقائد کے خلاف جہاد میں صرف کیں اور اصلاح و انقلاب کے لیے تحریر و تقریر کا ایک خاص اسلوب بیان اختیار کیا جس کا آہنگ عام موعظمی انداز سے جدا ہوتا ہے۔ اس میں خطابت، بلاغت، تمثیل، علم و تذکیر اور عبرت و موعظہ کے جملہ عناصر ایک جا جمع ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی دینی تاریخ کے پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی زمانے کے حالات روحانی مرکز ثقل سے ہٹ جاتے رہے اور نفوس انسانی مکدر ہو کر پژمردگی اور اضمحلال اجتماعی میں بدل جاتے رہے تو قدرت نے کوئی نہ کوئی صاحب دعوت و عزیمت پیدا کیا جس نے اپنی زبان اور قلم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے صور اسرافیل سے خوابیدہ دلوں کو جگایا اور غفلت آلود قلوب میں دینی حرارت پیدا کر کے احیائے قومی کے لیے نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا۔ اس کے لیے ان اکابر نے مصائب برداشت کیے، طوق و سلاسل سے دل لگایا اور دار و رسن کو قبول کر کے نعرہ زن ہوئے ؎

در مدرسہ کس را نرسد دعوئ توحید

منزل گہ مردانِ موحد سرِ دار است

طوق و سلاسل کی یہ داستان اسلاف کرام سے ابوالکلام آزاد تک پہنچی جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

اب دعوت و عزیمت کے علمبرداروں کے یہاں تقریری خطابت کا حربہ تو ہوا ہی کرتا ہے مگر اُن کی نگارش میں بھی خطابت کا آہنگ اور جوش و خروش نمودہ ہوتا ہے۔ جس کو طوفانوں اور آندھیوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو دلوں کو محشر خیال بنا کر تگ و تاز عمل پر ابھارتی ہیں۔ اور ان کے زیر اثر قاری و سامع مصلحت کی ہر احتیاط سے بے نیاز ہو کر میدانِ عمل تک جا پہنچتا ہے۔

ابوالکلام کے اس اندازِ نگارش کی ترکیب میں کئی عناصر نے حصہ لیا۔ اس میں ایک تو وہ آہنگِ عرب ہے جو عرب خطبا و بلغا کے حماسہ ہائے قبائلی میں ہے جن کا مقصد مبارزت کی دعوت ہوتا تھا۔ یہ عنصر ابوالکلام کے یہاں ادب عربی اور عربی روایات سے خصوصاً جامعۂ ازہر کے دوران حاصل ہوا۔ ان کے بعض فقروں اور عبارتوں میں بلغائے عرب اور شعرائے عرب کی سی للکار سنائی دیتی ہے۔ الہلال کے دور کی بہت سی تحریریں ایام العرب کے خطبات کا آہنگ رکھتی ہیں۔ جن کے اندر قرآن مجید کی آیات اور عربوں کے امثال و اشعار کا عنصر اس طرح پیوست ہوتا جاتا ہے گویا ذرا زکوہ سے کوئی پہاڑی ندی نشیب میں تندی و تیزی سے رواں دواں ہے اور راستے کی چٹانوں کو بے روک ٹوک بہا کر ساتھ لے جا رہی ہے، یہ ہے وہ ابوالکلامی آہنگ تند جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ابوالکلام کے اسلوب کا دوسرا عنصر ان کے عصر کے سیاسی اور بین الاقوامی واقعات و حوادث ہیں جن کی گونج سے مشرق و مغرب کی فضا مسموم تھی، یہ حرب و ضرب کی فضا تھی جس میں اقصائے عالم میں توپوں کی گرج اور رعد و برق کا شور ہر طرف سنائی دیتا تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ زمانہ ہند میں تقسیم بنگالہ اور مغرب میں طرابلس و جنگ بلقان اور ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اور اس کے معاً بعد تحریک

خلافت کا زمانہ تھا جس نے برصغیر میں ابوالکلام کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے خطبا مثلاً محمد علی، ظفر علی خاں، آزاد سبحانی، احمد سعید اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری پیدا کیے۔ ان میں ابوالکلام اپنی دوسری خصوصیات کے باعث خاص الخاص انفرادیت کے مالک تھے۔ ان سب خصائص نے ابوالکلام کی نثر کو اپنے سارے زمانے سے ممتاز رکھا۔

اُسلوبِ ابوالکلام آزاد کا تیسرا عنصر آزاد کی علمیت کا امڈتا ہوا طوفان تھا جس کے ریلے میں علم کی ہر صنف رواں دواں تھی جس کے باعث ان کا اسلوب صرف ایک سیل تند ہی نہ رہا تھا بلکہ اس میں جواہر ریزوں کی صَدَف بندی بھی موجود تھی۔ اس میں قرآن مجید کی آیات اور علوم دینی کے علاوہ علوم مغرب کے نقوش عبارتوں کے مرصع قلعے تیار کرتے جاتے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنے سارے اغلاق کے باوجود، بیان کی سطح ہموار اور متناسب نظر آتی تھی اور قاری کو کسی قسم کا ثقل محسوس نہ ہوتا تھا۔ ان متفرق آمیزشوں کے باوجود عبارتوں کے آہنگ میں کبھی خلل پیدا نہیں ہوا بلکہ اس سے اسلوب کی بداعت کا ایک خاص میناخانہ منقش ہو جاتا تھا۔

اسلوب ابوالکلام کا چوتھا امتیاز یہ تھا کہ اس میں ایک عنصر مغربی ادبوں کے معروف ادیبوں اور انشا پردازوں کے (مثلاً روسو، والیٹر، وکٹر ہیوگو، طالسطائی (جو آزاد کا محبوب مصنف تھا اور اناطول فرانس وغیرہ) کے اثرات اور اسالیب تخاطب بھی اثر انداز نظر آتے تھے۔ یہ امر بھی خصوصی توجہ کے لائق ہے کہ آزاد کی عبارتوں میں وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر جو ثقل سے پیدا ہو جاتا تھا اس کی تلافی مغرب کے ادب لطیف کی آمیزش سے ہو جاتی تھی، اس کے علاوہ عربی خصوصاً فارسی اور اُردو کے اشعار نغز و شیریں کے ذریعے بیان میں لطافت کا رنگ آجاتا تھا۔ آزاد کا شعری ذوق، نفاست اور تہذیب کی اعلیٰ نزاکتوں کا اس حد تک آئینہ دار ہے کہ اس میں اگر کسی اور کا نام بطور مثال لیا جاسکتا ہے تو وہ انھیں کے استاد شبلی اور ان کے بزرگ ہم عصر حالی ہی کے نام ہو سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ابوالکلام کی تحریروں میں سے اگر پیش کردہ اشعار کو سلیقے سے چن لیا جائے تو اشعار کا ایک نہایت ہی عمدہ مجموعہ نغز تیار ہو سکتا ہے۔

ان سب عناصر کے عقب میں آزاد کے مزاج کی شعلہ سامانی اور مقصد و نصب العین کی خاطر جذبے کی آتش فشانی کارفرما تھی۔ مگر قابلِ ذکر یہ ہے کہ بیان کے اس طمطراق کے باوجود ان کی علمی متانت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ابوالکلام کا اسلوبِ بیان سرسید احمد خاں کی سادہ حقیقت بیانی کی ضد اور رسالہ مخزن کے دھیمے آہنگ نثر کے خلاف ایک قدرتی ردعمل تھا، میرے اس خیال سے بعض محترم حضرات نے اختلاف کیا ہے اور سرسید اور ابوالکلام کو زبردستی یکساں ثابت کیا ہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ سرسید بھی ایک جلیل القدر انسان تھے لیکن اس کے لیے یہ کیوں فرض کیا جائے کہ ان کا یا مولانا حالی کا اسلوبِ بیان بھی ابوالکلام کی طرح کا تھا۔

مجھے اب بھی اس بات پر اصرار ہے کہ ابوالکلام ہر طرح سرسید احمد خاں کی ضد تھے جس طرح خود علامہ اقبال طرزِ احساس کے لحاظ سے سرسید کی ضد تھے۔ اور اس سے تنقیص کسی کی مقصود نہیں۔ مگر لوگ زبردستی کیے جا رہے ہیں اور مختلف لوگوں کو ایک ہی کرسی پر بٹھا رہے ہیں۔ دراصل یہ نتیجہ ہے اس گروہ بندی کا جو ہمارے یہاں کیمپوں کی صورت میں موجود ہے جس کی بنا پر ہم نظریات کی کش مکش کے قصے کو اسلوبِ بیان کے معاملے میں بھی سامنے لے آتے ہیں۔

حال ہی میں کراچی کے ایک ماہنامہ میں میرے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے دنیا بھر کی دلیلیں اس خیال کے حق میں صرف کر

دی ہیں کہ علامہ اقبال سو فی صد سرسید کے مقلد تھے۔ حاشا و کلا۔ اس سے بڑا مکابرہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ درست کہ سرسید بھی بلند ترین اور عظیم ہستیوں میں شمار ہونے چاہئیں مگر اقبال کی ندرتِ فکر کو سرسید کے تابع بنا دینا انتہائی ظلم ہے۔ یہی بات ابوالکلام کے سلسلے میں کہی جا سکتی ہے۔

اس گروہ بندی کی ایک اور مثال دیتا ہوں۔ ہمارے ایک مرحوم بزرگ نے جو جہاد اُردو میں ہمارے رہنما تھے یہاں تک کہہ دیا کہ ابوالکلام نے اُردو کو مار ڈالا۔ اس رائے کا ایک سبب تو حالی شبلی کشمکش کا واہمہ ہے۔ دوسرا وہ نظریاتی اختلاف ہے جو آجکل عام ہے۔ نیز یہ خیال کہ اصلی اسلوب وہی ہوتا ہے جو مدعا کے تقاضوں کے برعکس سلیس اور سادہ ضرور ہو۔ دراصل قصہ تو صرف یہ ٹھیک ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است لہٰذا حالی حالی ہیں، شبلی شبلی ہیں اور ابوالکلام ابوالکلام۔ کسی نے کسی کو نہیں مارا۔ اگر محض سادگی اور سلاست ہی کو واحد تقاضائے بیان سمجھ لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پرشکوہ انداز بیان (GRAND STYLE) ایک مہمل عمل ہے۔ دراصل بیان کوئی واحد اور یک رنگ شے نہیں، سرسید اور رفقائے سرسید اپنا ایک رنگ رکھتے ہیں۔ مخزن کے ادیب لطافت پر زور دیتے تھے، سجاد انصاری اور نیاز فتح پوری کا طرز جدا ہے۔ اور یہ سب برحق ہیں۔ دراصل اسلوب کا منبع ادیب کے شخصی مزاج کے علاوہ وہ مضمون و مدعا اور وہ دائرہ تخاطب اور نصب العین بھی ہوتا ہے جو ادیب کے مدنظر ہوتا ہے، وہ ادیب جو ایک طوفان انگیز شخصیت کا حامل ہوگا، جس کے سینے میں علوم کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر موجزن ہوں گے اور جس کا نصب العین خوابیدہ قوموں کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہوگا وہ اگر شاعر ہے تو علامہ اقبال کی طرح اس کا اسلوب، جبریل آشوب ہوگا، اور اگر نثر نگار ہے تو اس کا انداز بیان ابوالکلام کی طرح صور اسرافیل کے مانند محشر خیز ہوگا۔ ایسے ادیبوں سے خواب آلود موسیقی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

یہاں معاملہ اس تہذیبی مزاج کا بھی ہے جو اقبال اور ابوالکلام کو ورثے میں ملا۔ غالباً اس حقیقت سے انکار نہ کیا جا سکے گا کہ مسلمان قوم کے اجتماعی ذوق میں سجع و قافیہ، تناسب اور مراعاۃ النظیر کے علاوہ شان و شوکت کے عناصر کے لئے خصوصی میلان پایا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دبدبہ اور طمطراق اور رعب و ہیبت افزائی مسلمانوں کے عظیم ادبوں کے خصائص اعظم میں شامل ہے۔ متنبّی ہو یا خاقانی وصاف ہو یا ابوالفضل، غالب ہو یا اقبال، ان کی نوائے تند میں ان کے دیرینہ قومی ذوق ہی کی صدائے توانا سنائی دیتی ہے۔ ہمارے بزرگ ملائم اور نرم و نازک فوائد کے دلدادہ لوگ نہ تھے، وہ اس جاہ و جلال کے وارث تھے جس کا لوہا سارے عالم نے تسلیم کیا تھا۔ اور بطور جملہ معترضہ مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ برصغیر میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر سلاست نگاری کی جو تحریک اٹھی تھی بظاہر معصوم اور ابلاغ عامہ کے نقطۂ نظر سے معقول و مناسب ہی معلوم ہوتی ہے لیکن فرنگی نبض شناسوں کا ایک بڑا مقصد (بدگمانی ہی سہی) یہ بھی تھا کہ وہ مسلم قوم کو دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبۂ خاص میں بھی ان کے اصل مزاج شوکت پسندی سے منحرف کر کے انھیں لوریوں، گیتوں اور کہانیوں کی سطح پر لے آئیں اور ان روایتوں کو فراموش کرا دیں جو کہانیوں میں بھی آئیں تو انہوں نے رجال و ابطال کی معرکہ آرائیوں کی شکل اختیار کی، ان کے علاوہ عمومی نثر میں بھی اس کی مخصوص صورت توانائی اور جلال ہی تھی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اسلوب میں اصل شے "نیچرل" مدعا نگاری ہے۔ اسے آسان یا مشکل کی اصطلاحوں سے منسوب کرنا درست نہیں۔ حقیقی مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ کسی نصب العین کے تحت کسی شخصیت نے اپنا مدعا اور مقصد کامیابی سے بیان کیا یا نہیں۔ حقائق اگر علمی ہوں تو انھیں الف لیلہ یا حیدر بخش حیدری کی کہانیوں

میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ استدلالی نثر کے لیے بیانیہ نثر کی روش اختیار نہیں کی جاسکتی۔ وصفیہ نثر کے لئے توضیحی نثر موزوں نہیں، ہر ایک کا اپنا ایک منصب اور اپنا ایک انداز ہے بشرطیکہ اس میں تکلف برائے تکلف نہ ہو اور پھر ہر زمانے کا مزاج اور مقاصد کی نوعیت بھی اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہے اور ابوالکلام کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ عربی بلاغتوں اور عربی روایتوں میں پلی ہوئی شخصیت کے ساتھ مزاج و طبیعت کی شوریدگی و آشفتگی اور پیش نظر عظیم مقصد کے لیے طوفان خیز ہنگامہ آفرینی اور اس پر وفور علم جس کا سینے کی چار دیواری میں سمٹ سکنا ناممکن تھا ان سب عناصر نے اردو نثر کو ابوالکلام کا پُر جلال اسلوب عطا کیا جس میں اغلاق کے باوجود، ایک ایسا شعری مدد جزر بھی پایا جاتا ہے جسے سن کر حسرت موہانی کو اپنی شاعری بے مزہ محسوس ہوتی تھی۔

میں یہاں نثر ابوالکلام کے ایک اور عنصر کا ذکر کرتا ہوں جو وعظ و تذکیر کی اس روایت سے اس میں داخل ہوا جو ہماری دینی تاریخ میں صدیوں تک موجود رہی۔ وعظ کا سلسلہ تو پرانا ہے مگر ایک مخصوص سلسلہ حضرت غوث الاعظمؒ کے مواعظ سے شروع ہوا جو ابن الجوزی اور واعظ کاشفی وغیرہ سے ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور برصغیر میں دیگر بزرگوں کے علاوہ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور آگے چل کر مولانا اشرف علیؒ تھانوی اور ڈپٹی نذیر احمدؒ کی خطابت سے آملتا ہے۔ ابوالکلام کی نثر اس خطابتی انداز سے بھی متاثر معلوم ہوتی ہے لیکن یہ صرف ایک عنصر ہے۔ ابوالکلام کی تعلیم وسیع تر ہے۔ چنانچہ سطور گزشتہ میں ذکر آچکا ہے۔

بہر حال ابوالکلام کی نثر کی عمومی کیفیت یہی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ مضمون اور مدعا کے نوعیت ابوالکلام کے اسلوب پر بھی اثر انداز ہوئی چنانچہ تذکرہ اور الہلال کی تحریروں کی آشفتہ بیانی، قول فیصل کی استدلالیت سے مختلف ہے، اسی طرح ترجمان القرآن کا انداز افہام و تفہیم غبار خاطر کی دلآویزی اور نرمی و لطافت سے صاف جدا نظر آتا ہے۔ اور یہ سب مضمون و مدعا اور مقصد و نصب العین کے فرق کا نتیجہ ہے۔

بعض حضرات نے ترجمان القرآن میں اسلوب آزاد کے توضیحی و ابلاغی انداز نگارش پر طعن کیا ہے اور اس میں ان کے خلوص پر سیاسی طعنہ زنی کی ہے۔ حاشا وکلا۔ ابوالکلام کا دامن ان آلودگیوں سے پاک تھا، یہ تو موضوع اور مدعا و مضمون اور نصب العین کی جداگانہ نوعیت تھی جس نے مزاجاً و فطرتاً ان کے تفسیری اسلوب میں وضاحت اور حسن استدلال کی ایک صورت پیدا کی، اور یہ بے ساختہ تھی، مثال کے طور پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ربوبیت کے تحت، فطرت اور کائنات کے حوالے سے تشبیہی استدلال اس طرح کیا ہے کہ یہ تمام بیان تخلیقی ادب کا خوبصورت شاہکار نظر آتا ہے۔ قدرتی امر ہے کہ اس موقعہ پر الہلال کا اسلوب بیان کسی طرح موزوں نہ تھا۔

اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں غبار خاطر میں چڑیا کی کہانی اچھی نہیں لگی، لیکن ان بے دردوں سے کوئی یہ کہہ دے کہ عزیزو، ابوالکلام کے لیے الہلال اور تذکرے کی سی للکار ہمیشہ ضروری کیوں ہو۔ مقاصد کی سنگین صعوبتوں سے کچھ دیر کے لئے آزاد ہو جانے کی صورت میں ایک مرد مجاہد نے تفسیری سرگرمیوں کے علاوہ یا ان کے ساتھ ساتھ کچھ دیر کے لیے کائنات کے ہم صفیروں سے اگر ہم کلامی کا کچھ لطف حاصل کر لیا تو اس پر اس قدر خفا ہونے کی ضرورت کیا ہے، غبار خاطر کے اس اسلوب کو بلبل کی ہم زبانی ہی سمجھ لیا جائے تو یہ بھی یہ ایک حسین و جمیل سوغات ہے۔ لیکن ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کئی رنگوں میں یہ بھی ایسا رنگ ہے جس

کی تقلید نہیں کی جاسکتی اور یہ انفرادیت تو ابوالکلام ہی کا طغرائے امتیاز ہے کہ ان کی سی نثر لکھنے والا، نہ ان سے پہلے کوئی پیدا ہوا نہ اُن کے بعد آج تک نمودار ہوا۔ سچ ہے ؎

قیس سا پھر نہ اُٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے قبیلے کا سدا ایک ہی شخص

مخطوطۂ دیوانِ ترقی

(نسخۂ خدا بخش لائبریری)

ڈاکٹر اکبر حیدری

میرزا محمد تقی نام، اسد الدولہ رستم الملک خان بہادر فیل جنگ خطاب، آغا صاحب عرف اور ترقی تخلص[1]۔ نام کے ساتھ "میرزا" نشانِ سیادت ہے یعنی "میرزادہ" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید[2] تھے۔ شیفتہ[3]، خوشگی[4]، ناصر[5] اور آزاد[6] نے ان کے نام سے آگے "میرزا" لکھا ہے، جو ان کے مغل ہونے پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر شمیم انہونوی مرتب تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا نے غلطی سے ترقی کا نام اسد اللہ ولد آغا محمد تقی خان لکھا ہے[7]۔ مخطوطۂ خوش معرکۂ زیبا نسخۂ لکھنؤ یونیورسٹی اور نسخۂ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ترقی کا نام صحیح درج ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے نسخۂ پٹنہ کے حوالہ سے حاشیہ میں بھی ترقی کا نام غلطی سے اسد اللہ ہی لکھا ہے۔ بہر حال ترقی فیشا پوری سید تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام سید محمد امین تھا۔ وہ نواب برہان الملک (م ۱۷۳۹ء) کی نواسی نجم النساء بیگم عرف کھیتو بیگم کے شوہر نامدار تھے اور اس طرح ترقی نواب موصوف کے کنواسے تھے[8]۔

ترقی کی ولادت فیض آباد میں ہوئی تھی۔ اسی لیے تذکروں میں ان کا وطن فیض آباد درج کیا گیا ہے[9]۔ نواب آصف الدولہ بہادر (م ۱۷۹۷ء) نے فیض آباد میں اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی تھی[10]۔

ترقی نواب شجاع الدولہ بہادر (م ۱۷۷۵ء) کے قرابت داروں میں تھے[11]۔ بہو بیگم (م ۱۸۱۶ء) نے اپنے رشتے کی ایک لڑکی لطف النساء بیگم کو منہ بولی بیٹی بنایا تھا اور بعد میں انھیں ترقی سے منسوب کیا۔ اس طرح وہ نواب وزیر الملک شجاع الدولہ کے داماد کہلاتے تھے[12]۔ بہو بیگم نے وصیت نامے میں ان کے لیے وثیقہ بھی مقرر کیا تھا[13]۔

ترقی بڑے باغ و بہار اور جاہ و جلال کے مالک تھے۔ ان کے دامنِ دولت سے فیض آباد میں بہت سے شعراء وابستہ تھے اور ان کے مبنعِ فیض سے ہر کس و ناکس نہال ہوتا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں بہت بڑے رئیس، عالی ہمت، امیر کبیر اور سرکار اودھ میں صاحب جاگیر تھے[14]۔ سرور انھیں "بسیار عمدۂ معاش و باجاہ و ثروت و صاحبِ مروت" کہتے ہیں[15]۔ مصحفی ان کی دریا دلی اور موزونیٔ طبع کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"جوانیست باغ و بہار، سرو قامتش بہ لباس موزونی آراستہ و پنجۂ دستش بہ حنائے سخاوت پیراستہ، عالی و دودمانی الیشان محتاج شرح و بیان نیست۔ از ابتدائے شوقِ موزونی طبع تا الی الآن رجوع از تہ دل بہ اہل کمال و صاحبانِ سخن از عطیہ دست او زر بدست می آرند۔ ہر کس و ناقص را محروم نمی گزارد"[16]

قاسم انھیں "بزرگ، خوش باش اور صاحب تمکین" کہتے ہیں[17]۔

ترقی صاحب مذاق، سخن فہم اور شعراء کے قدر دان تھے۔ فیض آباد میں اپنے مکان پر محفل مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی اور ہر شخص کے

ساتھ سلوک کرتے تھے[19]۔ ان کے گھر پر اہلِ علم و فضل کا اژدہام ہوتا تھا[20]۔ میر خلیق (م ۱۸۲۴ء) پندرہ روپے ماہانہ پر اُن کے ملازم تھے[21]۔ میر شیر علی افسوس (م ۱۸۰۸ء) لکھتے ہیں کہ فیض آباد میں "میر سخن خلیق تخلص اور میر محسن (برادر میر خلیق) میرزا تقی مہر بیگم صاحب مادر آصف الدولہ مدظلہا کے داماد کے رفیق ہیں[22]"۔ ترقی کی محفل مشاعرہ منعقدہ فیض آباد میں نواب میر زا مجھو[23]، نواب آغا نصیر خان[24] مرزا مغل سبقت[25] اور رنگین وغیرہ جیسے نامور سخن فہم اور ممتاز شعراء داد سخن دیتے تھے۔ مشاعرے میں اردو شاعری کے کئی پہلو زیر بحث آتے تھے[26]۔ ایک دن ترقی کے یہاں مشاعرے میں رنگین نے میر خلیق سے مثنوی سحر البیان کے بعض مشتبہ اشعار کا ازالہ کرنا چاہا[27]۔ ترقی نے ایک مرتبہ آتش (متوفی ۱۸۴۷ء) کو مشاعرے میں لکھنؤ سے بلایا۔ تجویز یہ تھی کہ انھیں وہیں رکھیں۔ مشاعرے میں جب میر خلیق نے غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

مثلِ آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

تو آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے[28]۔" غزل کی اس زمین میں ترقی اور آتش نے بھی غزلیں کہی تھیں۔ آتش کی غزل کا مطلع یہ ہے : ؎

کھائے گا خنجرِ جلاد کا چرکا پہلو
رشکِ پہلو کو مبارک ہو جگر کا پہلو[29]

ترقی کی غزل کے چند شعر یہ ہیں : ؎

یوں تہ زلف نمودار وہ رخ ہوتا ہے — ابر سے آئے نظر جیسے قمر کا پہلو
کارگر دل میں کسی کے جو نہیں ہوتی ہے — چھٹ گیا آہ سے شاید کہ اثر کا پہلو
لا دوا زخم سمجھ پہلو تہی کرتا ہے — دیکھتا ہے مرا جراح جدھر کا پہلو[30]

جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کے بدلے لکھنؤ کو اپنا دار الحکومت قرار دیا تو قافلۂ شعراء بھی لکھنؤ آگیا۔ ترقی بہو بیگم کی وفات کے بعد لکھنؤ گئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں شعر و شاعری کے خوب چرچے ہونے لگے۔ فیض آباد کی طرح انھوں نے لکھنؤ میں بھی محفل مشاعرہ قائم کی اور اپنے گھر پر شعراء کو مدعو کرتے تھے۔ ایک دن ان کے یہاں مشاعرہ تھا۔ جرأت اپنے شاگردوں کے لشکر کے ساتھ وارد ہوئے اور شعر کے علاوہ مشاعرے میں میر تقی میر بھی موجود تھے۔ جب مشاعرے میں جرأت نے میر سے داد چاہی، تو میر نے کہا کہ "تم شعر کہنا نہیں جانتے ہو۔ اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو[31]۔"

ترقی صاحب املاک تھے۔ نواب میرزا حسام الدین حیدر تخلص نامی (متوفی ۳ اکتوبر ۱۸۴۶ء) نے ان کی حویلی کی تاریخ۔ جو ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں تعمیر کی گئی تھی ذیل کے قطعہ میں کہی۔

جس وقت بنا یہ قصر حسب دلخواہ — تاریخ میں سوچا اسے تب کر کے نگاہ
ہاتف وہیں روئے دوستی سے بولا — کیا خوب بنا مکان ماشاء اللہ[32]

۱۲۱۵ ہجری

نامی نے اپنے دیوان میں بھی ترقی کا ذکرِ خیر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

التماس اپنا ترقی نے کبھو رد نہ کیا
نہ ہوئے ہوں گے عمل حاتم طے سے ایسے

طالب علی خان عیشی (متوفی ۱۸۲۴ء) اُردو فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ جناب راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں کلیات عیشی کے کئی نادر اور نایاب مخطوطے محفوظ ہیں۔ ان کا ایک نسخہ ۱۲۳۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس میں ترقی کی مدح میں کئی قصیدے اور مثنویاں ہیں۔ ورق ۱۴۱ اب میں مثنوی در مدح اسد الدولہ رستم الملک فیل جنگ آغا تقی بہادر دام اقبالہ" کے تحت ۲۳۵ شعر درج ہیں۔ ذیل میں ابتدا کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

بنام خداوند پست و بلند — پدید آور پیل چرخ نژند
طرازندۂ ناتوانی و زور — خداوند پیل و خداوند مور

ورق ۱۴۹ اب میں عیشی نے ایک غزل ترقی کی تعریف میں کہی ہے۔

ترقی کا سال وفات کسی تذکرہ یا تاریخ میں درج نہیں ہے۔ شیفتہ نے ان کا ترجمہ ۱۸۳۲-۳۳ء یعنی سال تصنیف گلشن بیخار لکھتے وقت صیغۂ حال میں لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۴ء کے درمیان زندہ تھے۔[۳۳] بلوم ہارٹ کی بھی یہی رائے ہے۔[۳۴]

ترقی کا مشہور مطلع ہے ؎

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز یہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

ناسخ کے اسی مطلع سے ترقی کا سال وفات نکالا ہے۔ یہ تاریخ دیوان ناسخ قلمی نسخۂ لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود ہے اور ابھی تک ان کے دیوان میں نہیں چھپی ہے۔ ذیل میں پورا قطعہ درج کیا جاتا ہے:۔

"تاریخ وفات میرزا محمد تقی ترقی"

تھے حاتم زمانہ میرزا تقی ترقی — ایسے کہیں جہاں میں صاحبِ کرم نہ ہوں گے
تا حشر اس امیرِ فیاض کے برابر — اہلِ چشم نہ ہوں گے عالی ہمم نہ ہوں گے
پائی وفات اس نے ماتم سرا ہیں یسنے — ہے کون دل کہ جس میں سوخارِ غم نہ ہوں گے
ہوں گے اگر نیستاں بہر قلم میسّر — اوصاف اس کے ناسخ تو بھی رقم نہ ہوں گے
لے لیں گے ساتھ اس کو جب تک نہ روزِ محشر — خلدِ بریں میں داخل شاہِ امم نہ ہوں گے
گن اس بلیغ کا یوں مطلع برائے تاریخ — بس ایک سے زیادہ اعداد کم نہ ہوں گے

دنیا کے جو مزے ہیں باللہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہیں رہیں گے اے وائے ہم نہ ہوں گے

۱۲۴۵+۱ = ۱۲۴۶ھ

مخطوطہ دیوان ناسخ میں تاریخ اسی طرح درج ہے لیکن اس سے مطلوبہ تاریخ نہیں نکلتی ہے۔
جناب راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں مرزا علی نظر شاگرد مصحفی کا قلمی و غیر مطبوعہ دیوان محفوظ ہے۔ اس کے آخر میں ترقی کا سال وفات ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء درج ہے۔ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ؎

"تاریخ وفات محمد تقی خان بہادر فیل جنگ"

محمد تقی خان بہادر کہ بود — بجود و شجاعت عدیم المثال
بحکم خدا زیں سرائے سپنج — سوئے باغ فردوس کرد انتقال
پے سال تاریخ آں ذی شکوہ — چو کردم نظر از دلِ خود سوال

ہماں دم خرد از سر علم گفت
برفت از زماں قدر دانِ کمال

۸ + ۱۲۳۸ = ۱۲۴۶ ہجری

الغرض ترقی کا انتقال ۱۲۴۶ ہجری مطابق ۱۸۳۰ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ کاظمین کے متصل نیشاپوری مقبرے میں دفن ہیں۔ قبر پر جو کتبہ ہے اس پر میر خلیق کی کہی ہوئی تاریخ کندہ ہے۔ راقم نے یہ تاریخ نوٹ کی تھی افسوس ہے کہ کہیں کھو گئی ہے۔

ترقی کی کئی اولادیں تھیں۔ ان میں سے ایک شاعر بھی تھا۔ اس کا نام نواب میرزا محمد علی خان خطاب دلیر الدولہ، فیروز جنگ خان بہادر عرف آغا حیدر تخلص حیدر۔ وہ برق کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان تھے۔ ان کا مطبوعہ دیوان نایاب ہے، اس کا ایک نسخہ لکھنؤ کے سلطان المدارس میں موجود ہے۔ ان کا انتقال ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ اسیر لکھنوی نے تاریخ کہی۔ ؎

"تاریخ وفات دلیر الدولہ میرزا حیدر صاحب بہادر متخلص بہ حیدر خلف میرزا محمد تقی ترقی"

دلیرے کہ از دولتش بود شہرت — شجاعے کہ مشہور ہمنام حیدر
بتاریخ فوتش ندا کرد ہاتف — کہ جا یافت حیدر بقربِ پیمبرؐ ۱۲۷۵ھ

میرزا غالب اور دلیر الدولہ کے درمیان بڑے اچھے تعلقات تھے۔ کلیات نثر غالب میں ان کے نام خطوط بھی درج ہیں۔ مرزا غالب نے ایک خط مورخہ جمادی الاول روز شنبہ ۱۲۶۶ ہجری کو ان کے نام لکھا تھا۔ ان میں مرزا نے اس قصیدے کے متعلق پوچھا تھا جو انہوں نے دلی سے واجد علی شاہ سلطان عالم کی تعریف میں لکھا تھا اور جو میر ضمیر (متوفی ۱۲۷۲ھ) نے دربار شاہی میں پڑھا تھا[۳۶]

ترقی کا کتاب خانہ مشہور تھا۔ اس میں اُردو، فارسی اور عربی کے بیش بہا قلمی نسخے موجود تھے۔ انہی میں میر حسن کا تذکرہ شعرائے ہندی بخط مصنف بھی تھا جسے راقم نے حال ہی میں ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ یہ کتب خانہ سلطان المدارس میں منتقل ہوا ہے۔ یہاں یہ علمی خزانہ بڑی کس مپرسی کے عالم میں ہے اور کوئی اس کی دیکھ بھال نہیں کرتا ہے۔ بعض نسخے بہت قدیم ہیں۔ یعنی سیکڑوں برس پہلے کے ہیں۔

ترقی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں میر سوز (متوفی ۱۲۱۴ھ) کے شاگرد تھے۔ ان کا شمار اساتذۂ قدیم

میں ہوتا ہے۔ متانت اور سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو لطف زبان اور معاملہ بندی میں اپنا مزا دکھاتے ہیں۔ کلام میں درد، دلکشی اور چاشنی ہے۔ زبان صاف شیریں اور لطف محاورہ بھی اس میں شامل ہے[۳۷]۔

دیوان ترقی:

ترقی صاحب دیوان تھے۔ ان کے دیوان کے تین نسخوں کا پتہ چلا ہے۔ دوسرا انڈیا آفس لندن میں نمبر ۲، ۱ کے تحت ہے۔ سائز ۸½ × ۴½، ورق ۱۰۵ یہ دو مختلف ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے[۳۸]۔ تیسرا نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے تفصیل یہ ہے۔

نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ:

نمبر مخطوطہ ۲۲۔ سائز ۷ × ۹"، اوراق ۱۱۹ ب، فی صفحہ ۱۱ سطر۔

راقم نے اسی نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی ترتیب درست نہیں ہے۔ ورق ۳۲ ب میں الف ردیف کے تحت اشعار درج ہیں صفحے کے آخر میں "ساقی" کی رکاب پڑی ہے۔ اس کے بعد ورق ۳۳ الف میں ردیف "یا" کے شعر لکھے گئے ہیں۔ اوراق کا یہ انتشار غلط جلد بندی کا نتیجہ ہے۔

پہلی غزل کی ابتدا میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ھو العلی الاعلیٰ" کی عبارت نمایاں ہے۔ اس کے بعد غزل شروع ہوتی ہے۔ اس میں ۱۳ شعر ہیں۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

وصف اس کا نہ کروں کیونکہ میں یہ ہاں پیدا — جس کی وحدت سے ہوئی کثرتِ امکاں پیدا
کیونکر اس صاحب قدرت کے نہ ہوں سب قائل — خاک سے جس نے کیا قالبِ انساں پیدا
جان عالم اُسے کہنا نہیں لائق ہرگز — کیونکہ پیدا وہ نہیں اور ہوئی جاں پیدا
کوئی تو شکل ہے باطن میں بسانِ تصویر — دیکھ کر جس کو ہوا آئینہ جاں پیدا

تیرے دیوان کا نہ شہرا ہو ترقی کیوں کر
یہ غزل تجھ سے ہوئی ہے سرِ دیواں پیدا

دیوان اشعار ذیل پر ختم ہوتا ہے۔ ؎

گل چیں نے توڑے باغ میں جو غنچہ ہائے گل — بے اختیار بلبلیں چلائیں ہائے گل!
نالے جگر خراش سنے اور نہ کچھ کہے — بلبل کے واسطے ہے بہت یہ جفائے گل
وہ رشکِ گل کل آیا تھا شاید کہ باغ میں — ہے جو مکدر آج نہایت صفائے گل
روئے زمیں سے زیرِ زمیں ہے فزوں بہار — اس چرخِ واژگوں نے ہیں کیا کیا مٹائے گل

اس رشکِ گل کے کیوں نہ سدا دل کرے تلاش
بلبل کو اور کچھ نہیں بھاتا سوائے گل

ذیل میں انتخاب غزلیات پیش کیا جاتا ہے۔ ؎

بیاں کیا کروں لطف ہر بار کا
عجب ہے مزا اس ستم یار کا

مسیحا مجھے دیکھ کہنے لگا
کروں کیا علاج میں اس آزار کا

نشانہ نہ دیکھا کبھی چوکتے
چلا تیر جب اس کماندار کا

جسے دیکھ کر بھول لی چال اپنی کبک
میں پامال ہوں اس کی رفتار کا

چمن چھوڑ کر جو قفس میں پھنسے
لگے خاک جی اس گرفتار کا

جلا ڈالے اک دم میں سارا فلک
میں قائل ہوں آہِ شرر بار کا

جو سوؤں تو دیکھوں اُسے خواب میں
کروں شکوہ کیا چشمِ بیدار کا

مجھے رشک سے قتل کرتا ہے کیوں
نہ کر خون ہر روز دو چار کا

میں عالم کہوں اپنی مستی کا کیا
گلے میں پہن رشتۂ زنار کا

کبھو بُت کو توڑا کبھو سجدہ گاہ
جلایا جگر گبر و دیندار کا

ترقی بھلا اور یہی دیکھیں ہم
تری شیخ تری کلکِ دربار کا

گنہ کچھ نہیں اس ستمگار کا
یہ باعث ہے سب میرے اظہار کا

پڑا بوجھ پھولوں کے جو بار کا
اڑا رنگ اس گل کے رخسار کا

مری قبر پر رکھیو نرگس کے پھول
کہ کشتہ ہوں اس چشمِ بیمار کا

نہیں داغ دل پر دیا ہے چراغ
خدا نے یہ مجھ کو شبِ تار کا

بہت سر کو ٹکرا کے مر جائیں گے
نہ کر بند رخنہ تو دیوار کا

تصور نے گل کے یہ تاثیر کی
قفس ہو گیا رشکِ گلزار کا

دمِ نزع کلمہ پڑھاتے ہو کیا
ہے وردِ زباں نام اس یار کا

اگر جان جاوے تو جراح کو
نہ دکھلاؤں زخم اس کی تلوار کا

مجھے دے گیا دل کی قیمت میں داغ
میں بندہ ہوں اپنے خریدار کا

اگر مجھ سے پوچھے کوئی وقتِ قتل
کہ مطلب ہے کیا تجھ گنہ گار کا

تو نکلے زباں سے یہی مری حرف
کہ تشنہ ہوں میں اس کے دیدار کا

ترقی کو نسبت نہ دو میر سے
یہ عالم کہاں اس کے اشعار کا

حشر کے دن بھی ہم سے کیا ہوگا
واں بھی اس کی طرف خدا ہوگا

گرہ زلف کھول اے شہِ حسن — صید اُس دام میں ہما ہوگا
بعد مدت خط اس کا آیا ہے — دل دھڑکتا ہے کیا لکھا ہوگا
جب ہمیں سے رہا وہ بیگانہ — پھر بھلا کس کا آشنا ہوگا
کچھ تو دیکھو کبابِ دل میرا — اس میں کچھ اور ہی مزا ہوگا
دل سے جو میرے تیری اُلفت ہے — جی میں تو اپنے جانتا ہوگا
تو عبث کہتا ہے کہ میری وہ — نزع میں راہ دیکھتا ہوگا
شور سا ہے اس کے گھر کی طرف — تیرا بیمار مر گیا ہوگا

سُن کے نالے مرے لگا کہنے
یہ ترقی ہے دل جلا ہوگا

ابرو ئے یار نے ہمیں مارا — تیغِ خم دار نے ہمیں مارا
یار سے کی مسیح نے فریاد — تیرے بیمار نے ہمیں مارا
آجکل پرسوں اور اترسوں روز — دن کی تکرار نے ہمیں مارا
قتل جس نے کیا زمانے کو — اسی خونخوار نے ہمیں مارا
اس کے در پر ہیں کشتوں کے پشتے — رشکِ اغیار نے ہمیں مارا
وصل کی آواز میں جان گئے — شوقِ دیدار نے ہمیں مارا
کل برہمن بچوں کا میلا تھا — ایک اوتار نے ہمیں مارا

اے ترقی نہ پوچھ حالتِ عشق
اسی آزار نے ہمیں مارا

نالہ جس کا اثر سے نکلے ہے — آہ میری جگر سے نکلے ہے
تو مکدر کرے گا دل میرا — صاف تیری نظر سے نکلے ہے
کھٹک اس کی مژہ کہ دل سے مرے — کب کسی نیچہ گر سے نکلے ہے
کان تک اس کے کوئی پہنچا دے — دُر مرے چشمِ تر سے نکلے ہے
تو نکل گھر سے ورنہ اے دلبر — دلِ بیتاب، بر سے نکلے ہے
ہے تماشائیوں سے رستہ بند — کون دیکھیں ادھر سے نکلے ہے
دشتِ غربت کی کیا کہوں آفت — خضرؑ بھی واں حضر سے نکلے ہے
خار جو پاؤں میں چبھے ہے آہ — رفتہ رفتہ وہ سر سے نکلے ہے

اے ترقی تو شام تک کس کے
جستجو میں سحر سے نکلے ہے

آنکھ اس کی حجاب کی سی ہے — آمد اس وقت خواب کی سی ہے
دل کا میرے ذرا مزا چکھیو — ساری لذت کباب کی سی ہے
بزم مے میں کبھی شریک تھے آپ — باس منہ میں شراب کی سی ہے
رُخ پہ اس کے نہیں نظر کو قرار — کیا چمک آفتاب کی سی ہے
اشک خوں کا پلک پہ ہر قطرہ — بوند گویا شراب کی سی ہے
لو مبارک ہو تم کو می خوارو — کچھ نمائش سحاب کی سی ہے
اس کے تن کی میں کیا کروں تعریف — بُو عرق میں گلاب کی سی ہے
جام تر می کی دیکھیو حالت — کیا چشم پر آب کی سی ہے
دیکھ تصویر قیس بولا یہ — مرے خانہ خراب کی سی ہے
دل مضطر کے میرے سب ترکیب — برق پر اضطراب کی سی ہے
ہاتھ ملتا ہوں اس کے محرم دیکھ — کیا نزاکت حباب کی سی ہے

یہ ترقی نے جو کہی ہے غزل
میر جی کے جواب کی سی ہے

فہرست مآخذ

۱۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ: ہندوستان کے بہترین کتاب خانوں میں ہر لحاظ سے سرِ فہرست ہے۔ اس کے مالک نواب خدا بخش خان بہادر (۱۹۰۸-۱۸۴۲ء) نے اسے ۱۸۹۱ء میں عوام کے لیے وقف کیا تھا۔ جب راقم الحروف جنوری ۱۹۸۱ء میں اُردو کے سب سے بڑے محقق جناب قاضی عبدالودود صاحب بار ایٹ لا کی دعوت پر پٹنہ گیا تھا تو کتاب خانے میں کئی دن تک کام کرنے کا موقع ملا۔ یہاں عربی، فارسی کے بیش بہا مخطوطات نہایت ہی اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ مخطوطات کے علاوہ مطبوعات کے قدیم نسخے بھی موجود ہیں۔ جو اب دستیاب نہیں ہیں۔ ان میں پرانے نادر اور نایاب رسائل بھی ہیں۔ اُردو مخطوطات زیادہ نہیں ہیں، لیکن جتنے بھی ہیں وہ نہایت ہی اہم اور مستند ہیں۔ کلیات سودا، کلیات میر حسن اور مثنوی سحر البیان وغیرہ کے نسخے خوبصورتی، صفائی اور فنِ خطاطی میں حیرت انگیز ہیں۔ کتاب خانے کا انتظام اعلےٰ درجے کا ہے۔ یہاں ہندوستانی اور بیرونی اسکالروں کا تانتا بندھا رہتا ہے، ان کے مطالعے کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ انھیں جس کتاب کی ضرورت ہوتی ہے فوراً پیش کی جاتی ہے۔ ناظم کتب خانہ جناب ڈاکٹر عابد رضا صاحب روزانہ دو تین مرتبہ اسکالروں سے پوچھنے آتے ہیں۔ کتب خانے میں بڑا ضبط و ربط۔ جناب قاضی صاحب اس ضعیفی میں جب کہ

ان کی عمر ۸۵ سال سے تجاوز کر گئی ہے کتاب خانے سے گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ بہر حال خدا بخش لائبریری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے یہاں ایسی نایاب اور قیمتی چیزیں ہیں کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ (۲) تذکرۂ ریاض الفصحا ص۵۴ مصحفی (۳) تذکرۂ نادر ص۴۶، بزم سخن ص۲۸ (۴) مخطوطہ گلشن بیخار مکتوبہ ۱۲۶۱ھ کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد (۵) گلشن ہمیشہ بہار ص۹۵ (۶) تذکرۂ خوش معرکہ زیبا قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی (۷) آبحیات ص۲۷۹ (۸) خوش معرکہ زیبا ص۱۸۴ (۹) قیصر التواریخ ص۲۶ جلد اوّل سید کمال الدین حیدر (۱۰) بزم سخن ص۲۸ سراپا سخن ص۵۶ (۱۱) محسن علی محسن، سخن شعرا ص۸۴ نساخ (۱۱) قیصر التواریخ ص۲۷، (۱۲) عمدۂ منتخبہ ص۱۶۸ (۱۳) قیصر التواریخ ص۱۹۱، تاریخ اودھ ص۳۰۹ جلد دوم مولوی نجم الغنی (۱۴) قیصر التواریخ ص۱۹۱ (۱۵) مخطوطہ گلشن بیخار، آبِ حیات ص۲۷۹ (۱۶) عمدۂ منتخبہ ص۱۶۸ (۱۷) ریاض الفصحا ص۵۴ (۱۸) مجموعۂ نغز ص۱۳۸ جلد اوّل (۱۹) مجموعۂ نغز ص۱۳۸ (۲۰) خوش معرکہ زیبا (قلمی) (۲۱) آبحیات ص۲۷۹ (۲۲) دیباچۂ مثنوی سحر البیان مطبوعہ ۱۸۰۳ء کلکتہ (۲۳) میرزا علی لفتی نام میرزا جو عرف، ترقی کے چھوٹے بھائی تھے (قیصر التواریخ ص۲۶ جلد اوّل) (۲۴) نواب آغا نصیر خان۔ ترقی کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی پرورش نواب صدر جہاں بیگم والدۂ نواب شجاع الدولہ بہادر نے کی تھی (قیصر التواریخ ص۲۶) (۲۵) سبقت تخلص نام مرزا مغل، والد کا نام مرزا اکبر علی۔ ان کے بزرگ ایرانی تھے لیکن خود سبقت لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اچھے شاعر تھے۔ ناسخ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ۱۲۲۹ھ (مطابق ۱۸۱۴ء) میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

مرزا مغل کہ بود دلا استادِ ما — امروز رفت سوئے جناں وا مصیبتا
کردیم بہر سال وفاتش چنیں رقم — شد میرزائے ما ز جہاں وا مصیبتا

۱۲۲۹ ہجری (خوش معرکہ زیبا)

ص۲۷۳ نسخۂ کراچی مرتبہ مشفق خواجہ،

(۲۶) فہرست مخطوطات ص۹۹ مرتبہ بلوم ہارٹ (۲۷) مجالس رنگین ص۴۶ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی (۲۸) آبحیات ص۲۷۹ (۲۹) مخطوطہ دیوانِ آتش (۳۰) تذکرۂ سراپا سخن ص۵۶ مرتبہ ڈاکٹر سلمان حسین (۳۱) مجموعہ نغز ص۱۵۷ جلد اوّل (۳۲) دیوان نامی ص۲۴۵ مرتبہ اکبر حیدری (۳۳) مخطوطہ گلشن بیخار (۳۴) فہرست مخطوطات اُردو نمبر ۲، ۱۷ ص۸۹ مطبوعہ ۱۹۲۶ء (۳۵) دیوان اسیر ص۴۸۰ مطبوعہ ۱۸۷۰ء (۳۶) کلیات نثر غالب ص۲۳۱ (۳۷) مجموعہ نغز ص۱۳۸ خمخانۂ جاوید ص۵۲ لالہ سری رام (۳۸) فہرست مخطوطات ص۸۹ مرتبہ بلوم ہارٹ۔

فنِ تاریخ گوئی اور اُردو میں اُس کی روایت

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اصطلاح میں کسی لفظ، لفظوں کے مجموعے، فقرے، عبارت، مصرعے، شعر، عبارت کے کسی ٹکڑے یا اشعار یا شعر کے جزو کی مدد سے سن ہجری یا عیسوی میں کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ نکالنے کو تاریخ گوئی یا فن تاریخ گوئی کہتے ہیں۔ واقعہ کے لیے کسی خاص واقعہ یا موضوع کی تخصیص نہیں ہے۔ ذاتی و غیر ذاتی، معاشرتی و تہذیبی، علمی و ادبی اور سیاسی و تاریخی، ہر قسم کے واقعات و موضوعات کی تاریخ نکالی جاسکتی ہے۔ بقول جلال لکھنوی:

"جاننا چاہیے کہ تاریخ لغت میں کسی چیز کے وقت ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور مورخین یعنی تاریخ گویوں کی اصطلاح میں کسی امرِ عظیم، اور واقعۂ قدیم و مشہور، مانند کسی بادشاہ کی سلطنت یا کسی فتنہ و فساد و جنگ و کارزار یا شادی و مرگ، یا بنائے عمارت و باغ وغیرہ و دیگر سوانح کی ابتدا کی مدت معین کرنے کو بولتے ہیں[1]"

لیکن تاریخ گویوں نے بالعموم "امرِ عظیم اور واقعہ قدیم و مشہور" کے شرط کی پابندی نہیں کی بلکہ معمولی معمولی واقعات و حالات کی تاریخیں بھی نظم و نثر دونوں میں کہی ہیں۔ صاحب خزانۂ عامرہ غلام علی آزاد بگرامی لکھتے ہیں کہ:

"اصطلاح میں تاریخ اُس کو کہتے ہیں کہ کوئی لفظ یا فقرہ، عبارت، مصرع یا بیت ایسی تجویز کریں کہ اس کے مکتوبی حروف کے عددوں سے بحساب جُمل سن اور سال کسی واقعہ شادی یا وفات کے معلوم ہوں یا نکاح، خواہ تولدِ فرزند، یا تصنیف کتاب، خواہ لڑائی یا بادشاہ کے جلوس یا اور امر کے وقوع کا زمانہ سمجھا جائے[2]"

تاریخ گوئی کا فن خاصا قدیم ہے اور دوسرے فنونِ ادبی کی طرح، عربی و فارسی کی معرفت اُردو تک پہنچا ہے۔ اس فن کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ کو مستقلاً محفوظ کر لینے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ پرانے سے پرانے، واقعہ کی تاریخ، اس کی مدد سے ذرا دیر میں آسکتی ہے اور دوسرے افادات کے ساتھ، تاریخ کے اس مروجہ عام میں بھی معاون ہو سکتی ہے جو اقوام و ملل کے حالات و واقعات کے نام سے مدارس و جامعات میں پڑھائی جاتی ہے۔ مختصر اًیوں

---

[1] مقدمہ افادۂ تاریخ ص ۲ مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ مطبوعہ ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء

[2] بحوالہ بحر الفصاحت ص ۹۰۵ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۶ء۔

سمجھنا چاہیے کہ کسی واقعہ کی تاریخ وقوع کو لفظوں کے ذریعے دائماً محفوظ کر لینے کا نام فنِ تاریخ گوئی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو نیاز فتح پوری کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو، البتہ اُسے اس کا علم ہو کہ ان کا تاریخی نام "لیاقت علی خاں" تھا وہ شخص اس نام کی مدد سے ان کا سال پیدائش معلوم کر سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس فن میں حروف سے اعداد کا بھی کام لیا جاتا ہے، یعنی ہر حرف کا ایک خاص عدد مقرر ہے اور جب متعلقہ حروف کے اعداد جمع کر دیتے ہیں تو مطلوبہ تاریخ برآمد ہو جاتی ہے، چنانچہ اُوپر کی مثال میں لیاقت علی خاں" کے حرفوں کے اعداد، فنِ تاریخ گوئی کے مطابق، اس طور پر بنتے ہیں:

ل+ی + ا +ق+ت + ع+ل +ی + خ + ا+ن = لیاقت علی خاں

۳۰ + ۱۰ + ۱ + ۱۰۰+۴۰۰ + ۷۰+۳۰ +۱۰+۶۰۰ + ۱+۵۰ = ۱۳۰۲

گویا اس نام کے ذریعے معلوم کر لیا گیا کہ نیاز فتح پوری کی تاریخ پیدائش ۱۳۰۲ھ ہے۔ تاریخ نکالنے کا یہ طریقہ، جیسا کہ عرض کیا گیا، بہت قدیم ہے" یہ ضرور ہے کہ اب اسے وہ مقبولیت نہیں رہی جو پہلے تھی، پھر بھی اس سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ابھی موجود ہے۔ اس دلچسپی کے دو خاص سبب ہیں، ایک تو یہی، اپنی ضرورت کی تاریخ کو آسانی سے محفوظ کر سکتے ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ ہمارے اسلاف عام طور پر قابلِ ذکر واقعات کی تاریخوں کا تحفظ اسی شکل میں کرتے تھے، ایسے میں جب تک، آج کا کوئی ادیب یا محقق اس فن کے رموز و اصول سے واقفیت نہ رکھتا ہو وہ کسی واقعے کی تاریخ یا سن کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ چونکہ ہمارے ادیبوں کی نئی نسل علم عروض و قافیہ اور بیان و بدیع اور تاریخ گوئی کے فن سے بھی عموماً ناواقف ہے اور جو اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی پرانے طرز پر لکھی ہوئی کتابوں سے، فارسی و عربی الفاظ و تراکیب سے آراستہ اور ثقیل و پُر پیچ ہونے کے سبب بد کتے ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس فن کا سادہ طریقے سے تاریخی جائزہ بھی لیا جائے اور اس کے قواعد و اصول بھی آسان صورت میں واضح کیے جائیں۔

فنِ تاریخ گوئی کی بنا، حقیقت میں عربی کے حروفِ تہجی پر رکھی گئی ہے۔ یہ حروف تعداد میں اٹھائیس ہیں اور ان کی موجودہ ترتیب اس طور پر ہے:-

ا، ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

لیکن کسی زمانے میں ان حروف کی ترتیب اس سے مختلف مندرجہ ذیل شکل میں تھی:

ا، ب، ج، د، ہ، و، ز، ح، ط، ی، ک، ل، م، ن، س، ع، ف، ص، ق، ر، ش، ت، ث، خ، ذ، ض، ظ، غ۔

اِن حرفوں کو مندرجہ ذیل آٹھ کلمات میں مرتب کر لیا گیا تھا تاکہ اُنھیں ذہن میں بآسانی محفوظ رکھا جا سکے۔

۱۔ ابجد = ا، ب، ج، د

۲۔ ہوز = ہ، و، ز

۳۔ حُطّی = ح ، ط ، ی
۴۔ کلمن = ک ، ل ، م ، ن
۵۔ سعفص = س ، ع ، ف ، ص
۶۔ قرشت = ق ، ر ، ش ، ت
۷۔ ثخذ = ث ، خ ، ذ
۸۔ ضظغ = ض ، ظ ، غ

چونکہ ان کلمات کا پہلا لفظ "ابجد" ہے اس لیے عربی کے حروف تہجی کو دوسرے لفظوں میں ابجد سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ علوم و فنون میں ان سے حساب و اعداد کا بھی کام لیا جاتا ہے اس لیے حروف جمل بھی کہلاتے ہیں۔ ابجد، ہوّز کے اِن آٹھ کلمات کی ایجاد کے بارے میں عربی، فارسی اور اُردو کی مختلف فنی کتب اور لغات میں، عجیب و غریب روایات ملتی ہیں، جو روایتیں تکرار نظر آتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ ابوجد یا ابا جاد، نامی ایک بادشاہ گذرا ہے۔ اسی کا محفف "ابجد" ہے، باقی سات کلمات کا تعلق، اس کے سات بیٹوں کے ناموں سے ہے۔
۲۔ مرامر نامی کوئی شخص تھا جس نے رسم الخط ایجاد کیا تھا اور یہ آٹھوں کلمات اُس کے آٹھ بیٹوں کے نام سے ہیں۔
۳۔ بعض کے نزدیک ان کلمات کے حروف خاص ترتیب اور مفہوم کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئے، جنھیں ترتیب دے کر حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ آٹھ کلمات بنا لیے۔
۴۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کلمات کو مَدیَن کے چھ بادشاہوں نے ایجاد و مرتب کیا تھا۔
۵۔ بعض نے ان کلمات کو مختلف دیووں، شیطانوں اور دنوں کے ناموں سے منسوب کیا ہے۔

علامہ فتح پوری نے "ابجد کی ایجاد" کے عنوان سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے جو رائے ظاہر کی ہے اس کے مطابق ان کلمات کی ایجاد و اختراع کے بارے میں اس طرح کی جتنی روایتیں ملتی ہیں، سب بے دلیل و بے بنیاد ہیں، ان کے لفظوں میں: "یہ سارے بیانات لغو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے حروف ہجا عبرانی اور آرمائی زبان سے حاصل کئے اور چونکہ وہاں یہی ترتیب تھی، جو ابجد، ہوّز وغیرہ میں پائی جاتی ہے اس لیے عربوں نے بھی اُسے بجنسہٖ لے لیا، بعد کو البتہ اس ترتیب میں بلحاظ اسلوب تحریر و مخارج کچھ فرق ہو گیا۔[1]"

"ابجد" کی تشریح کرتے ہوئے اس کی ایجاد و اختراع کے بارے میں کم و بیش اسی قسم کا حکم ان کلمات کے بارے میں دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مرتبین نے لگایا ہے۔[2]

---

[1] نگار (لکھنؤ) معلومات نمبر ص ۱۰۴ بابت جنوری فروری ۱۹۵۸ء۔
[2] دائرہ معارف اسلامیہ جلد اوّل ص ۳۳۷ مطبوعہ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۴ء طبع اوّل۔

ابجد، ہوز کی ایجاد کی طرح، ان کلمات کے معانی بھی مختلف لغت نویسوں اور فنِ تاریخ گوئی پر بحث کرنے والوں نے الگ الگ لکھے ہیں، لیکن ان میں سے معانی کی ایک روایت بہت عام ہے۔ اور مختلف کتب و لغات میں اس طور پر منقول ہوئی ہے:

ابجد = آغاز کرد

ہوّز = در پیوست

حُطّی = واقف گشت

کلمن = سخن گو شُد

سعفص = زود بیا موخت

قرشت = ترتیب کرد

ثخذ = در دل گرفت

ضظغ = تمام کرد[۲]

ابجد ہوّز کے جن آٹھ کلمات کا ذکر اُوپر کیا گیا، ان میں سے ہر حرف کی قیمت یا اعداد بحساب جُمل مقرر ہیں، اور یہ ذیل کے مطابق ہیں:

(۱) ابجد

ا = ۱

ب = ۲

ج = ۳

د = ۴

(۲) ہوّز

ہ = ۵

و = ۶

ز = ۷

(۳) حُطّی

ح = ۸

ط = ۹

ی = ۱۰

(۴) کلمن

ک = ۲۰

ل = ۳۰

م = ۴۰

ن = ۵۰

---

[۲] مخزن الفوائد - ص ۳، از مہدی حسین ناصری - مطبوعہ مشن پریس، الہ آباد، ۱۹۲۲ء طبع اوّل

(۵) سعفص
- س = ۶۰
- ع = ۷۰
- ف = ۸۰
- ص = ۹۰

(۶) قرشت
- ق = ۱۰۰
- ر = ۲۰۰
- ش = ۳۰۰
- ت = ۴۰۰

(۷) ثخذ
- ث = ۵۰۰
- خ = ۶۰۰
- ذ = ۷۰۰

(۸) ضظغ
- ض = ۸۰۰
- ظ = ۹۰۰
- غ = ۱۰۰۰

عربی میں فارسی کے حروف پ، چ، ژ اور گ نہیں ہیں، یہی صورت ہندی اور اُردو کے حروف ٹ، ڈ اور ڑ کی ہے۔ اس لیے ان کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ اِن حرفوں کی قیمت اُردو حروف تہجی میں، اِن حرفوں سے قبل آنے والے حرف کی قیمت کے مطابق مقرر کر دی گئی ہے چنانچہ:

پ = ب = ۲

ٹ = ت = ۴۰۰

چ = ج = ۳

ڈ = د = ۴

ڑ = ر = ۲۰۰

ژ = ز = ۷

گ = ک = ۲۰

حروف کی مندرجہ بالا قیمتیں یا اُن کے اِعداد معلوم ہوں اور وہ خاص فقرہ یا مادۂ تاریخ بھی سامنے ہو جس سے تاریخ نکالی گئی ہے تو اُس کے حروف کے اعداد کو جمع کر کے مطلوبہ تاریخ حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اعداد شمار کرنے کے بھی کچھ اصُول وضوابط ہیں اور جب تک وہ ذہن میں نہ ہوں تاریخی مصرع یا فقرے سے صحیح تاریخ کا برآمد کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے ان کی تفصیل کا جاننا بھی ازبس ضروری ہے۔ اہم اصُول جن پر تقریباً سارے محققین اور اہلِ فن متفق ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ صرف اُن حروف کے اِعداد شمار کیے جاتے ہیں جو مکتوبی ہوتے ہیں یعنی مادۂ تاریخ کی کتابت میں شامل ہوتے ہیں خواہ، پڑھنے میں، اُن کا تلفظ سے کوئی تعلق نہ ہو، مثلاً

ا: الرحمٰن اور عبدالرشید میں، ا ل کے اِعداد شمار ہوں گے حالانکہ یہ پڑھنے میں نہیں آتے۔

ب: خوش اور خواب میں "و" کے اِعداد لیے جائیں گے۔ اگر تلفظ میں یہ ظاہر نہیں ہوتا۔

ج : عربی کے بعض فقروں مثلاً "امنوا اور قالوا وغیرہ کے آخر میں جو الف آتا ہے، ہرچند کہ تلفظ میں ادا نہیں کیا جاتا لیکن ان کا عدد لیا جائے گا۔

د : چہ، اگرچہ، نہ اور فسانہ، وغیرہ کا آخری حرف ہائے ہوز، تلفظ میں ادا نہیں کیا جاتا، لیکن چونکہ مکتوبی ہے اس لیے اس کے عدد لیے جائیں گے۔

س : بھ، جھ، تھ وغیرہ کی بھی یہی صورت ہے، ان ہائے مخلوط اگرچہ الگ سے واضح آواز نہیں دیتی پھر بھی مکتوبی ہونے کے سبب حساب میں شامل کی جائے گی۔

ک : سنگ، جنگ اور رنگ میں "نون" پڑھنے میں بہت واضح نہیں ہے مگر چونکہ لکھا گیا ہے اس لیے شمار کیا جائے گا۔

ل : عربی کے فقروں میں جیسے رفانسر: واقتلواھو وغیرہ کا الف شمار ہوگا۔ کہ تلفظ میں نہ آنے کے باوجود مکتوبی ہے۔

م : فارسی تراکیب مثلاً مثلاً دل وجاں و رسم و راہ کا حرف عطف "واو" اکثر پڑھنے میں نہیں آتا لیکن محسوب کیا جائے گا۔

یوں سمجھنا چاہیے تاریخ گوئی کے فن میں حروف کا شمار، اصول تقطیع یا فن عروض کے بالکل برعکس ہے، عروض یا تقطیع کی بنیاد، ملفوظ الفاظ پر ہے یعنی وہ ساری آوازیں تقطیع میں شمار ہوں گی۔ جو کسی لفظ کے تلفظ میں شامل ہیں، خواہ املا میں ان کا اظہار ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس کے برعکس تاریخ نکالنے میں وہ سارے حروف محسوب ہوں گے، جو کسی لفظ کے املا میں آتے ہیں، خواہ تلفظ سے خارج ہی کیوں نہ ہوں۔

البتہ، بعض الفاظ اُردو میں، ایسے نظر آئیں گے جن میں اگرچہ کوئی حرف کسی نہ کسی شکل میں اُوپر یا نیچے، یا شروع اور آخر میں مکتوب ہوتا ہے، اس کے باوجود اس کے اعداد شمار نہیں کئے جاتے، وجہ یہ ہے کہ اُردو میں تاریخ گوئی کی اساس، عربی املا ہے اور عربی الفاظ کے املا میں، اس قسم کے حروف بطور اصلی شمار نہیں کئے جاتے، اسی لیے

(ا) عیسیٰ اور موسیٰ سموات وغیرہ کی 'ی' پر جو الف لکھا گیا ہے، وہ تاریخ گوئی میں محسوب نہ ہوگا۔

(ب) خرّم، فرّخ، کلّن وغیرہ کے حرف وسط پر اگرچہ تشدید ہے اور یہ دوبار پڑھنے میں آتے ہیں لیکن چونکہ دوبار مکتوب نہیں ہوئے اس لیے شمار نہیں ہوں گے۔

(ج) آب، آم، آگ وغیرہ کے شروع کا الف، مد کے ساتھ آیا ہے یعنی ممدودہ ہے اور تلفظ میں بھی مکرر آتا ہے۔ مگر چونکہ دوبار نہیں لکھا جاتا اس لیے صرف ایک لفظ شمار ہوگا۔

(د) ہمزہ، عربی کے حروف تہجی میں شامل نہیں، اس لیے اصولاً اور عموماً اس کا کوئی عدد محسوب نہ ہوگا۔ لیکن عربی، فارسی اور اُردو میں چونکہ ہمزہ، سیکڑوں الفاظ میں مستقل حرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے اس لیے جن الفاظ میں ہمزہ، تلفظ کے اعتبار سے 'ی' کا قائم مقام ہوگا اور اس کے اظہار کے لیے ہمزہ کے نشان کے علاوہ ان کے املا میں کوئی شوشہ یا دندانہ بنایا جائے گا، اُن کے ہمزہ کے دس لفظ لیے جائیں گے۔ مثلاً "آئینہ" کے لفظ کو لے لیجئے۔ اس میں ہمزہ، چونکہ 'ی'

کا قائم مقام اور مستقل حرف کے طور پر، دندانے کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس لیے اس لفظ کو "آئینہ" منصور کیا جائے گا اور اس میں حرف "ی" کے اعداد دو بار شمار ہوں گے۔ چنانچہ جلال لکھنوی نے بہت واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ:

"ہمزہ کا ایک عدد لینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ غلط بلکہ اغلط ہے کہ مؤرخین ثقات نے کبھی ہمزہ کا کوئی عدد تاریخ میں نہیں لیا، یائے معروف جس پر ہمزہ یعنی خطِ منحنی لکھ دیتے ہیں، عربی کی ہو خواہ فارسی کی، خواہ ہندی کی، اس کے بیس عدد لیے جائیں گے۔ اس لیے جب کسرۂ ماقبل، اس کا اشباع پائے گا، وہ دوسری "یا" ہو جائے گا اور کتابت بھی دو یاؤں سے چاہیئے جیسے مائی، ہوائی، خدائی، رہائی، آئی، بنائی، دکھائی، گئی، کئی بمعنی چند، نئی بمعنی نو، ہوئی وغیرہ کی یائے معروف کے بیس اعداد لیے جائیں گے اور یائے مجہول کے عدد، خواہ اس پر ہمزہ لکھا جائے خواہ نہ لکھا جائے دس عدد لیے جائیں گے جیسے جائے، خدائے، صفائے، آئے، پائے، لائے، کی "جائے مجہول کے عدد دس لیے جائیں گے"[1]

یہی کیفیت قائد، دائم، قائم، صنائع، مائع، شنائع، صنائع، بدائع، ذرائع، نائب، جائز، شائستہ، غائر، تائب، صائب، غائب، خائف، تحائف، کوائف، لطائف، غرائب، عجائب، زائد، فائز، نائلہ، رئیس، سئیس، شاید، تائید، عنایت، رعایت، زائر، دائر، سائل، قائل، حائل، مائدہ، طائفہ، لائقہ، فائقہ، فائدہ، بلائیں، سنائیں، دکھائیں، بیوائیں، جائیے، چاہیئے، لائیے، سوئیے، رویئے، شائقِ، معائنہ، مضائقہ، چھوئیں، بوئیں، دھوئیں، سائبان، رائیگاں، شرائط، جزائر، نقائص، مسائل، قرائن، نائن، ذائقہ، لائق، فائق، آرائش، زیبائش کے قبیل کے بے شمار الفاظ کی ہے کہ ان میں ہمزہ بطور حرفِ مستقل، شوشے یا دندانے کے ساتھ آیا ہے اس لیے اس کے دس عدد لیے جائیں گے۔

مندرجہ بالا مثالوں کے برعکس علماء، فقراء، شعراء، انشاء، جاؤ، کھاؤ، لاؤ، آئے جائے، کھائے، بندۂ خدا، دیدۂ نم، نامۂ شوق، نالۂ دل، حوصلۂ دل، عمدۂ منتخبۂ تذکرۂ شعراء اور اس کے بہت سے الفاظ کا ہمزہ محسوب نہ ہوگا کہ ان میں، اس کی حیثیت، نہ تو حرف زائد کی ہے اور اس کے لیے کوئی شوشہ یا دندانہ استعمال کیا گیا ہے۔

بعض تاریخ گویوں نے اس قیاس پر ہمزہ، عربی کے بعض الفاظ میں، کہیں الف کا قائم مقام ہوتا ہے کہیں "ی" کا اور کہیں واو کا، کبھی اس کا ایک عدد لیا ہے، کبھی دس اور پانچ اعداد شمار کئے ہیں، لیکن جیسا کہ جلال کا قول، اوپر گذر چکا ہے، کسی طرح درست نہیں، بلکہ غلط محض ہے۔ اصلاً، ہمزہ کے اعداد شمار کرنے کا وہی اصول درست ہے جس کی تفصیل اوپر دی جا چکی ہے۔ یعنی ہمزہ کے صرف دس عدد، "ی" کے بدل کے طور پر، اس وقت لیے جائیں گے جب کہ اسے مستقل حرف کی حیثیت سے دندانے کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہو۔

---

[1] افادۂ تاریخ ص ۱۲

(س) تائے قرشت یعنی "ت" کے اعداد صریحاً چار سو ہیں اور یہی محسوب ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی بعض تاریخ گویوں نے غلطیاں کی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عربی رسم الخط میں "ت" کو دائرے کی صورت میں بھی لکھا جاتا ہے اور یہ تائے مدوّرہ کہلاتی ہے، املا میں، اس کی شکل، کہیں کہیں ہائے ہوز کی شکلوں سے بھی مشابہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخ نکالنے والوں میں سے بعض نے "ت" کے ہر صورت میں چار سو شمار کئے، بعض نے ہائے ہوز قیاس کر کے صرف پانچ عدد لیے ہیں اور بعض نے حسبِ ضرورت من مانی کی ہے، یعنی کبھی چار سیکڑے لے لیے ہیں اور کبھی صرف پانچ عدد ــــ حالانکہ غلام علی آزاد بلگرامی اور جلال لکھنوی جیسے اساتذۂ فن کا فیصلہ یہ ہے کہ تائے قرشت اگر املا یعنی الفاظ مکتوبی میں اپنی آواز اور نقطوں کے ساتھ آئے تو، بہر صورت اس کے چار سو اعداد شمار ہوں گے۔ ورنہ صرف پانچ[1]۔ لیکن جو لوگ عربی سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ تائے قرشت، ہائے ہوز کی شکل میں لکھی جاتی ہے۔

(ا) علامت تانیث کے طور پر والدہ اور عالمہ وغیرہ میں۔

(ب) مثل تائے مصدری جیسے تذکرہ اور مقابلہ وغیرہ میں،

(ج) تائے مدوّرہ کی شکل میں جیسے عمدہ اور ذرّہ وغیرہ میں۔

اُنھوں نے تائے قرشت کی آواز اور نقطوں کو نظر انداز کر کے اس قسم کے الفاظ کی "ت" کو بھی، حالانکہ یہاں اس کی مکتوبی صورت واضح طور پر ہائے ہوز کی ہے اور اس کی آواز بھی کہیں ظاہر نہیں ہوتی، تائے دراز متصور کر کے چار سو اعداد محسوب کئے۔ یہ غلط اور صریحاً غلط ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فن تاریخ گوئی یا جمل کی اساس حروف مکتوبی پر ہے، تلفظ پر نہیں ہے۔

اُردو املا میں بھی عربی کی طرح تائے قرشت کی وہی شکلیں بنتی ہیں جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔ یعنی بہت سے الفاظ میں وہ ہائے ہوز کی طرح لکھی جاتی ہے اور خاموش ہوتی ہے جیسے روضہ، مدینہ، مشورہ، عمدہ، خزینہ اور تذکرہ وغیرہ میں یا فارسی کے مرکبات اضافی و توصیفی میں جیسے دائرۂ انتخاب، تذکرۂ شعراء، سورۂ رحمان، مقابلۂ حسن، مشورۂ سخن اور نسخۂ کیمیا وغیرہ میں، چونکہ ان الفاظ میں "ت" کو ہائے ہوز کی صورت میں لکھا گیا ہے اور حساب جمل کا مدار لکھنے پر ہے اس لیے ان میں "ت" کو "ہ" سمجھا جائے گا اور اس کے صرف پانچ عدد لیے جائیں گے۔ عربی مرکبات میں بھی جہاں اس قسم کے الفاظ، بطور صفت یا مضاف آتے ہیں اور ان میں تائے قرشت بغیر نقطوں کے "ہ" کی صورت میں لکھی جاتی ہے اور خاموش رہتی ہے، جیسے کتاب العمدہ اور بنت الفاطمہ وغیرہ، وہاں بھی اُسے ہائے ہوز متصور کر کے صرف پانچ عدد محسوب ہو گئے۔ البتہ اس نوع کے مرکبات میں جہاں یہ الفاظ بطور موصوف اور مضاف الیہ مستعمل ہوئے جیسے خزینۃ العلوم، سفینۃ الاولیاء، مراۃ الغیب اور عمدۃ الانتخاب وغیرہ میں، تو، ان میں تائے قرشت کے چار سو اعداد ہی لیے جائیں گے، صرف اس وجہ سے مدوّرہ ہونے کے باوصف نقطے

---

[1] افادۂ تاریخ ص ۱۲ خزانۂ عامرہ ص ۳۳۰ مطبوعہ نول کشور۔

اور آواز کے ساتھ مکتوب ہوتی ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یوں ہوا کہ :

ا ۔ "ت" کا حرف آواز اور نقطوں سے مشروط ہے۔ اس لیے مکتوبی صورت میں، جب دو نقطے ہوں گے اور یہ اپنی آواز ظاہر کرے گا تو اس کے چار سو لیے جائیں گے، خواہ اُسے کسی شکل میں بھی لکھا جائے۔

(ب) اس کے برعکس اگر "ت" کی آواز خاموش ہوئی اور اس پر نقطے بھی نہ ہوئے تو اسے ہائے ہوز ہی سمجھا جائے گا، اور اس کے صرف پانچ عدد لیے جائیں گے۔

تاریخیں دو طریقے سے نکالی جاتی ہیں

(۱) صوری

(۲) معنوی

صوری طریقہ سے مُراد، ایسا اسلوب تاریخ گوئی ہے جس میں مطلوبہ تاریخ یا سال کو واضح الفاظ کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہو اور حرفوں کے اعداد محسوب کرنے کی ضرورت نہ ہو مثلاً شیخ سعدی نے اپنی مشہور تصنیف "گلستان" کی تاریخ اس طور پر کہی :-

دراں مدت کہ ما را وقت خوش بود
زہجرت ششصد و پنجاہ و شش بود

اِس کے دوسرے مصرعے میں واضح لفظوں میں ظاہر کر دیا گیا ہے کہ "گلستان" کا سال تصنیف ۶۵۶ھ ہے۔

لیکن معنوی تاریخ، اِس کے برعکس، حساب جُمل سے یعنی حروف کے اعداد کے ذریعے نکالی جاتی ہے اور در اصل طریقۂ تاریخ گوئی کو فنِ تاریخ گوئی کہتے ہیں۔ یہ طریقہ اولاً سیدھا سادہ تھا اور مادّہ تاریخ کے سارے حُروف کو جمع کر کے تاریخ نکل آتی تھی، یہ طریقہ، آج بھی عام ہے اور حق یہ ہے کہ اسی طریقے سے ہزاروں، خوبصورت، آسان، مختصر اور واقعہ کی نسبت سے موزوں ترین تاریخیں نکالی گئی ہیں۔ مثلاً غنی کشمیری نے ابوطالب کلیم کی وفات یوں کہی :

طور معنی بود روشن از کلیم = ۱۰۶۱ھ

میر علی اوسط رشک نے ناسخ کے اِنتقال پر کہا،

مرقدِ ناسخ اِعجاز بیاں واویلا = ۱۲۵۲ھ

ضامن علی جلال لکھنوی نے میر اُنیس کی وفات پر کہا :

مُرد ہے ہے سخن درِ کامل = ۱۲۹۱ھ

سرکشن پرشاد نے داغ دہلوی کی تاریخ وفات یوں لکھی :

دِلّی کا چراغ بُجھ گیا آہ = ۱۳۲۲ھ

لیکن بعد کو علم بدیع کے حوالے سے، تاریخ گوئی فن میں بھی طرح طرح صنعتوں اور بدعتوں سے کام لیا گیا۔ چنانچہ فنِ تاریخ

اور علم بدیع کی بعض کتابوں میں ان کی تفصیلات سے بحث کی گئی، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان سب میں سے بعض صنعتیں ایک طرح کا گورکھ دھندا ہیں، مغت کی محنت و ریاضت، نہ زبان میں دلکشی نہ بیان میں لذت، نہ واقعہ مذکور سے کوئی تعلق اور نہ موضوع سے کوئی نسبت، ذہنی مشقت اور کوہ کندن کاہ برآوردن کا صحیح اطلاق انھیں پر ہوتا ہے، پھر اساتذۂ قدیم نے انھیں ایسی عبارت آرائی اور فارسی امثال کے ساتھ، بالعموم بیان کیا گیا ہے کہ خاص خاص کے سوا، کوئی دوسرا اُن سے پوری طرح استفادہ نہیں کر سکتا۔ اس جگہ ساری جزئیات سے بحث کرنا اور خواہ مخواہ مضمون کو طول دینا مناسب نہ ہوگا، پھر بھی، جو طریقے، عام طور پر مروج ہیں اور آج بھی برتے جاتے ہیں اور پرانوں نے بھی ان میں اچھی اچھی تاریخیں کہی ہیں ان کا ذکر اس جگہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ حرف نقطہ دار، یعنی حروفِ منقوطہ کی مدد سے تاریخ نکالی جائے جیسے کلیاتِ قدر بلگرامی کی تاریخِ طباعت قیام الدین نیرؔ نے اس طور پر کہی:-

"نظمِ قدرِ بلگرامی بہتر از دُرِ یتیم"

اس مصرعے کے حروف منقوطہ یعنی ن، ظ، ق، ب، ی، ب، ت، ز، ی، ت اوری سے ۱۸۹۱ء برآمد ہوتے ہیں، تاریخ گوئی کے اس طریقہ کار کو صنعتِ معجمہ یا صنعتِ منقوطہ یا صنعتِ اعجام کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ کبھی صرف غیر منقوطہ حروف کے اعداد محسوب کئے جاتے ہیں، جیسے جلال لکھنوی کے ایک شاگرد نے ان کے دیوانِ اوّل کی تاریخ طباعت اس مصرعے سے نکالی ہے کہ:

سرورِ ہر دلِ والا گہر، گہر اس کو کہہ = ۱۳۰۰ھ

اس طریقۂ کار کو صنعتِ مہملہ یا صنعتِ غیر منقوطہ یا صنعتِ اہمال سے موسوم کیا جاتا ہے، کبھی صنعتِ مہملہ و معجمہ کو یکجا کر دیتے ہیں، یعنی کوئی شعر یا قطعہ و مصرع ایسا کہتے ہیں جس کے حروف منقوطہ سے بھی تاریخ نکلتی ہو اور غیر منقوطہ سے بھی؛

۳۔ زبر و بینات بھی تاریخ گوئی کی ایک صنعت ہے بلکہ اس کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اہلِ جمل نے حروف کی تین خاص قسمیں کی ہیں۔

(ا) ایسے حروف کو کہتے ہیں جن کے تلفظ کے آخر میں، عربی و فارسی کے مطابق، الف آتا ہے۔ جیسے ب، ت، ث، ح، خ، ر، ز، ذ، ط، ظ، ف، ہ اوری جن کا تلفظ عربی و فارسی میں با، تا، ثا، حا، خا، را، زا، طا، ظا، فا، ہا اور یا" کہا جاتا ہے۔ ان حروف کو اصطلاح میں حروف مسروری کہتے ہیں۔

(ب) ایسے حروف جن میں اصل حرف کی آواز کے ساتھ تلفظ میں بعض دوسری آوازیں یا حروف بھی شامل ہو جاتے ہیں مثلاً ا، ج، د، ذ، س، ش، ص، ض، ع، غ، ف، ق اور ل، جن کو تلفظ، الف، جیم، دال، ذال، سین، شین، صاد، ضاد، عین، غین، قاف، کاف اور لام کہا جاتا ہے۔ ان کا اصطلاحی نام حروف ملفوظی ہے۔

(ج) تین حرف م، ن اور "و" کو مکتوبی کہلاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب یہ ملفوظی صورت یعنی میم، نون، واو، کی شکل میں لکھے جاتے ہیں تو ان کے تلفظ کے شروع اور آخر میں گھوم پھر کر، وہی حرف اصلی آجاتا ہے۔ چنانچہ اگر صرف پہلے قسم

کے حروف کی مدد سے تاریخ نکلتی ہے تو وہ صنعتِ مسروری کہلائے گی، صرف دوسرے قسم کے حروف برآمد کی جائے گی تو صنعت ملفوظی کا نام پائے گی اور صرف تیسری قسم کے حروف محسوب کیے جائیں گے تو صنعتِ مکتوبی کہا جائے گا لیکن حروف کی ان اقسام سے جو بہت مشہور طرز تاریخ گوئی نکالا گیا ہے اور وہ زبر و بنیات کہلاتا ہے اور اس کی صورت یوں ہے کہ اہل جمل

۱۔ اصل حرف کے پہلے حرف کے اعداد کو زبر کہتے ہیں مثلاً اوپر کے ہر گروہ سے باعتبار تلفظ ایک ایک حرف، با، الف اور جیم کو لیجیے، ان کے پہلے حرف یعنی ب، ا اور ج کے اعداد زبر کہلاتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی تاریخ، صرف ان کی مدد سے نکالی جائے گی تو وہ زبر کہلائے گی۔

۲۔ زبر کے علاوہ، جو حروف کسی حرف کے تلفظ میں شامل ہوتے ہیں وہ بنیات کہلاتے ہیں، مثلاً اوپر کے تین حروف با، الف اور جیم میں اگر "ب، ا، اور "ج" کے اعداد کو چھوڑ کر "ا، ل، ف اور "ی م" کے اعداد بنیات کہلائیں گے اور اگر صرف اسی سے تاریخ نکالی گئی ہے تو وہ بنیات سے موسوم ہوگی۔

۳۔ البتہ جب مادۂ تاریخ میں زبر و بنیات، دونوں قسم کے حروف کے اعداد شمار کئے جائیں گے۔ تو اسے زبر و بنیات کا نام دیا جائے گا، جیسے دیوانِ داغ "مہتاب داغ" کی تاریخ میری مہدی حسن الم نے ایک قطعہ میں اس طرح کہی ہے:

چھپ چکا استاد کا دیوان جب — عیسوی تاریخ الم نے یوں کہی
بنیات و زبر میں دیکھو عدد — "گلشنِ بے خار ہے دیوان یہی"

= ۱۹۹۸ء

یا جلال لکھنوی کے ایک شاگرد یاس نے، ان کے دیوان اول کے خاتمہ کی تاریخ اس طرح کہی ہے کہ

سالش زبر و بنیات است — دیوانِ جمال با کمال ایں

۱۳۰۰ھ

صنعت زبر و بنیات کے لیے ضروری ہے مادۂ تاریخ کے سارے زبر و بنیات کے اعداد محسوب کئے جائیں، یہ صورت ناقص ہوگی کہ بعض زبر و بنیات کے اعداد لیے جائیں اور بعض کے نظر انداز کر دیئے جائیں۔ جلال لکھنوی نے لکھا ہے کہ

"یہ جائز نہیں کہ بعض بنیات کو لے لیں اور بعض کو ترک کریں جیسا کہ مرزا سلامت علی دبیر مغفور مرثیہ گو مشہور نے میر ببر علی انیس مرحوم کی وفات کی تاریخ زبر و بنیات میں فرمائی ہے اور وہ یہ ہے:

طورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

۱۲۹۱ھ

اور یہی کیا ہے کہ بعض بنیات کو اخذ کیا ہے اور بعض کو ترک، پس یہ مؤلف[1]۔

---

[1] مادۂ تاریخ ص ۶، نگار، تاریخ نمبر جولائی ۱۹۲۳ء

ہیچ مداں کے نزدیک کسی طرح جائز نہیں ہے، اساتذہ میں ایسا کبھی کسی نے نہیں کیا۔"

(۴) "تاریخ گوئی کا ایک اور مشہور طریقہ یہ ہے کہ مادۂ تاریخ میں، کچھ اعداد کم یا زائد ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کمی کو پورا کرنے یا زائد کو خارج کرنے کا کوئی اشارہ، اس میں موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی اشارے مطابق مادۂ تاریخ کے مجموعی اعداد سے اشارہ کردہ حروف کے اعداد کو خارج کر دیتے ہیں یا ضرورت ہوئی تو جمع کر دیتے ہیں۔ اعداد کم ہوئے تو مادۂ تاریخ ناقص کہلاتا ہے اور زائد ہوئے تو زائد الاعداد۔ گویا، اس طریقۂ کار کی دو قسمیں ہیں:

(و) ایک کا اصطلاحی نام تعمیہ تدخلہ ہے۔ اس میں بعض حروف کے اعداد مادۂ تاریخ کے اعداد میں داخل یا جمع کئے جاتے ہیں جیسے مظہر جان جاناں کی شہادت پر سودا نے مندرجہ ذیل رباعی بطور تاریخ وفات کہی کہ ؎

مظہر کا ہوا جو قتل اک مرتد شوم — اور اُن کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ وفات اُن کی کہی بروئے درد — سودا نے کہ "ہائے جانِ جاناں مظلوم"

چوتھے مصرعے کے ٹکڑے "ہائے جانِ جاناں مظلوم" کے اعداد گیارہ سو اکانوے ہوتے ہیں، لیکن تیسرے مصرعے کے "بروئے درد" میں یہ اشارہ موجود ہے کہ "درد" کے چہرے یعنی حرف اوّل "دال" کے چار اعداد اس میں شامل کئے جائیں۔ اس طرح تاریخ وفات کا سال ۱۱۹۵ھ نکل آیا۔

اسی طرح قربان علی بیگ سالک نے مومن خاں مومن کی تاریخ وفات کے سلسلے میں جو اشعار کہے اُن کا آخری شعر یہ ہے: ؎

کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب — "ارم" میں عارف و تسکین و مومن

اس میں "ارم" کے اعداد دو سو اکتالیس ہوتے ہیں، اب اگر ان میں عارف و تسکین اور مومن کے اعداد داخل کر دیئے جائیں تو تاریخ وفات ۱۲۶۱ھ برآمد ہو جائے گی۔

(ب) دوسری قسم وہ ہے جس کے "مادۂ تاریخ" کے اعداد مطلوبہ تاریخ سے کچھ زائد ہوتے ہیں۔ اُن کو تفریق کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے اس کا اصطلاحی نام تعمیہ تخرجہ ہے مبتلا داغ دہوی کی تاریخ وفات اُن کے ایک شاگرد نے اس طور پر کہی ؎

"دم" نکلتا ہے سُن کے یہ تاریخ
آج راہی جہاں سے داغ ہُوا

دوسرے مصرعے ۱۴۶۶ھ برآمد ہوتے ہیں، لیکن پہلے مصرعے میں "دم" کے اعداد کو نکال دینے کا اشارہ پایا جاتا ہے چنانچہ "دم" کے اعداد چوالیس کو اس میں سے خارج کر دینے سے صحیح تاریخ ۱۳۲۲ھ نکل آتی ہے۔ یہی صورت ان مصرعوں کی ہے۔

لکھیے نادر مٹا کے "دلی" کو،
"آج راہی جہاں سے داغ ہوئے"

دوسرے مصرعے کے اعداد سے "دلی" کے چوالیس نکال دینے سے داغ کا سنِ وفات ۱۳۲۲ھ نکل آتا ہے یا مومن خاں مومن کی بیٹی

کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں یہ مصرعے بہت مشہور ہیں۔ ؎

"نال" کٹنے کے بعد ہاتف نے کہی تاریخ "دُخترِ مومن"

"دخترِ مومن" کے اعداد تیرہ سو چوالیس ہوتے ہیں، اس میں سے "نال" کے اعداد اکیاسی نخرج کر دینے سے ۱۳۵۹ھ رہ جاتے ہیں، یہی اصل تاریخ پیدائش ہے۔

۵۔ تاریخ گوئی کے ان طریقوں کے علاوہ بھی تاریخ گو شعرا نے اس سلسلے میں عجیب و غریب تکلفات و لوازمات اور معمات و مہمات سے کام لیا ہے اور سیکڑوں طریقے سے تاریخیں نکال کر اُن کے الگ الگ نام رکھ دیئے ہیں اور صنعت کا نام دیا ہے۔ مثلاً

۱۔ بعض نے صرف مفرد یعنی ایسے حروف سے تاریخ نکالی ہے جو کسی دوسرے حرف سے متصل نہیں ہوتے بلکہ الگ الگ لکھے جاتے ہیں۔

۲۔ بعض نے صرف متصل حروف کو مادہ تاریخ ٹھہرایا ہے۔

۳۔ بعض نے مادہ تاریخ کے اعداد کو آپس میں ضرب دے کر تاریخ نکالی ہے۔

مثلاً عبدالحکیم جوش میرٹھی نے امداد اللہ مہاجر مکی کی تاریخِ وفات یوں نکالی ہے کہ

بگو سہ مرتبہ "شیدائے حق آہ" = ۳×۴۳۹ = ۱۳۱۷ھ

یا داغ کے شاگرد الم نے "مہتاب داغ" کی تاریخ طبع سنِ فصلی میں اس طور کہی کہ

سالِ فصلی یوں بھی نکلے اے الم تین چکر گر لگائے "روزگار"

۳×۴۳۴ = ۱۳۰۲ف

اس طریقہ کار کو اصطلاحِ فن میں صنعتِ تضارب یا صنعتِ ضرب کا نام دیا گیا ہے۔

۴۔ صنعتِ تضارب سے ملتی جلتی ایک صنعتِ تضاعف ہے، اس میں کسی نقطہ یا فقرہ کے اعداد کو المضاعف یعنی دوچند کر لیا جاتا ہے۔ جیسے ضیاؔ حیدرآبادی نے ایک شادی کے موقع پر کہا ؎

مبارک ہو دلہن کو رُونمائی حبیب اللہ مسرت سے ہیں مخمور

ضیاؔ نے عرض کی جلوے کی تاریخ معاف ہو گیا نورٌ علیٰ نور

۲×۶۲۲ = ۱۲۴۴ھ

۵۔ کبھی مادہ تاریخ میں نام کا استعمال اس طرح کیا جاتا ہے کہ نام، اسم کم نہیں معلوم ہوتا جیسے میر الٰہی بخش کی رحلت پر کسی نے کہا۔ ؎

"الٰہی بخش دے اپنے کرم سے"

اس مصرعے سے تاریخ برآمد ہو جاتی ہے اور اسے اصطلاح میں صنعت سجع کہا جاتا ہے۔

۶۔ بعض ماہرینِ فن نے پوری پوری غزلیں، نظمیں، قصیدے اور طویل قطعات ایسے کہے ہیں جن کے ہر مصرعے یا ہر شعر سے مطلوبہ

تاریخ نکالی ہے اور اسے صنعتِ ترصیع کا نام دیا ہے۔ اس صنعت کو بھی طرح طرح سے برتا گیا ہے کبھی، دونوں مصرعوں سے ایک ہی سن یعنی ہجری یا عیسوی نکالا گیا کبھی ایک مصرعے سے عیسوی اور دوسرے سے ہجری یا فصلی برآمد کی گئی ہے۔ اس میں بھی کبھی منقوط کبھی غیر منقوطہ کبھی مفردہ کبھی متصلہ کبھی متحرک اور ساکن حروف وغیرہ کا التزام کرلیا گیا ہے، کبھی ایک ایک مصرعے سے دو دو تاریخیں نکالی گئی ہیں اور اس کا التزام پوری نظم میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عموماً اس قسم کی تاریخ گوئی میں ریاضت ہی ریاضت رہتی ہے۔ اور شعریت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر بھی بہت سی مثالیں ایسی بھی مل جاتی ہیں جن میں تاریخ گوئی کے ساتھ کمال شاعرانہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ جیسے مولانا حامد حسن قادری کا درج ذیل فارسی قطعہ جو علامہ اقبال کی وفات پر کہا گیا ہے اور رسالہ اردو کے اقبال نمبر ۱۹۳۸ء (اکتوبر) میں شائع ہوا ہے۔ عنوان سے لے کر آخر تک مرصع ہے، اس کے کسی مصرعے سے سال ہجری ۱۳۵۷ھ اور کسی سے عیسوی ۱۹۳۸ء برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں انھوں نے صحیح کہا ہے کہ: ؎

قطعۂ گفتہ ام کہ ہر مصراع
شعرے می شود بہ سال وفات

رفعت و رجعت

۱۳۵۷ھ

ترجمانِ حقیقت فیلسوفِ عصر

۱۹۳۸ء

سحر بیان آگاہ دل، ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۳۸ء

در نظرِ عقیدت

۱۹۳۸ء

کمترین افقر حامد حسن قادری عفی اللہ عنہ

۱۹۳۸ء

رفعت اقبال، آفتابِ جہاں

۱۳۵۷ھ

رفعت اقبال وقت، بدر آیات

۱۹۳۸ء

رفعت اقبال و ہم گل افشانی

۱۳۵۷ھ

رفعت اقبال و رفعت زیب حیات

۱۹۳۸ء

فخرِ اسلام و نازِ عالمِ علم

۱۳۵۷ھ

نازِ مشرق بہترین صفات

۱۹۳۸ء

ترجمانِ حقیقتے ، بے باک	حق پژوہ و فقیر خوش ادراک
۱۳۵۷ھ	۱۹۳۸ء
آں قلندر صفت سخن پیرائے	آں مثالِ حکیم ، قفِ نکات
۱۹۳۸ء	۱۳۵۷ھ
نامِ اقبال روشن و شیریں	ذاتِ اقبال ، مجمع الحسنات
۱۳۵۷ھ	۱۹۳۸ء
تربتِ پاک محفلِ قدسی	رُوحِ پُر نور و مہبطِ برکات
۱۳۵۷ھ	۱۳۵۷ھ

اِس صنعت کو اساتذۂ فن نے بکثرت استعمال کیا ہے اور عجیب و غریب کرتب دکھائے ہیں ، یعنی ایسے التزامات بھی کیے گئے ہیں کہ اگر پورے قطعہ کے مصرع ہا۔ ئے اوّل کے حرف اوّل سے وہ اسمِ خاص برآمد ہو جاتا ہے جس کے بارے میں تاریخ کہی گئی ہے ، کبھی دوسرے مصرعے کے سلسلے میں اسی طرح کی پابندی لازم کر لی گئی ہے اور کبھی ایسی شرائط کو لازم کر لیا گیا ہے جن کا فنِ تاریخ گوئی سے کوئی رابطہ نہیں ہے ۔ بلکہ بعض شعرا نے صرف اپنی مہارت ظاہر کرنے کے لیے ایسا کیا ہے اور بے کیف و بے اثر قطعاتِ تاریخی کا انبار لگا دیا گیا ہے ۔ اس لیے اس قسم کی ساری جزئیات کو بطور مثال پیش کرنا اور مضمون کو طول دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔

۷ ۔ تاریخ گوئی کے صنائع لفظی و معنوی سے قطع نظر بعض شعرا نے اپنے قطعات میں اس طرح کا التزام کیا ہے کہ اس سے صرف سال نہیں بلکہ وقت ، دن اور تاریخ بھی نکل آتی ہے مثلاً امانت لکھنوی کے بیٹے سید حسن لطافت نے میر انیس کی وفات کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل کہا : ؎

جو میر ببر علی ہیں اُنیس ذاکرِ شاہ ، وحیدِ دہر سب اہلِ جہاں کے راس و رئیس
فصیح و کامل و حسّانِ وقت و عبلِ عصر جہاں میں جا کے ہوئے ساتھ حور میں کے جلیس
قریبِ شام ہوئے آہ و کمالِ مام اخیر چاند تھا گذرے تھے آہ دن اُنتیس
سُنا یہ واقعہ جانکاہ جب کہی تاریخ کہ جس میں لفظ ہیں آئے مناسب اور سلیس
بیانِ مصرعِ آخر کے اب صنائع ہوں بفکر سمجھیں لطافت جسے حساب نویس
شروعِ مصرعِ تاریخ جو کہ ہیں دو حرف مہینا ایک ہے ، اور دوسرا ہے روز خمیس

سنین بھی ہیں عیاں اس سے عیسوی ہجری
جو بیّناتِ زُبر ہوں رقم بطور نفیس

وہ مرثیے ، نہ وہ پڑھنا نہ وہ بڑے مجمعے اُداس مجلسِ ماتم ہے سامعین دس بیس

عجیب مصرع تاریخ ہے ملایمت "یہ پنجتن کا ہے نوحہ انیس ہائے انیس"[1]

اس قطعہ میں آخری مصرعے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ شروع کے دو حرفوں میں پہلا حرف، مہینے کی نمائندگی کرتا ہے۔ دوسرا روز خمیس کی۔ چونکہ شروع کے دو حرف "ی" اور "ہ" ہیں۔ "ی" کے اعداد دس اور "ہ" کے پانچ ہوتے ہیں۔ اس لیے دسواں مہینہ اور پانچواں دن واضح ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ شام کا وقت اور آخیر چاند تھا۔ اس کی بھی وضاحت موجود ہے کہ زبر و بینات کے قاعدے سے سنِ عیسوی اور ہجری، دونوں برآمد ہوتے ہیں۔ اس لیے اس قطعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر انیس کا انتقال ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ بروز چہارشنبہ بوقت شام ہوا، اور جیسا کہ تاریخ لطیف میں تصریح موجود ہے۔ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ ۹ دسمبر ۱۸۷۴ء کے مطابق ہے[2]۔

اوپر فنِ تاریخ گوئی اور اس کے قواعد و اقسام کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا تعلق صرف اہم اور بنیادی باتوں سے ہے۔ اس فن کی بعض صنعتوں کا ذکر بھی بطور مثال آیا ہے۔ لیکن اس کے صنعتی کرتبوں اور ان کی دور از کار موشگافیوں سے دانستہ گریز کیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے طوالت اور پیچیدگی دونوں میں اضافہ ہوتا اور ماحصل، قدرے نظروں سے دور ہو جاتا۔ بہرحال جا بجا اوپر دیئے ہوئے حوالوں سے اتنا اندازہ تو کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ گوئی کی روایت اور اس کے فن کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایجاد بندہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بزرگوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور میں نے امکان بھر، اس سے استفادہ کیا ہے، ہر چند کہ حساب جمل یا ابجد کا ذکر عربی و فارسی کی کتابوں میں ملتا ہے، بلکہ یہ فن اصلاً آیا ہی عرب و عجم سے ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اہلِ عرب و عجم کے یہاں میری تلاش و دانست کی حد تک اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب یا رسالہ نظر نہیں آتا بلکہ تحریری صورت میں عربی، فارسی اور اردو میں جہاں کہیں فنِ تاریخ گوئی پر کچھ ملتا ہے وہ برصغیر کے اہلِ قلم کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس فن کی تاریخ و روایت پر قلم اٹھانے کا باقاعدہ آغاز حقیقتاً پاک و ہند کی سرزمین سے ہوتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈالوں، چنانچہ اس سلسلے میں ایک دو نہیں، درجنوں کتابیں دیکھیں، ان کے تضادات و اختلافات پر غور کیا، اور تقابلی مطالعہ و موازنہ کے ذریعے ان میں جن اجزا اور ضوابط کو درست جانا انھیں اختصار کے ساتھ بیان کر دیا۔

اس سلسلے میں کون کون سی قدیم و جدید کتابیں میرے پیشِ نظر رہی ہیں، ان کا بھی اجمالی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اس موضوع سے دلچسپی ہو، وہ ان سے براہِ راست استفادہ کر سکیں۔ "لغاتِ تاریخ نگاری" کے عنوان سے کبریٰ امتیاز صاحب نے بھی بعض کتابوں کا جائزہ اپنے ایک مضمون میں لیا ہے[3]۔ لیکن ان کا یہ مضمون صرف چند کتابوں کے تعارف تک محدود ہے۔

---

[1] میر انیس، حیات اور شاعری ص ۳۲ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۷۶ء

[2] تاریخ لطیف مرتبہ اکبر علی خان ص ۲۹ مطبوعہ نگار رامپور جولائی ۱۹۶۳ء

[3] صحیفہ (لاہور) شمارہ ۴۵ بابت اکتوبر ۱۹۶۸ء دس سالہ قومی ترقی نمبر مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔

میری نظر میں اس سے بہت زائد کتابیں ہیں اور اس جگہ بہت اختصار کے ساتھ میں ان کی نشاندہی کروں گا۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہمارے یہاں فنِ تاریخ گوئی سے متعلق جو مواد تحریری صورت میں ملتا ہے۔ اُسے سہولت کی خاطر مندرجہ ذیل نقشوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا۔ ضمنی تذکرہ یعنی وہ مواد جو لغات، قواعد اور علم معانی وبیان کی بعض کتابوں مثلاً بحر الفصاحت، مخزن الفوائد اور دائرۃ المعارف وغیرہ۔

ب۔ فن تاریخ گوئی اور اعداد الاسماء ایسی تصنیف و تالیف یا رسالے جن میں فنِ تاریخ گوئی پر مفصل یا مجمل بحث کی گئی ہے یا بے شمار ایسے الفاظ یکجا کئے گئے ہیں جو مادہ ہائے تاریخ کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔

ج۔ قطعات تاریخی ایسی کتابیں یا کتابچے جن میں مختلف افراد و واقعات سے متعلق تاریخی قطعات جمع کئے گئے ہیں۔ اور ان میں سے بعض میں تاریخ گوئی پر بھی سرسری سا تبصرہ ہے۔

میں اس جگہ شق اوّل کو نظر انداز کر کے صرف دوسری اور تیسری شق سے متعلق، چند کتب و رسائل کا ذکر ضرور کروں گا۔

افادۂ تاریخ اُردو کے مشہور شاعر، سیّد ضامن علی جلال لکھنوی کا مختصر سا لیکن بہت اہم رسالہ ہے۔ "افادۂ تاریخ" سے ۱۳۰۲ھ نکلتے ہیں، یہی اس رسالے کے اختتام کا سال ہے۔ کتاب کے آغاز میں جلال نے لکھا ہے کہ:

"نام تاریخی اس رسالے کے آغازِ تالیف کا "مادۃ التاریخ" اور ختم تالیف کا افادۂ تاریخ رکھا جاتا ہے۔"

"مادۃ التاریخ" سے جلال نے ۱۲۹۲ھ نکالے ہیں، گویا تائے مدوّرہ کے اعداد چار سو کے بجائے صرف ہائے ہوز کے مساوی پانچ عدد لیے ہیں، یہ فن تاریخ گوئی کے اصول کے منافی ہے۔ ہر چند کہ ایسا بعض دوسرے تاریخ گویوں نے بھی کیا ہے، امیر مینائی اور نواب محمد کلب علی رامپوری کے دیوان سوم کے تاریخی نام علی الترتیب "مراۃ الغیب" اور "دُرّۃ الکمال" ہیں، ان میں بھی تائے مدوّرہ کے صرف پانچ عدد محسوب ہوئے ہیں لیکن جیسا کہ اصولوں کی بحث میں یہ بات وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، نقطے دار تائے مدوّرہ کو کسی صورت میں بھی ہائے ہوز خیال کرنا درست نہیں ہے۔

"افادۂ تاریخ" میں تاریخ گوئی کے قواعد و اصول سے عالمانہ بحث کی گئی ہے، یہ بحث مقدمہ کے علاوہ تین ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ، اصول تاریخ گوئی پر مبنی ہے۔ باب اوّل میں تاریخ صوری اور باب دوم میں تاریخ معنوی کا بیان ہے۔ باب سوم میں صوری و معنوی، دونوں قسم کی ملی جلی تاریخ گوئی کے مباحث و مسائل ہیں۔ خاتمے پر مختصر تقریظیں ہیں، جن میں رسالے کی طباعت کا سال ۱۳۰۳ھ نکالا گیا ہے۔ یہ رسالہ مدّت سے نایاب تھا۔ عرشی زادہ جناب اکبر علی خان نے اسے جولائی ۱۹۶۳ء کے نگار (رامپور) میں شائع کر دیا ہے اور یہ اس کے بیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔

ملخص تسلیم: تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتے ہیں، یہ رسالِ آغاز یا تکمیل ہے۔ جہاں تک طباعت کا تعلق ہے

یہ کتاب ۱۸۹۶ء مطابق ۱۳۱۳ھ مطلع العلوم پریس مراد آباد سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی ہیں اور یہ فارسی زبان میں ہے۔ چھوٹی تقطیع کے کل ایک سو بیس صفحے ہیں، جس کتاب میں تاریخ گوئی کے مفہوم، ابجد کی اصطلاحات و تاریخ اور تاریخ گوئی کے اصول، سب پر بحثیں ہیں اور اس میں شبہہ نہیں کہ فنِ تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں سے یہ بہت اہم ہے، اور اس سے بہتوں نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ضامن علی جلال لکھنوی کی کتاب "افادہ تاریخ" میں بتائے ہوئے بعض اصولوں پر اس کتاب میں سخت تنقید کی گئی ہے اور اکثر جگہ اُن کو طعن و تعریض کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ کتاب کے آخری تین چار صفحے قطعاتِ تاریخی اور تقریظوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ خاص میں البتہ اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

مُلہم تاریخ انوار حسین تسلیم سہسوانی کی کتاب "ملخص تسلیم" کا اُردو ترجمہ ہے، یہ بھی تاریخ نام ہے ۱۳۲۶ھ نکلتے ہیں۔ اس کے مترجم سید اقتدار احمد صاحب ہیں اور یہ بھی مطلع العلوم پریس مراد آبادی سے ۱۹۱۲ء میں چھپی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کچھ اور لکھنا بے محل ہوگا کہ اصل کتاب "ملخص تسلیم" کی تفصیل اُوپر آچکی ہے۔

غرائب الجمل عبدالعزیز نواب عزیز جنگ متخلص بہ ولا کی تصنیف ہے اور ۱۳۳۰ھ میں عزیز المطابع حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔ بڑی تقطیع میں چار سو آٹھ صفحات مشتمل، فنِ تاریخ گوئی پر ایک مبسوط اور عالمانہ کتاب ہے۔ پہلے "جُمل" کے مفہوم اور اس کے اقسام پر مفصل بحث ہے پھر "تاریخ گوئی" کی تعریف اور اس فن سے اہلِ عرب و اہلِ عجم کی دلچسپی کا ذکر ہے۔ بعد ازاں تاریخ گوئی کے اقسام اور صنائع لفظی و معنوی کی تفصیل ہے۔ نیز سنِ ہجری کے علاوہ عیسوی، موسوی، مہدوی، فصلی شمسی، سنِ فارسی، سنِ بنگلہ اور ساکا وسمت وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور مثال میں تاریخی قطعات دے گئے ہیں۔ اس کے بعد سو صفحات میں متاخرین، متقدمین اور معاصرین کے تاریخی کلام کے نمونے ہیں۔ یہ نمونے مختلف مواقع سے متعلق ہیں اور مختلف شعرا کے کلام سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان نمونوں میں فنِ تاریخ گوئی سے متعلق صنعتوں کے ایسے ایسے کمالات نظر آتے ہیں کہ شعراء کی مہارتِ فن کا بہرحال قائل ہونا پڑتا ہے۔ کتاب کے آخر میں حساب جمل اور فنِ تاریخ گوئی سے متعلق جو اصطلاحی الفاظ، کتاب کے اندر آئے ہیں ان کی فرہنگ دی ہوئی ہے اور کتاب، ایک دو نثری تقریظوں پر ختم ہو جاتی ہے۔

گنجینۂ تواریخ میر نادر علی رعد کی تالیف ہے۔ مطبع فخر نظامی حیدرآباد دکن سے ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی ہے، ابتدائی دو صفحوں میں فنِ تاریخ گوئی کا اجمالی تذکرہ ہے۔ پھر ایک سے لے کر اُنیس سو تک کے اعداد کے لیے الفاظ دیئے گئے ہیں، کتابت جلی حروف میں ہے، الفاظ کی تعداد، کسی عدد کے مقابل بھی چار سے زیادہ نہیں ہے۔ عموماً ہر عدد کے لیے ایک یا دو لفظ ملتے ہیں۔ دو سو سولہ صفحے کی کتاب میں آخری سولہ صفحوں میں قطعاتِ تاریخی ہیں۔ اس کتاب کے تاریخی مادّے عموماً مرکبات کی صورت میں ہیں اور اسم علم کے بجائے اشعار ہی میں کھپائے جا سکتے ہیں۔

اُمّ التواریخ تاریخی نام ہے، ۱۲۸۹ھ نکلتے ہیں، اس کا دوسرا اڈیشن[1] میرے ذاتی کتب خانے میں ہے اور یہی میرے سامنے ہے، چار سو چوبیس صفحے کی یہ ضخیم تالیف منشی حسین علی فرحت دہلوی کی محنت اور توجہ کا نتیجہ ہے۔ حمد و ثنا کے بعد

---

[1] مطبوعہ مطبع قاسمی شہر میرٹھ ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء

"سبب تالیف" میں مؤلف نے بیان کیا ہے کہ "اعداد و الفاظ کی یہ جامع ڈکشنری" مادہ ہائے تاریخ کو بآسانی حاصل کرنے کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ ابتدائی دو صفحوں میں تاریخ گوئی کے قواعد بیان ہوتے ہیں، پھر اعداد کی ڈکشنری شروع ہو جاتی ہے۔ ایک سے لے کر دو ہزار اعداد تک کے الفاظ، پورے چار سو بیس صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر عدد کے مقابل میں، زیادہ سے زیادہ مفرد و مرکب الفاظ دیئے گئے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے دو ہزار تک کے تاریخی مادے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ آخر میں فرہنگ آصفیہ کے مؤلف، مولوی سید احمد دہلوی کی منشور اور منشی نثار علی کی منظوم تقریظ ہے، خاتمہ چند قطعات پر ہوتا ہے۔ یہ طبع دوم سے متعلق ہیں۔ جیسا عرض کیا گیا اس کتاب میں فن تاریخ نگاری پر کوئی جامع بحث نہیں ہے۔ البتہ اعداد و الفاظ کا ذخیرہ ضرور فراہم کر دیا گیا ہے جس کی مدد سے معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اپنی ضرورت کا مادۂ تاریخ نکال سکتا ہے۔ یہی اس کتاب کا اصل مقصود ہے۔

تاریخ لطیف کتاب کے مؤلف مہدی علی خاں ممتاز رامپوری امیر مینائی کے شاگردوں میں تھے "انتخاب یادگار" میں ان کا ذکر آیا ہے۔ مہدی علی خاں ریاست رامپور کے کتب خانے میں تحویلدار تھے اور تالیف و تصنیف کا بھی گہرا ذوق و شوق رکھتے تھے۔ اُن کی ترجمہ اور نقل کی ہوئی متعدد قلمی کتب و رسائل، کتب خانہ رامپور میں موجود ہیں۔ "تاریخ لطیف" بھی انھیں میں سے ہے، عرشی زادہ اکبر علی خاں نے، جلال لکھنوی کی افادۂ تاریخ کے ساتھ اس کی تلخیص بھی اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کر دی ہے[1]۔

مہدی علی خان ممتاز نے اس کتاب میں دو سو پچاس کے قریب اُردو شعرا کی وفات سے متعلق، مختلف شعرا کے قطعات تاریخی جمع کئے ہیں، اس میں شبہ نہیں بیشتر قطعات معیاری ہیں اور قدما کی وفات کے سلسلے میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ ترقیمہ سے ظاہر ہے کتاب کی تکمیل ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں ہوئی ہے۔

رہنمائے تاریخ اُردو حاجی محمد عبد القادر کی تالیف ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ڈیڑھ سو صفحے ہیں۔ مولانا عبد السلام ندوی کے مختصر تعارف اور مؤلف کی تمہید کے بعد مقدمہ ہے جس کے تحت فنِ تاریخ گوئی کے اصول و قواعد زیر بحث آئے ہیں۔ صفحہ تنتیس[۳۳] سے اُردو کے مشہور شعرا کے مختصر حالاتِ زندگی درج ہیں۔ ہر ایک کی وفات سے متعلق مختلف شعرا کے تاریخی قطعات بھی دیئے گئے ہیں۔ مذکورہ شاعروں میں میر ولی رکنی سے لے کر واجد علی شاہ اختر تک سینتالیس ممتاز افراد شامل ہیں۔ یہ سلسلہ صفحہ ایک سو آٹھ تک پھیلا ہوا ہے۔ بعد ازاں دہلی اور لکھنؤ کے مغل بادشاہوں اور نوابوں سے متعلق قطعات تاریخ ہیں۔ آخری تین صفحوں میں سید مفتی ظہور الحسن زیدی کی تقریظ ہے۔ کتاب میں تاریخ گوئی پر سیر حاصل بحث تو نہیں ہے پھر بھی مختصر ہونے کے سبب عام قاری کے لیے سود مند ہے۔ کتاب مطبع معارف اعظم گڑھ سے ۱۹۳۸ء میں چھپی ہے۔

---

[1] مشمولہ مطبوعہ نگار (رامپور) بابت جولائی ۱۹۶۳ء۔ ص ۱ تا ص ۶۱۔

تاریخ الاسما[1] کتاب کے مؤلف سید ابرار حسین ہاشمی فتح پور رسہوہ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے۔ تاریخ گوئی سے شغف کے نتیجے میں انھوں نے تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل "تاریخ الاسما" کے نام سے کتاب لکھی۔ مختصر دیباچہ کے بعد، پہلے تاریخ گوئی کے فن کے اصولوں کی طرف اشارات ہیں۔ پھر اعداد الاسما اور لغات الاعداد کا طویل سلسلہ ہے۔ چونکہ یہ کتاب بنیادی طور پر مسلمان گھرانوں کے بچوں کے تاریخی نام نکالنے کے لیے مرتب کی گئی ہے اس لیے کتاب میں اعداد الاسما کے تحت صرف ایسے الفاظ دیئے گئے ہیں جو بطور اسم علم استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن اس کتاب کا جو حصہ منفرد و بے مثال ہے وہ "لغات الاسما" کا ہے۔ یہ دراصل، اردو زبان کا ایک ایسا لغت ہے جس میں الف سے لے کر ی تک کے الفاظ ردیف وار، لغت کے طور پر جمع کئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے مقابل، اس کے ابجدی اعداد کے ساتھ معنی بھی درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک مطبوعہ نسخہ، راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے بعض اجزا اکتوبر نومبر ۱۹۸۱ء کے نگار میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اگر پوری کتاب ممکن ہو تو کم سے کم "لغات الاسما" کے حصے کو دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ اس طرح اردو میں فنِ تاریخ گوئی کی کتابوں میں اضافہ بھی ہوگا اور ایک منفرد انداز کا لغت بھی سامنے آجائے گا ——— اس لیے کہ اس انداز کی صرف ایک کتاب معین الادب معروف بہ معین الشعرا ہے جس میں الفاظ کے معنی کے ساتھ اعداد بھی دیئے ہوتے ہیں۔ یہ غلام حسین آفاق بنارسی کی تالیف ہے۔

تاریخی خزانہ حافظ فیروز الدین گکھڑوی کی مختصر سی تالیف ہے جو ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور سے چھپی ہے جیسا کہ مؤلف نے خود وضاحت کر دی ہے۔ چالیس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں فنِ تاریخ گوئی اور اس کے اصول و ضوابط کے ساتھ تین ہزار لڑکوں اور لڑکیوں کے ایسے تاریخی نام دیئے گئے ہیں جو ۱۳۲۶ھ سے لے کر ۱۴۰۰ھ کے درمیان پیدا ہونے والے بچے اور بچیوں کے لیے منتخب کئے جا سکتے ہیں۔ ہر ایک سنہ کے لیے بیس لڑکیوں اور بیس لڑکیوں کے نام دیئے گئے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ سارے ہی نام خوبصورت ہیں اور اسم علم کے طور پر استعمال ہونے کے لائق ہیں۔

گلبنِ تاریخ کتاب کا تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۳۱۳ھ نکلتے ہیں۔ مطبع فخر نظامی حیدر آباد دکن سے ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں چھپی ہے۔ کتاب کے مؤلف میر مہدی حسین رضوی الم نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "اس فن کے جملہ کتب مطبوعہ یعنی اُمّ التواریخ و آئینہ تواریخ و گنجینۂ تواریخ و گلشنِ خیال و کانِ تاریخ و مسادی الاعداد، بسعی و جستجوئے کمال فراہم کیا اور قریب بیس ہزار لفظ عمدہ و بکار آمد اس میں اضافہ کر کے ایک کتاب ضخیم تیار کی، جو اتمام تالیف و آغاز طبع ۱۳۱۳ھ میں منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوا لہٰذا اس کتاب کو باسم تاریخی "گلبنِ تاریخ" موسوم کیا۔

سات سو صفحوں کی ضخیم کتاب میں ابتدائی چھبیس صفحے، حروف ابجد اور فنِ تاریخ گوئی کی بحث میں ہیں، بعد ازاں

---

[1] کتاب کا سرورق غائب ہے لیکن دسمبر ۱۹۲۵ء کے نگار (لکھنؤ) میں نیاز فتح پوری کا تبصرہ ہے۔ دیباچے میں بھی بعض ایسے قرائن ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں فتح پور رسہوہ سے چھپی۔ ہے

حروف ابجد کے اعداد دیئے گئے ہیں اور تاریخ گوئی کی تعریف کا تعین کیا گیا ہے۔ آگے چل کر ہمزہ اور الف ممدودہ کے اعداد کا ذکر ہے۔ مؤلف کے مطابق ہمزہ چونکہ حروف ابجد میں شامل نہیں اس لیے اس کا کوئی عدد نہ لیا جائے گا۔ ہاں اگر ہمزہ اضافت کے ساتھ اس طرح آئے کہ اُردو فارسی کتابت میں ہمزہ کو "ی" کی شکل دینا پڑے تو اُس کے دس عدد محسوب ہوں گے۔ الف ممدودہ کا بہرحال ایک عدد شمار ہوگا۔ تائے مدورہ کے سلسلے میں یہ حکم لگایا گیا ہے کہ اگر نقاط کے ساتھ آئے تو بہرصورت چار سو لئے جائیں گے۔ نقاط سے پاک ہو تو صرف پانچ عدد لیے جائیں گے یعنی "کَعبَۃُ اللّٰہ" میں تائے مدورہ کے چار سو اور "بمعنی کَعبَہ" میں صرف پانچ عدد محسوب ہوں گے۔ کاف بیانیہ اگر "کہ" کی صورت میں الگ لکھا جائے تو کتابت کی رُو سے پچیس عدد ہوں گے ورنہ بیس مثلاً "کر" میں۔ بعدازاں مجھے مضمون میں تاریخ کے اقسام مع امثال درج ہیں۔ صفحہ ستائیس سے تاریخی مادّوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور صفحہ اڑسٹھ تک برقرار رہتا ہے تین سے لے کر دو ہزار تک کے لیے الفاظ و مرکبات دیئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب، اس نوع کی دوسری کتابوں سے زیادہ جامع ہے۔ آخری چند صفحات میں تاریخی قطعات ہیں۔

فنِ تاریخ گوئی تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۳۸۷ھ برآمد کیے گئے ہیں۔ گلوب پبلشرز اُردو بازار لاہور کی معرفت ۱۹۶۷ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ کتاب کے مصنف کیپٹن منظور حسن ایم اے ہیں۔ مصنف کی تمہید کے ساتھ، جناب ارشد میر کا "تعارف" اور ڈاکٹر وحید قریشی کا "پیش لفظ" بھی کتاب کی زینت ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دو تین تقریظیں بھی ہیں۔ کتاب کا انتساب چوہدری عبدالحمید خاں، پی، سی، ایس ریٹائرڈ کی یاد میں ان کے بیٹوں کے نام ہے۔ بقول مصنف چوہدری عبدالحمید خاں کو فنِ تاریخ گوئی سے گہرا شغف تھا۔ انھوں نے قائداعظم کی وفات پر کہے ہوئے قطعاتِ تاریخی کو "بطلِ مغفور" کے تاریخی نام سے قائد کی سوانح حیات کے ساتھ شائع کیا تھا۔ مصنف کے والد عزیزالدین، بقول ارشد میر صاحب، تاریخ گوئی کے امام تھے، چنانچہ کیپٹن منظور حسن کو اس فن سے جو وابستگی ہے۔ اس میں ان کی کوشش کے ساتھ گھر کے ورثے کا بھی دخل ہے۔

کتاب کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ منظور حسن کو واقعی اپنے موضوع سے گہری واقفیت ہے اور لگاؤ بھی۔ اُنھوں نے فنِ تاریخ گوئی بارے میں بہت کچھ پڑھنے اور جاننے کی کوشش کی ہے، چنانچہ آخری صفحے میں ماخذ کے تحت دی ہوئی کتابوں کی فہرست میں جہاں تاریخ و تذکرہ کی دوسری کتابیں شامل ہیں وہاں فنِ تاریخ گوئی سے متعلق بعض کتابوں مثلاً "کانِ تاریخ" "گنجِ تاریخ" "اُمّ التواریخ" محض تسلیم، افادۂ تاریخ اور "بطلِ مغفور" کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بڑی تقطیع کی دو سو سولہ صفحات میں پھیلی ہوئی اس صاف ستھری کتاب کو ترتیب کتاب کے جدید اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مضامین و ابواب کی فہرست بھی کہیں نہیں دی گئی۔ اس لیے جب تک شروع سے آخر تک پوری کتاب قاری کے مطالعہ میں نہ ہو، وہ اپنے کام کی کوئی بات اس سے نہیں نکال سکتا، اور نہ ہی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کتاب میں ضروری و غیر ضروری کیا کیا باتیں درج ہیں اور بحیثیت مجموعی اس کی افادیت کیا ہے۔ میرے خیال میں بہت معلومات افزا ہے ——— لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں بغیر عنوانات قائم کیے، مصنف نے فنِ تاریخ گوئی، تاریخ گویوں کی بعض لغزشوں اور بعض مشہور تاریخ گویوں کی سوانح وغیرہ کو گڈمڈ کرنے، اپنے خیالات کا جس گنجلک طریقے سے اظہار کیا ہے اس سے خاص خاص لوگ تو استفادہ کر سکتے ہیں، علم و ادب کا عام قاری اس سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔

آئینۂ تواریخ اس کا دوسرا نام "تحفۂ شائق" بھی ہے۔ پہلے پہل یہ کتاب ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں "تحفۂ شائق" ہی کے نام سے چھپی تھی۔ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں بعض اضافوں کے ساتھ دوبارہ چھپی۔ مطبع کا نام پڑھنے میں نہیں آسکا۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ سرورق بوسیدہ ہے۔ اس کے مؤلف الٰہی بخش شائق ہیں۔ کتاب میں بڑی تقطیع کے ۴۳۲ صفحے ہیں۔ دو صفحے کے مختصر دیباچے میں تالیفِ کتاب کے وقت پیش آنے والی مشکلات کا ذکر ہے۔ بعد ازاں سولہ صفحے تک تاریخی قطعات ہیں جن کا تعلق سالِ طباعت سے ہے۔ بقیہ پوری کتاب گویا اعداد الاسماء ہے یعنی اس میں تین سے لے کر دو ہزار اعداد تک کے الفاظ جمع کئے گئے ہیں۔ ہر صفحہ خانوں میں تقسیم ہے۔ کتابت کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ کتاب کی ضخامت بے سبب زیادہ ہوگئی ہے، ورنہ پورا مواد آسانی سے اس کے نصف حجم میں آسکتا تھا۔ ہر عدد کے مقابل عموماً چار یا چھ اور کہیں کہیں دس یا بارہ الفاظ و مرکبات نظر آتے ہیں۔ اس میں فنِ تاریخ گوئی پر کوئی بحث نہیں ہے، صرف تاریخی مادوں کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔

موجد التواریخ محمد حسین علی فرحت کی تالیف ہے۔ بتیس ۳۲ صفحات کا یہ رسالہ شگوفہ پریس میرٹھ سے ۱۳۰۲ھ میں چھپا ہے۔ اسے مؤلف نے تاریخی ناموں کا رسالہ بھی کہا ہے اور بجا کہا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ۱۳۰۱ سے لے کر ۱۴۰۰ تک کے اعداد کے ایسے نام یکجا کئے گئے ہیں جو سال پیدائش کی مناسبت سے تاریخی کار ناموں کا کام دے سکتے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کی صورت وہی ہے جو "تاریخی خزانہ" مولفہ حافظ فیروز الدین ککے زئی کی ہے۔ البتہ ککے زئی کی تالیف اس سے بہتر اور جامع ہے۔

مساوی الاعداد میر محمد حسین حیدر آبادی کی چھوٹی سی کتاب ہے۔ فیض عام پریس حیدر آباد دکن سے ۱۲۸۵ھ میں چھپی ہے۔ نام بھی اس کا تاریخی ہے۔ اس میں ایک سے لے کر ہزار تک کے مادۂ تاریخ جمع کئے گئے ہیں اور ہر عدد کے لیے کئی کئی نام یا الفاظ دیئے گئے ہیں۔

ذکرِ غم[1] "ذکرِ غم" کے اعداد ۱۹۶۰ء بنتے ہیں۔ یہی اس کا سالِ تصنیف و طباعت ہے۔ کتاب مکتبہ اردو کراچی سے چھپی ہے۔ اس کے سرورق پر بطور مؤلف یا مصنف کسی کا نام درج نہیں ہے۔ پیش لفظ البتہ بہ عنوان "حقیقتِ احساسِ پیشکش" جس سے ۱۳۸۰ھ نکلتے ہیں۔ شمیم صبا متھراوی اعزازی ناظم مکتبہ اردو کراچی کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے شمیم صبا متھراوی ہی اس کتاب کے مرتب قرار پاتے ہیں۔

چھیاسی ۸۶ صفحے کی اس کتاب کا اصل موضوع، ماہرین فنِ تاریخ گوئی سید انور علی شاد ہیں۔ شاد ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۰ء مطابق ۱۳۸۰ھ میں وفات پائی۔ گویا "ذکرِ غم" شاد کی وفات پر مرتب کی گئی ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان "ترویج فنِ تاریخ" ہے اور اس میں دورِ حاضر کے ایک ماہر فن جناب صبا متھراوی صاحب نے تاریخ گوئی کے اصولوں سے مختصر بحث کی

---

[1] مطبع البلاغ لکھنؤ ۱۸۱۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ۔

ہے، دوسرے حصے میں انور علی شاد کی زندگی اور فن پر مختلف اصحاب نے روشنی ڈالی ہے۔ تیسرے حصے میں مختلف شاعروں کے وہ قطعاتِ تاریخی ہیں جو شاد کی وفات پر کہے گئے ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب جہاں تاریخ گوئی کے فن اور شاد کے کمالات کا احاطہ کرتی ہے وہاں اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ ابھی تاریخ کہنے والے اور اس فن سے دلچسپی رکھنے والے کچھ لوگ موجود ہیں، اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مہر تقوی جے پوری نے انھیں تاریخ گوئی کے نام سے ایک جامع کتاب فنِ تاریخ گوئی پر لکھی ہے اور یہ مکتبہ اُردو کراچی سے شائع ہونے والی ہے میری نظر سے ہنوز نہیں گذری۔

نصیحت مختصر[1] شاہ محمد علیم اللہ آبادی کا تالیف کردہ رسالہ ہے، صرف سولہ صفحے ہیں۔ رسالے کا نام تاریخی ہے۔ ۱۸۸۸ء برآمد ہوتے ہیں۔ ابتدا میں تاریخ گوئی کے اصولوں کا بہت مختصر تذکرہ ہے۔ صرف چھ کے بعد مساوی الاعداد الفاظ یکجا کئے گئے ہیں۔ ہر عدد کے مقابلے میں دو دو لفظ یا مرکبات درج ہیں اور سات صفحات پر محیط ہیں۔ صفحہ ۱۳ سے ۱۶ تک تالیف رسالہ سے متعلق تاریخی قطعات ہیں جن سے ۱۸۸۸ء کے مطابق ۱۳۰۵ھ اور ۱۳۰۴ھ نکالے گئے ہیں۔

مخزن الواصلین ابو عبداللہ محمد فاضل، معروف بہ مظہر الحق اس کے مؤلف ہیں۔ کل ۱۶۸ صفحات ہیں۔ کتاب ۱۲۴۹ھ میں کلکتے سے چھپی ہے۔ اس میں حضور اکرمؐ کی وفات سے لے کر ائمہ کرام اور بے شمار اہل اللہ کی وفات تک، مختلف شعرا کے قطعات تاریخی درج ہیں۔

معیار التواریخ یہ بھی تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے۔ محمد جعفر علی خاں اس کے مؤلف ہیں۔ ریاض المومنین پریس کاظمین لکھنؤ سے ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۴۲ھ چھپا ہے۔ مختلف افراد و واقعات کے بارے میں مختلف شعرا کے تاریخی قطعات، اٹھائیس صفحے کے اس رسالے میں جمع کئے گئے ہیں۔

سرو دلبی تاریخی نام ہے ۱۲۹۲ھ نکلتے ہیں۔ اس کا دوسرا تاریخی نام "خیابان تواریخ" ہے۔ اس سے ۱۸۷۵ء برآمد ہوتے ہیں۔ مصنف کا نام سید محمد علی جویا مراد آبادی ہے۔ کتاب اکتوبر ۱۸۸۱ء مطابق ذی قعدہ ۱۲۹۸ھ میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپی ہے۔ کل صفحات ایک سو چونتیس ہیں۔ خاتمۂ کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۲۹۰ھ میں مکمل ہو گئی تھی۔ ابتدا میں فن تاریخ گوئی، اس کی قسموں اور صنعتوں کی تفصیلات ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مختلف اصناف یعنی غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور قطعات میں کہی ہوئی مختلف شعرا کی منظوم تاریخیں ہیں۔ ان تاریخوں میں ماہرین فن نے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ فن پر ان کی دسترس و مشق دیکھ کر آدمی حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ خود مصنف کی کہی ہوئی اس میں متعدد تاریخیں شامل ہیں اور ان کی مہارت فن کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کتاب سے بعض ایسے حکمرانوں، بزرگوں، شاعروں، امیروں اور عالموں کی وفات اور ان سے متعلق اہم واقعات و سوانح کی تاریخیں بھی مل جاتی ہیں جو شاید کہیں اور دستیاب نہ ہوں۔

جامع التواریخ :۔ چھوٹی تقطیع کے چند صفحوں کا کتابچہ ہے۔ سید دلدار حسین اطہر الٰہ آبادی اس کے مؤلف ہیں۔ کتاب کا نام تاریخی ہے۔

---

[1] مطبع البلاغ لکھنؤ ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ

اور ۱۳۵۶ھ نکلتے ہیں۔ کتاب اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن سے ۹ محرم ۱۹۶۰ء میں چھپی ہے۔ اس میں انھوں نے ۱۹۳۷ء تک کے موٹے تاریخی قطعات جمع کئے ہیں — اسی طرح کا ایک اور رسالہ مخزن التاریخ ہے۔ یہ ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں مذکورہ بالا پریس ہی سے چھپا ہے۔

احسن التواریخ یہ بھی سید دلدار حسین اظہر الآبادی کی تالیف ہے اور مجموعۂ قطعات ہے۔ ۱۳۶۷ھ میں چھوٹی تقطیع کے چھپن ۵۶ صفحات میں اعظم پریس حیدرآباد دکن ہی سے چھپا ہے۔ کچھ تاریخی قطعات تاریخ حصول پاکستان سے متعلق ہیں اور کچھ مؤلف کے عزیزوں اور علمائے سلف کے بارے میں ہیں۔

تاریخوں کے پھول جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، منظوم گلہائے عقیدت کا مجموعہ ہے۔ اس کے مؤلف اسد اللہ حسینی ہیں اور ۱۳۲۹ھ میں شمس المطابع حیدرآباد دکن سے یہ مجموعہ شائع ہوا ہے۔ چھوٹی تقطیع کے اٹھاسی صفحات ہیں، ابتدا میں سید امین الحسینی اور سید علی شبیر کے تعارفی کلمات ہیں۔ دیباچے میں، مؤلف نے حروف ابجد اور فن تاریخ پر مختصراً روشنی ڈالی ہے، بقیہ کتاب قطعاتِ تاریخی پر مبنی ہے۔

تواریخِ مہین یہ اس کا تاریخی نام ہے، غیر تاریخی نام آیاتِ کمال ہے۔ حکیم سید محمد مہدی متخلص بہ کمال ابن جلال لکھنوی اس کے مؤلف ہیں، چھیاسی ۸۶ صفحے کی کتاب بڑے سائز پر مطبع تصویر عالم لکھنؤ سے ۱۳۲۲ھ میں چھپی ہے۔ یہ بھی واسوخت مجموعۂ قطعاتِ وفات ہے۔ اس میں بہت سے اہم شاعروں اور بزرگوں مثلاً داغ دہلوی، خورشید علی نفیس لکھنوی، امیر مینائی، سید فرزند علی صغیر بلگرامی اور فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی وغیرہ کے بارے میں قطعہ تاریخ وفات مل جاتے ہیں۔

اس طرح کی اور کئی چھوٹی بڑی کتابیں جن کا تعلق فن تاریخ گوئی سے میری نظر سے گذری ہیں، ان سب کا تذکرہ یوں لاحاصل ہے کہ بیشتر کا تعلق مادہ ہائے تاریخ یا قطعاتِ تاریخ جمع کرنے سے ہے اور ان میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو قاری کی معلومات میں کسی طرح کا اضافہ کر سکے مثلاً:

۱۔ کانِ تاریخ مؤلفہ ۱۲۸۲ھ رام پرشاد مطبوعہ ۱۲۹۳ھ مطبع انوری آگرہ
۲۔ قطعاتِ تاریخ و رباعیات از سید احمد افسر مطبوعہ ۱۳۲۹ھ
۳۔ گلزار ہمیشہ بہار: از محی الدین حسین خاں تسلیم مطبوعہ نظامی المطابع حیدرآباد دکن
۴۔ عزّ التواریخ: از اصغر حسین نامی مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۲۵ھ
۵۔ قطعاتِ تاریخی: از مولانا سعید الرحمٰن رہبر کانپوری مطبوعہ کراچی ۱۳۷۱ھ
۶۔ جامع التاریخ: از مرزا بہادر علی صفی مطبوعہ ۱۳۵۶ھ
۷۔ گلشنِ خیال: از محمد سعید مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۲۹۷ھ
۸۔ عدد التاریخ: از تسلیم سہسوانی مطبوعہ اخبار نیّر اعظم مرادآباد ۱۳۲۰ھ
۹۔ تواریخِ اکمل: از محمد شاہ عرف فقیر محمد فدا مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ

۱۰ - مجموعۂ تاریخ : از سید محمد ہاشم مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۳ء

۱۱ - نگارستانِ اشعار : از قاضی عبدالصمد صارم سیوہاروی مطبوعہ دہلی ۱۳۵۴ھ

۱۲ - تواریخ میلاد پاک : از اصغر حسین نامی مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۲۵ھ

۱۳ - مشاہدۂ ریاض : از محمد ریاض الدین مطبوعہ حمیدیہ پریس حیدر آباد دکن ۱۳۶۶ھ

۱۴ - آخرت بانی : از نھنو لال تائب مطبوعہ محمود ذگر لکھنؤ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء

۱۵ - معین الادب یا معین الشعرا : از غلام حسین آفاق بنارسی مطبوعہ مطبوعہ صدیق بکڈپو لکھنؤ ۱۳۵۱ھ

۱۶ - شاہدِ غم : از سید انور علی شاد جے پوری ۔ مطبوعہ کراچی ۔

۱۷ - جمع التاریخ : از قاضی محمد تحسین صدیقی بیدل مطبوعہ لاہور ۱۹۵۳ء مطابق ۱۳۷۱ھ

اور اس طرح کی دوسری کتابیں کتب خانوں میں نظر آتی ہیں، لیکن ان میں کوئی کام کی بات نہیں ہے ۔ مؤلفین نے اپنے شوق کے مطابق قطعات تاریخی جمع کر کے شائع کر دیئے ہیں۔ اس سارے ذخیرے میں جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہوگا، اہم اور مفید مطلب کتابیں بہت تھوڑی سی ہیں۔ میری مراد افادۂ تاریخ، ملخص تسلیم، غرائب الجمل، اُمّ التواریخ، گنجینۂ تواریخ، رہنمائے تاریخ اُردو، تاریخ الاسماء، گلبنِ تاریخ، فن تاریخ گوئی، سرود غیبی، انیس تاریخ گوئی، جمیع التواریخ اور ذکر غم سے ہے، ان کتابوں میں فنِ تاریخ گوئی پر مختصر یا طویل بحث بہر حال کی گئی ہے ۔ ایک اور کارآمد تالیف ۔ معدن الجواہر کا ذکر بھی بعض کتابوں میں آیا ہے ۔ صاحب غرائب الجمل نے خصوصاً اس کا اور اس کے مؤلف کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ یہ نامکمل اور غیر مطبوعہ ہے، بہر حال میری نظر سے نہیں گذری ——— اس سرمایہ میں بھی اُمّ التواریخ، تاریخ الاسماء، گلبنِ تاریخ، گنجینۂ تواریخ، جمیع التواریخ اور ذکرِ غم ایسی ہیں جن کا اصل مقصود مادہ ہائے تاریخ یا قطعات تاریخ جمع کرنا ہے ۔ اس اعتبار سے چند کتابیں مثلاً افادۂ تاریخ، ملخص تسلیم، غرائب الجمل، رہنمائے تاریخ، فن تاریخ گوئی، سرود غیبی اور انیس تاریخ گوئی، ایسی رہ جاتی ہیں جنھیں فنِ تاریخ گوئی سے متعلق کیا جا سکتا ہے، میں نے ابتدا میں تاریخ گوئی کے اصول و مسائل سے جو بحث کی ہے وہ دراصل انھیں کتابوں سے مستفید و ماخوذ ہے ۔

تخلیق اور تخلیقی مسائل،
نفسیات کی روشنی میں

ڈاکٹر سلیم اختر

تخلیق اور تخلیقی مسائل میں اتنا تنوع ہے کہ تخلیق کار کی شخصیت سے لے کر خارجی ماحول میں عوامل و محرکات کے لہر در لہر سلسلوں اور باہم متصادم تقاضوں تک کی وسعت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ـــ اور دیکھا جائے تو یہی نفسیاتی تنقید کے اہم ترین مباحث قرار پاتے ہیں۔ نفسیاتی تنقید کے اہم بلکہ بنیادی مباحث مندرجہ ذیل ہیں :

الف : ادیب کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ

ب : تخلیق اور تخلیقی عمل کا مطالعہ

ج : کلچر سے وابستہ نفسیاتی محرکات اور تخلیقات پر ان کی اثر آفرینی۔

د : تاریخی حالات کے نفسیاتی اثرات

ر : سماجی کوائف کا نفسیاتی مطالعہ

س : ادب اور اخلاق کے مسئلے کا نفسیاتی پہلو

ش : موضوع و مواد کی نفسیاتی اہمیت

مغرب میں نفسیاتی ناقدین نے ان موضوعات اور ان میں وابستہ مسائل پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان کی ہمنوائی میں اُردو کے نفسیاتی ناقدین نے بھی خاصی خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ ان مباحث پر باضابطہ کتب تحریر میں نہ لائی گئیں لیکن مختلف اوقات میں مختلف ناقدین کے مجموعوں اور ادبی جرائد میں ان موضوعات پر مطبوعہ مقالات کی تعداد اچھی خاصی ہی نہیں پر تنوع اور فکر انگیز بھی ہے گو بیشتر صورتوں میں اُردو ناقدین نے مغربی خیالات اور تصورات ہی پر انحصار کیا اور ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے لیکن اس کے باوجود ذاتی سوچ کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ مقالہ اُردو ناقدین کے خیالات اور ان کی آراء سے مرتب کیا گیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ مغربی ناقدین اور نفسیات دانوں کے اکتساب کے باوجود اُردو ناقدین نے اپنی انفرادی سوچ کا کیسے اظہار کیا بلکہ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات ان ناقدین نے بھی نفسیات سے دلچسپی کا اظہار کیا جو نفسیاتی نقاد نہیں مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ کی تالیف "مباحث" فراق گورکھپوری کی "اُردو غزل شاعری" اور ڈاکٹر حنیف فوق کی "منتخب تذریں"۔

ادیب کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ

اس بے حد اہم اور نزاعی مسئلے پر ہمارے ناقدین نے خصوصی توجہ دی ہے اور یہ توجہ کوئی آج کی نہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفسیاتی تنقید کے مباحث سے بہت پہلے محمد حسین آزاد نے اپنے مضمون "نظم اور کلام موزوں کے باب میں" جن خیالات کا اظہار کیا، ان کی بنیاد وہی ہے جس پر فرائڈ سے لے کر ایڈمنڈ ولسن تک نے اپنے نظریات کی اساس استوار کی۔ محمد حسین آزاد جنون کو لازمہ شاعری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اس کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنوں کے یا عاشق کے کہ وہ برادرِ مجازی اس کا ہے ہر شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنوں کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے۔"[1]

اس اقتباس سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ محمد حسین آزاد نفسیاتی نقاد تھے۔ صرف اس امر کی طرف توجہ مبذول کرنی ہے، کہ جدید اُردو تنقید کی ابتدا سے ہی شاعر کی شخصیت کی نفسی اساس سے دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ عام ناقدین کے برعکس نفسیاتی ناقدین کے لیے یہ مسئلہ بے حد اہم ہے۔ نفسیاتی نقاد جب تک شاعر کی شخصیت کو سامنے نہ رکھے وہ اس کی تخلیقات سے انصاف نہیں کر سکتا۔ نہ ہی، وہ اس کے بغیر تخلیق کی درست تحسین پر قادر ہے۔ چنانچہ میراجی کے بقول:

"جب تک ہم کسی مصنف یا شاعر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات حاصل نہ کر لیں ہم ان کی ادبی تخلیقات یا کلام کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہر مصنف یا شاعر کی تخلیقات خواہ اس کا فنی اصول داخلی ہو یا خارجی، اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں۔"[2]

جب ہم اس نقطہ نظر سے اُردو کے نفسیاتی ناقدین کا مطالعہ کریں تو تقریباً سبھی نے محمد حسین آزاد کی اوّلین مثال کی مانند ادیب کی شخصیت میں جنون کو لازمۂ فن تصور کیا۔ چنانچہ سید شبیہ الحسن نے بڑے پُر جوش الفاظ میں ادیب کے لیے جنون کی نفسیاتی اہمیت اُجاگر کی:

"شعر و ادب کے سلسلے میں جنون اس معنی میں نہیں بولا جاتا۔ جس معنی میں یہ لفظ کسی طب کی کتاب میں استعمال ہوتا ہے اور نہ اس معنی کے اعتبار سے جنون شاعری کے لیے کوئی ضروری چیز ہے۔..... جنون کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ اس میں تخریبی عنصر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اپنے کو شدید مغالطے اور غلط فہمی میں مبتلا کرنا ہے۔ اصلاح پذیر جنون ہمیشہ ایک عظیم ذہن کی داخلی خصوصیت رہا ہے۔ دنیا کے اعلیٰ پایہ کے ذہن معتدل جنون کے شکار رہے ہیں اور اس کی بدولت وہ عظیم تخلیقات معرضِ وجود میں آگئیں جو انسانی معجزے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دنیا کے بہت سے فن کار ایسے بھی گذرے ہیں جو اپنی زندگی کے کسی دور میں

---

[1] نظم آزاد۔ ص ۵۔ محمد حسین آزاد نے "بعض محققوں کا قول ہے" کہہ کر جو بات کی ہے۔ اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار شیکسپیئر کر چکا ہے:
"The lunatic, the lover and the poet
are of imagination all compact."
"دلچسپ یہ امر بھی نفسیاتی دلچسپی کا موجب ہے کہ خود محمد حسین آزاد نے بھی عمر کے آخری بیس سال جنون میں مبتلا رہ کر انتقال کیا تھا۔
مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں "آزاد عالم دیوانگی میں" از ڈاکٹر محمد صادق (مطبوعہ ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۸ء) مولانا آزاد کا عالم وارفتگی کا ایک رسالہ، از مظفر عباس (مطبوعہ قومی زبان کراچی مارچ ۱۹۷۹ء)

[2] "مشرق و مغرب کے نغمے" ص ۱۶۷۔

جنون کے صید زبوں رہ چکے ہیں اور ان کی اعلےٰ تخلیقات کے فوارے عہد جنون کے اختتام پر پھوٹے ہیں.....
جس طرح سیلاب زمین کی زرخیزی کا سبب بن سکتا ہے۔ اس طرح جنون ذہنی قوتوں کے ارتقاء کا سبب ہو سکتا ہے[1]۔"

یہ فرائڈین طرز استدلال ہے اور اُردو کے بیشتر نفسیاتی ناقدین اس کے حامی ہیں۔ البتہ اس کے لیے اصطلاحات کے استعمال میں خاصا تنوع ہے۔ چنانچہ اعصابی خلل، مریضانہ رجحانات، غیر معمولی کیفیات، نیورائیت، اعصابیت وغیرہ سب جنون اور اس کی مختلف کیفیات کے ترجمان ہیں۔ میراجی نے ادیب کی شخصیت کی نفسیاتی اساس کے تفہیم کے ضمن میں بہت ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو اہم مضامین کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو اپنے انوکھے پن کی بناء پر آج بھی دلچسپ اور فکر انگیز ہیں ان میں سے ایک ہے "ناموں کی اہمیت" (مطبوعہ ادبی دنیا جنوری ۱۹۳۷ء) اور دوسرا ہے ——— "کیا گوری کیا سانولی" (مطبوعہ ادبی دنیا۔ مارچ ۱۹۴۲ء) اوّل الذکر مضمون میں میراجی نے ناموں کی نفسیاتی اہمیت اجاگر کی ہے۔ کیونکہ اس کے بموجب ناموں کے صوتی تاثرات بعض مخصوص نفسی تلازمات کا باعث بنتے ہیں، سو اس کے [illegible]:

"شیلے اور شکر کی زندگیوں میں ایک ہی نام کی تین عورتوں کا آنا اور بائرن کی بے شمار محبوباؤں میں سے سب کے ناموں میں لفظ مریم یا مریانہ کی موجودگی یونہی سرسری چیز نہیں ہے[2]۔"

"کیا گوری کیا سانولی" میں میراجی نے شعراء کی ذاتی زندگیوں میں رنگوں کے انتخاب کی نفسی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ میراجی کا طرز استدلال یہ ہے کہ شعروں کی طرح رنگوں کا انتخاب بھی دل کا معاملہ کھول سکتا ہے۔ چنانچہ میراجی کی دانست میں بادلیر کی سیاہ پسندی درحقیقت سفید فام عورت کو مسترد کرنے کے مترادف ہے۔ میراجی نے آریاؤں کی آمد سے پیشتر ہندوستان میں آباد سیاہ فام باشندوں سے بات شروع کی اور ولی، میر، میر حسن اور انشاء وغیرہ کے اشعار سے ان کے پسندیدہ رنگوں کی مثالیں فراہم کیں۔ جدید شعراء میں سے عظمت اللہ اور ڈاکٹر بجنوری کے رنگوں کے انتخاب کو سراہا ہے[3]۔

ڈاکٹر اجمل ژونگ کے مقلد ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "تحلیل نفسیات" میں نسبتاً ایک وسیع تناظر میں شخصیت کی نفسی اساس کی دریافت کے ساتھ ساتھ اس کی تربیت پر بھی زور دیا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نے کیمیاگری کی مثال سے اسے واضح کیا ہے:

"سونا سودھنے کا عمل محض زرگری نہیں ہے۔ یہ دراصل شخصیت کی تربیت کا عمل ہے جس سے شخصیت کی ادنیٰ صفات اعلیٰ صفات میں تبدیل ہو جاتی ہیں[4]۔"

---

[1] تنقید و تحلیل، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔
[2] "ادبی دنیا" جنوری ۱۹۳۷ء
[3] "ادبی دنیا" مارچ ۱۹۴۲ء
[4] "تحلیل نفسیات" ص ۱۲۸۔

الغرض ادیب کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ بڑا پر تنوع ہے دیکھا جائے تو یہ سوال ایک اور بہت اہم سوال سے پیوست نظر آتا ہے اور وہ ہے تخلیقی عمل کا مطالعہ۔ تخلیقی عمل شخصیت سے منقطع کوئی خود کار عمل نہیں۔ اس لیے ایک لحاظ سے یہ دونوں سوالات جام و مینا کی مانند لازم و ملزوم بن جاتے ہیں۔

نوٹ :۔ اس موضوع پر ان مقالات کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے (۱) "تخلیقِ فن اور جنون"
از دیوندر اسر مطبوعہ سوغات کراچی شمارہ ۵ ، ۶ - ۱۹۶۳ء (۲) "شاعری اور جنون"
از سجاد رضوی مطبوعہ صحیفہ نمبر ۷ دسمبر ۱۹۵۸ء

تخلیق سے وابستہ تخلیقی عمل کا مطالعہ

اُردو کے نفسیاتی ناقدین نے اس سوال کا جواب فرائڈ اور ژونگ دونوں کے حوالے سے دینے کی کوشش کی ہے۔ ژونگ کے اثرات نسبتاً محدود ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد جمیل اور ابن فرید نے ہی سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ باقی اکثریت فرائڈین کی ہے۔ گو دونوں ماہرین نے تخلیقی عمل کی وضاحت لاشعور سے کی ہے مگر فرق یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ فرائڈ نے لاشعور کو جنسی محرکات کے لیے مخصوص قرار دے دیا جب کہ ژونگ نے اجتماعی لاشعور کی صورت میں اس کے اثرات کو قدیم ترین انسانی آبا تک پہنچا دیا۔

ریاض احمد نے اپنے ایک مقالے "ادب اور صحافت" میں لکھا ہے کہ "شخصیت کے اظہار کی داخلی خواہش ادبی نظریات کی اہم ترین محرک ہے[۱]" اور اس انداز نظر سے انھوں نے لاشعوری محرکات کی تخلیق پر اثر اندازی کو سمجھنے کی سعی میں اس خیال کا اظہار کیا کہ "تحلیل نفس کے ماہرین فن کے ایک ایسے فعل کے قائل ہیں جس سے نفس خود اپنی ذات میں تحریک اور ہیجان کا سامان حاصل کرتا ہے یعنی آٹو ایروٹزم جمالیاتی احساس اور اظہار اس ضمن میں آتے ہیں[۲]" فراق گورکھپوری تاثراتی نقاد ہیں۔ گر انھوں نے اپنی کتاب "اُردو کی عشقیہ شاعری" میں جنس اور جنسیت کے حوالے سے اُردو شاعری میں جذبہ عشق کو سمجھنے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ فراق نے فرائڈ کا نام نہیں لیا، لیکن جنس کی شاعرانہ تعریف میں فرائڈ سے بھی بڑھ گئے ہیں ان کے بقول :

> "زندگی جنسیت سے عبارت ہے۔ جب جنسیت حاجت روائی یا ایک عارضی حالت ہو کر رہ جاتی ہے تب محبت ایک نام نہادی اور ذلیل یا گری ہوئی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ تمام جاندار جذبے جنسیت کی تخلیق ہیں..... شدت محبت..... گرویدگی..... فریفتگی خلاقانہ حالتیں ہیں[۳]"

محمد حسن عسکری سخت فرائڈین ہیں چنانچہ انھوں نے "جھلکیاں" کے سلسلۂ مضامین میں ژونگ کو بُرا بھلا کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا لیکن ان کے ایک بہت پرانے مضمون "غدر و ماندگی" سے واضح ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں تخلیقی عمل کے ضمن میں وہ ژونگ

---

[۱] "تنقیدی مسائل" ص ۴۲

[۲] "تنقیدی مسائل" ص ۱۴

[۳] "اُردو کی عشقیہ شاعری" الہ آباد سنگم پبلشنگ ہاؤس ۱۹۴۵ء، ص ۳۰

کے ہمنوا بھی رہ چکے ہیں۔ چنانچہ اجتماعی لاشعور کے تصور کی روشنی میں عسکری نے تخلیقِ فن کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا کہ تخلیق کا سرچشمہ فرد کی ذات میں ضرور موجود ہوتا ہے اس سے مجھے انکار نہیں لیکن آدمی اپنی ذاتی یا اجتماعی الجھنوں کے نکاس کا راستہ فن کو اس وقت بناتا ہے جب یہ ذریعہ معاشرے کے لیے قابلِ قبول ہو اور اس کی اہمیت اجتماعی طور پر تسلیم کی جاتی ہو یعنی معاشرہ خود چاہتا ہو کہ یہ ذریعہ استعمال کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تخلیق صرف فن کار نہیں کرتا بلکہ اجتماعی لاشعور بھی اس میں بڑا حصہ لیتا ہے مبالغے سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ فن کار تو بس اجتماعی لاشعور کا آلہ کار ہوتا ہے[1]۔ یہ نظریہ بہت پرانا ہے۔ شعر کے الہامی سرچشمے کا یہی مطلب ہے[2]۔"

تخلیقی عمل ناقدین کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اس پر وقتاً فوقتاً مقالات طبع ہوتے رہتے ہیں۔ تخلیقی عمل ایک ذہنی وقوعہ ہے اور اس کا تخلیق کار کی نفسیات سے بہت گہرا رشتہ ہے اس لیے غیر نفسیاتی ناقدین بھی اس میں کسی نہ کسی حد تک نفسیات سے امداد لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چند برس پہلے سہ ماہی اوراق (سالنامہ فروری ۱۹۶۸ء) میں اس موضوع پر ایک بہت خیال افروز بحث کرائی گئی تھی جس سے اس اہم مسئلے کی مختلف جہات اجاگر ہوتی نظر آتی ہیں۔ شرکاءِ بحث کے اسمائے ہیں۔ عرش صدیقی (محرکِ بحث) مسعود الرؤف، ریاض احمد، جیلانی کامران، شمس الرحمان فاروقی، اعجاز فاروقی، انور سدید اور ابن فرید، ڈاکٹر عبدالسلام نے بھی تخلیقی عمل کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ قلم بند کیا ہے جس میں اہم مکاتبِ فکر کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سیپ شمارہ نمبر ۲۴) اسی موضوع پر محمود ہاشمی کا مقالہ "تخلیقی عمل کیا ہے" (مشمولہ بہترین ادب ۱۹۶۸ء مرتبہ غلام جیلانی اصغر اور انور سدید) بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اجمل کے مقالے "تخلیق فن کی نفسیات" (مطبوعہ "راوی" نظر نمبر مئی ۱۹۵۳ء) اور ریاض احمد کے مقالے "ادبی تخلیق کا نفسیاتی پس منظر" (مطبوعہ ادبی دنیا جنوری ۱۹۴۳ء) سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔

گو فرائڈ اور ژونگ کے نظریات میں خاصا بُعد ہے لیکن جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا، لاشعور کی صورت میں دونوں کی اساس ایک ہی بنتی ہے۔ اس طرح دونوں نے ذات کو مرکزِ تخلیق قرار دے کر خارجی کوائف کو ثانوی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ محمود ہاشمی نے اپنے مضمون "تخلیقی عمل" میں فرائڈ اور ژونگ کے نظریات کے تقابلی مطالعے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا ہے:

> "ژونگ اور فرائڈ کے نظریات سے جس بنیادی حقیقت کا ادراک حاصل ہوتا ہے وہ ہے فن کی خالص شخصی اور انفرادی حیثیت یعنی تخلیقی عمل اپنی ہر ایک اظہاری صورت میں اظہارِ ذات ہے[3]۔"

---

[1] یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ ژونگ نے بھی ایک موقعہ پر بالکل یہی الفاظ استعمال کیے ہیں:

"اس کارکردگی (یعنی تخلیق میں) شاعر تخلیقی عمل کے ساتھ کلی طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے یا تو اس نے شعوری احساس سے تخلیقی عمل کے تحرک میں خود کو ملفوف کر لیا ہوتا ہے۔ ورنہ یہ اس پر حاوی ہو کر اسے یوں اپنا آلہ یا آلہ کار بناتا ہے کہ تخلیق کا شعوری احساس بھی نہیں رہتا۔ اس صورت میں وہ تو خود ہی تخلیقی عمل بن جاتا ہے۔ اس طرح کہ اس کے دھارے میں ہوتے ہوئے بھی اپنے مقاصد اور توانائی کی بنا پر اس سے ممیز رہتا ہے۔"

"CONTRIBUTION TO ANALYTICAL PSYCHOLOGY" (P. 235)

[2] ماہنامہ ہمایوں دسمبر ۱۹۵۶ء

[3] "ماہنامہ کامران" سرگودھا۔

کلچر میں وابستہ نفسیاتی محرکات اور تخلیق پر ان کی اثر آفرینی اُردو میں کلچر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے نفسیاتی لحاظ سے کم اور غیر نفسیاتی لحاظ سے زیادہ۔ واضح رہے کہ ہر کلچر کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے اور اس لیے کلچر کا مطالعہ محض کسی نظریئے کا اطلاق یا ابطال نہیں ہوتا۔ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ اس وقت اور بھی زیادہ شدت سے ہونے لگتا ہے۔ جب ڈاکٹر محمد اجمل کے مندرجہ ذیل بیان پر غور کریں :

"بلاشبہ ہمیں نئے شہر بنانے اور نئی تہذیب پیدا کرنی چاہیے لیکن اپنا وہ خاص تاریخی کردار کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے جو ہم پر خاص ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ ہمارے کلچر میں معاشرتی علوم سے پہلے فطری علوم نے ترقی نہ کی تھی۔ مغربی ممالک کی طرح ہمارے کلچر میں معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کا شعور فطری علوم کی ترقی اور اطلاق کا نتیجہ نہیں ہے[1]....."

ڈاکٹر محمد اجمل کی اس رائے کی روشنی میں کلچر سے وابستہ نفسیاتی محرکات اور تخلیق پر ان کی اثر آفرینی کا مطالعہ کلچر کی عام اور مروج بحثوں سے قطعی طور پر جُداگانہ صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس ضمن میں راقم اپنے ایک مقالہ "ادب — نرگسیت کے آئینے میں" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہے۔ "معاشرے کے تانے بانے میں جب نقوش اور رنگوں کی وجہ سے انفرادیت پیدا ہوتی ہے وہ کلچر ہی سے عبارت ہیں۔ یہی نہیں کلچر ہی سے کسی خاص عہد کی فضا متاثر ہوتی ہے اور آنے والے تخلیقی اذہان کے لیے فضائے تخلیق کی صورت اختیار کر کے ان کی تخلیقات کو عصری تقاضوں اور ان سے جنم لینے والے نفسی میلانات سے ہم آہنگ کرتی ہے[2]۔" کلچر کن چیزوں سے متاثر ہو کر کس خاص رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس سوال کے جوابات متنوع ہیں اور مختلف اصحاب نے اپنے اپنے انداز پر خوابِ جوانی کی مانند اس کی تعبیریں سوچی ہیں۔ فراق گورکھپوری فرائڈین نقاد نہیں لیکن انھوں نے کلچر کی تشکیل میں جنسی اور جنسی محرکات پر جس شد و مد سے زور دیا ہے وہ کچھ فرائڈ ہی کی یاد دلاتا ہے۔ سوان کے بقول :

"سماج جنسیات کی پیداوار ہے اور جنسیات سماج کی[3]۔"

یہی نہیں بلکہ انھوں نے شاعری اور کلچر کے باہمی تعلق کی مختلف صورتوں کو بھی جنس کے حوالے سے سمجھا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"کسی قوم کے کلچر کا اندازہ کرنے کے لیے کئی طریقے ہیں انھیں میں سے ایک طریقہ اس قوم کی عشقیہ شاعری کی جانچ پرکھ ہے[4]۔"

اسی طرح ایک اور موقع پر اس تصور کی مزید وضاحت میں لکھا :

"عشق اور عشقیہ شاعری دونوں سماج اور سماجی کلچر یا سماجی معیاروں اور روایتوں کی پیداوار ہیں۔ ہمارے

---

[1] "تحلیلِ نفسیات" ص ۱۵۵

[2] ریاض زیدی اور فیاض تحسین (مرتبین) نئے ذائقے ملتان، اُردو اکادمی ۱۹۶۹ء ص ۶۸

[3] اُردو کی عشقیہ شاعری" ص ۱۴۵ [4] ایضاً ص ۱۳۹

جسم ہماری روحیں جس رس میں پکائی جائیں گی جیسا قوام ہمارے جذبات و احساسات کے لیے ہمارا کلچر صدیوں میں تیار کرتا ہے ایسا ہی ہمارا عشق ہوتا ہے اور ایسی ہی ہوتی ہے ہماری عشقیہ شاعری[1]"

یہ طرزِ استدلال یک طرفہ ہے اور اس لیے نزاعی، لیکن اس کی دلچسپی مسلّم!

کلچر کو ایک خاص فضا دے کر اس کا مزاج متعین کرنے میں جنس کے علاوہ اور بھی کئی محرکات کی حیثیت تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے محض جنس تک ہی محدود نہیں کیا جاسکتا۔ کلچر کی تشکیل میں پہلے تو تاریخی، اقتصادی اور سماجی کئی طرح کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ یوں جب کلچر مخصوص اوصاف اختیار کر کے ایک خاص رنگ میں رنگا جاتا ہے تو یہی رنگ استثنائی مثالوں سے قطع نظر بیشتر تخلیق کاروں کے رنگِ طبع کو متاثر کرتا ہے۔ اگر تشکیلی اوامر میں تغیر و تبدل نہ ہونے سے اقدار کے مثبت یا منفی پہلو دیر تک برقرار رہیں تو کلچر سے پیدا ہونے والی ذہنی فضا بھی کیونکہ برقرار رہتی ہے۔ اس لیے بعض افراد کی مانند کلچر کا بھی ایک مخصوص مزاج بن جاتا ہے۔ گریس سٹورٹ نے اس ضمن میں "نرگسی کلچر" کی اصطلاح استعمال کی ہے اس کے بقول:

"بعض اوقات غلطی سے ہی سہی ——— سارا کلچر ہی نرگسی بن جاتا ہے۔ ایسا کلچر مریضانہ، حساسیت، تصرفیت، اہلاک پسندی، حسد، جارحیت، نفرت اور حقارت وغیرہ کی بنا پر اپنے ہیجانات پر قابو پانے میں اگر ناکام ثابت ہو تو وہ پھر اس راستے پر آنکھیں بند کئے گامزن رہتا ہے جو بالآخر اجتماعی خودکشی پر منتج ہوتا ہے[2]"

ژونگ نے اس اجتماعی خودکشی کی کیفیت کے اظہار کے لیے "اجتماعی اعصابی خلل" کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ اور ایسے ہی کلچر میں سانس لینے والوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے گریس سٹورٹ نے لکھا تھا کہ وہ "ہر وقت چوکنا رہتے ہیں کہ کہیں ان سے کوئی سبقت نہ لے جائے۔ نرگسیوں کا ایک جم غفیر ہے کہ ایک دوسرے کے کہنیاں اور گندھے مارتے، دھکیلتے، سازشیں کرتے اور چھل فریب سے کام لے کر بہتر سے بہتر آئینے کے لیے گریباں گیر نظر آتے ہیں[3]"

لکھنوی شعراء اور ان کی تخلیقات پر کلچر کی اثر اندازی کا مطالعہ کریں تو اسے نرگسی کلچر کی جامع اور مکمل مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ سیاسی انحطاط کا زمانہ تھا اس لیے لکھنو میں نرگسی کلچر کے بیشتر منفی پہلو ہی سامنے آئے۔ اختر اورینوی نے اپنے مقالے "عصرِ غالب اور غالب کے قبل و بعد کے میلانات" میں کلچر کی نفسیات سے بحث کرتے ہوئے لکھنوی کلچر کا بھی مطالعہ کیا۔ انھوں نے اسے انحطاط کی پیداوار قرار دیتے ہوئے اس کا تخلیقات سے تعلق متعین کیا ہے۔ یہ ان کے بقول:

---

[1] "اُردو کی عشقیہ شاعری" ص ۱۲۴۔

[2] Stewart, Grace, "Narcissus" London, George & Allen Unwin, 1956 (P-83)

[3] ibid. P-93

"فریبِ زندگی اور سرابِ نشاط انحطاطی منفی سلسلہ دونوں طرح کی تبدیلیاں معاشرے کی تہذیب ثقافت میں عام طور پر پیدا ہوتی ہیں کیونکہ اجتماعی نفسی حالت ویسی ہی ہوتی ہے۔ پھر عام ثقافتی رجحانات کا اثر ادبی زندگی پر بھی پڑنے لگتا ہے.....

لکھنوی کلچر کی عام خصوصیات کا اثر لکھنؤ کے ادب پر پڑا اور ان ثقافتی خصوصیات کی پیدائش اجتماعی نفس کے بطن سے پیدا ہوئی۔[1]"

اختر اورینوی نے کلچر کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے :-

"لکھنوی کلچر کی نفسی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک لاشعوری فریب کھانے کے سبب شعور کی سچی تنقید اور ضمیر کی آواز کو سن ہی نہیں سکتی تھی۔ لاشعور نے شعور کی دردخیز حالت سے اکتا کر خارجی دنیا کی طرف توجہ منعطف کی۔ شعور بیمار ہو کر بالکل بے دست و پا مفلوج ہو گیا۔ توازن قائم نہ رہ سکا اور ایک پُرفریب لاشعوری رَو کے تحت شخصیت سطحی خارجیت کے رنگوں میں مبتلا ہو گئی۔ اُسے پرورشن کہتے ہیں۔ جس طرح فرد کو اس کا مرض لاحق ہوتا ہے..... بالکل اسی طرح کلچر کو بھی اس نوع کا روگ لگ سکتا ہے جب احساس کمتری کے نشتر برداشت نہیں ہوتے تو اس قسم کی پرفریب سنک پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھنوی کلچر ایک اُلٹے دماغ کی تہذیب ہے[2]۔"

دراصل ہوا یہ کہ دلی کے اُجڑنے پر صرف لکھنؤ ہی خوشحالی کا مرکز رہ گیا۔ اس لیے لکھنؤ دربار فن کاروں اور تخلیق کاروں کا آن دانا بھی تھا۔ اس عہد کے عوام اور شعراء میں بھی خود کو دہلی سے ممتاز رکھنے کی شعوری کاوش ملتی ہے (میر امن کی سادہ نگاری کو جب رجب علی بیگ سرور نے محاوروں کے ہاتھ منہ توڑے ہیں۔ کہا تو اس کی وجہ بھی اسی احساس کمتری کے نشتر میں تلاش کی جا سکتی ہے)، غزل کے انداز عشق میں تبدیلی، معاملہ بندی، داسوخت، ریختی اور ان سب سے جنم لینے والی عریانی، فحاشی، ہیجان پن اور ابتذال اور پھر ان سب پر مستزاد رعایت لفظی سے لے کر شوکتِ لفظی تک تمام لفظی دشنگافیوں کو خصوصی اہمیت ہی نہ دینا، بلکہ بعض صورتوں میں تو مقصود فن بھی قرار دینا۔ الغرض لکھنؤ کلچر کے مخصوص انفس مزاج نے اس عہد کی تخلیقات میں یوں رنگ آمیزی کی کہ لکھنؤ کا دبستان شاعری معرضِ وجود میں آ گیا اور یوں اختر اورینوی کے الفاظ میں "لکھنوی کلچر کی ایک خاص نفسی حالت میں ہر شعبہ تمدن پر اپنا سایہ ڈالا۔ ادب و شاعری بھی فریب نشاط اور سماجی خارجیت کے شکار ہوئے۔ لکھنوی دبستان شاعری کی نمود اور اس کا جوش و رقص کسی گہرے بے کراں جذبہ حیات کے نتیجے میں نہیں[3]۔"

---

[1] "تنقید جدید" ص ۱۰۳

[2] ایضاً ص ۱۷۷

[3] ایضاً ص ۱۰۹

کلچر کی تشکیل میں تاریخی حالات اور سماجی کوائف بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں کہ اس لیے ان کا بھی مجمل سا مطالعہ پیش ہے۔

تاریخی حالات کے نفسیاتی اثرات ادیب لاکھ انفرادیت پسند ہو اور اس انفرادیت کے اظہار کے لیے ہر نوع کی آزادی کا طالب بھی کیوں نہ ہو لیکن اس کے باوجود وہ اپنے زمانے کے مخصوص تاریخی حالات کے نفسیاتی اثرات سے نہیں بچ سکتا۔ فرائڈ کی نفسیات میں لاشعور، ماحول سماج اور تاریخی عوامل سے خود مختار نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے اس لاشعور کے اظہار یا اس کے عوامل کے نتیجے میں جو تخلیق معرض وجود میں آئے گی۔ وہ صرف لاشعور کی عکاس ہوگی لیکن ژونگ کی نفسیات میں اجتماعی لاشعور بعید ترین انسانی نسلوں کے تجربات سے عبارت ہے اس لیے اس میں تاریخی حالات کے نفسیاتی اثرات سے دلچسپی کا اظہار نسبتاً زیادہ شدت سے کیا جاتا ہے۔ تاریخی حالات ماضی کے بھی ہو سکتے ہیں اور حال کے بھی۔ اور اس نسبت سے ان کے بارے میں خوابوں سے لے کر تخلیقات تک کی صورت میں نفسی ردعمل کا انداز متعین ہوتا ہے۔ یہ عمل اس وقت تیز تر ہو جاتا ہے جب قوم تاریخ کے کسی نازک موڑ سے دوچار ہو رہی ہو یا ہونے والی ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اجمل کے الفاظ ہیں:

> "جب کبھی معاشرہ کسی غیر معمولی اور ہیجانی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے افراد کے خواب تخیلاتی تصویروں سے لبریز ہوتے ہیں جو اس اجتماع کے افکار و عزائم کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں اجتماعی لاشعور بیدار ہوتا ہے اور حالات کی پکار کا جواب دیتا ہے۔"[1]

ویسے ایک بات یہ ہے کہ ہمارے نفسیاتی ناقدین نے اپنی تحریروں میں تاریخی حالات کے نفسیاتی اثرات کے مطالعے کی بطور خاص کوشش نہیں کی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نفسیاتی ناقدین کی اکثریت فرائڈ سے متاثر ہے اور اس کی تحلیل نفس میں تاریخی حالات وغیرہ سے خصوصی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے لیے ژونگ البتہ بہتر رہنما ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ہمارے ناقدین میں نسبتاً کم مقبول ہے۔

سماجی کوائف کا نفسیاتی مطالعہ تاریخی حالات کے مقابلے میں سماجی کوائف سے نسبتاً زیادہ دلچسپی ظاہر کی گئی۔ اشتراکی ناقدین نے اس ضمن خاصا کام کیا ہے۔ لیکن اردو کے نفسیاتی ناقدین نے بھی بعض ادوات شخصیت کی نفسیاتی تحلیل میں سماجی کوائف کے نفسیاتی مطالعے سے خصوصی نتائج مرتب کئے ہیں۔ چنانچہ "مشرق و مغرب کے نغمے" میں میراجی نے بعض شعرا کے مطالعے میں ان کے عہد کے مخصوص سماجی حالات سے تشکیل پانے والے نفس تناظر کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس ضمن میں اس کا یہ مضمون بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کا تخیل پرست شاعر — ایڈگر ایلن پو!"

اختر اورینوی نے بھی اپنے بعض مضامین میں سماجی کوائف سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے مقالے "حسرت کی انفرادیت" میں لکھتے ہیں: "فن کار کی نفسی قماش ماحول سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور نفس ذہن و ادراک وہ زمین ہے جس میں فن کے پھول کھلتے ہیں"[2] سماجی کوائف کا نفسیاتی مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ کبھی یہ واشگاف انداز میں تو کبھی غیر مرئی طور پر

---

[1] تحلیل نفسیات، ص ۱۰۳ [2] قدر و نظر، ص ۱۰۴

ایسے نفسی محرکات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جو تخلیق کار کے تخلیقی شعور کو ایک خاص رنگ میں رنگنے کا باعث بنتے ہیں۔ نفسیاتی نقاد سماجی کو الف کے نفسیاتی پہلوؤں کو اس لیے بھی مدِ نظر رکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کیسے ایک ہی عہد اور سماج میں سانس لینے والے دو فن کار اپنی اپنی شخصیت کے نفسیاتی تار و پود کے باعث اپنی تخلیقات میں جداگانہ ردِ عمل کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ میر، درد اور سودا تینوں معاصرین تھے۔ لیکن تینوں کی شاعری جداگانہ رنگ و بو کی حامل ہے۔ نہ فرد جامد شے ہے اور نہ سماجی کوائف پتھر کے مجموعے۔ دونوں کی باہمی اثر انگیزی ہی تخلیق کے مخصوص انداز کا تعین کرتی ہے۔ رنگینیٔ یا واسوخت لکھنوی سماج کے علاوہ کسی اور سماج میں نہ لکھے جا سکتے تھے۔

ادب اور اخلاق کا نفسیاتی مطالعہ اخلاقی مباحث اتنے ہی پرانے ہیں جتنا پرانا خود انسان ہے۔ انسان کے حوالے سے فلسفے سے لے کر ادبیات تک میں اخلاق اور اس سے وابستہ مسائل باعثِ نزاع بنے رہے ہیں۔ ادیب آزادیٔ اظہار کے نام پر ہر نوع کی آزادی چاہتا ہے جب کہ علمِ اخلاق معاشرے میں پاکیزگی کی رَو برقرار رکھنے کے لیے ہر اس ادبی اور فنی اظہار کے خلاف ہے جس میں کسی طرح سے بھی عریانیت یا جنسیت آتی ہو۔ جدید نفسیات اور بالخصوص فرائڈین نفسیات نے مذہب اور روحانیت سے لے کر فنونِ لطیفہ اور ادب کی تخلیقات تک سب کی اساس جنس پر استوار کرتے ہوئے تمام مظاہرِ زیست میں جنس کی رنگ آمیزی ظاہر کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں نفسیاتی نقادوں نے پہلی مرتبہ ادب اور فنی تخلیقات کا اخلاقی مغائیر سے ماورا ہو کر مطالعہ کیا۔ اردو میں ادب اور اخلاق یا ادب اور فحاشی کے ضمن میں جتنے بھی مقالات لکھے گئے (اور ان کی تعداد کم نہیں) ان سب کے لکھنے والے ناقدین کی اصل دلچسپی اس مسئلے سے رہی ہے کہ ادب اور اخلاق کی اس کشمکش کا (جس کا آغاز افلاطون کے مکالمات سے ہوا تھا) کوئی باعزت حل تلاش کیا جا سکے[1] جنس کیونکہ اخلاق کی سب سے بڑی دشمن سمجھی جاتی ہے اس لیے سبھی ناقدین نے ادب اور اخلاق کی ہر نوع کی بحث میں جنس کے حسن و قبح کو ضرور مدِ نظر رکھا۔ یوں دیکھا جائے تو ادب اور اخلاق کی بحث دراصل ادب اور جنس کی بحث بن جاتی ہے۔ چنانچہ ادب اور اخلاق کے موضوعات پر لکھے گئے مقالات میں ہم جنس کی بحث پڑھتے ہیں جب کہ ادب اور جنس (یا فحاشی یا عریانی) پر لکھنے والا اخلاقی مسائل حل کرتا نظر آتا ہے اور پھر ان سب مباحث سے جنم لینے والی ایک اور اہم ترین اور بے حد نزاعی بحث ہے ادبی احتساب کی بحث۔ اردو ناقدین (نفسیاتی یا غیر نفسیاتی کی تخصیص نہیں) نے اس موضوع اور اس سے وابستہ دیگر مسائل پر خوب لکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیشتر لکھنے والوں کے ہاں اخلاق کے مروج تصور کو مسترد کرنے کا رجحان نمایاں تر ہے۔ مثلاً علی عباس جلال پوری نے اپنے ایک خاصے پرانے مقالے "آرٹ اور اخلاق" میں آرٹ اور فنی تخلیق کے ضمن میں جنس کی کارفرمائی پر زور دے کر اخلاقی قواعد و ضوابط کو مسترد کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا:

"جس نفسیات کی ترقی سے کئی پرانے اخلاقی تعصبات کی قلعی کھل گئی ہے۔ اب علمائے نفسیات نے

---

[1] مزید دلچسپی کے لئے ملاحظہ ہو "اخلاقیات نفسیات کی روشنی میں" از باقر رضوی مطبوعہ "نفسیات" (اپریل ۱۹۴۹ء)

یہ حقیقت تسلیم کرلی ہے کہ جنسی جذبے کا ضمیر کئی قسم کے غیر معمولی رجحانات سے اٹھایا گیا ہے۔ بعض لوگوں میں یہ رجحانات اُجاگر ہوتے ہیں اور بعض میں دَب کر رہ جاتے ہیں۔ ان نفسی تبدیلیوں کا انحصار وراثت اور ماحول پر ہوتا ہے۔ اگر نسوانی جذبات کے غیر معمولی غلبے سے کسی مرد کا ذکوری توازن بگڑ جائے تو اس بے چارے کو معذور سمجھنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے۔[1]"

دراصل جدید نفسیات نے اخلاق اور اس کے متنوع معیاروں کو مسترد نہیں کیا۔ بلکہ ان کے بے لچک ہونے سے جو معاشرتی پابندیاں فرد میں نفسیاتی اُلجھنوں کی موجب بنتی ہیں اُنھیں یوں اجاگر کیا کہ خود اخلاقی معیار بھی ڈانواں ڈول ہوتے نظر آنے لگے۔ اس ضمن میں دیوندر اسر نے اپنے مقالے "ادب اور لاشعور" میں ایک نیا نکتہ نکالا ہے:

"جدید نفسیات نے اخلاقی اقدار کے بجائے شخصیت کے فطری اور غیر فطری ہونے پر زور دیا ہے۔ جس کے باعث احساسِ گناہ کا کرب کم ہوگیا ہے۔ کیونکہ ادیبوں نے اپنے کرداروں کو بداخلاق پیش کرنے کی بجائے مسخ اور ماحول کا شکار کے رُوپ میں پیش کیا ہے[2]۔"

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ:

"نفسیاتی پس منظر میں اخلاقی شعور ادبی تخلیق کی اہمیت اور قدر کو بڑھا دیتا ہے۔"

بالفاظِ دیگر نفسیاتی نقاد اخلاق دشمن نہیں بلکہ نفسیات کے ذریعے سے اخلاقی مسائل کی تفہیم کے لیے ایک نیا اور بہتر تناظر مہیا کرتے ہوئے ادیبوں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے قارئین میں بھی ایک نئی آگہی پیدا کرتا ہے۔ سیپ کراچی (شمارہ نمبر ۱۴) میں ادب اور فحاشی کے موضوع پر ایک مذاکرہ ہوا تھا جس میں ڈاکٹر احسن ـــ فاروقی۔ اے۔ بی۔ اشرف اور سلیم اختر کے مقالات طبع ہوئے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے "ادب میں عریانی کا سوال" میں اپنی ذات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس نازک موضوع پر بڑے لطیف انداز سے روشنی ڈالی تھی۔ ان کے بقول:-

"جنس کے سلسلے میں زیادہ تر بے راہروی، بداخلاقی اور ذہنی بگاڑ کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جنس جنسی اعضا اور جنسی تعلقات کی بابت صاف اور واضح خیالات رکھنے سے روکے جاتے ہیں۔ اگر ان کو صاف صاف باتیں بتا دی جائیں تو وہ چیز جسے جنسی شوق (سیکس کیوریسٹی) کہتے ہیں کم ہو جاتی ہے اور وہ خواہشات مٹ جاتی ہیں جو بداخلاقیوں کی بنیاد ہوتی ہیں..... اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے گھر کے ماحول میں عریانی سے دُور رکھنے کی کوشش اور ایسا مزاج بنانا کہ عریانی سے دلی نفرت ہو پرانے ڈگر پر چلنے چلانے کا ایک مخصوص عمل تھا جس میں رچ کر میرے اندر عریانی کے خلاف ایک غلط

---

[1] ماہنامہ ادبی دنیا اپریل ۱۹۴۳ء

[2] "فکر اور ادب" دہلی مکتبہ قصر اُردو ۱۹۵۸ء ص ۶۵

تعصب پیدا ہو گیا تھا۔ اصل میں جنس کی بابت معلومات نہ ہونا ہی تمام بد اخلاقی کی جڑ تھی.....
مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ باوجود بااخلاق ہونے کے میرے اندر ایک شوق ضرور تھا جس کو میں زبردستی چھپانا چاہتا تھا اور جس کو چھپانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عریانی کو پست کہوں مخرب اخلاق کہوں اور ام مورل کہتا پھروں۔ چنانچہ جو لوگ عریانی پر بہت سے اعتراض جڑ دیتے ہیں وہ اگر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو محسوس کریں گے کہ وہ دل ہی دل میں عام بدتمیزوں سے کسی طرح بہتر نہیں ہیں، عریانی سے یک لخت نفرت اور اس کے خلاف بے تحاشا شور مچانے لگنا جیسا کہ میں نے مورل ہائڈجین کے درس کے سلسلے میں کیا تھا ایک قسم کی ذہنی خرابی ہے۔[1]"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے جنس، ادب میں اس کے اظہار اور قاری کی اخلاقی اقدار کا تجزیہ بڑے لطیف انداز میں کیا ہے اور اس اہم موضوع پر ایک نئے زاویئے سے روشنی ڈالی ہے۔ جہاں تک ادبی احتساب[2] کا تعلق ہے تو شاید ہی کسی بالغ نظر نقاد نے اسے غیر مشروط طور پر سراہتے ہوئے اس کا پرچار کیا ہو۔ اور نہیں تو محض اس وجہ سے کہ احتساب کس فحش ادب پارے کے مُضر اثرات کا سدِ باب کرنے کی بجائے الٹا اس کا اشتہار بن جاتا ہے۔[3] ڈاکٹر احسن فاروقی کے خیال میں "اصل میں سارا معاملہ نقطۂ نظر کا ہے یعنی ہم زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔[4]"

دیوندر اسر نے اپنے مقالے "ادب اور فحاشی" (مطبوعہ تحیفہ لاہور نمبر ۶) میں بھی اس مسئلے پر مفصل بحث کرتے ہوئے بڑ دوہ کے اس جج کا بیان نقل کیا ہے جو اس نے البرٹو مراویہ کے ناول "دی وومن آف دی روم" کے مترجم اور ناشر کو فحاشی کے الزام سے بری الذمہ قرار دیتے ہوئے لکھا:

"فن بالغ لوگوں کے لیے تخلیق ہوتا ہے اس کا معیار بھی بالغ لوگوں کی نظر سے معین کرنا چاہیئے کسی نے درست کہا ہے کہ فن اور دوشیزاؤں کا ملاپ ممکن نہیں اور ان کو یکجا کرنے کی کوشش بے سُود ہے۔ اس سے کسی فن کار کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نوجوان لوگوں کو ان کی عمر اور ذوق کے مطابق صحیح ادب دیا جائے۔ میں صرف یہی چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی راہ نکالی جائے جس سے کہ ناول نگار کو یہ آزادی ہو کہ وہ اپنے دور کے مذہبی اور اخلاقی احساسات کو جیسا وہ محسوس کرتا ہے بیان کر سکے اور اسے مجبور

---

[1] سیپ کراچی نمبر ۱۴ - ۱۹۶۸ء

[2] فحاشی کے قانونی پہلوؤں کے بارے میں مزید دلچسپی رکھنے والے حضرات ان مقالات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ (۱) قانون اور فحش نگاری" از شہزاد منظر ماہنامہ افکار نمبر ۱۱۶ - ۱۹۶۱ء -

[3] اس مسئلے پر ماہنامہ "کتاب" لاہور نے ایک جائزہ شائع کیا تھا۔ شرکا کے نام یہ ہیں: شار طاہر، اطہر عارف اور ٹونی (مطبوعہ مارچ ۱۹۷۵ء)

[4] سیپ نمبر ۱۴ - ۱۹۶۸ء

کیا جائے کہ وہ والدین اور گارجین کے لیے لکھے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش روایتی اعتقادات کے مطابق کس طرح کر سکتے ہیں۔ محافظ الاخلاق اس بات کی دُہائی دیتے ہیں کہ ایسے ادب کا نوجوان لوگوں پر کیا اثر پڑے گا۔ ایسا ادب بالغ لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ اگر لوگ طبعی عمر سے بالغ ہو جائیں اور ذہنی طور پر بالغ نہ ہوں تو وہ بھی ایسے ادب سے صحت مند اثر قبول نہیں کریں گے۔ نابالغ اور بیمار ذہن کے لوگ جنس پر لکھی گئی سائنٹفک کتابوں اور ان کی تصاویر سے جنسی لذت اخذ کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کتابیں تحریر نہیں ہونی چاہئیں کس عمر کے لوگ کیسی کتاب پڑھیں اس پر غور کرنا چاہیے نہ کہ ادیب کی آزادی سلب کر لی جائے اور کتابوں پر پابندی لگا دی جائے کیونکہ عام عمر کے لوگوں کے ہاتھ میں ایسی کتابوں کے پڑ جانے کا خطرہ ہے۔ پرہیزگار قسم کے لوگ اس کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں کہ کیا فحش نہیں۔ فحاشی پوشیدگی میں ہوتی ہے۔ دی نیوڈ میں فحاشی نہیں لیکن جب احساس پر ہنگی کا ہو تو فحاشی ہے اور اگر لباس اس انداز سے پیش کیا جائے جس میں پوشیدگی کے ذریعے جنسی تجسس پیدا کیا جائے فحاشی اس میں ہے[1]۔"

(یہ مضمون دیوندر اسر کی کتاب "ادب اور نفسیات" میں بھی شامل ہے) فحش ادب کے بارے میں ماہنامہ کتاب لاشعور میں مئی ۱۹۴۰ء کے شمارہ میں ایک سروے شائع کیا تھا جس سے اس مسئلے پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ شرکا کے اسمائے یہ ہیں: ستار طاہر، عاصم صحرائی، محمد بدر منیر اس کے ساتھ ساتھ الوارشد کے مقالے "لٹیا ادب" (مطبوعہ ادبی دنیا دسمبر ۱۹۴۶ء) سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے جہاں تک احتساب کے مسئلے کا تعلق ہے تو وجیہ الدین نے اپنے مقالے "جنس، فساد اور احتساب" میں مشروط طور پر احتساب کو یوں تسلیم کیا کہ نہ ہونے کے برابر:۔

"جنسیات سے متعلق ادب کو قابلِ احتساب قرار دینے کا ارادہ کچھ ایسا غیر مستحسن نہیں۔ ہاں، یہ محتسب ماہرین تعلیم، ماہرین نفسیات اور خود ادیب ہونے چاہئیں۔ نام نہاد اخلاقیات کے اجارہ دار نہیں[2]۔"

——— اور ظاہر ہے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

موضوع اور مواد کی نفسیاتی اہمیت

موضوع اور مواد کا مطالعہ ایک لحاظ سے ادیب کے تخلیقی عمل کے اس پہلو کا مطالعہ بن جاتا ہے جسے انتخاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آخر کار کیا وجہ ہے کہ مختلف لکھنے والے ایک ہی زمانے میں سانس لینے اور اپنے عہد کے سماجی، تاریخی اور اقتصادی مسائل سے دوچار ہونے کے باوجود ان کے بارے میں متنوع، مختلف بلکہ بعض اوقات تو متضاد ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حالی اور اکبر الہ آبادی نے ایک ہی تاریخی واقعے سے جنم لینے والے حالات کے

---

[1] صحیفہ نمبر ۶ [2] "ادبی دنیا" نومبر ۱۹۴۹ء

پس منظر میں لکھا، لیکن دونوں کا انداز نظر کیوں ایک دوسرے کی ضد تھا۔؟

جدید تنقید نے موضوع اور مواد کی اہمیت کو تسلیم تو کیا، لیکن پس منظر میں کارفرما اس "کیوں" کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا کہ کیوں ایک لکھنے والے نے ایک موضوع کو بے حد اہمیت دی جب کہ اس کے ہم عصروں نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس "کیوں" کے جواب کے لیے نفسیات سے رجوع کی ضرورت ہے۔ نفسیات ہی تخلیق کار کی شخصیت کے نفس ناطق پر کے تجزیے کی صلاحیت رکھتی ہے اور وہی اس پر روشنی ڈال سکتی ہے کہ میر کے کلام میں کیوں آہ ہے اور سودا کے کلام میں کیوں نہیں؛ دبستانِ لکھنؤ سے متعلق ہونے کے باوجود آتش نے اس عہد کی عریانی اور ابتذال سے بالعموم خود کو کیوں بچائے رکھا؛ یا غالب، ذوق اور مومن معاصر تھے، لیکن اتنے مختلف کیوں؛ ریاض احمد نے اپنے مقالے "جدید اُردو تنقید کا پس منظر" میں نفسیاتی تنقید کے ضمن میں اس "کیوں" کا سوال اُٹھایا ہے۔

> "نیاز فتح پوری کو بیک وقت الٰہیات اور جنسیات کی طرف راغب کرنے والی چیز کونسی تھی، یا ابوالکلام آزاد اپنی تمام مولویت کے باوجود "تذکرہ" میں فسق و فجور کی راہوں کا ذکر شک کے کانٹوں کے ساتھ کیوں کرتے ہیں اور "غبارِ خاطر" میں وہ کون ساجذبہ ہے جو انھیں مغربی موسیقی کا ایک ریکارڈ سن کر مصری مغنیہ کے حسن و جمال کی داستان تک کہہ دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔"[1]

——— یہ اور اسی نوع کی تمام "کیوں" کا جواب تخلیقی شخصیت کے اس لاشعوری عمل میں نہاں ہے جو اس میں ایک خاص موضوع سے لگاؤ پیدا کرتا ہے اور زندگی کے پر تنوع ہنگاموں، وقوعات اور حوادث میں سے کسی ایک کو بطور مواد منتخب کروا کر بقیہ کو مسترد کروا دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر ادیب کا اس کے مخصوص حالاتِ زندگی اور نفسی حوادث کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہوئے اس کے فن اور محبوب موضوعات کا جائزہ لینا ہوگا۔

(۲)

اسلوب کا نفسیاتی مطالعہ

اسلوب شخصیت کا اظہار ہے یا اس سے فرار؛ یہ ایک نزاعی مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایسا سوال ہے جس کے جوابات میں مزید سوالات پنہاں ہیں۔ کیا اسلوب کا ادیب کی شخصیت سے کوئی رابطہ ہے؛ اسلوب میں انفرادیت کن محرکات کے تابع ہوتی ہے؛ کیوں ایک صاحب اسلوب ہے اور دوسرا نہیں؛ یہ اور اسی نوع کے دیگر سوالات نے ناقدین کو ہمیشہ اُلجھائے رکھا ہے اور عصری تنقید کا خاصا حصہ صرف اسلوب سے وابستہ مباحث کے لیے وقف نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر نفسیاتی[2] کے ساتھ ساتھ اُردو کے نفسیاتی ناقدین نے بھی اس ضمن میں خاصا کام کیا ہے۔

---

[1] ماہنامہ "ماحول" راولپنڈی شمارہ نمبر ۶، ۷ - ۱۹۵۵ء [2] غیر نفسیاتی ناقدین میں عابد علی عابد کی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اسلوب کے نفسیاتی مطالعے کے بارے میں ہر بحث سے قبل اس حقیقت کا ذہن نشین رکھنا لازم ہے کہ خود فرائڈ نے یہ اعتراف کیا تھا کہ تحلیل نفسی اسلوب پر بطور خاص کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلوب کا مطالعہ نفسیاتی تنقید کے مباحث سے خارج کر دینا چاہیئے یا یہ کہ اس کے بارے میں نفسیات سے کسی طرح کی بھی امداد نہیں لی جا سکتی۔

کبیر احمد جائس (علیگ) نے اپنے ایک مقالے "ادب اور نفسیات" میں نفسیاتی تنقید کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اسلوب کے ضمن میں یہ لکھا ہے کہ "نفسیاتی تنقید ان عوامل کا بھی مطالعہ کرتی ہے جو کسی اسلوب یا ہیئت یا فکر کے پس پردہ کام کرتے ہیں۔[1] اسلوب کے نفسیاتی مطالعے میں خاصی دقت نظری سے کام لیا گیا ہے اور لکھنے والے کے محبوب الفاظ سے لے کر تکرارِ لفظ تک سبھی سے دالبطہ معانی اجاگر کرنے کی سعی ملتی ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ فعل کا کثرتِ استعمال اس بات پر دال ہے کہ شاعر میں عمل قوت جوش تر ہے، صفات کا استعمال جذباتی شدت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔[2]"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اپنے مقالے "تنقید اور نفسیات" میں مشروط طور پر اسلوب کی نفسیاتی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے یہ لکھا :-

> "کسی خاص مصنف کے محبوب الفاظ اس کے مخصوص استعارے اس کے پسندیدہ تکیہ ہائے کلام جن کو وہ بار بار دہراتا ہے اس کے باطنی کوائف کا عکس ہیں۔ انھیں الفاظ و استعارات کو اس کے نفس کی کلیدوں کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور انھیں سے مصنف کی باطنی دنیا کے ہزاروں راز معلوم کئے جا سکتے ہیں..... شبلی کے تکیہ ہائے کلام اور محبوب الفاظ (غور کرو، عجیب راز ہے نکتہ وغیرہ) اور اس کے استعاروں کا مخصوص رنگ (اچانک پن، طراری، ہیجانی کیفیت وغیرہ) اور اس نوع کے لاتعداد خارجی خصائص شبلی کی نفسی حالتوں کا راز آشکار کرتے ہیں۔ پھر ان کو اکرام کے "غالب نامہ" کے ساتھ ملا کر پڑھئے تو نفسیاتی مطالعے کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔[3]"

اسلوب کا مطالعہ ادیب کی شخصیت کے مطالعے کی ذیل میں آتا ہے۔ اس مسئلہ پر حامد اللہ افسر نے "تنقیدی اصول اور نظریے" میں خاصی روشنی ڈالی ہے۔ مگر انداز نفسیاتی نہیں) محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور مولانا صلاح الدین احمد اردو نثر میں اسلوب کے تنوع کی چار منفرد مثالیں ہیں۔ ان سب کے اسلوب کو ان کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کے تناظر میں رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ کلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر ہی سہی۔ چنانچہ ریاض احمد نے اسلوب پر اپنے مقالے میں اسی خیال کا اظہار کیا :

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تالیف "اسلوب" سرفہرست قرار دی جا سکتی ہے جس میں انھوں نے اسلوب کی تعریف یوں کی: "اسلوب درحقیقت معانی اور ہیئت یا مافیہ اور پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔" (ص ۷۸)

[1] ماہنامہ "ادبی دنیا" اکتوبر ۱۹۶۷ء

[2] "تنقیدی مسائل" ص ۳۳

[3] "مباحث" ص ۳۸۱، ۳۸۲ ؛

"اسلوب کے تراوش کسی ادبی مسلک کی تقلید و تتبع کی بجائے براہِ راست شخصیت کے انداز سے تشکیل پاتی ہے اور اچھے اسلوب کے پسِ پشت شخصیت یا انا کا ایک توانا مثبت اور پُر اعتماد احساس کارفرما ہوتا ہے۔ جہاں یہ اعتماد مجروح ہوا وہاں اسلوب بھی مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ایک ڈانواں ڈول اکھڑی اکھڑی شخصیت کسی طور پر بھی ایک مستقل اور منفرد رنگِ طبیعت اختیار نہیں کر سکتی۔[۱]"

علامت کی نفسیاتی اہمیت

اسلوب کے ضمن میں علامت کا مطالعہ بے حد اہم ہے۔ یہی نہیں بلکہ علامت اسلوب کے ان عناصر میں سے ہے جن کی تشریح و تفہیم کے لیے نفسیات سے بطور خاص امداد بھی لی جا سکتی ہے۔ اُردو میں علامات کے ضمن میں ڈاکٹر محمد اجمل، محمد حسن عسکری اور سجاد باقر رضوی اور بعض دوسرے ناقدین نے بھی خاصا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل ان ناقدین میں سے ہیں جو نفسیات کو محض ادبی تخلیقات پر منطبق نہیں کرتے بلکہ وہ نفسیات کو اپنے معاشرے اور عصر کی تفہیم کے لیے ایک کلید جانتے ہوئے اس کے دائرہ کار کو وسعت دیتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے مقالے "نئے ادب کی قدریں" میں علامت پر بے حد دلچسپ اور معنی خیز بحث کی ہے۔ اُنھوں نے اشتہاری آواز اور علامات میں امتیاز کرتے ہوئے لکھا:

"اشتہاری آواز اور علامت میں یہ فرق ہے کہ جہاں یہ آواز انسان کی ایک علیحدہ ضرورت کو متحد کرتی ہے وہاں مذہبی علائم فکر اور جذبات کے ہر پہلو میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کے ساتھ افکار، احساسات، جذبات اور یادوں کا ایک ایسا تانا بانا وابستہ ہوتا ہے جو ایک ہی ضرب میں ان سب کو مرتفع اور مستقل کر دیتا ہے۔ سلوگن یا اشتہاری صدا سے شخصیت کا ایک جزو باقی اجزا سے کس قدر علیحدگی حاصل کر کے متحرک ہوتا ہے۔ لیکن علائم سے ایک پورا کمپلیکس عمل میں آتا ہے۔ کمپلیکس ایک پیچیدہ حرکت ہے جس کے ایک تار کی جنبش سے سارا مرکب جھنجھنا اُٹھتا ہے۔ جب ہم کربلا، کلیم اور مسیح کا ذکر کرتے ہیں تو یہ محض الفاظ نہیں ہوتے، اہم ذہن اور رُوحانی حقائق کا بیان ہے[۲]۔"

ڈاکٹر محمد اجمل نے علائم کے سلسلے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ عام زندگی میں علا[illegible] کے نفسی کردار پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل علامت کی اہمیت کے کس حد تک قائل ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:۔

"علامت بندی کا عمل انسانی نفس کا اعلیٰ ترین وظیفہ ہے[۳]۔"

اگر یہ صحیح ہے اور واقعی انسانی نفس اعلیٰ ترین کارکردگی کا اظہار علامت بندی سے کرتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ عام انسانوں سے زیادہ شدت احساس کا حامل اور تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ادیب اپنی تخلیقات میں علامات سے مفر حاصل کرے۔ علامات

---

[۱] "تنقیدی مسائل" ص ۱۷۲

[۲] "راوی"، گورنمنٹ کالج لاہور، دسمبر ۱۹۶۶ء

[۳] "تحلیلِ نفسیات" ص ۱۱۱ ؛

شعور اور لاشعور کے درمیان ایک ایسے پل کا کام کرتی ہیں جس کا ایک سرا خوابوں کے پُراسرار دھندلکے میں گم ہے تو دوسرے پر تخلیقات کے چراغ فروزاں ہیں۔

عام عقیدے کے برعکس علامات جدید شاعری سے ہی مخصوص نہیں۔ جدید ناقدین نے قدیم داستانوں تک سے بھی علامات کا سراغ لگایا ہے۔ آج کا باشعور نقاد داستانوں کو محض بے لگام تخیل کی پیداوار نہیں سمجھتا بلکہ ان میں علامات کا ایک جہاں آباد دیکھتا ہے۔ ایسی علامات جو اس عہد کی تہذیب و تمدن اور ان سے وابستہ نفسیاتی تقاضوں کی تفہیم کے لیے کلید بن جاتی ہیں۔ اس ضمن میں شمیم احمد کے مقالے "طلسم ہوشربا کی علامتی اہمیت" سے ایک اقتباس پیش ہے:

> "داستان طلسم ہوشربا تخیل کی پیداوار ہے جس کی علامات اور تمثیلات میں ایک دور اور ایک قوم کی روح جگمگاتی نظر آتی ہے۔ وہ دیووں اور پریوں کی داستان نہیں ہے بلکہ اپنے ہزاروں کرداروں میں ہمارے لیے وہی قدیم سرمایہ فراہم کرتی ہے جس پر صدیوں کے بعد علم النفس کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ نفسیات کی پیدائش سے پہلے دنیا میں اعلیٰ ترین ادب پیدا نہیں ہوا تھا، اگر ہوا تھا تو وہ اس تخیلی قوت ہی کا معجزہ تھا۔"[1]

شمیم احمد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ژونگ کی نفسیات کے عین مطابق ہیں۔ گو اُردو میں نفسیاتی لحاظ سے قدیم داستانوں کا زیادہ مطالعہ نہ کیا گیا۔ حالانکہ علامتی مطالعے کے لحاظ سے "آرائشِ محفل" جیسی داستانیں اپنے اندر بہت کچھ رکھتی ہیں۔ آج جدید افسانے میں علامت پسندی ایک باقاعدہ رجحان کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اگر اس کا مطالعہ قدیم داستانوں کے تناظر میں کیا جائے تو بعض امور میں جدید علامتی افسانے کی بھی "قدامت" واضح کی جا سکتی ہے۔ شہزاد منظر نے اپنے مقالے "افسانے میں رمز و علامت کا استعمال" میں لکھا ہے کہ اُردو کے علاوہ ہندی اور بنگلہ کے ہندو ادیبوں نے بھی قدیم داستانوں اور دیومالائی کرداروں کو نئے مفہوم میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان میں مائیکل مدھوسودن دت کی میگھ ناتھ بودھ کاویہ اور بھگوتی چرن ورما کا ناول "چترلیکھا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو میں اس کی واحد مثال ممتاز شیریں کا طویل افسانہ "میگھ ملہار" ہے۔[2]

علامت کا فرائڈ، ایڈلر اور ژونگ کے نظریات کی روشنی میں مطالعہ

علامت کا مطالعہ عام زندگی میں ہو یا تخلیقِ فن میں، افسانے میں ہو یا نظم میں، ایک امر کا ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے کہ علامت خلا میں جنم نہیں لیتی۔ اسی طرح لاشعور سے علامت کے ظہور کا بھی یہ مطلب نہیں کہ لاشعور کوئی اندھا کنواں ہے جہاں سے کسی جادوگر کے

---

[1] "نیا دور" کراچی۔ شمارہ نمبر ۳۴-۳۳

[2] اوراق۔ افسانہ نمبر جنوری ۱۹۷۰ء۔ اس افسانہ نمبر کے بعض مقالات اُردو افسانے میں علامت کے سلسلے میں کارآمد معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو (۱) داغ، "نئی تثلیث نیا نظریہ" از صہبا وحید اور (۲) اُردو افسانے کا نفسیاتی دبستان، از غلام حسین اظہر۔

چھو منتر سے علامت کنول کے پھول کی طرح تیرتی سطح آب پر آجاتی ہے چنانچہ بقول محمد علی صدیقی :

"کسی بھی قوم کی علامتوں کو چھاننے کے لیے اس قوم کی پرانی اور توہمات سے اٹی تاریخ کا کھنگالا بھی ضروری ہے ..... پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آیا تاریخ کا کوئی گوشہ شعوری طور پر نیم دانستہ نہیں ہے، ایسی صورت میں اس قوم کا مزاج بڑا پر پیچ ہوگا اور وہ ذہنی فساد میں مبتلا ہوگی[1]"

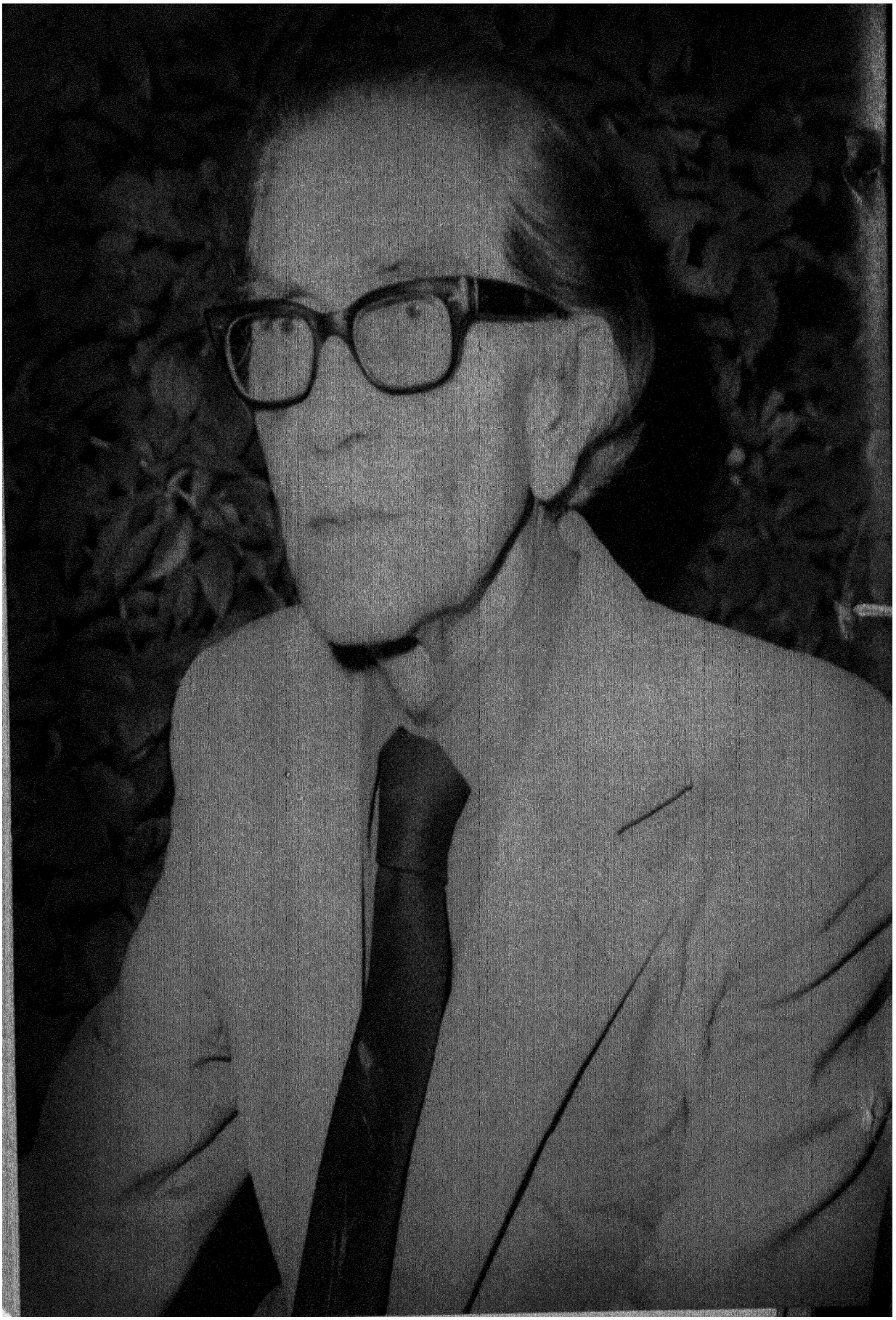
علامت کی تفہیم و تشریح کے ضمن میں اس عمومی تناظر کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کیونکہ فرد اپنی قوم سے منقطع خلا میں سانس نہیں لیتا۔ فرائڈ کا تصورِ علامت اس کے نظریۂ خواب سے منقطع اور جداگانہ نہیں بلکہ اسی کی ضمنی پیداوار ہے۔ ہمارے یہاں بالعموم فرائڈ کے تصورات پر بحث ہوتی رہتی ہے اس لیے یہاں ان سب باتوں کے اعادہ سے بچتے ہوئے صرف اس امر کو اُجاگر کیا جاتا ہے کہ فرائڈ کے بموجب خواب کی اساس جنس پر استوار ہے۔ لاشعور اس کا محرک بنتا ہے اور علامت وہ زبان ہے جس میں خواب کے صفحات پر لاشعور اپنی ناآسودگی کی داستان رقم کرتا ہے۔ جبکہ تحلیل نفس اس عبارت کو سمجھنے کے لیے لغت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حد تک کہ فرائڈ نے معروف علامات سے وابستہ جنسی معانی کی ایک باضابطہ فہرست بھی مرتب کر دی تھی۔

ایڈلر کو فرائڈ کے برعکس جنس وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس کے بموجب انسان بنیادی طور پر حصولِ برتری کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے خوابوں کی علامات اس کے احساسِ کمتری کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ احساسِ کمتری بالعموم عضوی خامیوں سے جنم لیتا ہے اس لیے ایڈلر کے خیال میں خوابوں کی علامات حصولِ قوت و اقتدار کے جذبات اور دوسروں پر برتری کی خواہشات کی عکاسی کرتی ہیں۔ جب کہ ژونگ کے بموجب خوابوں اور علامتوں کا منبع (اور تخلیقات کا سرچشمہ) اجتماعی لاشعور قرار پاتا ہے۔ ژونگ نے خوابوں کی علامات کی تحلیل و تشریح کے لیے قدیم دیومالائی مذہبی صحائف لوک کہانیوں حتیٰ کہ کیمیا گری تک سے امداد لے کر ان کی تفہیم کے دائرے کو وسیع اور ان سے وابستہ امکانات میں نہ در نہ جہات کا اضافہ کر دیا۔ محمد حسن عسکری نے ژونگ کی شدید مخالفت کی ہے چنانچہ انہوں نے ایک فرانسیسی مصنف اور نومسلم رینے گینوں کی کتاب "مقدس علم کی بنیادی علامتیں" پر اپنے تبصرے میں فرائڈ اور ژونگ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ لکھا :

"ژونگ نے فرائڈ سے بغاوت کرتے ہوئے ایمانداری سے بھی فراغت حاصل کر لی۔ فرائڈ نے تو صاف صاف لفظوں میں کہا تھا کہ علامتوں کا صحیح مطلب آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا تھا، پہلی دفعہ میں سمجھا ہوں، ژونگ نے پرانی تہذیبوں کی باطنیت اور عقلمندی سے بات شروع کی۔ چین، تبت اور ہندوستان کی مقدس کتابوں کے حوالے لیے جس سے یہ دھوکا پیدا ہوا کہ ژونگ کو پرانے علوم پر عبور حاصل ہے مگر علامتوں کی تشریح اس طرح کی جس کا روائتی معنوں سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ یعنی ژونگ نے قدیم

---

[1] "ادب میں علامت پسندی" (مطبوعہ سیپ شمارہ ۱۴)



حکمت کا نام لے کر قدیم حکمت کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ کام ہے جو ہماری روایت کے اعتبار سے دجّال کا کام ہے[1]۔"

محمد حسن عسکری نے بڑے تند لہجے میں تنقید کی ہے لہٰذا اس کے جواب میں ڈاکٹر محمد اجمل کی رائے نقل کی جاتی ہے کہ عسکری خود بھی ان کے بہت قائل ہیں۔ ڈاکٹر اجمل اپنے مقالہ "علامت پسندی اور ادب" میں رقم طراز ہیں:۔

"اب مجھے علامتی واردات کی دو خصوصیتیں بیان کرنے دیجئے۔ ایک خصوصیت تو ہے لاہوتیت اور دوسری نورانیت۔ لاہوتی سے میری مراد بقول ژونگ وہ اثر انگیزی ہے جو اسرار کا حامل ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ خصوصیت عقلی اصولوں اور ناقدانِ فہم کی مدد سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی، نورانی سے میری مراد وہ خصوصیت ہے جو روشنی کے ہالے، روشنی کے دائرے یا روشنی کے کسی اور انداز کی حامل ہو اور یہی اس واردات کی عین خصوصیت ہے۔ اب دیکھئے کہ تمام مذہبی واردات لاہوتی بھی ہوتی ہیں اور نورانی بھی۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ خالص شعری وارداتیں مذہبی وارداتوں سے بہت قریب ہوتی ہیں۔ ہر خالص شعری واردات علامتی ہوتی ہے۔ وہ شعوری رویے اور لاشعوری رویے کے مابین واسطے کا کام انجام دیتی ہے۔ شعور ایک سوال پوچھتا ہے اور جواب میں لاشعور کوئی علامت یا علامتوں کا کوئی سلسلہ جس کا اساطیر اور لوک ودیا میں اظہار ہو فراہم کر دیتا ہے۔ نخستینی شکلوں کا حامل لاشعور علامتوں ہی کے ذریعے سے بہترین طور پر اپنا اظہار کر سکتا ہے[2]۔"

ان تینوں ماہرین نفسیات کے طریقِ کار کو صرف ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ خواب میں سانپ دیکھنا فرائڈ کی رُو سے مردانہ عضو تناسل ہے تو ایڈلر اسے دوسروں کو خوف زدہ کرنے سے تعبیر کرے گا۔ جب کہ ژونگ کے بموجب یہ عبودیت کی علامت ہے (واضح رہے تہذیب کے مختلف ادوار میں ناگ پوجا ہوتی رہی ہے) علامت ایک ہے لیکن تین نظریات نے اسے جداگانہ بلکہ متضاد معنی پہنا دیئے۔

ادب اور خوابوں کی علامات کا نفسیاتی رابطہ

ادب اور خوابوں کی علامات کے نفسیاتی رابطے کی تفہیم سے پیشتر اُن کے اختلافی امور کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ دونوں میں خلوت اور جلوت اتنا فرق ہے۔ خواب پرائیویٹ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی علامات بھی ذاتی اور نجی ہوتی ہیں جب کہ ادب میں مستعمل علامات ذاتی ہوتے ہوئے بھی یوں ذاتی نہیں رہ جاتیں کہ ادیب انھیں قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ وہ علامات کو ابلاغ کے لیے بروئے کار لاتے ہوئے گریز پا کیفیات کی ترسیل کا ایک ذریعہ بناتا ہے۔ تخلیقات میں علامت شعوری طور سے وضع نہیں کی جا سکتی کہ ساختہ علامات مصنوعی ہوتی ہیں اس لیے ان کی نفسیاتی اہمیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ جس طرح بالارادہ خواب نہیں دیکھے جاتے۔ اسی طرح بالمقصد علامات

---

[1] "فنون" شمارہ ۴ - ۱۹۶۶ء - [2] "سویرا" - لاہور نمبر ۳۷ ؛

بھی نہیں گھڑی جاسکتیں۔ علامت تو اسلوب کو خود ہی اپنے رنگ میں رنگتی ہے۔ ایسی بے ساختہ علامات کا نفسیاتی مطالعہ اور ان سے وابستہ تلازمات جہاں تخلیقات میں گہرائی اور نفسیاتی بصیرت پیدا کرتے ہیں وہاں تخلیق کار کی شخصیت کی تفہیم کے لیے کارآمد سراغ بھی مہیا کرتے ہیں۔

جدید شعراء کی علامات اُردو کے معروف جدید شعراء جیسے میراجی، ن۔م راشد مجید امجد اور منیر نیازی وغیرہ کی مخصوص علامات کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ نکتہ بخوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ علامت نجی ہونے کے باوجود ابلاغ کی صلاحیت سے عاری نہیں ہوتی اور اس میں اس کی افادیت مضمر ہے۔ اس موقع پر جدید شعراء کی علامات کا نفسیاتی مطالعہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ ضرور واضح رہے کہ ان میں سے ہر شاعر کسی اپنی مخصوص نفسیاتی افتادِ طبع سے اور ایک خاص نوع کے اسلوب میں ہی وہ اپنی تخلیقات پیش کرنے کے لیے سعی کناں رہے ہیں۔ ان کی علامات بحیثیت تخلیقی فن کار جہاں ان کی انفرادیت کی مظہر ہیں وہاں بحیثیت ایک فرد ان لاشعوری محرکات کو بھی سامنے لاتی ہیں جنھوں نے ان کے اسلوب کو خاص علامات دیں۔ جنگل غالباً ایک ایسی علامت ہے جو ان سب کے ہاں کسی نہ کسی روپ میں ملتی ہے۔ لیکن ان سب نے جنگل سے وابستہ مختلف تلازمات اُبھارے ہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف ناقدین نے ان شعراء کے مطالعے میں ان کی علامات کو خصوصی طور پر اُجاگر کیا ہے۔ اگر صرف علامات ہی کے حوالے سے ان تمام شعراء کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے نفسی رجحانات کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو نتائج دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بصیرت کے حامل بھی ہوں گے۔ علامت کے موضوع پر مزید مطالعے کے لیے ان مقالات کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ "علامت نگاری کی تحریک" از ڈاکٹر سید محمد عقیل مطبوعہ فنون جون / جولائی، اگست ستمبر ۱۹۷۱ء۔

۲۔ "ادب میں علامت پسندی" از محمد علی صدیقی مطبوعہ سیپ نمبر ۱۴

تشبیہ اور استعارے کی نفسیاتی اہمیت اسلوب کا نفسیاتی مطالعہ تشبیہ اور استعارہ وغیرہ کے تذکرہ کے بغیر نامکمل رہتا ہے، کہ یہ کلاسیکی شعراء سے لے کر جدید ترین شاعر تک سب کی میراث ہیں۔ یہ اعتراف لازم ہے کہ اُردو میں اُن کے بارے میں نفسیاتی نقطہ نظر سے کام لینے کا رجحان اتنا قوی نہیں صرف گنے چنے چند ناقدین نے ہی ان سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ریاض احمد نے اسلوب میں مجاز کی اہمیت کے حوالے سے تشبیہ وغیرہ پر روشنی ڈالی۔ وہ اپنے مقالے "اسلوب" میں لکھتے ہیں:۔

> "مجاز زبان کے استعمال کے اس طریق کا نام ہے جس میں لفظ کی دلالتیں تلازمات سے واضح کی جاتی ہیں۔ تلازمہ تشبیہ۔ استعارہ۔ کنایہ۔ رمز وغیرہ کی تشکیل کرتا ہے[1]۔"

بالفاظ دیگر ریاض احمد علم بیان کی اساس تلازمہ پر استوار دیکھتے ہیں۔ تلازمات کا عمل شاعری میں جو اہم کردار ادا کرتا ہے اس پر مغرب میں تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خود ہمارے یہاں بھی بعض اصحاب نے اس کا بطورِ خاص مطالعہ کرتے ہوئے اس کے حوالے سے

---

[1] "تنقیدی مسائل" ص ۱۶۷۔ مزید ملاحظہ ہو عبدالسلام کا مقالہ "اسلوب کیا ہے" مطبوعہ "نگار پاکستان" نومبر ۱۹۶۲ء

اُردو شاعری کو پرکھا ہے۔ اس ضمن میں الیاس عشقی کا مقالہ "شاعری اور تلازمہ خیالات" (مطبوعہ "صریرِ خامہ" تنقیدی ادب نمبر، ۱۹۶۶ء شعبۂ اُردو جامعہ سندھ حیدر آباد) خاصی کارآمد معلومات کا حامل ہے۔ ریاض احمد نے ایک اور موقعہ پر بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"تشبیہ و استعارے میں پیشِ نظر اشیاء کے مسلمہ یا صوتی تصورات کی بجائے ان سے مختلف لیکن خاص کیفیات کے لحاظ سے مماثل اشیاء کے تصورات کو آلۂ اظہار بنایا جاتا ہے اور اس سے مقصد ان اشیاء کی اس کیفیت کو جو خاص طور پر ملحوظ ہو زیادہ وضاحت اور زیادہ مؤثر طریقے میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم محبوب کے رخسار کا تصور روشن کرتے ہیں اور اس کے لیے شعلہ گل کا استعارہ استعمال کرتے ہیں تو اس استعارے سے رخسار کا وہ مخصوص رنگ اور نزاکت جن میں اس کی کشش کا راز نہاں ہے نہایت بلیغ پیرائے میں قاری کے ذہن تک پہنچ جاتے ہیں۔"[1]

تشبیہ سازی ذہن کے اس عمل کا نام ہے جس میں حقیقت کو مجاز کے رُوپ میں دیکھا جاتا ہے۔ لفظ لباسِ مجاز میں زیادہ خوبصورت، زیادہ پُرکشش اور زیادہ لطیف معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادیب اپنے تلازمات سے کام لے کر تشبیہ یا استعارہ وضع کرتا ہے اور یہی تلازمات قاری کے ذہن میں بھی وہ لطیف تنوع پیدا کرنے کے موجب بنتے ہیں، جن میں جمالیاتی احساس جنم لیتا ہے۔ جہاں تک استعارے کی نفسیاتی اہمیت کا تعلق ہے تو ایک نقاد محمد افضل ملک نے اپنے مقالے "آواز کا استعاراتی رُوپ" میں استعارے کی تخلیق سے وابستہ نفسی کیفیات کے ضمن میں یہ لکھا ہے:

"زبان انسان کے اندرونی تجربے اور خارجی اشیاء کے درمیان مناسبت و مطابقت ڈھونڈنے یا خارجی اشیاء کو اندرونی تجربے کا قائم مقام بنانے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے اور استعارے کی تخلیق کا عمل بھی بالکل یہی ہے۔ ہماری زبان سے جو فقرہ نکلتا ہے وہ ہمارے بظاہر بھلائے ہوئے تجربات اور ہمارے گرد و پیش کی زندگی کے ایک دقیع حصّے سے مرکب ہوتا ہے۔ لہٰذا استعارے کی ولادت کا عمل ساری زندگی کا شعوری یا غیر شعوری طور پر احاطہ کرتا ہے۔ یوں کہیئے کہ استعارے کی پیدائش کا عمل بالکل وہی ہے جو خواب یا اس طور کی پیدائش کا ہوتا ہے۔ جیسے خواب میں ہماری پوری شعوری و لاشعوری ہستی اُجاگر ہو جاتی ہے اسی طرح استعارے میں بھی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام نقوش ضم ہو جاتے ہیں۔ استعارے کی تخلیق کے لیے انسان کو اپنے لاشعور اور گرد و پیش سے آنکھیں چار کرنا پڑتی ہیں۔"[2]

بلراج کومل نے علامت اور استعارے کی اہمیت ان الفاظ میں واضح کی ہے:۔

---

[1] "تنقیدی مسائل" ص ۲۶

[2] "اوراق" مارچ، اپریل ۱۹۷۳ء

"اگر فن کار صحیح استعارہ اور صحیح علامت تلاش کر سکتا ہے اور داخلی تجربات اور خارجی زندگی اور مظاہرِ فطرت کے درمیان صحیح رشتہ قائم کر سکتا ہے تو وہ کامیاب فنکار ہوگا۔"[1]

محمد حسن عسکری نے اپنے مشہور مقالے "استعارے کا خوف" میں استعارے کی نفسی اساس اُجاگر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ "استعارے کی پیدائش کا عمل وہی ہے جو خواب کی پیدائش کا"[2]۔ اس کی وضاحت میں وہ یوں رقمطراز ہیں:۔

"آدمی اپنے تجربات کو قبول بھی کرتا جاتا ہے اور رَد بھی۔ ان دو رجحانات میں سمجھوتے سے صورت نکلتی ہے کہ تجربہ براہِ راست ہو تو ظاہر نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا، اس کے بجائے کوئی خارجی چیز تجربے کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ اس عمل کے ذریعے چاہے خواب وجود میں آئے چاہے استعارہ۔ اس میں ہمارے شعور، ذاتی لاشعور، اجتماعی لاشعور، احساس، جذبے اور خیال کے ساتھ ساتھ ہمارے گرد و پیش کا وہ حصہ بھی شامل ہے جو ہم نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے لہٰذا استعارے کی تخلیق کے لیے آدمی میں دو طرح کی ہمت ہونی چاہیئے، ایک تو اپنے لاشعور سے آنکھیں چار کرنے کی۔ دوسرے اپنی خودی کی کوٹھڑی سے نکل کر گرد و پیش سے ربط قائم کرنے کی۔"[3]

محمد حسن عسکری نے جس انداز پر استعارے کا مطالعہ کیا ہے وہ اُردو کی نفسیاتی تنقید میں خاصے کی چیز ہے۔ عسکری نے اس مضمون میں ایک اور موقع پر بھی استعارے کی تخلیق کے عمل کو خواب کی تحلیل کے مماثل قرار دیا (ص ۲۸) یہی نہیں بلکہ عسکری کے بقول: "ہمارا ایک ایک فقرہ استعارہ ہوتا ہے۔ استعارے سے الگ اصل زبان کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ زبان خود استعارہ ہے۔" (ص: ۲۶)

امیج اور امیجری کا نفسیاتی جائزہ

امیج کے لیے بالعموم تمثال کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اپنے سیدھے سادے مفہوم میں اُسے حسّی تصور کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ امیجری الفاظ میں تصور کشی ہے نفسیاتی لحاظ سے اسے حسّی تصورات کی بازگشت قرار دیا جا سکتا ہے۔ امیجز کی ضرورت اور اہمیت کو پروفیسر قاضی محمد اسلم نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:۔

"جہاں کسی قسم کا اُلجھاؤ ہو اظہار یا ابلاغ میں دقت ہو ذہن اپنے ماحول پر حاوی ہونے میں اور مسائل کے حل کرنے میں روک محسوس کرتا ہو وہیں تمثال (امیجز) پیدا ہوتے ہیں جہاں ذہن اپنے ماحول پر یا اپنے مسائل پر حاوی ہونے لگتا ہے۔ وہاں تمثالوں (امیجز) کی جگہ الفاظ یا اصطلاحات لینا شروع کر دیتے

---

[1] "اوراق ۳" (۱۹۶۶ء) میں "معنی کا معنی" کے مسئلے پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔

[2] "ستارہ یا بادبان" ص ۲۶

[3] "ستارہ یا بادبان" ص ۲۷ ؛

ہیں۔ جہاں اور جب تک الفاظ اپنا رول ادا نہیں کر سکے وہاں اس وقت تک وہی رول تمثالیں ادا کرتی ہیں۔ گویا انسانی ذہن آگے بڑھتا ہے تو تمثالوں اور الفاظ کے سہارے آگے بڑھتا ہے[1]۔"

نفسیاتی لحاظ سے عام زندگی ہو یا ادب دونوں ہی میں حسّی تصورات کا مطالعہ بے حد اہم ہے کہ انسان اپنے حواس کے ذریعے سے ہی خارجی وقوعات کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ عقل، خیر اور شر جیسے مجرّد تصوّرات کو بھی ان کی مجرد صورت میں سمجھنے کے برعکس ایک ذہنی تصویر بنا لی جاتی ہے۔ مجرّد کی ذہنی تصویر کشی کا یہ عمل قدیم مذاہب میں اگر علم الاصنام کی صورت میں ظاہر ہوا تو ادب میں تمثیلی حکایت (الیگری) جیسی صنف کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔ بقول ریاض احمد:

"ان حسّی تصورات کو مقصود بالذات تصور کر لیتا ہے۔ مشاہدہ کے حامل کو وہ اہمیت ضرور دیتا ہے، لیکن مشاہدہ کا ذکر بغیر حسّی تصورات کے نہیں کرتا۔ جزئیات نگاری اور وصف نگاری کی بنیاد یہی ہے۔ ایک انجینیر ایک عمارت کی تمام جزئیات کو پیش کرتا ہے اور ایک ناول نگار بھی۔ لیکن ناول نگار آلاتِ سائنس سے کام نہیں لیتا وہ صرف اپنی آنکھ پر اعتبار کرتا ہے اور دونوں کی تفصیلات میں بُعد المشرقین پیدا ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ہی عمومیت اور ہمہ گیری کے اصول کے ماتحت تصوّرات کے ساتھ کہیں کہیں حسّ شامہ شامل ہو جاتی ہے اور اگر ان تصوّرات کی تحریک سے کوئی یاد اُبھر آتی ہے تو ادیب اسے بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ مشاہدہ ایک پوری شخصیت کو اپنے دامن میں لیے ہوتا ہے اور شخصیت جس حیثیت میں بھی متاثر ہوتی ہو وہ یکساں اہم ہے حسّی تصورات کی بھی ایک مجرّد حیثیت ہے جو روایات کے ماتحت تشکیل پاتی ہے[2]۔"

امیج اور امیجری قاری کے حسّی تصوّرات کے لیے ایک قوی تہیج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں امیجری کے رُوپ میں ایک سیدھا سادہ لفظ قاری کے تحت الشعور میں خوابیدہ سلسلہ ہائے خیال کو بیدار کر کے اُنھیں متحرک اور فعال بنانے کا باعث بن جاتا ہے۔ ادبی تخلیق کی تاثر آفرینی میں تشبیہ اور استعارے کی مانند امیج اور امیجری بھی خاصا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یوں نفسیاتی لحاظ سے دیکھیں تو امیج اور امیجری مصنّف اور قاری میں ذہنی رابطے بلکہ بعض صورتوں میں تو نفسی ہم آہنگی کا باعث بنتے ہیں۔

---

[1] "اوراق" نمبر ۳ میں "معنی کے معنی" کے مسئلے پر بحث میں حصّہ لیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ دیگر شرکاء کے نام یہ ہیں:۔

انتظار حسین (محرکِ بحث) ریاض احمد، بلراج کومل، عرش صدیقی اور اعجاز فاروقی۔

[2] "تنقیدی مسائل" ص ۱۲:

سفرنامے کی فنّی بحث

ڈاکٹر انور سدید

سفرنامے کا شمار اُردو زبان کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ سفرنامہ چونکہ چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے اس لیے سفر اس کی اساسی شرط ہے۔ بادی النظر میں سفر کے ساتھ انجانے دیسوں کی سیر، نئی فضاؤں سے واقفیت اور انوکھے مناظر کے مشاہدے کا تصور وابستہ ہے۔ اس لیے سفر میں تحیّر کا عنصر فطری طور پر شامل نظر آتا ہے اور یہ تحیّر انسان کو آمادۂ سفر ہونے پر اُکساتا رہتا ہے۔ سفر کی نوعیت خواہ کیسی ہو سیاح یا مسافر کے وابستگان اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ وہ تجرباتِ سفر سے زیادہ سے زیادہ آگہی حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ یہ بات ان ممالک میں زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ جہاں معاشرہ ایک مخصوص تہذیبی و نظریاتی چار دیواری میں محصور ہو اور فرد کو اس چار دیواری سے باہر نکلنے کے مواقع نسبتاً کم حاصل ہوں۔ اس قسم کے معاشرے میں دور دیس کی ہر چیز الف لیلوی نظر آتی ہے اور سامع کرید کرید کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مسافر نے کیا دیکھا۔ سفر کیسے گذرا اور اس میں کھویا کیا ہے اور پایا کیا ہے[1]۔ چنانچہ جو لوگ خود سفر اختیار نہیں کر پاتے وہ کوائفِ سفر سن کر ہی اپنے ذوقِ سفر کو تسکین دے لیتے ہیں مشرق کی داستانوں میں بغداد ایسا شہر تھا جو پُرشکوہ محلات، عالی شان باغات، شہنشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے طلسمات میں لپٹا ہوا تھا چنانچہ پرانے قصے کہانیوں میں اس شہر کے گرد دائرہ در دائرہ تحیّرات بُنے گئے اور قاری کو خواب الحسن دیکھنے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ اسی طرح مغرب کے ادب میں ہندوستان جادو کی سرزمین تھی اور اس کی سیر عجوبۂ روزگار سمجھی جاتی تھی۔ اس سرزمین نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف راغب اور آمادۂ سفر کیا اور چند ایک نے تو اپنے سفر کے حالات دلچسپ سفرناموں کی صورت میں بھی لکھے۔ مشرقی ممالک میں اسی قسم کا تاثر مغربی ممالک کے بارے میں پایا جاتا تھا چنانچہ یوسف خان کمبل پوش نے جسمانی سطح پر اور رتن ناتھ سرشار نے تخیلی سطح پر جب ان ممالک کا سفر کیا تو حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

انسان کی سفر پسندی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان فطری طور پر تنوّع پسند ہے۔ وہ جس ماحول میں سانس لیتا ہے کچھ عرصے کے بعد اس کی یکسانیت سے اُکتا بھی جاتا ہے کسی دوسرے مقام پر عارضی نقلِ مکانی اسے نہ صرف تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچاتی ہے بلکہ اس سے زندگی کی طویل یکسانیت اور بوریت بھی ختم ہو جاتی ہے اور انسان جب سفر سے واپس آتا ہے تو نگ و تازِ حیات میں دوبارہ شریک ہونے کے لیے اپنے آپ کو تازہ دم بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ سفر کی نوعیت جیسی بھی ہو ندرت اور لطافت کی ایک مخصوص کیفیت اس کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہتی ہے اور بعض اوقات یہی کیفیت انسان کو دیکھے ہوئے راستوں کو دوبارہ دیکھنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔

سفر کا سب سے قیمتی عنصر اس کی حرکت ہے اور زندگی چونکہ خود ایک مسلسل حرکت ہے اس لیے سفر بھی زندگی ہی کا استعارہ

ہے۔ حکمائے قدیم نے زندگی کو ایک ایسا سفر قرار دیا ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ حضرت آدمؑ کی داستانِ حیات میں شجرِ ممنوعہ کو چکھنے کا واقعہ بظاہر احکامِ ربانی کی خلاف ورزی اور آدمؑ کی اوّلین بغاوت سے عبارت ہے۔ تاہم اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس لغزش کی پاداش میں آدمؑ کو جنت سے نکل کر کرۂ ارض کی طرف مائل بہ سفر ہونا پڑا۔ چنانچہ آدمؑ کا پہلا سفر ارتقائے نسلِ انسانی کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ابنِ آدمؑ کے پاؤں سے چکر نکل نہیں سکا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سفر کے عمل سے جبر کی کیفیت زائل کرنے کے لیے "سیروا فی الارض" کا حکمِ ربانی نافذ کیا گیا تو تجرباتِ حیات نے سفر کو وسیلۂ ظفر قرار دیا۔ قرآنِ حکیم میں جن انبیائے کرام کے سفر کے حالات موجود ہیں، ان میں حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے چند اسمائے حسنہ مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کا سفر کھلے پانیوں کا سفر تھا، جب سیلِ عظیم نے بنی نوعِ انسان پر پانی کی وسیع تر چادر ڈال دی تو سفرِ نوحؑ نے ہی سلسلۂ حیات کا تسلسل برقرار رکھا۔ حضرت موسیٰؑ کو عالمِ عدم سے کتمِ وجود میں آتے ہی سفر درپیش ہو گیا تھا۔ ان کی والدہ ماجدہ نے انھیں فرعون کے ظالمانہ عمل سے بچانے کے لیے لکڑی کے ایک تابوت میں بند کیا اور دریائے نیل کے جوئے رواں میں ڈال دیا۔ حضرت موسیٰؑ کے سفرِ اوّلین کا اختتام فرعون کے محلات میں ہوا، اور یہ سفر اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ پھر ان کی زندگی پر فرعون کا دستِ تکبر دراز نہ ہو سکا۔ حضرت یوسفؑ نے کنعان سے مصر تک کا سفر اپنے سوتیلے بھائیوں کی ستم رانی کی بدولت کیا اور یوں حضرت یوسفؑ فطرتِ انسانی کے ایک ایسے انوکھے واقعے کی تخلیق کا باعث بن گئے جس میں خود غرضی شقاوتِ قلبی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور انسان ذاتی مقاصد کے لیے اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خشکی کا سفر اختیار کیا اور ایک لق و دق صحرا میں اللہ کا گھر تعمیر کیا جو بالآخر نہ صرف رشد و ہدایت کا مصدر بن گیا بلکہ یہ مقامِ مقدس سیکڑوں سالوں سے اب تک انسان کے روحانی سفر میں ایک اہم پڑاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں تشنگانِ حق اپنی عبودیت کے اعتراف کے لیے یہاں پہنچتے ہیں اور اپنے اپنے وطنوں میں واپس جا کر اس سفرِ سعادت کے ثمرات اَن گنت دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے سفرِ مقدس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں ایسے اَن گنت سفرنامے لکھے گئے ہیں، جن میں اس سفرِ سعادت کی یادوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں سفر اختیار کرنے کے متعدد واقعات موجود ہیں۔ ان کا اوّلین سفر تجارتی اغراض سے عمل میں آیا۔ مکہ سے مدینہ کا سفر سیاسی نوعیت کا تھا۔ حضورؐ کی مدینہ سے واپسی ایک فاتح کا سفر تھا، لیکن اس میں بھی رشد و ہدایت کے ہزاروں سلیقے موجود ہیں اور یہ سفر بنی نوعِ انسان کی راہنمائی کے لیے اب بھی مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ ان سب سے الگ واقعۂ معراج نبی اکرمؐ کے روحانی سفر کی ایک ایسی روداد ہے جس میں اللہ کے ایک برگزیدہ بندے نے تمام خلائی حد بندیوں کو عبور کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ حضورؐ کا اوّلین سفر بعض مادّی مقاصد کے تابع تھا۔ اس لیے اس کی تاریخی حیثیت اس کا ایک مخصوص زاویہ ہے۔ دوسرے سفر میں بھی ان کے جسدِ مبارک نے مکانی حرکت کی۔ تاہم یہ سفر حضورؐ کا ایک داخلی جذباتی تجربہ بھی تھا، اور اس میں حضورؐ نے اپنے مولد سے کٹ جانے اور نئی زمینوں میں بود و باش کو احساس اور روح کی واردات بنا دیا۔ واقعۂ معراج میں متذکرہ اُفقی جہتوں کے علاوہ عمودی جہت بھی شامل ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا یہ سفر جغرافیہ اور تاریخ، زمان اور

مکان سب سے ماورا ہو گیا اور حضورؐ نے ایسے مقاماتِ معلّٰی کی سیاحت کی جہاں فرشتے بھی پَر نہیں مار سکتے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ انسانی زندگی میں سفر کی ضرورت اور اہمیت سے کسی زمانے میں بھی انکار نہیں کیا گیا۔ پہیے کی ایجاد سے زندگی کے انسانی تصور میں اچانک تبدیلی آ گئی تھی اور اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کی سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ پہیّہ کی ایجاد ۳۰۰۰ قبل مسیح میں مصر میں اور دو ہزار قبل مسیح وادیٔ سندھ میں پہنچ چکی تھی[۲]۔ میسوپوٹیمیا میں انھیں سالوں کے لگ بھگ پہیّہ دار رتھوں کا استعمال عام ہو گیا تھا اور انھیں موجودہ زمانے کے ٹینکوں کے مماثل سمجھا جاتا تھا۔ اس انقلابی ایجاد نے نہ صرف زمینی فاصلوں کو محدود کر دیا بلکہ مزید ایجادیں معرضِ وجود میں لانے کے لیے بھی انسانی دماغ کو مہمیز لگائی۔ پتھر کے زمانے کے بعد جب دھات کا زمانہ آیا تو چپّو کی ایجاد عمل میں آ چکی تھی اور انسان نہ صرف بری سفر پر قادر ہو چکا تھا بلکہ اب اس نے دریاؤں اور سمندروں پر بھی حکمرانی حاصل کر لی تھی اور مشرق و مغرب کی تمام اکناف اس کی زد میں تھیں۔ اس دور میں انسان جنگلوں اور پہاڑوں کو خیرباد کہہ کر مدنیت کی طرف آمادہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ آبی گذرگاہوں کے کنارے جہاں کشتیوں کے ذریعے پہنچنے کی سہولت دستیاب تھی تہذیبی زندگی کا آغاز ہوا۔ مصر کی تہذیب دریائے نیل کے کنارے، سندھی تہذیب دریائے سندھ کے کنارے اور شنار کی تہذیب دریائے دجلہ اور فرات کے کناروں پر پروان چڑھی۔ اس زمانے میں دُوربین کی ایجاد نے انسان کی نظر آسمان کی طرف منعطف کی اور اب وہ اُفق سے آنکھیں ہٹا کر نمودی سمت میں بھی مائل بہ سفر ہونے کی سوچنے لگا۔ اس دور کی تاریخی دیومالائی کہانیوں، رزم ناموں اور داستانوں سے مرتب کی جاتی ہے۔ اور ان کتابوں کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اس دور کا انسان فطرتاً مہم جُو اور سفر پسند تھا۔ وہ نہ صرف سرکش فطرت کو زیر کرنے کی کوشش کرتا بلکہ اکثر جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے رزق کی تلاش میں دُور دراز کے علاقوں میں بھی نکل جاتا اور ان جیرتوں کا تماشہ دیکھتا جو ان مہمات میں اسے قدم قدم پر جاگتی ہوئی نظر آتیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح کو برٹرینڈرسل نے ایک عہد آفریں دور کہا ہے۔ اس دور میں انسان کی سفر پسندی نے اسے تاریکیوں سے نکال کر اُجالوں کی زندگی عطا کر دی تھی۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں کئی خلّاق شخصیتوں کا ظہور ہوا۔ طلبِ علم نے شدّتِ پیاس کی صورت اختیار کر لی۔ ذرائع نقل و حرکت کی ترقی نے دُنیا کے مختلف ممالک کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ سامانِ تجارت کے ساتھ خیالات کی ترسیل کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور سفر محض مادّی چیزوں کے حصول کا وسیلہ نہ رہا بلکہ اب یہ ایک رُوحانی ضرورت بھی بن گیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ:

> "چھٹی صدی قبل مسیح تاریخِ عالم کے حیرت ناک ادوار میں شمار ہوتی ہے۔ اس صدی میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں خیالات کی ترسیل کا سلسلہ براہِ راست جاری تھا اور چین سے لے کر مصر، رُوم اور یونان تک اثرات پہنچتے تھے۔ ان خیالات کا مرکز تمدّن کا گہوارہ بغداد تھا۔"
>
> (تمدّنِ ہند پر اسلامی اثرات۔ ص ۳)

اس دور میں مختلف تہذیبوں کے فکری تصادم سے جو ثقافتی انقلاب رُونما ہوا، اس میں ان اہلِ حرفہ کا عمل دخل زیادہ نظر آتا ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر اختیار کرتے تو اپنے سامانِ تجارت کے ساتھ کتابیں بھی لے جاتے اور ممالکِ غیر

کے لوگوں کو اپنے وطن کے بارے میں نادر معلومات بہم پہنچا کر ورطۂ حیرت میں ڈالنے اور اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

اس اجمال سے ایک یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ کتاب معلومات کی فراہمی کا عمدہ وسیلہ ہے اور یہ کسی ملک کے جغرافیائی، تاریخی اور فکری خزینوں کو باریک ترین تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہے۔ تاہم یہاں اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اس قسم کی کتابوں نے بہت سے لوگوں کے ذوقِ سیاحت کو جگایا اور یہ لوگ ان سرزمینوں کو جن کی ہیئت کتاب کا خاموش بیانیہ پیش کرتا ہے بہ چشمِ خود دیکھنے اور فطرت کی بوقلمونیوں میں بذاتِ خود شامل ہونے کے لیے آمادۂ سفر ہو گئے۔ حقیقت کے ان متلاشیوں کے ہاں جب اپنے مشاہدات اور تجربات بنی نوع انسان میں تقسیم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تو ایک سفرنامہ وجود میں آگیا۔ پس سفرنامہ محض سیّاح کے ذوقِ سفر کو ہی آسودہ نہیں کرتا بلکہ یہ رنگ، نسل، زبان اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود ایک ملک کو دوسرے ملک سے اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے متعارف کرانے اور ان کے درمیان رشتۂ محبت استوار کرنے کا وسیلہ بھی ہے اور اس سے کسی ملک کی جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی اور تمدنی معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔

سفرنامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفرنامہ وہ بیانیہ ہے جو سفرنامہ نگار سفر کے دوران یا اختتامِ سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔ اس صنفِ ادب کا تمام تر مواد موجود منظر کے گرد و پیش میں بکھرا ہوتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ سفرنامہ نگار صرف خارجی ماحول کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیہ کو مدلل اور ہمہ جہت بنانے کے لیے بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ سفرنامہ نگار کی آنکھ جتنی باریک بین ہوگی جزئیات اتنی ہی تفصیل سے اس کے مشاہدے میں آئیں گی۔ ایک عام سطح بین منظر کی جغرافیائی کیفیات کا میکانکی گوشوارہ تو عمدگی سے تیار کر لیتا ہے لیکن فطرت کا وہ اسرار جو منظر کے داخل سے پھوٹ رہا ہوتا ہے اور ناظر کے ذہن و دل پر شبنم کی پھوار بھیر دیتا ہے اس کی گرفت میں نہیں آتا۔ چنانچہ اس قسم کا سفرنامہ کسی ملک کے طبیعی حالات، جغرافیائی خدوخال، آبادیوں کے اُتار چڑھاؤ اور باشندوں کے اندازِ بود و باش کے بارے میں اعداد و شمار تو بہم پہنچا دیتا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے کہ یہ کام ایک مؤرخ بہتر طور پر سرانجام دے سکتا ہے۔ اُردو کے قدیم سفرناموں میں بالعموم یہی طریقِ عمل رائج رہا ہے۔ سفرنامہ نگار ایسی بشیر معلومات جمع کرنے کی کوشش کرتا جو مستقبل کے مسافروں کے لیے زادِ راہ کا کام دیتیں اور انھیں راستے کی صعوبتوں سے بچا لیتیں۔ اُردو کے نامور مؤرخ و ادیب شبلی نعمانی نے سفرنامہ مصر و روم و شام کے ابتدائیہ میں ملک کی حالت، انتظام کا طریق، عدالت کا اصول، تجارت کی کیفیت اور عمارتوں کے نقشہ جات وغیرہ کو سفرناموں کے لیے لازمی اور ضروری قرار دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شبلی نعمانی کے اندر کا ادیب بھی ان لوازمات کو کلیتہً قبول نہیں کر سکا اور جب انھوں نے بیرونی ممالک کی سرزمین کو مَس کیا تو علمی نوادرات اور معاشرتی کیفیات دیکھ کر ان پر حیرت اور مسرت کی عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی اور انھوں نے ایسی کیفیات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی جو سفرنامہ کی متذکرہ بالا تعریف کے حصار میں نہیں آتی تھیں شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ:

"..... عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے، ان میں سے ایک چیز بھی اس

سفرنامہ میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالات کے متعلق معتدبہ واقعات ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس قدر ہونے چاہئیں۔ غرض جو شخص سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہے ان کی دعوت میں ماحضر پیش کیا جا سکتا ہے کہ :۔

مالا ھدی کلہ لا تیری کلہ ؛

جدید اندازِ فکر کے نقاد ڈاکٹر وزیر آغا نے سفرنامے کی کئی قسمیں گنوائی ہیں اور لکھا ہے کہ :

"سفرنامے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم تو اس روایتی سفرنامے کی ہے جس میں سفر کرنے والا صرف ملک کا جغرافیہ بیان کرتا ہے، موسم کا حال، میدانی اور پہاڑی مناظر، آدابِ معاشرت، حاکمِ وقت کے خدوخال، اور اگر وہ بیسویں صدی کا سفرنامہ نگار ہے تو غسلخانوں اور ہوٹلوں کا حال، مشروبات کی قلت یا فراوانی اور ہر قسم کے شکار کی جملہ تفاصیل اپنے سفرنامہ میں سمیٹ لیتا ہے۔ دوسری قسم اس سفرنامہ کی ہے جس میں سفرنامہ نویس جغرافیہ کے بجائے صرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھتا ہے اور سُنے سُنائے قصوں کے اظہارِ مکرر میں لطف محسوس کرتا ہے۔"

شبلی نعمانی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اُردو سفرنامہ کی یہ روایت پُرانے سفرناموں سے دریافت کی ہے۔ چنانچہ یہ بات بالخصوص قابلِ ذکر ہے کہ بیشتر قدیم سفرنامہ نگاروں کے پیشِ نظر سفر کو بطور سیاح سرانجام دینا، ممالکِ غیر کو کسی مخصوص زاویے سے دیکھنا، اور ایک آزاد ناظر کی طرح اپنے محسوسات مرتب کرنا نہیں تھا، بلکہ ان لوگوں نے سفرنامہ کو دوسرے ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا اور قاری کو بہت سے مفید مطلب کوائف فراہم کر دیئے۔ پُرانے سفرنامے میں مسافر ابتداء میں ہی مقصد کی ڈوری اپنے گرد لپیٹ لیتا تھا اور سفرنامے کی ابتداء میں ہی ان مقاصد کا واضح اظہار بھی کر ڈالتا تھا۔ مثال کے طور پر ہز ہائی نیس رفیعہ سُلطان نواب بیگم صاحبہ نے "سیرِ یورپ" کے تمہید یہ میں لکھا ہے کہ :

"اصل میں یہ وہ خطوط ہیں جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیرِ یورپ کے حالات کے لکھے، اس میں نہ عبارت ہے اور نہ قافیہ پیمائی۔ صاف سیدھی عبارت ہے۔ وہاں کے حالات، طرزِ معاشرت، تدبیر المنازل، بعض امورِ سیاسیہ، تجارت، ہنروری، اقسامِ فنون کی کثرت، تہذیب، طریقۂ تعلیم، دربار کے آداب، غرض جو میں جتنا سمجھ سکی اپنی زبان میں اپنے اہلِ وطن کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔"

نواب محمد حامد علی خان اپنے سفرنامہ "سیرِ حامدی" میں لکھتے ہیں کہ :

"غرض اس کتاب کے لکھنے سے نہ تو ایسی تصنیف کی اشاعت مقصود ہے جو مصنف کی شہرت و نام آوری کا باعث ہوتی ہو..... بلکہ مختصر یہ غرض ہے کہ دورانِ سیاحت میں جو ملک اور

قومیں ہماری نظر سے گذریں ان کے طبعی حالات، طرزِ معاشرت، تہذیب و تمدّن، حرفت و صنعت، اور اسبابِ تجارت اور جس چیز کی اُن کو ہمارے ملک سے ضرورت ہے یا جس امر میں ہم اُن کی صنعت و حرفت یا طبعی اشیاء کے خواہشمند ہیں اور سیاح کو وہاں کس قسم کے امور پیش آتے ہیں ظاہر کریں۔ جو باتیں اہلِ ملک کے مفید و موافق ہوں اُن کو بقدرِ اعتدال اختیار اور جو غیر مفید یا بیکار سمجھیں ان کو یک لخت ترک کرنے کے مختار رہیں۔"

اِس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم زمانے میں جب ذرائع آمد و رفت کو زیادہ وسعت نہیں ملی تھی تو اس قسم کے سفرناموں کو نہ صرف مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ انھیں تاریخ و تمدّن کے ماخذات کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے سفرنامہ کو تاریخی سلسلے کا ایک دلچسپ قصّہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ "ترکی کے بارے میں یورپ کی تاریخی تصنیفات کا سرمایہ بہت کچھ انھیں سفرناموں سے لیا گیا ہے۔" بالفاظِ دیگر سفرنامہ سیّاح کا چشم دید بیانیہ ہوتا ہے اور وہ اکثر اوقات وقائع نگاری کا فریضہ بھی سرانجام دیتا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ :

۱۔ کیا سفرنامہ نگار کسی نئی سرزمین کو دریافت کرتا ہے ؟

۲۔ کیا سفرنامہ کسی ملک کی سیاسی یا سماجی تاریخ مرتب کرنے میں معاونت کرتا ہے ؟

اوّل الذکر سفرنامہ میں جغرافیہ کی اور مؤخرالذکر تاریخ کی اہمیت کو سامنے لاتا ہے۔ انسانی زندگی میں چونکہ تاریخی اور جغرافیائی حقائق نے اساسی کردار ادا کیا ہے اس لیے انسان اپنی اُفتادِ طبع کے مطابق ابدالآباد سے ان دونوں میں دلچسپی لیتا رہا ہے اس لیے ان دونوں کا سفرنامہ میں در آنا غیر فطری نہیں۔ سفرنامہ اوّلین سطح پر ناظرہ کو بروئے عمل لاتا ہے اس لیے کسی ملک کے جغرافیائی نشیب و فراز سفرنامہ نگار کی توجہ سب سے پہلے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور وہ جمادات، نباتات اور حیوانات کی مختلف اقسام کی دریافت میں ایک عجیب نوع کی مسرّت محسوس کرتا ہے۔ اس کیفیت کا سلیقہ مندانہ اظہار ایک اچھے سفرنامہ کی بُنیادی خصوصیت ہے۔ اور اس سے سفرنامہ کو لطافت اور جاذبیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ سفر نئی زمینوں کی دریافت کا وسیلہ ہے اور اس کا بیانیہ ان دریافتوں میں قاری کو شرکت کا موقعہ عطا کرتا ہے تاہم سفرنامہ نگار اگر موسموں کا احوال، پہاڑوں کی اُونچائی اور دریاؤں کی لمبائی وغیرہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے اور وہ لطیف کیفیات جن سے اس کا باصرہ متاثر ہوا ہے نظرانداز کر دے تو اس سے یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی کہ اس نے ساکن و جامد مادّی مظاہر کو تو اہمیت دے دی ہے لیکن انسان کو جو گردوپیش کے مظاہر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، اس سے سفرنامے کی داخلی رُوح بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اس قسم کا بیانیہ صرف علم جغرافیہ کی خدمت سرانجام دیتا ہے۔ جغرافیہ دان موجود کو تلاش کرتا ہے اور وہ مختلف چیزوں کے درمیان مشابہت یا اختلاف کے آثار تلاش کرتا ہے۔ اِس کا موضوع تحقیق کائنات کا خارجی زاویہ ہے۔ وہ زمینوں کی کھُدائی، سمندروں کی غواصی اور فضاؤں کی تسخیر سے فطرت کے چھُپے ہوئے خزینوں کو برآمد کرتا ہے اور مادّی منفعت اور جسمانی سہولت کے لیے ان سب کو بنی نوع اِنسان کے آگے جمع کر دیتا ہے۔ لیکن انسان چونکہ سلیم العقل اور مدنی الطبع ہے اس لیے جغرافیائی دریافتوں کی افادی

حیثیت کو تسلیم کرنے کے باوصف وہ فطرت کی اس عجوبۂ روزگار تخلیق کے بارے میں بھی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا آرزومند ہوتا ہے جسے آدمی کہتے ہیں۔ وہ نہ صرف واقعات و حادثات اور ان کے پس پردہ کام کرنے والی محرک قوتوں کو دریافت کرنے میں دلچسپی لیتا ہے بلکہ واقعات و حادثات کی تاریخی صداقت معلوم کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ چنانچہ زمانۂ حال تک بیشمار لوگوں نے تاریخ کے نادر کوائف سفرناموں میں جمع کئے ہیں تاہم بیشتر سفرناموں میں تاریخ کا باصرہ اور سفرنامے کا ناظرہ دو الگ الگ اجزا نظر آتے ہیں اور سفرنامہ نگار کی مرکزی شخصیت سفرنامہ میں تخلیقی ربط پیدا نہیں کر سکی، سفرنامے کے اس انداز پر اردو کے جدید سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ نے طنز کی زہرناک نظر ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ:

"ایک صاحب، ہر باب اس فقرے سے شروع کرتے ہیں کہ "جناب ہم اتنے بجے کی گاڑی سے ہمبرگ پہنچے اور ہمبرگ وہ شہر ہے کہ ..... اور اس" وہ شہر" میں کے بعد ہمبرگ کے سیاحتی کتابچوں سے تاریخ کی توپ داغ دی جاتی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس قسم کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے موصوف نے پورا عملہ وقف کر رکھا تھا، اور باب کے آخر میں ہمیشہ یہ فقرہ آتا کہ "ہم اتنے بجے کی گاڑی سے ہمبرگ سے روانہ ہو گئے۔"

اِس قسم کی کاوش میں سفرنامہ نگار تاریخ کی عینی شہادت مہیا نہیں کرتا بلکہ کم علم قاری کی رسائی اس مواد تک کراتا ہے جو خود اُسے دوسری کتابوں سے دستیاب ہوا ہے۔ سفرنامہ اگر مطبوعہ معلومات کو ہی منظر پر لاتا ہے تو اُسے تاریخی صداقت کا اظہار قرار دینا مناسب نہیں۔ سفرنامہ بلاشُبہ تاریخ کو مَس تو کرتا ہے لیکن یہ مربوط تاریخ پیش نہیں کرتا۔ تاہم سفرنامہ نگار کا ناظرہ اگر اپنے عہد کو تخلیقی انداز میں سفرنامہ کی نسبت میں شامل کر دیتا ہے تو مستقبل کا مؤرخ ان تاثرات سے نتائج اخذ کرنے میں مدد لے سکتا ہے لیکن اسے غلطیوں سے مبرا قرار دینا ممکن نہیں۔ اس کی بڑی وجہ بقول مولانا شبلی یہ ہے کہ سفرنامہ میں بالعموم جزئیات سے کلیات قائم کر لی جاتی ہیں اور سفر میں انسان کو جن شخصیات سے سابقہ پڑتا ہے وہ اُن کے اخلاق، عادات اور خیالات سے تمام قوم کی نسبت عام رائے قائم کر لیتا ہے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ وہ امور انھیں چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں۔ اسی طرح ہر واقعہ سے وہ ایک عام نتیجہ نکالنا چاہتا ہے اور اس واقعہ کے خاص الجواب کی جستجو میں نہ وہ اپنا وقت صَرف کرنا چاہتا ہے اور نہ اس کو اس قدر فرصت ہے۔"

دوسری وجہ یہ ہے کہ مؤرخ واقعات کو ایک مخصوص زمانی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور ذاتی تاثر و تعصب کو قریب نہیں آنے دیتا۔ مؤرخ جتنا غیر جانبدار ہوگا وہ سو ہ ظن اور قیاس سے اتنا ہی گریز کرے گا اور استنباطِ نتائج میں تعجیل کے بجائے صبر و تحمل سے کام لے کر کسی واضح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس سفرنامہ نگار منظر کے حُسن کو دریافت کرنا اور قاری کی حیرت کو جگاتا ہے، اس کا بیانیہ تاریخی صداقت کو ظاہر کرنے کے بجائے اس کے ذاتی تاثر کو ادبی اسلوب میں پیش کرتا ہے چنانچہ سفرنامہ میں بعض اوقات ایسی باتوں کے در آنے کا امکان بھی ہے جنھیں سفرنامہ نگار کی تخلیقی آنکھ نے دیکھا تھا اور جو زندگی کا حُسن اُجاگر کرنے کے لیے سفرنامے کی بُنت میں شامل ہو گئی ہوں۔ اس قسم کے اندراجات کے لیے ثقہ ماخذات

کی تلاش ضروری ہے۔ شبلی نعمانی نے سفرنامہ روم ومصر وشام میں ترکی کی ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاتون فاطمہ خانم کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جب یورپ کی معزز عورتوں نے ان کے سامنے ترکی خاتون کے بارے میں واقعات بیان کئے تو گمان یہ ہوتا تھا کہ یہ کسی اور قوم کا تذکرہ یا ناول کے قصے ہیں۔ چنانچہ اس پر فاطمہ خانم نے رائے دی "ان بے چاروں کا کچھ قصور نہیں۔ گائیڈ جو کچھ سیاحوں سے کہہ دیتے ہیں، اُن کو یقین کرنا پڑتا ہے۔"

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ سفرنامہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علمِ تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں کرتی بلکہ ایک مربوط، دلچسپ اور خوشگوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ان سب سے فائدہ ضرور اُٹھاتی ہے۔ سفرنامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھا ہے اور زندگی کے اس مشاہدے کو سفرنامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی رُوح کا تحرک محسوس کر لیتا ہے اور اس میں مکمل کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب سفرنامہ نگار ادب کے جملہ تقاضوں سے بخوبی واقف ہو اور مشاہدے کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی قوت رکھتا ہو۔

یہاں یہ اعتراض اُٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا سفرنامہ لکھنے کے لیے ادیب ہونا ضروری ہے؟ جواباً عرض ہے کہ دوسری اصنافِ اظہار کی طرح سفرنامے کے لیے بھی مواد خارج سے ہی حاصل کیا جاتا ہے اور پھر ایک خاص تخلیقی عمل کے بعد سفرنامہ نگار اس مواد کو قاری تک پہنچاتا ہے۔ اس عمل میں نہ صرف لفظ کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے بلکہ لفظ اظہار اور ابلاغ کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ چنانچہ سفرنامے کو ادب کی اصناف میں ایک وقیع مقام حاصل ہے۔ تاہم سفرنامہ لکھنا صرف ادیب کا مسئلہ نہیں، بلکہ ایک اچھے سفرنامہ نگار کے لیے جن داخلی خواص کی ضرورت ہے، ان میں اقلیمِ سیاحت کے فطری رجحان کو حاصل ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سفر زندگی کی علامت ہے۔ زندگی کے مختلف مراحل پر سفر ضرورتاً بھی پیش آتا ہے اور یوں مسافری ہر شخص کا مقدر بھی ہے اور سفر مسافر نوازوں کے سہارے بُرے یا بھلے انداز میں کٹ بھی جاتا ہے۔ تاہم ایسے مسافر پر جو ہمہ وقت مقصد کی ڈوری سے بندھا ہوتا ہے فطرت اپنے اسرار پوری طرح آشکار نہیں کرتی اور اگر وہ اپنے گردوپیش کو دیکھنے کی فرصت نکال بھی لے تو اس کا آئینۂ نظر مقصد کی گرد سے اتنا دُھندلا ہو جاتا ہے کہ وہ سود و زیاں کے جال سے رہائی حاصل نہیں کر پاتا چنانچہ ایک مسافر اچھا جغرافیہ دان اور عمدہ تاریخ نگار ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک اعلیٰ درجے کا سفرنامہ نگار بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سفر کو زحمت کے بجائے اکتسابِ مسرت کا وسیلہ سمجھے اور اپنے آپ کو سیاسی، نظریاتی، معاشی اور معاشرتی جکڑ بندیوں سے آزاد کر لے۔ اگر سیاحِ عالم کے دوران فطرت اپنا سینہ بنات النعش گردوں کی طرح بے اختیار اس کے سامنے عریاں کر دے تو وہ اس نظر افروز منظر کو اپنی ذات میں جذب کرنے اور بہجت و مسرت کی وجدانی کیفیات سے سرشار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مسافر کا سفر جبری اور سیاح کا سفر خود اختیاری ہوتا ہے۔ چنانچہ ادیب اگر مسافر ہے تو ممکن ہے کہ وہ اچھا سفرنامہ نہ لکھ سکے اور اس کے جمع کئے ہوئے اعداد و شمار و واقعات و کوائف سے زیادہ تاریخ یا جغرافیہ کی خدمت سرانجام دیں۔ سفرنامہ نگار کے لیے اساسی طور پر سیاح ہونا ضروری ہے۔ مسافر زندگی کو بھی ایک قید تصور کرتا ہے اور اسے طوعاً و کرہاً ہی کاٹتا ہے جبکہ

سیّاح گزارِ ہست و بود کو شوق کی نگاہوں سے دیکھتا اور زندگی کے ہر لمحہ کو عطیۂ خداوندی سمجھ کر اس سے رُوحانی حظ اکتساب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک انشائیہ میں مسافر اور سیّاح کے داخلی اوصاف کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل اس کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

"سیّاح کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، وطن، نام اور پیشے سے قطعاً منقطع ہو کر کسی غیر مادی شے کی طرح سبک اور لطیف ہو جاتا ہے اور بندھنوں اور حد بندیوں کو تج کر ایک آوارہ جھونکے کی سی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مسافر کی حالت تو اس پتنگے کی سی ہے جو مکڑی کے جالے میں قید ہو کر جالے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور ایک منزل سے دوسری منزل تک جالے کی ڈور سے بندھا ہوا بڑھتا چلا جائے لیکن سیّاح مکڑی کے جالے سے یکسر آزاد ہے۔ گھر کی دیواروں اور منزل کے دھاگوں سے بھی اُسے کوئی سروکار نہیں..... سیّاح تو اپنا راستہ خود بناتا ہے..... اور مسافر حرکت کرتے ہوئے بھی حرکت کی نفی کرتا ہے۔"

بالفاظِ دیگر مسافر جسم کی سطح پر حرکت کرتا ہے اور اس کی نظریں ہر وقت اپنی منزلِ مقصود کو ہی تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس سیّاح ذہنی اور رُوحانی سطح پر سفر کرتا ہے وہ مقصد میں نظر اُلجھانے کے بجائے گرد و پیش کو دیکھتا ہے اور منظر کو اپنا جزوِ ذات بنا لیتا ہے۔ مسافر فاصلے کی ڈور میں لپٹا ہوا ہے۔ سیّاح روح کی طرح آزاد ہے اور بے پر جذبے کی طرح جہاں چاہے اُڑتا چلا جاتا ہے۔ مسافر خارجی پابندیوں کا اسیر ہے۔ لیکن سیّاح داخلی طور پر بھی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بقول غلام الثقلین نقوی مسافر کا مقصد سیاحت نہیں ہوتا۔ سیاحت تو بے غرضی کا دوسرا نام ہے۔" چنانچہ ادیب اگر بے غرضی پیدا کر سکے اور اس کے اندر کا سیّاح بیدار ہو جائے تو بلاشبہ وہ جو سفر نامہ لکھے گا اس کی تخلیقی رعنائیاں ایک غیر ادیب کے سفر نامے سے فزوں تر ہوں گی۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک سیّاح کے لیے ادیب ہونا لازمی نہیں تاہم اس کے داخل میں ادیبوں سے ملتے جلتے خواص کا موجود ہونا یقیناً ضروری ہے۔ وجہ یہ کہ جب سیّاح سفر نامہ لکھتا ہے تو وہ ادیب کا فریضہ ہی سرانجام دیتا ہے اور نہ صرف ماحول کو زندگی کا تحرک عطا کرتا ہے بلکہ خارج کے مشاہدے کو داخل کے گھمبیر سمندر میں کھنگال کر یوں معرضِ تحریر میں لاتا ہے کہ اس میں بیشتر ادبی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان معروضات کی روشنی میں اُردو کے چند عمدہ سفر ناموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت خوشگوار حیرت بن کر ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے بیشتر سفر نامہ نگار ثقہ ادیب نہیں تھے اور ان کا طلوع سفر نامہ کی صنف سے ہی ہوا۔ مثال کے طور پر یوسف خان کمبل پوش اپنے "سفر نامہ عجائباتِ فرنگ" کی وجہ سے ہی معروف ہے۔ قاضی ولی محمد نے سفر نامے کے علاوہ کسی دوسری صنفِ ادب میں اظہار نہیں کیا۔ زمانۂ حال کے ادبا میں سے محمود نظامی ادب کا نکھرا استھرا ذوق رکھتے تھے، لیکن "نظر نامہ" شائع ہونے سے پہلے شاید ان کی ایک تخلیق بھی منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اختر ریاض الدین کی اوّلین رونمائی سفر نامہ سے ہوئی اور وہ اب تک اپنی کتاب "سات سمندر پار" کو پہلوٹھی کی تصنیف شمار کرتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی اوّلین محبت بھی سفر نامے سے ہوئی اور وہ اب تک اپنی کارگذاری اس صنف کے حوالے سے ہی منوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان سفر نامہ نگاروں کا اس صنفِ ادب میں فوری طور پر قدم جمانے اور شہرت حاصل کر لینے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ہاں سیّاح کے جملہ باطنی اوصاف موجود تھے۔

چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ سفرنامہ لکھنا ادیب کی طرح سیاح کی داخلی ضرورت ہے اور اس کا تعلق اس پُراسرار تخلیقی عمل کے ساتھ بھی ہے جو شاعر کو شعر کہنے اور افسانہ نگار کو افسانہ لکھنے پر اُکساتا ہے اور جب تخلیق کا لمحہ آجاتا ہے تو یہ عمل تکمیل کی راہ اختیار کئے بغیر نہیں رہتا۔

سفرنامے کی متذکرہ بالا بحث میں یہ نکتہ بالخصوص اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سفرنامہ قاری کو وہ سب کچھ دکھا دے جو سفرنامہ نگار نے خود دیکھا ہے اور وہ بے نام مسرت جو سفرنامہ نگار نے محسوس کی ہے سفرنامے کی نسبت سے یوں اُبھارے کہ اس کے مجموعی تاثر سے قاری بھی اکتسابِ مسرت کر سکے۔ بیسویں صدی میں جب کہ ذرائع آمد و رفت پر انسان نے مکمل قدرت حاصل کر لی ہے اور جغرافیائی اکناف سمٹ کر ایک عالمی شہر میں سما گئی ہیں، ایسے بہت سے سفرنامے لکھے گئے ہیں جن میں سفرنامہ نگار قاری کو زمانے کی تینوں ابعاد میں سفر کراتا ہے اور جغرافیائی کوائف کی معین حدود سے قطع نظر کرتے ہوئے سفرنامہ کو ایک ذاتی واردات بنا دیتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے اب سیاحت نامہ آہستہ آہستہ افسانے کی صنف میں ضم ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سفرنامہ نگار کے تخلیقی عمل نے سفرنامہ کی ابعاد میں اضافہ کر دیا ہے اور نیا سفرنامہ دوسرے ممالک کے بارے میں سطحی معلومات پیش کرنے کے بجائے ذات اور کائنات میں امتزاجِ عرفانی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نیا سفرنامہ نہ صرف اُفقی جہت کا احاطہ کرتا ہے بلکہ یہ عمودی سمت میں بھی سفر پیما ہوتا ہے۔ اس سب کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سفرنامہ نگار اپنا بیانیہ صادق مشاہدات سے ہی مرتب کرتا ہے۔ اور سیاحانہ آزادی اور ناظرانہ آوارہ خرامی کے باوصف اس کا تخلیقی کینوس ایک افسانہ نگار کی بہ نسبت محدود ہے۔ افسانہ نگار کا متخیلہ بے حد تیز ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے وسیع منظر سے صرف ایک قاش اُٹھاتا ہے اور اس کے گرد دائرہ در دائرہ یوں اسرار بنتا ہے کہ قاری وقت کے ایک مختصر لمحے کو افسانے کے محدب شیشے میں سے پوری طرح منعکس دیکھ لیتا ہے۔ افسانہ تکنیک کے ایک خاص انداز میں ترتیب پاتا ہے اور تاثر کی ایک واضح کیفیت اُبھارتا ہے۔ چنانچہ افسانہ نگار واقعات، کردار اور ماحول کو اس مرتب انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ قاری کو ایک منطقی انجام تک پہنچا دیتا ہے اور یوں اس کے داخل میں واقعاتی تاثر سے جو اضطرابی کیفیت پیدا کی گئی ہے اسے فنی پرکاری سے نقطۂ اعتدال تک بھی لے جاتا ہے۔ افسانہ جذباتی زیر و بم کو ایک خاص انداز میں کروٹ دیتا ہے اور اس کاوش میں وہ حسبِ ضرورت ہر چیز کو افسانے کی فنی ضرورت کے مطابق تخلیق کرنے کا حق دار ہے۔ اس کے برعکس سفرنامہ بالعموم زمانی اور مکانی صداقت کو مجروح نہیں کرتا۔ یہ افسانوی نشیب و فراز عبور کرنے کے بجائے نسبتاً ہموار تخلیقی سطح پر سفر کرتا ہے۔ بقول میرزا ادیب سفرنامہ میں سفرنامہ نگار کی اپنی باطنی زندگی ہوتی ہے اور افسانے میں واقعات کے حوالے سے کرداروں کی باطنی زندگی۔ چنانچہ سفرنامہ نگار جن جزئیات کو جمع کرتا ہے ان سب کا شگفتہ تذکرہ قاری کو امتزاز سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سب جزئیات ایک مکمل افسانے کی تکمیل میں بہت کم معاونت کرتی ہیں۔ افسانہ نگار اپنے تجربے کو تخیل کہانی کا رُوپ دیتا ہے لیکن سفرنامہ نگار اپنے تجربے کی ذاتی شہادت پیش کرتا ہے اور بقول غلام الثقلین نقوی "جو حقیقت ماضی کے تجربات کی دھند میں لپٹ کر تخلیق کی صورت میں ڈھلے گی اس میں افسانے کی اسراریت ضرور پیدا ہو جائے گی۔" اس

صداقتِ اسرار نے سفرنامے کو افسانے کی بہ نسبت زیادہ قاری مہیا کیے ہیں اور اس کا حلقۂ اثر روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ بعض افسانہ نگاروں نے سفر کے پس منظر میں خوبصورت ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ چند ایک افسانہ نگاروں نے تو سفر کے تاثر کو بھی افسانے کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی اور اسے کہانی کا روپ دینے کے لیے متخیلہ سے حسبِ ضرورت عمدہ کام لیا۔ کرشن چندر، اے حمید، اشفاق احمد، احمد عباس، عزیز احمد، ابراہیم جلیس، رفعت میرزا، شفیق الرحمان اور قدرت اللہ شہاب کے بعض افسانوں میں غیر ملکی فضا کو تخلیقی رعنائی سے گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ فردوس حیدر کا ناول "دائرہ در دائرہ" اور فریدہ حفیظ کا ناولٹ "چاند پر صلیب" میں کہانی کو سفرنامے کی بنت میں پیش کیا گیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے جو بنیادی طور پر سیاح اور سفرنامہ نگار ہے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے "نکلے تری تلاش میں" سے باقاعدہ کردار اور صورت واقعہ اچک کر "پیار کا پہلا شہر" اور "اپاہج دنیس" وغیرہ افسانے لکھے۔ اس سب کے باوجود افسانے اور سفرنامے کے فنی تقاضے الگ الگ نوعیت رکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہ افسانے ایک سیاح کی نظر سے دیکھے تھے۔ اور قاری کو اس تجربے میں شریک کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ چونکہ ان افسانوں میں تارڑ نے بعض حقائق کو افسانے کے جزو مد کے مطابق تخلیق کیا تھا اور ان کی تکنیک افسانہ نگاری کے مخصوص فنی قواعد کی پابند تھی، اس لیے انھیں مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ مغرب میں آرڈوس ہکسلے، ارنسٹ ہیمنگوے، ای۔ ایم فارسٹر، جیمز مشنر، اور سمرسٹ ماہم وغیرہ نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں ممالکِ غیر کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ ان ممالک کی زندگی کی تمام پرتیں تحرک و تحیر کے ساتھ قاری کے سامنے زندہ ہو جاتی ہیں۔ تاہم یہ سب ناول اور افسانے ہی ہیں اور انھیں کسی طرح بھی سفرناموں میں شمار کرنا ممکن نہیں۔

قدیم سفرنامے میں سیاح ماحول پر اچٹتی سی نظر ڈالتا تھا اور ماحول کا خاموش بیانیہ مرتب کر کے اپنے فرض سے بری الذمہ ہو جاتا تھا۔ قدیم سفرنامہ بے آواز فلم کی طرح تھا جو صرف مناظر اور تصویریں پیش کرتا اور داخلی رنگ آمیزی کا کام قاری پر چھوڑ دیتا تھا۔ جدید سفرنامے نے بتدریج جمود سے حرکت کی طرف سفر کیا ہے اور یہ گویا فلم کی طرح ہے۔ اور منظر کا پورا تاثر قاری کو منتقل کرتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا یہ خیال درست ہے کہ ماضی کا سیاح واقعات کو ضبطِ تحریر میں لاتے وقت اپنی ذات کو خارج کر دیتا تھا اور یوں وہ شہروں کا اور واقعات کا غیر جذباتی لہٰذا غیر تخلیقی بیان بن جاتا تھا۔ چنانچہ قدیم سفرناموں کو تحرک یا گویائی حاصل نہیں ہوتی تھی اور سفرنامہ آئینہ خانہ میں رکھی ہوئی بے جان ممی کی طرح نظر آتا تھا۔ قاری ان پتلیوں میں روح کی شدید کمی پا کر بہت جلد اُن سے منہ موڑ لیتا تھا۔ جدید سفرنامہ نگار نے اس بے جان ممی میں روح پھونکنے کے لیے اُسے اپنی ذات کا لمس عطا کیا۔ اس ضمن میں محمود نظامی کا یہ بیان بھی بے حد اہم ہے کہ کئی شہروں کو اُنھوں نے خود دیکھنے کی کوشش کی، لیکن چند ایک شہروں کو اُنھوں نے دل سے گزرنے کا موقعہ بھی دیا۔ محمود نظامی لکھتے ہیں کہ:

> "میں تو بس گذرتا چلا گیا اور ان ممالک کے جو نقوش میرے دل و دماغ پر بیٹھتے گئے اور احساسات کی گہرائی میں اُترتے گئے ان کا اندازہ بھی اگر سچ پوچھئے تو مجھ کو اُس وقت ہوا جب میں اس سفر کے بعد گھر پہنچا....

میں نے ان مختلف مقامات کے حالات پیش کرنے سے زیادہ اُن آئینہ خانوں میں خود اپنے آپ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں میں اس سفر میں بہت سے شہروں سے گذرا ہوں وہاں کئی شہر ایسے بھی تھے جو خود میرے دل سے گزرے ہیں۔"

چنانچہ اس عمل میں شہر خود بھی ایک کردار بن جاتا ہے اور نہ صرف سیاح کے دل سے اجنبیت کا احساس زائل کر دیتا ہے بلکہ سیاح کے ساتھ باتیں بھی کرتا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ سفرنامے میں شہر اور سیاح دو الگ الگ کردار نظر نہیں آتے بلکہ ان میں وہ رشتہ بھی موجود ہوتا ہے جو تخلیق اور تخلیق کار کے درمیان، خالق اور مخلوق کے درمیان اور کسان اور زمین کے درمیان ہوتا ہے۔ سفرنامے میں اگر یہ نہایت پیدا ہو جائے تو سفرنامہ محض واقعات اور مناظر کا بیانیہ نہیں رہتا بلکہ سیاح کی ذہنی اور روحانی واردات بھی بن جاتا ہے اور نقطوں کے وسیلے سے قاری کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ جدید سفرنامہ نگار نے بالعموم ذات اور ماحول کی دوئی کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ منظر کی ان جزئیات کو سمیٹتا ہے جن پر مسافر کی نظر نہیں پڑتی لیکن سیاح کی نظر پڑتی ہے تو اس منظر کی رُوح کو اپنے بدن میں اُتارے بغیر آگے نہیں بڑھتی۔ اس زاویے سے دیکھئے تو قدیم اور جدید سفرنامے میں ایک اساسی فرق یہ بھی ہے کہ قدیم سفرنامے میں معروف شہروں اور مشہور عمارتوں کا ذکر زیادہ ہوتا تھا، لیکن جدید سفرنامہ نام و نشان کی شناخت سے بلند ہوتا جا رہا ہے اور اس میں سنسان کوچوں اور گمنام منزلوں کی مسافت کا احوال بھی درج ہوتا ہے۔ سیاح اس مسافت میں ان کرداروں کا کھوج لگاتا ہے جن پر کسی روائتی مسافر کی نظر کبھی نہیں پڑتی۔ لیکن جن کے تذکرے کے بغیر زندگی کی تصویر اور منظر کا متحرک بیانیہ مکمل نہیں ہو پاتا۔ جدید سفرنامہ نگار نے اس کاوش میں ایسے کرداروں کو بھی پیش کیا ہے جن کے خدوخال اور شخصی خصوصیات سے قاری بے اختیار نفرت یا محبت کے جذبات محسوس کرنے لگتا ہے اور یوں عالم نوردی کے اثرات نہ صرف ایک نئی صورت میں سامنے آتے ہیں بلکہ زندگی کے حقائق و معارف کا شعور بھی بڑھ جاتا ہے۔ شائد اس قسم کے سفرناموں کو دیکھ کر ہی بعض ناقدین کو خدشہ ہوا کہ سفرنامہ افسانے کی صنف میں گم ہوتا جا رہا ہے اور سفرنامہ نگار آرام کرسی پر لیٹ کر اور فلم، اخبار یا ٹی وی سے معلومات حاصل کر کے ایسے سفرنامے تخلیق کر رہا ہے جو دراصل تخیلی افسانے ہیں۔

اُردو کے قدیم اور جدید سفرنامے میں ایک اور نمایاں فرق یہ ہے کہ قدیم سفرنامے میں فکری یا تہذیبی تصادم بہت کم عمل میں آتا ہے۔ برِصغیر کی جغرافیائی صورت ایک قلعہ نما کی سی ہے۔ یہاں کے سماجی، مذہبی اور معاشرتی حالات نے اس ملک کے باشندوں کو ملک سے باہر جانے کے بہت کم مواقع فراہم کئے۔ بیرونی حملہ آوروں نے کچھ تحرک پیدا کیا تو مقامی باشندے اندرونِ ملک ہی نقل مکانی کرتے رہے۔ اس ملک میں چونکہ فطرت نے اپنے خزینے بے دریغ جمع کر رکھے ہیں اس لیے بھی مقامی باشندوں کو تلاشِ معاش و رزق کے لیے بیرونِ ملک جانے کی ضرورت پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ لوگوں میں وہ اوصاف پیدا نہ ہو سکے جو ایک سیاح کو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں اور جو اسے گھر گھاٹ کے بندھنوں سے نجات دلا کر نئی سرزمینوں کی سیر پر اُکساتے رہتے ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد اس صورتِ حال میں نمایاں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی تھی۔ اب نہ صرف معاشرتی بندھن آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگے بلکہ حکومت کی نئی ولایت کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا بھی ضروری ہو گیا۔ سیاسی ضرورت نے سمندر پار جانے کا جو راستہ کھولا

تھا اس نے بہت سے عام لوگوں کے ذوقِ سیاحت کو بھی چمکایا اور انھیں اپنے نئے حاکموں کا دیس دیکھنے پر آمادہ کیا۔ قدیم سفرنامہ نگار کے ہاں سفر اور سوچ دونوں خاصے سست رفتار ہیں۔ چنانچہ وہ مغرب کا قصیدہ خوان ہی نظر نہیں آتا بلکہ وہ ہر قدم پر اس سے مرعوب بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاں اوّلین سطح پر اپنی پسماندگی پر تاسف اور ملال کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ پہلی نظر میں ہی ان سب چیزوں کو سمیٹ لینا چاہتا ہے جن کے بل بوتے پر انگریزوں نے برِصغیر پر اپنا اقتدار مستحکم کر رکھا تھا۔ چنانچہ قدیم سفرنامہ نگار یورپ سے آنکھیں ملانے اور تصادم پیدا کرنے کی جرأت نہیں کرتا بلکہ فوری طور پر اس سے مغلوب ہو جاتا ہے اور صرف اشیا اور ایجادات کے تذکرے سے ہی اربابِ وطن کو مغلوب و مسحور کرنے کی کوشش کرتے لگتا ہے۔

بیسویں صدی میں برِصغیر میں ایسی تحریکیں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں جو انگریزوں کے اقتدار کے مضبوط قلعے پر مسلسل ضربیں لگا رہی تھیں۔ ان تحریکوں نے نہ صرف ہندوستانی سیاح کا اعتمادِ ذات بحال کیا بلکہ اُسے اپنی قومیت پر سفر کرنے کا سبق بھی دیا۔ اس دور میں جن لوگوں نے یورپی ممالک کا سفر کیا۔ ان کے ہاں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب دریافت کرنے کی خواہش نسبتاً زیادہ ہے اور یہ بات بالخصوص توجہ کھینچتی ہے کہ بیشتر مسلمان سیاحوں نے ترکیہ کی سیاحت کو فوقیت دی اور مغربی ممالک پر بالعموم نفرت کی نظر ڈالی ہے۔ جدید سفرنامے میں مغرب کی تحسین یا مفاہمت کے بجائے فکری تصادم کی واضح لہر موجود ہے اور سوچ کی رفتار سفر کی رفتار سے تیز تر معلوم ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے ربعِ دوم کے آخر میں جب برِصغیر مکمل طور پر آزاد ہو گیا تو اس ملک کے سیاحوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو بالخصوص ہدفِ تنقید بنایا اور دور دراز کے ممالک کو یوں دیکھا جیسے ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ کو دیکھتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آزادی کے بعد مشرق کو اپنی ذات پر جو اعتماد حاصل ہوا تھا اس نے اس ملک کے سیاحوں پر بھی خوشگوار اثر ڈالا اور بیشتر سیاحوں نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ انھوں نے اپنے سفر میں مجموعی مشرقیت کو کہیں فراموش نہیں کیا بلکہ دُنیا کو مشرقی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُنیسویں صدی میں جب کوئی سیاح مغرب کے طوفانی سفر سے واپس آتا تھا تو مصلح کا رُوپ دھار لیتا تھا اور پورے ملک کو ترقی کی گاڑی کو جلد پکڑنے کی تلقین کرنے لگتا۔ نتیجتہً اس بلاواسطہ تلقین کے خلاف ردِ عمل بھی پیدا ہوتا اور پورے ملک میں مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا۔ جدید سفرنامہ نگار کو چونکہ مصلح کا رُوپ دھارنے اور ترقی کی رفتار کو مغربی ہتھیاروں سے تیز تر کرنے کی ضرورت نہیں رہی اس لیے اب سفرنامہ جسمانی سطح سے ذہنی سطح کی طرف پرواز کر گیا ہے۔ جدید سفرنامہ جسم سے زیادہ ذہن اور رُوح کو متحرک کرتا ہے۔ اُردو کے ایک معروف سفرنامہ نگار نے تو آج کے سفرنامے کو اکیلے آدمی کا ایپک (EPIC) قرار دیا ہے۔ وجہ یہ کہ جدید سفرنامہ معلومات مہیا کرنے کے بجائے اس فکری اور تہذیبی تصادم کو منظرِ عام پر لاتا ہے۔ جو مختلف تہذیبوں اور نظریاتی نظاموں کے درمیان عالمی سطح پر عمل میں آ رہا ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے سفرنامہ ایک ایسی صنف اظہار ہے جس میں بہت زیادہ تجربوں کی گنجائش موجود نہیں۔ ابتدائی اور قدیم سفرنامے بیانیہ تکنیک میں پیش کیے گئے تھے۔ آج کا جدید سفرنامہ بھی اسی تکنیک میں لکھا جا رہا ہے۔ سفرنامہ چونکہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے اس لیے اس میں فطری طور پر آپ بیتی کا انداز در آتا ہے۔ دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے اور سفرنامہ نگار ہی ہیرو نظر آنے لگتا ہے۔ سفرنامے کی

تکنیک میں اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ سفرنامہ کس وقت لکھا گیا، اور سفرنامہ نگار نے اپنی یادداشتوں کو کس طرح محفوظ رکھا ہے۔ سفرنامہ نگار اگر سفر کے حالات و تاثرات دورانِ سفر لکھتا چلا جائے تو السا سفرنامہ بالعموم ڈائری کی تکنیک اختیار کر لیتا ہے۔ اس قسم کا سفرنامہ نہ صرف تاریخ کا صحیح تعین کرتا ہے بلکہ حادثات و واقعات پر سیاح کا فوری ردِ عمل بھی پیش کر دیتا ہے اور اس میں سچائی کا عنصر زیادہ اور تخیلی آمیزش نسبتاً کم نظر آتی ہے۔ ڈائری میں سیاح اپنی ذات سے ہم کلام ہوتا ہے اس لیے اس میں حسن اور گہرائی پیدا ہو جانے کے امکانات بھی موجود ہیں۔ صیغۂ حال کے استعمال کی بنا پر سب کچھ آنکھوں کے سامنے سے گذرتا ہوتا ہے اور قاری ایک ایسے تبصرہ نگار کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو سیاح کا ہمزاد ہے اور منظر پر خود بھی تبصرہ کر رہا ہے۔

دورانِ سفر لکھے ہوئے سفرنامہ کی دوسری صورت خطوط کی تکنیک میں سامنے آئی ہے۔ ڈائری میں سیاح کسی دوسرے شخص کو اپنے تجربے میں شامل نہیں کرتا لیکن خطوط کا مخاطب تو فاصلے پر موجود ہوتا ہے۔ اور وہ منظر کے حسن میں بالواسطہ طور پر ہی شریک ہوتا ہے اور سیاح وہ کیفیت جو اس نے خود محسوس کی ہے مکتوب الیہ کو منتقل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اس کاوش میں گزرے ہوئے لمحے کی دوبارہ بازیافت کرتا اور اُسے زمانۂ حال میں زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سفرنامے میں سیاح صیغۂ ماضی استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات وہ جاذبِ نگہ کیفیت جو رواں تبصرے کے بیانیہ میں اُبھرتی ہے خطوط کی تکنیک میں نکھر کر سامنے نہیں آتی۔ خطوط میں سفر کی مختلف کڑیوں کو جوڑنے اور ان سے مجموعی تاثر پیدا کرنے کا جذبہ بھی شامل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو واقعات کے درمیان ایک منطقی ربط پیدا کرنے کی کوشش بھی شعوری سطح پر کی جاتی ہے۔ ڈائری کی خوبصورتی اس کی بے ربطی میں ہے لیکن خطوط کی بے ربطی مجموعی تاثر کو زائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ڈائری میں تخلیقی عمل بے ساختہ اُبھر آتا ہے لیکن خطوط میں آرائش اور تخلیقِ مکرر کا وافر عنصر موجود نظر آتا ہے۔ اس سب کے باوجود چونکہ ڈائری کی طرح خطوط بھی دورانِ سفر ہی لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے تاثر میں صداقت کا خطیر عنصر موجود ہے اور قاری انھیں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

سفرنامہ کی تیسری تکنیکی صورت ان سفرناموں میں ملتی ہے جو سفر کے بعد لکھے جاتے ہیں۔ ایسے سفرناموں کے مصنف دورانِ سفر اپنا زیادہ وقت ماحول کے مشاہدے میں گزارتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے یا تو اپنی لوحِ دماغ پر محفوظ کر لیتے ہیں یا پھر اپنی ڈائری میں یادداشتوں کو محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ سفر کے بعد فراغت کا لمحہ آتا ہے تو ان یادداشتوں کو ایک مربوط بیانیہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ دنیا کے بیشتر سفرنامے اسی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ اس قسم کے سفرناموں میں بیانیہ متعدد واقعات وحادثات اور مناظر سے مرتب ہوتا ہے اور سیاح چونکہ منظر کو ذہنی سطح پر دوبارہ زندہ کرتا ہے اس لیے اس میں بالعموم آرائش اور تخیل کو بھی راہ مل جاتی ہے، سیاح اگر منظر کو اہمیت دے تو ایک خوبصورت تصویر مرتب ہو جاتی ہے اور اگر وہ پوری فضا کو گرفت میں لینے کی کوشش کرے تو سفرنامے میں افسانے کا اسرار پیدا ہو جاتا ہے۔ بعد از سفر لکھا ہوا سفرنامہ بالعموم صیغۂ ماضی میں لکھا جاتا ہے لیکن بعض اوقات سفرنامہ نگار سفر کے تاثر کو تازہ رکھتا ہے اور سفرنامہ زمانۂ حال میں بیان کرتا ہے۔ اوّل الذکر صورت میں سفرنامہ بیتی ہوئی بات اور گذرا ہوا افسانہ نظر آتا ہے لیکن مؤخر الذکر صورت میں سیاح تاثر کی وہ گہرائی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو ڈائری اور خطوط کی تکنیک میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

تکنیک کا موزوں انتخاب سفرنامے کی دلچسپی اور اس کے فنی حسن میں اضافہ کرتا ہے تاہم اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ سیاح نے اپنے باصرہ سے کس طرح کام لیا ہے اور واقعات کے اخذ و اکتساب کے لیے اپنی ذہنی بصیرت کو کیونکر استعمال کیا ہے۔ سفرنامہ کا عمدہ مواد سادہ انداز میں بھی پیش کر دیا جائے تو وہ قاری کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے لیکن مواد اچھا نہ ہو تو اچھی تکنیک بھی سفرنامے کی خوبیوں کو آجاگر کرنے میں معاونت نہیں کر سکتی

ایک اچھے سفرنامے میں سیاح اور ادیب دونوں ہاتھ میں ہاتھ ملا کر چلتے ہیں۔ سیاح اپنے تیز باصرہ سے ماحول کی جزئیات کو سمیٹتا ہے۔ ادیب ان جزئیات کو خوبصورت، دلکش اور جاذبِ توجہ اسلوب میں یوں پیش کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہمکلام ہو جاتا ہے۔ سفرنامے کا بیانیہ اگر میکانکی اور غیر تخلیقی اسلوب میں مرتب کیا جائے تو اس کا حلقۂ اثر محدود ہو جاتا ہے اور ادب کی بعض خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ایسے سفرناموں کو ادب پاروں میں شمار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس قسم کے سفرناموں کا عرصۂ حیات بہت مختصر ہوتا ہے اور یہ بہت جلد لوحِ زمانہ سے مٹ جاتے ہیں۔ سفرنامہ کو سنجیدہ اصنافِ سخن میں شمار کیا جاتا ہے چنانچہ سفرنامہ کے بیانیہ کو مرصع بنانے کے لیے بالعموم ایسا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے جو داخلی طور پر توانا ہو اور خارج کی صداقت پر غالب آنے کے بجائے اس کی سچائی کا مظہر بن سکے اور سفرنامے کی سنجیدگی کو مجروح نہ کرے۔ چنانچہ حصولِ مقاصد کے لیے ادبا نے جو حربے استعمال کئے ہیں، ان میں سرسید کی وضاحت، شبلی کی خطابت، محمد حسین آزاد کی جمال آفرینی کو اہمیت حاصل ہے۔

جدید سفرنامے میں طنز و مزاح کا اصول آزمانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس قسم کے سفرناموں میں لفظ کو الٹنے، معنی کی معکوس صورت ابھارنے اور لطیفے کو بیانیہ میں سمونے کی کاوش زیادہ نظر آتی ہے۔ مصنف منظر کو اپنی شریر آنکھ سے دیکھتا ہے اور حیرتوں کو جگانے کے بجائے بوالعجبیوں کو ابھارتا ہے۔ وہ قاری کو بھی آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس تمسخر میں شریک ہو اور کھل کر قہقہہ لگائے۔ چنانچہ وہ شگفتہ کیفیت جو سفرنامے کو انشائیے کے قریب تر کر دیتی ہے اور قاری پر داخلی مسرت کا دروازہ کھول دیتی ہے، استہزا کی نذر ہو جاتی ہے۔ سفرنامے میں ہنسی مقصود بالذات بن جائے تو منظر کا بیان ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور یوں سفرنامے کا اساسی تصور مجروح ہونے لگتا ہے۔ انھیں وجوہ کی بنا پر طنز و مزاح کو شعوری طور پر سفرنامے کا جزو بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ جن ادیبوں نے یہ شعوری کوشش کی ہے ان کے سفرنامے بنیادی طور پر مزاح نامے ہیں اور انھیں سفر کا شیریں ثمر قرار دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

سفرنامہ میں اس حقیقت کا عمل دخل بھی بہت زیادہ ہے کہ سیاح نے سفر کے لیے کونسا وسیلہ حاصل کیا ہے اور مختلف مقامات پر رفت و بود میں کتنا زمانی وقفہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر ہوائی سفر میں سیاح زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہوتا ہے، بلندی سے زمین کی چیزیں چھوٹی نظر آتی ہیں اور منظر تیزی سے اپنی صورت بدل لیتا ہے۔ اس کے برعکس پیدل سفر میں سیاح زمین کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھتا ہے اور وہ اشیا اور مظاہر کے درمیان آسانی سے ربط باہم پیدا کر لیتا ہے اور یوں جزئیات کا مشاہدہ زیادہ قریب سے کرتا ہے۔ سمندری سفر میں نہ صرف تناظر بدل جاتا ہے بلکہ سیاح کے تاثر و احساسات میں بھی نمایاں تبدیلی آجاتی ہے۔ بلاشبہ اب وہ صنوبر کی طرح نہ ہوا میں معلق ہے اور نہ پا بہ گل بلکہ اب وہ کنول کے پھول کی طرح آبِ رواں پر تیر رہا ہے اور سمندر کے بدن کو ہی مس نہیں کر رہا، بلکہ سمندر کے تھپیڑے خود اپنے جسم و جان پر بھی برداشت کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ ایک نئے جہانِ حقیقت

سے آشنا ہوتا ہے اور اسی کو سفر نامے کے بطون میں شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے جس طرح سفر کا ہر نیا وسیلہ سیاح پر کائنات کو مختلف انداز میں منکشف کرتا ہے۔ اسی طرح کسی مقام پر سیاح کا وقوف و قیام بھی اس کے مشاہدات پر بلا واسطہ طور پر اثر انداز ہوتا ہے کسی مقام کا ایک آدھ دن کا دورہ ہوائی جہاز کے سفر کے مماثل ہے اور اس میں شہر کا مزاج سیاح کی گرفت میں پوری طرح نہیں آنے پاتا۔ بعض سیاح صرف اونچے درجے کے ہوٹلوں میں قیام کرتے اور اپنی سماجی حیثیت کے مطابق صرف اونچے درجے کے لوگوں سے ہی ملتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے ہاں بھی مشاہدے کی بوقلمونی ظہور میں نہیں آتی۔ اس کے برعکس جو سیاح کندھے پر تھیلا لٹکائے زمین کو قدم قدم ناپتے ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں اور طبقۂ معاش و خیال کے لوگوں سے ملتے ہیں ان کے سفر نامے میں تجربے کی گہمبیرتا زیادہ نظر آتی ہے اور سفر نامہ ماحول کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے کسی خطے میں سیاح کا طویل قیام اس لیے بھی معنی خیز اور ضروری ہے کہ کوئی بھی خطۂ زمین اپنے تمام اسرار سیاح پر فوری طور منکشف نہیں کرتا بلکہ یہ اسرار تو زمین کو مس کرنے اور اُسے برتنے سے کھلتے ہیں۔ ابن بطوطہ اور مارکوپولو کے سفر ناموں میں حقیقی زندگی کے نقوش اسی لیے زیادہ ہیں کہ ان سیاحوں نے ممالک غیر میں نہ صرف بود و باش اختیار کی بلکہ اُن سرزمینوں کو اپنی رُوح میں پوری طرح اُتارنے کے لیے وہاں شادیاں بھی کر لیں۔ جدید سفر نامے میں بعض سیاحوں کے ہاں زمین کو زیادہ طویل عرصے تک مس کرنے، ممالک غیر کے لوگوں سے ملنے، متعلقات بڑھانے اور خوبصورت لڑکیوں کے قریب آنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے اور ان کے سفر ناموں میں وقت کا پھیلاؤ بھی خاصہ زیادہ ہے اور قیام طویل۔ چنانچہ ان کے ہاں حقیقت کو جزئیات میں دیکھنے کا انداز نسبتاً نمایاں ہے اور اس سے سفر نامے کی جاذبیت میں ایک گونہ اضافہ ہوا ہے۔

سفر چونکہ دنیا کا قدیم ترین عمل ہے اور اس عمل کے ذریعے نہ صرف ایک نئے موجود کو دریافت کیا جاتا ہے بلکہ نامعلوم کا اسرار دریافت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ سفر نے اپنا اوّلین رابطہ کہانی سے قائم کیا۔ اس سے ایک نقطہ نظر تو یہ سامنے آیا کہ سفر کو کہانی کا اساسی عنصر قرار دیئے بغیر بڑی کہانی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ دوسرا یہ کہ قدیم کہانیوں، داستانیں اور مثنویاں سب سفر نامے ہیں۔ اوّل الذکر نقطہ نظر میں یہ صداقت موجود ہے کہ دنیائے قدیم کی بڑی بڑی کہانیوں میں مرکزی کردار مہم آزمائی کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔ طلسمات کے ہفت خوان طے کرتا، ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں سے گذرتا اور بالآخر کو سرمراد حاصل کر کے کامیاب و کامران واپس آتا، ہومر کی روڈیسی، طلسم ہوشربا، قصہ چہار درویش اور فسانۂ آزاد وغیرہ میں ہیرو اساسی طور پر سفر پسند اور مہم آزما ہے۔ اسے نہ صرف نئی زمینوں اور نئی تہذیبوں سے پالا پڑتا ہے بلکہ سفر کے عمل سے وہ اپنی شخصیت کا زنگ اُتارنے اور داخل کی روحانی پرت کو نکھارنے کی سعی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ان کہانیوں کا ضمیر سفر کے توام سے ہی اُٹھایا گیا ہے۔ تاہم ان کہانیوں اور داستانوں کو سفر نامہ قرار دینا اس لیے مناسب نہیں کہ داستان نگار نے کسی موجود زمین پر سفر کرنے کے بجائے زیادہ تر داستان کی ضرورت کے مطابق نئی سرزمینیں خود تخلیق کی ہیں اور داستان کے بطون میں خیالی ملکوں کے عجائبات جمع کر دیئے ہیں۔ نتیجۃً داستان کا سفر نامہ کہانی کو تحرک عطا کرنے اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں ہی معاونت کرتا ہے اور اس کی صرف تخلیقی سطح کو منظر پر لاتا ہے۔ البتہ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ داستان اور کہانی میں سفر کی روایت کو اہمیت حاصل ہوئی اور ان دیکھی زمینوں نے سیاحوں پر اپنے سینے کشادہ کر دیئے، تو اس روایت کو ایک الگ صنفِ ادب کے طور پر اُبھارنے میں بھی بڑی مدد ملی۔ چنانچہ تخیلی سفر نے حقیقی سفر کی اور داستان کی

داخلی جہت نے سفرنامے کی خارجی جہت کی صورت اختیار کرلی۔ یوں کہانی اور سفرنامے کی روایت میں جو مشترک اقدار ملتی ہیں، اُن کی حیثیت موضوعی ہی نہیں معروضی بھی ہے۔

اس اجمال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ ابتدائی سفر داستان اور کہانی کا حصہ تھا لیکن جب سیّاح کو بیرونی ملکوں اور اجنبی دیسوں اور تہذیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تو کہانی کا داخلی عنصر سفرنامے کی خارجی صداقت میں سما گیا اور اس صنف کے انفرادی نقوش آہستہ آہستہ اُجاگر ہونے لگے۔ قدیم سفرنامہ زیادہ تر طبقاتی کوائف جمع کرتا تھا لیکن جدید سفرنامے نے خارج اور داخل دونوں جہتوں کا احاطہ کیا اور اب سفرنامہ ایک ایسی صنفِ ادب کی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں داستان، کہانی اور آپ بیتی کے بیشتر عناصر شامل ہیں۔ تخلیقی اصول کی آمیزش نے اس میں شعری کیفیت بھی پیدا کر دی ہے چنانچہ سفرنامہ صرف نئے ملکوں اور براعظموں کو ہی دریافت نہیں کرتا بلکہ سیاح کے داخل میں آباد دنیا کا مشاہدہ بھی کراتا ہے اور اب یہ دو دنیاؤں کے سنگم پر تخلیق ہو رہا ہے۔

فٹ نوٹس

۱؎ شبلی نعمانی کے سفرنامے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ میں میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا تھا وہ محض ایک طالب علمانہ سفر تھا اور چونکہ نہ یہ کوئی غیر معمولی امر تھا نہ واقعاتِ سفر میں چنداں ندرت تھی۔ سفرنامہ لکھنے کا میرا ارادہ نہ تھا، لیکن وہاں سے واپس آکر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا سب سفرنامہ کے متقاضی تھے۔ میں نے خیال کیا کہ چونکہ مدت سے ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریق بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع حاصل نہیں ہوتی۔ لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بے جا نہیں۔"

(سفرنامۂ روم، مصر و شام" ص ۲)

۲؎ شپرڈ بی کلف "تہذیبوں کا عروج و زوال" ص ۲۶ ۔

عہدِ محمد شاہ کی لسانی خصوصیات

ڈاکٹر ملک حسن اختر

عہد محمد شاہی کی لسانی خصوصیات کا ذکر کرنے سے پہلے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کی زبان لسانی اعتبار سے ایک ہی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شروع ہی سے سارے ہندوستان (شمالی اور جنوبی) میں ادبی زبان ایک ہی رہی ہے چنانچہ عہدِ محمد شاہی سے بہت پہلے ملّا وجہی نے اپنی کتاب سب رس میں لکھا تھا کہ وہ جو زبان استعمال کر رہا ہے وہ "زبانِ ہندوستان" ہے۔ اس نے اپنی داستان کے شروع کرنے سے پہلے جو عنوان قائم کیا وہ یہ تھا "آغازِ داستان زبانِ ہندوستان"[1] اس سے پہلے اس نے لکھا کہ:

"آج مگنا کوئی اس جہان میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کریوں نہیں بولیا ہے"[2]

وجہی گولکنڈے کا رہنے والا تھا اور عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے دربار کا شاعر تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان سے مراد شمالی ہندوستان یا دہلی ہوتی تھی۔ خود وجہی نے جہاں محاورۂ دکن کے مطابق لکھا ہے وہاں اس کی صراحت کر دی ہے چنانچہ اس کتاب کے صفحہ ۲۱۰ پر "دکھنی دہرا" کے عنوان سے ایک شعر لکھا ہے۔ عہدِ محمد شاہی میں بھی شمالی ہند یا دہلی کے لئے ہندستان کا لفظ استعمال ہوتا رہا، میر صاحب سید عبدالولی عزلت کے بیان میں لکھتے ہیں کہ "تازہ وارد ہندوستان کہ عبارت از شاہ جہان آباد است شدہ اند"[3] اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وجہی ایسی اردو زبان میں کتاب لکھ رہا تھا جو پورے ملک کی ادبی زبان تھی۔

اسی طرح غواصی جو وجہی کا ہم عصر شاعر ہے اپنی کتاب سیف الملوک میں اپنا مقابلہ ہندوستان کے شاعروں سے کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی زبان میں شعر کہہ رہا ہے جو شمالی ہند میں بولی اور لکھی جاتی تھی۔

میرا گیان عجب شکرستان ہے — جو اس تے مٹھا ہندوستان ہے
جتے ہیں یو طوطی ہندوستان کے — بھکاری ہیں منج شکرستان کے[4]

---

[1] سب رس ص ۱۶

[2] سب رس از سید وجہی مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن ناشر انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۷ء ص ۱۱

[3] نکات الشعرا از میر تقی میر مرتبہ مولوی عبدالحق ناشر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ص ۹۲

[4] دیباچہ کلیات غواصی ص ۲۹ مرتبہ پروفیسر محمد بن عمر ناشر سب رس کتاب گھر حیدرآباد ۱۹۵۶

نصرتی (المتوفی ۱۰۸۵ھ) کو ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ وہ دکن کا شاعر ہے مگر واضح طور پر کہتا ہے کہ

دکن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیا ہیں
ہوا کیا سب گزرے گئے یو دیکھو حاضر دود فتر ہے[1]

اسی طرح ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی اُردو زبان ہندی یا پھر علاقائی نام سے پکاری جاتی تھی۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں "شاہ برہان کا ایک جگہ اپنی زبان کو ہندی کہنا اور دوسری جگہ گجری کہنا بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ بات نہیں۔ ہندی عام ہے یعنی وہ زبان جو ہر جگہ مستعمل تھی ہندی ہی کے نام سے موسوم تھی۔ گجری یا گجراتی خاص ہے یعنی وہ زبان جو گجرات یا اس کے قرب وجوار کے علاقے میں بولی جاتی تھی اور جس میں کچھ مقامی لفظ بھی شامل ہو گئے تھے۔ زبان ایک ہے دکن میں دکنی کہنے لگے اور گجرات میں گجری یا گجراتی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں کہیں مقامی رنگ کی جھلک نظر آجاتی ہے۔"[2]

مگر بعض اوقات اس معمولی فرق کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا اور اُردو یا ہندی کو علاقائی نام سے بھی پکار لیتے تھے مثلاً ولی نے اپنی زبان کو دکھنی کہا ہے جبکہ سب جانتے ہیں کہ یہ خالص اردو ہے۔ ان کا شعر ہے ؎

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہیں ہیں اے ولی
لیکن نئیں بولا ہے کوئی ایک شعر خوشتر زیں نمط

اردو صرف دکن میں نہیں بولی جاتی تھی۔ بلکہ پورے ملک پر اس کا راج تھا۔ گجرات کے متعلق آپ نے مولوی عبدالحق صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایا۔ اب بہار میں اُردو کی کیفیت کے متعلق اختر احمد اختر اورینوی کی رائے ملاحظہ ہو

"اب اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ صوبہ بہار میں اردو کو سرِ دورِ اول سے ہی دخل حاصل رہا ہے۔ اس دیار میں بھی لسانی ارتقا کی وہی مرکب اور پیچیدہ قماش ظاہر ہوتی ہے جو اور صوبوں میں ظاہر ہوئی۔ ..... پہلے دور کو میں بہار میں اُردو کے قدیم کا دور کہوں گا۔ اس دور میں ریختہ پن کے ساتھ کچھ لسانی پنجابیت بھی ملتی ہے جو دورِ وسطیٰ تک قائم رہی۔"[3]

اختر اورینوی بہار میں اُردو زبان وادب کا ارتقا (ص ۲۶۱) پر شاہ آیت اللہ کی مثنوی گوہر جوہر کی لسانی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہوتا ہے کی جگہ 'ہوہے' کھاتا ہے کی جگہ 'کھاہے' مستعمل ہیں۔ غالباً یہ بہاری بولی کا مقامی رنگ ہے۔" یہ بات درست نہیں کیونکہ شمالی ہند کے شاعروں مثلاً آبرو اور ناجی کے ہاں بھی فعل حال کا یہ استعمال ملتا ہے۔

---

[1] دیوانِ نصرتی مرتبہ جمیل جالبی ص ۵۳ ناشر قومیں لاہور ۱۹۷۲ء

[2] اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ ص ۸، ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۳ء

[3] بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا از سید اختر احمد اختر اورینوی ص ۱۱۶-۱۱۴ ناشر بیل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۷ء

دراصل سارے ملک کی زبان ایک تھی اور ایک حصّہ میں لکھی جانے والی کتابیں دوسرے حصّۂ ملک میں پڑھی جاتی تھیں۔ اختر اورینوی فقہ ہندی کے مختلف نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مجھے فقہ ہندی کے اب تک پانچ نسخوں کی اطلاع ملی ہے۔ ایک پنجاب میں، دوسرا گجرات میں، تیسرا اودھ میں اور چوتھا اور پانچواں بہار میں[1]۔"

اب آئیے جنوب اور شمال میں اردو زبان کی لسانی مماثلت کے متعلق ایک غیر ملکی گراہم بیلی کا بیان دیکھیں وہ لکھتے ہیں:

"یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ چودھویں صدی کے وسط میں دہلوی اور دکنی اردو میں واقعی کوئی فرق نہیں تھا لیکن جب خود مختار بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی تو دونوں بولیاں مختلف راستوں پر جا پڑیں"[2]

چودھویں صدی عیسوی کا وسط آٹھویں صدی عیسوی کا وسط ہے:۔

مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ سترھویں صدی عیسوی (گیارہویں صدی ہجری) میں وجہی اپنی زبان کو زبانِ ہندوستان کہہ رہا ہے لہٰذا گراہم بیلی صاحب کے بیان کا دوسرا حصہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ اردو کے بعض نقادوں کے بیانات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اردو کے نقادوں کو جب قلی قطب شاہ، وجہی اور نصرتی کا کلام ملا تو انہوں نے اسے دکھنی اردو قرار دیا۔ شمالی ہند میں اردو کے نمونے بعد میں دریافت ہوئے مگر جب شاہ حاتم، ناجی اور آبرو کے دواوین دستیاب ہوئے تو یہ نقاد الجھن میں گرفتار ہو گئے فضلی کو دکنی زبان سے لسانی مماثلت کی وجہ سے دکنی شاعر قرار دے دیا گیا تھا مگر آبرو، حاتم یا ناجی کو دکن کا شاعر تو نہ کہا جا سکتا تھا۔ البتہ ایک حقیقت اور بھی سامنے تھی کہ ولی کے اثر سے ان لوگوں نے دہلی میں شاعری کا آغاز کیا تھا اور دیوان مرتب کئے تھے۔ اور بعض تذکرہ نگاروں نے شاہ حاتم کی زبان کو ولی کی زبان کے مماثل قرار دیا تھا۔ مبتلا نے ان کے متعلق لکھا کہ "ان کی زبان ولی دکنی سے مناسبت رکھتی ہے[3]"

اور شورش نے کہا

"زبانش با زبانِ ولی مناسبت تمام دارد"[4]

لہٰذا یہ فرض کر لیا گیا کہ دکنی زبان کے اثر سے شمالی ہندوستان کے شعرا کی زبان میں لسانی تبدیلیاں ہوئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر فضل الحق لکھتے ہیں:

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ غواہ جمع بنانے کا قاعدہ ہو یا ڑ کو ڈ سے بدلنے کا رواج یہ مثالیں اول تو کم ہیں دوم ان کے اثبات دہلوی شعرا کم ہوئے بلکہ دکنی کے سہارے ان کا اثر ہوا جس طرح ناجی وغیرہ نے سیں، سیتی، سوں، اتنا کے بجائے ہیتا، کو کے بجائے کوں، اب تک کے بجائے 'ابلگ یا اب تلگ'، ہر دن کی بجائے نس دن، جگہ

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا از سید اختر احمد اختر اورینوی ص ۱۲۱ ناشر لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۷ء

[2] تاریخ ادب اردو از گراہم بیلی ترجمہ مس حمیدہ ملک ص ۶ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

[3] گلشن سخن (گلشن و گلزار ص ۵) مرتبہ سید عطاء الرحمٰن عطا۔ ناشر عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۶۸ء

[4] تذکرۂ شورش (دو تذکرے ص ۱۹۰ - ۱۸۹) مرتبہ کلیم الدین ناشر لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء

کے لیے 'جاگہ' ادھر کی بجائے 'ایدھر' کو کی جگہ "کے تئیں" اپنایا اسی طرح فعل سے اسم اور پنجابی جمع بنانے کا قاعدہ بھی اختیار کر لیا جس کو اسی دور کے شعرا نے ترک کرنا بھی شروع کر دیا۔[۱]"

حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے کہ ناجی اور ان کے معاصرین پر ولی کے اثر سے ان کی زبان میں مندرجہ بالا تبدیلیاں آئی ہیں۔ ولی کا دیوان ۱۱۳۲ھ میں دہلی میں آیا مگر اس سے بہت پہلے جنوبی اور شمالی ہند کی زبان میں مماثلت موجود تھی۔ مولوی عبدالحق ایک شاعر اسمٰعیل کی مثنوی وفات نامہ (جو ۱۰۵۰ھ میں شمالی ہند میں لکھی گئی) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مثنوی کی زبان دکنی اردو سے بہت ملتی جلتی ہے۔ جمع بنانے کا طریقہ، افعال کی ساخت، ضمائر کا استعمال اور قدیم الفاظ دونوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔"[۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء) کے فالناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فالناموں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ زبان سارے برِعظیم میں مروج تھی۔"[۳]

چنانچہ معلوم ہوا کہ ناجی اور ان کے معاصرین سے پہلے ہی شمال و جنوب کی زبان ایک جیسی تھی۔ دراصل شمال اور جنوب کا رابطہ پہلے سے قائم تھا اور شعرا شمالی ہند سے جنوبی ہند اور جنوبی ہند سے شمالی ہند کا سفر کرتے رہتے تھے۔ صرف مصحفی کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ دکنی شاعر شمالی ہند آئے تھے اور تیس کے قریب شمالی ہند کے شاعروں نے دکن کا سفر کیا تھا۔[۴]

قائم نے کہا ہے کہ شاہی دکنی کے مرثیے ۱۱۸۰ھ کے قریب شمالی ہند میں بڑے مقبول تھے۔[۵] اسی طرح ایک دکنی شاعر محق کا ذکر کرتے ہوئے میر حسن لکھتے ہیں۔

"محق تخلص از شاعرانِ دکن بود لیکن از کلامش معلوم می شود کہ با مردم ہندوستان تربیت یافتہ می شود۔"[۶]

میر حسن نے محق کا ذکر متقدمین کے تحت کیا ہے لہٰذا یہ عہدِ محمد شاہی سے پہلے کا شاعر ہے۔ یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ میر حسن نے محق کی زبان پر شمالی ہند کا اثر بتایا ہے جبکہ ہمارے نقاد دکن کا اثر شمال پر ثابت کرتے رہتے ہیں وہ جن الفاظ کو دکنی کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں وہ شمالی ہند میں بھی استعمال ہوتے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیضانِ دانش اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

---

[۱] دیوان شاکر ناجی — اردوئے معلیٰ قدیم اردو نمبر ص ۲۰۹۔

[۲] قدیم اردو از مولوی عبدالحق ص ۲۱۴۔

[۳] تاریخ ادب اردو جلد اول از ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۳۹، لاہور ۱۹۷۵ء

[۴] دکن کا اثر شمالی ہند پر محی الدین قادری زور (اردو اپریل ۱۹۲۹ء ص ۱۸۳)

[۵] مخزنِ نکات مرتبہ اقتدا حسن۔

[۶] تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن ص ۱۴۴ مرتبہ حبیب الرحمٰن شروانی دہلی ۱۹۴۰ء

"قدیم دکنی اُردو میں جو سنسکرت کے مادے استعمال ہوئے ہیں ان کا چلن دہلی میں نہیں تھا اور جب یہ زبان دہلی آئی تو دکنی زبان کے بہت سے اجنبی افعال ترک کر دیے گئے۔"[1] یہ الفاظ انہوں نے لکھے ہیں:

ان میں سے مندرجہ ذیل الفاظ پنجابی زبان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو عہد محمد شاہ یا اس کے بعد ترک کیا گیا البتہ پنجابی میں یہ اب بھی مستعمل ہیں:

دسنا ——— نظر آنا۔

سٹنا ——— گرانا، پھینکنا۔

کاڈنا ——— نکالنا، الگ کرنا۔

لانا ——— لگانا، مارنا۔

لڑنا ——— کاٹنا۔

نسنا ——— بھاگنا۔

ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا تعلق دکن سے نہیں بلکہ پنجاب سے ہے اور اب بھی یہ پنجاب میں استعمال ہوتے ہیں۔ غالباً ڈاکٹر فیضان دانش پنجابی سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ماریا، رہیا، چلیا، کہیا، گیا کو دکنی الاصل قرار دیا ہے[2] اور لکھا ہے کہ قدیم ہریانی میں ہی یہ ملتے ہیں جبکہ یہ افعال پنجابی میں اسی طرح ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر حبیب النسا بیگم ولی اللہ دکنی اردو کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ:

"دکنی زبان کے افعال ضمائر، متعلقات شمالی ہند کی مروجہ زبان جیسے کھڑی بولی، برج بھاشا، میواتی سے ماخوذ تھے۔"[3]

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شمال اور جنوب کی ادبی زبان ایک ہی تھی اور کوئی بھی دوسری سے ماخوذ نہ تھی۔ ان سب سے زیادہ اُردو کے قریب پنجابی ہے جسے ڈاکٹر صاحبہ نے نظر انداز کر دیا ہے۔

ڈاکٹر حبیب ضیا نے دکنی زبان کی قواعد لکھی ہے اور اس کے دیباچہ میں کہا ہے کہ "جہاں دکنی زبان کی قواعد اُردو سے مختلف ہو جاتی ہے میں نے خصوصیت کے ساتھ ایسے اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے درحقیقت میرے ریسرچ کا یہی پہلو نمایاں اور اہم ہے[4] مگر انہوں نے اُردو اور دکنی کے جن اختلافات کا ذکر کیا ہے وہ موجودہ اردو اور پرانی دکنی میں تو موجود ہیں مگر پرانی دکنی اردو اور قدیم شمالی ہند کی اُردو میں یہ اختلافات موجود ہیں جو وہ لکھتے ہیں: دکن میں جمع ان بڑھا کر بنائی جاتی ہے مگر اُردو میں ایسا نہیں ہے۔ مثلاً

---

[1] کلام ولی کا فنی اور لسانی جائزہ ص ۱۶۴ از فیضان دانش مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

[2] " " ص ۱۸۷

[3] ریاست میسور میں اردو کی نشوونما از ڈاکٹر حبیب النسا ولی اللہ ص ۳۷، برقی پریس بنگلور ۱۹۶۲ء

[4] دکنی زبان کی قواعد از ڈاکٹر حبیب ضیا۔ کراچی ۱۹۶۹ء۔

عورت سے عورتاں، بات سے باتاں، غلام سے غلاماں[۱] ۔ وغیرہ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ محمد شاہی میں جمع بنانے کا یہی قاعدہ تھا جس کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا ۔ اسی طرح انہوں نے لکھا ہے کہ دکن میں فاعل اگر جمع مونث ہو تو فعل کی جمع بھی ان سے ہی بنائی جاتی ہے جیسے ؎

محبت پیالہ پریاں سے کھڑیاں[۲] (محمد قلی) ۔

نیز وہ لکھتے ہیں کہ اردو میں عموماً صفتیں واحد اور جمع میں یکساں رہتی ہیں لیکن دکنی میں ان کی بھی ان کے اضافے سے جمع بنائی جاتی ہے[۳] جیسے کالیاں گوریاں وغیرہ لیکن عہدِ محمد شاہی کی اردو میں بھی جمع بنانے کا یہی قاعدہ تھا ۔ اردو اور دکنی میں جمع بنانے کی یہ خصوصیات یکساں ہیں ۔

ڈاکٹر حبیب ضیا اردو اور دکنی کا فرق بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ فعل متعدی اردو میں مفعول کے تابع ہوتا ہے لیکن دکن میں فاعل کے تابع ہوتا ہے[۴] مثلاً خدا یو بات بولیا[۵] لیکن شمالی ہند میں بھی فعل متعدی کا یہ استعمال ملتا ہے ۔ میر کا یہ شعر ملاحظہ ہو

گل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

اسی طرح کربل کتھا کی یہ عبارت ملاحظہ ہو :-

" جوں وہ طبق سکینہ کے آگے رکھے، پوچھی کہ کیا ہے ؟"[۶]

اس فقرہ میں پوچھی سکینہ کے لحاظ سے اور رکھے وہ کے مطابق آیا ہے حالانکہ رکھنا اور پوچھنا فعل متعدی ہیں اور انھیں مفعول کے تابع ہونا چاہیے ۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ اردو میں مفعول غیر ذی عقل یا بے جان ہو تو علامتِ مفعول استعمال نہیں ہوتی لیکن دکن میں غیر ذی عقل مفعول کے ساتھ بھی اکثر دفعہ علامتِ مفعول لائی جاتی ہے جیسے ؎

انگوٹھی لے وضو اوں پکڑ کر وہاں تے آیتہ الکرسی کوں پڑ کر[۷] (ابنِ نشاطی)

مگر شمالی ہند میں بھی علامتِ مفعول کا یہ استعمال ملتا ہے ۔ مثلاً

اب رنڈاپا ملے ہے دلہن کوں نوچتی ہے وہ اپنے ابرن کوں (فضلی)

---

[۱] دکنی زبان کی قواعد از ڈاکٹر حبیب ضیا ۔ کراچی ۱۹۶۹ء صفحہ ۴۹-۵۰
[۲] " " " " " " صفحہ ۵۱
[۳] " " " " " " صفحہ ۸۳
[۴] " " " " " " صفحہ ۲۵۹
[۵] " " " " " " صفحہ ۲۶۲
[۶] کربل کتھا از فضلی مرتبہ مالک رام ص ۲۸۳ پٹنہ ۱۹۶۵ء [۷] دکنی زبان کی قواعد از ڈاکٹر حبیب ضیا ۔ کراچی ۱۹۶۹ء ص ۲۱۶

ناصح تو آ تو اب کے سینے مرا گریباں ۔۔۔ میں تا تار کر دوں سارے یہ پیرہن کو (تاباں)

در اصل ڈاکٹر حبیب ضیاؔ نے قدیم دکنی کا مقابلہ جدید اُردو سے کیا ہے اگر وہ قدیم دکنی اردو کا مقابلہ شمالی ہند کی قدیم اُردو سے کریں تو دونوں کے قواعد کو یکساں پائیں کیونکہ در اصل یہ ایک ہی زبان ہے۔

اسی طرح حکیم شمس اللہ قادری نے دکنی زبان کے املا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں تسبیح کو تسبی، تجھ کو تج اور ساتھ کو سات لکھا جاتا ہے[1] مگر جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں ذکر کریں گے یہی املا شمالی ہند میں بھی رائج تھا۔

دکن کو چھوڑ کر اب ذرا دوسرے علاقوں کی طرف آئیں تو۔ یہاں بھی وہی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نل دمن از احمد مرادی کو "ہریانی اردو کا ایک اور نمونہ" قرار دیتے ہیں[2] اور ہریانی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ہریانی اردو رجحانات میں رُعام طور پر ڈ سے بدل جاتا ہے (ص ۱۱۲) مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر فضل الحق نے اسے دکنی کی خصوصیت قرار دیا ہے۔

مالک رام اور مختار الدین احمد کی رائے میں بھی "بعض الفاظ کا ٹھیک تلفظ ڑ یعنی رائے ہندی سے ہے ایسے مقامات پر دکن میں ڈ کو ترجیح دی جاتی ہے"[3] شیخ محبوب عالم ساکن جھجر کی تصانیف میں بھی ڑ ڈ سے بدل جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک زمانہ میں اُردو کی خصوصیت تھی اور اس کا تعلق کسی خاص علاقہ سے نہ تھا چنانچہ ڈاکٹر فیضان دانش کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ "دلی کے پہلے اُردو دوسرے دور کی زبان بھی بالواسطہ ہریانی ہی سے متاثر ہے[4]"

جب کسی محقق کو کوئی دکنی اُردو کا قدیم نمونہ ملتا ہے تو وہ اس کو دہلی کی زبان کا ماخذ قرار دے دیتا ہے مگر جب دوسرے صاحب ہریانی کی تصنیف دیکھ لیتے ہیں تو ہریانی زبان کے اثرات دہلی کی اُردو پر ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اُردو ایک ملک گیر زبان تھی اور ملک کے ہر حصہ میں ادبی اُردو ایک ہی تھی لہٰذا دکن، دہلی، بہار، بنگال، گجرات اور ہریانہ کسی بھی علاقہ سے اسے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

خود ڈاکٹر فیضان دانش نے چھ صفحوں میں دکنی اُردو اور ہریانی اردو کی مماثلت کو بیان کیا ہے[5] اور پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں کہ:

"فی زمانہ اس زبان میں بہت کچھ ابتری آگئی ہے لیکن عالمگیر اور اس کے بعد کے زمانہ میں اس کی یہ حالت نہیں تھی۔ اس عہد میں ہریانی باستثنا بعض امور اردو زبان کے بہت قریب تھی۔ نہ الف واؤ سے بدلتا ہے اور نہ ہ سین سے بدلتی ہے اور نہ مفعولی نے نظر آتا ہے نہ اس کی صرف و نحو اور بول چال میں اس قدر اختلاف ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس عہد کی اردو یہی ہے[6]"

---

[1] لمعات اُردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ قادری مختار الدین احمد لکھنؤ ۱۹۳۰ء۔

[2] مباحث (ہریانی اُردو کا ایک اور نمونہ ۔نل دمن) ص ۹۹۔

[3] مقدمہ کربل کتھا ص ۷۔

[4] کلام ولی کا فنی اور لسانی جائزہ (قلمی) ص ۲۴۹۔

[5] " " " " ص ۲۵۰ تا ۲۵۶

[6] مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد دوم مرتبہ مظہر محمود شیرانی ص ۳۵۸ ناشر مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ عہدِ محمد شاہی میں سارے ہندوستان میں ایک ہی ادبی زبان رائج تھی مگر یہ ادبی زبان عوام کی زبان تھی اور محاورہ عوام کو مستند سمجھا جاتا تھا چنانچہ ایک بار میر صاحب نے کہا کہ خاقانی و حافظ و سعدی کا کلام سمجھنے کے لیے فارسی کی فرہنگیں درکار ہیں لیکن میرا کلام سمجھنے کے لیے اس زبان و محاورے کا جاننا ضروری ہے جو دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ہے۔ میر کا شعر ہے

شعر میرے ہیں گو خواص پسند　　گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

اسی طرح سودا نے ایک شعر میں کہا۔

لب و لہجہ ترا سا ہے گا کب خوبانِ عالم میں
یہ غلط العام ہیں جگ میں کہ بس مصری کی ڈلیاں ہیں

یہ عوامی انداز ہی ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس عہد میں قواعد کی سختی سے پابندی نظر نہیں آتی۔ عوام قواعد سے زیادہ زبان کے آسان استعمال کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی زبان میں بڑی تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہر زبان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ عہدِ محمد شاہ سے پہلے فارسی کے حرف اور فعل تک استعمال میں لے آتے تھے مگر شاہ مبارک آبرو نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہ بات ابتدائے عہدِ محمد شاہ میں موجود رہی اور بعد میں عہدِ محمد شاہ میں ہی ترک کر دی گئی۔ اسی طرح ایک مصرع اردو اور ایک فارسی لکھنے کا رواج تھا اسے بھی عہدِ محمد شاہ میں ترک کر دیا گیا۔ لیکن جہاں اردو کو اس کا اصل رنگ عطا کیا گیا وہاں اس عہد میں فارسی زبان کے مضامین خیالات سے فائدہ بھی اٹھایا گیا اور ساتھ ہی فارسی زبان کے الفاظ و تراکیب کو بھی اردو میں داخل کر دیا گیا۔ چنانچہ فارسی محاورات کا اردو میں ترجمہ کر کے زبان کو وسعت بخشی گئی چند محاورات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱)　آشیاں بستن = آشیاں باندھنا　(اب آشیاں بنانا استعمال ہوتا ہے)

نہ گل اپنا کیا میں نے نہ بلبل باغباں اپنا　　چمن میں کس بھروسے باندھتا ہے آشیاں اپنا　(مرزا مظہر)

(۲)　برباد دادن = برباد دینا (اب برباد کرنا استعمال ہوتا ہے)

کہیں دینے سے جی کے وصل ہونا ہاتھ لگتا ہے　　دیا برباد پروانے نے ناحق دودماں اپنا　(مظہر)

(۳)　تصدق شدن = تصدق ہونا (یہ اسی طرح آج بھی مستعمل ہے)

کبھی ملتا نہیں میرا ہٹیلا کیا کروں مظہر　　تصدق ہو کے دیکھا پاؤں پڑ دیکھا سنا دیکھا　(مظہر)

(۴)　غنیمت دانستن = غنیمت جاننا (یہ بھی آج تک مستعمل ہے)

غنیمت جان قاتل جانِ مظہر　　یہ مقتولوں میں ٹک لیمل رہا ہے

(۵)　بو کردن = بو کرنا (یہ استعمال نہیں ہوتا)

ہم ہیں جنہوں نے نامِ چمن بو نہیں کیا　　آئی صبا جدھر سے ادھر رو نہیں کیا　(قائم)

(۶)　با ما آشنا بود = ہم سے آشنا تھا (آج بھی مستعمل ہے)

داغ ہے تا یاں علیہ رحمۃ کا چھاتی پہ میر　　ہو نجات اس کی بچارا ہم سے بھی تھا آشنا　(میر)

کربل کتھا میں فارسی محاوروں اور تراکیب کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ چند ایک ملاحظہ ہوں:

دوست داشتن (درست رکھنا)، در ورطۂ بلا گذشتن (ورطۂ بلا میں پڑنا) لافِ محبت زدن (محبت کا دم مارنا)، سر در پیش انداختن (سر نیچے کرنا) لرزہ بر اعضا افتادن (لرزہ بدن پر پڑنا) بانگ بر شکر زدن (شکر پر نعرہ مارنا) خون ریختن (خون گرانا یا ڈالنا) اقرار داشتن (اقرار رکھنا) وغیرہ۔ ان میں سے اکثر تراکیب متروک ہو گئیں۔ اور تو اور فارسی کے اشعار تک کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا۔ دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

اے بادِ صبا ادب ضرور است	ایں مشہدِ ماست گلستاں نیست	(مظہر)
یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے	قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں	(یقین)

از ابروئے کج تو دلم کے رہا شود	نشنیدہ ام کہ گوشت ز ناخن جدا شود	(سراج)
ترے ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز	گوشت ناخن سے کہیں کوئی جدا ہوتا ہے	(تاباں)

در فراقِ تو چہ ہا اے بت محبوب کنم	صبرِ ایوب کنم، گریۂ یعقوب کنم	(مراعلم)
ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا	صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا	(دردمند)

اور میر صاحب نے تو ایک شعر میں یہ وضاحت بھی کر دی کہ وہ فارسی کے تتبع میں شعر کہتے ہیں:

تتبع سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

فارسی کے اس تتبع سے فارسی زبان کے بیشمار الفاظ اور تراکیب اردو زبان میں داخل ہو گئیں۔

فارسی تراکیب اضافت اور واؤ عطف سے بنتی تھیں، اس زمانے میں فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت اور واؤ عطف کو جائز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح کی تراکیب رائج تھیں۔ بیڑۂ پاں، پوششِ چھینٹ صحنِ گھر نالہ ہائے دکھ، دریائے لڑائی، کپڑۂ حریر، دیارِ اشک، بحرِ دکھ، بعد میں اضافت کا یہ استعمال ناجائز قرار پایا چنانچہ انشا دریائے لطافت میں لکھتے ہیں:۔

"فارسی کے طرز پر مضاف کے نیچے کسرۂ اضافت دینا جب کہ دونوں لفظ ہندی ہوں یا ان میں سے ایک ہندی ہو غلط ہے جیسے اوسِ برسات، شبنم بھادوں، اوسِ صبح ..... لیکن کسرۂ اضافت ایسے لفظ کے آخر میں استعمال کر سکتے ہیں جس کے لیے فارسی میں کوئی لفظ نہ ہو۔"[1]

---

[1] دریائے لطافت مرتبہ مولوی عبدالحق ترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی ص ۲۷۵، ۲۹۰

ہمارے خیال میں فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت کو جائز سمجھنا چاہیے اس طرح اردو زبان میں وسعت پیدا ہوگی اور یہ عوام کے قریب ہو جائے گی۔ اب ہم عہد محمد شاہی کے شعرا کے چند شعر درج کرتے ہیں جن میں فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت کو استعمال کیا گیا ہے۔

(آبرو) جدھر جاتا ہے تو ہے سرو دلجو — رواں ہو چشم سے دریائے آنسو

(فضلی) ہم بارِ فراق تجھ پہ رکھے دیتے — سو چشمہ لہو سے دل کے کھوے دیتے

(فضلی) بے بہا لعل کا دو در یتیم — صدفِ غم میں بحرِ دوکھ کا مقیم

جب فارسی کے الفاظ کثرت سے اردو میں آنے لگے تو لفظوں کے تلفظ میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی چنانچہ کبھی متحرک حرف کو ساکن اور ساکن کو متحرک بنا دیتے تھے۔ یہ تبدیلی زیادہ تر سہ حرفی لفظوں میں ہوئی مثلاً قائم کا شعر ہے۔

میں دیکھا خاک تھا باطن میں جو کرم خوردہ
بظاہر گرچہ نظروں میں ترا رنجور بہتر تھا

اس شعر میں کرم کو کرِم باندھا ہے۔ اسی طرح فضلی کا شعر ہے

بیٹے دو تو یہ بی بی زینب کے — ماموں پہ ہو فدا عَدَن کو چلے

اصل میں عَدَن ہے جس کا مطلب بہشت کے باغات ہیں عَدَن حدودِ یمن کا ایک شہر ہے۔ مگر یہ چیز اس زمانے میں جائز سمجھی جاتی تھی۔ شفیق اورنگ آبادی نے خَتَم کو خَتِم لکھ دیا تو کسی مفتون نے اعتراض کیا اس کا جواب دیتے ہوئے شفیق نے کہا۔

کر خَتَم کہو سے خَتِم کو صاحب[1] — ہے روا حرکتِ مقام کو دیکھ
ریختے کی زباں میں یہ غلطی — ابتدا سے ہے انتظام کو دیکھ
آبرو زُلف کو زُلَف بولا — اور الفاظِ نا تمام کو دیکھ
نقل ہے وقتِ مغرب اعظم شاہ — یوں کہا اپنے یک غلام کو دیکھ
ہودے اسواری اس گھڑی تیار — سیر جا ہے ہے جی پہ شام کو دیکھ
مولوی جیون شاہ اوستادِ شاہ — تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھ
لفظ اسواری نہیں سواری ہے — کچھ تو اس صحتِ کلام کو دیکھ
شاہ نے تب تو یہ جواب دیا — میری طرزِ سخن تمام کو دیکھ
یہ عبارت کہا میں ہندی میں — اس میں جائز ہے تو نظام کو دیکھ

یہی رویہ بعد میں انشا نے بھی اختیار کیا۔ وہ کہتے ہیں۔

۱۔ وہ اردو میں صاحب تخلص کرتے تھے۔

" اُردو کے طالبوں سے پوشیدہ نہ رہے کہ عربی اور فارسی کے بعض سہ حرفی الفاظ کے درمیانی حرف کو اردو میں ساکن سے متحرک بنا دیتے ہیں جیسے شرم، گرم کی ر کو جو ساکن تھی مفتوح کر دیا - اسی طرح نرم، صبر، علم، ظلم، عقل، قبر، جبر، شکل، فکر، اجر، فخر، صلح، ..... اسی طرح بعض متحرک حرفوں کو ساکن کر دیا گیا جیسے بشریت، سب جانتے ہیں کہ اس لفظ میں شین مفتوح ہے مگر اس کے تلفظ میں شین ساکن بولا جاتا ہے -

جاننا چاہیے کہ جو لفظ اردو میں آیا وہ اُردو ہو گیا خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح - اس کی صحت اور غلطی اس کے اُردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے کیونکہ جو چیز اردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو جو اردو کے موافق ہے وہ صحیح ہے خواہ اصل میں صحیح نہ ہو"۔[1]

مگر انشا کے بعد یہ اصول برقرار نہ رہا اور ظلم اور عقل غلط قرار پائے اور آج بھی غلط قرار دیئے جاتے ہیں جبکہ عوام کے لئے درمیانی حرف کو متحرک بولنا زیادہ آسان ہے اور یہ تبدیلی فطری ہے لہٰذا ہمیں پھر اس سلسلے میں عہدِ محمد شاہ کی زبان کی پیروی کرنا چاہیے -

عہدِ محمد شاہی میں ہندی کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے تھے جن میں سے چند کا ذکر ہم نے ناجی کے حالات میں کیا ہے - ہندی الفاظ میں سے اکثر متروک ہو گئے اور ان کی جگہ فارسی یا عربی الفاظ نے لے لی - اس زمانے میں تشبیہات کے لیے بھی ہندی اسما سے کام لیا جاتا تھا مگر بعد میں یہ روایت بھی ترک کر دی گئی - یہاں چند مثالیں لکھتے ہیں:

(فائز) چیری ہیں اس کی از لبی[2]، رسبھا[3] در ادھکا[4] پربھوے پہ بنائی ہیں ویسی دوسری

(تاباں) سخن میں ان کی محبت کی بو ہے اے تاباں رکھیں ہیں تب تو کرشن چند جی سے ہم اخلاص

(تاباں) دھوپ میں تاباں اگر خورشید روجائے مرا ہو گل سورج کبھی تب آفتابی باغ میں

(حاتم) کرتا ہے حاتم بدی رکھتا ہے نیکی کی امید کمائے امرت پھل کہاں جن نے بویا ہو ارنڈ

" لال لوہو میں اپنے لال ہوا مسیں اوس شہ کا نیزے نال ہوا

ہندی کے ساتھ ساتھ پنجابی کا بھی بڑا گہرا اثر تھا - دراصل اردو زبان شروع ہی سے پنجابی زبان کے قریب رہی ہے بعد میں سے پنجابی سے دور کر دیا گیا چنانچہ عین الحق فرید کوٹی اپنی قابلِ قدر کتاب اردو زبان کی قدیم تاریخ میں لکھتے ہیں:-

"جب ہم اُردو زبان کے لغوی سرمائے اور صرف و نحو کا موازنہ برصغیر کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ صرف و نحو کے لحاظ سے پنجابی کے علاوہ کوئی دوسری زبان اُردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی"۔[5]

---

[1] دریائے لطافت از انشا اللہ خاں ص ۴۵-۳۵۳ (ترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی) ناشر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵
[2]، [3] اندر کی اسیرائیں - [4] رادھا [5] اردو زبان کی قدیم تاریخ ص ۹۳

اس عہد میں پنجابی اسماء، حروفِ تشبیہ، افعال، ضمائر وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ اُن کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

بعض الفاظ کی جمع ان لگا کر بنائی جاتی ہے۔ یہ قاعدہ اگرچہ فارسی میں بھی ہے مگر پنجابی کے گہرے اثر کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ پنجابی سے اردو میں گیا ہوگا۔ پنجابی میں آج بھی درخت کی جمع درختاں اور ذات کی جمع ذاتاں استعمال ہوتا ہے۔ کربل کتھا کے ابتدائی صفحوں میں ان والی جمع زیادہ بنائی گئی ہے اور بعد کے صفحات میں کم جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ اس زمانے میں ہی ترک ہو رہا تھا مثلاً مرزا مظہر کا شعر ہے ؎

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی — مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

پنجابی میں اسم جمع ہو تو اس کے ساتھ فعل بھی جمع استعمال ہوتا ہے۔ یہی حال محمد شاہی عہد میں بھی تھا۔ پنجابی میں اسم صفت جمع لاتے ہیں بلکہ موصوف جمع ہو تب بھی اردو میں صفت واحد ہی استعمال ہوتا ہے جیسے نیک لڑکے، بھولی بھالی بولی وغیرہ مگر اس زمانے میں پنجابی طرز پر لکھا اور بولا جاتا تھا مثلاً

(سودا) باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں — دل لے کے بولتا ہے جو تو اب یہ بولیاں

(") کیا چاہیے تجھے سر انگشت پر حنا — جس بے گناہ کے خون میں چاہی ڈبولیاں

(فغاں) ہم نے شبِ فراق میں سنتا ہے اے فغاں — کیا خاک سو کے حسرتیں دل کی نکالیاں

اب پنجابی افعال کے استعمال کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(میر) ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بیقرار — یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

(میر) اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا — کھب گئی جیو میں تیری بانکی ادا

(میر) اس آستاں سے کس دن پیشِ سر نہ ٹپکا — اس کی گلی میں جا کر کس رات میں نہ کوکا

(بیان) غنچوں سے صبا کہیو کہ آہستہ کھلیں — زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہیگا

(میر) پیکاں خدنگ اس کا یوں سینے سے باہر ہے — جوں مرثیہ کوئی کا ڈھے ہوئے پھن بیٹھے

(میر) آگ میں غم کی ہو کے گنداں جسم ہوا سب پانی سا — یعنی بن آں شعلہ رخوں کی خوب ہی ہم بھی تائے گئے

(آبرو) ع اشک آنکھوں میں رہے ہیں چو میاں

(آبرو) آتا ہے جب تو لالہ کانوں میں ڈال موتی — رخسار کی جھلک میں دستا ہے لال موتی

جن مصدروں کی علامتِ مصدر سے پہلے کوئی حرف علت ہو ان کے مستقبل، حال، ماضی ناتمام میں لاحقہ سے پہلے واؤ بڑھا دیتے تھے مثلاً کماوے، جاوے، لیوے ہے، دیوے تھا۔ اس کے متعلق انشا لکھتے ہیں کہ

"پنجابی میں نا علامتِ مصدر سے پہلے واؤ بڑھا دیتے ہیں جیسے جاونا، آونا لیکن یہ ایزادی وہاں کرتے ہیں جہاں مصدر کی علامت دور کرنے کے بعد الف رہ جائے ہر جگہ نہیں۔"[1]

---

[1] دریائے لطافت ترجمہ برجبھن ڈتا تریہ کیفی صہ ۱۸۸، ۱۸۷

اردو میں ضمیر واحد حاضر "تو" ہے اور پنجابی میں "توں" یا "تیں"[1] ہے عہد محمد شاہی میں توں اور تیں استعمال ہوتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی تو اور تم کا رواج بھی ہو گیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ نواح فتح پور اور الہ آباد وغیرہ میں اب بھی تو نے کی جگہ تیں نے بولتے ہیں[2]۔

(آبرو) تبسم سے مجھے، اس کو نظر سے کیا تیں دو کو راضی کس ہنر سے

(آبرو) یوں بے وفا ہوا ہے توں اے سرخ چہرے والے ہم کوں پڑے ہیں تیرے اب دیکھنے کے لالے

پنجابی میں ثانی حرفِ علت گرانے کا رجحان ہے۔ برج بھاشا میں ثانی حرفِ علت کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا پنجابی کے بعض الفاظ مثلاً کن، ہتھ اور ٹنگ وغیرہ اردو میں آکر برج کے اثر سے کان، ہاتھ اور ٹانگ بن گئے۔ ایسے الفاظ جن میں حرکت کا اشباع کر لیا جاتا ہے ان کی مثالیں املا کا ذکر کرتے ہوئے لکھی جائیں گی۔

اُردو میں علامتِ فاعل نے ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں:

> یہ ہندوستانی زبانوں سے مخصوص ہے ہندوستان سے باہر علامتِ فاعل کا وجود نہیں ملتا بھاشا میں علامتِ فاعلی کا چلنا عام ہے[3]

مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

> "نے فاعل کی علامت کے طور پر قدیم ہندی میں کہیں استعمال نہیں ہوا اور ہندی کی پوری شاخوں میں اس کا وجود نہیں تلسی داس کے کلام تک میں بھی کہیں اس کا استعمال نہیں پایا جاتا۔
>
> اس کا استعمال اس طور پر غالباً اسی وقت شروع ہوا جب کہ اردو نے اپنا سکہ جمایا۔ البتہ مرہٹی میں اس کا استعمال اردو یا ہندی کی طرح ہوتا ہے لیکن پہلے بطورِ علامتِ مفعول ہوتا تھا جس کا پتہ پنجابی اور گجراتی سے چلتا ہے[4]۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبان اردو میں مولوی صاحب کا بیان دہرا دیا ہے[5] مگر ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور مولوی صاحب کا یہ خیال درست نہیں کہ پنجابی میں یہ بطورِ علامتِ مفعول استعمال ہوتا ہے۔ پنجابی میں علامتِ مفعول نے نہیں بلکہ نوں ہے اور علامتِ فاعل نیں ہے چنانچہ عہدِ محمد شاہی میں نے اور نیں دونوں استعمال ہوتے تھے دراصل نے نیں ہی کی صورت ہے اس میں ن کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور ن کا یہ اضافہ کئی لفظوں میں کیا جاتا تھا جس کا ذکر املا کے بیان میں ملے گا۔ لہٰذا نے علامتِ فاعل کو پنجابی کی دین سمجھنا چاہیے۔

---

[1] ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق ص ۵۵۸ [2] نکاتِ سخن ص ۱۳۔

[3] اردو شاعری کا مزاج از وزیر آغا ص ۱۳۰ ناشر جدید ناشرین لاہور ۱۹۶۵ء

[4] قواعدِ اردو از مولوی عبدالحق ۱۶۰ ناشر انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۰ء

[5] مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ناشر اردو مرکز لاہور ۱۹۶۶ ص ۱۶۱۔

اسی طرح علامتِ مفعول ملتانی پنجابی میں کوں ہے عہد محمد شاہ میں کوں کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔

(مظہر) خدا کے واسطے اس کوں نہ ٹوکو یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

کربل کتھا میں کوں کا استعمال کثرت سے ہوا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ عہدِ محمد شاہ میں بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا مثلاً دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اب زنڑاپا ملے ہے دولہن کوں نوچتی ہے وہ اپنے ابرن[1] کوں
دیکھ قاسم توں اوس کی تہن کوں یاد کرتی ہر ایک سخن تیرا

مگر ایک دو جگہ کو بھی استعمال ہوا ہے مثلاً:

نجما کے زینب و کلثوم اس حالے کو لوٹائیں خاک میں اپنے نئیں دو کیاں رو رو

یقین کے دیوان میں بھی کوں کے ساتھ کو بھی استعمال ہوا ہے مگر شفیق نے چمنستانِ شعرا میں اپنے ۵۸ اشعار لکھے ہیں ان میں سے ایک میں بھی کوں استعمال نہیں ہوا اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۱۷۵ھ تک کوں کا استعمال ترک ہو گیا تھا۔ اسی طرح شاہ حاتم نے ۱۱۶۸ھ میں دیوان زادہ مرتب کیا تو کوں کو بدل کر کو کر دیا چنانچہ ۱۱۳۱ھ کی غزل کے اس شعر میں کو ہی ہے۔

کیا کہے قاصر زباں تو حیدِ حمدِ کبریا جتنے کن کے حرف ہیں کونین کو پیدا کیا

اب ہم عہدِ محمد شاہی کے شعرا کے چند شعر لکھتے ہیں جن میں پنجابی کے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

(دردمند) تجھے دفترِ زر کی حرمت کی سوں تجھے منعموں کی شرافت کی سوں

(دردمند) الٰہی ترا حمد مقدور نئیں اگرچہ سخن کا یہ دستور نئیں

(میاں جگنا) اے دل مریضِ عشق کو آزار ہی بھلا چنگا ہو تو ستم ہے یہ بیمار ہی بھلا

(فائز) عشق کی آگ میں رہے دن رین یارِ[2] تیرا مگر سمندر ہے

(فغاں) نت اسی آرزو میں رہتا ہے سارے ہفتہ کو جمعہ کہتا ہے

(فغاں) والے کس طرح کا یہ دولا ہے یہ موا ہاتھ سے تو لولا ہے

(میر) مدعی کی صف ہے کونجوں کی قطار شکری اس فوج کا ہر ایک عقاب

(میر) بوئے کباب سوختہ آئی ہے کچھ دماغ ہووے[3] نہ ہووے اے نسیم رات کسی کا دل جلا

(میر) کیا کیا نیاز طینت اے نازپیشہ تجھ بن مرتے ہیں خاک رہ سے گوڈے رگڑ رگڑ کر

(میر) کہہ سانجھ کے موئے اے میر دیں کب تلک جیسے چراغِ مفلس اک دم میں بل بجھا ہو

---

[1] زیور۔ [2] یارِ عین عاشق۔

[3] ہووے نہ ہوئے ملتانی پنجابی ہے (ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق)

(میر) نہ کر دیوار کا مجلس میں تکیہ ہمارے مونڈھے سے مونڈھا لگا کر

(جرأت) سر دیجے راہِ عشق میں پر منہ نہ موڑیے پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہ کن کی بات

اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے شوق نے لکھا ہے: "اگر بجائے لفظ لکیر پتھر کی لیک می شد ایں لفظ حکم کوہ کن می کرد دور دل نقش کالحجری شد"[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ محمد شاہ کے خاتمہ کے کافی عرصہ بعد تک بھی لکیر کی بجائے لیک کو مستند سمجھا جاتا تھا۔ اس عہد میں اردو میں کنے کا لفظ پاس اور طرف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی پنجابی سے آیا ہے۔ اسی طرح کا کے کی کی اضافتیں بھی پنجابی کی دین ہیں۔

شاہ مبارک آبرو کی مثنوی آرائش معشوق میں کئی لفظ پنجابی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں کھڑا، ں جھائی، پنڈے، کاڈ، لے کر کے، باہنھ پنجابی میں:

روشنی لے کر کے کھڑے کو مل دھوپ ہو تو گھر سے باہر مت نکل

زعفران اور تیل چنبیلی کا لے کاٹ کر اس بیچ رس لیموں کا دے

یہ دوا ہر روز استعمال کر چھیب اور جھائی ہو تو یوں پھر چال کر

یہ دوا ہر روز پنڈے کو لگا رات کو مل صبح اٹھ حمام جا

.. .. باہنھ اور ہاتھوں سستی زیادہ نہ کر

باندھ ٹپکا سات گز کا دے کے بل صاف بندش ہو نہ ہووے پل بھپل

شوق کو سبھوں میں ناڑے اک نگاہ میں جیو اس کا کاڈے

اس مقالے میں پنجابی کے تمام الفاظ کی فہرست دینا ممکن نہیں صرف چند کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ پنجابی کے یہ الفاظ عہدِ محمد شاہ کے بعد بھی استعمال ہوتے رہے مثلاً لون آتش کے زمانے تک ملتا ہے۔

(آتش) رنج خمار اٹھانے کی طاقت نہیں مجھے پیتا ہوں میں شراب بھی لون ڈال کے

کربل کتھا میں پنجابی کے بیشمار الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ خطوطِ دھدانی میں الفاظ کا مطلب دیا گیا ہے۔

سار (قدر، خبر) - اچرج (عجیب، حیرت) - ایک بھوئی پانی (تھوڑا سا پانی)

پرچانا (بہلانا) - تپانا (دکھ دینا) - چاڈ (پیار)

چوانا (ٹپکانا) - سیاپا (ماتم) - گھنیرا (بہت زیادہ)

لالن (محبوب) - لتا (کپڑا) - نیر (آنسو) - بر (شوہر) وغیرہ

---

[1] طبقات الشعرا از مولوی کریم الدین و فیلن باہتمام مولوی اشرف علی دہلی ۱۹۴۸ء ص ۳۱۴

ہم علامتِ مفعول کوں کا ذکر کر چکے ہیں مگر کو کے لئے کبھی کبھی کے تئیں بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:-

(مظہر) لوگ کہتے ہیں ہوا مظہر بے کس افسوس — کیا ہوا اس کے تئیں اتنا تو بیمار نہ تھا

(ناجی) اک بار جو بغل میں لوں سرو قد کتیں — پالا بتاؤں خضر کی عمر ابد کتیں

ناجی نے کے تئیں کو اکٹھا کر کے کتیں بنا دیا ہے۔

اس عہد میں حرفِ استفہام کبھی، کسی، کس نے کی جگہ کبھو، کسو اور کن نے استعمال ہوتے تھے مثلاً:

(قائم) تو مہرباں کبھو ہم پر ایک دم نہ ہوا — ہوئے جو تجھ پہ ہم عاشق تو کچھ ستم نہ ہوا

(ہدایت) کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک — پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

(فدوی لاہوری) کن نے بھیجا ہے کون ہے وہ شخص — جس کا لاتا ہے تو ادھر کاغذ

کبھو اور کسو پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں۔

"یہ دونوں لفظ لکھنؤ میں ناسخ کے عہد سے متروک ہیں۔ دہلی میں غالب و ذوق و مومن کے ان کا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا۔ اب وہاں بھی متروک ہیں۔ مرزا غالب نے اس باب میں اپنا مسلک ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ قافیہ کی رعایت سے اگر کہا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح کسی ہے۔ حضرت طبا طبائی کے نزدیک اب یہ طے ہے کہ قافیہ کی ضرورت سے بھی ان لفظوں کا باندھنا صحیح نہیں۔ راقم حروف کے خیال میں شعرائے اردو کو عام طور پر حضرت نظم کے قول پر عمل کرنا چاہیے البتہ شاذ مواقع پر کہنہ مشق اساتذہ کے لیے مرزا غالب کی پیروی بھی قابلِ اعتراض نہیں"[1]

حروفِ جارہ، حروفِ مقدارہ، حروفِ تشبیہ بھی اس عہد میں جس طرح استعمال ہوتے تھے اب نہیں ہوتے اور متروک ہو گئے ہیں۔ ان کی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ایسے حروف کے اوپر خط کھینچ دیا گیا ہے:

(فغاں) بہار آئی ہے سوتے کو ٹک جگا دینا — جنوں ذرا مری زنجیر کو ہلا دینا

(یقین) گرمیِ اہلِ بزم میں مت کر کہ میں ہوا ہوں داغ — شمع کی خدمت ستی ایتی ہے پروانے کی عرض

(یکرنگ) آتا ہے مست اپنے حسن کی مے سے سخن مرا — کہ کھاتا ہے بیاں کرنے مستی لغزشِ سخن میرا

(مبتلا) مبتلا جیوں دلی جہاں بھیتر — دل کوں اپنے مکانِ غم مت کو

(مبتلا) ہوا نیر نیساں کے بادل میں بند — توں بجلی نمن جب سوں آیا کڑک

(مبتلا) جامے منیں خوشی ستی جیوں گل نہ رہ سکوں — مجھ شعر کوں پڑھے جو وہ غنچہ دہان آج

(فضلی) اللہ کی جو مدد سے شاملِ حال ہے — دیباچۂ کتاب کا دل موں خیال ہے

(فضلی) کروں ہر ساعت اب فریاد میں تیری جدائی سے — ہزار افسوس گر باد صبا تجھ لگ نہ پہونچا دے

(فضلی) تھا دل مرے کی توں مراد عالم میں — بے بس یہ مراد آج چھوڑے و چلے

---

[1] نکاتِ سخن از فضل الحسن حسرت موہانی۔ اردوئے معلی کانپور ۱۹۲۵ء ص ۲۸

(حاتم) گلشن آبر سایہ پڑا اس بے مروت کا نہ چہرے پر کسی گل کے نہ دیکھا رنگ الفت کا

(سودا) ع نہیں یہ سوز جو مرنے کے بعد آ رہی تجھے بھولے

(فغاں) یہاں تلک تو بہا تیر اخوں ہوا ہے جا مہ تمام گلگوں گیا وہ قاتل تڑپھ چکا تو اے بلبل اب کے برس

مگر مولانا حسرت موہانی تلک کے ترک کرنے کو جائز نہیں سمجھتے وہ لکھتے ہیں:-

"لفظ تلک کو آج کل کے شعرا نے اتفاق کر کے ترک کر دیا ہے اور اس کو غیر فصیح سمجھتے ہیں۔ تلک کی جگہ تک کہتے ہیں لیکن ہر زبان میں معیارِ فصاحت محاورہ ہے اور محاورے میں تک اور تلک دونوں موجود ہیں پھر اس کے ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ ایک وجہ سے تلک بہ نسبت تک کے زیادہ افصح ہے وہ یہ کہ جن اہلِ تحقیق نے حروف کے مخارج و صفات پر نظر کی ہے انہوں نے چھ حرف ایسے پائے ہیں کہ جس کلمے میں ان کا کوئی حرف ہو اس کلمے کو سلیس اور فصیح سمجھتے ہیں۔ ان حرفوں کا مجموعہ مرنبفل مشہور ہے غرض کہ تلک میں مرنبفل کا لام ہے اور تک میں اس کا کوئی حرف نہیں۔"[1]

ہمارے خیال میں مرنبفل کی پابندی ضروری نہیں کیونکہ زبان میں فصیح اور غیر فصیح لفظ بعض حروف کے استعمال سے نہیں بنائے جا سکتے۔ تک چونکہ تلک سے مختصر ہے اور وہی معنی دیتا ہے غالباً اس لیے اسے زیادہ استعمال کیا جانے لگا ہے اور اب چونکہ تلک کی بجائے تک کا ہی استعمال ہوتا ہے اس لئے یہی فصیح ہے۔ خود مولانا حسرت موہانی نے ایسے کئی لفظوں کو متروک قرار دیا ہے جن میں مرنبفل کے حروف ہیں۔ مثلاً اب لگ، باج، لکھڑا، منے، کنے وغیرہ۔ نرباہ کی بجائے نباہ کو ترجیح دی ہے حالانکہ "نرنبفل کی" اس میں موجود ہے۔ تلک ناسخ کے عہد تک موجود رہا ہے اور اس کے بعد متروک ہوا ہے جیسا کہ ناسخ کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

موسمِ گل میں بشر ہے معذور گل تلک چاک قبا کرتے ہیں

عہدِ محمد شاہی میں سے کی جگہ سیں۔ ستی، سوں، ستیں کا استعمال بہت زیادہ ہوتا تھا۔ دیوانِ ناجی، دیوانِ آبرو (مکتوبہ ۱۱۴۴ھ) کربل کتھا اور دیوان قبلا میں ان کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں سے کا استعمال دو چار جگہ ہی ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل دو شعروں میں سے استعمال ہوا ہے۔

ہم جانتے ہیں خوباں گری کریں گے مل کر دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا

سینے میں آبرو کے ہر دم کے ساتھ آنجھو نکلا ہے۔ یوں کوئے سے جیوں آنکھ پہ بروما

چمنستانِ شعرا (ص ۱۸۱) میں آبرو کے نام سے یہ شعر بھی دیا ہے جس میں سے استعمال ہوا ہے ؎

اشکِ گرم و آہِ عاشق کے سے تو پرہیز کر خوب ہے پرہیز جب ہو مختلف آب و ہوا

لیکن آبرو کے قلمی دیوان مکتوبہ (۱۱۴۴ھ) میں سے کو سیں اور آب و ہوا کو آب اور ہوا لکھا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ چمنستانِ شعرا کی تالیف کے وقت سے کا رواج بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو اشعار بعد میں نقل ہوئے ان میں کاتبوں نے تصرف کر دیا ہے

---

[1] نکاتِ سخن ص ۴۵۔

یقین (متوفی ۱۱۶۹ھ) کے ہاں بھی سے کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ اسی طرح چمنستانِ شعرا میں شفیق نے جو اپنے اشعار کا انتخاب دیا ہے ان میں صرف ایک شعر میں ستی استعمال ہوا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

جیوں جلا آگ کا آتش ستی ہوتا ہے بھلا　　عشق کے درد کو تحقیق دوا ہیگا عشق

۱۱۶۸ھ میں حاتم دیوان زردہ مرتب کرتے ہیں تو سیں کو "سے" سے بدل دیتے ہیں چنانچہ دیوان زردہ میں ۱۱۳۲ھ کی غزل میں سے لکھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد میں کاتب نے سیں، ستی کو 'سے' سے بدل دیا ہو مگر ہمارا خیال ہے کہ شاہ حاتم نے دیوان زردہ میں پرانی زبان کو ترک کر دیا تھا۔ جیسا کہ دیباچے سے ظاہر ہے۔ اس لیے انہوں نے خود ہی ستی یا سیں کی جگہ سے لکھ دیا ہوگا۔

مسعود حسن رضوی صاحب دیوانِ فائز کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"کسی کی جگہ کسو اور کبھی کی جگہ کبھو کہیں نہیں ملتا لیکن ایک جگہ کہیں کے معنی میں کہوں ملتا ہے۔ کرتا تھا، کیتا تھا وغیرہ کی جگہ کرے تھا، کہے تھا تو کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ آتا ہے جاتا ہے کی جگہ آئے ہے، جائے ہے بھی ایک دو جگہ سے زیادہ نہیں آیا۔"[1]

ظاہر ہے کہ یہ کاتبوں کا تصرف ہے انہوں نے زبان کو جدید بنا دیا ہے جیسا کہ اوپر کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ کبھو اور کسو تو بعد کے شاعروں یعنی فغاں اور یقین کے ہاں بھی موجود ہے۔

اسی طرح یکتا کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ "مرزا مظہر جانجاں نے آخری زمانے میں ستی بمعنی از کا استعمال ترک کر دیا تھا اور اب حال کے شعرا کے ہاں نہیں ملتا۔"[2] مرزا مظہر بارہویں صدی کے آخری عشرے میں فوت ہوئے جبکہ سیں اور ستی کی جگہ سے کا استعمال عہدِ محمد شاہ میں ہی شروع ہو گیا تھا اور ۱۱۹۹ھ تک تو بالکل استعمال نہیں ہوتا تھا کیونکہ خواب و خیال (۱۱۹۹ھ) میں ہر جگہ سے استعمال ہوا ہے۔

اُردو میں فعل حال کی علامت "تا ہے" ہے۔ عہد محمد شاہی میں اس علامت کے ساتھ "جائے ہے"، جاوے ہے بھی ملتا ہے مولوی عبدالحق صاحب کا خیال ہے کہ اس سے موجودہ فعل حال بنا ہے جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں جاوے ہے پنجابی میں بھی ہے۔ مولوی عبدالحق نے فعل حال کے تغیرات قواعدِ اُردو میں بیان کئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ جاوے ہے، جائے ہے، جاوت ہے، جات ہے اور جاتا ہے۔[3] اور بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جائے ہے، کرے ہے کا استعمال آج بھی دہلی بجنور اور مراد آباد میں ملتا ہے۔[4]

اس عہد میں فعل حال میں ہیگا بھی استعمال ہوتا تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(فضلی)　پدر کوں خواب میں دیکھی ہے اک بچی بے حال　　سو ہٹ کرے ہے یہ غل ہے یہ شور آتا ہے۔

(آبرو)　پھر پھر کے دیکھ ہم کوں کیا مسکراتا ہے　　مدت میں آپڑا ہے یہ اتفاقِ حسنا

(آبرو)　زندگانی تو ہر طرح کاٹی　　مرکے پر جینا قیامت ہے

---

[1] اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ص ۸۶۔ [2] دستور الفصاحت، احمد علی خاں یکتا۔ ۱۹۴۳ء ص ۸۔ [3] قواعدِ اردو از مولوی عبدالحق ص ۸۶
[4] کرنل کتھا کی زبان — اُردو ئے معلیٰ قدیم اُردو نمبر ص ۸۴۔

(فضلی) پدر سے بوسے دہاں چھاتی سے لگاتا ہے — تو بے حیائی سے اب لگ نہ باز آتا ہے

(فضلی) ابھی جو حکم کروں ہوں تو بیٹھ کر جلاد — سبھوں کے تن سیتی سر سب کے کرتا ہے آزاد

ان کے علاوہ فعل مضارع جو عموماً حال اور مستقبل کے معنی دیتا ہے اس زمانے میں ماضی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا مثلاً کربل کتھا کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"جوں وہ طبق سکینہ کے آگے رکھے، پوچھی کہ کیا ہے بعض کہے جو چاہتی تھی سو ہے[1]"

اس عبارت میں پوچھی، اس نے پوچھا کی جگہ استعمال ہوا ہے جو اب متروک ہے۔ دیتا ہوں کی جگہ دیوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

(فضلی) نہ جانوں جانے کیا اپنے دل میں زندانی — میں دہم کرکے دیوں ہوں جیتی انا کانی[2]

کرنا مصدر سے اس زمانے میں کیا کی بجائے کریا بھی استعمال ہوتا تھا۔

(میر) حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کیجئے — تری تلاش میں ایک دل کدھر کدھر کیجئے

اور ع آبرو نے خوار ہو کر پختگی حاصل کری

ملا گیا کی جگہ ملائے گیا مثلاً

(آبرو) نین سے نین جب ملائے گیا — دل کے اندر مرے سمائے گیا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہوتا ہے یا ہوئے ہے میں "تا" یا "ئے" کو حذف کر دیتے تھے اور فعل حال کا اس طرح کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا مثلاً۔

(ناجی) شب کے تھکے ہیں ماہ رو مل جا گلے اے ماہ رو — اب صبح کی ہو ہے اذاں پھر تم کہاں اور ہم کہاں

(آبرو) میرا دل ڈوب جا ہے دیکھ تیرے کان کا موتی — قیامت آب ہے اس کی یہ ہے طوفان کا موتی

(آبرو) تم اپنی بات کے راجہ ہو پیارے — کہے سیں ضد تمھیں ہو ہے سوائی

بعض جگہ امدادی افعال کو حذف بھی کر دیا گیا ہے مثلاً

(فضلی) یہ باز آتے نہ اب لگ نہ ڈر ہے ان کوں مرا — غرور ان کا نہ گھٹتا نہ کوئی گھٹاتا ہے

(فضلی) اچھے آئے کہاں سے آئے بیٹھو — سراپا اب خوشی تم لائے بیٹھو

(فضلی) تھے چوکیدار جو حاضر دو کانپ بید مثال — کہے کہ بندیوں میں ہو رہا یہ تیل و قال

پوچھنا اور دیکھنا مصدر کی جگہ دیکھن اور پوچھن بھی استعمال ہوا ہے یعنی مصدر کے نا کا الف حذف ہو جاتا ہے۔

(مثلا) گر آج مرے گھر میں وہ چنچل چیل آوے — دیکھن کوں تماشا سینے سوں غم نکل آوے

چاند سا دیکھ مکھ سمریجن کا — ترک دیکھن کیا ہوں درپن کا

---

[1] ص ۲۸۳ [2] چشم پوشی

وجدی کی پنچمی بابچا (۱۱۵۵ھ) میں بھی پوچھنے کی جگہ پوچھن استعمال ہوا ہے۔

دیکھ کر پوچھن لگیارہ زن کریو

کبھی فارسی الفاظ کے اردو مصدر بنا لیتے تھے مثلاً کربل کتھا میں قبول کرنا اور بحث کرنا کی بجائے قبولنا اور بحثنا بعض اوقات امدادی فعل جو مصدر کے لئے استعمال کئے جاتے تھے وہ اب متروک ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے امدادی فعل استعمال ہوتے ہیں۔ کربل کتھا سے ہی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ نماز کرنا ۔ ۲۔ خبر کہنا ۔ ۳۔ برباد دینا ۴۔ سرمہ دینا

۵۔ وعدہ دینا وغیرہ۔

اسی طرح آبرو نے نیند آنا کی جگہ خواب آنا استعمال کیا ہے:

سخن کے دیکھنے کا شوق ہوتا ہے ہمیں جس شب اوس شب خوب آتی ہے مرے بختوں سیں خواب اوس کوں

آبرو نے ہی مہر لگانا کی جگہ مہر دینا استعمال کیا ہے:

آج کیوں مہر منہ پہ دے بیٹھے کل تو تم جان ہم ستی تھے وا

اسی طرح باس کرنا، بدلہ کرنا، گوش کرنا، خواب آنا بھی استعمال ہوئے ہیں جو اب متروک ہیں:

(میر) گل کو محبوب ہم قیاس کیا فرق نکلا بہت جو باس کیا

(فغاں) بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے تو بھی کہیں فریفتہ ہووے خدا کرے

(فائز) اے یار نصیحت کو اگر گوش کرے تو یہ طور و طریق اپنے فراموش کرے تو

گلزار فقیر (تصنیف ۱۱۴۰ھ) میں "ہوئی" کے لیے بھئی کا لفظ استعمال ہوا ہے جو آج کل متروک ہے۔

جب شمع جمال کی روشن بھئی ظلمت کفر کی ظلمت گئی

فارسی کے اسم فاعل سے حاصل مصدر بنا لیتے تھے مثلاً ظالم سے ظالمی اور خسرو سے خسروی۔ آبرو کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا

سجن کی خسروی میں آبرو سا نہیں شیریں زباں شکر تری کا

فعل امر کے آگے ی 'و' کا اضافہ کر دیتے تھے اور بعض صورتوں میں ی و کے بعد ج بھی اضافہ کر دیتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(فغاں) مجھ شکستہ دل کو خدا شاد کیجیو اس خانماں خراب کو برباد کیجیو

(ہدایت) نامہ کا میرے لے کر اس سے جواب پھریو پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھریو

(سودا) جس طرح چاہتا ہے دنیا میں زندگی کر لیکن تو یاد رکھیو عاشق کبھو نہ ہونا

(مضمون) میرا پیغام وصل اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کر کر

مگر عہد محمد شاہ میں ہی ی و کے بغیر بھی صیغہ امر استعمال ہوتا تھا۔ سودا اور فضلی کے شعر ملاحظہ ہوں۔

(سودا) نہ استفسار کیجے ہم سے اس لب کی حلاوت — شکر کا ذائقہ خونِ جگر خواروں سے مت پوچھو

(فضلی) مسجد سے مجھوں لے چلو اب گھر لہو لہان — دیدار آخری میرا دیکھیں جو بیٹیاں

(〃) میرے رفیقو تم اب یہاں ستی جاؤ — ناحق اپنے سر تن سے مجھ بدل نہ کٹواؤ

(〃) بلکہ میرا بھی ناموس اپنے ساتھ لے جاؤ — ہونا ہے سو ہووے مجھ پر یا نصیب یا قسمت

لیکن ی و (اور ج) کے اضافہ کے ساتھ امر کی صورت ہمیں بہت بعد تک ملتی ہے۔

(اسیر) پہلے رندوں میں ہو شریک اسیر — بیٹھیو بعد پارسا ہو کر

(حسرت موہانی) دامانِ صبر ہاتھ سے حسرت نہ دیجیو — گر خواہش طرب ہے ہجومِ بلا کے بعد

ضمائر کا استعمال زیادہ تر موجودہ زمانہ کے مطابق ہے مثلاً فضلی نے کربل کتھا میں میں، میرا، میری، تیرا، تیری، تمھیں تمہارا، ہم، ہمارا، اس وغیرہ کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے تم اور تو کی جگہ تون اور تیں بھی استعمال ہوتے تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ "جدید اردو میں یہ ضمیر آپ ہے لیکن فضلی نے پوری کتاب میں صرف ایک بار یہ ضمیر استعمال کی ہے"[1]۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال غلط ہے۔ یہ ضمیر فضلی نے ایک سے زیادہ بار استعمال کی ہے۔ ایسے دو مقامات کی نشاندھی ذیل میں کی جاتی ہے۔

۱۔ یہ دونو آپ سے جدا نہ ہووین (ص ۶۰)

۲۔ یہ سنج سند تبوک کے تا زیانہ آپ نے نکالا کہ مرکب پر لگا دیں (ص ۶۳)

فضلی نے "اس" کے لئے "وس" کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لفظ عبداللہ مسکین کے مرثیوں میں بھی ہے اور قائم کے شعر میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً

(فضلی) وس نے کہا کہ اپنی آقائی نہ کرو تم — پیغمبر آخر الزمان کو مت روسیہ کرو تم

(مسکین) جب دن ہوا تو وس نے شمشیر کر کے عریاں — بچوں کو گھر سے کاڈھا اور باندھیں ان کی زلفاں

(قائم) اے وفا بیگانہ ملنے میں ترے حاصل ہے کیا — بے وفا تجھ سا جو ہو کیا کیجے وس سے اختلاط

تیرے کی جگہ تجھ، تمہارے کی جگہ تم، میرے کی جگہ مجھ اور ہمارے کی جگہ ہم استعمال ہوتا تھا۔

(فضلی) الٰہی کہا قدرت فہم و عقل — کرے وصف تجھ فضل کی جو نقل

(حاتم) دل تو تم پاس ہے گو عقل میں — دور بیٹھے ہیں پرے بیٹھے ہیں

(مظہر) بجن کس مزہ سے آج دیکھا ہم طرف یارو — اشارا کر کے دیکھا، ہنس کے دیکھا، مسکرا دیکھا

---

[1] کربل کتھا کا لسانی مطالعہ — اردوئے معلیٰ قدیم اردو نمبر ص ۱۰۰

ہمارے کے لئے ہمن استعمال ہوتا تھا۔

(آبرو) دعویٰ ہے جس کوں شعر کی قوت کا آبرو — مضموں کا بوجھ آ کے اٹھاوے ہمن کے نال

(ناجی) تیری نگہ کی کثرت سیں دے کماں ابرو — ہمن کے سینے میں تو در ہوا ہے تیروں کا

ہم کی جگہ بھی ہمن استعمال ہوا ہے۔

(فائز) دوری نہ کرو ہمن سے اس حد — دل محو ہے تمہاری دلبری کا

(مبتلا) غصے نہ ہو ہمن پر اے بے وفا سریجن — کچھ بھی وفا بچن پر رے بے وفا سریجن

اپنے کی جگہ اپس کا استعمال ملاحظہ ہو۔

سیل کے مانند رو رو کر اپس — گھر کوں ویراں کر گیا ہے مبتلا

ان سے کی جگہ انہوں سے اور انہوں نے کی بجائے ان نے استعمال ہوتا تھا۔

(سودا) تو کہا ان نے کہ ہے میری سعادت اس میں — لیکن ہے خوف مجھے آپ کی بد ذاتی کا

(فغاں) فغاں میں نے تو یہ کچھ آزمایا دیر و کعبہ میں — مراد دل نہ برآئی انہوں سے واہ کیا کیجے

اسی طرح ان کی جگہ انہوں کا، اُن کی کی جگہ انہوں کی، اور ان کو کی جگہ انہوں کو استعمال کر لیتے تھے۔

(فغاں) جو میری تحقیق میں آیا سو اب کرتا ہوں عرض — رائے تو ان کی غلط ہے یہ انہوں کا شعار

(مظہر) حنا تیرے کفِ پا گر نہ اس شوخی سے سہلاتی — یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انہوں کی نیند کیوں جاتی

(قائم) ہمارے دردِ دل کے تئیں یہ کب بے درد بوجھے ہیں — ہم اپنے جی سے عاجز ہیں انہوں کو عیش سوجھے ہے

"بیچ" کے استعمال کے متعلق انشا لکھتے ہیں:۔

"بیچ ظرفیت کے لیے آتا ہے لیکن فصحا اس سے پہلے کے (یا، مجہول) ضرور لاتے ہیں جیسے چمن کے بیچ اگرچہ چمن بیچ بھی شہر کی زبان ہے لیکن زیادہ فصیح وہی ہے اور چمن میں دونوں سے بہتر ہے۔ شہر کے بعض رہنے والے چمن کے بیچ میں بھی بول جاتے ہیں یہ بہت ہی قبیح ہے۔ مگر بیچ میں بھی دہلی کے ہندوؤں کی زبان ہے۔"[1]

بیچ کا استعمال فصیح طریقہ پر عہد محمد شاہی میں ہوتا تھا۔ فضلی نے بیچ کو "کے" کے ساتھ ہی استعمال کیا ہے مثلاً "بیچ صحن عالم قدس کے" (ص ۱۸) یا "بیچ ملک ہندوستان کے" (ص ۲۵) خواجہ میر درد کا شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

جائیے کس واسطے اے درد مے خانے کے بیچ — اور ہی ہستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

بیچ کا استعمال دورِ جدید تک ملتا ہے مثلاً حسرت موہانی کا شعر ملاحظہ ہو: ؎

حسن بیتاب ہے محدود اداؤں کے بیچ — تری رفتار کے اندر مری گفتار کے بیچ

۱۔ دریائے لطافت ترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی ص ۲۳۱

اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ پنجابی اور فارسی کے اثر سے جمع اں لگا کر بنائی جاتی تھی۔ یوں اُردو میں جب حرفِ ربط ساتھ آئے تو ون سے جمع بناتے ہیں اور جب اضافت استعمال ہو رہی ہو اور اسم مونث ہو تو ین سے جمع بناتے ہیں مگر اس عہد میں ان ہی لگا دیتے تھے مثلاً تاباں کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

مجھے کہتے ہیں تجھ سے یار کو ہم چھین لیویں گے — رقیبوں کی یہ باتاں سخت ہیں کیونکر سہوں ظالم

قفس میں عندلیباں یاد کر کر گلشن کو کہتی ہیں — چھڑایا ہائے اے صیاد تو نے کیوں چمن ہم سے

دوسرے شعر میں عندلیباں جمع بنائی ہے تو پہلے میں رقیباں کی بجائے رقیبوں استعمال کیا ہے۔ تاباں ہی کے دو اور شعر ملاحظہ ہوں جن میں آج کل کے قاعدہ کے مطابق جمع بنائی گئی ہے۔

غزالوں کو تری آنکھوں سے کچھ نسبت نہیں ہرگز — کہ یہ آہو ہیں شہری اور وے وحشی ہیں جنگل کے

قفس میں بند ہیں یہ عندلیبیں سخت بے بس ہیں — نہ گلشن دیکھ سکتی ہیں نہ اب وے آشیاں اپنا

قائم نے مونث اسم کی جمع ین سے نہیں بلکہ ئیں سے بنائی ہے ؎

قائم خدا کے واسطے بدمستیئں یہ چھوڑ — تک گریباں آج پھٹ کر دھجیئں ہوئے تو پھیر

آج کل امدادی فعل کے ساتھ اصل فعل کو فاعل جمع ہو تو جمع استعمال نہیں کرتے مگر اس زمانے میں جمع استعمال ہوتا تھا اسی طرح ضمیر کو جمع استعمال نہیں کیا جاتا مگر اس زمانے میں ضمیر بھی جمع استعمال کر لیتے تھے یا فعل ناقص اور اصل فعل دونوں جمع استعمال کر لیتے تھے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

اے بابا کیا کریں گیاں ہم دو کھیلاں یاں تیرے بعد — کس کوں کہہ بابا ہو کاریں ہم بچاریاں تیرے بعد (فضلی)

دونو طرف ہیں منہ پہ جو موجیں سی جاریاں — لہریں ہیں میرے شوق کی زلفیں تمہاریاں (سجاد)

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ — مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (میر)

بعض الفاظ جنھیں ہم اب واحد ہی استعمال کرتے ہیں وہ اس زمانے میں جمع استعمال ہوتے تھے۔ طرح واحد استعمال ہوتا ہے۔ مگر فغاں نے اسے جمع استعمال کیا ہے ؎

کن کن طرحوں سے آزمایا ہم کو — کن کن طرحوں میں خوب پایا ہم کو (فغاں)

اردو قاعدے سے جمع الجمع بھی بنائی جاتی تھی چنانچہ کربل کتھا میں اصحاب سے اصحابوں احادیث سے احادیثوں جمع ملتی ہے۔ بعض الفاظ کو جمع استعمال کیا ہے مگر ان کے لیے فعل ناقص واحد استعمال کیا ہے جبکہ اب وہ جمع استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

یار وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا — نظروں میں سو طرح کی حکایات ہو گئی

میر حسن کے زمانے تک یہ استعمال جاری رہا ؎

وہ چشم لطف اور وہ عنایات کیا ہوئی — وہ غمزہ وہ ارادہ وہ اشارات کیا ہوئی

یہ گفتگو کبھی نہ آئی تھی درمیاں — جو کچھ کہ تو نے حرف و حکایات آج کی

جن الفاظ کے آخر میں حروفِ علت میں سے کوئی حرف ہوتا ہے ان کی جمع کا قاعدہ یہ ہے کہ بحالتِ تذکیر الف یائے مجہول سے بدل جاتا ہے لیکن واوری میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی مثلاً لڑکا آیا، لڑکے آئے۔ تانیث کی صورت میں البتہ ان لگاتے ہیں لڑکی آئی، لڑکیاں آئیں مگر اس زمانے میں مذکر کی صورت میں بھی ان زیادہ کر دیتے تھے۔ انشا کے عہد تک یہ بے قاعدگی ملتی ہے۔

انشا کا شعر ہے ؎

یہ کس سے چاندنی میں ہم بزیرِ آسماں لیٹے　　کہ باہم عرش پر مارے خوشی کے قدسیاں لیٹے

بعض مذکر الفاظ کو مؤنث اور مونث کو مذکر باندھا جاتا تھا۔ دراصل تذکیر و تانیث کا یہ جھگڑا بعد میں بھی موجود رہا بلکہ زیادہ شدت اختیار کر گیا۔ دہلی والوں نے ایک لفظ کو مؤنث قرار دیا تو لکھنؤ والوں نے اس کے مذکر ہونے پر ضد کی۔ تذکیر و تانیث میں احسان دانش نے ص ۲۳۳ سے ۲۴۲ تک ایسے الفاظ کی فہرست دی ہے۔ مؤنث اور مذکر کے اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں فاعل کے ساتھ فعل بھی مذکر یا مونث ہوتا ہے۔ چنانچہ جان اشیا کی تذکیر و تانیث میں بڑی دقت ہوتی ہے اور غالباً اس لیے اگر ایک زمانے میں ایک لفظ مونث تھا تو بعد میں مذکر اور مذکر تھا تو بعد میں مؤنث قرار دیا گیا یا ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی زمانہ میں ایک لفظ ایک علاقے میں مذکر تو دوسرے میں مونث اور اس کے بالعکس استعمال ہوتا رہا۔ لہٰذا اگر عہدِ محمد شاہی میں تذکیر و تانیث کے مختلف معیار ہیں تو انھیں غلط قرار نہیں دے سکتے۔ صرف دلچسپی کی خاطر چند مثالیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔ جان آج کل مونث ہے مگر اس زمانے میں مذکر تھا چنانچہ میر و سودا دونوں نے اسے مذکر باندھا ہے ؎

(میر)　وعدہ تو کیا اس سے دمِ صبح کا لیکن　　اس دم تئیں مجھ میں بھی اگر جان رہے گا

(سودا)　تیشے سے جو کوہکن نے سر کو پٹکا　　شیریں کا یہ سن کے جان تن سے بھٹکا

اسی طرح سیر، نور، نظم، شام، دید، تلاش، مروت، وفا، تعمیر مؤنث ہیں مگر ان کو مذکر باندھا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں الفاظ کی تذکیر کی طرف رجحان تھا۔ اب مثالیں ملاحظہ ہوں:

(میر)　وہ سیر کا دادی کے مائل نہ ہوا ورنہ　　آنکھوں کو غزالوں کی پاؤں تلے مل جاتا

(سودا)　بسکہ پونچھوں ہوں میں اپنی چشمِ خوں آلود کو　　جامہ کا ہر ایک تختہ سیر ہے گلزار کا[1]

(سودا)　توڑ کر بت خانے کو مسجد بنا کی تو نے شیخ　　برہمن کے دل کا بھی کچھ نکر ہے تعمیر کا

(حزیں)　وفا میرا اگر جور و جفا تجھ کو نہ سکھلاتا　　تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

(یقین)　جی سے میرے سانورے کی مگر رہی ہے جستجو　　جس طرح ہوتا ہے افیونی کو افیوں کا تلاش

(آبرو)　آبرو کوں شام ہو جاتا ہے صبح　　جب کبھی پاتا ہے تیرا رو میاں

---

[1] سودا ہی نے سیر کو مونث بھی باندھا ہے ؎

نہ سمجھو قتل کرنے میں کسو سے سیر ہے اس کو　　چلے تلوار تو آبِ رواں کی سیر ہے اس کو

(درد) اِک لحظہ اور بھی اگر آتا چمن کا دید فرصت نہ دی زمانے نے اتنی شرار کو

(حاتم) ایسا جہاں سے رسم مروت ہٹا ہے فوت مرتا ہوں چاہتا نہیں کوئی آشنا علاج

عہدِ محمد شاہی میں بعض افعال و حروف کو حذف کر دیا جاتا تھا۔ امدادی افعال کے حذف کا بیان ہم پہلے کر چکے ہیں مفاعل کو استعمال بھی کیا جاتا تھا اور محذوف بھی کر دیا جاتا تھا۔ کربل کتھا میں اسے اکثر و بیشتر حذف کر دیا گیا ہے مگر بعض مقامات پر استعمال بھی کیا گیا ہے جیسے "شمر کہا۔ ایک نے لشکر جمع کیا ہم پر شبخوں مارے"[1] اب اشعار میں 'نے' کے حذف کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(میر) آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

(فغاں) اے شیخ میں کل سے نہیں دیکھا ہے صنم کو اس وقت خدائی سے بھی بے زار بیٹھا ہوں

(سودا) سودا سے یہ کہا میں دل اس طرح سے کھونا کہنے لگا کہ ناداں کیا پوچھتا ہے ہونا

علامتِ فاعل کا حذف صحفی کے ہاں بھی ملتا ہے۔

میں جفائیں جھیلی ہیں سینکڑوں ترے عشق میں بدونیک کی
یہ ہزار شکر کہ آج تک گلہ گر دلب کے پھر انھیں

مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ:

"نے' علامتِ فاعل کا حذف قدیم شاگردانِ مصحفی کے وقت تک عموماً جائز سمجھا جاتا تھا بعد میں متروک قرار پایا حتیٰ کہ مصحفی کے آخری شاگردوں مثل آتش و اسیر کے کلام میں بھی اس کی مثال کہیں نہیں ملتی[2] اور یکتا کے خیال میں مرزا مظہر جانِ جاں نے اپنے آخری زمانے میں ہم بجائے ہم نے اور تو بجائے تو نے یا تیں بجائے تم نے کا استعمال ترک کر دیا تھا اور اسی وجہ سے شعرائے حال ان کو استعمال نہیں کرتے"[3]

کبھی کبھی علامتِ مفعول بھی حذف کر دی جاتی تھی مثلاً

(فائز) بن تیرے دیکھ مجھ نہیں آرام پیار سے اس عشق کا ہے کیا انجام

(〃) یہ نصیحت تمن ہماری ہے مرتے تھے عشاق دیکھ اس خوب رو

موجودہ زمانے کے مطابق فائز کے شعر میں مجھے یا مجھ کو ہونا چاہیے تھا۔

اسمائے انسانی کے ماسوا دوسروں کے ساتھ علامتِ مفعول کا حذف آج بھی جائز سمجھا جاتا ہے مثلاً: "تم نے کبوتر دیکھا ہے یا تم نے لاہور جانا ہے مگر آج تم نے اسلم دیکھا ہے غلط ہے"۔

---

[1] کربل کتھا مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد ص ۲۴۷۔

[2] نکاتِ سخن ص ۲۵۔

[3] دستور الفصاحت ص ۸-۷۔

حرفِ ربط کو بھی محذوف کر دیا جاتا تھا۔

(ناجی) صبح دم جب جا چمن میں تم نے زلفیں کھولیاں — لے چلی بادِ صبا خوشبو کی بھر بھر جھولیاں
(مضمون) کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں — ایک تو گل بے وفا تس پہ جوارِ باغباں

"کی" اور "کے" کے حذف کی مثال :

(ٹیک چند بہار) کوئی کس ساتھ ایسی فصلِ گل میں دل کو پرچا دے
نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ مطرب ہے نہ ہمدم ہے

(میر) حیف سمجھا ہی نہ وہ قاتل ناداں ورنہ — بے گنہ مارنے قابل یہ گنہگار نہ تھا
(〃) الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش — ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

حرفِ عطف کے حذف کی مثال :

(میر) اک رہا مژگاں کی صف میں ایک کے ٹکڑے ہوئے — دل جگر جو میر دونوں اپنے غمخواروں میں ہیں

مضارع کی "ے" کے حذف کی مثال :

(سجاد) کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی — مرجا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا
(سجاد) وہی خانہ خراب اس دکھ کوں جلے — کہ جس کا عاشقی ہیچ گہر جا

"پر" کے حذف کی مثال :

(فائز) وہ تماشا وہ کھیل ہولی کا — سب کے تن رخت کسری کا ہے یاد

عہدِ محمد شاہی میں بعض الفاظ کے وہ معنی نہ تھے جو آج کل مستعمل ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ رنڈی کا مطلب اب طوائف ہے پہلے صرف عورت کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا فضلی کا شعر ملاحظہ ہو۔

رنڈیوں کے کمر سے حق دے لاں — الاماں از مرا اینہا الاماں

مغل اب ایک ذات ہے مگر اس زمانے میں مسلمان کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اسی طرح تُرک کا مطلب بھی مسلمان لیتے تھے۔

(فائز) چرا لیا ادھر پرلے جب لگا کے گل — کہنے لگی مغل یہی ریت ہے بُری
(فائز) کہ اب چھوئی ترک نے اب مگر یا — لے جاؤں گھر میں کیونکر آج دیا (اے خدا)

میرزا اب ذات کے معنی دیتا ہے مگر اس زمانے میں امیرزادہ کو کہتے تھے۔

(تاباں) نبھے گی مری اس کی کس طرح تاباں — میں نازک طبیعت ہوں وہ میرزا ہے
(حاتم) جمع اے حاتم مے و معشوق و مطرب ہو جہاں — اس طرح کے عیش کو کہتے ہیں مرزا یا نہ عیش

فن بمعنی مہارت اور بوجھتے بمعنی جانتے استعمال ہوتا تھا ؎

(یقین) کم نہیں ہم بوجھتے کعبہ سے مے خانہ کے تئیں سجدہ ہم کرتے ہیں جو محراب پیمانے کے تئیں

(فائز) دل لبھاتا ہے سب کا وہ ساجن دل فریبی میں اس کو کیا فن ہے

اس عہد میں کئی لفظ ایسے استعمال ہوتے تھے جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ ان سب کو یہاں درج کرنا ممکن نہیں مگر ان میں سے کچھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

نمن (مثل)، نراس (ناامید)، من ہرن (محبوب)، لال (گونگا)، گھالنا (برباد کرنا)، رسسا (جوانی کے رس میں ڈوبا ہوا)، ست (سچائی)، پڑھویہ (پڑھنے والا)، بسرام کرنا (آرام کرنا)، بھ کسی (قید خانہ)، آدر (عزت)، کھوکرا (کھوکھلا)، پلیٹنا (لپیٹنا)، ہتھواسنا (تلوار سے تننا)، ڈاک لگنا (بار بار قے آنا)، اونٹنا (غصہ میں جلنا)، کلول ٹلنا (مصیبت دور ہونا)، اینچ (کھینچ)، دوہاگن (وہ عورت جو دوسرا نکاح کرلے)، خرفت (پیرانہ سالی کی وجہ سے بدحواس ہونا)،

پریم قصہ عرف تیرہ ماسہ (تصنیف ۱۱۴۲ھ) میں کڑکر کی بجائے پکڑوں استعمال کیا ہے۔

پانی بمعنی حد، اچھیرا (اپسرا)، ابرن (زیور) بتیاں (باتیں) رتیاں (راتیں) تروار (تلوار) زور (بہت) ندان (آخرکار) نانوں (نام) جیوڑا (جی)

عہدِ محمد شاہ کا املا

اردو زبان کے املا میں بھی عہد بہ عہد کچھ تبدیلیاں ہوتی رہیں ان کو پیشِ نظر رکھیں تو ہم بعض قدیم مخطوطات جن پر کتابت کی تاریخ نہیں دی گئی ہے کا زمانہ متعین کرسکتے ہیں۔ اندازِ کتابت میں تبدیلیوں کی داستان ویسے بھی اپنے اندر دلچسپی کے سامان رکھتی ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں عہد محمد شاہ میں مروج املا کی بعض خصوصیات کا ذکر کریں گے اور جہاں کہیں ممکن ہوا اُن خصوصیات کا زمانہ بھی متعین کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس عہد میں عموماً ڑ کی بجائے ر لکھتے تھے جیسے سودا کا شعر ہے۔

ساقِ سیمیں کی تری دیکھ کے گوری گوری شرم سے شمع ہو جاتی ہے تھوری تھوری

کربل کتھا میں توڑے کو تورے لکھا ہے۔ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں 'ڑ' کی جگہ 'ر' ہی لکھی گئی ہے چنانچہ 'اوڑسنا' کو اورسنا اور 'پڑا' کو 'پرا' لکھا ہے۔ فائز نے کلیات میں 'ٹ'، 'ڈ'، 'ڑ' کو ہمیشہ 'ت'، 'د' اور 'ر' ہی لکھا ہے۔ انشا لکھتے ہیں کہ "لفظ تھوڑا اور تھوڑی کو رائے مہندی سے لکھنا ہی درست ہے[1]" یہ عجیب بات تھی کہ انشا کے زمانہ میں لوگوں کا رجحان 'ر' کی بجائے 'ڑ' کی طرف تھا چنانچہ بعض لوگ اردو کو اڑدو بولتے تھے[2] عہد محمد شاہی سے پہلے بھی 'ڑ' کو 'ر' میں بدل دیتے تھے۔

---

[1] دریائے لطافت ص ۵۷۔ [2] دریائے لطافت ص ۵۸۔

جواہر الاسرار مکتوبہ ۱۱۱۰ھ میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے[1]

اس زمانے میں لوگ ڑ کو ڈ میں بھی بدل دیتے تھے۔ مثلاً کربل کتھا میں بوڑھیا کو بوڈھیا، بڑھاؤں کو بڈھاؤں، دیوان آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں بھی ڑ کو ڈ سے بدل دیا ہے مثلاً بڑی کو بڈی وغیرہ۔ کربل کتھا میں ڈ کی طرف رجحان زیادہ ہے چنانچہ د کو بھی ڈ سے بدل دیا گیا ہے مثلاً داڑھی کو ڈاڑھی، داڑھ کو ڈاڑھ، لیکن دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں ڈ کو د میں بدل دیا ہے مثلاً کاڑھا کو کادھا لکھا ہے۔

کادھا انکھیوں میں کاجل کا یہ دنبالا　　بانبی بستی نکل کر بیٹھا ہے آج کالا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کربل کتھا کی کتابت بعد کی ہے۔ کیونکہ جواہر الاسرار مکتوبہ ۱۱۱۰ھ میں بھی ڈ کو د سے بدل دیا ہے۔

نکات الشعرا (۱۱۶۵ھ) میں میر نے اپنے کلام کا جو انتخاب دیا ہے اس میں لفظ نپٹ میں ٹ کو ٹھ سے بدل دیا ہے چنانچہ ۱۱۶۵ھ تک نپٹ کو نپٹھ ہی لکھا جاتا تھا۔

دل پہنچا ہلاکت کو نپٹھ کھینچ کسالا　　اے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ

تمام اس کے قد میں سناں کی طرح ہے　　نکیلی نپٹھ اس جواں کی طرح ہے

میر نے نکات میں ہی ہونٹ کو ہونٹھ لکھا ہے۔

اپنے تو ہونٹھ بھی نہ ہلے اس کے روبرو　　رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہوگئی

مگر بعض دوسرے الفاظ میں ٹ ہی لکھا ہے مثلاً چوٹ، ٹک وغیرہ

ادھر ٹک ہے عرش سے مشکل سے ٹک گزر　　اے آہ پھر اثر تو ہے برچھی کی چوٹ پر

اسی طرح بعض الفاظ میں پ پھ سے بدل جاتی تھی مثلاً تڑپنا کی جگہ تڑپھنا۔

(میر)　اب وہ جگر تپش سے تڑپھتا ہے روز و شب　　مدت تلک جو میر کا لوہو پیا کیا

(فغاں)　ڈرتا ہوں یہ کہیں دلِ بسمل تڑپھ تڑپھ　　رنگیں کرے نہ دامنِ قاتل تڑپھ تڑپھ

دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں بھی تڑپھ ہی لکھا ہے مگر بعض مقامات پر تڑپ کو تپھ بھی لکھ دیا ہے۔ اسی طرح سودا کے دیوان مکتوبہ ۱۱۷۴ھ میں بھی تڑپھ ہی ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپھے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

اس زمانے میں ٹھ کو ت سے لکھتے تھے۔ غالباً فارسی داں طبقہ پھ سے ناآشنا تھا اور وہ ٹھ، تھ کی بجائے ٹ، ت لکھتا تھا۔ چنانچہ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں جہاں ٹھ ہے اس کو ٹ ہی لکھا ہے مثلاً تھا کو تہا، کھٹب کو کہب ٹ سے یہ

---

[1] جواہر الاسرار از علی محمد جیو کا نو ذہنی مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

آوازیں پیدا ہوتی ہیں جو فارسی میں نہیں ہیں۔

پھ، بھ، تھ، ڈھ، کھ، گھ، چھ، جھ، پھ

ان کو ہ سے ہی لکھا جاتا تھا، کربل کتھا میں بھی ھ کو ہ ہی لکھا ہے مثلاً اندھیر کو اندہیر، آنکھوں کو آنکہوں، ابھی کو ابہی، دیکھ کو دیکہہ مجھ کو مجہہ، ہاتھ کو ہاتہہ۔

دیوانِ میر مکتوبہ ۱۱۹۶ھ میں بھی ھ کو ہ سے لکھا ہے چنانچہ تھا۔ وہاں بھی تہا ہی نظر آتا ہے۔

ہاتھ کو ہات اور ساتھ کو سات بھی لکھا جاتا تھا یعنی تھ ت میں بدل جاتی تھی اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں

(سودا) آگیا رات میں جوں دزدِ حنا تیرے ہات ورنہ جاپانوں کو لاگا تھا چوری چوری

(قائم) میں دوانا ہوں اتا مجھے مت قید کرو جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے سات

کلیاتِ فائز مرتبہ مسعود حسن رضوی میں ھ کو بعض الفاظ میں بالکل ختم کر دیا ہے مثلاً:

بھی، سبھی، سبھوں، تھی اور تھا بی، سبی، سبوں، تی اور تا لکھا ہے

دیوانِ ولی مکتوبہ ۱۱۴۹ھ (پنجاب یونیورسٹی) میں ھ کی جگہ ہ لکھی گئی ہے اسی طرح دیوانِ دلی مکتوبہ ۱۱۳۸ھ (۰۰۰۰۰۰) میں بھی ھ کو ہ ہی لکھا ہے۔ یعنی لکھ کو لکہہ اور تجھ کو تجہ لکھا ہے۔

اسی طرح ٹ اور ڈ کی ط کی جگہ کبھی چار نقطے :: اور کبھی تین نقطے لگائے جاتے تھے۔ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں ہر جگہ ٹ، ٹھ اور ڈ کی ط کی جگہ چار نقطے لگائے گئے ہیں۔ اسی طرح کربل کتھا کے قلمی نسخے میں بھی تین نقطے لگا کر ط کو ظاہر کیا ہے[1] مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتابت بہت پرانی ہے کیونکہ عہدِ محمد شاہی کے بعد بھی ط کو چار نقطوں سے ظاہر کرنے کا رواج رہا ہے چنانچہ دیوان زادہ مکتوبہ ۱۱۹۵ھ میں ط بھی لکھی گئی ہے اور اس کی جگہ چار نقطوں سے بھی اسے ظاہر کیا گیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی دیوان زادہ کے ورق ۱۵ پر چھاتہ لکھا ہے جبکہ ورق ۲۴ پر توڑ (ط سے) لکھا ہے۔ دیوانِ ولی (قلمی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور) مکتوبہ شعبان ۱۱۴۱ھ بمقام بھوانی پور میں بھی ط کو چار نقطوں (::) یا دو نقطوں (:) سے ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن ڑ کو ہر جگہ ر ہی لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڑ اور ط لکھنے کا رواج اس کے بعد ہوا ہے۔

جہاں فارسی کے اثر سے ھ کو ہ میں بدل دیتے تھے وہاں ہندی یا اردو کا اثر بھی نظر آتا ہے اور عربی فارسی الفاظ کو اردو طرز پر لکھا جاتا تھا۔ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں مصرع کو مصرا، قبلہ کو قبلا، غصہ کو غصا، زمانہ کو زمانا، تماشہ کو تماشا اور تسبیح کو تسبی لکھا ہے۔ کربل کتھا میں عماری کو انباری، آبِ فرات کو آب فراط، بصد کو بجد، لکھا گیا ہے۔ ہ کو الف میں بدل دینے کا رواج بہت عام تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ایسے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

(ناجی) نہ ہمت ہار گلرو دے دے برسا بڑا کہتے ہیں رتبا ہے سخی کا

---

[1] کربل کتھا کی زبان از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رسالہ اردوئے معلیٰ قدیم اردو نمبر ص ۷۵

(قائم) کس بھروسے پہ دلا اس کو تجا تھا تو نے — اسی منہ سے تجھے دعوا تھا شکیبائی کا
(ناجی) بلندی سن کے ناجی ریختے کی — ہوا ہے پست شہرا فارسی کا
(قائم) قائم خدا بھی ہونے کو جو جانتے ہیں ننگ — بندا تو ان کے پاس کہایا نہ جائے گا
(") ہے جو کوئی سو آشنا دل کا — وو ہی سمجھے ہے مرتبا دل کا
(") اور تو شعر ہیں ہی پہ قائم — خوب کہتا ہے مرتبا دل کا

ہمارے خیال میں عہد محمد شاہی کی اس روایت کو قائم رہنا چاہیئے تھا اور عربی فارسی الفاظ کی اردو شکل کو ہی مستند سمجھنا چاہیئے تھا مگر افسوس کہ اصلاحِ زبان کے زور میں بعض مفید چیزوں کو بھی ترک کر دیا گیا۔ جن لفظوں کے آخر میں ہ آتی ہے۔ ان کے املا کے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں۔

" اردو لفظوں میں ہ مختفی کا وجود نہیں ہے بلکہ مختفی ہ فارسی کی چیز ہے اور ہندی لفظوں میں نہیں آسکتی ..... ہندی لفظوں کو آخر میں ہ سے لکھنا درست نہیں سوائے مقاموں کے ناموں کے جیسے آگرہ، پٹنہ "[1]، وہ آگے چل کر لکھتے ہیں " ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اردو کا خاص حرف الف ہے اور ہر موقع پر ہمیں اس کو کام میں لانا چاہیئے سوا چند فارسی اور عربی لفظوں کے جن کا املا ہ سے ہے اور اس ہ کی آواز الف کی سی ہے ..... بعض عربی اور فارسی لفظوں کے آخر میں ہ ہے۔ ان کو بھی ہم بعض حالتوں میں ہ کی جگہ الف سے لکھتے ہیں۔ مثلاً گلا، مزا، دوا ہا، دعما وغیرہ "[2] لیکن اس سلسلے میں ہم انشا کے ہمنوا ہیں کہ جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہو گیا۔ لہذا ہر لفظ کو جس کے آخر میں ہ ہو یا ی ہو مگر آواز الف کی دیتا ہو اسے الف سے لکھنے کی روایت قائم کرنی چاہیئے جیسے دعوا اور بندا جب کہ عہدِ محمد شاہی کے بعد تک بھی اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ مثلاً مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا اور اس میں بندا اور قہقہا ہی لکھا ہے۔

عہد محمد شاہی میں گ کی جگہ ک ہی لکھتے تھے۔ چنانچہ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں ہر جگہ گ کو ک سے ظاہر کیا ہے۔ ۱۱۹۵ھ تک گ کو ک سے ہی لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ دیوان زادہ (قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں گ کو ک سے ہی لکھا گیا ہے۔ عہد محمد شاہی سے پہلے بھی گ کو ک سے ظاہر کیا جاتا تھا چنانچہ جواہر الاسرار مکتوبہ ۱۱۴۴ھ میں گ کو ک سے ہی ظاہر کیا گیا ہے چنانچہ گھونگھٹ کو کہونکھٹ لکھا ہے۔ اس زمانے میں یائے مجہول اور یائے معروف کا فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ یائے معروف اور مجہول کا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ جہاں یائے مجہول لکھنا ہے اس کی جگہ معروف اور معروف کی جگہ مجہول کر دی ہے۔ چنانچہ کی کو کے، مجھے کو مجھی اور ساقی کو ساقے لکھا ہے۔ دیوان زادہ مکتوبہ ۱۱۹۵ھ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے تک یائے مجہول اور معروف کے فرق کو مدِ نظر نہیں رکھتے تھے۔ کہیں ی کے نیچے دو نقطے لگا دیتے اور کہیں بغیر نقطوں کے بھی لکھ دیتے تھے۔ عہدِ محمد شاہی میں نون غنہ میں بھی نقطہ

---

[1] ۔ اردو املا از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (رسالہ ہندوستانی جنوری ۱۹۳۱ء ص ۵ و ۲)
[2] ۔ " " " " " (" " " ص ۱۱)

لگاتے تھے مگر اسے نون غنہ ہی پڑھتے تھے حتیٰ کہ کوں کو بھی کون ہی لکھا ہے اور کیوں کو کیون۔

ع کیا ہے آبرو کے شعر نہیں نایاب گوہر کون

یا ع آگ میں رشک کی اب کیون نہ جلے پروانہ

اسی طرح دیوانِ ولی مکتوبہ ۱۱۴۹ھ میں بھی ہر جگہ نون کا اعلان ہے مثلاً سوں کو سون لکھا ہے اور سیں کو سین۔ دیوان زادہ مکتوبہ ۱۱۹۵ھ (پنجاب یونیورسٹی لاہور) سے ظاہر ہوتا ہے کہ نون کے اعلان کا رواج اس زمانے تک تھا۔ چنانچہ عیاں کو عیان۔

اول خدا نے تمہارا عیان کیا اس نور سے بنا یہ زمین و زمان کیا۔

لیکن دیوانِ قدیم میر تقی میر مکتوبہ ۱۱۹۶ھ (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نون غنہ میں نقطہ ڈالنے کا رواج ختم ہو رہا ہے چنانچہ ورق ۶۲ پر نہیں اور یہاں میں نون کا اعلان نہیں ہے۔

عہدِ محمد شاہی میں زائد نون کے استعمال کا رواج بہت زیادہ تھا چنانچہ نے کو نیں، کو کو کوں، تو کو تون لکھنے کا رواج تھا۔ دیوانِ آبرو مکتوبہ ۱۱۴۴ھ (انجمن ترقی اردو کراچی) میں نے کی جگہ نیں ہی استعمال ہوا ہے نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں مندرجہ ذیل شعر میں نے کی جگہ نیں ہے

(میر) الم سے یاں ہیں میں مشقِ ناتوانی کی کہ میری جان نہیں تن پر میرے گرانی کی

مگر اس کے ساتھ ہی نے بھی استعمال کیا ہے جو بعد کا تصرف معلوم ہوتا ہے۔

سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے لیکن جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

میر اثر کے دیوان مخطوطہ پنجاب پبلک لائبریری میں بھی نہیں ہے ؎

تو نیں بندی سے جو سلوک کیا بُت کافر خدا سے پاوے گا

خواب و خیال شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان (۱۹۵۰ء) میں مولوی عبدالحق نے پرانا املا اختیار کیا ہے۔ خواب و خیال ۱۱۹۹ھ میں لکھی جاتی ہے۔ اس میں ہر جگہ نے کو نیں لکھا ہے مگر کوں اور سیں کا استعمال نہیں ملتا۔ اس طرح توں ملتا ہے مگر تو کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ اس کے برعکس کربل کتھا میں تو کے مقابلے میں توں کا استعمال زیادہ ہے۔

کربل کتھا کے مطبوعہ نسخہ میں نیں کی جگہ نے ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں نیں کا رواج زیادہ تھا لہٰذا قیاس کہتا ہے کہ نیں کی کتابت کو جدید بنا دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں بعض اسما میں بھی زائد نون کا استعمال ہوتا تھا بعض شاعر سانپ کو سانپن لکھتے تھے۔ میر محمود صابر (سندھی) کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

بس چڑھایا ہے دل کوں ڈس ڈس کے گھاؤ کاری ہے دل کے سانپن کا

پھولن کے ہار ڈال کے موتن کے مال پر زیور کا کر سنگھار سنوار آرسی کے تئیں

زائد نون کا استعمال ستیں میں بھی ملتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ستی میں نون کا اضافہ کر کے ستیں بنایا گیا تھا ؎

ناجی لعلِ لب کوں بند کیا مجھ طرف ستیں گویا تو ہم سیں بولنا پیار سے سدا نہ تھا

اسی طرح سہیں میں بھی زائد نون تھا جسے بعد میں گرا دیا گیا تو سے کی جدید شکل بن گئی۔ ناجی نے کنے کو کنیں بھی لکھا ہے۔ اس میں بھی زائد نون استعمال ہوا ہے۔

غافل کو باد کش ہے ہزور کنیں جرس ہر صبح اس فریب کوں کرتی ہے سر نسیم

دیوانِ متلا میں 'کو' کوکوں' اور 'تو' کو 'توں' لکھا گیا ہے۔ کریل کتھا میں یونہی کو 'یوں' نہیں 'توں' ہی کو تو نہیں، دوں ہی کو دو نہیں، بیچا کو بینچا، کوچ کو کونچ، پائنتی کو پائنتیں لکھا گیا ہے مگر بعض جگہ جہاں نون کا استعمال ہونا چاہئے تھا وہاں اسے حذف کر دیا ہے مثلاً دھواں کو دھوا، تینوں کو تیو، دونوں کو دونو، ملتا ہے۔ گلزارِ فقیر (۱۱۴۰ھ) میں خانوند، ہوناں، ڈرناں، زائد نون کے ساتھ ملتے ہیں۔ مگر گاؤں اور ناؤں کی جگہ گانو اور نانو ملتے ہیں، اس زمانے میں جہاں دونوں اب الگ الگ لکھے جاتے ہیں وہاں بھی تشدید سے کام لیتے تھے مثلاً ادن نے، جن نے، کو ادتے، جتے جاتا تھا مثلاً

(فغاں) اس کفِ پا پہ ترے رنگِ حنا ۔ جتنے دیکھا وہ ہاتھ ملتا ہے

دیوان زردہ مکتوبہ ۱۱۹۵ھ میں بھی جن نے کو جتنے لکھا ہے مثلاً ۱۱۶۱ھ کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

جتنی آدم کے تئیں جاں بخشا خضر کو چشمۂ حیواں بخشا

۱۱۹۶ھ کے کتابت شدہ دیوانِ میر میں ادن نے کو ادنے لکھا گیا ہے۔

نون غنہ جب ب کے ساتھ آئے تو م کی آواز دیتا ہے مثلاً انبساط، گنبد وغیرہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض الفاظ کو بعد میں ن کی جگہ میم سے لکھا جانے لگا مثلاً لمبا۔ کریل کتھا میں لمیا کو لنبا لکھا ہے۔

اسی طرح تھامنا کو تھانبنا لکھا ہے۔ مثلاً حضرت اوسے تھانبے نہ تھنبا۔ وغیرہ۔ کلیاتِ فائز میں چنپا بجائے چمپا اور برنبھا بجائے برہما لکھا ہے۔

ماضی مطلق (سہ حرفی) کے درمیانی حرف کو مشدد کر دیتے تھے مثلاً کیا، دیا، پیا وغیرہ۔ مرثیۂ مسکین سے مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ع چکلا سا ایک دوشافہ مدِ نظر جو گیا

ع دو دن سے دلنا پانی پیا نہ تھا نہ کھایا

مسکین نے دیا کو بھی دیا لکھ دیا ہے مثلاً:

ع دیا جلا کے ڈھونڈھا کوئی اپنے گھر کہا ہے

شاہ آیت اللہ کی مثنوی گوہر جوہری میں بھی کیا، لیا، مشدد ہی سے استعمال ہوتے ہیں۔

عہدِ محمد شاہ میں وہ کی کتابت دو (دو واؤ) سے کی جاتی تھی۔ کریل کتھا میں ہر جگہ دو ہی لکھا ہے مگر مطبوعہ نسخہ میں کہیں کہیں وہ بھی ملتا ہے مثلاً اس شعر میں ؎ پھر کہ عبداللہ قاسم ابن حسن وہی قاسم گیا جو چھوڑ دلہن

غالباً یہاں بھی غلطی سے وہ لکھا گیا ہے وہی ہوگا۔ شیفتہ نے چمنستانِ شعرا میں اپنے تمام اشعار میں وہ لکھا ہے لہٰذا یہ لفظ ۱۱۷۵ھ تک بغیر ہ کے استعمال ہوتا تھا۔ 'وہ' کی بجائے وے بھی استعمال ہوتا تھا ؎

وے مے گسار ظرف جنہیں مے کشی کے تھے　　بھر کر نگاہ تو نے جو کی دو ہیں جھک گئے۔

اسی طرح 'وہی' 'وہیں' کی بجائے 'دوہی' اور 'دوہیں' استعمال ہوتے تھے:

عہدِ محمد شاہ میں ش کی جگہ س، ذ کی جگہ ز، اور ز کی جگہ ذ لکھ دیتے تھے۔ کریل کتھا میں اسی، سات، ڈھارس کو اثی، ثات اور ڈھارث لکھا گیا ہے۔ املا میں یہ بے احتیاطی ۱۲۲۱ھ تک جاری رہتی ہے کیونکہ مجموعہ نغز میں محاورہ کو مہاورہ، ذخیرہ کو زخیرہ گلزار کو گلذار، زیبا کو ذیبا لکھا گیا ہے۔

یہ کو یو لکھا جاتا تھا۔ کریل کتھا سے مثال ملاحظہ ہو۔

بیٹے دو نو بو بی زینب کے　　ماموں پر ہو فدا عدن میں بسے

عہدِ محمد شاہ میں زیر، زبر اور پیش کی آوازوں کو ی، و اور واؤ لگا کر ظاہر کیا جاتا تھا مثلاً ایدھر، ماٹی اور اوس وغیرہ مگر زبر کو الف سے عموماً اس وقت بدلتے تھے جب حرکت کے بعد والا حرف مشدد ہو۔

(ناجی)　ہنسنے سیں یہ چمک ہے دانتوں کی　　یا اوجالا شفق میں بجلی کا

(ناجی)　جو عاشق پاکباز ہوتے ہیں　　نہ میلا رنگ ہوا ون کے کفن کا

(یقین)　ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار　　یاں کون ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

مگر اس زمانے میں مٹی بھی استعمال ہونے لگا تھا کافر کا شعر ہے ؎

حسرت سے ان بتوں کے دل پر کدورتیں　　مٹی کی مورتیں ہیں کافر یہ صورتیں

(یقین)　دلوں پہ برق سی گرتی تھی جب ہم ناز کرتے تھے　　گئیں کیدھر نہیں معلوم ان آہوں کی تاثیریں

〃　تیری جاگہ اگر پتھر بھی ہوتا آب ہو جاتا　　پھٹی چھاتی کو میری دیکھ کوہِ طور رو دیتا

〃　کسی کا کیجو راکھا کر دل تم کو لازم ہے　　وگرنہ دلرباؤں کا لقب دلدار کیوں ہوتا

〃　رشک سے لاگے ہے پروانہ کے جیسے تن کو آگ　　لگیو اے فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ

(مظہر)　سبھی مرتے ہیں خوش وقتی پہ جی جیتے ہیں شادی پہ　　تکلف برطرف یہ نوحہ گر باندہ[1] ہے ماتم کا

(نائز)　نینوں میں اس کے جادو زلفاں میں اوس کی پھاند　　دل کے شکار میں وہ شہباز ہے سراپا

(آبرو)　آج کیوں مہر مو تہہ پہ دے بیٹھے　　کل تو تم جان ہم سیتی تھے وا

(آبرو)　اوس خوش نین اودھر جب گذر کیا　　تب اوس کڑی نگاہ نیں دل تذر کیا

کریل کتھا میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اشباع کی مثالیں ملتی ہیں:۔

اونہوں (انہوں)، لوبائی (برائی) کوتے (کتے)، دوکھہ (دکھ) چوپکے (چپکے) اوجڑا (اجڑا) اودا اس (اداس) کوپی (کپی)

---

[1] باندی باندہ کی تانیث ہے۔ باندہ بمعنی بندہ۔

لولائے (بلائے) سونا (سنا) پہونچ (پہنچ) چہوپا (چھپا)، چوہا (چھپا) سولائی (سلائی) پوکارا (پکارا) چن (چن) اوتریں (اتریں) جھولا (جھنجھلا) پہیر (پھر) ایدھر (ادھر) وغیرہ۔ مثنوی خواب و خیال (۱۱۶۶ھ) میں بھی اشباع کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً اون، اوس مٹیاوے، دیکھادے وغیرہ لہٰذا اس کا رواج اس وقت تک تھا۔ مگر دیوان زادہ مکتوبہ ۱۱۹۵ھ میں اوس کی جگہ اُس استعمال ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اشباع کو اس زمانے میں ترک کرنے کی طرف رجحان ملتا ہے حتیٰ کہ انشا نے اس کو واضح طور پر ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"لفظ اس اور ایسے تمام ہندی لفظوں میں جن میں ضمہ بغیر واؤ کے آواز دیتا ہے واؤ کا لکھنا صحیح نہیں یعنی اوس لکھنا غلط ہے۔[1]" اور

"یہی حال ی کا ہے یعنی ایدھر وغیرہ جس حرف کے بعد تلفظ میں بھی اس کا اظہار ہو تو کتابت میں بھی درست ہے ورنہ غلط۔"[2]

بعض الفاظ میں جہاں ی لکھی جاتی ہے اس زمانے میں حذف کر دیتے تھے اور حرکت سے کام چلاتے تھے مثلاً دیوانہ کو دوانہ لکھتے تھے فضلی نے درگاہ کو درگہ لکھا ہے اور الف گرا دیا ہے۔

پادشاہا تیری درگہ ہیکی اب دارالشفا　　دردمند ہوں میں یہاں درماں لیے آیا ہوں اب

اسی طرح فضلی نے کریل کتھا میں بے گناہ کو بے گنہ، دولہا کو دولہہ، کوتاہ کو کوتہ لکھا ہے۔ حزیں کا شعر ملاحظہ ہو جس میں دیوانے کو دوانہ لکھا ہے ؎

پنٹ شورش سے آتی ہے بہار اب　　خبر لے اپنی اوا سے دل دوانے

کبھی کبھی ل کو ر سے بھی بدل دیتے تھے مثلاً قطبی نے تیرہ ماسہ میں کلیجا کو کریجا لکھا ہے

برہ کا بیں اچانک تیر کھایا　　کریجا ہاتھ دیکر دل گھر کوں آیا

شیخ محبوب عالم کی مسائل ہندی میں بدن، بادل، گلا، دھول، ابلے کی جگہ براؤں، بادر، گرا، دھور، اجارے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شاہ آیت اللہ کی مثنوی گوہر جوہری میں باڈلا کو باورا اور مندر کو مندل لکھا ہے۔

الفاظ کے آخر میں الف کا استعمال بھی ملتا ہے۔ شیخ محبوب عالم کی مسائل ہندی میں بات، رات، باس، آس پاس، ساتھ کو باتا، راتا باسا، آسا، پاسا، ساتھا لکھا ہے۔ میر سجاد کے دیوان جس کی مائیکرو فلم راقم کے پاس ہے میں کو ہسار کو کوہسارا لکھا گیا ہے ؎

آج فریاد ہے نہ مجنوں ہے　　کیوں نہ ویراں ہو دشت کسا

اسی طرح میر محمود صابر نے اپنے آپ کو صابرا باندھا ہے۔

نقد دل دے عشق کا سودا کیا ہوں صابرا　　حق کی رحمت سوں نہ آوے گا مرے سودا میں ٹوٹ

بعض مرکب الفاظ کو الگ الگ لکھا جاتا تھا۔ اور ان کے ٹکڑے کر دیے جاتے تھے۔ دیوانِ فائز میں بنتا کو بن تا، لٹکتا کو لٹک تا، کھلیلی کو کھل بلی، لکھا ہے۔ اسی طرح دیوان سجاد قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں کھٹکتا کو کھٹک تا، جھکتا کو جھک تا لکھا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس دیوان میں جھکتا بھی لکھا گیا ہے۔

---

[1] دریائے لطافت ص ۲۲۸ ۔ [2] دریائے لطافت ص ۲۲۹

تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول

ڈاکٹر جمیل جالبی

آج کا موضوع یہ ہے کہ تحقیقی و تنقیدی موضوعات پر لکھنے کے اصول کیا ہیں؟ یہ ایک ایسا وسیع موضوع ہے جسے ایک گھنٹے کے لیکچر میں پورے طور پر سمیٹا نہیں جاسکتا۔ اسی لیے کم وقت میں بہت سی باتیں پیش کرنے کا طریقہ میں نے یہ سوچا کہ پہلے چند بنیادی باتیں بیان کروں اور پھر انھیں مثالوں سے واضح کردوں تاکہ اس موضوع کا ایک خاکہ آپ کے سامنے آجائے۔ اپنے موضوع کی وضاحت سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ دنیا کے سارے اصول بے معنی اور بے کار ہیں جب تک ان اصولوں پر چلنے والے میں پیدائشی صلاحیت، کام کرنے کی دُھن اور اپنی منزل تک پہنچنے کا عزم نہ ہو۔ میں جو کچھ کہوں گا اس کا مقصد یہ ہوگا کہ میں صرف راستے کی نشاندہی کردوں۔ اس کے خطرات و مشکلات سے آگاہ کردوں

بالعموم انسان ذہانت کے اعتبار سے کم و بیش ایک سا ہوتا ہے۔ جو فرق ہوتا ہے وہ صرف درجوں کا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے یہ فرض کرتے ہوئے کہ آپ سب ذہانت کے اعتبار سے نارمل ہیں، اور آپ میں لکھنے کی پیدائشی صلاحیت موجود ہے اور آپ میں لگن اور عزم بھی ہے، میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اچھا لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ وہ خواہ نثر میں لکھا جائے یا نظم میں، لیکن نثر میں لکھنا نظم میں لکھنے سے اس لیے زیادہ مشکل ہے کہ اس کے لیے آپ کو پتا مار کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ تیاری کرنی پڑتی ہے مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور سوچ کر اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنا پڑتا ہے۔ ابہام شاعری کی جان ہے لیکن یہی ابہام نثر کی خرابی ہے۔ نثر میں اچھا افسانہ لکھنا مشکل کام ہے لیکن اچھا تحقیقی و تنقیدی کام کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ فطری صلاحیت اور ذہانت کے ساتھ ساتھ صبر آزما، دقت طلب کام ہے اسی لیے تحقیقی و تنقیدی موضوعات پر لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ:

۱۔ وہ کیا لکھنا چاہتا ہے اور کیوں لکھنا چاہتا ہے؟

۲۔ اس لکھنے کے لیے اُسے کیا تیاری کرنی ہے؟

پہلی بات کے دو حصّے ہیں۔ آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں اور کیوں لکھنا چاہتے ہیں۔ "آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں" کے سوال کے ساتھ غور و فکر کا عمل شامل ہوجاتا ہے اور دوسرے حصّے سے کہ "آپ کیوں لکھنا چاہتے ہیں" آپ کی تحریر کا مقصد واضح ہوجاتا ہے، جب تک یہ دونوں باتیں آپ کے ذہن میں صاف نہ ہوں، اس وقت تک آپ کی تحریر میں کوئی معنی اور کوئی نقطۂ نظر پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے۔ یہ مرحلہ لکھنے سے پہلے کا مرحلہ ہے یعنی آپ کو لکھنے کے لیے کیا تیاری کرنی ہے۔ کون کون سی کتابیں اس موضوع پر پڑھنی ہیں۔ تاکہ اپنے موضوع سے آپ نہ صرف واقف ہوجائیں بلکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہوجائے کہ دوسروں

نے اس موضوع پر کیا لکھا، کیا کہا اور کیا سوچا ہے۔ اگر آپ کو بھی وہی کہنا ہے جو دوسروں نے کہا ہے اور جو مطالعے سے آپ کے سامنے آگیا ہے تو پھر وہی کچھ کیا لکھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ وہی کچھ دہرا رہے ہیں اور وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو پہلے لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اس صورت میں آپ کی تحریر محض ایک خلاصہ کی حیثیت رکھے گی اور ایسے میں مناسب یہ ہے کہ آپ کو لکھنے کے مرحلے میں قدم نہیں رکھنا چاہیئے۔ لیکن اس موضوع پر سب کچھ پڑھنے کے بعد آپ کے خیال میں ایک زاویہ ابھی ایسا ہے جو اب تک سامنے نہیں آیا ہے تو پھر آپ کو لکھنے کی طرف مائل ہونا چاہیئے۔ دراصل زاویہ اور نقطہ نظر ہی وہ بنیادی چیز ہے جو آپ کی تحریر کو وقعت اور انفرادیت عطا کرتی ہے ورنہ تنقیدی تحریر نصابی ضرورت کی تحریر بن کر رہ جائے گی اور پرائمری اسکول کے اُس مدرس کے سوال کا جواب ہوگی جس نے انسپکٹر اوف اسکولز کی موجودگی میں ساری جماعت سے یہ سوال کیا کہ بچو! بتاؤ رانا سانگا میدانِ جنگ سے کیا دبا کر بھاگا اور سب نے ایک زبان ہو کر کورس کے انداز میں جواب دیا ــــ "جنابِ والا دُم" یہ بات کہہ کر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کی تحریر چبائے ہوئے لقموں کی طرح نہیں ہونی چاہیئے۔ اس میں ایک زاویہ ہونا چاہیئے جو آپ کا اپنا زاویہ ہو اور جو نہ صرف غور و فکر اور مطالعہ سے بلکہ زندگی اور اس کے مسائل کے حوالے سے پیدا ہوا ہو، اور جسے آپ بیان کرنے کے لیے لفظوں کو وسیلۂ اظہار بنا رہے ہیں۔ اس مخصوص زاویئے کی اہمیت ہی آپ کی تحریر کو وہ قوت اور زور عطا کرے گی جس سے دوسرے متاثر ہوں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ آپ اس لیے لکھتے ہیں کہ آپ کی بات دوسروں تک پہنچے اور آپ کے خیالات سے دوسرے بھی متاثر ہوں۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو پھر لکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ آدمی خود اپنے ذہن میں لکھتا ہے۔ آخر آپ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہی تو لکھتے ہیں۔ بہرحال جب آپ نے اپنے موضوع پر پڑھ لیا۔ اس پر غور و فکر کر لیا۔ نوٹس بنا لیے، اُنھیں مرتب کر لیا اور آپ کا نقطۂ نظر خود آپ کے ذہن میں صاف ہو گیا تو پھر آپ کے باطن میں وہ اضطراب، وہ کرب پیدا ہوگا جو آپ میں لکھنے کی خواہش کو تیز تر کر دے گا۔ گویا لکھنے سے پہلے آپ نے چار کام کیے:۔

۱۔ آپ نے اپنے موضوع سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لی۔

۲۔ آپ نے غور و فکر کے بعد اپنا نقطۂ نظر متعین کر لیا۔

۳۔ آپ نے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے حوالے جمع و مرتب کر لیے۔

۴۔ اور آپ اس موضوع میں اتنے محو و منہمک ہو گئے کہ آپ کے وجود میں اس کے اظہار کی بے چینی پیدا ہو گئی۔

اس کے بعد آپ کے سامنے یہ مسئلہ رہ گیا کہ آپ اپنی بات کس طرح کہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ابلاغ کر سکے، اسے کہاں سے شروع کریں اور کیسے شروع کریں۔ کونسی بات پہلے کہیں اور کون سی بعد میں تاکہ آپ اپنی بات اس ترتیب سے کہیں کہ وہ دوسروں کو اسی طرح متاثر کرے جس طرح آپ خود اس بات سے متاثر ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر غور کرتے کرتے اچانک ایک لفظ یا ایک جملہ آپ کے ذہن کے دریچے پر دستک دے گا اور آپ کہیں گے کہ یہ میرا پہلا جملہ یا پہلا لفظ ہے ممکن

ہے یہی وہ جملہ ہو جس کی آپ کو ضرورت تھی یا آپ محسوس کریں کہ یہ وہ جملہ تو نہیں ہے اور مزید غور کرنے کے بعد آپ کے ذہن میں کوئی اور جملہ کاغذ پر آجاتے۔ اس طرح جو تحریر وجود میں آئے گی اس میں مطالعہ، تفکر، نقطۂ نظر اور آپ کا باطن شامل ہوگا اور یہی وہ سطح ہے جہاں تنقید اور تخلیق کے حدود مل کر ایک ہو جاتے ہیں یہ بات میں ادبی تحریروں کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ صحافیانہ تحریریں میرے دائرۂ کار سے خارج ہیں۔ لکھتے وقت سارا زور لکھنے پر ہونا چاہیئے۔ اور وہ اس لیے کہ کیا لکھنا ہے اور کیوں لکھنا ہے؟ یہ آپ پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔ لکھنے کے دوران جو تبدیلیاں آپ کے ذہن میں آئیں گی یہ وہ تبدیلیاں ہیں گی جن کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کا ذہن پہلے سے تیار رہے۔ لکھتے وقت آپ کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

۱۔ اپنی بات کو جہاں تک ممکن ہو عام بول چال کی زبان میں لکھیں۔ انگریزی، عربی و فارسی کے ایسے الفاظ استعمال نہ کریں، جن کے لیے اردو میں الفاظ موجود ہیں۔ ادق عربی الفاظ اور کثرت سے فارسی تراکیب سے بھی گریز کریں۔

۲۔ لکھتے وقت ایسے لفظ تلاش کریں جن سے آپ کی بات اسی قوت سے پڑھنے والوں تک پہنچے جس قوت سے وہ آپ کے اندر موجود ہے۔ ممکن ہے لکھتے وقت آپ چند جملوں یا چند لفظوں سے مطمئن نہ ہوں اور سوچ رہے ہوں کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ اس لفظ یا اس جملے سے پورے طور پر ادا نہیں ہو رہا ہے تو آپ اس پر مزید غور و فکر کرنے کے لیے نشان لگا لیں اور لکھنے کے عمل کو جاری رکھیں۔

۳۔ جب آپ ایک چیز لکھ رہے ہوں تو پھر اس عرصے میں دوسری چیز نہ لکھیں بلکہ اپنے موضوع کے ساتھ اُٹھتے، بیٹھتے اور سوتے جاگتے اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ہنر سیکھیں۔

اس طرح آپ کا جب پہلا مسودہ تیار ہو جائے تو اُسے ایک دفعہ پڑھ کر جو تبدیلیاں کرنا چاہتے ہیں کر لیں اور مسودہ کو چند دن کے لیے یوں ہی پڑا رہنے دیں اور اس کے ساتھ شب و روز بسر کرتے رہیں۔ کچھ دن بعد جب آپ اُسے پھر پڑھیں گے تو آپ کی بے اطمینانی بڑھ جائے گی آپ اس میں مزید کانٹ چھانٹ کریں گے اور آپ کا جی چاہے گا (حرام خوری کی بات دوسری ہے) کہ آپ اُسے دوبارہ صاف کریں۔ دوبارہ صاف کرنے سے آپ کمزوریاں کو خود بخود نکالتے جائیں گے۔ بات کو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کریں گے اور جب آپ کا مسودہ صاف ہو جائے گا تو آپ اس سے پہلے سے زیادہ مطمئن ہوں گے، اعلیٰ درجے کی کوئی تحریر اس عمل سے گذرے بغیر سدا بہار پھول کھلانے سے قاصر ہے گی۔ آپ اپنے مسودہ سے جب تک خود پورے طور سے مطمئن نہ ہو جائیں اسے اشاعت کے لیے نہ بھیجیں اور جب وہ منزل آجائے کہ آپ خود یہ کہنے لگیں کہ میں اب اس کو اس سے بہتر نہیں بنا سکتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب آپ کا مسودہ تیار ہے ایسی تحریر نہ صرف اختصار کی حامل ہو گی بلکہ اس میں دوسرے ذہنوں کو متاثر کرنے اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت بھی ہو گی تکرار سے گریز اور کم سے کم لفظوں میں بات کہنے کی صلاحیت آپ کی تحریر کو بلند درجہ عطا کرے گی اور اسے آپ اُسی طرح بروئے کار لا سکتے ہیں جس طرح میں نے بتایا ہے۔

مختصر لکھنے کے لیے طول طویل لکھنے کے مقابلے میں زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے، جو اپنی غیر معمولی سیاسی

معروفیات کی وجہ سے حد درجہ عدیم الفرصت تھے۔ "کامریڈ" اخبار میں ایک طول طویل اداریہ لکھا۔ اس وقت تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ اداریئے نے لوگوں کو متاثر کیا لیکن ایک صاحب بصیرت نے مولانا کے اداریئے کی تو تعریف کی، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ ۔۔۔ "مولانا! اگر یہ مختصر ہوتا تو اس کا اثر کہیں زیادہ ہوتا" مولانا محمد علی جوہر نے اس بات کو توجہ سے سنا اور کہا "محترم! آپ کی بات نہایت درست ہے لیکن مختصر لکھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے"۔ بظاہر بات ایک چٹکلا معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں اچھے اسلوب کا ایک گہرا نکتہ پوشیدہ ہے۔ مختصر لکھنے کے لیے یقیناً وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس عمل سے گزرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا اظہار میں نے ابھی آپ کے سامنے کیا ہے۔ ممکن ہے اس منزل کو سر کرنے کے لیے آپ کو مسودہ ایک بار دو بار یا تین بار صاف کرنا پڑے تاکہ اس سے وہ اثر پیدا ہو سکے جو آپ کا مطمح نظر ہے۔ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" کو کئی بار صاف کیا، تبدیلیاں کیں اور پھر بار بار تبدیلیوں سے اس کی وہ صورت پیدا ہوئی جو آج ہمارے سامنے ہے اور اسلوب کا شاہکار ہے۔ یہ کہنا کہ میں نے قلم برداشتہ لکھا ہے، کوئی قابل فخر بات نہیں ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے کیا یہ وہی ہے جو آپ لکھنا چاہتے تھے۔ ٹالسٹائی نے اپنے ضخیم ناول "وار اینڈ پیس" کو سات آٹھ دفعہ صاف کیا اور ہر بار ایسی تبدیلیاں کیں جو بنیادی نوعیت کی تھیں اور آج یہ ناول دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگر ٹالسٹائی اس پر اتنی محنت نہ کرتا تو یقیناً ایک شاہکار سے محروم ہو جاتے۔ اصل چیز تو وہ ہے جو آخری شکل میں سامنے آئی ہے۔ پڑھنے والے کے لیے اس بات کی اہمیت نہیں ہے کہ آپ نے اسے کتنی بار لکھا ہے۔ "بہار عجم" ٹیک چند بہار کی سات جلدوں میں ایک ضخیم فارسی لغت ہے ٹیک چند بہار لفظوں کی تشریح کو مسلسل اس طور پر بدلتے رہے کہ اس کے معنی اختصار کے ساتھ واضح ہو سکیں۔ ان کا ارادہ آٹھویں بار بھی پورے مسودہ کو صاف کرنے کا تھا کہ وہ وفات پا گئے۔ اسی محنت و تشریح نگاری کی وجہ سے آج بھی یہ لغت مستند فارسی لغت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ آپ کی تحریر اُسی وقت سدا بہار بنے گی جب کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہی گئی ہو جب اس میں علم و فکر کے جوہر شامل ہوں اور جب اس میں آپ کا سارا وجود رنگ بھر رہا ہو ایسی تنقیدی تحریریں ادبی رفعت کی حامل ہوں گی اور وہ صدیوں تک پڑھنے والوں کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہر اعلیٰ تنقیدی تحریر ان صفات کی حامل ہوگی، تنقیدی تحریر ہر ادبی تحریر کی طرح سچائی کی تلاش اور اس کا اظہار ہوتی ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ مطالعہ ہر لکھنے والے کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ مطالعہ کی حیثیت اس کھاد اور پانی کی ہے جس سے ننھا سا پودا تناور اور چھتنا درخت بن جاتا ہے۔ وہ لوگ صرف لکھنے کا عمل کرتے ہیں اور مطالعہ سے گریز کرتے ہیں اپنی تحریروں میں خود کو دہرانے لگتے ہیں۔ ان کی تمام تحریروں سے گہرائی اور تہہ داری غائب ہو جاتی ہے اور کچھ ہی عرصے بعد ان کے لکھنے کا عمل بھی خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ بہت سے ایسے لکھنے والوں کے نام آپ کے ذہن میں ہوں گے۔ مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اس موضوع تک محدود نہ ہو جس پر آپ لکھ رہے ہیں۔ بلکہ لکھنے والے کو ہر قسم کی قابل قدر علمی و ادبی تحریریں، کتابیں، مضامین و رسائل وغیرہ کا مسلسل مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے، اس سے ذہنی تناظر وسیع ہوگا اور مختلف علوم و فنون آپ کی تحریروں میں رنگ بھریں گے۔ مثلاً تنقیدی موضوعات پر لکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے سارے ادب اور اس کی پوری

تاریخ کا توجہ اور گہرائی سے مطالعہ کریں بلکہ اس کے اہم و غیر اہم، پہلے اور دوسرے درجے کے لکھنے والوں کی تحریروں سے بھی پوری طرح واقف ہوں، وہ نہ صرف قدیم ادب پر نظر رکھتے ہوں بلکہ جدید ادب پر بھی۔ وہ تحریریں جو کل لکھی گئیں اور وہ تحریریں جو آج لکھی جا رہی ہیں۔ ان سے بھی باقاعدگی سے واقف ہوں۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی قوم کی تاریخ سے واقف ہوں بلکہ فلسفہ، جنسیات، عمرانیات علم زبان ولسانیات اور کلچریات سے بھی واقف ہوں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ دنیا کے ادب میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ کیا تحقیقات ہو رہی ہیں اور سماجی کے اثرات ذہن انسانی پر کیا اور کس طرح مرتب ہو رہے ہیں۔ وہ سوانح عمریاں بھی پڑھے اور سفرنامے بھی۔ پڑھنا اس کا سب سے بڑا مشغلہ ہو۔ ضروری ہے کہ وہ کم از کم ایک غیر زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو اور اس کے ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہو۔ مطالعہ ہی کا وہ عمل ہے جو ذہن کو کشادگی، شعور کو پختگی اور جامعیت عطا کرتا ہے اور جب لکھنے والا قلم اٹھاتا ہے تو اس کا وسیع ذہنی پس منظر اس کے اظہار کو جامعیت، اس کے خیالات کو وسعت اور اس کی تحریر کو وقار عطا کرتا ہے۔ مطالعہ کے تنوع سے اکثر ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو صرف ایک رخے مطالعے سے نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وسیع مطالعہ تحقیق و تنقید کے لیے از بس ضروری ہے۔ وسیع مطالعہ سے ایک طرف مختلف علوم و فنون اور فکر و فلسفہ جذب ہو کر آپ کی تحریروں کو وسعت دیں گے اور دوسری طرف بہت سی ایسی باتوں کی تصدیق بھی غیر ادبی ماخذ سے ممکن ہو سکے گی جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کروں گا۔ محمد شاہ کے دوسرے سال جلوس میں دیوانِ ولی دکنی دِلّی پہنچا۔ یہاں کے شعرا نے اُسے دیکھا، پڑھا اور اس کے زیرِ اثر نہ صرف یہاں اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہو گیا بلکہ ایک نئی شعری تحریک بھی پیدا ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیوانِ ولی آندھی کی تیزی کے ساتھ مقبول ہو گیا اور اس کے اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ قوال ولی کی غزلیں گانے لگے۔ اس بات کا ذکر مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں شاہ حاتم کے حوالے سے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

"روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنِ دویم فردوس آرام گاہ دیوانِ ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ[1]"

یہاں فردوس آرام گاہ سے مُراد محمد شاہ ہیں۔ محمد شاہ ۱۱۳۱ھ میں تخت پر بیٹھے۔ اُن کا دوسرا سال جلوس ۱۱۳۲ھ ہوا۔ گویا دیوان ولی ۱۱۳۲ھ میں دِلّی آیا اور مشہور ہو گیا۔ یہ بیان مصحفی کا تھا جو انھوں نے شاہ حاتم کے حوالے سے درج کیا تھا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی تیزی سے یہ دیوان اس طرح معاشرے کے چھوٹے بڑوں کی زبان پر چڑھ جائے۔ یہ بات سوائے مصحفی کے کسی اور تذکرہ نویس نے نہیں لکھی اور یہ بنیادی بات تھی جس سے اُردو ادب کی پہلی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک دن میں مرزا محمد حسن قتیل کی تصنیف "ہفت تماشا" پڑھ رہا تھا جس کے اس جملے پر میری نظر ٹھہر گئی اور شاہ حاتم کی روایت جسے مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں نقل کیا ہے، میرے ذہن میں گردش کرنے لگی۔ قتیل نے بتایا تھا کہ کائستھ قوم ہولی کیسے

---

[1] تذکرۂ ہندی: غلام ہمدانی مصحفی، ص ۸۰، انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد ۱۹۳۳ء

کھیلتی ہے اور کہا تھا کہ :

"در عالم مستی شراب ہمراہ تقلید اشعار فارسی و عبارات گلستان و ریختہ ولی دکنی را رسوا کنند۔"[1]

اس جملے سے کائستھ ہولی کھیلتے ہوئے عالم مستی میں فارسی اشعار، عبارات گلستان اور ولی دکنی کے اشعار پڑھتے ہوئے گلی کوچوں میں پھرتے ہیں۔ شاہ حاتم کی روایت کی تصدیق ہو گئی اور معلوم ہوا کہ واقعی ولی دکنی کا دیوان اس دور میں کتنا مقبول تھا اور اس کا یہ گہرا اثر معاشرے پر پڑا تھا کہ اس کے زیر اثر اردو شاعری کی پہلی تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس بات سے اس بات کا پتا چلا کہ غیر ادبی ماخذ بھی ادبی موضوعات پر لکھنے کے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

اب ہم اپنے موضوع کے دوسرے پہلو پر آتے ہیں۔ عام طور پر تحقیق کو ہمارے ہاں ایک بے کار سی چیز سمجھا جاتا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے لکھنے والے محققوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر ہمارے محقق وہ کام نہ کرتے جو انھوں نے کیا ہے تو ہماری زبان و ادب کی تاریخ میں تسلسل اور ربط پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ہم مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی خان عرشی اور قاضی عبدالودود وغیرہ کی تخلیقات اور ان کے گہرے اثرات کو نظر انداز کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ وہ مسلمات جو آج ہمارے نقادوں اور ادیبوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں اور جنھیں ہم سب تسلیم کرتے ہیں، انھیں محققوں کی کوشش و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے ادب کو نہ صرف تسلسل دیا، بلکہ ان کے گم شدہ گوشوں کو سامنے لا کر ہماری تاریخ کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا دیا اور انھیں تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ وہ نقاد جو تحقیق کو اہمیت نہیں دیتے ایسی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں کہ جن سے ان کی تحریر بے وقعت ہو جاتی ہے۔ تحقیق دراصل تلاش و جستجو کے ذریعے حقائق کو معلوم کرنے اور ان کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ جب آپ نے تلاش و جستجو سے، جسے آپ تحقیق یا ریسرچ کا نام دیتے ہیں، "صحیح" کو تلاش کر لیا تو پھر آپ جو نتائج نکالیں گے، جو رائے قائم کریں گے اور جو بات اس کی روشنی میں کہیں گے وہ بھی مستند اور صحیح ہو گی۔ محمد حسین آزاد نے بغیر تحقیق کے "آب حیات" میں افسانوں کے جو طومار اڑائے ان کا اثر یہ ہوا کہ ہر اپنے ادب کے حوالے سے متعدد غلطیوں اور غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے۔ تحقیق کا کام یہی ہے کہ ہر بات کو پہلے سے ٹھوک بجا کر دیکھ لیا جائے۔ نقاد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رائے اور اس کے نتائج کی بنیاد تحقیق پر قائم ہو ورنہ وہ کھینچ کے قیاسی کرتب سے ادب کی پتنگ کاٹنے کے عمل میں اسی طرح مصروف رہے گا جس طرح ہمارے اکثر نقاد مصروف ہیں۔ میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کروں گا۔

پروفیسر احتشام حسین اردو کے اہم نقاد ہیں لیکن انکا رشتہ چونکہ تحقیق سے قائم نہیں تھا اس لیے ان کی تحریروں میں بہت سی بنیادی باتیں غلط مفروضات پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ احتشام حسین صاحب کا ایک مضمون "غالب کا تفکر اور اس کا پس منظر" ہے جس میں غالب کے وسعت مطالعہ اور تاریخ سے گہری واقفیت کو غالب کے تفکر کی بنیاد بتایا ہے۔ انھوں نے غالب کے اس فارسی

---

[1] "ہفت تماشا" : مرزا محمد حسن قتیل

ترجمے کو جو "مہر نیم روز" کے نام سے مشہور ہے، ان کے وسعت مطالعہ اور تاریخ دانی کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ اگر وہ یہ بات کہنے سے پہلے اسے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ لیتے تو شاید انھیں اپنے مضمون کا بڑا حصہ خود بے معنی معلوم ہوتا۔ یہ واضح رہے کہ غالب کو تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ "مہر نیم روز" غالب کی تصنیف نہیں بلکہ ترجمہ ہے جو بادشاہِ وقت کے اصرار پر انھوں نے کیا تھا۔ غالب نے اپنے ایک خط میں مہر نیم روز کے بارے میں خود لکھا ہے کہ :-

"مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں۔ آپ مدعا کتب سیر سے نکال کر زبانِ اردو میں میرے پاس بھیج دیا کیجیے، میں اسے فارسی میں کر کر تم کو دے دیا کروں گا۔ انھوں نے ابتدائے آفرینش عالم و ظہور آدم سے میرے پاس اردو مسودہ بھیجا۔" (نادرات غالب ص ۳۴)

اسی سلسلے میں ایک اور جگہ لکھا کہ :

"کارپردازانِ دفترِ شاہی خلاصۂ حالات از روئے کتب اردو میں لکھ کر بھیج دیتے ہیں، میں اس کو فارسی کر کے حوالے کرتا ہوں۔ میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں ہے۔ میں اس فن سے اتنا بے خبر ہوں، کہ یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا کہ پنڈت صاحب نے کیا کچھ لیا ہے اور وہ کیا ہے۔"

(نادرات غالب ص ۲۹)

اب دیکھیے کہ غالب کے تفکر کی بنیاد غالب کی جس تاریخ دانی پر قائم کی ہے۔ وہ کتنی کمزور اور بے معنی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ کتنے بے بنیاد اور غیر ذمہ دارانہ ہوں گے۔ غالب کیا کہہ رہے ہیں اور ہمارے محترم پروفیسر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ من چہ می سرائم و طنبورۂ من چہ می سراید۔ تحقیق سے بے تعلقی و بے خبری کی وجہ ہی سے ہماری تنقید خود غیر وقیع اور غیر مستند ہو کر رہ گئی ہے اور ہمارے اساتذہ و طلبہ ایسی غلط فہمیوں کا شکار ہیں جن سے نکلنے میں نہ معلوم کتنا عرصہ لگے گا۔ اسی لیے میری گذارش یہ ہے کہ آپ جس مسئلہ پر اپنی بات قائم کریں اُسے پہلے سے ٹھوک بجا کر دیکھ لیں تاکہ جو بات آپ کہیں اور جو نتائج اخذ کریں وہ صحیح ہوں۔ صحیح تحقیق کے عمل سے ہمارے نقاد بے بنیاد نتائج (SWEEPING REMARKS) اور بے شعوری سے پیدا ہونے والے اعتقاد کے ساتھ غلط بات کہنے سے بچ سکتے ہیں۔ تنقید کو تحقیق سے کاٹ کر جو صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اس کی ایک اور مثال میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی تحریروں سے پیش کرتا ہوں۔ ان کے مجموعے "تنقیدی حاشیے" میں مثنوی اسرار محبت کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"گلِ رعنا کو چھوڑ کر جتنے تذکرے میری نظر سے گذرے ان میں اس مثنوی کا نام نہیں ملا۔"

(ص ۲۰۸، حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء)

دیکھیے اس جملے میں کتنا اعتماد ہے۔ بظاہر یہ ایک ایسا جامع جملہ ہے۔

کہ اس میں کسی استثنا کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اس جملے کو جو بھی پڑھے گا وہ اس کی صداقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا۔ یہ جملہ ہماری اردو تنقید کے عام طرز کا اظہار کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تنقید نے تحقیق سے اپنا رشتہ قائم کرنے سے اب تک گریز کیا ہے اور یہ بے خبری اسی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ یہ جملہ لکھنے سے پہلے تحقیق کی جاتی تو آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ

مثنوی "اسرارِ محبت" کا ذکر تذکرہ طبقات الشعرائے ہند کریم الدین وصلین مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء کے صفحہ ۱۹۲ پر ملتا ہے۔ مرزا علی لطف کے تذکرے گلشنِ ہند (لاہور ۱۸۰۱ء) کے صفحہ ۲۳۰ پر اور گارساں دتاسی" میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے کہ "اس مثنوی کا عنوان "اسرارِ محبت" ہے اور اس میں سستی پنوں کی محبت کا قصہ نظم کیا گیا ہے"۔ میں اپنے محترم مجنون صاحب پر کوئی اعتراض نہیں کر رہا ہوں صرف ایک مثال دے رہا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس طرح کے کلیے اور بے تحقیق چلتے ہوئے جملوں سے نئے نقاد اپنا دامن بچائیں اور تنقیدی تحریروں، افکار اور مطالعوں کی بنیاد تحقیق پر قائم کریں۔ تحقیق یہی کام کرتی ہے کہ وہ تنقید کی بنیادوں کو درست کر دیتی ہے۔ وہ فکر اور نتائج کو صحیح راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اگر اردو تنقید اپنی بنیاد تحقیق پر قائم کرے اور ہمارے نقاد تحقیق و تنقید کو ملا کر ایک کر دیں تو اس سے نہ صرف اردو تنقید کا معیار و وقار بلند ہو جائے گا بلکہ تنقید وہ کام انجام دے سکے گی جو اس کا منصب ہے اور میری آپ سے یہ گذارش ہے کہ آپ اس کام کو اسی طرح انجام دیں۔

یہاں ایک بات کا اعادہ ضروری ہے کہ بغیر تحقیق کے جب کوئی بات کہی جاتی ہے تو پھر نہ صرف وہ غلطی آنے والی نسلیں دہراتی ہیں بلکہ ایک غلطی سے لاتعداد غلطیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ ہر بات کو خود اپنی آنکھ سے پڑھیں اور براہِ راست اصل مآخذ سے رجوع کریں تحقیق و تنقید میں براہِ راست مطالعے اور تصدیق کی بڑی اور اساسی اہمیت ہے اس بات کو بھی ایک مثال سے واضح کروں گا۔ "مجمع النفائس" سراج الدین علی خان آرزو کا مشہور تذکرہ ہے۔ اپنے والد کے ذیل میں خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ ان کا نام شیخ حسام الدین تھا۔ وہ شاعر بھی تھے اور حسامی تخلص کرتے تھے۔ اور انھوں نے ایک مثنوی "حسن و عشق" کے نام سے لکھی تھی جس میں قصہ کام روپ و کام لتا کو متین و پُرزور انداز میں موزوں کیا تھا۔ یہ بات ایک نہایت جیّد عالم، صاحبِ علم و فضل بیٹا اپنے باپ کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ اس لیے ہمیں مان لینا چاہیے لیکن ایک "محقق نقاد" کے لیے ضروری ہے کہ وہ مثنوی "حسن و عشق" سے براہِ راست رجوع کرے اور اس امر کی تصدیق کرے کہ اس کا موضوع کیا ہے؟ جب میں نے اس مثنوی کا مطالعہ کیا تو جہاں خانِ آرزو کے والد کے بارے میں کئی نئی باتیں سامنے آئیں وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس میں قصہ کامروپ و کام لتا کو نہیں بلکہ "منوہر و مدمالت" کی داستانِ عشق کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ مثال دے کر میں صرف یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جب خان آرزو جیسا صاحبِ علم بیٹا اپنے والد کی فارسی مثنوی کے موضوع کے بارے میں یہ غلطی کر سکتا ہے تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی بنیادوں کو قائم کرنے سے پہلے تحقیق کے عمل سے ان کی تصدیق ضرور کر لیں۔ یہ مثنوی خان آرزو کی ولادت سے ۲۸ سال پہلے لکھی گئی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کے موضوع کا ذکر کرتے ہوئے یہ مثنوی اُن کے سامنے نہیں تھی۔ تحقیق کا بنیادی اصول یہی ہے کہ ہمیشہ اصل مآخذ سے براہِ راست رجوع کیا جائے۔ تحقیق نامعلوم کو معلوم بناتی ہے اور ہمارے فکر و نظر اور علم و خبر کو درست و مرتب کرتی ہے۔

تحقیق کرتے وقت ساری بات آپ کے سامنے نہیں ہوتی۔ آپ کو نامعلوم کے ذریعے معلوم کی طرف قدم بڑھانا ہوتا ہے، اگر آپ کو ذرا سی بات معلوم ہو تو آپ اس کی مدد سے پوری بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ "ذکرِ میر" محمد تقی میر کی مشہور تصنیف ہے۔ میر صاحب نے "ذکرِ میر" میں اپنے والد کی وفات کی تاریخ اور مہینہ تو درج

کیا ہے لیکن سال نہیں دیا اور لکھا ہے کہ "میرے والد نے ۲۱ رجب کو وفات پائی"۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر ۲۱ رجب کا کون سا سال تھا۔ اب چند معلوم باتوں کی مدد سے ہم نامعلوم کو دریافت کرتے ہیں۔ میرؔ کی پیدائش ۱۱۳۵ھ میں ہوئی۔ میرؔ نے ذکرِ میرؔ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ عید کے دوسرے دن ان کے منہ بولے چچا امان اللہ کا انتقال ہوا۔ گویا امان اللہ کی وفات عید یعنی شوال کی ۲ تاریخ کو ہوئی۔ اس وقت جیسا کہ میرؔ نے خود لکھا ہے کہ اُن کی عمر دس سال تھی۔ گویا امان اللہ کی وفات ۲ شوال ۱۱۴۵ھ کو ہوئی۔ امان اللہ کی وفات کے بعد میرؔ کے والد، جیسا کہ ذکرِ میرؔ میں لکھا ہے۔ محمد علی متقی کی حالت غیر ہوگئی۔ ایک دن جب وہ امان اللہ کی فاتحہ چہلم کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک نوجوان احمد بیگ آیا جو اُن کے والد کی توجہ کے باعث وہیں ٹھہر گیا اور سات مہینے سخت ریاضت کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا۔ یہ سب باتیں ہمیں ذکرِ میرؔ سے معلوم ہوتیں۔ شوال کے بعد ذیقعدہ اور پھر ذوالحجہ کا مہینہ آتا ہے جس پر ۱۱۴۵ھ کا سال ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد نئے سال یعنی ۱۱۴۶ھ کا پہلا مہینہ محرم آتا ہے۔ گویا ۱۱۴۵ھ کے ذیقعدہ میں امان اللہ کا چہلم ہوا اور اس وقت احمد بیگ آیا جو سات ماہ رہا۔ اس کے بالکل صاف معنی یہ ہوئے کہ میرؔ کے والد کی وفات ۲۱ رجب ۱۱۴۶ھ کو ہوئی۔ آپ نے دیکھا کہ تحقیق کے ذریعے کس طرح مختلف معلوم اجزا کو ملا کر نامعلوم کو دریافت کیا گیا۔

اس بات کو ایک اور مثال سے سمجھئے، یہ بات کہ میرؔ دلّی سے لکھنؤ کب آئے متنازعہ فیہ رہی ہے۔ میرؔ نے اپنے لکھنؤ آنے کا سال کہیں نہیں لکھا لیکن ذکرِ میرؔ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب میرؔ دلّی سے چلے تو اُس وقت نجف خان ذوالفقار الدولہ سخت بیمار تھے، لکھنؤ پہنچنے کے بعد میرؔ نے نجف خان کے مرنے کا ذکر کیا ہے کہ "میرے ادھر آجانے کے بعد وہاں نجف خان بسترِ علالت پر تھے، فوت ہوگئے۔ ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ میرؔ کے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد نجف خان کے مرنے کی اطلاع ملی۔ معاصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نجف خان نے ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ مطابق ۷ اپریل ۱۷۸۲ء کو وفات پائی۔ ربیع الآخر قمری سال کا چوتھا مہینہ ہے۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہوئی کہ میرؔ ۱۱۹۶ھ میں دلّی سے لکھنؤ آئے لیکن اب یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ مہینہ کون سا تھا؟ اس کے لیے اس دور کی تاریخوں کا مطالعہ کیا معلوم ہوا کہ نجف خان اواخرِ صفر یا اوائلِ ربیع الاوّل ۱۱۹۶ھ میں ذی فراش ہوئے، اس وقت میرؔ دلّی میں تھے۔ نجف خان کی تاریخِ وفات ۲۲ ربیع الآخر ہے۔ اس وقت میرؔ لکھنؤ میں تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ میرؔ ربیع الاوّل کے آخر یا ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ پہنچے۔

مختلف نوعیتوں کی یہ دو مثالیں میں نے اس لیے پیش کیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ معاصر تاریخوں، غیر ادبی مآخذ اور دوسری کتابوں کی مدد سے کیسے نامعلوم کو معلوم کیا جاسکتا ہے اور معلوم کا فائدہ یہ ہے کہ ہم بے بنیاد مفروضات اور چلتے ہوئے بے تحقیق دعووں سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ اور جو بات کہتے ہیں اُس کی بنیاد ٹھوس علم پر قائم ہوتی ہے۔ ہماری تنقید کا روشن مستقبل تحقیق و تنقید کو ملا کر ایک اکائی بنانے سے ہی ممکن ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی یہی کرنا چاہیئے۔

> نقاد و محقق دونوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا ذہن ہر قسم کے مذہبی، علاقائی، ذاتی و تاریخی تعصبات و مغالطوں سے پاک ہو ورنہ صاحبِ تحقیق و تنقید غلط سمت کی طرف چلا جائے گا اور اس کا سارا کام بے بنیاد ہوجائے گا۔ میں تعصب کی ایک انتہائی مثال پیش کرتا ہوں۔ سب تذکرہ نگاروں کے برخلاف

"تذکرہ" خوش معرکۂ زیبا" کے مؤلف سعادت خان ناصر نے خواجہ میر درد کو تعصب پیشہ لکھا ہے اور اس تعصب کے ثبوت میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

"اس صوفی صافی کی نذر کو ایک شخص مینا لایا اور حضرت (خواجہ میر درد) نے پنجرہ اس کا خلوت خانۂ خاص میں لٹکایا۔ اس جانور نے یا علی مدد کی صدا کی۔ باوجود اس کے کہ طریقۂ فقیری بولی ٹھولی کا نہیں اس تعصب پیشہ نے زبان اس حیوانِ مطلق کی حلق سے کھینچی، نعوذ باللہ من ہذا العقیدہ"[1]

یہ واقعہ کسی طرح بھی خواجہ میر درد کے مزاج، خاندانی روایت، صوفیانہ تعلیم و تربیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میر درد کا وہ سلسلہ تصوف، جو ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب پر منکشف ہوا تھا اور جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں کو متحد کرنے کی کوشش تھی۔ طریقِ حسنیؓ اور طریقِ محمدیؐ کہلاتا ہے۔ پھر خود خواجہ میر درد کا سلسلۂ نسب پچیس واسطوں سے امام عسکری سے ملتا ہے۔ میر درد نے اپنے والد کی تاریخ "جس مصرع سے نکالی ہے اس میں امامین و علی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ع وارثِ علم امامین و علی[2]۔ خود علم الکتاب میں حضرت علی کا ذکر بار بار آیا ہے۔ مثلاً وارد و معارف بعض آیات و محبت اہل بیت علیہم التحیات" کا پورا وارد ص ۲۵۵ سے ۲۶۷ تک دیکھ لیجئے۔ آپ کو حضرت علیؓ اور اہل بیت کا ذکر ملے گا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا ہے کہ:

"یہ صوفیانہ وسیع النظری ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ مدح صحابہ یا محبت اہل بیت میں غلو کرتے ہیں نہ حد اعتدال سے متجاوز ہوتے ہیں بلکہ دونوں سمتوں میں افراط و تفریط سے کام لینے والوں کو راہِ صواب سے ہٹا ہوا مانتے ہیں"[3]

یہ تو ہم نے داخلی شواہد، خواجہ میر درد کی تحریروں اور ان کی خاندانی روایت کے حوالے سے معلوم کیا کہ تعصب پیشہ کا الزام خواجہ میر درد پر نہیں بلکہ خود سعادت خان ناصر پر عاید ہوتا ہے۔ اب آیئے اس واقعہ کی تحقیق کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اصل واقعہ کیا ہے۔؟

سعادت خان ناصر کا "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" ۱۲۶۲ھ میں لکھا گیا۔ اس سے تقریباً سو سال پہلے ۱۱۶۵ھ میں مرزا افضل بیگ خان قاقشال نے اپنا تذکرہ "تحفۃ الشعراء" لکھا جس میں یہی واقعہ میر عبدالمنان عزت کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"نقل مشہور است کہ جانور مینا کہ نام مبارک حضرت علی فصیح می گفت زبان او را بریدند"[4]

---

[1] خوش معرکۂ زیبا: مرتبہ مشفق خواجہ، جلد اوّل ص ۱۸۰ - ۱۸۱، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ء

[2] علم الکتاب: خواجہ میر درد، ص ۱۳۷۔ مطبع الانصاری دہلی ۱۳۰۸ھ

[3] خواجہ میر درد: ڈاکٹر وحید اختر، ص ۶۲، علی گڑھ ۱۹۷۱ء

[4] تحفۃ الشعراء، مرزا افضل بیگ خان قاقشال مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل، ص ۱۸ حیدر آباد دکن ۱۹۶۱ء۔

تاقشال نے خود اس واقعہ کی تحقیق کی اور بتایا کہ :

"فقیر از میر نعمان خان نبیرہ اش پرسید۔ جواب داد کہ آن چہ مردم می گویند غلط، آن مینا کہ یا علی بر زبان می آورد بہ قیمت پانصد روپیہ خریدہ بود۔ چوں در خانہ آوردند نام خجستہ فرجام را نگفت و گنگ شد۔ آن را بمالکش واپس دادند۔"[1]

سعادت خان ناصر نے یہ واقعہ بے وجہ میر درد کے سر منڈھ دیا ہے۔ جب کہ یہ واقعہ جو عبدالمنان عزت سے منسوب کیا گیا تھا خود بے بنیاد و غلط تھا۔ اب دیکھئے کہ تعصب نے کس طرح حامد کی ٹوپی محمود کے سر پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ نقاد اور محقق دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعصب سے، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، بچے اور حقیقت اور سچائی کو اس کے اصل روپ میں تلاش کرے اسی وقت فکر و نظر کا ارتقا ممکن ہے اور خیال و روایت آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اب ایک بات اور آپ کے کام میں "توازن" ہونا چاہیئے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کون سی بات کو کتنے الفاظ میں کہا جائے تاکہ کل سے اس کا تناسب باقی رہے۔ ہمارے ہاں محققوں کی تحریروں میں یہ عدم تناسب آپ کو اکثر نظر آئے گا۔ شاعر یا مصنف کے حالاتِ زندگی کی بحث اگر سو صفحے میں لکھی گئی ہے تو اس کے کام کا جائزہ یا تو سرے سے لیا ہی نہیں گیا ہے۔ یا پھر اُسے ایک دو صفحے میں محدود کر دیا گیا ہے۔ توازن اعلیٰ تحقیق اور بلند پایہ تنقید کے لیے ضروری ہے۔ آپ کو اس تناسب پر خاص توجہ دینی چاہیئے۔

دوسری بات جس سے آپ کو بچنا چاہیئے یہ ہے کہ اکثر اہلِ تحقیق جب کوئی نیا مخطوطہ دریافت و مرتب کرتے ہیں تو اُس کی اہمیت کے بارے میں جذباتی ہو کر ایسی رائے دیتے ہیں جیسے یہی وہ واحد مخطوطہ تھا جس کی اصل اہمیت تھی یا اس شاعر یا ادیب کے بارے میں ایسی مبالغہ آمیز رائے دیتے ہیں کہ سب کے سہرے اُسی کے سر باندھ دیتے ہیں۔ تحقیق و تنقید میں یہ مبالغہ آرائی، یہ عدم توازن یا صفات کا بے جا استعمال کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

اسی طرح تنقید میں "ذاتی مغالطے" سے بھی بچنا چاہیئے۔ ذاتی مغالطے سے مراد یہ ہے کہ آپ کا کوئی عزیز دوست یا رشتہ دار کوئی چیز لکھتا ہے تو ذاتی تعلق و مراسم کی وجہ سے آپ اس تحریر کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ آپ کا دوست یا رشتہ دار ہے اور اس تحریر کے حوالے، واقعات، پس منظر سے آپ زیادہ واقف ہیں اور اسی لیے وہ تحریر آپ سے زیادہ ابلاغ کرتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک محفل میں ایک ایسی تحریر پڑھ کر سنائی گئی جس کی تعریف صاحبِ خانہ ایک ہفتے سے مسلسل کر رہی تھیں۔ لیکن جب وہ تحریر سُنی گئی تو صاحب کے سوا کوئی بھی اس سے اس لئے لطف اندوز نہ ہو سکا کہ اس کے حوالے، واقعات، اشارات و پس منظر سے صرف وہی واقف تھیں اور تخلیقی سطح پر وہ تحریر دوسروں سے ابلاغ نہیں کر رہی تھی، نقاد کی حیثیت سے آپ کو اس قسم کے ذاتی مغالطوں سے بچنا چاہیئے ورنہ آپ بے وقعت تحریروں کو اعلیٰ تخلیقات شمار کرنے کی غلطی کے مرتکب ہوں گے

اب آخر میں دو چار باتوں کو ایک بار پھر دُہرانا چاہتا ہوں :-

---

[1] تحفۃ الشعرا : مرزا افضل بیگ خان قاقشال مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل، صفحہ ۱۸ حیدرآباد دکن ۱۹۶۱ء

۱ ۔ تنقید کی بُنیاد تحقیق پر رکھنی چاہیئے اور تحقیق کے دوران اپنی ذات اور تعصّبات کو الگ کے معروضی انداز سے اصل حقیقت کو تلاش کرنا چاہیئے۔

۲ ۔ کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اِس کا براہِ راست مطالعہ کرنا چاہیئے اور پھر غور و فکر کے بعد جو کچھ آپ کو لکھنا ہے اُس کی تیاری کرنی چاہیئے۔

۳ ۔ تنقید میں بے اعتبار معروضات، چلتے ہوئے نتائج اور بے بُنیاد کُلیہ سازی سے گریز کرنا چاہیئے۔

۴ ۔ لکھنے سے پہلے آپ کا ذہن صاف ہونا چاہیے اور معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کو کیا لکھنا ہے، کیوں لکھنا ہے اور کیسے لکھنا ہے۔

۵ ۔ اپنے موضوع کے ساتھ آپ کو شب و روز بسر کرنے چاہئیں۔ محنت سے جی نہیں چُرانا چاہیئے تاکہ آپ جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو کہ کہا جائے کہ اس موضوع کا نہ صرف آپ نے حق ادا کیا ہے بلکہ اس سے بہتر اب تک نہیں لکھا گیا۔ لکھتے وقت کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہنی چاہیے اور اس طور پر کہ وہ دوسروں تک بغیر کسی اشکال کے پہنچ جائے۔ تنقید کے لیے واضح اسلوب ضروری ہے۔

۶ ۔ آپ کی تحریر میں زاویۂ نظر کا ہونا ضروری ہے اور زاویۂ نظر اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ آپ آخر کیوں لکھنا چاہتے ہیں؟

اِس میں اور بھی کئی باتوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن سرِ دست اِتنا ہی کافی ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

(رائٹرز ورکشاپ کے سیمینار میں پڑھا گیا)

گل زمیں کی تلاش میں

ابو الفضل صدیقی

تحصیل حافظ آباد ضلع رحمت آباد روہیلکھنڈ ڈویژن کے اندر دلی یہات واقع قصبہ نور آباد فارس پور کے باغ دار رئیس جاگیردار روہیلہ نامکار یافتہ آغا محمد حق نواز خاں کے جدِ امجد آغا لہراسپ نواز پارسی گبر مذہب تاجر تھے، مشہور بات چلی آتی تھی کہ دو مبارک گھوڑوں کی توہماتی روائتی بھاگ اور بیوپار میں چند روز کی عارضی ملکیت نے ان کے مقدر کی کایا پلٹ دی تھی اور آغا لہراسپ نواز گھوڑوں اور پھلوں کے سوداگر سے بڑھ کر یک دم رئیس جاگیردار نامکار معافی دار بن گئے تھے۔ وہ بیوپاری قسم کے سوداگر تھے انھیں اپنے باپ سے صرف اور خاص حکومت روہیلکھنڈ ہی کو اعلیٰ نسل کے بہترین تازی دعربی گھوڑے ولایت سے درآمد کرنے کا معاہدہ توریث میں پہنچا تھا۔

آغا لہراسپ نواز پارسی تاجر سال کے سال شروع موسم سرما (اکتوبر) تازی دعربی نسل کے گھوڑوں کا طویلے کے روہیلکھنڈ میں وارد ہوا کرتے۔ قافلہ کے ساتھ چھوٹے سائڈ بزنس کے طور پر بیدانہ، انار، پٹاری کے انگور، مشہدی سیب، ناشپاتی بگوگوشے وغیرہ تازہ پھل اور خوبانی زرد آلو، آلوچہ، آلو بخارا وغیرہم خشک اور پستہ بادام وغیرہ مغزیات اور منقی کشمش خشک ولایتی میوہ جات پار کر لاتے اور گھوڑوں کا بڑا سودا تو آہستہ آہستہ کہیں جاڑوں بھر میں چھان پھٹک اور قیل وقال کے بعد مکمل ہو پاتا یہ ولایتی پھل یہاں نایاب تھے پہنچتے ہی منہ مانگے داموں ہاتھ کے ہاتھ بک جاتے اور اسی حلقہ میں یہ چٹکیا بیوپار فوراً کا فورا ہو جاتا جہاں گھوڑوں کا بڑا سودا ہوا کرتا ہر چند کہ دونوں سودوں میں مالیت اور نوعیت کے لحاظ سے بہت بڑا تفاوت تھا۔ مگر آغا لہراسپ نواز پارسی اس خطہ کا اہم آدمی تھا۔ کیونکہ فوج اور فوج میں بھی سواروں اور امرا کے شایانِ شان گھوڑے فراہم کرتا تھا لہٰذا اس ولائتی پھلوں کی نایاب جنس کی فراہمی کا یہ چھوٹا سا کاروبار بھی اس طبقہ کے اندر اس کی اہمیت کو تقویت پہنچاتا تھا پھر یہ بات بھی تھی اس چھوٹے بیوپار میں اس کے قافلہ کی آمد رفت کا خرچہ نفع ہی میں پورا ہو جاتا اور گھوڑوں کا بڑا سودا کرنے میں اس کو اور اس کے خریداروں کو ایک قسم کی آسانی رہتی اور بڑے کاروبار پر اس چھوٹے سے بیوپار کا ہر پہلو سے آسان اور اچھا اثر پڑتا حالانکہ یہ سب کچھ خریداروں ہی کی جیب سے نکلتا مگر ذرا گھومے ہوئے ہاتھ سے "نایاب ولائتی پھلوں کی فراہمی" "اعلیٰ ولایتی گھوڑوں کی فراہمی" ایک مخصوص نوعیت کی تجارتی ساکھ بنتی اور وقار قائم ہوتا اور آغا کی پوزیشن کو اس سادنتی مزاج حلقہ کے اندر وقیع سطح کے ساتھ محسوس کیا جاتا۔ جو عام طور پر اس ماحول میں اس کے برعکس ہوتا ہے اور فیوڈل سوسائٹی میں کاروباری اور اہل کار ملازم پیشہ تربیت کے زیر اثر نفسیاتی طور پر اپنے سے نچلی سطح کے لوگ تصور ہوتے ہیں۔

آغا ہمیشہ اواخر سرما (اوائل مارچ) اپنا ہر گھوڑا گھوڑی فروخت کر کے فارغ ہو جاتے۔ تقریباً یہ کل کا کل سودا حکومت روہیلکھنڈ سے ہوا کرتا، آئندہ فصل کے لئے حکومت کی ضروریات اور دو ایک چھوٹے مقامی تاجروں اور ایک آدھ انفرادی گاہک کے آرڈر لے کر واپس کوچ کر جاتے اور جب سلسلہ کوہ ہمالیہ کے دامن کے اس زرخیز خطہ روہیلکھنڈ کے اندر بہار قافلہ در قافلہ خیمہ زن ہوتی، خوشبوؤں کے بقعے اور رنگوں

کے بنارے فضائ بسیط میں تیرتے لوٹتے پھرتے، تو آغا کا قافلہ بولان یا خیبر کے چٹیل خشک سنگستانوں میں کہیں رواں دواں سرحد پار کرتا ہوتا اور آم کے سدا سبز درختوں پر بور پھوٹتا اور کھل کھل کر اپنی مخصوص خوشبو سے خطہ روہیلکھنڈ کی فضا کو آم کے سرور کی یادوں کا پیام اوّلیں سناتا تو آغا سرحد پار کر کے کہیں ولایت میں بیٹھا ولائتی پھلوں اور ولائتی گھوڑوں کے برآمد درآمد کا منصوبہ بناتا ہوتا اور بیوپار کے پھندوں میں اُلجھا ہوتا اور راس المال کے اُتار چڑھاؤ میں نانوے کے پھیر میں ہوتا اور جب آگے چل کر کہیں دو تین ماہ بعد ہی مست کوئلیں کوک کوک کر اور بادِ صبا "پپیہے پی کہاں" کی ہوکیں لگا لگا کر نغموں اور نفیریوں سے بہار میں برشگال کی غم حرارتوں میں حرکتیں فزوں تر کر دیتے اور آموں کی نعمتیں من و سلویٰ کے نزول کی موسوی معجزاتی تاریخ دہراتی ہوتیں جیسے براہِ راست فردوس نعمتیں جنت سے ٹپک ٹپک کر درختوں کے نیچے رنگا رنگ فرش ہو جاتیں اور وہاں سے یہ ساون بھادوں کی بہاروں کا یہ تحفہ جیسے آپوں آپ لڑھک لڑھک کر ایک رفتار یکساں فراوانی کے ساتھ محلوں، حویلیوں، دیوان خانوں، بیوپاریوں اور جھونپڑیوں میں پہنچ کر غریب امیر چھوٹوں بڑوں سب کے سامنے ڈھیر کے ڈھیر ہو جاتا، یاں سے واں تک رس کی بوندیں بارش کی باجرہ پھواروں کی طرح عام ہوتیں، یہاں تک کہ جب نیتیں سیر ہو کر شکم بھی پُر ہو جاتے تو آغا لہراسپ نواز بیچارہ کو مطلق پتہ نہ چلتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے وہ تو اس تمام شیرینی حلاوت تغذیہ اور رنگ و خوشبو کا منہ چڑانے کے لئے ولایت کے باغوں تاکوں بغیچوں میں ولایتی پھلوں کی جنس اعلیٰ کے بیوپار کی بات کرتا ہوتا اور اپنی روانگی کے وقت کا تعین کر کے نقل اور دسترخوان کے کھانوں کے لیے ولایت کے باغبانوں کو مال کی خرید کا زر پیشگی بیعانہ دیتا ہوتا جبکہ یہاں شہروں کی منڈیاں بازار آم کے ڈھیروں سے پٹے پڑے ہوتے، جن کی دیہات میں تو کوئی قیمت ہی نہ ہوتی البتہ یہاں بھاؤ ٹکے ٹوکرا ہوتا۔

مگر اس مرتبہ آغا کا معمول کا قافلہ کیا آیا باؤلے گاؤں اونٹ آ گیا۔ طویلہ میں حسبِ معمول اعلیٰ نسل اور ارفع خصوصیات کے عربی تازی گھوڑوں اور مادیان کے ساتھ ہر جانور سے نمایاں دو اسٹیلین (نسل کشی کے سانڈ گھوڑے) جن کے قد و قامت کا کوئی گھوڑا نہ اس قافلہ میں تھا نہ پہلے کبھی آیا تھا اور نہ ہزاروں کی تعداد والے سرکاری طویلہ اصطبل ہی میں موجود تھا اور دونوں نسل کشی کے لیے مرتب کئے گئے تھے غرض اس تن و توش کا گھوڑا اس خطہ کے اندر تصوّر ہی میں نہ آ سکتا تھا، پھر طرفہ یہ کہ اس گراں ڈیل قد و قامت اور تن و توش کے ساتھ ساتھ موزونی جسم، تیور، کنوتیوں کے خارجی اوصاف اور علامات نجابت کے تمام تر معیار پر پورے اترتے ہوئے پرلے درجہ کی شائستگی، مزاج کے جبلّی حامل تھے۔ سودا گر ایرانی کا دعویٰ تھا کہ ایک آٹھوں گانٹھ کمیت رنگ والا نجیب الطرفین افرنگی نسل ہے اور دوسرا سیاہ زانو سمند رنگ آسٹریلیا کا ولایتی ہے، نیز یہ کہ یہ دونوں نسلیں براعظم ایشیا میں آج پہلی مرتبہ آئی ہیں ساتھ ہی ان کے حاصل کرنے کی گراں قیمت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک الف لیلائی افسانوی سی مہم بیان کی اور ساتھ ہی یہ کہ خاندانی پشتینی نمک خوار خادم ہوتے ہوئے یہ تمام مصیبت صرف آغائے روہیلہ کے سرکاری طویلہ میں یہ اعلیٰ نسل پھیلانے کے لئے جھیلی ہے اور اس کے ساتھ دونوں سانڈوں کے ہفت پشتی شجرۂ نسب مہر ثبت پیش کئے جو کسی مغربی زبان کے رسم الخط میں تحریر تھے۔ عساکر روہیل کھنڈ کے سپہ سالار سردار دوداخاں روہیلہ تھے سرکاری طویلہ انھیں کے راہ راست چارج میں تھا۔ ملک بھر میں گھوڑوں کے مانے ہوئے سب سے بڑے متبحر تھے، شہسوار، بیطار، چابک سوار، گھوڑوں کے متعلق سبھی کچھ تھے۔ اپنے زمانہ کی زندگی کے اس اہم ترین شعبہ اور ناگزیر شق کا شوق اور معلومات گھٹی میں پڑی تھیں اور تجربات

کے ذریعہ علم لدنی کی طرح پہنچا تھا۔ ملک بھر میں سردار دوداخاں جسمانی تن وتوش اور رنِ حرب میں اپنی مثال آپ تھے اور انھیں متنوع اوصاف کے سبب حافظ الملک حافظ رحمت خاں والئی روہیل کھنڈ کے جانشین ولی عہد تصور کئے جاتے تھے اور حکومت روہیل کھنڈ کی آئینی روایات میں جانشینی ولی عہدی نسلی وخاندانی کے بجائے اہلیتوں پر مبنی ہوا کرتی تھی ویسے رشتہ میں حافظ الملک کے برادر عم بھی تھے اور حافظ الملک نے بے پایاں اٹھتی ہوئی صلاحیتوں کا بچپن سے اندازہ کرکے نوجوانی ہی میں اپنی چہیتی چھوٹی بیٹی سے شادی کرکے فرزندی میں بھی لے لیا تھا مثل بیٹے کے محبوب داماد تھے۔ وزیر دانا کی مانند مقرب خاص تھے، صف آرا جرنیل تھے اور میدان کارزار میں صف شکن کماندار تیغ زن سپاہی تھے۔ حکومت کے ساتھ آغا لہراسپ نواز کا سودا انھیں سے بالمشافہ ہوا کرتا۔ پھر ان کا دسترخوان بھی اپنی افتادِ طبع کے تحت بہت وسیع تھا، لہٰذا میوہ جات بھی تقریباً کل کے کل یہی خریدتے۔ آغا پارسی تاجر تھا زرتشتی آتش پرست گبر تو کہتے ہیں بنی اسرائیل کے بارھویں بھٹکے ہوئے قافلہ کے پانچویں سواروں میں سے ایک موسوی تھا، پھلوں کے معاملہ میں تو خیر نایابی پھر کھانے پینے کی چیز دسترخوان کے ایرانی کھانوں میں استعمال ناگزیر بھی، چھوٹا سودا، نقل کی لذت آغا کو چپ چاپ بلاقیل و قال منہ مانگی قیمت دے دیتا اگرچہ دل کی گہرائیوں میں اس سلسلہ میں بھی آغا سے مقابلہ کرنے اور مات دینے کی تمنا کبھی کبھی خصوصاً آم کے موسم میں مچل جایا کرتی مگر اس زمانہ میں آغا یہاں نہ ہوتا۔ لیکن آغا گھوڑوں کا درآمد کنندہ بیوپاری تھا اور سردار گھوڑوں کا واحد خریدار اور اس خطہ کے اندر اکیلا پالنے والا اور کام لینے والا۔ دونوں ہی ایک سے ایک بڑھ کر گھوڑے کے رنگٹے رونگٹے کے شناسا اور ادا ادا کے پہچاننے والے ماہر تھے، بڑی مین میکھ نکلتی، بال کی کھال نکالا کرتی، اس میں شک نہیں کہ آغا بیوپاری بہت ٹھونک بجا کر مال لایا کرتا پھر بھی سردار خریدار مال میں خامیاں نکال کر سودا کیا کرتا۔ دونوں گراں ڈیل افرنگی اور آسٹریلوی سانڈوں کے حصول کی مہم اور گراں قیمت ادا کرنے کی بات اور ان کی نجابت اور شائستگی کا دعویٰ تمام کی تمام روئداد سردار نے سُنی اور دونوں مہر ثبت کسی یوروپی زبان میں تحریر نسب نامے بھی دیکھے مگر پڑھوانے سمجھنے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی یوں ہی ایک جانب رکھ دیئے، گھوڑوں پر لٹو ہو گیا۔ سردار کو آغا کی دکانداری سے نسب نامے پڑھوانے یا کوئی سوال کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی۔ پہلی جوہر شناس نگاہ نے پرکھ لیا اور تہیہ کر لیا کہ پھلوں کی طرح ان سانڈوں کی بھی منہ مانگی قیمت ادا کروں گا اور اس جنسِ سعید کو سلطنت روہیلکھنڈ کے لئے حاصل کروں گا جو اپنے خطہ میں ہر پہلو سے نایاب تھی۔ اور غور کیا تو سعادت اور خوش بختی کی ابتدا آغا پر ولایت سے یہاں تک چند روز کے بیوپار کی عارضی ملکیت ہی میں ہو گئی، خرید فروخت کے لین دین میں منہ مانگی قیمت پائی اور نہال ہو گیا پھر تو جوں جوں وقت گذرا آغا پر سعادتوں اور اکرام کی بارش ہوتی گئی مقدر کی پٹڑی ہی بدل گئی، ملک ملک خطہ خطہ پھر کر بیوپار کرنے والا تاجر جاگیردار باغ دار اور تخت و تاج کا حصہ دار ٹھکانے والا زمیندار بن گیا کاروبار کے ناطے۔ خطہ روہیلکھنڈ کا اہم آدمی تو تھا ہی اب حکومت کا ستون بن گیا جس کی بنیادیں پاتال تک گہری ہوا کرتی ہیں اور جس کے مینارے آسمان میں گھسے دکھائی دیا کرتے ہیں۔

ویسے عقیدہ کے اعتبار سے بھی روہیلے حکم ربی، قوتِ بازو اور تلوار کی دھار پر بھروسہ کرنے والے حکمران گزرے ہیں اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں روہیلہ فرمانروا تو اس معاملہ میں بڑا موحد اور قلندر و درویش کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا، مگر بات فوج کے عام حوصلہ کی تھی مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید سردار دوداخاں کو ان سانڈوں کے رنگ ڈھنگ نسلی قد و قامت جبلی شائستگی کے ساتھ ساتھ ان مبارک اور

سعد سمجھی جانے والی بھونریوں نے خاص طور پر متاثر کیا جن سے اُن کے جسم کے بال پیدائشی طور پر کاتبِ قسمت نے جیسے اپنے ہاتھ سے سنوار کر مزین تھے اگرچہ اپنے تربیتی ماحول کے زیرِ اثر خود سردار کے دل میں ان کی کوئی قدر وقعت اہمیت نہ تھی مگر حکمت عملی کے تحت اس کا اثر اپنا پڑتا تھا میدان جنگ میں اترنے والا ہر فرد خواہ سردار ہو خواہ سوار سپاہی توہمات کا شکار ہوتا ہے اور ان بالوں کے چکروں کے ساتھ جوان گھوڑوں میں پائے جاتے تھے روایات میں خوش بختوں، فتح مندیوں، کامرانیوں کے یقین کی ضمانتیں چلی آ رہی تھیں اور لطف یہ کہ علم سینہ کی روایات ایک جانب ملک بھر میں جتنی قدیم کتابیں اس موضوع پر ملتی تھیں ان کے اندر اُن کی تفصیل اور خواص پر بحث تھی پھر ان کے متعلق ہر دور میں اور اس اپنے زمانہ میں بھی ذاتی و شخصی تجربے سامنے تھے چنانچہ اس ملک کے ہر خطہ میں گھوڑے کے بالوں کے اِس پیدائشی چکروں جنھیں بھونریاں بولتے تھے اور جس نوعیت کی ان دونوں سانڈوں میں تھیں اس کی قدر و قیمت میں خاص دخل تھا عجیب بات یہ ہے کہ ایسے گھوڑے گھوڑیاں جن کے بالوں میں یہ مبارک بھونریاں پیدائشی طور پر پائی جاتی تھیں جسمانی و مزاجی عیوب اور خامیوں سے مبرا ہوا کرتے شائستگی مزاج کے ساتھ تربیت آسان ہوتی گویا اس پیدائشی خارجی سعادت کا پہلا صلہ خود اس جانور کو قدرت عطا کیا کرتی، سردار دوداخان نے کلیہ کے تحت کہ جان داروں میں سب سے زیادہ گھوڑا اپنی خصوصیات اپنے بچہ میں منتقل کرتا ہے علاوہ ان سانڈوں کی نادر اور اچھی نسل پھیلنے کے ان سعید بھونریوں کے روہیل کھنڈی طویلہ میں عام ہو جانے کے خیال سے خرید لیا اور سب سے اس کا پہلا مبارک صلہ ولایت سے یہاں تک چند ہفتہ ہی کی بلکیت میں آنے کا آغا کو منہ مانگی قیمت ملنا قرار دیا اور سردار دوداخاں نے بنیادی فوجی حکمت عملی کے تحت اس اسکیم کے ساتھ یہ چند ہی سال میں بالوں کے یہ مبارک چکر سرکاری طویلہ میں عام ہو جائیں گے اور میدان جنگ میں اترنے والے ہر سوار کا حوصلہ اپنے مرکب کی سعد بھونریوں کے احساس کے تحت بلند ہو جائے گا نسل کشی کا منصوبہ بنایا سردار دوداخاں سلطنت روہیلکھنڈ کی آبرو تھا، حکمت عملی سیاست و تدبیر میں نجیب الدولہ ثانی، صف آرائی میں غلام قادر روہیلہ کا ڈھنگ اور صف شکنی میں اپنی مثال آپ، مجادلہ کے ذوق جلال میں بھرا میدان جنگ پر بجلی کی طرح لہراتا اور دشمن پر صاعقہ کی طرح پڑتا صفیں کی صفیں اُلٹ پھینکتا، کشتوں کے پشتے لگا دیتا، نرم میں یہ حال اور بزم میں یہ قال کہ شیریں زبانی سے جان محفل رنگ ہی رنگ نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو، شعر ہی شعر بن کر چھا جاتا، ہمہ وقت اپنے گرد فضا ہی بندھی رکھنا اور ٹھوس مادی قبیل کا جمالیاتی پہلو زندگی کے ضمائم تغذیہ سے دلچسپی آم کا رسیا تھا، باغبانی کا شوقین آم کی فصل کے متعلق پہلو پہلو کا شناسا، موسم اور آم کی فصل کے متعلق پیش گوئیاں کرنے والا اور آم کے محاسن کا بڑا دقیقہ رس شناسا اور عیب و ثواب کا ماہر خاص تھا۔ اس کی اپنی جاگیر تو باغوں کا خطہ اور اعلیٰ درجہ کے آموں کا وطن تھی، شوق میں بھرا بہار کے موسم میں خود جا قیمتی ریشے لئے نظر آتا، اعلیٰ اعلیٰ خصوصیات کے تخمی درختوں پر اپنے ہاتھ سے قلمیں باندھنا بڑا کامیاب جوڑ لگاتا نئے نئے چھپے ہوئے تخمی درخت ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تلاش کرتا اور قلمیں باندھ باندھ کر تیار کرتا یہ اس کی فرصت کی گھڑیوں کا جمالیاتی رُخ تھا اور کسی اعلیٰ خصوصیات کے آم کو پروان چڑھانا اس کا چین کے زمانہ کا سب سے محبوب مشغلہ تھا آم کھانے سے زیادہ کھلا کر داد لینے میں مزہ لیتا۔ ظاہر ہے پھر ایسے ذی حیثیت آدمی کے گرد اسی نوعیت کے ماہر ذی استعداد لوگ کھنچ کر آپوں آپ جا پہنچتے ہیں۔ یوں تو زرعی اراضی اور اس کے لوازمات و متعلقات سے منسلک معمولی معمولی لوگ بھی اچھے خوشحال تاجروں اور کامیاب مال دار کاروباریوں کو اپنے سے کمتر تصور کرتے چلے آئے تھے اور دوداخاں تو بہت بڑی ہستی تھا، حافظ الملک کے بعد سب سے بڑی شخصیت جس نے شاہ اودھ اور وارن ہیسٹنگز دونوں کا چیلنج قبول کیا۔ دہلی کے مرہٹوں اور پنجاب کے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ نواب نجبش کو چیلنج کیا جو مرہٹوں کا مہرہ تھا اور سردار دوداخاں سپہ سالار

تھا پھر سلطنت روہیل کھنڈ کی روایات اور نظم و نسق اٹھارھویں صدی کے اندر ہندوستان ہی کیا شاید روئے زمین پر جمہوری عجوبہ تھا، تاج و تخت کا وارث نسلی نہ ہوتا تھا، سرداروں کے گروہ کے اندر جو سب سے زیادہ اہل ثابت ہوتا تھا اس کو بلا چوں و چرا بالاتفاق رائے سربراہ تسلیم کر کے تخت نشین کر دیا جاتا اور اس کی سربراہی نگرانی میں سرداروں کی مجلس شوریٰ حکومت کرتی اور صلاحیتوں کے تحت حافظ رحمت خاں کی جانشینی کا قرعہ فال سردار دودا خاں کے نام پڑتا نظر آ رہا تھا، وہ لسولی کی جاگیر کے مالک تھے اور حافظ رحمت خاں کے جانشین تصور ہوتے تھے مزاج کے اعتبار سے سارنتی سرداروں سے ذرا مختلف تھے گھوڑوں کے تاجر لہراسپ نواز ایرانی اور گھوڑوں کے مبصر سردار دودا خاں سپہ سالار عساکر روہیلکھنڈ سے انھیں اقدار مشترک کے سبب دوستی ہو گئی اتنے قریبی تعلقات کہ تاجروں اور جاگیرداروں کے درمیان شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ورنہ آخر الذکر بڑے سے بڑے ذی حیثیت تاجروں کے ساتھ مخصوص برتری کا برتاؤ اور فاصلہ رکھتے ہیں۔ سانڈ خریدتے وقت سردار نے یہ شرط لگائی کہ آغا لہراسپ نواز پہلی نسل کشی تک مستقل نگرانی کے لیے یہیں سال بھر قیام کریں گے، سرکاری طویلے سے اور ملک بھر میں جہاں نظر آئیں گابھن کرانے کے لئے مناسب گھوڑیاں انتخاب کریں گے، اور بچہ دینے تک روزانہ ہر گھوڑی کا معائنہ کیا کریں گے، آغا سوداگر تھے من مانی قیمت وصول کی تھی پھر اپنے قدر دان جاگیردار سردار دودا خاں کا لحاظ ملاحظہ اور دلچسپ صحبت بھی تھی جن کے ذریعہ حکومت سے ہر سال ہزارہا روپیہ کا سودا ہوتا چلا آیا تھا، انہوں نے قیام کی شرط منظور کر لی آئندہ فصل کے لئے ہدایات دے کر اپنے ایک معتبر نائب کی قیادت میں قافلہ واپس کر دیا، گھوڑوں اور پھلوں سے دلچسپی کی قدر مشترک نے آغا اور سردار کو دلی دوست بنا دیا تھا، اور سردار دودا خاں نے اپنے دیوان خانہ کو سرکاری مہمان خاص بنا کر مقیم کیا اور یہاں تک کہ سارنتی روایات کے منافی دونوں وقت خاصہ کے دسترخواں پر پہلو بہ پہلو نمایاں نشست دیتے۔ طویل قیام مستقل مہمانداری، گہری قربت، اقدار مشترک، حرم سے باہر جتنا وقت گذرتا آغا کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے، دلایتی سانڈوں کے متعلق خاص غیب شپ رہتی، گابھن گھوڑیوں سے اچھی نسل اور اعلیٰ خصوصیات کے بچے دینے کی امیدیں لگائی جاتیں اور باتیں ہوتیں، کبھی کبھی ایرانی پھلوں کا تذکرہ چل پڑتا جن کی ساکھ دھاک ہمیشہ سے پورے ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی سردار دودا خاں دلایتی گھوڑوں کا تو لوہا مانے ہوئے تھے مگر شہنشاہ بابر کی طرح دلایتی پھلوں کی فوقیت تسلیم نہ کرتے تھے اور ان کے متعلق آغا کی لن ترانیاں سن کر چپکے ہو جاتے اور وقت کے منتظر تھے۔ اکتوبر میں وارد ہو کر مارچ میں مراجعت کر جانے والا سیاح نوعیت کا تاجر دوست بیدانہ انار، پٹاری کے انگور، شیریں سیب، آخری فصل والی ایک مار کا گاڑھا قوام سا بھری بے کیف خوبانیاں، آلوچے اور کئی کئی سال جوں کے توں بھاری بھرکم رہنے والے مغزیات لذیذ مقوی بادام پستے کاجو وغیرہ خشک میوے درآمد کرنے والا اور اس جنس اعلیٰ کی بہترین اقسام لانے والا صرف ایسا ہی سوداگر ہو سکتا تھا، اور پھر آم کی حقیقت سے بیچارہ ناواقف۔ بھلا اس کے سامنے پھلوں کے موضوع پر سردار بولتے بھی تو کیا، اور یہ آم کی فصل میں آم کے دیس کے اندر آغا کا پہلا قیام تھا اور سردار دودا خاں اپنے دلایتی دوست کو دلایتی پھلوں کا جواب عملی طور پر دینے کے لئے اسی گھڑی کے منتظر تھے کہ برسات کی پہلی بارش کے بعد آم کھانے کا روائتی وقت آ لگے اور آج وہ مبارک شام آ ہی گئی جب کھانے کے بعد دسترخوان پر شائقین موسم کے سازگار و مناسب ہو جانے پر آم کھایا کرتے ہیں۔ یوں بھی سردار دودا خاں کا دسترخوان دوسرے جاگیرداروں سے مختلف اور وسیع تھا اور آج تو سازشی سی نوعیت کا خصوصی پروگرام تھا دسترخوان پر کئی سردار روسا اور وہ ایک اعلیٰ رتبہ کے فوجی اور دو تین شعرا کرام ہر شعبہ کے مخصوص مشاہیر شریک تھے، آج کھانے سے قبل سردار دودا خاں نے بڑی مجلسی خوبصورتی کے ساتھ پھلوں کا ذکر

چھیڑا۔ کھانے کے دوران یہی غپ شپ چلتی رہی اور آخری لمحوں میں یہاں جا پہنچی کہ آغا صاحب بولے۔

"ہمارے یہاں بیدانہ انار پیدا ہوتا ہے اس پھل کا آپ کے یہاں کوئی جواب ہے؟"

"جی قبلہ آغا صاحب اس کا جواب آم" سردار دودا خان نے نہایت اطمینان کے ساتھ قطعیت کے لہجہ میں برجستہ جواب دیا اور آغا لہراسپ نواز سردار دودا خاں کے دیرینہ ساتھی تھے، دونوں ہی ایک دوسرے کی ہر ادا کے شناسا تھے گھوڑوں کی نسل اور اوصاف وعیوب کے متعلق کبھی کبھی بحث ہو جاتی اور اکثر آغا لہراسپ نواز کو سردار کی بات مان کر قائل ہونا پڑتا مگر آغا اعلیٰ پھلوں کے خطہ کا رہنے والا تھا، اس بحث میں آسانی سے زیر نہ ہو سکتا تھا۔

اس مخصوص انداز کو بھانپ کر آغا نے اپنی دانست میں سردار کے "آم" پر دوسرا زیادہ کاری وار کیا "خیر جانے دیجئے حضرت آپ کی سرزمین ہندوستان جنت نشان پر ہمارے انگور کا بھی کوئی پھل ہمسر پایا جاتا ہے؟ سردار کا لہجہ اور دھیما ہو گیا اور تیوروں میں وہی خود اعتمادی ابھر آئی جو میدان میں مدمقابل پر اس کے حملہ کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے آخری اور سب سے زیادہ کاری ضرب لگاتے ہوئے تربیت میں روا رکھنڈ ساونتوں کا مخصوص انداز ہوا کرتا تھا" مہمان محترم قبلہ لہراسپ نواز صاحب ایرانی، جناب کے بڑے چھوٹے دو چار قسم کے انگور کا جواب ہمارا کوئی ایک آم۔ ایک لاکھ اقسام انبہ دریافت ہو چکی ہیں اب تک اور ہنوز یہ سلسلۂ خیر جاری کی صورت حرکت تحقیق میں ہے"۔

آغا نے پہلو بدل کر سیب کا نام لیا اور برجستہ آم جواب سنا۔ سردار کے ریشم کے لچھے جیسے سرسراتے انداز اور تلوار کی دھار جیسی چلتی زبان کی بات پر اپنے دو فولادی وار خالی جاتے دیکھ کر آغا لہراسپ نواز جز بز ہو گئے۔ پھر ذرا سنبھلے، پہلو بدلا، طنزیہ انداز میں بولے "سردار دالا تبار، چہ خوش، اوں، آں، ایں، تو پھر ہمارا شفتالو، خوبانی، زردآلو، آلوچہ، آلو بخارا آڑو وغیرہ در ہیچ شمار قطار نیست" سردار نے مدمقابل کو مائل بہ شکست اندازہ کر کے ذرا استہزائیہ انداز میں حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اور بھی کڑا وار کیا "کیوں نہیں جناب آپ کے وطن کے ان وقیع میووں کا جواب ہماری گھٹی تخمی انبیا، جس غریب کو ہم پھل کا درجہ بھی نہیں دیتے اور "آم" کے بجائے حقارت سے "انبیا" بولتے ہیں اور سبھوں کے ساتھ بیچاری آپوں آپ ٹپک پڑتی ہے تو یوں ہی زمین پر پڑی سڑ جاتی ہے۔ اٹھا کر کھانا تو درکنار ادنیٰ آدمی اس کی جانب دیکھتا بھی نہیں، گائے بیل موشی بھی دور سے سونگھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ اوں یہ بڑی گٹھلی، ریشے دار، رس گودا ایسا ہی کھٹ منڈرا جیا آپ کے ان نام دار پھلوں کا ہوتا ہے، جن کے اسمائے گرامی آپ نے اس طرح بیان فرمائے جیسے یہ جنت الفردوس سے نازل شدہ ثمار عالیہ میں ہوں، حالانکہ اگر آپ کے یہ فخر ایرانی پھل ہماری اس بیچاری انبیا کے بھی مقابل پر لا کر رکھے جائیں گے تو لذت، کیف، خواص میں شاید اس کی گرد کو بھی نہ پہنچیں گے۔ مگر آغا صاحب ہمارے اس خطہ میں جو کچھ بھی ولایت سے نازل ہوتا ہے وہ اپنی ساکھ ڈھول ساتھ لاتا ہے آپ کا مویز منقیٰ ہمارے بیماروں کی غذا ہے اور آپ کا انار گویا ہمارے بیماروں کے لیے پرہیز پیدا ہی ہوتا ہے اور نسخوں جو شاندوں میں آلو بخارے بیدانہ کیا کیا چلتے ہیں آپ کے بادام پستہ مغزیات آپ کی بریانی متنجن مرغ قورمے کے ساتھ مغلوں نے درآمد کیے شہنشاہ ہمایوں برسوں کی مہمانی میں یہ کھانے کھانا سیکھ آئے تھے۔ ہوں آں"۔

آغا نے سردار کے مجلسی حملے کی شدت کا اندازہ کر کے پہلو بدلا، برسوں کی اپنی اور صدی بھر کی اپنے اپنے اب و جد کی رفاقت معاملت میں دونوں ہی ایک دوسرے کی ہر ہر ادا کے شناسا تھے، آغا کا گھوڑوں کے سودے کے معاملہ میں مدتوں سے سردار سے واسطہ چلا آ رہا تھا، لازم و

ملزوم سے تھے، سردار خریدار آغا دکاندار اور خریدار کی مٹھیں برداشت کرنا دکاندار کے طرزِ معاملت میں شامل ہے۔ مگر آج تو پھلوں کے معاملہ میں ازلی فوقیت، اور تاریخی مانی ہوئی حقیقت پر پانی پھر رہا تھا۔

بات چلتے چلتے دسترخوان پر آخری لقموں تک پہنچ گئی۔ آغا نے اطمینان کے ساتھ جائزہ لیا، سامنے ساڑھے تین فیٹ چوڑا اور سات فیٹ طویل قامت روہیلہ پٹھان پورے ہتھیار زیب تن کئے اپنے مخصوص فوجی ملبوس میں دسترخوان کے بیچوں بیچ چٹان کی مانند براجمان تھا، جو خلوت میں بھی کم و بیش اسی طرح ہوتا تھا، اور اہل حرم کی سپردگی کے ساتھ اسی صورت میں کمال نرمی و شائستگی سے روا مانی معاملت کیا کرتا تھا، یہ وضع روہیلے بانکوں کا ازلی مقدر تھی عید بقرعید یہی ملبوس ہوتا اور اسی سج دھج میں نظر آتے۔ جنگ میں حق و ناحق کے فیصلہ کے لیے اترا کرنے اور میدان جنگ سے اسی ملبوس کا کفن پہنے اپنے خون سے غسلِ میّت کر کے شان کے ساتھ موت کو شکست فاش دے کر حیات دوام کی آغوش میں قبر کے اندر جا لیٹتے اور تاریخ عالم کی جلد کو ایک مطلّا ورق دے جاتے۔

دودا خان تو بے اندازہ عسکری صلاحیتوں اور فنون جنگ کی بے پناہ صف شکن اہلیتوں کے علاوہ بے پایاں ذہنی صلاحیتوں کے زور سے علم مجلسی میں بھی یکتائے روزگار تھا اور حاضر جوابی میں اپنا جواب آپ تھا۔

اس وقت دسترخوان والی خوش کلامی اور غپ شپ میں ایرانی گبر تاجر پر بھی چھا گیا، وہ تاجر جس کے مال کی درآمد پر بڑی حد تک روہیلہ فوج کے سواروں کی اہلیت اور کارکردگی کا دارومدار تھا، مگر سردار دودا خاں تو اپنے گرد فضا باندھے رکھنے کے فن سے آراستہ تھا۔ کھانا آخری لقموں پر آگیا، اور سردار دودا خاں نے سیادت برطرف لطق کے زور سے نہایت بے تکلفی کے ساتھ برابر کی سطح پر مذاق اڑا کر آغا کو زچ مسا کر کے غلبہ پالیا، اور یہ یقینی امر تھا، پہلے سے منصوبہ باندھ سازش کر کے عمل کیا گیا تھا اور شکست کا احساس کر کے پُرگو اور بیباک بانکا تاجر ذرا سنبھلا، کاروباری پینترا بدل کر بولا "خانِ عالی سردار دودا خاں بہادر میزبانِ مکرم یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی۔ جناب آپ میرے ہر پھل کے جواب میں کمتب کے غبی نطق سے عاری جیسے بچہ کی طرح "آم آم" کہہ کر آمدن کے مصدر کی غلط شاید اپنی کسی ہندی ترکیب میں گردان کرتے رہے، اوں، آں، ایں" اور آغا کی بات کٹ گئی اِدھر ایک جانب سے دسترخوان بڑھا اُدھر دوسری جانب سے نقل لگانے والے مخصوص خادم قطار کی قطار آگے پیچھے آموں کی کشتیاں لے داخل ہوئے اور آغا کا شامہ پہلی مرتبہ پختہ آم کی مخصوص پھیلنے والی خوشبو سے آشنا ہوا جس سے بجز سیب کے اکثر دلائتی پھل محروم ہوتے ہیں، سبھی متوجہ ہوئے مگر آغا صاحب تو چونک ہی پڑے، آج برسات کی پہلی بھرن کے بعد کھلا تھا اور یہ آموں کے شائقین کے یہاں فصل کا آم نیا کرنے کا وقت ہوتا ہے اور یہ بحث بھی آم دسترخوان پر لگنے کی تمہید میں چھڑی تھی۔ اور اب کشتیاں دسترخوان پر چن گئیں، کمایوں اور گڑھوال سے جاڑوں میں لاکر ذخیرہ کی ہوئی آسمانی برف میں ٹھنڈے کئے ہوئے، شروع فصل کے مخصوص اقسام کے چیدہ چیدہ آم جگمگاتے، تر، رنگ رنگ شکل شکل قدقد کے آتے ہی تمام فضا مہک اٹھی تھی اور آغا کے شامہ پر سرور کی مرعوب کن ضرب پڑی تھی، "تاجر مہمان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا" بوئے خوشش دارد!" اور پھر چنی موٹی کشتیوں کا ذرا غائر نگاہ سے یہاں سے وہاں تک جائزہ لے کر بولا ؎

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

اور مردِ میدان روہیلہ پٹھانوں نے اندازہ کر لیا کہ تدِ مقابل لوہا مان گیا۔ اور سب کے سب اپنے سردار کی مضبوط کمان میں دوش بدوش صف آرا

ہوگئے۔ ایک دفعہ بزم میں رزم کا سماں بندھ گیا، اور روہیلہ حویلی و دیوان خانہ کی مخصوص تربیت جو میدان جنگ میں بھی بروئے کار رہتی تھی عسکری اصول تھا کہ غلبہ کے ساتھ ساتھ زیر ہوتے مخالف کے ساتھ شائستگی اور مخصوص نوعیت کی نرمی طریقہ کار طرز معاملت تھا پہلے تو ایرانی آداب طعام کے مطابق مہمانِ خصوصی ہوتے ہوئے خاص خاص دعوتوں میں خوان بھی زیادہ اتارے جاتے تھے اور کھانے کی اقسام بھی زیادہ ہوتی تھیں اور آج آغا لہراسپ نواز مہمان خاص تھے اور اس سلسلہ میں کئی اور روہیلے سردار بھی مدعو تھے اور صورت کچھ دعوت و ضیافت خاص کی تھی، آغا نے بکمال عنایت و تواضع ایسی دعوتوں کے دستور کے مطابق کھانے کے اقسام اپنے سامنے سے اٹھا اٹھا کر شرکا طعام میں شکریہ کے تبادلہ کے ساتھ تقسیم کی تھیں اور اس وقت آموں کے خوان بھی زیادہ اتارے گئے اور جملہ اقسام کے بھی۔ مگر ہر شریک دستر خوان نے بڑھ کر چن چن کر اپنے ہاتھ سے آغا کی الٹی تواضع کی۔ کیونکہ آغا کو آموں کے متعلق ناواقفِ محض تصور کر لیا گیا۔

پہلے سردار دوداخان نے دستِ خاص سے ایک مخصوص دانہ تراش کر تاش پیش کرتے ہوئے معزز مہمان کے تواضع کی ابتدا کی اور پھر تو سازش کے مطابق تواضع چل پڑی۔

نوع بہ نوع ایک ایک پسندیدہ دانہ سردار دوداخان انتخاب کر کر کے اٹھاتا نہایت شائستگی کے ساتھ تراش کر تاش پیش کرتا پٹھان سردار قسم قسم کے آموں کو یکے بعد دیگرے کھانے کے ردِ عمل اور تاثر سے واقف تھے، مشاہیر شرکا طعام شہد کی مکھیوں کے چھتے کے انداز میں آغا کے اندر اپنے اپنے پسندیدہ آم کا رس جیسے پرونے لگے، خوشبو ہی خوشبو، رنگ ہی رنگ، متنوع لذتوں کے آم تاش تاش یکے بعد دیگرے آغا کے کام و دہن سے گذرتے رہے کہ قصبہ آنولہ کا ایک رئیس اٹھا جو شاہی حکیم بھی تھا اور طب کی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر معافی دار جاگیر دار تھا حکیم رئیس نے اپنی دریافت اور تیار کیا ہوا ایک آم شربتی بگرین کا ایک پسندیدہ دانہ اٹھایا چینی نچوڑی اور اپنے ہاتھ سے نہایت نرمی شائستگی کے ساتھ آغا کے ہونٹوں سے لگا دیا، اور آغا کے حلق سے عطر کیوڑہ کی خوشبو میں بسا ہوا ایک تار کے مصری کے تیلے توام کا پہلا گھونٹ اترا تو روح تازہ ہوگئی، جیسے رس کا ہے کو مفرح خاص تھا اور ایک کے بعد دوسرا اور یکے بعد دیگرے پانچ چھ مفرح خاص کے گھونٹ اور اترے سانس لے کر بے اختیار زبان سے نکلا "ہمہ بسیار خوب ہستند در فرحت روح، جوابے ندارد در اثمار ایرانیاں" اور کام و دہن کے اندر آم کا جادو سر کیا نطق پر چڑھ کر بولا شیرینیوں، حلاوتوں، کیف اور لذتوں میں لپٹی زبان سے بے ساختہ ادا ہوتا رہا "تا حر آغا بولنے اور داد دینے میں اپنا اصولِ تجارت بھی کھو بیٹھا اور جب نقل ختم ہوا تو سامنے چھلکوں کے ڈھیر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آغا صاحب خود اور سبھی مقدار میں اتنے زیادہ آم کھا گئے کہ کوئی اور پھل کھا جانا ممکن ہی نہیں اور سردار دوداخان نے نقل کا خوان بڑھتے ہوئے آغا صاحب سے کہا "مہمانِ عالی جاہ۔ اب آم کا جواب آپ مجھے بتا دیجئے"

ایرانی مہمان نے اپنے محترم میزبان کی بات پر اپنے سامنے کھائے ہوئے چھلکوں کا یہ بڑا ڈھیر ذرا جھینپی جھینپی نگاہ سے دیکھا، اور پیٹ بدستور ویسا ہی معتدل محسوس کیا جیسا دستر خوان بڑھنے اور کھانے کے بعد نقل لگنے سے قبل تھا، جیسے کھانے کے بعد کچھ کھایا ہی نہیں ہے، نقل کے ڈھیر کے ڈھیر آم نہ معلوم پیٹ کے اندر کون سے گوشہ میں گم ہوگئے! تو ساری دکانداری بالائے طاق رکھ کر حیرت میں جواب دیا "میزبان کرم فرما، جوابے ندارد! بسیار خوری و خوش خوراکی صفتے دارد!۔ بے شک شہنشاہ اثمار عالم است"۔ — اور پھر آغا غریب آم کے دیس میں آم کے مزہ میں ایسے سرشار ہوئے کہ اپنے وطن کو بھی بھول گئے۔ فصل کے اختتام تک وقت وقت

پر تیار ہونے والے آم کھا کر آم ہی کے ہو رہے اور آم کے دیس میں بس رہنے کا تہیہ کر لیا۔ گھوڑوں کے طویلہ کے درآمد کرنے کا وقت بدل دیا اور یہ تجارت اُدھر درآمد ماہر و معتبر گماشتوں کے ذمہ کر دی۔ سردار دودا خاں نے انھیں حافظ الملک کی خدمت میں پیش کیا، حافظ الملک ان کو پہچانتے تھے اور گھوڑوں کے تجارتی توسل کے علاوہ ان کے ایرانی انداز تمدن سے انھیں پسند بھی کرتے تھے لہٰذا کمال عنایت خسروانہ حافظ الملک نے انھیں اپنے جاگیرداروں کی صف میں شامل کیا اور کئی ہزار ایکڑ زرخیز اراضی پر سے جنگل کاٹ کر اعلیٰ اقسام کے قلمی آم لگانے کی پیشکش کی اور لکھو را باغ نصب کرنے کے منصوبہ پر عمل کرنے کا حکم دیا، ان مراعات کے ساتھ کہ جتنے رقبہ پر باغ نصب ہوتا جائے وہ اراضی مال گذاری سے نسلاً بعد نسلاً معافی دوام بدنا نکار ہوتی چلی جائے گی۔ نیز "خان" کے خطاب سے سرفراز کیا اور اب آغا لہر اسپ نواز ایرانی تاجر اسپ آغا لہر اسپ نواز خاں جاگیردار دولت روہیلکھنڈ اور خان کے ممتاز خطاب سے سرافراز ہو گئے ساتھ ہی روہیلہ خواص اور روہیلکھنڈی عوام کے رویہ اور لطف و کرم سے ایسے متاثر ہوئے کہ آتش پرست مذہب ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہو گئے اور ان دونوں عالی نسل گھوڑوں کی سعادت نے ان پر ربانی نعمتوں کی بارش کر دی۔ وہ سوداگر سے والیٔ ریاست بن گئے۔ کچھ عرصہ بعد گھوڑوں کی تجارت اور ولایتی پھلوں کی درآمد ثانوی پیشہ رہ گیا اور اعلیٰ و نسلی کامیاب باغبان ہو گئے۔ اور یہیں کے ہو رہے، انہوں نے نسلاً بعد نسلاً اس خطہ پر ایرانی تہذیب و تمدن کی گہری چھاپ لگائی۔ آموں کی فصل کے شباب کو جو "نوروز" کہا جاتا ہے وہ انہیں کا دیا ہوا ایرانی نام ہے۔ پہلے پنج سالہ میں لکھ پیڑا آم نصب کر کے دکھلایا۔ آم کی ایجاد اور ترقی دے کر قلم لگانے کے فن کو بڑا فروغ دیا، اس خطہ میں آم کی نئی دنیا آباد کی۔

علاقہ روہیلکھنڈ میں دو تین سیاسی تاریخی انقلاب آئے، حافظ الملک کی شہادت کے بعد روہیلہ حکومت کو کلی زوال آیا اور شجاع الدولہ شاہ اودھ نے ایک لاکھ روپیہ میں وارن ہسٹینگز سے کرایہ پر اچھی آراستہ انگریزی فوج لے کر حملہ کیا، روہیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا اور پھر انگریز کرایہ کے ٹٹو نے چند سال بعد ہندوستان کے اندر اپنی اچھی فوجی طاقت بڑھ جانے پر اپنے اس کرایہ کے بقایا دار کو نااہل قرار دے کر روہیل کھنڈ سے نکال باہر کیا اور خود مالک بن بیٹھا۔ اور ان تمام کے تمام نشیب و فراز سے آغا لہر اسپ نواز خاں کے بیٹے پوتے پڑپوتے سلامت روی کی چال چلتے گزرتے رہے اور حافظ رحمت خاں، شاہ ولیم، شجاع الدولہ ملکہ وکٹوریہ کے دور سے جارج پنجم کے عہد تک یہ آموں کا تمدن مبدۂ نمائش اور مقابلہ تک ترقی کر گیا، آموں کا زرعی تمدن اودھ بلکہ پورے شمالی ہند سے بڑھ کر تمام ہندوستان پر محیط ہو گیا۔ ذرا بیدار مغز زمیندار دل کا ذریعہ آمدنی بن گیا اور اس مفلوج طبقہ میں کما کر کھانے کا جذبہ بیدار ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے روزی کا سہارا بن گیا، اور یہ آغا حق نواز خاں پالن پور والے تھے۔

بات آغا لہر اسپ نواز خاں ایرانی گبر سے بڑھتے بڑھتے آغا محمد حق نواز خاں باغ دار پالن پور پر آ گئی تھی، برطانوی دورِ جلال کا شباب تھا، ہندوستان کے اندر فرد فرد طرح طرح کے جہل مرکب میں گرفتار تھا۔ زمیندار طبقہ خود کو اپنے محل کی بالائی منزل سے اڑنے کے لئے عقاب کی طرح فضا میں کامیاب جست لگانے کی صلاحیتوں کے جہل مرکب میں گرفتار تھا، راس کماری سے گلگت تک اور زنگون سے خیبر تک ریشمی جال کے رنگا رنگ پھندے پھیلے ہوئے تھے جس کے قوسیں سایہ میں پرواز سے معذور آشیانہ سے بے نیاز پر و مزے مزے چہچہا رہے تھے اور اس دانہ و دام کو اپنا ازلی و ابدی مقدر تصور کئے چین کی بنسی بجا رہے تھے۔ برطانوی صیاد کی گرفت کا دور جلال تھا جو سایہ جمال بن کر ان کم بختوں پر پرتو فگن تھا

نوروز کی سالانہ نمائش اور بھی زیادہ گہما گہمی کے ساتھ منعقد ہوتیں اور پنج سالہ مقابلوں کے جذبے برٹش دور کی اُپج تھی، ان میں نہایت باقاعدگی اور الیکشن والا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ صدی بھر قبل کی باقاعدگیاں دوسرے رُخ کی ہوا کرتیں۔ ادھر کئی سال سے سالانہ نمائشوں میں رنگا رنگ افواہیں تیرنے لگی تھیں اور افواہوں کا ذریعہ تو عام لوگ ہوا کرتے ہیں اور یہ عام افواہیں لوگوں کی بھیڑ کے مواصلاتی سیارہ پر تیرا کرتی ہیں۔ بات اب بھی بلاشبہ بڑوں ہی کی تھی اور دیوان خانوں والی مگر اب چوپالوں پر ہونے لگی۔ الاؤں پر کھیتوں میں کھلیانوں میں یہ موضوع زیر بحث آنے لگا۔ علاقائی جتھہ بندی کے ہلکے سرور سے دیہاتی عوام روشناس ہو گئے پورے سال چھوٹے بڑے چیلنج ساونتی علاقائی نوعیت کے تیز دعوے باغ داروں سے منسوب کر کر کے ان کی عادتوں اور کرداروں کے مطابق ناقابل یقین نوعیت کے گڑھ گڑھ کر ادھر سے اُدھر اڑتے رہتے۔ مقابلہ میں آنے والے آموں کی خصوصیات دیو بالائی کرامتی انداز کے اوصاف میں مشہور کی جاتیں جبکہ یہ چیز باغ داروں کے یہاں اتنا گہرا راز ہوا کرتی کہ تین بیٹے اور بیوی کو بھی مطلق علم نہ ہوتا کہ اپنا کون سا آم مقابلہ میں جائے گا حتیٰ کہ وہ مزدور باغ کے معتمد مالی ملازم بھی نہ سمجھ سکے کہ آقا کون سا پھل مقابلہ میں اتارنے کی سوچ رہے ہیں۔ جن کے ہاتھوں یہ پھل کا درخت پروان چڑھ کر پھلا ہوتا، پھر ان افواہوں کی ستم ظریفی یہ کہ یہ بالکل غیر متعلق دیہاتیوں کے بیتے تار کی تار برقی سے صرف مزہ لینے اور علاقائی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے پھیلتیں، جنھیں نہ نمائش ہی سے کوئی ذاتی سروکار ہوتا نہ پنج سالہ مقابلہ ہی میں جن کا کوئی دخل ممکن تھا اور یہ بدنصیب تو اپنی موروثی کاشتہ اراضی پر آم کا ایک درخت نصب کر لینے کے قانونی مجاز نہ ہوتے اور کڑھنے اور تصنیف تالیف کرنے والے تو سرے سے کاشت کاری کیا کسی بھی نوعیت کے کار سے بے نیاز ہوتے ایسے پہنچے ہوئے بزرگ گاؤں گاؤں تو دو چار گاؤں پیچھے ایک آدھ ضرور پائے جاتے ہیں، غیر معمولی باتونی اور طبّاع، یک گونہ ظریف و خوش باش بھی چکنے چپڑے دُور سے چمکتے ہر کام سے بے نیاز اور ہر ایک کے ہمدرد دلچسپ شخصیت اور ہر ایک کا کام کرنے کے لیے مستعد۔ یہ لوگ تمام علاقہ کی جانی پہچانی ہستی ہوا کرتے ہیں کھیتی کیاری کے بیکار کام میں کبھی پھنستے نہیں، مشترکہ دیہاتی خاندان کی برکت اور دیہاتی خلوص کے ہاتھوں اگر بیوی بچے ہوں تو سب کے سب تیری میری بھائی بھتیجوں کی کمائی کھاتے رہتے ہیں۔ ایسے خلیفہ نوعیت کے جواں سال بزرگ گھر پر کبھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں اور زندگی سفر اور مقصدِ زندگی "گونتر" (مہمانی) ہوا کرتا ہے اور سال کے بارہ مہینہ مہمان ہی رہتے اور "گونتر کھاتے" (مہمانی میں تواضع کراتے) ہی نظر آتے ہیں اور خوش قسمت اتنے ہوتے ہیں کہ دیہاتی خلوص قدم قدم پر ان کی آؤ بھگت کرتا ہے۔ کیونکہ دلچسپ خوش پوش، خوش آواز، نکھرے نکھرے، دیہات کی فضا میں اپنی مثال آپ چلتا پھرتا ریڈیو رنگین ٹیلی وژن سا ہوتے ہیں۔ باتوں کے ڈرامائی انداز سے جاگتے تو جاگتے ہوتے میں بھی ان کے گرد خاموش فضا بندھی رہتی ہے اور مجمع میں بیٹھ کر اپنی معمولی بات پیش کرنے کے انداز ہی سے اہم اور دلچسپ بنا لیتے ہیں، اب یہ دیہاتی ٹیڈی قسم کے لوگ اپنے موضوعات میں آموں کی نمائش اور مقابلہ کو بھی شامل کرنے لگے تھے۔ ورنہ اب تک خرید و فروخت کا موقع تو عمر میں بھی، خدا نہ کرے کبھی تکلیف کرنی پڑے اور مشکل دستخطوں کی لکیر بنا لینے کی قابلیت کے سبب ہفتہ وار ملنے والے نخاسوں ہاٹوں اور سالانہ میلوں میں خط پتر لکھنے والے دیہاتیوں اور جانوروں کی خرید و فروخت کی رسید چٹھی تحریر کرنے والے منشی کی ٹھگ پر منشی سے زیادہ نمایاں براجمان نظر آتے تھے، یا پھر ذرا بڑی بستی کے اندر شرفِ مہمانی بخشتے ہوئے مؤدب میزبان کی چوپال پر الاؤ کے گرد چلتے ہوئے موضوعات پر اپنی اور اپنے سامعین کی استعداد کے مطابق چلموں کے دھوئیں میں خبریں اور اپنی اسکرپٹ گڑھ گڑھ کر سناتے ہیں ایسی خارجی و داخلی اور صوتی سنجیدگی کے حامل ہوتے ہیں جیسے شاستریں پڑھ رہے ہیں اور سامعین جھوم جھوم جاتے ہیں اور نخاسہ میلہ کی رسید والی ٹھگ اور گاؤں کے الاؤ سے اڑی ہوئی خواہ بے پر کی ہو مگر چالیس چالیس کوس چاروں طرف لمحے تار کی تار برقی سے آن کی آن میں اڑ کر پہنچ

جاتی ہے، اور مواصلاتی سیارہ کی طرح آنکھوں دیکھی معتبر و مستند پھیلتی ہے اور ان پہنچے ہوئے بزرگوں نے یہ موضوع جدید قانون قبضہ اراضی نافذ ہونے کے بعد ہاتھ میں لیا تھا اور اس نسل کے نوجوان بوجھ بجھکڑوں کا ٹاپک آموں کی نمائش اور آموں کا مقابلہ بنا تھا ورنہ اب تک یہ راجاؤں کا کھیل تھا یہ تو پرجا تھے، انھیں کسی طرح بھی اس سے سروکار نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جیسے یہ راجہ کے معاملہ میں دلچسپی کا اسراب دیہاتی ہوا میں کسی پھیلنے والی وبا کے جراثیم کی طرح حلول کر رہا تھا اور نیا رجحان تھا کہ راجہ کے معاملہ میں پرجا اس طرح علاقائی جتھہ بندی کے جذبہ میں دلچسپی لے رہی تھی جیسے یہ انھیں کا ذاتی مسئلہ ہے۔ حالانکہ ان کم بختوں کو ہندوستان کے اندر کسی صوبہ کا بھی قبضہ اراضی کا قانون آج بھی اپنی موروثی کاشتہ اراضی پر بھی آم کا ایک درخت نصب کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا اور غلطی سے آم کا درخت ان کے مقبوضہ کاشت پر جم بھی آتا تو انھیں ان کے باپ دادا کے حاصل کئے ہوئے موروثی حق کاشت سے محروم کر دیتا تھا اور راجہ کے کھیل میں پرجا کی یہ دلچسپی اس بے جوڑ سی تھی اور رعیت مملکت خویش خسرواں دانند میں ناخوش گوار سی مداخلت اور تحسین ناشناس جیسی داد، جیسے قورمہ کی پتیلی میں شکر ملا دی جائے۔ بہرحال پتہ نہیں کہ یہ راجہ کے حلقہ دلبری کا جادو تھا یا پرجا کا راج کی جانب باغیانہ جارحانہ نہیں تو دخل در معقولات نوعیت کا نامعقول اقدام۔ انھیں دو تین سالوں کی نمائش اور ایک مقابلہ کی پیداوار جن میں جدید قانون قبضہ اراضی (یو پی ٹینسی ایکٹ) میں ترمیم ہوئی تھی اور موروثی کاشتکاروں کو خواصی مراعات دی تھیں گو کہ ان میں آم کا درخت کاشتہ موروثی اراضی پر نصب کرنے کا حق نہ دیا تھا مگر یہ دلچسپی جیسے اس حق کے مطالبہ کی جانب خوبصورت قدم تھی شاید غیر شعوری اقدام۔

اور حق بات تو یہ ہے کہ بات بھی اتنی اہم تھی، تیورس سال کے واقعہ کی حادثہ کی حد تک پہنچی ہوئی سنگینیت، اس افواہ سازی اور چرچوں کی بنیاد تھی، یہ موضوع اس وقت تو اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ شاہان اودھ اور والیان روہیل کھنڈ کے زریں دور کی یہ تمدن سازانہ تاریخی یادگار کسان اپنا لیں گے دنیا بھر کے بہترین چیدہ چیدہ آموں کی سالانہ نمائش اور ہر پانچ سال بعد نئے بہترین آم کی تحقیق و دریافت کا شاندار پیمانہ پر جوش مقابلہ، ہزارہا دھڑکتے دل کسانوں سیکڑوں زمینداروں اور بیسیوں رئیسوں کا پرشکوہ اجتماع، عوامی امر بن جائے گا آموں کے ڈھیروں کا رنگیں شیریں خوش نما و خوش مزہ، خوشبودار رس بھرا میلہ کسانوں کی دلچسپی سے عبارت ہوگا۔ حسن ہی حسن، مٹھاس ہی مٹھاس، خوشبو ہی خوشبو کا رومانٹک مقابلہ، قہقہہ لگاتے تیور رس بھری آنکھوں سے کہتے ہوئے "ہم تم سے زیادہ میٹھے ہیں" اور رس بھری انکھڑیاں ہنستے تیوروں کو ناز بھرے انداز میں جواب دیتی ہوئی "نہیں ہم زیادہ شیریں ہیں"۔ مقابلہ کرو، اور مٹھاس، حلاوت، کیف، خوشبو اور رنگ کا مقابلہ، کیسا شیریں، کیسا پرکیف، بڑا ہی رنگین ٹکراؤ، ٹکریں رنگ و بو و خوشبو بکھرتی ہوئی۔ کیا کیا پُر سرور ہنگامے، کیسے کیسے رنگین و نوریں کھیل مگر اب سب کے سب بند ہو جانے کے اندیشے لاحق ہو گئے تھے جن سے کسانوں زمینداروں غلاموں آقاؤں چھوٹے بڑوں سبھی کی زندگیاں عبارت تھیں اور جن کے چرچوں سے ایک فصل سے دوسری فصل تک اور ایک پنج سالہ سے اگلے پنج سالہ تک بھونپڑے، چوپالیں، بیٹھکیں اور کوٹھیاں، دیوان خانے ایک آواز گونجتے۔ بظاہر یہ شوق کا مشغلہ اور مقابلہ کی دلچسپی کا سرور ہیجان خیزی کا ذریعہ تھا مگر اس کی اہمیت و افادیت ایگری کلچر کے فائن آرٹ جیسے شعبہ باغبانی میں تمدن سازی کے درجہ تک پہنچتی تھی اور مقابلہ کا فیصلہ حقیقی معنی میں خاص ریسرچ و دریافت کا درجہ رکھتا تھا۔ شاہان اودھ اور سرداران روہیل کھنڈ اس کے بانی تھے مگر ان کے

زوال کے بعد برٹش گورنمنٹ نے بھی اس کی تحقیقی اہمیت افادیت کے تحت اس کی ہمت افزائی کی تھی' اور اس کے انعقاد و قیام کے لئے ایک معقول رقم صوبائی بجٹ میں مختص تھی' لیکن اس کے انتظامی عاملی اور بجوڈیشلی پہلو پر ہمیشہ عیاش مرہٹہ دارِ نرسری میں زمیندار چلاتے رہے تھے اور خوبصورتی کے ساتھ گورنمنٹ کے عاملی عہدہ داروں کی مداخلت سے بچاتے رہے تھے۔ اودھ کے بارہ اور روہیلکھنڈ کے چھ سات اضلاع کے عمائدین ماہرین اس کے کرتا دھرتا تھے اور ایگری کلچر کے اس ارفع شعبہ کا کلچر انہیں انیس اضلاع میں پھول پھل کر پروان چڑھا اور دنیا بھر میں پھیلا' اور انہیں اضلاع کے اندر بالعموم اودھ کے کسی باغوں بھرے دیہاتی خطہ میں سالانہ نمائش جڑتی اور پنج سالہ مقابلہ منعقد ہوتا۔ جنگل میں منگل ہو جاتا' جیسے شہر آباد ہو جاتے۔ مجلس عاملہ اس کام کا انتظام کرتی۔ آم کے متعلق تجربہ کار ماہر متبحرین عمائدین پر مشتمل ججوں کا پینل ہوتا' جس کے سبب اراکین غیر متنازعہ شخصیت اور قطعی فیصلہ کرنے کے اہل ماہرین ہوتے یہ پینل تقریباً ہمیشہ بالاتفاق رائے تمام تر اوصاف پر پورا اترنے والے آم کو دنیا کے بہترین پھل کا درجہ دیتے اور پھلوں کے بادشاہ کا خطاب دیتے اور اس کے دریافت کر کے پروان چڑھانے والے کو طلائی تمغہ اور نقری کپ عطا کرتے اور توصیفی سند دیتے۔ نتیجہ میں اس کی زبردست پبلسٹی ہوتی' اس پودے کی من مانی قیمت پر مانگ پوری نہ ہوتی۔ اس کے ساتھ اس نرسری کے دوسرے پودوں کے آرڈروں کی بھرمار ہو جاتی اور پانچ سال کے لئے در نہ کبھی کبھی عمر بھر کے لئے ساکھ بن جاتی۔ موجد نہال ہو جاتا' بھر بھر جھولی شہرت عزت ملتی اور یوں بھی مشہور بات ہے دنیا کی کسی تجارت میں اتنا منافع نہیں لیا جاتا جتنا آم کی قلموں کے کاروبار میں حاصل ہوتا ہے اور اس انعام یافتہ قلم کے منافع کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوتی' ہر باغ والا خواہش کرتا کہ اس کے یہاں اس قلم کا پودا کہاں قطعہ نصیب ہو۔ پچھلے فساد کے سبب انعامی مقابلہ کی افواہیں لن ترانیاں بن بن کر فضا میں گشت کر رہی تھیں۔ ویسے دور کے ڈھول سہانے' اندیشے ظاہر کئے جا رہے تھے کہ ورھنگہ مرشد آباد والے پورے اور احاطہ مدارس دناگیور حیدر آباد کے دکھنی ایک گروپ ہو کر آپس میں کوئی مخصوص معاہدہ کر کے ایک آم لے کر مقابلہ میں شریک ہوں گے۔ تاکہ ادھر شمال والوں خاص طور پر اودھ روہیل کھنڈیوں کی چیلنج سے فائدہ اٹھا کر تمغہ اور کپ لے جائیں۔ فاروقی صاحب وقتی طور پر رفع شر ضرور کرا گئے تھے مگر آغا صاحب و خاں صاحب کے دلوں میں کدورت اور غبار بستور تھا۔ یوں بھی مخالفت' دشمنی' رقابت لاگ ڈانٹ کسی نہ کسی نوعیت کی کنبہ پروری اس طبقہ کی جبلت ہے اور اس کے تحت کچھ نہ کچھ عمل اور حرکت ان کا ہابی ہے۔ کسی فروعی بات پر بیٹھے بٹھائے بگڑ بیٹھتے تو تند خو پٹھان ہوں' یا جلالی سید' بانکے چودھری ہوں یا کھرے چوہان راٹھور راجپوت ٹھاکر آپس میں بنی عمام کے درمیان ہو یا خاندان سے باہر کسی ہم چشم سے' ہاتھی مارنے کی بندوقیں لے کر آمنے سامنے آتے اور جس کا ہاتھ پہلے اٹھ جاتا مدِ مقابل کی چھاتی پر ۵۰۰ گرین والی ٹھوس گولی دے مارتا' پہلے کراہ اور پیچھے سوزش ان کا لائحہ عمل اور اصول کا تقاضا اور جب بزم میں جا کر بیٹھتے تو طور کی طرح سینے صاف شفاف ہو جاتے' معاملت میں ریشم کی طرح سرسراتے' اور حلق سے فالودہ والے شربت کے گھونٹوں کی طرح اترتے چھوٹا بڑا ہر دھارا چشمہ جھرنا ایک ندی بن کر بہتا' جیسے جڑواں بھائی' ایام رضاعت میں' خاص طور پر جب آموں کے مقابلہ کا وقت آتا تو شیر و شکر آم کے دودھیا' گاڑھے' میٹھے ملک شیک رس کی طرح ایک ہو جاتے اور اس مخصوص موسم میں تو قدرت بھی خوبصورتیوں اور رذتوں کی گوناگوں نعمتوں سے زمین کو مالا مال کر دیتی ہے' جیسے رحمت العالمین کے بدن کا سایہ براہ راست کرہ ارض پر منعکس ہوتا ہے۔ آسمانوں پر قوس و قزح ہے زمین پر زمردیں مخمل کا فرش ہوتا ہے' اور اس گرم و تر موسم میں اس طبقہ کے اندر مہمانداری' وضع داری کا جذبہ اپنی انتہائی بلندیوں پر جا پہنچتا ہے' ہاتھ جوڑ جوڑ کر تواضع کرتے ہیں' پاؤں

پر ٹوپی ڈال ڈال کر مہمانوں کو ٹھہرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ غلاموں کی طرح خدمت کے لیے پیش ہوتے ہیں۔ آم کھلاتے ہیں تواضع کا دائرہ ملک کے طول و عرض میں پھیل جاتا ہے اپنے پودوں کی لسٹ اور اخباروں کے ذریعہ اعلان کرتے ہیں کہ جو کوئی بھی ہمیں اپنا پتہ لکھ کر فرمائش کا ایک کارڈ ڈال دے گا اس کے لئے ایک پارسل بہترین آموں کا تحفہ میں ارسال کر دیا جائے گا۔ فرمائش کی اس دعوتِ عام کے علاوہ اپنے خاص خاص دوستوں، معمولی اہلکاروں سے لے کر گورنر تک شروع، درمیانی اور آخری فصل کے آموں کے پارسل تین مرتبہ ارسال کرتے اکیلے تو بیچاروں کے مہینہ جیسے چلنے سے معذور ہوتے۔ دو چار کو پکڑ کر کھانے کے لیے ساتھ بٹھا لیتے اور ایک ایک آم ہاتھ سے تراش کر قاش قاش دینے اور ردِ عمل دیکھنے میں خود کھانے سے زیادہ کھلانے میں مزہ لیتے ہیں۔ اور جب خود کھانے پر آتے ہیں تو جاگتے گھنٹوں میں چسکی ماقاش منہ کے چلتی ہی رہتی ہے بقول شخصے نتھنوں سے رس بہنے لگتا ہے۔ اونٹ کی طرح پیٹ میں رس کے لئے گویا کوئی علٰحدہ تھیلی لگ جاتی ہے اور ستم یہ کہ معمول کی غذائی مقدار بدستور رہتی ہے البتہ دودھ برف کے لیے مزید گنجائش ہو جاتی ہے اور دو چار گلاسوں کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور تمام کا تمام ایک ڈکار میں ہضم ..... پوری فصل اول اخری بغایتہ اواخر ستمبر آموں کی ترسیل اور استقبال میں گذرتی، آموں ہی آموں کا ذکر ہوتا خواب میں بھی تا حدِ نگاہ آم ہی آم دکھائی پڑتے اک ذرا کروٹ لیتے تو بستر اور تکیہ پر آم کے رس کی موٹی تہ چپ چپاتی سی محسوس ہوتی۔

اور شوق میں تو چھوٹے بڑے کی تمیز نہ تھی روہیل کھنڈ اور جنوب میں ٹنگش کا علاقہ فرخ آباد قائم گنج، مغرب اور شمال مغرب میں دہلی اور اطراف دہلی میرٹھ مظفر نگر غازی آباد وغیرہ کے باغ دار زمیندار اس کو سائڈ بزنیس کے طور پر اختیار کئے ہوئے تھے اور اس کے ذریعہ خریف ربیع کے بجائے پورے سال کے سال ان زمینداروں کے گھروں میں فارغ البالی رہتی تھی اور یہ ذرا زیادہ مہم جو طبیعت کے آم پیدا کرنے والے باغ دار زمیندار رہوتے تھے جنھیں تحقیق تلاش تخلیص طیار کرنا اور مقابلہ کے ہنگاموں میں ہار جیت فوقیت کے جذبہ سے دلچسپی ہوتی تھی اور اس کے ذریعہ یہ خوشحال بھی رہتے تھے جبکہ دوسرے زمیندار برادروں کے گھر میں ساہوکار کے قرضہ پر گذر ہوتی تھی۔ روہیل کھنڈی زمیندار اپنی روایات کے تحت جبلت میں بھی صوبہ بھر کے اور زمیندار تعلقہ دار برادروں سے مختلف تھے، ملک بھر میں کسی صوبہ کا ٹینسی ایکٹ کسی بھی نوعیت کے کاشتکار کو حتیٰ کہ قدیم موروثی کاشت اراضی پر آم کا ایک درخت نصب کرنے کا حق نہ دیتا تھا لیکن روہیل کھنڈی زمیندار اپنے ان کاشتکاروں کو جن کا رجحان اور دلچسپی درخت نصب کرنے کی جانب ہوتی تھی ان کی موروثی اراضیوں پر تحریری اجازت نامہ کے ذریعہ باغ لگانے کی مراعات دیکر آم نصب کرنے کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے اور یہاں تک کہ کبھی کبھی ایسی بھی افواہیں اڑیں کہ کسی شوقین ذہین اور تحقیق کے دیوانے اپنے کسی کاشتکار کا دریافت کیا ہوا آم چپکے سے نمائش اور مقابلہ تک میں شریک کرا دیا بعد کو بات پھوٹی تو بہت لے دے ہوئی ویسے مقابلہ میں تو نہیں مگر نمائش میں روہیل کھنڈی زمیندار اپنے موروثی دھیکار کاشتکاروں کے آم ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح لایا کرتے تھے تاہم دبی چھپی بات کی پوچھوٹ کہہ ہی رہتی تھی اور مقابلہ میں آنے والے آم کے موجد مالک کا نام سکونت پیشہ وغیرہ انتظامی بورڈ کے سامنے مکمل پیش ہوتا تھا، اور جہاں تک مقابلہ کے آئین کا تعلق تھا اس میں زمیندار کاشت کار کی کوئی قید نہ تھی لیکن شرکت کی روایت صرف زمینداروں کی تھی اور یہ ان کا ہی کھیل ہوتا تھا۔

ججوں کا پینل مہارت میں اپنی مثال آپ ہوتا، ساتھ ہی ساتھ اسم بامسمّٰی بھی ہوتا، فیصلہ کے معاملہ میں رُو رعایت، سفارش علاقائی عصبیت سے ماورا ہوتے اگرچہ سب کے سب زمیندار طبقہ کے لوگ ہوتے اور اس تدین و امتیازی کے حامل ہوتے کہ اگر کسی ادنیٰ کاشتکار کا آم مقابلہ پر آجاتا تو بڑے سے بڑے رئیس کی رو رعایت لحاظ ملاحظہ نہ کرتے انھیں تحقیق اور دریافت سے دلچسپی ہوتی اور سب علاقوں

خطوں کے زمیندار ان کو برداشت کرتے تھے اور تحقیق کے عمل کو سندِ قبولیت ملتی تھی کہ ہر آم کو شرکت کا موقع میسر آیا اور بازی جیت کر لے جانے والا زیادہ قطعی اور مضبوط سطح پر آجاتا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ ملک بھر میں خطہ اودھ اس فن میں سرخیل تھا اور سچی بات یہ ہے کہ یہ اس خطہ کا حق بھی ہوتا، کسی کسی مقابلہ میں روہیل کھنڈی بھی بازی جیت کر لے جاتے۔ اودھ کے بعد پورے ملک میں روہیل کھنڈی ہی اہل تھا بھی۔

بہرحال غم دوراں اور غم جاناں، اس ہر غم سے بے غم طبقہ کے درمیان ایک مقابلہ کے بعد دوسرے مقابلہ تک پورے پنج سالہ بھر معلاتی سازشیں متحرک رہتیں اور آم کی فصل میں تیز تر ہو جاتیں اور سالانہ نمائش کے موقع پر اگلے مقابلہ کے متعلق پیش گوئیاں قیاس آرائیاں ہونے لگتیں اور افواہیں مہمیز ہو جاتیں، جاڑوں بھر ذرا سست سی رہتیں اور بور آتے ہی پھر چل پڑتیں اور مقابلہ کا سال شروع ہوتے ہی تو موضوع جنون کی حدود کو چھو چھو آتا اور علاقائی، عصبیتیں صوبہ اضلاع اور کمشنریاں چھوڑ کر گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ شہر شہر محدود ہو جاتیں اور پھر کبھی کبھی سرحدیں ملے ہوئے باغوں کے درمیان صف آرائیاں ہو جاتیں نفسی نفسی پھیل جاتی۔ سل کے گرد چٹنی سے مستی جوار باجرے کی روٹی کھانے والوں سے لے کر دیوان خانوں کوٹھیوں حویلیوں میں فرمہ، شیر مال بہ یانی مرغ مغز ہضم کرنے کا واحد ذریعہ ہوا کرتیں اور تیور سال تو یہ اتنی بڑھیں کہ اودھ اور روہیل کھنڈ کی علاقائی چپقلش کی شکل اختیار کر گئی اور دونوں کمشنریوں کے باغ داروں کے درمیان مجادلہ اور صف آرائی کی نوبت آگئی اور امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا، فساد، مداخلت، لوٹ مار سنگین جرائم کی نوبت پہنچ گئی اور علاقائی جتھہ بندی کی شکل بننے لگی۔ ہاتھی کی ہاتھی سے اس ٹکر کے بیچ بچاؤ میں دونوں کمشنریوں کے کمشنر اور متعلقہ اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں نے درمیان میں پڑ کر بات بڑھنے نہ دی اور ایک ہمسایہ سرحدی ضلع کے اعلیٰ تعلیم یافتہ جواں سال وجواں فکر اعلیٰ تعلیم یافتہ زمیندار کو درمیان میں ڈالا جو اپنی اچھی شہرت، تدین اور راست فکری کے اعتبار سے ہر دو فریقین کو قابل قبول غیر متنازعہ شخصیت تھے۔

مسٹر خاروقی نے ایڈمنسٹریشن کی تحریک اور ذاتی اثر و رسوخ سے درمیان میں پڑ کر حکمتِ عملی سے خوبصورتی کے ساتھ معاملہ بکسو کرا دیا، فساد فوجداری مقدمہ بازی تو ٹل گئی مگر ٹھنڈی جنگ کی ریشہ دوانیاں چل پڑیں اور ٹھنڈی جنگ یوں بھی اس طبقہ کو بڑی خوش آئند ہے اور یہ بات بھی ہے کہ میدانِ کارزار سے زیادہ سنگین ہوتی ہے مگر دیوان خانہ کی سازشیں اور جاسوسیاں اس عمل کی روحِ رواں ہوتی ہیں اور اب ہر دو فریقین کو اس راز کا سراغ لگانا سب سے اہم اور بنیادی شغل تھی کہ مخالف گروہ کون سا آم مقابلہ میں لا رہا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، جس کے مطابق ہم اپنا آم مقابلہ میں لائیں اور اسی جذبہ کے تحت تاریخی، گروہی، علاقائی نوع بہ نوع عصبیتیں ایک دھار ہو کر بہنے لگتیں اور ایسی دو دھاریں آمنے سامنے سے ایک دوسری کی جانب متحارب تیور دل سے بڑھتی محسوس ہوتی، جیسے ٹکرا کر سب کا سب شیرازہ منتشر ہونے والا ہے اور ستم یہ کہ اس معاملہ میں جانبین کے اندر ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سوچ ایک تھی اور جیسے یہ دو سوچوں کی ٹکر تھی۔ جانبین میں۔ دوستوں ندیموں سے تو مشورے ہو ہی رہے تھے، جن افراد سے پرانی رنجشیں چلی آرہی تھیں آج اس معاملہ میں وہ بھی بھول کر گلے آملے تھے اور رنجشیں شیر و شکر ہو رہی تھیں۔ اودھ کے تعلقہ داروں میں تو بات بہت کچھ اپنی ہی سطح اور طبقہ کے اندر رہی مگر روہیل کھنڈ کے زمیندار اور وزارتِ تعلیم کا اشتکار علاقائی خلش کی یکساں ٹیس اپنے اپنے کلیجہ کے اندر فرداً فرداً محسوس کر رہے تھے اور تمام میں داخلی خلفشار ایک رفتار تھا اور علی القدرِ مراتب رابطہ بھی تھا، جو تقریباً تمام تر معمولاتِ زندگی میں اس علاقہ کے اندر پایا جاتا تھا، سراغ رسی جاسوسی کے ذریعہ خبریں ادھر اُدھر ہوتیں اور بڑی اہمیت کے ساتھ زیرِ غور آتیں اور موضوعِ بحث بنتیں، دیوان خانوں کی نشستیں ہوں یا الاؤ کے گرد چوپالوں کی بیٹھکیں خمیرہ تمباکو کا پیچوان سے نکلتا ہوا خوشبودار

بغارہ ہو یا دیسی خانہ ساز تلخ تمباکو کی بھری چلموں کے دم سے پیہم چھوٹتا ہوا دھواں ہو بات ایک ہی ہوتی اور موضوع یہی ہوتا۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی اور دن ڈھلے سے آدھی رات کھس جاتی اپنا اپنا لہجہ ضرور مختلف سا ہوتا لیکن زبان اور موضوع یہی ایک ہوا کرتا۔ دونوں ہی اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق آج بیسویں صدی کے چھ سات پنج سالوں سے الٹی قلابازی کھاتے اٹھارھویں صدی کے تلخ تاریخی دور میں جا پڑا کرتے اور روہیل کھنڈ کے خطہ کے ساتوں اضلاع کے اندر بات آخری روہیلہ جنگ کے تاریخی المیہ کے گرد پینترا کاٹتی جس کی سند دیہات کے اندر تلخ لوک گیتوں میں آج تک برہا کے موڑ مل چلی آتی ہے اور اچھل اچھل کر تاریخی میزان کی تلخی پر آ لگتی۔ میٹھے میٹھے خوشبودار پرکیف آموں کا ذکر تلخ ہو کر ختم ہوتا۔ حافظ رحمت خاں شہید اور پنجاب کے سکھ غارت گروں، دہلی تخت پر برائے نام مغل شہنشاہ کی آڑ سے قابض چوتھ کے نام سے استحصال کرنے والے لٹیرے مرہٹے اور ان کی بساط کے مہرے نواب بنگش کے مقابلہ پر جہاد کا فتویٰ زیر بحث آتا، غازی غلام قادر روہیلہ کو لال قلعہ کی نظر بندی کے دوران سیاسی مصالح کی بنا پر شاہ عالم کے حکم سے خواجہ سرا کرانے کے عمل جراحی سے مظلوم بنا کر نامرد کیا جانا اور پھر جواب آں غزل میں برسر اقتدار آنے پر غلام قادر روہیلہ کا دہلی پر چڑھائی کر کے خواجہ سرا کرانے کے عمل جراحی کے انتقام میں شاہ عالم کی آنکھیں اپنے خنجر سے پھوڑنا، شاہی بیگمات کی کسبیوں کی طرح برتاؤ کر کے رقص کا حکم دینا، کبھی کچھ غیب شپ میں آتا اور چوپالوں سے دیوان خانوں بیٹھکوں تک یکساں موضوع دلچسپی ہوتا۔ جوں جوں نمائش قریب آتی جاتی یہ حدت جذبات شدت پذیر ہوتی جاتی اور آم کی فصل کے بھرا بھر گرم تر موسم میں تو عام دیوانگی جیسی شکل اختیار کر لیتی گویا فرد فرد اس کو اپنا ذاتی مسئلہ تصور کرنے لگتا۔ ہر دو شمالے روہیل کھنڈیے اور ادھے بڑے تو بڑے چھوٹے سبحان اللہ سب کے سب بڑے تیز واقع ہوئے تھے اور روہیل کھنڈئے تو اودھیوں کو حقارت کے ساتھ پوربئے کہا کرتے تھے اور وہ انھیں کھپٹیں کہا کرتے تھے گویا دونوں میں بعد المشرقین سے بھی زیادہ بالمقابل بُعد تھا اور آمنے سامنے متحارب تھے، ایک دوسرے کے رسم و رواج بولی اور لباس تمام تر طرز معاشرت حتیٰ کہ شعر و ادب کے رنگ پر بھی معترض تھے، تاہم آموں کی تحقیق ایجاد کے معاملہ میں صریحاً اودھ کو فوقیت حاصل تھی، مگر اقسام اوصاف کے معاملہ میں اختلاف تھا، روہیل کھنڈی کہتے تھے کہ آم صرف پال کا کھانا چاہیے جبکہ اودھ والے کہتے تھے کہ روہیل کھنڈی آم کو سڑا کر کھاتے ہیں۔ بد ذوقے ہیں۔

لیکن جب اڑتی اڑتی کوئی افواہ جنوبی ہند مرشد آباد دربھنگہ، حیدر آباد احاطہ مدراس وغیرہ کسی خطہ کے آم کی شہرت کی مقابلہ میں آنے کی پہنچا کرتی تو یہ شمالی اودھ روہیل کھنڈ حتیٰ کہ مقامات دہلی میرٹھ مظفر نگر اور ادھر فرخ آباد تک کے تمام بالائی شمالی ہند کے خطوں کے باغ دار ایک گٹ ہو جاتے، اور آپس میں کھلی کتاب ہو کر مشورہ کیا کرتے اور سب مل کر ایک آم مقابلہ پہ لا کر اکثر فتح حاصل کرتے اور سورج کا دھارا ایک ہو جاتا۔

فصل میں دیہات قصبات کے اندر ہر نوعیت کا آم یکساں فراوانی کے اندر ہر ایک کو میسر آتا، غریبوں کے وقت کٹنے کا سہارا ہوتا خواہ روٹی ملے یا نہ ملے فصلی آم ضرور پیٹ میں اور پیٹ بھر کر پہنچا کرتا اور نیت کم بخت تو کبھی بھرتی ہی نہیں مگر پیٹ اس نعمت بہشتی سے ہر وقت بھرا رہتا، قیمت تو کہیں بڑے بڑے شہروں کے بازاروں منڈیوں میں سنائی پڑتی ہوگی دیہات میں آم مول نہیں ملا کرتا، بس صبح سے شام تک دھوپ اور تازہ ہوا کے بھاؤ پہ ہوتا ہے۔ جا گئے گھنٹوں میں ہر ایک کا منہ متحرک اور چسکی چلتی ہی رہتی ہے اور پیٹ کی چکی گھمر گھمر کرتی رہتی ہے تمام دن ہلکا ہلکا عجیب سا سرور رہتا ہے، ایسا نادر کہ جس میں چسکی کے ردعمل میں چستی بر روئے کار رہتی ہے البتہ رات کو گہری اور شیریں شربتی

آم کے رس جیسی میٹھی نیند آتی ہے۔ اور یہ مسلسل سرور اور گہری نیند تغذیہ کی پیہم کارفرمائی ہوتی ہے اور صرف باغ کے مالکوں کا مقدر نہیں ہوتی نہ باغ کے محافظ رکھوالوں ہی کی تقدیر کا نوشتہ ہوتی ہے یہ تو صلائے عام ہوتی ہے خواہ یارانِ نکتہ داں ہوں یا نہ ہوں، مگر کھانے والے ہوں۔ رات کو اکثر آخری حصہ میں والقہ شامہ اور باصرہ کا ردِ عمل تصور کی فسوں کاری بن کر بروئے کار آتا ہے، محافظ ہوں یا مالک شاید اس وقت جب پیٹ میں سے آم کا رس اک ذرا کھسک جاتا ہوگا تو شعور کی گہرائیوں سے آواز سی اٹھتی ہے، آم کھاؤں گا! آم کھاؤں گا!" اور کچھ نیم خواب نیم بیداری جیسے عالم میں بستر سے ترنگ لگا کر باغ کے اندر جا کھڑے ہوتے ہیں اور ساون بھادوں کی اماوس میں بجلی کے کوندے کے سہارے درختوں کے نیچے سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر آم بھاڑنے چوسنے لگتے ہیں اور لہراتی نیشلی پروائی میں لہراتے مست ناگ بھی ان کی آہٹ سے بھاگ جاتے ہیں آم کی طلب شدت میں وہ ان کا خوف نہیں کرتے یہ ان سے ڈر جاتے ہیں۔

قصبات دیہات میں آم کھانے کا ریکارڈ قائم کرنے والے مخصوص کھانے والے مشہور ہوا کرتے ہیں اور نمائش کے موقع پر اچھی بھری فصل کے سالوں میں کبھی کبھی ان کی بھی ٹھن جاتی ہے۔ ہار جیت کا فیصلہ گٹھلی چھلکے کے سامنے والے ڈھیر اور داڑھی ناپ سے ہوا کرتا ہے۔ سات داڑھی ناپ تک آخری ریکارڈ اور چمپئن شپ اعزاز کے مخصوص کھانے والے مشہور ہوتے تھے۔ پتلے رس کے چاشنی و آرام چوستے چوستے گٹھلی چھلکے کا ڈھیر سامنے ٹھنڈی تک پہنچ جاتا تو ایک داڑھی ناپ ہوتا اور اکڑوں بیٹھا ہوا کھانے والا اک گز ڈیڑھ گز برابر کو کھسک کر دوسری داڑھی شروع کر دیتا اس طرح مدِمقابل کھانے والے کے سامنے چوس چوس کر ڈھیر کرتے جاتے اور سرکتے جاتے۔ اس کا ریکارڈ سات داڑھی ناپ تک تھا۔

دوسرا مقابلہ کا طریقہ اس سے زیادہ واضح ہوتا یہ بالعموم گاڑے رس والے انتہائی میٹھے تراش کر کھانے والے آموں کے زیادہ کھائے جانے پر ہوا کرتا اور سامنے کی گٹھلیاں گنی جاتیں اور ہار جیت کا فیصلہ ہوتا۔ نمائش کے لیے بالعموم اودھ کے اضلاع میں جہاں باغ بکثرت ہوں کسی اندرون دیہات قصبہ میں جگہ منتخب ہوتی اور خواص و عوام سبھی اس تقریباً پانچ چھ ہفتہ کی مدت کو جس میں آم زیادہ اور ہر جگہ پھلتا نوروز کے ایرانی لقب سے پکارا کرتے یہ ہفتے ہندی مہینوں کے حساب سے موسم کے مطابق اوائل جون لغایت اواخر اگست کسی بھی وقت پر آموں کے پکنے کے مطابق آ سکتے تھے۔

پنج سالہ مقابلہ میں تو عسکری اہمیت کا سماں بندھ جاتا۔ مقامی اضلاع کے ہفت روزہ اخباروں میں اشتہار دے دے کر بانکپن کے ساتھ اعلان کیا جاتا کہ "ہم گٹھلی فروشی عار سمجھتے ہیں، ہمارے یہاں ایک لاکھ درخت لدے ہوئے تیار ہیں، جو صاحب بھی دو پیسہ کا ایک فرمائش کا کارڈ پوسٹ کر دیں گے انھیں ایک پارسل آموں کا تحفہ ارسال کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پودے کا اشتہار ہوتا۔ اور یہ آغا حق نواز خاں کی اپج تھی، وہ بنیادی طور پر تاجر تھے اور پشتینی باغ دار زمیندار ہوتے ہوئے بھی سودا کرنے کا گر اور پبلسٹی کا ماڈرن طریقہ جانتے تھے۔ کسی درخت کے پھل مفت کھلا کر اس کا پودا فروخت کرنا کس قدر تاجرانہ عمل اور فروخت کرنے کا کتنا کامیاب طریقہ ہے کہ اس کی لذت سے آشنا کیا جائے۔

اودھ کے سرحدی ضلع روہیل کھنڈ ڈویژن کے اندر آغا صاحب کا "لکھورا" لکھ پیڑا باغ تھا (ایک لاکھ درختوں والا) ادھر اسی سرحد پر خاں صاحب کا ایسا ہی طویل و عریض لکھ پیڑا تھا اور دونوں ہی دنیا بھر کو مفت آم کھلا کھلا کر خاص خاص لوگوں کو پودوں کا نمونہ بھیج بھیج کر تاجرانہ پبلسٹی کیا کرتے۔ نمائش کا ایک منظم نوعیت کا بورڈ تھا جو آموں کے متعلق کھیل قسم کے مذکورہ مقابلہ کے فنکشن کراتا، اپیلیں سنتا،

اول دوم سوم اور چہارم کے سرٹیفکیٹ جاری کرتا اور انھیں سالانہ نمائشوں کے ذریعہ پنج سالہ مقابلہ کی فضا بنتی اور دوسرا زیادہ مضبوط اور وقیع بورڈ ماہر ججوں پر مشتمل قطعی اور آخری فیصلہ دینے والا پنج سالہ مقابلہ کا تھا روایت کے مطابق اس بورڈ کا فیصلہ قطعی حتمی نہ تھا۔ یہ لوگ کتنے ہی آزاد منش اور بولنے میں کتنے ہی بے لگام اور عمل میں کتنے ہی سرکش کیوں نہ ہوں مگر ججوں کے بورڈ کے فیصلہ کو خون کا سا گھونٹ پی کر بے چون وچرا قبول کرنا پڑتا۔ جتھ بندی کی مکسانی ذہنیت کے مطابق آغا صاحب اور خاں صاحب دونوں کے منظم نوعیت کے متحارب سے گروپ تھے جن میں اودھ اور روہیل کھنڈ کے بعض چھوٹے چھوٹے اور کچھ ذی حیثیت باغ دار نرسری میں شامل تھے۔ اب کی مرتبہ آغا صاحب کی تیاریوں کی شہرت سن سن کر اودھ والے بجائے جوش میں آنے کے ڈر رہے تھے اور یہ پارٹی دن رات اس پر چول میں تھی کہ کسی طرح آغا صاحب کا مقابلہ میں آنے والا آم معلوم ہو جائے، ادھر آغا صاحب کی پارٹی اس مرتبہ اودھ کی دو تین پنج سالوں کے مقابلہ کی اجارہ داری توڑنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھی جوں جوں مقابلہ کا وقت قریب آتا گیا طرفین کے جذبات شدت سے حدت پذیر ہوتے گئے، آغا صاحب ویسے تو ناجر بارد مزاج ایرانی نسل تھے مگر جب جلال میں بھر کر بگڑتے تو بڑوں سے نہ بٹور ملتے لیکن ایسا پشتہا پشت ہی میں کبھی ہوا کرتا ویسے تو جمال ہی جمال تھے، سوداگر بچہ — رہے خاں صاحب وہ تو ویسے بنی اسرائیل کے بارہویں بھٹکے ہوئے قافلہ سے مناسبت رکھتے تھے، افغان بچہ بامثل مشہور ہے پٹھان کا پوت گھڑی میں اولا گھڑی میں بھوت' ذرا سی دیر میں اپنی اصل پر پلٹ پڑتے۔ آغا صاحب کا دعویٰ تھا کہ ان کی چودھویں یا اکیسویں نہ معلوم کون سی پشت میں ان کے مورثوں کو شہنشاہ ہمایوں اپنے ساتھ لائے تھے ہندوستان پر دوبارہ تسلط حاصل کر کے انھیں ولایت سے درآمد برآمد کا محصول معاف تجارتی پروانہ عطا کیا تھا جو حافظ الملک حضرت حافظ رحمت خاں روہیلہ کے وقت تک جاری و ساری رہا اور وہ قلمرو روہیل کھنڈ کو فوجی گھوڑے اور رولائتی پھل فراہم کرتے رہے اور پھر یہ باغ والی جاگیر حافظ الملک ہی کا نان کا عطیہ ہے اور وہ آج تک مالیہ معاف روہیلوں کے نمک خوار ہیں مگر یہ ان کی خوابیدہ تاریخ تھی اور روہیلوں کے درمیان پشتوں کی بود و باش میں مزاجاً روہیلہ ہی جیسے ہو کر رہ گئے تھے اور نفع نقصان کا میزان وہی بارھویں بھٹکے ہوئے قافلہ والا لگتا۔ اور برسات کی رات تو بڑے ڈھب کی ہوتی ہے اور یہ تو غضب کی تھی اور اقدام کو پکار پکار کر دعوت دے رہی تھی، آخر ماہ جیٹھ اور شروع اساڑھ کی بھیانک راتیں، جب اس خطہ کے اندر فضا میں مانسون ڈیرہ تو جما لیتی ہے مگر بارش کی نوبت نہ آتی ہوتی، آسمان پر کالے بادل شامیانہ کئے ہوتے ہیں، زمین تا حدِ نگاہ خالی پڑی ہوتی ہے اور بادلوں کے سیاہ عکس سے کالی کالی ہوتی ہے، راتوں میں فضا بسیط غیر محسوس سیاہی سے بھری ہوتی ہے، کھیتوں میں کام شروع نہیں ہوا ہوتا مہیب سناٹے پر بحرِ ظلمات کا گمان ہوتا ہے۔ خاں صاحب کو آغا صاحب کے باغ کے ملازموں مزدوروں کے ساز باز سے مقابلہ میں آنے والے درختوں کی تلموں کی جاوقوع معلوم ہو گئی۔ اپنے چند دل چلے جوان اندھیری رات میں بھیج دیے، جو سر ہتھیلی پر رکھ کر آغا صاحب کے باغ میں داخل ہوئے یہ باغ اودھ اور روہیل کھنڈ ڈوئیوں کی سرحد پر نصب تھا اور اس کا مشرقی منڈھا اودھ کی بالکل سرحد سے ملا ہوا تھا۔ محافظوں چوکیداروں کو آدھی رات کی نیند کا نشہ دن بھر کے گرے ہوئے سیپ آموں کے گرم گرم رس کا نشہ، برسات کی پہلی پروائی کی لہروں کا سرور اور شاید آقا کے اقبال اور اپنی طاقت کا نشہ بے سدھ پڑے سوتے رہے اور تو اور دیسی نسل کے نمک حلال برق مزاج کتے جو ایک روٹی کے ٹکڑے اور چھچھڑوں کے لالچ پر عمر کاٹ جاتے ہیں آج کی رات ان کم بخت نمک حلال نسلی کو بھی سانپ سونگھ گیا۔ جیسے باغ کی فضا پر جادو کر دیا ہو۔ ستم یہ کہ کہیں دن چڑھے قصبہ سے آغا صاحب

آئے اور حسب معمول معائنہ کے لیے پہنچے تو بجلا کر جا پڑے۔ اوس سے ڈھکی گھاس پر کھوج لئے تو سراغ ملا کہ خاں صاحب کے آدمیوں کی حرکت ہے۔ پوری سازش سمجھ میں آگئی بڑا تاؤ آیا۔ غصہ میں ارادہ کیا کہ نہلے پر دہلا، ابھی حالی والی جاں نثار جمع کر کے لام بندی کر دیں اور انھیں اوس کے نقش قدم پر چڑھ دوڑیں، مگر مخالفت اور ٹکراؤ کا اندیشہ تھا۔ پارسی نسل تاجرزادہ کا دامن عقل نے تھاما اگر نسلی سانوت ہوتا تو یہی کرتا۔ مگر انہوں نے نفع نقصان کا میزان نتیجہ میں لگایا۔ چھوٹے بڑے حالیوں موالیوں اور اس ڈھب کے جاں نثاروں کی محفل شوریٰ جمع کی۔ یہ سب کے سب روہیلے تھے۔ حافظ الملک کی شہادت کا ڈیڑھ صدی پرانا ٹھنڈا ناسور بھڑک کر رسنے لگا۔ شجاع الدولہ اور وارن ہسٹنگز کا لگایا ہوا زخم دہک اٹھا۔ روہیلوں کے تاریخی ساتھی اور شکری ٹھاکر راجپوت چوہان راٹھور مقابلہ کے لیے پھر جمع ہو گئے جو آج تک اپنے گھروں میں حافظ رحمت خاں کی مورتی رکھ کر دسہرہ پر پوجا کیا کرتے تھے آغا صاحب تو پس پشت جا پڑے، بات روہیلوں اور پوربیوں کے درمیان جتھہ بندی بن گئی اور اسی جذبہ کا پرتو معلوم ہونے لگا جیسے بنگش کے پٹھانوں، مرہٹوں سکھوں پر چڑھ دوڑا کرتے تھے اور غازی غلام قادر روہیلہ نے بارہ برس بعد اپنے خواجہ سرا کا انتقام لال قلعہ پر چڑھ کر شاہ عالم کی آنکھیں نکال کر لیا تھا، بلاشان گمان آغا صاحب کا روہیل کھنڈی جتھہ دن دہاڑے اس باغ پر چڑھ دوڑا جہاں شب خون کا مغزوقہ مال دہ پودے رکھے تھے۔ خیریت ہی گذری خاں صاحب کو پہلے سے پتہ نہ چلا، ورنہ کڑا مقابلہ ہوتا۔ باغ کے محافظوں نے الٹا سیدھا مقابلہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مال مسروقہ پہچان کر اٹھا لیا۔ اس گھمسان میں مار پیٹ تو یوں ہی واجبی واجبی ہوئی مگر خاں صاحب کی نمہ سری تاراج ہو گئی اور بڑے درختوں کو نقصان پہنچا کچا پھل بہت ضائع ہو گیا اور آغا صاحب کے روہیلے راجپوت تہس نہس کر کے اپنے پودے واپس لے کر خراماں خراماں واپس آگئے۔ خان صاحب کو خبر پہنچی تو اپنی بڑی ہتک محسوس کی اور جواب الجواب حملہ کی تیاری بڑی تیزی کے ساتھ کرنی شروع کر دی اور تاریخ الٹی قلابازیاں کھاتی پچھلی سے پچھلی صدیوں میں جاتی نظر آئی۔ مقامی تھانوں کی پولیس تو ایسے قضیوں میں پڑتی نہیں ہے جہاں ہاتھی کی ہاتھی سے ٹکر ہوتی ہے لیکن دونوں طرف کے کچھ صلح پسند چھوٹے زمینداروں نے اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کو مطلع کیا، جتنا کچھ ہو چکا تھا قانون فوجداری کی رو سے وہی بہت کافی تھا۔ بات کمشنروں تک پہنچی کہ اندیشہ سخت نقص امن کا ہے۔

دونوں جتھے قانون ہاتھ میں لے کر لاٹھی گولی کے قانون کا مظاہرہ کریں گے۔ دونوں ذی حیثیت بڑے زمیندار ہیں، ہمیشہ کے خاندانی جتھہ بند ہیں، طبیعت کے بانکے اور عدالت دیوانی سے رجوع کرنا اور نالش دائر کرنا اپنی توہین خیال کرنے والے لوگ ہیں بلکہ لفظ نالش کے لغوی و معنوی پہلو کو اپنی ہتک سمجھنے والے بانکے زمیندار ہیں۔ محکمہ مال والے صرف قبضہ دیکھکر اندراج کر دیتے ہیں اور حق ملکیت کا فیصلہ تو کہیں ہائی کورٹ پر اپیوی کونسل سے ہوتا ہے اور کہیں دوسری تیسری پشت میں ہو پاتا ہے۔ اندیشہ بلوہ فساد کا تھا، لکھنؤ اور روہیلکھنڈ دونوں ڈویژنوں کے کمشنروں اور متعلقہ اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں نے صورتحال کی نزاکت کے مطابق مداخلت کی۔ فریقین کو طلب کیا اور زور ڈال کر معاملہ فیصلہ ثالثی کے طے کرنے پر اصرار کیا اور ثالث ایسا تجویز کیا کہ دونوں نے نام سنتے ہی اس کے فیصلہ ثالثی پر رضامندی دے دی اور یہ تھے مسٹر فاروقی روہیل کھنڈ ڈویژن کے ایک چھوٹے سے شہر کے معمولی حیثیت کے مضافاتی زمیندار۔ ہندوستان اور یورپ کی ایگری کلچر یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اب اپنی زرعی اراضی پر قابض و حاضر نیم ماشینی فارمنگ کرنے والے کلاک (CULLIK) پریکٹیکل ایگری کلچرسٹ اور آم کی کاشت، باغبانی میں ماہر خاص آم کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جو تھیسس کا درجہ رکھتی تھی اس کا اردو ترجمہ کیا جس سے تمام ہندوستان کے زمیندار

اور نرسری مینوں نے استفادہ کیا اس کو "رموزِ باغبانی" کا اُردو نام دیا اور یہی ان کی شہرت کا ذریعہ بنی اور ساکھ یوں بنی کہ دسیوں نئے آموں کے موجد تھے مگر کبھی مقابلہ تو درکنار نمائش میں بھی ایک آم نہ لائے البتہ اخباروں میں کبھی کبھی اپنی دریافت کی ہوئی کسی نئی قلم کا اعلان کر دیتے۔ ملک کے واحد زرعی رسالہ "مفید المزارعین" کے تبصرہ والے صفحہ میں کسی ماہر ایگری کلچرسٹ، ہائی کلچرسٹ کا تبصرہ چھپوا دیتے لہٰذا زمینداروں، باغ داروں اور نرسری مینوں میں لیڈر قسم کی پوزیشن تھی اسی حیثیت سے کئی گنا بڑے زمینداروں سے زیادہ مالدار اور آمدنی والے کما کر کھانے والے زمیندار تھے جو اس طبقہ میں استثنیٰ ہوتا ہے مسٹر فاروقی کو کہ جواں سال تھے مگر ملک بھر کے بوڑھے بوڑھے زمینداروں میں برابر کا درجہ تھا۔ جب تصفیہ کرا دیا تو فریقین اور دوسرے بزرگ لوگوں سے آنے والی نمائش اور معاملہ میں اپنا پھل بھیجنے پر اصرار کیا انہوں نے نمائش مقابلہ کی چقلش میں پڑنے سے معافی چاہی تو ججوں کی بورڈ میں شامل ہونے کی پیشکش کی مگر جب انہوں نے اس سے بھی معافی چاہی تو ججوں کے بورڈ کے چیئرمین اور نمائش کے مہتممین نے اگلے مقابلہ اور نمائش کا انتظام سنبھال کر اس کو زیادہ مناسب اور صحیح طور پر انجام دینے پر راضی کر لیا اور وہ اس شرط پر تیار ہو گئے کہ وہ نوروزانہ اور نمائش مقابلہ کے انعقاد کا انتظام اور جگہ کا انتخاب اپنی صوابدید پر کریں گے اور یہ انہوں نے اس سرحدی جگہ پر کیا جو دونوں کمشنریوں کا خطِ اتصال تھا۔

یوں تو سیدھے سادے آبائی ملکیت والے زمیندار تھے مگر باوجود معمولی حیثیت کی زرعی اراضی کے مالک ہونے کے خوشحال فارغ البال، پھر نہ شعر کہتے تھے نہ برش ہی چلانا جانتے تھے مگر دہی خلقی طور پر باذوق پرلے درجے کے واقع ہوئے تھے، اعلیٰ تعلیم کی نائین آرٹ کی برکتوں کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ان کا جمالیاتی ذوق سرخہ آموں کی اعلیٰ اقسام کی دریافت اور پروان چڑھا کر رنگین، خوشبودار شیریں پھل لینے سے تسکین پاتا اور یہ ان کا ہابی تھا ان کے ہر باغ میں ان کا نصب کردہ ایک معقول رقبہ کا قطعہ سرخوں کا تھا، کسی جگہ بھی ہو ان کی نگاہ ہر سرخہ آم پر پڑتی اور وہ اس کے متعلق تحقیق دریافت میں مشغول ہو جاتے، صرف اول یا کم کم صرف دوم کے ہی معیار پر کوئی سرخہ آم پورا اترتا تو ہابی کا جذبہ بروئے کار آجاتا۔ اصلی نخی درخت پر ان کی نگاہِ نکتہ بین قلم لگانے کے لیے پسندیدہ شاخیں انتخاب کر لیتی، بالعموم شوق کے ساتھ سرخہ آم کی قلم بندی خود اپنے ہاتھ سے کیا کرتے اور ان کے ہاتھ کی بندھی قلم تو سو فی صدی بہترین چپکا کرتی اور لطف یہ کہ اوروں کی باندھی چالیس دن میں چپک پاتی فاروقی صاحب کی باندھی مہینہ بھر سے بھی کم میں لگ لگا کر تیار ہو جاتی، اور یہی مقدران کا دو علیحدہ دلوں اور گروہوں کے درمیان میل کرانے میں بھی تھا۔ سرخہ آم اپنے ہاتھ سے نصب کرنے اور نوکروں مالیوں مالیوں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے داشت پرداخت کرتے شاخ کا انتخاب اور پھر مخصوص نگہداشت ان کے سرخہ آم کے درخت پانچ سال کے اندر پروان چڑھ کر پھل پایا کرتے۔

اس وقت نمائش اور پھر اگلے سال مقابلہ کے جشن نوروز کے میلہ کا انتظام و انعقاد انہوں نے مجلس عاملہ، مقابلہ کے ججوں اور ہر دو کمشنریوں کے ایڈمنسٹریشن کے باہمی اصرار پر قبول کیا اور کئی شرطیں لگائی تھیں جن میں اہم اور بالکل نئی یہ تھی کہ اس سال کی نمائش اور پھر مقابلہ کی جا وقوعہ جو ہمیشہ اودھ کے اندر کہیں ہوا کرتی تھی ہٹا کر روہیل کھنڈ اور اودھ دونوں کمشنریوں کے عین سرحد کے خطِ اتصال پر رکھی تھی۔ کیونکہ پچھلے ذرا سنگین "تنازعہ کی جا وقوع ہی تھی اور یہاں پر دونوں طاقتیں کانٹے میں تُل جاتی تھیں۔ اور ابھی صدی ڈیڑھ صدی قبل اس خطہ کی قسمت اور ملک کی تاریخ پلٹنے والی آخری روہیلہ جنگ بھی یہیں لڑی گئی تھی۔ اور سنتے چلے آئے تھے کہ کوروں پانڈوں کا دیوالائی

معرکہ بھی یہیں ہوا تھا جس میں کرشن جی اپنے رتھ پر بندرابن سے سوا سو کوس بڑھ کر آئے تھے اور پانڈوں کا کوروں سے مقابلہ ہیں پانڈوں کی رتھ بانی رہنمائی کی تھی اور اب تک بیسویں صدی کے اول ربع بیت جانے کے بعد بھی یہ ماورا التاریخی سے قدیم جنگل جیسے آم کے باغوں کا لامتناہی مہیب غیر دریافت سا سلسلہ تھا، جو ایسا نظر آتا تھا کہ صدیوں کی حکومتوں کے محکمہ پیمائش کے جریب گٹھے نیتے کھینچنے والے عمال مال کے پاؤں کے تلوے چھونے سے بھی آج تک بے نیاز تھا۔ البتہ آج برطانوی دور کی پیمائش کے بموجب کسی نہ کسی زمیندار کی ملکیت اس لق و دق جنگلی سلسلہ پر بحیثیت باغ دار محکمہ مال کے کاغذات میں اندراج چلی آتی تھی جس کے قبضہ یا ملکیت سے اس کو نہ کوئی استفادہ تھا نہ اس کاغذی اندراج کی پرواہی تھی اور اس ناقابلِ گداز اور حقِ ملکیت کی حدبندی کرانے کی کسی مالک قابض کو کبھی ضرورت ہی پیش آئی تھی۔ بلکہ جاننے سے بھی بے نیاز تھے۔ پچھلی مرتبہ فاروقی صاحب جب دونوں باغ دار رؤسا کا تصفیہ کرانے آئے تھے تو اس ماحول کو اپنی ذہانت کے زور سے اچھی طرح سمجھ کر گئے تھے۔ اس مرتبہ جو آئے سارنتی مزاج تواضع کے مطابق متعلقہ و غیر متعلقہ فریقین کے علاوہ اور سب نے اپنے یہاں قیام کی پیشکش کی اور اصرار کیا مگر سب سے معذرت کر کے فاروقی صاحب اپنے قیام کے لیے اسی جنگل کی حدود کے اندر کہیں پر ایک قدیم ڈاک بنگلہ پسند کیا جو انگریزوں سے اپنی نقل و حمل کی سہولت کے لئے انیسویں صدی کے اوّل ربع میں ملک کے اندر جگہ جگہ تعمیر کرنے تھے یہ ویران سا ڈاک بنگلہ جا قیام ان قلمی باغوں کے قریب ہی جنگل کے کنارے حدود میں واقع تھی۔ ایک سمت لامتناہی غیر دریافت سی مہیب تخمی آم کے جنگل جیسی پھیلی ہوئی غیر دریافت نامعلوم سی وسعتیں چلی گئی تھیں اور دوسری جانب قلمی باغ ہی باغ تھے۔ وہ آموں کے جنگل نما سلسلہ میں واقع اس ڈاک بنگلہ سے علی الصبح کبھی قلمی باغوں کی جانب سیر کرتے ہوئے اکیلے چل پڑتے اور کبھی کبھی کافی دور تک جنگل میں بھی ٹہلتے ہوئے نکل جاتے اور یہ صبح کی سیریں تو معمول تھی مگر یہاں بھی افتادِ طبع کے تحت کسی نادر سرخ آم کی دریافت تحقیق تلاش کی دھن ہوا کرتی۔ جو اس گودڑی کے اندر لعل کہیں چھپا ہوا ہو اور وہ قلم لگا کر ایک نیا سرخہ اور پروان چڑھا لیں۔

ایک صبح انھیں اندازہ ہوا کہ وہ جنگل کے سلسلہ میں نہیں، بلکہ شاید قلمی باغوں کے حدود میں ہیں۔ ذرا ٹھٹکے اور ایک عجیب سے غیر دریافت خفیہ سے مقام پر جا کھڑے ہوئے۔ عجیب کسی مخلوق کا مسکن، جو ندہ یا بندہ اور یہ خاں صاحب اور یہ آغا صاحب کے مملوکہ جنگلی باغوں کے سلسلہ کا خطِ اتصال تھا جن کے درمیان ایک لمبی پٹی دور تک شاداب چلی گئی تھی، سرخ ہی سرخ — ادھر آغا صاحب تخمی باغ کے مملوکہ جنگل جیسے قطعہ کی سرحد تھی ادھر خان صاحب کے مملوکہ کی سرحد لطف یہ کہ دونوں قطعے نہ صرف دونوں کمشنریوں کے دو مختلف ضلعوں ہی میں واقع تھے بلکہ دو متحارب فریقین کی ملکیت میں بھی تھے۔ پٹی کے درمیان نگاہ ڈالی تو دنیا سرخ ہی سرخ اور بیچوں بیچ ایک کٹیا سی تھی جو گلاب کی بیل سے ڈھکی ہوئی تھی اور پٹی کے چاروں طرف گلاب کی باڑھ تھی، جس پر پھول کچھ غیر معمولی زیادہ ہی لگے ہوئے تھے اور کٹیا کے کونوں پر گلاب کی اونچی سے اونچی جھاڑی سے کچھ زیادہ ہی بلند جھاڑیاں سی جیسے گلاب کے بہت بڑے پھولوں سے اٹی لدی ہوئی تھیں کہ کہیں پتا نظر نہ آتا تھا اور ان کی متلاشی و ماہر نگاہ نے دوسری ہی مرتبہ جائزہ لینے میں پہچان لیا کہ یہ اچھی داشت کی ہوئی گلاب باڑی ہے اور یہ جو کونوں پر بڑے بڑے پودے چار نمایاں اور سرخ چھتری دار نظر آ رہے ہیں کسی بڑے گہرے رنگ کے سرخے کے قلمی آم کے درخت ہیں اور اتنے میں ایک بوڑھا سا آدمی کھرپی بیلچہ ہاتھ میں لئے اس سرخ ماحول سے نمودار ہوا اور جھک کر نہایت ادب سے سلام کیا جس کے انداز سے مسٹر فاروقی نے سمجھ لیا کہ مالی ہے اور دوسرے ہی لمحہ بوڑھا مالی کھرپی بیلچہ پھینک کر منٹ بھر میں آس پاس کے گلاب میں سے جلدی جلدی لدھ کھلے پھول

چن کر چھوٹا سا گلدستہ بناتا بڑھا اور گلاب کی باڑھ کے اِدھر تھے مالی اُدھر سے جھک کر نہایت ادب سے گلدستہ پیش کر رہا تھا۔ مگر مسٹر فاروقی ہاتھ سے تو گلدستہ لے رہے تھے لیکن آنکھیں اس سرخہ آم سے لدے ہوئے قلمی درختوں پر تھیں۔ گلاب کی باڑھ کے سلسلہ میں کہیں پر کوئی راستہ تھا، جس سے فاروقی صاحب کو مالی نے اس پٹی کے اندر لے لیا۔ مالی کچھ سٹ پٹایا سا معلوم ہو رہا تھا، حالانکہ وہ اپنی اس گلاب باڑی کی پٹی کے اندر محصور رہتا تھا پھر بھی باہر کی دنیا سے پوری طرح باخبر تھا اس نے مسٹر فاروقی کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی صاحب بہادر ہیں جو پہلے دونوں رئیسوں کا جھگڑا چکانے گورنمنٹ کی جانب سے مقرر ہوئے تھے اور اب نمائش اور مقابلہ کا انتظام کرانے آئے ہیں، نیز میلہ انھیں باغوں میں اس بنگلہ کے اندر قیام پذیر ہیں، ان کی نگاہ سرخہ آم کے لدے ہوئے درختوں پر تھی، انہوں نے یوں ہی جیسے خالی الذہن سے انداز میں سوال کیا۔ یہ پھلوار کس کی ہے، آغا صاحب کی یا خاں صاحب کی اور مالی نے اندازہ کر لیا کہ صاحب بہادر کے دماغ میں اس تمام ماحول کا خسرہ نقشہ اچھی طرح موجود ہے، دونوں شیروں کے نام سن کر غریب بھیڑ کی طرح سہم گیا، سوال قانونی ساتھا، یہاں پہ دور دور تک کوئی ایک تنکا بھی بجز ان دو کے کسی اور کا مملوکہ تو درکنار مقبوضہ بھی نہ ہو سکتا اور وہ تو بات یوں ہی کر رہے تھے لیکن نگاہ بدستور سرخہ آم کے قلمی لدے ہوئے درختوں پر جمی ہوئی تھی جس سے مالی غریب کو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ مخصوص مالیوں والے نستعلیق انداز میں جواب دیا۔ "سرکار یہ پھلوار آپ ہی کی ہے"۔

مسٹر فاروقی ذرا چونکے "ایں! مگر یہ آغا صاحب اور خاں صاحب کے باغوں کے بیچوں بیچ تم کیسے؟" ان کی آواز مدھم تھی بڑبڑائے۔ بڑے عجیب موقع پر ایں؟!"

مگر مالی گھگھیا سا گیا، دانت نکال عاجزی اور ادب کے ساتھ ذرا جھکا اور پھر بولا "ہاں سرکار، پھر غلام تو سبھی کا ہے نا اور آپ کا بھی، سب کا زر خرید سا۔ اور سرکار بڑوں کے جھگڑوں میں بڑے ہی ہاتھ ڈال سکتے ہیں، وہ، اوں، آں۔ مجھے آپ کے تشریف لانے کی خبر معلوم ہوئی تھی پھول لے کر حاضر ہونے والا تھا واں بنگلہ پر" پتہ نہیں کہ انہوں نے مالی کا جواب سنا بھی، پھلوار کا غائر جائزہ لیا محدود دیہی پچاس ساٹھ گز چوڑی پٹی جو دو باغوں کے درمیان دور تک لگی ہوئی تھی۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں جیسے رقبہ کا اندازہ لیتے ہوئے بولتے رہے۔ "اوں پھر یہ چھوٹا سا ایکڑ ڈیڑھ ایکڑ بھر قطعہ کی پٹی تمہارے قبضہ میں کسی؟ ایں؟" اور ایکی مرتبہ سرخہ آم کے چھوٹے قلمی پودوں کے گملوں پر نگاہ جم گئی جو انہوں نے پہچان لی کہ اسی کی یک سالہ دو سالہ ہونہار قلمیں ہیں، مالی غیر معمولی رومانٹک سا خادم ہوتا ہے سہرے سے لے کر قبر کے پھولوں کے گچھے چادروں تک ساتھی اور روز کا روز دیوان خانہ سے زنان خانہ تک پھول ہار خوشبو پہچانے والا سرکاروں کا مقرب، روز صبح کا حاضر باش، سنبھل کر بولا سرکار مجھے معلوم ہے، ہاتھی کی ہامتھی سے ٹکر، آپ نے دو سال پہلے بیچ میں پڑ کر بچائی تھی، اب کیا حضور کچھ پھر تحقیقات کے سلسلہ میں میرا بیان اظہار لینا چاہتے ہیں۔ سو سرکار میں خدمتی غلام، دونوں ڈیوڑیوں دیوان خانوں کا نمک خوار خانہ زاد — اچھی گھڑیوں کی خوشی کا شریک۔ اوں۔ ایں، گ گ"

"لاحول ولاقوۃ" میں قانونی کارروائی نہیں کر رہا ہوں، نہ گرداور قانونگو پٹواری ہوں، تم ڈر گئے مالی۔ وہ کوئی بات نہیں۔ تم ہی جیسا، اوں"

"جی ہاں، ہاں جی سرکار، میں حضور کا ادنیٰ غلام" ذرا جھکا "عرض کرتا ہوں کاغذ تو غلام کو پڑھنا آتا نہیں پر اتنا یاد ہے کہ پٹواری کے بیٹے کا سہرا لے کر گیا تھا تو حضور یہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے اب تو کمی سال ہوئے وہ بیٹا بھی پٹواری ہو گیا تو اس کا باپ انعام تو

کیا دینا یہ دونوں باغوں کے درمیان چھینٹ کی پٹی بنائی تھی کہ بیچ میں سے آدھی آدھی خاں صاحب کی اور آغا صاحب کی ملکیت ہے اور بیس پچیس گز چوڑی اودھ کمشنری میں اور اتنی ہی روہیل کھنڈ کمشنری میں پڑتی ہے چاروں طرف اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی آپ جانتے ہیں پیداوار کیا خاک دیتی، تاہم پٹواری نے اس کو عطیۂ زمیندار معافی خدمتی کے خانہ میں بھر دیا اور ساتھ ہی ادھر روہیل کھنڈ کے آغا صاحب کے پٹواری سے بھی بھروا دیا، دونوں ہی کا خادم، دعاگو، سرکاروں کو خبر بھی نہ ہوئی اور یہ پٹواری کے بیٹے کا سہرا گوندھنے کا انعام ہے۔ سو آپ جانتے ہیں درختوں کے سایہ سایہ دور تک زمین ناکارہ ہوتی ہے مگر میں نے باغ کے پتوں کا کھاد اور گوبر ڈال ڈال کر اس میں جان ڈال دی اور گلاب باڑی لگا لی۔"

"خوب مگر یہاں دیہات میں اتنے پھولوں کا کیا کرتے ہو؟" مسٹر فاروقی نے لمبی پٹی کے گلاب کی کاشت کا اندازہ کر کے سوال کیا۔

مالی چونک سا پڑا اسے ایسے سوال کا اندیشہ نہ تھا۔ میٹھے اور خوشبودار سے لہجے میں بولا "حضور، صاحب بہادر پشتوں سے کیسے ہی نہ کیسے انھیں سرکاروں کا نمک کھاتا چلا آرہا ہوں۔ دونوں سرکاروں کے پرانے پشتینی قصبے بھی آپ جانیں کوس بھر ادھر ادھر پاس ہی پاس واقع ہیں آغا صاحب کے صاحبزادہ کے بیٹے کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی خان صاحب نے بھی چوٹ پر وہی تاریخ اپنے صاحبزادہ کی مقرر کی اور حضور لیکھ کا مالی میں اکیلا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے پھر گھر والی اس زمانہ میں زندہ تھی، ہم دونوں نے بلکہ دونوں سرکاروں میں ایک سے سہرے ہار مہندی گوندھ گوندھ کر سیکڑوں ہار روزانہ ہر رسم پہ دونوں سرکاروں میں پیش کئے اور حضور جب تو گھر والی زندہ تھی، خیریت یہ گزری کہ دونوں ڈیوڑھیوں کا چٹیا سہرے کا وقت علٰحدہ علٰحدہ تھا، ورنہ ہاتھ پاؤں پھول جاتے، ایک ہی وقت دونوں جگہ مشکل ہو جاتا پورا ڈانا۔ مگر آپ کی دعا سے بخیر خوبی انجام پائے سرخرو آبرو ہوئے۔ پٹواری پہلے اندراج کر ہی چکا تھا، پٹواری نے دونوں سرکاروں کے مختار عاموں کو مشورہ دیا کہ یہ چھینٹ کی بنجر سی پٹی معافی خدمتی میں دے دیں اور اس طرح پٹواریوں سے اپنا انا راج پکا کر لیا۔ سہرے کی ایک ایک اشرفی، ایک ایک جوڑی چاندی کے کنگن، پانچ کپڑوں سے ایک ایک جوڑا دونوں سرکاروں سے انعام ملا، خوراک میں منوں چاول، گڑ، شکر آٹا کیا کیا فصل بھر کھانے کو کچی جنس ملی۔ نہال ہو گیا حضور — اور سرکار میں نے وہ دونوں اشرفیاں چاندی کے کنگن سب کا سب اسی چھینٹ کی بنجر پٹی میں جان ڈالنے کے لئے کھاد کھود میں لگا دیا اور گلاب کی قلمیں لگا کر یہ گلاب باڑی سال اندر سال نٹھی کر لی، سرکار صاحب بہادر آپ کی عنایت سے ہوں۔ آں۔"

فاروقی صاحب نے کہا۔ "ہاں دیکھ رہا ہوں بڑی اچھی گلاب کی کاشت ہے، پھر اتنے گلاب کا یہاں دیہات میں کیا کرتے ہو؟ یہ تو فصل ہی ہے۔"

مالی بڑے مزاج شناس ہوتے ہیں، سیوتی لال فاروقی صاحب کے متعلق سن تو پہلے ہی چکا تھا، اتنی بات کر کے اچھی طرح پہچان گیا کہ ڈھب کے آدمی ہیں، اپنے یہاں کے سب رئیسوں سے مختلف در آزاد ہو کر بات کرنے لگا۔ "حضور صاحب بہادر، یہ دیسی گلاب ہے ہماری زمین کے لیے دنیا بھر کے گلابوں سے زیادہ بہتر ہے، بہت پھولتا ہے، بڑی پیداوار ہے، تین تین مہینہ بعد پھولتا ہے، اور خوشبو تو اتنی گہری ہے کہ دنیا بھر میں جواب نہیں، عطاروں کے مطلب کا بہترین ہے۔ اور غلام نے شہر کے عطار لگائے ہیں بہار آنے پر بھیجے

چن کر چھوٹا سا گلدستہ بناتا بڑھا اور گلاب کی باڑھ کے ادھر تھے مالی اُدھر سے جھک کر نہایت ادب سے گلدستہ پیش کر رہا تھا۔ مگر مسٹر فاروقی ہاتھ سے تو گلدستہ لے رہے تھے لیکن آنکھیں اس سرخہ آم سے لدے ہوئے قلمی درختوں پر تھیں۔ گلاب کی باڑھ کے سلسلہ میں کہیں پر کوئی راستہ تھا، جس سے فاروقی صاحب کو مالی نے اس پٹی کے اندر لے لیا۔ مالی کچھ سٹ پٹایا سا معلوم ہو رہا تھا، حالانکہ وہ اپنی اس گلاب باڑی کی پٹی کے اندر محصور رہتا تھا پھر بھی باہر کی دنیا سے پوری طرح باخبر تھا اس نے مسٹر فاروقی کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی صاحب بہادر ہیں جو پہلے دونوں رئیسوں کا جھگڑا چکانے گورنمنٹ کی جانب سے مقرر ہوئے تھے اور اب نمائش اور مقابلہ کا انتظام کرانے آئے ہیں، نیز میلہ انھیں باغوں میں اس بنگلہ کے اندر قیام پذیر ہیں، ان کی نگاہ سرخہ آم کے لدے ہوئے درختوں پر تھی، انہوں نے یوں ہی جیسے خالی الذہن سے انداز میں سوال کیا۔ یہ پھلوار کس کی ہے، آغا صاحب کی یا خاں صاحب کی اور مالی نے اندازہ کر لیا کہ صاحب بہادر کے دماغ میں اس تمام ماحول کا خسرہ نقشہ اچھی طرح موجود ہے، دونوں شیروں کے نام سن کر غریب بھیڑ کی طرح سہم گیا، سوال قانونی سا تھا، یہاں پر دور دور تک کوئی ایک تنکا بھی بجز ان دو کے کسی اور کا مملوکہ تو درکنار مقبوضہ بھی نہ ہو سکتا اور وہ تو بات یوں ہی کر رہے تھے لیکن نگاہ بدستور سرخہ آم کے قلمی لدے ہوئے درختوں پر جمی ہوئی تھی جس سے مالی غریب کو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ مخصوص مالیوں والے نستعلیق انداز میں جواب دیا "سرکار یہ پھلوار آپ ہی کی ہے"۔

مسٹر فاروقی ذرا چونکے "ایں! مگر یہ آغا صاحب اور خاں صاحب کے باغوں کے بیچوں بیچ تم کیسے؟" ان کی آواز مدھم تھی بڑبڑائے۔ بڑے عجیب موقع پر ایں؟!"

مگر مالی گھگھیا سا گیا، دانت نکال عاجزی اور ادب کے ساتھ ذرا جھکا اور پھر بولا "ہاں سرکار، پھر غلام تو سبھی کا ہے نا، اور آپ کا بھی، سب کا زر خرید سا۔ اور سرکار بڑوں کے جھگڑوں میں بڑے ہی ہاتھ ڈال سکتے ہیں، وہ، اوں، آں۔ مجھے آپ کے تشریف لانے کی خبر معلوم ہوئی تھی پھول لے کر حاضر ہونے والا تھا واں بنگلہ پر"۔ پتہ نہیں کہ انہوں نے مالی کا جواب سنا بھی، پھلوار کا غائر جائزہ لیا محدود یہی پچاس ساٹھ گز چوڑی پٹی جو دو باغوں کے درمیان دور تک لگی ہوئی تھی۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں جیسے رقبہ کا اندازہ لیتے ہوئے بولتے رہے "اوں پھر یہ چھوٹا سا ایکڑ ڈیڑھ ایکڑ بھر قطعہ کی پٹی تمہارے قبضہ میں کسی؟ ایں؟" اور ایکی مرتبہ سرخہ آم کے چھوٹے قلمی پودوں کے گملوں پر نگاہ جم گئی جو انہوں نے پہچان لی کہ اسی کی یک سالہ دو سالہ ہونہار قلمیں ہیں، مالی غیر معمولی رومانٹک سا خادم ہوتا ہے سہرے سے لے کر قبر کے پھولوں کے گچھے چادروں تک ساتھی اور روز کا روز دیوان خانہ سے زنان خانہ تک پھول ہار خوشبو پہنچانے والا سرکاروں کا مقرب، روز صبح کا حاضر باش، سنبھل کر بولا سرکار مجھے معلوم ہے، ہاتھی کی ہاتھی سے ٹکر، آپ نے دو سال پہلے بیچ میں پڑ کر بچائی تھی، اب کیا حضور کچھ پھر تحقیقات کے سلسلہ میں میرا بیان اظہار لینا چاہتے ہیں۔ سو سرکار میں خدمتی غلام، دونوں ڈیوڑھیوں دیوان خانوں کا نمک خوار خانہ زاد — اچھی گھڑیوں کی خوشی کا شریک۔ اوں۔ ایں، گ گ"

"لاحول ولاقوۃ"۔ میں قانونی کارروائی نہیں کر رہا ہوں، نہ گرداور قانونگو پٹواری ہوں، تم ڈر گئے مالی۔ وہ کوئی بات نہیں۔ تم ہی جیسا، اوں"۔

"جی ہاں، ہاں جی سرکار، میں حضور کا ادنیٰ غلام"۔ ذرا جھکا "عرض کرتا ہوں کاغذ تو غلام کو پڑھنا آتا نہیں پر اتنا یاد ہے کہ پٹواری کے بیٹے کا سہرا لے کر گیا تھا تو حضور یہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے اب تو کمی سال ہوئے وہ بیٹا بھی پٹواری ہو گیا تو اس کا باپ انعام تو

کیا دینا یہ دونوں باغوں کے درمیان چھینٹر کی پٹی بنائی تھی کہ بیچ میں سے آدھی آدھی خاں صاحب کی اور آغا صاحب کی ملکیت ہے اور بیس پچیس گز چوڑی اودھ مکشزی میں اور اتنی ہی روہیل کھنڈ مکشزی میں پڑتی ہے چاروں طرف اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی آپ جانتے ہیں پیداوار کیا خاک دیتی، تاہم پٹواری نے اس کو عطیۂ زمیندار معافی خدمتی کے خانہ میں بھر دیا اور ساتھ ہی ادھر روہیل کھنڈ کے آغا صاحب کے پٹواری سے بھی بھروا دیا، دونوں ہی کا خادم، دعاگو، سرکاروں کو خبر بھی نہ ہوئی اور یہ پٹواری کے بیٹے کا سہرا گوندھنے کا انعام ہے۔ سو آپ جانتے ہیں درختوں کے سایہ سایہ دور تک زمین ناکارہ ہوتی ہے مگر میں نے باغ کے پتوں کا کھاد اور گوبر ڈال ڈال کر اس میں جان ڈال دی اور گلاب باڑی لگا لی۔"

"خوب مگر یہاں دیہات میں اتنے پھولوں کا کیا کرتے ہو؟" مسٹر فاروقی نے ملہی پٹی کے گلاب کی کاشت کا اندازہ کر کے سوال کیا۔

مالی چونک سا پڑا اسے ایسے سوال کا اندیشہ نہ تھا۔ میٹھے اور خوشبودار سے لہجے میں بولا "حضور، صاحب بہادر پشتوں سے کیسے ہی نہ کیسے انھیں سرکاروں کا نمک کھاتا چلا آرہا ہوں۔ دونوں سرکاروں کے پرانے پشتینی قصبے بھی آپ جانیں کوس بھر ادھر ادھر پاس ہی پاس واقع ہیں آغا صاحب کے صاحبزادہ کے بیٹے کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی خان صاحب نے بھی چوٹ پر وہی تاریخ اپنے صاحبزادہ کی مقرر کی اور حضور لیکھ کا مالی میں اکیلا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے پھر گھر والی اس زمانہ میں زندہ تھی، ہم دونوں نے بلکہ دونوں سرکاروں میں ایک سے سہرے ہار مہندی گوندھ گوندھ کر سیکڑوں ہار روزانہ ہر رسم پہ دونوں سرکاروں میں پیش کئے اور حضور جب تو گھر والی زندہ تھی، خیریت یہ گزری کہ دونوں ڈیوڑھیوں کا چٹیا سہرے کا وقت علٰحدہ علٰحدہ تھا، ورنہ ہاتھ پاؤں پھول جاتے، ایک ہی وقت دونوں جگہ مشکل ہو جاتا بورڈانا۔۔ مگر آپ کی دعا سے بخیر خوبی انجام پائے سرخرو آبرو ہوئے۔ پٹواری پہلے اندراج کر ہی چکا تھا، پٹواری نے دونوں سرکاروں کے مختار عاموں کو مشورہ دیا کہ یہ چھینٹر کی بنجر سی پٹی معافی خدمتی میں دے دیں اور اس طرح پٹواریوں سے اپنا انا۔ راج پکا کرا لیا۔ سہرے کی ایک ایک اشرفی، ایک ایک جوڑی چاندی کے کنگن، پانچ کپڑوں سے ایک ایک جوڑا دونوں سرکاروں سے انعام ملا، خوراک میں منوں چاول، گڑ، شکر آٹا کیا کیا فصل بھر کھانے کو کچی جنس ملی۔ نہال ہو گیا، حضور۔۔۔ اور سرکار میں نے وہ دونوں اشرفیاں چاندی کے کنگن سب کا سب اسی چھینٹر کی بنجر پٹی میں جان ڈالنے کے لئے کھاد کھود میں لگا دیا اور گلاب کی قلمیں لگا کر یہ گلاب باڑی سال اندر سال ڈٹھی کر لی، سرکار صاحب بہادر آپ کی عنایت سے ہوں۔ آں۔"

فاروقی صاحب نے کہا۔ "ہاں دیکھ رہا ہوں بڑی اچھی گلاب کی کاشت ہے، پھر اتنے گلاب کا یہاں دیہات میں کیا کرتے ہو؟ یہ تو فصل ہی ہے۔"

مالی بڑے مزاج شناس ہوتے ہیں، امیوتی لال فاروقی صاحب کے متعلق سن تو پہلے ہی چکا تھا، اتنی بات کر کے اچھی طرح پہچان گیا کہ ڈھب کے آدمی ہیں، اپنے یہاں کے سب رئیسوں سے مختلف در آزاد ہو کر بات کرنے لگا۔ "حضور صاحب بہادر، یہ دیسی گلاب ہے، ہماری زمین کے لیے دنیا بھر کے گلابوں سے زیادہ بہتر ہے، بہت پھولتا ہے، بڑی پیداوار ہے، تین تین مہینہ بعد پھولتا ہے، اور خوشبو تو اتنی گہری ہے کہ دنیا بھر میں جواب نہیں، عطاروں کے مطلب کا بہترین ہے۔ اور غلام نے شہر کے عطار لگائے ہیں بہار آنے پر بھبکے

والوں کو بھیج دیتے ہیں دو ہفتہ کی بہار زوردار ہوتی ہے یہیں عرق کھینچ کر کنٹروں میں بھر کر لے جاتے ہیں، کچھ پتی زیرہ اور بھائی کلی دانہ دار شکر میں کچل کچلا کر دھوپ میں رکھ دیتے ہیں، چار چھ سیر گل قند بھی تیار کر لیتے ہیں، مرتبان قرابے ساتھ لاتے ہیں۔" مالی رئیسوں کا مزاج شناس بھی تھا اور نگاہ شناس بھی، وہ شروع ہی سے فاروقی صاحب جس کی نگاہیں پہچان رہا تھا اسی لئے گلاب کی خوشبودار باتوں میں لگا کر وہ سوال بچا رہا تھا جو وہ ان کی آنکھوں میں سے ان پودوں کے متعلق چھلک رہا تھا، ان کی نگاہ رہ رہ کر ادھر جاتی تھی، وہ چاہتا تھا کہ باتوں ہی باتوں میں انھیں یہاں سے ٹرخا دوں، وہ اپنی حق کاشت والی اراضی پر آم کا درخت نصب کر لینے کی غیر قانونی کمزوری کو بھی سمجھتا تھا آم کے درختوں کے متعلق سوال کا مکہ باتوں کے پھولوں میں الجھا الجھا کر بچا رہا تھا۔" اور سرکار آپ کے یہاں لیکھ کا مالی ضرور ہوگا، ماشاء اللہ خاندانی شیخ زادہ رئیس ہیں بھلا مالی کہیں ہل جوتتے پھاوڑا کھودتے ہیں بیلچہ، کھرپی قینچی ہمارے اوزار اور ہم آپ جیسے رئیسوں کے کھلونے پھول سنگھا کر خوش کر کر کے دعائیں دے دے کر آپ کا کھلونا بن کر عزت پاتے پیٹ پالتے ہیں اور سرکار اپنی لیکھ راجاؤں کا گھانا اور یوں سمجھئے غلام کی راج دھانی ہے۔ راج کنواروں راجکنواریوں، صاحبزادوں صاحبزادیوں شہزادیوں شہزادوں کے سہرے سہریاں گوندھ گوندھ کر پشتوں پیڑھیوں سے گھر بساتا چلا آ رہا ہوں اندر بھگوان کی کرپا وشنو جی کی دیا میری لیکھ ٹھاکروں میں چودہ پشتی چلی آ رہی ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے سیوتی لال مالی کا ہاتھ ایسا بھاگ بھرا ہے کہ اس کے گوندھے سہرے کی ہر شادی سپھل ہوتی ہے (مسکرا کر) نویں مہینہ پہلوٹھی بیٹا جمتا ہے جوڑا خوب پھولتا پھلتا ہے۔" فاروقی صاحب ہنس پڑے۔" خوب یعنی یہ بھی گارنٹی ہے کہ نویں مہینہ بیٹا!" مگر مالی نے اک ذرا مسکرا کر سنجیدگی کے ساتھ سلسلہ کلام جاری رکھا۔" اور سرکار اب تو بڑھاپا ہے، گھر والی مر گئی، یہ سلسلہ لیکھ کا بڑے بڑے سرکاروں میں جو دن ہے ایسا معلوم ہوتا ہے بس میرے اپنے دم تک ہے۔ ہوں، کنیّا ذات پرایا دھن (ٹھنڈی سانس لے کر) ویسے بیٹے تو تین دیئے ایشور نے (بسورتے ہوئے) پھر اُن کی کھیتی کچی کاٹیں پکی اُن کی مرضی رضا۔ دو دو تین تین برس کے ہو ہو کے مر مر گئے۔ ہوں آخر یہ بیٹی جنمی۔ ماتا بدل۔ ادھر بیٹی نے دنیا میں آ کر پہلی چیخ لگائی ادھر ماں نے پران چھوڑے، مرنے والی کے کان میں پیدا ہونے والی کی آواز نہ گئی، بیٹھ بیٹھ کر ہوئی (آواز اور بھی زیادہ گلوگیر ہو گئی) حلق صاف کر کے کنکھارتے ہوئے بولتا رہا بکری کے دودھ سے پالی، میں نے تو ماتا بدل نام رکھ تھا، دو ڈھائی برس کی ہوئی تو حویلی میں صبح ہی صبح پھول لے کر جاتا تو چھوڑ آتا دن بھر کا راج کنواریوں رانیوں شہزادیوں بیگموں کا کھلونا بن گئی گڑیا کی طرح کھیلتیں۔ بڑی بیگم نے کن چھیدن کرایا سونے کی دُریاں کان میں ڈالیں اور نھما بو نام رکھ دیا، لال ہی لال تھی نا، گلابو فرنگن آمن جیسی — اور اب سب حویلیوں میں اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔ پلی گئی بے ماں کی (آواز میں استقامت پیدا ہو گئی) ویسے لکھ پتی باپ نہیں پاتا دکھیاری ماں پال لیتی ہے۔ مگر سرکار خیر سے پندرہ برس کی ہو گئی مزدور دکھیارے باپ نے پال کر دکھلا دیا۔ پھر آپ جانیں سرکار یہ تو کنیا جاتی ہے، پرایا دھن، امانت دھرور، کسی ڈھنگ کے لڑکے کے پلو باندھنے کی فکر میں ہوں، اپنی برادری میں آج کل گھر جمائی اچھے لڑکے ملتے نہیں ہم دیہات والوں کو ویسے بسیٹھ کے سہارے شہر کے بھی اچھی حیثیت کے مالیوں میں بات بھجوائی۔ سو پرانوں کی نو خیر شہروں میں بھی بھاری بھرکم بات تھی اب نئے منڈوں لونڈوں کا تو یہ حال ہے کہ شہر کی ایسی ہوا لگی ہے مارے مارے پھرتے ہیں نکھٹو — تمام دن اور ساری رات آوارہ، ماں بہن جورو تمام دن کے چنے پھول گوندھ کر ہار بنا دیں اور شام کو یہ چوراہوں پر پیسہ پیسہ ٹکا ٹکا بیچ اور کھا پئیں۔ میری یہ لیکھ یہ پھلوار کی ریاست پر شہر چھوڑ کر یہاں دیہات میں بسنے سے جی چراتے ہیں یہاں تو دن مندنے تک محنت کرنی پڑتی ہے، روز کا

کنواں کھودنا، روز کا پانی پینا اور پھر شہر کی ہوا ہی ایسی ہے سرکار۔ ویسے تو ہم نو دس برس ہی کی بیاہ دیتے ہیں اور یہ سرکار کی کنیز ہو گئی خیر سے چودہ پندرہ کی اب تو اور دیکھتا ہوں سال چھ مہینہ، ورنہ پھر شہر ہی کے کسی اچھے محنتی لڑکے کو بیاہ دوں گا۔ اور سرکار گھر جمائی نہ ملا (بسوتی آواز) میں یہ اپنے گھر کی ہوگی یہ لیکھ کا پرکھوں کا پیڑھیوں کا ریاست کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا، یہ اُدھر گئی اور میں ہوں، بس میرے دم تک رہ جائے گا۔ اور میرا بھی کیا ہے حضور، میرے بعد سرکار اللہ کا نام ہے بس۔ اور سرکار اس کا جہیز جمع کر رہا ہوں اور میں کیا حضور بیگمیں، رانیاں راجکنواریاں شہزادیاں حویلی حویلی جوڑ دی ہیں اپنی جیتی گڑیا کی شادی کی طرح اپنی گلابو کا کپڑا گہنا پاتا۔" فاروقی صاحب نے مسلسل بولتے ہوئے مالی کی بات کاٹ کر پوچھا: "مگر مالی یہ کیا بات تم اپنی بیٹی کے لئے جہیز جمع کر رہے ہو ویسے تم لوگوں میں تو لڑکے والوں سے اچھی رقم لے کر بیٹی دیتے ہیں۔" مالی نے جواب دیا، جی جی سرکار، ہاں ہاں بجا فرمایا حضور نے صحیح بات ہم نیچی ذاتی شدرا چھوت رقمیں لے لے کر کنیا دکرے کرتے ہیں اور شہروں میں لک پنچے مالی سب کے سب ایسا ہی کرتے ہیں پھر سرکار ہم لیکھ کے مالی آپ سرکاروں کے پھول مہندی کے منہ چڑھے غلام پیڑھیوں پشتوں کے نمک خوار خدمتی، اپنے سرکاروں کی اونچی ناک کی دیکھا دیکھی آپ سرکاروں ہی طرح برتتے ہیں اور اپنے سرکاروں کی طرح جہیز دے کر بیٹی رخصت کرتے ہیں اور سرکاروں کی بیٹھ بھاری کرتے ہیں اور میں نے عرض کیا نہیں مالن بچی یہ تو حویلی حویلی کا کھلونا گڑیا سی ہے، پھول مہندی پہچانے والی، فرحت سہاگ کی نشانی ہے گھر گھر دولاری ہے دلہنوں، بہوؤں بیٹیوں کا کھلونا سرکار میری گلابو اور سرکار میری ہی کیا سبھی شہزادیوں رانیوں کی گڑیا ہے پیاری پیاری آغا صاحب اور خاں بہادر صاحب کی پوتیوں نواسیوں میں کھیلتی ہے اور چھوٹی ٹھکرائن رانی تو سونے کی نتھ سے بیاہنے کی بات کرتی ہیں، ان کی تو بہت لاڈلی ہے۔ بیٹی کہتی ہیں اور سرکار دشنو جی کی دین ہے، ناک نقشہ رنگ روپ میں پٹھانیوں راجکنواریوں میں جاتی ہے تو چھنکتی نہیں، مل جاتی ہے انھیں میں کی کوئی ایک معلوم پڑتی ہے۔ پٹھانی ٹھکرائن ایرانی ——" فاروقی صاحب کے کان مالی کی آواز پر تھے اور نگاہیں لدے ہوئے سرخہ آم کے نو ڈھوں پر —— انھیں اس تعریف اور غائبانہ تعارف سے لڑکی کے متعلق قطعاً اشتیاق نہ ہوا۔ بلکہ لڑکی کے متعلق جو تفاصیل تعریف و توصیف میں باپ بیان کر رہا تھا وہ بھی یوں ہی سنیں تو انھیں خیال یہ گذرا کہ لڑکی اس وقت حویلی وغیرہ میں کہیں گئی ہوئی ہے اور باپ محبت پدری میں اکلوتی بیٹی کا ذکر تقاضائے بشریت کے تحت بے محل اور کچھ ضرورت سے زیادہ ہی کر رہا ہے، جو خواہ مخواہ کی بکواس سی ہے۔

مالی ڈھب کا آدمی پا کر فاروقی صاحب کے سامنے باتوں کی جھڑی لگائے ہوئے تھا۔ وہ ایسے قدر شناس آدمیوں سے خال خال ہی واسطہ میں آتا تھا۔ دیوان خانوں میں مالیوں، حجاموں، درزیوں اور چابک سواروں کا سرکاروں کے ساتھ اور حویلیوں میں حجامنوں، دایاؤں اور مالنوں کا بیگمات رانیوں صاحبزادیوں، راج کنواریوں کے ساتھ یہی انداز ہوا کرتا ہے تاہم سیوتی لال اس طبقہ کا بڑا مزاج شناس تھا۔ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس سوال کا سامنا کرنا ضرور ہے اور بات مشکل ہی سے ٹل سکتی ہے، فاروقی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی اور سوال کر ہی دیا۔" بھئی سیوتی لال یہ سرخاتم نے کون سا لگایا ہے، پھلت تو بڑی اچھی ہے اور رنگ بھی خوب جگا، سندوریا —— واہ! ایں پورب پچھم سب کے سب دانے یک رنگ پھر پوست باریک۔؟ اور فاروقی صاحب کی دکھتی نس چھیڑتی بات کو مالی نے پھر اپنی چرب زبان کی ڈھال پر لے کر ٹالنا ڈھکنا چاہا اور بات بجائے اس اپنے آم کے سرخہ پر ہمارے لے کر آم کالا باغ تک پہنچا دی۔" ہوں آں سرکار ہم مالی خدمتی تو آپ رئیسوں کے نیک شگون میں سہرے سہریوں سے گھر بسانے والے دعا گو غلاموں کے غلام۔ خدا آپ سرکاروں کی گدیاں سلامت رکھے۔

یہ کلاب پھلوار کا سہارا تو ابھی چند برس ادھر سے کر لیا۔ گھر والی کے مرنے کے بعد سے، ورنہ کبھی پروا ہی نہ رہی کما کر کھانے کی اپنی تو ڈیوڑھیاں ڈیوڑھیاں روزی اترتی رہی پشتوں سے۔ باپ دادا کے وقتوں سے آج بڑھاپا آ گیا، تین پشتیں آم کے پتے ہاتھ میں چلے آ رہے ہیں۔ حضور یہ پھول پھلوار تو ہمارا پشتینی پیشہ ہے مگر سرکار میرے دادا باپ اور میرا اپنا اصل کام نئے نئے تخمی تلاش کر کر کے قلمی آم تیار کرتا چلا آ رہا ہے، اسی میں آنکھ کھلی اور اسی میں آج پکی رہی ہے۔ ویسے ایشور کی کرپا اور وشنو جی کی دیا ہے کہا جاتا ہے کہ سیوتی لال اپنے ہاتھ سے شاخ توڑ کر پھینک دے تو قلمی آم بن کر پروان چڑھ جاتا ہے۔ سرکار شمار نہیں ان انگلیوں سے لاکھوں قلمیں باندھیں، جیسے کوئی منشی اپنی عمر بھر میں سوچ سوچ کر لاکھوں لفظ دماغ سے نکال نکال کر رہے نا حضور لکھتا ہوگا اور بس میاں میرے اندر مہاراج کی کرپا اور آپ سرکاروں کے نمک کی تاثیر عنایت لوگ کہتے ہیں کہ سیوتی لال کے ہاتھ کی بندھی ایک قلم بھی ایسی نہیں جو چپکے نہیں رہ گئی ہو۔ ہوں سرکار، بلکہ اوروں کی باندھی چالیس دن میں جڑتی ہے وشنو جی کی دیا سے اپنے ہاتھ میں ایسی تاثیر ہے کہ میرے ہاتھ کی بندھی مہینہ بھر سے کم میں چپک کر ساؤنٹھی ہو جاتی ہے۔ سندیلہ والے چودھری صاحبوں کا ثمر بہشت چونسے، ان کی زمینداری کے گاؤں چونسہ کے اصل پرانے درخت پر پہلی قلم میں نے ہی باندھی جو آج دنیا کا مانا ہوا سب سے بڑا پھل ہے۔ دھوم ہے تمام میں جس کی — اور امیر غریب سب کو ایک طرح برابر پیٹ بھر ملتا ہے۔ ادھر ٹھاکر صاحب سے گاؤں کھجری میں ایک ایسا ہی پرانا درخت اور تھا اور ملیح آباد کی کمان نرسری والے خاں صاحب نے اس پر قلم باندھی اور آم تیار ہوا تو خیر کسی طرح چودھری صاحب کے ثمر بہشت چونسے سے کم تو نہ تھا مگر وہ بات کہاں قد میں ہٹیارہ گیا۔ رنگ زرد، ریشہ البتہ ذرا کم ہے ادھر رام پور والوں سے ثمر بہشت رام پور کے نام سے گولہ تیار کر دیا اور سرکار وہ روہیل کھنڈی خاص طور پر شاہ آباد والے وہ تو پال ہی کے آم کو آم کہے ہیں، ثمر بہشت رام پور پال میں لگا کر کھانے کا آم ہے اور پھر سرکار جانتے ہی ہیں گولہ ہے۔ بازار میں ذرا پہلے نظر آتا ہے اسی شکل کی وجہ سے گولہ آم اور پہلے پکتا ہے، حضور جانتے ہی ہیں اور پھر سرکار کے یہاں تو ہوگا درخت، پھلت کا بڑا اچھا ہے۔ پیڑ پر آم ہی آم دکھائی پڑتا ہے، نہ پتہ نہ شاخ اور پال اٹھ کر تو کوئی آم مقابلہ نہیں کر سکتا اس کا اور خوشبو بھی اپنی اچھی ہے سفیدہ ملیح آباد والی سوئے کی۔

ہوں، میاں۔ سنتے ہیں کہ جنت مکانی سرکار رام پور کے دسترخوان پر تو بارہ مہینہ لگا کرتا تھا نقل میں۔"

فاروقی صاحب نے بات کاٹی "ہاں ضرور لگتا ہوگا بہت روکنے والا آم ہے۔"

"ہاں تو حضور یہ آم بھی میری ہی خاندانی دریافت تھا میرے پتا کے ایک شاگرد نے اس کی پہلی قلم باندھی اور درخت میرے چچا نے وہیں کہیں ریاست کے اندر ڈھونڈھ نکالا تھا۔"

وہ تو مجھے معلوم ہے پھر سیوتی لال تمہارا یہ سرخہ، یہ کیا۔؟"

جی حضور۔ اس کے کتنے ہی نام ہیں سرخہ بہما، برائڈ آف رشیا، رومان کا نتا، سدیر خاص اور ایک اور۔ سرکار عنابی گولہ مراد آباد کٹ گھر کے ٹھاکر جے پال سنگھ چوہان کے یہاں کا آم میرے باپ نے انھیں کے پرانے زمانہ کے تخمی جنگل جیسے باغوں سے ڈھونڈھ کر نکالا تھا، بیساکھ مئی میں ہی مدیہ آ جاتا ہے شوقین کھانے والے برف میں لگا کر کھاتے ہیں اس پر ٹھاکر جی کا پہلا مقابلہ کا انعام کپ تمغہ ملا تھا۔ دھوم ہو گئی تھی۔

مگر عنابی گولہ نام کا عنابی آم ہے سرخہ تو نہیں ہے۔

ہاں سرکار سرخہ نہیں ہے۔ گول گول گچھوؤں میں پھلنے والا آم سے عنابی گول شکل کی وجہ سے کہتے ہیں اور سرکار آپ کو بھلا کیا بتادوں بیکار بکواس آپ کے تو سب رئیس دوست برادر ہیں یہ بڑے بڑے سرکاروں باون گزوں کا کھانا ہے، رئیس رئیس برادری" فاروقی صاحب نے مالی کے منہ سے بات لے کر کہا "نہیں بھیا سیوتی لال ہم بھی تمہاری طرح سمجھو تم ہی میں سے ہیں۔ مٹی کرید کر روزی نکالنے والے یہ یہاں بڑے بڑے رئیس ہیں۔ یہ چار پانچ تو علاقہ وار اس خطہ بھر کے پشتینی مالک ادھر دو تین پٹھان گھرانے ادھر یہ روہیلے بلوچ اور پھر ادھر ادھر دونوں جانب کمشنریوں کا دور تک کوسوں میلوں حصہ بائے تمہارے ایرانی آغا صاحب ہیں اور میں بیچارہ شیخ ان سب سے ذات میں بھی کم حیثیت میں بھی چھوٹا۔ جب ان میں سر پھٹول کی نوبت آجاتی ہے تو دونوں جانب کے کمشنر ڈپٹی کمشنر بہادر انگریز حاکم تصفیہ کرانے کے لیے مجھے یاد کر لیتے ہیں پھر ان رئیس لوگوں کی بھی لیاقت ہے میری بات مانتے عزت کرتے ہیں اور مانیں نہیں تو سن ضرور لیتے ہیں۔ ویسے ان میں احمق گھامڑ کوئی ایک نہیں ہے سب کے سب بڑے ذہین ہیں مگر ذرا سی دیر میں عقل کھو بیٹھے ہیں اور تمہارے آغا صاحب کا علاقہ تو بہت بے ڈھب پھیلا ہوا ہے تینوں کمشنریوں میں روہیل کھنڈ سے ادھر کمایوں ادھر اودھ تک اور مجھے ان سب میں سوچ بچار کر کے عمل کرنے والے یہی نظر آتے ہیں ——— عقل سے کام لینے کا گر جانتے ہیں۔ جی ہاں سرکار آغا صاحب ان سب سرکاروں میں اپنی دھج کے نرالے بھی تو ہیں روں دبک شان شیخی ہے تو اور طرح کی ان پٹھانوں روہیلوں ٹھاکروں سے مختلف ہیں اور سرکار کو پتہ نہیں معلوم ہو نہ ہو، ان کا وہ نرالا آم "مئے بے خودی"۔

"اچھا ہاں مئے بے خودی ہے میرے یہاں"۔

تو سرکار یہ غلام ہی نے ڈھونڈا نکالا، باندھا پروان چڑھایا ہے"۔

میرے یہاں درخت پھل رہا ہے وہ علی گڑھ کالج دیوبند اور ہندو یونیورسٹی گروکل کانگڑا والا وقف ایک سو ایک روپیہ الا پودا ایں: وہی نا؟"

جی ہاں سرکاری وہی، پس حضور اس آم کے ساتھ میرا باپ بیٹے والا رشتہ ہے ویسے سرکار چار پشتیں بیت گئیں، سیکڑوں ہزاروں نہ معلوم کتنے آم" ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قلم لگا لگا کر پروان چڑھا دیئے اور حضور سیکڑوں میں تو میرے اپنے ہی ہاتھ کے ڈھونڈے قلم باندھے تعداد ہوں گے اور اب تو حضور اپنی بھی یاد نہیں، باپ دادا پرکھوں بزرگوں کی تو کیا بتاؤں کوئی نہیں جانتا کتنے دریافت کر کے وہ بزرگ کریا میں جا لیٹے شمار نہیں سرگباش ہوئے۔ پھر سرکار جو بتیا اس مئے بے خودی میں جھیلی وہ مرتے دم تک نہ بھولوں گا، جب خیال آجاتا ہے تو کھوپڑی پکنے لگتی ہے، آتما دھک اٹھتی ہے اور کوئی ہوتا تو اس آم اور اس کے نام سے نفرت عداوت ہو جاتی پھر اللہ آغا صاحب کا بھلا کرے بات بنائی اور سرکار بڑوں کی بڑی ہی بات ہوتی ہے اور آغا صاحب بھی پوتڑوں کے رئیس ہیں مگر سیاست حکومت کے ساتھ کاروبار کا ڈھنگ بھی خوب جانتے ہیں۔ ان کے بیٹے جئیں، میرے بھی آنسو پونچھ گئے بڑے دان پن کرنے والے ہیں اور سرکار میرا تو کیا، دل کا معاملہ تھا اُس بدنصیب کے بال بچوں کی روزی کا سہارا ہو گیا، اب ہر قلم پر سو روپیہ تو خیرات مدرسہ علی گڑھ کالج اور گروکل کانگڑہ اور کہاں کہاں دیوبند بنارس جاتے ہیں اور اوپر کا ایک روپیہ اس مرنے والے جواں مرگ کے بال بچوں کو ویسے کا ویسا ہی ہر سال چلا جاتا ہے لاگت کی دوتی بھی آغا صاحب نہیں کاٹتے۔ مالی نے بولتے بولتے اک ذرا توقف کیا رئیسوں سے بات کرنے کینڈے سے واقف مالی نے

فاروقی صاحب کی توجہ اپنے سرخہ کے سوال اور جواب سے ہٹادی اور پٹے باز استاد کی طرح ان کے سوال کا وار مٹے بے خودی پر ڈھال دیا فاروقی صاحب نے ذرا حیرت کے ساتھ پوچھا "این سیوتی لال، مٹے بے خودی، مٹے بے خودی تو بڑا معصوم آم ہے جس کے ساتھ کار خیر کی شرط لگی ہوئی ہے اچھا یہ تم نے دریافت کیا باندھا ہے پھر اس کے ساتھ بتیا، جیسی مہم، کیا بات، این؟ ابھلا؟" ہاں سرکار" مالی کی آواز رندھ گئی اس نے حلق سے کنکھا۔ مٹھار کر آواز سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" سرکار بتیا ہتھیا۔ ہائے ہائے سرکار، کیسا کڑیل، جوان مرگ یاد کرتا ہوں تو آج بھی کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے، کل کی ہی بات لگتی ہے، پھر سرکار افسوس اس کا ہے کہ مجھے کوئی زمیندار رئیس تو حکم دیتا نہیں کہ جاکر ڈھونڈھوں نکالوں، خود ہی شوق کی بھٹکار میں فصل بھر مارا مارا پھرتا ہوں، پرانے باغوں کے جنگلوں جنگلوں، یہ میری اپنی لگن ہے کہ ہر فصل میں کوئی نیا آم تلاش کروں، اس بھٹکار کے جنگلوں کے چکر میں یہ موٹے موٹے انگلی برابر روئیں دار کملے بھی لگتے ہیں، سارا سارا بدن کھجلی کے مارے لال ہو ہو جاتا ہے۔ بنگو ہو جاتا ہوں، ارم ہیں پھول کر مشک ہو جاتا ہوں کبھی کبھی بخار کی بھٹ چڑھتی ہے۔ جونکیں بھی چمٹتی ہیں۔ ایک ایک پاؤ پاؤ بھر خون پی پی کر چھٹتی ہے، پھر سرکار یہ اپنی لگن اپنا شوق، وہ کوئی بات نہیں کسی سرکار مالک رئیس کو خبر تو جب ہوتی ہے جب ان بنوں میں سے کوئی ڈھنگ کا آم ڈھونڈھ کر نکالتا ہوں اور سرکار لوگ کو بتاتا ہوں اور وہ چکھ کر تلمیں باندھنے کا حکم دیتے ہیں اور چھوٹے بڑے سرکاریہ برساتی کیڑے اپنے ہاتھوں اور پھول کیاری بغیچوں میں برسات میں تھوڑے بہت واسطے میں آتے رہتے ہیں۔ مرتے رہتے ہیں، ان کا ہمارا ساتھ ہے مگر بنوں جنگلوں میں تو ان کا راج ہے۔ پھر سرکار کو ہمارے اس لتے کا حال تو معلوم ہوگا ایک ایک رئیس کا علاقہ میلوں میں پھیلا ہوا ہے خود بھی کوئی گنا گنت نہیں کسی کو۔ بیگھوں ایکڑوں کی تو شمار ہوئی تو کہیں تحصیل میں سرکاری کاغذوں میں میزانی پیمائش ہوگی۔ یہاں ہمارے تو پٹواری تک چوپٹ ہیں، نقشہ شجرہ کھیوٹ کھتونی میں پڑھ تو دیں گے پھر موقع نہیں بتا سکتے یہاں اراضی املاک بنجر جنگل کھیتی میلوں لمبائی چوڑائی میں پھیلی چلی گئی ہے ایک ایک زمیندار تعلقہ دار رئیس کی، ان میں جنگل کے جنگل پرانے بے گہت آم کے اتنے باغوں کے بھی ہیں، پتہ نہیں کب اور کس کے لگائے پروان چڑھائے اب تو خود رو جیسے جنگلی ہیں۔ ایک ایک آم کا پیڑ چار چار پانچ پانچ بیگہ پر پھیلا ہوا چھتنا ور، تناور۔ حضور کوئی کہتا ہے کوروں پانڈوں کے وقتوں کے ہیں، کچھ سُدبُد نہیں، سرحدی چوہدی سرحدی کے دُھرے تو دے پتھر بھی کہیں نظر نہیں آتے اور ہوں گے تو کہیں چھپے ہوئے کون جریب کھینچے اور ڈھونڈھے نکالے اور کاہے کے لیے۔ گھٹنوں گھٹنوں کانس، کمر کمر بیپ اور تو اور کہیں کہیں ہاتھی ڈباؤ اونچی چاندرونیا بھر کی گھاسیں اور ان گھاسوں کے اوپر آدم قد سے اونچی کٹیلی جھاڑیاں سب کا سب ڈھیر کے ڈھیر کی صورت دکھائی پڑے اور سرکار اس گھاس اور جھاڑیوں کے اندر سے چیر چیر کر نکلتی ہوئی بید اور بن تری بھانت بھانت کی بیلیں، کٹیلی، سخت اور پیچ در پیچ برسات ہی پر منحصر نہیں بارہ کے بارہ مہینہ ابل ابل کر بڑھتی ہوئیں مکڑی کے جالے کی طرح گھاس سے لے کر جھاڑیوں، آم اور کہیں کہیں جامن کے بھی بڑے بڑے اجگری جہازی درختوں تک سب کا سب زمین سے چوٹی تک ایک لپیٹ جکڑا پڑا ہوا۔ قلعہ کی دیوار فصیل، اس جیسے جنگل پر توپ کا گولہ بھی مارتو پار نہ ہو، چپٹا ہو کر ادھر ہی گر جائے۔"

فاروقی صاحب نے کہا" بھئی سیوتی لال مجھے معلوم ہے کہ اپنے اس خطہ میں ایسے قدیم باغ ہیں جو بن ہو کر رہ گئے ہیں، کبھی شکار کھیلنے بھی ان کے اندر میں جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر سنا ہے، تو وہ چاہے کب کے لگائے ہوئے ہوں، جیسا کہ تم نے کہا کوروں پانڈوں کے زمانہ کے یا راجہ دسرتھ جنک کے وقتوں کے اور ایسے جنگلی باغ ملک بھر کے کسی اور حصہ میں نہیں پائے جاتے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے اس خطہ میں ہزاروں سال

کبھی پہلے بھی ہم ہی جیسے مہذب لوگ بستے تھے جو اچھے اچھے پھل لگانا جانتے تھے، جن پر آج ابھی ان تین چار سو برس سے ہم نے قلمیں چڑھا چڑھا کر کوہِ نور، بیگم پسند اور لال دیا نام رکھے ہیں۔ ملک بھر میں چلے جاؤ، پنجاب میں تو اللہ کا فضل ہے، یہ بڑا بڑا گیہوں اگانا چاہتے ہیں اناج کی بے تحاشا پیداوار لیتے ہیں مگر سو برس پرانا آم کا درخت نظر نہیں آتا کہ دیتے ہیں کہ آدھی صدی کی سکھاشاہی میں سب کچھ نیست نابود ہو گیا، آم کے باغ تو باغ کسی جنگلی درخت کا بھی وجود نہ رہا۔ ایک پیڑ ڈھنگ کا دکھائی نہیں پڑتا، ادھر سی پی رکن بنگال بہار میں جنگل ملتے ہیں ششم سال سمبل، ٹیک اور کیا کیا عمارتی لکڑی، مگر آم کے جنگل اپنے اسی تھوڑے خطہ میں پائے جاتے ہیں۔

"خیر سرکار، ہاں جنگل، آپ انھیں جنگل ہی کہہ لیں، وہ تو میں نے گھوم پھر کر کچھ لیا، یہ کسی زمانہ میں چاہیں ہزاروں سال پہلے نصب کئے گئے ہوں بڑے قاعدہ میں لگائے گئے تھے رام تیور قطاروں میں باغ تھے۔ اپنے وقت میں اب بھی گھوم پھر کر دیکھیں تو باغوں کے کھنڈر ہیں۔ کہیں کہیں قطار بھی مل جاتی ہے۔"

مالی رئیسوں کا مقرب صحبت یافتہ تھا، حجام تو جمعے کے جمعہ قینچی استرے کے ساتھ منہ پر ہاتھ چلاتا اور رات کو بستر پہ پاؤں دباتا نظر آتا اور مالی صبح شام سرکار کی کرسی سے ملحق کولہا ملائے فرش پر بیٹھا پھول سنگھا رہتا۔ فاروقی صاحب کو شروع ہی میں اس کی لچھے دار باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ خوبصورتی کے ساتھ اپنی گلاب باڑی میں نصب سرخہ آم کے لدے ہوئے درختوں کے متعلق بات کرنے سے کترا رہا ہے مگر اس کی لسانی اور رئیسوں سے بات کرنے کی معاملت میں آتے رہنے کے سامنے ابھی نک ٹک نہ سکے تھے اور اس نے خوب خوب چکر دیے۔ گلاب باڑی والے سرخہ کے استفسار سے پھسل کر تحقیق و تاریخ کی گتھیوں میں جا پڑے ہاں بھئی یہ ہمارے بزرگوں پرکھوں کا چھوڑا ہوا آخری دفینہ ہے، ادھر ان چار پانچ صدیوں میں ہم نے قلمیں باندھ باندھ کر کچھ آم بنا سنوا کر وہ بھی تخمی باغوں اور متفرق درختوں میں سے نکال لئے ہیں ان جنگلوں میں تو ابھی نہ معلوم کیسی کیسی نعمتیں چھپی پڑی ہیں اور کتنی غارت ہو گئیں۔"

ہاں سرکار، شنو جی نے تو جو کچھ اتارنا تھا اتار دیا دھرتی پر اور اندر مہاراج نے پروان چڑھا دیا، تلاش کرنا ہمارا کام ہے اور سرکار تخمی باغوں کا تو ہر درخت قلم ہاتھ کی لکھی کھلی کتاب ہوتا ہے۔ ان میں سے اچھا آم تلاش کر لینا بڑی بات نہیں، بات تو ان جنگلوں بنوں کے درختوں سے کوئی آم نکال کر لانے میں ہے اور سرکار مجھے اسی میں مزہ آتا ہے۔ تمام کے تمام بنوں جنگلوں کے سب خطروں کٹھنائیوں سے بھرے ہوئے ہیں قدم قدم پر موت جھپٹتی ہے۔ سارے کا سارا میلوں لمبا چوڑا علاقہ تمام کا تمام ڈکوروں کے ٹیلوں سے بھرا ہوا، ان میں سانپوں کی بانبیاں ہی بانبیاں اور پرانے درختوں کی کھنڈالیں آپ کے یہاں بھی تو پرانے باغ ہوں گے، جانتے ہی ہوں گے۔ پرانے درختوں کی کھنڈالوں ہی میں تو بڑے بڑے اجگری بس کھڑے رہتے ہیں اور تو سب بڑے بڑے اجگر سانپ ناگ آدمی کے کھٹکے سے بھاگ جاتے ہیں پر یہ بس کھڑا ڈھیٹ ہوتا ہے مقابلہ پر آجاتا ہے۔ کم بخت، یہ تو پلٹ کر سیدھا ہو جاتا ہے چھوٹ حملہ چوٹ کرتا ہے۔ ویسے آس پاس قدم قدم پہ کالے ہتھیلی بھر چوڑے چکلے یہ موٹے موٹے ڈنک والے بچھو دُں اور بالشت بالشت بھر کے کن کھجوروں کی درزیں سوراخ، گھڑیال، گھاس میں نیچے زمین سے اوپر پھنگی تک جھاڑیوں بیلوں میں کملوں کے گچھے، جونکوں، کان سلائیوں کی کھیتیدیں، کون سی بلا نہیں بھلا، سرکار، چپہ چپہ مصیبت بھری دنیا زمین پر جہنم اور سرکار جانتے ہی ہیں چیت ہی سے سب بلائیں انڈے بچے دے کر جنم لیتی ہیں اور اساڑھ سے بھادوں تک پورا زور پکڑ جاتی ہیں اور ایسی ہی جگہوں پر ڈیرہ جما لیتی ہیں، اور

سرکار برسات بھر اس کال موت کی دنیا میں گھس گھس کر کوئی نیا آم معلوم کرنا، پیڑ پیڑ پر کھنا اور پرکھتے پرکھتے دور نکلے چلے جانا میرا عمر بھر شوق رہا۔ میرے دادا مجھے تو منع کیا کرتے تھے۔ ویسے مگر خود یہی لت تھی اور پھر ان کے ساتھ میرے پتا کو بھی یہی لت تھی۔ لڑکپن سے جوانی تک ہر فصل دو ایک آم ڈھونڈھ نکالنا کسی نہ کسی سرکار کی دھوم ہو جاتی اور آس پاس اپنوں میں اپنا بھی نام خیر لیا جاتا۔ واہ! کیا کام دکھایا! پھر اپنا جی خوش ہو جاتا ہے اپنے سرکاروں کا نام اونچا کر کے۔ اپنا تو یہ ہے کہ سانپوں سے تو میں ڈرتا نہیں نہ حضور میرے پاس سانپ پھٹک سکتا ہے۔ سرکار بچھوؤں کن کھجوروں سے بچا رہتا ہوں اور بس کھپڑے، خدا بچائے نہ ان کے ڈسے کا کوئی منتر ہے نہ ڈھاک بجتی ہے اور جونکوں کے لیے اپنے بدن میں خون بہت ہے پاؤ آدھ سیر ان کے حصہ میں بھی رہے کھلے بری بلا ہے، ادمو مومو! بلا کی کھجلی مچتی ہے، اک دو دن بخار چڑھتا ہے پتی سی اچھلتی ہے۔ لوٹ پیٹ کر ٹھیک ہو جاتا ہوں، پروا نہیں۔

"ہاں وہ جو تم نے کہا سانپ سے کیا دوستی ہے تمہاری یا کیوں نہیں پاس پھٹکتا، کیا ڈرتے ہیں تم سے؟"

جی ہاں سرکار، دوستی کیا ہوگی بھلا سانپ سے۔ ڈرتے ہی ہیں، شاید آغا صاحب نے نہ معلوم کون سی بولی کا ہے فارسی عربی کا منتر عمل یاد کرا دیا ہے، پڑھ کر تالی پٹخارتا ہوں جہاں تک پٹخار جاتی ہے سانپ بھاگ جاتے ہیں بانبیوں میں گھس کر چھپ جاتے ہیں اور سامنے پڑ ہی جائیں یا خدا نکرے ایک دفعہ کو پاؤں بھی پڑ جائے تو منہ کل جاتا ہے، کاٹ نہیں سکتا۔ بڑے بڑے اجگر ناگ جن کا کاٹا تو کیا پھنکار کی بھی ڈھاک نہ بجے مجھ سے کترا کر نکل جاتے ہیں، رُخ نہیں ملا سکتے۔"

"خوب سیوتی لال"۔ خاروتی صاحب نے اشتیاق کے انداز میں کہا۔ "وہ عمل منتر بھی ہمیں بھی بتا دو ذرا، ہمارا بھی بالا تمہاری طرح دن رات سانپوں سے رہتا ہے اپنے یہاں پرانے باغوں میں۔"

مالی سٹ پٹا گیا "اوں، آں، ایں میں میں سرکار وہ پھر آغا صاحب کا حکم نہیں ہے بتانے کا، وہ کہتے ہیں کہ تم کسی کو بتاؤ گے تو تمہارے منہ سے تاثیر جاتی رہے گی" اور فوراً بات ٹالنے کے لئے رُخ بدلا۔ "اور حضور آج تک دل روتا ہے، اس مئے بے خودی کی مہم کی ساری روئداد آنکھوں میں پھرتی ہے اور میں نے تو ہی کم بخت نے کہا تھا۔ میں جوان تھا اور وہ کھلنڈرا لونڈا چڑھتی جوانی، دو فصلوں سے یہ آپ کا مئے بے خودی بھانپ لیا تھا، وہ جو آپ کہتے ہیں کن درختوں کا کوروں پانڈوں کرشن جی کا زمانہ دیکھے پان سو ہزار نہ معلوم سرکار کتنے ہزار سال پرانا درخت تھا، بیگھوں میں پھیلا، آسمان سے باتیں کرتا، اونچا ——— جھاڑیوں کا لسن بیپ گھاسوں میں گھرا ہوا بیلوں کی رسیوں میں جکڑا ہوا، پہلے تو سال بھر اسی میں گذر گیا کہ یہ کس زمیندار کے محال میں ہے اگلی فصل معلوم ہوا کہ آغا صاحب کی زمینداری میں ہے اور میں نے آغا صاحب کے حکم سے مختار عام کے ذریعہ بیگار چلائی، بیگاریوں میں ایک پھرتیلا چمار، بلا کا طاقتور اور ساتھ ہی ساتھ جی لگا کر دل سے کام کرنے والا کھیت مزدور سبھوں سے تیز اور زیادہ بڑھتا ہوا کانس بیپ کاٹتا، بیلیں جھاڑیاں، چھانٹتا مشین کی طرح بڑھتا چلا گیا اور میں اس کو کھڑا ترکیب بتاتا رہا۔ کاٹ کر راستہ بنانا اور مزدوروں سے پہلے تنے تک پہنچ گیا اور سرکار وہیں پر کھنڈال تھی پرانے بس کھپڑے کم بخت کی، یک دم اچھل کر ڈس لیا اور سرکار میری آنکھوں کے سامنے پران چھوڑ گیا، دیکھتے دیکھتے وہیں پر، ذرا دیر نہ لگی میں نے بڑھ کر سنبھالا، میرے ہاتھوں میں ہی جان نکل گئی، ہائے ہائے..... (آواز سنبھال کر) ایں سرکار اس کا تو وقت آ گیا تھا ہے نا سرکار، وہ تو اسی وقت مرتا۔ ایں سرکار! آج تک بھولا نہیں، دل روتا ہے، چہ چہ چہ، بیگار میں بھی میرے ہی اشارہ پر مختار عام نے پکڑا تھا، اگر میں نہ پکڑواتا تو بھی وہ مرتا اسی وقت؟

ہے نا سرکار۔ اور سرکار اس کو گھاس جھاڑی جھنکاڑ چھانٹنے کی ہدایت بھی تو میں ہی دے رہا تھا، جبھی تو وہ تیز تیز کاٹتا اس جگہ جا پہنچا جہاں پر کھنڈال تھی بس کھپڑے کی اور بس کھپڑا کھٹ پٹ سے غصہ میں بھرا بیٹھا تھا، ہائے کم بخت نے ڈس لیا اچھل کے میری آنکھوں کے سامنے۔ اس کا تو وقت آ گیا تھا جتنی لکھی تھی پوری کر چکا تھا وہ جو کہتے ہیں وعدہ کم نہ زیادہ، ہیں سرکار ہے نا۔ (سسکی بھر کر) دل روتا ہے۔ کیسا کڑیل جوان اٹھتی جوانی۔ آج تک نہیں بھولا، پندرہ سولہ برس بیت گئی، آنکھوں میں گھومتا ہے۔ بدنصیب۔ اس بس کھپڑا کم بخت کا نکاس ادھر ہی کو تھا، بس کھپڑا تو اپنی کھنڈال میں گھنے نکلنے کا راستہ علیحدہ علیحدہ رکھتا ہے، یہ کاٹتا چھانٹتا ہی ادھر نکاس سے جا پہنچا اس نے اچھل کر ڈس لیا، چٹ پٹ ہو گیا سب کی آنکھوں کے سامنے۔"

"نہیں سیوتی لال تمہارا کیا قصور، اس کا وقت آ گیا تھا اور اسی بہانے۔ وہ بیگار میں تمہاری نشاندہی پر پکڑا جانا لکھا تھا اور اسی طرح مرنا مقدر تھا، ٹل نہیں سکتی تھی کوئی بات"۔ فاروقی صاحب نے کہا اور مالی کا دل ذرا ٹھہرا اور جذبات سے چھٹکارا پا کر بات کرنے لگا۔

"آغا صاحب کے کیا کہنے! بڑے رحم دل سرکار ہیں۔ انھیں خبر بھجوائی اور اس بدنصیب کا وہیں کریا کرم کرایا مگر بیگاری تو آپ جانیں بیگاری ہوتے ہیں جو ہونا تھا ہو چکا تھا، اب وہاں کوئی خون نہ تھا خون کا بہانہ مل گیا مدد اکھڑ گئی، بھاگ کھڑے ہوئے۔ آغا صاحب کو تھی دانے جو میں نے پیش کئے تھے چکھ کر بہت پسند کر چکے تھے"۔ میں حاضر ہوا سب حال بیان کیا فرمایا لعنت بھیجو بیگاریوں پر، جس اجرت پر مزدور ملیں کام لگاؤ اور مختار عام کارندے نے ڈبل اجرت پر پاسی اور بھیل مزدور فراہم کر دیے۔ آغا صاحب پہلے روز صبح تڑکے پندرہ میل گھوڑے پر سوار ہو کر پہنچے۔ چند دانے وہیں جھاڑیوں میں اور تلاش کر کے پھر چکھے آغا صاحب کی توجہ اور شوق دیکھ کر دوسرے تیسرے روز مختار عام نے اور بہت سے نئے بیگاری پکڑ لیے اور اٹھوارے اندر درخت کے آس پاس جگہ دور تک چاروں طرف کھل کر صاف ہو گئی، جھاڑ جھنکاڑ تو درکنار گھاس کا پتہ تنکا بھی نہ رہا۔ آغا صاحب نے پانسو قلمیں باندھنے کا حکم دیا۔ اچھے جان دار پیٹے گملوں میں بھرے نرسری سے نکلوا کر چھکڑے میں لدوا کر پہنچوا دیئے اور اوپر سے نیچے جھکی ہوئی شاخوں تک سرکار میں نے تین دن میں پانچ سو کے پانچ سو پیٹے قلم باندھ دیئے وشنو جی کی دیا اندر مہاراج کی کرپا سب کی سب قلمیں جڑ گئیں ۔ اور سرکار ویسے آغا صاحب ہیں تو ایرانی اور سنتے ہیں کہ دادا پردادا گھوڑوں پھلوں کا کاروبار بیوپار کیا کرتے تھے اور کل کی بات حافظ جی کے وقت میں یہ جاگیر پائی بہت پرانے رئیس بھی نہیں ہیں، پھر سرکار بڑے کھلے دل کھلے ہاتھ کے رئیس ہیں، ہمارا ادھر کا یا ادھر کا کوئی پٹھان ٹھاکر چوہان راجپوت بچہ ہوتا تو کان پر جوں نہ رینگتی جب کمزار چڑھتے چڑھتے قلمیں جڑ کٹ کے نرسری میں پہنچیں تو پہلے تو آغا صاحب نے اس آم کا نام اس مرنے والے بیگاری کے نام پر رکھنا چاہا۔ سو سرکار میں نے عرض کیا کہ حضور نام چاہیں کچھ اور اچھا سا رکھیں، اس کی بکری قیمت میں سے مرنے والے کی بیوہ اور بچوں کا کچھ خیرات پُن کے طور پر ہی سالانہ فصلانہ مقرر کر دیں۔ میری بات سن کر بہت خوش ہوئے نام مئے بے خودی رکھا آپ کو معلوم ہی ہے علی گڑھ، دیوبند گرو کل بنارس کے لیے دان پن وقف دے دیا۔ قیمت ایک سو ایک روپیہ رکھی اور ایک روپیہ جو ان کے یہاں قلم کی عام قیمت ہے وہ سب کی سب اس بیوہ کو فصل کے فصل دے دیتے ہیں ویسے سرکار آپ جانتے ہوں گے لاگت ایک پودے پر سات پیسہ دو آنہ آتی ہے۔ پھر سرکار آغا صاحب اپنی لاگت کی دوائی بھی نہیں کاٹتے۔ اس قلم کا حساب علیحدہ رہتا ہے نرسری کے بہی کھاتہ میں اور سرکار مختار عام کو ہدایت ہے کہ ربیع خریف جتنی قیمت بنے اس کا موٹا اناج بیوہ کے گھر بھجوا دیا جائے۔ فصلانہ بندھ گیا۔ پل گئے تین چار چھوٹے چھوٹے بچے ایک بیوہ اور بوڑھی ماں اور حضور روزی کا سہارا

ہوگیا کھانے کے لیے سال کا اناج مل جاتا ہے گھر بیٹھے۔ ورنہ بھوکوں مرجاتے۔ پھر وہ جو وعدہ ہے روزی آسمان پر سے زمین پر نہیں پورا ہوا علی گڑھ دیوبند گرد و کل بنارس سے چندہ کی ایک سو ایک روپیہ کی رسیدیں چلی آتی ہیں پودا اُدھر چلا جاتا ہے ایک روپیہ اس مرنے والے کے حساب میں ادھر پڑ جاتا ہے۔

"پھر سیوتی لال اچھا آم ہے، مگر بازار کے کام کا نہیں"۔ اور سیوتی لال نے منہ سے بات لے کر کہا "جی ہاں جی ہاں سرکار پھلت کچھ ہے ہی نہیں، بھرے درخت پر ہزاروں میں سے مشکل سو سوا سو دانے بچتے ہیں پہلے تو پھوٹتا کم ہے پھر ڈنٹھل کا لوا ہے آخر تک مچھرتا ہی رہتا ہے یہ ہوا ان کا خاص الخاص شاہ آباد بازار کے آم نہیں، رئیسوں سرکاروں کے دسترخوان سجتے ہیں اور انھیں کے حصہ تک پہنچنے کے لائق پیدا ہوتے ہیں، وہ جو کہتے ہیں سرکار رئیسوں کے چونچلے اور پھر سرکار یہ بھی بات ہے یہ بادشاہ آم ہیں اور بادشاہ تو اکیلا ہوتا ہے، بازار نہیں جایا کرتا"۔

اور جب قصبوں میں نوروز منایا جاتا ہوتا، جھولے پڑتے تیجیں تیوہار ہوتا، تمام کا تمام دیہات کا ماحول رنگ رس خوشبو اور گیتوں میں گم ہوتا تو سیوتی لال کا تین پشت سے معمول تھا کہ پرانے باغوں میں بن جیسے رقبوں کے اندر تحقیقی جنون کے سفر میں کہیں گم ہوتا اور جب کالی کالی گھٹائیں اس گھٹاٹوپ ماحول کو اور بھی زیادہ گھمبیر بنا دیتیں تو اس کا جی پروائی کے جھونکوں کی لہک کے ساتھ اور بھی لہرا اٹھتا۔ مونجھ کا ریشے کا مندھے پر لٹکائے چھال چھیلنے والا چاقو، جیب میں رکھے اور بیلچہ بغل میں دبائے وہ کسی خاصہ کے تخمی آم کی تلاش میں اس دشوار گذار قدیم باغوں کے ماحول کے اندر اپنا بے سنگ و میل سفر جاری کئے ہوتا اور جب ان قدیم درختوں کے نیچے پیار میں سے پکا ہوا کوئی آم چکھ کر دریافت کر کے پسند کرتا تو وہیں کہیں آس پاس جھاڑیوں گھاس میں سے کوئی ابھرتا ہوا پچھلے سال کا بیاپا اسٹاک کے لیے تلاش کر کے کھادتا اور قدیم ماورا التاریخی درخت کی کوئی ہونہار موقع کی شاخ کے ساتھ قلم بندی کر کے آگے بڑھ جاتا۔ اور یہ دھن اس کی آبائی تورثی تیسری پشت میں چل رہی تھی اور آج تو اس کی جوانی کی شام تھی اس کے باپ دادا اسب کی جوانیاں اسی شاداب صحرا نوردی میں گزری تھیں اور ان کے دریافت کر کر کے لائے ہوئے اور قلم باندھ باندھ کر ترقی دیئے بنائے سنوارے پروان چڑھائے آموں کی تعداد بھی کسی کو معلوم نہ تھی اور وہ ان کے آغازین کے ان مالکوں کے نام سے موسوم ہو کر جن کے نام سرکاری کاغذات میں اندراج چلے آتے تھے ان کے نام حرف غلط کی طرح گم نام معدوم ہو گئے تھے اور تیسری پشت میں ان کی میراث ایک گلابو اسم بامسمّٰی بیٹی تھی اور ایک سرخہ آم کا درخت سوا دل الذکر کنیا ذات پرایا دھن تھا اور آخر الذکر کی ملکیت کا وہ قانونی مقدور نہ رکھتا تھا، دونوں ہی دوسروں کا مال تھے اور مالی کو اس کا سماج اور قانون دونوں صورتوں اور پہلوؤں سے اچھی طرح اندازہ بھی تھا، اور وہ اس پر صابر بھی چلا آتا تھا۔ اور دکھے پہلوؤں سے دل کو سمجھائے ہوئے بھی تھا۔

فاروقی صاحب سمجھ گئے کہ وہ اس آم کے درخت کے متعلق سوال سے گریز میں اپنے نطق اور ویوان خانہ والی باتوں سے پہلوتہی کر رہا ہے اکتا گئے اور کٹیا کے چاروں کونوں میں سے ایک پورب رُخ والے خوب لدے جھاڑدار درخت کے قریب پہنچ کر ٹھہرے جس پر اُوپر سے نیچے تک کچے گدرا اور پختہ آم ہی آم سرخ ہی سرخ نظر آتے تھے پتہ اور شاخیں بھی پھلوں میں گم تھیں انہوں نے لٹکتے ہوئے آموں پر محبت اور شفقت والی دلچسپی کے انداز میں ہاتھ پھیرا اور بولے "بھئی استاد سیوتی لال، وہ تو ہم نے سب سنی تمہاری دریافت تحقیق کی لمبی داستان اور کیا ہم جانتے ہیں تم اس لئے

کے استاد ہو، پھر اپنے اس سرخہ کی بھی تو بات بتاؤ، تم جانتے ہو، سارے علاقہ میں مشہور ہے، ہمیں بھی اچھے سرخوں سے شوق ہے، ہم نے اپنے یہاں چار ایکڑ پر "لال باغ" نام کا پورا قطعہ نصب کیا ہے۔"

جی ہاں، جی ہاں سرکار عرض کرتا ہوں نا، حضور تو بڑے لکھے قابل آدمی ہیں اور ہاں مجھے تو تجربہ ہی ہے، حضور مانگے، سرخے آم ذرا کم ہی اچھے اور کسوٹی پر پورے اترتے پائے جاتے ہیں۔ سرکار نہ معلوم کیا وجہ ہے، پھر سرکار یہ آپ کا سرخہ اپنی جگہ پر جنت بیکنٹھ کا اترا پھل معلوم ہوتا ہے، وشنو مہاراج کی دیا ہے۔ (ہاتھ جوڑ کر) ذرا معاف فرمائیں حضور اک ذرا چکھنے کی تکلیف کریں، تو میری عزت بڑھے ویسے حضور کا غلام ہوں۔ پھر آپ قدر دان ہیں۔ "اچھا خیر چکھ کر بھی دیکھیں گے پھر اس کی اصل نسل کیا ہے، کہاں سے نکالا۔" فاروقی صاحب نے منہ سے بات لے کر کہا۔

" سرکار وہ دیکھئے"۔ مالی نے باڑی منڈھے میں کھڑے اک ذرا اونچے درخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" بس سرکار وہ اس کا تخمی ہے اصلی درخت۔"

" مگر یہ تخمی، یہ یہاں کہاں سے پہنچا؟" فاروقی صاحب کا برجستہ سوال تھا مالی نے ویسے ہی برجستہ کہا۔" اور سرکار یہ مجھے بھی نہیں معلوم" ——— فاروقی صاحب نے حیرت سے کہا۔" اچھا تمھیں بھی!"

" جی سرکار یہاں پر مجھے بھی علم نہیں، بہت تلاش کیا پرانے تخمی باغوں میں بھی ڈھونڈا، دور دور پھر کھوج نہیں ملا۔"

" خوب!" فاروقی صاحب نے کہا۔

مالی نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا۔" ہاں سرکار آج تک پتہ نہیں، پھر یہاں پر ایک ہرسنگھار کا پرانا پودا تھا، وہ میں نے نکال دیا اب، بتا نہیں کوئی طوطا، یا اللہ جانے کوا، یا الیشور جانے حضور رات کو چمگادڑ، پھر خیال ہے کہ شاید... طوطا تھا کسی چڑیا نے ایک آم کہیں سے لاکر اس ہرسنگھار کے پودے پر بیٹھ کتر کتر کر کھایا اور جیسا کہ ہوا کرتا ہے گٹھلی نیچے گرا گیا اور سرکار برسات میں جیسے گری پڑی ہر گٹھلی گھورے گلیارے جگہ جگہ جاگ پڑتی ہے یہ بھی جم اٹھی، اچھا تگڑا پیا۔ اس بچی کی نگاہ پڑی، حضور کوئی اور بچہ ہوتا تو اکھیڑ کر رگڑ رگڑا کر پیا بچا کر پھینک دیتا اور یہ کیا نہیں، یہ بھی صبح سے شام تک جگہ جگہ سے اکھیڑ اکھیڑ کر بچاتی پھرتی ہے تمام دن۔ مگر سرکار وشنو جی مہاراج اور اندر مہاراج کی دیا کرم اس بچی کے دل میں کیا آئی کہ اس نے تو پروان چڑھانا شروع کر دیا اور پھر سرکار آپ جانیں مچھلی کے بچہ کو تیرنا کون سکھائے، مالی باغبان کی بیٹی، ادھر کنارے کھیل کھیل میں گول گول گڑھا گویا کیلیاں کھودی، گلاب باڑی کے لیے میں رہٹ چلاتا تھا اس نے کھیل کھیل میں نالی میں سے پتلی سی اپنی نالی اس گڑھے میں کو بنائی، ہوں اپنا کنواں کھود کر پانی بھر لیا، دیوالی کی دو کلیاں نکال کر پتلی سی سُتلی ڈوری میں لٹکائیں اور دو لکڑیاں سیدھی کھڑی کیں اور ایک آڑی آڑی، ان پر کہیں سے سلائی کے دھاگے والی کاٹھ کی گرّیاں لگا کر لے آئی اور اس پر سُتلی چڑھا کر میری رہٹ کی چھوٹی سی نقل بنائی اور صبح شام میں ادھر رہٹ چلاتا یہ اپنی ادھر سے اپنی کلیوں کی رہٹ چلا چلا کر نچائی کرتی اور سرکار کھیل ہی کھیل میں چھ مہینہ اندر اندر پیا پودا بن گیا۔ کنیا جاتی کے ہاتھ کی سنچائی سیوا سے ویسے تخمی آم آٹھ دس سال میں پروان چڑھتا ہے یہ پانچ سال ہی میں پھول کر بور گیا۔ میں نے پہلا بور سب کا سب نہ توڑا، چند خوشے اندر کو پورب سمت گابھے میں کو رہنے دیئے اور سرکار مجھے پہلے پہل ہی گمان ہوا تھا کہ سرخہ سے اور سرکار سرخہ ہی نکلا۔ اوں آں۔ حضور ویسے سرکار میں ویسے تو ان پڑھ ہوں آپ بڑے ودمان سرکاروں کی صحبت کے آدمی ہیں نہ ایسی باتوں

پر وشواس یقین رکھتا ہوں پھر سرکار آج آٹھ دس برسیں بیت گئیں تلاش کرتے کرتے، اس عرصے میں بیٹی نے یہ چار قلمی باندھ کر پروان چڑھائیں اور پھل لے لیا، میں نے تخمی باغ بھی بہتیرے تلاش کئے اور بن بھی اور ہر جگہ اس سرخہ کو ڈھونڈا مگر سرکار اس کا اصل درخت کہیں نہ ملا، اب ایسا گمان گزرتا ہے کہ وشنو جی نے کوئی طوطا گل رم پنچھی چونچ میں لے کر میری گلابو بیٹی کے لئے اتارا تھا۔"

فاروقی صاحب ہنس پڑے "نہیں سیوتی لال، کہیں کوئی درخت ہوگا۔ یہیں، آس پاس یا کون جانے دور کہیں بن میں اور ہر سال گرمیوں میں دیسوں بڑے بڑے پرانے درخت تو مار دھتی ہے سوکھ جاتے ہیں کون جانے سوکھ گیا ہو۔ اور کیا معلوم کہیں ہو اور تمہیں نہ ملا ہو، یہاں تو درخت ہی درخت باغ ہی باغ باغوں کے بن ہی بن ہیں۔"

اور اب سیوتی لال مالی نے پیار بھری پکارنے والی مخصوص آواز بلند کی "گلابو، گلابو کدھر سے ذرا سرکار کو تو اپنا سرخہ پیش کر۔"

اور کہیں گلاب کی جھاڑیوں میں سے گلابو نمودار ہوئی تو فاروقی صاحب چکا چوند ہو گئے۔ حسن صحرائی و فطری رعنائی اور خلقی تندرستی کا مجسمہ اور تم یہ کہ اپنے آپ سے بے خبر حویلی والے بیگماتی مخصوص انداز میں سلام لیا اور چھپر کے اوپر رکھے ہوئے رات کے بسے آم نکالے جن پر اوس نے تمام رات خنکی اور تری برسائی تھی اور کاٹ کر ایک قاش بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کی۔ فاروقی صاحب پھڑک اٹھے ایسا سرخہ عمر میں پہلی مرتبہ زباں و تالو سے گذرا تھا تم یہ کہ خوشبو بالکل ہی انوکھی تھی، یعنی نایاں سہ آتشہ عرق گلاب میں ڈوبا ہوا تھا اور اس خوشبو کا آم پہلی مرتبہ فاروقی صاحب کے تجربہ میں آیا تھا اور پھر ایک قاش اور ایک اور، اس نادر خوشبو والے سرخہ کو کھا کر فاروقی صاحب حیرت میں گم ہو گئے اور پروان چڑھا کر اور کاٹ کر کھلانے والی کی شخصیت میں تو پہلی نگاہ ہی میں گم صم ہو گئے تھے، اور گلابو، سیوتی لال کی بیٹی تھی، نسلی ارذل شودر زادی، جس نے بابا آم کے اس فائن آرٹ جیسے کلچر میں گوناگوں بیش بہا اضافے کر کر کے اور ایگری کلچر میں گوناگوں بیش بہا اضافے کر کر کے اور ایگری کلچر کے اس شعبہ کو تمدن کی روشنی کے گوناگوں لذتوں کے رنگوں رخوں سے چمکایا تھا اور اپنا سب کچھ اسی گھنی خود رو منو کے اندر گم چھوڑ کر آقاؤں کے نام اجالے کئے تھے وہ اپنی وہبی اور توریثی جبلت کے زور سے بغیر جدید آلات اور خبر رسانی کے ذرائع کے محض اپنی آنکھ کے لینس اور جسم کے لمس کے ذریعہ اَن پڑھ ماہر موسمیات تھا اور موسموں اور آم کی فصل کی معاملت کا تو ماہر نجومیوں سے زیادہ پیش گوئی کرنے والا زیادہ شناسا تھا باغ کی فصلوں کے خریدار ٹھیکہ دار اس کے نام کے ساتھ چودھری لگا کر استفادہ کیا کرتے، فاروقی صاحب مردم شناس اور قدر آشنا آدمی تھے ساتھ ہی سوچ اور عمل میں اپنے طبقہ میں سب سے علیحدہ اور ٹھوس حقائق میں یقین رکھنے والے، گلابو کا سرخہ آم چکھا کیا پیٹ بھر کھایا اور دل ہی دل میں اپنے ان بیڑیں اور مرغے لڑا کر تماشا دیکھنے والے ہم نشینوں کے درمیان مموے اور شہباز کی ٹکر کرانے کے تماشا کا فیصلہ کر لیا۔ وہ خود آم کھانے کے معاملہ میں پُرخور قسم کے شوقین واقع ہوئے تھے، صبح ہی صبح یہ سرخہ کھا کر بہت خوش ہوئے اور بولے سیوتی لال، آم کھانے کے بھی شوقین ہو یا کھلانے نکالنے پروان چڑھانے کے ہی۔"

سرکار ویسے کھانے کے معاملہ میں بھی ایسی بات نہیں ہے کہ رہ جاؤں، مگر اپنے آقاؤں ان داتاؤں رئیسوں کے نام اونچے کرنے کے نشے سرور میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ ان کے ہرے بھرے باغوں کو دیکھ کر ہی جی ہرا رہتا ہے، سونے میں بھی یہ نشے نیند کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے ان دور تک کھڑے درختوں کی سائیں سائیں پُروائی میں سرور چڑھائی رہتی ہے سرکار اور کھانے کے معاملہ کو جو آپ نے دریافت فرمایا، وہ بھی کیوں نہیں۔ اچھا پتے رس کا ہلکی چاشنی اور تیز مٹھاس ہو، ڈھنگ کا چل ہو تو صرکار بہت، بہت شوق اور خیر اب تو بڑھاپا ہے سرکار، جوانی میں نمائش میلہ میں شرطیں

لگا کرتی تھیں تو سرکار پتلے پتلے پاپڑ کے چھوٹے منحنی سے چھ چھ سات سات داڑھی کھایا کرتا تھا۔ ایسوں دیسوں کا تو ذکر کیا اچھے اچھے پہلوان متھرا کے مانے ہوئے کھانے والے پہلوان چوبیتے تک جز دنکل میں آیا کرتے تھے چار پانچ داڑھی میں چھک کر ہٹ جایا کرتے تھے اور سرکار اب توڑ چکا ہے اور پھر تاش منہ میں لیتے ہی مزہ آنے کے بجائے یہ کہنے پڑ جاتا ہوں، موسم فصل کا اثر، داشت ہوا، پورب پچھم رُخ کے دانوں کی پہچان پرکھ اور گابھے تیکھے دانوں اور پال ہے تو پھر اس کے توڑنے اور اُٹھانے کی اچھائی برائی غلطی اور وقت مزہ کیا خاک آتے (سرگوشی میں) اور حضور سنتے ہیں ایک روز آغا صاحب ذکر کر رہے تھے کہ آم کا ذکر ویدوں میں بھی تو آیا ہے، انہوں نے خود پڑھا ہے"۔ ادھر رئیسوں کی زبان اور طور سمجھنے والا مصاحب قسم مالی فاروقی صاحب کے جملے کے آخری الفاظ "یا کھلانے کے بھی" پر چونکا تاہم اس طرح کسی رئیس کی توضیع کھانے کے لئے کرنا، یوں رستہ چلتے اس کا منصب تھا اور صرف پھول چن کر سکتا تھا ادھر فاروقی صاحب اس سرگوشی کی آواز سے سمجھ گئے کہ ویدوں کا ذکر چپکے سے کر رہا ہے شودر ہے اور اس کی سزا جو منوجی نے رکھی ہے اس سے ڈر رہا ہے اور آغا صاحب یہ بھی بتلاتے تھے آم کا درخت افریقہ میں بھی پایا جاتا ہے مگر کہہ رہے تھے کہ کڑوا ہوتا ہے، جنگلی جانور ہی کھا سکتے ہیں" ہاں سنتے ہیں کہ واں آم جنگلی ہوتا ہے اور کھانے کے قابل نہیں ہوتا"۔ فاروقی صاحب نے کہا۔ اور مالی نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "حضور آپ نے تو پڑھی ہوگی۔ شری رامائن، کتھا کیرتن میں ایک مرتبہ بامنوں نے سنائی تھی تو مجھے پتہ چلا کہ راجہ جنک نے سیتا جی کے بیاہنے کے لیے دُنیا بھر میں اعلان کرایا کہ جو راجپوت بجہ ان کی کمان کا چلہ چڑھا سکے گا اسی کو سیتا جی بیاہ دیں گے۔ دنیا بھر کے ویر راجپوت جمع ہو گئے اور ایک روز کر کر کے ہٹ گیا، کمان اتنی کڑی تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوئی کسی ایک سے۔ آخر میں بھگوان رام چندر جی میدان میں اترے۔ چلہ چڑھانے کے لیے جو اک ذرا سا زور کیا تو کمان ہی کے دو ٹکڑے ہو گئے، اور راجہ جنک نے سیتا جی کو بھگوان رام چندر جی سے بیاہ دیا۔ جب بھونرے پڑ گئے تو سمدھی راجہ دسرتھ کے ایک مترمصاحب نے رخصتی کے وقت کہا کہ دولہن کی چوتھی جب لوٹے گی جب میکے سے کوئی عجیب تحفہ آئے گا جو وہاں نہ ہوتا ہو اور سرکار سیتا جی نے ایک کوئل پال رکھی تھی۔ سیتا جی تو سسرال سدھاریں اور کوئل ان کی جدائی یاد میں رونے لگی اور روتے روتے آواز مدھم پڑ کر رہ رہ کر سنائی دینے لگی، اور آپ کو تو سرکار معلوم ہوگا سیتا جی کے باپ راجہ جنک تھے اور ماں دھرتی ماتا تھیں، ادھر دھرتی ماتا کی چھاتی سے بھانت بھانت کے آم ٹپکنے لگے ادھر ساون سے بھادوں آ گیا کوئل کی آواز مدھم پڑتے پڑتے ڈوراسی رہ گئی اور اس نے اپنی کمزور آواز میں بتایا کہ چوتھی لوٹانے کے لئے آم کا تحفہ سمدھیانے بھیجا جائے ادھر راجہ جنک نے حکم دیا ادھر دھرتی ماتا نے اپنے تمام کے تمام آموں کے خزانے اپنی بیٹی کی سسرال بھیجنے کے لئے اوپر بکھیر دیے۔ بہنگیاں لگانے کہاروں کی قطار آموں کے ٹوکرے بھرے راجہ جنک کی راجدھانی سے اجودھیا تک لگ گئی اور یہاں سے واں تک آم ہی آم پھیل گیا"۔

فاروقی صاحب نے مزاحیہ انداز میں کہا "کون کون سے آم ہوں گے سیوتی لال ؟"

سیوتی لال نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "سرکار حساب لگا لیجئے بھادوں آ لگا ہوگا۔ بھادوں ہی میں کوئل چپکی ہو جاتی ہے آج بھی"۔ فاروقی صاحب نے مزاحیہ انداز میں کہا تو پھر چونسے، کیلوا، چمپا، نیلم نرگس کجھری وغیرہ میں سے کوئی ہوگا؟ ایں" مالی بدستور سنجیدہ رہا "ہاں سرکار انھیں میں سے کوئی ہوگا یا پھر کون جانے یہ بھی ہوں، راجہ جنک اور راجہ دسرتھ کے درمیان جتنے آم آج تک دھرتی کی کوکھ میں پیدا ہوتے ہیں سبھی تحفہ میں چلے ہوں گے۔ وہ تو سیتا جی کی ماتا کی مایا تھی"۔

"تو پھر یوں کہو آم ہماری سسرال کا تحفہ ہے"؟

"بالکل حضور، اور آج تک آپ سب سرکاروں میں داماد کو آم کا تحفہ ضرور جاتا ہے اور سرکار دیہاتی مسلمان تو آم کو ولی مانتے ہیں

ہمارے مولا زادے، جولاہے، لوہار، سب کے سب نبرا ولیا کہتے ہیں آم کے درخت کو۔ اور اونچی جاتی کے ہندو یہ ہمن ٹھاکر سب کے سب آم کی مال میں دو مرتبہ پوجا کرتے ہیں ایک مرتبہ دھرم بیساکھی پر ادھر بھادوں میں۔"

"یہ تمہارا سرخہ، ایں؟ کہیں وہی تو نہیں ہے جو راجہ جنک نے مہارانی دھرتی ماتا کے حکم پر بیٹی کی چوتھی لوٹانے کے لئے راجہ دسرتھ کے یہاں تحفہ میں بھیجا ہوگا۔" فاروقی صاحب نے مزاحیہ انداز میں مگر بات عقیدہ پر چوٹ جیسی تھی لہٰذا نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔

مالی نے اک ذرا چونک کر ان کی جانب دیکھا اور موڈ کو پہچان گیا مگر سنجیدہ ہی رہا۔ "ہاں سرکار، کون جانے وہی ہو۔ شاید اور سرکار آم تو ہے آپ راجوں مہاراجوں میں تحفہ ہی چلنے کے لائق۔"

"مگر سیوتی لال یہ آم تو تیار ہوگیا اور کوئل ابھی چپکی نہیں ہوئی، سن لو، بول رہی ہے اور سیتا جی کی کوئل تو آم مد پر آنے پر سوکھ کر رہ گئی تھی گھونسلے میں۔"

مالی نیچی نگاہ کئے مسکرایا پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولا۔ "ہاں سرکار ملوطے کوے کے لگائے تخمی کا دانہ چکھتے ہی قلمیں باندھیں اور کٹیلے کے چاروں کونوں پر چار اچھی اٹھتی ہوئی ہونہار قلمیں چھانٹ کر نصب کر دیں، اور حضور کے اقبال سے یہ دوپورب والی امسال ہی پہلا پھل لائیں ہیں، بھرپور پھلت کے ساتھ، ملاحظہ فرمایا سرکار نے اور سرکار یہ ہے اس سرخے کا پہلا قلمی پھل"۔ اور مالی نے لدے ہوئے سرخ سرخ آموں کے رنگ میں چھتری کی طرح ڈھکے نو دھے کی جانب توجہ دلائی۔ "ہاں ہاں میں دیکھ رہا ہوں سیوتی لال اور انھیں دیکھ کر ہی تو ادھر آیا تمہاری گلاب باڑی کی ٹہنی میں کو۔" اور فاروقی صاحب کے انداز توجہ اور پذیرائی کا احساس کر کے مالی کے چہرہ پر فخر کا انداز نمایاں ہوگیا، اک ذرا جھک کر روایتی انداز تکریم کیا اور فاروقی صاحب بولتے رہے۔ "دیکھنے میں تو بڑا بانکا سرخہ ہے، سرخوں کی مکہ کہتا اگر آم ہوتی، پھر آم ہے تو سرخوں کا بادشاہ کہا جائے تو ٹھیک ہی ہے پھلت کا بہت اچھا ہے، ایں ڈنٹھل کا مضبوط ہے نا اور اللہ کا فضل ہے، اپنا تجربہ ہے اور لوگ تو چکھ کر سمجھ پاتے ہیں، یا ہم سونگھے بغیر دور سے دیکھ کر اندر تک کا سب حال بتا دیتے ہیں مٹھاس کی نوعیت، رس، ریشے گودا گٹھلی اور نیچا درخت ہو تو ہوا دھوپ آندھی طوفان زیادہ نہیں ستاپاتے۔" بجا فرمایا حضور نے، دیکھئے نا سپیدہ ملیح آبادی کے قد کا درخت ہے، اونچا کم اٹھتا ہے نیچے ہی نیچے گلاب کی جھاڑی کی طرح پھیلتا ہے اور پھلت بھی ویسی ہی ہے۔ سپیدہ ملیح آبادی والی شاخ پتہ دکھائی نہیں دیتا، بس آم ہی آم، چاروں طرف، اوپر سے نیچے تک ــ اوں ابھی اس روز جو کالی آندھی آئی تھی تو باغوں میں ستھراؤ ہوگیا۔ گابھے تک کے چھپے مضبوط ہوئے آم جھول کر گر گئے لیکن ان پودوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔"

فاروقی صاحب نے کہا۔ "ہاں بھئی نیچے درخت کی بلا دور ہوتی ہے پھر تمہارے بھوپیڑے لاڈ، چاروں طرف اونچے اونچے جنگلی درختوں کے باڑھ مینڈھے ایسے میں نیچے پودوں کو خبر بھی نہیں ہوا کرتی کہ طوفان کدھر سے گذر گئے۔"

مالی نے آم کے ان درختوں کی جا و نوع زیر بحث آنے کے خطرہ میں خوبصورتی کے ساتھ بات کا رُخ پھر بدلا۔ "یہ دیکھئے سرکار یہ گملے" اور گملوں میں لگی ہوئی یک سالہ دو سالہ قلموں کی قطار کی جانب توجہ مبذول کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سرکار آپ کی کنیز ہر سال فصل کے فصل دو چار قلمیں باندھ کر چپکاتی رہتی ہے اور دشنو مہاراج کے کرم سے ایسا سچا ہاتھ ہے کہ مجال ہے جو ایک بھی جڑنے سے رہ جائے پھر غضب یہ ہے کہ ہم آپ باندھیں تو چالیس دن میں جڑ پاتی ہے اور آپ کی کنیز کے ہاتھ کی بندھی مہینہ بھر سے بھی کم میں چپک کر مضبوط ہو جاتی ہے۔"

فاروقی صاحب نے گملوں میں لگے ننھے قلمی پودوں پر نگاہ ڈالی اور زیرلب بولے "بڑی ہونہار قلمیں ہیں، جڑ اور پیوند دونوں ہی بڑے مضبوط، شاخ کا انتخاب اچھی طرح ٹھونک بجا کر کیا ہے جڑ بھی دیکھ بھال کر لی ہے۔ واہ سب پروان چڑھ جائیں گی۔"

مالی خوش ہو گیا اور اولاد کی تعریف والدین کی بڑی کمزوری ہوتی ہے، جھک کر آداب کیا، خوشی میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "سرکار آپ کی لونڈی باندھتی رہتی ہے کھیل کھیل میں، پھر حضور پھر وہی عرض کرتا ہوں، مچھلی کے بچہ کو تیرنا، ایں، کون سکھائے، اوں تاک کر ہونہار شاخ پر مضبوط اٹھتی ہوئی جڑ انتخاب کر کے بڑے شوق کے ساتھ باندھتی ہے جیسے راجکنواریاں کشیدہ کاری زردوزی کرتی ہیں۔"

اب جو ہے سرکار ایشور کی دیا دشمنو مہاراج کا کرم حضور کا اقبال ہے اور مالی نے جھک کر آداب کیا پاؤں چھوئے اور دونوں ہی کے ذہن میں یہ وسوسہ گذرا کہ یہ عمل خلاف قانون ہے، ٹینینسی ایکٹ کی رُو سے کسی نوعیت کے موروثی کاشتکار کو بھی اپنی مقبوضہ کاشتہ اراضی پر آم کا درخت نصب کرنے کا حق نہیں ہے، اور بہرصورت بات ایک زمیندار اور کاشتکار کے درمیان ہو رہی تھی اور سیوتی لال اپنی کاشتہ اراضی پر آم کا درخت نصب کرنے کا مجاز نہ تھا، اس غیرقانونی فعل سے بیدخلی کا مستوجب تھا، پھر زمین کے اوپر کہیں پر خواہ کوئی ہی درخت کیوں نہ ہو اس کا مالک زمیندار تھا اگر اپنی کاشتہ اراضی پر سے کوئی موروثی کاشتکار بھی کوئی ایستادہ درخت کاٹے گا تو قانون فوجداری کی رُو سے قید کی سزا کا مستوجب ہوگا۔ اور معاً اس کے ذہن میں خطرہ ابھرا، فاروقی صاحب زمیندار ہیں اور یہاں زمینداروں کے بلائے ہوئے آئے ہیں اور گلاب باڑی میں جھاڑیوں کے درمیان یہ آم کے درخت نصب ہونے کی بے ضابطگی ان کے علم میں آگئی اور مالی نے فاروقی صاحب کا بُشرہ بھانپا تو اس طبقہ کے مزاج داں اور مردم شناس خدمتی کو سرخہ آم کی نوعیت تجسس کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا، مالی شیخ سے پہلی مرتبہ اتنے قریب معاملت میں آیا تھا۔ شیخ کا خلوص پہچان کر ہمت بڑھی ورنہ اس طبقہ کے فرد کی تواضع کرنا اس کا منصب نہ تھا۔ اطمینان ہوا، روسا کا خوشبو سنگھا کر موڈ بدلنے والے اَن پڑھ سائی کا لوحیرٹ نے اب بیٹی کو آواز دی "گلابو، گلابو" ادھر ہے، ذرا ایک دانہ اپنے پودے کا سرکار فاروقی میاں کو تو چکھا، ایک قاش اپنے سرخہ کی۔ ذرا سرکار بھی تو دیکھیں کیسا پھل وشنو جی نے طوطے کی چونچ میں لے کر اتارا ہے۔"

باپ کی پکار پر بیٹی کسی گرتے سے کام چھوڑ کر آئی، اتنے بہت سے غائبانہ تعارف کے بعد فاروقی صاحب کو اشتیاق ہو جانا چاہئے تھا مگر وہ سرخہ آم کے متعلق شدید پرچول میں تھے، ہاں ایک پھسلتی سی نگاہ سے دیکھا کہ رنگ روپ چال ڈھال میں خوب صورت تندرست لڑکی ہے، جیسی بالعموم چھوٹی ذات کے لوگوں میں نہیں ہوا کرتا اسم بامسمّیٰ "گلابو" ہے، گوڈر میں لال پھر خود فراموشی کا والہانہ انداز۔ گلابو نے مخصوص حویلیوں والا آداب کیا اور کیلے کے پتہ پر دو تین صبیح کے پسار والے آم لے کر آئی اور تراش تراش کر قاشیں فاروقی صاحب کو یک گونہ آزادی کے ساتھ پیش کیں اور فاروقی صاحب چکھ کر بھی آم کی شیرینی اور کیف میں اسی طرح کھو گئے جیسے ابھی ذرا دیر پہلے دیکھ کر متوجہ ہوئے تھے، بلاشبہ اس میں ابھی مالی کے آم اور بیٹی کے تعارف اور لڑکی کی معصوم ادا کو بھی دخل تھا، آم اور آم والی دونوں ہی خاصے جی اور داخلی طور پر ایک ہی سے تھے وہ آموں کی دنیا کے عقلِ کل اور متبصر تمام تھے لیکن سرخہ ایسا اس سے قبل نہ کھایا تھا۔ واقعی یہ دسہری تھا اور جنک جیسے مہاملی راجاؤں کے درمیان تحفہ میں چلنے کے قابل پھل ہے۔ تحسین و آفریں کرتی نگاہیں اوپر اٹھیں داد طلب نرگسی انکھڑیوں سے چار ہوئیں، ایسی معصوم، اتنی بیباک آنکھیں ہندوستان تو ہندوستان یورپ میں بھی نظر نہ آئی تھیں، پانچ سال کے قیام میں اور داد پانے پر بشرہ پر ماتاب اور ہونٹوں سے پھل جھڑیاں چھٹ گئیں۔

"اوں سرکار، وہ آں، آپ پال پسند فرماتے ہیں یا ڈال" لڑکی نے حویلیوں والے راج کنواریوں صاحبزادیوں کے انداز سے دریافت کیا۔

"ارے بی، ہم نہ اُدھر کے ہیں نہ اِدھر، جیسا ہاتھ آجائے کھا لیتے ہیں، آم ہو اور میٹھا ہو، ایسا جیسا تمہارا یہ سرخہ ہے بس۔"

"سرکار میں نے چند دانے پال میں لگا دیے تھے ان میں سے رات دو تین اُٹھ گئے میں نے دھو کر وہاں چھپر پر اوس میں رکھ دیے ہیں حاضر کروں؟ حضور پسند فرمائیں۔" گلابو نے اپنے مخصوص زبان میں کہا جو اس نے بچپن سے حویلیوں میں اختیار کی تھی۔ اس کی آواز کی جل ترنگ خدو خال کے تیکھے پن اور ادا کے رنگ و بو اور لذت میں کھو کر رہ گئے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے "ہوں، پال'۔ اچھا پال بھی ہے کوئی؟ مگر گرم ہوگا اس وقت تک۔"

"نہیں نہیں، جی ہاں سرکار پال بھی اور ٹھنڈا بھی وہ میں چند تیار دانے رات ہی اوس میں رکھ دیئے تھے اور کٹیا کے اوپر اُچکی، چھپر پر پونڈی ہوئی گلاب کی بیل کے نیچے سے چند دانے برآمد کیے۔ برف ہو رہے تھے، قاش کاٹ کر بڑھائی اور قاش چکھتے ہی گلاب کی خوشبو کا اندازہ ہوا۔ متعجب سے ہوئے، یہ خوشبو آم میں پہلی مرتبہ تجربہ میں آئی تھی۔ پال کا ایک آم کھا کر ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ سیوتی لال، مالی بھانپ گیا اور بولا "ہاں سرکار ہوں، اور حضور خوشبو کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"ہاں ہاں مالی، یہی تو میں کہنے والا — یہ گلاب کی خوشبو — ! یہ تو پہلی مرتبہ۔" مالی نے برجستہ منہ میں سے بات لے لی۔ "ہاں سرکار، آم میں گلاب کی خوشبو پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئی جبھی تو وہ میں نے وشنو جی کی کرپا والی بات کہی — ہوں — واں — سرکار اور یہ دو چار تلیں، اون آں میں نے، یوں سنچار لیں کہ جی چاہے تو کسی زمیندار کے باغ میں ہاتھ پھیلانے نہ جانا پڑے۔"

فاروقی صاحب "مگر مالی اس خطہ میں اور ہر ایسے خطہ میں جیسا یہ آموں کا ہے، آم کے پھل کی کوئی قیمت تو نہیں ہوا کرتی اور ہاتھ پھیلانے کی بات بیکار ہے، جہاں سے چاہو اُٹھا کر کھا لے جو بھی — یہ تو یہاں تازہ پانی اور ہوا کے مول ہے۔ ہاں یہ بات کرو کہ تمہارا جیسا آم کسی باغ میں ہے بھی کسی رئیس کے پاس، اس کی اصل نسل حسب نسب دریافت کرو، تم تو اس معاملہ میں بڑے کھوجی ہو۔"

مالی نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔ "جی ہاں سرکار بجا فرمایا، وہ یہی بات تو ہے معلوم کرنے کی، پھر جس دن سے مجھے یہ سرخہ معلوم ہوا ہے، سرکار بارہ برس ہونے کو آئے میں نے پرانے پرانے پانچ پانچ سو برس کے تخمی باغ ڈھونڈھ ڈالے پر کہیں سراغ نہ ملا کہ وہ طوطا، کوا چمگادڑ جو بھی ہو کہاں سے لے کر آیا تھا۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ درخت کٹ گیا، سوکھ گیا اور دنیا سے ختم ہو کر بیکنٹھ باسی ہوا۔ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے ہمارے صاحبزادوں میں پرانے باغوں کے اندر سے کھٹا درخت کاٹ پھینکنے کی آل چل پڑی، آپ سمجھتے ہی ہیں، بڑے بوڑھے تو غور بھی کریں اور مان بھی لیں سرکار یہ نئے صاحبزادے تو کتاب پڑھ کر بات کرتے ہیں اور کتاب میں لکھی پر عمل کرتے ہیں میں نے ہر چند کہا کہ میاں! خدا کی مخلوق مٹائے نہیں مٹا کرتی، دنیا میں کھٹے آم بھی رہیں گے اور میٹھے بھی۔ مگر ان صاحبزادوں میں ایک دفعہ کو چل پڑے پھر کوئی روک نہیں سکتا، تمام پرانے باغوں میں کلہاڑی بج اٹھی — اور سرکار ہماری آپ کی طرح ان درختوں میں بھی جان ہے، یہ کلہاڑی کی آواز سے سہم جاتے ہیں۔ ایک کھٹا درخت کاٹا گیا برابر والے دوسرے میٹھے درخت سہم کر رہ گئے بعض کمزور تو ڈر کے مارے سوکھ کر مر کر رہ گئے اور پورے کے پورے باغ نے دو دو فصل پھل نہ دیا۔"

"وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو مشہور بات ہے، پرانے بزرگوں سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ جس باغ میں کلہاڑا بج جاتا ہے وہ سہم کر ختم ہو جاتا ہے، تو تمہارا کیا خیال ہے کیا اس سرخہ کا اصلی تخمی کہیں سوکھ کر رہ گیا اور اب دنیا میں اس کا اصل باقی نہیں ہے۔" فاروقی صاحب نے کہا۔

"سرکار سوکھا نہیں تو غلطی سے کھٹوں کے ساتھ جھپٹ میں آگیا۔ ویسے صاحبزادوں راجکماروں نے چکھ چکھ کر ہر کھٹے درخت پر کھود دے کر

نشان لگایا تھا تب سے کتنے آئے تھے۔ مگر کون جانے کہاں سے کب غائب ہوا۔ کٹیا سوکھا اور سرکار جبھی تو مجھے وشنو جی کی خاص کرپا کا گمان ہوتا ہے یہ آم اوتار ہے اور لڑکی نے اس تحقیق کی گفتگو میں دخل در معقولات کیا۔" ہاں سرکار اور اس سرخہ کی کچی کنیڑی پال اٹھ جاتی ہے اور سرکار مدپر ہو تو پال میں لگا کر بھول جاؤ تو پک کر کھجور کی طرح خشک ہو کر رہ جاتا ہے، سڑتا نہیں اور ہاں سرکار اس وقت اس میں گلاب کی خوشبو بہت تیز ہو جاتی ہے۔"

فاروقی صاحب سنتے رہے اور چلتے وقت بولے۔" مالی دیکھو ابھی تو ہفتہ بھر سے اس کے ٹیکے ہمیں واں بنگلہ میں پہنچاتے رہو اور ان چھوٹی بڑی قلموں کی خاص نگرانی کرو، بڑے اچھے پیوند ہیں اور بڑے ہونہار پودے، خاص طور پر وہ آخر والے گملوں میں بڑی اچھی چپکی پروان چڑھتی قلمیں ہیں۔ زمین میں نصب ہوتے ہی سنبھال کر اٹھیں گی اور چند روز میں تیار ہو جائیں گی انھیں پھلنے میں مشکل پانچواں سال لگے گا ورنہ اس سے پہلے ہی بور آ جائے گا اور تیسرے سال پھل دے دیں گی۔ پرانی شاخیں ہیں"۔

ہاں سرکار درخت اونچا نہیں جاتا گٹھی بن کر پانچ چھ فٹ بڑھ کر پھیلتا ہے، اپنے سپیدہ ملیح آبادی کے پودے کی طرح اور ویسا ہی بے تحاشا لدتا ہے، دیکھئے نا۔

اور دلوں کا حال تو اللہ جانے، یا پھر وہ خود، تاہم فاروقی صاحب نے اپنی ساکھ و وجاہت حکمت عملی کے ذریعہ اس سرداران اودھ اور شاہان روہیل کھنڈ کے دور کی تاریخی روایت کو بچا لیا اور دونوں فریقوں کے ہاتھ ملوا دیئے اور نمائش مقابلہ کے اہتمام کا کام اپنے سر لیا ورنہ وہ تو ہمیشہ سے روہیل کھنڈ کے ایک سرحدی ضلع کے خاموش دور کے تماشائی اور ان صف آرا زمینداروں کی بہ نسبت بہت معمولی حیثیت کے زمیندار تھے۔ اور پھر نہ پٹھان، نہ مغل، نہ ایرانی، سیدھے سادے "شیخ" اور "بیٹھا بیٹھا دیکھ" پر عامل۔

اور وہ مبارک ساعت آ ہی لگی۔ دیکھا گیا ہے ایسی شبھ گھڑیوں میں قدرت بھی خصوصی تعاون اور بخششوں پر آ جاتی ہے۔ پہلی بات تو ملک گیر آم کی اتنی وافر فصل ہوئی کہ سو سو برس عمر کے بوڑھے کہتے کہ ایسی بھری فصل ہوش میں نہ دیکھی تھی، پھر جشن منانے کے لیے موسم نے بڑا ساتھ دیا، ساون بھادوں ملنے کی کہت مہورت تھی، پُروائی پچھیاؤ اُدتا (شمالی مغربی) ٹکرا ٹکرا کر چوبیاتی ہیں اور دنیا غرق آب ہو جاتی ہے، مگر اس مرتبہ یہ صورت پچھلے ہفتہ میں بیت گئی اور نمائش مقابلہ والا ہفتہ گہرا ابر آلود رہا، اُودی اُودی سرمئی گھٹائیں اور بھورے بھورے بادل چڑھتے اترتے افق تا افق شامیانے تانے رہے تیز دھوپ گہرے بادلوں میں چھپی رہی، ٹھنڈی ہوائیں پورب پچھم اور اترے چل چل کر چوبیاتی رہیں، اور موسم انتہائی خوشگوار رہا۔ پچھلے دو ہفتوں میں تیز بارشوں نے زمین کی چھاتی جل تھل بھر دی تھی، اب اس ہفتہ میں بانسوں کمزور پڑ چکی تھی، چوسمتی ٹکراتی ہوائیں ٹھہر ٹھہر کر پانی کی پوٹ لیے اِدھر اُدھر ہوتیں تو خوش خرام باجرا پھوہاروں کی چلتی پھرتی دیواریں ہی ٹکرا ٹکرا جاتیں، گڈمڈ ہو جاتیں، کپڑے نم ہو جاتے اور چھتریاں کھلتے کھلتے منہ دھوتی نکل جاتیں موسم خوشگوار اٹھکیلیاں ہی کرتا کالے کالے بادلوں کے اندر اندر مہاراج کا آتشیں کوڑا لہرا کر کڑک کڑکتا اور اک ذرا کے ذرا کوئلوں، پپیہوں اور موروں کو متوجہ کر کے آواز نکالنے پر مجبور کر دیتا، میدان میں کھڑے ہوئے چشم آہو والے ہرنوں کی ڈاڑھیں موج میں اچھل کر جا پڑتیں۔ کلیلیں بھر کر ادھر سے ادھر منتشر ہو کر پھر جمع ہو ہو جاتیں تم فضا میں مٹھاس رچی ہوئی تھی، آموں کے بوجھ سے ڈالیاں گھاس تک آ لگی تھیں، ذہنوں میں چاشنی دار رس رچا ہوا تھا، بشروں میں مٹھاس ہی مٹھاس نظر آتی تھی، خوبو

میں ہلکا ہلکا سُرور متحرک تھا۔ درختوں کی چوٹی سے لے کر سبز گھاس تک ڈال ڈال پات پات رنگ برنگے امرت بھرے آم سے لدے درخت پر نگاہ پڑتی تو جذبۂ عبودیت بیدار ہوتا، زمین کی چھاتی حیات آفریں نمی سے پُر تھی، فضا بسیط رس کی نعمتوں سے بھری ہوئی تھی، شش جہات میں رنگینیاں ہی رنگینیاں، شیرینیاں خوشبوئیں ہی خوشبوئیں سرور ہی سرور تھا، آم کا جشنِ نوروز تھا، آدمیوں کے مزاج رسیلے ہو رہے تھے، موسم کی رومانی کیفیت جشن کی داخلی و خارجی سرخوشی کو دوبالا کر رہی تھی اور سونے پر سہاگہ اس نواح کے ایک نوجوان راجپوت کے نودھے باغ کا بیاہ رچا ہوا تھا اُس نے کوشش کر کے اپنے اس نئے باغ کی بارہ دری میں نمائش مقابلہ کا انتظام کرایا تھا اور پورے ہفتہ وضیافت کی دعوت عام دی تھی دلہن باغ کا بنگلہ مقابلہ کی جگہ قرار دیا گیا۔ آس پاس کے باغوں کے بنگلے بارہ دربان خانہ باغ اور متعلقہ قصبوں دیہات کے اندر مہمانوں کے قیام کا انتظام ہوا اور یہ سب انتظام مسٹر فاروقی کا تھا۔

نوجوان ٹھاکر کا نودھا باغ تیسرا پھل لایا تھا اور شادی رچانے کی مہورت ایسی فصل میں برہمنوں نے نکالی تھی، باغ کی چوحدی پہ سرخ قناتیں لگائی تھیں، اور نو تعمیر بنگلہ کے چبوترہ پر گولڑ کا درخت ایستادہ تھا قدیم روایت کے مطابق اس کو دولہ بنایا گیا تھا، پورے درخت کو رنگین ڈورے اور سنہرے روپہلے تار کے سہرے کی لمبی لمبی لڑیوں سے ڈھانک دیا گیا تھا ایسا کہ کہیں پتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ اِس روہیل کھنڈی جوان ٹھاکر راجپوت نے اس نمائش اور مقابلہ کی مخصوص شہرت کے تحت اپنے باغ کی شادی کے لیے یہ ہفتہ انتخاب کیا تھا، ملک بھر میں دعوتی کارڈ ڈاک کے ذریعہ ارسال کئے تھے قرب وجوار میں ہرکاروں کے ذریعہ تقسیم کرائے تھے، ڈھول کے ذریعہ منادی کرا کر دیہات اور گاؤں کی لگنے والی ہاٹوں نخاسوں میں دعوتِ عام دی تھی۔ مجمع پچھلے دو سال کی افواہوں کے سبب یوں بھی زیادہ ہوتا تھا، پھر شادی کی دعوتِ عام — اور خلوص دل بھی شامل ہو تو قدرت بھی مدد کرتی ہے۔ مسٹر فاروقی کے خلوص کا تصرف فصل بھی اتنی بھری ہوئی تھی کہ بوڑھے بوڑھے کہتے تھے کہ انہوں نے اپنی عمر میں نہ دیکھی تھی۔ اس عرصہ میں موسم بھی خلافِ امید ایسا سازگار رہا جیسے یہ بھی ان کے حسنِ انتظام کا حصہ ہے۔ خوشیاں خوش بختیاں خوش فعلیاں خوش گپیاں موسم کے اعتدال کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ جو نہ آنے کو تھا وہ بھی آیا۔ مجمع امید سے زیادہ ہو گیا۔ آس پاس کے باغ دار تیس تیس چالیس چالیس میل تک سے اپنے تین تین دن تک کے پسار کے کل آم چھکڑوں میں بھر بھر کے نمائش میں لائے تھے، دربھنگہ مرشد آباد، مدراس بمبئی اور سی پی وا سے جنوبی مشرقی گروپ کے نام سے اپنے آموں کے کریٹ مقابلہ میں لے کر خود آئے تھے اور دور دور گین پارسل فروٹ ایکسپریس کے ذریعے نمائش میں ملک کے اندر جگہ جگہ سے آئے تھے دنیا آم ہی آم تھی۔ ڈھیروں کے بجائے آم کے ٹیلے تھے، آم کے پہاڑ تھے، آموں کے فرش تھے، جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔

مخصوص مناسب جگہوں پر ٹھاکر کے باغ کی شادی کے پکوان چڑھے تھے، نوجوان ٹھاکر اور اس کے عزیز آنے والوں کو بلا تخصیص چھوٹے بڑے غریب امیر مخصوص انداز میں تواضع کے ساتھ پوری کچوری اور حلوہ بھوج پیش کر رہے تھے۔ جگہ جگہ دودھ برف کی سبیلیں لگی ہوئی تھیں ٹوپیاں جمع تھیں، پکوان، آم حلوہ، دودھ برف کا دور چل رہا تھا ہتھے چمچے تھے، مٹی کے آب خوروں میں سرد دودھ کا دور اور آم پھر دودھ کا دور پھر پوری کچوری حلوہ چل رہا تھا، خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ بہتات و فراوانی، مٹھاس اور رس، سرد دودھ اور گرم گرم پکوان، موسم انتہائی خوشگوار، سرگوشیوں میں دل کی کدورتیں دور ہو گئی تھیں، غبار ڈھل گئے تھے جیسے اس اونچے طبقہ کی نفسیات ہی بدل گئی تھی بڑوں کی تقریب تھی اور تقریبیں ہوتی ہی بڑوں کی ہیں لیکن آج ہر چھوٹے سے چھوٹا بھی کسان کھیت مزدور بھی اس کو اپنی ذاتی تقریب

محسوس کر رہا تھا، جو اپنی نوعیت کی تاریخ میں شاید پہلی چیز تھی۔ آم کے رس کا تصرف فضا میں سُکر کی کیفیت پیدا کر رہا تھا، ہر شخص سرور میں تھا۔ اور اپنا ذاتی جشن سا منا رہا تھا۔ ویسے ہر سال مجمع اور رونق سب کچھ انہیں کے دم سے ہوا کرتا، اگرچہ ان بیچاروں کی پوزیشن جو تھی وہ تھی، مگر اجتماع نام ہے میلہ نمائش مقابلہ کا اور یہ انھیں کے ذریعہ ہو سکتا تھا، لیکن اس مرتبہ یہ لوگ کچھ زیادہ ہی آئے تھے اور معمولی حیثیت کے باغ دار اپنا ہفتہ بھر کا کل آم لے کر آ گئے تھے جگہ جگہ چھوٹی بڑی ڈھیریاں تھیں، نئی اقسام اور غیر معروف آموں سے عوام الناس کو آشنا کرنے کے لیے طرح طرح کی اقسام لائی گئی تھیں، ہر حیثیت کے لوگوں کو تواضع کے ساتھ کھلا کھلا کر خوش ہو رہے تھے۔ ہفتہ بھر آموں کے سیلاب طوفان سے اُمنڈتے رہے، کھانے کھلانے کا بازار گرم رہا اور آم کم بخت ایسا خوردنی جنس ہے جس سے پیٹ تو بھرتا ہے نیت نہیں بھرا کرتی اور اس مرتبہ نیت میں بھی سیری کے آثار پیدا ہونے لگے، یا شاید کھاتے کھاتے منہ تھکے اور جتنے منہ اُتنی باتیں اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق ٹولیاں کی ٹولیاں مجلس عاملہ اور ججوں کے فرائض پر بحث کرنے لگیں۔ ایک عجیب سی نوعیت کی پنچایت پھیل گئی۔ مجلس عاملہ کا اجلاس مقابلہ کے انعقاد سے ایک روز قبل ہوا کرتا تھا، مجلس عاملہ سے بڑی باڈی تھی مقابلہ میں آنے والے آموں کے متعلق معلومات اور اگر پھل آ گئے ہوتے تو سرسری جائزہ لیتے تھے۔ سطحی اعتراض ٹیکنیکل عذرداریاں پیش ہوتی تھیں اجلاس ہوا تو ایک مخصوص نام کو مقابلہ میں آنے سے اراکین نے کچھ پس و پیش اور ذرا غور کیا اور سکریٹری کی حیثیت سے کچھ سوالات استفسار کئے، کیونکہ مقابلہ میں آنے والا تمام شرکا مقابلہ کے بہ نسبت چھوٹا آدمی تھا، مگر فاروقی صاحب نے اس کا کیس پلیڈ کیا کہ مقابلہ کے لیے آئینی طور پر چھوٹی بڑی حیثیت کی شرط نہیں ہے، درحقیقت یہ بہتر سے بہتر آم تحقیق ہو جانے کی کسوٹی ہوتی ہے، کوئی لائے اچھا آم تحقیق ہو جانا چاہیئے اور اس طرح یہ تحقیق چھوٹوں بڑوں سب کے مفاد میں ہے اور آئین کے اندر پہلی شق شرط عام مقابلہ ہے اور یہ اعلیٰ سے اعلیٰ آم کی تحقیق ہو جاتا ہے"۔ مجلس عاملہ میں ایک مقتدر رئیس پڑھے لکھے خان بہادر قسم کے بھی تھے بولے۔ مگر اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ کوئی ادنیٰ آدمی اپنا آم مقابلہ پر لا کر ہمارے برابر آ کھڑا ہو"۔

فاروقی صاحب نے ادب سے کہا "اگر ادنیٰ سے ادنیٰ آم پیدا کر کے پیش کرتا ہے تو وہ اعلیٰ آدمیوں کے بھی مفاد میں ہے۔ اور مقابلہ پر ادنیٰ غلام نہیں اعلیٰ آم آئے گا اور غلام بھی کوئی اعلیٰ چیز ہمارے کلچر کو دیتا ہے تو تمدن سازی کے ضمن میں اس کا کارنامہ زندہ رہے گا۔ اعلیٰ ایجاد و دریافت صرف اعلیٰ طبقہ کی اجارہ داری تو نہیں ہے۔ اور وہ تو چھوٹوں بڑوں سب کے مفاد میں ہے۔ یہ نہ دیکھئے کہ کس نے دی ہے بلکہ یہ دیکھیے کہ کس پایہ کی چیز دی ہے"۔

مگر باہر یہ چیز کچھ زیادہ پھلی نہیں میلہ کا ٹیمپو تفریح اتنی زیادہ تھی کہ گم ہو کر رہ گئی۔

پہلے اندر پنچایت پھیلی، مجلس عاملہ کے صدر کچھ زیادہ ہی جُز بُز تھے، دیکھئے مسٹر فاروقی آپ ہمیں میں سے ایک ہیں اور آپ اپنی روایات کو جانتے ہیں، کسی ادنیٰ طبقہ کے فرد کے آم کو مقابلہ میں شریک نہیں کیا جاتا رہا ہے آج تک لیکن رد ہیل کھنڈیوں کے متعلق انکشاف ہو چکا ہے کہ پچھلے مقابلوں میں اپنے کاشتکاروں کے آم رکھ دیئے تھے لا کر"۔

"جناب یہ کوئی نئی بات تو نہیں قبلہ رد ہیلوں نے تو اپنے سربراہی چھوٹے طبقہ میں سے عظیم آدمی تلاش کر کر کے بنائے ہیں"۔ فاروقی صاحب نے نہایت نیاز مندانہ انداز سے کہا۔

"لیکن آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں میرے خورد وں میں ہیں، کیا عرض کروں، آپ ایک ادنیٰ غلام کو اتنے بڑے بڑوں کے سامنے لا رہے ہیں

سوچ لیجیے۔"

ایک روہیل کھنڈی چوہان ٹھاکر صاحب نے جواب دیا۔" خان بہادر صاحب، پھر کیا کیا جائے، روہیلوں کی طاقت یہی چمار چورے کسان لودھے، دھنے، جولاہے، مولازادے، جھوجھے تھے۔ روہیل کھنڈی ٹھاکر راجپوت اور روہیلے پٹھان تو انھیں کی فوج بنا کر ادھر پنجاب تک سکھ سرداروں کو، ادھر دکھن میں بنگش پٹھانوں کو اور بیچ میں دتی کے تحت کے ٹھیکیدار مرہٹوں کو اور آپ کی جانب شاہ اودھ اور انگریز بہادر کو للکارا کرتے تھے۔"

" خیر چھوڑو بھی، سیوتی لال ؟! ہوں خود بھگتے گا مینڈھا ہاتھی سے ٹکرلے کر، اور آپ لوگ بچانے کے لئے نہ آئیں گے، مقابلہ پہ تو لے آئے۔" ایک اودھ کے راجہ صاحب نے کہا اور کرسی پر ترچھے ہو گئے۔

فاروقی صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔" لاحول ولا قوۃ۔ یہ ادنیٰ و اعلیٰ چھوٹے بڑے ٹھاکر برہمن، سید مغل پٹھان یا غریب امیر کا مقابلہ نہیں ہے۔ میرے محترم یہ اچھے سے اچھے آم کی دریافت کا میلہ ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک طے بھی ہو سکتا ہے کہ ہر ایک آم کے چیلنج کو برداشت کیا جائے اور جانچ تحقیق کے لیے میدان میں لایا جائے"۔

ایک برہمن راجہ صاحب نے بات کاٹ دی۔" ہاں بھئی کل جگ ہے کل جگ، اب للو پنجو شرفا کے سامنے آ رہے ہیں۔ بھلا مقدر ہمارا بھلا مالی، غلام ہمارے مقابلہ پر!!۔ آپ تو رئیس زادہ ہیں، شیخ فاروقی خاص عرب کے۔"

خان بہادر صاحب نے کہا۔" میاں فاروقی صاحب بہادر آپ شریف زادہ ہیں ذرا بزرگوں کی روایات کا پاس کرو" ہماری نہیں اپنی عزت کا ہی خیال کرو۔"

فاروقی صاحب نے بات کاٹ دی۔" میرے بزرگوں نے تو وہاں غلاموں کو سپہ سالاری دی اور فتح کے بعد سر پر شاہی عطا کی اور یہاں غلام کے سر پہ ہندوستان کا پہلا تاج پہنایا اور نسلاً بعد نسلاً غلاموں سے شہنشاہی کرائی ——— میری کچھ نہ پوچھئے اگر آپ ازلی شدرکو بھی میرے مقابلہ پر ڈال دیں گے تو میں اس کا چیلنج ایسی ہی خوشی کے ساتھ قبول کروں گا۔ جیسے کسی راجپوت ٹھاکر سید پٹھان کا۔"

خان صاحب نے تلخ ہو کر ان چوہان ٹھاکر صاحب کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے کہا۔" لاحول ولا قوۃ۔ چھوڑو جی بل بیر سنگھ۔ ہاں جناب ذرا ان سے پوچھو ان مسٹر فاروقی صاحب بہادر سیکریٹری نمائش و مقابلہ کیا نام اس کا ہمیں منظور ہے۔ سیوتی لال مالی۔"

" جی نہیں قبلہ گلابو دختر سیوتی لال مالی۔"

ہوں یہ بھی کوئی روہیل کھنڈی راجپوت ہوں گے؟ اور یہ گلابو کوئی راجکنواری۔ ہیں نا؟"

" عورت نہیں، ہنجڑے مقابلہ پر لاؤ مالن نہیں بھنگن ——— مقدر اپنا، آپ سکریٹری جو ہیں۔" مجمع میں سے پیچھے سے کوئی بڑبڑایا۔ فاروقی صاحب نے چونک کر دیکھا۔

" جی ہاں، جی ہاں، سیوتی لال مالی۔" مسٹر فاروقی نے کہا خاں صاحب اور نام لکھتے ہوئے بڑبڑائے۔" اجی، روہیل کھنڈی چوہان راجپوت لکھائیے" اور یہ کہتے ہوئے اپنے ساتھی راجہ بل بیر سنگھ کی جانب مخصوص داد رسی طلب نگاہوں سے دیکھا، اور بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بل بیر سنگھ بڑبڑائے" ہاتھی سے مینڈھا ٹکرلے گا بھگتے گا۔ (گالی)"

بات حافظ رحمت خاں روہیلہ اور شجاع الدولہ سے وارن ہیسٹنگز تک الٹی قلابازیاں کھاتی، ماورالتاریخی دور میں جا پہنچی تھی اور۔ پرتھوی راج سے چند اور محمد غوری و قطب الدین ایبک کے گرد چکر لگا رہی تھی وہ تو خیریت گذری کہ راجہ جل بیر سنگھ کے سر پہ سے ٹل گئی اور خان صاحب نے نزاکت کا اندازہ کر کے آئی گئی کر دی، اور دوسرا ہی دن مقابلہ کا تھا آرے آرے ہو گئی کہ رئیسوں کے مقابلہ پہ ایک ادنیٰ مالی نئے سکریٹری صاحب لے کر آئے ہیں پٹھان، ٹھاکر، بچھوتوں کے مقابلہ پر ایک شُدرا اور اس شہرت کے ساتھ ہی مسٹر فاروقی کی پوزیشن کو اس چھوٹے بڑوں کے تمام مجمع میں حیرت تعجب غم غصہ قنوط طرسنک کے انداز میں ہر شریک جشن نے اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق محسوس کیا حتیٰ کہ سیوتی لال مالی سامنے پڑنے کی ہمت نہ کر سکا تاہم معصوم نوخیز مالی کی لڑکی گلابو جو بیگمات، رانیوں اور راج کنواریوں میں صبح ہی صبح پھول مہندی لے کر جایا کرتی تھی اور حویلیوں میں جس کی کھلونے کی طرح پذیرائی ہوا کرتی تھی اسی طرح کا ایک کھیل والا مشغلہ سمجھ کر تیار ہو گئی۔

علی الصبح مسٹر فاروقی نے سکریٹری کی حیثیت سے مقابلہ کا انعقاد کیا اور ججوں کے سامنے اُدھر اندر آم پیش ہو رہے تھے اِدھر باہر "جتنے منہ "اتنی باتیں" کے بجائے۔ جتنے منہ اور "ایک ہی" بات تھی "یہ اچھے انگریز منش سکسٹر صاحب بہادر لا کر مسلط کر لئے مقابلہ پہ کمین کھڑا کر دیا۔ کوئی مالی بھلا۔ یہ کوئی شرافت ہوئی"

یہ کون سی عنائت ہے۔ ویسے تو یہ بھی شیخ ہیں اور شیخ ہو کر "پھر یہ دوغلہ پن دکھلایا"!! حیرت ہے"

"انگریزی پڑھے، ولائت پلٹ! یہ وضع داری کیا جانیں بیچارے اور پھر شیخ تو شیخ ہوتے ہیں۔ اپنے آپ الگ رہے اور بیٹھے بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہیں، اگر آج اپنا کوئی مقابلہ میں ہوتا تو یہ مالی کا آم مقابلہ میں پاس بھی نہ ہوتا۔ بُرا زمانہ آگیا، چودھویں صدی ہے چودھویں قرب قیامت کہیں، غربا شُربا، شریفوں امیروں رئیسوں کے منہ آ رہے ہیں دیکھو نا"

"اب آبرو سے شیوہ اہل نظر گئی۔ مالی آگیا سارے اودھ روہیل کھنڈ، مرشد آباد دربھنگہ اجی پورے ہندوستان کے سامنے مقابلہ کرنے اللہ خیر کرے زمانہ کیا کیا دکھلائے"

"کل جگ ہے کل جگ راون نہیں چڑھ آیا تھا مہاراجہ رام چندر جی پہ کیا نتیجہ ہوا آج تک (گالی) ہر سال جل رہا ہے (گالی) پوری کوڑی ہندوستان بھر میں لعنت ماری پھر رہی ہے بھئی یہ روہیل کھنڈی کی۔ اودھ والوں سے تو نباہ کر چلے ہی نہیں، ہمیشہ چوہانوں، تو مڑوں راٹھوروں، بھٹیلوں کے بھیس میں چماروں، کسانوں کی فوج لے کر اودھ پہ چڑھے اور خود مٹ گئے اور اودھ کو بھی میٹ دیا"

"یارب العزت۔ تو ہی نگہبان ہے شریفوں کی عزت کا آج"

"اجی خان صاحب۔ عزت تو گئی اسی گھڑی جب ایک ادنیٰ شدر غلام آپ کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا اس روہیلے پٹھان شیخ نے ہم سب شریفوں کے سامنے"

"اجی صاحب سب ملے ہوئے ہیں یاں سے واں تک ان روہیلوں نے تو اپنے تخت پر ادنیٰ جاٹ بٹھائے ہیں تاریخ کھول کر دیکھ لیجیے۔ ان کے یہاں شرافت نجابت وراثت کب چلتی تھی بس جو ذرا دل چلا سردار چمک جائے وہی بس تخت پر بٹھا کر اچھے اچھے روہیلے پٹھان سردار اس کے سامنے جھکا کرتے تھے یہ کیا جانیں شرافت نجابت وراثت کیا چیز ہوتی ہے"

ایک روہیل کھنڈی شیخ نے جواب دیا۔ جو یہ تمام چہ میگوئیاں سن رہے تھے۔ "لیکن ان انگریز منش صاحبزادہ مسٹر فاروقی کے ہاتھ

میں انتظام تو اودھ والوں ہی نے دیا۔"

"ہاں بھئی دیا۔ اودھ ہی والوں نے دیا پھر اودھ ہی والے بھگت بھی رہے ہیں۔" ایک اودھ کے ٹھاکر صاحب بولے۔

"کیوں کیا روہیل کھنڈی اور یہ غریب مرشد آبادی اور سارے کے سارے جنوبی مشرقی اس توہین میں نہیں شریک ہیں کیا؟" شیخ بولا۔

"ہاں میاں ہمارا ہی جوتا ہمارا ہی سر۔ پورے ملک کے شرفا سے ایک ادنیٰ شُدر کی ٹکر کرا دی اس فطرتی روہیل کھنڈی شیخ نے ڈیڑھ صدی کا انتقام لیا ظالم نے یہ تو اس شیخ کے ہاتھ میں انتظام دینا ہی غلطی تھا کسی روہیلے پٹھان یا سادات امروہہ، سادات بارہ کے کسی شریف نجیب الطرفین غریب آدمی کو دے دیتے۔ کم از کم اس کو شریفوں کی عزت کا پاس تو ہوتا۔ یہ شیخ تو بڑا فطرتی نکلا صاحب سب کے سر پہ جوتا گھموا دیا۔ مفت میں غضب رے غضب۔"

"اور آم تو دیکھو، یاں سے واں تک ہزاروں من مال برباد کرا دیا۔ دنیا بھر کے گنوار لٹھ جمع کر لئے ہیں بھلا انھیں کیا تمیز، یہ میٹھا سمجھتے ہیں خواہ مالدہ ہو یا چونسہ"۔

"اور وہ ٹھاکر رن بیر سنگھ کو دیکھا یعنی باغ کا بیاہ رچا ڈالا۔ سیکڑوں من میدہ گھی آلو کھٹمل برباد کر دیا۔ اجی اور تو اور دودھ برف کی سبیلیں!"

مقابلہ کے آم پہلے بارہ دری کے ایک کمرہ میں جمع کئے گئے، خوبصورت سرخ سبز پیلے پیلے کاغذ اور رنگین ڈھکنوں سے ڈھکی ہوئیں ٹوکریاں اندر آموں پر چاندی کے ورق لگے ہوئے باہر سے جو آم بذریعہ ریل یا رسل آئے تھے ان کا کوئی نمائندہ اگر ساتھ نہیں آیا تھا تو سیکرٹری کو خود اپنے اہتمام سے پیش کرنا تھے۔ کسی منچلے شاعر مزاج شوقین نے برف کی سِل میں آم جما کر اور سِل توڑ کر پیش کیے تو کوئی روئی کے نرم گالوں میں رکھ کر لایا اور کوئی شیشہ کے جہازی مرتبانوں کے اندر کوئی پھولوں میں۔ باکر اور کوئی نفاست کے ساتھ کوئی صندل، آبنوس ہاتھی دانت کی ڈبے میں لگا کر، اور نمائش شروع ہونے سے ذرا قبل گلابو سر پہ اپنے آموں کی ڈلیا لے کر پہنچی، دونوں ہاتھوں سے انگڑائی کی صورت سر پہ سنبھالے۔ ویسے ہی جیسے بچپن سے دیوان خانہ کے صحن سے گزرتی پھول مہندی کی ڈلیا لیے زنان خانہ کی ڈیوڑھی میں جایا کرتی تھی۔ ماحول سے بے خبر، الہڑ پن کے ساتھ گذرتی چلی جاتی اور حویلی میں پہنچ کر بیگموں بہوؤں اور راجکنوریوں صاحبزادیوں میں اس طرح گھل مل جاتی جیسے یہ انھیں میں سے ایک ہے مگر اس وقت پولین کی پہلی سیڑھی سے ساتویں سیڑھی تک چڑھتے چڑھتے چودہ کے چودہ ریمارک ہو گئے، نوجوان زمینداروں میں بزرگوں کی موجودگی کے سبب صرف ناک بھوں چلی اور ٹھنڈی سانسیں بھری گئیں منچلے جواں سال لوٹ پوٹ ہو کر آپس میں دو ایک جملوں تک رہ گئے ——— گدگدی کو دبانے کے لیے غیر شعوری طور پر آہستہ آہستہ ہاتھ چھاتی تک پہنچ گئے دو ایک کھنکھار پڑے کسی نے ہلکا سا آوازہ کسا اور تو اور جھک سفید بوڑھوں تک کے چہرے ہموار ہو گئے اور رہائے! اپنا اپنا زمانہ یاد آ کر جیسے مسلط ہو گیا۔ "آمن انگوری ہے — اجی"

"اجی آمن فرنگن" — "ہوں" "آمن حسن آرا ———" "بھئی یہ تو آمن عردس ہے" "کیا کہتے ہو یار" "برانڈ آف رشیا" — "ارے ارے گلابو ہے وہ تو یوتی لال مالی کی لونڈیا" — "اوہو ہو، کیسے رنگین پرزے نکالے ہیں ظالم نے، چیت کی تتلی ہو رہی ہے پچرنگی تتلی" "بھاروں کی دھنک کہو" "اجی یہ اپنا آم نمائش میں لے کر آئی ہے یا خود" "یہی تو دریافت ہے سنتے ہیں روہیل کھنڈی انگریز

منش سیکرٹری صاحب بہادر کی۔" "بچئے میرے مالک"۔" کون جیت پائے گا اس سے، کیا روہیل کھنڈ سے ساتھ لائے ہیں صاحب بہادر"۔
"نہیں جی وہ سیوتی لال استاد مالی کی بیٹی ہے"۔ — اور ان آوازوں ریمارکوں کے درمیان معصوم چال چلتی، الھڑپن سے دلوں کو پائمال کرتی مسٹر فاروقی کی رہنمائی میں ججوں کے بورڈ کے سامنے جا پہنچی اور یہ آخری "اگزیبٹ" تھی۔ اس سے پیشتر جج تھوڑی بہت بحث تمحیث مقابلہ میں آنے والے ہر آم کا نام موجد کا نام اور حسب نصب سنتے رہے تھے اور چکھ چکھ کر نمبر دیتے رہے تھے اور سب سے آخیر میں گلابو کی باری آئی۔ کیلے کے پتوں سے منڈھی پوری ٹوکری یوں ہی اٹھا کر سامنے والی لمبی چوڑی میز پر رکھ دی۔ ججوں سے دریافت کرنے والے کا نام پوچھا تو بولی "گلابو مالن"۔ مزید تعریف پوچھی تو کچھ بولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن مسٹر فاروقی نے لقمہ دیا۔
دختر سیوتی لال مالی"۔
مقام کا نام پوچھا تو لڑکی سمجھ نہ سکی لیکن فاروقی صاحب نے عجیب بات بڑھائی۔" اودھ روہیل کھنڈ"
جج کچھ شش و پنج میں پڑے مگر یہ ان کے جیوری ڈکشن کی بات نہ تھی انھیں تو آم کا درجہ طے کرنا تھا، یہ مہمل سا جواب انہوں نے جوں کا توں نوٹ کر لیا۔ آم کا نام پوچھا تو لڑکی تو کیا جواب دیتی یہ چیز گڑھنا فاروقی صاحب بھی بھول گئے تھے ذرا ٹھٹکے پھر گھونٹ سالے کر برجستہ بولے جی "گلاب خاص"۔ گلاب خاص۔ ہے نا؟" ایں گلابو؟" اور گلابو نے اثبات میں سر ہلایا اور آم تراش کر قاشیں جج کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کیں، چکھ کر جھوم ہی تو اٹھے ادھر گلابو نے ڈلیا کے اوپر سے کیلے کا پتہ ہٹایا جیسے دیسی گلاب کے پھولوں سے لبریز ٹوکری ساتھ ہی آم کی مخصوص خوشبو کے ساتھ ہلکی ہلکی گلاب کی خوشبو ناک میں پہنچی، تو چونکے، ادھر قاش منہ کے اندر پہنچتے ہی یہ گلاب کی خوشبو بالکل نمایاں محسوس ہوئی بے اختیار منہ سے سبحان اللہ نکلا اور گلابو جلدی جلدی قاشیں کاٹ کاٹ کر پلیٹوں میں رکھنے لگی، حسب نسب اور اصلی تخمی درخت کی جا و قوع پوچھی تو کوے کی کھا کر پھینکی گٹھلی سے آگے پتہ نہ تھا، مگر وہ تخمی نودھا ابھی تک موجود تھا جس کی قلمیں لی تھیں قلمی درخت اسی نودھے سے قلم لے کر تیار کئے گئے تھے اور یہ آم تھے "مگر اصل درخت کا پتہ کیوں نہیں چلا" ایک جج نے پوچھا۔ سرکار یہاں سے واں تک کئی لکھ پیڑے ہیں۔ ان میں پچھلے دو سال سے کھٹے درخت کاٹنے کی جو مہم چلی اندیشہ ہے کہ اسی میں کہیں پر غلطی سے کٹ گیا۔ یا پھر بہت سے درخت ہر سال سوکھ جاتے ہیں، کئی برس تلاش کیا مگر پتہ نہ چلا اتنے بڑے جنگل جیسے باغوں میں کوئی شمار قطار نہیں کیا ہوا ایک جج نے جا و قوع پوچھی تو گلابو نے بتائی کہ "اس کے باپ کی گلاب باڑی ہے"۔
جج نے مسکرا کر کہا" یہ "گلاب خاص" کی وجہ تسمیہ ہے"۔
مسٹر فاروقی نے برجستہ کہا۔" جناب والا اس کی خوشبو۔ پر آپ نے غور نہیں فرمایا ہم سب جانتے ہیں کہ گلاب کی خوشبو آم میں آج تک نہیں پائی گئی باوجود کوشش کے"۔
ایک جج نے اظہار خیال کیا "آم فرنگن کا روپ آم دسہری کا قد و قامت، ثمر بہشت چونسے کی صاف شیرینی اور خاص الخاص شاہ آبا کا کیف و لطافت اور آم عروس کی خوب صورت سڈول شکل و شباہت، آم ہے کہ ہمہ صفت موصوف"۔ اللہ اللہ پھر آم ہے آم نہیں! — اور خوشبو! خوشبو! — جیسا آپ نے فرمایا یہ تو اپنی جگہ پر صرف اسی سرمے میں پائی گئی ہے۔ جیسے گلاب خاص تو خارجی و داخلی ہر اعتبار سے خاص گلاب ہی گلاب ہے"۔

گلابو نے نہایت آزادی کے ساتھ کہا "جی اور سرکار پال میں یہ خوشبو اور نکھر جاتی ہے"۔ اور ٹوکری میں سے چند دانے پال کے برآمد کئے اور قاشیں پیش کیں۔ "واہ واہ"۔ "پھلتا لدتا کیسا ہے؟ کتنا اونچا جاتا ہے؟ ڈنٹھل کا کیسا ہے؟" ججوں نے سوال کئے اور گلابو بولی "سرکا درخت سفیدہ طبح آبادی کے برابر اونچا ہوتا ہے۔ لدتا اتنا ہے کہ پہلی نگاہ میں دیسی گلاب کے پھولوں کی بہار میں بہت بڑی لدی ہوئی جھاڑی معلوم پڑتا ہے"۔

ایک جج نے ٹوپی دیکھ کر کہا "ڈنٹھل کا بھی مضبوط ہے چونسہ کی طرح، پھر نیچا درخت ہے ہوا دھوپ زیادہ نہیں ستاپاتی ہوگی"۔ سرکا جتنے آم چھٹ کر لگتے ہیں تقریباً سب کے سب لگے ہی رہتے ہیں۔ اور ہاں سرکا پال میں لگا کر بھول جائیے تو سڑتا نہیں۔ پکنے کے بعد سوکھتا ہے اور سوکھ کر ہی رہ جاتا ہے اور ہاں سرکا اس کی کچی کینٹری پال اُٹھ جاتی ہے پھر ایسے پال میں کیف کم ہوتا ہے اور ہاں شیرینی بھی اتنی نہیں ہوتی کچی کینٹری کے پال میں اتنا تیز سرخ رنگ بھی نہیں آپاتا۔

اور بالاتفاق رائے سب ججوں نے اس پنج سالہ کا بہترین آم گلاب خاص کو قرار دے کر پانچ سال کے لیے اس کو آموں کا بادشاہ قرار دیا اور کپ، تمغہ گلابو مالن پر سجا دیا، باہر اک کہرام سا مچ گیا، گلابو سفید ساڑھی پر سنہرا تمغہ سجائے، چاندی کا کپ ہاتھ میں لئے نکلی۔ مقابلہ سے شرکا پر تو مُردنی سی برگئی۔ بعض کو غش سا آگیا۔ جب ذرا آگے بڑھی تو دیہاتیوں کسانوں کے مجمع میں سے اندر مہاراج کی لیلا، وشنو جی کی جے کا جیکارا گونجا۔ زمینداروں کے ملازموں حالیوں موالیوں مقدموں نے ڈپٹا، مگر جب تک اس مجمع کے درمیان سے گزرتی رہی جیکارہ پر جیکارہ گونجتا ہی رہا۔ میلوں مربع آراضی پر ایستادہ باغوں کا درخت درخت جیسے الٹا ہو گیا۔ پھُنگیاں تحت الثریٰ میں گھس گئیں جھکڑا موسلا جڑیں فضا بسیط میں پھیل گئیں، پیچ در پیچ، جال در جال جیسے ہر پرانے باغ کے درخت درخت کا حُلیہ بدل گیا۔ جن کے اندر سے زمینداروں کے حالی موالی مالی پرانے درخت دریافت کر کر کے نئی قلمیں باندھتے اور مالکوں کے نام سے موسوم کرتے چلے آئے تھے اور ہر مقابلہ میں پیش کر کے گم نام سپاہی کی قبر پر اپنے آقا کے نام کا کتبہ نصب کرتے چلے آئے تھے اور آج کسانوں کے تیوروں میں سے ہزارہا سال بعد آقاؤں زمینداروں سے دوڑی کے انداز چھلکے تھے اور اس رنگ، رس، خوشبو کے اجتماع میں ازلی جھکی گردنیں بلند ہو گئیں اور اور دوسری جانب زمینداروں نے سمجھ لیا کہ فاروقی صاحب گلاب خاص کے رس میں بس گھول کر چپکے سے چل دیئے۔ انہوں نے اپنی روشنی طبع سے شاعرانہ دلبستگی کے ساتھ ساتھ معاصرانہ علاقائی چشمک میں اپنے معزز معاصرین کو ادنیٰ آدمی کے مقابلہ پر لانے اور اس کے ہاتھوں بڑے بڑے بکرما جیتوں خان خاناؤں کو شکست دلوانے کا تماشہ کیا، ساتھ ہی ایک نیا آم بھی دریافت ہو گیا جس کے متعلق دیومالائی بات وشنو جی کے نازل کردہ عطیہ تک جا پہنچی کیونکہ اس کا اصل تخمی درخت دریافت ہی نہ ہو سکا لہٰذا لاثانی ہے۔ وقتی تفنن طبع کے لئے خاصہ مشغلہ تھا ہمالیہ اور بندھیاچل کو گلاب خاص سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ کرا دینے۔ مگر گلاب خاص کی سرخی، ملاحت، شیرینی حلاوت سب کچھ فاروقی صاحب کی روشنی طبع میں سمو کر گلاب خاص والی غریب پر طبائن کے سوار ہو گئی۔ یوں بھی اس جیت کا پبلک ریلشنگ خاص ہی ہوتا تھا پھر مقابلہ میں آنے والی کے کامیاب مقابلہ سے زیادہ گلاب گوں رخساروں کی تمتماہٹ۔ "پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے" اس کے لب کی تازگی۔ نرگسی آنکھوں کے گلابی ڈورے۔ گلاب خاص کی تعمیر میں خالق وشنو نے جیسے اسی گلابو کی بچی ہوئی تھوڑی سی مٹی سے کام لیا تھا۔ مگر گلاب خاص کا سارا کیف شیرینی، رنگینی، خیرگی اور تمتماہٹ جیسے تاریکیاں بن کر امنڈ پڑیں، گلابو جیسی سندر اور تازہ ہستی کملا کر رہ گئی،

سہم گئی، لوگ اس کے شریر کے کنجن کو لوٹ کر کچلا دیتے اور روح کی چاندی کو سنولا دینے کے لئے جھپٹ پڑے ۔ ویسے خان صاحب اور آغا صاحب دونوں ہی اپنے طبقہ کے محترم بڑے بوڑھے تھے ۔ بزرگ، سنجیدہ، جوان جوان پوتوں، نواسوں نواسیوں کے دادا نانا ۔ جھک سفید دودھ برف میں دھلی ہوئی مقطع داڑھیاں ایک عرصہ سے حج بیت اللہ کے سفر کی نیت کئے ہوئے بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے بیٹھے تھے بس حکم اور کشش کے منتظر تھے، روز ازل روحیں لبیک پکار چکی تھیں، مدتوں سے اللہ اللہ کر رہے تھے، خان صاحب نے تو مدتیں ہوئیں عمر بھر کی چڑھی داڑھی اتار لی تھی، ایک دم میٹھے میٹھے حجام کو اشارا کیا اور اس نے سنبھال کر پھر چڑھا دی، مگر انمل بے جوڑ ہو گئی سفید داڑھی سکی اور کالی چڑی صحیح معلوم ہوتی ہے اور دوسری روز حجام نے خضاب لاجواب ستارہ صبح مارکہ گھول کر لگا دیا اور پھر جو چڑھائی تو چہرہ کی جھریاں بھی تناؤ میں غائب ہو گئیں اور ساٹھا سو پاٹھا' ضرب المثل کے مطابق جوان ہو گئے اور پرانے بزرگوں سے سنتے چلے آرہے تھے کہ اگلے وقت میں تو ساٹھ برس کی عمر سے پائجامہ پہنا شروع کرتے تھے اور اس حساب سے پچھتر کی عمر میں پہنچ کر خان صاحب ابھی لڑکپن میں تھے اور نوجوان بھی نہیں نوخیز تھے ۔ آغا صاحب ایرانی نژاد اسی کے پیٹے میں کھچڑی بال تھے اور چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمکتا تھا ۔ دور سے جھریاں ضرور ایسی نظر آتیں جیسے بڑھیا چرخا کات رہی ہے ۔ دونوں کو اپنی اپنی گردنوں کے نکلے ہوئے مستانہ دار خم پھر سے تجدید کرنے پڑے اور دونوں ہی قبض کے شکار تھے اور قبض کشا گلقند آفتابی دونوں ہی کے نسخہ میں لکھا ہوا تھا اور دوا کے لیے پوری گلاب باڑی اور گلابو، سیوتی لال، سارے سارا غوث سے نکل جانے کی سوچ رہے تھے ۔ زر سے تو بے نیاز تھے 'زن' اور 'زمین' کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا اور زن کے لیے رسہ کشی میں قضیہ زمین پر سرزمین گلاب باڑی کی چھاتی پر جریب کھنچنے لگی اور دو زمینداروں کے درمیان جب جریب کھنچی ہے تو زمین بیچاری کانپ کانپ کر اپنے محور پر ڈانوا ڈول ہو ہو جاتی ہے اور جریب کی زنجیر کی کڑیوں کے ساتھ کبھی قطب شمالی اور کبھی قطب جنوبی کی سمت جھک جھک جاتی ہے ۔

جریب گھٹے ڈلوانے والے کائستھ نژاد پٹواری بچارے سبھی کے ہوتے ہیں اور اپنی روایات میں بجز اپنے آج تک کسی اور کے ہوتے نہ دیکھے گئے نہ سننے میں آئے تاہم ان کے ناپ کا میزان آج تک اپنے سوا ہر ایک ہی کے حق میں آتا رہا ہے، سیوتی لال کی بھلوار کی پٹی ہر بندوبست اراضی کے سرکاری پختہ مقام سے نپ نپ کر جریب گھٹوں کی رو میں آئی یہاں اس وقت چار مڈھ زمیندار تھے، ٹھاکر جسبیر سنگھ چوہان، آغا صاحب، خان بہادر صاحب اور چوتھا جس کا نام ابھی ہوا میں درج تھا بے فیت کا حولدار اں سب پر اکیلا بھاری خان بہادر صاحب کا نوخیز بھتیجہ اور آغا صاحب کا ہونے والا داماد چھدن میاں جس کا ابھی تیورس سال مونچھوں کا کونڈا ہوا تھا اور اسی تقریب کے سلسلہ میں اب ٹھیک سے منگنی کی بات کھلی تھی کہ جب آغا صاحب کی بیٹی پیدا ہوئی تھی تو چھدن میاں کی ماں ٹھیکرے میں اشرفی ڈال آئی تھیں ۔ مگر اگلا سال میٹھا برس لگ رہا تھا ۔ لہٰذا سالگرہ سے ایک روز قبل رسم نکاح بھی سرانجام ہو گئی اور اسی گھڑی میٹھا برس گزرتے ہی شادی کی تاریخ پڑ گئی تیاریوں میں سال ڈیڑھ سال گزر جانا معمولی بات تھی اور ابھی شادی کی تاریخ میں پانچ چھ ماہ باقی تھے کہ علاقہ میں گلاب خاص کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ ویسے چھدن میاں کے باپ کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور اودھ کے قانون کے مطابق اس کا باپ آبائی زمینداری سے صرف خریف ربیع فصل کے فصل مخصوص تھوڑی سی رقم بطور گذارہ پانے کا مستحق تھا بقیہ کل ذاتی اخراجات کھانا پینا، رہائش، ملبوس سواری ہر چیز ریاست کے ذمہ تھی، کل زمینداری پر خان بہادر تایا قابض و متصرف تھے، ہر ایک کے رازق، ان داتا، جاں پناہ انگریزی تحت دنلج کی روایت کے مطابق قانونی طور پر اکیلے

تمام توریث کے مالک مگر ان کے اپنی کوئی اولاد نہ تھی ان کے بعد برادر زادہ چھدن میاں کے نیچے ہی آتا تھا، ادھر نانیہالی قرابت میں صرف نانا تھے اور کم و بیش اسی حیثیت کے رئیس جتنے تایا دادا تھے اور ان کی اولاد صرف چھدن میاں کی والدہ تھیں، ادھر ابھی چھ سات ماہ پیشتر ہی آغا صاحب کی بیٹی سے نکاح ہوا اس میں بھی باپ کی تاریخ نے دوہرایا، آغا صاحب بہت بڑے رئیس تھے اتنے بڑے کہ چھدن میاں کے دادا اور نانا دونوں داڑھ میں سما جاتے اور ان کی اکلوتی بیٹی واحد اولاد سے چھدن میاں کا نکاح ہوا تھا۔ غرض دو تین چراغوں اور ایک مشعل کا میزانِ کل چھدن میاں کے نیچے لگتا نظر آتا صرف صبح کی دیر تھی۔ ویسے نام ابھی کسی کاغذ میں اندراج نہ تھا لیکن قانونی طور پر نابالغ چھدن میاں کے "ولی قدرتی" خاں بہادر صاحب ہی مانے جاتے۔ اور مچھلی کے بچہ کو تیرنا کون سکھائے سات درجہ انگریزی پڑھنے کے ساتھ ہی جمع تفریق۔ ضرب تقسیم میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ نانا، تایا اور خسر سب کا میزانِ کل اپنے نیچے لگنے کا منتظر تھا اور "ولی قدرتی" تایا کے اور اس کے درمیان باریک سا ململ کا پردہ حائل تھا، ایسا کہ ادھر والا اُدھر والے کو اور اُدھر والا ادھر والے کو صاف شفاف نظر آتا تھا کہ ہم کہاں بیٹھے ہیں اور چھدن میاں کو تو اس کی ماں نے آٹھ سال کی عمر سے مجسم کمپیوٹر بنا دیا تھا اور راستہ کے جتنے روڑے پتھر نشیب و فراز تھے سب دکھلا دیئے تھے اور نعلی صندوقی قبروں کے راز بتا دیے تھے بجز اپنے جو اس کے اور اس کے نانا کے ترکے کے معاملہ میں درمیان کا پتھر تھا اور ابھی تو ماشاء اللہ نانا ہی ہٹے کٹے سرخ سپید بیٹھے تھے اور اس طبقہ میں عمریں بالعموم خاندانی طور پر طویل ہوتی ہیں، تایا ابا اسّی کے پیٹے میں تھے۔ نانا میاں شاید نوے کی بہار لوٹ رہے ہوں گے اور خسر ابا تو ابھی خیر پچاسویں ساٹھویں میں چل رہے تھے سو نانا میاں کے درمیان تو خیر اتنی حائل تھیں ہی، اور خیر خسر ابا کے درمیان اس کی اپنی دلہن آتیں، جو نکاح کے بعد ہماری کوئی مسئلہ نہ تھیں تایا ابا ضرور چھڑا چھانٹ تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے سے نہایت چوکنے اور خوب پہچانتے تھے۔ نانا ابا اور تایا ابا دونوں کے یہاں جہاں چاہتا مداخلت کر دیتا جس وقت چاہتا دس پانچ ہزار ہتھیا لیتا۔ جس پر یہ لوگ جز بز ہو کر رہ جاتے ادھر کچھ عرصہ سے نکاح کے بعد آغا صاحب کے یہاں بھی دست اندازی کرنے لگا تھا اور اور ہر سہ بزرگ اس مالی قسم کی مداخلت پر طرح دے جانے اور مستقبل قریب کا میزانِ کل سامنے آجاتا تو بیچاروں کو صبر بھی آ ہی جایا کرتا۔ تاہم جب دل ٹٹولتے تو اس صبر کا اصل نام مجبوری تھا اور مجبوری بھی تو ناگزیر قسم کی ورنہ ——

ایک اور شریک کار اور گلاب باڑی کے جریب گھٹے کے الٹ پلٹ میں سہیم جائداد ٹھاکر جسبیر سنگھ چوہان تھے، انہوں نے شروع میں اگر دگر کی، بات منوجی تک جا پہنچی۔ ٹھاکر جی نے جب راون سے یہ سرزمین چھینی تھی تو اس کے ساتھ تمام حشرات الارض بھی تو ہاتھ آئے تھے جو راچھوتوں کے لیے جنس اعلیٰ پیدا کرنے میں کیچوے گبریلے والا کردار ادا کیا کرتے تھے جنھیں زمین کھود کھود کر اور کھاد کی گولیاں بنا بنا کر ادھر ادھر پھیلانے کی خدمت انجام دینے کے بعد خود صرف مٹی چاٹ کر جینے کا جواز پیدا ہوتا تھا اور یہی صورت سیوتی لال مالی اور گلابو مالن کی تھی، ایک گلاب کا کیڑا تھا تو دوسری گلاب خاص کے بور کی مکھی دونوں ہی اچھوتوں کے شامہ و ذائقہ کے راستہ روح کو فرحت اور جسم کو توانائی بخشنے کے ازلی ذمہ دار اور گلاب خاص ہو یا گلاب دونوں ہی دوسرے روز صبح کے سونگھنے، چوسنے کے بعد کوڑے کے ڈھیر پر نظر آتے ہیں اور ٹھاکر جسبیر سنگھ کی نگاہ کیا بلکہ جیسے ہاتھ میں یہی گلابو اور سیوتی لال کا مقدر چلا آ رہا تھا۔ ویسے ان کیڑے مکوڑوں کے بازار کی دنیا میں ہر سکہ چل رہا تھا، حتیٰ کہ ٹھاکر جی کی دس ہزار سال پرانی ملت دوانی بھی جس کی ریکھا تصور سب مٹ گئی تھی دمک رہی تھی، اور آغا صاحب و خانصاحب کی ضرب بھی اور ملکہ وکٹوریہ کا کل وارٹکسال والا بھی۔ بلاشبہ ٹھاکر جی نے راون کا گھر لوٹ کر انھیں منوجی کے تلے

سے شدر قرار دیا تھا مگر منوجی کا آئین خان صاحب اور آغا صاحب نے بھی برقرار رکھا تھا حتیٰ کہ سات سمندر پار دور دیس کی رانی بھی ٹھاکر، آغا صاحب خان صاحب سب کے گھر لوٹ کر منوجی کے کوڈ پر چلی۔ لہٰذا اس قانون کی رو سے ہر راجپوت ہر مالن پر یکساں حق رکھتا تھا، ٹھاکر جبیر سنگھ، خاں بہادر صاحب آغا صاحب، سب کے سب اور دور دیس کی رانی ملکہ وکٹوریہ کا آئین دستور بھی حتیٰ کہ چھدن میاں بھی۔ اِدھر سیوتی لال مالی کو بلاشان گمان ایک نوٹس عدالت مال کا تینوں زمینداروں کی جانب سے موصول ہوا "ہر گاہ کہ تم نے اپنی کاشتہ اراضی پر بغیر اجازت درخت انبہ نصب کر لیے ہیں لہٰذا ہفتہ بھر کے اندر وجہ بیان کرو کہ تم کو حقوق کاشت سے محروم کر کے کیوں نہ اراضی کاشتہ سے بے دخل کیا جائے۔ تاکید جانو کہ اگر درخت انبہ ایستادہ اراضی تمہاری ملکیت نہیں ہیں لہٰذا بے دخلی کے قانون سے بچنے کے لئے اگر نصب کرنے کو چھپانے کی غرض سے تم درختان ایستادہ کو کاٹو گے تو علاوہ بے دخلی کے چوری، مداخلت اور نقصان رسانی کے جرم کے مرتکب ہو گے۔

ٹھاکر جی نے خود عدالت مال جا کر یہ نوٹس جاری کرایا اور چونکہ وہ کاشتہ پٹی نبوں زمینداروں کے محالوں پر پڑتی تھی لہٰذا تینوں کے دعوے پر جاری ہوا۔ یہ اودھ اور روہیل کھنڈ کے بڑے زمینداروں کی تاریخ میں پہلی چیز تھی ورنہ عدالت مال سے رجوع کرنے کے بجائے قضیۂ زمین ہر سرزمین خود طے کیا کرتے اور تعمیل حکم اپنے حالیوں موالیوں کے ذریعہ ریڈی جسٹس سے طرز پر فوراً کرا لیتے اور لطف یہ کہ وہ جو کچھ فیصلہ کرتے ہیں وہ عدالت کے فیصلہ سے کم وقیع اور کم بر بنائے انصاف نہیں ہوا کرتا اور سیوتی لال مالی تو دیوانی اور مال کے جملہ قوانین سے مستثنیٰ تھا اور فوج داری کے جرم کا ارتکاب اس کی ذات سے ممکن ہی نہ تھا۔ تاہم وہ اپنے آقاؤں کی نفسیات خوب ہی سمجھتا تھا اور پھر تینوں دیوان خانوں میں اس کے جاسوس آقاؤں کے دائیں بائیں لگے ہوئے تھے وہ نوٹس پا کر بھی کسی کے پاس غدر داری، معافی خواہی کے لئے نہ گیا۔ اور اماوس کی رات میں اس کو ٹھاکر جی کی سرکردگی میں چھاپہ پڑنے کی یقینی اور حتمی خبر ملی، اس کو معلوم تھا کہ پدمنی کہیں جنمے یہ تو چھتریوں کا آسمانی مقدر اور زمینی حق ہے اور آج اسی حق کے لئے اس نواح کے تمام چھتری دیوانے تھے اور یہ آگ تو زنّار کے پاک مقدس دھاگے کے نیچے ہی چھاتی کی انگیٹھی میں دہک سکتی ہے چھتریوں کا یقین ایمان تھا لیکن اگر اس نوعیت کی چنگاری کسی شُدر کے اندر تحفظ کے لیے بھی اک ذرا کے ذرا بھی سخت ہے تو منوجی کے کوڈ کی کتاب آپوں آپ بند بھی ہو جایا کرتی ہے اور گنگا جمنا اُلٹی بہ کر گنگوتری جمنوتری پر بڑی اونچی ترنبی بناتی ہیں —

"میں اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو نہ مرنے دوں گا، خواہ بوند بھر پانی نہ ہو۔ میں ہر قانون سے گریز کروں گا خواہ موسمرتیوں کا آکاش سے نازل آئین کیوں نہ ہو۔ جس نے قانون قبضۂ اراضی بنایا ہے۔ وہ ان بکرما جیتوں کے ہاتھ اپنی غیرت حمیت نہ بیچنے دے گا، وہ اپنی گلابو پٹی کو سندر ہی رکھے گا۔ گلاب خاص کی طرح بے داغ، امرت بھری، ظاہر باطن رس سے جوں کی توں پر سیوتی لال کا دھرم خاندان چھدن میاں کی جوانی دیوانی تھی۔ خسر، تایا، نانا سب کے باؤلے پڑ ہاپوں کے مقابلہ پر خم ٹھونک کر آ گیا اور نادری حکم کچھ اس منصوبہ سے جاری کیا تھا کہ سیوتی لال مالی دیوان خانہ کے پائین باغ میں ایکڑ بھر رقبہ پر ڈھاکہ گراس کا لان لگاتے ایک ٹینس کورٹ بنائے اور دو بیڈمنٹن کورٹ، جتنے مزدور درکار ہوں بیگار میں پکڑ لے۔ گلاب باڑی سے دیوان خانہ کے شاگرد پیشہ میں منتقل ہو جائے تین کو مٹھڑیاں اپنی رہائش کے لیے پسند کر لے اور یہ سب کچھ تینوں بزرگوں کے آداب عشق میں خلل اور منافی تھا۔ چنانچہ آغا صاحب نے تو بیٹی کے تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کرنے کے لئے اپنے دیوانی والے وکیل کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ بوڑھے خان بہادر نے بے غیرت کے حوالدار بھتیجے کی بھاوج سے شکایت کی اور اپنے بڑھاپے کے عشق میں دراندازی رقابت سے باز رہنے کی استدعا بھی کرائی جبکہ ٹھاکر صاحب کے اندر پچاسی نوے فی صد چوہان پرتھوی راج کے ساتھ اب ہزار سال بعد دس پندرہ

فی صد ہیمو بقال بھی شامل ہو گئے تھے انہوں نے سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے سنجوگتا کو دن دھاڑے اٹھا کر لے آنے کے بجائے تھوڑا اندھیری رات کے پردے کا سہارا بھی لینا مناسب خیال کیا۔ تینوں بزرگ نہایت وسیع القلب اور ایک دوسرے کے حق میں نہایت متواضع واقع ہوئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سمجھتے تھے کہ اگر چڑیا نوجوان کے آہنی جال میں جا پھنسی تو پھر ان تینوں میں سے ہر ایک کی مٹھی سے باہر ہوگی سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ جس میں صاحبزادہ بھی زیر بحث آئے، ٹھاکر جی نے آغا صاحب کو دوستانہ ڈانٹ پلائی، بھلا اس خارجی عشق کے چکر میں پردہ نشین بیٹی بہو کو کیوں درمیان میں لایا جائے حویلی، حویلی ہے، دیوان خانہ، دیوان خانہ۔ کنواری پردہ نشین بیٹی کیوں مطلقہ بنائی جائے، رئیسوں کے بچوں کی بیگم رانی تو اور ہوتی ہے اور نہ معلوم کتنی اور کیا کیا اور کون ہوا کرتی ہیں۔ نکاح ہو گیا، مرے پار، بابھرے پار، ڈولا جائے گا اور جائے گا؛ جنازہ نکلے گا اور نکلے گا۔ اور خود اسی بھادوں کی اماوس کی رات کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس وسیع القلبی کے ساتھ کہ بزرگی عمر اور سیادتِ نسلی کے تقاضہ کے تحت پہلے ایک اٹھوارے آغا صاحب قبلہ کی تحویلِ خلوت میں رہے گی دوسرے اٹھوارے آغا صاحب بجمال عنایت اس کو خاں صاحب بہادر کی تحویل میں دے دیں گے اور خان صاحب بہادر دو اٹھوارے اپنی خلوت میں دکھا کر حق بحق دار رسید منوجی کے دستور کے مطابق اس شدر کو ٹھاکر جی کے حوالے عمر بھر کے لیے کر دیں گے اور یہ تبادلہ کا چال چلن اس طبقہ میں دائمی روایت چلا آتا تھا، سواری کی گھوڑیاں، گھوڑے، شکاری کتیاں، کتے، لڑنے والی بٹیریں مرغے ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر ہوتے رہنے کا رواج تھا ہی اسی طرح ملازموں خدمت گاروں حالیوں موالیوں کے پارسل ہوتے رہتے تھے اور گلدبو انھیں جنسوں میں سے تو ایک تھی اور ایسی تحفہ تحائف کی سال دو سال پیچھے رسم سا کرام میں تکرار ہوتی رہتی تھی۔ مفت میں صاحبزادہ صاحب نے اس چیونٹیوں بھرے کباب میں ہاتھ ڈالا اور بزرگوں کے اکل و شرب میں چونچ ڈبوئی، یہ بچارے تو مع چیونٹیوں کے کباب سٹ نے نگل جایا کرتے تھے اور اس معاملہ میں سب کے سب بزرگ یورپ کی جنگ عظیم کے اتحادیوں سے زیادہ پُرخلوص واقع ہوئے تھے۔ صاحبزادہ بھی تینوں بزرگوں کو خوب پہچانتے تھے، لیکن بیچارے خام کار تھے یہ نہ سمجھتے تھے کہ یہ اتنے پہنچے ہوئے بزرگ نکلیں گے کہ ایسا پیارا سمجھوتہ کر جائیں گے اور اس جہل مرکب میں گرفتار ہو گئے کہ میرے سامنے پڑنے کی ان کی سفید بزرگی ہمت نہ کرے گی

سیوتی لال مالی سب سرکاروں کی نفسیات کا ماہر محرم تھا اور ٹھاکر جی کو تو ان کے جنم پترا بنانے والے برہمن سے زیادہ اچھی طرح پہچانتا تھا اور ان کے حقوق کا ان کے تفویض کرنے والے بزرگ وار منوجی سے کم واقف نہ تھا۔ دیوان خانوں کے ملازموں کے ذریعہ تمام سازش کا سراغ لیتا رہا حتیٰ کہ یہ بھی کہ آج اماوس کی رات میں آدھی رات گئے ٹھاکر جی چھاپہ ماریں گے۔ سرِ شام ہی معلوم ہو گیا اور بھادوں اماوس کی رات کی اندھیری چھاپہ مارنے والے کے لئے چادر ہو مگر فرار ہونے والے کے لئے جیٹھ کی تپاں کے دن کی طرح روشن تھی۔

سیوتی لال مالی ازلی خدمتی، ابدی شُدر، حیاتِ انسانی کی ضامن اہم ترین شقِ اعلیٰ، غذاؤں اور بیش بہا نفیس و لذیذ پھلوں کے قدیم ترین مادرا لتاریخی چھپے خزانوں، دفینوں کا محقق، موجد، بے قرار متلاشی۔ بزرگوں کی پیدا کردہ ارضی تمدن کی یہ گوناگوں نعمتوں کی دولت برآمد کر کر کے کھلے بازاروں عام کرنے والا، میدانِ تمدن کا وہ پیادہ ہیرو تھا جس نے خود رو بنوں کی حد تک پہنچے ہوئے قدیم تخمی باغوں کے اندر سے ایجاد کی حد تک تلاش و تحقیق کر کر کے سیکڑوں نادر اور بہمہ صفت موصوف اقسام کے آم پیدا کئے اور قلمیں باندھ باندھ کر ان کی اصل و حقیقت

نکالی تھی اور درخت پر ان چڑھا چڑھا کر مشرقی معاشرہ پر نت نئی قلم کاریاں اور طلاکاریاں کیں تھیں نمائشوں مقابلوں میں اپنا نام چھپا کر اپنے آقا کے نام کا بول بالا کیا اور بابا آدم کے اولیں اور اصلی کلچر کو بیسویں صدی کی مین کے اوپر وقت کے دوش بدوش مجلا و مزین کیا، آج اسی نوعیت کی صرف ایک ایجاد کے جرم میں جام سقراط بہ لب تھا اور یہ اس کی گلاب خاص کی تحقیق تھی جو روشنی طبع بلا بن کر کم بخت پر کریا کا بھوں بن کے نازل ہوئی تھی۔ اس ایجاد کے طریقۂ نزول سے وہ اپنے اوپر گلاب خاص کو وشنو جی کی دیا تصور کرنے کے جہل مرکب میں گرفتار ہو گیا تھا اور یہی غلط سوچ جو شیو شنکر کا عتاب بن گئی تھی اور وہ تو اپنی ماتا بدل گلابو بیٹی ہنی کو اپنے وشنو مہاراج کی دیا تصور کیا کرتا تھا اور گلاب خاص تو اسی کنیا کے ہاتھ کا کرشمہ اور وشنو جی کی کرامت تھا۔ مگر وہ یہ بھول گیا کہ اس کا مقدر ازل سے آج تک نصیب اغیار رہا ہے اور اس کا حصہ منو جی کے سنہرے قلم سے لکھے بیٹے ہوئے زنار پوشوں کے دھاگے میں بندھنا لکھا ہوا ہے اور ہر آواز کلام دیگراں ہی بالا کرتی رہی ہے اور سیوتی لال کا نام تو ہمیشہ موسوم دشمناں ہی ہوتا چلا آیا ہے اور اس کی تالیفیں مضمون اغیار رہی ہیں اور تصانیف پر جلی قلم غیر مصنفین کا نام ٹھپا ہوتا رہا ہے چنانچہ عمر بھر لانعات تحقیق، دریافتیں دوسروں کی جھولی پلے میں پڑتی رہنے کے بعد حادثاتی طور پر اپنی صرف ایک ایجاد وشنو جی کے پرشاد کے طور پر دھوکے سے اپنے پلے بندھی رہ جانے کی یادداشت میں آج وہ اس حد تک وارو گیر کی زد پہ ہے کہ وہ زمین کا ذرا سا ٹکڑا جس پر وشنو جی کا امرت بھرا یہ عطیہ اس نے امانت رکھا تھا اس سے بھی اس نصب کرنے کے قصور میں محروم ہو رہا ہے اور اس آراضی نے اس قصور میں خود ہی اس کو اور اس کی بیٹی کو اور اس کے گلاب خاص سب کو اکھیڑ دیا ہے۔ منو جی کے مرتبہ قانون قبضہ آراضی کے مطابق صرف زمین کے مالک ہی کو آم کا درخت نصب کرنے کا حق ہے اور زمین کا مالک آم ہی کیا ہر درخت کا جو آراضی پر ایستادہ پایا جائے یا نصب کیا جائے یا خود رو اگ آئے مالک تصور ہوتا ہے۔ اور سیوتی لال اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ گلاب کی فصل اگانے کا مجاز تھا گلاب خاص کا اگانا اس کو اس کے اس حق کاشت سے بھی محروم کرتا تھا اور گلاب خاص کا درخت تو زمیندار کا حق قانونی ہے اور ملکیت توریثی ہے۔ وہ شدر تھا اور اپنی ذات کے لیے ارزل جنس پیدا کرنے کا حق لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کا مقدر بھینی بھینی خوشبو والے خوش رنگ پھول آقا کے لیے اگانا تھا اور چنتے وقت سے لے کر گجرے گوندھتے وقت ناک پر کپڑا لپیٹ لینے کا حکم تھا ورنہ پھول جو ٹھن ہو جاتے۔ وہ پھولوں اور پھلوں کے پودوں کی جڑوں میں کیچوے گبریلے کی خدمت انجام دے کر صرف روئیدگی بالیدگی کا ضامن تھا، آم کھانا اس کے لیے ایسا ہی تھا کہ جیسے کسی پھل میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اور آقا کے حق پہ خیانت دست درازی تھی۔ مگر سیوتی لال عام شدروں خاص طور پر اپنی برادری کے دوسرے مالیوں سے ذرا منفرد سطح کا آدمی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی ذہانت اور خدمت کے سبب زمینداروں میں اس کی وقعت تھی، عام لوگ اس کو استاد کے لقب سے پکارتے تھے۔ آقاؤں مالکوں کا منہ چڑھا تھا اور یہ خصوصیت فن باغبانی خاص طور پر آموں کے متعلق تحقیق و ایجاد اور معلومات اور تجربے کے سبب تھی، ساتھ ہی بات سنتے وقت صرف اثبات ہی اثبات اور "جی ہاں، جی ہاں" "بجا ارشاد" ہی برداشت کر سکنے کے اہل تھے مگر سیوتی لال آموں کے متعلق اپنے ذاتی تجربہ اور سابقہ معلومات کی بنا پر بات کرتے ہوئے ان کے ساتھ فنی و تحقیقی بحث میں جا پڑنے کی بھی ہمت کر جاتا اور ان سے اختلاف رائے تک کر جاتا جو اس "جی ہاں" ہی سن سکنے کے اہل طبقہ میں معاملت کا عجوبہ ہوتا اور اس کی بات اس طبقہ میں اکثر تسلیم ہوتی جس میں ہر امر پر سر تسلیم خم کر لینے ہی کا دستور تھا۔ یہ برداشت، رعایت اور چھوٹ سیوتی لال کا عظیم اعزاز تھا۔

تاہم اپنی ذہانت اور محنت کی ہر دیافت ایجاد تحقیق اپنے آقائے نامدار کے نام نامی اسم گرامی سے پتھر کی لکیر کی طرح موسوم کر کے اپنا نام سلیٹ کی تحریر کی مانند پونچھا پھیر کر خود مٹاتا چلا آیا تھا۔ اور یہ عمل اس کا پشینی ایمان اور پیٹر ہیوں کا دھرم تھا مگر روسا آقاؤں کے اس تھوڑے سے مخصوص تقرب کی سعادت نے اس طبقہ کی نفسیات شناسی میں طاق کر دیا تھا۔ تاہم کم بولنا اور احتیاط کے ساتھ بات کرنے کا گر اس کی خوش خلقی اور تربیتی صفت تھی ایاز قدر خود بشناس اس طبقہ کے اندر جہاں پشتوں سے اس کی معاملت تھی یہ پہچان گیا تھا کہ کون سی بات سننے کے یہ اہل ہیں اور کیا بات کرنا میرا منصب ہے۔ خواہ ملٹری سائنس کی کتابی اور اخباری علمیت کے ذریعے معلوم نہ ہو مگر اس کو اچھی طرح علم تھا کہ فتح کا سہرا آپریشن روم کے اندر چکردار کرسی پر بیٹھے نقشوں پر جھکے رنگ برنگی جھنڈیاں لگانے والے کور کمانڈروں ہی کے سر بندھتا ہے اور ہتھیاروں سے لدا، نقد جاں کی پونجی ہتھیلی پر رکھے سوار پیادہ مار مر کر اپنے مضبوط جسم کے ساتھ اپنا نام بھی لیے مٹی میں مل جایا کرتا ہے اور کبھی کبھی تاریخ کے بھولے بنے ہوئے عیار محقق اور وقائع نگار مسخرے "گمنام سپاہی کی قبر" نام سے سیمنٹ بجری چونے کے ڈھیر کے بت کی پوجا کراتے ہیں اور تاریخ کی تضحیک اور تحقیق کا غبی بچہ کی طرح منہ چڑا کر خوش ہوتے ہیں اور یہ بھی کمانڈروں کا زندہ پن اور اپنے ہی ہاتھ سے اپنے سر زر اور دوسرے رنگ کا سہرا سجانا ہوتا ہے۔

سیوتی لال آموں کے قبرستان کا گمنام سپاہی کی قبر تھا۔ جس میں اس کو یاد بھی نہ تھا کہ اپنی آدھی صدی کی متحرک فنی تحقیقی زندگی میں نہ معلوم گھٹا ٹوپ گھنے غیر دیافت جنگل جیسے ماورا التاریخی نصب کردہ قدیم باغوں میں سے کتنے بیش بہا آم بزرگوں کے دبائے ہوئے دفینہ کی طرح دریافت کر کے برآمد کئے اور سیکڑوں ہی نامعلوم اقسام ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قلمیں باندھیں اور ان پر ایگری کلچر کی قلم کاری کر کے بیسویں صدی کے گوناگوں کلچروں کے دوش بدوش کھڑا کیا اور اپنی تحقیق کو علم سعید کا درجہ دے کر اس کی اصل حقیقت اجاگر کی اور دنیا بھر میں تجھ مجھ کے غلط ناموں سے عام کر کے جھوٹا تعارف دیا اور محلوں سے جھونپڑیوں تک شہروں کے بلند و بالا فوٹ مارکٹوں سے گاؤں کی ہاٹوں پنچھیوں تک یکساں دریا دلی کے ساتھ سب کو پہنچائیں، جبکہ جن کے نام سے موسوم تھیں وہ بجز کھانے کے صبح کو بیت الخلا جانے کے اور کسی امر کے اہل نہ تھے اور ان نااہل آقاؤں نے شوخی و بے حیائی کے ساتھ ان پھلوں پر اپنے غلط ناموں کی پٹیاں اور بزاں لیں اور آبائی ملکیت اور ولدیت کے سہارے جھوٹی شہرت اور باطل زندگی پائی جنھیں پشتہا پشت سے نہ تو زندگی سے کوئی واسطہ رہا تھا اور نہ درخت ہی سے، بجز اس کے کہ قصبہ کے رجسٹر پیدائش میں ان کا نام ولدیت کے اندراج کی اتفاقی سند ملتی تھی اور فوجداری کے رجسٹر میں اندراج ہو کر کاغذات مال میں ذد حقیقت اور کھیوٹ کھتونی کے خانوں میں اور بہت سے ارضی علائق کے ساتھ باغ کی ملکیت کے خانہ میں بھی نام بھر جاتا تھا اور وہ اس جرم کے اس گھر کے اندر پیدا ہو جانے کے صلہ میں مالک تھے اور ان کے جد نام دار کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ سب کچھ سیوتی لال کی ازلی تا ابد لمبی قطار کے مضبوط بازوؤں اور فولادی بیلچہ کی کارفرمائی اور بہ بر کر مٹی میں ٹپکتے ہوئے پسینہ کی کھاد کا کرشمہ تھا جو ان آقاؤں کے نام مال کے سرکاری کاغذات کے خانوں میں بھرا ہوا تھا لہلہا لہلہا کر پھل رہی تھی اور ولی قدرتی وارث حقیقی کسی سیوتی لال کا نام تو درکنار نام کے الف کی بچی اصلی چٹ آم آمن تو درکنار کسی جامن کے پودے پر بھی آج تک نہ ٹنگ پائی تھی، اس کے گوندھے سہرے تو ازل سے دوسروں ہی کے سر سجاتے اور گھر بساتے رہے تھے اور اس کا ازلی مقدر سیک سری اور بے گھری تھا۔ وہ شدر تھا، برہما کے پیٹھ کے میل پسینہ کی گھنونی پیداوار اور خالق کے جذبۂ نفرت و حقارت کی تخلیق، ازل، ردِ خلق مخلوق دھرتی پر بوجھ، پھر منوجی

کی نظرِ کرم نے اس کی خدمت کو فرا دوسرے نوعیت کے خانہ میں بٹھایا تھا، اور اس کی خدمت اپنے ذہنی نابالغ داڑھی مونچھوں والے کودک خام کار آقاؤں کا کھلونا بن کر رکھی تھی، پھول اُگا کر سنگھانا اور میٹھے میٹھے پھل پیدا کر کے کھلانا زنار پوشوں کے بدن اور رُوح کے لئے تغذیہ فراہم کرنا اس کا فرض تھا اور اس خدمت کے سبب یہ دوسرے شدروں کی بنسبت ان زنار پوش آقاؤں کے ساتھ ذرا مختلف اور قریب فاصلہ رکھتا تھا اور سیوتی لال اس قربت کے طفیل ان آقاؤں کی نفسیات کا بڑا محرم تھا اور ان کے جنم پترا دالے برہمنوں نجومیوں اور نام دھرنے والے باغوں سے بھی زیادہ ان کے ماضی حال مستقبل کو پہچانتا تھا، اور اس وقت تو بات ڈھکی چھپی نہ تھی، سیوتی لال تو سیوتی لال اس کی نوخیز نابچھ بیٹی بھی سمجھ رہی تھی کہ یہ کلجگ کی ڈھیل کی سزا ہے، نہ گلاب باڑی کاشت کرنے کی قانونی بے ضابطگی اور نہ گلاب خاص آم کا درخت نصب کر لینے کی خلاف ورزی کی پاداش ہے، یہ کلجگ کے تقاضہ میں شدر کی کوکھ سے گلابی رنگ کی گلابو بیٹی جنمنے کی پاداش ہے کہ آج وہ اس جرم میں دار و گیر کی زد پر ہے اور اس کی بیٹی کی عصمت سربازار اور اس کی انا سربدار ہے۔

آج بھادوں کی اماوس تھی سال کی تاریک ترین اور ہر رات سے زیادہ بھیانک رات، بوجھل کالی کیچڑ بھری، بھانت بھانت کے حشرات الارض جنم لے کر پوری پوری طرح پروان چڑھ چکے تھے اور مجرموں کو روز روشن کی طرح دعوت دے رہی تھی اور گناہوں کو آغوشِ مادر کی طرح پناہ۔ اور سیوتی لال کے محلاتی ہم عصر دوست جاسوس شروع ہی سے پوست کندہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہے تھے اور آج رات کا آخری نصف حصہ اس پرچھا پہ پڑنے اور بیٹی کو اٹھا کر لے جانے کے لیے سازش کا میزان کل تھا، ویسے کئی روز سے سازش کا کام اور تفاصیل باپ اور بیٹی دونوں ہی کانوں میں انھیں مستند ذرائع سے پہنچ رہی تھیں مگر دونوں میں یہ موضوع زیرِ بحث آنا تو درکنار اشارتاً کنایتاً بھی تبادلہ خیال میں نہ آیا تھا اور سیوتی لال بھی اسی سال کی تاریک ترین رات کا اطمینان کے ساتھ منتظر بیٹھا تھا اور تجربہ کار باپ و ذہین بیٹی دونوں ہی دل ہی دل کے اندر طے کئے بیٹھے تھے کہ یہ کرنا ہے اور "وہ" نہیں ہونے دینا ہے اور ایسے مقامات پر تو دو ہوں تو تیسرا اندر والا راستہ بتا دیتا ہے اور اگر اکیلا ہو تو چھٹی حس سمجھا دیا کرتی ہے کہ یوں کرو یوں نہ کرو۔ اماوس کی سیاہ پوش جرم پناہ رات کا آخری نصف حصہ چھاپا اور اغوا کے لیے متعین تھا تو اس کے اول شروع حصہ کو ہی دماغ کے لئے منتخب کیا اور سیوتی لال کو بھی فرار کا صحیح موقع اسی اماوس کی اندھیری کالی چادر کی آڑ میں ہو سکتا تھا، آج کٹیا میں چولہا گرم نہ ہوا تھا۔ وہ پہر بھر رات گئے تیندوئے کو طرح اٹھا اور شدر کے اندر سے بارہ ہزار سال پرانا مغلوج آدمی ساؤنٹھا ہو گیا اور راجپوت کا دار خالی دینے کے لیے اپنا ناموس بچانے کو سیوتی لال راجپوتی چھاپہ کا وار خالی دینے کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور مالی باغبان جس کے حیات آفریں اور خوشبو و رنگ اور رس پیدا کرنے والے رومانی ہاتھ کا ہمیشہ بیلچہ ہی مقدر تھا اور نو پروان مقدس پھیشہ تھا آج اس ہاتھ میں کلہاڑا نظر آیا۔ بھگوان شیو شنکر مہاراج والا ہتھیار!!— اس نے اپنا ازلی مقدر و شنو جی کا عطا کیا ہوا فرودیں اوزار بیلچہ جس کے پھل رستے سے اس نے زمین پر جنت کی پیٹنگ نقل کی تھیں، کرہ ارض کی فضا میں رنگ و بو کے بخارے اڑائے تھے کوثر تسنیم کی موجیں بہائی تھیں اور امرت کی پھواریں برسا برسا کر گلی گلی گھر گھر عام کی تھیں نہ معلوم کہاں پھینک دیا اور اس جہاں بیز و بہار آفریں گلاب پاش سے ہاتھ میں کلہاڑا دیکھ کر تاید وشنو جی کی بھی آنکھیں حیرت اور افسوس کے ملے جلے انداز میں ایک دفعہ کو جھپک گئی ہوں گی — اور مالی، باغبان کے ہاتھ سے اس کی ازلی اور شاید ابدی تاریخ اور مقدر میں پہلی مرتبہ کلہاڑا اجا، موت کی مہیب ضرب گونجی۔ دھادھم، دھادھم، دھادھم، چٹاخ پٹاخ، چٹاخ پٹاخ، ایک دو تین

چار پانچ چھ سات ..... ضرب پر ضرب اور اور ضرب اور دیکھتے دیکھتے گلاب خاص کا اصل بڑا تخمی درخت بس کے متعلق اب عام عقیدہ یہ ہو گیا تھا کہ دشنوی طوطے کوسے کے چولے میں سیکنڈ جنت کا پھل لا کر بو گئے ہیں اور پوجا ہونے کی نوبت آنے والی تھی اور اُدھر ادھرام شدر کی بے کفن لاش کی مانند کریا کا ایندھن بن کر ملیا ملیا زمین پر دراز ہو گیا جس کے پھل نے راجپوتوں کو شکست دینے کا تصور کیا تھا اس راجپوتی سنسار میں اسی طرح کیفر کردار کو پہنچ گیا جیسے رام اور راون کے ساتھ ہوا تھا اور اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں شدر کے سینہ پر سونے کا تمغہ سجنے اور چاندی کا کپ پکڑنے کے پاداش میں کلہاڑی ماری اور اصل گلاب خاص کا فتنہ ختم کر کے سیوتی لال اس سم شیریں کو نیست نابود کرنے کے لیے بڑھا اور چاروں قلمی درخت بیچارے تو کیا ایک ہی ایک ضرب میں زنار پوشوں کو چیلنج کرنے کے تصور میں زمین بوس ہو گئے یاں سے واں تک گھاس اور گلاب کی جھاڑیوں میں کچے گدرے گلاب خاص کے پھلوں کا فرش ہو گیا اور وہی ہوا جو بارہ ہزار سال سے ہوتا چلا آیا تھا اور اب مالی نے اک ذرا اطمینان کا سانس لیا، چند گہری سانسیں لیتے ہی گملوں کی قطار پر نگاہ جا پڑی جن میں گلاب خاص کی یک سالہ دو سالہ سہ سالہ قلمیں نصب تھیں ہونہار اٹھتی ہوئیں اپنی پروان چڑھانے والی گلابو کی طرح سانولی گل بدن سی۔ نرم نرم نیلوفر کے سے سبز ڈنٹھل، گلابی گلابی ریشمیں کونپلیں، سبز شاداب مخملیں پتیاں گلاب خاص کی تمام تر رنگینیاں شیرینیاں اور ننھے ننھے وجود کے اندر بالیدگی اور تاریخ سازی کے لیے تڑپ رہی تھیں، جڑے ڈیڑھ دو فٹ اونچے پنیگوں تک سب کچھ ایسا جیسے کوئی نوخیز بچی اپنی گڑیوں کے لیے رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کے ننھے ننھے ملبوس تیار کرتی ہے اور قلمیں تیار کرتے ہوئے گلابو کے اندر گڑیا کھیلنے والی لڑکی کے ہی تو جذبات متحرک ہوتے تھے۔ شاداب مضبوط چمکی ہوئی ہونہار گلاب نما کی قلمیں جڑ تنا اور شاخ جس کے ننھے منے وجود کے اندر کرۂ ارض کی اوّلیں متمدن مخلوق آدم و حوا کے جوڑے کا زمردیں شادابیوں والا شفاف نوس اندر قوس کلچر جھلکتا تھا اور حیات کی ضامن حرارت غریزی اور توانائی کی تولید کا ضامن تھا۔ ازل سے ابد تک اور ابد سے ازل تک اگلی پچھلی تمام نادر مدتیں اور دار و دار انگڑائیاں لے لے کر اپنے مضبوط کندھوں پر سنبھالے ہوئے تھا اور یاں سے واں تک، واں سے یاں تک کرہ ارض تا باغ فردوس زندگی کی لہر بنا جاری و ساری تھا۔ رنگ، رس، خوشبو کا یہ قافلہ زندگی کا دھارا لائے ہوئے رواں دواں تھا۔ گملوں کی قطار

اب سیوتی لال، نہ مالی، نہ باغبان، ہونہار چکن چکن پات بروا کی گملوں میں کھڑی قطار پر آ ٹوٹا۔ اور آن بان والے قرن اولیٰ کے راجپوتوں کی طرح جیسے بیٹیوں کا گلا گھونٹنے لگا، بید دی کے ساتھ اوپر چوٹی والا نرم نرم ریشمی قمچیوں والا گچھا مٹھی میں دباتا اکھیڑتا جاتا اور دور پھینکتا جاتا۔ جب اکھیڑتا اکھیڑتا دو سالہ قلموں سے یک سالہ قلموں تک اس سرے سے اس سرے تک پہنچا اور دشنو جی کے اتارے ہوئے اس امرت پھل کے دھرتی سے نیست و نابود ہونے کا آخری وقت آ لگا اور اسی سال کی صرف ابھی کی بندھی نازک نوخیز، ہونہار صرف دو بالی قلمیں باقی رہ گئیں جو بچاریاں اپنے برابر والی ساتھنوں کے انجام کو پہنچنے کے لیے سر تسلیم خم کیے سہمی سہمی کھڑی تھیں اور ابھی پرشاد ان پر دبوچ لینے کے لیے اس طرح جھپٹا جیسے شکرا گوریا پر ٹوٹتا ہے، تو اندھیرے میں زبان و حلق کے بجائے پیٹ کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک غوں، غراہٹ سی سنائی دی اور گلابو اپنے دونوں بالے بچہ پودوں اور سیوتی لال کے درمیان آ گئی جیسے ماتا کا قطب مینار حائل ہو گیا، بیٹوں کو بچانے کے لئے ماں کی دیوار چیں آ کھڑی ہوئی "نہ ــــ نہیں نہیں، نہیں، غوں، غاؤں" اور ماتا کی شدت کے آثار سے سیوتی لال کی راجپوتی نوعیت کی حدت اک گونہ انفعال سا بن گئی اور دوسرے ہی لمحہ جیسے وہ بے دست و پا رہ گیا۔ اپنی فطرت و جبلت پر پلٹ پڑا، شاید نادم و خجل اور اس کا ہاتھ تو خلاف جبلت و

منافی فطرت عمل یہ دنیا میں پہلی مرتبہ سرکت میں آیا تھا۔ اس نے نوچمن بندیاں باغ بانیاں فطرت میں ودیعت پائی تھیں اور تربیتی آبائی ماحول میں یہی گھٹی میں پڑا بھی تھا۔ وہ فطرت جبلت اور تربیت کا متناسب امتزاج تھا۔ شیرنی گھاس نہیں کھایا کرتی نہ گائے چیر پھاڑ کر کے گوشت اور آج تو کچھ ایسا ہی ارتکاب ہوا تھا۔ رنگا رنگ خوشبودار شہد بھرے پھول کھلانے والا بیٹھے امرت میں بھرے پھل پروان چڑھانے والے بیکنٹھ اور جنت کی تربیت کا حامل، سیوتی لال منافی خلاف جبلت اقدام پر منفعل ہو کر رہ گیا۔ نادم و خجل — اور اس کے مضبوط ہاتھ تو ازل سے آج تک پہلی مرتبہ اس نہج پر حرکت میں آئے تھے۔ اس نے شکست سی کھا کر ہتھیار ڈال دیے۔ کلہاڑا دور پھینک دیا۔ اُدھر فطری عمل کی اس کارفرمائی سے ناآشنا، ناکتخدا دوشیزہ کی اچھوتی چھاتیوں کے بلوریں پیالوں کے اندر سنسناہٹ سی ہونے لگی، اس نے نوزائیدہ جڑواں بیٹوں کی ماں کی طرح لپک کر دونوں پودوں کے گملے اٹھا کر دائیں بائیں دونوں جانب گودوں میں دبائے اور اس عمل کے ردعمل میں بھولی، ناواقف لمس سے دوشیزہ کے دونوں آنچلوں میں میٹھی میٹھی گھمر گھمر ہونے لگی۔ جیسے پہلوٹھی کی پیدائش کے ساتھ نوجواں ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی گردش اٹھتی ہے اس نے مالی والے ہی پیار کے ساتھ ہی دونوں پودوں کو دونوں گودوں میں بھینچ لیا اور اس بھینچنے کے ساتھ دونوں چھاتیوں کے اندر گلاب خاص کا رس گدگدانے لگا۔ کچی چاندی اور سچی چینی کے اتصال سے جل ترنگ سی بج اٹھی اور گلاب خاص کے دونوں نوبندش قلمی پودے نوزائیدہ جڑواں بیٹوں کی طرح دائیں بائیں گلابو کی دونوں گودوں میں تھے اور گلاب خاص کا امرت رس اس کی چھاتیوں کے اندر اور اس کی چھاتیوں کے تیسوں دودھ کی دھاروں کی پھواروں کا فوارہ گلاب خاص کے اندر رواں دواں تھا، من دیگرم تو دیگری کے پردے درمیان سے معدوم تھے منفعل باغباں مالی کلہاڑا تو پھینک ہی چکا تھا۔ اس منظر سے متاثر ہو کر جلدی سے پھر اپنا بیلچہ اٹھا لیا اور سیوتی لال گلابو کی گنگا جمنی مثبت لہریں پھر ایک سمت سیدھی ہو گئیں اور گلاب خاص کے گملوں کے حلقوں میں پراگ کا سماں بندھ گیا۔ دونوں جڑواں بھائی چپ چپ دودھ پینے لگے تربیتی کے بھنورا اور دھارا نظر آنے لگی۔ آدمی نے پودے کو پہچانا اور پودے نے انسان کو۔ اور جب دونوں گودوں میں دبے دونوں گلاب خاص کے پودوں کی نرم نرم، ریشمیں، مخصوص خوشبو والی کونپلیں تتیاں گلابو کے رخساروں سے چھوئیں تو اس پر ہلکا ہلکا صبوحی والا کیف سا طاری ہو گیا اس ماں کے سرور کی طرح جو اپنے بچہ کو گود میں اٹھاتی ہے تو اس کے ریشمیں بال رخساروں پر چھو کر پیدا کرتے ہیں تخلیق کے عظیم فطری تعلق و عمل اور منشائے خالق ہبوط آدم کی سب سے بڑی غایت کی مظہر محبت پیار اور یگانگت کی کارفرمائی، گلاب خاص کے نودھے پودوں سے گلابو کے گلابی مرمریں نوخیز مدبھرے بدن تک لہر اندر لہر سلسلہ جڑ کے ریشے ریشے پتی پتی کونپل کونپل سے رگ رگ بال بال تک بیک خون ہو کر ایک رو گدگدا کر زندگی کو بیدار کرنے لگا اور روئے زمین پر حیات کی ایک نادر ترکیب وجود میں آئی۔ ناکتخدا نوخیز دوشیزہ اور نودھے، نوبندش پودے۔ دونوں ہی پر شدید جینے اور جینے جانے میٹھی میٹھی والی بیت گئی۔ . . . . . —

تاسف ملال، ندامت اور محرومی مختلف النوع حیات کا عجیب سا ملغوبہ بنا سیوتی لال مالی باغبان بغل میں بیلچہ دبائے چل پڑا۔ اور بیٹی جیسے اپنے دونوں جڑواں بچے دبائے پیچھے پیچھے بھولی۔ ہولی دیوالی کے تیوہاروں پر دیہات میں لڑکیاں باپ بھائی، ماموں چچا کے ساتھ پیچھے پیچھے ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر میکے جاتی نظر آیا کرتی ہیں۔ گلاب باڑی پیچھے چھوڑی نشیتوں کی جنم بھوم پیچھے چھوڑی۔ گلاب خاص کی سوکھی لکڑی اور کچے آم بکھرے پڑے چھوڑے کٹیا پیچھے چھوڑی اور کٹیا کے کسی کونے میں سونے کا تمغہ اور چاندی کا کپ اُلٹا پڑا چھوڑا اور آدمؑ و حوا سے بغیر قصور خورد ن گندم صرف ایک پودا لگانے کے جرم میں جنت چھوٹی۔

انہوں نے ناسازگار ماحول کو خوب ٹھونک بجا کر منہ موڑا تھا اور پرکھوں کی جنم بھومی سے مضبوطی کے ساتھ لات مار کر بیٹھ پھیری تھی۔ ہر راستہ مسدود اور ہر گلی بند پا کر یہ بے سنگ و میل سفر اور راہِ بے منزل اختیار کی تھی مگر پھلوار کے دروازہ پر پہنچ کر سرحد سے باہر قدم اٹھاتے اٹھاتے جیسے خود کا اندازہ ہیں ان کی گردنیں آپوں آپ مڑ گئیں اور سب کچھ تو بھادوں کی اماوس نگلے ہوئے تھی، آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے، شش جہات میں تو اندھیریاں ہی اندھیریاں پڑی ہوئی تھیں جیسے سارے جہاں میں اندھیر بپا تھا، کوئی کسی کا نہ تھا، حتیٰ کہ ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا مگر انہوں نے تو اندھیریاں چیر کر ہی اندھیرے ہی میں سب کچھ دیکھ لیا تھا، اپنا مقدر بھی، گلاب خاص کی جیت میں ہار کی ناش کشکست بھی اور اپنے آقاؤں کا مقدور بھی۔ البتہ گلابو کے مرمریں بازو اور صندلیں پہنچے گلاب خاص کے دونوں گلوں کو آغوش میں دبائے روشن بالذات گرفت کی طرح اندھیرے میں چمک رہے تھے اور جیسے انھیں کی رہنمائی میں وہ بھادوں کی اماوس چیرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ کالے کالے بھرِ ظلمات جیسے تھپیڑوں کو چیرتا پھٹتا ہوا کالا بوجھل جھونکا سامنے سے بڑھ کر ٹکرایا اور پیچھے سے بجلی کا کوڑا لہرایا، عالم لمحہ نور ہو گیا اور ساتھ ہی کڑاکڑ، اڑاڑار ادھم۔ دنیا دہل اٹھی، سیوتی لال کے منہ سے بے اختیار نکلا "اوم برہم!۔ ہے اندر مہاراج تمہاری لیلا! بی آں! بی آں! بی آں! چاروں سمت درختوں میں دبکے ہوئے موذوں نے چیخوں کا دور تک ایک آواز سلسلہ ملا دیا اور فریب ہی کہیں ایک اکیلا گیدڑ رو کا، اور یہ شور منظر تو ان کے کانوں کے لیے نیا نہ تھا، مگر آج نیا اور نامانوس سا لگا جو پیدائش سے آج تک معمول رہا تھا، سیوتی داں کی نگاہ اک ذرا کے ذرا تا حدِ نظر اپنے نصب کئے ہوئے باغوں کی قطاروں میں دوڑتی چلی گئی، درخت نصب کرنے کے ناپ کی یکسانیت موزونیت کے سلیقہ قاعدہ کے مطابق اصطلاح میں "رام تیور" کہلانے والے طریقہ میں لگائی ہوئی قطاروں کے باغ، ہر قطار ہر سمت اور ہر جگہ سے ایک ہی زاویہ اور راست خط میں نظر آنے والی، یکساں و یک سمت جاتی ہوئی سطرنج کے مہرے" قطار میں ایستادہ، رام سیوک مالی سیوتی لال کے سیدھے ہاتھ کی نصب کی ہوئی، کسی خوش فکر سلجھے ہوئے مصنف کی تصنیف کی سطریں لفظ لفظ کھلی ہوئی، عقل و معنیٰ کے رنگ و رس سے بھری ہوئیں، سطر سطر نئی تحقیق نادر ریسرچ سے پُر اور سب کی سب اس کی اپنی جانب رُخ کئے اس کی تحقیق کی شاہد، جیسے دور سے اس کو اپنی جانب کھنچتی بڑھتی دکھائی پڑیں اور انھیں دور سے دیکھ کر خاص طور پر اس موسم میں اس کو اکثر یہ محسوس کر کے دل پہ لہر سی اٹھا کرتی جیسے یہ اس کے اپنے نوزائیدہ جواں سال بیٹوں ہی کی تو قطاریں ہیں اور اس خطہ کے اندر جہاں سماج اور قانون باپ کی بیٹی کو اولاد کا درجہ نہیں دیتے یہ قطاریں اس کے اندر بیٹوں کے باپ کے یقین و احساس کو سہارا دے رہی تھیں اور اولاد ذکور کی محرومی کا شائبہ بھی اس کے شعور کے اندر کبھی نہ ابھرنے دیا تھا اور اس کے یہ سپوت بیٹے تو خیر جاری تھے، رس رنگ اور خوشبوئیں، زندگی کی ضامن تمام شیریں نعمتیں عام کر کے بکھیرنے والے، انسان، حیوان اور طیور پر یکساں مہربان اور انھیں کے قیام سے تو اس کی بغیر بیٹے والی زندگی عبارت تھی اور اس کی گلابو بیٹی تو بیٹا تھی اور انھیں قطار اندر قطار باغوں نے بیٹی کے اس باپ کو فردوسیں شیرینیاں اور رنگ و لو پاشیاں کر کے اولادِ ذکور کی محرومی کا احساس نہ ہونے دیا تھا، گلاب خاص کے متعلق کبھی کبھی صبح تڑکے اس کے شعور میں نیم خواب ستم بیداری کی کیفیت میں یہ آرزو ابھرتی جیسے یہ کوئی خوبصورت سرخ سرخ دمکتا ہوا لڑکا ہے، بڑا ہی شیریں، دھن، بڑا ہی خوشبودار اور جیسے وہ اپنی گلابو کو دلہن بنا کر اس کا پلو اس کے ساتھ باندھ دے اور بھونرے ڈال دے گا۔ اور آج ایک بیٹی اور ایک آم ہی اس کے

تنہا رفیق تھے اور دوسرے جھونکے کے ساتھ ایک کڑک اور کوندے کی چمک میں یہ قطاریں کی قطاریں اور بھی زیادہ واضح اور متحرک سی ہو کر سب کے سب اسے اپنی جانب چلتے ہوئے نظر آئے یا شاید خود وہی ان کی جانب بڑھ رہا تھا، نہیں نہیں وہ ان سے دور ہو رہا تھا یہ تو سب اس کے ایستادہ نصب کئے ہوئے تھے اور یہ اس کا واہمہ فریب نگاہ اور بھول تھی ان کے پاؤں تو اس نے خود ہی باندھ کر پرورش کیا تھا اور تیری میری مٹی کی کیمیا سے مرکب زمین پر بنیاد رکھی تھی اور اسکے یہ جوان سال بیٹے بھی تجھ مجھ کے ہو کر رہ گئے تھے اور دوسروں کی ولدیت میں بھر گئے تھے اور وہ بیگانہ وار ان کے عین بیچوں بیچ سے گزر رہا تھا اور ایکی مرتبہ پھر بڑے زور کا کوندا اور کڑک ہوئی، اس نے آس پاس دیکھا یہ درخت اب بے ترتیب جھرمٹ سے کئے نظر آئے، قطاروں کا تسلسل و یکسانیت آخری قربت میں گم ہو گیا اور سوتی لال مالی کو بغل میں دبا ہوا بیلچہ تیشہ فرہاد سا محسوس ہوا۔ گلابو کو اس جھرمٹ میں ایک نوعیت کا خوف سا لگا، اس نے دونوں جانب دونوں گملے بازوؤں پہنچوں میں جڑواں بچوں والی خائف ماں کی طرح مضبوط بھینچ لیے، مبادا کہیں یہ میرے جائے بھی انھیں میں نہ جا کھڑے ہوں اور وہ دونوں بیگانے بن جانے والے اپنوں سے اس بن جیے جھرمٹ میں تیز تیز قدم بڑھتے رہے، جن کے جڑوں کے ریشے ریشے جھکڑے جھکڑے موسلے موسلے سے لے کر شاخ شاخ پھنگی پھنگی پتہ پتہ پر کسی مو قلم پینٹر آرٹسٹ کے نام کی طرح ان کے دستخط ثبت تھے اور اس وقت یہ انہیں بھوتوں کے غول بیابانی کی طرح ڈراؤنی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ اس ماحول میں اور اس مجمع کے بیچوں بیچ جہاں اس نے خود کو آدمی کے بجائے چھتناور شاداب، آم کا درخت محسوس کیا تھا اور انھیں میں سے کوئی ایک خود اور اس کی بیٹی گلابو شاید خود کو لڑکی سے زیادہ گلاب خاص محسوس کر کے اسی ہوا اور پانی میں ایسی ہی رنگینیوں شیرینیوں، خوشبوؤں کے ساتھ پروان چڑھتی رہی تھی جیسا کہ اس کا گلاب خاص تھا۔ انہوں نے آم کے چھتناور درختوں کے ساتھ پھاگن چیت سے بھادوں کنوار تک لوؤں دھوپوں، آندھیوں کا جم کر اور جھوم جھوم کر آنکھ سے آنکھ ملا کر برابر آفت ارضی سماوی مقابلہ کیا تھا اور انھیں سے اپنے اندر "امرس" کی تخلیق کی تھی اور آج باپ اپنا بیلچہ بغل میں دبائے اور بیٹی اپنا گلاب خاص جڑواں بیٹوں کی طرح دائیں بائیں دونوں گودوں میں بھرے عزت بچائے فرار ہو رہے تھے اور بھادوں کی سی کالی چادر کی آڑ آڑ جا رہے تھے جو پشتوں سے ان کا مرغوب لباس رہی تھی، اور وہ ان باغوں کے سلسلہ کو پار کر کے آخری حصہ پر پہنچ گئے جنھیں اس نے اپنی بے پایاں قوتِ بازو کی گرمی پسینہ کی کھاد اور اپنے بیلچہ کی دھار کے ذریعہ ایستادہ کیا تھا اور اس خطہ کے کلچر کو پروان چڑھایا تھا — سامنے ریل کی پٹری نظر آئی اور اُس جانب ریلوے اسٹیشن کی سنگین عمارت تھی اور یہ کٹیا سے چلنے کے بعد اس کی اوّلین منزل تھی، بے سنگ و میل و بے نام و نشان آخری منزل پہنچنے کے لئے۔ پلیٹ فارم بک ہونے والے پودوں اور آموں کے پارسلوں سے پٹا پڑا تھا اور اندھیرے میں یہ ان آم کے پارسلوں اور پودوں کی ٹوکریوں سے ٹھوکر کھانے سے بچتے ہوئے اُدھر پہنچے تو ایک مرتبہ پھر گردن آپوں آپ مڑی، مگر پیچھے کا جائزہ نہ لے سکے اور اب اتفاقیہ کوندے کی چمک بھی نہ تھی جو سہارا دیتی اور رہنمائی کا ذریعہ بنتی۔ گھنے باغوں کا سلسلہ اس کے دست و بازو کے سلیقہ کی ترتیب بھادوں کی اماوس میں سب کچھ گم تھا اور وہ بھی گم ہی ہو کر رہ گیا۔ سامنے اسٹیشن کی مٹی کے تیل کی دریبانی اونچائی والی مخصوص بتی کھڑی ٹمٹما رہی تھی اور اندھیرے کا پردہ چاک کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، گاڑی پاس کرانے کے لیے اسٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر سے لپکتا ہوا آ رہا تھا اور سامنے سے آتے ہوئے بڑے بابو نے اس کو پہچان لیا اس کی زندگی کا یہ پہلا سفر تھا، وہ اسٹیشن تک بھی سال میں ایک آدھ مرتبہ شاذ و نادر ہی آیا کرتا تھا، مگر اس نواح کا جانا پہچانا اور اپنی نوعیت و سطح کا اہم سا آدمی تھا، ایسے بے وقت اسٹیشن ماسٹر دور ہی سے دیکھ کر یک دم بولے "ارے استاد سیوتی لال ارے بھئی کہاں؟ آج تم کہاں؟!

خیر تو ہے کدھر سامان سفر!"

وہ بڑے بابو کو سلام کرنا بھی بھول گیا۔ جواب بھی نہ دے سکا اور بابو نکلا چلا گیا — اب اس نے پانچ روپیہ کا نوٹ چٹکی میں پکڑے بکنگ آفس کی کھڑکی کے اندر ہاتھ بڑھایا اور بکنگ کلرک نے پہچان کر ضابطہ کے استفسار سے زیادہ گھریلو انداز میں بے تکلفی کے ساتھ اندر سے ہانک لگائی "ارے! ایں آں، آج اُستاد سیوتی لال! کہاں۔ کدھر آج چل پڑے بھئی، ایں؟" تو بکنگ آفس کی کھڑکی کے سامنے اندر ہاتھ بڑھائے مسافر سچ مچ بغلیں جھانک گیا جہاں ہر مسافر گھر سے پوری اسکیم سفر بنا کر پہنچا کرتا ہے۔ اس نے بار بار دائیں بائیں دیکھا جیسے آس پاس کی تاریکی میں مشورہ کر رہا ہے کہ "کہاں جاؤں" اور چھوٹے بابو کا اہم سوال بھی بڑے بابو کے چلتے ہوئے سوال کی طرح بے جواب رہا اور "کہاں؟" کا سوال اس کے شعور میں جھنجھلا کر اندر ہی اندر گونجا، وہ ٹکٹ خریدنے والی کھڑکی پہ اندر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا اور اس کا سوال سن کر اس کے اندر والے نے جواب دیا "وہاں جہاں کی سرزمین کی مٹی اپنی چھاتی پر گلاب خاص کو کھڑا کر کے پروان چڑھا سکے اور جس فضائے بسیط کی ہوا پال پروان چڑھا کر چھتنا ور درخت بنا سکے اور گلاب خاص، دیسی گلاب کے پھولوں کی جھاڑی کی طرح لد سکے۔ وہ سرزمین کہاں اور کرۂ ارض کے کون سے اسٹیشن پر ہے نہ تو بابو جانتا تھا، نہ خود سیوتی لال اور نہ اس کی بُلا بو بیٹی ہی کہ پتہ معلوم تھا، نہ جریب کھینچنے اور گھٹے ڈالنے والے پٹواری چک تراش ہی کے نقشہ شجرہ میں ہنوز اس کا حدود اربعہ پایا تھا اور نہ اس کا جغرافیہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک قابض و خیل "مالک" کہلانے والے زمینداروں نے ہی آج تک دریافت کر پایا تھا، سب کچھ بھادوں کی اماوس کے اندھیرے میں گم تھا۔

سیوتی لال بیچارہ کہاں کا ٹکٹ مانگتا اور بابو غریب کون سے اسٹیشن کا ٹکٹ کاٹتا —

روپے

مسعود مُفتی

افراد

کریم ——— تیس برس کا سمارٹ لڑکا

عائشہ ——— کریم کی نو بیاہتا دلہن ۔ عمر ۲۲ یا ۲۳ برس ہنس مکھ خوبصورت اور سمارٹ

شکیل ——— کریم کا دوست ۔ وہی عمر

ابا جان ——— کریم کے والد ۔ ملازمت سے ریٹائرڈ ہمیشہ ڈھیلے سے کوٹ پتلون اور ٹائی میں ملبوس

شبراتی ——— کریم کا گھریلو ملازم ۔ عمر پچاس برس کے قریب

فوزیہ ——— ۲۲ یا ۲۳ برس کی خوبصورت سمارٹ لڑکی ۔

جمشید ——— چالیس برس کے قریب عمر کا سمارٹ مرد جو اپنے کپڑوں وغیرہ کا خاص خیال کرتا ہے ۔

چند دیگر مہمان ـــ مالی

امی جان ——— کریم کی والدہ

(کیمرہ کھلتا ہے ۔ تو دیوار پر ایک میخ پر فوکس ہوتا ہے ۔ جسے ایک ہاتھ تھامے ہوئے ہے ۔ جیسے دیوار میں لگا رہا ہو ۔ اتنے میں ایک ہتھوڑا آ کر کیل کے سر پر لگتا ہے ۔ اسی طرح کیل پر دو تین چوٹیں پڑتی ہیں ۔ مگر کیل ٹیڑھا ہو جاتا ہے ۔ وہ پھینکا جاتا ہے ۔ پھر دوسرا کیل سکرین پر نمودار ہوتا ہے کیمرے کا منظر ذرا پھیلتا ہے ۔ اب ہتھوڑے کے ساتھ ساتھ دوسرا ہاتھ بھی نظر آنے لگتا ہے ۔ دونوں ہاتھ مل کر دیوار میں کیل لگا رہے ہیں ۔ منظر آہستہ آہستہ پھیلنے لگتا ہے اور کریم کا سر نظر آتا ہے ۔ پھر کیمرہ اس کے جسم سے ہوتا ہوا نیچے اترتا ہے ۔ تو پاؤں کے نیچے میز ہے ۔ اور اس سے نیچے ڈش کیمرہ اور پیچھے ہٹتا ہے ۔ تو ڈرائینگ روم کا سین نظر آتا ہے جس میں ایک میز پر چڑھا ہوا کریم دیوار پر کیل لگانے میں مصروف ہے ۔ ڈرائینگ روم میں سارا سامان معمولی بے ترتیبی سے پڑا ہوا ہے ۔ جیسے اپنی اپنی جگہ رکھ دیا گیا ہو ۔ مگر آخری ترتیب نہیں ہوئی ۔ ایک کونے میں قالین لپٹا ہوا پڑا ہے ۔ ایک میز پر ٹیبل لیمپ اور دو تین ایش ٹرے پڑے ہیں ۔ صوفوں اور کرسیوں پر بھی سجاوٹ کی وہ چیزیں پڑی ہیں جو ابھی دیواروں پر لگانا ہیں ۔ وقت دن کے گیارہ بجے کا ہے ۔ کیل ٹھونکنے کے بعد کریم آواز دیتا ہے ۔)

کریم : عائشہ ..... (وقفے بعد) عائشہ ... (جواب نہ آنے پر مسکرا کر شرارت سے پکارتا ہے) اری دلہن ن ن ن ۔

عائشہ : (آواز آتی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ دروازے میں نمودار ہوتی ہے شلوار قمیص پہنے ہوئے) آگئی .... آگئی .... کیا ہوا۔ آوازوں پر آوازیں پڑ رہی ہیں۔

کریم : کمال ہوگیا۔ شادی کو سال ہوگیا۔ اور ابھی تک دلہن کہہ کر نہ پکارو۔ تو رسید ہی نہیں ملتی۔

عائشہ : (ہنستے ہوئے) میں ذرا کچن تک گئی تھی۔ کہ شبراتی کو چائے کا کہہ دوں۔ صبح سے تو کام سے ہی ہوش نہیں آئی۔

کریم : اوہ تھینک یو۔ ونڈرفل آئیڈیا۔ تو ذرا جلدی سے مجھے تصویر دے دو۔ میں اتنی دیر سے ٹنگا ہوا ہوں۔ تصویر مانگی جائے تو مجھے چھٹی مل جائے۔

(کیل والی دیوار سے ٹکی ہوئی ایک تصویر فرش پر رکھی ہے۔ عائشہ کریم کو دے دیتی ہے اور وہ ٹانگنے لگتا ہے)

کریم : تم ذرا فاصلے سے دیکھو۔ ٹیڑھی تو نہیں لگ رہی۔

عائشہ : (پرے ہٹ کر بتاتی ہے) ذرا دائیں .... نہیں زیادہ ہوگئی ..... تھوڑا بائیں .... بس ٹھیک ہے .... نہیں زیادہ کردی ..... ذرا سی سرکائیں ..... بس پرفیکٹ (PERFECT) اوکے .... اوکے OK

کریم : (وہیں نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ لمبا سانس لے کر) توبہ توبہ۔ گھر سیٹ SET کرنے میں سب سے مشکل کام تصویر ٹانگنا ہے۔

عائشہ : میں نے تو کہا تھا کہ شبراتی سے لگوالیں۔

کریم : اصول تو میرا بھی یہی ہے کہ ملازم اور بیوی سے پورا فائدہ اٹھاؤ۔ (عائشہ منہ بناتی ہے) اور یہ سب سامان شبراتی نے ہی رکھا ہے۔ مگر تصویر والا معاملہ ذرا نازک ہے۔ یہ میں خود ہی کرتا ہوں۔

عائشہ : تو گویا آپ ملازم اور بیوی کو ایک ہی درجہ دیتے ہیں۔

کریم : توبہ توبہ۔ کیا کفر بول دیا تم نے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کہاں بیوی کہاں ملازم۔ کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں۔

عائشہ : خود ہی تو کہا آپ نے۔

کریم : وہی بیویوں کی یونیورسل پرابلم کہ کسی بات میں سے صحیح نقطہ نہیں پکڑیں گی۔ بلکہ ہمیشہ غلط نکتہ اٹھائیں گی (چھلانگ لگا کر نیچے اترآتا ہے)

عائشہ : وہی شوہروں والی یونیورسل پرابلم کہ غلط بات پر بھی اڑے رہیں گے کہ صحیح بات کی ہے۔

کریم : پھر وہی بیویوں والی پرابلم ... اور یونیورسل کہ صحیح بات کو بھی غلط سمجھیں گی۔

عائشہ : مگر اس میں کیا غلط سمجھا میں نے۔

کریم : غلط یہ سمجھا دلہن بیگم کہ میرے اصول کا زور فائدے پر تھا۔ ملازم اور بیوی پر نہ تھا۔

عائشہ : تو گویا آپ نے مجھ سے صرف فائدہ اٹھانے کو شادی کی ہے۔

کریم : (قہقہہ مار کر) یہ لیجئے۔ ایک اور آن پڑی۔ مگر مسئلہ وہی نا سمجھی۔ یونیورسل۔ دیکھو نا عائشہ جیسے پرانے زمانے میں بڑے بوڑھے بیوی کی برکت کہتے تھے۔ آجکل کے ماڈرن زمانے میں ہم بیوی کا فائدہ کہتے ہیں۔ بات تو صرف VOCABULARY کی ہے۔ اور ہر زمانہ اپنی

VOCABULARY ساتھ لاتا ہے۔

عائشہ: ہوں اوں۔ تو یوں لگتا ہے کہ آج کل کا زمانہ اپنی TERMINOLOGY صرف آپ کو ہی سکھا رہا ہے ..... یا آپ زمانے کے خاص شاگرد ہیں۔

کریم: نہیں یہ بات نہیں سکھا تو سب کو رہا ہے۔ مگر کوئی طالب علم ذہین ہوتا ہے اور کوئی غبی ..... اور ہم (نیم فرشی سلام کرتے ہوئے) ماشاءاللہ ذہین واقع ہوئے ہیں۔

عائشہ: (طنز سے) مبارک ہو جناب ہونہاری پر۔ مگر کچھ ہونہاری زمانے کے لیے بھی رکھ دیں۔ ساری بے چاری بیوی پر ہی نہ صرف کریں۔

کریم: دیکھو بیگم۔ تم خدانخواستہ لڑائی کے موڈ میں تو نہیں آگئیں۔ سنا ہے نیا گھر سیٹ SET کرتے ہی بیوی پہلا کام یہ کرتی ہے کہ شوہر سے چھوٹی سی لڑائی کرتی ہے۔ یہ نئے گھر میں اس کی مساوی حیثیت کا اعلان ہوتا ہے کہ (شرارت سے کھانس کر بازو وائیڈ تے ہوئے) ہم بھی کچھ ہیں۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اگر یہ بات ہے تو سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دو چار روز رک جاؤ۔ ذرا یہ سب سیٹ (SET) ہو جائے تو پھر ہمسائیوں کو ایڈوانس نوٹس دے کر طبع آزمائی کریں گے۔

(عائشہ ہنسنے لگتی ہے)

کریم: ویسے تم داد دو کہ شادی کو ایک سال ہو گیا ہے اور ایک بھی لڑائی نہیں ہوئی۔ سال بھر کا ریفریشر کورس کمپنی بونس دیتی ہے۔ اور تم داد بھی نہیں دیتیں۔

عائشہ: (ہنستے ہوئے) داد کیسی دوں۔ لڑائی تو اس لئے نہیں ہوئی کہ ہم آپ کے گھر میں تھے۔ اور امی اور ابا جان کے خوف سے آپ لڑ کہاں سکتے تھے۔

کریم: اوگاڈ! وہی پرابلم۔ یونیورسل کہ خاوند کو کسی بھی بات کا کریڈٹ (CREDIT) نہیں ملے گا ..... لاؤ اپنی اس یونیورسل بے چارگی پر چائے ہی پی ڈالیں۔

عائشہ: ابھی لاتی ہوں۔ (باہر جانے لگتی ہے۔)

کریم: شبراتی کو آواز دو۔ وہ لے آئے گا۔

(مگر عائشہ نکل جاتی ہے اور کریم دیوار پر لگانے کے لئے دیگر تصویریں چھانٹنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد عائشہ ٹی ٹرالی میں چائے رکھے آتی ہے۔ ایک پلیٹ میں بڑا سا کیک بھی ہے۔)

خود کیوں بھاگ گئیں۔ ملازم کس مرض کی دوا ہے۔

عائشہ: (نظر انداز کر کے) کشمیری چائے ہے۔ نمک تو ڈالا ہے۔ شکر بھی لیں گے۔

کریم: آہا۔ کشمیری چائے۔ (مڑتے ہوئے) آدھی چمچ ڈال دو۔ ..... اوہو کیک بھی ہے ..... بھئی واہ۔ تم تو اس حدیث پر پورا پورا عمل کر رہی ہو۔ کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اسے مزدوری ملنی چاہیے۔

عائشہ: آج پہلی دفعہ ٹرائی (TRY) کیا ہے۔ مجھے تو کچن کا اوون (OVEN) ٹھیک نہیں لگتا۔

کریم : تو یہ ہوا اس گھر میں پہلا کیک ..... اوہ اب میں سمجھا ..... اسی لئے چائے خود لینے گئی تھیں اور شبراتی کو نہیں کہا تھا۔

عائشہ: جی نہیں ..... یہ وجہ نہ تھی۔ جس طرح آپ کے کچھ اصول ہیں۔ ملازم اور بیوی سے فائدہ اُٹھانے کے متعلق۔ اسی طرح ہمارے بھی کچھ اصول ہیں۔

کریم : اچھا آ آ آ ..... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ..... یہ اصولوں کا اعلان سال بھر پہلے کیوں نہیں ہوا۔

عائشہ : اس لئے کہ ان کی ضرورت اپنے گھر میں پڑتی ہے۔

کریم : اچھا تو ٹی ٹمالی کس اصول کی مدد سے کھینچی جا رہی تھی۔

عائشہ : (چائے بناتے ہوئے) اصول یہ ہے جناب کہ اگر چند چھوٹے موٹے مخصوص کام عورت اپنے ہاتھ سے کرلے۔ تو گھر جو ہے نا۔ وہ گھر و ندا بن جاتا ہے۔

کریم : کیا مطلب؟

عائشہ : ہونہار صاحب! ..... یہ کسی ایک زمانے کی VOCABULARY نہیں بلکہ یونیورسل VOCABULARY ہے (کریم ہنستا ہے) مطلب یہ کہ اس طرح گھر میں رونق بڑھتی ہے ..... یعنی وارمتھ (WARMTH) کا احساس ہوتا ہے۔ گھر میں زندگی سی نظر آتی ہے۔ اور اگر ہر کام نوکروں پر چھوڑ دیا جائے۔ تو گھر تو رہتا ہے۔ مگر اس میں گھر ہستی نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ..... سرد خانہ سا بن جاتا ہے ..... وہاں کسی ریسٹ ہاؤس یا ہوٹل کا گمان ہوتا ہے۔

کریم : واہ! عائشہ یہ تو شعر کہہ دیا تم نے ..... کشمیری چائے ایسا شعر اور تم۔ یہ سب مل کر نشہ آ گیا۔

عائشہ : اور کیک کا نام ہی نہیں لیا۔

کریم : اور ہاں۔ کیک تو پھر کیک ہوتا ہے ..... اور پہلا کیک تو بہت ہی کیک ہوتا ہے ..... لاؤ ادھر ڈال دو میری پلیٹ میں ..... اور اچھا یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے کام ہیں جو خاتون خانہ کو اپنے ہاتھ سے کرنے چاہئیں۔

عائشہ : چھوڑیئے۔ آپ تو مذاق کرنے لگ گئے۔

کریم : بائی گاڈ۔ مذاق نہیں کر رہا ..... یہ انداز تو میری ذات کی گونج ہے گونج واقعی تمہارا تھیسس (THESIS) بہت دلچسپ ہے ..... اچھا تو کون سے کام ہیں وہ۔

عائشہ : بس یہی ..... کہ ..... چائے خود بنانا۔ خود لانا۔ خود پلانا ..... گھر میں پھول خود سجانا۔ لان اور باغیچے میں خود کام کرنا ..... اور .....

کریم : (بات کاٹ کر) خاوند سے خود جھگڑا کرنا۔

عائشہ : (ہنس کر) بالکل۔ جھگڑے کا بھی تو سپیشل حق ہوتا ہے نا۔

کریم : اچھا تو اور کیا؟

عائشہ : بس اسی قسم کی چیزیں۔ جیسے خاوند کے چھوٹے موٹے کام خود کرنا ..... بچوں کے کام خود کرنا .....

کریم : (شرارت سے کھنکار کر) کہیں یہ تھیسس اس لئے تو نہیں بنایا کہ مجھے بچوں کی یاد دہانی کرائی جائے۔

عائشہ : لاحول ولاقوۃ ۔ میں تو سیدھی سی بات کر رہی ہوں ۔

کریم : (بات کاٹ کر پیالی رکھ دیتا ہے) اور میں بھی سیدھی بات کر رہا ہوں کہ اپنی لسٹ میں سے آخری آئیٹم فی الحال کاٹ دو۔ کیونکہ کم از کم پانچ سال میرا کوئی پروگرام نہیں کہ بچوں کو نازل ہونے کی دعوت دوں ۔

عائشہ : اور یہ پانچ سال کا ہندسہ کیسے چنا گیا ۔

کریم : اسے مزید بھی بڑھا سکتے ہیں ۔ مگر میرا خیال ہے کہ پانچ برسوں میں میں اپنے پیشے میں کافی ترقی کر لوں گا ۔

عائشہ : ترقی بچوں کے ساتھ بھی تو ہو سکتی ہے ۔

کریم : یہی نکتہ تو تمہیں ..... نہ ہی ابا جان سمجھتے تھے ۔ اسی لئے مجھے گھر علیحدہ لینا پڑا ..... دلہن بیگم پہلے ترقی ہوتی تھی ۔ کام سے محنت سے ۔ سینیارٹی سے مگر اب ہے مختلف زمانہ ۔ آجکل ہوتی ہے پبلک ریلیشننگ (RELATIONING PUBLIC) سے تعلقات سے میل ملاپ سے ..... اب یا تو تم میرے ساتھ مل کر میل ملاپ میں مدد کرو ۔ اور یا پھر تم بچوں کے نیپکن (NAPKIN) دھوتی رہو ۔ اور میں ان کی انگلی پکڑ کر گھومتا رہوں ..... یا بچے یا ترقی ..... دونوں کام اکٹھے نہیں ہو سکتے ۔

عائشہ : اچھا پھر بات کریں گے ..... آپ چائے تو پی لیجیے ۔

کریم : (پیالی اٹھا کر) جی ہاں چائے پئیں گے ..... اور پیتے رہیں گے ۔ مگر یہ بات پھر کبھی نہیں کریں گے ۔

(عائشہ خاموشی سے کیک کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتی ہے اور سوچتے سوچتے کھانے لگتی ہے)

کریم : اچھا تم اب کی بات کرو ..... یہ بتاؤ باقی گھر کیسے سیٹ (SET) کریں گے ۔

عائشہ : (سوچتے ہوئے) سیٹنگ (SETTING) کا انحصار تو اس پر ہے نا کہ آپ کے ذہن میں گھر کا تصور کیا ہے ۔

کریم : ہاں ... عائشہ اچھی بات کی تم نے .. (سوچنے لگتا ہے) اچھا تمہارا کیا تصور ہے گھر کے بارے میں ؟

عائشہ : میرا ؟

کریم : ہاں ۔

عائشہ : میرا تصور ... (سوچتے ہوئے) کوئی لمبا چوڑا تصور نہیں ۔ بس گھر ہو ..... میرا مطلب ہے آرام دہ صاف ستھرا گھر ..... جس میں ..... نہ زیادہ تنہائی ہو نہ زیادہ غل غپاڑہ ..... بس سکون ہو ..... ایک دم سکون ۔ میں تو سکون کو سب سے اہم چیز سمجھتی ہوں ۔

(باہر سے کھانسنے کی آواز آتی ہے ۔ عائشہ بات کرتے کرتے رک جاتی ہے)

کریم : یہ تو ابا جان کی کھانسی لگتی ہے ۔ (دروازہ زور سے بند ہوتا ہے تو اٹھنے لگتا ہے مگر ابا جان داخل ہوتے ہیں) السلام علیکم ابا جان ۔

(عائشہ بھی سلام کرتی ہے)

ابا جان : وعلیکم السلام بچو ! ابھی تک تم سیٹنگ (SETTING) کے کاروبار میں پھنسے ہوئے ہو ۔

کریم : پتہ نہیں ابا جان کام ختم ہی نہیں ہوتا ..... اب چار دن تو ہو گئے ہیں ۔

ابّاجان: ہاں بیٹا۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تک ہر کام کئی گنا وقت لیتا ہے۔ (کریم شرارت سے مسکرا کر عائشہ کی طرف دیکھتا ہے) .... وہ کدھر ہے تمہارا ملازم شبراتی..... ارے شبراتی ..... شبراتی۔

(شبراتی کی آواز آتی ہے۔ "جی صاحب" اور پھر وہ دروازے میں نمودار ہوتا ہے)

جا باہر گاڑی میں سے ٹفن نکال لے۔ (کریم سے) تمہاری امی نے گاجر کا حلوہ بنا دیا تھا۔

کریم: شبراتی۔ گاجر کا حلوہ ہے اور تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے ..... فوراً ڈبل سے جا اور .... بھاگ بھاگ .....۔

اَبّاجان: بیٹی کریم کی تو جان ہے گاجر کا حلوہ (عائشہ ایک کرسی سے چیزیں اٹھا کر خالی کرتی ہے)

کریم: ابّاجان۔ گاجر کی کوئی شرط نہیں۔ کوئی بھی حلوہ ہو۔ کہیں سے تو لگے کہ میں اچھا مسلمان ہوں۔

ابّاجان: (ہنستے ہوئے بیٹھ کر) بیٹے میں نے تو تمہیں بڑی محنت سے ایسی تربیت دینے کی کوشش کی کہ تم ہر چیز سے اچھے مسلمان لگو۔

کریم: واقعی ابّاجان۔ نماز نہ پڑھنے پر تو وہ وہ تھپڑ پڑے ہیں کہ اب بھی اذان ہوتی ہے تو جسم خود بخود درد کرنے لگتا ہے

(سب ہنستے ہیں)

اور عائشہ ہمارے گھر میں ایک کتاب ہوتی تھی۔ الفاروق ..... حضرت عمرؓ کی سوانح عمری۔ جب ہم چھوٹے ہوتے تھے۔ تو ابّاجان وہ پڑھانے لگے۔ وہ بھی اتنی موٹی کہ پورا بچپن ختم ہو جائے۔ مگر وہ ختم نہ ہو۔ ..... اس پر بھی بڑی مار پڑتی تھی۔

اَبّاجان: بڑی اچھی کتاب ہے وہ۔

کریم: اتنی اچھی کہ میں نے چار دفعہ جان بوجھ کر گم کی ..... اور ابّاجان چاروں دفعہ نئی خرید لائے۔

اَبّاجان: بیٹے انہی چیزوں کا تو اثر ہے کہ آج کچھ ڈھنگ کے آدمی بنے نظر آتے ہو۔

کریم: لیکن۔ ابّاجان۔ اگر اس سے ایک چوتھائی محنت سے بھی آپ ہمیں دنیاداری سکھا دیتے تو ہم زیادہ بندے بن جاتے۔

اَبّاجان: بیٹے۔ زندگی میں جتنی دنیاداری کی کم از کم ضرورت ہے۔ اتنی تو میں نے بھی تمہیں سکھائی ہے۔

کریم: وہ تو ٹھیک ہے۔ ابّاجان! لیکن آپ کے زمانے میں کم دنیاداری سے کام چل جاتا تھا۔ مڈل پاس دنیادار بھی خوب پھلتا تھا۔ لیکن آجکل تو دنیاداری کی پی ایچ ڈی کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔

اَبّاجان: (پیار سے فہمائش کے انداز میں) یہ فتور کہاں سے آیا تمہارے دماغ میں۔

کریم: فتور نہیں ابّاجان۔ فیکٹ (FACT) ہے۔ میں اپنے سکول اور کالج کے زمانے کے ساتھیوں کو دیکھتا ہوں۔ تو حیران ہو جاتا ہوں۔ ان میں سے کئی تو کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

اَبّاجان: کریم عمر کے ساتھ تم بھی ترقی کر جاؤ گے۔ انشاء اللہ۔ جب میں نے سروس شروع کی تھی تو بعض اوقات میں بھی ایسے ہی سوچتا تھا۔ مگر تقویٰ ساتھ تھا۔ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیتا گیا ..... جب میں نے کار خریدی تھی تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ میری کار ہے۔

کریم: مگر ابّاجان! آپ نے اپنی گاڑی بعد میں تبدیل کیوں نہ کی۔

اَبّاجان: بیٹے ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ بڑی اچھی سروس دے رہی ہے مجھے۔ حالانکہ بیس بائیس برس پرانا ماڈل ہے یہ۔

کریم : اب بدل لیجیے۔

اَبّاجان: سال بھر سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ کیا کروں گا اب بدل کر ..... جو چند دن رہ گئے ہیں۔ وہ بھی گزر جائیں گے۔ اسی پر۔

کریم : یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ ایک کھٹارہ سی کار میں ساری زندگی گزار دی۔

اَبّاجان : بیٹا۔ انسان حرص پر اتر آئے۔ تو کئی زندگیاں ملنے پر بھی خواہش سیر نہیں ہوتی۔ مگر قناعت ہو تو ایک کار بھی ساری زندگی کے لیے کافی ہوتی ہے ..... مجھے یہ حرکت میں رکھتی تھی کہ ایک کامیاب زندگی گزار دوں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

کریم : آپ کے وقت میں یہ شاید ٹھیک ہو۔ مگر اب تو کامیابی کا پیمانہ ہی کار کا ماڈل ہے۔

(شبراتی دروازے میں داخل ہوتا ہے)

شبراتی: وہ جی وہ آئے ہیں۔

کریم : وہ کون۔

شبراتی : جی .... وہی۔

کریم : میاں کیا نام ہے ان کا۔

شبراتی : جی نہیں بتاتے ..... کہتے ہیں صاحب سے کہہ دو وہی آئے ہیں جو پہلے گھر آیا کرتے تھے۔

کریم : اور تم نہیں پہچانتے۔

شبراتی : (ہنس کر) مجھے تو جی چار ہی دن ہوئے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے ..... میں نے انھیں پہلے دیکھا نہیں۔

کریم : میرا خیال ہے شکیل ہوگا (کھڑکی میں سے دیکھ کر) ہاں وہی ہے ..... دیکھو یہ صاحب میرے بڑے پرانے دوست ہیں ... ... ان کے لیے مزیدار چائے بناؤ ..... ارے ارے رکو ..... کچن کو بھاگ لیے۔ پہلے جا کے بلا تو لاؤ۔

اَبّاجان : شبراتی شکیل کو بلانے گیا تو وہ دہلیز میں پوچھتے ہیں شکیل کی شادی وغیرہ نہیں طے پائی کہیں؟

کریم : نہیں اَبّاجان۔ اسے کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی۔

(اَبّاجان کھانسنے لگتے ہیں .....)

شکیل : (اندر داخل ہوتے ہوئے) سلام علیکم۔ انکل۔

اَبّاجان : وعلیکم السلام۔ آؤ شکیل بیٹے۔ کیسے ہو۔ بڑے دن بعد نظر آئے۔

شکیل : بس انکل ذرا مصروف رہا۔

کریم : تم شبراتی کو نام کیوں نہیں بتاتے تھے۔

شکیل : اپنا گھر بسلتے ہی تم ہمیں اجنبی سمجھنے لگے اور اب ہمارے تعارف کی ضرورت پڑ گئی۔

کریم : شبراتی تو اجنبی ہے نا۔ وہ تو تمہیں نہیں پہچانتا۔

شکیل : بس اب ایسا پہچان گیا ہے کہ پھر نہیں بھولے گا۔ (عائشہ کرسیوں سے سامان اُٹھا اُٹھا کر نیچے رکھ رہی ہے) عائشہ: مجھے تو ایک

ہی کرسی چاہیے۔ ..... بس ..... بس ..... بس (بیٹھ جاتا ہے ..... پھر ادھر ادھر نظر دوڑا کر) تو ابھی تم سیٹنگ (SETTING) سے فارغ نہیں ہوئے؟

شکیل : یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا کافی دن۔

ابّا جان: عائشہ اندر کے کمرے بھی کچھ ٹھیک ہو گئے ہیں۔

کریم : (مذاق سے) ابّا جان عائشہ اندر کہاں تھی۔ یہ تو لان میں نئے پودے لگاتی رہی ہے۔

عائشہ : ابّا جان۔ یہ تو ویسے ہی مبالغہ کرتے رہتے ہیں۔ صرف ایک پودا لگایا تھا۔ PEACHES کا ..... وہ مجھے اچانک کہیں سے مل گیا۔ میں نے سوچا کہ دیر کی تو سوکھ جائے گا۔ اتنے اچھے ہوتے ہیں BLOSSOM اس کے کہ میں اُسے ضائع نہ کرنا چاہتی تھی۔

کریم : اور دن رات گڑھے بھی تو کھدتے رہتے رہے۔

عائشہ : وہ تو میں نے دو چار پودے لگانے کی جگہ تیار کر لی تاکہ اگر کچھ اور اچانک مل جائے۔ تو فوراً لگا سکوں۔

شکیل : اور جو بڑی قینچی لے کر پودوں کی حجامت ہوتی رہی ہے۔

ابّا جان: یہ بہت اچھا کیا بیٹی۔ چلو تمہارا لان دیکھیں پہلے۔ پھر باقی گھر دیکھیں گے۔

(عائشہ خوشی سے اٹھتی ہے اور ابّا جان کے ساتھ باہر نکل جاتی ہے)

کریم : یار شکیل۔ میں بھی تمہیں ملنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ ..... اچھا ہوا تم آ گئے۔

شکیل : کیوں؟ خیریت تو ہے؟

کریم : اس گھر میں ایک دم بہت سے فرنیچر کی ضرورت ہے ..... میں نے لسٹ تیار کر لی ہے۔ اگر تم کسی وقت اپنے دوست کے پاس لے چلو۔ تو وہ کچھ CONCESSION دے دے گا۔

شکیل : کون سا دوست؟

کریم : وہی جس کی فرنیچر کی دکان ہے۔ مال پر۔

شکیل : اسلم؟

کریم : ہاں ہاں وہی۔

شکیل : (سوچنے لگتا ہے) کچھ کریں گے۔ میرے کئی فرنیچر ڈیلر واقف ہیں۔

کریم : ہوں گے۔ مگر اس کی کوالٹی بہت عمدہ ہے اور مجھے اب اس گھر میں کئی پارٹیاں دینا ہوں گی ..... میں چاہتا ہوں کہ ایک دم اے ون (A-ONE) قسم کی ستھری چیزیں۔

شکیل : (خاموش رہتا ہے)

کریم : کیوں؟ چپ کیوں ہو گئے؟

شکیل : بھئی بات یہ ہے کہ میں اسلم کو کہنا نہیں چاہتا۔
کریم : کیوں وہ واقف نہیں ہے تمہارا؟
شکیل : واقف تو ہے۔ ..... مگر ... ایسا جس سے سوال کر دو تو بعد میں کچھ خفت سی ہوتی ہے۔
کریم : کیوں؟
شکیل : پتہ نہیں۔ کام تو وہ میرے کہنے سے شاید کر دے گا ..... ممکن ہے تھوڑی بہت رعایت بھی دے دے۔ مگر اس سے سوال کرو تو اس کا رویہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو خواہ مخواہ اپنی SELF RESPECT ٹوٹتی ہوئی لگتی ہے۔
کریم : (قہقہہ لگاتا ہے) یار یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگر وہ کام کر دے گا۔ تو تم اپنے کام سے غرض رکھو۔ بیچ میں SELF RESPECT کو کیوں لا رہے ہو۔
شکیل : یہ تو ہر شخص کے ساتھ لگی ہے۔ نہ بھی لائیں تو وہ خود سر اٹھا لیتی ہے۔
کریم : اوں ہوں۔ ایک عملی آدمی بننے کے لئے غیر ضروری COMPLEXES سے نجات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(شکیل سگریٹ سلگانے لگتا ہے۔ کریم چند لمحے اسے دیکھتا ہے)

ابھی تم موڈ میں نہیں ہو۔ پھر بات کریں گے۔ چلو ہم بھی چل کر لان دیکھیں (اٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر شکیل۔ بیٹھا رہتا ہے۔ اٹھو بھی اب کیا سوچ رہے ہو شکیل سوچ کچھ نہیں رہا سگریٹ دکھاتے ہوئے ذرا یہ ختم ہو لے۔ انکل کے سامنے اچھا نہیں لگتا۔

(باہر کا منظر : لان میں جہاں دو دیواروں کا کونہ بنتا ہے۔ وہاں ایک بانسٹ بھر کا پودا لگا ہے۔ جس کو تازہ پانی دیا گیا ہے۔ عائشہ۔ شکیل۔ کریم اور ابا جان اس کے آس پاس کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ کیمرہ چند لمحے پودے پر فوکس رہتا ہے حاضرین کو باتیں کرتے دکھایا گیا ہے۔ مگر ان کی گفتگو سنائی نہیں دیتی)

دوسرا سین

(کریم کا ڈرائینگ روم اب پوری طرح آراستہ ہے۔ اس میں پارٹی جمی ہے۔ چاروں طرف صوفوں اور کرسیوں پر مہمان بیٹھے ہیں اور آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ گو باتوں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کیمرہ PAN کرکے سارے کمرے کا VIEW دکھاتا ہے اور فوزیہ کے چہرے پر چند لمحے زیادہ رکتا ہے۔ فوزیہ بائیس تئیس برس کی سمارٹ لڑکی ہے۔ شاعی خوب صورت۔ لباس قدرے عریانیت کی طرف مائل ہے۔ مگر زیادہ نہیں۔ کپڑے پہننے میں TASTE بھی ہے۔ وہ ہاتھ میں سگریٹ پکڑے جمشید سے باتیں کرتے ہوئے بے تکلفی سے قہقہہ مارتی ہے۔ گو قہقہے کی آواز نہیں آتی مگر کیمرہ قہقہے کو سمیٹتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اور چند لمحوں بعد پھر فوزیہ پر فوکس ہوتا ہے۔ جواب اپنی دوسری طرف بیٹھے ہوئے مہمان کی بات سنتے سنتے مسکرا رہی ہے

اور پھر سگریٹ کا کش لیتی ہے۔ کیمرہ PAN کرتے کرتے دروازے پر آتا ہے۔ جس میں سے کریم نمودار ہوتا ہے)

کریم: آیئے۔ خواتین و حضرات۔ کھانا تیار ہے۔

(کیمرہ پھر کمرے میں گھومتا ہے۔ سب مہمان اُٹھ رہے ہیں۔ لمحہ بھر کو فوزیہ بھی نظر آتی ہے۔ جو اُٹھتے اُٹھتے جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ بجھا رہی ہے۔ اسی طرح مہمانوں میں شکیل کے چہرے پر بھی کیمرہ ذرا دیر کو رکتا ہے۔ وہ دوسرے مہمانوں سے باتیں کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جمشید بھی اسی طرح چند لمحوں کے لئے فوکس میں آتا ہے۔

ڈائننگ روم۔ دس بارہ COUPLES مہمان ہیں۔ سبھی عمروں کے لوگ ہیں۔ جوان لوگ نسبتاً کم۔ بوفے ڈنر۔ اگلے چند مناظر اس کی چھوٹی چھوٹی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔

پہلی جھلک:

لمبی میز کے کنارے کی طرف عائشہ کھڑی ہے اور اندر آنے والے مہمانوں کو ایک ایک کر کے پلیٹیں دے رہی ہے۔ وہ پہلے ایک پلیٹ اٹھاتی ہے پھر ایک نیپکن اٹھا کر پلیٹ میں رکھتی ہے اور اس پر ایک کانٹا رکھ کر مہمان کو دے دیتی ہے۔ جب کیمرہ اس پر فوکس ہوتا ہے۔ تو وہ ایک مرد مہمان کو پلیٹ دیتی ہے اور اس کے بعد فوزیہ آگے آ کر پلیٹ لیتی ہے)

فوزیہ: اتنا TEMPTING کھانا۔ اور صرف ایک پیٹ ..... میں تو بائی گاڈ اتنا کھاؤں گی کہ کئی پلیٹوں کی ضرورت پڑے گی۔

عائشہ: (ہنس کر) جتنی سختی سے تم DIETING کرتی ہو۔ اس حساب سے تو تمہیں پلیٹ کی بجائے صرف پرچ ملنی چاہیے۔

(دونوں ہنستی ہیں)

دوسری جھلک:

(میز پر کھانا پڑا ہے۔ مگر مہمان پلیٹوں میں ڈال کر پیچھے ہٹ گئے ہیں اور اب میز سے ذرا فاصلے پر چھوٹے چھوٹے گروپوں میں ہٹ کر کھانا کھا رہے ہیں۔ عائشہ ادھر ادھر آتی جاتی نظر آتی ہے۔ اور مہمانوں کو چیزیں پیش کر رہی ہے۔)

عائشہ: (جمشید کے پاس رک کر) جمشید بھائی آپ کی پلیٹ تو بالکل خالی ہے۔ کچھ بھی نہیں لیا آپ نے۔

جمشید: خالی ہونے کا مطلب ہے۔ کھا رہا ہوں میں۔

عائشہ: کچھ ڈالیں گے تو کھائیں گے نا۔ ..... اور لیجئے آپ۔

جمشید: SURE, SURE عائشہ۔ بہت لذیذ کھانا ہے۔ (میز کی طرف جاتا ہے)

تیسری جھلک:

(دو مرد مہمان اور فوزیہ کھڑے کھا رہے ہیں۔ کریم بھی آ کر شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے۔)

کریم : بھئی باتیں ہی کرتے رہو گے یا کچھ کھاؤ گے بھی ..... فوزیہ جی آپ تو صرف حاضری لگوانے کو پلیٹ اٹھائے کھڑی ہیں - ایسی بھی کیا ڈائٹنگ DIETING ؟

فوزیہ : نہیں کریم - تھینک یو - آئی ایم آل رائیٹ (I AM ALLRIGHT)

کریم : (مذاق سے دوسرے مہمانوں کی طرف دیکھ کر) یہ خواتین کھانے کے بغیر زندہ کیسے رہتی ہیں -

فوزیہ : کریم بھائی - یہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کبھی -

کریم : کیوں جی - ایسا بھی کیا معمہ ہے -

فوزیہ : معمہ تو ہے ..... اچھا ایک ہنٹ (HINT) دیتی ہوں - .... خواتین خوراک نہیں مانگتیں - اٹینشن (ATTENTION) مانگتی ہیں .... بس آپ نے ایک دفعہ پوچھ لیا - اسی میں ہم سیر ہو گئے -

کریم : لیکن محترمہ - جہاں کھانا اور ATTENTION دونوں مل جائیں - بیک وقت - وہاں تو کھائیے نا -

فوزیہ : (نیم قہقہہ لگا کر) خاک ATTENTION ہے - یہاں کھڑے ہو کر کھانے پر لیکچر دے رہے ہیں اور یہ نہیں کہ کچھ لا کر پیش ہی کر دیں -

کریم : اوہ آئی ایم سوری .... میرا نہیں خیال تھا کہ میز اتنی دور ہے - (فوراً مڑ کر ایک ڈش اٹھاتا ہے اور لا کر پیش کرتا ہے)

مائی پلیژر (MY PLEASURE) فوزیہ -

(فوزیہ تھوڑا سا اپنی پلیٹ میں لے کر ناز سے تھینک یو کہتی ہے کریم ڈش رکھ کر واپس مڑتا ہے -

تو دونوں مہمانوں میں سے ایک کہتا ہے)

پہلا مہمان : بڑی STYLISH پارٹی دی ہے کریم -

کریم : (نیم فرشی سا سلام کر کے) تھینک یو پارٹنر (PARTNER)

دوسرا مہمان : سٹائیل پر تو کریم مرتا ہے نا -

کریم : یار ایک ہی زندگی ہے - اس میں بھی تھوڑا سا سٹائیل نہ ڈالا - تو خاک جیئے ہم -

پہلا مہمان : تمہاری گاڑی کا کیا بنا -

کریم : چل رہی ہے پارٹنر -

پہلا مہمان : مگر تم تو اسے بدل رہے تھے -

کریم : گاڑی بدلنے کی بجائے ارادہ بدل دیا ہے ..... اب سوچا ہے دو سال صبر کریں - پھر ایک دم مرسیڈیز (MERCEDES) ہی لیں گے ..... جو مزہ اس میں ہے - وہ کسی اور گاڑی میں نہیں ہے -

دوسرا مہمان : تو گویا گاڑی کے میک MAKE کے ساتھ خریدنے کا ٹائم ٹیبل بھی طے کر لیا ہے -

کریم : ٹائم ٹیبل تو پارٹنر اپنی ساری زندگی کا طے ہے۔ ..... اگر آدمی کو گڈ لائف GOOD LIFE کی خواہش ہو۔ تو شروع سے ہی ہر لمحہ پلان کرنا پڑتا ہے۔

فوزیہ : (شرارت سے) تو اس ٹائم ٹیبل کے مطابق مریڈیز سے اگلا STEP کون سا ہے

کریم : پانچ سال بعد فرسٹ کلاس ولا FIRST CLASS VILLA ایسا آرٹسٹک ARTISTIC ہاؤس HOUSE کہ بس دیکھنے کا بھی لطف آئے اور رہنے کا بھی۔

فوزیہ : (پھر شرارت سے) بھائی اگر کسی خزانہ کا پتہ چل گیا ہو تو ہمیں بھی بتائیے۔

کریم : فوزیہ جی۔ خزانے باہر نہیں ملا کرتے ..... خزانہ یہاں ہے (سر پر انگلی رکھ کر گھماتا ہے اور کنپٹی کو ٹھونک کر بجاتا ہے) آدمی اگر اپنی عقل استعمال کرے تو سارے خزانے آپ کے ہیں۔

پہلا مہمان : اور اگر کسی میں عقل نہ ہو۔ تو

کریم : عقل سب میں ہوتی ہے پارٹنر ..... مگر لوگ اس کا استعمال نہیں کرتے۔ مختلف رویوں کی وجہ سے ..... ہمارے اپنے غلط رویے ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

(جمشید اور ایک اور مہمان پلیٹیں اٹھائے آکر شامل ہو جاتے ہیں)

جمشید : فوزی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ صرف ایک ہی گروپ آپ کی ذات سے مستفید ہوتا رہے۔ اس لیے میں نے حملہ کر دیا ہے۔

(فوزیہ کھل سی جاتی ہے اور ہنسنے لگتی ہے۔ عائشہ دونوں ہاتھوں میں ڈش اٹھائے کیمرے کے سامنے سے گزرتی ہے۔ اور باری باری مہمانوں کو پیش کرتی جاتی ہے۔

چوتھی جھلک :

(شکیل اور ایک دو اور مہمان کمرے کے ایک کونے میں کھڑے کھا رہے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔

——— کیمرہ دور سے ان کو فوکس میں لیتا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ زوم ZOOM کرتا ہے۔

اسی دوران دوسرا مہمان میز کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور کریم کو اکیلے ہوئے چند ہی لمحے گزرے ہیں کہ فوزیہ آکر اس سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ کیمرہ قریب ہو جاتا ہے)

فوزیہ : شکیل بھائی۔ چاروں طرف اتنی رونق ہے اور آپ ایک گوشے میں کھڑے گھسے گھڑے ہیں۔

شکیل : کھانا ENJOY کر رہا ہوں۔

فوزیہ : ENJOY تو COMPANY میں کیا جاتا ہے۔ اکیلے میں تو بور ہوا جاتا ہے۔

شکیل : تو چلئے بور ہو رہا ہوں۔

فوزیہ : جان بوجھ کر؟

شکیل : جی ہاں۔ جان بوجھ کے۔

فوزیہ : کیوں؟ ..... کوئی اور شغل راس نہیں آتا آپ کو؟

شکیل : بور ہونا میرے لئے شغل نہیں ..... میری عادت ہے۔

فوزیہ : عادت ہے؟؟؟

شکیل : جی۔

فوزیہ : چچ چچ ۔ تو بُری عادتیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے ۔

شکیل : کیسے چھوڑوں؟

فوزیہ : اچھے لوگوں کی صحبت میں رہ کے ۔

شکیل : اچھے لوگ کہاں سے ڈھونڈوں ۔

فوزیہ : آپ نہ ڈھونڈیں ۔ وہ خود آپ کے پاس آ جائیں گے ۔

شکیل : وہ کیسے؟

فوزیہ : (اپنی طرف اشارہ کرکے) جیسے اب آئے ہیں ۔

(قہقہہ لگا کر ہنستی ہے ۔ شکیل بھی ہنسنے لگتا ہے)

فوزیہ : مذاق چھوڑیئے شکیل بھائی ۔ میں آج آپ کے دفتر بھی گئی تھی اور آپ غائب تھے ۔ نہ معلوم اس وقت کس گوشے میں چلے گئے تھے ۔ بور ہونے کے لئے ۔

شکیل : میرے دفتر آئی تھیں؟ . . . . آپ؟

فوزیہ : جی ! بالکل . . . . میں . . . . بہ نفس نفیس . . . . اور آپ کے دفتر ۔

شکیل : خیریت تو تھی ۔

فوزیہ : یعنی آپ کا مطلب ہے ۔ جو آپ کے دفتر جاتا ہے ۔ اس کے ہاں خیریت نہیں ہوتی ۔

شکیل : نہیں . . . . میرا مطلب ہے . . . . کہ دفتر ذرا کاروباری جگہ ہے نا ۔

فوزیہ : اور ہم بھی تو آپ سے کاروباری رشتہ قائم کرنے گئے تھے ۔ (شکیل حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے) بالکل . . . . . ایک دم کاروباری رشتہ ۔

شکیل : وہ کیسے؟

فوزیہ : وہ ایسے کہ ہم نے بھی کاروبار شروع کیا ہے ۔

شکیل : (بے یقینی سے) کون سا کاروبار؟

فوزیہ : اوں ہوں . . . . ابھی نہیں ۔ یہ دفتر میں ہی آ کر بتائیں گے . . . . کاروباری باتیں کاروباری جگہ ۔

شکیل : تو کب آ رہی ہیں دفتر؟

فوزیہ : (مذاق سے) تاریخ کا انتظار فرمایئے ۔ (ہنسنے لگتی ہے)

شکیل : (مذاق سے) مگر آپ کی عمر میں تو شادی کا کاروبار چلتا ہے . .

فوزیہ : وہ بھی مناسب وقت پر کر لیں گے . . . . مگر صرف . . . . SIDE BUSINESS کے طور پر (ہنسنے لگتی ہے)

شکیل : تو مین بزنس (MAIN BUSINESS) کون سا ڈھونڈا ہے ؟
فوزیہ: آپ اگلے ٹیوز ڈے کو دفتر میں رہیئے گا۔ وہیں آکر بتاؤں گی..... چلئے سب لوگ ڈرائینگ روم کی طرف جا رہے ہیں۔
(دونوں پلیٹیں رکھ کر چل پڑتے ہیں)

پانچویں جھلک :

(سب لوگ ڈرائینگ روم میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں کیمرہ آن ہوتا ہے۔
تو فوزیہ گانا سنا رہی ہے ؎

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے

جمشید اور دو ایک اور مہمان تالی سے تال دے رہے ہیں۔ باقی سن رہے ہیں۔
..... گانا ختم ہوتا ہے تو سب لوگ تالیاں بجاتے ہیں اور شاٹ ختم ہوتا ہے)

سین نمبر ۳

(ڈائینگ ٹیبل پر کھانے کے برتن دھلنے کے بعد اکٹھے پڑے ہیں۔ اور عائشہ چھری کانٹے بڑے ڈبے میں سجا رہی ہے۔ کریم داخل ہوتا ہے اور پاس کھڑا ہو جاتا ہے ؎

کریم : پارٹی کے بعد بھی بہت کام ہوتا ہے)
عائشہ : ہوتا بھی ہے اور بور بھی ہوتا ہے۔ پارٹی سے پہلے والی EXCITEMENT تو نہیں ہوتی نا۔
کریم : ویسے پارٹی بہت اچھی رہی۔
عائشہ : ہاں فرسٹ کلاس۔
کریم : تھری چیئرز فار عائشہ۔
(عائشہ ہنستے ہوئے کافی کی پیالی کو گتے کے ڈبے میں ڈالنے لگتی ہے)
اوں ہوں۔ عائشہ! اتنی پکی پیکنگ کیوں کر رہی ہو۔
عائشہ : تو اندر نہ رکھوں۔ الماری میں کھلی رکھنے سے تو ٹوٹنے کا خطرہ رہتا ہے کبھی شبراتی سے ہی ایک آدھ پیالی ٹوٹ سکتی ہے۔
کریم : تو اگلی پارٹی پر پھر نکالنا پڑے گی۔
عائشہ : نکال لیں گے.... اگلی پارٹی کون سی کل ہو رہی ہے۔
کریم : نہیں عائشہ اس خیال میں نہ رہنا۔ پارٹیاں تو ہمیں اکثر دینا پڑیں گی۔
عائشہ : ہائے توبہ..... روز روز تو نہیں۔

کریم : بالکل - تقریباً روز روز -

عائشہ : مگر کیوں ؟

کریم : یہ میرے کیریئر CARREER کے لیے ضروری ہیں -

عائشہ : ہائے اللہ - مجھے اتنا شور شرابا روز روز اچھا نہیں لگتا -

کریم : عائشہ - شور شرابا تو ہمارا LIFE STYLE ہوگا -

عائشہ : ہو - مگر گھر تو پُرسکون ہونا چاہیے نا -

کریم : سکون حاصل کرنے کے لیے ہی تو ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں نا - اب کل کی پارٹی پر ہی دیکھو - میں نے بہت سوچ سمجھ کر مہمان بلائے تھے - ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا - جو آج یا کل میرے کاروبار کے لئے مفید نہ ہو - کامیابی کے لئے یہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے -

عائشہ : (وقفے کے بعد) میری تو ابھی تک ٹانگیں دکھ رہی ہیں -

کریم : ہاں ! تم نے کام بھی تو بہت کیا -

عائشہ : اور ساتھ ہر دم یہ ڈر کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے - کوئی کسر نہ رہ جائے -

کریم : اوں ہوں - کوئی کسر نہ رہی ..... ایک دم فرسٹ کلاس .... ہاں ایک بات ہے - (عائشہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہے) وہ یہ کہ تمہیں مہمانوں کو لک آفٹر (LOOK AFTER) ذرا زیادہ کرنا چاہیے -

عائشہ : ہر ایک کو پچاس پچاس دفعہ تو پوچھا اور کیا لک آفٹر کرتی -

کریم : نہیں ، نہیں ، میں EFFORT کی بات نہیں کر رہا - EFFORT تو تم نے بہت کی مگر میں تو (ذرا مسکرا کر) سٹائیل STYLE کی بات کر رہا ہوں -

عائشہ : کیا مطلب ؟

کریم : میرا مطلب ہے کہ جتنے مہمان آئے تھے - ان میں سے ہر ایک کو خیال ہونا چاہیے کہ بس ہمارے دل من وہی بستا ہے -

عائشہ : بھئی میں تو سب کی مدارات کرتی رہی ہوں -

کریم : صرف سب کی نہیں .... یہی تو فرق ہے ... سب کی بھی کرو - اور ہر فرد میرا مطلب ہے ..... ہر INDIVIDUAL کی بھی کرو -

عائشہ : تو گویا آپ کا مطلب ہے کہ میں گھر کی دعوت کو تجارتی اصولوں پر چلاؤں -

کریم : کچھ کچھ سمجھ گئی ہو ..... مگر پریشان نہیں - آہستہ آہستہ سمجھ بھی جاؤ گی اور ..... سیکھ بھی جاؤ گی -

عائشہ : نہ بابا - مجھ میں تو اس سے زیادہ خاطر کرنے کی ہمت نہیں -

کریم : (اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے) گھبراؤ نہیں - TAKE IT EASY سب ٹھیک ہو جائے گا -

سین نمبر ۴

(شکیل کا دفتر۔ اچھی فرم کے آفیسر کے کمرے والی سجاوٹ۔ لمبا سا کمرہ۔ ایک طرف میز اور شکیل کے بیٹھنے کی کرسی۔ میز کے سامنے تین چار کرسیاں۔ میز پر ٹیبل لیمپ، قلمدان، ٹیبل ڈائری، ٹیلی فون وغیرہ رکھے ہیں۔۔۔۔ کمرے کے دوسری طرف ایک صوفہ پڑا ہے۔ ساتھ چھوٹی میز پر ایش ٹرے وغیرہ رکھی ہے۔

شکیل اپنی کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے والی کرسی پر فوزیہ بیٹھی ہے۔ کیمرہ آن ہوتا ہے۔ تو دونوں ایک کاغذ پر جھکے ہوئے بات کر رہے ہیں۔ اور فوراً ہی بات ختم کر کے اپنی اپنی سیٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھ رہے ہوں۔)

فوزیہ: شکیل بھائی! بہت بہت شکریہ۔ آپ نے جو کچھ سمجھایا۔ اس سے میرے بہت سے IDEAS کلیئر CLEAR ہو گئے ہیں۔ ورنہ تو میں عجیب CONFUSION میں تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ آگے کیا کروں۔

شکیل: مگر آپ نے کام تو خود بھی کافی کر لیا تھا۔

فوزیہ: شروع تو کیا تھا۔ مگر میں SURE نہ تھی کہ اگلا STEP کیا ہو۔

شکیل: ڈونٹ وری DO NOT WORRY۔ میرا خیال ہے آپ کی پلاننگ PLANNING درست ہے۔

فوزیہ: تھینک یو۔۔۔۔۔ مگر آج کی میٹنگ کے بعد مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ سے وقتاً فوقتاً۔ گائیڈنس GUIDANCE لینا پڑے گی (معنی خیز انداز میں اسے دیکھنے لگتی ہے۔ مگر شکیل اس نظر سے بچنے کے لیے سگریٹ سلگانے لگتا ہے) شکیل صاحب۔۔۔ پلیز میرے لیے کبھی کبھار تھوڑا تھوڑا وقت نکال دیا کریں نا۔ (اسے ایک ٹک دیکھنے لگ جاتی ہے)

شکیل: (جان چھڑانے کے انداز میں) SURE، SURE جب کبھی آپ چاہیں۔

فوزیہ: (اٹھتے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگتی ہے) اوتھینک یو ویری مچ۔ تھینک یو۔ (پھر چلتے چلتے) میں زیادہ فارمل FORMAL نہیں بننا چاہتی۔۔۔۔۔ کبھی آپ بھی فارغ ہوں تو فون کر لیا کریں I WILL ALWAYS HAVE SOMETHING TO DISCUSS WITH YOU نیا بزنس جو ہوا۔

(باہر نکلنے لگتی ہے تو کریم داخل ہوتا ہے)

کریم: ارے رے رے۔ فوزیہ جی۔

فوزیہ: (خوش دلی سے) ہیلو کریم۔

کریم: کمال ہے۔ ہمارے دفتر میں آئی ہیں۔ ہمارے ساتھ والے کمرے میں بیٹھی ہیں اور ہمیں خبر ہی نہیں دی۔ ایسی بھی کیا بے مروتی۔

فوزیہ: کریم بھائی پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکی ہوں۔ وعدہ رہا NEXT TIME ضرور ملوں گی۔ آپ سے بھی۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔

(باہر نکل جاتی ہے)

کریم : (شرارت سے سوچنے کے انداز میں الفاظ چبا چبا کر بولتا ہے۔) آپ سے بھی ..... گویا ملاقات آپ سے ہے۔ مگر ہم سے بھی مل لیا جائے گا۔ ..... منہ کا ذائقہ بدلنے کو ..... ذرا دلاسہ دینے کو ..... ہوں اوں اوں .... (شکیل کے قریب جا کر) اور جناب یہ NEXT TIME کا چکر کیا ہے؟؟

شکیل : بیٹھو۔

کریم : بیٹھو ..... یعنی جو موضوع ہم نے چھیڑا ہے۔ اس کی رسید ہی نہیں۔

شکیل : فضول بات کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔

کریم : شکیل سنو۔ فوزیہ تمہارے بارے میں انتہائی SERIOUS ہے۔

شکیل : (سگریٹ کا کش لے کر) ہوگی۔

کریم : ہوگی کا بچہ ..... پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتا ..... ہوگی نہیں ہے

شکیل : کیوں؟ تمہیں کہا ہے اس نے؟

کریم : دیکھو میاں۔ ہمارا اصول ہے۔ کان کھلے اور آنکھیں تیز۔ چیزیں خود بخود نظر آجاتی ہیں۔ کسی کے بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔

شکیل : تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔

کریم : میں پوچھ نہیں رہا۔ صرف تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ وہ کیوں آئی تھی۔

شکیل : تم تو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہو۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ خود اعتماد ہے۔ ENTERPRISING ہے ..... اب اپنا کاروبار شروع کر رہی ہے۔

کریم : دل کا کاروبار؟

شکیل : یہ تو مجھے پتہ نہیں۔ وہ کرنا ہوتا تو میرے پاس نہ آتی۔ تمہارے پاس جاتی۔

کریم : میاں! اسی کا تو رونا ہے کہ غلط دکان پہ جا رہی ہے۔ تمہیں تو سالے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔ ساری عمر کنوارے رہ جاؤ گے۔

شکیل : یہ تو نہ کہو۔ یوں کہو کہ ابھی تک پسند نہیں آئی۔ جس دن کوئی پسند آگئی۔ تمہیں بتائے بغیر شام سے پہلے شادی کر لوں گا۔

کریم : تو کر لو فوزیہ سے ..... وہ بھی مری جا رہی ہے تم پر۔

شکیل : (سگریٹ کا کش لے کر) فوزیہ از گڈ کمپنی (FAUZIA IS GOOD COMPANY) لیکن میرے ذہن میں بیوی کی REQUIREMENTS بڑی مختلف ہیں۔

کریم : یعنی ..... بیوی کے ..... چار کان .... دو سر اور کئی ٹانگیں ہوں؟

شکیل : اوں ہوں یعنی وہ بیوی ہو ..... صرف بیوی۔

کریم : یار یہ "صرف بیوی" کیا ہوتی ہے ہم نے یہ محاورہ تو سنا ہے کہ "نرا الو" اور "خالص گدھا"۔ مگر یہ "صرف بیوی" آج ہی سنا۔

شکیل : بات تو سیدھی سی ہے۔ نہ معلوم تم کیوں نہیں سمجھے۔ حالانکہ تمہارے کان کھلے اور آنکھیں تیز ہیں۔


JAVED IQBAL

کریم : میاں اگر تمہاری اور میری سمجھ ایک جیسی ہوتی ۔ تو جھگڑا ہی کاہے کا تھا۔

شکیل : یہ ہوئی نا سچی بات ۔ تو کانوں اور آنکھوں کے پھٹے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا برخوردار ۔ اگر کھوپڑی میں سمجھ نہ ہو۔ ..... بات یہ ہے کہ میں اچھی بھلی پُرسکون زندگی گزار رہا ہوں ۔ اگر تو شادی سے یہ سکون بڑھ جائے تو بیوی ٹھیک ہے اور اگر یہ سکون گھٹ جائے تو غلط ہے ۔

کریم : ہوں اوں ۔ تو " صرف بیوی " کا مطلب ہوا " سکون "

شکیل : جی ای ای ای ۔ ایک دم سکون ..... یہ جو ہمارا طرزِ زندگی ہے نا ۔ ہر وقت بھاگ دوڑ ۔ کھینچا تانی (TENSION) COMPETITION اس سے تو اب چھٹکارا نہیں ۔ مگر یہ تو ہم کر سکتے ہیں نا کہ گھر کو ایک ایسا گوشہ بنائیں ۔ جہاں چند گھڑیاں سکون کی مل جائیں ۔

کریم : قبلۂ محترم ۔ زندہ رہنا ہے تو زندوں کی طرح رہو ۔ زندگی حرکت سے ہے اور حرکت میں برکت ہے ..... سکون و کون کا چکر چھوڑو ..... اور اگر زیادہ شوق ہے تو یہ زندگی چھوڑو ۔ اور کسی قبرستان کے مجاور بن جاؤ ۔ اللہ قسم ایسا سکون ملے گا کہ اور کوئی تمنا باقی نہ رہے گی ۔

شکیل ۔ (سگریٹ کا کش لے کر لمبا دھواں چھوڑتے ہوئے) قبرستان بھی ٹھیک رہے گا ..... اس گھر کی نسبت جہاں سکون نہیں ایسا گھر تو جہنم ہے جہنم ..... اور قبر جہنم سے بہتر ہے ۔

سین نمبر ۵

(کریم کے گھر کا لان ۔ عائشہ گھر پی ہاتھ میں لئے پھولوں کے پودے کی گوڈی کر رہی ہے ۔ ساتھ ہی آڑو PEACH کا وہ پودا ہے ۔ جو لان کے کونے میں سین نمبر ۱ میں لگایا گیا تھا ۔ کیمرہ پہلے عائشہ پر فوکس ہوتا ہے اور پھر قریب ہوتے ہوتے اس پودے پر فوکس ہوتا ہے ۔ جو اب کوئی دو اڑھائی فٹ اونچا ہے ۔

اتنے میں کریم گھر کے اندر سے نکل کر عائشہ کے پاس آتا ہے اس نے کوٹ پتلون پہنا ہے اور باہر جانے کے لئے تیار ہے ۔ پورچ میں نئی کار MERCEDES کھڑی ہے ۔ کریم اندر سے نکل کر کار تک جاتا ہے ۔ اسے فخر سے دیکھتا ہے ۔ اس کے بونیٹ BONNET پر ایسے پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے ۔ جیسے سوار گھوڑے کو پیار کرتا ہے ۔ ادھر سے عائشہ اس کا انہماک دیکھ کر مسکراتی ہے ۔

پھر وہ آکر عائشہ کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے ۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتی ہے)

عائشہ : نئی کار کی مزاج پرسی ہو رہی تھی ۔

کریم : (فخر سے) IST IT NICE عائشہ۔

عائشہ : ہاں بہت اچھی ہے۔ (وہ گوڈی کو فیے لگتی ہے۔ کریم وہیں کھڑا کار کو دیکھتا رہتا ہے) .... تیار ہو گئے ؟

کریم : ہاں شکر ہے۔ جمشید کے آنے سے پہلے ہی تیار ہو گیا۔ ورنہ وہ شور کرتا۔

عائشہ : کب تک واپس آئیں گے۔

کریم : بس لنچ کی دعوت ہے۔ دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔

عائشہ : چھٹی والے دن لنچ کی دعوت ہمیں نہیں پسند۔ ساری چھٹی تو اسی میں نکل جاتی ہے۔

کریم : تم اسے چھٹی نہ سمجھا کرو۔ ہمارے لئے تو لنچ اور ڈنر بھی کاروبار کا حصہ ہیں۔ CONTACTS CONTACTS ڈارلنگ ان کے بغیر کچھ نہیں چلتا آجکل۔

عائشہ : تو CONTACTS چھٹی کے دن ہی بنتے ہیں۔ آگے پیچھے بھی تو بن سکتے ہیں۔

(کریم جواب دینے کی بجائے آڑو کے پودے کو دیکھنے لگتا ہے)

کریم : یہ اب کافی بڑا ہو گیا ہے۔

عائشہ : ہوں۔ اب دو سال ہونے کو آرہے ہیں۔

کریم : تو یہ BLOSSOM کب تک دے گا؟

عائشہ : میرا خیال ہے اگلے سال کے شروع میں۔ تین سال تو کم و بیش لگتے ہی ہیں۔

(کار داخل ہوتی ہے اور پورچ کے قریب آکر رک جاتی ہے اس میں سے جمشید اترتا ہے اور ان کی طرف آتا ہے۔)

جمشید : ول ڈن۔ تم تو تیار کھڑے ہو۔ گڈ بوائے۔ سلام علیکم عائشہ جی۔

عائشہ : سلام علیکم۔

جمشید : عائشہ آپ تیار نہیں ہوئیں۔

عائشہ : (حیرانی سے) میں؟ مجھے تو نہیں جانا۔ کریم نے تو نہیں بتایا۔

جمشید : کریم تو ہمیشہ سے نالائق ہے۔ چلئے اب تیار ہو جائیں۔

کریم : مگر تم نے مجھے تو نہیں بتایا تھا کہ عائشہ کو بھی لانا ہے۔

جمشید : اوہو۔ نہیں کہا تو اب کہہ رہا ہوں۔ HIS MAJESTY, GOVT. جب چاہے اپنا بیان بدل سکتی ہے۔

کریم : اور بھی لوگ ہوں گے کیا۔

جمشید : پہلے تو نہیں تھے۔ مگر ابھی فوزیہ کا فون آیا تھا۔ تو میں نے اُسے بھی کہہ دیا۔ بس ہم ہی ہوں گے۔ کوئی دعوت تو ہے نہیں۔ فقط چھٹی کاٹنے کا مشغل ہے .... چلئے عائشہ۔ یو نو فوزیہ از ویری گڈ کمپنی YOU KNOW FAUZIA IS VERY GOOD COMPANY

کریم : کیا خیال ہے عائشہ؟

عائشہ : (کھڑپہ دکھاتے ہوئے) میرے تو ہاتھ مٹی مٹی ہو رہے ہیں۔ میں تو نہ جاسکوں گی آپ لوگ جائیں۔

جمشید : تو ہاتھ دھونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

عائشہ : نہیں HONESTLY مشکل ہو جائے گا۔ آپ جانتے ہیں۔ ہم عورتوں کو تیاری میں کافی دیر لگتی ہے۔

کریم : چلو تکلف چھوڑو عائشہ۔ تیار ہو جاؤ جلدی سے۔

عائشہ : نہیں، اللہ قسم۔ میں نہیں جاسکوں گی۔ آپ جائیے۔ بلکہ میں یہ کہوں گی کہ جلدی جائیے اور جلدی آئیے۔

جمشید : اب جس محفل میں فوزیہ ہو۔ وہ جلدی کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ ہی چلی چلیں۔

فوزیہ : نہیں جمشید بھائی۔ میں یہ کام کر رہی ہوں۔ (کیاریوں کی طرف اشارہ کرکے) اور اگر یہ آج نہ ہو سکا۔ تو پھر کئی دن کے لیے رک جائیگا۔

عائشہ : تو یہ کام آپ WEEK DAYS پہ کیوں نہیں کرتیں۔ جب اکیلے میں بور ہو رہی ہوتی ہیں GARDENING کا مزہ تو چھٹی والے ہی دن میں ہے۔ جب ہم دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ میں تو اس دن کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔

کریم : جمشید! یہ پودے اس نے خود لگائے ہیں۔ یہ ان کو نہیں چھوڑے گی۔ چاہے ہمیں چھوڑ دے۔

فوزیہ : کیوں؟ آپ کو بھی تو میں نے خود ہی چنا تھا۔ نا۔

جمشید : ہیر ہیر (تالی بجاتا ہے) تو چلیں پھر اُن کے ساتھ ہی تیار ہو جائیں۔

(آواز ختم ہو جاتی ہے۔ مگر وہ دونوں اصرار کرتے کھڑے نظر آتے ہیں۔ مگر فوزیہ مڑ کر کیاریوں میں گوڈی کرنے لگتی ہے۔ وہ دونوں مڑ کر کار میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں)

سین نمبر ۶

گھر کی چند جھلکیاں

پہلی جھلک : ڈرائینگ روم میں عائشہ قالین کے کنارے پر بیٹھی ہے۔ کپڑے وہی ہیں۔ جو باہر لان میں تھے۔ ساتھ ننگے فرش پر پھولدان رکھا ہے۔ چند تازہ توڑے ہوئے پھول، کچھ ٹہنیاں کچھ کانٹے اور پتے وغیرہ رکھے ہیں۔ وہ مختلف انداز میں پھول پتے اور ٹہنیاں وغیرہ سجا رہی ہے۔ ساتھ ساتھ ناک میں سے کسی گانے کی سُر HUM کر رہی ہے پہلے ایک ترتیب بناتی ہے۔ ذرا فاصلے پر رکھ کر دیکھتی ہے۔ پھر اسے بگاڑ کر دوسری بناتی ہے۔ پھر تیسری۔ بالآخر ایک پر مطمئن ہو کر پھولدان کو شیلف یا میز پر سجا دیتی ہے۔

دوسری جھلک : کھانے کے کمرے میں۔ عائشہ کے کپڑے وہی ہیں۔ جو باہر لان میں تھے۔ وہ ریفریجریٹر کے دونوں دروازے کھول کر سٹول پر بیٹھی ہے۔ ساتھ شیراتی کھڑا ہے۔ عائشہ ریفریجریٹر میں سے چیزیں

نکال نکال کر اسے دے رہی ہے۔ اور وہ کھانے کی میز پر رکھا جاتا ہے۔ خالی کر کے
عائشہ اندر سے کپڑا مار کر صاف کرتی ہے۔)

شبراتی: بیگم صاحبہ۔ میں کر دیتا ہوں۔ آپ کیوں تھکتی ہیں۔

عائشہ: نہیں شبراتی۔ یہ کام تمہارے کرنے کا نہیں۔ . . . . ویسے بھی بعض کام کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔
(پھر صفائی کر کے شبراتی سے کہتی ہے کہ چیزیں اسے دیتا جائے اور خود اندر رکھتی جاتی ہے۔
اسی دوران کہتی ہے۔ گھڑی دیکھ کر)
صاحب ابھی تک نہیں آئے۔ چار بج رہے ہیں۔ . . . . . لنچ پر گئے تھے۔

شبراتی: آتے ہی ہوں گے۔ بی بی!

تیسری جھلک: (بیڈ روم میں عائشہ بستر میں لیٹی میگزین پڑھ رہی ہے۔ ساتھ میز پر پھولوں کا گلدستہ رکھا ہے۔ کمرے میں لگی ہوئی گھڑی پر پانچ بجنے کی ٹن ٹن ہوتی ہے۔ عائشہ ناگواری سے گھڑی کی طرف دیکھ کر اکتاہٹ سے جمائی لیتی ہے۔ پھر رسالہ پڑھنے لگتی ہے۔ اتنے میں دروازہ کھلتا ہے۔ اور کریم اندر داخل ہوتا ہے۔)

کریم: (خوشدلی سے) واہ کیا مزے سے رسالہ پڑھا جا رہا ہے۔

عائشہ: (رکھائی سے) بڑی دیر لگا دی۔

کریم: ہاں بس دیر ہو ہی گئی . . . . . ارے پانچ بج گئے ہیں۔ ہمیں تو باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔

عائشہ: کیا باتیں ہو رہی تھیں۔

کریم: بس . . . . . ادھر ادھر کی . . . . . اناپ شناپ . .

عائشہ: تو اس اناپ شناپ میں ساری چھٹی خراب کر دی۔ ہفتے میں ایک ہی تو دن ہوتا ہے۔ آپ کے گھر رہنے کا۔ اور وہ بھی میں نے اکیلے میں گزار دیا۔

کریم: (قدرے رکھائی سے) میں نے تو بہت کہا تھا کہ تم بھی ساتھ چلو۔ جب جمشید بھی کہہ رہا تھا۔ مگر تم ہی نہیں مانی۔ . . . . . اب کسی کو اکیلے رہنے کا شوق ہو۔ تو کوئی کیا کرے۔

عائشہ: مجھے تو شوق نہیں اکیلا رہنے کا۔ آپ ہی کو شوق ہے باہر گھومنے کا۔

کریم: دیکھو۔ عائشہ۔ میں نے تمہیں کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ اس فرم میں میرے کیریئر کے لئے لازمی ہے کہ میں CONTACTS رکھوں اور جمشید سے رابطہ رکھنا تو از حد ضروری ہے . . . . . اب اس نے مجھے خود کھانے پر بلایا۔ تو میں کیسے انکار کرتا۔

عائشہ: تو میرے ساتھ CONTACT کوئی ضروری نہیں۔

کریم: عائشہ . . . . . عائشہ . . . . کبھی تو سمجھا کرو . . . . . میں تو اس لئے تمہیں ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہا تھا کہ دونوں مقصد پورے

ہو جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ جمشید کو بھی انکار نہ کرنا پڑتا اور تم بھی گھر میں اکیلی بور نہ ہوتیں ۔

عائشہ : مگر میں جا کر بھی تو بور ہوتی ۔

کریم : وہ کیسے ؟

عائشہ : مجھے نہیں پسند آپ کا یہ دوست ۔

کریم : تم دوست دوست نہ کہو ۔ میرا تو یہ بزنس کا ٹیکٹ BUSINESS CONTACT ہے ۔ ایسے لوگ اگر نہ بھی پسند ہوں تو بھی ان سے نبھانا پڑتا ہے ۔

عائشہ : واہ ۔ یہ بھی کوئی مجبوری ہے ۔

کریم : ہاں ! ایسی مجبوریاں ہوتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اب دیکھو نا فوزیہ مجھے بالکل پسند نہیں مگر میں اس سے بھی مجبوری میں ملتا ہوں ۔

عائشہ : (طنز سے) واہ کیا مجبوری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پانچ پانچ گھنٹے گپ لگانے کی مجبوری ہے ۔

کریم : دیکھو ۔ اسے غلط انداز میں نہ دیکھو ۔ یہ محض سوشل مجبوری ہے ۔ ایسی تیسے تکلف قسم کی لڑکی سے ملاقات میں ایک SOCIAL ADVANTAGE ہوتا ہے ۔ میں اسے اپنی پارٹیوں میں بلاتا ہوں ۔ اس کی وجہ سے پارٹی میں رونق رہتی ہے ۔ اس رونق کی وجہ سے لوگ میری پارٹی میں آنا پسند کرتے ہیں اور لوگوں کے آنے سے مجھے فائدہ پہنچتا ہے ۔

عائشہ : پہنچتا ہوگا آپ کو فائدہ ۔ مگر مجھے اعتراض ہے کہ آپ کا کیریئر ہمارے گھر میں گھسا آرہا ہے ۔ اور اس گھر کی فضا خراب کرنے لگا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فوزیہ کو ملنا اگر ملازمت کی مجبوری ہے تو وہ میرے گھر کا سارا وقت کیوں لے جاتی ہے ۔

کریم : پگلی نہ بنو ۔ کیریئر ہے تو گھر بھی ہے ۔ کیریئر خراب ہو جائے تو گھر میں بھی خاک اڑنے لگتی ہے ۔

عائشہ : (غصے سے اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے) دیکھئے جی ۔ میں نے شادی کی ہے گھر بسانے کے لیے ۔ آپ نے ملازمت کی ہے کیریئر بنانے کے لیے ۔ آپ دفتر میں کیریئر بنائیے ۔ میں گھر کو گھر بناؤں گی ۔ لیکن کیریئر اگر ہر وقت گھر میں گھستا رہا تو یا گھر خراب ہو جائے گا ۔ یا کیریئر کو چوٹ لگے گی ۔ آپ ان دونوں کو ملانے کی کوشش نہ کریں ۔

کریم : (غصے سے) یہی تو تمہارا پاگل پن ہے ۔ آج کے زمانے میں کیریئر ایک شامیانے کی طرح ہے ۔ اس کے نیچے کئی بانسوں کے سہارے لگائیں ۔ تب یہ کھڑا ہوتا ہے ۔ ان میں سے سب سے اونچا اور مضبوط ستون گھر ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جتنے اونچے اور جتنے زیادہ بانس اتنا اونچا اور اتنا شاندار شامیانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج کل لوگ آگے بڑھنے کے لئے خود کوشش کرتے ہیں ۔ ان کی بیویاں کوشش کرتی ہیں ان کے سسرال محنت کرتے ہیں ۔ ان کے ماں باپ کوشش کرتے ہیں ۔ ان کے دوست احباب کوشش کرتے ہیں ۔ تب کہیں انسان آگے بڑھ سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ COMPETITION کا دور ہے ۔ COMPETITION کا ۔ اس میں بازی جیتنے کے لیے تاش کا ہر وہ پتہ استعمال کرنا پڑتا ہے ۔ جو قدرت نے پھینٹ کر آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کھیل میں گھر کوئی علیحدہ اکائی یا UNIT نہیں ۔ گھر کوئی مسجد نہیں کہ وہاں صرف نماز پڑھنے کے لیے آیا جائے ۔ اور باقی ہر کام باہر کیا جائے ۔

عائشہ : مسجد نہ ہو کریم ۔ مگر حجرہ تو ہو ۔ ۔ ۔ ۔ PRIVACY تو ہو ۔ آرام اور چین کی جگہ تو ہو ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری بزنس کی دنیا بہت وسیع ہے ۔

مگر میری دنیا تو یہ گھر ہے۔ میں اس چھوٹی سی دنیا کو اپنی جنت بنانا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ اور تمھیں بھی تو اس گوشے کی ضرورت ہے۔

کریم : نہیں! مجھے کوئی ضرورت نہیں گوشوں کی۔۔۔۔ میں بھرپور زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ گوشہ نشین نہیں بننا چاہتا۔۔۔ اگر باقی لوگ زندگی کا پورا مزہ لے رہے ہیں۔ تو میں کیوں اپنے لیے صرف ایک گوشہ سنوارتا رہوں۔

عائشہ: (اسے حیرت سے دیکھتی ہے) پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔

کریم : میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر تم میرے کیریئر میں مدد نہیں کر سکتیں۔ تو کم از کم رکاوٹ تو نہ بنو۔

عائشہ : تو گویا مجھے دھمکایا جا رہا ہے کہ میں آپ کے اور فوزیہ کے درمیان رکاوٹ نہ بنوں (رونے لگتی ہے) یہ آج کی چھٹی کا تحفہ ہے۔

کریم : یہ میں نے کب کہا۔۔۔۔ پگلی ہوئی ہو تم۔۔۔۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر چھٹی کے دن مجھے مصروف رہنا پڑا تو اس پہ واویلا نہ کرو۔

عائشہ : (سسکی لے) فوزیہ بھی اب مصروفیت بن گئی ہے۔

سین نمبر ۷

لان میں آڑو کے پودے پر کیمرہ چند منٹ فوکس رہتا ہے۔ اور مختلف زاویوں سے اس کا حجم اور قد دکھاتا ہے۔ جو اب پانچ فٹ کے قریب ہے۔ پھیلاؤ بھی کافی بڑھ گیا ہے۔ اور اس پہ پھول بھی آئے ہوئے ہیں۔

سین نمبر ۸

(کریم اور عائشہ بیڈ روم میں بیٹھے ہیں۔ شبراتی دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آتا ہے)

شبراتی : جی! وہ آئے ہیں۔

کریم : وہ کون۔

شبراتی : وہ۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔ نام بھول رہا ہے۔۔۔۔۔۔ جی وہ۔۔۔۔ جو شادی نہیں کرتے۔

(دونوں ہنستے ہیں۔ کریم پوچھتا ہے۔ شکیل صاحب)

شبراتی : جی صاب۔ وہی صاب۔

کریم : (ہنستے ہوئے) بٹھاؤ کمرے میں۔ ہم آتے ہیں ابھی۔

(ڈرائینگ روم کا منظر۔ شکیل بیٹھا سگریٹ سلگا رہا ہے۔ کریم داخل ہوتا ہے)

کریم : میاں۔ اب تو شرم کرو کچھ۔ شبراتی بھی تمہیں لاعلاج کنوارا سمجھنے لگا ہے۔

شکیل : کیوں کیا ہوا؟

کریم : شبراتی تمہاری اطلاع دینے آیا تو بولا کہ وہ صاحب آئے ہیں۔ جو شادی نہیں کرتے۔

شکیل : تم نے ڈانٹنا تھا نا اُسے۔
کریم : بھئی یہ ایسا مقام ہے۔ جہاں تمہیں ڈانٹ پڑنی چاہیئے۔ جس کے چرچے ہو رہے ہیں۔ نہ کہ ان لوگوں کو جو چرچے کر رہے ہیں۔
شکیل : بہت خبیث ہے یہ شبراتی۔ بلاؤ اسے ..... شبراتی ..... او شبراتی۔
کریم : (ہنستے ہوئے) کیا کہو گے اسے؟
شکیل : آنے دو ذرا اسے۔

(شبراتی دروازے میں سے نمودار ہوتا ہے)

شکیل : (مصنوعی سنجیدگی سے) شبراتی تم نے کیا کہا تھا صاحب کو کہ ہم شادی نہیں کرتے۔ (شبراتی تھوڑا سہم کر کریم کو دیکھتا ہے۔ اسے ہنستے دیکھ کر ذرا حوصلہ پکڑتا ہے۔ مگر کہتا کچھ نہیں) شبراتی! اگر ہم شادی نہیں کرتے تو تم خوش نہیں ہو اس بات پر۔
شبراتی : نہیں سرکار۔
شکیل : ارے؟؟ تم ہماری خوشی میں خوش نہیں۔
شبراتی : نہیں سرکار
شکیل : کمال ہے کیوں خوش نہیں۔
شبراتی : آپ بھی کہاں خوش ہوں گے۔ یہ تو اُوپر اُوپر سے ہے۔

(کریم ہنسنے لگتا ہے)

کریم : NOW YOU TAKE MORE -
شکیل : شبراتی۔ تمہاری شادی ہوئی ہوئی ہے؟
شبراتی : بہت عرصے سے جناب۔
شکیل : کتنے بچے ہیں۔
شبراتی : اللہ کے فضل سے کافی ہیں جناب۔
شکیل : اور تم خوش ہو؟
شبراتی : خوش تو نہیں جناب! مگر یہ ناخوشی اور قسم کی ہے۔ آپ کی ناخوشی اور قسم کی ہو گی۔
شکیل : تم کیوں ناخوش ہو؟

(شبراتی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر جواب نہیں دیتا)

شکیل : بیوی بچے کہاں ہیں تمہارے؟
شبراتی : آزاد کشمیر میں جی۔
شکیل : بیوی سے لڑائی ہوتی ہے؟

شبراتی : ڈھیروں لڑائی جی ۔ ۔ ۔ ۔ صبح شام ۔

شکیل : تم لڑتے ہو۔ یا وہ لڑتی ہے ؟

شبراتی : لڑتی تو وہ ہے جی ۔ پر کہتی ہے میں لڑتا ہوں ۔

شکیل : بچے کیا کہتے ہیں؟

شبراتی : دل سے تو میرے ساتھ ہیں جی ۔ پر اُس کے ڈر سے بولیں نہیں ۔

شکیل : تم بھی ڈرتے ہو اس سے؟

شبراتی : ڈرتا تو نہیں سرکار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جھگڑا بڑھانے سے چپ رہنا اچھا ۔

شکیل : گھر کے معاملے میں تم اُس کی سنتے ہو یا اپنی کرتے ہو ۔

شبراتی : کرتا تو اپنی ہوں جی ۔ ۔ ۔ ۔ پر اس سے پوچھ کے کرتا ہوں ۔

شکیل : پوچھتے تم اس سے ہو۔ ڈرتے اس سے ہو۔ جھگڑتی وہ ہے تمہارے ساتھ اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ میں بھی شادی کر لوں ۔

شبراتی : شادی تو ہر حال میں کرنی ہوئی جی ۔

شکیل : کیوں کریں۔ اس طرح مزے میں ہیں۔ نہ ڈرنا ۔ نہ پوچھنا۔ نہ لڑنا ۔

شبراتی : (سر ہلاتا ہے) نہیں سرکار۔ لڑنا جھگڑنا تو رہتا ہی ہے۔ (کان کھجا کر) ہمارے گاؤں میں بولتے ہیں جی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو شادی کرے وہ بیوی سے جھگڑے۔ جو شادی نہ کرے وہ دنیا سے جھگڑے ۔

(شکیل اور کریم ہنسنے لگتے ہیں۔ عائشہ اندر داخل ہوتی ہے)

عائشہ : تو ادھر کھڑا ہے۔ میں آوازیں دے دے کر ہلکان ہو رہی ہوں۔ چل چائے بنا جلدی سے۔

(شبراتی کمرے سے نکل جاتا ہے۔)

عائشہ : دیکھئے شکیل بھائی۔ شبراتی کہتا ٹھیک ہے۔ آپ کریم کے کالج کے دوست ہیں ۔ اب کام بھی ایک ہی فرم میں کر رہے ہیں۔ ہم عمر ہیں۔ کریم کی شادی کو اب چار برس ہو چکے ہیں ۔ مگر آپ ہیں کہ ابھی تک باغی ہیں ۔

شکیل : باغی بالکل نہیں ہوں۔ میں نے کب کہا کہ شادی نہیں کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جیسے ہی مرضی کی لڑکی نظر آئے گی۔ شام سے پہلے شادی کر دوں گا۔ کسی کو بھی شادی پہ دعوت دیئے بغیر۔

عائشہ : لیکن مرضی کی لڑکی کا پتہ کیسے چلے گا ۔ لڑکیوں کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا نا کہ وہ کیسی ہیں ۔

شکیل : بالکل نہیں لکھا ہوتا۔ مگر یہ ضرور لکھا ہوتا ہے کہ کیسی نہیں ہیں ۔

کریم : کیا مطلب؟

شکیل : مطلب جب سمجھو گے جب میری آنکھ سے دیکھو گے ۔

کریم : آنکھیں تو میری بھی تمہاری طرح کی ہیں۔ نظر بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ مگر تمہارے والی چیز نظر نہیں آتی۔

شکیل : برخوردار! تم بصارت کی بات کر رہے ہو۔ اور میں بصیرت کی بات کر رہا ہوں ..... بصیرت پیدا ہوتی ہے تمہارے خیالات اور تصورات سے۔ اب میرا جو گھر کا تصور ہے میں اس کے مطابق لڑکی پرکھتا ہوں۔

عائشہ : کیا کوئی آسمانی تصور ہے شکیل بھائی۔

کریم : نہیں زمینی ..... بالکل زمینی ..... اور زمین کے لوگوں کے حالات دیکھ کر بنا ہے (عائشہ منہ بناتی ہے اور کندھے اچکاتی ہے) اب دیکھئے نا۔ بعض گھر صرف میاں بیوی کے اکھاڑے ہوتے ہیں۔ بعض گھر میاں بیوی کے رشتہ داروں کے اکھاڑے۔ بعض گھر بیرونی اثرات کے اکھاڑے ..... بعض گھروں میں خواہشات چھتوں اور منڈیروں سے بھی اونچی ہوتی ہیں ..... میں یہ سب نہیں چاہتا۔ یہ ساری زندگی کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ میں تو بس گھر چاہتا ہوں۔ جو پرندے کے گھونسلے کی طرح آرام دہ ہو۔ پُرسکون ہو۔ ..... آدمی گھر میں داخل ہو تو یوں لگے۔ جیسے کسی نے سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ کو آہستہ سے نیم گرم پانی میں ڈال دیا ..... وہاں ہونٹوں پر مسکراہٹیں ہوں۔ اگر وہ نہیں۔ تو نظروں میں اطمینان ہو ..... مجھے سائز میں حویلی نہیں چاہیے۔ مجھے کمروں میں قیمتی سامان نہیں چاہیے۔ میں اپنے گھر کو زیبائشی شوکیس نہیں بنانا چاہتا۔ مجھے تو صرف فضا میں ٹھہراؤ چاہیے۔ شاعر نے تمہارے لیے ہی کہا تھا " میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں "

عائشہ : مگر شکیل بھائی۔ یہ سب کچھ تو آپ نے بھی مہیا کرنا ہے۔ صرف لڑکی کی ہی تو ذمہ داری نہیں ہے یہ۔

شکیل : بالکل درست کہا آپ نے عائشہ۔ مگر عورت کو خدا نے پیدا ہی تخلیق کے لیے کیا ہے۔ مرد تو تخلیقی عمل میں تھوڑا سا حصہ لیتا ہے۔ ..... بالکل معمولی سا حصہ ..... اور اگر تخلیق کرنے والی بانجھ ہو ..... تو مرد بے بس ہے ..... اسی طرح گھر کا ماحول بھی بنیادی طور پر عورت تخلیق کرتی ہے۔ مرد تو اس میں مدد کرتا ہے ..... اگر عورت میں وہ جوہر نہیں ہوگا تو مرد وہاں بھی بے بس ہو جائے گا ..... اب دیکھ لو شرابی گھر چھوڑ کے میلوں دور یہاں پناہ لیتا ہے۔

(سب ہنستے ہیں۔)

سین نمبر ۸

(کریم کا ڈرائینگ روم۔ جمشید بیٹھا ہے۔ اور بار بار گھڑی دیکھ رہا ہے۔ ساتھ بے صبری سے سگریٹ پی رہا ہے۔ دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر میز پر سے میگزین اٹھا کر سرسری انداز میں پڑھنے لگتا ہے۔ اور بے دلی سے ورق الٹتا جاتا ہے)

(منظر بدلتا ہے ..... کریم کا بیڈروم۔ عائشہ ڈرائینگ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ کریم باہر جانے کے لئے تیار کھڑا ہے اور کمرے میں کھڑا ہے)

عائشہ : آپ جائیے۔ میں نے کب روکا ہے آپ کو۔ مگر میں نہ جاؤں گی۔

کریم : مگر بلا وجہ کیوں اڑ رہی ہو ..... جمشید نے لکچر پر صرف تمہیں اور مجھے INVITE کیا ہے اور کوئی بھی نہیں ہوگا ..... اس

نے باکس بھی ریزرو RESERVE کرا لیا ہے۔

عائشہ : اسی لئے تو میں جا نہیں رہی۔

کریم : کیا مطلب؟

عائشہ : اب آپ کو پچاس مرتبہ تو بتا چکی ہوں کہ جمشید مجھے بالکل پسند نہیں۔ اور میں اس کے ساتھ ہرگز نہیں ملنا چاہتی۔

کریم : عائشہ تم دن بدن ضدی ہوتی جاتی ہو۔۔۔۔۔ اور بلاوجہ ضد۔ تمہیں کئی بار سمجھایا ہے کہ ہمارا ان لوگوں سے ملنا کتنا ضروری ہے۔ ۔۔۔۔۔ اس کے بغیر گزارہ نہیں۔۔۔۔ مگر تمہاری سمجھ میں بات ہی نہیں آتی۔

عائشہ : آتی ہے۔۔۔۔ بالکل آتی ہے۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ اور باتیں بھی سمجھ میں آتی ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں پڑتیں۔

کریم : مثلاً۔

عائشہ : مثلاً یہ کہ جمشید اوباش قسم کا انسان ہے۔ اور میں اس کے قریب نہیں جانا چاہتی۔

کریم : (چند لمحے اسے غصے سے گھورتا ہے) تو گویا تمہارا فیصلہ ہے کہ تم نہیں جاؤ گی۔

عائشہ : آپ جائیے۔ میں نہیں جاؤں گی۔

کریم : مجھے جانے کیلئے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ باقی بات واپسی پر کروں گا۔ (کمرے سے نکل جاتا ہے)

(منظر بدل کر پھر کریم کے ڈرائینگ روم میں آتا ہے جمشید بے دلی سے میگزین کے ورق الٹ رہا ہے۔ کریم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے)

کریم : چلو یار چلیں۔

جمشید : اور عائشہ؟

کریم : وہ نہیں آ رہی۔

جمشید : (چونک کر) کیوں؟

کریم : بس اس کی طبیعت خراب ہے۔

جمشید : تو بھلے آدمی مجھے اس وقت بتا دیتے جب میں نے تمہیں فون کیا تھا

کریم : دراصل میں نے اس سے پوچھے بغیر ہاں کہہ دیا تھا۔ مجھے اس وقت اندازہ نہ تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔

جمشید : تو ظاہر ہے اتنی خراب نہ ہوگی کہ تم خود دیکھ سکتے۔ چھوٹی موٹی خرابی ہوگی وہ پکچر سے دور ہو جائے گی۔

کریم : ہاں میں نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ پکچر سے زیادہ خراب ہو جائے گی۔

جمشید : مگر پکچر میں کرنا کیا ہے۔ آرام سے بیٹھے ہی تو رہنا ہے۔

کریم : نہیں اس کے سر میں بھی درد ہے۔ شور سے اور بگڑ جائے گی۔

جمشید : کمال ہے (سگریٹ سلگانے لگتا ہے) یہ تو سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔

کریم : تو چلو نا پھر دیر ہو رہی ہے۔
جمشید : (صوفے کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھو۔
(کریم حیران ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ جمشید سگریٹ پیتا رہتا ہے پھر کہتا ہے)
جمشید : میرا خیال ہے پروگرام کینسل کرتے ہیں۔
کریم : کیوں؟ تم تو کہتے تھے کہ ریزرویشن کروائی ہوئی ہے۔
جمشید : ہاں وہ تو ہے ..... مگر یہ مناسب نہیں کہ عائشہ کی طبیعت خراب ہو۔ اور تم اسے چھوڑ کر جاؤ۔
کریم : نہیں اتنی کوئی بات نہیں۔
جمشید : نہیں میاں مانو میری بات۔
کریم : مگر ریزرویشن .....
جمشید : فکر نہ کرو۔ میں ابھی فون کر کے کینسل کروا دیتا ہوں۔ (اُٹھتے ہوئے) تم جاؤ بیگم کے پاس۔ میں چلتا ہوں۔
(نکل جاتا ہے۔ کریم صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ لگاتا ہے۔ سوچتے ہوئے دو چار لمبے لمبے کش لیتا ہے۔ پھر سگریٹ ختم کئے بغیر اُسے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیتا ہے۔ اور اُٹھ کر بیڈ روم کی طرف چل دیتا ہے۔ کیمرہ اسے سارا راستہ COVER کرتا جاتا ہے۔ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ تو عائشہ کرسی میں بیٹھی سلائیوں سے بن رہی ہے، کریم داخل ہو کر کوٹ اتارنے لگتا ہے۔ پھر ٹائی کی گرہ کھولتا ہے۔ عائشہ کنکھیوں سے ایک دو دفعہ دیکھتی ہے۔ پھر پوچھتی ہے۔)
عائشہ : آپ گئے نہیں۔
کریم : جاتا کیسے۔ تم نے جو حسبِ معمول پروگرام خراب کر دیا۔
عائشہ : معمول تو نہیں میرا۔ البتہ جمشید کے ساتھ میں کبھی نہیں جاتی۔
کریم : (غصے سے) اس لئے کہ وہ ہم سے مروت سے پیش آتا ہے۔ وہ ہمارا خیال کرتا ہے۔ وہ OUT OF THE WAY جا کر بھی ہمیں فائدہ پہنچاتا ہے۔
عائشہ : شاید اسی لئے .... مگر کبھی آپ نے سوچا نہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔
کریم : ظاہر ہے ان تعلقات کے لیے جو ہمارے درمیان ہیں ..... اور تمہاری ہٹ دھرمی انہی تعلقات کو نقصان پہنچا رہی ہے۔
(عائشہ جواب دیئے بغیر پھر نٹنگ KNITTING کرنے لگتی ہے)
کریم : (کمرے میں ایک دو چکر لگا کر) آج پھر تم نے مجھے جمشید سے شرمندہ کرایا۔ اگر ہر دفعہ ایسا ہوتا رہا۔ تو وہ کیا پردا کرے گا ہماری۔
عائشہ : تو نہ کرے پردا ہماری۔ ہمیں کیا پڑی ہے کسی کی خوشامد کرتے رہیں۔

کریم : عائشہ! تمہارے اسی رویے کی وجہ سے میری ساری پلاننگ ناکام ہوتی جا رہی ہے۔ اب پانچ سال ہو رہے ہیں ہماری شادی کو اور میرا خیال تھا کہ میں ان پانچ برسوں میں کہیں سے کہیں جا پہنچوں گا..... مگر میرے سارے خواب ادھورے رہتے جا رہے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں جو محنت میں نے جمشید پر کی تھی۔ اب اس کے پھل لانے کا وقت آیا۔ تو تم جمشید سے میرے تعلقات خراب کرنا چاہتی ہو۔

عائشہ : جمشید اس دنیا کا خدا تو نہیں آخر کہ اس کی رضا کے بغیر کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔

کریم : وہ دنیا کا خدا نہ سہی۔ مگر میرے لیے بہت اہم ہے۔ آجکل اس کی ایک سفارش میرے لیے کئی نئے راستے کھول سکتی ہے اور میں اس قابل ہو جاتا ہوں کہ اپنے خواب پورے کر سکوں..... اگر آج تم یہ پروگرام خراب نہ کرتیں تو شاید میں کل ہی اگلا قدم اٹھا سکتا۔ مگر آج تم نے اسے اتنا ناراض کر دیا ہے کہ مجھے کئی ہفتے اس کے مناسب موڈ کا انتظار کرنا پڑے گا۔

عائشہ : خدا کوئی اور راہ بنا دے گا۔

کریم : (غصے سے چیخ کر) خدا ان کے لیے کوئی راہ نہیں بنایا کرتا جو اپنی راہیں خود بگاڑ لیں۔

عائشہ : (بگڑ کر) میں نے کون سی راہ بگاڑی ہے؟؟

کریم : بگاڑی نہیں..... اور کیسے بگاڑتے ہیں..... میں جس شخص کو اتنے عرصہ سے HUMOUR کر رہا ہوں۔ تم اس سے دانستہ رکھائی برت کر میری ساری محنت کو ڈبو رہی ہو۔

عائشہ : تو کیا کروں..... اسے سر پہ بٹھا لوں؟

کریم : سر پہ نہ بٹھاؤ۔ تو کم از کم اتنی توجہ تو دو۔ جتنی حالات کا تقاضا ہے۔ اسے یہ احساس تو دلاؤ کہ ہم لوگ اس کے قریب ہیں..... تاکہ وہ بھی ہمیں قریب سمجھے اور ہمارے مفاد کو دوسروں پر ترجیح دے۔

(کمرے میں غصے سے ٹہلنے لگتا ہے۔ عائشہ اون کا گولہ ادھر سے اُدھر پٹخ کر پھر سلائیاں تیزی سے چلانے لگتی ہے)

کریم : (رک کر) دیکھو! میں تمہیں وارن WARN کر رہا ہوں کہ DONOT PUSH ME AGAINST THE WALL..... مجھے اتنا مجبور نہ کرو کہ مجھے سوچنا پڑے کہ میں اپنے مفاد اور تم میں سے کس کو ترجیح دوں۔

عائشہ : (غصے سے اسے دیکھتی ہے۔ پھر سلائیاں پٹخ کر کھڑی ہو جاتی ہے) کریم آپ کو احساس ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

کریم : (رک کر اس کی طرف سیدھی نظروں سے دیکھتے ہوئے) مجھے اپنے الفاظ کا پورا پورا احساس ہے..... اور شاید مجھے ان پر عمل بھی کرنا پڑے۔

عائشہ : آپ..... آپ مجھے بے عزت کر رہے ہیں۔ اس آدمی کی خاطر جو اس قابل نہیں کہ اُسے منہ لگایا جائے۔

کریم : کیا خرابی ہے اس میں؟

عائشہ : آپ کو خوب پتہ ہے کہ وہ بدکردار آدمی ہے..... میں اس کی نظر پہچانتی ہوں۔ اسی لئے اسے اپنے قریب نہیں آنے دیتی۔

کریم : مجھے اس کے کردار سے کوئی غرض نہیں ..... میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ میرے لیے بہت اہم ہے ..... انتہائی اہم ..... اور مجھے اس کو استعمال کرنا ہے۔ اسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر۔

عائشہ: (اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ کو اس کے کردار سے کوئی غرض نہیں تو میرے کردار سے تو ہے نا .....

کریم : (غصے سے رک کر الفاظ چباتے ہوئے) میں کوئی آسمان کا دارو غہ نہیں۔ جس نے فیصلہ کرنا ہے کہ تمہیں دوزخ میں بھیجوں یا جنت میں ..... میں اس دنیا کا انسان ہوں ..... آج کے معاشرے کا فرد ہوں ..... اور یہ میرا حق ہے کہ یہاں کامیاب زندگی بسر کروں ..... اور میں دیکھوں گا کہ جب تک تم میری بیوی ہو ..... تم میرا ساتھ دو گی ..... اور میری راہ میں رکاوٹ نہیں بنو گی۔ (چل کر دروازے کے پاس جاتا ہے۔ آہستہ سے کھولتا ہے اور باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر کہتا ہے) اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے ..... یا تو میرے خواب ٹوٹیں گے یا تمہاری ضد ٹوٹے گی۔

(دھڑاک سے دروازہ بند کر کے نکل جاتا ہے۔ عائشہ حیران ہو کر پھٹی پھٹی نظروں سے دروازے کو دیکھتی رہتی ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانک لیتی ہے۔ اس کے کندھے ہلکی سسکیوں سے ہلنے لگتے ہیں۔ پھر وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل قالین پر جھک جاتی ہے چند لمحے بعد قالین پر گر کر بلک بلک کر رونے لگتی ہے)

سین نمبر ۹

(چند جھلکیاں۔ پہلی جھلک لان کی ہے اور بعد کی جھلکیاں کریم اور عائشہ کے جھگڑوں کی ہیں۔ یہ تمام جھلکیاں آہستہ SLOW MOVING ہیں)

پہلی جھلک : مکان کے باہر کا منظر۔ پورچ میں MERCEDES کار کھڑی ہے۔ پھر لان کے کونے میں PEACH کا درخت کھڑا ہے۔ لان میں پودے پر بہار ہیں اور کئی کیاریوں میں پھول کھلے ہیں۔)

دوسری جھلک : کریم اور عائشہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہیں اور ناشتہ کر رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں غصے سے بحث بھی کر رہے ہیں۔ کریم بالآخر چھری اور کانٹا پلیٹ میں پٹخ کر اٹھ جاتا ہے۔ اور عائشہ اکیلی سوچ میں ڈوبی ہوئی ناشتہ کر رہی ہے۔

تیسری جھلک : عائشہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال درست کر رہی ہے۔ اور ساتھ ساتھ رو رہی ہے۔

چوتھی جھلک : وہ دونوں کاریں بیٹھے بحث کر رہے ہیں کار ان کے پورچ میں کھڑی ہے اور بالآخر عائشہ کار کا دروازہ کھول کر غصے سے باہر نکلتی ہے۔ دھڑاک سے بند کر کے گھر میں چلی جاتی ہے۔ کریم چند لمحے سوچتا ہے سگریٹ سلگاتا ہے۔ پھر کار چلا کر گھر سے نکل جاتا ہے)

سین نمبر ۱۰

(شکیل کے دفتر کا کمرہ۔ وہ کسی کاغذ کو غور سے پڑھ رہا ہے۔ دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد کریم داخل ہوتا ہے۔)

کریم : بڑے سکون سے کام کر رہے ہو یار۔

شکیل : آؤ بیٹھو (کریم بیٹھ جاتا ہے) میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے کمرے میں جھانکا تھا۔ تم نہیں تھے۔

کریم : بس ویسے ہی ذرا باہر نکل گیا تھا۔ . . . . . بور ہو رہا تھا۔

شکیل : کیوں آج کام نہیں ہے کیا؟

کریم : کام کب نہیں ہوتا یار۔ . . . مگر جی کام میں نہیں تھا۔

شکیل : کیوں خیریت؟

کریم : بس آج کل لائف عام طور پر بور گزر رہی ہے۔

شکیل : کیوں؟ تمہارے جمشید کی پارٹیاں آجکل ٹھنڈی پڑی ہیں۔

کریم : جمشید سے عرصہ ہوا ملاقات نہیں ہوئی۔

شکیل : یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

کریم : یہ بھی ہو رہا ہے . . . . کچھ تعلقات اس سے ٹھنڈے پڑے ہیں آجکل۔

شکیل : وجہ؟

کریم : وجہ کو چھوڑو۔ تمہیں FACT بتا رہا ہوں۔

شکیل : چلو تو اچھا ہے۔ زیادہ وقت گھر میں بیگم کے ساتھ گزرتا ہوگا۔

کریم : اوں ہوں . . . . وہاں بھی بہت چخ چخ رہتی ہے آجکل۔

شکیل : یہ تو اچھی خبر نہیں سنائی تم نے۔

کریم : خبروں میں اتار چڑھاؤ آتا ہی رہتا ہے . . . . . فکر نہیں کرنا چاہیے اس بات پہ۔

شکیل : آجکل اتار ہوا۔ تو چڑھاؤ کب آئے گا۔

کریم : مشکل ہی لگتا ہے اب چڑھاؤ کا آنا۔

شکیل : ہیں ہیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہو . . . . . اتنی اچھی لڑکی ہے تمہاری بیوی۔

کریم : (سوچتے ہوئے) یار کچھ زیادہ ہی اچھی ہے۔

شکیل : کیا مطلب؟

کریم : میرا مطلب ہے مجھے اتنی اچھی بیوی کی ضرورت نہیں تھی

شکیل : اسے کفرانِ نعمت کہتے ہیں .... ویسے .....

(فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ہیلو ..... جی ..... بیٹھے ہیں ..... کریم تمہارا فون ہے ۔

کریم : ہیلو ..... جی ..... ہوں اوں ..... تو گویا اب کوئی پرابلم نہیں ..... ہوں ..... جی ..... بالکل ٹھیک ہے .. .... ہاں ہاں ..... مجھے منظور ہے ..... جی آپ ان سے کہہ دیجئے ..... بس کاغذات تیار کرلیں ..... جی ..... جی ..... اوکے ..... تو کل ملیں گے پھر ۔

(فون رکھ کر)

چلو یار تم سے جس بات کا مشورہ کرنے آیا تھا ۔ اب اس کا خود ہی فیصلہ ہوگیا ہے اُس فون سے ۔

شکیل : کیا بات تھی ۔

کریم : شکیل میں یہ JOB چھوڑ رہا ہوں ۔

شکیل : (حیرت سے) کیوں ؟ تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا ۔

کریم : بس وہی ذکر کرنے آیا تھا ۔ مگر حالات مجھ سے بھی تیز نکلے ۔

شکیل : کوئی اور JOB ہے کیا ؟

کریم : نہیں ..... جاب JOB نہیں ۔ پارٹنر شپ ہے ..... میں اپنا بزنس شروع کر رہا ہوں ۔

شکیل : کمال ہے ..... یہ ایک دم کیا نئی سوجھی ۔

کریم : ایک دم تو نہیں پارٹنر ۔ میری پلان کے مطابق تو مجھے دو سال پہلے بزنس شروع کر دینا چاہیے تھا ۔ مگر عائشہ کے ساتھ چخ چخ کی وجہ سے بات بگڑتی رہی ..... بہر حال دیر آید درست آید ..... سب ٹھیک ہو جائے گا ..... میں نے اب لائف کی نئے سرے سے نئی پلاننگ کرلی ہے ۔

شکیل : وہ کیا ۔

کریم : بس پتہ چل جائے گا تمہیں ۔

سین نمبر ۱۱

(ابّا جان اپنے گھر میں صحن میں آرام کرسی پر بیٹھے ہیں ۔ چھوٹی میز پر چائے کے برتن پڑے ہیں ۔ وہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں ۔ ساتھ چارپائی پر تکیے سے لگی اماں جان بیٹھی ہیں ..... عائشہ دھیرے سے اندر داخل ہوتی ہے ۔ اور دونوں کو سلام کرتی ہے ۔ وہ انتہائی سنجیدہ اور پریشان سی لگتی ہے)

ابّا جان : وعلیکم السلام ۔ آؤ بیٹی عائشہ ۔

اماں جان: کیا بات ہے بیٹی۔ پریشان سی لگتی ہو..... بیٹھو۔

عائشہ: (سمٹ کر چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور خاموشی سے نیچے دیکھنے لگتی ہے۔ دونوں غور سے اس کی طرف دیکھتے ہیں..... وہ تھوڑا جھجکتی ہے..... کہنے سے پہلے رکتی ہے پھر ضبط کرتے ہوئے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہتی ہے) میں خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔

ابا جان: خدا حافظ؟

عائشہ: میں گھر جا رہی ہوں۔

امی جان: کتنے دنوں کے لئے؟

عائشہ: (نفی میں سر ہلاتی ہے) خدا معلوم..... شاید ہمیشہ کے لیے۔

ابا جان: کیا مطلب... بیٹی؟

عائشہ: (پھر اپنے پر ضبط کی کوشش کرتی ہے) کریم مجھے..... طلاق دے رہے ہیں۔

(دونوں ہڑبڑا کر بیٹھ جاتے ہیں)

ابا جان: کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟

عائشہ: ٹھیک..... (اس کے بعد اس کا گلا رندھ جاتا ہے اور وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ جاتی ہے)

امی جان: مگر یہ کیسے ممکن ہے؟

عائشہ: (جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھ مایوسی سے ہلاتی ہے جیسے کہہ رہی ہو مجھے کیا پتہ)

امی جان: کچھ بولو تو سہی۔

عائشہ: امی کیا بولوں..... میرے پاس کیا ہے بولنے کو۔

ابا جان: آخر بات کیا ہے۔

عائشہ: بس ابا جان..... ہر وقت لڑتے رہتے تھے..... کہ تم میری مرضی کے مطابق نہیں چلتیں..... خود سر ہو..... ضدی ہو..... اب آپ بتائیے کبھی آپ کو مجھ سے یہ شکایت ہوئی ہے۔

(امی اور ابا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

پھر ان کو کچھ عرصہ سے یہ گلہ ہے کہ میں سوشل نہیں ہوں۔..... اور..... اور ان کے کیریئر کو آگے بڑھانے میں مدد نہیں کرتی۔

امی جان: بیٹی تو تم اس کی بات کیوں نہیں مانتی تھی۔

عائشہ: مانتی تھی۔ امی جان..... اس حد تک جہاں تک مانی جا سکتی ہے..... سوشل تو میں خود بھی کافی ہوں۔ مگر..... مگر..... ہم ہم میں آوارہ تو نہیں بن سکتی نا۔

ابا جان: (صدمے اور حیرت کے ساتھ) یہ کیا کہہ رہی ہو تم عائشہ۔

عائشہ: مجھے پتہ تھا ابا جان آپ کو صدمہ ہوگا..... مگر..... یہ بات ہی ایسی ہے۔ کہ..... کوئی یقین ہی نہیں کرتا۔

ابّا جان: (دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر) بیٹی یا تو میں پاگل ہو گیا ہوں ..... یا تم پاگل ہو گئی ہو۔
عائشہ: میں نے بھی اپنے آپ سے بارہا یہی سوال کیا ہے ..... دن کو رو رو کے ..... راتوں کو جاگ جاگ کے ..... سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو جاتا تھا ..... اور میں سمجھتی تھی کہ میں سچ مچ پاگل ہو گئی ہوں ..... مگر جب حقیقت ننگی ہو کر سامنے آئی۔ تو پتہ چلا کہ میں پاگل نہ تھی ..... تب میں نے فیصلہ کیا کہ کل کو آوارہ مشہور ہو کر طلاق لینے سے بہتر ہے کہ آج اپنے اچھے نام سمیت طلاق لے لوں۔ (سسکیاں بھر بھر کر رونے لگتی ہے)

(ابّا جان سکتے کے عالم میں کئی لمحے گم سم بیٹھے رہتے ہیں۔ اماں سر جھکائے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتی ہیں ..... بالآخر ابّا جان سر اٹھا کر تھکے تھکے خفیف انداز میں کپکپاتی آواز میں پوچھتے ہیں۔)

اَبّا جان: بیٹی۔ مجھے ساری تفصیل بتاؤ۔

(آواز غائب ہو جاتی ہے۔ کیمرہ ان تینوں کو باتیں کرتے دکھاتا ہے۔ جن میں عائشہ بار بار روتی ہے)

سین نمبر ۱۲

(کریم کا بیڈ روم۔ ابّا جان کرسی پر بیٹھے ہیں۔ کریم پلنگ پر بیٹھا ہے اس کی بات کا انداز پر اعتماد ضرور ہے مگر گستاخانہ ہرگز نہیں ہے۔ ابّا جان بڑے ٹھنڈے انداز میں اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں)

کریم: اَبّا جان! یوں لگتا ہے عائشہ نے بڑھا چڑھا کر باتیں کی ہیں۔ جن سے آپ بدظن ہو گئے ہیں۔
ابّا جان: عائشہ کی بات نہیں بیٹے ..... میں تم سے پچھلے ایک گھنٹے سے بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں ..... مگر نہ تو تم کوئی ٹھوس بات کرتے ہو۔ نہ مجھے ابھی تک کوئی ایسی چیز نظر آئی ہے۔ جو عائشہ کو غلط ثابت کر سکے۔ یا یہی بتا سکے کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔

کریم: اَبّا جان میں نے جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔
اَبّا جان: اگر تم واقعی سوچ رہے تھے۔ تو تم نے مجھ سے مشورہ کیوں نہیں کیا۔
کریم: ابا جان یہ اتنا ذاتی معاملہ تھا کہ .....
اَبّا جان: (ذرا تیزی سے بات کاٹ کر) ذاتی معاملہ؟ بیٹے جب رشتے بکھرتے ہیں تو یہ ذاتی معاملے نہیں رہتے ..... فرد کی موت پر تو صرف انسان لرزتا ہے مگر رشتے کی موت پر خدا بھی کانپ جاتا ہے۔ تم صرف اپنی بیوی کو ہی طلاق نہیں دے رہے۔ اس گھر کی بہو کو بھی نکال رہے ہو۔ دو خاندانوں کے تلاپ کو کاٹ رہے ہو۔ اگلی مخالفتوں کے بیج بو رہے ہو ..... اور یہ سب کچھ کسی لئے ..... یہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔

کریم: بات صرف اتنی ہے کہ ہم دونوں کے سوچنے کے انداز الگ الگ تھے WE ARE VERY DIFFERENT۔
اَبّا جان: بیٹے! کوئی دو شخص ایک انداز میں نہیں سوچتے۔ نہ ہی وہ سوچ سکتے ہیں۔ پچانوے فی صدی میاں بیوی ایک دوسرے سے

مختلف ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اختلاف کوئی خرابی نہیں۔ خوبی ہے۔ مختلف قسم کے میاں بیوی ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک کی خوبیاں دوسرے کی خامیوں کی خانہ پری کرتی ہیں۔ میاں بیوی کا مختلف ہونا بدقسمتی نہیں خوش قسمتی ہے۔ اگر تم اس وجہ سے اپنا گھر اجاڑ کر زندگی برباد کر رہے ہو۔ تو یہ حماقت ہے۔

کریم: میں زندگی برباد نہیں کر رہا۔ ابا جان بلکہ سنوار رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ترقی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ابا جان: (چند لمحے سوچ کر) تم ترقی کسے کہتے ہو کریم؟

کریم: (سر کھجا کر مناسب الفاظ تلاش کرتا ہے) ترقی میں بہت سی چیزیں ہیں ابا جان ۔ ۔ ۔ ۔ جنہیں میں مجموعی طور پر کہوں گا GOOD LIFE اچھی زندگی گزارنے کی تمنا کرنا اور کوشش کر کے پا لینا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ترقی ہے۔

ابا جان: اچھی زندگی کیا ہے؟

کریم۔ (ہنس کر) اچھی زندگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھی زندگی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی میں ہر اس چیز کا شامل ہو جانا۔ جس کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ دولت عزت۔ سوشل سٹیٹس (SOCIAL STATUS) کمفرٹس COMFORTS ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا یوں کہئے۔ اچھی خوراک ۔ ۔ ۔ ۔ اچھی پوشاک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ٹیسٹ (TASTE)

ابا جان: (سر جھکا کر سوچتے رہتے ہیں) بیٹے تم نے سب اچھی چیزیں گنوائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اچھا انسان بننا نہیں گنا۔

کریم: جی۔ دانستہ نہیں گنا۔

ابا جان: کیوں؟

کریم: میں کئی سال اچھا بن کر رہا۔ مگر ہمارے ماحول نے قدم قدم پر جھنجھوڑا کہ یہاں اچھا انسان بننے سے اچھی زندگی نہیں ملتی۔

ابا جان: (افسوس سے) بیٹے میں نے تمہاری تربیت یہ تو نہیں کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو تمہیں عمر بھر اچھا انسان بنانے کی کوشش کرتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہیں اچھا سکھایا۔ اچھا پڑھایا اور اچھا بن کر دکھایا۔

(کریم خاموش ہے۔ باپ سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ پھر وقفے بعد کہتا ہے)

زندگی کی دلچسپیاں کسے نہیں پکاریں بیٹے۔ انہوں نے مجھے بھی بہکایا۔ پھسلایا۔ بہلایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ اگر میں پھسل گیا۔ تو میری اولاد پہ کیا اثر پڑے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فطرت کی چپل مجھ میں بھی تھی۔ مگر میں اسے سلاتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رشوت کی چمنک میرے لئے بھی دلکش تھی۔ مگر کبھی پیسہ نہ لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جائیداد کی طلب مجھے بھی تھی۔ مگر اس کی خاطر کبھی بے ایمانی نہ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواہش پالنے کی نسبت خواہش دبانا بہت مشکل ہے بیٹے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں سب کچھ عبادت سمجھ کر کرتا رہا۔ کہ تمہیں اچھا بن کر دکھا سکوں تاکہ تم بھی اچھے انسان بنو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر آج تم یہ کہتے ہو کہ اچھا انسان بن کر اچھی زندگی نہیں ملتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے ایک ہی فقرے میں میری ساری تربیت توڑ پھوڑ کر میرے منہ پر مار دی ۔ ۔ ۔ ۔ میں جیا تو کیا جیا؟ (افسوس سے سر ہلاتا ہے)

کریم: میں نے دانستہ کچھ نہیں توڑا ابا جان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میرا ماحول میری تربیت سے زیادہ طاقتور نکلا میں تو آپ کے سکھائے ہوئے اصول لے کر کالج سے نکلا تھا۔ اور ملازمت شروع کی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی۔ مگر تھوڑے ہی

عرصہ بعد یہ تکلیف دہ سبق سیکھا کہ ہمارے آج کے معاشرے کو اچھے انسان کی ضرورت نہیں۔

ابّا جان: (تڑپ کر) بیٹے یہ غلط مفروضے ہیں۔ معاشرہ کبھی بھی شہد کی طرح صاف اور میٹھا نہیں ہوتا ..... ہمارے وقت میں بھی بدی چمکدار تھی۔ لیکن آپ کے پاس اصولوں کی ڈھال ہو۔ تو بدی اثر نہیں کرتی۔ قناعت ہو تو ترغیب کند ہو جاتی ہے۔ دیانت ہو تو گلی میں پھیلی ہوئی بے ایمانی کی بو آپ کو تنگ نہیں کرتی ..... اگر اچھائی کی خواہش ہو بیٹے تو لوگ اپنے اندر تلاش کرتے ہیں۔ اگر برائی کا ارادہ ہو۔ تو معاشرے کا بہانہ تلاش کرتے ہیں۔

کریم: ابّا جان! آپ زندگی بھر تیر کر کنارے پہنچ چکے ہیں۔ میں نے تیرنا شروع کیا ہے۔ مگر آپ کو احساس نہیں کہ آپ کے گزر جانے کے بعد آب پانی گدلا ہو چکا ہے ..... وہ پانی ہی نہیں رہا بلکہ دلدل بن چکا ہے ..... دلدل میں وہ طریقے نہیں چلتے۔ جو پانی میں تیراکی کے لیے ہوتے ہیں ..... میرے سامنے صرف دو راستے ہوں۔ یا تو دلدل میں دھنس جاؤں۔ مر جاؤں۔ یا پھر دلدل میں چلنے کے انداز سیکھوں ..... اور پھر یہ صرف ماحول کی بات نہیں۔ ہمارے آج کے معاشرے کا فرد بھی غرق ہو گیا ہے۔ اس کے اندر سوائے لالچ کے کچھ نہیں رہا۔ نہ اچھائی رہی۔ نہ اچھائی کے لیے مزاحمت رہی۔ نہ مزاحمت کرنے کی خواہش رہی۔

ابّا جان: میری تربیت یہ تو نہ تھی بیٹے کہ تم عام لوگوں کی بھیڑ میں خوش رہو۔ تم اُن کے اطوار سیکھو یا تم ماحول میں اپنی انفرادیت کھو دو۔ میں تو تمہیں ماحول کو سدھارنے والا بنا رہا تھا۔ تمہیں پیغمبر کی سنت سکھا رہا تھا۔

کریم: میں نے کی۔ ابا جان۔ خود پیغمبری کی .... مگر (مایوسی سے ہاتھ ہلاتا ہے اور سر ہلاتا ہے) کچھ نہیں ..... کچھ بھی نہیں ... پیغمبر کو لوگ پتھر مارتے تھے تو چوٹ نظر آتی تھی۔ مگر ہمارے معاشرے میں لوگ بااصول اور دیانت دار آدمی کو پتھر نہیں مارتے۔ فقط نظر انداز کر دیتے ہیں ..... مکمل طور پر نظر انداز ..... میں نے خود کھا کر دیکھی ہے ابّا جان۔ تجاہل کی چوٹ پتھر کی چوٹ سے بہت سخت ہے ..... اور ظلم یہ کہ نظر بھی نہیں آتی ..... پھر پیغمبر کو تو خدا کا سہارا تھا۔ مگر مجھے کسی کا سہارا نہ ملا۔ نہ حکومت کا نہ ماحول کا ..... وہ منہ سے کچھ ہی کہیں۔ مگر اپنے دلوں میں ہمارے لوگ دیانت کو حماقت سمجھتے ہیں۔ قناعت کو کم ہمتی کہتے ہیں۔ اصول کو گالی سمجھتے ہیں ..... میں آپ کی تربیت لے کر آگے چلا۔ تو مجھے یوں لگا جیسے میں جلد ہی ..... سماجی خودکشی کر لوں گا ..... مجھے اس معاشرے میں زندہ رہنا ہے ..... اس لیے مجھے اس معاشرے کے انداز سیکھنے پڑیں گے ..... اور اگر ترقی کرنا چاہوں گا۔ تو کچھ زیادہ ہی سیکھنے پڑیں گے۔

ابّا جان: (حیرت سے) تمھیں یہ باتیں کس نے سکھائیں کریم۔

کریم: ابا جان! جس طرح آپ اپنے اصول مجھے تھپڑ مار مار کر اور سزائیں دے کر سکھاتے تھے۔ اسی طرح ہمارا آج کا معاشرہ ہمیں گھونسے اور لاتیں مار کر سکھاتا ہے ..... فرق یہ ہے۔ جب آپ مجھے مارتے تھے۔ تو امی جان آ کر بچا لیتی تھیں۔ مگر جب ماحول نے مجھے مارا تو کوئی بھی بچانے نہ آیا ..... وہ لوگ بھی نہ آئے جو دیانت داری اور قناعت پہ ہر وقت لمبی لمبی تقریریں کرتے رہتے ہیں ..... جتنی تکلیف مجھے آپ کے اصول سیکھنے پہ ہوئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف مجھے آپ کے اصول بھولنے میں ہوئی۔ ..... مگر ابّا جان میرے سامنے کوئی CHOICE نہ تھی۔ یہ باتیں مجھے لوگوں کی سرد نظروں نے سکھائیں۔ ان دوستوں کی رکھائی نے سکھائیں جو پہلے گرم جوش تھے مگر بعد میں مجھے دیانت دار دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے کہ اس سے کوئی ناجائز

کام نہیں نکل سکتا۔ بیوقوفی کے ان طعنوں نے سکھائیں۔ جو لوگوں نے مذاق مذاق میں دیے۔

ابّا جان: مگر ہمارے معاشرے میں اچھے لوگ بھی تو ہیں نا بیٹے۔

کریم: ہیں ابّا جان۔ ضرور ہیں۔ مگر ان کی تعداد دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں صرف وہ لوگ ترقی کرتے ہیں جو منافق ہیں۔ یا وہ جن کو آپ کے زمانے میں آوارہ کہا جاتا تھا۔ ..... میں نے کئی مہینے اس کرب میں گزارے کہ منافق بنوں یا آوارہ اور فیصلہ آوارگی کے حق میں کیا۔ کیونکہ آوارہ آدمی کھلی کتاب کی طرح دھوکا نہیں دیتا۔ مگر منافق بند لفافے کی طرح دوسروں کو بھی دھوکا دیتا ہے اور خدا کو بھی دھوکا دیتا ہے۔ ..... منافقت آوارگی سے بڑا جرم ہے ابّا جان۔ اور پھر آج کل میرے جیسے آدمی کو آوارہ نہیں کہتے۔ عملی شخص یا پریکٹیکل PRACTICAL انسان کہتے ہیں۔ ..... ہر زمانہ اپنی VOCABULARY خود ڈھالتا ہے۔ جسے کل آپ آوارہ کہہ کر نفرت کرتے تھے۔ آج اُسے پریکٹیکل کہہ کر عزت بخشتے ہیں۔

ابّا جان: مگر بیٹے اگر ہر شخص ایسے سوچنے لگا۔ تو ہمارے معاشرے کی برائی کون دور کرے گا۔

کریم: (سوچ کر) شاید میں ہی یہ کوشش شروع کر دوں ابّا جان ..... مگر اس وقت جب میں برائی سے تنگ آ جاؤں گا۔ فی الحال تو میں اس بُرے ماحول میں اچھائی سے تنگ آیا ہوا ہوں۔ کچھ آپ کی اچھائی کا ردِ عمل کچھ میری اچھائی کی ناکامی۔ دونوں نے مجھے اچھائی سے کافی دور بھگا دیا ہے۔

ابّا جان: ردِ عمل ہو سکتا ہے۔ مگر انسان ردِ عمل میں بھی تو اپنے لئے کوئی حد مقرر کرتا ہے۔ تمہاری حد کونسی ہے۔

کریم: میں نے ساری حدود توڑ دی ہیں۔ ..... جب ماحول ٹوٹ پھوٹ رہا ہو۔ تو افراد کی حدیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔

ابّا جان: ہمارے ملک کا ماحول تو پچھلے کئی برسوں سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ مگر میں نے تو اس ٹوٹتے ماحول میں بھی اپنی حدود قائم رکھی تھیں۔

کریم: اسی لئے ابّا جان آپ کی زندگی محرومیوں کی زندگی تھی۔ میں آپ کے گھر میں پلا ہوں۔ میں نے وہ ساری محرومیاں چکھی ہیں اور اب میں محرومیوں کی زندگی نہیں چاہتا۔ میں آسودہ خواہش کی زندگی چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اپنی تمام حدیں توڑ دی ہیں۔

ابّا جان: چیونٹی اپنی حدیں توڑ دے بیٹے تو وہ کچھ بھی کرے۔ ہاتھی نہیں بن سکتی ..... بلبل لاکھ جتن کرے عقاب نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ ان کی صلاحیتیں چیونٹی اور بلبل والی ہیں۔ (اٹھ کر ٹہلتے ہوئے) تم اپنے روئیوں کی حدیں توڑ سکتے ہو بیٹے۔ مگر اپنی صلاحیتوں کو تو لامحدود نہیں کر سکتے ..... تم اپنی ہر محرومی کو آسودگی میں نہیں بدل سکتے ..... تمہیں میری زندگی محرومیوں والی نظر آتی ہے ..... آتی ہے نا؟ ..... اس لئے کہ تم میرے گھر میں پلے ہو۔ اس لئے کہ تمہیں میرا قرب حاصل تھا۔ ..... دوسروں کی محرومیاں تمہیں اس لیے نظر نہیں آتیں کہ تمہیں ان کا قرب حاصل نہیں ..... اور تم بھول رہے ہو کہ محرومی ہر شخص کے ماتھے کا پسینہ ہوتا ہے ..... دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جس کی زندگی کسی نہ کسی محرومی سے خالی ہو۔

کریم : مگر ابّا جان! دنیا بھری پڑی ہے ایسی مثالوں سے کہ لوگ اپنی ہمت سے اپنی محرومی سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں ..... تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔

ابّا جان: (رک کر چند لمحے اسے غور سے دیکھتے ہیں) بیٹے۔ محرومی کا گڑھا ہر انسان کے مقدر کا بنیادی ڈیزائن ہے ..... ابدی اور اٹل ڈیزائن ..... ایک گڑھے کو پُر کرنے کے لیے تم مٹی کھود دو تو وہ گڑھا تو بھر جائے گا۔ مگر دوسرا گڑھا بن جائے گا ..... اسے پر کرنے کو مٹی پیدا کر دو تو تیسرا گڑھا بن جائے گا ..... تم اس بنیادی ڈیزائن کو بدل نہیں سکتے۔ اور کسی نہ کسی محرومی کو تمھیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔

کریم : مگر لوگوں نے بدلا ہے یہ ڈیزائن۔

ابّا جان: ڈیزائن نہیں بدلا بیٹے ..... فقط محرومیاں بدلی ہیں ..... اگر اپنی لگن اور ہمت سے ایک محرومی سے چھٹکارا پایا ہے تو اس کی جگہ اور محرومیاں خریدی ہیں۔ ایک گڑھے کو پُر کرنے میں دوسرا گڑھا خود کھودا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ..... تم تمام محرومیوں سے بیک وقت چھٹکارا نہیں پا سکتے بیٹے۔ فقط محرومیوں میں سے انتخاب کر سکتے ہو ..... میں دیانت دار آدمی تھا۔ اور اس وجہ سے مالی آسودگی سے محروم تھا۔ بقول تمہارے اچھی زندگی سے محروم تھا۔ مگر یہ میرا اپنا انتخاب تھا۔ ذاتی چناؤ تھا۔ کیوں کہ میں اس اطمینان اور سکون سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جو مجھے اس طرح ملتا تھا ..... اگر میں دیانت دار نہ رہتا۔ تو اچھی زندگی سے بھی محروم نہ رہتا۔ مگر میں اپنی نظر سے گر جاتا۔ میں خود داری سے محروم ہو جاتا ..... خود شناسی سے محروم ہو جاتا ..... عزتِ نفس سے محروم ہو جاتا ..... بیٹے۔ مجھے یہ محرومی قبول نہ تھی۔ جب میرے چناؤ کا مرحلہ آیا۔ تو میں نے میں جان بوجھ کر وہ محرومی چنی۔ جو آج تمھیں تنگ کر رہی ہے۔

کریم : ابّا جان ..... جب آپ نے زندگی شروع کی۔ تو زیادہ تر لوگ خود دار تھے۔ جب میں زندگی شروع کر رہا ہوں۔ تو زیادہ تر لوگ خود غرض ہیں۔ تب ..... خود داری کی عزت تھی اب ..... خود نمائی کو داد ملتی ہے ..... آپ کا چناؤ ..... محرومی ..... آپ کے ماحول کے مطابق تھا ..... میرا چناؤ ..... آسودگی ..... میرے ماحول کے مطابق ہے ..... آپ نے اپنا انتخاب آزادانہ کیا تھا۔ مجھے اپنا انتخاب آزادانہ کرنے دیجیے۔

ابّا جان: (سوچتے رہتے ہیں۔ پھر شکستہ دلی سے) تمہاری جوانی کی سوچیں ہیں بیٹا۔ جوانی منہ زور بھی ہوتی ہے۔ منہ پھٹ بھی ہوتی ہے اور باحوصلہ بھی ..... مگر دور اندیش نہیں ہوتی ..... تم میری تربیت کے چیتھڑے اڑا کر پھینک چکے ہو۔ اب میں تمھیں نصیحت دینے کے قابل نہیں رہا ..... اور نہ ہی تم سنو گے ..... مگر بیٹے عائشہ اچھی لڑکی ہے۔ اچھی بیوی ہے اچھی بہو ہے۔ اور میرے خیال میں اچھی انسان ہے۔ تم میری بات نہ سنو ..... خود ہی اکیلے میں بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سوچنا۔ شاید تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو ..... میں اسے چند دن اپنے گھر روک لوں گا۔

کریم : (آنکھیں چراتے ہوئے) مت روکئے اسے ابّا جان۔ عائشہ کو اپنے والدین کے گھر بھیج دیجیے ..... میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کروں گا۔ کیونکہ عائشہ واقعی اچھی لڑکی ہے ..... اور کئی برس سوچنے کے بعد میں اب CONVINCED

ہوں کہ مجھے ..... اچھی لڑکی نہیں چاہیے - اچھی زندگی چاہیے ..... بُرے ماحول کی اچھی زندگی ..... مجھے ایسی لڑکی چاہیے جو برے ماحول کے تقاضے سمجھتی ہو ..... جو پریکٹیکل PRACTICAL ہو -

(ابّا جان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے رہ جاتے ہیں)

سین نمبر ۱۳

(لان کا منظر - کیمرہ گھوم کر سارے پودوں کا جائزہ لیتا ہے - زیادہ تر کس مپرسی کی حالت میں خراب ہو رہے ہیں - باڑھ بھی بے ترتیب سی بڑھی ہوئی ہے - جب کیمرہ گھوم رہا ہے تو اس دوران ٹھک ٹھک کی آواز آتی رہتی ہے - جب کیمرہ آڑو PEACH کے پودے پر جاتا ہے - تو وہاں مالی کلہاڑے سے آڑو کا درخت کاٹ رہا ہے - جس کی ٹھک ٹھک آواز آ رہی ہے - چند لمحے بعد شبراتی گیٹ میں سے داخل ہوتا ہے - اس کے ہاتھ میں تھیلا ہے - جس میں سے بازار سے خریدی ہوئی سبزیاں اور مولیاں جھانک رہی ہیں)

شبراتی : واہ میاں مالی - اچھے آئے - نہ کچھ بیجا - نہ اگایا اور آتے ہی درخت کاٹنے شروع کر دیے -

مالی : (رک کر غصے سے دیکھتا ہے) تو جا کے ہنڈیا جلا - گھی چرا کے کھا تجھے میرے کام سے کیا کام

شبراتی : ویسے ہی بگڑ گئے یار - کوئی بات بھی تو ہو -

مالی : اور بات کیا ہوگی - آتے ہی طعنہ کھینچ مارا - نہ سلام نہ دعا - میں وہی کر رہا ہوں جو مجھے صاحب نے کہا ہے - تو بیچ میں کیوں بولتا ہے

شبراتی : (صلح کے انداز میں) یہاں آئے دن تو تمہیں دو ہی ہوئے ہیں - مگر پہچان جلدی گئے ہو ہمیں - (مالی غصے سے دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے) شیدے کی ماں بھی مجھے برسوں سے یہی بات کہہ رہی ہے - حالانکہ میں اسے بھی طعنے نہیں بولتا - صرف کھری بات کرتا ہوں -

مالی : شبراتی ! کان کھول کر سن لو - کھری کہو گے تو کھری سنو گے بھی -

شبراتی : (آسمان کی طرف دیکھ کر) مولا جی وہی انداز ہیں اس کے بھی ..... اتنے عرصے گھر نہیں گیا - تو تو نے یہاں رونق لگا دی -

مالی : (غصے سے) اوے کون سی رونق -

شبراتی : جانے دے لالہ - جانے دے - میں اپنے آپ سے بات کر رہا تھا ..... آ چل تجھے کچن میں چائے پلاؤں -

مالی : (اندر سے نرم ہو کر) میں نہیں پیتا چائے -

شبراتی : لالہ تھوک دے غصہ ..... میں منانے میں اتنا بُرا نہیں - عمر بھر مشق کرائی ہے اس نیک بخت نے - (بازو پکڑ کر) چل لالہ چل -

(ہاتھ سے کھینچ کر کچن میں لے جاتا ہے - سٹول پہ مالی کو بٹھا کر چائے دیتا ہے اور خود سبزی پھیلنے لگتا ہے)

مالی : بیگم نہیں ہے تمہارے صاحب کی -

شبراتی : بخت ہو گئی

مالی (چند لمحے خاموش رہ کر) بخت ؟ مگر کیوں ؟؟

شبراتی : کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ایک دو سال تو بڑے سلوک سے رہے۔ پھر ان کے جھگڑے ہونے لگے۔ میں نے سوچا کوئی بات نہیں۔ شادی پکی ہو رہی ہے۔ مگر پھر تھوڑے ہی دنوں میں ان کی لڑائیاں اتنی بڑھ گئیں کہ مجھے گھر یاد آ جاتا۔

مالی : مگر لڑتے کس بات پر تھے۔

شبراتی : رب جانے کیا بات ہوتی تھی۔ . . . . گھروں کی لڑائی تو ایسی چیز ہوتی ہے کہ خود لڑنے والوں کو پتہ نہیں چلتا کہ کس بات پر لڑ رہے ہیں۔ پھر زبان بھی تو ہماری سمجھ میں نہ آئے نا۔ یہ پیار بھی انگریزی میں کرتے ہیں۔ لڑائی بھی انگریزی میں کرتے ہیں۔ اردو تو ان لوگوں نے مالی اور بیرے کے لیے رکھی ہے اور تو اور کتے کو بھی انگریزی میں بلاتے ہیں۔ چاہے وہ پاکستانی کتا ہو۔ اور بالکل ان پڑھ ہو۔

مالی : بیگم سخت تھی کیا۔

شبراتی : ویسے تو سخت نہیں تھی۔ مگر خانسامے کے لیے ہر بیگم سخت ہی ہوتی ہے۔ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔

مالی : بچے کتنے تھے۔

شبراتی : اوں ہوں۔ کوئی نہ تھے۔ بچے نہ ہوں۔ تو میاں بیوی بچے بن جاتے ہیں۔

مالی : کیوں؟ بچنا تھا ان میں؟

شبراتی : نہیں یہ بات نہیں۔ بیگم بڑی محنت کرتی تھی۔ بہت پیار تھا اس کو گھر سے۔ جیسے بچیاں گڑیا کا گھر سجاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح۔

مالی : اور صاحب۔

شبراتی : صاحب بڑا گھاگ ہے۔ اس میں بچپنا کہاں۔ وہ تو بڑے بڑوں کی بھجیا بنا کے کھا جائے اور ان کو پتہ نہ چلے۔

مالی : یار پیسے تو نہیں مارتا۔ تنخواہ تو دے گا نا؟

شبراتی : غم نہ کر۔ ایسا نہیں وہ۔ پیسے کا بادشاہ ہے۔ جب تک بیگم یہاں تھی۔ پیسے پیسے کا حساب مانگتی تھی۔ مگر جب سے صاحب اکیلا ہے کبھی پروا نہیں کی۔ اب تم دیکھو پانچ مہینے ہی تو گزرے ہیں اور تمہاری دعا سے اس چھوٹی سی ہنڈیا میں سے اپنے گاؤں میں گھر کا ایک اور کمرہ بن گیا ہے۔ اب بیوی لڑے گی بھی تو میں اس میں چلا جایا کروں گا۔ . . . . تم بھی چاہو تو کھاؤ اور بیچ میں سے اپنی مونچھ چیڑ لو۔

مالی : (مونچھ پر تاؤ دے کر خوش ہوتا ہے) یار یہ تو اچھی سنائی . . . . کہیں کل کو دوسری شادی تو نہیں کرے گا۔

شبراتی : ہوں اوں۔ بھئی خطرہ تو ہے . . . . آجکل ایک لونڈیا کا بہت آنا جانا ہے۔ اسے لے کر کار میں بھی بہت گھومتا ہے . . . . وہ یہاں آتی ہے۔ تو کھانے بھی خوب بنواتا ہے۔ کوفتے۔ مچھلی۔ مرغی۔ کریلے . . . . انگلش کھانے۔ چینی کھانے۔ یہ کھانے۔ وہ کھانے . . . . بھئی خطرہ تو ہے یہ۔

مالی : کب تک ہوگی شادی۔

شبراتی : (زور سے ہنستا ہے) کیا پتہ لالہ۔ ابھی تو یوں لگتا ہے ایک دوسرے کو ٹسٹ TEST کر رہے ہیں . . . . کون جانے یہی چلتا رہے اور شادی فالتو ہی ہو جائے اور کیا پتہ کر ہی ڈالیں۔

مالی : یار وہ بیگم سخت تو نہیں ہوگی۔
شبراتی : دیکھو بھئی تمہیں قاعدے کی بات بتاؤں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ بیگم کوئی سخت نہیں ہوتی۔ جب تک وہ کچن کا حساب نہ مانگے ...
... وہاں آکے سبھی سخت ہو جاتی ہیں۔ (باہر سے کار کے ہارن کی آواز آتی ہے) صاحب آگیا۔

(دونوں باہر کو بھاگتے ہیں)

سین نمبر ۱۴

(ریلوے سٹیشن کا منظر، ٹرین آکر رکتی ہے۔ مسافر اترنے لگتے ہیں۔ ایک ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں سے کریم اترتا ہے۔ تو سامنے شکیل آتا ہوا مل جاتا ہے۔)

شکیل : ہیلو کریم۔ بڑے عرصے بعد نظر آئے .... تم نے دفتر کیا چھوڑا۔ غائب ہی ہو گئے۔
کریم : بھلے آدمی تم بھی تو نظر نہیں آتے۔
شکیل : بس میں بھی بڑے دورے دورے کرتا رہا ہوں ..... تم کدھر سے آرہے ہو۔
کریم : بس یار ذرا ہنی مون کر کے آرہا ہوں۔
شکیل : ہنی مون؟ شادی بھی کر ڈالی .... یار کسی کو خبر ہی نہ دی۔
کریم : خبر تو پہلی شادی پر دیتے ہیں۔ دوسری تو خاموشی سے ہوتی ہے۔
شکیل : اور یہ کیسا ہنی مون ہے کہ اکیلے ہی کر رہے ہو۔ بیگم کہاں ہے۔
کریم : ذرا قلی سے سامان وغیرہ اٹھوا رہی ہے۔
شکیل : تو کہاں کی شادی تم نے۔
کریم : صبر بھئی صبر۔ اتنی جلدی بھی کاہے کی۔ ابھی منہ دکھائی ہو جائے گی۔
شکیل : باز نہیں آتے ڈرامہ کرنے سے۔

(دونوں ذرا ہٹ کر گاڑی کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں .. تھوڑی دیر بعد فوزیہ دروازے میں سے برآمد ہوتی ہے ساتھ ساتھ قلی کو ہدایات دے رہی ہے کہ اسے ٹھیک طریقے سے پکڑو۔ ورنہ ٹوٹ جائے گا۔)

شکیل : فوزیہ؟
کریم : (ہنس کر) جی جناب، کیسی رہی؟

(شکیل آگے بڑھ کر فوزیہ سے ملنا چاہتا ہے۔ مگر گومگو کے عالم میں کھڑا رہتا ہے۔ جیسے اس چیز کے لیے تیار نہ ہو۔

اتنے میں فوزیہ آجاتی ہے)

فوزیہ : ہیلو شکیل بھائی۔

شکیل : جیوفوزیہ۔ I JUST HEARD THE GOOD NEWS /

فوزیہ : IS IT DAMN FUNNY

شکیل : نہیں FUNNY کیوں۔ شادی شادی ہے۔

کریم : شکیل میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ فوزیہ سے شادی ہوگئی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔؟

فوزیہ : چھوڑیئے رسمی جملوں کو شکیل بھائی آپ کہاں جا رہے ہیں۔

شکیل : بس فوزیہ، آپ لوگ ہنی مون سے واپس آ رہے ہیں۔ اور ہم لوگ ہنی مون پر جا رہے ہیں۔

فوزیہ : OH ! HOW GREAT ..... کب ہوئی شادی آپ کی ؟

کریم : یار پہلے رسم تو سنو ..... کب ؟ کیسے ؟ اور بیگم کدھر ہے۔

شکیل : بس وہ ذرا رکی تھی ادھر بک سٹال پر۔ ابھی آ رہی ہوگی۔

فوزیہ : نام تو بتا دو۔

شکیل : ابھی آپ خود ہی دیکھ لیں گی۔

کریم : ارے میاں بتا بھی چکو۔ اتنے اونچے اونچے میعار قائم کر رکھے تھے تم نے کہ اب ہم دیکھنے کو بے تاب ہیں۔

شکیل : (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) اچھا وہ دیکھئے آ رہی ہیں۔

(دونوں بے تابی سے ادھر دیکھتے ہیں۔ سامنے سے عائشہ اپنے خیال میں مگن آ رہی ہے۔ اس کی نظر ابھی ان پر نہیں پڑی اور وہ چند قدم آگے آ جاتی ہے۔ پھر جب آنکھ اٹھا کر ان کو دیکھتی ہے۔ تو وہیں ٹھٹک جاتی ہے۔ ایک دو لمحے توقف کر کے۔ الٹے پاؤں مڑ جاتی ہے اور ویٹنگ روم میں چلی جاتی ہے ..... کریم اور فوزیہ بالکل حیران کھڑے ہیں۔)

شکیل : کریم! میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ ..... میں بھی تم سے وہی سوال پوچھ سکتا ہوں۔ جو تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔ مگر میں نہیں پوچھوں گا۔

کریم : (جھینپ مٹانے کو) ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے میری شادی پر مبارکباد نہیں دی تھی۔ اس لئے میں بھی تمہاری شادی پر مبارکباد نہیں دوں گا۔

شکیل : (اسے غور سے دیکھتا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) کریم تم اپنے آپ کو خوش قسمت کہتے ہو۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت کہتا ہوں ..... مناسب ہوگا کہ ہم اپنی اپنی مبارک باد کو چند برسوں کے لئے ملتوی کر دیں۔ وقت بتا دے گا کہ کون خوش قسمت ہے ..... وقت کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ (غور سے ان دونوں کو دیکھتا ہے) دراصل تم اور فوزیہ، میں اور عائشہ دو جوڑے نہیں ہیں۔ بلکہ دو رویے ہیں اور ہمارے بکھرتے ہوئے معاشرے میں رویے اس تیزی سے بدل رہے ہیں۔ جیسے آندھی میں کتاب کے ورق الٹتے ہیں۔ ..... ایسے میں حرف آخر کون کہہ سکتا ہے۔ ..... بہتر ہے ہم اپنا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیں .....

ادیبوں، شاعروں ۔ افسانہ نگاروں اور نقادوں کا

البم

جسے ادارۂ نقوش بڑے اہتمام سے شائع کر رہا ہے ۔

جو

نقاد، ادیب، افسانہ نگار اور شاعر نقوش میں چھپتے رہے ہیں۔
یا جو دوسرے اہم رسالوں میں چھپتے رہے ہیں یا جو صاحبِ تصنیف
ہیں وہ ہمیں مندرجہ ذیل معلومات اور اپنی فوٹو کاپی بھجوائیں ۔
ہم ممنون ہوں گے ۔

(۱) رنگین تصویر ۱۰" X ۸" سائز کی ۔ اگر ٹرانسپرینسی (TRANSPARENCY)
ہو تو زیادہ اچھا ہوگا ۔

(۲) نام (۳) قلمی نام
(۴) جائے پیدائش (۵) تاریخ پیدائش
(۶) نام تصانیف (۷) موجودہ ایڈریس
(۸) کوئی ایک شعر، اپنی تحریر میں، باریک سیاہ مارکر سے !

(ادارہ نقوش)

۱۰۰ کروڑ

ہمالہ
کے چشمے
اُبلنے لگے

اسلم کمال

میں ان اوراق میں جغرافیہ کا طالب علم نہیں ہوں۔
شاعر ہوں۔ حسن پرست ہوں۔
میں مؤرخ نہیں ہوں، محقق تو بالکل نہیں۔
مصور ہوں، خطاط ہوں۔
میں ملکِ چین تعصبات لے کر نہیں گیا کہ حکمت کی بات مومن کی گم شدہ میراث ہے۔
اور مرعوبیت میری سرشت میں نہیں ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔

یہ روداد اُن لمحوں کے شمار کا تسلسل ہے۔ جو ڈوبتے ابھرتے رہے۔ اس کہکشاں میں کبھی کوئی ستارہ چمک کر نیا افق روشن کرتا ہے۔ اور کوئی ٹوٹ کر لمبی لکیر کھینچتا ہوا سفرِ معکوس میں گم ہو جاتا ہے۔ ذہن کی ایک ایک لہر اور قلب کی تمام واردات اس تسلسل کی کڑیاں ہیں کہ سب منظر میری آنکھوں کے عدسوں میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے پھیلے اور سمٹے ہیں۔ قرب و بعد کی انتہائیں ہمیشہ ورائے ارتکاز رہتی ہیں۔ صرف آئینۂ وجدان پر اک عکس ابھرتا ہے۔

ایک سالم انسان کے سفر میں مری اور غیر مری ہر دو صورتیں یکساں اہمیت رکھتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان اوراق میں کوئی سفر نامہ نہ ہو اسی لئے میں اسے سفر نامہ نہیں کہتا ــــ مگر یہ ایک سفر نامہ ہے کہ ننھے ولید کمال کی مسکراہٹ اور اس کی ماں پروین کمال کے چہرے کا اعتماد اپنے گھر کے آنگن میں سرما کی پہلی بارش کی بوندوں میں چھوڑ کر گیارہ نومبر ۱۹۸۱ء بعد از دوپہر لاہور ائیر پورٹ پر ارشاد صدیقی، خالد بٹ، فہیم کمال اور سعدیہ کمال کو خدا حافظ کہہ کر کراچی کے لیے پرواز کر گیا تھا۔

کراچی ایئر پورٹ پر اترا تو سعدیہ کمال یاد آئی۔

"ابّو اپنے ساتھ ٹھنڈے پانی کا تھرماس رکھ لیں"۔

کراچی میں چند دوستوں کو آمد کی اطلاع دے سکا۔ بہت سارے ملنے آئے۔ محبت بھری باتیں اور لطیفے بازی ہوتی رہی۔ ساڑھے گیارہ بجے شب حریت والے سجاد میر پہنچے۔ دیر بعد ملے تھے۔ ڈوے ہوٹل کے ایپل روم میں فریش لائم پیتے رہے بیتے دنوں کو یاد کرتے رہے پھر میر صاحب چلے گئے اور نیند آ گئی۔

۱۲ دسمبر کی صبح ڈوے ہوٹل کراچی کے کمرہ نمبر ۲۷ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا۔

"سر آپ جاگ جایئے۔ آپ کی فلائیٹ ۵½ بجے ہے۔"

"ٹھیک ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ اور دانت صاف کر کے شیو کیا۔ نہانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ۔"

بیرا اندر داخل ہوا اور پوچھا۔ "سر چائے یا کافی؟"

"کافی۔" میں نے کہا اور بیرا چلا گیا۔

نہا کر جلدی جلدی کپڑے پہنے اور ایک سیب اور دو کیلے جلدی جلدی نگل کر کافی پی سگریٹ سلگایا اور دوبارہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"سر سب تیار ہیں اور لاؤنج میں آ چکے ہیں۔ آپ کا انتظار ہے۔ پورٹر کو سامان دیجئے اور آ جائیے۔" باہر آیا اور آغا صاحب السلام علیکم ہوئی۔ پھر ایئرپورٹ پہنچے اور دی آئی پی لاؤنج میں ارباب نیاز اور بیگم ارباب نیاز سے ملاقات ہوئی۔ سگریٹ سلگایا تو پتہ چلا تین رکنی وفد میں سگریٹ نوش میں اکیلا ہوں۔ صبح صادق کے نور میں جہاز پر سوار ہوئے اور جہاز رن وے پر دوڑ کر فضا میں بلند ہو گیا۔ اور کراچی شہر کا ایک خوب صورت چکر کاٹا۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا۔ اور کراچی کا عظیم شہر ابھی انگڑائی لے رہا ہے اور منوڑا کے ساحل پر ہلکی ہلکی لہریں ساحل کو تھپتھپا رہی ہیں۔ منوڑا اسی سائیٹ پر پہلے ایک مندر تھا۔ اب پرانے نام رہ گیا ہے۔ اس کے مغرب میں پی این ایس ہمالیہ کی جانب ایک قبرستان ہے جہاں کم لوگ دن کے اجالے میں بھی کم جاتے ہیں۔ میں راتوں کی تنہائیوں میں اس جگہ بیٹھتا تھا۔ یہ راتیں ماضی بعید کا قصہ ہیں۔ مگر میرے حافظے میں اس کی تمام تفصیل پوری کیفیات کے ساتھ موجود ہے۔ میرے پاس کرکٹ کا ایک بیٹ ہوتا تھا۔ جسے میں کالج کے بعد اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا تھا۔ فرصتوں کی تلاش میں۔ اس وقت کے انتظار میں کہ میں دوبارہ نیٹ پریکٹس کر سکوں۔ مگر جب وقت کے تسلسل میں کہیں بھی کوئی رخنہ کوئی وقفہ دور دور تک دکھائی نہ دیا۔ تو میں نے ایک رات وہ بیٹ چپکے سے سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا — یہ رات پورے چاند کی رات تھی۔ سمندر کف اڑا رہا تھا۔ چاروں طرف دھند تھی۔ میرا بلا موجوں میں ابھرتا ڈوبتا غائب ہو جاتا اور پھر کسی لہر کی انگلی پکڑے ضدی بچے کی طرح میری طرف لوٹ آتا — میں نے اس منظر سے نظریں ہٹانے کے لئے بھی اور ضدی بچے کی آس توڑنے کے لیے بھی ایک لکڑی کے ٹکڑے کو قلم کی طرح پکڑ کر تازہ تازہ ہموار ریت پر لکیریں کھینچنی شروع کر دیں۔ وہ لکیریں باہم ملتی بچھڑتی ایک دوسرے کو کاٹتی بناتی رہیں اور میں ہجر و وصال کے اس کھیل کی دلفریبی میں گم ہوتا گیا۔

سمندر کی لہریں آتیں اور میرے نقش چاٹ کر واپسی پلٹ جاتیں اور میں لہروں کے لوٹتے ہی نرم تازہ ہموار ریت پر پھر کوئی نقش بناتا۔ بڑی سرعت سے کہ مبادا لہر آ جائے اور میں اپنا نقش مکمل بھی نہ کر سکوں اور وہ میرا ادھورا نامکمل نقش نگل لے۔ نہ جانے کون میرے کان میں کہتا ہاں نقش ہر صورت میں لہر کی آمد سے پہلے مکمل کر لینا۔ ادھورا نقش کوئی نقش نہیں ہوتا اور لہریں صرف ادھورے نقش نگل سکتی ہیں۔ یہ ایک فنی مراقبہ تھا یا روحانی چلہ یا صرف کرکٹ کا کھیل تھا۔ میں نقش بناتا تھا یا رنز — اَن گنت راتیں — بے شمار لہریں — لاتعداد نقش — کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے رات گزر جاتی تھی۔ میں شل ہو جاتا تھا۔ ساحل کے پتھروں پر بیٹھ کر سوچتا تھا۔ سمندر نے جو میرے نقش چاٹ لیے کبھی تو ساحل پر بھی بکھریں گے تو کیسے موتی ہوں گے۔

" خواتین و حضرات السلام علیکم۔ جہاز کا کیپٹن آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم چھتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے نواب شاہ، رحیم یار خاں، اسلام آباد اور گلگت پر سے گزرتے ہوئے قراقرم عبور کرتے ہوئے چین میں داخل ہوں گے یہ پرواز مسلسل ساڑھے چھ گھنٹے کی ہے۔ اُمید ہے آپ کا یہ سفر ہمارے ساتھ نہایت خوشگوار گزرے گا۔"

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا اور مشرق میں پورا چاند دکھائی دیتا ہے۔ جہاز میں ابھی کافی ٹھنڈ ہے۔ ایئر ہوسٹس نے سرخ کمبل مسافروں میں تقسیم کئے۔ میں نے کمبل ٹانگوں پر پھیلا لیا۔ جہاز میں تقریباً پینتیس مسافر خواتین و حضرات ہیں۔ میرے مقابل والی سیٹ پر ایک نوجوان جاپانی لڑکی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ بیمار لگتی تھی۔ ایک نوجوان باریش جاپانی کیمرہ لئے جہاز میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے۔ ایک بوڑھا امریکی آدھے بازو کی بشرٹ میں اپنے ڈنڈ دکھاتا پھرتا ہے اور ہیلو کہہ کر ہر کسی سے گپ بازی شروع کر دیتا ہے۔ مخالف سیٹ پر بیمار نوجوان جاپانی لڑکی کے چہرے سے وہ کمبل ہٹاتا ہے۔ اُسے ہیلو ہیلو کرتا ہے۔ طبیعت کا حال پوچھتا ہے اور اُس کے سرخ گال پر بوسہ دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ میری اگلی سیٹ پر بوڑھی میم نے سگریٹ سلگا لیا اور لمبے لمبے کش لیتی ہے اور یوں دھواں باہر اُڑاتی کہ خواہ مخواہ تشویش ہوتی کہ اس بڑھیا کی صحت سگریٹ کیلئے سخت مضر ہے۔

اِس جہاز میں چار اسٹیورڈ ہیں۔ چاروں پاکستانی اور ان میں سے ایک چینی زبان بھی جانتا ہے۔ تین ایئر ہوسٹس ہیں۔ دو پاکستانی اور ایک چینی۔ انہوں نے ناشتہ لگا دیا ہے۔ میں نے سلائس پر مکھن لگایا۔ اور باہر کھڑکی سے پہاڑوں میں ایک جھیل دکھائی دی۔ میں نے غور کیا۔ تو مجھے یوں لگا۔ جیسے ہم تربیلا ڈیم پر سے گزر رہے ہیں۔ میں نے چینی ہوسٹس سے پوچھا۔ پہلے تو اُس نے کھڑکی سے جھانکا مگر شاید کچھ سمجھ نہ آیا۔ تو جا کر نقشہ اُٹھا لائی اور وہ مقام بتایا نقشہ پر جہاں پر سے ہم گزر رہے تھے۔ یہ واقعی تربیلا ڈیم کی جھیل تھی۔ چند ماہ قبل واپڈا نے مجھے اس کی سیر کی دعوت دی تھی۔ اس بجلی گھر میں خطاطی کروانے کا فیصلہ کیا تھا۔ خُدا اِس ڈیم کو سلامت رکھے۔ انسانی سعی مشکور فرمائے۔ اس کی زیرِ تعمیر ٹنل دیکھ کر بے ساختہ یاد آتا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اور تربیلا کی جھیل اس بلندی سے ایک بڑا ایاغ ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں نے ہوسٹس کے لئے پھر گھنٹی بجائی تو پاکستانی لڑکی آئی جسے میں نے لیٹر پیڈ کے لئے کہا۔ وہ پی۔ آئی۔ اے کا خوبصورت پیڈ لے آئی تو میں نے لکھا۔

" برادرم کیپٹن صاحب! السلام علیکم!

اُمید ہے آج بھی آپ کی یہ پرواز لاجواب ہوگی۔ وہ اس طرح کہ راہ کے قابلِ ذکر مقامات کا تعارف آپ ضرور کروائیں گے۔

مزید امید یہ ہے کہ آج بھی حسبِ معمول آپ کے ساتھ باکمال لوگ محوِ پرواز ہوں گے۔ میں صرف اسلم کمال ہوں۔"

یہ خط میں نے لفافہ میں ملفوف کر کے ہوسٹس کے سپرد کیا۔ وہ پہلے تو قدرے گھبرائی پھر شرمائی بھی۔ تب میں نے تسلی کے انداز میں عرض کیا۔

میرا یہ نامۂ محبت تمہارے کیپٹن کے لئے ہے اور اس میں آپ کی، اور آپ جیسی کسی اور کی کوئی شکایت وغیرہ نہیں ہے۔ وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد مسکراتی ہوئی آئی اور بولی۔

"کپتان آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور آپ کو مایوس نہیں کریں گے"۔ ہوسٹس نے یہ کہہ کر میرے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔

"جی آپ کا اپنا جہاز ہے۔ جہاں جی چاہے بیٹھئے۔ ویسے گرم چائے کا ایک کپ لا دیں تو برف زاروں پر پرواز کا لطف دوبالا ہو جائیگا"۔

"جی کیوں نہیں میں ابھی لاتی ہوں"۔

اور پھر گرم چائے کا کپ آ گیا۔ میں نے ایک گھونٹ لیا اور سگریٹ سلگا لیا۔

"خواتین و حضرات جہاز کا کیپٹن آپ کی توجہ چاہتا ہے اور مبارکباد دیتا ہے۔ آج اس فلائیٹ کے مسافروں کی اتنا خوشگوار اور صاف موسم اس روٹ پر پرواز کرنے والے مسافروں میں سے کبھی کبھی کچھ کے مقدر میں ہوتا ہے"۔ خواتین و حضرات بائیں کھڑکی سے دیکھئے نیچے دنیا کی پانچویں بلند ترین چوٹی راکاپوشی ہے"۔

راکاپوشی سر اٹھائے آسمان کی جانب نگراں ہے۔ راکاپوشی کا منظر دیدنی ہے۔ برف زاروں کی جوالا راکاپوشی۔ زمستان کا شعلۂ راکاپوشی ــــ نور ہی نور راکاپوشی حسن تمکنت اور تقدس کا پہاڑ اور پہاڑوں کی دلہن ــــ راکاپوشی۔ ہم جس کے سر پر سے گذر رہے ہیں مگر یوں لگتا ہے۔ پستی اور بلندی نے اپنے اپنے مفہوم ایک دوسرے سے بدل لئے ہیں۔ راکاپوشی آسمانوں سے اتر رہی ہے اور ہم زمین پر سر اٹھائے اسے نازل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ احساس ہوتا ہے۔ کہ آنکھ کتنی حریص، دل کتنا غریب اور روح کس قدر پیاسی ہے۔ کہ ایک پلک جھپکنے کا جرم زندگی بھر کی خلش بن سکتا ہے۔ میں کھڑکی سے چپک کر اس منظر کی آخری کرن بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جذبات کی تہذیب اور احساسات کی تزئین کا موقعہ ہے۔ قلب کی تسکین اور روح کی بالیدگی کا موقعہ ہے۔ فکر و وجدان کی آرائش و زیبائش کر لیں کہ شعور کی افزائش کا سامان سمیٹنے کا موقعہ ہے ــــ جی چاہتا ہے یہ نور یہ حرارت یہ روشنی یہ نکھار یہ حسن یہ تقدس یہ رفعت یہ وقار سب کچھ کشکولِ دل میں اتر آئے کہ زندگی مضمحل صبحوں اداس شاموں اور تاریک راتوں کا سفر ہے

"خواتین و حضرات دائیں کھڑکی سے آپ نانگا پربت چوتھی بلند ترین چوٹی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اسی چوٹی سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے سے گزر رہے ہیں۔ امید ہے۔ یہ منظر آپ کو پسند آئے گا"۔

میں اٹھ کر دائیں کھڑکی میں ایک خالی سیٹ پر بیٹھ کر نانگا پربت کا نظارہ کرتا ہوں۔ بادلوں کا ایک مہیب ٹکڑا نانگا پربت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ کوئی رقیب ہے۔ جل گیا ہے۔ نانگا پربت کو ڈھانپ لینا چاہتا ہے اور نانگا پربت کی جلوہ سامانیاں صرف اپنے لیے محدود رکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہم نے نانگا پربت کی مسکراہٹ آئینۂ دل میں اتار لی ہے۔

"خواتین و حضرات دائیں جانب دیکھئے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو آپ کو دعوت نظارہ دیتی ہے۔ ہم کے۔ ٹو سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر سے گزر رہے ہیں"۔

نیچے شاہراہ ریشم ــــ پاک سرزمین ختم اور چینی علاقہ شروع ہوتا ہے۔

جاپانی بیوٹی لڑکی نے کمبل اتار کر رکھا اور بیگ سے کیمرہ نکالا اور میری طرف بڑھایا اور کچھ کہا۔ جو میں فوراً سمجھ گیا۔ اور اس کے کیمرے

ہیں کے ٹو کا عکس اُتار کر کیمرہ اُسے واپس دیا۔ پھر کے ٹو کو دیکھنے لگا۔ کے ٹو مونٹ ایورسٹ سے تین سو فٹ کم بلند ہے۔ اس طرح یہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔ کیپٹن ٹی جے منٹگمری نے کوہستان قراقرم کا جائزہ لیتے وقت مختلف چوٹیوں کو ظاہر کرنے کے لیے کے ون، کے ٹو اور کے تھری کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ حرف "کے" برائے قراقرم ہے۔ باقی چوٹیاں دوسرے ناموں سے معروف ہیں۔ مگر کے ٹو کے لیے کوئی اور نام زبان زد عام نہ ہو سکا۔ جبکہ مقامی زبان میں کے ٹو کو چاگوری کے نام سے پکارتے ہیں۔ چاگوری کا مطلب پہاڑوں کا بادشاہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب دیر تک شکوہ اس چوٹی کا دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ "ناظر نظر برف پوش اونچے نیچے پہاڑوں کے درمیان کے ٹو کی عموداً اٹھتی ہوئی چوٹی کو آنکھ عظمت کے ایک نئے تناظر سے روشناس کرتی ہے۔ جو بسیط تنہائی سے ابھرتا ہے۔ بادشاہ شہنشاہ تو ان بلندیوں کے دامن اور پستیوں میں رعب اور دبدبہ کی سلطنت قائم کرتے ہیں۔ کے ٹو کی رفعت عظمت اور تنہائی کو دیکھ کر پیغمبر یاد آتے ہیں۔ اس کے نصیب ابھی کوئی بادل یا ابر پارہ نہیں۔ کے ٹو برف زاروں میں اداس پروقار ازل اور ابد کی تنہائیاں پہنے ہوئے ہے — ہمارے نیچے برف میں ایک لکیر شاہراہ ریشم — انسانی عزم و ہمت کا بے مثال کارنامہ — میری نظریں پھر کے ٹو کی طرف لپکتی ہیں۔ میں اس منظر کو کھونا نہیں چاہتا۔ مگر سفر کی ایک اپنی روشن ہے۔ مناظر گزرتے جاتے ہیں —

"خواتین و حضرات! اس وقت ہم چین کے صوبہ سنکیانگ کے دارالحکومت اورمچی پر سے گزر رہے ہیں۔ چینی وقت کے مطابق اپنی گھڑیوں میں تین گھنٹے وقت آگے کر لیجئے۔"

سنکیانگ جہاں چینی مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے۔

سیبوں کی بڑی تعداد ہے۔

اب نیچے پہاڑی علاقہ ہے کہیں کہیں برف اور جا بجا بادل، دھند، دھوپ میں اپنی سیٹ پر واپس آ گیا۔ میں نے گھنٹی دی اور ہوسٹس نے مسکرا کر حسب دستور پوچھا "چائے کافی"۔

"ابھی نہیں"۔ اور چند منٹ بعد وہ چائے دے گئی۔ چائے کا گھونٹ لے کر میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ نیچے کے منظر میں پہاڑ ہیں اور ان پر تیرتے ہوئے بادل۔ میں واپس راکاپوشی۔ نانگا پربت اور کے ٹو کی تنہائیوں۔ پاکیزگیوں اور فصیلوں کی جانب لوٹ گیا۔ کے ٹو نانگا پربت، راکاپوشی۔ قراقرم۔ قراقرم۔

نانگا پربت کے ٹو۔ راکاپوشی راکاپوشی .....

راکاپوشی۔ راکاپوشی۔ راکاپوشی۔ راکاپوش

کون سے کوہ ندا پر تجھ سے ہم کلام

کون سی تنہائیوں میں میرے ہوں گے روبرو

اک تلاش رائیگاں میں .....

اک تلاش رائیگاں میں اک مجرم بے اماں

کس طلب میں پھر اٹھے ہیں قتل گاہوں کو قدم
یہ سفر یہ راستہ . . . . .
یہ سفر یہ راستہ جانے کہاں لے جائے گا
کون سے پیڑوں پہ . . . . .
کون سے پیڑوں پہ نکلیں گے . . . . .
کون سے پیڑوں پہ نکلیں گے ــ ثمر . . . .
کون سے پیڑوں پہ نکلیں گے مرادوں کے ثمر
کس گلی میں کہکشاں سے ٹوٹ کر بکھریں گے ہم
کس نگر میں شام ہوگی کس ڈگر پہ روشنی
ہم تو ہر ساحل پہ اترے ہیں ستارہ دیکھ کر
کس نگر میں اِکائی کا نقشِ پارہ جائے گا
کون سے سنگِ ستم کا زخم ہوگا آخری
کون سی خواہش . . . . . .
کون سی خواہش کا ــ ہونے کے بعد
کون سی خواہش کا قتل ناروا ہونے کے بعد
کون سی زنجیر پہنیں گے رہا ہونے کے بعد
ایک دخترِ نامرادی اک ستارا شام کا
جلتا بجھتا دل میں شعلہ حسرتِ ناکام کا
ایک صورت اجنبی سی اور کچھ مانوس سی
تھرتھراتا ہے لبوں پہ حرفِ اوّل نام کا

"خواتین و حضرات، جہاز کا کپتان آپ سے مخاطب ہے۔ چند لمحوں بعد ہم بیجنگ کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ سگریٹ بجھا دیں اور حفاظتی بند باندھ لیں۔ اُمید ہے کہ آپ کا یہ سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔
شکریہ!"

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں اور منتظر ہوں کہ چین کی سرزمین پہلا واضح منظر کونسا آنکھ دیکھتی ہے۔ چین۔ ماؤزے تنگ کا دیس۔ چو، این، لائی کا وطن ــ ہیون سانگ کا دیس۔ کنفوشش کی سرزمین، دیوارِ چین والا ملک۔ میرے وطن سے عمر میں دو سال چھوٹا۔ میرے ملک سے کئی گنا رقبہ میں بڑا ملک۔ دنیا کی تیسری سپر پاور ــ چھوٹے قد اور گول گول سوتی سوتی سی آنکھوں والی زرد نسل کا وطن ــ جہاں

راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

بلندی کم کرتے جہاز کی کھڑکی سے جو پہلا واضح منظر دیکھا۔ ایک کھیت میں تین کسان ہیں۔ کچھ کچھ سائیکل سوار سڑک پر۔ پھر ٹرالیاں۔ ٹرک اور ٹریکٹر۔

جہاز سے اترے تو چینی محکمہ سیاحت اور فنون کے حکام نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ وی آئی پی لاؤنج میں پہنچے تو پاکستانی سفارت خانے کے اہل کاروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ لاؤنج خوب صورت اور کشادہ ہے اور دیواروں پر چینی روائتی مصوری اور خطاطی کے شہ کار آویزاں ہیں۔ جیسے ہی نشستوں پر بیٹھے ہمارے سامنے پہلے سے رکھے ہوئے چینی کے مگوں میں گرم پانی دو چینی لڑکیوں نے تھرماؤس ہی سے ڈالا۔ تقریباً چالیس سیکنڈ بعد باقاعدہ چینی میزبانوں نے مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگائے اور ہمیں بھی پینے کی دعوت دی۔ تو ایک پاکستانی سفارت کار نے میرے کان میں کہا۔

چائے پیجئے حضور۔ پتی تو کپ میں پہلے سے موجود تھی۔ البتہ دودھ اور چینی نہ پہلے ڈلی تھی نہ بعد میں ڈلے گی۔ بسم اللہ

سردی سے ٹھٹھرے ہوئے تھے۔ فوراً کپ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگایا اور گرم پانی نے ہونٹ جلائے تو بے ساختہ بسم اللہ نکلا۔ خدا جانے الحمد للہ اب کتنے دنوں بعد کہیں گے۔

تفصیلی تعارف شروع ہوا۔ نیلی جیکٹ نیلی پینٹ اور سر پر نیلی ماؤ کیپ۔ سب گول گول اور چھوٹے چھوٹے اور موٹے موٹے روشن آنکھوں اور تمتماتے چہروں والے چینی میزبان۔ چینی چائے کا پھر کپ اٹھایا۔ لبوں سے لگایا۔ برائے نام چسکی لی۔ اور واپس رکھ دیا۔ مگر پھر دوسرے گھونٹ کے لئے اٹھا لیا کہ سردی مجبور کر دینے والی تھی ریڈ فلیگ اور پیکنگ چینی گاڑیوں پر ہمارا قافلہ ریسٹ ہاؤس کی جانب چلا۔

ائر پورٹ سے نکلتے ہی کھیتوں اور دہقانوں کا منظر سڑک کے دونوں جانب ہے۔ شام کا وقت ہے اور سورج ہمارے بائیں سامنے سڑک کی سیدھ میں کہیں درختوں کی اوٹ میں ہے۔ اگر سڑک پر توجہ مرکوز رکھی جائے اور دونوں جانب کے مناظر ذہن سے نکل جائیں تو سڑک تزئین و آرائش اور کشادگی کی مماثلت سے زیرو پوائنٹ سے آب پارہ کی سی ہے۔ سڑک پر زیادہ تر آمد و رفت چینی بچوں کی پیدل اور بذریعہ سائیکل ہے۔ جو اسکول سے آرہے ہیں اور چینی لوگ دفاتر اور کارخانوں سے، ٹرک اور ٹرالیاں زیادہ ہیں۔ بسیں نمبر ۲ پر اور کاریں صرف جن پر ہماری سواری ہے۔ دو رویہ لگا ہوا درخت پاپولر ہے۔ البتہ خزاں کی وجہ سے ٹنڈ منڈ اور اسی حالت میں باغات بھی دونوں جانب ہیں۔ پیدل چلنے والے لوگ سڑک سے اتر کر اطراف ہی پر چلتے ہیں اور آپس میں گپ شپ کرتے ہوئے چلتے ہوئے کم دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں مرد و زن کی خاص شناخت نہیں۔ لباس ایک اور وضع قطع بھی ایک اور یوں لگتا ہے۔ اُن سب کو جہاں کہیں بھی جانا ہے۔ شام ہو جانے سے پہلے پہنچنا ہے۔ ابھی تک پیکنگ شہر کی آبادی شروع نہیں ہوئی۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا عجیب رومانٹک وضع کے ہیں ہاتھوں میں ہاتھ دیے دوسرے لوگوں سے ذرا دور ٹنڈ منڈ درختوں کے بیچوں بیچ چل رہے کوئی اُن میں ربط نہانی خاص ہے۔ یہ محسوس کر کے دل کو بڑا حوصلہ ہوا۔

پیکنگ شہر کی آبادی شروع ہو گئی۔ جو ماضی قریب میں پیکنگ تھا اور ماضی بعید میں جسے پنجاب کے وارث شاہ نے پیکین اور مراکش کے ابن بطوطہ نے پیکن لکھا۔ پنجابی شاعر کو تیلی پیکھے دی بڑی البیلی اور سجیلی لگی تھی اور مراکشی سیاح کو پیکن کے صورت گر بہت پسند آئے تھے۔

پیکنگ شہر میں سڑکوں پر سیلاب سائیکل سواروں کا اور فٹ پاتھوں پر بھیڑ لوگوں کی انارکلی کی سی ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ انارکلی

کی بھیڑ اپنی خوش رنگی اور خوش لباسی سے خوشگوار اور بیجنگ کی سڑکوں پر انسانوں کا انبوہ ایک لباس ایک چال ڈھال کی وجہ سے گھمبیر مگر پرشکوہ ہے۔

ائرپورٹ سے تقریباً چالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہماری گاڑیاں بڑی شاہراہ سے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سڑک پر مڑ گئیں اور ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا نیلے سوٹ اور ٹائی میں کامریڈ شان گویا ہوا۔

"صاحب یہ امید ہے کہ آپ لوگوں کو بیجنگ پسند آیا ہے۔ اس وقت شام کا وقت ہو رہا ہے۔ صبح جب ہوگی اور اجالا میں ہر چیز چمکے گی۔ تو آپ کو یہ بیجنگ اور بھی دلکش یعنی دل کو کھینچنے والا لگے گا۔"

"صاحب آپ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں آپ کو یہ رہائش گاہ بڑی پُرلطف لگتی ہے۔"

تب ہماری گاڑیاں ایک گیٹ میں داخل کر دائیں جانب ایک پارک نما احاطہ میں ایک چھوٹی سی سڑک پر رینگنے لگیں۔ پھر موڑ مڑا اور ایک کمان نما آہنگ پل سے گزر کر بائیں چکر کاٹ کر ایک اور ویسے ہی پل پر سے گزریں۔ دائیں مڑیں اور ایک پورچ میں رک گئیں۔ دو چینی لڑکیوں نے دروازے وا کر کے خوش آمدید کہا۔ پھر پہلے فلور پر ہماری رہنمائی ہمارے کمروں کی طرف کی گئی۔ نہایت کشادہ کمرے سرخ اور بھورے قالین۔ بیڈ شیٹ روایتی چینی سلک کے حریری پردے اور نفیس صوفے — خوب صورت ڈرائنگ روم اور ننھا سا آراستہ پیراستہ دفتر۔ ٹیلی فون ٹرانسسٹر رنگین ٹی وی اور فریج میں دفترانِ وزکے منجمد عنصرے عنوے اللہ اللہ سمجھ آئی کہ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے۔ اور باتھ روم کی جلوہ سامانیوں میں ابھی دیدۂ حیرت کھلا ہی تھا کہ کامریڈ شان ٹپک پڑا۔

"صاحب میرا خیال ہے۔ آپ کو یہ جگہ کافی پسند آئی ہے۔ جلدی کیجئے کھانا لگ گیا ہے۔"

آپ کا خیال درست ہے۔ کامریڈ شان اسی لئے تو آئینہ میں اپنا کمالِ جلال و جمال تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا بس چلتے ہیں۔

"آپ جلدی جلدی آجائیے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اور کامریڈ چلا گیا۔ گرم گرم پانی سے منہ دھویا۔ آنکھیں صاف کیں۔ بال سنوارے۔ ہاتھی دانت کی کنگھی تھی۔ بڑی پیاری کنگھی اتنی نفیس کنگھی تھی کہ بال بناتے ہوئے سامنے آئینے میں دیکھا تو اپنی بجائے خاقان خاور اور جلیل عالی کے عکس دکھائی دیتے تھے۔ ڈائننگ ہال کو جاتے ہوئے در و دیوار کی رونقوں کے لیے داد بے ساختہ نکلی۔ سادگی اور پرکاری میں خراماں انسان بھی پروقار بن جاتا ہے۔ دیویاتائی اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس باہر سے جتنا خاموش خاموش اور اداس سا ہے۔ اندر سے اتنا ہی متاثر کرنے والا ہے۔

کھانے پر بیگم ارباب نیاز ارباب نیاز آغا ناصر اور حبیب الرحمٰن اور چینی میزبان تیار تھے۔ کھانے کی گول میز کے گرد کرسیاں اور میز پر ایک گول گھومنے والا تختہ جس پر کھانے سجائے جاتے ہیں چینی لڑکیوں نے کھانا دینا شروع کیا۔ لڑکیوں کا کھانا کھلانا پرانی چینی روایت مہمان نوازی ہے اور مخ جوس اور سوڈا گلاس میں لڑکیوں نے ڈالا اور کھانے کا پہلا کورس شروع ہوا۔ ہم سب نو وارد سفارت کار حبیب الرحمٰن کی جانب دیکھتے۔ وہ اشارہ کرتا۔ اور ہم تناول فرمانے لگتے۔ ایک کورس دو کورسز پھر کئی کورسز۔ خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا۔ اور نقل مارنے سے فرصت ملی تو سیب۔ کینو اور کیلے کھائے۔ کیلے ہری چھال کے مگر چھوٹے سائز کے۔ کینو مزیدار سے۔ مگر سیب لذیذ خستہ اور شیریں تھے۔ سب نے ایک کی جگہ دو۔ دو تین تین کھائے۔ کہ بھوک مٹانے کا یہی طریقہ تھا اور یہ دریافت کرنا آداب کے منافی تھی کہ چنگوا راولپنڈی می کانگ اور شنگھائی لاہور والے چینی ہوٹلوں میں ملنے

والے چینی کھانے کب دیں گے۔ پھلوں میں ہماری اس قدر دلچسپی سے متاثر ہو کر چینی میزبان خاتون مادام چنگ نے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ کامریڈ شان نے کیا۔

"صاحب آپ کو پھل شاید زیادہ پسند آتے ہیں"۔

"ہاں ہم کھانے کے بعد پھل فروٹ ضرور کھاتے ہیں۔ ارباب نیاز نے کہا۔

کھانے کے بعد فوراً ہمیں پیکنگ کے کیپٹل تھیٹر لے جایا گیا جہاں ہم نے شاہراہ ریشم (سلک روٹ) بیلے دیکھا۔ پس منظر یوں ہے۔ تانگ خاندان (۹۰۷-۶۱۸) عیسوی میں چین کے ایک استاد مصور یانگ نے ایک ایرانی تاجر اینس کو شاہراہ ریشم کی کٹھنائیوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جانے سے بچایا۔ اس طرح وہ دونوں دوست بن گئے۔ مصور یانگ کی ایک بیٹی حادثے میں کھو گئی تھی۔

پہلے سین میں مصور یانگ نے اپنی گم شدہ بیٹی کو دن ہانگ کی منڈی میں دیکھا۔ ایک تھیٹریکل کمپنی میں ایک غلام رقاصہ کے روپ میں۔ سوداگر اینس نے معاوضہ دے کر یانگ کی بیٹی ینگ نیانگ کو آزاد کرا لیا۔

دوسرے سین میں دکھایا گیا کہ مصور یانگ نے دن ہانگ کی غاروں میں بہت ساری رقاصائیں پینٹ کی ہوئی ہیں۔ ان سب میں اُس نے اپنی بیٹی کی شباہت دہرائی ہے۔ ایک بدمعاش مجسٹریٹ ینگ نیانگ لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یانگ بجائے اپنی لڑکی حاصل کرنے مجسٹریٹ کے ہتھکنڈوں میں پھنس جاتا ہے۔ اور اپنے دوست اینس سے التجا کرتا ہے کہ وہ اُس کی بیٹی کو اس مصیبت سے دور ایران اپنے ساتھ لے جائے۔ بدمعاش مجسٹریٹ غصے میں یانگ کو زنجیریں ڈال کر غاروں میں بند کر دیتا ہے اور سزا کے طور پر میورل پینٹ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

تیسرے سین میں دکھایا گیا ہے کہ ینگ نیانگ کافی عرصہ سے ایران میں رہ رہی ہے اور اُس نے اپنے بہت سارے دوست بنا لئے ہیں۔ اور بہت سارے کرتب بھی سیکھ لیے ہیں۔ دریں اثنا اینس کو سفیر بنا کر چین بھیجا جاتا ہے اور وہ ینگ نیانگ کو بھی اس کے وطن واپس لے آتا ہے۔

چوتھے سین میں مصور یانگ کو بے انتہا پریشان دکھایا گیا ہے۔ وہ بے تاب و بیقرار ہے۔ اپنی بچی کے فراق میں اور اپنی تخلیق کی ہوئی جنت میں اُسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ایک فوجی گورنر اس غار کی سیر کو آتا ہے اور یانگ کے فن میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ یانگ سے روا رکھی گئی زیادتی کا ازالہ کرتے ہوئے آزاد کر دیتا ہے۔

انٹرول ہو گیا اور ہمیں تھیٹر کے لاؤنج میں چائے دی گئی آغا ناصر اور میں چینیوں کے فن تمثیل کی مہارت کے سحر میں کھوئے کھوئے سے تھے۔ پردہ کیا اُٹھا تھا۔ نظروں میں ایک نیا افق روشن ہو جاتا تھا۔ حیرت کا باب کھل جاتا تھا۔ سیٹ ڈیزائننگ میں چینی کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ رنگ اور روشنی کا تناسب اور امتزاج دیدنی تھا۔ اور اداکاروں کی ہنرمندی دم نہیں مارنے دیتی تھی۔ ایک سین سے دوسرے سین کے درمیان مشکل ایک منٹ کا وقفہ اور اس قدر سرعت سے سیٹ بدلتا ہے کہ تماشائی دنگ رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی یہ کھیل گذشتہ چھ ماہ سے چل رہا تھا۔ اور آج بھی ہال لبالب بھرا ہوا تھا چینی رقاص لڑکے اور لڑکیاں تو جیسے آتش بجاں تھے اُن کے ملبوسات زیورات حرکات و سکنات ترتیب و تنظیم ورطۂ حیرت میں ڈالتے ہیں۔

پانچواں سین شروع ہوا بدمعاش مجسٹریٹ نے اپنے ٹولے کے ساتھ سوداگر اینس کو مارنے کی سازش کی۔ یانگ نے مشعل جلا کر

اینس کو بچانے کی کوشش کی مگر اپنی زندگی دوستی پر قربان کر گیا۔

ساتویں سین میں فوجی گورنر نے ون ہانگ میں ۲۷ ملکوں کے مہمانوں کے استقبال میں ایک پارٹی دی۔ جس میں ینگ نیانگ بھیس بدل کر آئی۔ اور رقص کرنے کی پیش کش کرتی ہے اور اپنے فن کے ذریعے مجسٹریٹ کی بدمعاشی آشکار کرتی ہے مجسٹریٹ گرفتار کیا جاتا ہے اور یوں شاہراہ ریشم کا ایک خفیہ خطرہ ختم ہوتا ہے۔ اختتام میں میزبان اور مہمان ایک دوسرے کے لئے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور الوداع کہتے ہوئے چینی عوام کے ساتھ دوستی کے فروغ کی امید کرتے ہیں۔

چینی ہنرمندوں کے فن نے ایک عجیب سی فرحت سے ہمکنار کر دیا تھا۔ کہانی کا تسلسل اور روانی جس طرح رنگ و نور کے زیر و بم سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ اس کا ایک جادو تھا۔ جس نے ہمیں مبہوت کر دیا تھا۔

باہر نکلے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

اندو۔ یہ آواز میرے قریب سے آئی۔

اندو۔ پھر یہ آواز سنائی دی تو میں سنبھلا۔ ایک چینی لڑکی ایک دوسری لڑکی سے میری طرف اشارے کر رہی ہے۔

اندو۔ اس نے تیسری بار کہا تو میں چوکنا ہوا۔ کامریڈ شان سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ مجھے ہندوستانی کہہ رہی ہیں کامریڈ شان اسے کہو۔ میں پاکستانی ہوں۔ مسلم ہوں۔

نہیں جناب وہ خدوخال کے لحاظ سے یوں کہہ رہی ہے۔ کامریڈ نے مجھے تسلی دی۔ کامریڈ اُسے کہو کہ یہ خدوخال پاکستانی ہیں۔

کامریڈ شان گیٹ تک بھاگتا ہوا اُن لڑکیوں تک گیا اور انھیں بتا کر واپس آیا۔

ٹھیک ہے؟ کامریڈ نے کہا۔

بالکل ٹھیک ہے کامریڈ۔

——— واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے تکان سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ گرم گرم پانی سے نہائے۔ پھر اُسے یاد کیا جو کبھی نہیں سوتا اور سو گئے۔

۱۳ نومبر کی صبح جلدی بیدار ہو گیا اور مغربی کھڑکی کھول کر۔ باہر جھانکا تو سوائے درختوں کے جنگل کے اور کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ تیار ہوئے اور ناشتہ مل کر کیا۔ اور پیلس میوزیم کی سیر کو روانہ ہوئے۔ سائیکلوں کا سیلاب ہر گلی اور ہر سڑک پر جتنی بڑی سڑک ہے۔ سائیکلوں کا سیلاب اتنا ہی تند و تیز ہے۔ ہم پرانے بیجنگ شہر میں سے گزرتے ہوئے ایک خندق کے پل پر سے گزر کر ایک پُرشکوہ دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ یہ پیلس میوزیم ہے۔ کیمرے گلے میں لٹکائے ہوئے دیس دیس کے سیاح مرد و زن کا ایک ہجوم ہے۔ جو اس عظیم الشان میوزیم کو دیکھنے آیا ہے۔ چینی مرد و زن کی بھی کافی تعداد ہے۔ مرد تو قومی لباس میں ہیں۔ مگر عورتیں اور بچے مختلف لباسوں میں ہیں۔ پیلس میوزیم محلات کا ایک سلسلہ ہے۔ جسے چینی سانگ اور کنگ خاندانوں نے اپنے اپنے عہد میں آگے بڑھایا ہے۔ یوں اس قصر آباد کا معمار صدیوں کا تسلسل ہے۔ عرف عام میں پیلس میوزیم کو شہر ممنوعہ (FORBIDDEN CITY) کہتے ہیں اور اس کی تاریخ پانچ صدیوں پر محیط ہے۔ ۱۴۰۶ء میں منگ شہنشاہ ینگ لو کے زمانے میں ۲ لاکھ مزدوروں نے اسے پندرہ سال میں مکمل کیا۔ اس میوزیم کا رقبہ ۷۲۰۰۰۰ مربع

میٹر اور ۱۵۰،۰۰۰ مربع میٹر رقبہ پر حصہ تعمیر ہے۔ یہ دس میٹر اونچی فصیل کے اندر ہے اور فصیل کے باہر ۵۲ میٹر چوڑی خندق ہے۔ پیلس میوزیم میں تقریباً ۹،۰۰۰ کمرے ہیں اور اس کا لے آؤٹ جیومیٹریکل ہے۔ اور خوب گٹھا ہوا ہے۔ محلات کی یہ کہکشاں قدیم چینی طرزِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔

پیلس میوزیم عقبی اور پیشی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ سامنے کے حصے میں تین بڑے ہال ہیں۔ جن کو سپریم ہارمنی کمپلیٹ ہارمنی اور پری زرونگ ہارمنی ہال کہتے ہیں۔ سپریم ہارمنی ہال باقی دو سے بہت زیادہ خوش نما ہے۔ یہاں بادشاہ کی رسم تاجپوشی۔ سالگرہ جشنِ سالِ نو اور دوسری اہم تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ اسے طلائی تخت والا ہال بھی کہا جاتا تھا۔ اس محل کے تین عالیشان دروازے ہیں۔

عقبی حصے میں بھی تین محل ہیں جن کو قصرِ جنت، قصرِ اتحاد اور قصرِ سکون کہتے ہیں۔ اس کے مغرب میں چھ محل ہیں اور چھ مشرق میں یہ شہنشاہ اور اس کی داشتاؤں کے لئے ہیں۔

پیلس میوزیم میں چینی تہذیب و تاریخ اور ثقافت کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ آلاتِ حرب، ملبوسات، زیورات، مصوری اور خطاطی کے شاہکار، دھات اور پتھر کے مجسمے۔ ظروف، قالین اور تخت و تاج نہایت عمدہ طریقے سے نمائش کے لیے سجائے گئے ہیں۔ حکمرانوں کو ایک محل سے دوسرے محل تک لے جانے کے لیے کرسی نما سواری ہے۔ جیسی مرزا غالب کے زمانے میں پینس ہوا کرتی تھی جسے کہار اٹھا کر چلتے تھے۔

بادشاہ کی شب بسری کے لیے حفاظتی اقدامات کے طور پر ایک ہی نمونے کی ایک ہی جیسے سامان سے آراستہ ۲۷ خواب گاہیں ہیں۔ تاکہ رات کو بادشاہ کس خواب گاہ میں ہے یہ پتہ نہ چل سکے۔ ویسے بھی یہ شہنشاہیت کی عالمگیرانا ہے کہ وہ اپنی مملکت میں ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس چاہتی ہے۔ اپنی رعایا کی ہر خواب گاہ اور اُن کے خوابوں تک میں اپنی موجودگی چاہتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب کبھی رعایا مہم جوئی پہ اترتی ہے تو ان خوابوں کی سرنگوں میں سے ہوتی ہوئی شہنشاہوں کو زمین کی پاتال میں سے بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔

محلات کا ماحول بھی کرۂ ارض پہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ جو ایک ہی طرح کی سازشیں جنم دیتا ہے اور جب ان سازشوں میں سازشیوں کی تمام عقل خرچ ہو جاتی ہے تو یہ محلات عوام پر اپنے دروازے کھول دیتے ہیں۔

ان محلات میں ایک شہنشاہ نے اپنے بے شمار بیٹوں میں سے نمبر ۱۴ کو اپنا جانشین بنانا چاہا اور اُس کا نمبر ۱۴ لکھ کر چٹ تخت کے پیچھے آویزاں ایک خطاطی کی اوٹ میں صندوقچی میں ڈال دی۔ نمبر ۱۴ کو تو خبر نہ ہوئی۔ البتہ نمبر ۴ نے ہشیاری سے اس چٹ پر ۱۴ کا ایک غائب کر دیا اور باپ کی وفات کا انتظار کرنے لگا اور بالآخر شہنشاہ بن ہی گیا۔ اسی سلسلۂ محلات میں ایک ملکہ کو زندہ کنویں میں دھکیلا گیا۔ کنویں پر تختی لگی ہے۔

پورے میوزیم میں نیلا، سبز، گہرا سبز اور مٹیالہ رنگ کثرت ملتا ہے۔ اب سرخ ان سب پر حاوی ہے۔ جو انقلاب کے بعد داخل ہوا ہے۔ سرخ کی زیادتی سے باقی رنگوں کا حال وہی ہے۔ جو فاتح کے سامنے مفتوحین کا ہوتا ہے۔

اس میوزیم کی سیر کے لیے بہت ہی زیادہ وقت درکار ہے۔ وقت جو ۱۹۱۱ء میں اس شہرِ ممنوعہ کے عقبی حصہ کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ اور منگ شہنشاہ نے انقلابیوں کے نعرہ ہائے حریت کے ہانکے میں خودکشی کا ہی راستہ اپنایا۔ چینی حریت پسندوں کی تصاویر

جو معاصر چینی مصوروں نے تخلیق کیں۔ یہاں آویزاں ہیں۔ اس شہرِ ممنوعہ کا جنوبی حصہ اب سرکاری دفاتر میں بدل گیا ہے اور برلب سڑک تیئن من TIAN - AN MEN واقع ہے۔ جس کی محراب میں چیئرمین ماؤ کھڑے ہو کر اہلِ وطن کو خطاب کرتے تھے اور ہم تصویریں دیکھا کرتے تھے۔ اب اس پر چیئرمین کی ایک تصویر آج بھی ویسے ہی لگی ہے اور ہم نے پورے دورۂ چین میں صرف یہاں ہی ایک تصویر دیکھی ہے۔

پیلس میوزیم کی فصیل کے بیرونی حصے میں مختلف قسم کے پوسٹر دیکھے تو استفسار کرنے پر محرم راز نے بتایا کہ رات کے پردے میں کچھ لوگ ناپسندیدہ اشتہار بھی لگا جاتے ہیں۔ یا نعرے لکھ جاتے ہیں۔ ہمیں وطنِ عزیز کے ایک صدرِ محترم بہت یاد آئے جو رات کی تاریکی میں اپنی سرکاری رہائش گاہ کی بیرونی دیوار پر اپنی رہائی کا مطالبہ لکھتے پائے گئے تھے۔ دروغ بر گردنِ راوی۔

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس واپس آئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور وضو کر کے نمازِ جمعہ ادا کرنے پیدل بیجنگ کی مسلم آبادی کے علاقہ نیوچے پہنچے۔ مسجد ایک عام سی روایتی چینی عمارت ہے۔ اس کے رنگ و روغن بھی روایتی چینی ہیں۔ مسقف حصہ میں قبلہ کی جانب ایک بڑی سی محراب ہے جس میں روایتی منبر ہے۔ قبلہ والی دیوار پر پوری چوڑائی میں سورۂ حشر کی کچھ آیات لکھی ہیں۔

مسجد کا فرش چوبی ہے۔ صف بندی کے لئے قالین اور سجدہ کے لیے جگہ خالی امامِ مسجد خطبہ پڑھ رہے تھے۔ جب ہم پہنچے۔ عصا تھامے ہوئے منبر پر کھڑے تھے۔ سر پر پگڑی تھی داڑھی مختصر مگر آواز بلند اور بارعب تھی۔ جماعت کھڑے ہونے تک تمام مسجد خاکِ حرم سے آشنا چینی ہندی، عربی، پاکستانی، افریقی جینیوں سے بھر گئی۔ جو سجدہ کرتے وقت چوبی فرش سے ٹکراتیں تو بڑی ولولہ انگیز آواز گونجتی۔ الحمد للہ رب العالمین ھا الرحمٰن الرحیم ھا مالک یوم الدین ھا ——— بعد میں پوچھنے پر پتہ چلا کہ ھا معنی فل سٹاپ ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ والتین پڑھی گئی جس میں انسان کو بہترین سانچے میں پیدا کرنے کے بارے میں خدائے پاک نے فرمایا ہے۔ نماز ختم ہوئی۔ چینی میں دعا ہوئی اور ہم نے آمین کہا۔ امام صاحب سے ملاقات ہوئی سب سے گلے ملے۔ اربابِ نیاز نے اس مسجد کے لیے قرآنِ پاک کا ایک نسخہ عطیہ دیا۔ امام صاحب نے آنکھوں سے لگایا۔ چوما اور پھر ایک بار سب سے گلے ملے۔

امام صاحب کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرکردہ ممبر ہیں۔ اور یہ مسجد ایک ہزار سال پرانی ہے۔

مسجد سے واپسی پہ پھر وہی سڑک کنارے بھیڑ اور سڑک پر سیلاب سائیکلوں کا۔ شام سمے یہ منظر کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ جس میں تنظیم، ترتیب، یک جہتی، اور عزمِ منزل سب مل کر ایک دبدبہ پیدا کرتے ہیں۔ میں نے اپنے چینی میزبانوں سے کہا۔

"اے کامریڈو تم خواہ مخواہ ایٹم اور ہائیڈروجن کی بازی میں الجھ رہے ہو۔ ریگن اور برزنیف کو یہ منظر سائیکلوں کا دکھا کر کہہ دو کہ اس سیلاب کا رُخ ماسکو اور نیویارک کی جانب ہے۔ تو یقین جانو ان کے اندازے تمہارے بارے اور شاندار ہو جائیں گے۔"

چینی میزبانوں نے خوب خوب داد دی اور جگہ جگہ میرا فرمودہ دہراتے تھے۔ سائیکلوں کے علاوہ ایک اور شئے جو جا بجا دیکھی۔ بلکہ بے جا دیکھی وہ گوبھی کی کثرت تھی۔ میرا خیال ہے۔ وہ بند گوبھی اور پھول گوبھی طرح کی کوئی تیسری قسم ہے۔ گوبھی کی۔ بڑے بڑے پتوں والی۔ ڈھیروں کے ڈھیر گوبھی کے۔ بیجنگ میں کوئی شئے سرِعام گندگی پھیلاتی دکھائی دیتی ہے تو وہ گوبھی ہے۔ دکانوں پر گوبھی۔ عالی شان اپارٹمنٹس کی ریلنگ پر لٹکی ہوئی گوبھی، سائیکلوں کے کریئرز میں ٹکائی ہوئی گوبھی، ہاتھوں میں گوبھی اور کسی کسی جیپ میں بھی گوبھی۔ کھانوں

میں گوبھی کے روپ بہروپ گویا گوبھی چینیوں کی قومی پسند ہے۔ علامہ اقبالؒ کے ملازم علی بخش بہت یاد آئے جنھوں نے مولانا گرامی کو بھگا دیا صرف یہ کہہ کر کہ "آج بھی گھر میں گوبھی پکی ہے"۔

گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ جھٹ پٹ کمرے میں آئے۔ جرسی اتار کر پھینکی۔ بوٹ اتارے اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا اور اصنام خیالی کے حلقۂ خوش کن میں ابھی بیٹھا بھی نہ تھا کہ انگریزی مترجم پیچھے پہنچ گئی اور سامنے صوفے پر بے حال ہو کر گرتی ہوئی بولی۔

چینی ثقافتی ٹیم سے مذاکرات چند منٹ بعد شروع ہونے والے ہیں۔

چند منٹ بھی بہت ہیں۔ میں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں ۔۔۔ کے ٹو، نانگا پربت، راکاپوشی، گلگت، ہنزہ، سوات اسلام آباد، شکر پڑیاں، فیض آباد، مری روڈ اور دائیں ہاتھ سکستھ روڈ۔

"چار منٹ ہو گئے"۔ انگریزی مترجم بولی۔

میں نے بے دلی سے آنکھیں کھولیں۔ اُس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ بھی کسی خواب کی دھند میں دھندلایا ہوا تھا۔

ٹھیک ہے۔ میں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔ بس آرہا ہوں۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی چلی گئی۔

گراؤنڈ فلور پر کانفرنس ہال میں لمبی میز کی ایک طرف چینی ثقافتی ٹیم اپنے وزیر کے ساتھ اور دوسری طرف ارباب نیاز آغا ہمر افضل، قادر، حبیب الرحمن اور راقم۔ میز پر چینی چائے کے کپ جن میں ہمارے بیٹھتے ہی گرم پانی ڈال دیا گیا۔ بعد میں پیٹری آئی اور مذاکرات شروع ہوئے دونوں جانب سے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار۔ نئے عزائم نئے ارادے اور نئی توقعات۔ گپ شپ۔ پھر حبیب الرحمن نے بروشر کا سودیز چینی ٹیم کو بانٹا جس میں خاکسار کے بارے میں معلومات اور کچھ تخلیقات کے عکس تھے۔ نہایت اچھا موسم، نہایت اچھی گفتگو، اکسانے والی چائے اور بہلانے والی پیسٹری۔ انگریزی میں ہماری جانب سے گفتگو، اور انکی طرف سے چینی میں۔ اُن کی طرف سے انگریزی بولی گئی تو صرف ایک خاتون نے بولی۔ جو وزیر ثقافت چین کی پرائیویٹ سکریٹری اور انٹرپریٹر تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے مذاکرات اتفاق رائے اور بزنجاست۔

نئی انگریزی مترجم کا لہجہ اور وکیبلری بڑی شاندار تھی شکل بڑی دلپذیر اور عمر بڑی ہلاکت خیز الغرض فتنۂ شہر نہ سہی فتنۂ محکمۂ ثقافت چین ضرور تھی۔ پس عرض کیا ارباب نیاز کے کان میں "خاں صاحب انگریزی کتنی اچھی ہے اس کی!"

"او یار او ونڈرفل بالکل ایئر ہے یہاں"۔ خاں صاحب ایک دم بولے۔

"چینی تو لگتی نہیں بالکل جاپانی ہے"۔ آغا ناصر بولے۔

صد شکر کہ سارا وفد متفق تھا۔

رات کو چینی نائب وزیر اعظم نے پاکستانی ثقافتی وفد کو عشائیہ دیا۔ یہ تقریب گریٹ ہال آف دی پیپلز میں منعقد ہوئی۔ گریٹ ہال ایک وسیع و عریض کمپلکس ہے۔ نیچے اکیس ہال ہیں اور ایک ایک ہال اتنا بڑا ہے۔ جتنا پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس ہال اس کے علاوہ دفاتر، غسل خانے اور دیگر کمرے کتنے ہیں۔ معلوم نہیں ہے اور کتنے ہال اور کتنا کیا کیا اوپر ہے۔ اوپر والا ہی جانے۔ اس کی تعمیر جدید طرز کی ہے۔ آئینے جیسے چمکتے دمکتے فرش چیپس سے مزین اور یوں مہذب کئے ہوئے کہ ذرا سی بے دھیانی سے پاؤں پھسل جاتا ہے دیواروں کے رنگ دھیمے اور خوشگوار، نفیس چینی پردے، عمدہ لکڑی کا منقش فرنیچر، عدیم النظیر فانوس، دیواروں پر چینی

روایتی مصوری اور خطاطی کے شہکار آمنے سامنے اپنے سائز اور طرزِ نمائش میں چینی مہارت اور ذوقِ جمال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یہ گریٹ ہال بھی دس ماہ کی مدت میں چھت تک تیار ہوا۔ اور جدید چین کے آٹھ عجائب میں شمار ہوتا ہے اور یہ ایک لاکھ مزدوروں کی انتھک محنت کی منہ بولتی مثال ہے۔ تمام سرکاری تقریبات اسی جگہ منعقد ہوتی ہیں۔

کھانا شروع ہوا کثرتِ خورد و نوش میں لذتِ کام و دہن نے صحت پر تو خوشگوار اثرات ضرور چھوڑے ہوں گے مگر حافظہ کمزور ہو گیا۔ اس لئے کھانے کے کتنے کورس چلے یہ یاد نہیں ہے۔ انسان کھا کھا کر پی پی کر تھک جاتا ہے۔ ٹھنڈے یخ جوس کے گھونٹ پر دوسرا گھونٹ دھواں دیتے سوپ کا اور اس پر مٹھائی کا نوالہ جو ابھی حلق میں ہو اور گرم تلی مچھلی کا منہ میں۔ قصہ مختصر کھا کر پیو اور پی کر کھاؤ۔ گرم اور سرد نرم اور سخت سب نگلتے جاؤ بے دھڑک اپنے معدے سے مخاطب ہو کر ؎

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہاں تک کہ کھا کھا کر تھک جاؤ اور پکارنے لگو کہ کامریڈ و تم اگر کسی کام میں وقت کا زیاں کرتے ہو تو کھانے میں ـــ کھانے کی اقسام اور کثرت اور مہمان نوازی کا ساتھ ہم گرتے پڑتے دیتے رہے۔ آغا ناصر نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کاش ہمارے ساتھ اس وفد میں دو ایک مولوی حضرات بھی ہوتے۔"

ارباب نیاز نے آغا ناصر سے اتفاق کیا "بالکل ٹھیک۔"

پھر اپنی بیگم سے مخاطب ہوئے۔ عینک اتار کر۔

"موٹاپے کو روکنے کے لئے کھانے سے ہاتھ روکنا پڑتا ہے۔"

بیگم ارباب سادہ سی خاتون ہنس پڑی اور کھانے سے ہاتھ چھوٹ گیا۔

پھر جامِ صحت نوش ہوئے اور ارباب نیاز نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی اور کہا۔ میں تقریر اردو ہی میں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اردو کا مترجم ادھر دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے انگریزی میں کرتا ہوں۔ اس بات پر نائب وزیر اعظم نے اپنی ٹیم پر ایک ناپسندیدہ نظر ڈالی۔ پھر ارباب نیاز تقریر کرتے رہے اور چینیوں کے نچلے درجے کے افسران میں تشویشناک کانا پھوسی ہوتی رہی۔ میں نے اور آغا ناصر نے بھانپ لیا کہ آج ایک دو چینی افسر ضرور کلچر سے ایگریکلچر میں پہنچ جائیں گے۔

"آج کامریڈ شان کی خیر نہیں۔" آغا ناصر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

میں نے اُسے پوچھا تھا تو وہ یہ کہتا تھا مجھے بلایا ہی نہیں۔ میں نے کہا۔ ویسے اُس کا کچھ کرنا چاہیے۔ نزلہ اس پر گرے گا۔

اور پھر ہم نے ارباب نیاز سے یہ اندیشہ ظاہر کیا تو وہ نہایت خوبصورت طریقے سے کامریڈ شان کو بچا گئے۔ باہر نکلے۔ تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ اور سڑکوں پر انسان بہت کم رہ گئے تھے۔ گاڑیوں میں بیٹھے اور گیسٹ ہاؤس روانہ ہوئے۔

پیلس میوزیم یعنی شہرِ ممنوعہ کی جنوبی دیوار پر برابر سڑک تیان من ہے۔ تیان من کے سامنے سڑک کے پار ایک کھلا میدان ہے۔ میدان کے درمیان عوامی ہیروز کی یادگار ہے۔ یادگار کے عقب میں چیئرمین ماؤ میموریل ہال (مقبرہ) اُس کے عقب میں کیان من یعنی پرانے جینگ شہر کی فصیل کا ایک دروازہ ہے۔ بائیں ہاتھ گریٹ ہال اور داہنے ہاتھ مہذری میوزیم ہے۔ اس سارے علاقے کو عرفِ عام میں ریڈ سکوائر یا ریڈ اسکوائر بھی کہتے ہیں۔ عوامی ہیروز کی یادگار کے قریب میں چلتی گاڑی میں سے دیکھتا ہوں معمولی روشنی ہے۔ باقی گھپ اندھیرا

چیئرمین ماؤ ہال کا ہیولا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ماؤ گہری نیند سو رہا ہو آسمان کی گہری کالی چادر اوڑھ کر جس پر چاند ستارے دمکتے ہیں۔ میرے دل میں کوئی آواز جاگی۔ باہر اندھیرا ہے۔ اندر بھی روشنی نہیں مگر اجالا ضرور ہے۔

واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ گرم پانی کا غسل کیا پھر آغا ناصر اور حبیب الرحمٰن آ گئے۔ گپ شپ ہوتی رہی یہ حبیب الرحمٰن جو پاکستانی سفارت خانے کا بکنڈ سکریٹری ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ شروع شروع میں مجھے اور آغا ناصر کو یہ عجیب الخلقت چیز بڑی پراسرار سی لگی تھی۔ چھوٹا قد جلا ہوا گندمی رنگ سر پہ بال بس بال بال بچے ہوئے چھوٹی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں گول گول اور اوپر نوکدار بھنویں درمیانی ناک اور مونچھیں قابل اعتراض قسم کی، گول چہرہ، چھوٹے چھوٹے بازو، موٹے ہاتھ، موٹی توند اور ٹانگیں بس ٹانگیں ہی تھیں۔ گردن کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ وہ تھی ہی نہیں۔ پیچھے سے چلتا دیکھیں تو لڑھکتا دکھائی دیتا تھا اور آتا دکھائی دے تو خنجر لہراتے ہوئے کسی قاتل کا شبہ ہوتا تھا۔ دو دن میں ایسا گھل مل گیا اور ایسا کھلا کہ بند ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ فریج کھول کر کہنے لگا۔

یہاں سے کوئی چیز نہ چکھنا نہ پینا۔ یہ سب بدبودار ہیں۔ ویسے بدبو گوارا ہو تو بھی ایک دوسرے کو گواہ نہ بنانا۔

فریج بند کر یار۔ پہلے ہی تمہاری بدبو کافی ہے۔ آغا ناصر بولا۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ زور کس پر ہے یہ پر۔

حبیب الرحمٰن نے آنکھ میچ کر کہا۔

حبیب الرحمٰن بڑے مزے مزے کے چٹکلے سناتا رہا۔ بیجنگ اور چین کے دیگر شہروں میں پاکستانی طالب علم لڑکوں اور لڑکیوں کے مشاغل کے بارے میں اپنی معلومات کے خزانے لٹاتا رہا۔ اور چینی زبان اُس نے کس طرح سیکھی ہے۔ یہ معرکہ بیان کرتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چینی عورتوں کی جسمانی ساخت پر لکچر دینے لگا تو آغا ناصر اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا میرے کمرے سے لے گیا جاتے جاتے حبیب الرحمٰن نے میری طرف دیکھا اور سینہ پھیلا کر بولا۔

دیکھا باقی باتیں اب یہ مجھ سے اپنے کمرے میں سنے گا

میں نے کپڑے بدلے بستر پہ دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ تب اُس کا نور میری روح میں پھیل گیا جو نور ہے زمین اور آسمانوں کا۔

۱۴ نومبر کے ناشتے کے بعد ارباب نیاز بیگ اپنی بیگم کے ایک گلاس فیکٹری دیکھنے چلے گئے۔ آغا ناصر نیف ڈیک کے چکر میں اپنی منزل کو اور میں مادام چنگ اور کامریڈ شان کے ساتھ نیشنل آرٹ گیلری بیجنگ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ہم ایک ڈپارٹمنٹل سٹور اترے۔ جہاں سے میں نے کیمرے کے لیے فلم خریدی۔ کچھ سگریٹ لیے۔ کرنسی وغیرہ تبدیل کرائی۔ نیشنل آرٹ گیلری پہنچے تو چینی مصوری کی ایک شاندار نمائش زوروں پر تھی۔ تقریباً دو سو کے لگ بھگ نئے شہکار تھے۔ جن میں روایتی چینی مصوری بھی اور جدید چینی مصوری بھی ہے۔ چینی مصور مرد و زن سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ چائے پی اور تصاویر دیکھنے لگے۔ آج موسم سخت سرد ہے اور نیشنل گیلری کے کشادہ ہالوں میں یہ شدت اور بھی محسوس ہو رہی ہے۔ مترجم شان شاہراہِ ریشم کی تعمیر کے دوران گلگت ہنزہ وغیرہ میں رہا اور یہیں سے اس نے اُردو سیکھی بعد میں اسلام آباد میں کوئی کورس بھی کیا۔ مگر سڑک کی تعمیر کے دوران ہی اُسے یہ آتے آتے آنی والی زبان

سیکھنے کا موقع ملا۔ بعد میں وہ اردو ناولوں کی مدد سے اردو کی مشق کرتا رہا۔ لہجے میں وہ بعض اوقات اہلِ زبان تو کیا اہلِ لکھنؤ کی نزاکتوں کو بھی چھو لیتا تھا۔ مگر روزمرہ کی زبان میں شاہراہِ ریشم کی اینٹ سیمنٹ بجری چونا کسی کدال سے زیادہ اُس کے پاس کچھ نہ تھا۔ لہٰذا اُس کے ذریعے کوئی ٹیکنیکی گفتگو کرنا عبث تھا۔ لہٰذا جو میں کہتا وہ اُن سے خدا جانے اُس میں سے کتنا اور کیسے کہتا اور وہ جو مجھ سے کہتے کتنا مجھ تک پہنچتا۔ اس لیے تصاویر کو زیادہ سے زیادہ دیکھنا ہی ایک سودمند فعل تھا اور یہ ہم نے جی بھر کے کیا۔ نیشنل آرٹ گیلری لمبی چوڑی ہے۔ دو منزلہ ہے اور کئی کشادہ ہال ہیں۔ ایک ہال میں چین کی قدیم ترین مصوری کے نمونے جو ایک قبرستان سے برآمد ہوئے آویزاں ہیں ان میں مصوری بھی ہے اور خطاطی بھی۔ دونوں دعوتِ نظر دیتے اور دامنِ دل خوب پکڑتے ہیں۔ مصوری کی یہ تصویریں منی ایچر میں مرقع چغتائی میں کچھ چہرے جو چینی لگتے ہیں۔ اسی دور چین، ایران اور ہندوستان کے ثقافتی پس منظر میں چنگیز خان، قبلائی خان اور بابر کے حوالے سے سمجھ میں کچھ کچھ آئی۔ خطاطی میں مسلمانوں کے بعد اگر کسی قوم کے پاس یہ سرمایہ ہے تو وہ چینیوں کے ہاں ہے۔ چینی خطاطی کے پانچ بڑے مکاتب ہیں۔ یہ خطاطی اپنی روانی زاویوں، قوسوں اور دائروں اور باہمی رچاؤ کے اعتبار سے اوجِ کمال کو چھوتی ہے۔ ارتقائی تنوع کے اعتبار سے مسلم خطاطی یقیناً اول نمبر ہے اور اسی صف کی بدولت یہ اس قدر جہتوں کی کہکشائیں اپنے دامن میں رکھتی ہے کہ آج تک اسے پوری طرح دائرۂ نظر میں سمیٹا ہی نہیں جا سکا۔ دوسری طرف چینی خطاطی کی نگہداشت اور پرورش جس ذوق و شوق سے کی جاتی ہے۔ قابلِ ستائش اور لائقِ تقلید بھی ہے۔ اس نمائش کی سیر سے آنکھ روشن، دل غنی، دماغ اور روح پُرنور ہو گئی۔ وزیٹرز بک میں نقشِ کمال دادِ فن کے طور پر پیش کیا اور چینی مصور خواتین و حضرات کے خوش آئند تاثرات لے کر واپس آئے۔

واپسی پر ریڈ سکوائر سے گذرے تو میں نے سوچا کہ ایسا بھی کیا کہ ماؤ کے دیس میں آ کر بار بار پاس سے گذر جائیں اور ماؤ کے حضور حاضری نہ دیں۔ میں نے مادام چینگ سے کہا۔ ابھی تھوڑا وقت ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ مجھے ماؤ ہال کی سیر کروائی جائے۔ بڑی محتاط خاتون تھی کچھ سوچتی رہی پھر راضی ہو گئی گریٹ ہال اور ہسٹری میوزیم کے درمیان میدان ہے۔ شمال میں تیان من اور اس کے عین مقابل اس میدان میں چینی عوامی ہیروز کی یادگار۔ اس کے عقب میں ماؤ میموریل ہال۔ ہال کے سامنے بھی اور عقب میں بھی دونوں جانب تحریکِ حریت کے مناظر سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونوں کی صورت میں نصب ہیں۔ بندوق، کلہاڑی، ہل، ہتھوڑا، درانتی اور پرچم اٹھائے ہوئے حریت پسند مرد و زن ایک تنظیم ایک ترتیب میں اپنے نصب العین کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماؤ ہال میں داخل ہوں تو سامنے ماؤ کا سفید خام مجسمہ کرسی پر بیٹھے مسکراتے ہوئے استقبال کرتا ہے۔ اس مجسمہ کے دونوں جانب سے راستہ عقبی ہال میں جاتا ہے۔ جہاں درمیان میں شیشے کے تقریباً ۸ × ۱۲ مستطیل شوکیس میں ماؤ کی حنوط شدہ لاش پڑی ہے۔ چیئرمین ماؤ سیدھے لیٹے ہوئے۔ آسمان کو دیکھتے ہوئے۔ سرخ کمبل شانوں تک ہے۔ ماؤ کے چہرے کی سیدھ میں چھت میں روشنی کے لئے مربع شکل میں روشن دان ہے۔ شوکیس کے چاروں طرف سرخ رنگ گملوں میں سرخ بلّی کے پھول کھلے ہیں۔ دونوں طرف سے غیر ملکی اور ملکی زائرین آہستہ آہستہ ماؤ کی زیارت کرتے گذرتے جاتے ہیں۔ کوئی رکتا نہیں اور شاید اسی لئے بعض چینی زائرین کی ہچکیاں اور سسکیاں بھی نہیں رکتی ہیں۔ سرد آہوں کی سائیں سائیں میں آگے گذر جاتا ہوں اور ہال سے باہر نکل ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں۔ دل اور دماغ میں بہت کچھ یک دم اور یک لخت ابھر آیا ہے۔ کوئی ترتیب ان ہی سب میں نہیں ہے۔ مگر ایک احساس کی ڈوری ان سب کو پروئے ہے جیسے بہت سارے مختلف گیت اپنے اپنے آہنگ کے ساتھ ایک گیت میں ڈھل رہے ہوں۔

رنگ، لفظ، خوشبو، سوچ، صدا، سُر، سب امانت ہیں مبارک ہیں وہ لوگ جو امین کہلائے، جن کے حرف صحیفوں میں

ــ سُر سماعت میں ــ نعرے فضا میں اور جن کے رنگ منظروں میں ہیں۔ معرکۂ وجود میں جن کے گھوڑوں کے سُموں سے اٹھنے والی گرد کی قسم کھائی گئی ہے۔ جن کے قلم، عَلم، سیف و ساز دلوں کے عجائب گھر میں عہد بہ عہد سجائے جاتے ہیں ــ وہ سب جو چراغ لے کر اندھیروں میں چلے، وہ سب جو شہید ہوئے، سچائی کی تلاش میں سرخرو ہوئے، وہ سب جو غازی ہیں ــ انھیں یاد کریں، سلام کریں کہ نسلِ نو کا لاشعور الجھنوں سے پاک رہے اور شعورِ علمِ خیر سے فیض یاب ہو اور دشتِ سفر میں نخلِ آگہی ابھرے جس کے سامنے ہی ہر قسم کے استحصال سے نجات ملتی ہے۔ جہاں نور تیرگی پہ غالب آتا ہے اور خزاں بہار سے مات کھاتی ہے۔ سُر قائم ہوتا ہے۔ سکوت صدا سے زیر ہوتا اور اسمِ اعظم کی گمشدہ میراث واپس ملتی ہے۔ تب آسمان درِ ابرِ مراد کھولتا ہے اور زمین وہ سب نعمتیں اگلتی ہے۔ جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔

۱/۲ ۱۲ بج گئے اور میں چینی ساتھیوں کے ساتھ قریب ہی بیجنگ ڈک ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا۔ جہاں چینی وزیرِ ثقافت پاکستانی وفد کو دوپہر کا کھانا دے رہے تھے۔ بیجنگ ڈک مشہورِ زمانہ ہے اور بیجنگ ڈک ریسٹوران میں دنیا بھر سے لوگ بطخ کھانے آتے ہیں۔ یہ بطخ ایک خاص انداز میں پرورش کی جاتی ہے۔ جس کا گوشت نہایت خستہ اور لذیذ ہوتا ہے۔

باقی حضرات بھی پہنچ چکے تھے۔ کھانا شروع ہوا۔ کھا کھا کر اور پی پی کر بے حال ہونے لگے تو ایک حسینہ ٹرے میں سالم بطخ بھُنی ہوئی سجا کر لائی اور دعوتِ نظارۂ مرغِ بیچارہ دینے لگی۔ یہ بطخ کی رونمائی تھی اور جو کچھ کھا چکے تھے۔ وہ تو صرف بھوک چمکانے کا سامان تھا ــ پھر کورس چلے اور چلتے رہے اور وہ خاص ڈش جب آئی جس میں بطخ کی چونچ پائنچے سر اور ٹانگیں تھیں۔ تو غنودگی چھانے لگی کیونکہ پلیٹ میں بطخ کے سر میں جڑی دو آنکھیں کہتی تھیں ــ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

تب ہم نے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھاما۔ سگریٹ سلگایا اور کرسی سے کر دھوئیں کے مرغولے چھوڑے اور چینی میزبانوں سے باتیں کرنے لگے۔ ایک چینی مسلمان سے جو کافی اچھے عہدے پر ہے۔ تعارف ہوا اور تعارف ہوتے ہی وہ شاعر بھی نکل آیا اور جھٹ سے ایک نظم جو اس نے بقول اُس کے ابھی اُسی وقت ہمارے استقبال میں کہی تھی۔ سنا ڈالی۔ اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ بھلا مانس واقعی مسلمان ہے۔ نظم کا نام شاہراہِ ریشم تھا۔ کامریڈ شان نے ترجمہ سنایا تو پتہ چلا شاہراہِ ریشم کتنی طویل ہے۔

ساڑھے تین بجے گریٹ ہال والس چیئرمین سٹینڈنگ کمیٹی مع چینی ثقافتی ٹیم کے ساتھ پھر مذاکرات ہوئے، ثقافتی مسائل اور پروگرام کا ذکر ہوا۔ نئے عزائم اور ارادوں کا تبادلہ ہوا۔ سفارشات تیار ہوئیں ــ پھر روسی جارحیت زیرِ بحث آئی اور افغانستان کا ذکر ہوا۔ تو والس چیئرمین نے کرسی سے اُٹھ کر غصے میں لال پیلا ہو کر مکہ میز پر مارا اور کہا۔

"ہمارے دوست پاکستان پر کسی بھی طرف سے اگر بالادستی تھوپنے کی کوئی کوشش کی گئی تو ایک سو کروڑ چینی عوام پاکستانیوں کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔"

جاپان کے ساتھ چینی برآمدات کا ذکر ہوا تو چینی برادران میزانیہ ہند سوں پہ ایک نہ تھے۔ ایک بار کوشش پھر کوشش اور ہر کوشش ناکام۔ بالآخر چینی دوست یہ قصہ گول کر گئے۔ تو میں نے کامریڈ کے کان میں کہا۔

پاک چین دوستی کی بنیاد میں ریاضی میں دونوں قوموں کی کمزوری بھی ایک قدرِ مشترک ہے اور کامریڈ لن نے اس بھی اتفاق کر لیا۔

بھاری بھرکم مذاکرات کے بعد ہلکے پھلکے موضوعات چھڑے۔ پاکستان کی ایک فلم "میرا نام ہے محبت" جو یہاں پچھلے دنوں دکھائی گئی تھی۔ اُس کی تعریف وائس چیئرمین نے بھی کی۔

پھر اچانک ایک قہقہہ چینیوں میں درجہ بدرجہ اترتا ہوا مترجم کامریڈ شان تک پہنچا تو اُس نے منہ کھول کر قہقہہ آگے بڑھایا اور فورِ مسرت میں اپنا ہاتھ وائس چیئرمین کے ہاتھ پر دے مارا۔ وائس چیئرمین نے اپنا ہاتھ انگریزی مترجم فتنۂ ثقافت کے نازک ہاتھ پر مار کر یہ ثابت کر دیا کہ چینی دکھ درد اور مسرت میں نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ پھر جامِ صحت ہر دو جانب سے تجویز ہوئے اور ارباب نیاز نے "میرا نام ہے محبت" جیسی اور فلمیں بھجوانے کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد میری ایک پینٹنگ (خطاطی) پاکستانی وفد کی جانب سے وائس چیئرمین کو تحفہ میں دی گئی۔ جس پر لکھا تھا۔ "ھوالحی القیوم" وائس چیئرمین نے تپاک سے میرا ہاتھ دبایا اور تحسین آمیز کلمات کہے۔

گریٹ ہال سے نکلے تو سپورٹس کامپلکس بیجنگ پہنچے۔ راستے میں دارالحکومت کے در و دیوار کا نظارہ کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ رہائشی کوٹھیاں اور فلیٹس اور اپارٹمنٹس خوب صورت مگر سادہ۔ صاف ستھرا ماحول ہر ابھرا۔ جدید یورپی طرزِ تعمیر کا بھی اثر نفوذ ہو رہا ہے۔ مگر زیب و زینت کے باب میں چینی سادگی و پرکاری کا عنصر حاوی ہے۔ ہمارے اسلام آباد کا سا عالم نہیں ہے جہاں بنگلے اور کوٹھیاں معماروں اور مزدوروں کی بجائے کسی بیکری کے بنے ہوئے کیک اور پیٹریاں دکھائی دیتے ہیں۔

سپورٹس کمپلکس میں داخل ہوتے ہوتے شام ہو گئی۔ پندرہ سو تماشائیوں کے لئے نشستوں کے انتظام والی اس خوبصورت اور جدید بازی گاہ میں روشنی اور آواز کا سسٹم بہت عمدہ اور جدید ہے فرش پہ برف جمائی جا رہی تھی اور چھت پر روشنیاں چاند ستاروں اور کہکشاں کی صورت میں جیسے چینی شعوری طور پر آسمان کو زمین پر اتارنا چاہتے ہیں۔ نہ معلوم یہ جذبۂ تقابل ہے یا لاشعوری سطح پہ گمشدگی کا احساس۔

یہاں سے تیز تیز بیجنگ فرینڈ شپ اسٹور کو چلے۔ بیگم ارباب نیاز کو ڈرائیور کی سست روی پہ بہت غصہ آ رہا تھا۔ بہرحال پہنچ گئے فرینڈ شپ اسٹور کئی فلوروں پہ مشتمل ہے اور دنیا بھر کی اشیا یہاں دستیاب ہیں۔ پہلے کرنسی بدلوائی۔ ڈالرز کے عوض یوآن۔ ماؤ اور فنس لیے اور فرینڈ شپ اسٹور کی سیر کرنے لگے۔ سب بچھڑ گئے مگر چینی میزبانوں کا کمال تھا کہ ہر ایک کے ساتھ ایک ایک ضرور رہا۔ ملبوسات، پارچات۔ نوادرات مصنوعات بہت کچھ خریدنے کو جی چاہتا تھا۔ مگر سب کچھ خریدا نہیں جا سکتا اور فرینڈ شپ اسٹور پر غیر ملکیوں کے لیے کچھ خریدنا اور بھی دشوار ہے۔ رش اس قدر ہوتا ہے کہ سفید ماؤ کیپ جیکٹ اور پنٹ پوش چینی سیلز گرل اگرچہ کافی تعداد میں ہر کاؤنٹر پہ ہوتی ہیں پھر بھی باری نہیں آتی اور چونکہ غیر ملکی اُن سے بات مترجم کے ذریعے سے ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک کو ریٹ دوسرے کو سائز تیسرے سے نقدی وصول کرتی چوتھے کو رسید دیتی اور پانچویں کے لیے پیکنگ کرتی ہوئی بے حد مصروف ہوتی ہیں۔ اس کا یہ حل سوچا کہ کم از کم سیلز گرل کو بلانے کے لیے تو کامریڈ شان سے چھٹکارا پایا جائے۔ ہم نے کامریڈ سے لڑکی کو بلانے کے لیے چینی زبان میں ادائیگی پوچھی۔

"سئے سئے" کامریڈ بولا۔

بالکل ٹھیک ہے کامریڈ سئے سئے، لیلا، لیلے یہ تو ہم نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر اور نجد کے صحراؤں سے چینی

مرغزاروں تک پکار سکتے ہیں پھر اس عاشقی میں ۱۵۰ یوآن خرچ کر کے واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے۔

۱۵ر نومبر کی صبح ناشتہ کیا اور دیوارِ چین دیکھنے روانہ ہوئے۔ بیجنگ کے بازاروں اور سائیکلوں کے سیلاب سے گذرتے کچھ دیر بعد ہم شہر سے نکل کر مضافات میں داخل ہو گئے۔ تا حدِ نظر دونوں جانب کھیت۔ کھیتوں میں بوائی ہو چکی ہے۔ فصل ابھی اگی نہیں اس لئے بیجنگ کے مضافات میں ابھی ہریالی زیادہ دکھائی نہیں دیتی ہے۔ سڑک کے دورویہ درخت خشک موسم کی وجہ سے کچھ کچھ گرد آلود و گرنہ چین میں گرد نام کو بھی نہیں ہوتی۔ سڑک پر ٹرک ٹرالیاں ٹریلر اور ریڑھے، بلڈوزر اور ٹریکٹر قطار اندر قطار آتے جاتے ہیں۔ ڈرائیور زیادہ تر عورتیں ہیں جو چین میں ہر محنت ہر مشقت میں برابر کی حصہ دار ہیں یہاں تک کہ راہ میں ایک برساتی نالے پر زیرِ تعمیر پل پر چنائی کرتی پتھر اٹھاتی اور لاتی عورتیں ہم دیکھتے ہیں۔ جن کی نازک کلائیوں حنائی انگلیوں اور پتلی کمر سے شاعری کے دیوان روشن ہوتے ہیں۔ بیجنگ کے مضافات میں باغات کم اور کارخانے فیکٹریاں زیادہ دکھائی دیتے ہیں اور شہر کے کئی منزلہ رہائشی اپارٹمنٹس کا سلسلہ اب گارے اور مٹی سے بنے ہوئے دیہاتوں کی جانب دراز ہوتا جا رہا ہے۔ کاشتکاری میں ایک قومی جذبہ ایک قومی انہماک بڑا واضح دکھائی دیتا ہے۔ نوخیز فصلوں کو موسموں کی شدت سے محفوظ کرنے کے لئے قطار اندر قطار پولیتھن کی چھتریاں استعمال کی جاتی ہیں۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد کامریڈ شان نے سامنے پہاڑی سلسلہ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ دیوارِ چین۔

دیوارِ چین جو ساتویں کے نصاب میں پڑھی تھی اور خلا سے کرۂ ارض کی واحد قابلِ شناخت چیز دیوارِ چین ہے۔ پھر ساتویں جماعت کے طالب علم کی طرح ہاتھوں میں چہرہ تھام کر پر اشتیاق آنکھوں سے دیوار کو دیکھتا ہوں کہ کب دیوارِ چین آئے۔ جس پر میں اچھل کودوں۔ جوں جوں دیوارِ چین کے قریب جا رہے ہیں۔ اگر غلط سلط پڑھا ہوا جغرافیہ اور جھوٹی سچی تاریخ ذہن سے نکل جائے بمت کا یقین بھول جائے تو یوں لگتا ہے۔ جیسے ہم پشاور سے جمرود اور پھر آگے درۂ خیبر میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہی درۂ خیبر کی طرح ایک جانب سڑک اور دریا بھی بائیں جانب۔ بیچ میں پانی کی گذرگاہ اور مخالف سمت میں ریلوے لائن۔ چڑھائی چڑھتی سڑک اور چنائیاں اور اترائیاں بالکل دیسی ہی پُرخطر اور دشوار گذار ہیں۔ البتہ چینیوں نے اندھے موڑوں پر آئینے نصب کر کے مقابل سے آنے والی ٹریفک کو سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ درۂ خیبر کے پہاڑ خشک ہیں۔ یہاں خشک نہیں گھاس ہے جھاڑیاں اور درخت ہیں۔ مگر یہ سب مل کر اس حسن کا مقابلہ نہیں کرتے جو درۂ خیبر کے خشک پتھروں کے نصیب میں ہے۔ جہاں سے دیوارِ چین کو ہم دیکھنے والے ہیں۔ یہ بھی ایک درہ ہے جس کا نام شان ہائی پاس ہے اور بیجنگ کی حفاظت کے لئے یہ دیوار اس کو کاٹتی یا بند کرتی یہاں سے گزرتی ہے۔ یہاں بھی بالکل وہی منظر ہے طورخم بارڈر والا۔ بائیں جانب ویسے چینی نوادرات کی دکانیں، چائے خانے اور بس سٹینڈ ہیں۔

دیوارِ چین کی سیر شروع ہوتی ہے، ایک زینے سے چڑھ کر دیوار میں داخل ہوئے۔ دیوار ایک سڑک ہے۔ جس میں ان گنت انسان چڑھ کر گولے بارود اور خورد و نوش کے سامان سے لدے ہوئے ریڑھے کھینچا کرتے تھے۔ اور یوں اگلے مورچوں میں لڑتی فوج

کو سامانِ رسد پہنچتا تھا۔ دیوارِ چین جو آٹھ عجائباتِ عالم میں سے ایک ہے۔ تقریباً ۷۰۰ برس قبل از مسیح دفاعی نوعیت کے مختلف مقامات پر حصوں میں بنائی گئی۔ ۲۲۱ قبل از مسیح میں کن خاندان کے دورِ حکومت میں اس کے حصوں کو آپس میں ملا دیا گیا۔ گویا منگ خاندان کو (۱۴۰۰) عیسوی میں پہلی بار یہ دیوار پوری کی پوری تیار ملی۔ یہ موجودہ چین کے سات صوبوں کو عبور کرتی ہے۔ اس کی بنیادوں میں پتھروں کی بھاری اور لمبی سلیں ہیں اور بالائی حصہ لمبی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے دونوں جانب تقریباً ایک میٹر بلند حفاظتی دیواریں ہیں۔ اندرونی حفاظتی دیوار مسلسل اور بیرونی حفاظتی دیوار میں حملہ آور پر حملہ آور ہونے کے لیے رخنے ہیں۔ تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر باقاعدہ چوکیاں ہیں۔ دیوارِ چین کی اونچائی تقریباً سات آٹھ میٹر ہے اور چوڑائی تقریباً پانچ اور چھ میٹر کے قریب ہے۔

میں اس دیوار کو دیکھتا ہوا بہت آگے نکل گیا اور بہت اونچائی پر پہنچ گئے یہاں تک کہ چینیوں سے بھی چھٹکارا مل گیا۔ میں اس کو ہر نشیب میں اترتا اور ہر فراز پر سے گذرتا دیکھتا ہوں۔ ٹھنڈی یخ ہوا بہت تیز ہے۔ مگر سیاحوں کا ایک ہجوم ہے۔ پھر میں نیچے اُس مقام کو دیکھتا ہوں جہاں سے سیاحوں کی سیر شروع ہوتی ہے۔ یہ دیوار ایک لمبی روش لگتی ہے پھولوں سے بھری ہوئی نیلے پیلے سفید کالے سبز سرخ ملبوسات غیر ملکوں کے بالکل انارکلی کی بھیڑ جیسے لگتے ہیں پیشہ ور فوٹو گرافر بوڑھی میموں اور نیلے ہیٹ اور سوٹ بوٹ میں ملبوس چھڑیاں ٹیکتے چلتے سیاحوں کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ میں اس دیوار کا ایک بھرپور نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے۔ یہ منظر اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ میرے حافظے پر نقش ہو جائے دفاعی نقطۂ نظر سے بنائی گئی اس دیوار کے شکوہ کا یا اعجاز ہے انسان کے ذہن سے یہی دفاعی نقطۂ نظر بالکل نکل جاتا ہے دیوارِ چین کو انتہائی بلندی سے نیچے آتا دیکھیں تو ایسے لگتا ہے جیسے آسمان میں کوئی دروازہ کھلا ہے۔ اور رُوانے سے کوئی زینہ زمین کی جانب اترتا ہے۔ جو نشیب میں سے گذر کر فراز کی جانب لپکتا ہوا پھر بادلوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ یوں اس دیوار کا زیرِ دیوار کے تصور کو نفاق، دشمنی، رقابت، ہوس، حسد اور سازش کی چار دیواری سے بلند کر کے ایک نئی غنائیت سے بہرہ ور کرتا ایک انوکھے تناظر سے ہمکنار کرتا ہوا تصویر نغمہ اور تخیل کی سطح پر بے جاتا ہے

دیوارِ چین ایک جھولا ہے۔ جسے انسان سرخوشی میں جھولتا ہے اور عالمِ بے خودی میں آسمانی گیت گانے لگتا ہے۔ ھواللہ الذی لا الہ الا ھو علم الغیب والشھادۃ ھو الرحمٰن الرحیم ہ

کوئی دو سو گز پیچھے ڈھلوان پر کھڑا آغا ناصر میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اور اشارے سے مجھے واپس بلا رہا ہے۔

اسلم کمال واپس آجاؤ۔ ساتویں جماعت کے کھلنڈرے طالب علم تاریخ کی کتاب کے اپنے صفحے پر چلے آؤ۔ دل اس مراجعت پر آمادہ نہ تھا۔ مگر دل جسم کا قیدی ہے اور جسم شرطِ سفر کا پابند تھا۔ رفعتوں سے اتر آیا۔

یہ دیوار ایک داستان ہے۔ کلیلہ دمنہ جیسی کوئی کہانی در کہانی ہے۔ چینی طرزِ زندگی کی کہانی۔ چینی طرزِ فکر کی کہانی — چینی طرزِ جنگ کی کہانی۔ کہانی جو چینی طرزِ اظہار کی علامت بن کر پستیوں اور رفعتوں میں اترتی چڑھتی ہے۔ یہ دیوار ایک اژدھا ہے۔ یہ دیوار ایک خطِ تسخیر ہے۔ جسے دستِ انسان نے کھینچا ہے۔ میری چشمِ تمثیل روایتی چینی مصوری کے پسِ منظر میں ابھرنے ڈوبنے لگتی ہے اور چینی مصور کو ترائیوں میں پھیلتے اور اونچائیوں پر لپکتے دیکھتی ہے۔ جس کے فن پاروں میں باولوں سے پہاڑ جدا ہوتے دھند سے جنگل ابھرتے اور جنگلوں سے دریا نکلتے دیکھتی ہے۔ بادلوں کی نمی، جنگلوں کا بھید، پہاڑوں کا استقلال اور دریاؤں کی نغمگی چینی مصوروں کو ان ترائیوں میں پھیلنے اور ان اونچائیوں پر لپکنے سے ہاتھ آئی ہے۔

کامریڈ کمال بریو۔ بریو۔

میں چونک کر مادام چینگ اور مس چن کی جانب دیکھتا ہوں اور کامریڈ شان بتاتا ہے۔
یہ آپ کو بریو (بہادر) کہہ رہی ہیں۔ آپ اتنی دور اتنی بلندی پر چلے گئے تھے۔
میں نے خاتون کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ بہادری ہم پاکستانیوں کی سرشت میں ہے۔ دیوار پر ہم فوراً چڑھ جاتے ہیں اور بے ساختہ قہقہہ لگاتے ہیں۔ ہمپٹی ڈمپٹی کی کہانی بھی ہمارے انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔
دیوار سے نیچے اتر کر ایک کیفے میں چائے پی۔ کاروں میں بیٹھے اور دیوارِ چین کو مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ واپس ہوئے۔
سڑک کے دونوں جانب تاحدِ نظر میدانی علاقہ، کھیت اور ندی نالے اور چھوٹے چھوٹے گاؤں بانس کے جھنڈوں میں۔ راستے میں منگ قبرستان دکھایا جائے گا۔ اور ہم بڑی سڑک سے نکلتی ہوئی ایک چھوٹی سڑک پر ہو لئے۔ پھر ایک گیٹ وے سے گزرے۔ پھر دوسرے گیٹ وے سے اور آگے سڑک کے دونوں کناروں پر ہاتھی، شیر، ہرن، بیل، گھوڑا، اژدہا اور کچھوا کے دیوہیکل مجسمے مؤدب سجائے گئے ہیں۔ یہ آنجہانی شہنشاہ کی قبر کے راستے میں آخری دیدار کے لئے ایستادہ ہیں۔ پھر ایک گیٹ وے سے گذرے تو سڑک کے دونوں جانب امیر وزیر سفیر دبیر دانشور اور فنکاروں کے مجسمے مؤدب آنجہانی کے آخری دیدار کے لئے کھڑے ہیں۔ ایک اور گیٹ وے سے گزر کر گاڑیاں کافی دیر بھاگتی رہیں۔ تب ایک پُررونق مقام آیا۔ یہ منگ قبرستان ہے۔ ایک دیوہیکل کچھوے پر ایک لاٹھ ہے۔ اور لاٹھ پر ایک تختی پر کچھ لکھا ہے۔ جو یقیناً آنجہانی شہنشاہ کے بارے میں ہے۔
(۱۶۴۴ - ۱۴۰۳) منگ خاندان نے اپنا دارالحکومت پیکنگ بنایا۔ اور ۱۳ منگ شہنشاہوں نے شمال مغربی مضافات میں اپنے قبرستان بنوائے۔ یہ قبرستان جس کی سیر ہم کرنے والے ہیں۔ تیسرے منگ بادشاہ چاؤلی کا ہے۔ سات کلومیٹر لمبی سڑک جس پر پتھر کے بنے ہوئے چار گیٹ ہیں۔ اور جن میں سڑک کے دونوں جانب جانور اور انسانوں کے مجسمے کھڑے ہیں۔ یہ مقدس راستہ ہے اس قبرستان کا ہے اور یہ قبرستان تین حصوں میں ہے۔ باغِ بہشت پہلا حصہ ہے۔ یہ ایک ہال ہے۔ جو ۱۴۲۷ء میں بنا اور چین میں لکڑی سے بنی ہوئی سب سے بڑی عمارت ہے۔ اس کا رقبہ ۱۹۰۰ مربع میٹر ہے۔ اس ہال کے پیچھے ایک ۳ منزلہ مینار ہے۔ یہ روح کی آرام گاہ ہے یہاں بادشاہ چاؤلی کا پتھر کا تعویذ ہے۔ اسکے پیچھے ایک اور باغِ جنت ہے۔ جس کے گرد فصیل ہے۔ یہ فصیل دیوارِ چین کا منیچر ماڈل ہے۔
اس باغِ جنت کے نیچے دو منزلہ تہ خانہ ہے۔ جہاں بادشاہ چاؤلی کا تابوت ہے اس کے ایک طرف اسکی ملکہ کا اور دوسری طرف داشتہ کا تابوت ہے۔ یہ دو منزلہ تہ خانہ تقریباً ۲۷ میٹر گہرا ہے۔ جس میں سامنے درمیان میں عقب میں دائیں اور بائیں پانچ ہال ہیں۔ یہ زیرِ زمین محل تمام کا تمام پتھر سے تعمیر کردہ ہے جس میں ایک بھی کالم یا بیم کا استعمال نہیں کیا گیا عقبی ہال میں شہنشاہ اس کی ملکہ اور داشتہ کے صندوق پڑے ہیں۔ جن میں میرے جواہرات بھرے پڑے تھے
منگ خاندان کے سترہ بادشاہ تھے۔ تیرہ نے پیکنگ کے مضافات میں چالیس مربع کلومیٹر ہی کے رقبے میں اپنے قبرستان بنوائے باقی چار اپنے قبرستان نہ بنوا سکے۔ کیونکہ ایک کو قتل کر دیا گیا۔ ایک نے پھندا گلے میں ڈال کر اپنا کام تمام کر لیا۔ ایک کو پھانسی پر لٹکا کر راہی ملکِ عدم کیا گیا اور چوتھے نے خودکشی کر لی۔ خودکشی کا طریقہ نہیں معلوم ہو سکا۔ تیرہ قبرستانوں کا کھوج لگا لیا گیا ہے۔ مگر کھدائی ابھی اسی ایک قبرستان کی ہوئی ہے۔ شہنشاہ چاؤلی نے باغِ بہشت بنوایا۔ روح کے آرام کے لیے مینار بنوایا۔ پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو ایک اور باغِ جنت فصیل کے حصار میں بنوایا، منگ چاؤلی کا یہ قبرستان مصری فرعونوں اور نمرودوں جیسا ہے۔ انسان جتنا چاہے بھاگے اور اپنی

دانست میں بھاگ بھی نکلے مگر اللہ میاں کے تصورِ جنت سے دامن نہیں چھڑا سکا نہ آج سے پہلے نہ آج تک اور شاید نہ آج کے بعد بھی۔ یہ سارا قبرستان کروڑوں مزدوروں نے دن رات ایک کر کے تعمیر کیا اور نہایت پوشیدہ طور پر اس کی تعمیر ہوئی۔ یہاں سنائی جانے والی کہانیوں کے مطابق تمام کاریگر یا گونگے چنے جاتے تھے یا اُن سے مطلب براری کے بعد اُن کو گونگا کر دیا جاتا تھا۔ اُن کی قوتِ گویائی چھین کر مطلق الحکم شہنشاہ نے عافیت پائی ہوگی کہ اُس کا تابوت اس کی داشتائیں اور ہیرے جواہرات سب زیرِ زمین دنیا کی آنکھ سے اوجھل رہیں گے۔ لیکن جس طرح چاؤلی کی لاش اس کی ملکہ اور داشتاؤں کی لاشیں اور اُن کے ساتھ ہیرے جواہرات پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ اسی طرح سلب شدہ قوتِ گویائی کھنڈرات کی زبان بن کر تاریخ سے مکالمہ کرنے لگی ہے۔ عقبی ہال یعنی تابوت گاہ میں پہنچے تو دیکھا مرکز میں تابوت ہے۔ چاؤلی منگ بادشاہ کا۔ دائیں جانب ہے اُس کی ملکہ کا اور بائیں جانب تابوت ہے اُس کی ایک بہت پیاری داشتہ کا۔ ملکہ اور داشتہ اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے دائیں اور بائیں پہلو میں دفن تھیں ملکہ بے اولاد تھی مگر داشتہ آبدیکار یعنی اُس نے لڑکا جنا جو بادشاہ اور ملکہ اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوا تو داشتہ کی لاش ملکہ کے صندوق میں اور ملکہ کی لاش داشتہ والے صندوق میں منتقل کر دی گئی۔

استفسار کرنے پر بتایا گیا کہ اب ان صندوقوں میں لاشیں نہیں ہیں۔ جس طرح آزوبازو میں دیگر چوبی صندوقوں میں ہیرے جواہرات نہیں رہے۔ انسان بھی عجیب ناقص العقل ہے۔ قفسِ عنصری سے روح کی پرواز کا ایک محض تصور رکھتا ہے۔ حالانکہ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں اور قفسِ عنصری بھی قفسِ چوبی سے غائب ہو سکتا ہے۔ یہ مرحلہ انسان کی ناقص عقل میں ابھی تک نہیں آیا۔

مزید استفسار کرنے پر کہ منگ شہنشاہ کا قفسِ عنصری کہاں گیا۔ ہیرے جواہرات تو سمجھ میں آتے ہیں کہ کہیں ضرور پہنچ گئے ہوں گے۔

بتایا گیا کہ اوپر میوزیم میں پتہ چلے گا۔

اوپر میوزیم میں آئے تو وہاں پر تاج، جوتے، کپڑے، تصویریں، برتن اور ملکاؤں، داشتاؤں کے زیورات، ملبوسات، سامانِ آرائش، وغیرہ وغیرہ سب نہایت سلیقے سے شوکیسوں میں زیرِ نمائش ہیں۔ اور ایک کونے میں ایک مکروہ انسانی ڈھانچہ کا بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گراف دلوں کو دھڑکاتا اور سان خطا کرتا تھا۔ ہمت کر کے پوچھا تو بتایا گیا۔

شہنشاہ چاؤلی کا ڈھانچہ ہے۔

یہ تو فوٹو گراف ہے۔ صاحبِ تصویر ڈھانچہ کہاں ہے؟ چینی بھائی اُسے شاید آنجہانی چاؤلی کی خواہش کے احترام میں ہمیشہ پوشیدہ رکھنے پر مصر تھے۔ لاعلمی کا اظہار کیا گیا تو میں نے پلٹ کر چینی مصوروں کی تخلیق کردہ منگ شہنشاہوں اور اُن کی ملکاؤں اور داشتاؤں کی تصاویر پر توجہ مرکوز کی۔ چینی گائیڈ کا چھلانگ مارنا اور ایک ایک چھلانگ صدیاں عبور کرتی ہوئی اُن انقلاب کے گنتی کے سال سلوموشن میں دیکھتے رہنے سے کہیں زیادہ بہتر سمجھا کہ آنکھ جو دیکھتی ہے۔ دیکھتے جاؤ گوشِ سماعت پہ بار گذرتی آوازوں کو دوسرے کان سے نکال کر حسنِ سماعت کو جگاتی صداؤں پر توجہ دینے سے تاریخی شعور کی پرورش ہوتی ہے۔

شہنشاہ اپنی مملکت کے ایک ایک انچ کے لیے اپنی رعایا کا آخری فرد بھی کٹوانے کو تیار رہتے ہیں۔ مگر شہنشاہی مزاج کسی حد کسی سرحد کا پابند نہیں ہوتا۔ کرہ ارض پہ اس کی ایک جیسی خاصیت ہے۔ آفاقی مزاج ہے۔ لیکن چینی مطلق الحکم بادشاہوں کی تصویریں دیکھ کر اس

آفاقیت کو دھچکا سا لگتا ہے۔ ظالم، جابر، فاسق اور فاجر کی عالمگیر نشانیوں میں سے کوئی بھی نشانی ان چینی حکمرانوں کے خدوخال میں نہیں ہے نہ بڑی بڑی مونچھیں، نہ خوفناک ڈاڑھی نہ خونخوار آنکھیں، نہ قاتل گہری بھنویں، نہ موٹے آدم خور ہونٹ، نہ سخت گیر ٹھوڑی، نہ گردن سؤر کی سی اور نہ تنور جیسی توند۔ یہ تو مغنی سے ہیں۔ خوفناک مونچھیں اور ڈاڑھی زردنسل کے مقدر میں ہی نہیں۔ گردن پتلی صراحی دار ہوتی ہے اور توند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ان سب باتوں کے الٹ عالم پناہ کی پشت پر لمبی سی بل کھاتی چٹیا بھی لٹکتی ہے۔ یہ کیسے ظالم تھے کہ ظالم جیسے نہیں ہیں۔ جب یہ سوال ذہن میں ابھرا تو وہ اوراق جن پر مظلوموں کی آہیں اور چیخیں رقم تھیں اور جن کو تاریخ نے اسی مظلومیت کے باوصف دھتکار دیا تھا۔ پھڑ پھڑا کر آنکھوں میں تیرنے لگے۔ کروڑہا گونگوں کا انبوہ میرے سامنے تھا۔ وہ جو گونگے تھے۔ مگر گونگے نہ لگتے تھے بالکل اُسی طرح کہ جو ظالم تھے مگر ظالم لگتے نہیں ہیں اور جو ظالم ہو مگر ظالم دکھائی نہ دیتا ہو۔ نوجان لو اس کا ظلم جسموں سے بہت آگے دل کو گھیرنے والا روحوں کو کچلنے اور خوابوں کو مسلنے والا ہوتا ہے۔ پس انقلاب سے پہلے دیوارِ چین فراز ہے۔ پیکنگ سطح مرتفع اور نشیب منگ قبرستان ہے۔

بیجنگ واپس پہنچے۔ رات کو ارباب نیاز نے چینیوں کو عشائیہ دیا پاکستانی ایمبیسی میں۔ یہاں پاکستانیوں نے بھی تورمے پلاؤ بریانی کے کورس چلائے مگر وہ بات کہاں چینیوں والی۔

واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ ہوا تیز ہو کر آندھی کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ گرم پانی سے غسل کیا ٹھنڈا اورنج جوس پیا۔ مختار احمد سے ٹیلیفون پر گپ شپ ہوئی اور دوبارہ کینٹن سے بیجنگ واپسی پر ملاقات کا وعدہ کیا۔ اور سو گئے۔

•

۱۶ نومبر کی صبح بہت جلدی بیدار ہو گیا۔ یہ رات بڑی بے چینی میں کٹی۔ بار بار آنکھ کھل جاتی اور نیند گہری نہ ہو سکی۔ بدن میں تھکن کا زہر سا گھلا ہوا تھا۔ جسے زائل کرنے کے لیے پورا ایک گھنٹہ گرم پانی کے ٹب میں لیٹا رہا۔ پھر شیو کی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

ویٹرس اندر آئی۔

سر۔ کافی۔

پھر میں کمرے میں گھومتا کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ کافی کا تلخ ذائقہ مزا دے رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا سر پورٹر آ رہا ہے۔ سامان دے دیں اور ناشتہ کے لیے آ جائیں۔

ٹھیک ہے۔ لے جائیے۔

میں نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔ ہم آج شینگ ہائی روانہ ہو رہے ہیں۔ پھر پورٹر آیا اور سامان اٹھا کر لے گیا۔ اور میں نیچے ناشتہ کے لیے اتر آیا۔ ارباب نیاز بیگم، ارباب نیاز، آغا ناصر، حبیب الرحمان، افضل قادر اور بیگم کوثر افضل قادر، مادام چنگ، کامریڈ لن اور کامریڈ شان سب جمع تھے۔ ناشتہ کیا اور گیسٹ ہاؤس کے پورچ میں نکلے۔ باہر سماں ہی اور تھا۔ رات بھر کی بے چینی کا سبب معلوم ہوا۔ دل میں کانٹے سے چبھنے کی وجہ سمجھ میں آئی کہ موسم ایک نئی کروٹ بدل چکا تھا۔ رات بھر سے برفباری جاری ہے۔ زمین سفید فام ہو چکی ہے۔

اور درختوں پر برف کے برگ و بار پھیل چکے ہیں۔ میں کار میں بیٹھنے سے پہلے پورچ سے نکل کر کھلی فضا میں چند لمحوں کے لیے کھڑا ہو گیا۔

اویار کیوں بیمار پڑنے کا ارادہ ہے۔ ارباب نیاز نے مجھے کہا۔

صحت یاب ہو رہا ہوں خاں صاحب۔ میں نے جواب دیا۔

مسافر کو زادِ سفر سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ ہر منظر کی ایک برکت اور ہر موسم کی ایک دعا ہوتی ہے۔ ضرور لینی چاہیے۔

گاڑیاں آہستہ آہستہ ائرپورٹ کی جانب رینگنے لگیں۔ نیف ڈیک کے آغا ناصر نے کہا۔

چلو اچھا ہوا خیر سگالی کے سٹریو اظہار کی تکرار سے فراغت ہوئی۔ آدھے دن کھانے میں اور آدھے دن شکریے میں گذر گئے۔ بندھے ٹکے پروگرامز ختم ہوئے۔ کیا بک بک تھی یار کہ موسم اس لئے بہت سرد ہے کہ میں اپنے ساتھ لایا ہوا اوور کوٹ پہن سکوں اور سردی کی شدت کم ہو ذرا تو یوں کہنا پڑے کہ سردی میرے لیے کم ہو گئی ہے کہ میں اوور کوٹ اتار سکوں۔ یہ بادل اتر کر ہمارے بلائیں لینے آ رہے ہیں اور یہ دھوپ ہمارے گال تھپتھپانے کے لئے نکلی ہے۔ درختوں کے پتے ہمارے استقبال کے لئے جھڑ کر فرشِ راہ ہو گئے ہیں۔

شاعری کرنے لگے ہو آغا۔ میں نے آغا ناصر کو بے حد جذباتی ہوتے دیکھ کر کہا۔ اور وہ ہنس دیا۔

گاڑی بیجنگ شہر سے نکل ائرپورٹ کی جانب رواں ہے۔ بیجنگ ساٹھ لاکھ آبادی کا شہر جس میں ۳۰ لاکھ سائیکلیں ہیں۔ ایرپورٹ روڈ پر آتے وقت شام کا سماں تھا اور درخت ٹنڈ منڈ تھے۔ اب صبح کا عالم ہے اور درختوں نے برف کی چادر اوڑھ لی ہے۔ گاڑیاں تشویشناک حد تک سست رو ہیں۔ اندیشہ تھا کہ جہاز نکل جائے گا۔ مگر ہم بروقت ائرپورٹ پہنچ گئے۔ برفباری کے باعث جہاز آدھ گھنٹے کی تاخیر سے ٹیک آف کر گیا۔ بیجنگ میزبان ٹیم میں سے کامریڈ لن، کامریڈ شان اور مادام چنگ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ جہاز کی کھڑکی سے باہر نیچے بادل اور بادلوں کے خلا میں سے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ کامریڈ لن میرے ساتھ کی سیٹ پر ہے۔ ساٹھ سال عمر ہے۔ چھریرا بدن ہے اور شریف آدمی ہے۔ اس کی بڑی لڑکی بیجنگ کے ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ یہ خود کلچر ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہے۔ ثقافتی انقلاب میں جب کلچر وغیرہ زد میں آئے تو یہ بھی متاثر ہوا اور ایگریکلچر میں چلا گیا اور کھیتوں میں مشقت کرتا رہا۔ اب دوبارہ بحال ہو چکا ہے اور بہت خوش ہے۔ انگریزی بول لیتا ہے۔ مگر اردو سے ناواقفیت ظاہر کرتا ہے۔ مگر اردو سنتا بڑے غور سے ہے۔

مادام چانگ کمیشن برائے ثقافتی تعلقات کی ڈائریکٹر ہیں۔ کٹے ہوئے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں والی معنک خاتون ہر وقت ایک تشویش میں مبتلا دکھائی دیتی ہیں۔ صرف چینی بولتی ہیں۔

فضائی میزبان لڑکیاں چاکلیٹ اور ٹافیاں بانٹ رہی ہیں۔ کامریڈ لن نے اپنے لئے اور میرے لئے ٹرے میں سے اٹھا کر اُسے شے شے کہا۔ زیادہ وقت خاموشی میں گذرا۔ اور باہر جہاز سے ایک ہی منظر چلا آ رہا تھا اور جہاز کے اندر بھی مسافر چپ چاپ اپنے آپ میں مگن تھے۔ پھر جہاز اترنے والا ہے۔ یہ اعلان چینی میں پھر انگریزی میں ہوا۔ پھر جہاز شینگ ہائی کے ہنگ چیاؤ بین الاقوامی ائرپورٹ پر اتر گیا۔ شینگ ہائی کی میزبان ٹیم نے ہمارا استقبال کیا اور کاریں شینگ ہائی شہر کو روانہ ہوئیں۔ ائرپورٹ سے نکلتے ہی ایک طلسم آباد میں داخل ہو گئے۔ سڑک کے دونوں جانب چوڑے پتوں والے ایک عمر اور ایک ہی فاصلہ پر گھنے درختوں کی شاخیں آپس میں گلے مل رہی تھیں

اور یوں اوپر سڑک پر مسلسل سائبان بنتا ہے۔ درختوں کے سبز پیلے اور براؤن پتوں سے چھن چھن کر آتی روشنی بڑا سندر سماں پیدا کرتی ہے اور ہوا سے آپس میں بجتے پتوں کی آواز بڑی مترنم ہے اور ہم تو ازل سے ہی جاں جادۂ ہوائے سرِ رہگذار ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب سبزہ ہی سبزہ، کھیت ہی کھیت اور جلد ہی آبادی شروع ہوگئی۔ شینگ ھائی اپنی شہری طرز میں یورپین شہروں جیسا ہے اور کھیتوں میں دہقانوں کی ماؤ کیپ جیکٹ اور پتلون سے نظر ہٹ جائے تو پنجاب کے زرعی علاقوں کا منظر ہو بہو ہے۔ سڑکوں اور گلیوں تک میں درختوں کا سائبان شینگھائی کے حسن کا ایک اہم عنصر ہے۔ ایک قدیم شہر جو اپنے چپے چپے سے ایک انفرادیت کا اظہار کرتا ہے۔ پرانے شینگ ھائی کی سڑکیں اور گلیاں زیادہ کھلی نہیں ہیں اور انسانوں کے ہجوم سے اور بھی تنگ داماں لگتی ہیں۔ سڑک پر کھلتے دروازے اور کھڑکیاں سڑک پر فرش سے زیادہ سے زیادہ دو فٹ بلند ہیں۔ یقیناً یہ ایک خاص نقطۂ نظر سے کبھی ایشیا کا پیرس ہوگا۔ یہ ایک معروف شہر ہے اور بارونق بندرگاہ ہے۔ اس شہر کی انقلابی خدمات بھی قابلِ تعریف ہیں۔ انگریزوں، فرانسیسیوں نے یہاں کیا کیا گل کھلائے اور جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی وہ جاپانیوں نے پوری کر دی اور ہم تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل کو یہ اندازہ کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی کہ اسے ایک نائٹ کلب میں بدلنے کے لیے غیر ملکی استعمار نے کتنی عقل صرف کی اور کتنی دولت سے تجوریاں بھریں۔ جبھی اس شہر کا پرانا حصہ روشن دنوں سے زیادہ روشن راتوں کا نوحہ خواں لگتا ہے۔

ہماری گاڑیاں بارونق بازاروں سے گزرتی ہوئی جنگ جیانگ ہوٹل کے عالی شان پورچ میں رک گئیں۔ اس ہوٹل کے دو حصے ہیں۔ ایک وکٹورین طرزِ تعمیر کا اور دوسرا فرانسیسی طرزِ تعمیر کا ہے۔ ہم پرانے یعنی وکٹورین طرز کی بلڈنگ کے چھٹے فلور پر کمرہ ۶۰۹ اور آغا ناصر کمرہ ۶۰۸ میں ٹھہرے۔ یہ ہوٹل ایک فرانسیسی یہودی نے بنوایا تھا۔ اس کی جائیداد نان چنگ سٹریٹ تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہودی ہونے کے ناطے سے پراپرٹی ٹیکس کا چور تھا۔ بالآخر بھاگ نکلا مگر ممکن ہے کہ دبے پاؤں واپس بھی آ گیا ہو کیونکہ ہم نے بازاروں میں جینیوں کو کوکا کولا پیتے دیکھا ہے۔ اس ہوٹل میں وکٹورین عہد کی پرانی لفٹ بڑے سے ہینڈل والی جس میں مسافروں کی تعداد کی کوئی پابندی نہیں کھٹا کھٹ چلتی ہے۔ یہ ہوٹل بہت پُرآسائش اور اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ اسی ہوٹل میں ہم نے پہلی بار ڈانکنہ، بنک سٹیشنری سٹور فرینڈ شپ سٹور ایک نہیں تین چار دیکھے ہیں۔ اس کا لاؤنج بہت خوب صورت اور ایک خاص قسم کی بنسی باس سے مہکتا ہے۔ ہم یہ بُو سونگھ رہے تھے کہ کراچی سے بیجنگ پرواز کے دوران گپی ۸۵ سالہ امریکی ڈشکرا سامنے صوفے پر اپنی بیٹیوں برابر دو میموں کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا بڑا ہشاش بشاش نظر آیا۔ اس کی ان بیٹیوں برابر خواتین کی عمریں زیادہ سے زیادہ ساٹھ ساٹھ سال ہوں گی، مگر امریکی ڈشکرا بڑا اترا رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اچھلا ہیلو ہیلو کرنے کے بعد زندگی مسرت ہے۔ مسرت زندگی ہے کا راگ الاپنے لگا۔ ہم نے جان چھڑائی اور ڈائننگ روم کو چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہاں کھانے میں ہمیں پاکستانی تکے بھی کھانے میں ملے۔ جن کا بہت لطف آیا۔

ساڑھے تین بجے شینگھائی فلم سٹوڈیو دیکھنے گئے۔ شینگھائی میں چار سٹوڈیوز ہیں۔ شینگھائی فلم سٹوڈیو ڈاکومنٹری فلمیں بناتا ہے اور یہ ہماری خاص دلچسپی کا مرکز تھا۔ یہ سٹوڈیو جدید آلات سے بھی آراستہ ہے۔ مگر یہاں بھی جو کیفیت ہمارے سٹوڈیوز میں عنقا ہے وہ یہ کہ پورے ماحول میں اپنے وسائل کی مدد سے جدید دنیا کی دوڑ میں شانہ بشانہ چلنے کا عزم عیاں ہے۔ سٹوڈیو کے مختلف فلور دیکھتے

شوٹنگ دیکھی۔ پانچ فلموں کے رش پرنٹ دکھائے گئے۔ جن میں سے اوّل ایک چینی روایتی خطاط کے بارے میں تھی۔ واہ کیا شان تھی خطاط جناب کی۔ یوں لگتا تھا کوئی نواب تھا۔ کوئی فرمانروا تھا کہ معاشرے کا ہر فرد دیدہ و دل فرشِ راہ کئے ہوئے ملتا ہے۔ ہر حسین کی چشمِ غزالی میں خواب اُسی خطاط کے بہ اُمیدے آں کہ روزے شکارِ خواہی آمد۔ پانچ فلموں کے رش پرنٹ ہمارے لئے بڑے معلومات افزا ثابت ہوئے۔ چین جیسے وسیع علاقے اور کثیر آبادی والے ملک اور گوناگوں مصروفیات والے معاشرے میں گھوم پھر کر کچھ مشاہدہ کرنے کی فرصت ہمارے مقدر میں نہ تھی۔ اس کام کے لئے تو کئی سال چاہئیں۔ چینی چونکہ بہت زیادہ حقیقت پسند لوگ ہیں۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ فلموں میں مواد بھی مبنی بر حقیقت ہی ہوگا اور چینی حکومت کی معاشرتی پالیسی کا آئینہ دار بھی۔ پس ان فلموں میں بوس و کنار سے لے کر جدید مغرب کا سارا گلیمر موجود ہے۔ اس تضاد کے ساتھ کہ معاشرے میں ایسے سارے لذیذ کام اچھے نہیں سمجھے جاتے ہیں۔

سکرپٹ رائیٹرز سے ملاقات ہوئی اور ڈائریکٹرز سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ عصرِ حاضر کے مقبول فلمی ہیرو اور ہیروئن سے گپ شپ ہوئی اور ایک پرانی ہیروئن جو اب کریکٹر ایکٹنگ کرتی ہے۔ سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ بڑی متین بڑی دبی دبی سی مسکراہٹ والی خاتون ایک عجیب سحر کی گرفت میں اُس کی شخصیت تھی۔ وہ دیکھتی تھی تو شعور کی سطح پر ملتی تھی اور آنکھیں جھکاتی تھی تو چہرے پہ لاشعور کا سرمئی سایہ سا پھیل جاتا تھا ——— جب فرانسیسی مسٹنڈے برطانوی بوفر اور جاپانی فراڈیے پرانے دنوں کی رونق تھے۔ جب راتیں بیدار اور دن غنودگی میں ڈوبتے تھے۔ شینگ ہائی کا ہر گھر طوائف کا کوٹھا تھا۔

بیجنگ کے برعکس شینگ ہائی کی سڑکوں پہ لوگ ہنستے کھیلتے خوش گپیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اور سرِ شام گلیوں بازاروں میں عجیب ہنگامہ سا ہوتا ہے۔ نوجواں جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے اور اس سے زیادہ جوشیلے جوڑے ایک دوسرے کے گلے میں لٹکتے جھومتے چلتے پھرتے ہیں۔ مس تن جو شینگ ہائی کی میزبان ٹیم کی ایک اہم رکن تھی۔ لمبی اونچی کٹے ہوئے بالوں والی متبسم لڑکی سے آغا ناصر نے پوچھا کہ شادی کا طریقہ یہاں کیا ہے۔ پہلے تو وہ شرمائی پھر اپنے فرائض کا احساس کر کے بولی کہ چین میں ایک لڑکا جب کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے، تو وہ اس لڑکی کی قریب ترین سہیلی سے رابطہ کر کے اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ وہ لڑکی لڑکے کے چند دوست اور اپنی سہیلی اور ایک دو اور سہیلیوں کے ساتھ ایک پارٹی کا انتظام کرتی ہے۔ وہاں یہ مدعا بیان کیا جاتا ہے کہ محترمہ آپ کو یہ صاحب اپنی بیوی بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں کو کچھ وقت کی تنہائی دی جاتی ہے۔ وہ کچھ بنیادی مسائل پہ اگر اتفاق کر لیں تو اُن کی شادی کا عبوری دور شروع ہو جاتا ہے اور یہ عبوری دور دو تین سال تک بھی رہ سکتا ہے۔ اس مدت میں وہ اگر جنسی تجربہ سے بھی گزرنا چاہیں تو گزر سکتے ہیں۔ مگر اولاد پیدا نہیں کر سکتے جس کے لیے سزا ہے۔ آزمائشی عبوری دور میں وہ اگر یہ محسوس کر لیں کہ اُن میں ضروری مفاہمت پختہ ہو چکی ہے۔ تو وہ رجسٹرار کے پاس حاضر ہو کر اپنا کیس رجسٹر کرواتے ہیں اور میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ اُن کو ایک عدد شناختی کارڈ مل جاتا ہے کہ یہ مسٹر فلاں ہیں اور یہ مسز فلاں ہیں۔ یہ جو آپ کو تاریک گوشوں میں محبت کرتے جوڑے دکھائی دیتے ہیں یا سرِ عام گلے لگے نظر آتے ہیں۔ یہ سب آزمائشی دور کے مسافر ہیں۔

عالمِ بوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ۔ یعنی اس جنسی اختلاط کو سوشل ایول ہونے سے روکنے کا کیا بندوبست ہے؟

میں نے پوچھا تو مس لن نے جواب دیا۔

نہیں جناب کھلی چھٹی نہیں ہے۔ پولیس اور خفیہ پولیس مشکوک جوڑوں سے پوچھ گچھ کرتی ہے۔ میاں بیوی ہونے کی صورت میں انھیں شادی کارڈ دکھانے پڑتے ہیں۔

اور اگر آزمائشی دور سے گزر رہے ہوں تو پھر کیا دکھاتے ہیں ارباب نیاز نے پوچھا اور مس لِن نے جواب دیا۔

پھر کچھ نہیں دکھاتے بس کہہ دیتے ہیں کہ ہم آزمائشی دور سے گزر رہے ہیں۔

حبیب الرحمٰن جو واقفِ حال تھا فوراً بول پڑا۔

بادشاہو۔ پکڑے جانے کا خطرہ صرف شادی شدہ لوگوں کو ہوتا ہے کہ اگر راہ چلتے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر خود بھی عبادت آب وہوا کرنے لگیں اور پولیس والا پوچھ لے اور بدقسمتی سے وہ دونوں یا اُن میں ایک کا بھی کارڈ پاس نہ ہو تو سیدھے تھانے میں۔ جبکہ آزمائشی دور والے صرف یہ کہہ کر چھٹکارا پا لیتے ہیں کہ آزمائشی دور سے گزر رہے ہیں۔ بس۔

رات کو شیننگ ہائی کے میئر نے اسی ہوٹل میں عشائیہ دیا۔

۱۷ نومبر کی صبح اُٹھ کر کھڑکی کھول کر شیننگ ہائی شہر پر نظر ڈالی۔ تو باہر بارش ہو رہی تھی تیار ہو کر تیسرے فلور پر ڈائننگ ہال میں ناشتہ کی ٹیبل پر سب جمع ہوئے۔

یار یہ کنگ حسین تو نہیں؟ آغا ناصر نے ساتھ والی ٹیبل کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کون ہے کنگ حسین؟" — بیگم ارباب نیاز نے پوچھا۔

"یہ ساتھ والی ٹیبل پر!" — بیگم افضل قادر نے بتایا۔

"وہ ادھر کیسے ہو سکتا ہے؟" — افضل قادر نے بات ختم کرنی چاہی۔

ہاں دیکھو یار اس کا قد کاٹھ رنگت بال اور داڑھی سب ویسی ہی ہے۔ ارباب نیاز نے دادِ شباہت دی۔ پھر دوسری ایک ٹیبل کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

یار یہ امریکی بوڑھا نوجوان ہر جگہ محفل جما لیتا ہے۔ کہتا ہے میرے پاس بے شمار دولت ہے۔ کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی ہے۔ اب ساری عمر عیش وعشرت میں کاٹوں گا۔

ہاں اس کا گپ مارنے کا ۵۰ سالہ تجربہ ہے

حبیب الرحمٰن بولا۔

۸ بجے شیننگ ہائی کا ایک کمیون دیکھنے روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹہ کی ڈرائیو کے بعد کمیون پہنچ گئے۔ کمیون کے تنظیمی ڈھانچہ میں اول ٹیم ہوتی ہے۔ دوم بریگیڈ اور سوم کمیون۔ اس کمیون کے صدر سے کمیون ہال میں ملاقات ہوئی۔ پچاس پڑھ سادا سا کسان تھا۔ مگر گفتگو بڑے اعتماد سے کرتا تھا۔ لڑائی جھگڑا چوری چکاری زنا اور دوسرے معاشرتی جرائم کی روک تھام کے طریقِ کار پر باتیں ہوئیں

زمین کی پیداوار اور اوسط پیداوار بڑھانے کی تدابیر زیرِ بحث آئیں۔ اس کمیون کا ایک ہینڈی کرافٹ سنٹر دیکھا۔ ایک موبیشی خانہ اور ریڈی میڈ ملبوسات کی ایک فیکٹری دیکھی۔ پھر ایک سکول کی سیر کی اور مڈل کے بچوں کو دیواریں پھاندتے کھڑکیوں سے کودتے دیکھ کر اپنا مڈل کلاسز کا زمانہ سارے ارکانِ وفد کو یاد آیا۔ کمیون سے واپسی پر شینگ ہائی سپورٹس کا مپلکس دیکھا۔ جس میں والی بال اور ٹیبل ٹینس کی پریکٹس دیکھی۔ سپورٹس کامپلکس کے فرش دیواروں اور چھتوں کی چمک دمک دیکھ کر پوچھا کہ اس کا افتتاح باقاعدہ کب ہونے والا ہے۔ جواب ملا۔

پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ باقاعدہ افتتاح ہوئے۔

ہماری حیرت ابھی ختم بھی نہ ہو پائی کہ یہ سنا کہ پندرہ ہزار تماشائیوں کے لئے اس سٹیڈیم کی چھت علٰحدہ تیار کر کے اس پہ لگائی گئی تھی۔ بس ہم بدحواس ہونے کے سوا اور کیا ہو سکتے تھے۔ واپس جنگ جیانگ ہوٹل۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور تکے والی ڈش کا انتظار کیا۔ مگر روز روز تکے کباب کہاں۔ ہم چین میں تھے لاہور کے صفانوالہ چوک میں تو نہ تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ابھی کمروں میں پہنچے اور ہاتھ منہ ہی صاف کیا کہ پتہ چلا حبیب الرحمٰن کی زبانی کہ چند منٹ بعد ہماری سواری شینگ ہائی کے صنعتی نمائش گھر کو روانہ ہونے والی ہے۔

صنعتی نمائش گھر شینگ ہائی ایک پُرشکوہ عمارت ہے طرزِ تعمیر پگوڈا اور چرچ کی خوب صورت آمیزش کا نمونہ ہے۔ اس کے اندر مصنوعات کی طرزِ نمائش دیکھنے کی چیز تھی۔ بھاری مشینوں سے لے کر ملبوسات اور کاسمیٹکس کی اشیا جس قرینے اور سلیقے سے سجائی گئی تھیں اُن کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے۔ اور کئی ہالوں پر مشتمل ہے صنعتی نمائش کی سیر کے بعد شینگ ہائی چلڈرن پیلس پہنچے۔ ننھے منے بچوں نے پھولوں کے گلدستوں سے استقبال کیا۔ اس پیلس کی سیر ایک عجیب و غریب تجربہ تھا۔ جو دل میں امنگ اور روح میں نور ہی نور بھر گیا۔ چین کا ثقافتی مستقبل کتنا واضح اور متعین ہے۔ رقص، نغمہ، مصوری، خطاطی اور کشیدہ کاری کی تربیت سے لے کر کھیلوں کی کوچنگ کا شاندار انتظام دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ پانچ پانچ چھ چھ سال کے بچے بچیاں اس کمرہ میں آرٹ سیکھ رہے ہیں۔ دوسرے میں خطاطی سکھائی جا رہی ہے۔ ادھر موسیقی کی تدریس ہو رہی ہے۔ ادھر نغمہ بلند ہو رہا ہے۔ وہاں رقص کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہاں کشیدہ کاری کی تربیت ہو رہی ہے۔ میں نے ننھے منے بچوں کو ایک تصویر بنا کر دی اور بچوں کے استاد نے مجھے ایک خطاطی کر کے بچوں کی طرف سے پیش کی۔ ٹیبل ٹینس کھیلنے بچوں کے ہال میں گئے تو ایک ننھی سی گڑیا نے دو ڈرکریکٹ میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور میں نے چند منٹ اُس کے ساتھ کھیل کر اُس کا منہ چوما اور دل و دماغ میں روشنی ہی روشنی بھر کر جب ہم لوٹ رہے تھے۔ تو بچوں نے تالیاں بجا کر رقص کر کے نغمہ گا کر ہمیں الوداع کیا۔ چلڈرن پیلس شینگ ہائی کے بچوں کے چہروں کا نور کتنے ہی سایوں کے نرغے میں ہمیں لے آیا۔ اپنے وطن کے بچے بہت یاد آئے۔

رات کو شینگ ہائی کے قدیم تھیٹر میں بیلے "بارش" دیکھا۔ چینی اسٹیج اور پرفارمنگ آرٹس میں چینیوں کی مہارت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی جگہ کو جس سرعت سے ایک جہان میں بدل لیتے ہیں۔ ہمارے لئے ہی نہیں چینی اور بھی بہت ساروں سے ہزاروں میل آگے ہیں۔

جنگ جیانگ ہوٹل واپس ——— پھر سو گئے۔

۱۸ر نومبر کی صبح ناشتے میں انناس، کینو، کیلے، توس مکھن انڈا جام اور کیک پیس بھی ملے۔

۹ بجے کے قریب ہم سب شینگ ہائی کا ایک باغِ جنت (نو ڈریگن والا) دیکھنے گئے۔ یہ جنگ جیانگ سے قریب اور پرانے شینگ ہائی کے قلب میں واقع ہے۔ کسی فیوڈل کا بنوایا ہوا یہ باغ دیکھنے کی چیز ہے۔ دنیا بھر کے پودے اور درخت اس کی زینت ہیں۔ بے شمار پیولین، تالاب، قطعات اور غاریں اس باغ کی رونق ہیں۔ ایک جادو کی نگری ہے جس میں گرے چٹانیں بادلوں کی طرح تیرتی دکھائی دیتی ہیں اور غاریں الف لیلوی منزلیں لگتی ہیں۔ تالاب، پل اور انسانی مجسمے انسان اور فطرت کے مثبت رشتوں کو مستحکم کرتے اور سے اور منظرنت نئی بلندیوں پر بنانے کی خواہش پیدا کرتے ہیں۔ چینی روایتی مصوری اور خطاطی کے شہکار دعوتِ نظارہ دے کر دامنِ دل کو بھرتے اور روح میں شعلۂ نور جگا کر تخیل کو پَر پرواز دے دیتے ہیں۔

اس باغِ جنت کے گرد جو فصیل ہے وہ نو (ڈریگن) اژدہوں کا تسلسل ہے۔ جب اہلِ شینگ ہائی کی عوامی جدوجہدِ آزادی نقطۂ عروج کو پہنچی تو اس باغ کے نو اژدھے بڑھتے قدموں کی یلغار روک نہ سکے اور اس باغ کا ایک پیولین جس میں اس وقت کھڑا ہوں حریت پسندوں کا ہیڈ کوارٹر بنا۔ میں مشرق کی جانب دیکھتا ہوں۔ اونچی اور نیچی عمارات کو عبور کر کے درختوں کی گھنی شاخوں میں سے گذر کر سورج کی کرنیں اس پیولین کی چوکھٹ عبور کر چکی ہیں۔ اس پیولین میں حریت پسندوں کے ہیرو اور ہیروئن کی تصاویریں، میں انھیں سلام کرتا ہوں۔

دس بجے مادام چانگ اور ایک انگریزی مترجم کے ساتھ چائنا انسٹیٹیوٹ آف آرٹس شینگ ہائی پہنچا۔ روایتی چینی طرزِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ یہ خوب صورت عمارت واقعی فنون کا گہوارہ لگتی ہے۔ پھولوں بھری کیاریاں، درختوں کی فنکارانہ تراش خراش سبزہ شاداب قطعات اور پھول دار بیلوں بھری دیواریں چینی ذوقِ جمال کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ چینی مصوری اور خطاطی کا بیش قیمت سرمایہ یہاں دعوتِ نظر دیتا ہے۔ چینی معاشرے میں مصور اور خطاط کا مرتبہ یکساں قابلِ احترام ہے۔ چینی زبان میں مصور کو خواچہ اور خطاط کو سوفاچہ کہتے ہیں۔ چینی مصور مرد و زن سے جب مراتعارف مادام چنگ نے یہ کہہ کر کروایا کہ کامریڈ اسلم کمال خواچہ بھی اور سوفاچہ بھی ہے۔ تو حاضرین میں ایک حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ چینی زبان تقریباً ایک لاکھ کریکٹرز پر مشتمل ہے۔ چینی خطاطی بائیں سے دائیں اور اوپر سے نیچے کی جانب ایک سی روانی سے لکھی جاتی ہے۔ قلم کی بجائے ایک خاص قسم کا موقلم جو چینی مصوری میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ روشنائی خاص طور پر تیار کی جاتی ہے اور خشک کر کے چھوٹے چھوٹے قرص بنا لیے جاتے ہیں۔ حسبِ ضرورت حل کر لی جاتی ہے۔ موقلم کا منہ یعنی بالوں والا حصہ اچھی خاصی روشنائی کی مقدار اپنی چونچ میں بھر لیتا ہے۔ لکھتے وقت سارا کنٹرول فنکار کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ حسبِ ضرورت ہاتھ کو دباتا اور ڈھیلا کرتا ہے۔ لکھائی کے اتار چڑھاؤ اور پھیلاؤ کے لیے ہاتھ میں وزن بڑھاتا اور کم کرتا ہے۔ چینیوں کا موقلم پکڑنے کا انداز بھی منفرد ہے۔ چینی فن کار موقلم کو انگوٹھے کے دباؤ میں تین بڑی انگلیوں پر جماتے ہیں اور چھوٹی انگلی انگوٹھے کے دباؤ کو متوازن کرتی ہے۔ اس طرح موقلم کی نوک کا رُخ معکوس ہو جاتا ہے۔ دورانِ عمل ہمارا ہاتھ تو ساکت رہتا اور انگوٹھا اور انگلیاں آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں۔ مگر چینی فنکاروں کا ہاتھ اور انگلیاں برابر جمی رہتی ہیں مگر بازو متحرک

رہتا ہے۔

اس گہوارۂ فن میں مصور عورتیں، لڑکیاں اور مرد کافی تعداد میں آئے تھے۔ اُن سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ پھر ایک چینی مصور نے مظاہرۂ فن کیا اور راقم نے کسبِ کمال دکھایا۔ چینی خطاطوں نے خطاطی کی تو میں نے خطِ کمال کے جلوے ارزاں کئے۔ اُن کے لئے یہ حقیقت بڑی تعجب خیز تھی کہ ایک ہی شخص خطاطی اور مصوری کرتا ہے۔

ایک چینی مصور دوشیزہ جہاں روایتی چینی مصوری میں بھی بڑی تاک تھی۔ وہاں اپنے حسن و جمال میں بھی منفرد تھی۔ اس کی شخصیت میں وہ سارے فتنے جمع تھے کہ پہلی ہی نظر میں اہلِ دل پکار اُٹھیں "نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا"۔ لمبی لمبی سیاہ آنکھیں، رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی سخت وحشت پیشہ تھیں۔ تیکھی ناک پتلے پتلے ہونٹ لمبی گردن سرخ و سفید رنگت اور قد و قامت میں ایسی کہ کوئی معتقدِ فتنۂ محشر بھلا کیسے نہ ہو کہ جیکٹ پتلون اور ماؤ کیپ میں تو وہ فی الواقع افسرِ شمشاد قداں لگتی تھی۔

ایک چینی خطاط نے مجھے اپنی ایک قومی نظم کے کچھ اشعار کی خطاطی کر کے پیش کی۔ میں نے شکریے کے ساتھ قبول کی اور جواب میں خطاطی کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور انگریزی مترجم کو بتایا کہ اس کا معنی ہے۔

IN THE NAME OF ALLAH, THE BENEFICENT, THE MERCIFUL

تو اُس نے چینی ترجمہ اُن کو سنایا تو تمام کامریڈ حیرت سے منہ کھول کر کبھی مترجم کو کبھی مجھے اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

میں نے برش پکڑا اور سیاہی میں ڈبو کر ایک لمبے چوڑے کاغذ پر لکھا۔

الذی علم بالقلم

اور مترجم کو بتایا۔

WHO TEACHES BY THE PEN.

مترجم نے اُن کو چینی ترجمہ سنایا تو وہ اور بھی حیران ہو گئے۔ اور کافی دیر تک مترجم کے ساتھ چینی میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ جب فارغ ہوئے افہام و تفہیم سے تو مترجم نے بتایا کہ آپ کے طرزِ تحریر سے تو بہت متاثر ہیں۔ اور خوب خوب داد دے رہے ہیں۔ مگر جو کچھ آپ لکھ رہے ہیں۔ یہ سمجھ نہیں پا رہے کہ وہ کون ہے۔ مہربان اور رحم کرنے والا اور جس نے قلم سے لکھنا سکھایا ہے۔

میں نے برش سے پھر رنگ لگایا اور لکھا۔

قل ھو اللہ احد

SAY: HE IS ALLAH, THE ONE

مترجم نے چینی ترجمہ سنایا تو سب نے میری طرف دیکھ کر ایک ایک انگلی کھڑی کی۔ جیسے وہ مجھے یقین دلا رہے تھے۔ کہ میرا لکھا اُن کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ان کی سمجھ میں آنے والا صرف ہندسہ ایک ہے۔ پھر بھی میں نے اس کو اقرار باللسان کے طور پر

غنیمت جان کر آخری خطاطی کی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

WE ARE ALLAH'S AND UNTO HIM WE ARE RETURNING

پھر ایک مصور نے روایتی چینی مصوری میں ایک تصویر بنائی۔ چینی روایتی مصور گہرے سے ہلکے رنگ کی سمت بڑھتے ہیں اور تصویر مختلف مدارج طے کرتی ہوئی دھند سے نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے فوٹو پرنٹ آہستہ آہستہ ڈویلپر سے نکھرتا ہے۔ یہ تو ملونی چینی سرزمین اور فطرت کے درمیان ایک خوشگوار مفاہمت اور مصالحت کی نشاندہی کرتی ہے۔ جہاں کے پہاڑ، دریا، جنگل رتوں اور موسموں کے ساتھ دلچسپ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔

چینی مصور اور خطاط اپنی ضروریات کی تمام اشیا اور سامان اپنی یونین سے حاصل کرتے ہیں۔ اور فن پارہ مکمل کر کے خود اس پر سرکاری مہر ثبت کر کے یونین میں جمع کرواتے ہیں اور تصویر یوں سرکاری ملکیت بن جاتی ہے۔ چنانچہ چینی مصور نے تصویر مکمل کی۔ مہر لگائی یونین کے رجسٹر میں اندراج کیا اور لکھا کہ کامریڈ فلاں کو جو فلاں ملک کا ہے۔ تحفے میں دی گئی اور میں نے شے شے کہہ کر قبول کر لی۔

جواب میں ایک اور تصویر میں نے بنائی اور اسی مصور کو پیش کر دی۔ باقی خطاطیاں خطاط حضرات کو پیش کر دیں اور شے نے ـــ شے شے کی آوازیں گوشِ سماعت میں سنبھال لیں۔

پھر آٹوگراف کا سلسلہ چلا۔ جو کافی دیر چلتا رہا۔ اور افسرِ شمشاد قداں نے اپنی آٹوگراف بک آگے بڑھائی۔ جس پر میں نے "تو اور آرائشِ خمِ کاکل" کا سماں باندھا۔ اس نے اگلا ورق الٹ دیا۔ اس پر میں نے کوچۂ دلبراں کے در و دیوار بنا کر روزن اور دریچوں میں پری چہروں کے چاند روشن کئے اور اس ہجوم میں اپنی اپنی شبیہِ آشفتہ خاطر کہ ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے۔

تو اس نے پھر ورق الٹ دیا۔ پھر ہم اس کے سادہ اوراق با تصویر کرتے گئے ـــ حدیثِ دل کی تفسیر میں، پندار کے صنم کدہ کی تصویریں ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں، آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ـــ غرض سو ڈھنگ سے ہم شرحِ فراق مدحِ لب مشکبو کریں کہ اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے ـــ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟ لیکن ـــ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ اللہ عالم الغیب ہے۔ مترجم اس سے کیا کہتا تھا اور ہم سے کیا بیان کرتا تھا ؎

اوروں سے کہا تم نے اوروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

چار و ناچار سب سے ہنس کر ملے۔ مسکرا کر کلام کیا۔ گاڑی میں بیٹھے شے شے کہا اور سناٹا ہاتھ ہلائے اور میرے دل مرے مسافر گنگناتے نانچنگ سٹریٹ پہنچے۔ کچھ کاغذ خریدے اور کچھ رنگ کہ نسیاں نہ طرزِ ما است ولے بہرِ احتیاط کچھ استعارے ہی قرطاسِ دل پر بجا لے چلیں۔ واپس جنگ جیانگ ہوٹل آئے۔ لنچ کیا اور دو دن کے لئے ضروری سامان ساتھ رکھا باقی ہوٹل میں چھوڑا اور ۳ بجے بذریعہ ریل

شینگ ہائی کے خوب صورت ریلوے سٹیشن سے ہانگچو کے لئے روانہ ہوئے۔ شینگ ہائی سے ہانگچو تک ریل کا ۱½ ۳ گھنٹے کا سفر ہے۔ ریل کی فسٹ کلاس میں خوب صورت آرام دہ نشستیں اور چار نشستوں کے درمیان ایک خوشنما میز جس پر گلدان میں پیارے پیارے پھول شاید اس لئے تھے کہ ضروری نہیں کہ آس پاس کے مسافر خوبصورت بھی ہوں۔ گاڑی کافی دیر چلتی رہی مگر شینگ ہائی کا شہر ختم نہ ہوتا تھا۔ پٹری کے بالکل قریب بھی جہاں چند فٹ جگہ ملی ہے چینیوں نے وہاں سبزیاں اگا رکھی ہیں۔ ان ننھی منی کھیتیوں میں فصل کی صحت اور بود و باش پر جو توجہ دی گئی ہے۔ صاف دکھائی دیتی ہے اور گواہی دیتی ہے کہ چینی اپنا بویا ہوا ہی کاٹنا پسند کرتے ہیں شینگ ہائی بے انتہا پھیلا ہوا کثیر آبادی کا شہر ہے۔ شہر میں سے گذرنے والے ندی نالوں میں کشتیاں اور سٹیمر چلتے ہیں۔ جو باہر سے غلہ اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا بھاری سامان شہر میں لاتے ہیں۔ اس طرح شہر کی سڑکوں پر ٹریفک کا بوجھ کم کیا جاتا ہے۔ پھر شینگ ہائی شہر کی آبادی ختم ہو گئی اور دونوں جانب سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ فصلیں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ غلہ اٹھایا جا رہا ہے۔ سبزیاں لادی جا رہی ہیں۔ بانس اور نرسل کے جھنڈ ہیں۔ دہقان کھیتوں کے کنارے کنارے ماؤ کیپ جیکٹ پینٹ میں آلاتِ کشاورزی کاندھوں پر رکھے قطار اندر قطار یوں مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے ہمارے سرحدی دیہات میں فوجی جوان جنگی مشقیں کرتے نظر آتے ہیں۔ کھیتوں میں بڑے بڑے نل ہیں اور لمبی لمبی موٹی ٹیوب سے فصلوں پر پانی سپرے کیا جا رہا ہے۔

آغا ناصر میرے سامنے کی سیٹ پر ہے۔ کامریڈ لن میرے برابر اور حبیب الرحمٰن اس کے مقابل بیٹھے ہیں۔ گرم گرم چائے ویٹرس نے میز پر رکھی تو مادام چینگ نے بیگ میں سے نہایت نفیس بسکٹ نکالے۔ ہم نے چائے کی چسکیاں لیں اور بسکٹ کھائے۔

میں تو صرف چینی جس میں پیوں گا۔ اور مولانا ابوالکلام کی طرح لذت لینے کی کوشش بھی کروں گا۔

آغا ناصر نے کہا۔

میں بھی جسمیں چائے کا قائل ہوں اور مولانا کا فرمایا بھی مستند مگر لذت تو اس میں سے کوشش کرنے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

میں نے کہا۔

ہاں کسی کی تعریف کسی اور کے حصے میں ڈالنا بڑی محنت کا کام ہے۔

آغا ناصر بڑا مدبر بنتا جا رہا تھا اور حبیب الرحمٰن تدبر نہ کرنے والوں میں سے تھا۔ تفکر سے الرجک تھا بڑی ہمدردی سے آغا ناصر کو مشورہ دیا۔

بسکٹ کھاؤ بسکٹ۔ مادام چینگ کے پاس یہی ایک لذیذ شئے ہے۔

مادام چینگ کا نام سن کر کامریڈ لن نے کان کھڑے کئے۔ تو حبیب الرحمٰن نے اُس کی طرف بسکٹ کی پلیٹ بڑھائی اور پچکار کر دعوت دی۔

بسکٹ کھائیے۔ بسکٹ۔

یک دم ریل نے ایک خوفناک دھچکا کھایا اور پھر ہموار چلنے لگی۔ سب کے بدن میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور لہر کا اثر زائل کرنے کے لیے میں نے کہا۔

یار یہ ریل بہت صاف ستھری ہے۔

ہاں صفائی میں تو اہلِ چین کا جواب نہیں۔

آغا ناصر نے کہا اور پھر سنانے لگا کہ اشفاق احمد خاں پندرہ سال قبل چین کے دورے پر آئے تھے۔ انہوں نے یہاں کا ایک واقعہ بہت لوگوں کو سنایا کہ انہوں نے اپنے دورے میں ایک گاؤں والوں کو چھریاں کلہاڑیاں بھالے اور نیزے لئے ایک طرف کو بھاگتے دیکھا تو سبب پوچھا۔ مگر کوئی بھی جواب دینے کے لئے نہ رکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب لوگ چہروں پر فتح و نصرت کی چمک لئے واپس آ رہے تھے۔ اشفاق صاحب فرماتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ بھائی یہ آلاتِ حرب و ضرب لے کر کس جنگ پر دیوانہ وار گئے تھے۔ تو سب نے سینہ پھیلا کر بڑھکیں مار کر کہا۔ ہم نے اپنے دشمن کا قلع قمع کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ کونسا دشمن۔ کہنے لگے ایک مکھی نظر آ گئی تھی۔ ٹھکانے لگا کر آئے ہیں۔

اشفاق صاحب کا واقعہ بھی سچا ہو گا۔ مگر میں نے جنگ جہانگ میں مکھیاں دیکھی ہیں۔ میں نے حیرت سے کہا۔

ارے وہ امریکی ڈشکرے کے ساتھ جو چمٹی بیٹھی تھیں۔

حبیب الرحمٰن لولا۔

نہیں بابا حقیقی مکھیاں۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔

میں نے کہا۔

نہیں یار تلقین شاہ کے بقول اہلِ چین نے مکھی کی نسل ہی ختم کر دی ہے۔

آغا ناصر مکھیوں کے خاتمے پر یقین دلانے لگا۔

چلو یار میں بھی مان لیتا ہوں۔ اپنے شاہ جی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میں نے بات ختم کر کے باہر کے منظر میں لطف لینا شروع کیا۔ ندیاں نالے اور چھوٹے چھوٹے دریا۔ دریاؤں میں اسٹیمر زلزلے ہوئے علاقے سے۔ چین کی سرزمین۔ حسین سرزمین ——— میری ناک پر کچھ سی ہوئی۔ میں نے ہاتھ اٹھایا تو مکھی اڑ کر آغا ناصر کے کاندھے پر بیٹھ گئی۔

یہ کیا شے ہے؟ اب کہو ——— میں نے آغا ناصر سے رازداری میں کہا۔ اور آنکھوں سے اشارہ بھی کیا کہ یہ رازداری برقرار رہنی چاہیے۔ کامریڈ لن اور عادام چانگ اونگھ رہی ہیں۔

مکھی آغا کے کاندھے پر سے اتری اور حبیب الرحمٰن کی خطرناک مونچھ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بھی اپنی گول گول آنکھیں گھما کر اقرار کیا۔ ہے۔ بھئی ہے۔

مگر یہ راز راز ہی رہے۔ چینیوں کو پتہ چل گیا۔ تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ اودھم مچ جائے گا۔ قیامت ٹوٹ پڑے گی اور ماں بچے سے بیگانہ ہو جائے گی۔ تمام چینی اس مکھی پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اور اگر مکھی ریل کی کھڑکی سے باہر نکل گئی تو یہ بھی چلتی ٹرین سے چھلانگیں لگا دیں گے۔

میں نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ فی الحال راز راز ہی رہنا چاہیے۔ شاہ جی کا کیا ہے۔ ہم انہیں سمجھا لیں گے۔ دو زانوں ان کے سامنے بیٹھ کر عرض کریں گے کہ جس مکھی کو مار کر آتے لوگوں کو آپ نے دیکھا تھا۔ اس مکھی کی عمر بڑی لمبی ہے۔ پندرہ سال بعد بھی اب یہ شینگ ہائی سے ہانگچو جاتی ریل کے فسٹ کلاس میں سفر کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے۔ شاہ جی یہ بات جھٹلائیں گے نہیں۔ صرف اپنی ناک میں

انگلی پھیر کر کان کھجلا کر کہیں گے۔

بابا جی سچ کہتے ہیں۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

شام ہو رہی ہے اور سورج دُور درختوں کی قطار کے پیچھے اتر رہا ہے۔

یکدم پھر ٹرین نے پہلے سے زیادہ دلدوز جھٹکا کھایا اور خوفناک آوازیں پٹڑی کے ساتھ پہیوں کی رگڑ سے پیدا ہوئیں۔ سب لوگ گھبرا گئے مگر یہ فائدہ ہوا کہ مادام چنگ کی آنکھ کھل گئی۔ بیچاری اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی تھوڑی دیر بعد لوٹی اور کہنے لگی۔ ٹرین کی بریک میں گڑبڑ ہے۔

پھر گاڑی ہانگچو کے بہت بڑے ریلوے اسٹیشن پر رک گئی۔ دی آئی پی لاؤنج میں پہنچے اور ہانگچو کی میزبان ٹیم نے خوش آمدید کہا۔ گاڑیاں اسٹیشن سے نکلیں تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اور سڑک کے دونوں جانب وہی شیشنگ ہائی والے درخت گہرا سایہ کئے ہوئے۔ بہت اندھیرا تھا۔ پھسلن تھی۔ گاڑیاں بائیں جانب مڑ گئیں اور بائیں ہاتھ پر ایک وسیع و عریض جھیل کے کنارے پر رینگنے لگیں۔ سڑک پر خوب صورت روشنیاں جگہ جگہ تھیں اور جھیل میں روشنیوں کا عکس بڑا منظر افروز تھا۔ اگرچہ رات کا سماں تھا اور اندھیرا بھی گہرا مگر حواسِ خمسہ نے فرحت محسوس کی تھوڑی دیر بعد جھیل کنارے ایک عالی شان ہوٹل کے پورچ میں گاڑیاں رک گئیں۔ یہ ہانگچو ہوٹل ہے۔ ایک خوب صورت پُرآسائش نہایت ملبا چوڑا ہوٹل ہے۔ چوتھے فلور پر ۴۱۳ نمبر دو دن کا مسکن ٹھہرا۔ رات کا کھانا کھایا اور جھیل کنارے سیر کو نکلے۔ بہت ہلکی بارش کی پھوار۔ اندھیرا روشنی جھیل اور جھیل میں روشنیوں کا عکس جھیل کنارے درخت گنجان اور صاف ستھری سڑکیں دونوں طرف سے پھولوں سے آراستہ غرض بڑا ہی رومان پرور سماں تھا۔ اس وقت اندھیرے کے باوجود یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ جھیل میں کنول کے پھولوں کی بہتات ہے۔ روشنیوں کی بریکٹس کا پیٹرن بھی کنول کے پھول کا ہے۔ جھیل کو سڑکوں سے کاٹ کر مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور خوبصورت پل بنائے گئے ہیں۔ ہم ایک سڑک پر جھیل کے بیچوں بیچ آگے نکل گئے۔ درختوں سے سائیکلیں ٹیک کر نوجوان جوڑے گھاس پر بیٹھے راز و نیاز میں محو ہیں۔ کچھ کی سائیکلیں گھاس پر لیٹی ہیں اور وہ درختوں سے ٹیک لگا کر محبت کے بیج بو رہے ہیں۔ کچھ بنچوں پر ایک دوسرے سے سر جوڑ کر خاندانی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور ہمارے ساتھ اردو مترجم کامریڈ شان تھا۔ جس کی اُردو دانی کے سب قائل ہو چکے تھے۔ اس رومان پرور ماحول میں ہمیں اکھڑا اکھڑا سا محسوس کر کے بولا

صاحب یہ جگہ بہت حسین ہے۔ بہت جمیل ہے اور خوبصورت ہے۔ نوجوان جوڑے رات کو یہاں آ کر بڑی محبت کرتے ہیں۔ آپس میں۔

ارباب نیاز نے اپنے نارمل رہنے کا احساس دلانے کے لیے کہا۔

ہاں محبت انسان کو ضرور کرنی چاہیے۔

کامریڈ شان نے برجستہ داد دی۔ بلند آواز میں۔

شاباش، شاباش۔

آغا ناصر نے کامریڈ شان کو سمجھایا۔ بڑوں کے لیے شاباش کی بجائے بہت خوب کہتے ہیں۔

تو میں پھر معذرت کر لوں۔ کامریڈ نے مجھے پوچھا؛

میں نے کہا۔

کوئی بات نہیں ارباب نیاز بھی تمہارے جتنی اُردو جانتے ہیں۔ اور آغا ناصر نے اُس کی مزید اصلاح شروع کی۔

دیکھو کامریڈ تم ہمارے صاحب اور تمہارے صاحب کہنے کے بغیر اُردو سے چینی میں اور چینی سے اُردو میں ترجمہ سنا دیا کرو۔

جی اچھا۔ کامریڈ شان نے کہا۔ مگر اس کے بعد کچھ بجھ گیا۔ غالباً اس احساس سے کہ ہم اُس کی اُردو سے مطمئن نہیں۔ اور یہ بات حکام بالا تک نہ پہنچ جائے۔ پھر ارباب نیاز اور افضل قادر مع اپنی بیگمات کے ہوٹل واپس چلے گئے آغا ناصر کی بھی بیگم نہ تھی وہ فرینڈ شپ سٹور میں جا گھسے۔ میں اور حبیب الرحمٰن اور کامریڈ گھومتے رہے۔ مجھے کامریڈ کے بجھ جانے کا احساس تھا۔ اور میں نے چاہا کہ اس کا اعتماد بحال ہو جائے۔

کامریڈ یہ جگہ یہ جھیل واقعی ایک خوب صورت مقام ہے۔ تم نے اتنی اچھی اُردو کہاں سے سیکھی؟

اس سے پہلے کہ کامریڈ کچھ جواب میں کہتا ایک لڑکی اور لڑکا سائیکلوں سے جلدی میں اترے۔ سائیکلیں تیزی سے درخت کے ساتھ کھڑی کیں اور ایک مقناطیسی زور سے آمنے سامنے سر جوڑ کر ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے کر بھینچ کر کھڑے ہو گئے۔

کامریڈ شان آپ واقعی شاندار لوگ ہیں۔ جنگ بھی مل کرتے ہیں۔ کھیتی باڑی بھی ایک ساتھ اور محبت بھی سر جوڑ کے کرتے ہیں۔

ہاں صاحب یہ اچھی بات ہے۔ کامریڈ بولا۔

کامریڈ تمہاری شادی ہو چکی۔ میں نے پوچھا۔

ہاں صاحب ایک بچی بھی ہے۔ میں نے پھر پوچھا

شادی سے پہلے سر بھی جوڑا تھا۔ حبیب الرحمٰن نے مسکرا کر پوچھا

سر جوڑا تھا تو جوڑی بن گئی تھی۔ کیوں ٹھیک نہیں میں نے کہا۔

کامریڈ نے حبیب الرحمٰن کو جواب دیا۔

میں پوچھتا ہوں بچے۔ جھیل کنارے والی بات۔ حبیب الرحمٰن شرارت کے موڈ میں تھا۔ ویسے ہم سب اسی موڈ میں تھے۔

جھیل کنارے کہاں صاحب۔ میں تو ہانگچو پہلی بار آپ کے ساتھ آیا ہوں۔ کامریڈ نے جواب دیا۔

واپس ہوٹل پہنچ گئے۔

بوڑھی میمیں، کھانگڑ صاحب، جاپانی، فرانسیسی، ڈچ، اطالوی، امریکی، ہندوستانی، برمی، نیپالی، افریقی تمام ممالک کے سیاح بریف کیس اٹیچی کیس لفافے اور بیگ اٹھائے ارض چین کی جنت ہانگچو دیکھنے آ رہے ہیں۔ حبیب الرحمٰن اپنے انتظامی امور کے سلسلے میں چلا گیا۔ کامریڈ شان کو میں نے بھیج دیا اور لاؤنج میں بیٹھ کر سگریٹ نوشی کے مزے لینے لگا۔ پھر ہانگچو ہوٹل کے بک سٹال کا خیال آیا تو تیسرے فلور پر وہاں پہنچا۔ چینی انگریزی رسالے کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس ہوٹل کی کشادگی اور جھیل کے کنارے نے اس کی فضا میں بڑی فرحت بسا رکھی ہے جی چاہتا ہے۔ بس گھومتے رہو۔ سو میں چینی مصوری کے شہکار جو جا بجا آویزاں تھے۔ دیکھنے لگا میرے پاس لفٹ کا دروازہ کھلا۔

ہیلوینگ مین ۔ امریکی ۱۸ سالہ ڈشکرا تھا۔ جو تجھے دیکھ کر پکارا۔ بغل میں ایک اٹھارہ انیس سالہ برطانوی گلیمر گرل دبائے ہوئے لفٹ سے باہر آیا۔

کیسی ہے مصور؟

خوبصورت ۔ میں نے داد دی ۔

ہاں یہ بہت خوب صورت ہے اور نوعمر بھی ہے ۔ امریکی ڈشکرا سینہ پھیلا کر اور اپنے بازوؤں کے پٹھے اور بھی ابھار کر بولا۔

ہاں واقعی ایسا ہے۔ نوعمر ہے۔ مگر صبح تک بوڑھیا بن جائے گی۔ انشاء اللہ تمہاری گپیں سن سن کر۔

میں نے کہا۔

اونہیں یہ مجھ سے بھی زیادہ باتونی ہے ۔ اُس نے کہا۔

باتونیوں میں بھی جنریشن گیپ ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔

تمہارے ساتھ کوئی لڑکی نہیں۔ اُس نے پوچھا۔

ہے مگر میرے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہے ۔ میرے دل کے باغ میں ۔ میں نے اُسے یقین دلایا۔

چھوڑو یہ افلاطونیت ۔ زندگی کی راہ میں بڑے شہر آتے ہیں ۔ ہر شہر میں مزا لینا چاہیے ۔ اُس نے اپنا مسلکِ عشق بیان کیا۔

ہر شہر میں نیا دل بدل لینے سے تمام شہر ویران لگنے ہیں اور انسان تمہاری طرح محض گپ باز بن جاتا ہے ۔

وہ یہ سن کر پورے زور سے قہقہہ لگا کر لڑکی کی کمر میں بازو کا حلقہ اور تنگ کر کے اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

حبیب الرحمٰن ٹیلیفون پر بیجنگ میں اپنے بچے اور بیوی سے گپ لڑا رہا تھا اور پاس بیٹھی ویٹرس سے چھیڑ خانی کرتا جاتا تھا۔

میں نے کہا۔

حبیب الرحمٰن وہ امریکی گپی ہانگجو میں ایک جوان مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ہے بھائی ۔

وہ بڑا حرامی ہے سالا ۔ اپنی صحت کا راز جانتا ہے ۔ حبیب الرحمٰن نے کہا۔

ویسے حبیب الرحمٰن تم ٹیلیفون پر بیوی سے بات کرتے ہو ۔ اور گپ لڑاتے ہو اس چینی گڑیا سے ۔ سنجوگ کی اس ایک گھڑی کے بعد ہجر کی لمبی رات کے قہر سے ڈرو ۔

ارے نہیں ۔ حبیب الرحمٰن نے کہا۔

میں تو تمہارا تعارف اس میٹھی لڑکی سے کروانا چاہتا ہوں ۔

پھر حبیب الرحمٰن نے ویٹرس کو خلا میں انگلی سے چہرہ بنا کر میرا تعارف کروایا اور ویٹرس نے خوش ہو کر اپنے چہرے کے گرد انگلی گھمائی اور حبیب الرحمٰن سے متوجہ ہوئی ۔ حبیب الرحمٰن نے بتایا۔

یہ کہتی ہے میری تصویر بنائے گا اور میں نے کہہ دیا ہے ۔ ہاں بنائے گا ۔ اب تم اس کی تصویر آج ضرور اپنے کمرے میں بنانا رہیں اس بہانے سے اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنانے کی کوشش کروں گا ۔

پھر حبیب الرحمٰن نے اُسے اشارہ کیا۔ وہ میرے کمرے کی چابی لے کر میرے آگے چل پڑی۔ چھوٹی سی گڑیا سی۔ سفید پینٹ جیکٹ اور ماؤ کیپ میں بہت معصوم سی لگ رہی تھی۔ اُس نے میرا کمرہ کھولا پھر روشنی کی اور فریج دکھایا۔ باتھ روم دکھایا۔ سلیپر بیڈ کے نیچے سے باہر نکالے اور مؤدب کھڑی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے شے شے کہا۔ وہ جواب میں شے شے بولی اور پلٹ کر دھیمے دھیمے دروازے میں جا کر رکی اور پھر شے شے کہا۔ میں نے بھی پھر شے شے کہا اور وہ چلی گئی۔ اللہ غریقِ رحمت کرے عدم صاحب کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

دیکھنا جھومنا دعا دینا
ہم یہی کاروبار کرتے ہیں

گرم پانی کا غسل کیا اور تولیے لپیٹ کر کمرے کی گرم فضا میں فرحت محسوس کرتا گھومنے لگا۔ پھر کھڑکی کھولی اور ویسٹ لیک کا نظارہ کرنے لگا۔ میرے کمرے سے قائمہ زاویہ بناتے کمرے کی کھڑکی کھڑاک سے کھلی پردے کرچ کر کے سمٹے اور امریکی ڈشکرا شیطان کی طرح پھر سامنے تھا اور اُس کمرے میں اُس نوعمر حسینہ کو سٹرپ ٹیز سکھا رہا تھا۔ شاید اُسے بوڑھا لباس پہنانا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لی۔ پردل کی کھڑکی کھل گئی۔

دلِ پرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پرخوں۔ دلِ پرخوں
دلِ ناداں دلِ ناداں۔ ناداں
دلِ ناداں کی بازیابی سے .....
کچھ تو فرصت .... کچھ تو فرصت ....
کچھ تو فرصت ملی خرابی سے
صحنِ مقتل میں جا ... صحنِ مقتل میں جا نکلتی ہے۔
وہ گلی، اس کی بے نقابی سے
جانے کیا کیا کہاں گنوایا ہے
اے جنوں تیری ہمرکابی سے
سیرِ شہر .... سیرِ شہرِ ستم .... سیرِ شہرِ ستم شعاراں میں
ہم تو پھرتے رہے شرابی سے
کشتِ دل ۔ کشتِ شب میں .....
صحنِ شب میں ..... صحنِ شب میں چراغ جلتے ہیں .....
صحنِ شب میں ..... کشتِ شب میں نجوم اُگتے ہیں
کشتِ شب میں نجوم اُگتے ہیں۔

تیرے پیکر کی آفتابی سے

۱۹ر نومبر کی صبح ناشتے کے بعد ویسٹ لیک میں لانچ پر سیر کی۔ لانچ میں بیٹھتے ہی گرم گرم قہوہ اور کینو دیے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ آسمان صاف اور جھیل کا پانی صاف شفاف، کنول کے پھول اور سبز پتے اور مرغابیوں کے غول کے غول دھومیں مچا رہے تھے۔ ہانگچو شہر واقعی جس نے نہیں دیکھا اُس نے چین نہیں دیکھا۔ ہر چند کہ چینی میزبانوں کی اس شہر کی تعریف میں ہم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر یہ بتانا نہ بھولے کہ پاکستان میں لاہور نام کا ایک شہر زمانے میں مشہور ہے اور جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

ہانگچو صوبہ ژی جیانگ کا دارالسلطنت ہے۔ اور تاریخ تقریباً دو ہزار سالہ پرانی ہے۔ سانگ خاندان کے زمانے میں یہ شہر چین کا سب سے بڑا شہر تھا اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ اطالوی سیاح مارکوپولو نے اس شہر کی تعریف یوں کہ کرۂ ارض پر جنت ہے۔ اور پریوں کے باغ کی طرح اس جہانِ فانی میں واقع ہے۔ سبز سبز پہاڑیاں، نیلا آسمان، باغات، پانی، ہوا اور جھیل ——— چینی کینو جنہیں چینی میزبان بیجنگ سے ہانگچو تک بڑے فخریہ انداز میں پیش کر کے تعریفوں کے پل باندھتے نہ تھکتے تھے۔ درمیانے سائز کا پھل زیادہ چھلکا سبز اور کہیں کہیں سے برائے نام نارنجی اور ذائقے میں بھی ترشی غالب مگر پھر بھی ہر چینی اس کا دیوانہ تھا۔ ہمارے ہاں کے کینو کے ڈھیروں میں سے چھانٹی سے بھی ایسے بہت نکلیں مگر پھر بھی کم نکلیں۔ ارباب نیاز نے انھیں پاکستانی کینو بھجوانے کا وعدہ کیا اور ہم اس جھیل کے ایک جزیرے ژونگ شان پارک میں اتر گئے۔ دنیا بھر کے پودے اور درخت اس جگہ بہار دکھاتے ہیں۔ اُس جزیرے میں چھوٹے چھوٹے تالاب جن میں سرخ سنہری اور پیلی مچھلیاں کھیلتی ہیں۔ یہاں پورے ہانگچو پر ایک بھرپور نظر پڑتی ہے۔ ہو نہ ہو یہی جگہ ہے۔ جہاں سے مارکوپولو نے ہانگچو شہر کو دیکھ اسے جنت کہا تھا۔ یہاں ایک چھوٹے روایتی چینی طرز کے پگوڈا نما کیفے میں کنوں کا گرم گرم شیرہ پینے کو ملا۔ کیا چیز پی تھی کہ رگ و پے میں روشنی سی اتر گئی۔ سگریٹ سلگائی اور اکیلا کیفے سے نکل کر باہر کھلی فضا میں سُرخ نارنجی پتوں والے سایہ دار درخت کے نیچے آکر رک گیا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے چاروں اور اپنا کشکولِ نگاہ گھمایا۔ اس شہر پر نیلا آسمان جس میں سفید بادل تیرتے ہیں نیچے گہرے سبز، نیلے، گہرے نیلے پہاڑ اور پہاڑوں کے دامن میں درختوں کے جنگل جن میں رنگ برنگے مکانات اور اس سارے منظر کا عکس اپنے پانی میں اتارتی جھیل اور جھیل کے قلب میں یہ جزیرہ — جہاں سحرِ فطرت وجدان کو مرتکز کرتا ہے۔ اور لہر لہر دائرہ دائرہ گیان کو کھولتا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے فطرت فی الواقع سکون و اطمینان اور یکسوئی کے حصاروں میں ہو پانی دھوپ کے خمیر سے کسی جنت کی صورت گری میں راز داری برت رہی ہو۔ یہاں وہ چند لمحے بھی آئے جو مجھ پر طاری نہ ہو سکے بلکہ میری مراجعت کے منتظر رہے۔ مجھے اپنے تسلسل میں سمونے کے لئے معطل رہے۔ وہ چند لمحے جو لافانی ہیں۔ انھیں اس حیات سے الگ سمجھنا چاہتا ہوں کہ یہ حیات فانی ہے اور حیاتِ فانی تو خود ایک وقفہ ہے یہ کسی تعطل کی متحمل نہیں ہو سکتی — میرا بدن شکن در شکن تہ در تہ سمٹ کر گھاس

پر رہ گیا تھا۔ میں فی الواقع زمین سے اٹھ گیا تھا۔ چاروں اور پھیل گیا تھا۔ تمام رنگ میرے نصرف میں اور ہر خوشبو میری مٹھی میں تھی۔ میں نے ہوا کے گیت سنے اور کرنوں کا تاج پہنا تھا ــــ ان لمحوں کا احساس تب ہوا تھا۔ جب میں نے دوبارہ ہی بدن کا لباس پہنا تو جیب و داماں میں ہزار دکھ تھے۔ زخم تھے۔ میں نے دیکھا آغا ناصر مجھے عجیب کیفیت میں دیکھ کر مضطرب تھا۔ شاید وہ میرے ہی جیسی کسی کیفیت کے کسی کنارے پر جا کر لوٹ آیا تھا۔

آغا ناصر بارہ کا رلائل سے کسی نے پوچھا کہ میاں صاحب تمہارے یوٹوپیا میں آخر لوگ کریں گے کیا؟ تو اُس نے کہا تھا۔

"لمبی لمبی پیار بھری باتیں ــ کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں"

مگر ہمارے چینی مہمان ہمیں کاروں کی جانب بڑی جلدی سے بلا رہے تھے۔ بس ہم چند منٹ کی ڈرائیو سے پیگوڈا آف سکس ہارمنیز پہنچ گئے۔ اس پیگوڈے کے دامن سے اس کی بلندی پر نظر ڈالنے کے لیے سر کی ٹوپی گرانے کے ساتھ اُلٹ بازی بھی لگانی پڑتی ہے۔ یہ پیگوڈا ۹۷۰ عیسوی میں سانگ خاندان کے عہد میں تعمیر ہوا۔ ۱۱۵۶ء میں اس کی تعمیر دوبارہ ہوئی اور انقلاب کے بعد اسے مستحکم کیا گیا۔ اس کی ۱۳ منزلیں ہیں۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر تیسری منزل تک گئے کہ دیگر سیاحوں کے ساتھ ہمیں بھی روک دیا گیا۔ شاید انقلاب کے بعد اسے دوبارہ مستحکم کرنے کا ارادہ تھا۔

یہاں سے اترے اور دریائے کیان تنگ کے کنارے کنارے چائے کے باغات میں پہنچے۔ پہاڑی ڈھلوانوں پہ چائے کے باغات اس قدر خوش منظر ہیں کہ چائے کے سمندر پیئے ہوئے لوگوں کے دل میں چائے نوشی کے لئے ایک نیا حوصلہ پیدا ہوتا اور ساتھ ہی جذبۂ رقابت بھی جاگتا ہے اُن کے لیے جو دوشیزہ کے ہونٹوں جیسی گرمی اور مٹھاس والی اس معصوم شے کو ترک کرنے کے مشورے دیتے اور موٹی موٹی کتابوں سے حوالے لاتے ہیں۔ ذرا یہ باغات دیکھ لیں تو ماتم کریں اپنی کور ذوقی کا جسے وہ عقلمندی سمجھے بیٹھے ہیں۔ ذوق اللہ کی خاص دین ہے عقل سے محروم تو وہ کسی کو نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ہی بانس کا جنگل "BANDOO GHOUE" میرے لیے خاص دلچسپی کا سامان رکھتا تھا۔ چینی مصوری میں بانس کا تنا، رہتے وہی کام کرتے ہیں۔ جو آرکسٹرا میں طبلہ ایک پرانی جھونپڑی کے ساتھ سے شروع ہو کر جنگل میں جاتی پگڈنڈی چینی پینٹنگز اور ایمبرائیڈری کے نمونوں میں بارہا دیکھ چکے ہیں۔ اس پگڈنڈی کے دونوں جانب بانس کا جنگل ایک سبز چتکبرا اور بھیگا بھیگا حسن رکھتا ہے۔ ایک مہک ہلکے ہلکے دلوں کو چھیڑتی ہے۔ سکون ہی سکون اور خاموشی ہی خاموشی۔ یہ پگڈنڈی جو اس جنگل کے بیچوں بیچ گزرتی ہے۔ چائے کے باغات سے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتی اختتام تک جاتی ہے۔ سیاہ پتھر کی سلوں سے بنی ہے اور جنگل کے گہرے سبز حسن میں اس پگڈنڈی کا ہر مسافر اپنے کسی نہ کسی خواب کے کنارے جا نکلتا ہے۔ سترہ سالہ مونا لیزا کا پچاس سالہ عاشق لیوناڈو ونچی اپنے ایام دل زدگی میں کہاں کہاں نہ مارا مارا پھرتا تھا۔ اُس نے چین میں بھی آوارگی کی۔ یہ معلوم نہیں کہ ماتگچو آیا اور اس نے یہ پگڈنڈی دیکھی کہ نہیں لیکن مونا لیزا کے دائیں کاندھے سے پھوٹ کر بل کھاتی کسی جھیل کنارے سرکنڈوں میں گم ہوتی پگڈنڈی کا سحر اس پگڈنڈی کا ہمزاد ہے۔ میں اس پگڈنڈی کے ٹھنڈے ٹھنڈے ماحول میں نہ جانے کن کن گلیوں میں دلگیر پھرتا تھا کہ کامریڈ لن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ پوچھتا تھا۔

اس عورت کی کیا عمر ہے؟

بالوں کی دو چوٹیاں شانوں پر گرائے نیلی پینٹ جیکٹ میں ملبوس درمیانے قد کی بنا تراش بنا تراش لڑکی تو ہمارے ساتھ نہ تھی۔ یہ اس جنگل میں کہاں سے نکل آئی۔ میں نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ یقین نہ آتا تھا مگر مسٹر لن کے سوال میں عورت لفظ کو سہارا بنا کر عمر بتائی۔

پچیس سال

اور کامریڈ لن سے درخواست کی اگر میرے قیافے میں یہ عمر اس کی اصلی عمر سے بہت زیادہ ہو تو ٹال جاؤ۔ آخر عورت ہے۔

کامریڈ لن نے اُسے میرا قیاس بتایا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی اور یکدم اور بھی حسین ہو گئی۔ اُس نے جھک کر میرا شکریہ ادا کیا۔ شے شے۔

تب کامریڈ لن نے بتایا۔ اس کی عمر بیالیس برس ہے۔

یہ سن کر ہم اُسے دیکھتے رہ گئے وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی حسین سے حسین تر ہوتی چلی گئی چمکدار پورے دانت، روشن آنکھیں سُرخ سفید رنگت، سڈول جسم چست و چالاک زندگی سے بھرپور بیالیس سالہ عورت ہی ایک مستعد اور محنت کش سرزمین کی مونالیزا ہو سکتی ہے۔ جس کا حسن اتنا پائیدار ہو کہ وہ اینٹیں اٹھا سکے، چنائی کر سکے، ٹرک چلا سکے، ٹریکٹر چلا سکے، فصل کاٹ سکے، سر پہ منوں بوجھ اٹھا کر چل سکے اور محبوب اگر رزق کی تلاش میں دور دیس گیا ہو تو اس کی امانت اپنے حسن و جمال کی حفاظت برس ہا برس کر سکے بغیر کوئی دانت گرائے کوئی ایک بال بھی اپنے سر کا سفید نہ ہونے دے اور آنکھوں کی پوری چمک سنبھال سکے لمحۂ وصال تک ——— چین کتنا مختلف خطۂ زمین ہے ——— اس جنگل میں ایک اور قسم کے بہت سارے درخت پگڈنڈی کے ساتھ رنگ برنگے پتوں اور پھولوں والے ہیں۔ بہت تناور ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر کی عمریں ایک ہزار سال بتائی جاتی ہیں۔ جنگل کی سیر کو سب نکلے تھے۔ کس کس نے درخت گنے اور درختوں کے اسرار کس نے سمیٹے، کون جنگل میں گم ہوا کس نے راستہ پایا۔ سگمنڈ فرائڈ کے بقول کون دیوانہ اور کون کون فرزانہ تھا۔ یہ تفریق ہونے کی نوبت چینی یاروں نے آنے ہی نہ دی۔ سب کو گھیر گھار کر لے آئے تھے۔

ہانگچو ہوٹل میں کھانا کھایا اور چند لمحے آرام بھی نہ کیا کہ ہانگچو کی ایک مادام اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ کچھ کاغذ کچھ رنگ اور کچھ اور خریدنے روانہ ہوئے جھیل کنارے چلتی کار مادام نے ایک جگہ رکوائی اور ہمیں ساتھ لے کر شملہ پہاڑی طرز کے ایک ٹیلے پر چڑھنے لگی۔ کیا بھول بھلیاں تھیں۔ پتھروں اور درختوں کی فنکارانہ تراش خراش دیکھنے کی بات تھی۔ اندر داخل ہوئے تو وہ ایک ڈرائنگ میٹریل سٹور تھا۔ اس سٹور تک رسائی ایسے پُرتکلف راستوں سے اللہ اللہ بہ سلیقہ یہ قرینہ کہ ان راستوں سے گذرتے گذرتے ایک سیدھا سادا انسان بھی مصور بننے کے ارادے باندھنے لگے۔ کچھ واٹر کلر پیپر خریدے۔ کچھ گاش کی ٹیوبیں خریدیں۔ پھر اگلے سٹور پر اور اس کے بعد تیسرے اور چوتھے سٹور پر۔ اس خرید و فروخت کے بعد ایک پرہجوم چوک میں ہم نے چینی ریوڑیاں اور گچک کھائی اور کاجو کی خستگی کا لطف اُٹھایا۔ بعد میں فرینڈ شپ سٹور سے دلیدہ لئے اونی سوٹ، سعدیہ کے لئے روائتی چینی لباس، فہیم کیلئے جیکٹ اور پروین کے لیے کھلا کپڑا خریدا۔ پھر کار ایک جگہ کھڑی کر کے ہانگچو کی سیر بس نمبر ۱۱ پر خوب خوب کی۔ پیدل مارچ کرنے کو بس نمبر ۱ کہتے ہیں۔ جیسے ہمارے لاہور میں پاگل خانہ کے لیے بس نمبر ۴ مخصوص ہے۔ پھر ہانگچو کا پیپلز سکوائر دیکھا۔ ایک نمائش گاہ دیکھی۔ واپس آئے تو شام کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہانگچو کے میئر نے کھانا دیا۔ جام صحت اور تقریریں۔ خیر سگالی کے جذبات کا اظہار اور ہانگچو کے حسن و جمال کی تعریف

میں شاعری ہوئی۔

تھوڑی دیر ہانگچو ہوٹل کے فرینڈ شپ سٹور میں نوادرات دیکھتے رہے۔ جو خرید سکتے تھے انہوں نے خریداری بھی کی پھر سب واپس اپنے اپنے کمروں کو چلدیئے۔

میں چوتھے فلور پر پہنچا تو پھر وہ چینی گڑیا مجھے دیکھتے ہی چابی لے کر میرے آگے آگے چل دی۔ کھڑاک سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک جاپانی تیزی سے باہر نکلا اور زبردستی اس چینی گڑیا کے ہاتھ میں کچھ تھمانے کی کوشش کی۔ جسے چینی گڑیا نے جھٹک دیا۔ مجھے سونے کے خول چڑھے دانتوں والے اس جاپانی کی اس حرکت پر سخت طیش آیا اور میں نے بدمعاش، پٹھے، لفنگے، شورے، اچکے اور غنڈے جیسے القابات سے اُسے نوازا ـــــ وہ میری طرف کھی کھی کرتا ہوا کھسیانی ہنسی ہنستا رہا۔ تب مجھے خیال آیا کہ یہ سب گالیاں جو میری تالیفِ قلب کا باعث ہوئیں۔ سب بیکار گئیں اور یہ تو شاید مورا وور (MORE OVER) والی زبان بھی نہ سمجھے گا۔ آزمانے کے لئے میں نے اُسے پوچھا۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو" وہ کچھ سمجھ گیا اور فوراً بولا۔ "ویری گڈ" اور آداب عرض کرنے کے انداز میں واپس کمرے میں گھس گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو چینی گڑیا دروازہ کھول کر روشنی کئے درمیان میں کھڑی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو اُس نے اپنے چہرے کے گرد انگلی گھمائی۔ میں سمجھ گیا۔

میں نے پیڈ نکالا اور چند منٹ میں اُس کا پروفائل بنا کر اُسے دے دیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ زمین پر بالکل پتلی کی طرح اچھلنے کودنے لگی۔ میں دیکھتا رہا۔ پھر کچھ بولی۔ جس میں سے صرف شے شے سمجھ سکا۔

میں نے بھی کہا۔ شے شے۔

شے شے۔ وہ پھر بولی۔

شے شے۔ میں نے ذرا لٹکا کرا دا کیا۔

وہ شے شے کہتی نہ رکتی تھی اور بڑی احسان مند نظروں سے مجھے دیکھتی جا رہی تھی اور مجھے یہ دقت آن پڑی تھی کہ اسے کس طرح کہوں کہ تمہارا شکریہ قبول ہوا۔ اب جاؤ ـــ لیکن وہ چند قدم ادھر چند قدم ادھر گھوم کر پھر قدرے جھکتی اور شے شے کہتی۔ اپنے اسکیچ پر انگلی گھما کر پھر اپنے چہرے کے گرد انگلی پھیرتی اور آنکھیں خوشی سے پھاڑ پھاڑ کر داد دیتی جو میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ حبیب الرحمٰن بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ مجھے کل صبح می شوشوئے ژدین ہانگچو کا دورہ کرنا ہے۔ میں نے کہا۔

اچھے بچے حبیب الرحمٰن یہ می شوشوئے ژدین کا مطلب تو بعد میں پوچھوں گا۔ یہ چینی گڑیا کو میں نے اس کا اسکیچ بنا دیا ہے۔ وہ درمیان میں بلند آواز میں بولا۔ شاباش نوک پلک بالکل درست کر کے چھوڑنا۔ اور اگر کوئی خامی رہ گئی ہے تو کہہ دو فنشنگ ٹچ مجھ سے لگوا لے۔

او میرے بچے حبیب الرحمٰن میری بات سنو۔ میں نے اُس کا اسکیچ بنانے میں اتنی دیر نہیں کی۔ جتنی دیر سے وہ میرا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ شے شے کی رٹ ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔ میں اسے ٹیلیفون دیتا ہوں۔ تم اسے چینی میں کہہ دو کہ میں اُس کا شے شے قبول کر چکا اب وہ اپنی ڈیوٹی پر واپس جائے۔

اچھا تو مشکل میں ہیں آپ دیں اُسے۔

میں نے چینی گڑیا کو ریسیور دیا تو وہ سخت گھبرائی۔ مگر پھر اُسے حبیب الرحمٰن کی آواز سن کر اطمینان ہوا۔ میری تعظیم میں جھکی شے شے کہا۔ دھیمے دھیمے دروازے تک گئی پھر پلٹ کر جھکی اور شے شے کہہ کر چلی گئی۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور ویسٹ لیک کی جانب کھڑکی کھول کر وہ جزیرہ جواب اک سیاہ ڈیہ تھا اُس میں اُس درخت کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جس کے پتے سرخ پیلے اور نارنجی تھے۔ جہاں میں نے اپنا کشکولِ نگاہ چاروں اور گھمایا تھا۔ اس شہر پر نیلا آسمان جس میں سفید بادل تیرتے ہیں۔ نیچے گہرے، سبز، گہرے سبز، نیلے، گہرے نیلے پہاڑ، پہاڑوں کے دامن میں درختوں کے جنگل جن میں رنگ برنگے مکانات اِس سارے منظر کا عکس اپنے پانی میں اتارتی جھیل اور جھیل کے قلب میں یہ جزیرہ جہاں دھیان لہر لہر مرتکز ہوتا ہے اور گیان دائرہ دائرہ پھیلتا ہے۔ لیکن جب وہ درخت مجھے اس وقت دکھائی نہ دے سکا تو میں نے اپنے کشکولِ نگاہ کی ریزگاری کا میزان کیا۔ تب دھیان کی کھڑکی گیان میں کھلی اور گیان کے آخری افق پر وہ ستارا چمکا جو استعارہ ہے کسی جنت گم گشتہ کا جس کی تلاش میں انسانی متخیلہ پر پرواز کھولتی ہے۔ ہر اُس شانت لمحے میں جو بڑا کمیاب ہے کہ ہر نئی ایجد صدیوں کی گویائی کے خمیر سے اٹھتی ہے اور انسانی حواس سے شناسائی پیدا کرنے کے لئے زمانوں کا تسلسل درکار ہوتا ہے۔ تب پرندوں کی چہکار میں ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ ہوا کی سرسراہٹ میں سُر کی پہچان ہوتی ہے۔ پتوں پر تحریروں کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے سبز سرمئی چمپئی رنگوں والے ابر دباد، برگ و بار، مرغ و ماہی اور آب و گل کے شہر اہلِ چین کی جنتِ ارضی ہانگچو کی جھیل کے قلب میں اُس جزیرے پر میں نے پھر نظر ڈالی جہاں سورج کی شعاعوں کا کھیل دیکھنے کی عادی آنکھ شعاعوں کے تعاقب میں آسمان کی جانب بھی اُٹھ ہی جاتی ہے ؎

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست

۲۰ نومبر کی صبح بیدار ہوا۔ غسل اور شیو کے بعد زیادہ ہی گرم کپڑے پہنے کہ گزشتہ شب سے ہانگچو کا موسم بھی بہت سرد ہو گیا تھا۔ کافی کا کپ پکڑا اور کھڑکی کھول کر ویسٹ لیک پر سورج کی کرنیں بکھرتی دیکھنے لگا۔

پھر ناشتہ کے لیے تیسرے فلور پر اترا۔ ناشتہ کے بعد چی چیانگ می شو شوئے ژو ین ہانگچو ZHE JINNG
ACADEMY OF FINE ARTS HANG ZHOV کے لیے روانہ ہوئے۔ جو ہانگچو ہوٹل سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے روایتی چینی مصوری کے مشہور زمانہ مصور تن پائی (TIN PAI) جو اس اکیڈیمی کے وائس پرنسپل ہیں چشمہ لگائے نیلا مفلر گلے میں ڈالے استقبال کے لیے آئے۔ اس درس گاہ میں پینٹنگ ڈیزائننگ، کیلی گرافی، سکلپچر اور روڈکٹ کے شعبوں میں طلبا اور طالبات کی کثیر تعداد زیرِ تعلیم

ہے۔ یہ اکیڈیمی چین کی سب سے بڑی فنون کی درس گاہ ہے۔ یہاں ۲۳۰ ملکی طلبا ہیں۔ ۱۷۰ اساتذہ ۸ پروفیسر ۲۰ نائب پروفیسر اور خاص تجربہ اور مہارت رکھنے والے ۸۰ استاد ہیں۔ جاپان کے ساتھ جنگ کے دوران اس اکیڈیمی پر کافی کڑا وقت گذرا اور یہ اکیڈیمی چین کے مختلف شہروں میں نقل مکانی کرتی پھری۔ ثقافتی انقلاب میں بھی کڑی آزمائش سے گذری۔ اب اس کے حالات سازگار ہیں۔

ہمیں تمام شعبے دکھائے گئے اور ہر شعبے میں درس و تدریس کا طریق کار سمجھایا گیا۔ طلبا اور طالبات کو مصروف فن دیکھا اساتذہ کا معلمانہ خلوص اور طلبا کا انہماک قابل ستائش ہے۔ تربیت کے جتنے کڑے مدارج اور مراحل اس درس گاہ کے ہیں اور جس قدر محنت کروائی جاتی ہے۔ اس کی بنا پر یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک کے برعکس چین میں کوئی جعلی آدمی فنون لطیفہ میں نہیں گھس سکتا۔ اس درس گاہ میں روایتی اور جدید مصوری دونوں کی تدریس کا انتظام ہے۔ چین کی جدید مصوری میں اب مغربی اثرات بکثرت جگہ پا رہے ہیں میں نے یہاں کسب کمال اور خط کمال کا مظاہرہ کیا۔ کسب کمال کی داد تو فوراً مل گئی مگر خط کمال میں وہی شیشنگ ہائی والا مسئلہ تھا کہ رنگ و خطا کی تفہیم تو جلد ہو جاتی ہے۔ مگر اب جو نسل زیر تعلیم و تربیت ہے اس کیلئے عبارت کا مفہوم قطعی طور پر اجنبی اور تعجب انگیز ہے چونکہ ہماری فنکارانہ خطاطی کا پسندیدہ مواد آیات قرآنی ہیں۔ اور چینی بھائی تو آسمان کی سمت دیکھتے ہی نہیں۔ وہاں سے اترنے والی کتابوں کا ان کے ہاں تصور بھی ناپید ہے۔ خط کمال کے تزئینی عناصر یعنی مسلم فن تعمیر کے گنبد و مینار ان کی سمجھ میں نہ آتے ہوئے دیکھ کر میں نے مشہور چینی خطاط اور اس درسگاہ کے استاد کامریڈ لیو چیانگ کو زحمت فن دی۔ انہوں نے ایک مشہور نظم جو وطن کی محبت میں ہے۔ اس کے دو اشعار لکھے۔ تو میں نے برش سے اس خطاطی کو پینٹنگ میں بدل دیا۔ پگوڈے، کنول کے پھول، پہاڑ، دریا اور بانس کی شاخیں دیکھ کر انہوں نے خوب خوب داد دی اور میرے گنبد و مینار کا ابلاغ ہونے لگا۔ میں نے یہ تصویریں اسی شعبے کو پیش کر دیں اور شے کی آوازوں کا درس کانوں میں گھلنے لگا۔ اس درس گاہ میں دو پاکستانی لڑکیاں بھی زیر تعلیم ہیں۔ مس تانیا ثانی اور مس سیمیں اعجاز خاں۔ جن سے ان کی تعلیم کے بارے میں بھی تبادلہ خیال ہوا۔ دونوں بڑی لگن سے فن سیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پاکستان میں اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا۔ جو میں نے تابناک بتایا۔

اس اکیڈیمی سے نکل کر سیدھے ہانگچو ہوٹل آئے اپنا سامان گاڑی میں رکھا تاکہ مزید سیر و سیاحت کے بعد سیدھا ہانگچو ریلوے سٹیشن پہنچ جائیں۔

ہانگچو مصوروں اور شاعروں کا شہر ہے۔ ہر قدم پر ایک نیا احساس حسن اور انوکھا پن دکھائی دیتا ہے۔ ویسٹ لیک کے کنارے خوشنما راہداری ہے جس پر تھوڑے فاصلے پر دیدہ زیب پویلین ہیں۔ جہاں سے سیاحوں کو ریفریشمنٹ مل سکتی ہے۔ ہانگچو کے آسمان سے جنگی طیاروں کی پرواز کی آواز بھی آتی رہتی ہے۔

جھیل کنارے ایک ٹیلے کے دامن میں ایک سفید براق مجسمہ دعوت دید دیتا ہے یہ اس انقلابی خاتون کا ہے۔ جس نے اس علاقے میں بادشاہت کا تختہ الٹنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ میں نے چند پھول توڑ کر اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔ ویسٹ لیک کے کنارے ہانگچو ہوٹل سے ملحق ایک ہیرو جنرل کا ٹمپل اور قبر ہے۔ دیکھنے کی چیز ہے۔ اس یادگار میں داخل ہوں تو ایک

خوب صورت قطعۂ زمین کے آگے ٹیلہ ہے جس میں یوی فی (YUE FIE) کا دیوہیکل مجسمہ ہے۔ یوی فی (۱۱۰۳-۱۱۴۲) عیسوی میں جنوبی سانگ خاندان کا فوجی جرنیل تھا۔ شمالی حملہ آور تاتاریوں کے خلاف مردانہ وار لڑا۔ بعد میں چاؤ گو کے عہد میں ہانگچو کی جیل میں اس پر مقدمہ چلا اور پھانسی چڑھایا گیا۔ آٹھ سو سال سے چینی لوگ اُسے خراجِ عقیدت پیش کرنے آتے ہیں۔

ٹیلہ کے دائیں جانب اس کی قبر ہے۔ جو ۳ فٹ اینٹوں کی چنائی پہ مٹی کے گول ڈھیر پہ سبز گھاس اگی ہے۔ اس قبر کے پہلو میں ایسی ہی مگر چھوٹی قبر اُس کے بیٹے کی ہے۔ قبر تک راستے میں دو رویہ دانشوروں کے مجسمے آمنے سامنے تعظیماً کھڑے ہیں۔ ذرا پیچھے ہٹ کر گھوڑے بیل اور شیر کے مجسمے ہیں۔ ایک کونے میں غدار چاؤ گو اور اس کی بیوی کے مجسمے ذلت و رسوائی کی علامت بنے سرنگوں ہیں۔ لوگ ان پہ تھوکتے ہیں۔ ہم نے بھی لعنت بھیجی۔

یوی فی کے ٹیلہ کے دروازے سے ٹیک لگائے ایک چینی ماں اپنے شیر خوار بچے کو بڑے نارمل انداز میں اپنی چھاتی ننگی کئے دودھ پلاتے دیکھ کر یاد آیا۔ کنفیوشس نے کہا تھا "اس دنیا میں ہر آنے والا بچہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا"۔

یہاں سے سیدھے ہانگچو ریلوے سٹیشن پہنچے۔ دی آئی پی لاؤنج میں ارباب نیاز بیگم ارباب نیاز، افضل قادر بیگم افضل قادر حبیب الرحمٰن کا مریڈ شان اور مادام چنگ سب منتظر تھے۔ بارہ بج کر پچاس منٹ پر ہانگچو سے شینگ ہائی کے لیے ریل کی روانگی تھی اور بارہ بج کر نیتالیس منٹ پر پلیٹ فارم کے قرب وجوار میں بھی ریل کا نشان تک نہ تھا۔ آغا ناصر نے لاہور ریلوے سٹیشن کا وہ معروف لطیفہ سنایا۔ کہ ایک گاڑی آتے دیکھ کر مسافروں نے خوشی سے تالیاں بجائیں کہ شکر ہے آج تو گاڑی وقت پر آ ہی گئی۔ مگر پاس سے ایک محرم راز نے بتایا۔ بھائیو! یہ وہ گاڑی ہے۔ جس کو گذشتہ کل یہاں اس وقت پہنچنا تھا

ہاں ہم پاکستانیوں کی برکت سے یہاں بھی تھوڑی بہت تاخیر تو ضرور ہوگی۔ حبیب الرحمٰن نے کہا۔

مگر ہم پاکستانی چین میں بابرکت ثابت نہ ہوئے۔ ۱۲ بج کر ۴۷ منٹ پہ گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ ٹکٹ پر پلیٹ فارم کا سیکشن بھی درج ہوتا ہے۔ مسافر وہاں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ریل کا ڈبہ بھی بالکل اُن کے سامنے آ کر رکتا ہے۔ مسافر ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور اترنے والے دوسرے دروازے سے نکلتے ہیں۔ ہمارے ہاں کا منظر جس میں کچھ مسافر سامان اٹھائے اپنے ڈبے کی تلاش میں پیچھے اور آگے کو بھاگتے ہیں ٹکراتے ہیں اور ایک طوفانِ بدتمیزی پیدا ہوتا ہے۔ چین کے ریلوے اسٹیشنوں پہ یہ عالمِ ناپید ہے۔ گاڑی کے سوار مسافر اگر اپنی منزل پر اترنے میں کسی وجہ سے ذرا لیٹ ہو جائیں تو پھر وہ کھڑکی سے کودتے ہیں۔

۱۲ بج کر پورے ۵۰ منٹ پہ ریل گاڑی ہانگچو سے شینگ ہائی کے لئے روانہ ہو گئی۔

گاڑی کی بریک تو ٹھیک ہے نا؟

ہم نے مادام چنگ سے ازراہِ مذاق پوچھا مگر وہ سنجیدہ ہو کر اور قدرے متفکر بھی ہو کر اُٹھی اور باقاعدہ پتہ کر کے آئی کہ بریک بالکل ٹھیک ہو چکی ہیں۔ پھر اُس نے لنچ باکس کھولے اور ہمارے سامنے بڑی مادرانہ شفقت سے سجانے لگی۔ اس لنچ کا بہت مزہ آیا۔ مختصر سا تھا مگر بھرپور۔

باہر وہی تاحدِ نظر کھیت ہریاول سے لدے ہوئے۔ ندی، نالوں نہروں اور دریاؤں کا ولولہ انگیز منظر۔ چینی دہقان

قطار اندر قطار کشتِ رزق افروز کے کنارے کنارے۔

چینی کاشتکار زمین کا چپہ چپہ کاشت کرتے ہیں۔ وہ کم سے کم جگہ پر کھیتی اگا لیتے ہیں اتنے سلیقے اتنے قرینے سے اور نگہداشت بڑے خلوص سے کرتے ہیں۔ فصل کو لمحہ لمحہ بڑھتے دیکھتے ہیں اور کھیتی زمین کے سینے پر شیر خوار بچے کی طرح ہمکتی دکھائی دیتی ہے۔

چینی دہقان کا ایمان ہے کہ زمین ماں ہے۔ وہ اس یقین سے بیج بوتا ہے کہ زمین بڑی سخاوت کرنے والی ہے۔ وہ فصلوں کی پرورش سوکروڑ چینی آبادی کو مدِنظر رکھ کر کرتا ہے۔

وہ فصل کاٹتا اور سمیٹتا ہے۔ اس احتیاط اور ذمہ داری سے کہ ایک بھی دانہ ضائع نہ ہو۔

چینی دہقان کھیت کنارے قطار اندر قطار چلتے ہیں۔ مؤدب ہو کر جیسے ماں کے قرب میں ہوں۔ وہ کام ختم کر کے دھیمے دھیمے گھروں کو لوٹتے ہیں جیسے زمین رزق اگلتی ہے آہستہ آہستہ۔

ہانگچو اور شیننگ ہائی کے عین درمیان چاسی نام کا ایک قصبہ ہے جس کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ یہاں ٹریکٹر سازی کی صنعت ہے۔

ساڑھے چار بجے شیننگ ہائی پہنچ گئے۔ شیننگ ہائی کی میزبان جماعت نے خوش آمدید کہا یوں لگا جیسے واپس گھر پہنچ گئے ہیں۔

شیننگ ہائی پیپلز سکوائر سے گزرتے جنگ جیانگ پہنچے۔ اس بار رہائش فرانسیسی طرز کے حصے میں ملی۔ ہمارا سامان ہمارے کمروں میں پہنچ چکا تھا۔ کمرہ نمبر ۶۵ گیارویں فلور پر ملا۔ شام کا کھانا کھایا اور پنگ لی جو چنگ میں چینی سرکس دیکھنے پہنچے۔ چینی قلابازوں کا تو زمانے میں جواب نہیں۔ ان کی پھرتی مہارت اور چابکدستی کو بس دیکھتے جاؤ اور ہم چپ چاپ دیکھتے رہے ویسے بہت سوں کا منہ کھلا ہی رہا ہو تو یہی داد فن شمار کیجیے۔

ہاف ٹائم میں آئس کریم سے تواضع ہوئی۔ شیننگ ہائی کی شدید سردی میں آئس کریم نے وہ مزا دیا کہ اور بھی طلب کی۔ واپس آئے کچھ خطوط لکھے پھر کپڑے بدلے اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر شیننگ ہائی شہر پر نظر ڈالی تو ایک سکوت کی چادر شہرِ ہنگامہ پرور پر تنی تھی ؎

سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو

۲۱ نومبر کی صبح ذرا دیر سے آنکھ کھلی۔ جلدی جلدی تیاری کی پھر کافی کے چند گھونٹ لئے۔ سگریٹ سلگایا اور کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ تو سارا شہر لاہور جیسا لگا۔ کیونکہ سامنے مینارِ پاکستان دکھائی دے رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو مینارِ پاکستان سے مشابہ مینار کی بالائی دو منزلیں تو بالکل ویسی ہیں۔ مگر زیرِ حصہ چوکور اور محرابوں والا ہے۔ بعد میں پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شیننگ ہائی میونسپل یوتھ پیلس ہے۔

ناشتے کے بعد پھر شیننگ ہائی ریلوے سٹیشن پہنچے۔ آج ہم ایک اور خوبصورت شہر 'سوچو' دیکھنے جا رہے تھے۔ ایک گھنٹے کا سفر ہے ریل کا اور 'سوچو' ہانگچو کی سسٹر سٹی ہے۔ ۲۰۰۰ ہزار سالہ پرانی تاریخ اور اپنے خوبصورت مناظر کی بدولت ہانگچو کے بعد چین ہی سوچو ہے۔ شیننگ ہائی سے سوچو تک چار چھ بڑے اسٹیشن راہ میں آئے۔ تن شیانگ، ین تنگ، کی شان اور باقی جو تھے پڑھے نہیں

جا سکے۔ دہقان عورتیں اور مرد۔ کھیت اور فصلیں، بانس کے جھنڈ، سبزیاں، ترکاریاں، آبادیاں دریا، ندی، نالے اور اسٹیمر ۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں مشغول گروہ در گروہ بھی اور تنہا اکیلا بھی۔

شینگ ہائی سے ہانگچو تک آتے جاتے سفر کے دوران مجھے اگر کوئی کچھ نہ کرتا دکھائی دیا تو تنہا گھومتا، کسی سوچ میں گم گم یا کھیلتا کودتا تو وہ آٹھ سات سال کے بچے تھے۔ میں نے جن کو مختلف بستیوں کے قریب، کسی مکان کی منڈیر پر، صحن میں کھیلتے، گلی میں بھاگتے یا کسی ندی کنارے یا جوہڑ کے پاس سوچ میں گم دیکھا اور اب سوچ جاتے ہوئے بھی کوئی اگر بیکار دکھائی دیتا ہے، تو کہیں کہیں اسی عمر کا کوئی بچہ ہے۔ اس عمر کے کچھ بچے عام بچوں سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ تنہا اکیلے گھومتے ہیں۔ کچھ سوچتے پھرتے ہیں اور اُن کی یہ عادت بھی ایک مصروفیت جیسا انہماک رکھتی ہے۔ چلتی گاڑی سے میں نے دیکھا وہ اپنے گھر کے پاس گھاس کے ایک قطعے پر گیند سے کھیل رہا تھا۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ سن کر اس نے گیند اپنے پاؤں تلے داب کر روکی اور گردن موڑ کر گاڑی کو دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے ہاتھ لہرا لہرا کر خدا حافظ خدا حافظ کہا۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ لہرایا۔ خدا حافظ خدا حافظ۔

کس کو خدا حافظ کہہ رہے ہو؟ خواجہ (مصور)

کامریڈ لن نے پوچھا اور میں نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

اپنے بچے کو۔

یہ کیسے ممکن ہے۔ تمہارا بچہ چین میں کہاں؟

ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکالے پیچھے رہتے جاتے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اب پاکستان میں بھی نہیں ہے۔ دو سال پہلے کہیں چلا گیا تھا۔ کسی ریلوے سٹیشن پر گاڑی آہستہ ہو کر گزر رہی تھی۔ میں نے اسٹیشن کا نام پڑھنا چاہا مگر حروف کی روشنائی پھیلی پھیلی سی تھی۔ تب میں نے انگوٹھے سے آنکھوں سے ڈھلکتے آنسو ہوا کو سونپ دیئے خواب حقیقت بنتے کتنے خوش آئند ہوتے ہیں اور حقیقت خواب میں تحلیل ہوتی کس قدر کرب ناک۔ باقی کا سفر سوچ تک کیسا تھا کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی ہے

سوچو ریلوے سٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ ایک چھوٹا مگر خوب صورت ریلوے اسٹیشن۔ جہاں سے سیدھا ہمیں ٹائیگر پل لے جایا گیا۔ جو چند منٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ ایک تاریخی مقام ہے۔ جو ٹیلے پر واقع ہے۔ صدر دروازے کی محراب اور دائیں بائیں ایک جیسے دو روزن ٹائیگر کا منہ اور آنکھیں لگتی ہیں۔ محراب کے عقب میں آٹھ منزلہ پیپل ٹائیگر کی دم کی طرح کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہی نقشہ اس پہاڑی کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔ محراب میں سے گذر کر داخل ہوں تو ایک طرف زمین پر ایک بڑی سِل دو لخت پڑی ہے۔ کہانی یوں بیان کی گئی کہ سورما جرنیل نے دیو سکیل تلوار کی دھار آزمانے کے لیے اس سِل پر ماری اور یہ درمیان سے کٹ گئی آگے بڑھیں تو پودوں کی تراش خراش سے خوب صورت زیبائش کے نمونے نظر کو ذوقِ نظر دیتے ہیں۔ بادلوں جیسی چٹانیں جن کے دامن میں پھولوں کی کیاریاں عجیب سماں باندھتی ہیں۔ چٹانوں میں پانی کا ایک قدرتی تالاب جس میں تین چار بڑے بڑے پتھر الٹے سیدھے پڑے ہیں۔ بتایا گیا کہ کسی واعظ کے وعظ سے یہ پتھر بھی سرنگوں ہو گئے تھے اور ایسی باتوں پر فوراً یقین کر لینا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کام

ہے۔ پھر پہاڑی کے اوپر پہنچے جہاں ینگ ٹمپل ہے جو آٹھ سو سال پرانا ہے۔ ایک طرف آہستہ آہستہ جھک رہا ہے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کی ہزار کوششوں سے اس ٹمپل کا جھکنا جانا رک نہیں سکا۔ چینی محکمہ آثارِ قدیمہ بھی شاید پاکستانی محکمہ آثارِ قدیمہ جیسی خوبیوں کا مالک ہے۔ جو تاریخی عمارات کی کجی دُور کرتے کرتے قومی خزانے کی کمر خمیدہ کر دیتا ہے۔

یہ ٹمپل ہو خاندان نے اپنے عہدِ حکومت میں بنوایا تھا۔ اس پہاڑی سے سوچو کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس پہاڑی سے جو گاڑی کر مشہورِ زمانہ چینی ایمپائر اینڈری کی ایک فیکٹری میں پہنچے۔ چینی ہنرمندوں کی باریک کاری اور حسن و مہارتِ فن کے وہ نمونے دیکھے کہ ان کرشموں سے دامنِ دل خود بھی چھڑانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ہلکے ہلکے پیڑن اور بیل بوٹوں والی ایمپائر اینڈری سے کہیں آگے۔ نادر نمونہ ہائے مصوری کی ریشمی دھاگوں سے تخلیق نو ناقابلِ یقین حد تک معراجِ فن کو چھوتی ہے۔ چینی ہنرمندوں کے انہماکِ فن کو سلام کرنے کے بعد ساڑھے بارہ بجے سوچو کے شاندار ہوٹل نیو لن پہنچے اور کمرہ نمبر ۳۰۷ میں پہنچ کر ابھی گرم گرم پانی سے منہ دھو بھی نہ پائے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی کہ سوچو کے میئر کی طرف سے دیا جانے والا لنچ بالکل تیار ہے۔ بس ابھی آیا کہہ کر پھر منہ پر گرم گرم پانی ڈالا اور صاف کیا۔ اور کنگھی کرتے وقت اپنے بال کچھ زیادہ ہی سفید دکھائی دینے لگے۔ ان کا کوئی علاج شاید اہلِ چین کے پاس ہو؟

ان کا علاج اہلِ چین تو کیا اہلِ زمیں نے اپنی ہزار کوششوں کے باوجود ابھی تک نہیں ڈھونڈ پایا۔

یہ میرے کان میں "جینے کی اہمیت" والے چینی دانشور لن یوتانگ نے کہا۔ مجھے متوجہ پاکر اُس نے مزید کہا۔

اور اگر سفید بالوں کا کوئی علاج ہے ہی نہیں تو کیوں نہ انھیں خوب صورتی سمجھ لیا جائے۔

ٹھیک کہتے ہو کامریڈ۔ میں نے کہا اور لنچ کے لئے نیچے اتر آیا۔ لنچ شروع ہوا۔ پہلا کورس ختم ہوا۔ پھر دوسرا اور تیسرا علیٰ ہذا القیاس جوں جوں یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اپنی کوتاہیٔ فن کا احساس گہرا ہوتا گیا اور نوبت غنودگی سے بیہوشی تک پہنچنے لگی اور اگر جامِ صحت جلد تجویز نہ ہوتے ہوتے تو ہم شاید جانبر نہ ہو سکتے تھے۔ اُٹھے اور باہر ہوٹل کے لان میں گھومے پھرے اور تخ بستہ ہوا سے بہ رضا و رغبت دو چار تھپیڑے ہلکے سے کھائے تو ہوش قائم ہوئے۔

پھر میں سانگ خاندان کے عہد کے ایک وزیر کا ذاتی باغ دیکھنے گئے۔ یہ باغ آٹھ سو سال پُرانا ہے اور اب قومی ملکیت ہے۔ اس باغ کی ایک گھنٹہ سیر کے بعد دوسرے باغ کی طرف چلے۔

سوچو کی سڑکوں پر بھی وہی درخت دو رویہ لگایا گیا ہے۔ جو شینگ ہائی اور ہانگچو کی سڑکوں کا حسنِ نظر نواز ہے۔ مگر سوچو کی سڑکوں پر وہ بہار نہیں ہے۔ کہیں کہیں تو لاپروائی اور بے نیازی اس شہر کی سڑکوں سے روا رکھے جانے کا شدید احساس بھی ہوتا ہے۔

دوسرے باغ میں داخل ہوئے۔ یہ منگ دورِ حکومت میں کسی نواب نے بنوایا تھا۔ اب یہ بھی قومی ملکیت ہے۔ اور تقریباً چار سو سال پُرانا ہے۔ اس باغ کے اندر ذوقِ تزئین و آرائش کی ایک اپنی اور کثیر دولت ہے۔ مگر لے آوٹ ڈیزائننگ کے اعتبار سے اور طرزِ تعمیر کی مماثلت کے باعث پہلے باغ کا مکمل تتبع ہے۔ ایک گھنٹہ سیر کے بعد آخر میں تیسرے باغ کو چلے، راستے میں شہر کے رہائشی مکانات کافی بے رنگ اور کسی حد تک بدصورت سے لگتے ہیں اور کہیں کہیں تو ہمارے بڑے شہروں کی کچی آبادیوں کا گمان گزرتا ہے۔ چین میں ہر شئے قومیانے کے نظام نے کتنی ہی ناہمواریاں ہمواریوں میں بدل دی ہوں مگر اس کے جو منفی اثرات شہروں کے

رہائشی حصوں کی خوب صورتی پر پڑے ہیں۔ بے حد کھٹکتے ہیں۔ بے رنگ در و دیوار، خستہ حالت کھڑکیاں، شکستہ شیشے اور برائے نام کواڑ مکینوں کی ذاتی دلچسپی ختم ہو جانے کے نوحہ خواں ہیں۔

تیسرا باغ آ گیا۔ یہ باغ دوسرے نمبر پہ باغ کا ہم عمر یعنی منگ دور حکومت کے ایک انسپکٹر جنرل پولیس نے بنوایا تھا۔ جس نے بے انتہا دولت رشوت میں کمائی اور بے حد خوب صورت جگہ اہلِ ذوق کے لیے چھوڑ گیا۔ یہ باغ پہلے دونوں باغوں سے ہر انداز میں جدا ہے۔ پہلے دونوں گنجان باغ ہیں اور یہ کشادگی کا وافر احساس فرحت رکھتا ہے۔ اس طرح پہلے دونوں کی یہ باغِ تعمیرِ نو ہے۔ غالباً یہ استفادہ براہِ راست چین کی قدیم مصوری کی اس تحریک سے کیا گیا ہے۔ جو دبے پاؤں منگ دور میں چینی مصوری میں در آئی تھی۔ جس میں تصویری گنجان پن کی جگہ مثبت خلا (POSITIVE SPACE) کو شعوری اہمیت حاصل ہونے کا احساس واضح طور پر نظر آتا ہے اس طرح چینی مصوری ایک بے ساختہ پن سے ہمکنار ہوئی۔

شینگ ہائی کا باغ اور یہ تین سو چو کے باغ جن کو دیکھنے کا موقع ہمیں ملا۔ یہ باغات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ چینی ذوقِ جمال موسیقاتی تو قلمزنیوں سے ایک منفرد اور مخصوص انداز میں بہرہ مند ہوتا ہے۔ ان باغات کا ایک ایک چپہ ایک ایک گوشہ مصورانہ تخلیقی عمل کا مرہونِ احسان ہے۔ یوں لگتا باغات زمین پر تعمیر نہیں کیے گئے بلکہ پینٹ کیے گئے ہیں۔ ان باغات کی ہر دیوار میورل، ہر گوشہ کمپوزیشن ہر آنگن سٹل لائف کا منظر پیش کرتا ہے۔ ان باغات میں تصویری ذوق کو اتنی اہمیت سے پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی دروازہ کھولیں کسی بھی روزن سے باہر دیکھیے دروازے روزن اور روشندان کی چوکھٹ تصویر کا چوبی فریم بن جاتا ہے اور نظر آنے والا منظر تصویر ہے جس میں چینی مصوری کی نوکیلی گرے اور براؤن رنگ کی چٹانیں نیلے پہاڑ پھولدار جھاڑیاں اور بانس کی لہلہاتی گہری سبز پتلی شاخیں جن پر ہلکے سبز پتے خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں۔ اس امر کا مزید ثبوت یہ ہے کہ ان باغات میں کمروں کی اندرونی تزئین و آرائش میں مصوری اور خطاطی کے شہکار بہت قلیل تعداد میں ملتے ہیں جیسے کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ یہ باغ جس کی ہم اب سیر کر رہے ہیں۔ پہلے باغات سے یکسر مختلف ہے۔ فطرت کے بے ساختہ پن سے اس باغ کا دامن بھرا ہوا ہے۔ سبزا اور بھوری گھاس کے قطعات میں دیہی علاقوں کی پگڈنڈیاں ہیں اور کہیں کہیں دانستہ طور پر پودوں اور درختوں کی تنظیم اور ترتیب کو توڑ کر اکھڑ سا حسن پیدا کیا گیا ہے۔

یہ باغ مختلف تختوں پر مشتمل ہے چھوٹے چھوٹے تالاب اور پہاڑیاں ہیں۔ پل ہیں۔ پویلین ہیں اور ہر پویلین کے گرد راہداری اور سیڑھیوں کی شکل میں روایتی چینی ڈریگن (اژدھا) کی فارم استعمال کی گئی ہے۔ اس باغ میں خزاں، بہار، گرما، سرما، خشک اور تر موسموں کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے الگ الگ تختے ہیں۔ یہاں بونے درختوں کا ایک کثیر ذخیرہ ہے اور بونے درختوں اور پودوں کی عمریں ماشاءاللہ کئی کئی ہزار سال بتائی جاتی ہیں۔

رشوت میں بٹوری ہوئی دولت سے یہ جنت نگاہ بنوانے والے انسپکٹر جنرل پولیس کو جوئے بازی کا بھی از حد شوق تھا۔ جب اُن کی جگہ کوئی اور رشوت لینے والا آ گیا تو موصوف کو جوئے کے چکر میں سزا ہوئی اس باغ کا کثیر حصہ بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا دوسرے رشوت خور نے ایسا کوئی باغ بنایا کہ نہیں البتہ اس راشی جوئے باز کا جنون باغ باقی نہ گیا اور اس نے ضبط شدہ باغ سے ملحق اپنی باقی ماندہ زمین پر بھی باغ بنوا لیا۔ پہلے دونوں حصوں میں دیوار تھی۔ مگر جب انقلاب باغ کی سیر کرتا اندر بھی آ گیا تو دیوار ہموار ہو گئی۔

اور اب ہم دیوار پار حصے میں ہیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس تھا یا جنّ تھا۔ اس کا ذوقِ جمال تھا کہ موسم بہار تھا۔ بوئے گل دیوار پھاند آئی اور بلبل کی زبان بھلا کبھی رکی ہے۔ عاجزی ہے تو بس دستِ صیاد اور کفِ گلچیں کے لئے ہے۔ قدم قدم پر وہ پولیس والا پھولوں کے گجروں کی ہتھکڑیاں لئے کھڑا ہے اور پاؤں میں شاخِ گل کی بیڑیاں ڈالتا ہے۔ آگے بڑھیں تو ایک ننھا سا پیولین ہے۔ جس کی شکل چینی دستی پنکھے کی ہے۔ اس پیولین کے روزن بھی پنکھے کی شکل کے اور اس میں ایک لوح بھی پنکھے کی شکل والی نصب ہے۔ جس پر چینی خطاطی بے مثل اور مضمون لاجواب اس کا اس طرح ہے۔

"کون ہے جو ہمارے ساتھ یہاں بیٹھے اور یہ مناظر دیکھے۔"

ہم نے اُس کی تنہائی پر ایک سرد آہ کھینچی جس نے بے تکلف یہ اہتمام آج سے چار سو سال قبل یوں کیا کہ آج بھی پتے پتے سے بوئے وفا آتی ہے۔

ہم نے اس پیولین سے کچھ فاصلے پر ایک چائے خانے میں گرم گرم چائے ایک سحر میں گم ہو کر پی اور پھر سیدھے پہنچے سوچو ریلوے سٹیشن۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ باہر اندھیرا اور اندر روشنی تھی زندگی تھی۔ مگر اس پولیس والے کا عشق ابھی تک حواس کو اسیر کئے تھا۔ اندھیرے میں دیکھنے ڈھونڈنے اور کچھ محسوس کرنے کو جی چاہتا تھا۔

تراشیدہ زلفوں والی ویٹرس ننھی سی مگر آہو چشم سفید لباس میں تھی۔ چائے لے آئی۔ ارباب نیاز نے اُس کا شکریہ زوردار قہقہہ لگانے کے بعد شستے کہہ کر ادا کیا اور اپنی بیگم سے بولے۔

جیلاں پی لو۔ پی لو۔ بڑی اچھی چائے ہے۔

حبیب الرحمٰن نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر اپنی پتلی بھنویں سکیڑ کر آغا ناصر کی طرف دیکھا اور آغا ناصر نے میری طرف دیکھ کر آہو چشم کو دادِ حسن دی۔ ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے کہا۔ مگر ننھی سی اس کے واسطے تلوار چاہیے۔ پھر میں نے آغا ناصر سے مشورہ کیا۔

یار آغا ہو سکتا ہے۔ میں چین کا سفر نامہ لکھوں تو کیوں نہ اس حسینہ سے عشق کروں۔ کون دیکھتا ہے اور پھر ہم بھی تو اس وطن میں اجنبی ہیں۔

ایک نہیں بلکہ کئی عشق کر ڈالو تاکہ سفر نامہ میں گلیمر ہو۔ آغا ناصر نے مشورہ تو مجھے دیا مگر خود تحت اللفظ عشق کرنے لگا۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
سولیوں پہ ہمارے لبوں سے پرے

تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری آنکھوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی چمکتی رہی
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم

اور گاڑی شینگ ہائی ریلوے سٹیشن پر رک گئی۔ مس تن اور دوسرے میزبان حضرات منتظر تھے۔ جنگ چیانگ پہنچے گھر کا احساس ہوا مگر گھر نہ تھا۔ کھانا کھایا اور شینگ ہائی فرینڈ شپ سٹور پہنچے۔ اس سٹور کے دو فلور ہیں۔ بہت بڑا ہے اور ہر شئے دستیاب ہے۔ ہر کوئی اپنی تلاش میں ایک دوسرے سے بچھڑ گیا۔ پردین کیلئے شینگ ہائی کا سلک خریدا۔ سعدیہ کے لیے گڑیا اور کھلونے فہیم کے لیے قمیصیں اور دلید کے لیے سرما اور گرما کے لباس خریدے۔ ایک گھنٹہ بعد سب کو چینی میزبانوں نے ڈھونڈ نکالا اور ہانک کر وفد کی شیرازی بندی کی اور واپس چلے۔ شینگ ہائی شہر کی رات کی رونقیں دیکھیں۔ اتنا گنجان آباد اور زندگی کے ہنگاموں کا شہر ہے۔ پرانے شینگ ہائی کی سڑکیں تنگ ہیں۔ جن پر الیکٹرک بسیں، کاریں، دیو ہیکل ٹرک، رکشا، ٹیکسی اور ان سے بڑھ کر سائیکلیں اور فٹ پاتھ پر لوگوں کا ہجوم اور نوجوان جوڑوں کا اظہارِ محبت سرِ عام مگر پھر بھی حیرت کی بات یہ کہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ دیکھا۔ آج کی رات بہت بے چینی میں گذری۔ صبح جلدی آنکھ کھل گئی اور گرم گرم پانی کے ٹب میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ پھر شیو کی لباس پہنا اور گرم گرم کافی کے بعد کھڑکی کھول کر شہر کا منظر دیکھنے لگا۔

شینگ ہائی میں آج کڑاکے کی سردی ہے چینی لوگ اپنے گھروں کے آنگن میں اور سڑکوں پر بس سٹاپوں پر کھڑے شیڈو باکسنگ کرتے دکھائی دیئے۔ یہ ایک ورزش ہے۔ جو چینی لوگ زمانۂ قدیم سے کرنے کے عادی ہیں۔ یہ کھڑے کھڑے ہاتھ اور ٹانگوں کو سلو موشن فلم کے انداز میں چلاتے ہیں۔

آج پورا دن ہماری ڈسپوزل پر تھا۔ اور شام کو کینٹن کے لئے روانہ ہونا ہے۔ ناشتے پر آج خوب خوب باتیں ہوئیں۔

کینٹن میں کھانا ذرا دیکھ کر کھائیے گا۔ حبیب الرحمٰن نے سب کو متنبہ کیا۔

ارے کیا ہے زیادہ سے زیادہ ہمیں مینڈک کھانے کو دے دیا جائیگا۔ افضل قادر نے کہا۔

مینڈک۔ بیگم ارباب نیاز نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہاں مینڈک یعنی ڈڈو۔ حبیب الرحمٰن نے ترجمہ کر دیا۔

کھالیں گے یار۔ آغا ناصر نے چیلنج قبول کر لیا۔

کتے چوہے اور سانپ بھی بڑے پسند ہیں ان چینیوں کو۔ حبیب الرحمٰن نے مینوا اور پھیلا دیا۔ آغا ناصر کو للکارنے کے لئے۔

یہ تو ان کی ڈیلی کیسیز ہے۔ افضل قادر نے بتایا۔
افضل جو بہاری ہیں مگر انہوں نے پاکستان میں رہنا پسند کیا۔ بڑا نرم نرم چپ چاپ سا بندہ ہے۔
حبیب الرحمٰن فسٹ کلاس چینی بولتا ہے اور چینیوں کو خوب سمجھتا ہے۔ کہنے لگا بس کچھ کھانے لگیں تو میرے اشارے کا انتظار ضرور کریں۔

آج شینگ ہائی میں شدید سردی ہے۔ سارا دن اوور کوٹ چڑھائے رکھے۔ پیدل گھومے، شاپنگ کی اور دوپہر کو پاکستانی کھانا مرغ کڑی کہہ کر بنوایا اور مزے اڑائے۔ سہ پہر میں بھی مٹر گشت کی۔ شام ساڑھے چھ بجے جنگ جیانگ سے نکلے اور شینگ ہائی ائرپورٹ پہنچ گئے۔ شینگ ہائی کے چار ائرپورٹ ہیں۔ دو سول اور دو فوجی ہیں۔ ہنگ پیاؤ انٹرنیشنل ائرپورٹ ہے۔ جہاں سے ہم کینٹن روانہ ہو رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہے۔ سات بجے طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔ ہم نے کھڑکی سے شینگ ہائی کی روشنیاں دیکھیں۔ چین کا عظیم شہر جو تقریباً ۸۰۰۰ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے اور جس کی آبادی تقریباً ۱۲٫۸ ملین ہے۔ شینگ ہائی دریائے وانگ پو کے کنارے پر اور ینگسی سے ۱۲ میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ مغربی اقوام کے زیر نگیں رہنے سے شہر کی تعمیر کا طرز بیشتر مغربی ہے۔ شینگ ہائی صنعت کا مرکز ہے اور مصروف تجارتی بندرگاہ ہے۔ عصر حاضر سے خراج وصول کرنے والا ماضی کا مظلوم شہر۔ شینگ ہائی ؎

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

دو گھنٹے کی پرواز تھی۔ رات کی وجہ سے باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے سب اپنے اپنے ساتھ والوں سے محو گفتگو ہیں۔ چینی ائر ہوسٹس نیوی بلیو ماؤ کیپ، جیکٹ، پینٹ اور گلے میں پیلا سکارف لگائے ادھر سے ادھر گھوم رہی ہیں۔ چین میں مرد اور عورت کے لباس میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ تفریح گاہوں پر عورتیں امتیازی لباس پہنے دکھائی دیتی ہیں۔ وگرنہ عورت اور مرد کا فرق بادی النظر میں مشکل ہوتا ہے تاوقتیکہ کوئی دراز گیسوؤں والی نے دو چٹیا شانوں پر گرا رکھی ہوں۔ ہوٹلوں میں ویٹرس کا لباس یہی مگر رنگ سفید ہوتا ہے اور انتخاب بڑا کڑا ہوتا ہے اور ائر ہوسٹس کے سلسلے میں تو چینی لاکھوں چھوڑ کروڑوں میں ایک تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں چینی گوہر شناس پی آئی اے سے بہت متاثر ہے اور اس امر کا اظہار اکثر سرکاری تقریبات میں انہوں نے کھلے دل سے کیا۔ نیوی بلیو رنگ کے لباس میں پیلا سکارف لگا کر سفید سرخ رنگت اور نکھر جاتی ہے اور خصوصاً رات کی پروازوں میں جب باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا تو اندر بھی ان نیلی پوشاک والیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ گفتگو کسی سے ہو تر ادھیان رہتا ہے اور اسی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا۔ اگر وہ مہربان ہوں اور جہاز کی طرف سے کوئی سوونیئر وغیرہ پیش کریں تو طرز نوازش سوا فسانے گھڑنے کی ترغیب دیتی ہے اور اردو کے بیشتر سفرنامہ لکھنے والے خوب یاد آتے ہیں۔ اس نے جب ہمیں ہاتھی دانت کی کنگھی پیش کی تو امجد اسلام امجد مجھے اس قدر یاد آیا جس قدر میرے سر پر بال ہیں۔

اس پرواز میں کامریڈ لن سے میں نے بہت ساری باتیں پوچھیں جن کا جواب اور جس طرح دیا۔ یوں ہیں۔ چینیوں کی اول ترجیح بائیسکل ہے۔ نمبر دو سلائی مشین نمبر تین استری اور کسی کی عمر بہت ہی طویل ہو اور وہ قطرہ قطرہ جمع کر کے دولت کا دریا جمع کرے تو ٹرانسسٹر خرید لیتا ہے اور دولت کا دریا دریائے ینگسی جیسا لمبا ہو تو ٹی وی پر مووی میں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ محلہ کمیٹیاں نہانے کے آٹھ ٹوکن ایک شخص کو

ماہانہ دیتی ہیں۔ کوئی ایک ہی دن میں آٹھ بار نہانے یا ضرورت پڑنے پر نہانے۔ اب حکومت محدود جائیداد کی بھی چھوٹ دے رہی ہے۔ مثلاً چھوٹا سا مکان اور دہقان کو مختصر قطعۂ اراضی جس کی پیداوار کا سرکاری حصہ نکال کر باقی دہقان کا ہوتا ہے۔

دوسری ائر ہوسٹس آئی اور کی رنگ دے گئی۔ لہٰذا گفتگو کا سلسلہ جو ائر ہوسٹس کے آنے سے ٹوٹا تھا پھر وہیں سے جوڑنے کی کوشش کی تو دوسری ائر ہوسٹس نے کینٹن میں خوشگوار موسم کی نوید سنائی اور بتایا کہ چند لمحوں میں لینڈنگ ہونے والی ہے اور اُمید کی کہ ہمارا سفر اچھا گذرا ہوگا۔ چو یقیناً بہت اچھا نہ تھا۔ پس ہم کینٹن ائر پورٹ پر اتر گئے۔ روشنی میں نہایا ہوا خوشنما ائر پورٹ ہے۔ ہلکی ہلکی بارش کی پھوار پڑ رہی ہے۔ لیکن خوشگواری کا احساس واقعی وافر ہے۔ لہٰذا ہوٹل پہنچ کر سب سے پہلے کوٹ اتاریں گے۔ ائر پورٹ سے نکلے تو رات کی وجہ سے مناظر صاف نہیں ہیں پھر بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ سڑک کے دونوں جانب سفیدے کے تناور درخت اور اُن کے پیچھے کھیت ہیں۔ تقریباً پندرہ منٹ میں ہم کینٹن کے ایک عالیشان ہوٹل تن فینگ TUN FANG میں اترے بہت بڑا لابی عبور کر کے کمرہ نمبر ۲۵۰۹ چوتھے فلور پر ملا۔ جس میں داخل ہو کر سب سے پہلے کوٹ اتار دیا۔ پیچھے ہی بیرس چلی۔ جس نے گرم گرم بھاپ اڑاتا مہک برساتا تولیہ منہ ہاتھ صاف کرنے کے لیے دیا۔ ہاتھ منہ صاف کیا۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ اپنے وطن کی طرح کی کالی چائے چینی دودھ والی۔

تن فینگ ہوٹل بھی ایک شہر اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ بہت سی گوناگوں دلچسپیوں کا گہوارہ ہے۔ ہانگ کانگ اور کینٹن ایک دوسرے سے قریب ہیں اور آنے جانے کی آزادی کی بدولت تن فینگ ہوٹل میں قربت کی ساری نعمتیں خوب خوب دکھائی دیتی ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ اور ملک ملک کے تماشبین تماشہ دیکھتے تماشہ بنتے نظر آتے ہیں۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ اس لئے کمرے میں پہنچے اور سو گئے۔

۲۳ نومبر کی صبح ناشتے میں کالی چائے دودھ چینی والی پا کر سب کے چہروں پر ایک نور اتر آیا تھا اور سب نے کم از کم تین تین کپ پیئے۔

ساڑھے آٹھ بجے ہاتھی دانت کی آرائشی مصنوعات بنانے والی ایک فیکٹری دیکھنے گئے۔ اس کارخانے کے کئی شعبے ہیں۔ ایک ایک کر کے سب دیکھے۔ ایک ایک کاریگر اپنے فن میں ماہر اور اپنا فریضۂ فن جس خلوص اور محنت سے سرانجام دے رہا تھا۔ لائقِ ستائش ہے شعبۂ خطاطی کے انچارج خطاط نے ایک مجھے اور ایک ارباب نیاز کو خطاطی کر کے تحفہ میں دی۔ ہم نے وزیٹر بک میں دستخط کئے۔ میں نے پاک چین دوستی کا ایک فقرہ بنا کر فیکٹری کے کارکنوں کے نام منسوب کیا۔ یہاں سے نکل کر کینٹن ہسٹری میوزیم پہنچے۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس تک پہنچنے کا راستہ بہت خوب صورت ہے اور مری کی سڑکوں سے ملتا جلتا ہے کینٹن کا موسم گرم ہے۔ مگر بارش سے ہلکی ہلکی خنکی فضا میں موجود ہے۔ میوزیم کے چار فلور ہیں۔ ایک گھنٹہ سیر کی اور چوتھے فلور کی بالکنی میں چائے پیتے ہوئے کینٹن کا نظارہ کیا۔ سامنے کی پہاڑی پر چینی تاریخ کے ایک ہیرو کی یادگار دکھائی دیتی ہے۔ اسی پہاڑی کے دامن میں اس سورما کی یاد میں پولیلین ہے۔ میوزیم کے سامنے نشیب میں کینٹن کا سپورٹس سٹیڈیم ہے۔

میوزیم کی چوتھی منزل سے نیچے اترے اور واپس جاتے ہوئے کینٹن کے مرکزی پارک گوانگ یوآن میں پھولوں کی نمائش دیکھتے ہوئے ہوٹل پہنچے۔ اپنے کمرے کی مشرقی کھڑکی کا پردہ سرکا کر بلند و بالا عمارات کے دامن میں جھونپڑیوں جیسے مکانات کی آبادی بھی دیکھی۔ کینٹن جس کا چینی نام کوانگ چو ہے۔ کبھی فصیل بند تھا اور آٹھ دروازے تھے۔ اب دروازے باقی ہیں۔ فصیل معدوم ہو چکی ہے۔ جدید کینٹن انگریز بہادر کا بنایا ہوا ہے اور ہانگ کانگ کا برادرِ خورد ہے۔ فارسی محاورے سگ باش برادرِ خورد نہ باش سے اللہ کی پناہ مانگی کہ یہاں لوگ دور دور سے کتے کھانے آتے ہیں۔ لنچ کے بعد کینٹن فرینڈ شپ سٹور میں شاپنگ کے بعد چینی بھائی کہیں اور لے جانا چاہتے تھے مگر ہم مصر تھے کہ اس شہر میں ہمارے آقا و مولاؐ کے ایک صحابیؓ کا مزار ہوا اور ہم حاضری نہ دیں۔ یہ گستاخی ہے اور ہم بے ادب نہیں ہیں۔ چینی ہماری خواہش کے احترام میں ہمیں وہاں لے گئے گوانگ یوآن پارک جہاں پہلے پہر ہم نے پھولوں کی نمائش دیکھی تھی۔ اس کے صدر دروازے کے بالمقابل سڑک پار بانس کا ایک سرسبز و شاداب ذخیرہ دکھائی دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک قدرے چھوٹی سڑک اندر جاتی ہے۔ جس پر ہماری گاڑیاں مڑ گئیں اور تقریباً فرلانگ اندر جا کر رک گئیں اور ہم سب پیدل اس سڑک سے بائیں ہاتھ نکلتی ایک پختہ پگڈنڈی پر بانس کے ذخیرے میں چلنے لگے۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک سفید دیوار میں چینی طرز کا دروازہ ہے جس پر روضہ ابی وقاصؓ لکھا ہے۔ اردو اور چینی میں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دو چینی سر پر کپڑے کی ٹوپیاں پہنے استقبال کو بڑھے۔ ہاتھ ملائے اور میں نے ہاتھ سے اوک بنا کر منہ میں پانی ڈالنے اور انگلی چلا کر پانی اگلنے کا اشارہ کیا تو وہ فوراً میرا اشارہ سمجھ کر مجھے وضو گاہ پر لے گئے۔ باقاعدہ ہمارے ہاں جیسی ٹونٹیوں والی وضو گاہ ہے۔ میں نے کلی کی۔ اور بتایا گیا کہ جہاں ہم کھڑے تھے۔ مسجد ہے اور تیرہ سو سال پرانی ہے۔ مسجد کی مغربی دیوار میں پھر ایک دروازہ ہے۔ جس پر اردو اور چینی میں روضہ ابی وقاصؓ لکھا ہے۔ دروازے سے گذر کر پندرہ بیس گز کے فاصلے پر مزار ہے۔ حاضر ہوئے فاتحہ پڑھی قبر زمین سے تقریباً چار فٹ بلند ہے۔ اور مختلف رنگوں کی ریشمی چادریں چڑھی ہوئی ہیں فرش پر قالین ہے۔ قبر والے کمرے کے ارد گرد قبرستان ہے۔ کچھ قبریں پختہ کچھ کچی ہیں۔ پام کے پودے عام ہیں۔ مسجد میں واپس آئے۔ جہاں چند لمحے رکے۔ یہاں سب لوگوں نے عجیب طرح کی تازگی محسوس کی اور ارباب نیاز نے کہا۔

یار ایہاں آ کر تو طبیعت تازہ ہو گئی ہے

یہ دیکھ کر از حد مسرت ہوئی کہ یہ روضہ اور مسجد نہایت عمدہ طریقے سے رکھی گئی ہے اور نیشنل مونومنٹ ڈیکلر ہو چکی ہے۔ چین کے تقریباً ہر حصے میں مسلمان ہیں اور مساجد بھی ہیں۔ مگر چینی مسلمانوں کی اکثریت صوبہ سنکیانگ میں ہے۔ چینی مسلمانوں کی مشہور قومیں ادئی گر، تاتار اور کرغیز وغیرہ ہیں اور یہ سب سر پر ایک مخصوص وضع کی ٹوپی رکھتے ہیں۔ جن دو چینیوں نے ہمارا استقبال کیا وہ بھی مسلمان تھے۔ ان سے مختصر حال چال پوچھنے تک ہی بات ہو سکی۔ باہر آئے تو راستے میں آتی جاتی چینی عورتیں ادب سے السلام علیکم کہہ کر گزرتے۔

رات کو کینٹن کے نائب گورنر نے ایک روایتی مگر خوش نما اور بھول بھلیوں والے ریستوران میں عشائیہ دیا۔ ہم سب کوئی بھی ڈش چھیڑنے سے پہلے حبیب الرحمٰن کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے اور اشارہ پا کر کھانا شروع کرنے یا گریز کی حالت میں اور نخ جوس پینے لگتے۔ ہماری احتیاط کی وجہ سے کھانا اتنا زیادہ تھا کہ بعض چینی میزبان تو کھا کھا کر فی الواقع بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ کر بہانہ کر کے

محفل سے اُٹھ گئے۔ واپس تن فینگ آئے اور گھوم پھر کر طبیعت ہلکی کرنے لگے۔

ارباب نیاز نے ایک جگہ مجھے ایک پوسٹر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ کامریڈ فلاں فلاں دن فنگر کیلی گرافی اور فنگر پینٹنگ کا مظاہرہ کریں گے۔ اس پوسٹر کے سپانسرز ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی کہ پانچ دن بعد کیا کل یہ مظاہرہ کر دیتے ہیں۔ مگر سپانسرز تو نہ ملے۔ البتہ مظاہرہ کرنے والے کامریڈ فلاں مل گئے۔ اُن سے کیلی گرافی اور پینٹنگ پر بڑی دلچسپ باتیں کی اور اس بات چیت میں حبیب الرحمٰن مترجم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

۲۴ نومبر کی صبح ناشتہ کر کے کینٹن ایئرپورٹ پہنچے ارباب نیاز، بیگم ارباب نیاز اور آغا ناصر دورہ ختم کر کے ہانگ کانگ روانہ ہو رہے تھے۔ مجھے ابھی واپس بیجنگ جانا تھا۔ اُنھیں خدا حافظ کہا۔ واپس ہوٹل آ کر پھر کینٹن فرینڈ شپ سٹور پہنچے۔ یوآن خرچ کئے اور واپس ہوٹل آ کر دوپہر کا کھانا کھایا اور کمروں میں بند ہو کر سستانے لگے۔

شام چار بجے مشہور چینی مصور کامریڈ لین ژیون بمع اپنی مصور بیوی کے اور بہت ساری نئی تخلیقات کا بنڈل اٹھائے ملنے آئے۔ لین ژیون پاکستان کا دورہ بھی کر چکا ہے۔ اُس کا تازہ کام دیکھا۔ پورٹریٹ میں خاص دلچسپی رکھتا ہے اور یورپی اثرات سے مستفید ہو رہا ہے۔ ہم نے اُس کی خاطر چائے اور بسکٹ سے کی۔

شام کے قریب میں نے اور حبیب الرحمٰن نے کینٹن شہر میں آوارہ گردی کی۔ لطیفے سنائے اور سُنے۔ ہانگ کانگ سے یوآن کمانے آئی ہوئی لڑکیوں کا پیچھا کرتے جاپانی دیکھے۔ ہمارے ہاں کی تکے کباب کی دوکان کے مشابہ ایک دوکان کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھا جو ہونٹوں پر زبانیں پھیرتے تھے اور للچائی ہوئی نگاہوں سے اندر دیکھتے تھے۔ حبیب الرحمٰن سے پتہ کرنے کو کہا۔ وہ آگے بڑھا۔ پوچھا اور آ کر مجھے بتایا کہ نہایت لذیذ گوشت ہے سٹیم روسٹ کیا ہوا۔ دوکان دار کامریڈ کہتا ہے۔ ایک بار کھاؤ گے تو پھر کھانے ضرور آؤ گے۔ ہم نے آگے بڑھ کر شوکیس میں دیکھا۔ بھُنے ہوئے پلے بھی اور خونخوار سائز کے کتے بھی مع پائنچوں، کانوں اور دموں کے سٹیم روسٹ کئے ہوئے لٹک رہے تھے۔

شام کے کھانے کے بعد حبیب الرحمٰن نے ایک پاکستانی طالب علم کو بلایا اور میرے ساتھ وقت گذارنے کا کہا۔ کیونکہ وہ خود اب دوسرے انتظامی امور میں مصروف ہونا چاہتا تھا اور میں کامریڈ شان کامریڈ لن اور مادام چنگ سے ذرا علیحدہ ماحول میں کینٹن کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ طالب علم کا نام سعید ہے اور تین سال سے کینٹن میں زیر تعلیم ہے۔ بہت اچھی چینی زبان سیکھ چکا ہے۔ شیخی بگھارنے میں بڑا ماہر لگتا تھا۔ لیکن چین جیسے عملی ملک میں شیخی بگھارنے والے حضرات سے خواہ مخواہ چڑ سی ہونے لگتی ہے۔ مگر اُس سے پسندیدگی کا ایک رشتہ بھی مستحکم تھا کہ اردو بھی بہت اچھی بولتا تھا۔ یوں ارشاد صدیقی کی کمی قدرے پوری ہوتی تھی۔

تن فنگ ہوٹل کے سامنے سرکس ہاؤس کے گیٹ پر بڑی رونق تھی۔ کینٹن میں لباس کے بارے میں باقی شہروں والی باقاعدگی نہیں ہے۔ اور عورتیں تو اس قید سے بالکل آزاد لگتی ہیں۔ نیلے پیلے سفید کالے سبز گرے تمام ہی رنگوں کے سویٹر جرسیاں کوٹ پتلون سکرٹ بلاؤز پہنے عورتیں ہر عمر اور ہر سائز کی عورتیں سرکس ہاؤس کے گیٹ پر گھوم پھر رہی تھیں۔ میں نے سعید سے کہا کہ تن فینگ سٹور سے کاجو کے

ایک دو پیکٹ لے آئے تاکہ ذرا منہ چلتا رہے۔ بصورتِ دیگر ذہن چلے گا گویا شیطان کا کارخانہ چلے گا۔ سعید کا جو مونگ پھلی لینے گیا اور میں سگریٹ سلگا کر سڑک کنارے کھڑا ہو کر تماشہ دیکھنے لگا۔ میرے قریب دو سائیکل سوار نوجوان لڑکی اور لڑکا نیچے اترے سائیکلیں کھڑی کیں۔ پھر لڑکی جنگلے پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور لڑکا اُس کے ساتھ لگ کر باتیں اُس کی کمر میں ڈال کر اُس کی بلائیں لینے لگا اور میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ سامنے سے سعید آتا دکھائی دیا جو کے پیکٹ ہاتھ میں اور دو لڑکیاں اپنے آزو بازو میں۔ ایک لمبی ہے۔ پتلی ہے۔ سفید پینٹ نیلی جرسی اور سر پر پیلا سکارف اور دوسری درمیانی قامت کی جینز میں کسی ہوئی اور بالوں کی دو چٹیا شانوں پر گرائے ہوئے تھی۔

ان سے ملئے بڑی اچھی لڑکیاں ہیں۔ یہ جینز والی ہانگ کانگ سے کینٹن آئی ہے اور یہ یہیں کی حسینہ ہے۔ دونوں کا اصرار ہے کہ پہلے ان کے ساتھ سرکس ہاؤس میں ڈانس کریں پھر ہم لوگ جہاں پسند کریں گے یہ ہمارے ساتھ کھانا کھانے جائیں گی۔

سعید اچھا کیا تم نے کہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ میں تو کھانا کھا چکا اور ڈانس مجھے آتا نہیں۔ ان کو چھٹی دے دو میں اُن کے لئے بیکار ہوں۔

چلو ویسے ہی پھرتے ہیں ان کے ساتھ کمال صاحب۔

لیکن ان کا قیمتی وقت ضائع کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہوگا۔ ہم ان کے بغیر گھومیں گے تم ان سے کہدو کہ یہ کسی اور کے ساتھ گھومیں پھریں۔ سعید میاں انھیں چلتا کرو۔

اور سعید سرکس ہاؤس کے گیٹ پر سے جا کر انھیں چھوڑ کر آ رہا تھا کہ سڑک عبور کرتی آئی ایک عورت جس نے ٹوکری اٹھا رکھی تھی ایک ہاتھ میں اور دوسرے میں ایک پیپتا پکڑ رکھا تھا۔

میرے سامنے آ کر بولی۔ ہیلو۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولی ہیلو۔

ہیلو میں نے بھی جواب میں کہہ دیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ کیونکہ میری چینی لغت صاف تھی اور اُس کی انگریزی لغت میں بھی دوسرا کوئی لفظ نہ تھا۔ سعید آ گیا تو میں نے اُسے آگے کر دیا۔ وہ چند لمحے باتیں کرنے کے بعد مجھے بتانے لگا۔

کہتی ہے کہ یہ جو اُس کے ہاتھ میں پپیتا ہے۔ تحفے میں دے گی۔ اگر میں اپنی کرنسی اس کی کرنسی سے بدل لوں۔ کیوں کہ باہر سے آنے والوں کو دی گئی کرنسی کھلے بازار میں اور مقامی لوگوں کی کرنسی فرینڈ شپ سٹور میں قبول نہیں کی جاتی اور فرینڈ شپ سٹور سے یہ بی بی کچھ اپنی پسند کی چیز خرید کرنا چاہتی ہے اور اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ پھر آپ کو اظہارِ تشکر کے لئے اور کسی جگہ چلنے کی دعوت دے گی۔

اسے بھیجو یار — خواہ مخواہ پریشانی ہوگی۔ میں نے سعید سے قدرے بیزاری سے کہا۔ اور اتنے میں ایک نہایت خوبصورت لڑکی نیلی پینٹ پر سفید ہائی نیک پہنے اور بالوں میں ربن لگائے بس سے اتری اور ہمارے قریب ایک درخت کے نیچے رک کر اِدھر اُدھر متلاشی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

کیا خوب صورت شئے ہے۔ میں نے سعید کی جانب دیکھ کر بے ساختہ داد دی۔

واقعی یار بہت عمدہ ہے۔ لو ابھی پتہ کرتا ہوں۔ سعید نے کہا اور لپک کر اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چند لمحے گفتگو کرنے کے بعد لوٹا تو بتایا کہ وہ منتظر ہے کسی کی۔ ورنہ اُسے کوئی اعتراض نہیں چلو دیکھتے ہیں تھوڑی دیر اگر اُس کا انتظار ختم نہ ہوا تو پھر ہم تو حاضر ہیں کیوں؟

سعید تم یہاں خوب رچ بس گئے ہو اور خوب پہچانتے بھی ہو اور بات بنا لینے کا ڈھنگ بھی جانتے ہو مگر یہ جو میرے پاس بلٹریا سا کھڑا ہے تمہاری حرکات بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ چونکہ تم لپک کر جاتے ہو لڑکی کی طرف اور پھدک کر آتے ہو میرے پاس اس لئے کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔

سعید نے اُس بلٹریا نما آدمی کو غور سے دیکھا اور فکرمند ہو کر بولا۔ یار کہیں سی آئی ڈی کا آدمی نہ ہو۔ ٹھہرو میں اس سے بھی بات کر دیکھوں۔ پھر سعید اُس بلٹریا سے بھی بات کرتے لگا اور کرتا چلا گیا۔ پھر کہیں لوٹا تو قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

جاپانی ہے سالا۔ گلے تک شراب سے لبریز ہے اور چھوکری کی تلاش میں ہانگ کانگ سے آیا ہے۔

ارے ٹھہریں یہ بھی ہو جائے اور ایک میک اپ زدہ موٹی ٹھنگنی سکرٹ اور جرسی میں ملبوس عورت کی طرف لپک کر گیا اور اپنے کولہوں پر ہاتھ ٹکا کر اُس سے اس بھیڑ میں یوں باتیں کرنے لگا جیسے وہ سیدھی اسی کی تلاش میں آئی تھی۔

ایک لڑکی اور لڑکا تیزی سے سڑک پار کر کے آئے اور فٹ پاتھ سے اتر کر ذرا اندھیرے میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر بچھڑ گئے۔

سعید آیا اور کہنے لگا کہ یہ خاتون انگریزی بھی بول سکتی ہے۔ ہانگ کانگ سے آئی ہے۔

سعید یار تم نے تو مجھے کینٹن کی سیر کروانی تھی اور ہم ایک گھنٹہ سے اسی سرکس ہاؤس کے سامنے کھڑے ہیں۔ میں تمہارا بہت مشکور ہوں۔ میں تھک چکا ہوں اب جا کے آرام کرتا ہوں شکریہ! خدا حافظ۔

سعید چلا گیا اور میں ہوٹل میں آ گیا۔ تن فینگ کے وسیع لاؤنج میں چینی خطاطی اور مصوری کے شاہکار دیکھنے لگا۔ مگر ہر شے بے رس سی ہو گئی تھی۔ ہوٹل کے کیسینو میں گیا۔ لڑکیاں، لڑکے، بچے، جوان، بوڑھے اور کھوسٹ میمیں بڑی رونقیں لگائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی رونق بھی عجیب ناقابلِ تعریف ناقابلِ فہم سی بھجارت بن جاتی ہے۔ آگے آگے چلتی ہے۔ پھر غائب ہو جاتی ہے۔ دل میں رونق ہوتی ہے یا آنکھ میں یہ دماغ میں ہوتی ہے یا دھیان میں رہتی ہے یا کہ گیان میں؟ کیوں بعض اوقات انسان رونق کی تلاش میں اپنے دل اور آنکھ اپنے دماغ اور روح کے خانوں میں بھٹکتا ہے۔ دھیان کی دیواروں سے سر پٹکتا ہے۔ مگر گیان کا دروازہ نہیں کھلتا۔ رونق ہاتھ نہیں آتی۔ رونق ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یک دم کیوں دبے پاؤں کہیں اپنا راستہ جدا کر لیتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فریج سے جوس نکال کر پیا اور بیڈ پر لیٹ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ مگر طبیعت میں بے چینی ہے۔ سارے بدن میں نامعلوم سی چبھن کا احساس تیز ہوتا جا رہا ہے۔ میں کمرے سے نکل آیا۔ ہوٹل سے نکل کر بائیں مڑ گیا۔ دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک چوک سے دائیں جانب ہو لیا۔ اکیلا۔ اجنبی۔ زبان سے ناآشنا۔ راہ سے ناواقف۔ لیکن میں تلاش کروں گا۔ کہیں بھی۔ کچھ جذبوں کی ایک ہی زبان ہوتی ہے۔ جو سب جانتے ہیں۔ سب سمجھتے ہیں۔

میں چلتا جا رہا ہوں۔ سڑک پر اب آمد و رفت خاصی کم ہو چکی ہے۔ جہاں کہیں اندھیرے گوشے ہیں۔ جوان دلوں جوان جسموں نے وہاں چراغِ وفا روشن کیا ہوا ہے۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد پھر ایک راؤنڈ اباؤٹ آ گیا اور میں اندازے سے ہوٹل کی جانب میں

جاتی ہوئی ایک اور سڑک پر بائیں ہاتھ مڑ گیا۔ لمبے لمبے تناور سفیدے کے درخت جن سے کہیں کہیں ٹیک لگائے جوان جسم ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ پھر کسی نے میرے کان میں کہا ادھر بائیں گھوم جاؤ یہ ہے بانس کی خوشبو والا علاقہ بڑھ جاؤ آگے اندھیرے میں داخل ہو کر گم ہو جاؤ تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا۔ یہ جو اندیشے تمہارے دل میں جاگتے ہیں۔ فضول ہیں۔ پاسپورٹ نہیں ہے کوئی بات نہیں۔ زبان نہیں آتی نہ سہی، بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس پگڈنڈی پر ہو لو یہی راستہ ہے۔ وہ ہے سفید دیوار۔ دروازہ بند ہے تو کیا ہوا۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ چلو چھوڑو دروازہ بند ہے تو کیا یہ سایۂ دیوار ہی بہت ہے — تب میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بید کی شاخیں ہوا سے ہلنے لگیں اور نازک نوکیلے پتوں کی سرسراہٹ سرگوشیاں کرنے لگی۔

اے ابی وقاص! اللہ راضی تجھ سے میں ترے سکون میں مخل ہوتا ہوں درگذر کرنا۔ دل سے کہا۔ وہ جس کے سر پر بادل سایہ کئے چلتا تھا۔ وہ قصوی اونٹنی کا سوار جس کے عشاق حسینوں سے خوشتر و زیباتر و محبوب تر ہیں دل جس کے عشق سے توانا اور خاک مدینہ ثریا ہوتی ہے وہ جو دلوں کا مکین اور میری تمہاری آبرو جس کے نام سے ہے۔ اور موج غبار جس کے گھر کی ہے شفاف جلوۂ طور سے۔ وہ شبستانِ حرا کا تنہا — قوم و آئین و حکومت کی طرح ڈالنے والا جس کی تلوار جنگ میں لوہا موم کرتی اور آنکھ پُرنم ہوتی تھی نماز میں۔ جو دعائے نصرت کرتا تو تلوار آئین کہتی بادشاہی کی نسلیں کانپتی تھی۔ جو نسخۂ کونین کا دیباچہ اور تمام عالم غلام جس کا اور وہ آقا جو نگاہِ عشق و مستی میں اول بھی آخر بھی جو قرآن بھی فرقان بھی اور یٰسین اور طٰہٰ جیسے جیلے نام جس کے۔ وہ جو آیۂ کائنات کا معنیٔ دیرباب ہے۔ جو لوح بھی ہے قلم بھی ہے جو کل وجود کا [illegible]۔

— اے ابی وقاص! اللہ راضی تجھ سے پر کتنی دور آن بسے ہو۔ ریشم و اطلس کی سرزمین پر، حریر و پرنیاں کے دیس میں وہ ریگِ نواحِ کاظمہ کی نرمیاں یاد تو آتی ہوں گی۔ بانس کے تنے لرزے نازک شاخیں تھرتھرائیں اور نوکیلے نرم پتوں کی سرگوشیاں ایک ترتیب میں ڈھل گئیں۔

درود بھیجو درود۔ آمنہ کے لالؐ پر۔ کملی والےؐ پر سلام بھیجو — یہ فاصلے یہ دوریاں یہ ہجر و فراق سب عیشِ دوام میں ڈھل جائیں گے۔

اے اللہ سلامتی دے محمدؐ کو اور اس کی آل کو
تو نے جس طرح سلامتی دی ابراہیمؑ کو اور اس کی آل کو
بیشک تو ہی تعریف کے لائق اور بزرگی والا ہے۔

۲۵ر نومبر کی صبح تیار ہو کر کھڑکی سے موسم کا حال دیکھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ اور بارش کا امکان تھا۔ ناشتہ کیا۔ کالی چائے چینی دودھ کے ساتھ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔

مادام چنگ نے میرے لئے امریکی ڈالروں کے عوض مقامی کرنسی کا خاص انتظام کیا۔ پھر کامریڈ شان اور مادام چنگ اور

کینٹن کی اوام کے ساتھ کینٹن کے ڈپارٹمنٹل سٹوروں میں گھومے پھرے۔ بارش ہلکی ہلکی ہونے لگی۔ مگر سیر کا لطف دوبالا ہو گیا۔ وہ ایک ہائی بک جرسی جو بیجنگ کے فرینڈ شپ سٹور میں اپنے رنگ کی وجہ سے مجھے پسند نہ آئی تھی۔ شینگ ہائی میں اُس کا سائز میرا نہ تھا۔ ہانگچو میں سرے سے ہی ناپید تھی۔ کینٹن میں بھی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ ناچار ایک خرید لی جیسی بھی تھی۔ کینٹن کے بعض حصوں میں کراچی کے بعض علاقوں خصوصاً کھارادر، جنسو ہال وغیرہ کی یاد آتی ہے۔ شاید اس لئے کہ مچھیروں کی بستی کو جس نے کراچی شہر بنایا وہ لارڈ نیپئر تھا اور کینٹن میں پہلے پہل جس شخص نے تجارتی مراکز کھولے اُس بھلے مانس کا بھی نام لارڈ نیپئر ہی تھا۔

کینٹن کے بازاروں سے چینی موقلم اور کاغذ خریدا۔ ایک بنک میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ماحول اندر سے ہماری گوالمنڈی چونامنڈی اور اکبری منڈی کے بنکوں سے مختلف نہ تھا مگر کارکردگی کہیں زیادہ بہتر تھی۔ ایک دو پارک دیکھے اور دریائے پرل کی سیر کی۔ جو کینٹن شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا بہتا ہے۔ دریا پار سن یات سن یونیورسٹی ہے۔ جسے ڈاکٹر سن یات سن نے ۱۹۲۴ء میں قائم کیا اور جسے دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

تن فینگ میں واپس آئے۔ پیک کیا اور کینٹن ائرپورٹ پہنچ گئے۔ افواہ گرم تھی کہ پرواز میں تاخیر واقع ہوگی۔ کامریڈ شان پتہ کرکے آیا اور بولا۔

"گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ طیارے کی آمد میں قدرے تاخیر واقع ہونے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے۔ ہمیں روشن اُمید ہے کہ ابھی چند لمحوں بعد فضا میں طیارہ نمودار ہوگا اور آہستہ آہستہ پرواز کرتا ہوا زمین پر اتر آئے گا۔"

پھر طیارہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ اتر کر واقعی آ گیا اور مقررہ وقت پر زمین پر دوڑنے لگا۔ پورے ۲ بجے ٹیک آف کر گیا۔ جہاز میں بھانت بھانت کے لوگ تو نہیں البتہ بھانت بھانت کے چینی لڑکے لڑکیاں بوڑھے نوجوان سب تھے۔ کچھ جاپانی دلایتی بھی تھے۔ بادلوں کا سمندر جہاز کی کھڑکی سے دکھائی دیتا ہے اور اندر جہاز کے بھانت بھانت کے چینی جو جہاز کے مسافر تھے تو یقینی طور پر متمول ہوں گے۔ عورتیں اور مرد اپنے اپنے طور پر بہترین اور جدید لباسوں میں تھے۔ مگر نہ جانے کیوں اُن سب کے لباس لنڈے بازار کے لگتے تھے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ چینیوں کو آنکھیں ایک ہی لباس میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اور اس سے بھی زیادہ قوی وجہ یہ تھی شاید کہ اس پرواز میں دونوں ائرہوسٹس نیوی بلیو پینٹ جیکٹ پتلون ماڈکیپ اور پہلے سکارف میں سرخ و سفید تو تھیں مگر قد آور بھی تھیں اور چین میں لڑکی کا قد آور ہونا بہت نشہ آور ہوتا ہے۔ میں نے کامریڈ لن سے پوچھا۔ تم کامریڈ لوگ کیسی لڑکیاں پسند کرتے ہو؟

کامریڈ لن حد درجہ سنجیدہ انسان تھا۔ پورے دورے میں ہمارے ساتھ تھا پہلی بار اُس کے چہرے پر رومانٹک مسکراہٹ پھیلی اور وہ مجھے آنکھ مار کر بولا۔ "پسند تو سب کو ایسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مگر سب کو ایسی کہاں سے ملتی ہیں۔"

اتنے میں ائرہوسٹس ایک ٹوتھ برش اور ننھی سی ٹوتھ پیسٹ کا تحفہ دے گئی۔ جسے کامریڈ لن نے وصول کرکے مخمور آنکھوں سے اُسے دیکھا اور رشک کیا۔

اب باہر بادلوں کی سرزمین پر تازہ تازہ روئیں بن گئی ہیں۔ جیسے کسی مشاق دہقان نے ابھی ابھی ہل چلایا تھا۔ خدا جانے اس

کھیتی میں کون سے ستارے بوئے جائیں گے اور کس فصل کی کہکشاں اگے گی۔

اتنے میں دوسری ائر ہوسٹس نے کھانے کی ٹرے ہمارے سامنے سجا دی۔ ایک دم بھوک چمک اٹھی نہ جانے کیوں۔ چھری کانٹا اٹھایا پھر خیال آیا حبیب الرحمٰن کا جسکی طرف دیکھا تو اُس نے خلافِ معمول متانت سے کہا۔

خوب صورت لڑکی خنزیر پھلانا چاہتی ہے۔

اتنے میں کامریڈ لن اپنی پلیٹ میں سے آدھے سے زیادہ سؤر ہڑپ کر چکا تھا۔ میں نے اپنی ایک پلیٹ بھی اُس کی طرف بڑھائی، جو اس نے تیزی سے اچک لی۔ جیب سے پولیتھین کا لفافہ نکالا۔ اس میں سلاد ڈالا اور اپنے کوٹ کی جیب میں بھر لیا۔ ہم نے بل دی۔ ہوسٹس آئی تو حبیب الرحمٰن نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ معجوب سی ہو کر ٹرے اُٹھا لے گئی پھر کچھ دیر بعد ٹرے میں کیک پیس، پیسٹری۔ سنگترے، کیلے اور سیب لے آئی۔

میں نے حبیب الرحمٰن سے پوچھا۔

کیک پیسٹری میں کچھوے اور سانپ وغیرہ کا امکان تو نہیں؟ نکل آئے تو مادام چنگ کو دے دینا۔ حبیب الرحمٰن نے مشورہ دیا۔ نہ جانے بھوک ایک دم کدھر سے آئی تھی اور سؤر کو دیکھ کر پھر کدھر نکل گئی۔ کیلے اور سیب نے خوب مزا دیا۔

کامریڈ لن نے پوچھا "آپ لوگ پھل بہت پسند کرتے ہیں"۔

"ہاں ہمارا گزارا پھلوں پر ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

باہر سورج کی کرنیں بادلوں کے افق پر قوس قزح بنا رہی ہیں۔ اور جب بادلوں کے صحرا میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ جہانِ آب و گل میں عصر کا وقت ہو گا۔

ساڑھے چھ بجے شام بیجنگ کے ہوائی اڈے پر اترے

بیجنگ میں برفباری گذشتہ دو دن سے جاری تھی سخت سردی اور ہاتھ کان ناک جھاڑنے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ ایک گھنٹہ کار آہستہ آہستہ چلتی رہی اور مس چن جو ہمیں ائرپورٹ لینے آئی تھی۔ میرے سفر کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر منزو (MINZU) ہوٹل پہنچے اور کمرہ نمبر ۸۶۱ رین بسیرا ٹھہرا۔

۹ بجے رات مختار احمد کا فون آیا ہے کہ وہ پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہے۔ اتنے میں میں نے کھانا کھا لیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ گیا۔ باہر برفباری زوروں پر تھی۔ مگر اُس نے جب گھر پر بنی ہوئی پاکستانی چائے کا لالچ دیا تو میں فوراً تیار ہو کر ساتھ چل دیا۔ ٹیکسی میں ۱۰ منٹ کا راستہ ہے اُس کے گھر تک بیگم مختار احمد نے شاندار چائے پلائی اور کہا کہ کم از کم تین کپ پیئیں۔ مختار کے بیٹے سے باتیں کیں۔ جو بڑا ذہین اور پیارا بچہ ہے۔

مختار احمد اردو کا مشہور افسانہ نگار بیجنگ ریڈیو کی اردو سروس میں ہے اور چین بالتصویر سے بھی منسلک ہے۔ بے حد ملنسار اور پڑھا لکھا انسان، درویش منش، اعلیٰ ظرف ہے اور ان اوصاف کی وجہ سے وطن سے دور رہنے پر مجبور ——— ویسے وہاں کافی خوش ہے۔ کام لگن سے کرتا ہے۔ اور وہاں اسے کام کرنے دیا جاتا ہے۔ چین سے سونا ہے کہ کام کے عادی شخص پر فیند مہربان ہوتی ہے۔

سردی کے ساتھ رات بھی زیادہ ہو رہی تھی۔ مختار نے ٹیکسی سٹینڈ پر فون کیا مگر کافی دیر تک ٹیکسی نہ آئی تو ہم دونوں پیدل مارچ کرتے برفباری کا لطف لیتے ٹیکسی سٹینڈ تک آئے وہاں سے ٹیکسی لی اور مختار مجھے ہوٹل چھوڑ کر صبح ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں نے لباس تبدیل کیا۔ کمرہ کافی گرم تھا۔ کھڑکی کھولی کہ برفباری کچھ دیر تک دیکھوں مگر باہر ہوا آندھی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نے مس لن سے فون پر پوچھا کہ محکمہ موسمیات کی کیا پیش گوئی ہے کل کے بارے میں۔ تو اُس نے بتایا کہ صبح تک برفباری بند ہو جائے گی۔ دھوپ ہو گی البتہ ہوا بدستور چلے گی۔

۲۶ نومبر کی صبح گرم پانی کے غسل سے بدن تر و تازہ ہو گیا۔ تیار ہو کر کھڑکی کھولی تو حیرت ہوئی کہ واقعی برف باری تھم چکی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔ اتنی ٹھیک پیش گوئی تھی اہلِ چین کی۔ اگر ہمارا پاکستانی محکمہ موسمیات ایسی پیش گوئی کرے اور وہ ایسی ٹھیک نکلے تو مجھے امید ہے لوگ محکمہ موسمیات سے متعلق لوگوں کو اولیاء کے برابر عزت و تکریم دیں گے۔ تعویذ دھاگے کروائیں گے۔

ناشتہ کرنے کے بعد مس چن مادام چنگ کامریڈ شان اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ سمر پیلس دیکھنے روانہ ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد بیجنگ کے بازاروں سے نکل کر مضافات میں ایک نہر کے کنارے کنارے سفر شروع ہوا۔ یہ نہر لبِ آربی کی طرح دونوں کناروں سے پختہ ہے اور کناروں پر کیکر قسم کے درختوں کی قطاریں ہیں اور دونوں جانب کھیت ہیں۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد ہم سمر پیلس پہنچ گئے جو بیجنگ کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ گرما میں چینی لوگ یہاں پکنک منانے آتے ہیں اور سرما میں اس پیلس کی جھیل میں برف پر سکیٹنگ کرتے ہیں۔

اس وقت ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی ہے جھیل کا بیشتر حصہ منجمد ہے اور جھیل سے باہر اس عظیم الشان پیلس کے پودوں پر اور گھاس پر جا بجا برف دکھائی دیتی ہے۔ عرفِ عام میں یہ منگ خاندان کی ایک بیوہ ملکہ نے گرمیوں کے دن گذارنے کے لیے بنوایا تھا۔ اس سمر پیلس میں اتنے محل اور حویلیاں ہیں کہ گنتی میں نہیں آتی ہیں۔ یہاں مجھے اپنے یار خداداد کا وہ فقرہ شدت سے یاد آیا جو اُس نے اپنے ایک جسٹس دوست کی بیگم کے اس شکوہ گلہ پر کہ پاکستان نے انھیں کیا دیا ہے۔ کہا تھا۔ ہاں جی آپ لوگوں کو واقعی اس پاکستان نے کچھ بھی نہیں دیا۔ دیکھئے نا یہ آپ کی کوٹھی کہ اندر داخل ہوتے چلے جائیں گر یہ شروع ہونے میں نہیں آتی۔ سمر پیلس بھی دیکھتے جائیے اور چلتے جائیے یہ کھلتا ہی چلا جاتا ہے سمر پیلس ایک الف لیلوی جگہ ہے۔ نظارہ ہی نظارہ ایک کے بعد ایک نیا انوکھا اور خیال انگیز، مور۔ شیر۔ ہاتھی۔ کچھوا۔ ہرن۔ بیل۔ گھوڑا۔ اژدھا۔ اونٹ یہ سب جانور زمانۂ قدیم سے اہلِ چین میں لمبی عمر، عزت، وقار، طاقت، تقدس کی علامتوں کے طور پر قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں۔ اس محل میں ان جانوروں کے مجسمے اور دیواری تصویر آراستہ ہیں۔

ایک کے بعد ایک پویلین ہے۔ جن میں خواب گاہیں، آرام گاہیں اور یقیناً سازش گاہیں بھی ہیں۔ ایک بیوہ ملکہ کے عیش و آرام کی خاطر یہ سات سو ایکڑ پر محیط ہے۔ اُس ملک میں جہاں لوگ آج بھی ریل کی پٹریوں کے قریب چھوٹی چھوٹی جگہوں پر کاشت کر لیتے ہیں زمین کے چپے چپے سے رزق اگانے کے متمنی اور ایک بھی نوالہ ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ اور اس غیر طبقاتی نظام میں آج تک صدیوں کی بھوک

کے خوف سے دامن نہیں چھڑا سکے۔ آج بھی ایک چینی جب دوسرے سے ملتا ہے تو پوچھتا ہے۔

"کھانا کھایا ہے؟"

مس چن مادام چنگ کامریڈ شان اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ اس پیلس کے ایک ریسٹوران میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ چینی کھانے کا لطف جو یہاں آیا وہ اور ہی تھا۔ اس کی لذت غیر معمولی تھی۔

سمر پیلس اصل میں دو محل تھے۔ پہلا محل تاتاریوں نے جن دورِ حکومت (۱۲۳۹ - ۱۱۵۵ء) میں بنایا تھا۔ جہاں آج تسنگھوا یونیورسٹی کا عقبی دروازہ ہے۔ یہ چنگ خاندان کے دورِ حکومت کے آخری دنوں تک رہا اور ۱۸۶۰ء میں برطانوی استعمار نے دربار شاہی کو اپنی شرائط پر مجبور کرنے کے لئے دھمکی کے طور پر جلا دیا تھا۔

یہ موجودہ محل کا زیادہ حصہ چنگ بادشاہوں نے کن منگ جھیل کے کنارے بنوایا ہوا ہے۔ شہنشاہ چی این نے پہاڑی پر سفید بادل (PAI YUN) نامی محل ۱۷۹۱ء میں اپنی ساٹھ سالہ بیوہ ماں کے لئے تعمیر کیا۔ پھر اس میں مزید توسیع ہوئی۔ اور ایک باتصویر گیلری کا عظیم الشان اضافہ کیا یہ گیلری چینی ذوقِ جمال اور پرورشِ فنِ مصوری کا لافانی ثبوت ہے۔ یہ لکڑی کی بنی ہوئی ایک مسقف راہداری ہے۔ جس کی طوالت دو ہزار تین سو اٹھاسی فٹ ہے اور یہ کن منگ جھیل کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، اس میں ہر سو گز کے فاصلے پر ایک پویلین ہے۔ اس راہداری میں دائیں بائیں اور اوپر چینی سرزمین کے لینڈ سکیپ پینٹ کئے گئے ہیں۔ فن کے ان نمونوں کی تعداد کم و بیش لاکھوں میں ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سمر پیلس سے میٹھے خستہ سیب کھاتے نکلے اور سیدھے بیجنگ کا رُخ کیا۔ اور بیجنگ فرینڈ شپ سٹور پہنچے بیجنگ میں آج میری آخری شام ہے۔ جو یو آن گرہ میں تھے خرچ بھی تو کرنے تھے۔

فرینڈ شپ سٹور میں گھومے پھرے کچھ ٹیپسٹری اور مصوری کے نمونے اور کچھ برتن چینی روایتی طرز کے خریدے۔ یہاں لئیق احمد سے ملاقات ہوئی جو تعلیمی وفد کے ساتھ آج ہی بیجنگ پہنچے تھے۔

اس رات افضل قادر اور ان کی بیگم نے کھانا دیا۔ کوثر کی مصوری کے نمونے تو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے پراٹھے، دال، چاول، قیمہ، ساگ، مرغ اور میٹھا جس طرح بنایا اور وہ سب کچھ اتنا لذیذ تھا کہ انگلیاں چاٹیں۔ اعتراف کرنا پڑا کہ وہ ایک اچھی مصورہ ہی نہیں عمدہ کھانا بھی بنانے میں فن کار ہیں۔

۹ بجے رات منزو ہوٹل واپس اور فختار احمد سے فون پر گپ شپ۔ وہ مجھے ریڈیو بیجنگ کے لئے انٹرویو پر اکساتا رہا اور میں ٹالتا رہا بالآخر ٹال گیا۔ یہ چین میں آخری رات تھی

۲۷ نومبر کی صبح جلدی جاگ گیا۔ گرم پانی کے ٹب میں دیر تک نہاتا رہا۔ پھر تیار ہو کر نیچے آیا۔ ناشتہ کیا اور حبیب الرحمٰن فون پر کہہ رہا تھا۔ گیارہ بجے چینی الوداعی کھانا دیں گے اسی ہوٹل میں اور دو بج کر دس منٹ پر پرواز ہے۔ گویا اتنا وقت میرے پاس تھا۔ تب میں نے سوچا کہ پیدل اور چینیوں کی ہمراہی کے بغیر جاتے جاتے چین کی کیا چیز خود دیکھ کر واپس آسکتا ہوں۔

اوورکوٹ پہنا اور ہوٹل سے نکل گیا۔ آہستہ آہستہ ہر شئے دیکھتا فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ یخ ہوا چل رہی ہے۔ مگر منزل دُور نہیں۔ یہ گریٹ ہال ہے۔ سامنے ہسٹری میوزیم اور میری جانب تی این من اور اس کے بالمقابل لمبے چوڑے میدان کے پار عوامی ہیروز کی یادگار اور اس کے عقب میں ماؤ میموریل ہال ——— میں اندر داخل ہوا اور مسکراتے آرام سے پُروقار بیٹھے ماؤ کے سفید فام مجسمے سے گذر کر عقبی ہال میں ماؤ کو سکون سے سیدھے لیٹے سرخ کمبل اوڑھے دیکھتا ہوں، ارد گرد سرخ للی کے خوبصورت پھول مسکرا رہے ہیں۔ اس ہال سے نکل کر پرانے بیجنگ کے گرد معدوم ہو چکی دیوار کے واحد موجود گیٹ (کی این من) کی محرابی سرنگ سے گذر کر چند لمحے رکتا ہوں مجھے چیئرمین ماؤ کی ایک نظم کی ایک لائن یاد آتی ہے "سرزمین چین کے یہ ستر کروڑ عوام سارے کے سارے ولی ہیں۔ یہ ویرانوں کو شہروں میں اور صحراؤں کو کھیتوں میں بدل سکتے ہیں۔ یہ جو چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے" پھر ہوٹل کو چلتا ہوں اور کچھ دیر بعد پہنچ جاتا ہوں۔ جہاں بیگم مختار احمد میری منتظر ہیں اور پلاسٹک کے پھولوں کا تحفہ لے کر آئی ہیں۔

پھر مختار احمد سے ٹیلیفون پر الوداع کہی اور مادام چنگ، مس چنگ کا مریڈ شان، کامریڈ لن اور حبیب الرحمٰن پہنچ گئے۔ مل کر کھانا کھایا پھر ائیرپورٹ کو روانہ ہوئے۔ ائیرپورٹ پر افضل قادر بھی ہیں۔ سب سے ملے اور دو بج کر ۲۰ منٹ پر طیارہ ہوا میں بلند ہو گیا۔ میں اس بلند ہونے کے ساتھ ساتھ چینی زمین پر آخری نظر ڈال رہا ہوں۔ محنت کشوں، کاریگروں، ہنرمندوں اور سچے لوگوں کی زمین ——— کھیتوں، کھلیانوں اور دہقانوں کی سرزمین ——— خود اعتمادی کا تیر دل میں پیوست کر دینے والا خطۂ چین ———

السلام علیکم۔ خواتین و حضرات جہاز کا کیپٹن آپ سے مخاطب ہے۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم چھتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے انشاء اللہ ساڑھے چھ گھنٹے میں اسلام آباد کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اتریں گے۔ اُمید ہے آپ کا یہ سفر خوشگوار گزرے گا۔

جہاز میں کل بیس پچیس مسافر ہیں۔ پی آئی اے کے عملہ کے علاوہ میں واحد پاکستانی تھا۔ باقی سارے مغربی ممالک کے سفید فام لوگ۔ جن میں زیادہ تر بوڑھی عورتیں اور مرد ایک دو جوان عورتیں بھی۔ جن میں سے ایک جینز میں کسی ہوئی ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ جس کا بچہ ایک بیٹری سے چلنے والی کھلونا کار سے کھیلتا ہوا سارے جہاز میں سیٹوں کے نیچے اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر آگے پیچھے جا کر اُسے تلاش کر کے اپنے قریب لاتی ہے اور پھر بچہ اپنے کھیل میں اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ اس جہاز میں مونث ائرہوسٹس دو ہیں۔ ایک تو دلربائی کی سرحدوں سے اتنی دور جا چکی ہے کہ شاید میک اپ سے بھی مایوس ہو چکی ہے اور دوسری یوں لگتی ہے جیسے گذشتہ کئی دنوں سے صرف میک اپ ہی کرتی رہی ہے۔ سچ ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔

طیارہ بلندی مکمل کر کے ہموار ہو چکا ہے۔ میں کھڑکی سے دیکھتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگاتا ہوں اور اپنے سامنے دنیا کا نقشہ پھیلا لیتا ہوں۔ خطۂ چین پر اُن مقامات کو دیکھتا ہوں جو اس سفر میں میری نظر سے گزرے۔ بیجنگ سے شینگ ہائی، شینگ ہائی سے کینٹن اور کینٹن سے بیجنگ واپس۔ ان مقامات کو اگر خطِ مستقیم سے ملا دیا جائے تو کینٹن سے بیجنگ والے خط پر کینٹن سے شینگ ہائی اور بیجنگ سے شینگ ہائی تک خطوط کینٹن اور بیجنگ کے نقطوں پر برابر برابر زاویے بناتے ہیں۔ اس طرح شینگ ہائی کینٹن اور شینگ ہائی بیجنگ والے خطوط بھی اپنی لمبائی میں تقریباً یکساں ہیں۔ یوں وہ علاقہ جو میں نے دیکھا چین کے مشرقی ساحل پر ایک مساوی الساقین مثلث کی شکل بناتا ہے۔ اور اس مثلث کا رقبہ چین کے کل رقبے کا کم و بیش بیسواں حصہ ہے۔ یہ مساوی الساقین مثلث بیجنگ سے کینٹن والے عمود ائخط پر بن رہی ہے۔ علم ہندسہ کی یہ شکل مجھے خاص پسند ہے۔ میرے

دائیں ہاتھ میں یہ شکل عام ہے۔ خطِ کمال میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ہمیشہ سے میرے لیے اتنی خیال انگیز رہی ہے۔ جتنے مصر کے اہرام۔ باہر کا منظر بادلوں کی گہری تہ کے نیچے ہے اور اندر جہاز کا منظر سیاحت سے واپسی پر تھکے ہوئے چہروں کا منظر ہے۔ اس لئے میں مثلث پر اپنی دلچسپی مرکوز رکھنے پر مجبور رہوں مثلث کے تین زاویوں کے حوالے سے میں نے چینی قوم میں جو کچھ دیکھا چشمِ تصور میں لایا تو سائیکل لباس اور زبان تین نقطے بڑے ٹھوس بڑے واضح دکھائی دیتے ہیں۔

ایئر ہوسٹس چائے اور ہلکا سامانِ خورد پیش کر گئی ہے۔ میں چائے کا گھونٹ لیتا ہوں اور نقشے پر بیجنگ سے ۴۰ ڈگری عرض بلد کو مغرب کی طرف سفر کرتا غور سے دیکھتا ہوں۔ جو روس میں سمرقند اور بخارا کے سر پر سے گذرتا کیسپین کو عبور کر کے ترکی کے دارالحکومت انقرہ سے جا ملا ہے۔ میری دلچسپی اور بڑھتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں ۴۰ ڈگری عرض بلد جاپان کے نچلے ساحل سے آتا ہوا شینگ ہائی کے پاس سے گزرتا ہے۔ میں ۳۰ ڈگری عرض بلد کا تعاقب کرتا ہوں۔ جو قراقرم عبور کر کے لاہور کے پاس سے گزرتا ہے۔ جہاں مغرب کے جواب میں پیام مشرق میرے مرشد نے لکھی۔ لاہور سے گزر کر ۳۰ ڈگری عرض بلد افغانستان سے گزرتا ہے اور اس عرض بلد پر جتنے فاصلے پر شینگ ہائی اور لاہور واقع ہیں۔ اسی فاصلے اور اسی سمت پر قندھار ہے۔ جہاں محراب گل افغان کی للکار گونجتی ہے۔ راستہ روک لیتی ہے۔

افغان باقی ! کہسار باقی !

اب میری نگاہ ۳۰ ڈگری سے ۲۰ ڈگری عرض بلد کی طرف جاتے جاتے ایک سرخ لکیر پر رک جاتی ہے۔ یہ خطِ سرطان ہے۔ جو کینٹن سے گزر رہا ہے۔ جو برما، بنگلہ دیش، بھارت سے گذرتا بھارت اور پاکستان کو بمبئی اور کراچی کے درمیان سے کاٹتا بحیرہ عرب میں خلیج کے دہانے سے گزرتا اومان سے جا تا سعودی عربیہ میں داخل ہو کر اس شہر میں مجھے چھوڑ جاتا ہے جو کبھی بیماریوں کا شہر یعنی یثرب کہلاتا تھا پر چودہ صدیوں سے اب تک خاک اس شہر کی اکسیر ہے۔ آنکھ کا سرمہ ہے اور آشفتہ سروں کی دستار ہے

"خواتین و حضرات! جہاز کا کپتان آپ سے مخاطب ہے۔ اس وقت ہم چین کے صوبہ سنکیانگ کے دارالحکومت اورمچی پر سے پرواز کر رہے ہیں شکریہ۔"

میں نیچے دیکھتا ہوں۔ بادلوں نے بھی نگاہ کو زمین تک راستہ دے دیا ہے۔ مگر اورمچی شہر اور اس کے گرد و نواح میں اتنی بلندی سے کوئی بھی شے قابلِ شناخت نہیں ہے۔ البتہ جو بھی زمینی منظر ہے۔ ایک ہلکی ہلکی مہک اس کی اس بلندی تک پہنچ رہی ہے۔ اہلِ چین ابھی جفاکشی کے پسینے میں شرابور ہیں۔ ابھی اقلیمِ انبساط میں داخل ہوں گے اور سرخوشی کی ہوا چلے گی تو قلوب میں ردِ عمل کی لہر ضرور اٹھے گی

خواتین و حضرات! نیچے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں میں گہری لکیر شاہراہِ ریشم ہے اور بائیں جانب تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو آپ دیکھ سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہم چین سے نکل کر پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ شکریہ

شام ہو رہی ہے۔ بادلوں کی تہیں اور گہری ہو رہی ہیں۔ میں پھر نقشہ پر تکون کا مطالعہ کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مثلث کا نقطۂ ابھار چین کے مشرقی ساحل پر یعنی شینگ ہائی ہے۔ پھر سمندر ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ ابھار سے مثلث کی دو مساوی ٹانگوں کو لمبا کر کے دیکھنا چاہیے اور میں شینگ ہائی سے بیجنگ والے خط کو آگے بڑھاتا ہوں، جو منگولیا کو کاٹتا ہوا روس میں داخل ہو کر سائبیریا میں ٹھٹھرتا ہوا بالآخر بحرِ منجمد شمالی میں اتر جاتا ہے۔ پھر میں شینگ ہائی سے کینٹن والے خط کو لمبا کرتا ہوں تو وہ لاؤس، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا

اور نیکال سے گزرتا بحرِ ہند میں اتر جاتا ہے۔ اگر ان دو خطوط کو ٹانگوں کی بجائے بازو کہہ لیں۔ تو ان دو پھیلے ہوئے بازوؤں کے زاویہ میں سارا کرۂ ارض سما جاتا ہے۔

خواتین و حضرات! آپ اپنی بائیں جانب تقریباً ۶۰ میل کے فاصلے پر چوٹی بلند ترین ہوٹی نانگا پربت دیکھ سکتے ہیں۔ شکریہ

نانگا پربت کی طرف بادل تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ جیسے اُسے آغوش میں لینے کو بیقرار ہوں اور میں درختوں کی آغوش میں سمائی ہوئی زمین پر اس صدی میں کوئی مشترک بات تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر نانگا پربت کو دیکھتا ہوں بادلوں نے اُسے بالکل ڈھانپ لیا ہے۔

خواتین و حضرات اب اپنی دائیں جانب نیچے راکاپوشی کو بادلوں کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے۔ اندھیرا زیادہ ہو گیا ہے شکریہ۔

کے ٹو۔ نانگا پربت۔ راکاپوشی۔ گویا ہم اس وقت دنیا کی بلندیوں پر سے پرواز کر رہے ہیں اور تین چوٹیوں کے حوالے سے میرے ذہن میں تین نقطے مثلث کے پھر روشن ہو گئے۔ میں نے ایک نقطے پر جذبہ رکھا۔ دوسرے پر فعل رکھا اور تیسرے پر فکر۔ کہیں پہ فکر تھا۔ جذبہ نہ تھا۔ کہیں جذبہ تھا تو عمل نہ تھا اور عمل تھا تو فکر نہ تھا۔ گویا ہاتھ دل اور ذہن میں اشتراکِ کار کا فقدان ہے۔ اس سانحہ کے باوجود ایک ہی حرف سے شروع ہونے والے تین نام مارکس، مادّ اور مودودی ذہن میں روشن ہوئے۔ تو کسی نے میرے دل میں کہا۔

یہ سب فروغِ اسمِ محمدؐ ہے۔

تو پھر ہاتھ دل اور دماغ میں عدم اشتراک کا سانحہ کیا ہے۔

میں نے پوچھا۔

ابھی یہ جلوے تمام کے تمام نامِ نامی اسمِ گرامی محمدؐ کی 'م' اوّل کے ہیں اور یہ رنگ و بو کا قافلہ ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است تب کتنی ہی ملکوتی آوازیں میری سماعت میں اتر آئیں اور میں کن فیکون کی صدائے دما دم سے آشنا ہوا کہ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید۔

خواتین و حضرات! آپ اپنی گھڑیوں میں وقت ٹھیک کر لیں۔ پاکستان میں شام کے ساڑھے پانچ ہیں۔ میں نے اپنی گھڑی میں جہاں چین کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ وقت تین گھنٹے پیچھے کر لیا۔ اپنا وقت تین چوٹیوں کی اوٹ میں تین نسلیں پیچھے کر لیا۔

خواتین و حضرات! ابھی کچھ دیر میں ہم اسلام آباد کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔ حفاظتی بند باندھ لیجئے سگریٹ بجھا دیجیے۔ شکریہ!

جہاز بلندی کم کرنے لگا تو میں نے باہر دیکھا۔ بادلوں کے اوپر گہرا نیلا آسمان اُس میں ایک جھلمل کرتا بڑا سا شوخ ستارہ دیکھا تو یاد آیا کہ پورے دورۂ چین میں ہم نے آسمان کی جانب دیکھا ہی نہیں اللہ اللہ کیا زمین تھی کہ اُس پر آسمان ہی نہ تھا۔

لیکن آسمان بہت ضروری ہے۔

ورنہ انسان زمین پر چلتے چلتے راستہ بھول جاتا ہے۔

میرے دل میں کوئی کہہ رہا تھا۔

قطب نما اصل نہیں ——— قطبی ستارہ اصل ہے۔ جنھیں اپنی صبح یاد نہ اپنی شام یاد رہی وہ گردشِ صبح و شام میں گم ہوئے مانند اُس ورق کے بے شک جو نقشۂ چاہِ جیواں تھا۔ پر کتاب سے نکلا۔ ہوا میں لے اڑیں۔

مجھے اپنا قطبی ستارا یاد ہے۔ جو چراغ بن کر مرے طاقِ دل میں جلے تو ستارۂ شب، جب سپید و سیاہ سمندروں کی موجیں اپنے اپنے اصل کو لوٹ جائیں تو ستارۂ سحر بھی ہے۔

یہی ستارہ قلبِ اعدا پر متمکن کرتا ہے۔ تیر جری بہادروں کے — یہی ستارۂ شام بھی ہے۔ ہمیشہ جس کے نواح میں تلاش کی میں نے ہلالِ عید کی — یہ ہلالِ عید جو خنجرِ ہلاکت ہے۔ ان کے لئے جو روشنی سے چہرہ پھیرتے ہیں، ہدایت کو دلوں کے دَرسے دھتکارتے اور ظلم کرنے والے ہیں۔ جن کی شکست میری فتح — ہیں ازل کا فتحمند — چاند رُخ — ستارہ سمت یہ میری جانماز سرسبز سفید، اجلی اجلی، نکھری نکھری، افق تا بہ افق!

عشقِ ثقافت

ثاقبہ رحیم الدّین

میرے مہربان اور ستم ظریف دوستو — ! آؤ بیٹھو کچھ تم سناؤ کچھ ہم سے سنو — جہاں تک، لکھنے لکھانے کا تعلق ہے تو بڑے ادیب کے کیا کہنے۔ کبھی وہ اپنے لئے موضوع زندگی کی عام باتوں سے حاصل کرتا ہے اور کبھی روزمرہ کی دنیا سے ماورا عنوانات پر قلم اٹھاتا ہے۔ ایک مزاح نگار کس رقت اور کب حیاتِ انسانی کی متحرک قدروں کو دیکھتا ہے، یہ بتانا مشکل ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ وہ ماضی کی بکھری ہوئی رداؤں پر کیسے نظر ڈالتا ہے۔ اور وہ ابھرتے ہوئے نئے ذہنی رجحانات اور مصلحت پسندی پر کس سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ مزاح نگار خود زیست کے متصادم مسائل اور دور سے آنے والی تیز و تند ہواؤں میں گھرا ہوا ہے — وہ کیا کہے؟ کیسے کہے اور کسے سنائے؟

دیکھئے جناب یہ کہاں کی دوستی ہے کہ آپ مہربان ہوتے ہوئے کوئی موضوع میرے لیے تجویز نہیں کرسکتے ہیں۔ آخر ہم ایک دھواں دار تقریر، نعرے اور تالیوں کے بغیر آپ کو کیسے مخلص سمجھ لیں؟ خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ کوئی وقت ہو کوئی زمانہ ہو، شگوفے تو کھلا ہی کرتے ہیں — اور ہاں چٹیاں تو چہکا ہی کرتی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہر باذوق انسان کو ہمیشہ عشق میں مبتلا رہنا چاہیے۔ پاکستان بننے کے بعد سے ثقافت کا عنوان بڑے دلربا مراحل سے گزرا ہے یقین مانیے — ہم خود عشقِ ثقافت میں جی جان سے گرفتار ہیں۔ میرے کچھ اور کہنے سے پہلے، آپ بس ہاتھ اٹھا کر، جوشیلے انداز سے، پہلے اپنے آپ کو یقین دلائیے اور زور سے اعلان کیجئے ..... کہ "یہ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ .... !"

تقریباً پچیس سال پہلے، ہم پاکستانیوں میں عجیب عجیب ہوائیں تھیں۔ نیا نیا ملک وجود میں آیا تھا — واقعی یہ اچھا ہوا کہ اُن ہنگامہ خیز دنوں میں، لوگوں نے آنسوں گھروں اور زمینوں کو حاصل کرنے میں تیزی دکھائی ——— ورنہ ہر شام یار دوستوں کی محفل میں چائے کا پیالہ پیتے ہوئے، پاکستان کے آئین کے بننے کا شوشا چھوڑا جاتا۔ اُس وقت زیادہ بڑے لوگ صرف انگریزی ادب پڑھا کرتے تھے اور نسبتاً دیسی لوگ کرشن چندر، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی کتابیں پڑھتے تھے۔ عصمت چغتائی کو ذرا بے شرم لڑکیاں پسند کرتی تھیں۔ منٹو کا نام اکثر و بیشتر بطور گالی کے استعمال میں آتا تھا اور ایک نوجوان کے لئے اُس کو پڑھنا، انقلابی ہونے کے برابر تھا۔ کراچی میں "منٹوئی ذہنیت" عام ہونے کا خطرہ تھا۔ اکثر کارٹونسٹ، ابراہیم جلیس کے نام کے ساتھ جیل خانے کی لوہے کی سلاخیں بنا دیا کرتے تھے۔ احسان دانش اور حفیظ جالندھری پُرامن شعرا تھے۔ نیک بیبیاں "عصمت" "جوہرِ نسواں" اور "حور" پڑھا کرتی تھیں۔ "شمع" "چنگاری" اور "آنگن" ذرا رنگیلے رسالے تھے۔ اور بھئی "ادبِ لطیف" "نقوش" "نیرنگِ خیال" اور "نقاد" کے بارے میں کیا کہیں — یہ تو باذوق لوگ خریدا کرتے تھے۔ ہم بھلا کیا رائے دیں؟

۱۹۵۶ء کی بات ہے ایک نوجوان کے ماڈرن اور ترقی پسند ہونے کی علامت یہ تھی کہ گردن پر بال بڑھائے معہ میل کے

ناخن بڑھا لے، اور جون کی گرمیوں میں، زیلنس ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر BLACK بلیک کافی پیے۔ یہ ریسٹورنٹ انسٹنٹ سٹریٹ، جس کا پایۂ کا نام "الفی" تھا پر واقع تھا۔ اس نوجوان کا آہیں بھرنا، غمگین ہو کر آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ڈالنا از حد ضروری تھا۔ کافی ختم کر کے بل کو گرل فرینڈ پر چھوڑ دینا اور کھوئے ہوئے انداز سے باہر نکل جانا، فیشن تھا۔ لال پیلے ڈھیلے بشرٹ پسندیدہ تھے۔ ذرا غور فرمائیے ہمارے علامہ اقبالؒ نے قبل از وقت، کیسے پیار سے گلوں کو "اودے اودے نیلے نیلے پیرہن" پہنے کو کہہ دیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کی تو اور بات ہے کہ انہوں نے اپنی صحت کا خیال نہ رکھا۔ مگر ہم تو اس وقت ان کی جدائی میں سوکھ سوکھ کر بتی ہوئے جا رہے تھے۔ حسن کا یہ معیار حاصل کرنے کے بعد، لباس کا قدرتی طور پر بگڑنا اور ڈھیلا پن بڑھ رہا تھا۔ اچھا خیر — یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔ ہم اپنے محبوب، ثقافت کو یہ کہے بنا نہیں سکتے۔ ع

مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

سنیئے صاحب — کسی ملک کی ثقافت آجکل دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے رسم و رواج دیکھیے — تقاریب اور محفلوں میں جایئے۔ اب ہم میں ایسی شان بے نیازی آئی ہے کہ پرانی غلامانہ ذہنیت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ ہمارے احباب لاکھ پیچھے پڑے مگر ہم نے WEDDING نہ منائی اور نہ کیک کاٹا۔ اسی طرح ہمارا بڑا منا جو ماشاءاللہ بیس سال کا ہے HAPPY BIRTHDAY ANNIVERSARY ہک لک کر نہیں مناتا ہے۔ اب تو مرد حضرات میں ترس ترس کر رہ جانے کی کیفیت (حضرت آتش سے ملتی جلتی) بڑھتی جا رہی ہے۔ آج کل نہ NEW YEAR کوئی مناتا ہے اور نہ لوگوں نے رات ایک بجے تک ایسی حرکتیں کیں کہ جس سے خود بخود سویرا ہو جائے۔ ہم تو بس اپنے محبوب کے متوالے ہیں۔ واہ وا کیا کہنے کیسی سوچ کیسی فکر اب ہم ثقافت کے نئے سورج، مگر سرخ ہرگز نہیں، کی تلاش میں چل پڑے ہیں —

ہماری پھوپھی جان اپنے بیٹے کا ولیمہ ارینج کرنے کا حقیقتاً ایک ہی نظر افروز بکرے پر کروا دیتی ہیں۔ دوستو — کیا تم سوشل خلوص کے لئے ہماری جان لے لوگے — ؟ یخنی پلاؤ اور اس کی خوشبو — لطف آ گیا۔ مگر تمام مہمانِ گرامی تکے کباب اڑاتے وقت بھول بھول جا رہے ہیں کہ وہ ولیمے میں آئے ہیں یا عقیقے میں — ہم نے خود گھبراہٹ میں دولہا کو عقیقے کی مبارکباد دے دی ہے

نہیں نہیں — بات مانیے، بلا وجہ بحث نہ کیجیے — آج جو شادی پڑوس میں ہے، اس کے سارے انتظامات میرے سامنے ہوئے ہیں۔ دلہن والے شام سات بجے تک۔ بڑے سے بڑے فوجی اور سویلین افسروں کو "کوک" پیش کرتے رہے۔ ذرا دیر بعد کچھ "نرچائے" آئی — اور آخر کار چاند تاروں کے جھرمٹ میں وہی مرغِ مسلم اور محبوبِ زمانہ نظر افروز بکرے کا تورمہ — دولہا والے ایسے سادہ اور نظم و ضبط والے کہ انہوں نے بری کے سوٹ کیسوں کی چابی سرمائکر دلہن والوں کو تھما دی — ہم تو اپنی وضع داری اور تہذیب کے قربان ہو ہو گئے — ! دلہن والوں نے منہ سے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے مہندی کی رات ہی جہیز دولہا کے گھر بھجوا دیا۔ دیکھئے شرم و شرمی میں کیسا حسن ہے جہیز و بری کے تعلقات میں کیا رمز کنایہ ہے؟

میرے ستم ظریف دوستو — خواہ مخواہ ہنسے جا رہے ہو۔ ابھی ہم نے ثقافتی سین کے climax کی بات بھی نہیں کی — ہاں تو شادی میں نئی نویلی بنو، ناجو پیاری بیوٹی سلون سے دلہن بن کر آنے والی ہے۔ ارے رے رے — یہ تو سامنے کی سڑک سے بڑا بھاری

بلوں گزر رہا ہے لو بھئی مہمانوں نے گھبرا گھبرا کر ڈنر کھا لیا اور اس کے بعد دلہن گھر کے پچھلے دروازے سے سجی بنی اندر آ گئی ہے تاکہ نکاح میں شامل ہو سکے۔ بہت رات ہو چلی ہے، باقی باتیں پھر ہوں گی۔

ہم نے ہمیشہ بڑوں سے سنا تھا کہ موسیقی اور گیت سنگیت ایک قوم کی تہذیب و روایات کے امین ہوا کرتے ہیں۔ نغمہ و ترنم انسان کی روح کی تصویر اور اس کی پکار ہیں۔ سوچا کہ ہم بھی اپنے حسن ذوق کو زندہ و جاوید رکھیں گے اور اسٹیج، ٹی وی ریڈیو اور نجی محفلوں میں موسیقی کے پروگراموں میں ضرور شامل ہوں گے۔ ہاں تو صاحبو — اب دل تھام کر بیٹھئے۔ رنگا رنگ حادثات آپ کو سنائے جانے والے ہیں ایک بار یوں ہوا کہ ہم سب سے بڑے شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں "ثقافتی شو" دیکھنے گئے۔ ہم جان بوجھ کر دھیمے دھیمے مہذب انداز سے دوستوں سے بات چیت کرتے رہے۔ اسٹیج پر ایک نوخیز ابھرتی ہوئی فنکارہ آئیں جن کے بارے میں پہلے سے کہہ دیا گیا کہ وہ عظیم ہیں۔ ہمارے پیچھے سے ایک محترمہ نے فرمایا کہ "ان کے عظیم بن جانے کے وقت تک ہمارا کلیجہ ضرور پھٹ جائے گا" — ہاں اور تو کچھ نہ ہوگا۔" بہرحال انہوں نے فن کا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے مرحلوں سے گزریں۔ جوڑے پر جوڑا بدلا، کندھے ہلائے، دیدے گھمائے، آہیں بلند ہوئیں اور گیت کے اختتام پر بڑے زوروں سے شرمائیں حد ہو گئی جناب۔ ہم چپ ہیں اور آپ مسلسل سمجھا رہے ہیں کہ سر دھنو — مدہوش ہو جاؤ اور زور زور سے تالیاں بجاؤ — اچھا اچھا سمجھ میں آ گیا یہ ہمارے اصل ثقافتی ہونے کی علامتیں ہیں۔

دورِ حاضر میں ظالم سماج فنکار کا استحصال اور قتل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ پہلے تو مغلوں کے دربار میں موسیقار فرشی سلام کرتے اور آنکھیں ملتے تھے۔ انگریز حکمران آیا تو انہیں ذرا چال میں کلف لگانا پڑا اور منہ ٹیڑھا کر کے بولنا اور ہنسنا آیا۔ اب ہمیں آزادی اور جمہوریت دے گئی ہے (جو کہ ہے کہ ہو) اور فن کار کی عبادت اس کے حسن ادائیگی میں نظر آتی ہے۔ سنئے بھائی صاحب۔ آپ کا کیا جاتا ہے آپ ہر فنکار کو عظیم کہہ دیا کریں — آپ علامہ تو دیکھئے کہ وہ تہذیب و تمدن کا علمبردار ہوتے ہوتے۔ لمبی بحروں اور اترے سروں میں آہیں لے کر گائے تو عوام خفا ہو جاتی ہے۔ آخر وہ قوت کا چشمہ ہے۔ تو چھ چیاں کرنا ہی پڑتا ہے۔

چلیئے خدا کا شکر ہے آج کے اس فنکشن میں رنگ بدلا ہوا ہے۔ یہ کیا؟ انگریزی میں غزل گائی جا رہی ہے۔ ہماری کزن پہلے سر ہلا رہی ہے، پھر ہاتھ اور پھر انگلیس تھرا رہی ہے۔ اب تو ہم بھی محظوظ ہو رہے ہیں۔ کمال ہے میرے ساتھیو — یہ ہڑتال اور جلوس کا سماں کیوں بندھ گیا؟ شاید مجھے کچھ غلطی لگی ہے یا معلوم نہیں یوں ہی، لوگ نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے اٹھے اور نازک و مہین فنکارہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔

آخر آپ اصرار پر اصرار کیوں کر رہے ہیں کہ میں اب لاہور والے "ثقافتی شو" کا حال سناؤں! سچ ہے کہ ہمارے احباب بلائے جان ہیں — خیر تو پھر سنیئے — پرسوں ہم لاہور میں ایک جان لیوا "ثقافتی شو" میں گئے۔ تعجب ہوا کہ کوئی عظیم اور مشہور گلوکارہ نظر نہ آئیں ہم ایک محب الوطن فن کارہ کے اعتدال پسندانہ اور مصلحت پسند رویہ سے بڑے متاثر ہوئے۔ نہ انہوں نے فرشی آداب کیا اور نہ ٹانگوں اور جسم کو مائیک سے لپٹا کر تھرتھرایا۔ انہوں نے ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر دو مصرعوں کے درمیان "ہوک" لگائی۔ ہم اُن پر دل و جان سے نثار ہو رہے تھے۔ جیسے ہی ٹی وی والے ہم پر لائٹ ڈالتے ہم جذب و شوق کے عالم میں آنکھیں زور سے بند کر لیتے۔ معزز فنکارہ "آئیو ٹیوا دا آئیو ..... تو رد تو رد تو رد ..... پوم پوم پا پوم پوم پا پوم پوم ... اوائیں ایں ایں .... واں واں واں ....."

قسم کی آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ اس لمحے ہمارے دل نے گواہی دی کہ ثقافت گول گول موٹے موٹے مونچھوں اور چمکتی آنکھوں کے دائرے سے نکل کر پختگی کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے۔ تب ساز بجانے والوں نے آلات موسیقی کو سینے سے لگا لیا۔ کسی نے سُر کو بندی پر پہنچانا چاہا تو بالوں سے چہرہ چھپ گیا اور داڑھی مونچھ سب مل ملا کر جنگل بیاباں میں ڈھل گئے ——— بہت خوب ——— بہت خوب ——— آپ سب تو ہنس ہنس کر بے دم ہوئے جا رہے ہیں، ہم بات ختم کئے دیتے ہیں۔

کسی دانا کا قول ہے کہ سڑکیں اور راستے تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چلئے چلئے ذرا گھوم پھر آئیں۔ اُہو ہو ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔ چند سال پہلے کراچی میں "نور دین سوت والے"۔ "محمد اشرف ٹین والے" اور "اللہ دتا صابن والے کارتوس مارکہ" تھے ——— اب اچانک "البیرونی کوٹن انڈسٹری" کا بورڈ لگا بیٹھے۔ اچھا یہ وہی محمد اشرف ٹین والے "ال ہارون اینڈ کمپنی" ہیں۔ واللہ جواب نہیں حسن ذوق کا ——— اللہ دتا صابن والے کارتوس مارکہ کا بورڈ ہٹ گیا ہے۔ اور بسم اللہ کے بعد "خمینی جنرل اسٹور" کا بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ نہ بھئی نہ۔ ہم "لٹکا دیا" نہیں کہہ رہے ہیں۔ آپ نے غلطی کی ہے۔ آپ لوگ پڑھنے پڑھانے میں غلطی نہ کیا کریں۔ ہماری سمجھ میں خاک نہیں آتا کہ اچھا بھلا "قدافی میڈیکل اسٹور کوئٹہ" ایک صبح "رہبرِ حفظانِ صحت کوئٹہ" میں کیسے بدل گیا۔

کالج کی لڑکیوں کو لے لیجیے۔ لاہور کی طویل گرمیاں صنفِ نازک پر بار ہیں۔ لہٰذا ان کو کالج سے اکثر و بیشتر "کم ان بیوٹی سیلون" "نکی ہیئر ڈریسر اینڈ بیوٹی سیلون"۔ "گرینڈ بیوٹی پارلر" اور "ڈکٹورین بیوٹی ٹچ اینڈ اسٹیم باتھ" جانا پڑتا ہے۔ اتنی خوشی ہوتی ہے کہ ممی ڈیڈی پیا اور ڈیڈ اتنے سویٹ ہو گئے کہ کبھی MIND نہیں کرتے۔ ہاں تو ہم بات کر رہے تھے سائن بورڈ کی۔ اب جو اپنے حُسن کو ذرا ٹریٹ منٹ دینے جا رہا ہو تو اُن سیلونوں کے بجائے "الحمرا سیلون"۔ "ال فلوریٹرا ماہرِ حسن اینڈ کمپنی"۔ "ماہ لقا حسن ساز انجمن" اور "یا حبیبی بیوٹی سیلون" لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمیں بتاؤ کہ ہم کدھر جائیں ——؟ سارا وقت جگہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے نکل جاتا ہے۔ آجکل پڑھائی بھی تو اتنی مشکل ہے۔ کمپیوٹر ٹریننگ کی کلاس، بس جی دو گھنٹے کے وقفے سے شروع ہو جاتی ہے! ہماری زندگی حرام ہو گئی ہے۔

ہم عورتیں، انسانی چہرے پر دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ ہیں۔ اسے موندنے اور جھکانے سے بھلا کیسے کام چلے گا؟ ہر زمانے میں مرد نے کسی نہ کسی "ازم" کا نعرہ لگایا مگر وہ بیچاریاں کبھی کچھ بولیں؟ مردوں کے ذہن سیاست، فوج، معاشیات اور بیرونی ممالک سے تعلقات، غرض ہر عنوان پر مسلسل لہراتے، گنگناتے اور بل کھاتے رہے۔ آخر کار ہم خواتین کی آنکھ کھلی اور ہم بیدار ہوئے۔ اب ہم ملکی ثقافت کو بلند، بلند سے بلند تر اور پھر بلند ترین کیوں نہ بنائیں۔ (عزیز دوستو۔ مسکراؤ نہیں تم شاید میری اس بات کو جدید نظم کا مصرعہ سمجھ رہے ہو۔!)

ہم پاکستانی ہیں اور ملکی ثقافت کو استحکام دینے کے لیے قلمی قوت کا اظہار کرتے ہیں۔ اکثر خواتین مضامین کا عنوان اس طرح سے دیتی ہیں "آزادیِ نسواں"۔ "حقوقِ زن کی حفاظت"۔ "مرد و عورت انصاف کے آئینے میں"۔ "عظمتِ خواتین" اور "معاشرے میں عورت کا مقام"۔ وغیرہ وغیرہ ہم دوسروں کو کیا کہیں، ہم خود بڑے موڈرن ہیں۔ جب ہمیں آزادیِ نسواں ٹائپ کا انشائیہ لکھنا ہوتا ہے تو ہم موٹے لینس کا چشمہ لگا کر، چھپی ہوئی چادر سر سے اوڑھ کر، کچھ اداس سی تصویر کھچوا لیتے ہیں۔ یہ انشائیہ شروع ہونے سے پہلے چھاپ دی جاتی ہے۔ جی ہاں جی ہاں ——— ہم آپ کا اشارہ سمجھ گئے! جب ہم نے انگریزی میں WOMEN AND BASIC CONCEPT OF FREEDOM AND EQUALITY کے قسم کا مضمون لکھا تو کانوں سے اونچے بال کٹوائے اور چیتے کی طرح کا لیدر کا

کوٹ پہنا۔ ہماری کمر پہ بڑا سا بکل ہے جس پہ کچھ دھات سے ثقافتی نشان ہے مثلاً اونٹ، بیل کے سینگ، مچھلی، یا حقہ وغیرہ ——— اور مضمون کے ابتدا میں، ہماری یہ تصویر چھپی ہے۔ کہیے کیا سمجھے۔؟ ہماری ایک افلاطون سہیلی نے بڑا تیکھا سوال کیا اور خود ہی اپنی ذہانت سے جواب بھی دے دیا۔ "جی ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اونٹ کمر کا تو پرابلم بنا ہوا ہے۔ اکثر نظر نہیں آتی، پھر کہاں کی بکل اور کہاں کا بکل۔؟ اس کا حل یہ ہے کہ گلے میں لمبی سی چین ہو اور اس میں WHITE METAL کی منی سی آدمی کی کھوپڑی لٹکی ہو۔ دھات کا بنا ہوا چھوٹا سا لسی کا مٹکا، یا کھجور کا درخت بھی گلے کی چین میں لٹکا ہوا بڑا CUTE لگتا ہے" ——— میری پیاری بہنو ——— ! بات میں بات نکلتی چلی جا رہی ہے ——— یاد رکھیئے آپ کو ظالم سماج، بے درد زمانہ، اور استحصال سے بچنا ہے۔

اس وقت جو ہمارا رہن سہن اور عادتیں ہیں، وہ ہماری صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت کا آئینہ ہیں۔ ہمیں اس سے کیا۔ ہر ذہن میں راوی کی لہروں سے الہڑ مٹیاران' لاچہ باندھے اُبھرتی ہے، مچلتی ہے اور جھومری انداز سے عشق کرتی ہے ——— ہم بھلا کیا کہہ سکتے ہیں۔ ——— کیکر کے درخت تلے سائیں جنو اجرک اوڑھے کھڑا ہے۔ بال نوچتا ہے، سینہ کوٹتا ہے اور چیخ مار کر دھمال کرنے لگتا ہے۔ اللہ اللہ رے۔ اب ہم سے تو کچھ کہا سنا نہیں جاتا۔ پتھریلی زمین پہ آغا بندوق پہ بندوق چلا رہے ہیں اور ان کے اپنے کانوں سے غیرت کے خون کا فوارہ زور سے بہہ رہا ہے۔ اچھا اچھا یہ خوب رہی۔ شیشے کی ٹوپی لگا کر بھیڑ کا بچہ بغل میں لے لو اور چٹکی سے دانتوں میں نسوار لگاؤ تو بلوچی ثقافت کا جھنڈا لہرا جاتا ہے۔ چلو بھئی۔ سب خوش رہو ہم ٹھہرے کم گو ——— ذرا زبان و ادب پہ نگاہ ڈالیں۔

آجکل فیشن کے مطابق آپ کو مسلسل اہلِ قلم بنے رہنا چاہیے۔ اچھی زبان بولنے اور لکھنے میں تشبیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً بڑے سے بڑا فلسفہ اور نظریہ ہو، عورت سے تشبیہ دے ڈالئے۔ جیسے سیاست ایک بڑا شوخ و چنچل محبوب ہے (یعنی عورت ہے) ادبی تحریکیں حسنِ یار کی طرح کئی روپ رکھتی ہیں (یعنی خواتین ہیں)۔ تجارتی معاہدے وعدۂ محبوب کی طرح وفا کئے جاتے ہیں (یعنی خاتون ہیں) کراچی والوں کے لیے گیس بجلی اور پانی کے صحیح انتظامات انتظارِ محبوب سے طویل تر ہیں (خواتین جیسے ہیں) ——— ہمیں اپنے ایک درست کا جملہ سنائی دے رہا ہے کہ مان گئے تمہاری شیریں زبانی کو ——— باتوں ہی باتوں میں کیا کچھ سمجھا دیا ——— !

نوجوان طلبا و طالبات ہر قوم کا سرمایہ اور مستقبل کی روشنی ہیں۔ ہم اس نظریے کے دل و جان سے قائل ہیں۔ بقول ہمارے بزرگوں کے پاکستانی ثقافت کا شجا موتی ہمارے نوجوانوں کے قلب و ذہن کے سمندر میں چھپا ہوا ہے۔ ہمارے نوجوان فطری طور پر آزاد و معصوم ہستیاں ہیں۔ کیوں جناب جب ٹیگور انسانی دل کو آزاد کہہ کر مخاطب کرے تو آپ پُرزور تائید کرتے ہیں اور برنارڈ شا انسان کو ابتدا سے معصوم تصور کرے تو آپ فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ ہم بھی طلبا و طالبات کی اس ادا کو قدرتی عطیہ سمجھتے ہیں اور شکر ہے کہ وہ معلومات اور علم ادب کے بوجھ سے گھائل نہیں ہوئے۔ سیدھی سی بات ہے بیچارے لڑکے صرف امتحان دینا نہیں چاہتے تو آپ دلوا دیتے ہیں، اور وہ کالج کھلوانا چاہتے ہیں آپ بند رکھتے ہیں۔ وہ اپنے منوا کو بہلانے نکلتے ہیں، اساتذہ کلاسوں میں بٹھا دیتے ہیں۔ اُن کی سیاسی وفاداریاں پاکستانی تہذیب و ثقافت پر قربان ہوئے جا رہی ہیں۔ یہی پیاری ثقافت نوجوانوں کو خون کے آنسو رلاتی ہے مثلاً جھنگڑ ڈالو، لڈی مارو، تالیاں بجاؤ، کولہے مٹکاؤ اور منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکالو ——— ستم یہ کہ کہیں کہیں یہی ثقافت اچانک ملنگ بنا کر پیروں میں گھنگرو بندھوا دیتی ہے۔ کیا کہنے ——— زمانے تیرے رنگ نرالے۔

لو اُدر سنو — ابھی گھر میں قدم رکھا ہے اور بھابھی صاحبہ کی ہنسی روکے نہیں رک رہی ہے۔ ناصر پچھلے چار سال سے تو اپنے والد کو ڈیڈی کہا کرتا تھا اور آج شام سے "ابا حضور" اور "بابا محترم" کہہ کر بات کر رہا ہے۔ چلو چھوڑو اس لڑکے کو — مگر یہ کیا؟ مسز وحید اپنی ننھی پوتی کو چند دن پہلے SWEET HEART کہتے کہتے "پوتی اعلیٰ" کہنے لگی ہیں۔ معاف کیجئے شاید اس سے ملتا جلتا لفظ ہے جو ہم صاف سن نہیں سکے۔

ہمیں اپنے مہربان دوستوں اور اہل قلم سے بڑی شکایتیں ہیں۔ جہاں ہم نے اپنے محبوبِ زمانہ یعنی ثقافت کی بات چھیڑی اور دل نشیں مسکراہٹ بکھیری — سارے دانشوروں نے ثقافت کو تاریخ اور معاشیات کی روشنی میں چھلنی کرنا شروع کیا۔ کبھی اُس کے حوالے سے جنگ اور انسانی نسلوں کی کہانیاں سنائیں۔ بعض دیوانوں نے ثقافت کی جڑیں مذہب اور زبان سے منوا رکھیں۔ ہم تو اتنی تعریفوں سے عاجز ہیں۔ نہ آپ خود سمجھ رہے ہیں اور نہ ہم۔ دیکھئے ثقافت کو سادگی سے سمجھئے۔ سادگی ہمارا زیور اور ایمان ہے۔

صاحبو! جس طرح لاہور لاہور ہے اسی طرح ثقافت ثقافت ہے۔ آپ حضرات ثقافت کی ایک سی شکل کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ آپ تو پلاسٹک سرجری سے موٹی ناک خوبرو بنوا لیتے ہیں — لوگ فیانسی کے اشارے پر مجبوراً کار بدل دیتے ہیں اور یہاں تک کہ اپنا محلِ وقوع بدل کر کویت، دوبئی اور بحرین چلے جاتے ہیں۔ اور بیچاری ثقافت LOVELY پڑی بور ہوتی رہے۔ یہ جو اقبالؔ تھے نا... میری بھابھی نے اُن کے بارے بڑی پیاری بات کہی ہے — "طرزِ کہن پر کوئی لڑائی نہ کرو۔ اور جی آئینِ نو بڑی ہی اسمارٹ چیز ہے۔ بہت ہی DARLING چیز ہے۔" ہم ثقافت کے بارے میں کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ اس کے عشق نے ہمیں بڑا ڈسٹرب اور کنفیوز کر دیا ہے۔ ورنہ ہم تو اچھے بھلے تھے! اقصہ مختصر۔ دن ڈھلا اور شام ہو چلی۔ دوستو ہم چلتے چلتے اتنا کہے دیتے ہیں کہ ہمارا ثقافت سے عشق سچا اور بالکل سچا ہے بلکہ کورا ہے (معاف کیجئے کورا لفظ ذرا یوں ہی لکھ دیا، مقصد ہے کہ اُجلا اور پاک ہے) راہِ محبت کے حادثات بیان کر دیئے۔ خیال رہے کہ نئے راہی کا سینہ صندوقی اور آنکھیں بیل گم کی مانند ہونے کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ارے رے جناب کیا کہا یاد رکھیے! اس سفرِ عشق میں دو طرح کے مرض اکثر آن ملے۔ ایک IN LOVE کی بیماری سے نروس ہو کر لندن، کابل یا کینیڈا میں فنا ہو جانا۔ دوسرے "ثقافت کے بخار" میں مبتلا ہو کر جدہ یا دوبئی میں اداس ہو کر دم دے دینا... ... سنیئے تو آپ لوگ غلط معنی نہ لیجئے۔ واللہ جواب نہیں، یہ تو ہم ہیں اور ہماری محفلِ دوستاں... ہمیشہ سے ہماری ہنسی اور دل لگی کی علت ہے۔ اب تو بس ہم ایک ترنگ میں، اپنی راہ لیتے ہیں۔

ذرا ٹھہریئے، دیکھئے تو ہمارے پیچھے ریت پر ایک چڑیا کی سی، اور ڈگمگاتے قدموں کے اُلٹے سیدھے نشان تو نہیں بنتے چلے جا رہے ہیں؟

اصلی اور نقلی ضمیر

صدیق سالک

میں نے جب پہلی مرتبہ سیّد ضمیر جعفری کا نام سُنا تو اس وقت میرے دُودھ کے دانت تھے جب ان سے دوستی کا شرف حاصل ہُوا تو ان کے مصنوعی دانت بھی گرنے لگے تھے۔ اب اُن کی ساتویں نوکری اور پانچویں بتیسی ہے اور ہر بتیسی کے اخراجات پورا کرنے کے لیے وہ ہر مشاعرے میں تشریف لے جاتے ہیں۔ نوکری کا پوچھیں تو کہتے ہیں کہ پیٹ پالنا ہے۔ حالانکہ آپ خود دیکھ لیجئے کہ اب اس کو مزید پالنے کی ضرورت ہے۔؟

سید ضمیر جعفری سے میرا ایک تعلق یہ ہے کہ میں منگلیہ میں پیدا ہُوا، اور یہ منگلہ میں۔ میں دو تین محکموں کی "رکی" کر کے افواجِ پاکستان کے شعبہ تعلقاتِ عامہ میں پہنچا تو یہ میرے آنے کی اطلاع پاتے ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ یہ بنا شہر آباد کرنے اسلام آباد چلے گئے اور میں راولپنڈی میں ——— محتاط فاصلے پر مقیم ہو گیا۔ وقتاً فوقتاً ملاقاتیں شروع ہوئیں جو جلد ہی اکثر و بیشتر ملاقاتوں میں بدل گئیں۔

ان ملاقاتوں میں پتہ چلا کہ یہ میرا دستِ دوستی قبول کرنے سے پہلے دوستی کی کئی بار ریہرسل کر چکے ہیں۔ جن میں سنگاپور کی دوستی سب سے نمایاں ہے۔ ان کی سنسر شُدہ باتوں سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ قیامِ سنگاپور کے دوران یہ بہت جوان تھے۔ وہاں اُنھوں نے مولانا چراغ حسن حسرت کی انگلی پکڑ کر شعر و ادب کی وادی میں قدم رکھا۔ اور جوانی کی لٹھ لے کر کشورِ حُسن کو تسخیر کیا۔ بعض مفتوحہ علاقے تو مستقلاً ان کی اور ان کے دوستوں کی راجدھانی میں شامل ہو گئے۔ عہدِ جوانی کی رومانی شاعری کا سارا مواد اُنھوں نے سنگاپور اور ملایا کی سرزمین سے حاصل کیا تھا۔ کیونکہ جب یہ وطن واپس آئے تو ان کا وطن اسلامیہ جمہوریہ پاکستان بن چکا تھا جہاں ایسی حرکتوں کو خلافِ شرع سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ بالائی کی طرح نرم مالائی حسیناؤں کے حُسن کے گیت گاتے رہے۔ ——— اور جہاں جہاں مقامی عشق کا موقع ملا اُسے بھی بیرونی فتوحات ظاہر کر کے ملایا کے کھاتے میں ڈالتے رہے ——— حتیٰ کہ ان کی شادی ہو گئی۔ آپ خود جانتے ہیں کہ شادی کے بعد دوست، دوست کم اور شوہر زیادہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کچھ عرصے کے لیے رُوپوش ہو گئے ——— لیکن شادی میں اللہ تعالےٰ نے ایسی کچک دی ہے کہ یہ ایک بار اُبھر کر پھر دب جاتی ہے اور پندرہ بیس سال بعد شوہر مرجھا جاتا ہے اور دوست دوبارہ دریافت ہو جاتا ہے۔ اُن کے پُرانے دوستوں کا کہنا ہے کہ جب شادی کی کٹھالی میں چند سال گذار کر یہ دوبارہ ظہور پذیر ہوئے تو کندن بن چکے تھے۔ یہی وہ دور ہے جب یہ دوبارہ دوستی کے لیے دستیاب ہوئے اور میرے ہاتھ لگے ——— اب میرا اور ان کا ہاتھ میں ہاتھ ہے۔ میں انھیں بڑھاپے اور موت کی منڈیر سے پیچھے کھینچتا رہتا ہوں اور یہ مجھے جوانی کے جھٹ پٹے سے اپنی طرف گھسیٹتے رہتے ہیں۔ اس رسہ کشی میں ان کا پلّہ بھاری نظر آتا ہے۔

منگلا ڈیم کے قریب پیدا ہونے سے ان میں اس ڈیم جیسی کئی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں مثلاً یہ کہ یہ اپنے اندر ہوں اور حسرتوں کے کنکر اپنے وسیع سینے کی تہہ میں دفن کر لیتے ہیں اور اُوپر سے سطحِ آب ہموار رکھتے ہیں۔ شعر و ادب کی بجلی پیدا کر کے دوسروں کی زندگی کو چمکاتے اور بنجر ذہنوں کو سیراب کرتے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ کارِ خیر انجام دیتے دیتے انھیں کئی برس ہو گئے ہیں اور آج تک ان کی کوئی ٹنل (TUNNEL) ایک بار بھی خراب نہیں ہوئی۔

پیدائشی لحاظ سے منگلا اور منگلیہ کا فاصلہ میں کبھی عبور نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ دورانِ ملازمت بھی وہ مجھ سے آگے آگے رہے، ——— وہ سمجھتے رہے کہ وہ لیڈ (LEAD) کر رہے ہیں اور میں سمجھتا رہا کہ وہ مجھ سے بھاگ رہے ہیں ——— لیکن ایک وقت ایسا آیا جب ہم دونوں ہی ایک دفتر میں اکٹھے ہو گئے۔ یہ ۱۹۶۵ء کا زمانہ تھا۔ بھارت نے جنگ چھیڑ دی تھی۔ میں آئی۔ ایس۔ پی۔ آر میں کپتان تھا۔ یہ سی۔ ڈی۔ اے میں میجر تھے۔ خبر آئی کہ ریزرو سٹ میجر سید ضمیر جعفری (RFCAI) کئے گئے ہیں۔ بس وردی پہن کر آیا ہی چاہتے ہیں۔ پھر دیکھیے ہم بھارت کا کیا حشر کرتے ہیں۔ انھوں نے خاصا انتظار کرایا۔ جب بوٹ پیٹی سے لیس ہو کر آئے تو سر کے بال جھڑ چکے تھے۔ کمر پھیل چکی تھی اور چھمب جوڑیاں فتح ہو چکا تھا۔ پوچھا حضرت دیر کیوں کر دی۔ کہنے لگے۔ "میرے سائز کی پیٹی کہیں نہیں ملتی تھی۔ آج گاؤں سے پہلی جنگِ عظیم کا ایک صوبیدار آیا تو مشکل حل ہوئی اور حاضر ہو گیا۔ اب جہاں چاہو مجھے لانچ کر دو۔"

پھر یہ ایسے لانچ ہوئے کہ انھوں نے شعر و شاعری کے میدان میں بھارت کے چھکے چھڑا دیئے۔ "لام پہ آئے تو لڑ رام" جیسے جنگی نغمے لکھ کر انھوں نے نہ صرف اپنے سپاہیوں اور ہم وطنوں کا حوصلہ بڑھایا بلکہ یہ جنگ نہ ہارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان خدمات میں ان کی واحد حریف یا حریفہ بلکہ ترنم نور جہاں ہیں۔

ضمیر جعفری چند دن آئی۔ ایس۔ پی۔ آر میں بہار دکھا کر واپس سی۔ ڈی۔ اے میں چلے گئے جہاں حسبِ سابق دوستوں نے انھیں پلاٹ دلوانے، بجلی لگوانے اور پانی کا کنکشن دلانے کے لیے تنگ کرنا شروع کر دیا ——— اور انھوں نے حسبِ عادت ان مضامین کے خطوط لکھوانا چھوڑ دیئے ——— دوست گلہ کرتے ——— خود آتے مگر چائے پی کر اور مزاحیہ شعر سن کر واپس چلے جاتے ——— پلاٹ، بجلی، پانی اور دیگر مسائل وہیں کے وہیں رہتے۔

کئی لوگ ان کی شاعرانہ مقبولیت سے مرعوب ہو کر یہ سمجھ لیتے کہ پاکستان میں ہر افسر، ہر کارخانہ دار اور ہر صاحبِ اختیار آدمی ان کا دوست ہے۔ لہٰذا وہ سفارشیں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے کہ فلاں کارخانے دار کو فون کر کے فیکٹری ریٹ پر دو تھان کے، ٹی منگوا دو۔ فلاں افسر سے کہہ کر بھتیجے کا تبادلہ کرا دو یا فلاں بینکر کو زبانی گارنٹی دے کر قرضہ دلوا دو ——— میں نے عموماً انھیں یہ کام کرواتے کی "بھسوڑی" میں دیکھا۔ ممکن ہے بعض کام کروا بھی دیتے ہوں۔ لیکن انھوں نے اس محنتِ شاقہ کے ذریعے اپنے لیے جو شہرت کمائی وہ یہ تھی کہ ضمیر جعفری کسی کا کام نہیں کراتے۔ بس ہر وقت شاعری کی ریشمی سی غنودگی میں اُونگھتے رہتے ہیں۔ کام کی گدگدی سے ذرا سا ہلتے ہیں، پہلو بدلتے ہیں اور پھر دیرینہ کاہلی کی آغوش میں سو جاتے ہیں ———

میرے خیال میں کسی شاعر کی یہ امیج کوئی ایسی خراب امیج نہیں۔ کیونکہ اس سے عموماً اس کی شاعرانہ عظمتوں کا اندازہ کیا جاتا ہے، لیکن میں نے جس ضمیر کو دیکھا ہے اور خاصا قریب سے دیکھا ہے وہ اس ضمیر سے بالکل مختلف ہے جس کی عوامی امیج ابھی آپ کے سامنے

پیش کی گئی ہے۔ اصلی ضمیر کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے :

چند سال پہلے موسم سرما کی ایک سرد رات کو میں اپنے ایک مہمان کو راولپنڈی اسٹیشن پر چھوڑ کر آ رہا تھا کہ پرانے صدر کے علاقے میں ایک شخص کو کیل کی بُکل میں لڑھکتے ہوئے دیکھا۔ یہ شخص ایک ٹوٹی ہوئی حویلی میں داخل ہو گیا۔ چال ڈھال سے لگا کہ یہ ضمیر جعفری ہیں لیکن رات گئے یوں انھیں ACTIVE دیکھ کر خیال آیا کہ نہیں جس شخص کی سُستی، کاہلی اور غیر ذمہ داری کی اتنی دھاک ہے وہ یوں رات کو ایکٹو نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میں وہیں کھڑا رہا۔ یہ شخص ایک تنگ زینے سے اُوپر گیا جہاں ایک کمرے میں مدھم سی بتی ٹمٹما رہی تھی۔ ضمیر صاحب اس کمرے میں گئے اور واپس آ گئے ——— پتہ چلا کہ وہاں ایک مفلوک الحال ادیب رہتا ہے جس کی آمدنی کا واحد ذریعہ ضمیر جعفری ہیں۔ وہ اس ادیب سے سرکاری کتابچوں کے تراجم، مضامین کے مسودے یا اخبارات کے تبصرے لے آتے ہیں اور ان کی محنت کا عوضانہ خاموشی سے ان تک پہنچا آتے ہیں۔ مفلوک الحال ادیب کی عزتِ نفس بھی قائم رہتی ہے اور گزارے کے لیے رقم بھی مل جاتی ہے۔

اسی طرح ان کے ایک دوست کا انتقال ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں۔ یہ کاہل اور سست شخص باقاعدگی سے ہر تہوار کو اس دوست کے گھر جاتا ہے۔ بچوں کو عیدی دیتا ہے۔ ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتا ہے اور اگر ان کا کوئی کام ہو تو اُسے کر دیتا ہے۔ میں نے ان تینوں بچوں کے کام کروانے کے لیے ضمیر جعفری کو بارش اور دھوپ میں بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھاتے اور دفتروں کے چکر کاٹتے دیکھا ہے۔

اسی کاہل اور غیر ذمہ دار شخص کے طرزِ سلوک کا ایک واقعہ مجھ سے بھی متعلق ہے۔ میں ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد بھارت کی قید میں تھا۔ میرے بچے ضلع گجرات کے ایک پسماندہ علاقے میں مقیم تھے ——— اور گاؤں بھی ایسا کہ گرمیوں میں اس گاؤں کے اپنے کوّے گرمی سے تنگ آ کر ٹھنڈے مقامات کی طرف ہجرت کر جاتے تھے۔ ۱۹۷۲ء کی گرمیوں میں یہی کاہل و سُست شخص کھلونوں کا بنڈل اُٹھائے گاؤں جا پہنچا، بچوں سے ملا، میرا اور میرے خطوط کا ذکر کرتا رہا اور گھر والوں کو تسلی دے کر واپس چلا آیا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کاہل الوجود اور بکھرا بکھرا شخص اپنے سماجی فرائض سرانجام دینے کے لیے اتنا منظم اور مستعد بھی ہو سکتا ہے۔

خواتین و حضرات! جس طرح سید ضمیر جعفری شخصی لحاظ سے MISUNDERSTOOD ہیں۔ اسی طرح وہ ادب و شعر کے حوالے سے بھی بہت بدنام ہیں۔ لوگ انھیں صرف مزاح نگار یا مزاحیہ شاعر سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ ان کی سنجیدہ تحریریں ——— نثر و نظم دونوں ——— پڑھ کر دیکھ لیجیے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ دورِ حاضر میں ان کے پائے کے سنجیدہ شاعر بہت کم ہیں۔ اگر سنجیدہ لکھنے والے ان کی سنجیدہ شاعری دیکھ لیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اور سنجیدہ ہو جائیں کہ ہم اب تک کیا کرتے رہے ہیں ——— لیکن یہ الگ موضوع ہے۔ جس کو میں یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ صرف شخصی لحاظ سے سید ضمیر جعفری کے متعلق اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اصلی اور نقلی ضمیر میں فرق ضرور کیجیے ———

(یہ مضمون "ضمیر جعفری کے ساتھ ایک شام" میں راولپنڈی آرٹ کونسل کی تقریب منعقدہ ۷ مارچ ۱۹۸۲ء میں پڑھا گیا)

ہمارے گھر چوری ہوئی

سیّد ضمیر جعفری

۱۹۴۵ء میں اوائل اپریل کے دن تھے میں دہلی میں تھا۔ گاؤں (جہلم) سے چچا جان نے بذریعہ تار گھر میں چوری ہونے کی اطلاع دی، اور جلد پہنچنے کی تاکید کی۔ چچا جان خاندان کے سربراہ تھے۔ علاقہ کے سفید پوشوں میں ان کا اپنا مقام بہت نمایاں تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کا الیکشن ہو یا مرکزی اسمبلی کا، اپنے تھانے کی حدود میں، ان کی شخصیت مرکزی شخصیت ہوتی تھی۔ "بستہ الف" اور "بستہ ب" کے کئی معروف و مصروف کردار ان کی پناہ کے متمنی رہتے تھے۔ میرے بڑے بھائی جان بھی / جو بعد میں مجسٹریٹ ہوئے مگر اس وقت نئے نئے ایل ایل بی تھے گھر پر تھے۔ مجھے گھر پہنچ کر کیا کرنا تھا۔ مگر حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ ہم لوگ شادی کی تقریبات پر جمع ہوں یا نہ ہوں، غمی کے موقعوں پر ضرور اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب میں گھر پہنچا تو ہمارے دس بارہ چچیرے، پھوپھیرے، خلیرے، ممیرے بھائی، اپنی اپنی ملازمتوں کی جگہوں سے چھٹیاں لے کر گاؤں پہنچ چکے تھے۔ حویلی اور بیٹھک میں گہما گہمی کا سماں تھا۔ برادری کے لوگ صبح سے شام تک بیٹھے رہتے۔ تھانہ (بڑا تھانیدار، چھوٹا تھانیدار، چھ سپاہی اور دو گھوڑیاں) اترا ہوا تھا۔ علاقہ کے سفید پوشان (تعداد دو درجن) ازراہِ ہمدردی و مشورت صبح آتے اور شام کو واپس جاتے۔ چچا جان کے "حلقہ بگوش شکروں" کا طائفہ مزید براں ——— عام ——— "نمکساروں" کے لیے آلو گوشت، کا لمبا شوربہ چل رہا تھا ——— تھانے کے عملے اور دوسرے مہمانوں کے لیے بہرحال تکلف کی وضع داری قائم تھی۔ تنور اور چولھے ہمہ وقت روشن رہتے۔ چچا جان اس چہل پہل پر بہت خوش تھے کیونکہ لوگوں کے ہجوم اور حکام کی آمد و رفت سے ہماری خاندانی وجاہت پر مہرِ تصدیق ثبت ہو رہی تھی۔ دوسرے تیسرے دن وہ خود ضلعی ہیڈ کوارٹر میں جا کر انتظامیہ کے کسی اعلیٰ افسر کو پکڑ لاتے۔ حتیٰ کہ ایک روز ——— افسر جنگلات ہی کو لے آئے۔

چور ہمارے گاؤں کا رُخ کرتے عموماً گھبراتے تھے۔ بزرگوں کی اس بستی کے بارے میں یہ روایت مشہور تھی کہ چور جب بہ قدر دو جریب بستی کے قریب آتے ہیں تو ان کے دیدے بے نور ہو جاتے ہیں ——— مجھے دہلی میں جب چوری کی اطلاع ملی تو مجھے صدمے سے زیادہ حیرت ہوئی کہ نہ ہمارے زندہ اکابرین کی وجاہت آڑے آئی نہ مرحوم بزرگوں کی کرامت۔

ویسے ہمارے ہاں کی چوری میں چوروں کو زیادہ قصوروار نہ سمجھنا چاہیے۔ گاؤں میں ہمارا مکان مستقل تھا، رہائش مستقل نہ تھی ——— گاؤں میں علاج معالجے کی تنگی محسوس ہوئی تو ہم لوگ شہر کے مکان میں چلے گئے۔ شہر میں صحت گرنے لگی تو گاؤں آ گئے ——— نتیجہ یہ کہ گاؤں کی حویلی اکثر خالی رہتی یا خالی معلوم ہوتی ——— ہمارا گھر چوروں کے لیے نہایت موزوں ہدف تھا ——— حویلی کے ایک طرف کھلی اور تین اطراف میں کھیت تھے جن میں کوئی نہ کوئی فصل ہمیشہ لہلہاتی رہتی ——— اب تک اگر چوری نہیں ہوئی تھی تو یہ چوروں کی مہربانی تھی ———

ہمارے علاقے میں جرائم کم تھے۔ قتل کی واردات بہت ہی شاذ و نادر ہوتی۔ جن لوگوں کو قتل ہونا تھا وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں قتل ہو چکے تھے ——— مقدمہ بازی بھی کم تھی ——— مقدمہ بازی ہوتی بھی تو اس میں پہل ہندو ساہوکاروں کی طرف سے ہوتی۔ وہ قرض خواہ، ہم مقروض ——— دیوانی مقدمہ جرم کی سنسنی خیزی سے محروم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جرم کی سنسنی چوری کی وارداتوں سے پیدا ہوتی تھی۔ چوری بعض لوگوں کا پیشہ تھی ——— بعض نوجوان ——— اپنے جیالے پن کی ترنگ میں بھی اس کا ذائقہ چکھ لیتے تھے، نقب لگا کر کسی کے گھر میں داخل ہونا معمولی دل گردے کا کام نہ تھا۔

چوری اواخر مارچ میں ہوئی۔ گھر کے سب لوگ شادی پر میرپور گئے ہوئے تھے۔ حویلی دن کو بند رہتی۔ رات کو بھاپا کالے شاہ آکر سو رہتے۔ بھاپا کالے شاہ ہمارے قریبی عزیز بلکہ بزرگ تھے۔ بھاپا ان کا عوامی لقب تھا۔ اعزہ کے کام کاج کے علاوہ وہ کوئی کام کاج نہیں کرتے تھے ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دن کو سوتے اور رات کو جاگتے تھے۔ سو اتفاق کہ بھاپا اس روز دن کو جاگتے اور رات کو سوئے رہے اور چور گھر کی صفائی کر گئے ——— چوروں کے اطمینان کا اندازہ نقب کے شگاف سے ہو سکتا تھا جو بمشکل کر داخل ہونے کے لئے عموماً جس سائز کی کھڑکی رکھی جاتی ہے، یہ شگاف اس سے کچھ بڑا ہوگا ——— مشتبہ ملزمان کے ہمراہ، جتنی مدت تک ہماری حویلی زیر تفتیش رہی ——— ہمارے ہاں لوگوں کی آمد و رفت عموماً اسی شگاف سے ہوتی رہی ——— بعد میں بھائی جان نے اس خداداد شگاف میں کواڑ لگوا کر ایک مستقل دروازہ حویلی کے عقب میں کھلوا دیا۔ تاکہ اگر چور پھر کبھی آئیں تو قفل توڑ لیں۔ انھیں دیوار نہ توڑنی پڑے ———"

تفتیش کے معاملے میں چودھری صاحب (تھانیدار) صاحبِ اسلوب تھانیدار تھے۔ ان کا انداز کچھ جمہوری سا تھا۔ تفتیش کے دوران میں مشتبہ لوگوں کے علاوہ انھوں نے علاقہ کے سفید پوشوں کو بھی حاضری کا پابند کئے رکھا ——— تھانیدار ——— سفید پوشوں کی رائے کے پیچھے چلتا اور سفید پوش تھانیدار کی رائے کے پیچھے چلتے۔ نتیجہ یہ کہ تفتیش کھڑی تھی اور تھانیدار صاحب کی گھوڑی چل رہی تھی ——— نہ چوری کا سراغ مل رہا تھا نہ اترا ہوا تھا نہ اٹھ رہا تھا۔

چچا جان اور بھائی جان کی طبیعتوں میں بُعدِ مشرقین تھا ——— بھائی جان پر ہوتا تو وہ والدِ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے چوروں کے حق میں دعا کرتے کہ انھوں نے آلائشِ دنیا سے نجات دلائی ——— چوروں کی عادات اور اعداد و شمار کے لحاظ سے بھی اُن کا موقف تھا کہ گئے ہوئے وقت کی طرح، گیا ہوا چور بھی ہاتھ نہیں آتا۔ نقصانِ مایہ جو ہوا سو ہوا شماتتِ ہمسایہ سے بچو ——— بھائی جان تو تھانے میں رپٹ بھی نہ لکھواتے، مگر چچا جان سفید پوشوں کا ایک وفد لے کر سیدھے انگریز کپتان پولیس کے پاس چلے گئے اور اس سے کہا ——— "صاحب بہادر، یہ بات کان کھول کر سُن لو کہ اگر چوروں کا ہاتھ ہم جیسے شرفا پر اٹھ گیا ہے تو یہ سمجھو کہ آپ کی حکومت بھی یہاں قائم نہیں رہ سکتی ———"

چچا جان واقعی چوروں کی واردات پر تلملائے ہوئے تھے ——— اُن کو نقصان کی پروا نہ تھی ——— وہ اس واقعے کو خاندانی توہین سمجھتے تھے ——— ان کے طیش اور تحکم سے یوں لگتا تھا جیسے علاقے میں کوئی چوری اُن کے ایما و اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی ——— اُن کے تیور بتا رہے تھے کہ چور جب تک کیفرِ کردار تک نہیں پہنچ جاتے

وہ نہ خود چین سے بیٹھیں گے نہ تھانے کو اُٹھنے دیں گے۔

"آپ کا کوئی دشمن؟"

تھانیدار نے تفتیش کی بسم اللہ کرتے ہوئے پہلا دائمی سوال پوچھا۔

بھائی جان نے لپک کر جواب دیا ——— "جی نہیں ——— ہمارے علم میں تو ہمارا کوئی دشمن نہیں....."

"چپ رہ بچے" ——— چچا جان نے بھائی جان کو سختی سے جھڑکا ——— پھر حقے کی نے کو تھانیدار کی طرف پھیرتے ہوئے بولے:۔

چوہدری صاحب اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ بشیر تو بچہ ہے (حالانکہ وہ دو بچوں کے باپ تھے) اس کو دشمن کی کیا پرکھ۔ میں ایک سامنے کی بات آپ کے سامنے رکھتا ہوں کہ جو خاندان سیاست میں ہوگا اُس کے دشمن بھی ہوں گے۔ میں تو اس شخص کو زندہ ہی نہیں مانتا جس کا کوئی دشمن نہ ہو ——— چوہدری صاحب! آپ نے علاقہ میں ہماری دوستی کا چرچا یقیناً سنا ہوگا ——— اس قدر وسیع دوستی، بہت سی دشمنی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔"

چچا جان نے دشمنوں کی ایک فہرست تو تھانیدار صاحب کے گوش گزار کر دی۔ البتہ یہ طے ہوا کہ مشتبہ لوگوں کو ہماری بیٹھک کے بجائے تھانے میں طلب کیا جائے گا کیونکہ بازپرس کے ضروری اوزار بھی وہاں مہیا ہو سکیں گے۔ ایک روز ہم بھی زیرِ تفتیش لوگوں کو ایک نظر دیکھنے تھانے گئے ——— ہم تو بخدا کانپ گئے ——— بہت سے لوگ، دو لمبی قطاروں میں، ننگی زمین پر بیٹھے تھے۔ سبھی ہمارے آس پاس کے رہنے والے ——— ہمارے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے۔ ان میں اکثریت ان اصحاب کی تھی جنھوں نے اسمبلی کے الیکشن میں چچا جان کے اُمیدوار نواب طالب مہدی خان کو ووٹ نہیں دیا تھا ———

تفتیش کئی روز تک اسی ڈگر پر چلتی (بلکہ گھسٹتی) رہی۔ اگر کچھ ترقی ہوئی تو دشمنوں کی تعداد میں ہوئی۔ تیاقوں سے کام نہ چلا تو ضلع گجرات سے "دو کھوجی" بلوائے گئے۔ بیس روز تک وہ بیٹھے رہے۔ وہ روزانہ صبح سویرے کچھ نقدی اور کچھ پراٹھے پلے باندھ کر "کھُرے" کی تلاش میں گھر سے نکلتے اور رات کے کھانے تک بے نیلِ مرام گھر واپس آ جاتے۔ اولاً پانچ کھُرے (پاؤں کے نشان) کچھ دُور تک چلے۔ جو کھُرا "جہاں ملتا اُس کو مٹی کے پیالے یا کسی دوسرے برتن سے ڈھانپ دیا جاتا۔ حتیٰ کہ کمہاروں کا گھر پیالوں اور صحنکوں سے خالی ہو گیا۔ "کھُرے" مل رہے تھے مگر سمت نہیں مل رہی تھی ——— چور ——— کھوجیوں سے زیادہ کایاں نکلے۔ ایک کھوجی کے نزدیک چور تعداد میں پانچ تھے۔ جن میں سے دو ابھی "دوندے" یعنی پندرہ سولہ برس کے چھوکرے تھے۔ دوسرے کھوجی کی رائے میں کہ یہ جتھا تو چوروں اور ایک گھوڑی پر مشتمل تھا ——— چھ کھُرے" (تین چور) قریبی گاؤں مدوکاس کے بڑے تالاب میں اُترے تو سہی مگر پھر وہاں سے نکلے نہیں۔ چور شاید تالاب میں ڈوب گئے۔ دو چور عقبی کھیت سے نکلتے ہی بابا فضلو شاہ کے بیری کے درخت پر چڑھ گئے اور وہاں سے اُترے نہیں۔ صرف ایک نشانِ قدم میدان میں ثابت قدم نکلا وہ گیہوں کے کھیت سے نکل کر گلی میں آ گیا اور پہلے دروازے سے جو ہمارے مکان کا تھا، مکان کے اندر داخل ہو گیا اور حویلی کے کچے صحن میں چلتا چلتا اس مقام پر آ ٹھہرا جہاں بھاپا کالے شاہ کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر تفتیش کا رُخ بھاپا کی طرف مُڑ گیا۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ میں تفتیش کو اسی رُخ پر چھوڑ کر دلی واپس آ گیا۔ چچا جان اور بھائی جان کافی عرصہ تک چور پکڑوانے کے بجائے بھاپا کالے شاہ کو چھڑوانے میں مصروف رہے۔

میری مطالعہ گاہ

فکر تونسوی

جب میں دُنیا بھر کی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تو میں نے اپنے لیے ایک مطالعہ گاہ بنوا لی ـــــ اپنی یہ حرکت مجھے بالکل ایسے لگی کہ میرے ایک شاعر دوست نے سالہا سال میگساری کرنے کے بعد توبۃ النصوح کر لی، تو ایک دن اچانک مزارِ غالب پر پل گئے وِھسکی کی بوتل بغل میں تھی۔

میں نے حیرت سے پوچھا: "کیا توبہ ٹوٹ گئی؟"

بولے: "نہیں تو!"

"تو پھر یہ بغل میں وھسکی.....؟"

"یہ غالب کے مزار کے اُوپر چھڑکاؤ کرنے کے لیے لایا ہوں۔"

میں نے بھی اپنی مطالعہ گاہ اس لیے بنائی ہے تاکہ اس پر مزارِ غالب کا شُبہ ہو۔ توبہ کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ مطالعہ گاہ مکان کی سب سے اُپر لی منزل پر تعمیر کی گئی ہے۔ سُنا ہے پرماتما عرش پر رہتا ہے اس لیے عرش سے ادھر اپنا ایک مکان بنا لیا۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح پرماتما سے براہِ راست تُو تُو مَیں مَیں ہو سکے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ تُو تُو بھی مَیں کروں گا اور مَیں مَیں بھی مَیں۔

ویسے مطالعہ گاہ ہم دونوں کے لیے بے معنی ہے۔ مطالعے کی نہ اُسے ضرورت ہے نہ مجھے۔ البتہ گفتگو کے لئے دو چار مرتبہ میں نے عرش پر پرماتما کو آواز دی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ پرماتما شاید بہرہ ہو چکا ہے۔ شور و غوغا سے بھرپور، ڈھیروں ڈھیر مخلوق پیدا کرے گا۔ تو کان کہاں تک سالم رہ سکتے ہیں!

میرے ایک دوست ہیں خورشید عالم، عمر کا پیٹا ساٹھ سال ـــــ کسی کی عمر ساٹھ سال سے دو تین مہینے بھی کم ہو، تو وہ مجھے دوست بنانا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نے اپنے آپ کو تیسری منزل کے مطالعہ گاہ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ تو میری خیر و عافیت پُوچھنے کے لیے اُوپر آ گئے۔ مگر اُلٹے مجھے اُن کی خیر و عافیت پُوچھنا پڑی۔ کیونکہ چار درجن سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہانپ اور کانپ رہے تھے۔

پُورے پانچ منٹ تک وُہ اسی کیفیت میں رہے۔ درمیان میں شاید ایک آدھ بار پرماتما کا نام بھی لیا۔ جب قدرے دم میں دم آیا تو میں نے میٹھے شربت کا ایک گلاس پیش کیا۔ بولے: "مجھ پر میٹھی چیز ممنوع ہے، کیونکہ مجھے شوگر کی بیماری ہے۔"

میں نے کہا: "خورشید صاحب! آپ کا انتقال شوگر سے نہیں ہوگا۔"

وہ بولے: "تو پھر ہارٹ اٹیک سے ہوگا۔"

میں نے کہا: "عین ممکن ہے۔"

"مگر جناب! وہ زمانہ اور تھا جب ہارٹ اٹیک صرف شرفا اور بڑے بڑے آدمیوں کو ہوتا تھا اب تو ہر کہ ومہ کو ہونے لگا ہے۔ کل ایک سرکاری دفتر کے چپڑاسی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"تو وہ رشوت لیتا ہوگا۔"

وہ خاموش رہے کیونکہ رشوت خوری میں وہ کبھی چپڑاسی سے بھی کئی درجے اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے۔ بہرکیف مجھے خیال آیا کہ وہ چپڑاسی کہلانا پسند نہیں کرتے، بڑے آدمی بننا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے انھیں کہا "قبلہ! چونکہ آپ بڑے آدمی ہیں اس لیے آپ یا تو خودکشی کریں گے یا کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔"

وہ بولے "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا: "عظیم کتابوں کے مطالعہ سے" ——— اور یہ کہہ کر میں نے الماری میں سجی ہوئی ایک کتاب کی طرف اشارہ کر دیا جس کے پشتے پر لکھا تھا: "انجام دنیا کے بڑے آدمیوں کا"

میری مطالعہ گاہ میں اعلیٰ اور ادنیٰ ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں، حتیٰ کہ ایک شاعرہ کا مجموعہ کلام بھی موجود ہے جس کے ہر صفحے میں وزن اور بحر سے خارج شعر درج ہیں مگر میں اُسے ادنیٰ کتاب نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اُسے ایک صوبے کی اردو اکیڈمی نے اعزازی انعام دیا تھا البتہ میں اُس کتاب کے جشنِ اجرا میں شامل نہیں ہوا تھا کیونکہ وہاں ایک وزیر بطور چیف گیسٹ موجود تھے۔ (اکثر وزیر بحر و وزن سے خارج ہوتے ہیں)

اور مطالعہ گاہ میں ایک مختصر بلکہ مختصر ترین شوجی جاپ مالا بھی موجود ہے جسے میں نے ٹیگور کی گیتانجلی کے اوپر رکھا ہوا ہے یہ جاپ مالا میرے ایک دھرم زدہ مداح نے عنایت کی تھی۔ میں نے پوچھا: "جناب! یہ عنایتِ خسروانہ کس سلسلے میں؟"

وہ بولے: "جس لمحے بھی اشانتی آپ کو پریشان کرے۔ اس جاپ مالا کا پاٹھ (مطالعہ) شروع کر دیجئے، شانتی مل جائے گی۔"

مگر میں نے کہا: "مجھے تو ہر لمحے اشانتی رہتی ہے۔"

وہ بولے: "تو پھر ہر وقت اس جاپ مالا کو پڑھتے رہیے۔"

شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی مطالعہ گاہ میں صرف یہی جاپ مالا رہنے دیجئے۔ باقی کتابیں، ردی بوتلیں، خالی ڈبے سمجھ کر بیچ دیجئے ——— اتھاہ شانتی ملے گی۔

مگر اُن دنوں میں برنارڈ شا کے ڈراموں کا ایک منتخب مجموعہ لے آیا تھا۔ چونکہ مہنگا بہت تھا۔ اس لیے ایک لائبریری سے چُرا کر لایا تھا۔ میری مطالعہ میں جتنی کتابیں ہیں وہ یا تو کسی سے مانگ کر لائی گئی ہیں اور واپس نہیں کیں، یا مصنف کی طرف سے بطور نذرِ عقیدت پیش کی گئی ہیں اور یا چرا کر لائی گئی ہیں کیونکہ کتابوں کے چور، چور نہیں کہلاتے ہیں، اہلِ ذوق کہلاتے ہیں۔

چنانچہ میں اس جاپ مالا کی بجائے برنارڈ شا کی کتاب پڑھنے کے لیے اشانت تھا، بلکہ شا کے ڈرامے اور ان کے دیباچے پڑھنے کا زیادہ آرزومند تھا کیونکہ شا کے دیباچے ہی زیادہ لطیف اور سکون بخش ہوتے ہیں۔ ڈرامے تو کتاب میں بطور دہی جاپ مالا شامل ہوتے ہیں۔

چنانچہ میں برنارڈ شا کی کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا اور جاپ مالا اپنی بیوی کو دے دی کہ تم ہر روز صبح اُٹھ کر اس کا جاپ کیا کرو۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ جس دن بھی وُہ جاپ مالا پڑھتی۔ اُس دن نہ مجھے ناشتہ ملتا نہ چائے دُودھ۔ بلکہ اُلٹے وہ کسی نہ کسی نامعقول مسئلے پر جنگ آزمائی ضرور کرتی۔ اور یُوں میری شانتی بھنگ ہو جاتی۔ چنانچہ ایک دن میں نے بیوی سے کہا: "اب یہ جاپ مالا مجھے واپس کر دو، تم مت پڑھا کرو۔"

وہ بولی: "کیوں؟"

میں نے کہا: "یہ تمھارے فہم سے بالاتر ہے کیونکہ یہ ایک طرح کا تجریدی افسانہ ہے۔"

"تجریدی کیا بلا ہوتی ہے؟"

"ہوتا ہے ایک بلا ——— جیسے تم سبزی میں مرچیں زیادہ ڈال دو، اور میں کہوں کہ اس میں نمک زیادہ ہے۔ یعنی مرچیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی اور نمک میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ نتیجے کے طور پر ہم دونوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ہم مرچیں کھا رہے ہیں یا نمک، اور سبزی؟ وہ تو اس کنفیوژن میں کہیں غائب ہی ہو جائے گی۔"

یہ اُلجھی ہُوئی تجریدی فلاسفی، بیوی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن کئی اجاب سے سُن چکی تھی کہ فکر تونسوی ایک دانشور ہے۔ اس لئے وہ جاپ مالا مجھے واپس کر دی ——— اور اسے معجزہ ہی سمجھیے کہ دوسرے ہی دن رسول دار بند ہو گئی، اور میں نے وہ جاپ مالا ٹیگور کی گیتانجلی کے اُوپر رکھ دی۔ آسانی اس میں یہ تھی کہ گیتانجلی اتنی گہری، اتنی بلند اور اتنی خلائی پرواز والی شاعری ہے کہ میں نے اپنی فہم کے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ نچوڑ کر سیکڑوں مرتبہ اس پر ڈالا۔ مگر وہ ہر مرتبہ میرے لہو میں سے مچھلی کی طرح باہر نکل جاتی ہے اور پھر بدستور عمیق سمندر کے طواف میں پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے اب میں نے اُسے پڑھنا ترک کر دیا ہے جاپ مالا اور گیتانجلی دونوں کے نام الگ الگ ہیں، مگر کام ایک ہی ہے۔ یعنی نہ پڑھو تو شانتی، پڑھو تو اشانتی۔

اور یہ عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ دونوں میری مطالعہ گاہ میں بڑی شانتی سے پڑی رہتی ہیں اور بڑے سکون سے جئے جا رہی ہیں۔

نجانے کیسے جھینگروں اور چوہوں کو معلوم ہو گیا کہ میں اب کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتا، اس لیے وہ خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے میری کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے پہنچ گئے ——— ایک مرتبہ ایک سٹوڈنٹ میرے پاس آیا، وہ ایم۔ اے کی ڈگری کے لیے ریسرچ پیپر تیار کر رہا تھا، مجھ سے بولا: "جناب! کیا آپ کے پاس دیوانِ غالب ہے؟"

"ہاں، نہ صرف دیوانِ غالب، بلکہ شرح دیوانِ غالب بھی موجود ہے۔"

میں نے دیوانِ غالب نکالا۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ اُس کا مطالعہ تو کوئی چُوہا کر رہا ہے۔ نجانے کون سا ریسرچ پیپر تیار

کر رہا تھا۔ بہ سلسلۂ ریسرچ اُس نے دیوانِ غالب کے کئی صفحے دانتوں سے کتر ڈالے تھے۔ مگر وہ کمال کا اہلِ نظر چوہا تھا کہ اُس نے غالب کے صرف وہی شعر کترے تھے جن میں شعریت کم اور کنایت زیادہ تھی۔ مثلاً ؎

شمار سبحہ مرغوب دل مشکل پسند آیا

اس مصرع میں صرف "آیا" کا لفظ نہیں کترا گیا تھا۔

میں نے سٹوڈنٹ سے کہا "معذرت چاہتا ہوں غالب پر ریسرچ تو آپ سے پہلے ایک صاحب کر چکے ہیں اور ہم انسانوں سے بہتر کر گئے ہیں" ——— اور میں نے دیوان کی شکست و ریخت کی طرف اشارہ کر دیا۔

وُہ بولا: "تو شرح دیوانِ غالب ہی عنایت کر دیجئے۔"

میں نے شرح نکالی، تو دیکھا کہ چوہے نے ہر شعر کی تشریح کو کنڈم کر دیا تھا۔ صرف شرح کرنے والے کا نام جلد بازی میں یا رعایتاً چھوڑ دیا تھا ——— بلکہ ایک اور شاعر کے مجموعہ کلام کا ایک شعر بھی نہیں کترا تھا، صرف شاعر کا نام دانتوں سے کاٹ دیا تھا۔ اس لیے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس شاعر کا کلام ہے کیونکہ شاعر اپنے اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔ مگر اسلوب پوری کتاب میں غائب تھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ شاعر محترم کبھی غالب کے سٹائل میں لکھتے تھے، کبھی اقبال اور میر کے ——— چونکہ اور بحل اسلوب غائب تھا، اس لیے چوہے نے نام ہی غائب کر دیا۔

ایک چینی فلسفی کی لحیم و شحیم کتاب تھی جس کا مطالعہ میں تین چار مرتبہ کر چکا تھا۔ کتاب کا لُبِ لباب یہ تھا کہ انسان کو بہتر اور بے تکلف زندگی گزارنے کے لیے کون سے آداب اختیار کرنا چاہییں۔ میں نے کتاب سے متاثر ہو کر چند آداب اختیار کیے، تو طرزِ تپاک اہلِ دنیا سے جی جل گیا ——— ملک میں کتابی آداب پر عمل کیا جائے، تو انسان سوشل لائف سے کٹ جاتا ہے یا سوشل لائف اُسے کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔

میں چاہتا تھا وُہ کتاب کسی لائبریری کو خیرات میں دے دُوں، کیونکہ سُنا تھا کہ دان دیئے دھن نہ گھٹے، کہہ گئے بھگت کبیر ——— مگر ایک دن خیرات کے لیے اس چینی فلسفی کی کتاب کھولی تو اُس کے ہر دوسرے تیسرے ورق میں جھینگر آرام فرما رہے تھے اور اپنے بول و براز سے کتاب کے پُورے آداب غلیظ کر چکے تھے۔ میں نے اُن جھینگروں سے پُوچھا:

"آپ حضرات کون ذات شریف ہیں؟"

وہ بولے: "ہم چینی رفیوجی ہیں۔ چین میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو ہم وہاں سے فرار ہو کر اس کتاب میں آ بسے۔"

"جانتے ہو یہ کتاب کیا ہے؟"

"ہاں، یہ ہمارا رفیوجی کیمپ ہے۔"

چند کتابیں علامہ قسم کے نقادوں کی تھیں، دل آویز جلد، بیش قیمت کاغذ، قد و قامت میں وجیہ! میں نے انھیں کبھی نہیں پڑھا تھا، نہ صرف میں نے بلکہ چوہوں اور جھینگروں نے بھی انھیں نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ ہم سب جانتے تھے کہ ان میں زیادہ تر یورپ اور امریکہ کے انٹلکچولز کے جملوں کے جوڑ توڑ اور حوالے شامل کیے گئے ہیں۔ نقاد کی اوریجنلٹی ان میں صرف خالی وقار تک قائم ہے۔

مجھے یہ سرسری اور رُعب داب والی کتابیں دیکھ کر ہمیشہ اپنے اُس تیس دوست کا خیال آجاتا تھا کہ ایک مرتبہ میں اُس کے امیر خانے پر حاضر ہُوا تو نہایت قیمتی اور شوخ رنگ کتابوں سے اُس کا بک شیلف بھرا ہوا تھا۔ میں نے پُوچھا: "کیا آپ ان کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں؟"

وہ بولے: "اجی کہاں، فرصت ہی کہاں ملتی ہے!"

"تو پھر یہ کتابیں خرید کیوں ڈالیں؟"

"اجی، میرے آرکی ٹیکٹ نے کہا تھا کہ ماڈرن آرکی ٹیکٹ میں ایک بک شیلف ضرور بنانا چاہیے۔ اس سے عزت بڑھتی ہے۔"

میں نے کہا: "تو کتنی عزت بڑھی؟"

"ہی ہی ہی! اجی کوئی ملاقاتی آجائے تو اس کے دل میں میری عزت کچھ اور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ ملاقاتی سمجھتے ہیں کہ میں پڑھنے کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہوں۔"

میں نے اُسے یہ کہنا خلافِ تہذیب سمجھا کہ اگر آپ کے ہاں بک شیلف نہ بنتا تو آپ کے اعلیٰ ذوق کا کافی بُرا حشر ہوتا۔

خود ایک مرتبہ میرا بُرا حشر ہو چکا ہے کہ میرا ایک دوست نہایت پُر تکلف قسم کی حسین و جمیل ہومیوپیتھی کی کتاب میرے گھر بھُول گیا۔ فراموش گاری میں دوبارہ اس نے مانگی نہیں، اور اہلِ ذوق بننے کے لیے میں نے واپس نہیں کی۔ اور اب الماری میں یُوں آراستہ کر رکھی ہے، جیسے کچھ لوگ شوکیس میں پلاسٹک کا مور سجا کر رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ اُس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اینٹی پوئٹری (ناشاعری) کی طرح اپنے پلّے نہیں پڑی۔ اور دوسری مرتبہ اسے اس لیے پڑھنے سے باز رہا کہ معلوم ہُوا کہ شہر کا ہر تیسرا آدمی ہومیوپیتھی کا ایکسپرٹ بن بیٹھا ہے یا ٹی شاپ کھول کر بیٹھ گیا ہے۔

میری مطالعہ گاہ میں میری اپنی بھی کچھ تصانیف ہیں۔ باقی کتابوں کے برعکس انھیں کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں اور آہ بھر کر سوچتا ہوں کہ میں اس سے بہتر بھی لکھ سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُن پر اپنائیت کا شبہ ہوتا ہے (جو یقین میں بدل چکا ہے) اپنائیت میں ایک عجیب طلسم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں مشہور رائٹر اپندر ناتھ اشک کے گھر ڈنر پر بلایا گیا تھا۔ کھانا آیا تو اُس میں سالم، بُھنے ہوئے بینگن تھے۔ مگر ان کی بیوی کوشلیا جی نے جب بینگن پروسے تو اشک جی کی تھالی میں تین بینگن رکھ دیے اور میری تھالی میں دو بینگن۔

میں نے کوشلیا جی سے تفریحاً کہا: "بینگن بھی عجیب چیز ہیں، تھالی میں ہوں تو لڑھک جاتے ہیں، ایک تھالی میں دو چلے جاتے ہیں دُوسری تھالی میں تین۔"

کوشلیا جی سمجھ گئیں۔ ایک اور بینگن لا کر میری تھالی میں دھر دیا۔ میرے مُنہ سے نکل گیا: "آہ، کوشلیا جی! آپ نے اپنائیت اور پتی برتا دھرم کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔"

گزشتہ دنوں میرا نواسہ میری مطالعہ گاہ میں تشریف لایا۔ پُوچھنے لگا: "نانا جی! آپ نے یہ مطالعہ گاہ پڑھنے لکھنے کے لیے بنائی ہے کیا؟"

میں نے کہا: "مجھے معلوم نہیں۔"

"کیا آپ سماج سے تنہائی کے لیے یہاں رہتے ہیں ؟"

" معلوم نہیں۔"

" آپ کے پاس یہ ڈھیر ساری کتابیں کہاں سے آتی ہیں ؟"

" معلوم نہیں۔"

"کیا آپ یہاں بیٹھ کر اپنی آپ بیتی لکھتے ہیں ؟"

" معلوم نہیں۔"

"آخر اتنا لکھ پڑھ کر آپ کیا بننا چاہتے ہیں ؟"

" معلوم نہیں۔"

اس پر وہ خاموش ہو گیا تو میں نے کہا:

" پوچھو ، پوچھو ، اور پوچھو بیٹا ! نہیں پوچھو گے تو علم کیسے حاصل کرو گے ، میری طرح عرش سے ادھر اپنا مکان کیسے بناؤ گے !"

ادیب کے فرائض

احمد ندیم قاسمی

فرض اور شعور کے الفاظ ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کے ایک طبقے میں مردود قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ان دوستوں کا کہنا یہ ہے کہ ادیب کا اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس اس کے منصب کے منافی ہے اور تخلیقِ فن میں شعور کو کوئی دخل حاصل نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس شعور ہی سے ادیب کے اندر فرض کا احساس بیدار ہوتا ہے اور ادیب جونہی فرض شناسی پر اُترتا ہے وہ بحیثیت ادیب ختم ہو جاتا ہے۔ ان دوستوں کو علم ہونا چاہیئے کہ ادیب کے باشعور ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شعر و ادب کے تمام فنی مطالبات سے قطع نظر کر کے سیاسی سٹیجوں پر کی جانے والی تقریروں کو نظم کی صورت میں موزوں کرتا پھرے۔ ادیب کے باشعور ہونے کا مطلب ہے اپنی انسانی اور وطنی اور سماجی ذمہ داریوں سے آگاہ ہونا اور اپنی تخلیقات میں اس شعور کی وہ رویں چلانا جو نعرہ مارنے کی بجائے ذہن و احساس میں سرگوشی سی کریں اور یہ سرگوشی موضوع و ہیئت کے معاملے میں اتنی دلآویز ہو کہ قاری یا سامع کا لاشعور بھی اسے کان دھر کر سُنے اور متاثر ہو کر ادب و فن سے کرداریں بدلتے ہیں اور ذہنیتیں یوں سنورتی ہیں: ؎

لمحہ بھر کو تو لبھا جاتے ہیں نعرے، لیکن
ہم تو اے اہلِ وطن، دردِ وطن مانگتے ہیں،

وطن کی تاریخ اور مُلک کے کوائف کا شعُور

ادیب کو سب سے پہلے تو یہ شعور حاصل ہونا چاہیے کہ وہ جس ملک کا باشندہ ہے وُہ تاریخ کے کون کون سے عوامل سے صورت پذیر ہوا۔ مثلاً ہمارے معاملے میں وُہ کون سے حالات تھے جنھوں نے ہماری تاریخ کی ان عظیم تحریکوں کو جنم دیا جو آخر میں قیامِ پاکستان پر منتج ہوئیں شخصیتوں کی باری ہمیشہ تحریکوں کے بعد ہی آتی ہے کیونکہ تحریکیں ہی تو شخصیتوں کو جنم دیتی ہیں۔ سو جب تک ہمارے ادیب کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے سے قبل کے حالات کس کس طرح ہماری تہذیب پر اثر انداز ہوتے رہے اور مغلوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کے دور میں اُنھوں نے اپنوں کے ساتھ کیا کیا، اور شرافت و نجابت کی قدریں کیسے بدلیں، اور کیسے ہمارے معاشرے پر وہ جاگیری نظام مسلّط ہوا جس نے مسلمانوں کی بیداری کی ہر تحریک کی یوں مخالفت کی جیسے اس میں اس کی آخرت کی نجات پوشیدہ ہے تو اس وقت تک ہمارا ادیب اپنی تخلیقی قوتوں کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کر سکے گا۔ بعض عناصر پاکستان کے نظریاتی مملکت ہونے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں محض عقیدے کی بنا پر کسی مملکت کی انفرادیت کیسے قائم ہو سکتی ہے۔ ان عناصر کو یقیناً معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی میں عقیدہ

اور نظریہ ہی تو مختلف ملکوں کے نظامہائے حکومت کا محور ہیں۔ کمیونسٹ ممالک کی بنیاد ایک نظریئے پر ہی تو ہے مغربی ممالک بھی تو زندگی اور نظامِ زندگی کے بارے میں ایک خاص عقیدے ہی کی وجہ سے ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انسانی شعور ترقی کر کے اب تک بعض نظریوں اور عقیدوں تک ہی تو پہنچا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ نظریہ یا عقیدہ جہاں اپنے نظامِ حیات اور اپنی مملکت سے محبت کا درس دے وہاں دنیا کے دوسرے ملکوں اور ان کے پسندیدہ نظاموں سے نفرت کرنا نہ سکھائے۔ اس کے بعد نظریہ یا عقیدہ ایک خاص قسم کا طرزِ حیات بن جاتا ہے اور جمہوری معاشرے میں تو طرزِ حیات کا اختلاف عالمِ انسانیت کا بہت بڑا حسن ہے۔ اس اختلاف میں تعصب کو راہ پانے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے اور بحمد اللہ اسلام ہر نوع کے تعصبات کا شدید ترین مخالف ہے۔ اس صورت میں پاکستان کا ایک نظریاتی مملکت ہونا کس طرف سے قابلِ اعتراض رہ جاتا ہے؟

پاکستان کے قومی شعور کا عنوان وہ نظریہ ہے جس کے تحت پاکستان وجود میں آیا۔ برِصغیر کے مسلمان صدیوں کے تلخ تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنے طرزِ حیات، اپنے فکر و فن اور اپنی مادی آسودگی کا تحفظ صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ متعصب اکثریت کی دستبرد سے مکمل طور پر آزاد ہو جائیں، ایک زبردست ہمہ گیر اور عوامی تحریک اور اس تحریک کی کامیاب رہنمائی کی برکت سے ہم نے یہ آزادی حاصل کر لی، مگر اس آزادی کو برقرار رکھنے اور مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے شعر و ادب میں فنکارانہ انداز سے پاکستان کے اس بنیادی نظریے کی روح پھونکیں اور اس کا مثبت طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی قومی خصوصیات اور انفرادیتوں کو نمایاں کریں اور قاری کے دل میں پاکستانی ہونے پر فخر کا جذبہ پیدا کریں۔

پاکستانی ادیب کا ایک اور اہم فریضہ یہ ہے کہ اپنا معاشرہ اس کے لیے اجنبی نہ ہو اور اسے معلوم ہو کہ مروجہ نظامِ معیشت اس معاشرے کی کتنی ہولناکیوں سے دوچار کیے ہوئے ہے۔ ادیب کو اس حقیقت کا شعور حاصل ہونا چاہیئے کہ ہماری آبادی کی اکثریت بے وقاریوں سے سارا جھگڑا انسان کی بے وقاری کا ہے۔ انسان کا وقار اس کے ساتھ باوقار برتاؤ اس کا حق ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ آدمی مسجودِ ملائک ہے۔ جب ہم مانتے ہیں کہ آدمی کرۂ ارض پر خدا کا خلیفہ ہے، جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آدمی اشرف المخلوق ہے تو اس طرح ہم آدمیوں کی کوئی خاص فہرست مرتب نہیں کرتے۔ سبھی انسان مسجودِ ملائک اور خلیفۃ اللہ علی الارض اور اشرف المخلوق ہیں۔ وہ جو سائیکل کو پنکچر لگا رہا ہے وہ جو ٹرک میں مٹی لاد رہا ہے، وہ جو دفتر میں قلم چلا رہا ہے، وہ جو بازار میں آنے آنے دو دو آنے کی اشیا بیچ رہا ہے ——— اور وہ جو ایئر کنڈیشنڈ گھر میں بیٹھا گرمیوں میں سردیوں کے مزے لوٹ رہا ہے، وہ جو اپنی موٹر کار کے بغیر چار قدم بھی نہیں چلتا اور وہ جسے الگ الگ ہند سے بھول گئے ہیں کیونکہ وہ برسوں سے لاکھوں اور کروڑوں کی باتیں کر رہا ہے ——— یہ سب اشرف المخلوق ہیں۔ یہ سب ایک سطح کے آدمی ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی سے اشرف نہیں ہے۔ اشرف صرف وہی ہے جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خدا ترس ہے، جو خدمتِ خلق کو عبادت کا درجہ دیتا ہے، جو کسی کا حق نہیں مارتا اور جو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ مگر ہم دین و مذہب

کے نام لیوا اور اس کے اصول و قوانین کے پابند ہونے کے باوجود اشرفیت کے اپنے اپنے معیار قائم کئے بیٹھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے، کہ خدا ترس اور خدمتِ خلق، حق کوشی اور حق رسی کی روایت ہمارے ہاں سے نہ صرف ختم ہوگئی ہے بلکہ اب تو لاکھوں میں کوئی ایک اس پاکیزہ ذہنیت کا آدمی ہمیں ملتا بھی ہے تو ہماری ہنسی نکل جاتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ پرانے خیال کا آدمی ہے ہم اسے کمزور قرار دیتے ہیں اور اس کے ذہنی توازن تک پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔

شرفِ انسانی اور دولت

میں یہ باتیں منبر پر کھڑے ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بالکل سامنے کی باتیں ہیں۔ ہر روز ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں۔ ہر فرد انھیں محسوس کرتا ہے۔ اس کا اظہار بھی کر دیتا ہوں اور میں بعد الطبیعیاتی باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ میں اس کے اظہار کے لیے علمِ فلسفہ یا علمِ سیاسیات کی مروجہ اصطلاحات کا بھی سہارا نہیں لے رہا ہوں۔ میری گفتگو براہِ راست اپنے قارئین سے ہے اور میں ان سے پوچھتا ہوں (جیسا کہ میں خود سے بھی پوچھتا رہتا ہوں) کہ کیا ہم نے صرف ان ہی انسانوں کو اشرف نہیں قرار دے رکھا ہے، جو اندھا دھند دولت سے فیضیاب ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ وہ بڑا آدمی ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ امیر آدمی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ وہ معمولی آدمی ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ غریب آدمی ہے۔ یوں کیا ہم نے اشرف اور غیر اشرف لوگوں کی من مانی فہرستیں تیار نہیں کر رکھی ہیں؟ کیا ہمارے معاشرے میں دولت و ثروت ہی کو شرافت و نجابت کا ثبوت نہیں سمجھا جاتا؟ اپنے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہمیں اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ چاہے ہم غریب ہوں چاہے امیر، کیا ہم سب امارت ہی کو اشرفیت کی نشانی نہیں مانتے؟ ہمارے ذہنوں کو اس بیہودہ روایت نے جس سختی سے جکڑ رکھا ہے اس کے ثبوت میں بعض انقلاب پسندوں تک کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کا طرزِ حیات اگر امیرانہ نہ ہو اور جن کا میل ملاپ امرا سے نہ ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حقیر ہو گئے! ان کی انقلاب پسندی پر شبہ کرنا غلط ہے مگر وہ اس روایت کے سامنے بے بس ہیں جو صرف امارت، دولت اور ثروت کو عزت و آبرو کا سرمایہ قرار دیتی ہے۔ یوں ہم ان کروڑوں کی بے وقاری اور ہتک کے مرتکب ہوتے ہیں جو دولت سے محروم ہیں اور وہ دولت سے اس لیے محروم ہیں کہ ہم نے انھیں جس نظامِ معیشت میں جکڑ رکھا ہے وہ صرف چند کے ہاں دولت کو مرتکز کر دیتا ہے اور اللہ کی شان، کہ آج ہم میں سے بعض میں یہ حوصلہ بھی ہے کہ ہم اس سراسر غیر منصفانہ ارتکازِ دولت کے حق میں دلائل لانے سے بھی نہیں چوکتے اور جو لوگ اس نظامِ معیشت کو بنی نوع انسان کی اشرفیت کی بے آبروئی قرار دیتے ہیں، ان کی نیتوں پر شبے سے بھی باز نہیں آتے اور یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے عقائد کی، ہمارے ایمان کی، ہمارے اسلام کی عظمت تو اس میں ہے کہ معاشی لحاظ سے ہمارے درمیان کوئی غیر معمولی تفریق نہ ہو، تاکہ ہم سب محض قولاً نہیں، بلکہ عملاً اشرف ہوں اور ہم سب کو شرفِ انسانی کا، وقارِ انسانی کا ذائقہ اپنی زبانوں اور اپنی روحوں میں محسوس ہو سکے۔

افریشیائی حالات کا شعور

اپنے سیاسی اور تہذیبی ماضی اور مروجہ معاشرت و معیشت سے پوری طرح آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے ادیب کو اپنے "ہم نصیبوں اور ہم قسمتوں" کے حالات و کوائف سے بھی باخبر رہنا چاہیئے۔ یہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک ہیں یا لاطینی امریکہ کے وہ ملک جو بظاہر آزاد ہیں مگر جن کی رگِ جاں دوسرے ملکوں کی گرفت میں ہے۔ صدیوں کے غیر ملکی استحصال کے بعد ہم سب نے حال ہی آزادی حاصل کی ہے۔ ہمارا ماضی فریب خون آلودہ ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں نے ہماری سرزمینوں کا لہو نچوڑ لینے کے بعد ملبہ ہمارے سپرد کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے ان سابق حکمرانوں نے جو ہماری ہی دولت کے بل پر بڑے بنے۔ ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ ہم اپنی تعمیر و ترقی کے لیے بلکہ بعض صورتوں میں زندہ رہنے اور پیٹ بھرنے کے لیے بھی اُن کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ انھوں نے افریشیائی ممالک کے گرد ایسے ایسے حصار کھینچ دیئے ہیں جنھیں آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، مگر جن کے سائے ہماری رُوحوں پر پڑ رہے ہیں، سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود ہم میں سے بیشتر ممالک کو معاشی طور پر غلام رکھا گیا ہے تاکہ ہم سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود وہ جذبہ ہی اپنے دلوں میں پیدا نہ کر سکیں جو کسی بھی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ممالک کو عالمی سیاست کی شطرنج کے "پیادے" بنانے کی کوششیں اب تک جاری ہیں۔ یہ "پیادے" جگہ جگہ مر رہے ہیں اور مر رہے ہیں اور مقاصد ان "شاہوں" کے پورے ہو رہے ہیں جو بساط کے ایک گوشے میں محفوظ و مصئون کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ سو ہمارے ادیب کو محسوس کرنا چاہیے کہ یہ براعظم جو صدیوں تک مغرب کے مٹھی بھر سفاکوں کی من مانی کارروائیوں کی اماجگاہ رہے ہیں آج دورِ غلامی سے بھی کہیں زیادہ نازک دور میں سے گزر رہے ہیں اور اگر ان براعظموں کے تخلیقی فن کاروں نے ذرا سی بھی سہل انگاری سے کام لیا اور جذبہ و احساس کو سو جانے دیا تو ایک ایسی غلامی کا آغاز ہو گا جس کا نتیجہ ان براعظموں کی بھوک اور احتیاج ہے اور بھوک اور احتیاج ایسی چیزیں ہیں کہ انھیں دُور کرنے کے لیے غلامی تک قبول کر لی جاتی ہے۔

عالمی کشیدگی کا شعور

حقائق سے فرار کا نتیجہ عموماً یہ نکلتا ہے کہ مفرور ادیب کو اپنی پناہ گاہ میں بھی خوفناک تر حقائق کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔ وہ وہاں سے بھی بھاگتا ہے تو ان سے بھی زیادہ لرزہ خیز حقائق اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ سو حقائق سے مفر ممکن ہی نہیں اور دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ ان حقائق سے نمٹا جائے۔ شترمرغ جب شکاری کے ڈر سے اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے تو اس طرح شکاری بھی ریت میں نہیں گڑ جاتا، انسان کو شترمرغ کی سی خود فریبی سے کام نہیں لینا چاہیئے کہ اس کا انجام نیک نہیں ہے۔ ادیب کو ملکی حالات اور افریشیائی کوائف کے علاوہ عالمی کشیدگی کے پس منظر پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اسے سوچنا چاہیئے کہ یہ قومیں جنھیں اپنے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کے اتنے بڑے بڑے دعوے ہیں۔ اس آدمی خوری کی طرف کیوں مائل ہیں۔ جس کا آغاز اگست ۱۹۴۵ء میں ایشیا ہی کے ایک شہر ہیروشیما سے کیا گیا تھا۔ اگر ان قوموں کو انسان اور اس کی تہذیب اور اس کے علوم سے اتنی محبت ہے

تو ان کے درمیان بم سازی کا کمپی ٹیشن کیوں ہو رہا ہے اور وہ یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ مستقبل میں ان کا کوئی مخبوط الحواس قسم کا حکمران (کہ ماضی میں بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں رہی) جوہری جنگ کا بٹن نہیں دبا دے گا اور پورا کرۂ ارض ایک دھکتا ہوا انگارہ بن کر نہیں رہ جائے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ مسابقت کی اس دوڑ کی اصل وجہ پوری زمین پر حکمرانی کی اُمنگ ہے۔ امریکہ، ویٹ نام میں صرف اپنے جوانوں کی لاشوں کا پھڑکا کر نے تو نہیں آیا تھا۔ وہ تو جنوب مشرقی ایشیا کو چین کے زیر اثر آنے سے روکنے آیا تھا۔ کیوبا میں خروشچیف کی میزائلیں کیا کرنے گئی تھیں؟ امریکہ کو یہ بتانے گئی تھیں کہ اپنے ساحلوں سے باہر قدم نکالتے ہی اُسے خوفناک مدافعت کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ روس افغانستان میں اپنے مفادات سے تحفظ کے علاوہ امریکہ کے رستے میں خندق کھودنے آیا ہے۔ سو آج عالمی سطح پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک دوسرے کو آپے میں رکھنے کی کوششیں ہیں۔ ورنہ یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہر ملک اپنی پسند کا نظام زندگی اور نظام حکومت اختیار کرے اور ایک ملک میں جو کچھ بھی ہوتا رہے اس سے دوسرا ملک لاتعلق رہے، اور ملکوں کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہو تو وہ محبت کا اور ایک دوسرے کی بھلائی کا اور قطعی غیر مشروط امداد کا رشتہ ہو۔ سو یہ عالمی کشیدگی دراصل کرۂ ارض پر اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کی کھینچا تانی ہے اور یہی کے ان پاٹوں میں ایشیا اور افریقہ پسے جا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ براعظم ارباب قوت کی تجربہ گاہیں ہیں۔ ہم اس لیے عرض کر رہے ہیں کہ صدر ٹرومین برلن پر بھی تو دنیا کے پہلے ایٹم بم کا تجربہ کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہ کیا کیونکہ برلن میں گوری نسل آباد ہے جو امریکہ کی رشتہ دار ہوتی ہے۔ اس تجربے کے لیے ہیروشیما کو چنا گیا کیونکہ وہاں غیر گورے لوگ بستے ہیں اور ان میں سے ہزارہا انسانوں کا ایک منٹ کے اندر اندر مر جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اپنی ذات کا شعور

کیا کوئی انسان جس کے ہاتھ میں قلم کی سی مقدس چیز ہو، ان حقائق سے چشم پوشی کا حوصلہ کر سکتا ہے؟ کیا وہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے اردگرد قیامت برپا ہو اور وہ اپنی ذات کے خول میں گھس کر اس امر کی فکر کر رہا ہو کہ انسان اپنی ماں سے محبت کرتا ہے تو دراصل اس محبت کی نوعیت جنسی ہوتی ہے؟ یقیناً ذاتی غم یا ذاتی مسرت کا جذبہ شعر و ادب سے خارج نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر اس غم اور اس مسرت کا تجزیہ کیا جائے تو اہل قلم کو محسوس ہوگا کہ یہ غم تو ہمہ گیر ہے اور اس مسرت میں تو پوری دُنیا شریک ہے۔ ذاتی غم اس لیے کاٹنا تی دستیں اختیار کر جاتا ہے اور یہی ادیب کا شعور ہے۔ جنگ ستمبر (۱۹۶۵ء) کے دنوں میں ہمارے ہاں ایسے ایسے اہل قلم کا شعور بھی جاگا تھا جو شعور کے لفظ ہی کو غیر شاعرانہ قرار دیتے تھے اور جن کا دعویٰ تھا کہ اِدھر شاعر اور ادیب کے فکر پر فرض شناسی کے شعور کا سایہ پڑے گا، اُدھر اس کی فنکاری کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ جنگ کی خوفناک حقیقت نے اُنھیں آگاہ کیا کہ ان کی ذات اس بہت بڑے اجتماع کا ایک حصہ ہے جسے وطن کہتے ہیں۔ یہ اجتماع خطرے میں ہے تو اس کی ذات بھی خطرے میں ہے۔ یہ اجتماع آزاد ہے تو اس کی ذات بھی آزاد ہے۔ بڑے بڑے "ارباب فن" اس دوران مشرف بہ شعور و ادراک ہوئے مگر جب جنگ ختم ہوئی اور خطرات کی شدت میں کمی آگئی اور معمول کی زندگی کا آغاز ہو

گیا تو بعض ادیب تو یہ کہتے بھی پائے گئے کہ ہمارے شعور کی وہ بیداری عارضی تھی۔ شعور کی اس بیداری کا ہمارے نظریۂ فن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ نازک دور ختم ہوا تو ہم نے شعور کو بھی چھٹی دے دی اور اپنے اس نظریے کی طرف واپس آگئے جس کا اپنے وطن یا اپنے معاشرے یا اپنے ماحول سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک الگ اکائی ہے۔ وہ ادیب کی انفرادیت ہے ورنہ سب لوگ باشعور ہو جائیں تو ادیب کی انفرادیت ملیامیٹ ہو جائے گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ڈوب رہا ہو اور اُسے ڈوبنے سے بچانے والا اپنی جان پر کھیل کر اُس کے پاس پہنچے مگر ڈوبنے والا کہے میری پروا نہ کرو بلکہ میرے جُوتے اُتار کر لے جاؤ کیونکہ یہ میں نے نئے خریدے ہیں اور آرڈر پر بنوائے ہیں! یہ طرزِ عمل انسان کی اس خاص نوعیت کی ہتک ہے جو اُسے دوسرے حیوانات سے ممیز کرتی ہے اور اُسے اشرف المخلوق بناتی ہے۔

فیض احمد فیض — ایک جائزہ

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

گزشتہ نصف صدی کے دوران ہمارے ادبی افق پر نمایاں ہونے والے وہ تمام شعرا جو "جدیدیت" کے مدعی رہے ہیں اور جن میں خاصی تعداد کو معاصرین اور بعد میں آنے والوں نے جدید شاعری کے رجحانات کا نمائندہ تسلیم کیا ہے ایک ہی طبقے یا دبستانِ فکر سے وابستہ نہ تھے۔ ان میں واضح اکثریت، ترقی پسند شعرا کی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہیں یہ شعرا ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے تھے جس میں بغاوت اور احتجاج کا رجحان بیداریٔ شعور کی علامت بن گیا تھا۔ سیاسی بیداری۔ معاشی بے اطمینانی اور معاشرتی انتشار کے عوامل بڑی شدت و سرعت کے ساتھ بروئے کار آ رہے تھے اور ان کی بدولت قبولیت عام کے معیار بھی اس طرح بدل رہے تھے کہ کوئی شاعر اس دھارے کے ساتھ بہنے پر رضامند نہ ہو سکتا تھا۔ وہ عقیدت مندوں اور پرستاروں کے ایسے کسی حلقے تک رسائی حاصل نہ کر سکتا تھا جس کی داد و تحسین کی ضمانت بن سکے۔ پرانی روایتی شاعری کی بندشیں بڑی سخت ریاضت اور محنت کا مطالبہ کرتی تھیں اور روایت پرستوں کی سخت گیری اور خوردہ گیری نے استناد کے درجہ تک پہونچنا بہت مشکل بنا دیا تھا۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کے نام پر بہت سی ایسی بدعتوں کو روا رکھا جا سکتا تھا جو روایت پرستوں کی شریعت میں گناہ کبیرہ سے تعبیر کی جاتی تھیں اس کے برعکس نئی شاعری ان ابھرتے ہوئے شاعروں کے درمیان کم سے کم مزاحمت LINE OF LEAST RESISTANCE کی دیوار بنتی تھی۔ اس نئی شاعری کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ محفل شعر و ادب کا نظم و نسق نئی نسل کے قبضے میں آجانے کی وجہ سے مشاعروں اور ادبی محفلوں کے پرانے آداب اور ضابطے بھی رفتہ رفتہ متروک ہو رہے تھے اور اس دور کے ایک بزرگ روایت پسند شاعر کے الفاظ میں نوجوانانِ سخن[1] نئے آہنگ اور نئے ساز کا مطالبہ اس انداز سے کرنے لگے تھے کہ بہت سے کہنہ مشق اساتذہ میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ نئے شعرا مجموعی طور پر چند ذہنی رویوں یا رجحانات کے علمبردار تھے اور یہ تمام رویے اور رجحانات ترقی پسندانہ مقاصد سے ہم آہنگ بھی نہ تھے تاہم نئی نسل کے شعرا عصری آگہی اور جدید طرزِ احساس کے حوالے سے روایتی شاعری کی پامال شاہراہ سے ہٹ کر اپنی راہ آپ متعین کرنے کا جواز تلاش کر لیتے تھے۔ پرانی روایت کے علمبرداروں کی نظر میں قدامت اور جدت پسندی کی یہ آویزش جو بیسویں صدی کے آغاز ہی میں ظاہر ہونے لگی تھی اور اس صدی کی چوتھی دہائی میں ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ نئی آواز جن کی بندشوں سے آزادی، بے قیدی، عریانی اور مذاق سلیم و شائستگی کے معیاروں سے بالارادہ روگردانی کے مترادف تھی اور اس

---

[1] مولانا احسن مارہروی :

ساز ندوں کے انداز کہاں سے لاؤں — بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں مجھے معاف اربابِ سخن — بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

کے منفی اور تخریبی رجحانات کے خلاف ان کی اکثریت کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ وہ اس میں کسی مثبت قدر کا وجود بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس آویزش کا نتیجہ ظاہر تھا۔ نئے رجحانات کے خلاف قدامت کے پرستاروں کی مقاومت بڑھتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش تھی اور وقت کے ناگزیر تقاضوں کی بدولت ناکامی اس کا مقدر بن چکی تھی۔

۳) سنہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے باضابطہ آغاز کے ساتھ نئی شاعری کے مختلف رجحانات کو ایک واضح سمت مل گئی یا یوں کہہ لیجیے کہ مختلف سمتوں میں بہتے ہوئے سیلابی دھاروں کو بہاؤ کا ایک راستہ CHANNEL مل گیا۔ لیکن ترقی پسندی کا کوئی معین مفہوم پیشِ نظر نہ ہونے کی وجہ سے اس نام نہاد ترقی پسندی کو بھی ایک واضح یا معین مسلک قرار دینا مشکل نظر آتا ہے۔ ترقی پسندی کے نام پر جن عناصر کو شرفِ قبولیت عطا کیا گیا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ آزادی کی لگن اور طبقاتی عدم مساوات اس کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ اتحاد، مذہب اور اخلاق کی مسلمہ قدروں سے بغاوت، عریانی، شائستگی و شرافت کے معیاروں سے بیگانگی اور سرمستی کو محض تقاضائے طبیعت کے طور پر نہیں بلکہ ایک مسلک اور عقیدے کے طور پر تقدس کا مقام دینے کی روش، زبان و بیان کے مناہلوں سے انحراف، شعر کی ہیئت، موضوعات اور اسالیب میں نت نئے تجربے اور اختراعات، شعر و ناشر یا تخلیقی عمل اور پروپیگنڈے کے درمیان امتیازات سے قولاً اور عملاً انکار اور پھر ان تمام مختلف عناصر پر حاوی ایک مبہم سے مسلک انسان دوستی کا دعویٰ ——

غرض ان تمام چیزوں کی بدولت ترقی پسندی کا اصل مفہوم ہی مابہ النزاع بنا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کے بارے میں ایک فاضل ناقد کا یہ قول حرفِ آخر معلوم ہونے لگتا ہے کہ "ترقی پسندی کا مفہوم تو صرف 'مختلف ہونے' JUST TO BE DIFFERENT سے زیادہ نہیں اور اکثر یہ اختلاف کسی مقصد کی خاطر نہیں محض اختلاف کی خاطر کیا گیا ہے۔ ان مختلف دھاروں کے نقطہ ہائے اتصال و افتراق کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اس کی شاعری میں کن ادوار میں کون سے عناصر زیادہ نمایاں رہے ہیں اور ان مختلف اور بعض اوقات متضاد عناصر میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں وہ کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے فیض کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر (جو سب کے سب ادبی یا فنی نوعیت کے نہیں ہیں) نئے اور ترقی پسند شعرا کی ایک خاص بڑی تعداد فیض کے اقتدا کی دعوے دار رہی ہے۔

۵) سنہ ۱۹۳۰ء تا سنہ ۱۹۴۰ء کے دور میں نئے شعرا کا جو قافلہ سرگرم سفر ہوا تھا اس میں فیض کی ممتاز حیثیت مسلم تھی۔ ان شعرا میں فیض کی آواز سب سے زیادہ پرزور اور بلند آہنگ تو نہ تھی لیکن اس کے دھیمے پن اور ٹھہراؤ میں ایک قوت اور دیرپا تاثیر تھی جس کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں انھیں اس قافلے کے راہنماؤں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے دوسرے معاصروں کے مقابلے میں وہ زیادہ طویل عرصے تک اس مقام پر فائز رہے ہیں۔ بظاہر یہ بات ناقابلِ توجیہ معلوم ہوتی ہے کہ فنی خامیوں، زبان و بیان کی خامیوں اور فکر و احساس میں ربط و ہم آہنگی کی کمی کے باوجود جس کا احساس ان کے ہر دور کے کلام میں شدت کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس طبقہ شعرا کی صفِ اول میں اپنی جگہ بنا سکے اور اس کو ایک عرصے تک برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ مداحوں اور پرستاروں کی عقیدت یا کسی خاص لابی LOBBY سے وابستگی اس دیرپا مقبولیت کی کافی ضمانت نہیں بن سکتی تھی، لازماً اس مقبولیت کا راز ان کی رچی ہوئی شعریت۔ ان کے شاعرانہ تجربات کی واقعیت۔ روحانی انداز نظر اور اردو شاعری (خصوصاً غزل) کے مزاج سے شناسائی اور لب و لہجہ کے دھیمے پن میں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر ان کا قدم ایسے مراحل پر بھی کم بہکا ہے۔ جہاں ان کے اکثر ہم سفر عبرت انگیز اور

مضحکہ خیز لغزشوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اس میں ان کی سلامت ذوق۔ وسعت مطالعہ اور علمی و فکری پس منظر کا فیضان بھی شامل ہے جس کے زیر اثر ان کے رومانی مزاج میں وہ نظم و ضبط پیدا ہو سکا جو عموماً ایک کلاسکی روایت سے وابستگی کی پیداوار ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت وہ اپنے مسلک اور عقیدے سے شدید وابستگی کے باوجود اس نعرہ بازی اور کلیشے CLICHE سازی کے کم مرتکب ہوئے ہیں جسے ان کے ہم عصر شعراء کی اکثریت نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی قابل لحاظ ہے کہ فیض نے عقیدے اور مسلک کے شدید اختلاف کے باوجود اقبال کے کلام اور افکار کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جزوی طور پر اس کے اثرات کو بھی شعوری سطح پر قبول کیا ہے۔ اس دور میں اقبال کا یہ اثر اتنا ہمہ گیر تھا کہ وہ شعرا بھی جو اقبال کے فلسفے اور نظریات کے منکر تھے اس کے انداز فکر و نظر اور اس کے شعری آہنگ کے اثر سے اپنی شاعری کو محفوظ نہ رکھ سکتے تھے۔

فیض کی شاعری کو موضوع مطالعہ بنانے کی تحریک صرف اس خیال کی بنا پر نہیں ہے کہ اپنے دور کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ان کا مطالعہ نئی شاعری کے بنیادی رجحانات کی پہچان اور پرکھ کے لیے وافر مواد فراہم کر سکتا ہے۔ اس انتخاب میں یہ احساس بھی کارفرما ہے کہ ان کے حالیہ کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب اُن کی شاعری اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ نہ سہی وضاحت کے ساتھ بات کرنا ممکن ہے۔ جب تک ان کی شاعری تشکیلی دور سے گزر رہی تھی اس کے بعض پہلو اتنے مبہم اور غیر واضح تھے اور ان میں ایسے تضادات نمایاں تھے کہ ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ محاکمہ کرنے کی کوشش قرین احتیاط نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے ان کی شاعری اپنے مضمر امکانات کا بتدریج انکشاف کر رہی تھی اور جب تک انکشافات کا یہ سلسلہ جاری تھا اس کے بارے میں وحدت تناظر کا حصول دشوار تھا اور ان کے مستقبل کے بارے میں کسی پیش گوئی کو ایک جسارت بے جا قرار دیا جا سکتا تھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض بحیثیت شاعر اپنی شاعری کے مستقبل سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو چکے ہیں اور ماضی کا جو سرمایہ اس کے دامن میں موجود ہے۔ اسی کو اپنی شاعرانہ زندگی کا ماحصل قرار دے چکے ہیں۔ مضامین اور موضوعات کی یکسانیت اور تکرار کا احساس تو ان کے ابتدائی مجموعوں (نقش فریادی، دست صبا اور زندان نامہ) کے مطالعے کے دوران بھی ہوتا تھا لیکن شاعرانہ اظہار کی لطافت اور رنگینی کسی حد تک اس کی تلافی کر دیتی تھی۔ ان کے تازہ تر کلام سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان کے شاعرانہ وجدان کے سرچشمے خشک ہو چلے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے دو بزرگ ہمعصر شاعروں (جوش اور فراق) کی طرح ان کی شاعری کا چراغ بھی گل ہونے کے قریب ہے اور ممکن ہے کہ فیض کے کچھ ناقد اس پر مصر ہوں مگر میں اس حد تک جانے پر تیار نہیں۔ عملی اور ذہنی اعتبار سے وہ اب بھی جوش و فراق کے مقابلے میں زیادہ متحرک اور فعال ہیں لیکن اس حقیقت کا بہرحال اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری اپنے ابتدائی اور وسطی دور میں جن مضمر ممکنات کی نشان دہی کرتی رہی ہے وہ اب ایک قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ بقول اقبال:

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن آستیں خالی

عمر کے ساتھ شاعرانہ صلاحیتوں کا انحطاط خصوصیت کے ساتھ ایسی شاعری میں جس کا سرچشمہ رومانی افکار و احساسات سے پھوٹا ہو۔ کوئی حیرت انگیز بات نہیں، یہ وہ کلاسیکی آہنگ والی شاعری نہیں جس میں زور گھٹنے کے ساتھ مشق سخن بڑھ سکتی ہو۔ بقول میر انیس ؎

گھٹا زور، مشق سخن بڑھ گئی
بڑھاپے نے ہم کو جواں کر دیا

فیض جیسے رومانی شاعر کے بارے میں جس کی شاعری کا رنگ و آہنگ شبابیات کا مرہون منت ہے یہ توقع رکھنا کہ جذبہ و احساس کی حرارت حدت کے زوال کے بعد بھی اس کے ساز سے تازہ نغمے پھوٹ سکیں گے، غیر حقیقت پسندانہ انداز فکر کا غماز ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ماضی کے جوانمرگ شاعر مثلاً طرفہ ابن العبد۔ شیلی یا کیٹس اگر منقاد سالگی کی عمر تک پہنچ سکتے تو ان کی شاعری کیا رخ اختیار کرتی۔ پیرانہ سالی میں شباب فن کا مقام تو صرف ان شعرا کو حاصل ہو سکا ہے جن کی تخیل کی خلاقی۔ نشاط تصور کی گرمی یا فکر کی پرانی اور رتاب ناکی ان کے کلام کو ان فتوحوں سے آشنا کر دیتی ہے جن تک محض جواں جذبے اور احساس کی رسائی نہیں۔ یہ بات بطور تعریض نہیں بلکہ اظہار حقیقت کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ فیض شاعرانہ جذبے اور احساس سے بہرہ ور سہی لیکن بہر حال وہ فیض احمد فیض ہیں متنبی۔ غالب یا اقبال نہیں۔

فیض کے بارے میں یہ تسلیم کر لینا کہ وہ نئے شاعروں کے قافلے میں "پیش آہنگ" کی حیثیت رکھتے ہیں یا ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں کی صف میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کی قدر متعین کرنے میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان کے بارے میں یہ بار بار دہرایا ہوا دعویٰ کہ انہوں نے ایک طرف اس جدید طرز فکر و احساس کو جو مغرب کے مادی اور ذہنی غلبہ کا پروردہ تھا، کشادہ دلی کے ساتھ قبول کیا ہے لیکن اس کے ساتھ مشرق کی ادبی و تہذیبی روایات سے بھی اپنا رشتہ کلیتہً منقطع نہیں ہونے دیا ان کا شاعرانہ مقام متعین کرنے میں زیادہ دور تک ہماری راہنمائی نہیں کر سکتا۔ ایسے دعوے بعض دوسرے شاعروں کے بارے میں بھی کئے گئے ہیں لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ کسی شاعر کے کارنامے کی صحیح قدر و منزلت کا تعین صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی شاعرانہ شخصیت کے ارتقا کے مختلف مراحل کو بہ یک وقت سامنے رکھ کر اندازہ لگایا جائے کہ زندگی کے مختلف اور متنوع تجربات میں اس کے فنی شعور نے کس طرح ہم آہنگی پیدا کی اور وہ فکر کے مختلف سمتوں میں رواں دھاروں میں کس حد تک ربط پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس نظر سے فیض کی شاعری کا مطالعہ مایوس کن نظر آتا ہے۔ اس بات کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ "نقش فریادی" سے "سر وادیٔ سینا" تک ان کی شاعری میں دو مختلف آوازیں، لہجے یا آہنگ پہلو بہ پہلو رواں دواں نظر آتے ہیں۔ (اگرچہ مختلف ادوار میں ان کا تناسب وقتی طور پر بدلتا رہا ہے) یہ دونوں آہنگ ایک دوسرے میں ضم نہیں ہونے پاتے۔ ریعان شباب کی رومانیت (عاشقانہ، متغزلانہ اور رندانہ) ان کے مزاج اور رجحان طبیعت پر اس قدر غالب رہا ہے کہ وہ جب "غم جاناں" سے "غم دوراں" کی طرف یا "کوئے یار" سے "فرازدار" کی جانب رخ کرتے ہیں تو یہ دونوں رجحان ایک سالم یا مربوط شخصیت (INTEGRATED PERSONALITY) کا ردعمل نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایک منقسم دولت شخصیت (AMBIVALENT) کے دوجلاگانہ تجربوں کی غمازی کرتے ہیں۔ میں ان کی رومانی شاعری اور شبابیات کے حسن و دل کشی کا منکر نہیں لیکن 'نقش فریادی' کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں اور بعد کے مجموعوں میں بکھری ہوئی متعدد نظموں اور اکثر غزلوں میں جس رومانی شخصیت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ اس نظریاتی انقلاب پسند یا ترقی پسند شاعر کی شخصیت ہیں جس نے سیاسی مقاصد اور مصلحتوں کے زیر اثر ایک نقاب کی طرح اوڑھ رکھی تھی اور جس کی بدولت نئے ادیبوں اور شاعروں کے ایک طبقے نے انھیں اپنا امام تسلیم کر

لیا تھا[۱] فیض کی رومانی شاعری میں والہانہ سرمستی۔ کیف و نشاط کے ساتھ ایک دھیمی سی غم آگیں لے ابتدا ہی سے نمایاں رہی ہے جو اس کی شدت تاثیر کی ضامن تھی۔ یہ شاید ان کے اولین تجربات عشق کی دین تھی جس کی کسک ان کے بعد کے کلام میں بھی جا بجا ابھرتی ہے۔ لیکن 'دیارِ عشق و مستی' سے ان کا 'کوئے دار و رسن' کی جانب سفر واقعاتی اعتبار سے حقیقت ہو تو ہو ان کی شاعری اس کے مراحل کو پیش کرنے میں اس تاثیر اور یقین آفرینی سے محروم نظر آتی ہے جو ان کے عاشقانہ اور زندانہ تجربے کی روداد میں نمایاں ہے۔ اس عدم مطابقت کو شاعرانہ خلوص کی کمی بیشی پر محمول نہ کیا جائے تب بھی دونوں انواع کی شاعری کے تقابلی مطالعے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ حقیقی شاعر وہی فیض ہے جو جمالِ آفاق و جمالِ لب و رخسار کا پرستار رہا ہے اور یہ حقیقی شاعر ان نظموں میں مستور ہو جاتا ہے جن میں وہ کسی سیاسی مقصد یا نظریے کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ فیض کی اصل شاعری ان کی ترقی پسندی کی مرہونِ منت نہیں ان کے کلام کا سب سے دل کش (اور شاید دیر تک زندہ رہنے والا) حصہ وہ ہے جسے اگر فیض کے نام سے منسوب کیے بغیر پڑھا جائے تو کسی کو یہ گمان بھی نہ گزرے کہ یہ کسی ترقی پسند شاعر کا کلام ہے۔ مثلاً

رنگ پیرہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام — موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے — چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں — آگ سلگاؤ آبگینوں میں

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں — جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو — وہ بے خبر ہی سہی، ایسے بے خبر بھی نہیں

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں — وہ بات انھیں بہت ناگوار گزری ہے

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس — مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

نہ یہ غم نیا نہ ستم نیا کہ تری جفا کا گلہ کروں — یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تھی دل میں کبھی کی

---

[۱] 'نقشِ فریادی' تو خیر نقشِ اوّل تھا اس کے بعد 'دستِ صبا' اور 'زندان نامہ' میں ان کی اسیری کی روداد کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور ناگزیر بھی تھا لیکن ان مجموعوں میں بھی غزل میں زیادہ تر تو ماضی کے ساتھ تمہارے حسن کے نام "یاد" "اے حبیبِ عنبر دست" اور ایسی بہت سی نظموں میں ایسی رومانی لے کی صدائے بازگشت ملتی ہے۔ یہ اس شاعر کے لہجے سے بالکل مختلف محسوس ہوتی ہے جو انتخل اور جولیس روزنبرگ کا مرثیہ یا 'ماؤ ماؤ کا ترانہ' "آجاؤ افریقا" جیسی واضح مقاصد کی حامل نظمیں لکھتا ہے۔ یہی فرق فیض کی پابند شاعری میں رچی ہوئی تغزل کی لے اور آزاد نظموں کے اکہرے لہجے میں محسوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فیض کی شاعری کے بعض پرستار ان کی نظریاتی (IDEOLOGICAL) شاعری کو نظر انداز کر کے ان کی غزلوں اور نظموں میں اس شاعر کو تلاش کرتے ہیں جو کہولت کی منزل پہ پہونچ کر بھی ریعانِ شباب کی رنگینی و سرمستی کی یادوں کو زندہ رکھ سکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ انقلاب اور ترقی پسندوں کی امامت کا منصب اس رومان پسند شاعر کو راس نہیں آیا جو شباب کی رنگین مزاجی اور عشق کامراں اور ناکامی عشق کا شاعر تھا مگر بعض مصلحتوں نے اس کو بار بار اس روحانی تجربے کی حد سے گزرنے پر مجبور کیا۔ لیکن زندگی کے کسی دور میں وہ اسے بھلا نہ سکا۔

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ (13) وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

ان اشعار کو فیض کے اکثر مداحوں نے ان کے شاعرانہ کمال کی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے اور اشعار واقعی خوب ہیں۔ اگرچہ ایسے اشعار فیض کے یہاں بہت زیادہ نہیں ہیں پھر بھی اگر کسی مصور کی چند تصویریں اپنے ناقد سے خراجِ تحسین وصول کر لیتی ہیں تو اس کو عظیم فن کار ماننے میں کسی کو تامل نہیں ہوتا اور اسی طرح اگر کسی شاعر کے اشعار خواہ وہ کم ہوں اگر فن اور جذبہ کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں تو اس شاعر کی عظمت میں شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح فیض کے یہاں بھی ایسے اشعار نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ ان کی غزلوں پر طائرانہ نظر ڈالنے سے ان کے ہر مجموعے میں کم و بیش اس رنگ کے اشعار بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ان میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو ان کے مجموعوں میں غزل کے عنوان سے پیش کی گئی ہیں اور وہ غزلیں یا غزل نما نظمیں بھی جو کسی عنوان کے تحت نظم کی صورت میں پیش ہوئی ہیں ——— لیکن

یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ایسے اشعار کا حسن آبیات غزل کا حسن ہے۔ نظم کے ربط و تسلسل معین ہیئت کا مرہون احسان نہیں۔ اس لئے کہ ایسے اشعار کا حسن نظم کے سیاق و سباق سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ اب اس کو ان اشعار کی خوبی کہہ لیجیے یا ان نظموں میں تعمیری ہیئت کے فقدان کا کرشمہ قرار دے لیجیے۔ جن میں غزل مسلسل کا سا انداز بھی کہیں کہیں ملتا ہے لیکن اشعار میں شعریت کی مختلف سطحیں یا انداز بیان میں ناہمواری اور پست و بلند کی یک جائی انھیں کامیاب مسلسل غزل بھی نہیں بننے دیتی۔ ایسی غزل نما نظمیں ان کے ہر دور کے کلام میں کثرت ملتی ہیں جنھیں کسی قابلِ توجیہ بنیاد کے بغیر نظم کی صورت دے دی ہے۔ "نقش فریادی" میں 'انجام'، 'بعد از وقت'، 'سرود'۔ 'مرگ سوز محبت'۔ "دستِ صبا" میں 'لوح و قلم'، 'طوق و دار کا موسم'، "دست تہ سنگ" میں 'دستِ تہ سنگ آمدہ'، "سرِ وادیٔ سینا" میں 'ایک شہر آشوب کا آغاز'، 'دلدار دیکھنا'، 'ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند' جیسی نظمیں یا غزلیں ان غزلوں سے کسی اعتبار سے مختلف نہیں جو بغیر عنوان غزل کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ان میں فنی استقام، عروضی و قوافی کی غلطیوں، زبان و بیان کی لغزشوں کے انبار میں دبے ہوئے جو پُر لطف اشعار مل جاتے ہیں ان کا تاثر غزل کے شعر کا تاثر ہوتا ہے اور عنوان کا تکلف اس تاثر میں حارج نہیں ہوتا۔ اسی طرح دو دو تین تین ہم قافیہ و ہم ردیف اشعار پر مشتمل نظمیں جو جداگانہ مختصر نظموں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں ان متفرقات کے نام سے مکمل غزلوں کے بعد دیوان کے آخر میں دی جاتی تھیں۔ پھر ان غزلوں اور غزل نما نظموں کے علاوہ ایسی نظمیں جو ہیئت کے اعتبار سے غزل کے زمرے میں نہیں آتیں (مثلاً قوالیاں یا ایسی نظمیں جن میں قافیہ و ردیف کی یکسانی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا جو چند اشعار تک غزل کی ہیئت برقرار رکھنے کے بعد بند کی صورت اختیار کر لیتی اور مقفیٰ مصرعوں کی ترتیب سے اس حد تک بے نیاز ہو جاتی ہیں کہ اُن کو نظم معرّیٰ یا نظم آزاد کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے) ان سب میں وہی تعمیری ہیئت سے بیگانگی نظر آتی ہے جس کا [illegible] پر کلیم الدین احمد جیسے ناقد غزل کو ایک نیم وحشیانہ صنفِ سخن قرار دیتے ہیں۔ 'نیم وحشیانہ' خصوصیت فیض کے ایسے اشعار میں نمایاں ہے جن پر ان کی شہرت اور مقبولیت کا انحصار ہے اور جن کے حوالے سے ان کی شاعرانہ شخصیت کی شناخت ہوتی ہے۔ اس نقص کی بنا پر ان کی شعریت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذوق کو متاثر کرنے والے پُر لطف اشعار کا تناسب ان کے کلام میں ان کے کم تر درجے کے اشعار یا ناقص اشعار کے مقابلے میں زیادہ نہ سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس سے فیض کی شاعرانہ شہرت کے

زندہ رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس مقالہ میں یہ بحث تفصیل سے اس لئے چھیڑی گئی کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان اشعار کا حسن فیض کی جدیدیت۔ ترقی پسندی یا انقلابیت کا مرہون منت نہیں۔ اگر یہ اشعار فیض کے نام سے منسوب کر کے نہ پیش کئے جائیں تو ہر باذوق قاری انھیں شاعر کے مسلک فکر کی شہادت کے طور پر قبول کرنے میں تامل کرے گا۔ ایسے اشعار کو کسی انقلابی مسلک سے وابستہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سنت منصور و قیس کے حوالے مقتل و زنداں۔ طوق و سلاسل۔ شوق شہادت اور آزمائش دست و بازوئے قاتل کا ادعا اردو کی روایتی شاعری کے لیے غیر معروف اور اجنبی نہیں تھے اور غزل کے مسلمہ رموز و علائم میں شامل تھے۔ خوش سلیقگی اور فن کارانہ حسن کے ساتھ ان کو برتنے میں بھی کسی طبقہ شعرا کی تخصیص نہیں۔ ہر شاعر انھیں اپنے انفرادی تجربے اور فن کارانہ استعداد کی حد تک کام میں لا سکتا تھا۔ اس لئے ان کی تکرار کو ایک بائیں بازو سے وابستہ ترقی پسند ادیب کی امتیازی خصوصیت یا پہچان قرار دینا ایک خوش فہمی سے زیادہ نہیں۔ روایت غزل سے بقدر ضرورت آگاہی رکھنے والا کوئی ذہین اور باذوق شاعر ایسے اشعار کہہ سکتا تھا۔ خواہ وہ عملاً انقلاب پسند ہونے کی بجائے قائم بر سر اقتدار نظام (ESTABLISHED ORDER) کا حاشیہ بردار یا متوسل دامن دولت اور قدامت پرست ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اشعار متغزلانہ جذباتی اور تخیلی تجربے کی غمازی کرتے ہیں اور غزل کے غیر وابستگی کے انداز NON COMMITTED ATTITUDE میں اتنی وسعت ہے کہ نظام سرمایہ داری کا کوئی نمائندہ بھی ان تجربات میں کسی انقلاب پسند کے ساتھ مساوی سطح پر شریک ہو سکتا ہے۔ فیض کے رنگ تغزل کا تجزیہ کر کے دیکھئے تو نظر آئے گا کہ چند مخصوص رموز و علائم کی تکرار سے قطع نظر اس کے دامن میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی بنا پر گزشتہ ادوار کی شاعری کو مجموعی طور پر زوال آمادہ اور ترقی دشمن (DECADENT AND ANTI PROGRESSIVE) اور رجعت پسند قرار دیا جاتا رہا ہے۔ حقائق سے گریز کا رجحان، حدیث لب و رخسار اور جام و مینا کو خود فراموشی کا وسیلہ بنانے کی خواہش روایتی تغزل کا مسلک نیاز کیشی و خود سپردگی۔ خود ترحمی (SELF PITY) اور ایذا پسندی اور ایسے بہت سے عناصر جنھیں منفی رجحانات کی علامت قرار دے کر ترقی پسندی کی شریعت میں صرف کفر ہی نہیں بلکہ کفر صریح کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس رنگ تغزل میں اجزائے ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان بیان کے باریک سے فرق کو نظر انداز کر کے جو وقت اور مقام کے امتیازات پر مبنی ہے اگر ان متغزلانہ اشعار کے معانی پر غور کیا جائے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان اشعار کو بیسویں صدی کے ربع ثانی کے ایک ترقی پسند شاعر کے منفرد رشحات فکر کا درجہ دیا جائے۔ داستان داغ و امیر یا ان سے بھی متقدم شعرائے دلی و لکھنؤ کے یہاں بھی یہی مضامین تقریباً ایسے ہی در و بست کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فیض کا جدید شعرا میں مقام ان اشعار کی بنا پر متعین کرنا درست نہیں ہے۔ قطع نظر یہ امر مسلم ہے کہ ایسے اشعار ہی فیض کی مقبولیت کا سبب بنتے ہیں اور اگر ان اشعار کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی شاعری کی قدر و قیمت ہی معرض شک و شبہ میں آ جاتی ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اشارہ کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ فیض کے بعض ترقی پسند ناقد بھی (جن میں علی سردار جعفری کا نام نمایاں ہے) ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے فیض کی شاعری میں اس "دو آہنگی" یا "دو رخی" (AMBIVALENCE) کی جانب (دبی زبان ہی سے سہی) اشارہ کرتے رہے ہیں اور اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اُن کی شاعری میں جہاں حقیقی شعریت ظاہر ہوئی ہے وہ ان کی روایتی رنگ تغزل سے وابستگی۔ غزل کے الحاقی انداز کے ماہرانہ استعمال اور ترقی پسندانہ فکر و احساس میں غزل کی تشبیہات و استعارات اور رموز و علائم کے سانچے میں ڈھال سکنے کی مرہون منت ہے۔

فیض کے مطالعے کے ضمن میں یہی وہ مرکزی سوال ہے جس کا تشفی بخش جواب تلاش کئے بغیر ان کی شاعری اور ان کی ترقی پسندی

۱۶

کے بارے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ کہنا ممکن نہیں ہے بعض دوسرے شعرا کے یہاں جب ایسا تضاد سامنے آتا ہے تو اس کی ممکن توجیہ کے لیے کچھ اشارات بیٹھ رومانیت (اور یہاں بھی یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس سے میری مراد وہ خام کارانہ سطحی جذباتیت کا ابال ہے جو اکثر بغاوت اور احتجاج کی راہ اختیار کر لیتا ہے) اور بلند آہنگ دعوت انقلاب کا اجتماع جوش کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ وہاں بھی یہ دونوں عناصر ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن کسی سطح پر ان میں مکمل امتزاج ممکن نہیں ہوتا۔ جوش کی شاعری کے اس تضاد کی توجیہ ان کے یہاں فکری عنصر کی کمی اور ان کے مزاج اور طبیعت پر مرتسم ان اثرات کے حوالے سے کی گئی ہے جو ان کے جاگیردارانہ ماحول اور ان کی زندگی اور تجربے کے ان عناصر کی پیداوار تھے جو اودھ کے زوال پذیر جاگیرداری اور اس کے تعیش پسندانہ روایات کے پروردہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نواب شبیر حسن خاں اور شاعر انقلاب جوش دونوں اپنے درمیان ایک مناسب فاصلہ قائم رکھنے پر مجبور ہوئے۔ جوش کی انقلابیت کسی انقلابی فکر یا نظریے کی دین نہ تھی۔ بیرونی سماج کے خلاف بلند آہنگ رجز یا انداز اور انسان دوستی کے دعوؤں کے باوجود یا غیانہ روح۔ سماج۔ مذہب اور اخلاق کی ان بندشوں کے خلاف طبیعت کے تقاضوں کی راہ روکتی رہی ہے۔ اس کے پیچھے وہ فکری اور نظریاتی سازوبرگ نہ تھا جو حقیقی انقلابی شاعر کا محرک بھی ہوتا ہے اور اس کو انقلاب کی راہ سے ہٹنے نہیں دیتا۔ ان کی شبابیات۔ خمریات اور طنزیات۔ مذہب اور اس کی قائم کردہ اخلاقی حدود کے خلاف جارحانہ احتجاج ایک طبعی تقاضا تھا۔ جس کی حقیقی انقلابیت اور ترقی پسندی سے ربط صرف اس بنا پر تھا کہ دونوں کا ہدف ایک ہی تھا۔ فیض کے یہاں تضاد کا یہ عنصر دوسرے عوامل کا نتیجہ تھا جو ان کی شاعرانہ شخصیت کے نشوونما میں کارفرما رہے تھے۔ اس ضمن میں نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی عملی زندگی اور تجربات کے ان پہلوؤں پر بھی اجمالی سی ایک نظر ڈالی جائے جو ان کی شاعرانہ نشوونما میں بروئے کار آئے۔ فیض نے چوں کہ ایک عملی انقلابی جدوجہد کی راہ اختیار کی تھی اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عملی جدوجہد اور اس کے متوقع نتائج کو سامنے رکھ کر اس کے محرکات پر نظر ڈالی جائے۔

گزشتہ سطور میں اس مایوس کن تاثر کا ذکر کیا گیا جو فیض کے کلام کے ایک مجموعی مطالعے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں دو باہم متضاد عناصر نمایاں ہیں۔ رومانی تجربات کا غنائی طرز سے اظہار اور ایک مخصوص نظریہ سے وابستگی اور اس کی ترجمانی۔ لیکن دو عناصر ان کی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل میں متوازن اور ہم آہنگ طور پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ اس لئے ان کی شاعری میں دو متبائن سطحیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک ترقی پسندانہ مقاصد سے بے تعلق اور بے گانہ رومانیت (جو کہیں کہیں زوال آمادگی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے) اور ایک نظریے سے وابستگی جو بین الاقوامی سطح پر ایک منظم سیاسی تحریک کی حمایت اور پروپیگنڈے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہ دونوں متضاد عناصر۔ شعریت۔ رنگینی اور اثر آفرینی کے لیے یکساں طور پر سازگار ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے شاعر فیض اور انقلاب پسند فیض کے درمیان بھی فاصلے حائل رہے ہیں اور شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کا فرق اور فاصلہ سب سے زیادہ تخلیقی عمل کی مختلف سطحوں پر نمایاں ہوا ہے۔ فیض کی رومانی شاعری بعض منفی یا تنزل پسند رجحانات کے باوجود زیادہ زندہ اور شاعرانہ خلوص کی آئینہ دار ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ شاعرانہ یا فن کارانہ خلوص اس شخصی خلوص سے مختلف چیز ہے جس کا تذکرہ اخلاقی اقدار کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔ فیض اپنے سیاسی عقائد میں شاید مخلص ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہ حیثیت شاعر انہوں نے اپنے مخصوص عقیدے اور مسلک کی گرفت اس کشادہ دلی کے ساتھ قبول نہیں کی ہے جس طرح رومانی اور عشقیہ واردات کو اپنی زندگی کے ایک دور میں انہوں نے اپنی پوری شخصیت پر حاوی ہو جانے دیا۔

ان حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہمیں دوبارہ اس سوال پر غور کرنا پڑتا ہے کہ اپنے ہم عصروں میں یہ امتیازی مقام بظاہر انھیں اس شاعری کی بدولت حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو ان کے مسلمہ معتقدات، پیمانہ ہائے اقدار اور عملی مقاصد سے ہم آہنگ نہ تھی۔ اس کے برعکس ان کی شاعری کے وہ اجزا جن میں ان معتقدات و نظریات کی چھاپ واضح طور پر پہچانی جا سکتی ہے، شاعرانہ اعتبار سے اس پائے کے نہ تھے کہ انھیں اس مقام تک پہونچانے کے ضامن ہو سکتے۔ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے بعض دوسرے سرگرم کارکنوں نے شاعری کو بھی اپنے مسلک کی ترویج و تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس وقت سے جب فاشزم کی مخالف، عوام دوست تحریک کا آغاز ہوا تھا جس کو بعد میں ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ بہت سے سرگرم سیاسی کارکنوں نے شاعری کو بھی اپنی اجتماعی جد و جہد میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے لیکن ان میں سے کسی کا تشخص بہ حیثیت شاعر قائم نہ ہو سکا (مثال کے طور پر ہوچی منھ اور ماؤزے تنگ بھی شاعری کر لیتے تھے لیکن تحریک سے عملاً وابستہ شعرا میں بیلو نرودا جیسے افراد بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں) عملی سیاست میں بھی فیض نے جو راہ اختیار کی وہ انھیں ان انقلابیوں کے مقام تک پہونچا ہی نہیں سکتی تھی کیوں کہ یہ راہ نظریاتی راسخ الاعتقادی اور عوامی انقلاب کی عملی جد و جہد کے "کعبہ تک پہونچانے والی نہ تھی"۔ یہ صرف زیر زمیں سیاسی سازش اور کودیتا (COUP - DE - ELAT) کے ترکستان تک جاتی تھی[1] اس راہ پر چل کر فیض اگر کامیابی کی منزل تک پہنچ بھی جاتے تو عوامی انقلاب کے عظیم رہنما کی بجائے بابرک کارمل ہی بن سکتے تھے۔ مجموعی حیثیت سے فیض کی شاعری میں (رسمی۔ نظریاتی اور تبلیغی انداز کی حامل شاعری اور شخصی رومانی واردات کی ترجمان شاعری دونوں شامل ہیں) نہ کسی منفرد جمالیاتی احساس اور شاعرانہ وجدان کا سراغ ملتا ہے نہ کسی تابناک بصیرت اور توانا فکری اجتہاد کی شہادت ملتی ہے۔ ان کے کلام میں جہاں حقیقی شاعری نظر آتی ہے وہ روایتی اسالیب اور رموز و علامت سے گراں بار ہے اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مصلحتاً یا اپنی افتاد طبع کی بنا پر فاش گوئی سے پرہیز کیا ہے۔ اس طرح روایت غزل کا سہارا لے کر ان کی شاعری اس احتساب سے بھی محفوظ رہی جو دور ابتلا میں برصغیر کے متعدد شعرا کا مقدر بن گیا تھا[2]۔ جہاں تک مجھے علم ہے فیض کا کوئی مجموعۂ کلام ضبطی کی زد میں نہیں آیا اور نہ اپنی شاعری کی بدولت انھیں تعزیر "طوق و سلاسل" اور "زنداں و دار" سے سابقہ پڑا۔ جن کا تذکرہ انہوں نے اپنے اشعار میں بڑی تکرار اور شد و مد سے کیا ہے۔ دوسرے عملی مقاصد کے حصول کی راہ میں بھی ان کی شاعری معاون ہی رہی، رکاوٹ نہیں بنی۔ راولپنڈی سازش کے مقدمے میں ان کا ماخوذ اور سزایاب ہونا کسی انقلابی جد و جہد کا نتیجہ نہ تھا اور اس کا اثر ان کی تصنیفات کی اشاعت پر منفی نہیں بلکہ مثبت ہی ثابت ہوا۔ احتیاط کا دامن انہوں نے ایک بار چھوڑا لیکن وہ قصہ کرسی کا تھا ادب اور شاعری

---

[1] سعدی کا شعر ہے ؎

ترسم نرسی، بہ کعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

اور اس میں ترکستان کی رعایت سے بلاغت کا اضافہ ہو گیا ہے۔

[2] اقبال نے ارباب شریف کی سخت گیری سے بچنے کے لئے ایک غزل کے شعر میں کہا تھا۔

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوق تکلم کی — چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں

اقبال کا یہ شعر تھوڑے سے تغیر کے ساتھ فیض پر بھی منطبق ہو سکتا ہے۔

حکومت کیوں گریباں گیر ہو الخ

کی بات نہ تھی۔ ان کی شاعری کے ان اجزا میں جن میں بائیں بازو کے مسلک سے نظریاتی (IDEOLOGICAL) وابستگی نمایاں ہے اور جس نے ان کو لینن پرائز کا مستحق ٹھہرایا، شعریت ان کے لئے مقصود بالذات نہیں رہتی۔ اس شاعری کا تعلق بڑے عملی (PROGMATIC) مقاصد سے ہے جن کے لیے اور بہت سی چیزوں کی طرح شعریت اور شعر کے جمالیاتی پہلو کو قربان کر دینا بھی خسارے کا سودا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس شاعری میں پارٹی لائن کی بندش اتنی سخت ہے کہ کسی اجتہادِ فکر کی تلاش سعی لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ یہاں جو کچھ دارومدار ہے وہ نعرہ بازی پر ہوتا ہے اگر فکر و استدلال کی ضرورت پڑ ہی جائے تو دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے اس فراوانی سے دستیاب ہوتے ہیں کہ ذہن کو سوچنے کی زحمت میں مبتلا کرنا فعل عبث معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فیض کے ہم مشرب اردو کے دوسرے شعرا کے کلام پر نظر ڈالئے تو رومانیت اور شعریت کے اعتبار سے بھی ان کا کلام کئی ہم عصر شعرا کے مقابلے میں ذرا روکھا پھیکا نظر آئے گا۔ ساحر، مجاز، جاں نثار اور مخدوم کی شاعری میں جابجا فیض کے دھیمے محتاط استعارات و رموز کے بارے دبے ہوئے انداز تغزل کے مقابلے میں ایک زیادہ زندہ اور توانا رومانی لے ملتی ہے۔ فکری اعتبار سے بھی فیض کی شاعری میں تہہ داری کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ ان کے مطالعے اور مشاہدے کی وسعت مسلم سہی لیکن ان سے حاصل ہونے والے کسی مربوط نظام افکار کا سراغ ان کی شاعری میں نہیں ملتا۔ اس کی اساس چند رویوں یا میلانات (ATTITUDES) پر ہی قائم ہے جو ان فکری ماخذ سے مستعار ہیں جن سے انہوں نے انتساب فیض کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے نظریاتی پہلو کو ادبیت دینے والے شعرا مثلاً علی سردار جعفری۔ کیفی اعظمی اور مخدوم وغیرہ کے یہاں ایک سے زیادہ بار بطا اور ہم آہنگ (CONSISTENT) انداز فکر کی شہادتیں ملتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل تردید نظر آتی ہے کہ ان میں سے کوئی وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو فیض کو حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ترقی پسند شعرا میں فیض کی امتیازی حیثیت بڑی حد تک بیرونی پبلسٹی کی مرہون منت ہے جو بوجوہ خاص انھیں اپنے ملک سے زیادہ ہندوستان میں اور بعض بیرونی ملک میں حاصل ہوتی ہے۔ بظاہر اس کا تعلق ان کی ادبی حیثیت سے کم اور بین الاقوامی سیاست کے خم و پیچ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شاید کچھ ایسے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں جن پر ان کے ناقدوں اور پرستاروں نے کما حقہ توجہ صرف نہیں کی۔

ایک شاعر یا ادیب پر تنقید کے ضمن میں ذاتیات کو زیر بحث لانا مستحسن طریقہ نہیں معلوم ہوتا لیکن بیرونی دنیا میں فیض کا ایسا اور اس کا ان کی شاعرانہ حیثیت پر بالواسطہ اثر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ بعض ایسے عوامل کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے جو فیض کو ان کے موجودہ مقام تک پہونچانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی طبیعت اور مزاج کی نشوونما کا مطالعہ کرنے کے لئے ان کے ماحول۔ سماجی پس منظر اور ان روابط پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے جو ان کی شخصیت کی تکمیل میں کارفرما رہے ہیں۔ ان کا تعلق پنجاب کے متوسط طبقہ کے ایک مرفہ حال گھرانے سے ہے۔ تعلیمی امتیاز اور اس کے ثمرات۔ سرکاری ملازمت۔ سماجی رسوخ اور روابط کی بنا پر آزادی کے بعد حکمراں اور صاحب اقتدار طبقہ کی حیثیت سے ابھرا۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ان کی زندگی پر نظر ڈالئے تو کالج کی ابتدائی ملازمت کے بعد سرکار برطانیہ کی فوج میں کمیشن جنرلزم ایک۔ کالج کی سربراہی۔ بیرون ملک کے روابط۔ نیم سرکاری اداروں میں بااختیار مناصب کے حصول۔ درمیان میں قید و بند کے چند سالوں کے علاوہ بیرونی دوروں کے چند وقفے بھی گذرے۔ اپنے سارے کیریر میں ملکی حکومتوں اور ان کی آئینی بنیادوں سے وہ مسلسل منحرف رہے لیکن ان لوگوں کے ساتھ جو ہر دور میں حقیقی اقتدار پر قابض رہے۔ (نوکر شاہی کے بااختیار ارکان۔ بڑے زمیندار۔ سرمایہ دار اور ان سے وابستہ

سیاستدان) ان کے سماجی تعلقات و روابط میں کبھی بل نہیں پڑا۔ انسان دوستی کے ایک عمومی ادعا کے علاوہ انہوں نے اپنے ملک اور برصغیر کو درپیش مسائل سے بھی اغماض برتا ہے۔ یا تشبیہ و استعارہ۔ رمزیت و ایہام کی آڑ لے کر اپنے مافی الضمیر کو بیان کیا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری قانون اور حکومت کے احتساب کی زد میں نہ آسکی۔ اپنی نظریاتی شاعری میں بین الاقوامی پس منظر اور پروپیگنڈے کا ایک مخصوص زاویہ ملتا ہے جس کا تعلق وطن کے مسائل سے زیادہ سوویت یونین کی عالمی پالیسیوں سے ہے۔ انتہا یہ ہے کہ سرداد ئ سینا میں دو فلسطینی مقاصد کی حمایت بھی اسی کے حوالے سے کرتے ہیں۔ شاید یہ بھی وفاداری بشرط استواری ہی کا تقاضا ہے۔ دانش وروں۔ ادیبوں۔ صحافیوں کے حلقوں میں انھیں بھی ایک ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ مزاج کے اعتبار سے انہوں نے عوام کی سطح پر اترنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور شاید وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے جس سیاست میں قدم رکھا وہ ڈرائینگ روم یا بند کمروں کی سیاست تھی۔ جلسوں۔ جلوسوں۔ ریلیوں کی سیاست سے انھیں سروکار نہیں رہا۔ شعر و ادب میں قبولیت تمام (خصوصاً نوجوان طبقہ) میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بڑی مہارت سے وہ تمام ذرائع استعمال کئے جو حصول مقصد میں معاون ہو سکتے تھے۔ لیکن اپنی امتیازی شان کو ادب میں اسی طرح قائم رکھا جس طرح سوشل لائف میں انہوں نے اپنے "خواص پسند" (ELITIST) رجحان کے زیر اثر اپنی آن بنائی رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زندگی بھر رہن سہن۔ وضع و انداز۔ تعلقات و روابط کے سطح کی طرح ادب میں بھی ایک امتیازی حیثیت کو اپنا مطمح نظر بنائے رکھا۔ ان کی زندگی میں وہ نشیب و فراز نہیں ملتے جو ترقی پسند تحریک کے آغاز میں اشتراکی کوچہ گردوں کا مقدر بن گئے تھے۔ قید و بند کا تجربہ جوان کی شخصیت کا امیج بنانے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ انھیں کسی عوامی جد و جہد کے سلسلہ میں حاصل نہیں ہوا۔ راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں تاہنوز حقائق منظر عام پر نہیں آئے اس لئے اسکے بارے میں کچھ کہنا مناسب ہوگا لیکن یہ تو بدیہی بات ہے کہ انقلابی اقدام بھی کسی ہوشیار و محروم طبقوں کی خاطر اور انکی شرکت سے نہیں بلکہ چند فوجی اور سول افسروں۔ سیاست دانوں اور دانشوروں کے ہاتھوں ہی رونما ہوتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی زمام اختیار کن ہاتھوں میں رہتی۔ اس صاحب اختیار طبقے سے فیض کے خوش گوار روابط کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ بعض باخبر ذرائع کے مطابق انھیں دوران قید اور اسیری وہ سہولتیں حاصل رہیں جو اگر نیز کے دور حکومت میں حسرت اور ظفر علی خاں جیسے اسیران سیاست کو خواب میں بھی میسر نہ آسکتی تھیں۔ معاشی اعتبار سے بھی وہ کبھی نا آسودہ نہیں رہے اور بیرونی امداد کے علاوہ وہ بے کاری کے وقفوں میں بھی با اثر ارباب اقتدار کی عنایات سے بہرہ ور ہوتے رہے ہیں۔

اس مختصر جائزے سے اتنا تو واضح ہو سکتا ہے کہ جس انقلاب کا تصور فیض کی شاعری میں ابھرتا ہے وہ محض انسان دوستی۔ غریب اور پس ماندہ طبقات کی جد و جہد کی بار آوری کی صورت میں ظہور پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک جماعت، مشترک اغراض رکھنے والوں کے حلقہ (COTERIE) کے ہاتھوں ایک بین الاقوامی توسیعی پروگرام کی تکمیل کا ذریعہ ہی بن سکتا ہے۔ مارکس اور لینن کی تعلیمات اور کمیونسٹ مینی فیسٹو پر ایمان اور ایقان کتنا ہی محکم کیوں نہ ہو۔ عملاً وہ جن مقاصد کے داعی ہیں وہ روسی سیاست کے مالیہ رجحانات سے اس طرح وابستہ نظر آتے ہیں کہ ان کے بارے میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اس نقطہ نظر کے سیاسی مضمرات سے قطع نظر مجھے اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ ان مقاصد سے عملی زندگی میں انھیں کتنا ہی فائدہ پہونچا ہو یا پہونچنے کی توقع ہو مگر یہ ان کی شاعری کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوئے اور بتقاضائے سن و سال یا بربنائے مصلحت جس حد تک ان کی شاعری کا شبابی اور رومانی آہنگ مدہم ہوتا گیا اسی حد تک یہ سیاسی مقصد غالب

ہوتا گیا یہاں تک کہ ان کی شاعری ایک ایسے نقطہ پر پہنچ چکی ہے جس سے بازگشت ممکن نہیں۔ اس میں اگر کہیں 'سرودِ رفتہ' کی صدائے بازگشت سنائی دیتی بھی ہے تو اس نظریاتی شاعری سے ہم آہنگ نہیں ہوتی اور اگر اس میں مخصوص رموز و علائم کی مدد سے مقصدیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو تکلف اور ساختگی کا احساس ہوتا ہے۔

سطورِ بالا میں 'خلوص شاعرانہ' کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا شاعر کے اقوال و اعمال میں مطابقت تک محدود نہیں ہوتا اور اس کا فیصلہ اخلاقی بنیادوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ انقلاب پسند اور انسان دوستی کے مسلک کے ساتھ فیض کی وابستگی اور ان مقاصد سے وفاداری یہاں معرضِ بحث میں نہیں لائی جا سکتی۔ اس بارے میں فیصلہ کن شہادت صرف ان کے تخلیقی کارنامے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ شاعری کی اس شہادت کے مقابلے میں شاعر کی مخصوص مقاصد سے وابستگی یا ان کے بارے میں اس کے متضاد رویے کا سوال اٹھانا غیر متعلق اور بے محل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ غالب کی آزادہ روی اور ان کے موحدانہ اور عارفانہ ادعائے شنویت (DICHOTOMY) یا جوش کے جاگیردارانہ مزاج اور ادعائے انقلاب پسندی کا تضاد ان شعرا کی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کی بنیاد بن سکتا ہے لیکن شعر کی حدود میں ان امور کا فیصلہ صرف اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ شاعر اس فکری یا جذباتی میلان کا حق ادا کر سکا ہے یا نہیں جس کا دعویٰ وہ اپنی شعری تخلیقات میں کرتا ہے۔ فیض کی شاعری کے مطالعے کے مایوس کن تاثر میں (جس کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے) یہی پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ ان کی وہ شعری تخلیقات جو ذوقِ شعر کو متاثر کر سکتی ہیں (ان کی بعض غزلوں کے اشعار، رومانی اور جذباتی نظمیں) اس شاعرانہ خلوص کی آئینہ دار نظر آتی ہیں لیکن وہ نظمیں جن میں وہ ایک موقف اختیار کر کے ایک بلند مقام سے قاری سے خطاب کرتے ہیں یا اپنے حقیقی چہرے پر ایک نقاب سجا کر سامنے آتے ہیں وہ شاعری نہ یقین آفریں معلوم ہوتی ہے اور نہ قاری کے ذوق کو اس طرح متاثر کرتی ہے جس طرح ان کے اوائل شباب کی نسبتاً ناپختہ رومانی شاعری کر سکتی ہے اور یہ فرق فن کار اور شاعرانہ خلوص کے مختلف مدارج پر مبنی ہے۔ اپنے مسلک فکر میں ان کی راسخ الاعتقادی مسلم سہی لیکن فنی اعتبار سے ان کی وہ شعری تخلیقات جو اس مسلک کی ترجمانی کے لیے وقف رہتی ہیں عقیدے کی استقامت اور اس سے مخلصانہ وابستگی کی کافی شہادت فراہم نہیں کر سکتیں اور مجھے اپنے اس دعوے میں کسی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ فیض اپنے جس کلام کی بدولت زندہ رہیں گے وہ ترقی پسندی اور انقلاب دوستی کی ترجمان نہیں بلکہ ایک تخیل پرست۔ جذباتی۔ پرستارِ حسن فطرت و جمالِ انسانی۔ رندِ مشرب۔ آزادہ رو رومانی شاعر کے قلبی واردات کا اظہار ہے۔

بیادِ والدۂ ماجدہ

عبدالعزیز خالد

اے دیارِ راول و اے خطۂ برّی امام!
آسماں تیری زمیں کو جُھک کے کرتا ہے سلام

یہ زمینِ سرفراز و سربلند و ارجمند
جس کا نم، جس کی نمو، ممنونِ کاساتِ کرام

کیوں نہ اس کے سامنے خم ہو سپہرِ لاجورد؟
کیوں نہ اس پر بارشِ انوارِ سرمد ہو مدام؟

وہ قرارِ خاطرِ رنجور و جانِ ناصبور
اس کے پہلو میں ہے محوِ راحتِ خوابِ دوام

جس کی آغوشِ محبت میں کھُلیں آنکھیں مری
مجھ سے کرتی تھی زباں جس کی نگاہوں سے کلام

عشرتیں دُنیا جہاں کی جس کے قدموں پر نثار
آنسوئے عرشِ بریں جس شاہ بانو کا مقام

دلفریب و دلربا و دلنواز و دلکشا
بدر تھی خورشید تھی یا صبح وہ آئینہ فام؟

جس کے روئے گندمیں پہ آتشِ گُل کی دمک
گھولے رس کانوں میں جس کا دلکش و دلدار نام

طاہر و عاطر نسیمِ نو بہاراں کی طرح
دستِ قدرت نے اٹھایا جس کا نکہت سے قوام

تھی جو میرے واسطے افلاک کے سائے تلے
سایۂ پروردگار و رحمتِ ربِّ انام

وہ سراپا ناز تھی میں نازبرداروں میں تھا
کیا بتاؤں؛ آہ مِنْ قَلْبِیْ وَمِنْ حَرِّ الْغَرَام!

زندہ تھی تو دل میں رہتا تھا ہجومِ شوقِ دید
اس سے ملنے کو میں کرتا کیسے کیسے اہتمام!

قوتِ تسخیر جس کے پیار کی تھی بے پناہ
جس کا پیغامِ عمل تھا: بَیْنَکُمْ اَفْشُوا السَّلام!

عقل میں فرہنگ و دانائی میں فرد و منفرد
جس سے فہم و آگہی ہمسائیاں لیتی تھیں وام

نخلِ حُب کی آبیاری خونِ مژگاں سے کرے
رو کے امواجِ بلا کو جس کی تاثیرِ کلام

مثلِ ہم چشموں کے پابندِ روایات و رسوم
دل کی گہرائی سے مدّاحِ بزرگانِ عِظام

ذکر تھا جس کا وظیفہ، ذکر تھا جس کی غذا
ہر مہینہ سال کا جس کے لیے ماہِ صیام

آنسوؤں سے پلکیں تر، آواز بھرّائی ہوئی
رکھے ہر دم وقفِ پیچ و تابِ قلبِ مُستہام

ایک دن ناغہ نہ کی جس نے تلاوت صبح کی
کاربندِ اُذْکُرُوا فِی اللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیام!

شکوۂ بے مہریٔ دوراں سے نا آلودہ لب
دی نہ دستِ نفس میں جس نے کبھی دل کی زمام

قلب تھا اس کا صبور، اس کی طبیعت تھی غیور
چہرۂ بیجادہ فام، آئینۂ ایمانِ تام

پوچھتی تھی حال میرا نجمِ شب بیدار سے
اس کے معمولات میں تھا آخرِ شب کا قیام

پاک مرشدؒ کی ارادت میں، گدازِ عشق نے
اس کو بخشا تھا بطورِ خاص قلبِ لائینام

وہ کہ میرے واسطے ہر دم سراپا انتظار
جس کو سیرابی کے عالم میں بھی دیکھا تشنہ کام

جس کے لب ہر دم دعا میرے لیے کرتے رہے
جز مری باتوں کے جیسے ہو نہ اس کو کوئی کام

عمر جس کی بیشتر محنت مشقت میں کٹی
باوجودِ تنگدستی خوش مذاق و شاد کام

زیبِ تن اس کے ہمیشہ سادہ و ساتر لباس
ہُوبہو تصویرِ پُر توقیرِ حُورانِ خیام

خال و خد پر انعکاس اس کے سکونِ قلب کا
گیسوئے مشکین و طلعت — آیۂ نور و ظلام

ہلکے ہلکے گنگنانا شب کو چکی پیستے
پھر بلونا دُودھ کا، پٹانا گھر کے کاج کام

کیسے لفظوں میں ابھاروں وہ مناظر گاؤں کے
وہ ترنجن ہیں نہ پنگھٹ ہیں وہ آنگن ہیں نہ بام

جب اُتر کر آسماں سے چاندنی کرتی ہے کھیت
قالبِ خوباں میں ڈھل جاتا ہے جب ماہِ تمام

جگنوؤں کی روشنی برکھا کی بھیگی رات میں
خیرہ آنکھوں کو کرے جب برقِ تیغِ بے نیام

قصّے ان بانکوں کے رُومانوں کے ہوں کیونکر بیاں
جن کے زیرِ ران اسپِ تازیِ سیمیں ستام

بھر جوانی اٹھڑوں کی لہر پہ آئی ہوئی
بے محابا بے جھجک لیکن امینِ ننگ و نام

عزت ان دھی رانیوں کی سب کا سانجھا مسئلہ
ڈال دے چنگاری بھُس میں، ایک حرفِ اتہام

مانو، کر سکتا ہے خوفِ بازدپرس و احتساب
انسدادِ ہر خرابی، ہر بدی کی روک تھام!

چوڑیوں کی چھن چھنن، کومل ہنسی کی کھن کھنن
وہ غریبی کا تموّل، سادگی کا احتشام!

وہ رنگیلی چُنریاں پھولوں پہ جیسے تتلیاں
دن کو نظارہ بنات النعش کا بالائے بام

گندلیں سرسوں کی شرمائیں لچکتے ڈیل سے
نیل گایوں کو کرے محجوب بے پروا خرام

رس بھرے گلنار ہونٹوں پر رسیلے دو ہڑے
ہیر، سسّی، صاحباں، دو جو بھی چاہو ان کو نام

ہان مٹیاروں کا وہ اڈی چھپڑ پا کھیلنا
اور کرنا خند خنداں رازدارانہ کلام

حدتِ خوں سے بھبھوکا چہرے چھلکائیں شراب
وہ کنکے کندن کی طرح سوزِ دروں سے سیم خام

اس طرح زیر و زبر سانسوں سے مخروطی ابھار
جیسے پیڑوں پر ہوائے تیز سے ہلتے ہیں آم

ڈھولکیں بجتی ہیں پازیبیں چھنکتی ہیں مگر
اس نظارے کو نہیں ہے دیکھنے کا اذنِ عام

سرکش و بالا بلند و نازک و نازو ملوک
ان قیامت قامتوں کو کون کر سکتا ہے رام؟

وہ مزاروں پر چڑھاوے، وہ براتوں کی بہار
میلوں ٹھیلوں کے وہ ٹھٹھ، وہ شادیوں کی دھوم دھام

ہرنیوں کی ڈاریں، غٹ پریوں کے، ہنسوں کی قطار
بال ریشم سے ملایم جن کے تن سنگِ رُخام

مجھ سے بھی کرتی تھیں اکثر ہنس کے جو فرمائشیں:
"پھڑ کتاب اڑیا! سُنا یوسف زلیخا کا کلام"!

جن کی آنکھوں میں فسانے، جن کے ہونٹوں پر فسوں
بھیجتا ہوں میں سلام اُن حُسن آراؤں کے نام!

ٹھیلنا ستلج میں وہ سرکنڈے لانے کے لیے
یخ دسمبر کے وہ جاڑے وہ لبِ پُر ابتسام!

ریت پر چلنا برہنہ پا وہ تپتی دھوپ میں
جب پسینے کی جگہ لاوا اُگلتے ہیں مسام

ڈولیاں مخصوص تھیں بس نوعروسوں کے لیے
باقیوں کے پاؤں تھے رہوار، ٹانگیں تام جھام

رانجھڑوں کی بنسیاں ہیروں کی لگنے دیں نہ آنکھ
کیلیں رادھاؤں کو الغوزوں کی گونجاروں سے شیام

گوردواروں میں رسنگت کیرتن، جپ جی کا پاٹھ،
مسجدوں میں اللہ اللہ، مندروں میں رام رام

صبحدم گندم کے کھیتوں میں بٹیرے جال جال
تُوت کے پیڑوں تلے سیار تنکیر زیرِ دام

آج تک اس گدگداہٹ کا مزہ ہاتھوں میں ہے
دوہنے سے قبل پسیانا تھنوں کا وقتِ شام

یہی روٹی بھور کر مکّی کی، چاٹی چاٹنا
سامنے اس عیش کے بے کیف شاہانہ طعام

سرگی ویلے کے پراٹھے گاڑھے اودھ ڑکے کے ساتھ
پنّیاں السی کی جاڑوں میں مع پستہ، بدام

اور جب پٹھے کُرتے میری انگلی کٹ گئی
اس کا لینا دوڑ کر آغوش میں "اے جانِ مام"!

وہ ہمارا گاؤں بھی کیا ہی انوکھا گاؤں تھا
ہمسرِ شیراز و بغداد و دمشق و بلگرام

پرجیاں سے کوٹ شاکر کے سفر کا ماجرا
بھوک، بارش، خوف، دارو گیر، کیمپوں کا قیام

وہ نہ گرڈھارس بندھاتی ہر بزرگ و خورد کی
جان لیوا تجربہ تھی ہجرت دارالسلام

مادرِ نوری نہادِ خالدِ عبدالعزیز
زوجۂ شاہِ محمدؐ، فاطمہ تھا جس کا نام

سائرہ کی خواہرِ فرخندہ، بنتِ رابعہ
دُخترِ دلبند محمد اکبرِ ذی احترام

جس کے بیٹے ہیں مجیدِ شاہد و صوفی حمید
بیٹیاں جس کی حمیدہ، زاہدہ ریحاں مشام

اس کی خدمت پر میں اکساتا تھا ان کو دمبدم
"وقت ہے کم عجّلوا الاغتنام الاغتنام"!

وہ تھی گھر کی مالکہ ہم ننھے مُنّے اس کی فوج
رُوکھی سُوکھی کھا کے خوش رہتے، خدا کا لیتے نام

وہ امورِ خانہ داری میں تھی طاق و چُست و چاق
گاؤں بھر میں تھی نہ اور ایسی زنِ خوش انتظام

اس طرح کرتی وہ اس مٹیالے گھر کی دیکھ بھال
جیسے ملکائیں کریں ملکوں کا اپنے انصرام

کس طرح اس نے سنبھالا صورتِ احوال کو
مدرسے سے لے گئی جبراً جب ابّا جی کو لام

لوٹ کر جب ان پہ طاری خود فراموشی ہوئی
کس طرح اس نے گزارے وہ ستمگر صبح و شام!

میری ماں جی، میری امّی جان، میری والدہ
میری بی بی جس کا بی بی پاکدامن عرفِ عام

جس نے میری نوکری لگتے ہی مجھ سے یہ کہا:
"سُن مرے نورِ نظر! لاخیرَ فی کسبِ الحرام!

جو بھی جوہر تجھ کو بخشا ہے خدائے پاک نے
کر اسے صیقل برائے سُود و بہبودِ عوام

زمزمہ ہائے ثنا کو دشنۂ قاتل سمجھ
حرفِ شیریں کو ہلاہل جان، فرشِ گُل کو دام

شاہِ بطحاؐ کی محبت تجھ کو گھُٹّی میں ملی
تو ہُوا پیدا پئے مدّاحیٔ خیر الانامؐ

شانِ استغنائے فن کی کچھ خبر ان کو نہیں
تجھ سے رکھتے ہیں جو چشمِ مدحتِ کسریٰ و سام!"

کشف کے عالم میں اکثر اس ولیہؒ نے دیا
مجھ میں جو شاعر ہے اس کو مژدۂ عمرِ دوام:

"ایک دن ہو گی تری مُزدِ محبت بار ور
ایک دن ہو گا تجھے حاصل قبولِ خاص و عام

ایک دن ہو گا لقب تیرا خُداوندِ سخن
اعتبارِ شعر ٹھہرے گا ترا رنگِ کلام

دادرِ اقلیمِ دانش تو بنے گا ایک دن
اے خجستہ نغمہ گستر اے ہمامِ ابنِ ہمام!

کشورِ لوح و قلم ہو گی ترے زیرِ نگیں
ذات ہو گی تیری زندہ رودِ فیضِ مستدام

تُو ہے، جب تک تُو زمانے پر عیاں ہوتا نہیں
شیرِ غاب اندر کُنام و آفتاب اندر غمام!

ایک دن مثلِ ادھم ہو گا مفاتیح العلوم
معترف ہوں گے ترے روس و فرانس و روم و شام

انقلابِ چرخِ پُر نیرنگ سے محفوظ کون ؟ کون ہے دُنیا میں بے افکار و آلام و سقام؟
جانِ مادر ! رزق کا کرتی ہے جانے کس طرح ربِّ دانا و توانا کی مشیّت انقسام؟
حق ترا پیدا کُنی آزادیِ فکر و بیاں کچھ بھی ہو کذب و تقیّہ سے کبھی لینا نہ کام
فرضِ فن ، سچ دیکھنا سچ سوچنا سچ بولنا اور بننا تختۂ مشقِ بلیّات و مُہام
کام لے اپنے قلم سے بے درنگ و بے دریغ ہے قلم قلعہ ترا ، تیری زِرہ ، تیری حُسام
اپنے امکاں کو بروئے کار لانے کے لیے کر بقدرِ وسعت و توفیق سعی و اہتمام
ہے غلامی کا قبالہ نسبتِ ہر ما سوا ہو نہ مردِ حُر کبھی گرویدۂ دینار و دام
استقامت کو ریاضت کو یقیں و شوق کو آج تک دیکھا کسی نے نامراد و بے مَرام؟
دستگیری کی توقع ہے نپٹ ناحاصلی ہر مقامِ عظمت و اعزاز ہے صعب المرام
اُن کے خُبثِ نفس سے حکمت سے بچنا چاہیے اکثریّت ہے بنی آدم کی ابنائے لِئام
یاد رکھ اَلنَّاسُ اَخْیَافٌ وَشَتّٰی فِی الشِّیَمْ ازدحام ان کا ہو اکثر باعثِ بؤس و زحام
مکر و سازش سے کبھی ، شور و خموشی سے کبھی لے بڑائی سے حسد کی کینہ توزی انتقام
ہے چلن دنیا میں بے انصافی و بیداد کا دیدنی ہے جا بجا آویزشِ باز و حَمام !
اس کے درسِ عصمت و عصیاں نے سمجھایا مجھے کیا وظیفہ تیغ کا ہے اور کیا فعلِ نیام
دَیر کو مسجد بنائیں اور منبر دار کو ہو جن اہلِ جذب کا حبل المتیں سے اعتصام
دیکھ کر مردِ سبک سر کی خفیف الحرکتی پھبتی کستے ہیں : ہُوا لو مینڈکی کو بھی زکام !
میری صبحِ زندگی کی اس کے مطلع سے نمود قائم اس کے دم سے میرے بُرجِ طالع کا نظام
اس کے دل کا میں سرور اور اس کی آنکھوں کا میں نور میں ندیم اس کا ، میں اُس کا ہم نفس ، اس کا غلام !
بے تکلف تھا مگر آدابِ فرزندی کے ساتھ محرمی کیا ہے ؟ فقط حفظِ حدودِ احترام !
ڈھل گئی ظلماتِ شب میں دیکھتے ہی دیکھتے اس شفق اندام کی ضو گستر و ضو پوش شام
اس رباطِ رنگ و بُو ، اس بزمِ ہست و بُود میں مختصر تھا کس قدر اس جادہ پیما کا قیام
گرمیٔ رفتار کا احساس بھی ہوتا نہیں اشہبِ چالاکِ روز و شب ہے کتنا تیز گام !

گرچہ ناممکن ہے پھر بھی ہے تمنّا و دُعا
ہر کسی کی: "رَبِّ اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَام"!

نوبہارِ عمر ہو خالد کہ پائیزِ حیات
نیشِ غم بے اندمال و زخمِ دل بے التیام

جانے والے لوٹ کر دنیا میں پھر آتے نہیں
قبر سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی واعظ، لاکلام!

رُوح جب ہوتی ہے رخصت تنگنائے جسم سے
کرب و حسرت کا وہ منظر، کپکپی کا وہ مقام! ۱۱۰

نارسا نکلی فغانِ صبحگاہی بھی مری
ہو سکی اس سے نہ مرگِ خانہ ویراں سازرام

بخشوانا دُودھ کی دھاروں کا لازم تھا مگر
کر سکا میں اپنی غفلت سے نہ اس کا التزام

ہائے وہ لہریں کہ جا کر جو پلٹ سکتی نہیں
ہے حکایت زیست کی رُوداد سعیِ ناتمام

میں کسی صورت بھی قرض اس کا چُکا سکتا نہیں
مامتا کی کوئی قیمت؟ دل دہی کے کوئی دام؟

اب ملاقات اس سے ہو گی حشر کے میدان میں
تُربتیں جب ہوں گی شق، سُبْحَانَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَام!

اس حکایت کے لیے تو ایک دفتر چاہیے
توسنِ طبعِ رواں کو کس طرح دُوں میں لگام؟

صاحبِ لوح و قلم ہُوں میں محاذِ علم پر
اور میدانِ عمل میں صاحبِ سیف و سہام

خام ہے تعلیم میری، پُرخلل میرا عمل
بخت نافرجام میرا، عقل میری ناتمام

ہوں میں لفظوں کو برتنے کے ہُنر سے نابلد
ادّعا تکمیلِ فن کا سر بسر سودائے خام

حرف کا مفہوم سے ہوتا ہے کیسے اتّصال؟ ۱۲۰
فکر کا احساس میں ہوتا ہے کیسے انضمام؟

ہو ابد کے قصرِ حیرت کے در و دیوار پر
فن کے زندہ نقش کا کس مُو قلم سے ارتسام؟

ہو نہیں سکتا جدید و کُہنہ کا کیا اجتماع؟
اُٹھ نہیں سکتی نئی بنیاد کیا بے انہدام؟

کر سکوں اس کی ثنا کا کاش کے حق میں ادا
ہے جو موضوعِ کتابِ سیرتِ ابنِ ہشام!

ہے ہر اک قانون سے آزاد از خود رفتگی
بندۂ بیخود نہ ہو مستوجبِ زجر و ملام

روح اس کی مجھ سے رکھتی ہے برابر رابطہ
یاد اس کی مجھ سے رہتی ہے برابر ہمکلام

ہمسفر میری، مری دمساز مادامُ الحیات
لائے ہر شب ہر سحر بادِ شمال اس کا پیام

بے کنار و تازہ کار و نَو بنَو ہے زندگی
کون کہتا ہے اجل کو زندگی کا اختتام؟

جب سے یہ دنیا بنی ہے تب سے ہا ہا کار ہے
دن ہیں اس دنیائے فانی کے قریب الاختتام

مجھ کو بھی ہونا پڑا تیری کشش کا معترف — اے دیارِ راول و اے خطۂ برّی امام!
آئی پنڈی میں ترے اندر سمانے کے لیے — گلزمینِ ہیر پُر تمکیں سے وہ زیبا خرام
ساتھ اپنے لے گئی وہ خاک میں وا حسرتا! — حسرتِ طوفِ مزارِ اقدس و بیت الحرام
اپنی ہستی کا مدار و محور اس کو میں کہوں — کون ہو سکتا ہے اس بے مثل کا قائم مقام؟
کلبۂ احزاں ہے اب کاشانۂ فرحت مجھے — دل بھر آئے جھنگ جانے کا جو لوں بھولے سے نام
والدِ مرحوم کے ہمراہ باغِ عدن میں — سرخوشِ سُور و حبور، اِنّی رَاَیتُ فِی المَنَام
نوشِ جاں کرتے ہیں دونوں جنّت الفردوس میں — وہ مئے ناب و مروّق مشک ہے جس کا ختام
ہو مبارک ان کو پیمانے بہشتِ جاوداں — جذا تِلکَ الخِیَامُ! جذا کاسُ المدام!
نعمت و انعامِ ربِّ منعم و منّان ہیں — والدینِ پاکباز و خوش خصال و نیک نام
آہ یہ ناقابلِ برداشت اندوہِ فراق — ہو تسلّی یاب کیسے میکشِ آتش بجام؟
دل رہے ہر چاہنے والے کا آتش زیر پا — ہو وہ مثلِ حیّ بنِ یقظان، حیّ لا ینام!
تیری مٹی کیمیا، عیسیٰ نفس آب و ہوا — اے دیارِ راول و اے خطۂ برّی امام!
ہے ترے سینے میں جو گنجینۂ گوہر نہاں — تا ابد ہے وہ مصوّن دستبردِ دیو و دام
آنکھ میری اشکبار اس کے لیے دل بیقرار — رویاں رویاں میرے تن کا اس کو کرتا ہے سلام
نقش ہے لوحِ دلِ خالد پہ اس کی بات بات — نام لیوا جس کا ہے یہ شاعرِ آشفتہ کام

اس کے مرقد پر کھڑا رو رو کے کرتا ہوں صدا!
میں حجازی لے میں: "قُم قُم یَا حَبِیبِی کَم تَنَام؟"

فیض احمد فیض

○

کس خواب گاہِ ناز کی جانب رواں ہے آج
ہے شمعِ ماہتاب کی کچھ لَو بڑھی ہُوئی
کس قتل گہ سے کس کا لہو پی کے آگیا
ہیں آج آفتاب کی آنکھیں چڑھی ہُوئی

○

اِدھر نہ دیکھو

فیض احمد فیض

اِدھر نہ دیکھو
کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمت کے مدعی تھے
اب اُن کے ہاتھوں میں
صدق و ایماں کی آزمودہ پُرانی تلوار مُڑ گئی ہے
اِدھر نہ دیکھو
جو کج کُلہ صاحبِ حشم تھے
جو اہلِ دستار محترم تھے
ہوس کے پُر پیچ راستوں میں
کُلہ کسی نے گرو رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے
اُدھر بھی دیکھو
جو اپنے رخشاں لہو کے دینار
مفت بازار میں لُٹا کر
لحد میں اس وقت تک غنی ہیں
اُدھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے اوجھل ہوئے
اور اہلِ جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں (نبی)

○

غزل

احمد ندیم قاسمی

کسی لاعلاج رجائی نے یہ خبر چمن میں اُڑائی ہے
کوئی پتہ جب نہ ہو پیڑ پر، تو سمجھ لو، فصلِ گُل آئی ہے

کوئی اشتراک ضرور ہے، وہ ہو رنگ کا کہ اُمنگ کا
مرا دل بھی تو گلِ سُرخ ہے، ترا ہاتھ بھی تو حنائی ہے

وہ کشش کچھ اور ہی چیز ہے جسے حُسن کہتے ہیں اہلِ دل
نہ جمالِ عارض و چشم و لب، نہ کمالِ چست قبائی ہے

سفرِ حیات کے موڑ پر مجھے تُو ملا کہ خُدا ملا
یہی مرا کعبۂ جُستجو، یہی میری حدِ رسائی ہے

میں جُھکوں تو چاند جُھکا رہے، میں رُکوں تو وقت رُکا رہے
میں تری وفا کا جب اہل ہوں، مرے بس میں ساری خدائی ہے

میں ندیمؔ قریۂ سیم و زر سے بھی سرکشیدہ گزر گیا
جو مری انا کا غرور ہے، مری عمر بھر کی کمائی ہے

○

غزل

احمد ندیم قاسمی

مجھے دُکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پر و بال ہیں
مرے ہمسفر! نہ ملول ہو، یہ ملال میرے ملال ہیں

مری بے کلی سے خفا نہ ہو، مری جستجو کا بھرم نہ کھو
تجھے اِک جواب وبال ہے، مرے لب پہ لاکھ سوال ہیں

وہ تھی اِک لکیر سی آبجو، یہ ہے چار سُو کی فضا سے ہُو
وہ گھڑی تھی تیرے وصال کی، یہ فراق کے مہ و سال ہیں

یہ عجیب حُسنِ قیاس ہے، کہ جو دُور ہے وہی پاس ہے
یہ تصوّرات کے واہمے مرے دشتِ غم کے غزال ہیں

یہ جو عرصہ گاہِ خیال ہے، ترا فن ہے تیرا جمال ہے
مرے شعر ہوں کہ ادب مرا، یہ سبھی ترے خد و خال ہیں

یہ عجیب طرح کا تضاد ہے، یہ دل و نظر کا فساد ہے
مرے تجربے ہیں کمال پر، مرے درد رُو بہ زوال ہیں

⊙

غزل

معین احسن جذبی

امید و بیم کے گیسو سنوارتے ہی رہے
کسی طرح شبِ ہجراں گزارتے ہی رہے

جنوں کی راہ الگ تھی مگر خرد والے
ہر ایک گام پہ ہم کو پکارتے ہی رہے

خبر نہیں اُنھیں اہلِ جہاں نے کیا بخشا
رہِ طلب میں جو دامن پسارتے ہی رہے

فروغِ بادہ سے خیرہ تھی اِک جہاں کی نظر
یہ اہلِ ہوش مگر جی کو مارتے ہی رہے

دل و جگر میں رہا ایک قطرۂ خُوں جب تک
چمن پرست چمن کو نکھارتے ہی رہے

فسردگی تو نہ تھی بے سبب مگر جذبی
ہم اپنے ڈوبتے دل کو اُبھارتے ہی رہے

○

غزل

جذبی

ہمارا نالۂ شب کامیاب ہے کہ نہیں
کہیں فضا میں کوئی پیچ و تاب ہے کہ نہیں

یہ دل شکستہ سہی، بینوا سہی، پھر بھی
حریفِ چنگ و جوابِ رباب ہے کہ نہیں

اِن آنسوؤں میں ہمارے، خدا معاف کرے
ملامتِ ستمِ بے حساب ہے کہ نہیں

ہماری ہرزہ سرائی بُری سہی، لیکن
صحیفۂ غمِ دوراں کا باب ہے کہ نہیں

پسِ نقاب بتا دے گا یہ جبیں کا عرق
ہمارا سوزِ نظر باریاب ہے کہ نہیں

کسے پڑی ہے کہ پُوچھے یہ تشنہ کاموں سے
کہ خمکدے میں تمھارے شراب ہے کہ نہیں

وہ تیرگی ہے کہ اکثر خیال آتا ہے
مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں

یہ زندگی جو بسر ہو رہی ہے اے جذبی
خدا ملے تو یہ پُوچھوں عذاب ہے کہ نہیں

○

دستک

ادا جعفری

اب تو وہ بھی بھول چکی ہے
دروازے کے آگے
جانے کب سے کھڑی ہے
جگ بیتے
یا صدیاں گزریں
دستک دیتے دیتے
ہاتھوں کی ہر پور ہے زخمی
اور ہتھیلی لال گلابوں جیسی
ہاتھ میں جتنی ریکھائیں تھیں
اتنی کرنیں پھوٹ رہی ہیں
جوگن بھی ہے بیراگن بھی
رُوپ سروپ سہاگن جیسا
وہ تو یہ بھی بھول چکی ہے
دستک کس نے دی تھی!

○

غزل

ادا جعفری

عالم ہی اور تھا جو شناسائیوں میں تھا
جو دیپ تھا وہ اپنی ہی پرچھائیوں میں تھا

وہ بے پناہ خوف جو تنہائیوں میں تھا
دل کی تمام انجمن آرائیوں میں تھا

اک لمحۂ فسوں نے جلایا تھا جو دیا
پھر عمر بھر خیال کی رعنائیوں میں تھا

اک خوابگوں سی دھوپ تھی زخموں کی آنچ میں
اک سائباں سا درد کی پُروائیوں میں تھا

دل کو بھی اک جراحتِ دل نے عطا کیا
یہ حوصلہ کہ اپنے تماشائیوں میں تھا

کٹتا کہاں طویل تھا راتوں کا سلسلہ
سورج مری نگاہ کی سچائیوں میں تھا

اپنی گلی میں کیوں نہ کسی کو وہ مل سکا
جو اعتماد بادیہ پیمائیوں میں تھا

اس عہدِ خود سپاس کا پوچھو ہو ماجرا
معروف آپ اپنی پذیرائیوں میں تھا

اس کے حضور شکر بھی آساں نہیں ادا
وہ جو قریبِ جاں مری تنہائیوں میں تھا

غزل

ادا جعفری

اندھیری راہ میں مسافر کہیں نہ بھٹکا تھا
کسی منڈیر پہ جب تک چراغ جلتا تھا

وہ کتنی دُور رہا فیصلہ بھی اس کا تھا
مجھے تو قرب کے احساس نے سنبھالا تھا

یہی غبارِ شب و روز کا کمال بھی ہے
جو آنکھ دیکھ نہ پائی وہ دل نے دیکھا تھا

سفر تمام ہوا اور حیرتیں نہ گئیں
جو قربتیں تھیں وہاں فاصلہ بلا کا تھا

چراغ ہاتھ میں تھامے ہُوئے تھا اک لمحہ
مرے قریب اندھیرا بھی اُجلا اُجلا تھا

نہ جانے لوگ کہاں تھے، زمانہ تھا کہ نہیں
زمیں پہ میں تھی فلک پر بس اک ستارا تھا

یہی خطا کہ پجارن تھی اور نہ دیوی تھی
بڑی خطا تھی کہ خود کو بھی میں نے چاہا تھا

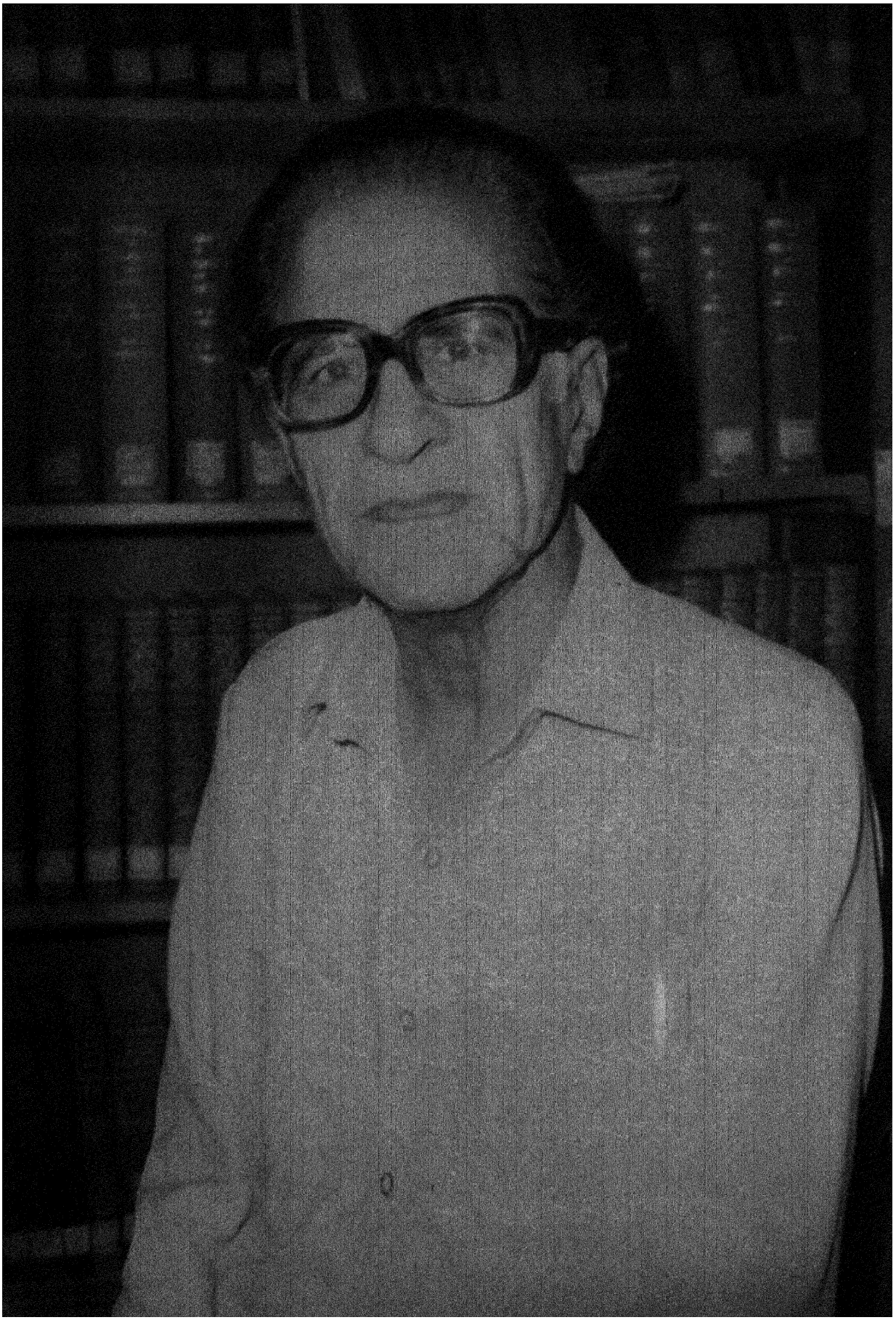
جو اذن ہو تو میں کچھ دیر اپنے پاس رہوں
کہا نہیں تھا یہ، بس یونہی دل نے سوچا تھا

نہ آستاں نہ کوئی بام و در ہی جی کو لگے
چلن سدا سے یہی سرپھری ہوا کا تھا

بہت حسیں، بڑی دلنشیں حقیقت ہے
جو تشنہ لب تھا وہی اعتبارِ دریا تھا

پھر اس کے بعد ادا کوئی شب نہیں آئی
بس ایک نام بیاضِ سحر میں لکھا تھا

○



غزل

غلام ربانی تاباں

کوئی دیوار تو ہو گی ، کوئی در تو ہو گا
بے ٹھکانوں کا بھی آخر کہیں گھر تو ہو گا

دشت سے عیش فراواں کا تقاضا ہے کسے
سر چھپانے کے لیے کوئی شجر تو ہو گا

چار تنکوں کی کسے فکر رہیں یا نہ رہیں
صحنِ گلشن میں مگر رقص شرر تو ہو گا

اگلے وقتوں سے مگر رسم چلی آتی ہے
شوق میں جی کا زیاں جاں کا ضرر تو ہو گا

اور کیا دامنِ صحرا میں ہے وسعت کے سوا
کوئی منظر سہی تا حدِ نظر تو ہو گا

اب اسے درد سے تعبیر کرو یا نہ کرو
زخم پھر زخم ہے کچھ دل پہ اثر تو ہو گا

کل بھی کم ہو گی نہ یاروں کی عنایت تاباں
میں نہیں ہوں گا یہاں میرا ہنر تو ہو گا

○

غزل

تاباں

سنگ و خشت کو تاباں بام و در نہیں کہتے
ربطِ غم نہ ہو جس سے اُس کو گھر نہیں کہتے

دل سے چھین لیں جس نے لذتیں جراحت کی
اُس کو جو بھی کہتے ہوں درگزر نہیں کہتے

بات صرف اتنی ہے زندگی کی راہوں میں
ساتھ چلنے والوں کو ہم سفر نہیں کہتے

کوئی کیسے سمجھائے سادہ دل اسیروں کو
بال و پر کی حسرت کو بال و پر نہیں کہتے

نخلِ دل کی شادابی اک سراب کا عالم
دشت کو بہاروں کی رہگزر نہیں کہتے

زندگی کا ہر منظر دلفریب و دلکش ہے
جان کے ضرر کو بھی ہم ضرر نہیں کہتے

سب چراغ بستی کے اونگھنے لگے تاباں
وہ کوئی کہانی ہو رات بھر نہیں کہتے

○

غزل

تاباں

ہدفِ طنز کہ میں موردِ دشنام نہیں
پھر بھی خوش ہوں کہ ترے شہر میں گمنام نہیں

دل گزرگاہ خزاں ہے نہ گزرگاہ بہار
ایک بے تاب سکوں جس کا کوئی نام نہیں

اس حقیقت پہ فسانے کا گماں ہوتا ہے
میکشی عام ہے اور تشنہ لبی عام نہیں

اتنا آسان نہیں میرا مٹانا ظالم
مکر و احساس بھی ہوں صرف میں اک نام نہیں

اہلِ اُلفت کو زمانے سے شکایت کیوں ہو
درد پھر درد ہے تہمت نہیں الزام نہیں

بات بھی کرتے ہیں فطرت کے مناظر تاباںؔ
چاندنی کیا ہے اگر چاند کا پیغام نہیں

○

غزل

تاباں

خود نما تو کیا کہیے خود شکن سی ہوتی ہے
زندگی کہ خوابوں کی انجمن سی ہوتی ہے

ہم بھی ڈھونڈ ہی لیتے گوشۂ اماں کوئی
قید کے تصور سے اک گھٹن سی ہوتی ہے

لوگ بے زبانی کو درد کی زباں سمجھے
ورنہ دل کی بے تابی کم سخن سی ہوتی ہے

زندگی کا ہر منظر اجنبی سا لگتا ہے
اب نظر کہیں جائے بے وطن سی ہوتی ہے

دلنواز ہیں کتنی موسمی ہوائیں بھی
نرم نرم جھونکوں میں اک چبھن سی ہوتی ہے

حرفِ مدعا تاباںؔ جب بھی لب پہ آتا ہے
دیر تک نجانے کیوں کچھ جلن سی ہوتی ہے

○

غزل

تاباں

بے رُخی بے اعتنائی کا گلا لے جائیگی
بزمِ گل سے اور کیا بادِ صبا لے جائیگی

دوست بن کے دل میں آئی تھی سکوں کی آرزو
کس نے سوچا تھا کہ سب رونق چرا لے جائیگی

شاخ سے ٹوٹے ہُوئے پتّوں کی آخر کیا بساط
جس طرف چاہے گی جنگل کی ہوا لے جائیگی

ایسا لگتا ہے کہ دریا کی کوئی بے تاب موج
ساتھ اپنے کچھ سفینے بھی بہا لے جائیگی

راہرو کا ساتھ تو کیا دے گی دن کی روشنی
جاتے جاتے سارے منظر بھی اٹھا لے جائیگی

راس آئے یا نہ آئے مصلحت کی زندگی
دربدر رُسوا کرے گی، جا بجا لے جائیگی

ذوقؔ کے مصرعے سے تاباںؔ استفادہ کیجئے
زندگی لائی تھی اک دن اور قضا لے جائیگی

○

غزل

ڈاکٹر گیان چند

معاصرین کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ
گُلِ سرِ سبدِ روزگار ہیں ہم لوگ

زماں کے غار کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ
زوال میں بھی بہت شاندار ہیں ہم لوگ

تمام عمر لڑا ہی کیے زمانے سے
اور اس کے بعد بھی باغ و بہار ہیں ہم لوگ

زمانہ یاد رکھے گا ہماری ایک ایک بات
اگرچہ آج بہت کم عیار ہیں ہم لوگ

عروجِ بارگہِ فکر کے کھنڈر ہیں ہم
ہماری سیر کرو، یادگار ہیں ہم لوگ

ہماری کم سخنی کو نگاہِ کم سے نہ دیکھ
کہ آفتابِ سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

ہماری بات سنو، ہم کو حرف حرف پڑھو
کمالِ فن کی گزرتی بہار ہیں ہم لوگ

خیال داغ ہے ماضی کی سُرخ یادوں سے
قدیم لاکھ سہی، لالہ زار ہیں ہم لوگ

کسی کو دے نہیں سکتے ہرا بھرا سایہ
کبھی چمن تھے پر اب خارزار ہیں ہم لوگ

○

غزل

ڈاکٹر گیان چند

اس انجمن کا جو نقشہ دکھائی دیتا ہے
یہ قصرِ جسد اُجڑا دکھائی دیتا ہے

جو کوئی رُوئے شکستہ دکھائی دیتا ہے
مجھے وہ اپنا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے

محیطِ زیست میں سب دُور دُور ٹھہرے ہیں
ہر ایک شخص جزیرہ دکھائی دیتا ہے

یہ کیسا آئنہ ہے! اس میں دیکھتا ہُوں جب
کوئی خبیث سا بُوڑھا دکھائی دیتا ہے

کسی کو بھُوک ہے عُہدوں کی اور کُرسی کی
کوئی نمود کا رسیا دکھائی دیتا ہے

کہاں کا علم، کہاں کا ادب، کہاں کا فن
ہر ایک زر کا دِوانا دکھائی دیتا ہے

چلو یہاں سے کنبڈی لگا کے بھاگ چلیں
حریمِ فن میں تہلکہ دکھائی دیتا ہے

قلم بکاؤ ہیں، جتنے بھی چاہو۔ لے ڈالو
وزیر بھاؤ بڑھاتا دکھائی دیتا ہے

اصولِ فن کی، فصاحت کی بات کرتا ہے
یہ شخص مجھ کو دِوانا دکھائی دیتا ہے

ہزیمتوں کے کچوکے جو رات دن کھائے
اُجاڑ شہرِ تمنّا دکھائی دیتا ہے

نہیں ہے عمر کے بڑھنے کا اس پہ کوئی اثر
وہ چہرہ پھُول سا تازہ دکھائی دیتا ہے

میں جانتا ہُوں وہ بے انتہا حسین نہیں
مجھے تو چاند کا ٹکڑا دکھائی دیتا ہے

جلائیں پیار کی باتوں سے جھلمل قندیل
ہر ایک سمت اندھیرا دکھائی دیتا ہے

نہیں ہے کبرسنی میں قنوطیت لازم
اُفق پہ کچھ تو اُجالا دکھائی دیتا ہے

○

غزل

جگن ناتھ آزاد

نہ عشق کا نہ کوئی حُسن کا فسانہ چلے
اب آج تذکرۂ گردشِ زمانہ چلے

اگر ہو مصرعِ اوّل میں ذکرِ جَورِ شہاں
تو وہ جو دوسرا مصرع ہو قاتلانہ چلے

یہ اور بات کہ حالات سازگار نہ تھے
وگرنہ جب بھی چلے ہم مجاہدانہ چلے

مجھے تو یاد بس اتنا ہے دوستوں کا سلوک
کہ میرے دوست مرے ساتھ تاجرانہ چلے

ہمارے ساتھ جو دُنیا منافقانہ چلی
ہم اُس کے ساتھ بہ اندازِ دوستانہ چلے

خبر نہیں اُسے انساں کہیں کہ اور ہی کچھ
سماج میں اگر انساں بھی وحشیانہ چلے

ہماری مصلحت اندیشیوں کا دَور گیا
قلم چلے تو اب آزاد! باغیانہ چلے

○

غزل

جگن ناتھ آزاد

گر اُن کو جُوئے خُوں سے گزرنے کا شوق تھا
یہ بھی ہے سچ کہ ہم کو بھی مرنے کا شوق تھا

آخر بس ایک موج بہا لے گئی اُنھیں
اُن کو بھی اس ندی میں اُترنے کا شوق تھا

اک دن کی زیست بھی نہ میسّر ہُوئی جسے
اُس کو بھی اس چمن میں سنورنے کا شوق تھا

احباب بچ گئے کہ ہمارے مزاج میں
الزام دُوسروں پہ نہ دھرنے کا شوق تھا

شعلے کی طرح تُند ہوں یہ آرزُو نہ تھی
پانی کی طرح ہم کو نتھرنے کا شوق تھا

ہم کو گہر کا شوق نہ خواہش صدف کی تھی
گہرے سمندروں میں اُترنے کا شوق تھا

ہم نے بُرا بھلا ہی سہی کام تو کیا
تم کو تو اعتراض ہی کرنے کا شوق تھا

تم لا سکے نہ جن کے تصوّر کی تاب بھی
اُن مشکلوں سے ہم کو گزرنے کا شوق تھا

تم کو جنھوں نے لرزہ بر اندام کر دیا
اُن گھاٹیوں میں ہم کو اُترنے کا شوق تھا

اب میں تمھارے شوق کی رُوداد کیا کہوں
تم کو تو صرف کام نہ کرنے کا شوق تھا

دارِ فنا میں کس کو حیاتِ ابد ملی
آزادؔ! اُسے فقط جسے مرنے کا شوق تھا

○

غزل

جگن ناتھ آزاد

تمھارے شہر کا اب کے سفر عجیب لگا
جو گھر کو لوٹ کے آئے تو گھر عجیب لگا

نہ جل رہا تھا نہ بجھنے کا نام لیتا تھا
کچھ آج رنگِ چراغِ سحر عجیب لگا

کسی مقام پہ ٹکتی نہ تھی نظر اپنی
جو تم گئے تو مذاقِ نظر عجیب لگا

قیام کرنے میں لذت کوئی نہ چلنے میں
تمھارے بعد یہ سارا سفر عجیب لگا

وہی نظر تھی وہی دل نہ جانے بات تھی کیا
کہ آج دل کو ترا رہگذر عجیب لگا

دیارِ غیر سے پلٹے تو دوستوں کا سلوک
بُرا تو خیر نہیں تھا مگر عجیب لگا

○

غزل

جگن ناتھ آزاد

ہم کہ ظاہر میں نظر آتے ہیں فرحاں کتنے
کیا بتائیں کہ ہیں باطن میں پریشاں کتنے

شاعرو، نغمہ گرو، اہلِ سخن! یہ تو بتاؤ
بے زبانی کا ہیں شہکار سخن داں کتنے

دورِ تکریمِ ہنر ہے مگر اے دوست! نہ پوچھ
کہ ہنرمند ہوئے آج ہراساں کتنے

اپنے لہجے کو ذرا دیکھ، مرے زخم نہ دیکھ
ترے لہجے میں ہیں آباد نمکداں کتنے

کچھ خبر بھی ہے تجھے فصلِ بہاراں! تُو نے
روند ڈالے چمنستان و بیاباں کتنے

صبح کو جلوۂ خورشید عجب شے ہے مگر
ایک جلوے نے اُجاڑے ہیں شبستاں کتنے

کل جو بارش کی دُعا مانگ رہے تھے وہ لوگ
آج سیلاب کے ہاتھوں ہیں پریشاں کتنے

کچھ ترا ذوقِ جنوں خام تھا ورنہ آزاد
تری تکریم کو حاضر تھے بیاباں کتنے

○

غزل

جگن ناتھ آزاد

فکر و فن کا یوں تو ٹھاٹھیں مارتا دریا ہوں میں
کون لیکن اس کو دیکھے کس قدر پیاسا ہوں میں

کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے آخر کیا ہوں میں
میں کسی جلوے کا پردہ ہوں کہ خود جلوہ ہوں میں

میں خود اپنے سامنے کچھ بھی سہی اے دل! مگر
مشتری جس کو نہیں ملتا ہے وہ سودا ہوں میں

جس طرح ایک اعترافِ جرم کی تصویر ہو
اس طرح خاموش تیرے روبرو بیٹھا ہوں میں

یہ نہیں ہے دوپہر یا شام کے سائے کی بات
اپنے سائے سے بہر صورت بہت چھوٹا ہوں میں

جس چمن کا تنکا تنکا تم اڑا کر لے گئیں
اے ہواؤ! اس چمن کا آخری تنکا ہوں میں

تم کہ میری محفلِ آرائی سے دھوکا کھا گئے
کس طرح تم کو بتاؤں کس قدر تنہا ہوں میں

ہم کلام آزاد! مجھ سے اب یہ منظر ہو نہ ہو
صبح کے منظر کو اب بھی دیکھتا رہتا ہوں میں

شعر کے فن سے تو ہوں آزاد! بیگانہ مگر
صفحۂ کاغذ پہ لکھ دیتا ہوں جو سنتا ہوں میں

○

غزل

شان الحق حقی

اک تمنا کہ سحر سے کہیں کھو جاتی ہے
شب کو آ کر مرے آغوش میں سو جاتی ہے

یہ نگاہوں کے اندھیرے نہیں چھٹنے پاتے
صبح کا ذکر نہیں، صبح تو ہو جاتی ہے

رشتۂ جاں کو سنبھالے ہوں کہ اکثر تری یاد
اِس میں دو چار گرہ آ کے پڑ جاتی ہے

دل کی توفیق سے ملتا ہے نشانِ منزل
آنکھ تو صرف تماشوں ہی میں کھو جاتی ہے

حسرتِ دل سے بھی بڑھ کر نہیں ہمدم کوئی
دل میں آتی ہے تو بس دل کی ہی ہو جاتی ہے

ناخدا چارۂ طوفاں کرے کوئی ورنہ
اب کوئی موج سفینے کو ڈبو جاتی ہے

کب مجھے دعویٔ عصمت ہے مگر یاد اُس کی
جب بھی آ جاتی ہے دامن مرا دھو جاتی ہے

کر چکا جشنِ بہاراں سے میں توبہ حقی
فصلِ گل آ کے مری جان کو رو جاتی ہے

○

غزل

محسن بھوپالی

غلط تھے وعدے مگر میں یقین رکھتا تھا
وہ شخص لہجہ بڑا دلنشین رکھتا تھا

ہے تار تار مرے اعتماد کا دامن
کسے بتاؤں کہ میں بھی امین رکھتا تھا

اُتر گیا ہے رگوں میں مرے لہو بن کر
وہ زہر ذائقہ انگبین رکھتا تھا

گزرنے والے نہ یوں سرسری گزر دل سے
مکاں شکستہ سہی پر مکین رکھتا تھا

وہ جوشؔ[1] ہی نہ رہا اب اسے کہاں ڈھونڈیں
جو لفظ لفظ میں دُرِ ثمین رکھتا تھا

وہ عقلِ کُل تھا بھلا کس کی مانتا محسنؔ
خیالِ خام پہ پختہ یقین رکھتا تھا

○

[1] جوشؔ

غزل

علامہ ذوقی مظفرنگری

جاگتی آنکھوں سے جس دم خواب سے اُگنے لگے
پیکرِ تعبیر بن کر حادثے اُگنے لگے

کہکشاں کے فرش پر کالی لکیریں کھنچ گئیں
چاند سے تاریکیوں کے زاویے اُگنے لگے

آندھیوں سے کیا شکایت، کیا تباہی کا گلہ
اب تو دل کی دھڑکنوں سے زلزلے اُگنے لگے

غنچہ غنچہ اپنی اپنی آگ میں جلنے لگا
کانٹے کانٹے سے سُلگتے سانحے اُگنے لگے

جب سے دشتِ خودغرض میں سازشی پرکار ہے
ہر طرف پر بادیوں کے دائرے اُگنے لگے

پھر ضمیرِ آدمیت کا لہو بہنے لگا
پھر فضائے تعزیت سے تعزیے اُگنے لگے

جب کسی رہگیر نے پایا ہے منزل کا سراغ
راستوں سے رہزنوں کے قافلے اُگنے لگے

جن کی آغوشِ فراست میں تھا فردوسِ نجات
اُن کی سوچوں سے بھیانک مسئلے اُگنے لگے

غیر کی پرچھائیوں سے جب بھی مانگیں راحتیں
اپنے گھر کے بام و در سے مرحلے اُگنے لگے

جب سرابوں کی زمیں پیاسے مسافر کھا چکی
ریگزاروں کے بدن سے آبلے اُگنے لگے

موسمِ وحشت کبھی آیا تو کشتِ سنگ میں
خونِ دل کی کیاریوں سے آئنے اُگنے لگے

جب عزائم کے دیے زندانِ شب میں جل اُٹھے
ظلمتوں میں روشنی کے راستے اُگنے لگے

میں نگارِ امن کی دُھن میں جو گزرا دشت سے
درد و غم کی جھاڑیوں کے سلسلے اُگنے لگے

جب نشاطِ دیں نے دل کے در پہ دی ہیں دستکیں
آنسوؤں کی چلمنوں سے قہقہے اُگنے لگے

جب مرا سازِ تمنا ٹوٹ کر بکھرا کہیں
دفعتاً گونگی فضا سے زمزمے اُگنے لگے

جب اندھیری رات میں ذوقی نے کی فکرِ غزل
زخمِ دل سے درد افسا قمقمے اُگنے لگے

○

غزل

شہزاد احمد

سکون کچھ تو ملا دل کا ماجرا لکھ کر
لفافہ پھاڑ دیا پھر ترا پتا لکھ کر

سمجھ میں یہ نہیں آتا خطاب کیسے کروں
حروف کاٹ دیے میں نے بارہا لکھ کر

قلم نے ٹوکا بھی دل کی صدا نے روکا بھی
مگر جو اس نے کہا میں نے دے دیا لکھ کر

ہجومِ غم میں زباں ساتھ جب نہ دے پائی
جو حال دل کا تھا میں نے سنا دیا لکھ کر

اب اس کی باری ہے اب اختیار اس کا ہے
کہیں کا میں نہ رہا اس کو بے وفا لکھ کر

بھلا سا کوئی بھی اک نام اس کو دے دینا
پر اس کے نام کو آنکھوں سے چومنا لکھ کر

میں اپنی حسرتِ دل کا حساب کیسے دوں
یہ ڈھیر میں نے لگایا ذرا ذرا لکھ کر

مجھے تو اپنے لیے راستہ تراشنا ہے
میں کیا کروں گا کسی کا لکھا ہوا لکھ کر

ملی ہے اس کے سبب اتنی روشنی شہزاد
بجھا دیے کئی سورج اسے دیا لکھ کر

⊙

غزل

شہزاد احمد

زمیں اور آسماں اندھیرے میں گم ہیں سارے
دہک رہے ہیں گلاب سینے پہ دو ستارے
زباں کی لذت دلوں کی دھڑکن بنے رہیں گے
یہ آنکھ کی پتلیوں سے چمٹے ہوئے نظارے
ہر ایک رُت میں بسی ہوئی اس بدن کی خوشبو
وہی مناظر وہی کنائے وہی اشارے
جہاں پہ دُنیا رُکی ہوئی تھی رُکی ہوئی ہے
عجب سماں ہے کہاں گئے روز و شب ہمارے
گلاب کھلنے کی رت کہاں ہے اِدھر بھی آئے
ہمیں بھی خوابوں کی سرزمیں سے کوئی پکارے
گرج چمک کھیل ہے، کہاں تک یہ کھیل چلتا
برس پڑے تشنہ لب زمینوں پہ ابر پارے
چمکتی سانسیں مہکتے لب صاف کہہ رہے ہیں
سمٹتے رہتے ہیں رات دن فاصلے تمہارے

○

غزل

شہزاد احمد

کسی صورت مسافت میں کمی ہونے نہیں دیتے
شجر بیدرد ہیں چھاؤں گھنی ہونے نہیں دیتے

سحر ہوتے ہی ہر جانب دھواں سا پھیل جاتا ہے
یہ بادل اس نگر میں روشنی ہونے نہیں دیتے

وہ روز و شب ہمیں اعزاز پہ اعزاز دیتے ہیں
مگر احساسِ ذلت میں کمی ہونے نہیں دیتے

تعلق کچھ بھی ہو قایم حدِ فاصلہ تو رہتی ہے
وہ ہم سے دوستی یا دشمنی ہونے نہیں دیتے

بجھا دیتے ہیں جو جلتا چمکتا جاگتا سورج
کسی کو رات کا احساس بھی ہونے نہیں دیتے

وہ سیلِ تند خو ہیں برق کی صورت گزرتے ہیں
کوئی دیوار رستے میں کھڑی ہونے نہیں دیتے

جلا کر خاک کر دیتے ہیں جو تازہ شگوفوں کو
وہ سورج ہیں جہاں میں تیرگی ہونے نہیں دیتے

وہ ہم کو نت نئے خوابوں کے آئینے دکھاتے ہیں
مگر امید کی صورت گری ہونے نہیں دیتے

اسے جانے نہیں شہزاد دیتے ہم تصور سے
کبھی ویران ہم دل کی گلی ہونے نہیں دیتے

○

غزل

شہزاد احمد

مجھے بس اتنی شکایت ہے مرنے والوں سے
وہ بے نیاز ہیں کیوں یاد کرنے والوں سے

مثالِ ابرِ رواں لوٹ کر کب آؤ گے
کوئی نہ پوچھ سکے گا نہ نے والوں سے

اداس چھوڑ گئے کشتیوں کو ساحل پر
گلہ کریں بھی تو کیا پار اُترنے والوں سے

وہ بات کرتے ہیں جیسے کہ تُو نہیں موجود
میں بھاگتا ہُوں ترا ذکر کرنے والوں سے

نقوشِ پا سے چلی منزلوں تک آبادی
یہ رونقیں تو ہوئیں پاؤں دھرنے والوں سے

بپھرتی موجوں نے ساحل پہ لا کے پھینک دیا
اُمید یہ تو نہیں تھی بکھرنے والوں سے

اُنھیں یہ فکر کہ کب آسماں ٹوٹتا ہے
مرا یہ حال کہ ڈرتا ہُوں ڈرنے والوں سے

○

غزل

شاعر لکھنوی

ہوا کو اور بھی کچھ تیز کر گئے ہیں لوگ
چراغ لے کے نہ جانے کدھر گئے ہیں لوگ

سفر کے شوق میں اتنے عذاب جھیلے ہیں
کہ اب تو قصدِ سفر ہی سے ڈر گئے ہیں لوگ

دُھواں دُھواں نظر آتی ہیں شہر کی گلیاں
سُنا ہے آج سرِ شام گھر گئے ہیں لوگ

جہاں سے نکلے ہیں رستے مسافروں کے لیے
مکان ایسے بھی تعمیر کر گئے ہیں لوگ

کبھی کبھی تو جُدائی کی لذتیں دے کر
رفاقتوں میں نیا رنگ بھر گئے ہیں لوگ

ملالِ ترکِ تعلق نہ جانے کیا ہوتا
خیالِ ترکِ تعلق سے مر گئے ہیں لوگ

غرورِ تُند ہواؤں کا یُوں بھی توڑا ہے
چراغ ہاتھ پہ رکھ کر گزر گئے ہیں لوگ

کوئی جواب نہیں فکر کی بلندی کا
زمیں پہ رہ کے بھی افلاک پر گئے ہیں لوگ

قریب تھے تو فقط واسطہ تھا آنکھوں سے
جُدا ہوئے ہیں تو دل میں اتر گئے ہیں لوگ

وہ گیسوؤں کی گھٹا ہو کہ دار کا سایہ
جہاں بھی چھاؤں ملی ہے ٹھہر گئے ہیں لوگ

یہ اور بات کہ گھر بُجھ گئے ہیں اے شاعرؔ
مگر دلوں میں چراغاں تو کر گئے ہیں لوگ

○

غزل

شاعر لکھنوی

نفس نفس پہ نیا سوزِ آگہی رکھنا
کسی کا درد بھی ہو آنکھ میں نمی رکھنا

وہ تشنہ لب ہوں کہ میری اَنا کا ہے معیار
سمندروں سے بھی پیمانِ تشنگی رکھنا

رفاقتوں کے تسلسل سے جی نہ بھر جائے
جُدائیوں کا بھی موسم کبھی کبھی رکھنا

وفا کسی پہ کوئی قرض تو نہیں ہوتی
جو ہو سکے تو ھمارا خیال بھی رکھنا

کہیں ستم کے اندھیرے نہ روح کو ڈس لیں
فصیلِ جسم پہ زخموں کی روشنی رکھنا

چراغِ صبح سہی ہم، ہمارے مسلک میں
روا نہیں ہے اندھیروں سے دوستی رکھنا

عجیب شخص ہے وُہ بھی کہ اُس کو آتا ہے
گریز میں بھی ادائے سپردگی رکھنا

تعلقات میں رخنے بھی ڈال دیتا ہے
ہر آدمی سے اُمیدیں نئی نئی رکھنا

ہمارا کام ہے حرفوں کو روشنی دے کر
خود اپنے ظرف میں چنگاریاں دبی رکھنا

ہوائے شب کا نہیں اعتبار اے شاعر
ہزار نیند ہو آنکھیں مگر کھُلی رکھنا

○

غزل

شاعر لکھنوی

خبر نہیں کہ گزر جائیں کتنے خوابوں سے
گھروں کا ذکر نہ کر خانماں خرابوں سے

دلوں میں درد کا احساس تک نہیں باقی
یہ کیا ہُوا کہ مہک چھن گئی گُلابوں سے

فصیلِ شہر سے دریا کا حوصلہ ہے بلند۔
خدا بچائے رکھے نیند کے عذابوں سے

یقینِ وعدۂ فردا بھی کیا قیامت تھا
ہم اپنی پیاس بجھاتے رہے سرابوں سے

ستم نے فکر کے کتنے ہی در سے بدلے
الگ ہُوئی نہ کتابِ وفا نصابوں سے

ہزار رنگ کے احساس ہیں محبت میں
یہ اک شراب بنی ہے کئی شرابوں سے

بتا رہے ہیں صحیفے حسین چہروں کے
زمیں پہ نور اتارا گیا کتابوں سے

مِلا ہے خاک کی صورت کو آدمی کا وجود
گزر کے کتنے ہی تخلیق کے عذابوں سے

کبھی تو دیکھیے صحرا کی سمت بھی شاعرؔ
ہزار شہر ہیں آباد ہیں جو خوابوں سے

غزل

شاعر لکھنوی

جو زخم دل کے سمائے نہ ظرفِ نشتر میں
لکھے گئے وہ مرے عہد کے مقدر میں

چراغ بن کے وہ آیا بھی اور چلا بھی گیا
دُھواں خیال کا پھیلا رہا مرے گھر میں

سفر میں دُھوپ نہ آئی کبھی مرے سر پر
غبار نے مجھے رکھا ہے اپنی چادر میں

میں یُوں ہوں اپنے رفیقوں کے درمیاں جیسے
اکیلا ایک دِیا ظلمتوں کے لشکر میں

الگ ہے صورتِ دریا مرے وجود کا رنگ
میں جذب ہو نہیں سکتا کسی سمندر میں

ہزار سنگ تراشوں کی انگلیاں ہوں قلم
اُبھر کے آئیں گی جو صورتیں ہیں پتھر میں

بلند کتنی تھی ہمسائے کے چراغ کی لَو
تمام رات اُجالا رہا مرے گھر میں

قلم نے لکھ کے ترا نام لوحِ کاغذ پر
ستارے ٹانک دیے حرف کے مقدر میں

مرے قریب نہ آ رُوپ میں فرشتوں کے
میں چاہتا ہوں تجھے آدمی کے پیکر میں

سمجھ سکے اُسے دریا کا ظرف کیا شاعرؔ
اُتر گیا ہوں میں جس کرب کے سمندر میں

○

غزل

شاعر لکھنوی

کرم کسی کا تھا مرگِ ناگہاں کی طرح
عزیز اُس کو بھی رکھا ہے اپنی جاں کی طرح

مجھے قبول کہ اک فردِ کارواں ہی سہی
میں ساتھ ساتھ تو ہُوں گردِ کارواں کی طرح

تمام عُمر رہا تیری یاد کا موسم
ہوا کے دوش پہ خوشبوئے رایگاں کی طرح

پناہ دے نہ سکے جو شکستہ حالوں کو
ہم اُس زمین سے گزرتے ہیں آسماں کی طرح

دیارِ جبر میں اک وہ بھی وقت آتا ہے
سکوت بولنے لگتا ہے جب زباں کی طرح

میں چاہتا ہُوں کہ پہلے وہاں چراغ جلیں
مکان اور بہت ہیں مرے مکاں کی طرح

سجا کے آئے تھے فہرستِ رہزناں میں جنھیں
وہ راستے میں ملے میرِ کارواں کی طرح

دبا سکا نہ مرے حرفِ حق کو جہل کا شور
میں اپنے دور میں زندہ رہا اذاں کی طرح

جو سر اُٹھا کے چلیں دار کی طرف شاعرؔ
زمیں پر ہیں وہی لوگ آسماں کی طرح

غزل

شاعر لکھنوی

اپنے ہی فاصلے نظر میں ہیں
ہم ابھی ذات کے سفر میں ہیں

تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے
ہم جہاں ہیں تری نظر میں ہیں

جتنے ہیں سنگ و خشت ہاتھوں میں
پھل تو اتنے کہاں شجر میں ہیں

کیسی ہوتی ہیں راحتیں گھر کی
پوچھیے اُن سے جو سفر میں ہیں

ہر قدم خوفِ سنگِ رُسوائی
جیسے ہم آئنوں کے گھر میں ہیں

ہاتھ رہتا ہے گیلی مٹّی پر
صورتیں ذہنِ کُوزہ گر میں ہیں

لوگ گھر کے چراغ گُل کر کے
انتظارِ رُخِ سحر میں ہیں

دُور کتنے نکل گئے شاعرؔ
پھر بھی ہم اُس کی رہگزر میں ہیں

○

نعت

قیّوم نظر

میرا ہر عُضو ڈھلا حمدِ خدا کہنے کو
دل کی دھڑکن ہے مگر صلِّ علیٰ کہنے کو

کچھ اگر ہیں تو وہ قرآں کے حوالے ہی سے ہیں
لفظ ہیں ورنہ کہاں تیری ثنا کہنے کو

تیری پابوسی نے سینہ کیا روشن اُس کا
تو وہ سنگ ہی تھا غارِ حرا کہنے کو

تیرے ہی نطق نے صحرا کو زبانِ حق دی
ایک اک ذرہ بنا کوہِ ندا کہنے کو

سایہ گستر [illegible] خضرا کا ہے پرتو دراصل
نور افشاں ہے مدینے کی فضا کہنے کو

[illegible] خدا کی ہے تمنّا دل میں
ہے ہر اک شخص یہاں محوِ دُعا کہنے کو

گنت عظمتوں کی اس کے نفس میں خوشبو
رُوح پرور ہے ترے در کی ہوا کہنے کو

○

اُس کے گیسو

قیّوم نظر

پیشانی کی [illegible] سے اُٹھے
پُورب پچھم پھیلے شُعلے
ہوتے نہیں لیکن بے قابُو
اُس کے گیسو

موجیں برقِ شرار بدن کی
کرنیں صبحِ نو کے چمن کی
شہرِ ختن سے اُٹھتی خُوشبو
اُس کے گیسو

نغموں کی زر تار زبانیں
آگ لگاتے راگ کی تانیں
سر پر چڑھ کر بولتا جادُو
اُس کے گیسو

سیمابی شانوں سے ستیزاں
دوشِ ہوائے نرم پہ رقصاں
دشتِ وفا میں جیسے آہُو
اُس کے گیسو

حلقہ بہ حلقہ بھنور پیدا ہیں
جانِ طغیانِ دریا ہیں
بالائے محراب ابرو
اُس کے گیسو

دھیان کی اُلجھن بے دھیانی میں
سُلجھاتے ہیں پریشانی میں
دے کے دادِ نظارا ہر سُو
اُس کے گیسو

○

غزل

قیوم نظر

اِس شہرِ برف آلود میں
سینہ سپر رعنائیاں
یخ بستہ احساسات کو
دیتی ہیں شُعلوں کی زباں

خوش رنگ جسموں کے سبو
مے خانۂ جذبات میں
آپس میں ٹکراتے ہیں جب
رہتا نہیں کچھ ہات میں

وارفتہ ارمانوں کے گُل
کِھلتے ہیں پھر اِس ڈھنگ سے
"ہو جو بھی ہو" کی کیفیت
مِل جائے شورِ چنگ سے

بے راہ روی کے ساز پر
آزاد منشی کا جہاں
زنجیریٔ حرص و ہوا
بے گانۂ زشت و زبوں

جاری ہے سکّہ جنس کا
تہذیبِ نو کی مُہر سے
ہو تیرہ تر سرمایں دن
جیسے چمکتی کُہر سے

○

غزل

قیوم نظر

بکھرے گیسو اُڑتی تانیں
خوشبوؤں کی اُٹھتی موجیں
گہری نیلی جھیل سی آنکھیں
جیسے تارے نیل گگن میں

کان میں بالے نادِ علیؑ سے
لعلیں لب نورُستہ کلی سے
شعلوں میں دو حرف جلی سے
آگ لگائیں شہر اور بن میں

رخساروں پہ ملائم نشّہ
رعنائی کا شگفتہ تحفہ
سُرخ و سفید کا اک گلدستہ
حُسنِ فراواں کے دامن میں

سینے پر گلرنگ اُجالا
گرتے ہوؤں کو دے کے سنبھالا
یخ بستوں کو جس نے اُچھالا
رُوپ کے پھیلے ہُوئے آنگن میں

چال میں کس سرکش دریا کا
جس میں تلاطم ناز و ادا کا
جادو تناسب اعضا کا
چلتا ہوا پھیلے لندن میں

روشنیوں کے سیل میں غلطاں
رقصاں جسم کا رُواں رُواں
وہ بھی جو ہے بظاہر پنہاں
عُریانی کے پیراہن میں

○

دھرتی سے رشتہ مت توڑو

فارغ بخاری

سپنوں کا پرچم
اتنی بلندی پر مت گاڑو
شیشہ بدن ہیں
پھسلے تو پارہ پارہ ہو جائیں گے
دُور خلا میں کھو جائیں گے
خواب بُنو ——— پر
دھرتی سے رشتہ مت توڑو
دھرتی ماں ہے
اس کی ناف سے کٹ کر بھی ہم
اس کی خوشبو ہی پیتے ہیں
اس کی باہوں سے ہٹ کر بھی
اس کے دودھ ہی پر جیتے ہیں
اس سے دور پر بھی جیسے
اس کے دھارے پر بہتے ہیں
اس کے محور میں رہتے ہیں
یوں لگتا ہے ، جیسے اب بھی
کہیں کہیں ہم
اس کی کوکھ سے بندھے ہوئے ہیں

○

واپسی

فارغ بخاری

کبھی کبھی سوچتا ہے انساں
کہ رشتوں ناتوں کی ان فصیلوں میں قید رہ کر
وہ کتنا محدود ہو چکا ہے
وہ ان کرم خوردہ سی فضاؤں میں
کتنے ہی اپنے خیرہ کن رنگ کھو چکا ہے
وہ زندگی کوئی زندگی ہے
جو دُوسروں ہی کے بس میں گزرے
ہمیشہ قیدِ قفس میں گزرے
وہ اپنی کتنی حسیں تمنائیں موت کے گھاٹ اتارتا ہے
یہ ایسا فرسُودہ کھیل ہے جو ہر اک اداکار ہارتا ہے

وہ کیوں نہ ان آہنی حصاروں کو توڑ کر
ایسی وسعتوں کا سراغ پائے
کہ جو اسے بیکراں بنا دیں
نئے جہانوں کا جو پتہ دیں
جو اس کے فن کو نئی فتوحات سے سجا دیں
وہ ذہن و دل کو نئی مسافت کی جنتوں سے گزارتا ہے

نئی صداؤں کا کھوج پانے کو نت نئے رنگ دھارتا ہے

پھر ایک ایسا بھی وقت آتا ہے
اپنے اندر برہنہ تنہائیوں سے گھبرا کے
یہ روایت شکار خود رختِ اجنبیت اتارتا ہے
شکستہ خوابوں کے ریزے ریزے کو جوڑتا ہے
تجی ہوئی خوشبوؤں کے پانے کو دامنِ دل پسارتا ہے
غمِ جہاں سے نڈھال ہو کر
وہ اپنی ٹھکرائی والہانہ محبتوں کو پکارتا ہے

○

غزل

فارغ بخاری

مل گئے انھیں شاید نقشِ پا ہواؤں کے
رُک گئے ہیں صحرا میں قافلے صداؤں کے

منجمد فضاؤں کے برف برف رستوں میں
نرخ بڑھتے جاتے ہیں دُھوپ کی کھڑاؤں کے

سایۂ شجر کوئی اور نہ بام و در کوئی
دل تلک اُتر آئے سارے زخم راہوں کے

ٹوٹ کر نہ رستے میں ہم کہیں بکھر جائیں
کتنی دُور ہیں یارو، شہر بیوفاؤں کے

ایک موجِ سرکش سے بند ٹوٹ جاتے ہیں
آزمائے ہیں ہم نے حوصلے خداؤں کے

اک حسیں تصوّر کا معجزہ ہے یہ فارغ
انگ انگ میں غنچے کھل گئے گناہوں کے

○

غزل

فارغ بخاری

تھے مقدر ہی نارسائی کے
جشن بھی تیری کج ادائی کے

کس بدن کو عطا ہوئے ہیں کبھی
اس قدر رنگ دلربائی کے

بندگی ہو کہ وہ خدائی ہو
رنگ ہیں سارے خود نمائی کے

ہم فقط حرمتِ گنہ کے لیے
بن گئے ہیں ہدف خدائی کے

اکثر اہلِ ہنر بناتے رہے
زندگی بھر پہاڑ رائی کے

خشک کھیتوں کو لے کے ہم فارغ
پیچھے پھرتے رہے ترائی کے

○

غزل

جمیل ملک

زباں ملے تو ہزار باتیں کہا کریں ہم
صدا کا رشتہ ہی ٹوٹ جائے تو کیا کریں ہم

یہ شہرِ شیشہ تو شہرِ نا آشنا ہے، پیارے!
کیسے پکاریں یہاں کسے آشنا کریں ہم

اگر خدا تک پہنچ سکے حرفِ نارسائی
تو عرش تک بھی بلند دستِ دُعا کریں ہم

یہاں مسیحا کے کام ہی جب دُعا نہ آئی
دُعا کریں اب تو کس کی خاطر دُعا کریں ہم!

اب ان کے ہاتھوں کفن کا احساں بھی کیوں اٹھائیں
شہادتوں کے لہو سے رنگیں قبا کریں ہم

کوئی کسی کو نہ دے سکے طعنِ نارسائی
جو قرضِ جاں ہے وہ مر کے عہدِ وفا کریں ہم

ہم اپنا قاتل خود اپنے ہی آئینے میں دیکھیں
اگر کبھی اپنی ذات کا سامنا کریں ہم

مہک اُٹھے کربلا سے اپنے وطن تک آئے
کچھ ایسے زندہ وہ قصۂ کربلا کریں ہم

وہ جس کی خوشبو ابد ابد تک رہے سلامت
اک ایسا نامہ رقم، سفیرِ صبا کریں ہم

وہ جس ادا سے عروسِ فردا کو تو نے چوما
نثار اُس پہ ہر اک ادا، خوش ادا کریں ہم

جمیلؔ سب سے عظیم تر اس صدی کا غم ہے
سبھی کو اب اس کے عشق میں مبتلا کریں ہم

○

غزل

جمیل ملک

جمیل ہوں، مرکزِ جلال و جمال ہوں مَیں
نوائے تازہ ہوں ایک زندہ خیال ہوں مَیں

نشانِ عبرت بنانے والو، اب آؤ دیکھو
مثالِ خورشید کس طرح بے مثال ہوں مَیں!

یہ معجزہ ہے کہ شامِ عہدِ زوال میں بھی
سحر کے ہاتھوں میں تحفۂ لازوال ہوں مَیں

مری شہادت، مری شہادت نہیں ہے لوگو!
تمھارے زخموں کا مرہم و اندمال ہوں مَیں

تمام صدیاں ہوئی ہیں سیراب میرے خوں سے
کہ سب زمانوں کا نکتۂ اتصال ہوں مَیں

وجود کٹ جائے روح لیکن نہ کٹ سکے گی
جو جذبۂ عشق سے ہے صیقل وہ ڈھال ہوں مَیں

جواب لکھا ہے سب کے سینوں کی دھڑکنوں میں
تمام چہروں پہ جگمگاتا سوال ہوں مَیں

دلوں کی تاریخ سے مٹاؤ گے مجھ کو کیونکر
زمانہ میرا ہے قسمتِ ماہ و سال ہوں مَیں

مَیں سج کے آیا ہوں پھر گلابوں کی انجمن میں
وہ یہ سمجھتے تھے سبزۂ پائمال ہوں مَیں

مجھے مجھی سا کوئی جیالا سمجھ سکے گا
جو ساری دُنیا سے ہے انوکھی وہ چال ہوں مَیں

کمالِ انساں بھی جس کو حیرت سے تک رہا ہے
جمیلؔ انساں کا وہ عروجِ کمال ہوں مَیں

○

غزل

جمیل ملک

نہ پوچھو مہرباں ہم پر نگاہِ قہر کتنی ہے
کہو اِس شہر میں اب آبروئے شہر کتنی ہے!

جو اِس کی تہہ میں اُترا آج تک واپس نہیں آیا
بتاؤ اور گہری خون کی یہ نہر کتنی ہے!

زباں ہی کاٹ کر رکھ دی وہیں آدابِ محفل نے
کسی نے بھی اگر پوچھا خطائے شہر کتنی ہے!

برونِ بحر تو سب سیپیاں خالی کی خالی ہیں
صدف کے دل میں تابانی درونِ بحر کتنی ہے!

تجھے دیکھیں کہ پہلے ہم فصیلِ شہر کو دیکھیں!
تری دستار سے اُونچی فصیلِ شہر کتنی ہے!

پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں کب آئیں گے!
کہاں ہے وہ سکوں کی شام، یہ دوپہر کتنی ہے!

کہاں ہم جی سکیں گے زہر کے تریاق ہونے تک
کسے معلوم خلقت آشنائے زہر کتنی ہے!

سماتی ہی نہیں جیسے زمینوں آسمانوں میں
ذرا دیکھو تو بے پایاں جنوں کی لہر کتنی ہے!

افق کھلتے ہی جاتے ہیں ابھی تازہ جہانوں کے
خلا بازو، مسافت ماورائے دہر کتنی ہے!

کنارِ بحر لگ جاتی ہیں جس سے کشتیاں ساری
جمیلؔ اب دور ساحل سے وہ موجِ بحر کتنی ہے!

○

غزل

جمیل ملک

وہی جو کل مرے کھیتوں میں تھے کپاس کے پھول
ترے بدن پہ سجے تو کھلے لباس کے پھول

خدا کرے تری جانب خزاں نہ آئے کبھی
سدا مہکتے رہیں ترے دل میں آس کے پھول

انھیں قبول کرو یا ادا سے ٹھکرا دو
تمھارے ہاتھ میں ہیں اک ادا شناس کے پھول

سمجھ سکو تو یہ دل بھی ہیں اور غزل بھی
بہت گراں ہیں یہ دو حسنِ التماس کے پھول

بڑا ہے فرق امیروں میں اور فقیروں میں
پہاڑ دور کے اچھے ہیں اور پاس کے پھول

پھر آس کے بعد گلستاں میں خوب دھول اڑی
بھری بہار میں نکلے چمن سے یاس کے پھول

وہ حبس ہے کہ پڑے آبلے زبانوں پر
تپک رہے ہیں جمیلؔ اپنی اپنی پیاس کے پھول

○

غزل

جمیل ملک

صلہ وفا کا فقط وفا ہے، یہ مختصر سا جواب لکھ دُوں
سمجھ سکو تو یہی بہت ہے، کہو تو پُوری کتاب لکھ دُوں

گلاب چہرہ یہ پُوچھتا ہے، نگاہ کا انتخاب کیا ہے
گلاب کا پھول پیش کر دُوں، کنایۂ انتخاب لکھ دُوں

اگر زمانے کی تنگ دامانیوں میں ہو وسعتِ نظر بھی
تو میں حقیقت کے خارزاروں سے چُن کے سارے گلاب لکھ دُوں

حساب داں مَیں نہیں کہ چاہت کو بھی ترازو پہ رکھ کے تولوں
خلوص کی انتہا نہیں ہے، خلوص کو بے حساب لکھ دُوں

اسی لیے تو عذاب تم نے مرے مقدر میں لکھ دیے ہیں
کہ چاہتے ہو تمھارے حصّے میں اپنے سارے ثواب لکھ دُوں

اسی سے تیرا بھرم ہے قایم کہ تُو ابھی تک حجاب میں ہے
ستارے ٹکرا کے ٹُوٹ جائیں اگر تجھے بے حجاب لکھ دُوں

مرے پسینے کی بارشوں سے مہک اُٹھیں کوہ و دشت و صحرا
اگر کبھی مَیں زمیں کے سینے پہ خواب، مثلِ سحاب لکھ دُوں

مَیں اپنے سینے کی آگہی سے میں اپنے چہرے کی روشنی سے
افق افق ماہتاب کاڑھوں، کرن کرن آفتاب لکھ دُوں

تمام قدریں ہیں آنی جانی مگر فقط ایک لفظ زندہ
سبھی زمانوں کے پیکروں پر بس ایک لفظ انقلاب لکھ دُوں

کوئی شگوفہ کھلے جو اظہار کا ہو مانوس استعارہ
میں عصرِ نو کی زبان بن کر حکایتِ احتساب لکھ دُوں

چمن چمن میں نہ جانے کس کس نے خُوں سے کتنے نصاب لکھے
جمیلؔ میں بھی کتابِ ہستی میں ایک رنگین باب لکھ دُوں

○

غزل

جمیل ملک

خدا سے ہم نے دو عالم خریدے
خوشی لینے گئے تھے، غم خریدے

نہ ہو خوشبو ہی جب خود اُن کے بس میں
گلوں سے کیا بھلا شبنم خریدے!

لیے پھرتے ہیں سب ناسور دل کے
کسی سے کیا کوئی مرہم خریدے!

کوئی گاہک نہیں دل کے نگیں کا
کوئی آہن کوئی ریشم خریدے

عجب بازارِ دُنیا کا چلن ہے
سبھی نے اپنے اپنے غم خریدے

نہ کوئی رُوح کو گرمانے آیا
ٹھٹھرتے بھیگتے موسم خریدے

فضا میں اُڑ گئیں سب فاختائیں
لہو میں تر بتر پرچم خریدے

وہی تو ہیں ستارے چاہتوں کے
وہ سارے داغ جو باہم خریدے

جمیلؔ آئینۂ دل خود نما ہو
تو پھر کیوں کوئی جامِ جم خریدے!

غزل

تابش دہلوی

کبھی وصل و ہجر بھی زندگی، کبھی زندگی سے فرار تک
ہیں ہزار شوق کے مرحلے غمِ یار سے غمِ یار تک

جو رُکی تو دل کی طرح رُکی، جو اُٹھی تو درد ہی درد تھی
وہی موجِ خُوں ہمہ رنگ ہے مری چشمِ تر سے بہار تک

نہ ہو تشنگی میں کمی ذرا، رہے برقرار یہ ذائقہ
کہ فسُونِ بادہ و جام ہے مری سرخوشی کے خمار تک

یہ عجیب جذبۂ شوق ہے، یہی شوق لے کے گیا مجھے
کبھی تیری بزمِ خیال تک کبھی صرف کوچۂ دار تک

کئی بار جاں سے گزر گئے مگر آہ پھر بھی نہ طے ہوئے
وہ تمام شوق کے فاصلے جو ہیں ہجرِ یار سے یار تک

نئے رنگ جوشِ جنوں سے ہیں سرِ شاخ بھی سرِ خار بھی
یہ چمن یہ دشت کی رونقیں ہیں مری خزاں کی بہار تک

کرے کیا وُہ دولتِ غم طلب اُسے تابشؔ اور ملے گا کیا
جسے کُوئے شوق سے مل سکی نہ متاعِ صبر و قرار تک

○

غزل

تابش دہلوی

احوالِ شوق ہم سے بمشکل کہا گیا
پوچھا کسی نے حال تو بس دل کہا گیا

اندازہ عافیت کا اُسی وقت تھا ہمیں
جب سیلِ ناگذشتہ کو ساحل کہا گیا

عہدِ وفا سے پہلے نہ تھا اس کا کوئی نام
اب جس کو چارہ گر کبھی قاتل کہا گیا

اربابِ عشق مصلحت اندیش ہو گئے
اِک زخمِ آرزو تھا جسے دل کہا گیا

محرومیوں نے خوب پناہیں تلاش کیں
میں تھک گیا جہاں اُسے منزل کہا گیا

اظہار کے لیے لبِ منصور ہی سہی
ھل من مزید اے شوق بمشکل کہا گیا

آبِ گہر کے تشنہ دہن سارے مر گئے
ہم سے یہ واقعہ لبِ ساحل کہا گیا

مجھکو سُنا کے میری ہی آوازِ بازگشت
کس کس کو میرا مدِ مقابل کہا گیا

تابش تمام دہر کی قدریں بدل گئیں
اِس دور میں تو حق کو بھی باطل کہا گیا

○

غزل

تابش دہلوی

منزل تلک ہیں نقشِ جبیں، نقشِ پا کے ساتھ
یہ کون شخص تھا جو گیا رہنما کے ساتھ

محرومیوں کے خوف سے، از راہِ احتیاط
مانگی دعا اثر کی بھی ہم نے دعا کے ساتھ

کیسی رفاقتیں ہیں کہ راہِ حیات میں
نا آشنا کی طرح ہیں ہر آشنا کے ساتھ

شاید اسی طرح سے شفایاب ہو سکیں
کیجے ہمارے حق میں دُعا بھی دوا کے ساتھ

کس سمت جانے قافلۂ گُل نکل گیا!
دیوانہ دوڑتا رہا بادِ صبا کے ساتھ

کوئی فریب بھی نہ رہا مُوجبِ سکوں
جائیں کہاں تک اس دلِ بے مدّعا کے ساتھ

ٹھیرے ہیں جانے کس کے گنہگارِ شرک ہم
پُوجا ہے ایک بُت کو بھی ہم نے خُدا کے ساتھ

وہ دل، وہ اشک و آہ کا موسم نہیں رہا
ہم بھی بدل گئے ہیں اس آب و ہوا کے ساتھ

تابشؔ یہ کم نہیں ہے کہ اس آن بان سے
اس عہد میں ہو زندہ دلِ مبتلا کے ساتھ

○

غزل

بشیر بدر

اب ہے ٹوٹا سا دل خود سے بیزار سا
اس حویلی میں لگتا تھا دربار سا

اِس طرح ساتھ نبھنا ہے دشوار سا
میں بھی تلوار سا تُو بھی تلوار سا

خوبصورت سی پاؤں میں زنجیر ہو
گھر میں بیٹھا رہوں میں گرفتار سا

گُڑیا گُڈے کو بیچا خریدا گیا
گھر سجایا گیا رات بازار سا

شام تک کتنے ہاتھوں سے گُزروں گا میں
چائے خانوں میں اُردو کے اخبار سا

میں فرشتوں کی صحبت کے لائق نہیں
ہمسفر کوئی ہوتا گنہ گار سا

بات کیا ہے کہ مشہور لوگوں کے گھر
موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

زینہ زینہ اُترتا ہُوا آئینہ
اس کا لہجہ انوکھا کھنک دار سا

وہ علی گڑھ کی شامیں کہاں کھو گئیں
اب وہ شاعر کہاں ہے طرح دار سا

○

غزل

بشیر بدر

سر پہ سایہ سا دستِ دُعا یاد ہے
اپنے آنگن میں اک پیڑ تھا یاد ہے

ایسا لگتا ہے ہر امتحاں کے لیے
زندگی کو ہمارا پتا یاد ہے

میکدے میں اذاں سُن کے رویا بہت
اس شرابی کو دل سے خدا یاد ہے

یہ ستارے بھی عاشق ہیں لیکن انھیں
رات کٹنے کی کوئی دُعا یاد ہے

جس میں اپنی پرندوں سے تشبیہ تھی
تم کو اسکول کی وہ دُعا یاد ہے

○

غزل

بشیر بدر

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی
زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی

میری مٹھی میں سوکھے ہوئے پھول ہیں
خوشبوؤں کو اڑا کر ہوا لے گئی

میں سمندر کے سینے میں چٹان تھا
رات اِک موج آئی بہا لے گئی

ہم تو کاغذ تھے اشکوں سے بھیگے ہوئے
کیوں چراغوں کی لَو تک ہوا لے گئی

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے
یہ طوائف بھی عصمت بچا کے لے گئی

چاند نے رات مجھ کو جگا کر کہا
ایک لڑکی تمہارا پتہ لے گئی

○

غزل

بشیر بدر

جگنو کوئی ستاروں کی محفل میں کھو گیا
اتنا نہ کر ملال جو ہونا تھا ہو گیا

پروردگار جانتا ہے تو دلوں کے حال
میں جی نہ پاؤں گا جو اسے کچھ بھی ہو گیا

اب اس کو دیکھ کر نہیں دھڑکے گا میرا دل
کہنا کہ مجھ کو یہ بھی سبق یاد ہو گیا

بادل اُٹھا تھا سب کو رُلانے کے واسطے
آنچل بھگو گیا کہیں دامن بھگو گیا

اک لڑکی، ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی
مَیں اُجلی دُھندلی یادوں کے کُہرے میں کھو گیا

○

غزل

بشیر بدر

مسافر کے رستے بدلتے رہے
مقدر میں چلنا تھا چلتے رہے

کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا
مرے پاؤں شعلوں پہ چلتے رہے

مرے راستے میں اُجالا رہا
دِیے اُس کی آنکھوں میں جلتے رہے

محبّت، عداوت، وفا، بے رُخی
کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

سُنا ہے اُنھیں بھی ہوا لگ گئی
ہواؤں کا جو رُخ بدلتے رہے

وہ کیا تھا جسے ہم نے ٹھکرا دیا
مگر عمر بھر ہاتھ ملتے رہے

○

ننھّے منّے فرشتے

پرتو روھیلہ

ننھّے ننھّے پھول فرشتے اُجلے اُجلے کپڑے پہنے آنکھیں ملتے صبح سویرے بھاری بھاری بستے اُٹھائے
سڑکوں گھر کے دروازوں پر بس کا رستہ دیکھ رہے ہیں
کیسی پیاری ٹھنڈی ہوا ہے
موسم کتنا سُہانا ہے
رات کی نیلی چادر ابتک سمٹی نہیں ہے
سُورج کی وہ لرزاں گیند ابھی تک اُبھری نہیں ہے
چڑیوں کی چُوں چُوں ہے یا پھر ننھے فرشتوں کی ننھی سوچ
"مس کانگا کی ناک کی عینک
پی ٹی سر کے ہاتھ کا ڈنڈا
اردو مس کی پان کی ڈبیا
گورے سر کا غصّہ - اپنی بدنامی
پچھلے ٹسٹ کے نمبر -
سمس اور ٹیبلس - سمس اور ٹیبلس
عامر اوّل - یوسف دوئم
ایک روپے کی میٹھی گولی - پاس اٹھنّی ففٹی پیسہ
چھینا جھپٹی - بنچ کے اوپر - روم کے باہر - گھر پہ شکایت
بُوٹ کے بدلے کالے چپّل - فائن کا ڈر"
کیسی کومل کومل کلیاں
کیسی مشکل مشکل سوچیں
کیسے بھاری بھاری مسائل (موجودہ تہذیب کی نعمت)
ہم نے مستقبل کے جلّاد سے ڈر کر
ان بچّوں کے سر ڈالے ہیں

○

ثانیۂ مارساں

پرتو روھیلہ

یہ اک ثانیہ وقت کی سطح پر اس طرح رک گیا
جیسے سیلاب میں کوئی بہتا ہوا سانپ یکدم بہاؤ سے لڑتا ہُوا پھن اُٹھا کر کھڑا ہو
اس اک ثانیہ نے جنوں کی بلاخیز آنکھوں سے پٹّی ہٹا کر
اُس آئینۂ سنگ میں جو کہ پردیس کی دُھول سے اٹ گیا تھا
تری پیاری صُورت دکھا دی
تری گرم سانسوں کی خوشبو سے ساری فضا بس گئی
ترے گرم ہاتھوں کی نرم انگلیوں نے اندھیرے میں شمع جلا دی
ترے جسم کی قربتوں نے وہ طُوفاں اٹھائے، ارادوں کی دُنیا ہلا دی
فقط بات اتنی کہ کُرتے کا میرے بٹن ٹوٹ کر گر گیا تھا

○

غزل

محسن احسان

تکریمِ خم و سبو بہت ہے
پینے کے لیے لہو بہت ہے

مرجھا گئیں تازہ پتّیاں تک
اِس سال چمن میں لُو بہت ہے

ہم تیرے نیازمند ، لیکن
پابندیٔ گفتگو بہت ہے

گونج اُٹھی ہے خلوتِ خموشی
محتاج نوا کو ہُو بہت ہے

خاشاک سے گھر میں ہے چراغاں
یہ روشنی چار سُو بہت ہے

ملبوسِ حرم میں تارِ زر ہے
اس دل کو غمِ رفو بہت ہے

نے رنگ ، نہ بُو مگر چمن میں
آوازۂ رنگ و بُو بہت ہے

اس زندگی بھر کی جستجو میں
ناکامیٔ جستجو بہت ہے

دل صاف خدا کے سامنے ہوں
میرے لیے یہ وضو بہت ہے

گوہر کی طرح صدف نشیں ہُوں
یہ عزّت و آبرو بہت ہے

اک بات پہ خوش تو اک پہ ناخوش
محسنؔ بھی بہانہ جُو بہت ہے

○

غزل

محسن احسان

بُجھا کے رکھ دے یہ کوشش بہت ہوا کی تھی
مگر چراغ میں کچھ روشنی انا کی تھی

مری شکست میں کیا کیا تھے مضمرات نہ پُوچھ
عدو کا ہاتھ تھا اور چال آشنا کی تھی

فقیہِ شہر نے بیزار کر دیا، ورنہ
دلوں میں قدر بہت خانۂ خدا کی تھی

ہم اب غبارِ مہ و سال کی لپیٹ میں ہیں
ہمارے چہرے پہ آسُودگی بلا کی تھی

ابھی سے تم نے دُھواں دھار کر دیا ماحول
ابھی تو سانس ہی لینے کی ابتدا کی تھی

شکست وہ تھی کہ جب میری سربلندی کی
مرے عدُو نے مرے واسطے دعا کی تھی

○

غزل

محسن احسان

مجھ پہ سُورج کا ہے کچھ قرض چکانے دینا
رات آئی ہے دِیا دل کا جلانے دینا

اپنے گلزار کے پھُولوں سے یہ کہنا ہے مجھے
تم کسی کو بھی نہ خوشبُوئیں چُرانے دینا

ہاتھ کمزور سہی میرے، شکستہ تو نہیں
بام و دیوار کبھی مجھ کو سجانے دینا

مجھ سے ہر بار یہ کہتی ہیں مسافر آنکھیں
تم کسی اور کو پاس اپنے نہ آنے دینا

استقامت مری مٹّی میں نہیں ہے تو مجھے
پانیوں پر ہی ذرا پاؤں جمانے دینا

شہر محروم نہ زنجیرِ صدا سے ہو جائیں
چند دیوانوں ہی کو شور مچانے دینا

مجھ کو محسنؔ ہو شکایت تو بھلا کیونکر ہو
میرے یاروں کا وطیرہ رہا طعنے دینا

○

غزل

محسن احسان

لفظ کاغذ پہ لکھا بارِ اذیت اُترا
اک غزل کہہ لی تو زنگارِ طبیعت اُترا

بھوک سے مرتے رہے خیمۂ افلاس میں لوگ
آسماں سے نہ مگر خوانچۂ نعمت اترا

ماں نے تعویذ بھی باندھا مرے بازو پہ مگر
پھر بھی سر سے نہ یہ سودائے محبت اترا

دل سرائے میں تمنائیں ہیں سر نیہوڑائے
کون بستی میں وہ مہمانِ مسرت اترا

اپنے قد کی اُسے پہچان بہت مشکل تھی
سر سے جب طرّۂ دستارِ فضیلت اترا

میں نہ غم خوارِ شہنشہ، نہ طلبگارِ کُلہ
مجھ پہ کس واسطے آشوبِ قیامت اترا

بانوئے شہرِ ادب کے لیے اِس عہد میں حرف
کتنا بے مایہ و محرومِ صداقت اترا

سر کی فصلوں کو بچا لے گئے سب لوگ مگر
صرف محسنؔ سرِ میدانِ ہلاکت اُترا

○

غزل

اختر ہوشیارپوری

اپنے اندر کا آدمی نہ رہا
مر گیا میں تو کوئی بھی نہ رہا

پانیوں میں جزیرے ابھرے ہیں
شکوۂ رنجِ ناخدا نہ رہا

یوں در و بام کو میں دیکھتا ہوں
جیسے اس شہر میں کبھی نہ رہا

کیا لکیروں کو کھینچ کر کرتا
نقش و کاغذ میں ربط ہی نہ رہا

شہر در شہر اُس کی تصویریں
ذکر جس کا گلی گلی نہ رہا

سب کو اپنا لیا ہے موسم نے
کوئی پت جھڑ میں اجنبی نہ رہا

ذات و زنداں میں فاصلے کیسے
میں وہاں ہوں جہاں کوئی نہ رہا

آئنے بھی شکست خوردہ ہیں
اپنے چہرے کا عکس بھی نہ رہا

حرف و آوازِ حرف ایک ہوئے
کوئی عنوانِ خامشی نہ رہا

کٹ گئی رات اب تو آ جاؤ
اب تو آنکھوں میں خواب بھی نہ رہا

بات ہو بھی تو کس سے ہو اختر
وہ جو اک شخص تھا وہی نہ رہا

○

غزل

اختر ہوشیارپوری

تصویر میں رنگ بھر رہا ہوں
میں رات کو صبح کر رہا ہوں

شاید وہ صدا ہو سب کے دل کی
جو بات میں کہتے ڈر رہا ہوں

سچا ہوں کہ جھوٹ بولتا ہوں
اور آپ ہی پھر مکر رہا ہوں

دریاؤں سے آشنا ہوں کب کا
اک عمر کنارے پر رہا ہوں

جو زخم ابھی لگے نہیں ہیں
وہ زخم ابھی سے بھر رہا ہوں

جتنا کہ میں جانتا تھا خود کو
اتنا ہی میں بے خبر رہا ہوں

نظروں میں رہیں کھلی فضائیں
ہر چند شکستہ پر رہا ہوں

شاید کوئی مجھ کو جانتا ہو
اس شہر میں عمر بھر رہا ہوں

ماتھے کا لہو یہ کہہ رہا ہے
اختر میں کشیدہ سر رہا ہوں

غزل

اختر ہوشیارپوری

گھر سے میں ہی نہ اکیلا نکلا
چاند بھی رات کو تنہا نکلا

بند آنکھوں سے بھی دیکھے کئی خواب
جاگتے میں یہ کدھر آ نکلا

مینہ کی ہر بوند جڑوں تک اُتری
شہر کا شہر ہی پیاسا نکلا

اپنی آواز کے پیچھے پیچھے
میں نہ نکلا مرا سایا نکلا

پاؤں پاتال میں سورج سر پر
یہی جینے کا قرینہ نکلا

دشت در دشت ہیں گلیاں آباد
دُور تک شہرِ تمنّا نکلا

عمر بھر اپنے مقابل جو رہا
اُس سے تو خُون کا رشتہ نکلا

تتلیاں اُڑ کے جہاں بیٹھی ہیں
وہ تو اک ریت کا ٹیلہ نکلا

سر کو ٹکرا تو رہے ہو یارو!
کیا کرو گے جو نہ رستہ نکلا

جتنا لوگوں کو نظر آتا تھا
زخمِ جاں اُس سے بھی گہرا نکلا

میرا ہمزاد وہ کب تھا اختر
اجنبی تھا جو شناسا نکلا

○

غزل

اخترھوشیارپوری

احساں ہیں دھوپ پر شجر کے
ہم بھی ہیں شہید اسی ہنر کے

پلکوں پہ چراغ جل رہے ہیں
سینے میں شرار ہیں سحر کے

شاید کوئی شہر اس جگہ تھا
پاتا ہوں نشان بام و در کے

اک ردِّ عمل مسافتوں کا
نظروں میں یہ فاصلے سحر کے

ایک ایک چراغ بجھتے دیکھا
اللہ رے حوصلے نظر کے

بستی کا نظارہ خوب تر تھا
پچھتائے ہیں بام سے اتر کے

اب خوف نہیں ہے پتھروں کا
ممنون ہیں ایک شیشہ گر کے

طوفاں کو صدائیں دے رہے ہیں
یہ لوگ ہیں جانے کس نگر کے

سورج بھی ابھرتا دیکھتے ہیں
اور عیب بھی گنتے ہیں سحر کے

ہر چند کہ گھر بنا لیے ہیں
محتاج ہیں پھر بھی اپنے گھر کے

یہ صحن کشادہ یہ کھلی چھت
کیوں راستے ڈھونڈیں ہم مفر کے

دہلیز پہ نقشِ پا کی سرخی
دیوار میں تذکرے ہیں در کے

دستک تھی ہوا کی لوگ پھر بھی
نکلے نہ گھروں سے مارے ڈر کے

اے صورِ قیامت اک ذرا صبر
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

زنداں سے فصیلِ جاں تک اختر
چرچے ہیں چراغِ راہگزر کے

○

غزل

محشر بدایونی

تا ختمِ سفر گرمیِ رفتار ملی ہے
سایہ نہ ملا، دھوپ تو غمخوار ملی ہے

کیا فخر کریں، یہ بھی ہے کچھ ملنے میں ملنا
سر رکھ دیا قدموں پہ تو دستار ملی ہے

دُور ایسے کہ جس طرح کنارے ہوں اُفق کے
پاس اتنے کہ دیوار سے دیوار ملی ہے

کیا وقت پڑا دشت کے موسم زدگاں پر
گھر جل گئے کب کے خبر اس بار ملی ہے

اک حرفِ جنوں کہہ نہ سکا مجھ سے تو محشرؔ
زنجیر ہی اچھی، جسے جھنکار ملی ہے

○

غزل

محشر بدایونی

سکوت کیسا جب اِس طرح رُوح جلنے لگے
زباں رُکے تو دُھواں جسم سے نکلنے لگے

ہوا وہ تُند ہے کہ دم بھر جو بادباں جُھک جائے
سفر کدھر کا ہو، کشتی کدھر کو چلنے لگے

نکل کے دشت سے بستی کی شام کیا دیکھی
چراغ جلنے سے پہلے مکان جلنے لگے

یہ روح ایسی سفر دوست تھی کہ اب شاید
ندائے قافلہ آئے تو قبر چلنے لگے

کچھ ایسے ڈھب سے ہیں سنبھلا نفس نفس جیسے
پرندہ شاخ کی ہر لہر پر سنبھلنے لگے

○

غزل

ظفر اقبال

سرسوں، خواب، ہوا، تصویر
کیسی چھوڑ گیا تصویر

بے منظر، بے خط، بے رنگ
ایسی ایک بنا تصویر

پیاسا ہو تو پی اُس کو
بھوک لگے تو کھا تصویر

دن بھر شہر کی سیر کرا،
رات کو ساتھ سُلا تصویر

جب وہ واپس آئے گا
پھاڑ کے پھینکے گا تصویر

آہٹ تھی دروازے پر
پوچھا، کون؟ کہا، تصویر

پڑھا محبت کا مضمون
بے مقصد، اور، با تصویر

ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں
کیا گلدستہ، کیا تصویر

کچی باتیں چھوڑ، ظفر
یوں بنتی ہے بھلا تصویر

○

غزل

ظفر اقبال

دیکھنا ہے وہ مجھ پر مہربان کتنا ہے
اصلیت کہاں تک ہے، اور، گمان کتنا ہے

کیا پناہ دیتی ہے، اور یہ زمیں مجھ کو
اور، ابھی مرے سر پہ آسمان کتنا ہے

کچھ خبر نہیں آتی کس روش پہ ہے طوفاں
اور، کٹا پھٹا باقی بادبان کتنا ہے

توڑ پھوڑ کرتی ہیں روز خواہشیں دل میں
تنگ ان مکینوں سے یہ مکان کتنا ہے

سوچیے تو بڑھ کر ہے خواب سے خیال اُس کا
زخم کتنا چھوٹا تھا، اور، نشان کتنا ہے

ایک بھی نہیں ہوتی بات کام کی، ورنہ
رابطہ مرے اُس کے درمیان کتنا ہے

حرفِ آرزو سُن کر جانچنے لگا، یعنی
اس میں بات ہے کتنی، اور، بیان کتنا ہے

شکریہ تعاون کا، صرف یہ بتا دیجے
اِس میں قرض ہے کیا کچھ، اور، دان کتنا ہے

پھر اُداس کر دے گی سرسری جھلک اُس کی
بھول کر یہ دل اُس کو شادمان کتنا ہے

○

غزل

احمد ظفر

اپنے ہی کسی سائے سے ٹکرایا ہوں پھر بھی
محسوس یہ ہوتا ہے یہاں آیا ہوں پھر بھی

کاغذ پہ سیاہی کی طرح پھیل رہا ہوں
یہ حرفِ ندامت نہیں شرمایا ہوں پھر بھی

ہر چند سفر درد کے دریا کا سفر تھا
ساحل کے کسی خواب سے گھبرایا ہوں پھر بھی

ساغر میں سرِ شام لہو میرا ملا ہے
اک نشۂ بے نام میں لہرایا ہوں پھر بھی

ہر چند کسی جیتنے والے نے صدا دی
ہارے ہوئے لوگوں میں چلا آیا ہوں پھر بھی

ملتے ہی رہے زخم مری کشتِ بدن کو
احساس کے ہر پھول کا سرمایہ ہوں پھر بھی

سورج کے مقابل تھا ظفر دشتِ سحر میں
میں پیاس کے صحرا میں کوئی سایا ہوں پھر بھی

○

غزل

احمد ظفر

گھر میں لڑائیوں کے سوا اور کچھ نہیں
یوسف کے بھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں

نیکی کے ہر عمل کو بہا کر جو لے گیا
دریا برائیوں کے سوا اور کچھ نہیں

دستِ خزاں نے پھول کے ماتھے پہ لکھ دیا
اب جگ ہنسائیوں کے سوا اور کچھ نہیں

شہرِ انا کی پوری مسافت عذاب ہے
رستے میں کھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں

کیوں آئنہ دکھایا دلِ داغ داغ نے
چہرے پہ چھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں

ملنے دیا نہ ان سے بچھڑنے کے خوف نے
دنیا جدائیوں کے سوا اور کچھ نہیں

کچھ دوستوں سے کہیے ظفرؔ فنِ دوستی
کیا کج ادائیوں کے سوا اور کچھ نہیں

○

ویرانے کی ایک شام

احمد ظفر

نیلے روشن آسماں کی بے حسی
زرد سورج کو نگلنے کے لیے بے تاب ہے
چاند گہرے کاسنی پھولوں کا غم
سر پہ دونوں ہاتھ رکھے زندگی
جسم بے زنجیر لمحوں کا اسیر

دُور خیمے میں سکوتِ منجمد
جیسے گویائی سے عاری آگہی
پھن اٹھائے ناگ اندھے راستے
پھیلتے بڑھتے ہوئے سب فاصلے

آہٹیں بنجر زمیں کی دھڑکنیں
اور کاغذ پر وہی کالے حروف
روشنی کی جھیل میں اک لرزش پیہم کسی کی بے دلی
ناچتے آسیب صحرا اور سراب
خواب اور تعبیرِ خواب

○

موسمِ ہجر کے نام

احمد ظفر

اے مرے ہجر کے چپ چاپ سلگتے موسم
زندگی درد کا دریا ہے کہ مدھم مدھم
ایک بے نام سمندر میں اُتر جاتا ہے!
عارض و لب کے کسی پھول میں خوشبو بھی نہیں
دیکھتے دیکھتے ہر پھول بکھر جاتا ہے!
آئنہ دل کا شکستہ ہے تو آنکھیں پُرنم

میرے چہرے پہ سرِ شام جو کبھی تُو نے
وہ عبارت کسی پتھر پہ لکھی جاتی ہے
پھول چُننے کی تمنا کا گنہگار ہُوں میں
کیوں مجھے راہیٔ گمنام لکھا ہے تو نے
اے کسی وادیٔ دلدار کے خاموش ستم

آذرِ یاس کہیں خاک بسر بیٹھا ہے
چاند اک راہیٔ بے خواب رواں ہو جیسے
رات کے پاس کسی زلف کی تحریر نہیں
منجمد لمحوں کے ہونٹوں پہ فغاں ہو جیسے
زندگی ایک سفینہ غمِ تنہائی میں
ساحلِ زیست کا ہر نقش ہے مبہم مبہم

○

قربتیں اور فاصلے

خاطر غزنوی

وہ بہت خوش پوش تھا

بخشا کرتا تھا شرف بس چند لمحوں کے لیے ملبوس کو

اب مگر پتھر کا جامہ زیبِ تن کر کے ابد تک کے لیے

سو یا ہے وہ

وہ بہت خوش ذوق تھا

ایک چیدہ نو دمیدہ پھول سے کالر سجاتا تھا

مگر

آج ڈھیروں پھول اس کی قبر پہ

اپنی خوشبو اپنے سینوں میں دبائے سوچتے ہیں

اتنی قربت

اور

اتنے فاصلے ؟

○

تتلیاں اُڑ گئیں

خاطر غزنوی

پیلی مرجھائی ہوئی کرنوں کے دھاگے یوں بکھر کر
چیختی دھرتی پہ پھیلے
زندگی گہنا گئی
خندہ رو، روشن فضائیں، تیرگی کا وار سہہ کر سو گئیں
صبحدم کلیاں جو کھل کر خوشبوؤں، رنگوں میں گھل کر جھومتی تھیں
الجھنوں میں کھو گئیں
اب بھی ان دھندلائی اور تشنہ فضاؤں میں
پرندے اُڑ رہے ہیں
شوخیوں سے سب مگر بے بہرہ ہیں
یُوں
جیسے سب کوئی حسیں شے کھو چکے ہوں
سب کے سب ڈاروں میں یکجا، سرنگوں
دن کے سارے چونچلے، چونچیں بھلا کر جا رہے ہوں
سرنگوں لیکن کھلی آنکھوں سے دھرتی میں ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں
آسماں نے جانے کتنے رنگ بدلے ہیں
چمن کی ہر کلی نے پھول بن کر پتی پتی ہو کے گرنے تک
ذرا جھپکی نہیں ہے آنکھ
حیراں سوچتی ہے
سب کے سب دریوزہ گر تھے
اپنی اپنی منزلوں سے بے خبر تھے

سنہرے خواب کا معمار

خاطر غزنوی

چمن کا رنگ گلوں کی ادائے خاص سے ہے
فضا کا حُسن طیور صبا شناس سے ہے

زمیں کی کوکھ میں اقلیمِ مورِ بے مایہ
شجر پہ شہرِ مگس نہرِ انگبیں لایا

گلی گلی پہ سگوں نے شبوں میں راج کیا
ملخ ملخ کو زمیں نے ادا خراج کیا

جہاں میں لائی ہے ہر چیز فطرتِ آزاد
مگر ہمارا مقدر تھا پنجۂ صیاد

دیارِ شرق پہ چھایا تھا غرب کا سایا
بشر بشر تھا یہاں بے بساط و بے مایا

پرائے دیس کے سوداگروں نے چھین لیا
مرے وطن کا تقدس، مری نظر کی ضیا

وقار و عزت و ناموس اُن کے پاؤں میں تھی
بدیسی بُوٹوں کی پھنکار جن کھڑاؤں میں تھی

مرا وطن کہ مرا تھا مگر مرا نہ رہا
سبھی کو تلخیٔ احساس تھی، خدا نہ رہا؟

مگر خدا کو تھا منظور لَا اِلٰہ کا بھرم
بنی ہماری طلب حُسنِ کوششِ پیہم

وہ اک فرشتہ تھا، بھیجا ہوا خدا کا تھا
شعورِ زخمِ وقار و علاج لایا تھا

وطن کو منزلِ گُم کردہ کا شعور دیا
غلام قوم کو آزادیوں کا طور دیا

ہزار پیچ و خمِ راہ کو عبور کیا
جو داغ داغ اُجالا تھا نور نور کیا

وہ فکرِ شاعرِ ملّت کا ہم خیال بنا
سنہرے خواب کی تعبیر کا جمال بنا

غزل

علی احمد جلیلی

وقت کے لب پہ تبسم جو اُبھر آیا ہے
ہو نہ ہو آج مری لاش اٹھا لایا ہے

اب وہ گرتی ہوئی دیوار کا سایہ ہی سہی
ہم تو بیٹھے ہیں وہیں تھک کے جہاں سایا ہے

اشک بیچین ہیں آنکھوں سے ٹپکنے کے لیے
کسی ہمدرد کا دامن جو نظر آیا ہے

میرے ہی جسم کے ٹکڑے ہیں یہاں راہوں میں
چارہ گر مجھ کو کہاں لے کے چلا آیا ہے

لوگ صحرا کی جسے دھوپ سمجھ بیٹھے تھے
میرے ہی جسم کا جلتا ہوا وہ سایا ہے

کون زخمی نہیں اس دور میں فرق اتنا ہے
کوئی شیشے سے کوئی سنگ سے ٹکرایا ہے

تھا علی وہ مرے احساس کا مقتول بدن
اپنے ہاتھوں سے جسے خاک میں دفنایا ہے

○

غزل

علی احمد جلیلی

اچھی معاملت یہ مرے ساتھ کی گئی
پردہ اُٹھا کے مجھ سے نظر چھین لی گئی

کیا جانے کیوں مجھی پہ رہی وقت کی نظر
ہر زاویے سے میری ہی تصویر لی گئی

جس ناگوار بات کا وارث کوئی نہ تھا
وہ بات میرے نام سے منسوب کی گئی

سرخم کیا نہ وقت کے آگے حیات نے
جتنا تھا زہر جام میں بھر بھر کے پی گئی

کانٹے دیے بہار نے بخشی خزاں نے دھول
کس اہتمام سے مری جھولی بھری گئی

تھا سر سے پاؤں تک وہ بدن دیکھنے کی چیز
جس جا پڑی نگاہ، وہیں چھوڑ دی گئی

ساری فضا چمن کے امیں لوٹ لے گئے
جتنی گھٹن تھی میرے لیے چھوڑ دی گئی

کیسے کہوں کہ شہر تھا اپنا ہی وہ علی
جس شہر میں متاع ہنر بیچ دی گئی

○

غزل

غالب احمد

اپنے گھر سے میرے گھر تک کچھ لمحوں میں آئے گا
اتنی مسافت میں لوگوں کو کتنے رنگ دکھائے گا

دھوپ تھی سرسوں کی کیاری میں دونوں مل کر سوئے تھے
یہ منظر بھی ساتھ ہمارے در در ٹھوکر کھائے گا

پھر وہ شاعر رات گئے اس شہر میں تنہا پھرتا ہے
اُس کو کہنا صبر کرے ملنے کا موسم آئے گا

ساری رات وہ ساتھ رہا سائے کی طرح ہم سے کچھ دور
ہم بھی ساتھ لگے رہتے ہیں کبھی تو مل ہی جائے گا

رات کی کالی چادر لے کر دن بھر سوئے رہتے ہیں
دیکھیں کب وہ سورج بن کر ہمیں جگانے آئے گا

○

غزل

غالب احمد

ٹوٹ کے سارے درد سے رشتے، آسودہ، آسان ہوئے
باغِ اِرم میں واپس آئے پھر سے نیم انسان ہوئے

کُل سے جُز کی طرف مسافت صفت ہوئی انسانوں کی
ریگِ رواں کی سیر بہت کی، دشت بنے ویران ہوئے

اُن کو زُعمِ خود آگاہی تھا ہم مجذوبِ تمنّا تھے
اپنی ذات کے دو رُخ دیکھ کے دونوں ہی حیران ہوئے

اُن کے پیار میں اپنی حدوں سے آگے گزر کر بھی دیکھا
لیکن جب وہ سامنے آئے اپنا ہی امکان ہوئے

حیرت کی اگلی وادی میں ایک انوکھا منظر تھا
خواہش، خواب، خیال، خوشی، سب ان پر قربان ہوئے

جب سے دِل والوں نے کہا ہے عشق خلل ہے دماغوں کا
کون کہے گا شعر یہاں اب شاعر تجزیہ دان ہوئے

○

غزل

صادق نسیم

نہاں سکوت کے پردے میں بھی صدا ہے کوئی
کہ جیسے مجھ کو کہیں سے پکارتا ہے کوئی

فراق و وصل کا جادو نہ چل سکے گا یہاں
کہ دشت دشت ہوں میں اور صبا صبا ہے کوئی

جہاں میں یوں تو بڑی شے ہے اعتبارِ نگہ
مگر نگاہ سے آگے بھی سلسلہ ہے کوئی

جسے نظر نے کیا انتخاب وہ تو ہے
جو میرے دل میں ہے وہ تجھ سے بھی سوا ہے کوئی

جو تیرا بزم نشیں ہے وہ میں سہی پھر بھی
جو مجھ میں نغمہ سرا ہے وہ دوسرا ہے کوئی

عجیب شعلہ اثر تھا کسی کا وعدۂ شب
چراغ جلنے سے پہلے ہی جل اُٹھا ہے کوئی

وہی بتائے کہ جو اس کی سمت دیکھ سکے
وہ رنگ ہے کوئی خوشبو ہے یا ضیا ہے کوئی

اسی کو دیکھ کے اپنا پتہ ملے صادقؔ
وہ آئنہ نہ سہی آئنہ نما ہے کوئی

○

غزل

صادق نسیم

پھول ہی کی نہیں ہے یار غزل
خار کی بھی ہے غم گسار غزل

ٹھنڈی ٹھنڈی صبا کی طرح لگے
اور کر جائے شعلہ بار غزل

شبنستاں دکھائی دیتی ہے
اور ہوتی ہے شعلہ زار غزل

کس سے بچھڑا ہوا ہوں میں کہ رہی
عمر بھر مجھ سے ہم کنار غزل

تھی مرے لب پہ آنے سے پہلے
تیری آنکھوں سے آشکار غزل

راز جو مجھ کو بھی نہیں معلوم
اُن میں بھی میری راز دار غزل

ترا صادق ترا قصیدہ کہے
اور ہو جائے بار بار غزل

○

غزل

صادق نسیم

اس احتساب میں دونوں کی جگ ہنسائی نہ ہو
ترا لباس کہیں میری بے ردائی نہ ہو

جسے زمانہ تری زور آزمائی کہے
وہی کسی کے لیے صبر آزمائی نہ ہو

ہر اک تھرکتی ہوئی لَو کے ساتھ رقص نہ کر
چراغ اپنے سہی روشنی پرائی نہ ہو

وُہ دَورِ اہلِ غرض ہے کہ یہ گماں گزرے
مری وفا بھی کہیں کاسۂ گدائی نہ ہو

وہ آپ اپنی طرف سے کہے مرے احوال
میں خود کہوں تو مجھے اِذنِ لب کشائی نہ ہو

تقدسِ سحر و عظمتِ اذاں کی قسم
وہاں چلیں کہ جہاں شورِ پارسائی نہ ہو

جہاں نماؤں کو دیکھوں تو یہ خیال آئے
کہ جامِ جم بھی کہیں جامِ خود نمائی نہ ہو

ہزار سامریٔ عجز بن کے پیش آئیں
یہاں ہے کون جسے زعمِ کبریائی نہ ہو

تھے دست و بازوئے اعدا تو آزمائے ہُوئے
خود اپنے آپ سے ہی ہم نے مات کھائی نہ ہو

یمِ حیات میں گرداب بن کے رہ جائیں
ہمارے دل میں جو عزمِ گرہ کشائی نہ ہو

○

غزل

سیف زلفی

اے سُوکھے ہوئے کھیت کی بے چین مراد و — تپتی ہوئی دھرتی سے، گھٹاؤں کو صدا دو
میں پھر بھی تمہارے ہی تصرّف میں رہوں گا — آنگن سے اٹھا کر مجھے گملے میں لگا دو
کس کس کو سناؤ گے تم اس گھر کی حکایت — کافی ہے کواڑوں پہ مری شکل بنا دو
اس زہرِ ہلاہل کو چھپانا بھی ہے لازم — سقراط کے کاسہ میں ذرا شہد ملا دو
مظلوم کا یہ خون قیامت نہ جگا دے — اس دور کے بے تاج یزیدوں کو جگا دو
میرے بھی خیالوں میں مچلتی ہے بغاوت — مجھ کو بھی ذرا ظلم کی تھپکی سے سُلا دو
زندہ تھا، تو تم نے مجھے کانٹوں پہ گھسیٹا — اب لاش ہوں، تو لاش کو ریشم کی قبا دو
تم پیڑ بھی کاٹو، تو نہ اُٹھے کوئی آواز — ہم شاخ بھی چھو لیں، تو میاں! شور مچا دو
ہم مردہ نصیبوں کے لیے حکم ہوا ہے — سُوکھے ہوئے پتّے ہیں انھیں آگ لگا دو
بے رُوح بدن کوئی بھی خواہش نہیں رکھتا — اب دفن کرو یا مجھے دریا میں بہا دو

زلفی کی جبلّت میں دریدہ دہنی ہے
اُس شوخ کے ہونٹوں پہ ذرا ٹیپ جما دو

○

غزل

سیف زلفی

احساس کی جانسوز کراہوں میں لکھا تھا
اس نے مجھے پت جھڑ کی ہواؤں میں لکھا تھا

کاغذ پہ مصوّر نے اتارا تو نہ اُترا
اُس کا جو سراپا مرے شعروں میں لکھا تھا

توہینِ مشیّت تھی، اگر ہاتھ چھڑاتا
اُس شخص سے، جو مرے نصیبوں میں لکھا تھا

یہ زہر تو امرت کی طرح میں نے پیا ہے
یہ زہر تو قسمت کے پیالوں میں لکھا تھا

یہ درد کسی اور کو ملتا بھی تو کیسے
یہ تو مرے ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا تھا

اس خواب کو ساحل کی تمنّا بھی نہیں تھی
وہ خواب جو اشکوں کے جزیروں میں لکھا تھا

ٹھہرا ہوں، تو اشکوں نے لہو چھان دیا ہے
کانٹوں پہ پڑاؤ مری راہوں میں لکھا تھا

اس خط نے بھرے گاؤں میں اک دُھوم مچادی
وہ خط جو تجھے دھان کے کھیتوں میں لکھا تھا

کٹ جائے گا سر ظلم کے آگے نہ جُھکے گا
اتنا مرے پرکھوں نے کتابوں میں لکھا تھا

اندر بھی وہی حشر ہے، باہر بھی وہی حشر
دل کا ہے وہی حال جو آنکھوں میں لکھا تھا

میں اپنی ہی حدّت میں پگھل جاؤں گا زلفی
یہ درد کا شعلہ مری سانسوں میں لکھا تھا

○

غزل

سیف زلفی

ظلم کے خنجر تلے، تڑپے نہ تڑپے، آدمی
مقتلِ احساس میں ہے ٹکڑے ٹکڑے، آدمی

اب قلم میں بَین ہے، لفظوں کی شہنائی نہیں
لکھ رہا ہے وقت کی قبروں کے کتبے، آدمی

شہر کی گلیوں میں بھی، اب کوئی سچائی نہیں
روشنی پہنے ہوئے پھرتے ہیں کالے آدمی

اس نگر کے بیل بُوٹے، پھُول پھل سکتے نہیں
آگ پیتا ہے یہاں پانی کے بدلے، آدمی

دوست کب برسے گی اس گلشن پہ رحمت کی گھٹا
کب تلک چاٹا کریں گے اوس، پیاسے آدمی

اتنے دکھیاروں کی چیخیں، اتنے دھن والوں کا شور
اس بھرے بازار سے کیا کیا خریدے، آدمی

تا بکے ہمت کرے گا، آخرش گر جائے گا
تھک چکا ہے پتھروں پہ چلتے چلتے، آدمی

رنگ کجلایا دُکھوں نے، فکر سے خم ہے کمر
نوجوانی میں نظر آتے ہیں بُوڑھے، آدمی

آجکل تو چُوستا ہے زندہ جسموں کا لہو
کل وہ دَور آئے گا جب کھائے گا مُردے، آدمی

اس طرح گُم صُم ہیں، گویا بولتے سُنتے نہیں
مصلحت سے بن گئے ہیں گونگے بہرے، آدمی

سیف زلفی داؤں لگ جائے اگر بازار میں
تولتے ہیں پتھروں کے مول ہیرے، آدمی

○

غزل

سیف زلفی

تم فن تو کجا، فن کی لگن بھی نہیں رکھتے
سورج تو بڑی شے ہے کرن بھی نہیں رکھتے

ہم ذہن بھگو دیتے ہیں بوچھار کی صورت
ہم ابر ہیں، لہجہ میں تھکن بھی نہیں رکھتے

آوارہ ہواؤں کے مچلتے ہوئے جھونکے
آزاد ہیں ایسے کہ وطن بھی نہیں رکھتے

تم ان سے گلابوں کی حنا مانگ رہے ہو
یہ لوگ تو ادراکِ چمن بھی نہیں رکھتے

ڈستے ہیں تو ڈسنے کا پتہ بھی نہیں چلتا
یہ سانپ ہیں وہ سانپ، جو پھن بھی نہیں رکھتے

تم کیوں مری کھیتی کا پتہ پوچھ رہے ہو
تم لوگ تو برکھا کا چلن بھی نہیں رکھتے

یہ کیسا چمن ہے نہ چہکنا نہ مہکنا
یہ صورتِ معصوم تو بن بھی نہیں رکھتے

دنیا انھیں جینے کا کوئی حق نہیں دیتی
وہ لوگ جو آہن کا بدن بھی نہیں رکھتے

ہم لوگ ترے پیار کی خوشبو میں مگن ہیں
ہم اور کسی گل کی لگن بھی نہیں رکھتے

رکھتے ہو جہاں پاؤں، کھلا دیتے ہو غنچے
یہ چال تو جنگل کے ہرن بھی نہیں رکھتے

ہم خود سے مخاطب ہی ہوا کرتے ہیں زلفی
دنیا کی طرف روئے سخن بھی نہیں رکھتے

○

غزل

سیف زُلفی

کوئی گیتا ، کوئی قُرآن نظر آتا ہے
سچّے انسان میں بھگوان نظر آتا ہے

کاغذی پھُول سے اُڑتی ہوئی تتلی نے کہا
باغ اب ریت کا میدان نظر آتا ہے

زرد ، گرتے ہوئے پتّے ، یہ چٹختی شاخیں
اس نئے پیڑ کو سرطان نظر آتا ہے

کوئی چہرہ ، کوئی دیوار یا اخبار پڑھو
ایک رنگ ایک ہی عنوان نظر آتا ہے

آج ہر گھر میں کوئی وقت کا یوسف ہے اسیر
آج ہر گھر مجھے زندان نظر آتا ہے

غم و اندوہ کی دلدل میں مرا رخشِ قلم
دوڑتے دوڑتے ہلکان نظر آتا ہے

ہر طرف آتش و آہن کی چمک ہے یارو
اک نئی جنگ کا امکان نظر آتا ہے

"روریانے" ہوئے کتّے ، یہ ہواؤں کا ہراس
رات کو شہر بھی شمشان نظر آتا ہے

طائرِ فکر کی پرواز کی رو میں زلفی
اک نئی سمت کا وجدان نظر آتا ہے

○

غزل

اسرار زیدی

گم ہوتی ہوئی فصلِ شبِ ماہ نہ دیکھو
میں صبحِ سفر میں ہوں میری راہ نہ دیکھو

ہنگامِ ہزیمت ہو تو پھر طبل و عَلم کیا
اب کوئی بھی حیرت سرِ جنگاہ نہ دیکھو

دستک بھی جو دو گے تو کوئی در نہ کُھلے گا
اِک سَیلِ بلا ہے یہ گذرگاہ نہ دیکھو

ہر شخص کہاں شمع کے مانند جلا ہے
یوں ہر سفر آمادہ کو ہمراہ نہ دیکھو

ہم اپنے ہی خوابوں کے جزیرے میں گھرے ہیں
اس قریۂ غم کا حشم و جاہ نہ دیکھو

○

غزل

اسرار زیدی

آنیوالی کل کی دے کر خبر گیا یہ دن بھی
ماہ و سال کی سیڑھیوں میں اُتر گیا یہ دن بھی

لمحہ لمحہ، ساعت ساعت، پَل پَل میں تقسیم ہوا
ریزہ ریزہ، ہوتے ہوتے، بکھر گیا یہ دن بھی

اِس کی تابانی پر کتنے ہی سُورج قربان ہُوئے
اپنے ہونے کا دُکھ سہہ کر مگر گیا یہ دن بھی

سرد ہوا کا جھونکا تھا جو سناٹوں کو چیر گیا
کتنے دلوں پر دستک دے کر گزر گیا یہ دن بھی

ہم تو اپنی نیندوں میں خوابوں کو جگا کر خوار ہوئے
موجِ سراب میں ڈھل کر جانے کدھر گیا یہ دن بھی

○

تزئینِ غم

احسن علی خاں

۱

تزئین جتنی پیاری تھی
اُس کا غم بھی اُتنا ہی پیارا ہے
اُس کا چہرہ
جنتِ نگاہ
اس کی آواز
فردوسِ گوش
اور اس کا وجود
ہماری زندگی کا حاصل تھا
موت نے یہ حاصل چھین لیا
اور اس کے عیوض ایک غم دیدیا
اور یہ غم ہی ہماری زندگی کا حاصل ہے

۲

تزئین کا غم ایک درد بن گیا ہے
یہ درد جسمانی نہیں ہے
یہ تو رُوح کی گہرائیوں سے اٹھتا ہے
اور آسمان کی بلندیوں کو چھُوتا ہے
اور عرش و کرسی ہِل جاتے ہیں

عرش و کرسی اُس وقت تک ہلتے رہیں گے

جب تک وہ ماں باپ زندہ ہیں
جن کی جوان اولادیں ان سے چھین لی گئی ہیں

۳

جب میں بیمار پڑتا تھا
یا تم بیمار ہوتی تھیں
تزئین بیٹی کتنی گھبراجاتی تھی
ایکبار میری بیماری سے وہ خوفزدہ ہوگئی
ایکبار تمہاری ناک سے خُون بہا تو اُسے کھٹکا سا لگ گیا
وہ کہتی
"امّی آپ کو کچھ ہوگیا تو میرا کیا ہوگا"
اور پھر یُوں ہُوا
خود اُسے کچھ ہوگیا اور وہ چلی گئی
اُسے ماں باپ کی جُدائی کے ڈر سے ہی نہیں
دُنیا کے ہر خوف سے نجات مل گئی

۴

جب تزئین بیٹی
ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئی
ہم نے بین کیے
اور سب کو اپنے غم میں شریک کر لیا
مگر اب کئی مہینے گزرنے کے بعد
تزئین کا غم

اتنا مقدس اور اتنا ذاتی ہو گیا ہے
کہ اس میں کسی کی شرکت گوارا نہیں ہے

۵

جس دن
موت نے میری جوان بیٹی کی رُوح
اس کے جسم سے جُدا کی
اُس دن
میری رُوح کا بھی ایک حصّہ مر گیا
ملک الموت
بعض لوگوں کو
اسی طرح
آہستہ آہستہ مارتا ہے

۶

کچھ لوگ مرنا چاہتے ہیں
مگر ان کو موت نہیں آتی
کچھ لوگ جینا چاہتے ہیں
اور اچانک مر جاتے ہیں
ایسا کیوں ہوتا ہے
کیا قدرت کا قانون بھی
استحصالی طبقوں کے قانون کی طرح
بے انصاف ہے؟

۷

اس فانی اور سپاٹ زندگی میں
ہر وہ لمحہ
جس میں احساس کے پھول کھلتے ہیں
(خواہ وہ احساس غم کا ہو یا خوشی کا)
جس میں خیال کے تارے چھٹکتے ہیں
(خواہ وہ خیال موت کا ہو یا زندگی کا)
کتنا قیمتی، خوبصورت اور اَمر ہو جاتا ہے

○

غزل

احسن علی خاں

بہت اُجڑا ہوا ہے دل، پر ایسا بھی نہیں ہے
کہ خاکستر میں آباد اک شرارا بھی نہیں ہے

یہ دہشت ہے کہ پاسِ خاطرِ ظالم جو لب پر
سزائے جُرمِ ناکردہ کا شکوہ بھی نہیں ہے

یہی وہ چاہتا تھا، ہم ہُوئے مایوس اتنے
کہ اب ایفائے وعدہ کا تقاضا بھی نہیں ہے

مثالِ ماہیِ بسمل عجب ہے دل کا عالم
اُبھرتا بھی نہیں، تہ پر ٹھہرتا بھی نہیں ہے

کنارِ آب ہی تو کربلا تھی، پھر عجب کیا
ہمارے نام پہ دریا میں قطرہ بھی نہیں ہے

کہاں جاؤں میں اپنے شہرِ ناپُرساں سے باہر
جہاں مجنوں بھٹکتا تھا وہ صحرا بھی نہیں ہے

○

غزل

احسن علی خاں

نیلگوں وُسعتِ گماں ہُوں میں
میں سمندر ہُوں، آسماں ہُوں میں

چاند سُورج کو میں نے گہنایا
چاند سورج کے درمیاں ہُوں میں

ہو چکا تار تار سر تا سر
پھر بھی کشتی کا بادباں ہُوں میں

اپنے گھر ہُوں نہ تیری گلیوں میں
نہیں معلوم اب کہاں ہُوں میں

خود سے گزروں تو تیری سمت آؤں
راہ میں پہلا امتحاں ہُوں میں

پھر بھی اظہارِ ذات ہو نہ سکا
حرف ہوں، لفظ ہوں، بیاں ہُوں میں

○

غزل

احسن علی خان

یہ ہست و بُودِ نقوش، طفلِ ہوا کا اک مشغلہ ہو جیسے
ہماری ہستی بھی ریگِ صحرا پہ نقشِ دستِ صبا ہو جیسے

ابھی کہیں کچھ مِٹا ہو جیسے، ابھی کہیں کچھ بنا ہو جیسے
ہم اہلِ دُنیا کی موت ہی کیا، حیات بھی حادثہ ہو جیسے

رہِ وفا میں اب ایسی منزل پہ آ گئے ہیں کہ لگ رہا ہے
ہمارا آغازِ سرکشی ہی مآلِ رسمِ وفا ہو جیسے

نہ کوئی پیغام نے اشارہ مگر یہ عالم ہے اپنے دل کا
کہ اَن کہی بات کا بھی اس نے جواب ہم کو دیا ہو جیسے

اکیلے اپنے ہی دل سے کرتے تھے اس کی باتیں مگر اچانک
ہم ایسے محتاط ہو گئے ہیں کوئی ہمیں سُن رہا ہو جیسے

نگاہ والے کہیں گے حسنِ ستم کہ حسنِ شہادت اِس کو
یُوں دستِ قاتل پہ منجمد ہے لہو کہ رنگِ حنا ہو جیسے

خدا سے مجبوریوں کا شکوہ بجا سہی پر جنابِ انساں!
جہاں بھی مختار آپ ہیں واں لگے ہے قہرِ خدا ہو جیسے

چمن کو تاراج کرنے والوں پہ کون انگلی اٹھائے احسنؔ
کھڑے ہیں لوگ ایسے سر جھکائے کہ ان کی اپنی خطا ہو جیسے

○

غزل

بشیر احمد بشیر

چل پڑی پورب کی پھر خود ہوا دِل ڈر گیا
ابر کا ٹکڑا اُفق سے کیا اُٹھا دل ڈر گیا

جذب دیواروں نے کر لی یا نجانے کیا ہوا
لَوٹ کر آئی نہ جب اپنی صدا دل ڈر گیا

عمر بھر ترسے جسے جس نے کبھی پروا نہ کی
آج کچھ ایسی مروّت سے مِلا دل ڈر گیا

نیم شب ویراں گلی رُکتی ٹھٹکتی چاپ سی
وہم تھا یا پھر نجانے کون تھا دل ڈر گیا

صبر سے ہر بات سُن لی کیا رَوا کیا نا روا
ہم مسافر، صورتیں نا آشنا، دل ڈر گیا

آج پھر شاید انہی سوچوں میں شب گزرے بشیر
شیشموں کی اوٹ میں سورج چھُپا دل ڈر گیا

○

غزل

سیّد یٰسین قدرت

شعلے، صلیبِ غم کے شرر بار کیا ہوئے
صورت کی سرد چھاؤں کے آثار کیا ہوئے

باندھے تھے ایک بلبلِ ہشیار نے کبھی
پھولوں سے وہ وفا کے جو اقرار کیا ہوئے

سایے کی اک جھلک نہیں پڑتی، نواح میں
خیمے تنے ہیں دھوپ کے — اشجار کیا ہوئے

بجلی گئی تو شہر کی گلیوں میں جا بجا
آسیب تیرگی کے نمودار کیا ہوئے

گلشن میں زورِ حبس بپا ہے کچھ اس طرح
ہلتے نہیں ہیں برگ بھی — لاچار کیا ہوئے

آندھی چلی تو ہو گیا سنسان کیا نگر
اُتری بلا تو کوچہ و بازار کیا ہوئے

ویرانیوں کی گود میں سیلاب رہ گیا
بستے ہوئے دیار کے گھر بار کیا ہوئے

ایسے کھلے کہ سارے نظارے نظر میں ہیں
پس منظروں کے جانیے اسرار کیا ہوئے

ہر سُو دیارِ دل میں ہوس کار ہیں رواں
اس شہر میں امنڈتے ہوئے یار کیا ہوئے

آگے تھے وہ جو اس کی وفا کے عَلم لیے
جب رَن پڑا تو سارے عَلمدار کیا ہوئے

مُحسن کُشی کے دامِ حسیں رنگ میں تھے سب
زلفِ ہوس میں لوگ گرفتار کیا ہوئے

لکھتے تھے جو دلوں کی، زمانے کی داستاں
قدرتؔ حقیقتوں کے قلمکار کیا ہوئے

○

غزل

سیّد یٰسین قدرت

ہے دل میں تو پھر حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتا
ویران جزیرے سے صدا کیوں نہیں دیتا

اس پھول کو، جو نذرِ خزاں اس کے لیے تھا
غیورِ چمن دادِ وفا کیوں نہیں دیتا

سرنگے تمازت سے جو ہیں برسرِ پیکار
اب ابر کوئی ان کو ردا کیوں نہیں دیتا

دم توڑتے منظر کو کوئی فیض کا مبدار
دیتا ہے دعا تو یہ دوا کیوں نہیں دیتا

یارا ہے اگر تجھ میں تو پھر ذہن سے اس کی
یادوں کو سرے سے ہی مٹا کیوں نہیں دیتا

قبل اس سے گرے اس پہ کوئی برق ـ پرندہ
خود اپنے نشیمن کو جلا کیوں نہیں دیتا

انجام ہو جو بھی، وہ حقائق کی حکایت
بے باک اگر ہے تو سنا کیوں نہیں دیتا

ہے جُرم کا حامل جو یقیناً ـــــ اسے قدرت
عادل جو یقیناً ہے ـــ سزا کیوں نہیں دیتا

کرتا ہے جو خیرات کا وعدہ ـ وہی قدرت
کچھ دامنِ ایفا کو تھما کیوں نہیں دیتا

غزل

ضمیر اظہر

آنکھوں میں رنگ جن کے دائم سجے ہوئے ہیں
کس دیس میں وہ منظر یا رب بسے ہوئے ہیں

آیا کوئی مسافر، پہنچا نہ کوئی مہماں
دروازے آرزو کے کب سے کھلے ہوئے ہیں

صحرا ہو یا سمندر، کوہسار ہو کہ میداں
ہر سُو برائے منزل رستے بچھے ہوئے ہیں

کیوں خوش نظر نہ آئیں ہم دردمند انساں
چہرے ہمارے آبِ غم سے دُھلے ہوئے ہیں

اُترا ہے جب سے دل میں نشتر حقیقتوں کا
ہونٹوں پہ خامشی کے تالے لگے ہوئے ہیں

اُمید میری اظہر وہ پھول ہے کہ جس میں
بادِ صبا کے ہاتھوں کانٹے چُبھے ہوئے ہیں

○

غزل

ضمیر اظہر

تنہا تنہا، غمگیں غمگیں، چُپ چُپ، گم صُم رہتا ہُوں
چہل پہل اور میلوں والی دنیا میں مَیں اکیلا ہُوں

اپنے آپ میں ڈُوب کے اکثر اپنا نظارا کرتا ہُوں
آپ ہی اپنا آئینہ ہوں آپ ہی اپنا جلوا ہُوں

پھُول بھی ہیں سَو رنگوں والے تتلی جیسی چیزیں بھی
میرا پھُول جُدا ہے سب سے خواب میں جس کے کھویا ہُوں

ریشم جیسی شاخیں اُس کی دل میں میرے پیوستہ ہیں
مخمل جیسی کونپلیں اُس کی آنکھ میں لے کر پھرتا ہُوں

خُونِ محبّت، خاکِ وفا سے قائم ہے بُنیاد میری
کسی کا بازُو، کسی کا شانہ، کسی کا دیدۂ بِینا ہوں

بھُولے بِسرے ہنگاموں کی یادوں میں کیا رکھّا ہے
ماضی کے جالوں سے بچ کر اظہر حال میں رہتا ہُوں

○

غزل

ناصر زیدی

ہم عجب سلسلۂ سیر و سفر رکھتے ہیں
ہر قدم ایک نئی راہ گزر رکھتے ہیں

زد پہ طوفان کی کاغذ کا نگر رکھتے ہیں
لاکھ سیلابِ حوادث ہو مگر رکھتے ہیں

اِس کے باوصف کہ ہر سمت اندھیرا ہے محیط
ہم ہیں وہ لوگ، جو امیدِ سحر رکھتے ہیں

تیری باتیں، تری یادیں، ترے رنگین خطوط
اپنے ہمراہ یہی زادِ سفر رکھتے ہیں

ہم خطا وارِ زمانہ ہیں فرشتہ تو نہیں
ہیں زیاں کار کہ اوصافِ بشر رکھتے ہیں

دل کے جُزدان میں اِک نام سجا ہے ناصرؔ!
ہم کسی حال میں ہوں اُس کی خبر رکھتے ہیں

○

غزل

ناصر زیدی

تجھ کو یہ وہم ہے کہ وہ تیری نظر میں ہیں
طوفانِ برق و باد پرندے شجر میں ہیں

شاید کبھی ہماری ضرورت پڑے تجھے
اب تک اِسی خیال سے ہم رہگزر میں ہیں

صحبت بھی اہلِ علم کی کرتی ہے سربلند
ہم بے ہُنر ہیں، حلقۂ اہلِ ہُنر میں ہیں

جُھک جائے وہ جبیں تو ہمیشہ جُھکی رہے
کچھ ایسی لذتیں بھی مرے سنگِ در میں ہیں

شیشے کے گھر بھی اپنی جگہ خوش نُما سہی
لیکن جو راحتیں مرے مٹّی کے گھر میں ہیں

محفل تمام جن کی نظر پہ ہے ملتفت
ناصرؔ! ہمیں ہے فخر کہ ان کی نظر میں ہیں

○

غزل

اکبر کاظمی

حُسنِ تخئیل کا پیکر ٹھہرا
جو مرے درد کا محور ٹھہرا

رنگ دکھلائے ہواؤں نے بہت
شوق زخموں کا پیمبر ٹھہرا

جانے کس گھر میں جلی ہیں شمعیں
جانے وہ کس کا مقدر ٹھہرا

کون احساس کی تہہ تک پہنچے
کون اس دشت کا سرور ٹھہرا

میں ستاروں کی قبا پہنوں گا
تُو اگر شام کا منظر ٹھہرا

لوگ گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں
کون اس دور کا رہبر ٹھہرا

کاظمی مہر و وفا کا شاعر
گویا خوابوں کا سمندر ٹھہرا

○

غزل

اکبر کاظمی

عکس اپنا مرے آئینۂ دل پر نہ اُتار
میری آنکھوں کے کواڑوں میں ہے غربت کا غبار

جی رہا ہُوں کہ محبت ہے مرا سرمایہ
بعد مرنے کے بھی چاہت ہو مرا لوحِ مزار

جب بھی ٹکراؤں میں الفاظ کی دیواروں سے
حسرتیں بن کے تڑپ اُٹھتے ہیں میرے افکار

حد سے گزرے مرا دشمن یہ دُعا ہے یا رب
رنگ پر آئے تو پھر زخم بھی دیتا ہے بہار

شاید آجائے فلک سے کوئی چھاؤں بن کر
دھوپ میں کب سے کھڑے دیکھ رہے ہیں اشجار

تجھ کو سمجھوں تو میں لکھ لکھ کے کتابیں بھر دُوں
تجھ کو پاؤں تو کتابیں سبھی میری بیکار

میں وُہ شاعر ہُوں سرِ عرشِ تخیّل جس کا
میں وُہ انساں ہُوں تہِ خاک بنے جس کا مزار

میں وُہ احساس ہوں جاگوں تو سویرا ہو جائے
میں وُہ پندار ہوں سوؤں تو اندھیروں کا حصار

سرحدِ کارگہِ فکر سے آگے پہنچا
لے گیا ہُوں میں کراں تا بہ کراں مُشتِ غبار

دل میں چُبھ جاتی ہے خنجر کی طرح نوکِ قلم
آج کے دَور میں آساں نہیں کہنے اشعار

کاظمی وقت کی خونخوار خراشوں سے نہ ڈر
رنگ اُڑ جائیں تو بیکار ہیں سب نقش و نگار

○

غزل

حزیں لدھیانوی

ہجومِ شب میں گھری روشنی کو پہچانو
اجل کے ساتھ لڑو، زندگی کو پہچانو

ہمیشہ چڑھ کے ندی ایک دن اُترتی ہے
زمیں کی پیاس بجھاؤ، ندی کو پہچانو

شجر کی، شاخ کی، گُل کی فسردگی دیکھو
کلی کلی کی کبھی بے کلی کو پہچانو

کٹا نہیں کسی کوہِ ستم کا دل اب تک
خرد سے کام لو، تیشہ گری کو پہچانو

بہاریں دیکھ چکے وجد و بیخودی کی بہت
نئی رتوں میں گلِ آگہی کو پہچانو

جفا مٹا کے چلو، دشمنی کچل کے بڑھو
وفا کی قدر کرو، دوستی کو پہچانو

حزیںؔ اشناخت خدا کی بشر کے بس میں نہیں
یہی بہت ہے کہ تم آدمی کو پہچانو

○

غزل

حزیں لُدھیانوی

نیا شعور، نئی منزلوں کا سورج ہے — بھٹک رہے ہیں جو اُن قافلوں کا سورج ہے

اُسی کے دم سے ہے قائم حیات کی گرمی — وہ شخص میرے لیے سردیوں کا سورج ہے

یہ سُرخ سُرخ دہکتا ہُوا گلاب کا پھول — مہک کا چشمہ ہے، یہ گلشنوں کا سورج ہے

کبھی کبھی جو بھڑکتا ہے شعلۂ آواز — اندھیری رات میں یہ رہروؤں کا سورج ہے

بُجھا دیا جو اُسے بھی تو مر نہ جائیں گے؟ — دِیا اُمید کا تو بیکسوں کا سورج ہے

پڑے گی اُس کی نظر کیسے تیرہ بختوں پر — وہ ماہ پارہ، ابھی محملوں کا سورج ہے

کِھلا ہُوا ہے جو ٹیلے پہ لالۂ خود رو — فقط چراغ نہیں، یہ بنوں کا سورج ہے

کُھلی ہواؤں میں آجائے تو دیا بھی نہیں — ترا وجود، حسیں محفلوں کا سورج ہے

رواں ہیں تپتے ہوئے دشت پر ہم اہلِ وفا — سروں پہ شعلہ فشاں گرمیوں کا سورج ہے

ابھی جو اُلجھا نہیں مسئلوں کی ظلمت میں
وہ ننھا بچّہ، حزیں! آنگنوں کا سورج ہے

○

غزل

مضطر اکبر آبادی

غم سے قریب تر تھا جو لمحہ خوشی کا تھا
عالم عجیب کشمکشِ زندگی کا تھا

امکان سے بعید سمجھنا کسی کا تھا
سمجھے تھے آگہی جسے زخم آگہی کا تھا

رگ رگ میں زہر پھیلا ہوا تشنگی کا تھا
صحرا کی دھوپ تھی کہ سفر زندگی کا تھا

تاریکیوں کی تہہ میں اُترتا چلا گیا
کچھ اس قدر ڈسا ہوا دل روشنی کا تھا

ہونے کے باوجود ہم اُس بزم میں نہ تھے
احساس اگر تھا کوئی تو اپنی کمی کا تھا

نادانیاں تھیں اُس سے جو کی تھیں توقعات
خوش فہمیاں تھیں ورنہ کہاں وہ کسی کا تھا

صبحیں تھیں گرد گرد تو شامیں دُھواں دُھواں
ہم جس جگہ تھے قحط وہاں روشنی کا تھا

تشویش تھی تو بڑھتی ہوئی بندشوں پہ تھی
احساس تھا شدید تو آوارگی کا تھا

مضطرؔ مزاج الگ تھے مگر اس کے باوجود
رشتہ ضرور دھوپ سے کچھ چاندنی کا تھا

○

غزل

مضطر اکبر آبادی

لکھتے ہوئے رکھو گے اگر سچ کا بھرم بھی
یہ انگلیاں پھر ہوں گی بہ ہر حال قلم بھی

کس کس کو بتائیں کہ میسر نہیں غم بھی
کس کس سے چھپائیں کہ تہی دست ہیں ہم بھی

ہو جائے بصارت جو بصیرت سے ہم آہنگ
سب کچھ نظر آئے پسِ دیوارِ عدم بھی

کیا گھونٹے وہاں کوئی گلا اپنی اَنا کا
ہو تنگ جہاں دامنِ اربابِ کرم بھی

روشن بھی سواحد سے ہے تاریک بھی بیحد
کیا چیز ہے آئینۂ ہستی و عدم بھی

گزرے ہیں کچھ اس تیز خرامی سے مسافر
ملتے نہیں راہوں میں کہیں نقشِ قدم بھی

جھکتی ہی چلی آتی ہے چھت بھی مرے سر پہ
بڑھتا ہی چلا جاتا ہے دیوار کا خم بھی

میں شکر و شکایت کے دوراہے پہ کھڑا ہوں
غم میری توقع سے زیادہ بھی ہے کم بھی

رشتوں نے مری راہ میں ہر گام پہ مضطرؔ
وہ جال بچھائے ہیں کہ دشوار ہے رم بھی

○

غزل

راسخ عرفانی

سکوتِ شب سے کہ آوازۂ سحر سے ملے
قرارِ جاں کا حوالہ کسی خبر سے ملے

ہوا نے ایسی بکھیریں خزاں کی تحریریں
بنامِ برگ تراشے شجر شجر سے ملے

طویل شب میں ہے درپیش ظلمتوں کا سفر
گزر گیا ہے زمانہ مجھے سحر سے ملے

بڑی تلاش پہ آخر اُداس جنگل سے
ملے بھی نخلِ تمنّا تو بے ثمر سے ملے

فضا جھلکتی ہے اندر کی روزنِ در سے
تمام عکس دلوں کے مجھے نظر سے ملے

شکستِ دل کے ہیں پہلو ہزار اے راسخ
یہی نہیں ہے ضروری، نظر نظر سے ملے

○

غزل

ڈاکٹر رشید انور

شہر کا شہر پھرے آج اُٹھائے پتھر
فکر تو یہ ہے کہ ہیں سب کے پرائے پتھر

سب ہی مخلص ہیں تو پھر کون منافق ٹھہرا؟
پھول بوئے تھے اگر، کس نے اگائے پتھر؟

جب بھی تنہائی میں یادوں کا دریچہ کھولا
سوچ کے ہاتھ میں الفاظ کے آئے پتھر

موسمِ گل کی پذیرائی کا یہ رُوپ بھی تھا
آستینوں میں رہے لوگ چھپائے پتھر

وہ بھی کہتا ہے کہ چھت بیٹھ رہی ہے گھر کی
اَن گنت جس نے مکاں پر ہیں گرائے پتھر

میں کہ پتھرا کے بھی تھا ایک صدائے محشر
لوگ مصروف تھے کیا سنتے صدائے پتھر

ہجر کی رات نے سو بار یہ منظر دیکھا
ہم نے آغوشِ تمنا میں سُلائے پتھر

حادثہ خواب میں گزرا ہے خدا خیر کرے
اُس نے خود پیش کیے پھول بجائے پتھر

گردشِ وقت کی یورش بھی عجب تھی انور
ہم جو گھبرائے تو معبود بنائے پتھر

○

غزل

عطاء الحق قاسمی

کانٹوں سی اس دنیا میں وہ پھولوں جیسی
جیون بھول بھلیّوں میں وہ رستوں جیسی

اُجلی اُجلی ، مہکی مہکی روشن روشن
میری سوچوں جیسی ، میرے جذبوں جیسی

جھلمل جھلمل کرتی اُترے دل آنگن میں
رات اندھیروں میں وہ چاند اُجالوں جیسی

جاگتی آنکھوں سے بھی اس کو دیکھتے رہنا
وہ خوابوں میں آنے والی پریوں جیسی

لُو برساتی دوپہروں میں اس کی یادیں
ٹھنڈی کرنوں جیسی ، ہلکے رنگوں جیسی

اک چہرے کا لپکا میرے چاروں جانب
میں ہوں اور یہ دنیا ہے آئینوں جیسی

○

غزل

غلام حسین ساجد

آسماں ہے اپنی وحشت میں کسی گھر کی طرح
چاند لگتا ہے مجھے اک روزنِ در کی طرح

سُن رہا ہُوں شہر کی گلیوں میں سنّاٹے کی گُونج
رات ہے گویا کسی گہرے سمندر کی طرح

پھر اچانک نیند کی دیوار اُونچی ہو گئی
خواب تھا اِک دُور کے خاموش منظر کی طرح

اب سلامت بچ نکلنے کا کوئی امکاں نہیں
سامنے اپنے کھڑا ہُوں ایک لشکر کی طرح

ایک دن ساجدؔ اُسے پہچان لینا ہے مجھے
ایک دن کُھل جائے گا وہ ساتویں در کی طرح

○

غزل

اکبر حمیدی

یوں تو وہ کوئی کسر اٹھا بھی نہیں رکھتے
عنوان مگر اس کا سدا بھی نہیں رکھتے

ایسا بھی نہیں ہے کہ بنے وجہِ تسلی
یہ بھی ہے کہ کچھ اس کے سوا بھی نہیں رکھتے

اُس راہ میں سجدوں کے نشاں ڈھونڈ رہے ہیں
جس راہ میں نقشِ کفِ پا بھی نہیں رکھتے

وہ لوگ شہیدانِ وفا میں ہوئے شامل
جو لوگ کوئی زخمِ وفا بھی نہیں رکھتے

ہر دور نے یہ کہہ کے ہمیں قتل کیا ہے
مقتول ہیں اور خُوں بہا بھی نہیں رکھتے

عاشق ہیں مگر آہ و فغاں کے نہیں قائل
مظلوم ہیں اور حرفِ صدا بھی نہیں رکھتے

جو بزم سجائی تھی بڑے شوق سے اکبر
اُس بزم میں گنجائشِ پا بھی نہیں رکھتے

○

غزل

لطیف ساحل

اک خواب ، مجسّم ہونے سے ویران ہُوا
اک جگنو ہاتھ میں آیا تو بے جان ہُوا

اک پیڑ پہ آئے پھل تو پرندے مِل بیٹھے
اک شخص کا بچپن بیتا تو انجان ہوا

اک دیکھنے والا ، دیکھ چکا جب آنکھوں میں
پھر دل میں اَن دیکھے کا ڈر مہمان ہوا

وہ ایک سفر ایجاد کا تھا یا ہجرت تھی؟
جو رستہ شہر سے نکلا اک میدان ہوا

میں راکھ ہُوا تو سوگ کی کوئی بات نہیں
اُس خاک پہ میرے وصل کا دن آسان ہوا

کچھ پودوں تک اک دن بھی دھُوپ نہ آئی تھی
اک پیڑ کے کٹنے سے جنگل گنجان ہوا

اک خواب سے جیسے سَو تعبیریں نکلی ہوں
اک چہرہ کتنے چہروں کی پہچان ہوا

○

غزل

شوکت ہاشمی

مرے لہو کی تمازت ہے اور اکیلا میں
اندھیری شب کی مسافت ہے اور اکیلا میں

مرے قبیلے میں بھی سچ کا قتل ہوتا ہے
وہی پُرانی روایت ہے اور اکیلا میں

نئے شعور کا انسان مجھ میں زندہ ہے
زمانے بھر کی ملامت ہے اور اکیلا میں

میں اپنی جنگ میں ناکام ہو نہیں سکتا
مرے خیال کی طاقت ہے اور اکیلا میں

تلاش کا یہ سفر اتنا سہل بھی تو نہیں
کوئی بلا کوئی دہشت ہے اور اکیلا میں

میری غزل یہ میرا فن، یہ شاعری شوکتؔ
نئے دلوں کی بشارت ہے اور اکیلا میں

⊙

گیت

سلیم کاشر

سانبھ نی گھر دِیاں کُنجیاں مائے
بُوہے جانجی آئے
پیار ترے نُوں تالے لا کے
میں چلی دیس پرائے

○

تُوں روئیوں تے چھم چھم رون گے ایہہ گلیاں ایہہ ویہڑے
ماپیاں دے گھر دِھی جتے تے رازق رزق نکھیڑے
سِر کڈھے تے ہتھیں ٹورن
مِل کے ماں پیو جائے ۔ سانبھ نی گھر دِیاں کُنجیاں مائے

○

ویہڑے وِچ دھریکاں وی نیں مائے! میرے ہان دِیاں
کدے نہیں آئیاں سوچاں تینُوں اوہناں نُوں کٹوان دِیاں
گھر دِیاں کندھاں ٹپدے جاون
ہُن اوہناں دے سائے ۔ سانبھ نی گھر دِیاں کُنجیاں مائے

○

اَیناں دھیان تُوں رکھّیں بابل کدے اُداس نہ ہووے
ویکھیں کدھرے میریاں گُڈّیاں نال نہ بہہ کے روو ے
اُنجے ای میرے پٹوہلے رکھّیں
رِیجھاں نال سجائے ۔ سانبھ نی گھر دِیاں کُنجیاں مائے

○

دُورگئی دا مائے نی ! تُوں پیار بھُلا نہ دیویں
سوہل جئی دِھی رانی نُوں ایہہ سخت سزا نہ دیویں
مانّواں نے دِھیّاں دی خاطر
پیار دے محل بنائے ۔ سانبھ نی گھر دِیاں کنجیاں مائے

○

میریاں سکّھیاں نُوں تُوں میرے ناں تے سدا بُلا وِیں
جدوں کدی جی ڈولے تیرا سَد کے کول بٹھا وِیں
ٹھنڈ کلیجے پئے جاندی اے
ماں جد کول بُلائے ۔ سانبھ نی گھر دِیاں کُنجیاں مائے

○

ہوا دی سُولی

سلیم کاشر

تاریاں وانگوں ٹہک نی جنّدے
پُھلّاں وانگوں مہک
لہکدیاں فجراں وچ تُوں وی
چڑیاں وانگوں چہک

○

کُل دُنیا چہکار دی قیمت
تارن والا کون
تیری سُرت صلیب اے تیری
مارن والا کون

○

لکھ جگراتیاں مارے تارے
فیر وی ونڈ دے لو
چڑھ کے آپ ہوا دی سُولی
پُھل ونڈے خوشبو

○

غزل

سلیم کاشر

رنگاں دے میلے وِچ رووے بال گواچا ہویا
پیلا پے گیا رنگا رنگ غُبارے پھڑ دا ہویا

دھن اوہ لوکی ہسدے نیں جو لے کے ٹُٹیاں آساں
بچّہ وی نہیں پھڑ دا جدوں کھڈونا ٹُٹّیا ہویا

سنّھ لگن تے شور کیہ کر دے واسی گُنگے تھتھے
ہر جیہا نُوں تنّدوے دا سی جنّدرہ وَجّیا ہویا

لادھ ہووے تے چور دی بھاجڑ دیکھن والی ہوندی
اَنتاں دے نیڑے ہویا اے بندہ نَدا ہویا

رُکھاں نالوں جھڑ دے بُور نُوں اَکھ کھڑی جو ویکھے
ہر شیشے دے اَگّے غرض دا جالا تَنیا ہویا

موت نُوں ہس کے سینے لایاں نویں حیاتی ملدی
کہنّدا اے پربت دی کُکھوں چشمہ پھُٹّیا ہویا

مست ہوا دی سنگت لے گئی اوہنوں نگری نگری
بنّدکلی دے سینے وِچ جو بھیت سی لُکیا ہویا

لہو دے تُبکیاں نال بنا گیا اوہ چشمے دا رستہ
صحرائی پنچھی نُوں بھانویں تیر سی لگّیا ہویا

باخبری نے کھولے اَنبریں جاون والے رستے
کاشر یار نُوں اَجے وی گھر دا رستہ بھلّیا ہویا

○

غزل

اقبال صفی پوری

کیسے اظہارِ تمنّا ہو گا — کچھ کہا میں نے تو شکوا ہو گا

راہ و رسم اس سے کوئی آساں ہے — اِک قیامت سے گذرنا ہو گا

ایک اُنھیں اپنا بنانے کے لیے — ساری دُنیا سے اُلجھنا ہو گا

لَو تو پروانے بھی دینگے، لیکن — پہلے خود شمع کو جلنا ہو گا

پُرسشِ حال تک آتے آتے — اُس نے کیا کچھ نہیں سوچا ہو گا

آئینے دستِ جنوں میں آئے — عقل حیران ہے اب کیا ہو گا

رونقِ بزمِ محبت میں ہمیں — ہم نہ ہوں گے تو اندھیرا ہو گا

ہم تو جب مانیں گے احسانِ بہار — جب دِلوں میں بھی اُجالا ہو گا

ہم اُسے دل سے بھلا دیں اقبال
یہ اُسے بھی نہ گوارا ہو گا

○

غزل

مظہر امام

یہ تجربہ بھی کروں ، یہ بھی غم اٹھاؤں میں
کہ خود کو یاد رکھوں، اُس کو بھول جاؤں میں

اُسی سے پوچھ کے دیکھوں، وہ میرا کتنا ہے !
کہ جان بُوجھ کے کب تک فریب کھاؤں میں

وہ بے لباس سہی ، جامہ زیب کتنا ہے
زمیں کے چاند کو پوشاک کیا پنھاؤں میں!

وہ پُل کہاں ہے جو دُنیا سے جوڑتا تھا مجھے
کہ پاؤں تجھ کو تو سب سے قریب آؤں میں

کبھی تو ہو مرے احساسِ کمتری میں کمی
کبھی تو ہو کہ اُسے کھل کے یاد آؤں میں

وہ شخص ہے کہ نسیمِ سحر کا جھونکا ہے
بکھر ہی جاؤں جو اُس کو گلے لگاؤں میں

اذاں کے بعد دُعا کو جو ہاتھ اُٹھائے وہ
امامؔ ! اپنی نمازیں بھی بھول جاؤں میں

○

غزل

مظہر امام

ترے خیال کا شعلہ تھما تھما سا تھا
تمام شہرِ تمنّا بجھا بجھا سا تھا

نہ جانے موسمِ تلوار کس طرح گذرا
مرے لہو کا شجر تو جُھکا جُھکا سا تھا

ہمیں بھی نیند نے تھپکی دی، سو گئے تم بھی
تمام حادثۂ شب سُنا سُنا سا تھا

بلائے شام کے سائے تھے اور وادیٔ دل
اگرچہ صبح کا چہرہ دُھلا دُھلا سا تھا

چراغ منزلِ دل پہ جلا کے کیا کرتے
وفا کا قافلہ کب سے رُکا رُکا سا تھا

وہ نام، جس کے لیے زندگی گنوائی گئی
نہ جانے کیا تھا، مگر کچھ بھلا بھلا سا تھا

○

شاعرِ آفاق جوشؔ ملیح آبادی

پروفیسر منظور حسین شور

خون رو، اے سرزمیں، اے آسماں کر سینہ چاک
ہو رہا ہے اک خدائے فکر و فن پیوندِ خاک

دانش و حکمت کو دفنانے کفن پھاڑا گیا
خاک میں تاریخ کے اک دور کو گاڑا گیا

عقل کا ماتم ہے، مرگِ شاعرِ برّ صغیر
یا ترازو ہے، دلِ فطرت میں خود فطرت کا تیر

اے سوادِ ذکر و زُہد و دانش و درس و کتاب
آج ڈوبا ہے ترے آغوش میں وہ آفتاب

جس کے اعجازِ نفس سے عقلِ انسانی ہے دنگ
عرصۂ کون و مکاں، پرواز پر جس کی ہے تنگ

تُو نے کس صحرا میں دابا عقلِ سینہ چاک کو
دفن کس مٹی میں تُو نے کر دیا ادراک کو

جس کے چھُو لینے سے لَو دیتے ہیں حرف لفظ و صوت
جسکی اک موجِ نفس کعبے کے بُو جہلوں کی موت

اے خدائے آگہی، اے نطق کے پروردگار
اب جنون و ہوش دونوں ہیں ترے ماتم گسار

جب ترے اظہار کا اعجاز بن جاتے ہیں لفظ
رنگ و خشت و سنگ کی آواز بن جاتے ہیں لفظ

تجھ کو کیا معلوم، اے جہل و تعصب کے جنون
پی گئی سینوں کی ظلمت، آہ کس سُورج کا خون

کون پتھر کی چٹانوں سے کرے گا اب کلام
کون اب لکھے گا جا کر برف پر شعلوں کا نام

کون گونگوں کے تکلّم کا کرے گا اعتبار
کون اب بہروں کی محفل میں بجائے گا ستار

کون اب رکھے گا نبضِ مکتب و مُلّا پہ ہاتھ
جہلِ بے پایاں کو دے گا کون حکمت کی زکات

کُفر و ایماں پر یقینِ جدّ و اب سمجھے گا کون
وحدتِ آدم کی کثرت کا سبب سمجھے گا کون

کون سمجھائے گا الفاظ و معانی کا نسب
کون کھولے گا لب و لہجہ کا طویٰ رِ حسب

درس گاہوں میں کرے گا جہل کی تعظیم کون
اتنے اندھوں میں کرے گا آئینے تقسیم کون

کون اب دے گا اذانیں جا کے گورستان میں
کون تولے گا ہوا کو، حبس کی میزان میں

اب بُنے گا کون ایسا حکمت و دانش کا جال
جس سے بچ کر نسلِ آدم کا نکلنا ہے محال

کارگاہِ فکر و فن میں آہ اب کون آئے گا
جو ادب کو وسعتِ ظرفِ زباں دکھلائے گا

کافر و دیں دار سب ہوں جس کی زلفوں کے اسیر
کون اُردو کو کرے گا اس قدر آفاق گیر

پاک کی آنکھوں میں نم ہو یا ہمالہ نالہ کوش
حشر تک اِس قوم میں پیدا نہ ہوگا کوئی جوشؔ

بیادِ جوشؔ ملیح آبادی

عبدالعزیز خالد

ہو رہا ہے مجھ کو مرگِ جوشؔ سے محسوس یوں
گر گیا جیسے کہ اردو شاعری کا اک ستوں

اس کو بخشے تھے مشیت نے خزانے شعر کے
شاہ خرچی پر بھی تھے یَوْمًا فَیَوْمًا جو فزوں

جوش زن زورِ طبیعت موجِ دریا کی طرح
کیا کبھی سیماب کو دیکھا کسی نے پُرسکوں ؟

اس سے رَسیا لفظ کے اردو نے دیکھے ہوں گے کم
اس کی ہر تحریر تھی گویا کرامات و فسوں

اس مغنّی کی نوا کے سامنے حیرت فروش
بربط و طبل و دف و چنگ و رباب و ارغنوں

دولتِ آیاتِ وجدانی سے مالا مال ، تھا
قادرِ ہر صنف و ہر اسلوبِ فن وہ ذُو فنوں

نغمہ پیرائے بلند اقبالیٔ عقل و خرد
نالہ پردازِ پریشاں حالیٔ عشق و جنوں

شانِ خلّاقی تھی اس کی ہر ادا سے آشکار
کیا کسی میں رنگ یہ آتا ہے بے سوزِ دروں ؟

جرأتِ اظہار بھی ، اظہار کی طاقت بھی تھی
شے کوئی اس کے تخیّل کی نزد سے تھی بروں

پا بجولاں وحشیانِ حرف و صوت اس کے حضور
سرکشانِ لفظ و معنی اس کے آگے سرنگوں

ہر بڑے فنکار کی مانند اس کامل کے بھی
قبضۂ قدرت میں تھی لوحِ طلسمِ کاف و نوں

تھا وہ آزادہ خیالی میں بھی پابندِ رسوم
کفر و دیں دونوں ہی ہیں نیمے دروں نیمے بروں

کام تھا اس کا تغیّر ، نام تھا اس کا شباب
وہ ازانِ عاقلاں ، منجملۂ اہلِ جنوں

نقش گر فطری مناظر کا ، مصوّرِ حسن کا
کیوں نہ میں صاحب قرانِ شاعری اس کو کہوں ؟

نو بنو نغموں پہ اکساتی تھی اس کو جاوداں
یہ زمینِ پُرنگاراں ، یہ فضائے نیلگوں

مہ وشوں سے ، گلرخوں سے جی نہ اس کا بھر سکا
عمر بھر کھینچا کیا گو نقش ہائے گوں بہ گوں

پیچ و تاب اس کو دلاتے ، اس کو کرتے مضطرب
سینہ ہائے مرمریں و ساق ہائے سیمگوں

وہ شکارِ ہر نگارِ نورس و تازہ بہار
وہ ہلاکِ ہر نگاہِ پُرخمار و خوابگوں

اس علاؤ الدین نے ہر قلعۂ چتوڑ گڑھ — فتح کرنے کی تگ و دو میں کیے اٹھارہ خوں

وہ زلیخاؤں کا شاعر، یوسفِ مصرِ سخن — بے نیازِ این و آں، بیگانۂ چند و چگوں

کتنی سج دھج سے نکالی اس نے "بادوں کی برات" — ہا و ہُو کتنی مچی اس نے مگر ہاں کی نہ ہُوں

دل میں ذوقِ وصل لب پر نعرہ ہائے انقلاب — تھا وہ رہزن آپ اپنا، آپ اپنا رہنموں

عالمِ مستی میں کہتا: "ہو اگر بس میں مرے — ہر دہانِ خشک کو جفتِ لبِ ساغر کروں!"

تھا وہ رندِ لاابالی وہ بظاہر مردِ حُر — بندۂ نفسِ حروں، خواہش کا نخچیرِ زبوں

کس طرح آلودگی سے آدمی ایمن رہے؟ — دشمنِ آسودگی ہے یہ جہانِ پُر فسوں

آخر آخر گوشۂ بیت الحزن میں معتکف — ہوں یونہی مسلوکِ فنِ مشرق کے فرزندانِ دُوں

وہ سخن کا ناخدا پیرِ خرابات نوا — تھا وہ یکتا اس کو کس فنکار سے تشبیہ دوں؟

مجھ سے پوشیدہ نہیں خالدؔ مقامِ شعرِ جوش
میں بھی شامل اس کے لاتعداد مدّاحوں میں ہُوں

○

غزل کا سہاگ — فراق گورکھپوری

پروفیسر منظور حسین شور

اے فلک ماتمِ ہمالہ بھی دیکھ
لب گنگ و جمن پہ نالہ بھی دیکھ

اے خراباتِ حافظ و خیام
کس سے پوچھوں بتا فراق کا نام

نشہ جھوٹا، شرابِ ناب غلط
سایہ بے اصل، آفتاب غلط

رامش و رقص و رنگ شعر و شباب
آفتابوں کا غم، قمر کا عذاب

نازنینوں کی جلوہ کوشی کیا
گل رخوں کی نقاب پوشی کیا

آگہی کو جنوں بھی راس کہاں
روشنی اس قمر کے پاس کہاں

زندگی دھوپ، زندگی سایہ
اور کیا ہے جنوں کا سرمایہ

رو رہے ہیں غمِ فراق میں لوگ
یا اندھیروں میں ہے چراغ کا سوگ

حلقہ در حلقہ مہ وشوں کے ہجوم
ہے یہ کس کی برات کیا معلوم

کتنے لب کتنے ساعد و بازو
چاک دل آج کر رہے ہیں رفو

کتنے قشقے ہیں اپنے خون میں لال
صرفِ ماتم میں کیسے کیسے غزال

کتنے آنچل ہیں نالہ کوش، نہ پوچھ
کتنے گیسو ہیں بارِ دوش، نہ پوچھ

ماہ وشں کتنے، سینہ کوٹ گئے
کتنے کنگن، کھنک کے ٹوٹ گئے

کیا خبر کتنے آہوانِ تتار
ایک صیاد کے ہیں ماتم دار

اک جنوں، لاکھ آگہی کا شعور
کتنے ماتھوں سے ڈھل گیا سیندور

خاک پر آسمان ٹوٹ گیا
یا غزل کا مکان ٹوٹ گیا

دوستو! لٹ گیا غزل کا سہاگ
اب لگا دو غزل کے شہر میں آگ

○

بیادِ فراق گورکھپوری

عبدالعزیز خالد

ہے ایک دورِ تغزّل کی مرگ، مرگِ فراق
وہ دور جس میں مٹا فرقِ انفس و آفاق

سیاہ پوش ہُوا اس کے بعد "شعلۂ ساز"
دُھواں دُھواں در و بامِ حریمِ راز و نیاز

وہ نکتہ سنج سخنداں، وہ شاعرِ خلّاق
تھی مثلِ برق کے جس کی طبیعتِ برّاق

سخنوروں میں کیا جس نے اس شعور کو عام
کہ شاعری فقط آہنگ و وزن کا نہیں نام

سنگھار رس کا نمونہ رباعیاں جس کی
بہارِ گلشنِ حُسنِ کلام جس سے تھی

ہے جس کے شعروں میں اُمش بھی رنگ بھی رس بھی
ہوس بھی سوزِ نفس بھی جمال بھی جس بھی

ہے جس کی نظم و غزل میں سجل بدن کا رچاؤ
تھی لاگ جس کو زمانے سے زندگی سے لگاؤ

وہ شعرِ شاعرِ "گیتا نجلی" کا متوالا
اور اس کو قالبِ اردو میں ڈھالنے والا

وہ جس کی جودتِ ذہن و فراخیٔ دل کے
ملیں ثبوت ہر اک صفحۂ "من آنم" سے

جگائے جس نے فسوں "روپ شبستاں" کے
ہیں حُسنِ نقد کا معیار جس کے "اندازے"

گو انتقاد کا لہجہ تاثّراتی ہے
مگر بصیرتِ فن اس میں جھلملاتی ہے

ہمیشہ "رمز و کنایات" میں کرے باتیں
اُپج سجھائے اُسے فن کی نت نئی گھاتیں

تھی زیست وقف پئے خدمتِ ہنر اس کی
بڑی وسیع تھی اس ذیل میں نظر اس کی

غمِ مآلِ محبت بھی گرچہ سہتا تھا
حریفِ شاہدِ شب زندہ دار رہتا تھا

نگاہ کو جو لگاتا تھا عشق کی گوں پر
ہُوا جو خاکِ محبت کی آگ میں جل کر

غمِ حیات نہ دے فرصتِ حیات جسے
کتابِ دل کو پڑھے اور بار بار پڑھے

بوصفِ مجمعِ لالہ رُخانِ سیمیں بر
لٹا لٹا ہی رہا اس کے دل کا پریم نگر

بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حسن ہو نہ سکی
رہی نظائے میں حائل سبک روی اس کی

بہ یادِ یار و غمِ روزگار و فکرِ معاش
رہی شرافت و شائستگی کی جس کو تلاش

وہ حُسن کار خراباتِ فن کا مستِ الست
پکارتے تھے جسے عشقباز : حُسن پرست !

وہ ہوش جس کا باندازۂ خمار رہا
جو عینِ وصل میں بھی محوِ انتظار رہا

وہ شانِ حسن کا محرم کہ ڈھائے جس پہ ستم
نگاہِ ناز کے عرضِ نیاز کا عالم

رفاقت اپنی رفیقِ حیات کی جس پر
دعائے بد سے تھی بدتر ، عذاب سے بڑھ کر

غم و نشاط سے بیگانہ زندگی جس کی
تھی اک حقیقت و افسانہ زندگی جس کی

تھی سارے زہرہ نگاہوں سے دوستی جس کی
بیانِ کیف و کمِ حسن شاعری جس کی

فرشتۂ موت کا آیا جو قبضِ جاں کے لیے
تو پا تراب کیا اس نے لا مکاں کے لیے

جہاں گلاب کے پتّے بکھیرے بادِ صبا
وہیں پہ خرمنِ تن اس کا جبل کے راکھ ہوا

امیرِ نغمہ سرایانِ عشق اس کو کہو
اور اس کے حق میں دُعا بارے مغفرت کی کرو!

○

جوش و فراق

جگن ناتھ آزاد

اک دَور میں چمکے تھے دو پیکرِ نورانی — اور تُو نے بجھا ڈالے اے موجِ ہوا دونوں

اِک رنگِ گلستاں تھا اک بُوئے گلستاں تھا — ہر بات میں رکھتے تھے پھُولوں کی ادا دونوں

سامانِ بہاراں تھے تزئینِ گلستاں تھے — جو پھُول چُنے تُو نے اے دستِ قضا دونوں

کچھ لوگ یہ کہتے تھے آہنگِ غزل ہے یہ

وہ نظم کا لہجہ ہے

کچھ لوگ یہ کہتے تھے یہ حُسن ہے لفظوں کا

وہ حُسنِ معانی ہے

میں تو یہ سمجھتا ہُوں کانٹوں بھری وادی میں تھے آبلہ پا دونوں

فیضِ تپشِ دل سے تھے نغمہ سرا دونوں

اب محفلِ یاراں سے ہیں جب کہ جُدا دونوں

محسوس یہ ہوتا ہے

"رنگِ گُل و بُوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے"

○

"قلیمِ سخن کا شہریار"

علّامہ ذوقی مظفرنگری

حرف ہیں مغموم، سوچیں ماتمی، فن سوگوار
مرگِ دانش پر ہے ششدر خامۂ تخلیق کار

جل رہی ہے کرب کے شعلوں میں جذبوں کی بہار
رو رہا ہے خُون کے آنسو ادب کا لالہ زار

قریہ قریہ دل گرفتہ، گوشہ گوشہ مضطرب
لمحہ لمحہ نوحہ خواں ہے لحظہ لحظہ اشکبار

دُھندلا دُھندلا کیوں نہ ہو آئینۂ ذوقِ حیات
اُڑ رہا ہے موت کی تاریک آندھی کا غبار

ڈگمگاتا ہے تخیل، لڑکھڑاتا ہے شعور
کس قدر مخدوش ہے رنج و محن کی رہگزار

اب کلیجہ تھام کر بیٹھیں نہ کیوں اہلِ سخن
اُٹھ گیا دُنیا سے اقلیمِ سخن کا شہریار

حضرتِ دانش کا غم ہے انجمن در انجمن
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم ہیں سوگوار

غم کے سائے رینگتے ہیں اب در و دیوار پر
اب کہاں دانشکدے میں دانشِ عالی وقار

رات بھر رہتا ہے دل میں اُن کی یادوں کا ہجوم
دل نکلتا ہے تو لگ جاتی ہے آہوں کی قطار

سُرخرو تھا اُن کے خُونِ دل سے نظموں کا چمن
ان کی غزلوں میں مہکتی تھی لطافت کی بہار

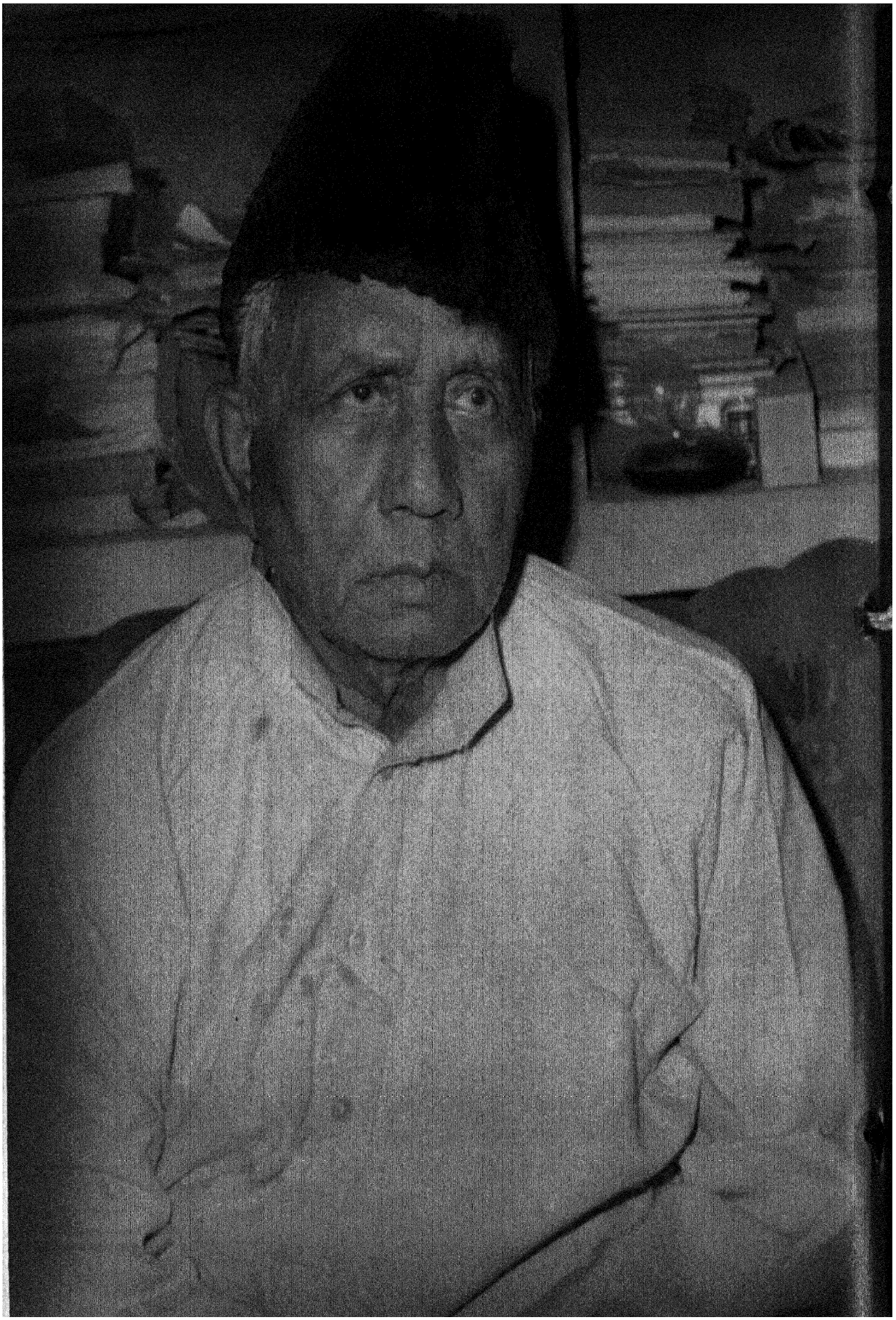
ظُلمتوں کے کھیت میں وہ روشنی بوتے رہے
اُن سے تھیں بے تاب پودوں کی امنگیں تابدار

اُن کی سوچوں میں مہکتا تھا نظامِ مصطفیٰؐ
جب کبھی ہوتی تھی گلشن کی فضا ناخوشگوار

مشعلِ راہِ ادب ہیں مشورے اُستاد کے
اُن کی اصلاحِ سخن ہے لائقِ صد افتخار

اُن کا فن زندہ ہے وہ زندہ رہیں گے تا ابد
کیا کہوں کمبخت میرا دل ہے پھر بھی بیقرار

کل جو گونگے آبشاروں کو غزلخواں کر گیا
آج ذوقی اُس فصیح العصر کی ہے یادگار



بیادِ احسان دانش

عبدالعزیز خالد

واد ریغا! حضرتِ احسان دانش کی وفات
وائے یہ دُنیائے فانی، یہ جہانِ بے ثبات!

وضعداری کا وہ پیکر، دیدہ ور، معنی نگر
وہ پیمبرؐ کا ثنا گر، صاحبِ صوم وصلوٰۃ

تھا وہ استاد آپ اپنا، آپ اپنا راہبر
عارفِ رازِ حیات و واقفِ سرِّ ممات

جس کو قدرت نے سخن کے واسطے پیدا کیا
کر سکیں جس کو نہ بد دل زندگی کی مشکلات

اعتراف اپنا کرایا جس نے دنیا سے بزور
جس نے دی محنت سے بختِ واژگوں کو شہ مات

اس کے شعروں میں حقیقی زندگی کی دھڑکنیں
ہے "جہانِ دانش" اس کا اک جہانِ تجربات

بخشی بخشہار نے اس کو "نوائے کارگر"
اور ساتھ اس کے سجھائے فن کے گوناگوں نکات

جذبے اس کے تھے کھرے، افکار تھے اس کے سلیم
اس کے محسوسات مخلص، صادق اس کی واردات

بندۂ مزدور کے اوقات کا ذاتی گواہ
اس جہاں دیدہ پہ بیتے ہر طرح کے واقعات

تھی زباں اس کی مغنّی کی، مصوّر کی نگاہ
انگلیاں اس کی تھیں صورت گر کی، محنت کش ہاتھ کے

نغمگی میں اس نے ڈھالا تلخیِ ایّام کو
زہر کو اس نے بنایا شہد، حنظل کو نبات

بو کے تخمِ آرزو "فصلِ سلاسل" کاٹنا
ہو غمِ نایافت سے کیسے سسی فس کی نجات؟

عاشقِ دلسوز وہ اسلام و پاکستان کا
سادگی میراث اس کی، فقر اس کی کائنات

بذلہ سنجی اس کی خُو، سنجیدگی اس کا مزاج
تول کر میزانِ دانش میں نکالے منہ سے بات

التہابِ قلب سے سرد چراغاں کی طرح
رونقِ صبحِ چمن تھی جس کے ویرانے کی رات

نقش گر اندازِ نازِ پُر نیازِ حُسن کا
ہاں، وہ مومن بھی رہا چندے مقیمِ سومنات!

اس کی فطرت سے محبت میں نہ فرق آیا کبھی
بھولے آخر تک نہ اس کو کاندھلے کے جنگلات

دوں وفاداری میں اس کی استواری کی میں داد
یاد جو کرتا رہا شمعی کو تا حینِ حیات

متصف حق نے کیا اخلاقِ حسنہ سے اسے — کتنی ہی ذاتوں کا مجموعہ تھی اس کی ایک ذات
کامل الفن دوسرا اس سا نظر آتا نہیں — اب کہاں سے لائیں ایسا ماہرِ فنِ لغات ؟

شاعرِ مزدور کہلاتا تھا خالد وہ کہ تھا
خاکیِ نوری نہاد و بندۂ مولا صفات!

○

احسان دانش

جیلانی کامران

احسان دانش کے رخصت ہو جانے سے ایک ایسا قابلِ قدر اور قدر آور شاعر ہم سے جُدا ہُوا ہے جس نے اُردو شاعری کی روایت کو عصرِ حاضر کے اُن موضوعات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جن سے اُردو شاعری کی روایت قبل ازیں عہدہ برآ نہ ہوئی تھی اور جس نے روایت کو ایک ایسے ادبی اور فکری ماحول میں اپنے لیے قابلِ قبول ٹھہرایا جب روایت سے انحراف کا رویہ اپنے عروج پر تھا اور فارم اور موضوع میں اِس انحراف کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ احسان دانش کی شعری زندگی کا ابتدائی زمانہ تصدق حسین خالد، ن۔ م راشد اور میراجی کا زمانہ تھا اور کاروان اور رومان کا زمانہ بھی تھا۔ اور یہ زمانہ سیاسی نظم کا زمانہ بھی تھا۔ فارم اور موضوع اور اسلوبِ بیان بدل رہے تھے اور روایت کی شکل اِن بدلتے ہوئے رویّوں کی موجودگی میں برابر متاثر ہو رہی تھی۔ تاہم وہ زمانہ اتنا آسان دَور نہ تھا جتنا شاید ہمارے اپنے زمانے میں سامنے آیا ہے۔ وہ زمانہ طے شدہ شہرتوں کا زمانہ بھی تھا اور اُس زمانے میں ادب کے شیدائی بڑے شاعروں کی پہچان کرنے میں بہت کم غلطی کرتے تھے۔ ایک ایسے زمانے میں ایک ایسے شخص کا شاعر کی حیثیت سے ظاہر ہونا، جو نہ تو یونیورسٹی کی مروجہ تعلیم و تدریس سے بہرہ مند تھا، اور جسے شہر لاہور میں وارد ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اور جو معاشی طور پر اہلِ ذوق کے طبقے سے کئی درجے باہر تھا اور جو روایت ہی کی نبض پہچانتا تھا، ایک ایسا واقعہ ہے جو ایک طرف تو احسان دانش کی داخلی تخلیقی سرشت کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسری طرف لاہور شہر کی تہذیبی نفسیات کو نمایاں کرتا ہے۔ اِن علاقوں کے لوگ، جہاں علاقائی زبانوں میں گفتگو کی جاتی ہے بہت کم اُن علاقوں میں شہرت پا سکتے ہیں جہاں لوگوں کی زبان اُردو رہی ہے۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے شاعر یو۔ پی، حیدرآباد اور بھوپال میں اُس وقت مشہور ہوئے جب اُن کی شہرت شہر لاہور میں راسخ ہو چکی تھی۔ مگر احسان دانش کے بارے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی کہ وہ ایک حاصل شدہ شہرت کے ساتھ لاہور میں وارد ہوئے تھے۔ احسان دانش کی سوانح عمری جہانِ دانش سے ایسا کوئی اشارا دستیاب نہیں ہوتا کہ احسان دانش اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے لاہور اس لیے آئے تھے کہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوں اور اُن کا ہماری ادبی روایت کی تاریخ میں وہ نمایاں مقام ممکن ہو جس کی تائید اور تصدیق زمانے نے خود بڑی وضاحت سے کی ہے۔ احسان دانش لاہور شہر میں ایک نوادرد اور اجنبی کے طور پر داخل ہوئے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے رخصت ہوئے جب اُن کی وفات کی خبر قومی نیوز بلیٹن میں نشر ہوئی اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر نے اظہارِ تعزیت کیا۔ انسانی زندگی کا ایسا شاندار گراف بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوا ہے۔ احسان دانش کی سوانح حیات اِس اعتبار سے لاہور شہر کی تہذیبی نفسیات کی روداد بھی ہے۔ جہانِ دانش میں اُن کے ورودِ لاہور کے ابتدائی ایام کا بڑی تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ لاہور نے اُن کو معاشی مواقع فراہم کئے مگر ہم احسان دانش کی معاشی زندگی کے حوالے سے اُن کے رخصت ہو جانے پر سوگوار نہیں ہیں۔ لاہور نے اُن کو معاشی مواقع فراہم کئے مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کی تخلیقی سرشت کو پھلنے

پھولنے کے مواقع بھی مہیا کیے۔ شہر اور شخصیت کے اس رشتے میں بلاشبہ احسان دانش کی اپنی محنت اور لگن کو بھی بڑا دخل حاصل ہے مگر محض محنت اور لگن سے وہ مقام عموماً حاصل نہیں ہوتا جو انھیں دستیاب ہوا اگر لاہور شہر کا مزاج انسان شناس نہ ہوتا۔ اٹھارہویں صدی کا لندن ۱۹۳۵ء کے لاہور سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا مگر لندن شہر نے چیٹرٹن کو قبول نہ کیا اور وہ نوعمر شاعر لندن شہر کی تعصب زدہ فضا میں اپنی محنت اور لگن اور اپنی بلند پایہ شعری صلاحیت کے باوجود زندہ نہ رہ سکا اور خودکشی کر کے جلد ہی مُردوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ ایسا سانحہ جہانِ دانش کے صفحات میں دکھائی نہیں دیا تو اُس کی وجہ شاید یہی ہے کہ اُس زمانے کا لاہور اپنے تہذیبی مزاج اور کردار کے مطابق ایک ایسا شہر تھا جہاں غریب ہونا طبقاتی جرم نہیں تھا اور نہ کسی شخص کے غریب ہونے سے اُس کی خوبیاں اوجھل ہوتی تھیں۔ اگر لاہور شہر کا ایسا مزاج نہ ہوتا تو شاید اُردو ادب احسان دانش سے کبھی متعارف بھی نہ ہوتا۔ اُس زمانے کا متوسط طبقہ بھی انسان شناس اور انسان دوست تھا اور انسانی سرشت کی بارے میں تعصب سے بھی آشنا نہ تھا۔ لیکن ان خصوصیات کے علاوہ ایک اور خوبی شہر لاہور کی یہ بھی تھی کہ اس شہر کی فضا میں علم و ادب کے ساتھ وابستگی اور لگن غیر محسوس انداز میں جاری و ساری تھی۔ جس بات کو ہم کسی زمانے میں گورنمنٹ کالج کے ساتھ منسوب کرتے تھے کہ اِس کالج کی آب و ہوا میں علم و ادب کی خوشبو ہے کچھ ویسا ہی عالم اُس شہر لاہور کا تھا جہاں احسان دانش کے ابتدائی نوعمری کے دن بسر ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح ماج بلدیو راج، جو ایک اچھے متمول ہندو گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، احسان دانش کے پاس مزنگ میں جایا کرتے تھے تاکہ اُن سے علم و شعر کے بارے میں اکتساب کر سکیں۔ اُس لاہور شہر میں طبقاتی دیوار شاید موجود نہ تھی۔ اس لئے بہت جلد احسان دانش کو بھی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے مواقع حاصل ہوئے۔ لاہور شہر انسانوں کو قبول کرنے کا شہر تھا اُن کو روندنے کا شہر نہ تھا اور اُس زمانے میں یہاں اچھے انسانوں کی کثرت تھی، اچھے دوستوں کی کثرت تھی۔ اور ایسے قریبی ہمدردوں کی بھی کمی نہ تھی جو دکھ درد میں انسان کے کام آتے ہیں۔ جہانِ دانش میں ایسے متعدد لوگوں کا تذکرہ کر کے خود احسان دانش نے لاہور شہر کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے اور اپنے احسان مند ہونے کا اعتراف کیا ہے!

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں اُردو شاعری کے قدردانوں میں ہندو متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کثرت تھی ہیلی کالج آف کامرس (لاہور) کے انگریزی کے پروفیسر شنکلو جو پیرس اور آکسفورڈ کے فارغ التحصیل تھے۔ اُن کے مطالعہ کی میز پر ن م راشد کی ماورا برابر موجود رہتی تھی۔ اور میں نے بھی اپنی نوبیں جماعت میں پونچھ کے دُور افتادہ پہاڑی شہر میں احسان دانش کا نام جن سے پہلی بار سنا وہ بھی ایک ہندو استاد تھے۔ انہوں (گیان چند صاحب) نے غالباً اِن الفاظ کے ساتھ احسان دانش کا تعارف کروایا کہ لاہور میں ایک نئے شاعر کا بہت چرچا ہے جس کی زبان اور طرزِ بیان نیا ہے۔ اور جس کی تشبیہیں انوکھی ہیں اور وہ غریبوں کا شاعر ہے۔ انہوں نے جادۂ نو میں سے جو ابھی ابھی شائع ہوئی ایک قطعہ بھی خاص طور پر پڑھ کر سنایا اور وہ قطعہ یہ تھا۔

"حوض میں گر پڑا گلاب کا پھول
پاس لانے سے دُور جاتا ہے
جیسے مدت میں مل ملنے والے کا
نام مشکل سے یاد آتا ہے"

یہ ہندو اُستاد سائنس کے اُستاد تھے۔

اُس زمانے میں جب کبھی احسان دانش کا ذکر ہوتا تھا انھیں احسان بن دانش کہا جاتا تھا۔ اور اُن کا یہ شعر عموماً اُن کی انفرادیت کے ضمن میں سنا اور سنایا جاتا تھا۔

؎ میں نے انگاروں کی چادر سے نچوڑی ہے شراب
میری ہستی بے تعلق ہے مئے گلفام سے "

اس شعر میں اُس زمانے کے اہلِ ذوق کو جسمانی محنت اور شاعری کا باہمی رشتہ دکھائی دیتا تھا۔ اور اُن کا کہنا تھا کہ انگاروں کی چادر پھولوں کی چادر سے کتنی مختلف ہے۔ اس میں کتنی تپش ہے اور کتنا انسانی خون پسینہ شامل ہے۔ اصل شاعری یہی ہے کہ اِس میں انسان زندگی کے بے حد قریب ہے۔ احسان دانش اپنے عہد کو زندگی کے شاعر کی صورت میں نظر آئے تھے۔ اور زندگی کے احوال سے اُن کی قربت کو اُس زمانے کے لاہور نے قابلِ قدر قرار دیا تھا۔ مگر یہ زندگی جابر نہ تھی۔ اس کی سختیاں غزل کے محبوب کی جفا کاریوں کے مانند پیاری اور دلکش تھیں۔ شاید اسی لئے وہ زمانہ شاعری کا زمانہ تھا۔ اور ہمارا اپنا عہد نثر اور بے تعلقی کا عہد ہے!

انسان کو اُس کے معاشی ماحول میں ایک سنجیدہ موضوع کے طور پر سب سے پہلے احسان دانش نے پیش کیا۔ اور انسان کی معاشی غربت اور اس کیفیت سے پیدا ہوتی ہوئی زندگی کو شاعری میں پیش کرنے کی اولین کوشش بھی احسان دانش کی مرہونِ منت ہے۔ تاہم وہ یہ سوال بہت کم کرتے ہیں کہ انسان کا معاشی غربت کا ماحول ایسا کیوں ہے اور اس اعتبار سے معاشی غربت کا ماحول اُن کا محض ایک خارجی منظر ہے۔ جس میں انسانی زندگیاں ملوث ہیں اور اِس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قاری کی ہمدردیاں چاہتی ہیں۔ آشوب اور کرب جو اس صورت سے پیدا ہوتا ہے وہ احسان دانش کی نظموں میں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ بے روزگاری بھی معاشی غربت کے موضوع کے طور پر اُن کی نظموں کو عنوان فراہم کرتی ہے۔ پڑھے لکھے بیکار نوجوانوں کی کیفیت کو بھی احسان دانش نے سب سے پہلے شاعری کا موضوع بنایا ہے ـــ اُن کی ایک نظم کا یہ شعر غور طلب ہے:

؎ صبح کالج رو رہی تھی ڈگریوں کی شام پر
علم تھا حیران اپنے دل شکن انجام پر "

۱۹۳۵ء کے بعد جس نوع کی معاشی بدحالی اور بے روزگاری کا زمانہ ظاہر ہوا تھا۔ احسان دانش کی نظموں میں اُن کی عکاسی ہمعصر شاعری میں منفرد ہے۔ احسان دانش نے ایک ایسی کیفیت اور تاریخی صورتِ حال کو انسانی زندگی کا تجربہ اور فرد کا معاشی ماحول فراہم کیا جو ایک قلیل عرصے کے لئے بین الاقوامی طور پر بالعموم اور جنوبی ایشیا میں بالخصوص ظاہر ہوئی تھی اور جسے دوسری جنگِ عظیم نے بہت جلد ملازمت اور کاروبار کے متعدد مواقع مہیا کر کے ختم کر دیا تھا۔ معاشی ماحول کی ایسی صورت غالباً دوبارہ ظاہر نہیں ہوئی!

اُس زمانے کے ادبی ذوق کے مطابق احسان دانش انسان کی معاشی زندگی کے شاعر تھے اور اُن کی نظموں کے مجموعے کی یہ نظمیں زیادہ پڑھی جاتی تھیں اور معاشی بدحالی کا شعری اظہار اُن کے شعری تاثر کا مرکزی رنگ تھا۔ اُن کے جو مجموعے اُس زمانے میں شائع ہوئے اُن کا موضوع انسان تھا۔ تاہم اُن کی وہ نظمیں بھی اِن مجموعوں میں شامل تھیں جو مسلمان اور ہندو قارئین کو الگ الگ مخاطب کرتی تھیں۔ قارئین کے حوالے

پھولنے کے مواقع بھی مہیا کیے۔ شہر اور شخصیت کے اس رشتے میں بلاشبہ احسان دانش کی اپنی محنت اور لگن کو بھی بڑا دخل حاصل ہے مگر محض محنت اور لگن سے وہ مقام عموماً حاصل نہیں ہوتا جو انھیں دستیاب ہوا اگر لاہور شہر کا مزاج انسان شناس نہ ہوتا۔ اٹھارہویں صدی کا لندن بھی ۱۹۳۵ء کے لاہور سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا مگر لندن شہر نے چیٹرٹن کو قبول نہ کیا اور وہ نوعمر شاعر لندن شہر کی تعصب زدہ فضا میں اپنی محنت اور لگن اور اپنی بلند پایہ شعری صلاحیت کے باوجود زندہ نہ رہ سکا اور خودکشی کر کے جلد ہی مُردوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ ایسا سانحہ اگر جہانِ دانش کے صفحات میں دکھائی نہیں دیا تو اُس کی وجہ شاید یہی ہے کہ اُس زمانے کا لاہور اپنے تہذیبی مزاج اور کردار کے مطابق ایک ایسا شہر تھا جہاں غریب ہونا طبقاتی جرم نہیں تھا اور نہ کسی شخص کے غریب ہونے سے اُس کی خوبیاں اوجھل ہوتی تھیں۔ اگر لاہور شہر کا ایسا مزاج نہ ہوتا تو شاید اُردو ادب احسان دانش سے کبھی متعارف بھی نہ ہوتا۔ اُس زمانے کا متوسط طبقہ بھی انسان شناس اور انسان دوست تھا اور انسانی سرشت کی بارے میں تعصب سے بھی آشنا نہ تھا۔ لیکن ان خصوصیات کے علاوہ ایک اور خوبی شہر لاہور کی یہ بھی تھی کہ اس شہر کی فضا میں علم و ادب کے ساتھ وابستگی اور لگن غیر محسوس انداز میں جاری و ساری تھی۔ جس بات کو ہم کسی زمانے میں گورنمنٹ کالج کے ساتھ منسوب کرتے تھے کہ اِس کالج کی آب و ہوا میں علم و ادب کی خوشبو ہے کچھ ویسا ہی عالم اُس شہر لاہور کا تھا جہاں احسان دانش کے ابتدائی نوعمری کے دن بسر ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح راج بلدیو راج، جو ایک اچھے متمول ہندو گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، احسان دانش کے پاس مزنگ میں جایا کرتے تھے تاکہ اُن سے علم و شعر کے بارے میں اکتساب کر سکیں۔ اُس لاہور شہر میں طبقاتی دیوار شاید موجود نہ تھی۔ اس لئے بہت جلد احسان دانش کو بھی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے مواقع حاصل ہوئے۔ لاہور شہر انسانوں کو قبول کرنے کا شہر تھا اُن کو رد کرنے کا شہر نہ تھا اور اُس زمانے میں یہاں اچھے انسانوں کی کثرت تھی، اچھے دوستوں کی کثرت تھی۔ اور ایسے قدر ہی ہمدردوں کی بھی کمی نہ تھی جو دکھ درد میں انسان کے کام آتے ہیں۔ جہانِ دانش میں ایسے متعدد لوگوں کا تذکرہ کر کے خود احسان دانش نے لاہور شہر کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے اور اپنے احسان مند ہونے کا اعتراف کیا ہے!

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں اُردو شاعری کے قدر دانوں میں ہندو متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کثرت تھی ہیلی کالج آف کامرس (لاہور) کے انگریزی کے پروفیسر شنگلو جو پیرس اور آکسفورڈ کے فارغ التحصیل تھے۔ اُن کے مطالعہ کی میز پر ن م راشد کی ماورا برابر موجود رہتی تھی۔ اور میں نے بھی اپنی نوبیں جماعت میں پونچھ کے دُور افتادہ پہاڑی شہر میں احسان دانش کا نام جن سے پہلی بار سنا وہ بھی ایک ہندو استاد تھے۔ انہوں (گیان چند صاحب) نے غالباً اِن الفاظ کے ساتھ احسان دانش کا تعارف کروایا کہ لاہور میں ایک نئے شاعر کا بہت چرچا ہے جس کی زبان اور طرزِ بیان نیا ہے۔ اور جس کی تشبیہیں انوکھی ہیں اور وہ غریبوں کا شاعر ہے۔ انہوں نے جادۂ نو میں سے جو ابھی ابھی شائع ہوئی ایک قطعہ بھی خاص طور پر پڑھ کر سنایا اور وہ قطعہ یہ تھا۔

؎ "حوض میں گر پڑا گلاب کا پھول
پاس لانے سے دُور جاتا ہے
جیسے مدت میں مل ملنے والے کا
نام مشکل سے یاد آتا ہے"

یہ ہندو اُستاد سائنس کے اُستاد تھے۔

اُس زمانے میں جب کبھی احسان دانش کا ذکر ہوتا تھا انھیں احسان بن دانش کہا جاتا تھا۔ اور اُن کا یہ شعر عموماً اُن کی انفرادیت کے ضمن میں سنا اور سنایا جاتا تھا۔

میں نے انگاروں کی چادر سے نچوڑی ہے شراب
میری ہستی بے تعلق ہے مئے گلفام سے "

اس شعر میں اُس زمانے کے اہلِ ذوق کو جسمانی محنت اور شاعری کا باہمی رشتہ دکھائی دیتا تھا۔ اور اُن کا کہنا تھا کہ انگاروں کی چادر پھولوں کی چادر سے کتنی مختلف ہے۔ اس میں کتنی تپش ہے اور کتنا انسانی خون پسینہ شامل ہے۔ اصل شاعری یہی ہے کہ اس میں انسان زندگی کے بے حد قریب ہے۔ احسان دانش اپنے عہد کو زندگی کے شاعر کی صورت میں نظر آتے تھے۔ اور زندگی کے احوال سے اُن کی قربت کو اُس زمانے کے لاہور نے قابلِ قدر قرار دیا تھا۔ مگر یہ زندگی جابر نہ تھی۔ اس کی سختیاں غزل کے محبوب کی جفا کاریوں کے مانند پیاری اور دلکش تھیں۔ شاید اسی لئے وہ زمانہ شاعری کا زمانہ تھا۔ اور ہمارا اپنا عہد نثر اور بے تعلقی کا عہد ہے!

انسان کو اُس کے معاشی ماحول میں ایک سنجیدہ موضوع کے طور پر سب سے پہلے احسان دانش نے پیش کیا۔ اور انسان کی معاشی غربت اور اس کیفیت سے پیدا ہوتی ہوئی زندگی کو شاعری میں پیش کرنے کی اولین کوشش بھی احسان دانش کی مرہونِ منت ہے۔ تاہم وہ یہ سوال بہت کم کرتے ہیں کہ انسان کا معاشی غربت کا ماحول ایسا کیوں ہے اور اس اعتبار سے معاشی غربت کا ماحول اُن کا محض ایک خارجی منظر ہے۔ جس میں انسانی زندگیاں نمو ہیں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قاری کی ہمدردیاں چاہتی ہیں۔ آشوب اور کرب جو اس صورت سے پیدا ہوتا ہے وہ احسان دانش کی نظموں میں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ بے روزگاری بھی معاشی غربت کے موضوع کے طور پر اُن کی نظموں کو عنوان فراہم کرتی ہے۔ پڑھے لکھے بیکار نوجوانوں کی کیفیت کو بھی احسان دانش نے سب سے پہلے شاعری کا موضوع بنایا ہے ــــ اُن کی ایک نظم کا یہ شعر غور طلب ہے:

صبح کالج رو رہی تھی ڈگریوں کی شام پر
علم تھا حیران اپنے دل شکن انجام پر "

۱۹۳۵ء کے بعد جس نوع کی معاشی بدحالی اور بے روزگاری کا زمانہ ظاہر ہوا تھا۔ احسان دانش کی نظموں میں اُن کی عکاسی ہمعصر شاعری میں منفرد ہے۔ احسان دانش نے ایک ایسی کیفیت اور تاریخی صورتِ حال کو انسانی زندگی کا تجربہ اور فرد کا معاشی ماحول فراہم کیا جو ایک قلیل عرصے کے لئے بین الاقوامی طور پر بالعموم اور جنوبی ایشیا میں بالخصوص ظاہر ہوئی تھی اور جسے دوسری جنگِ عظیم نے بہت جلد ملازمت اور کاروبار کے متعدد مواقع مہیا کر کے ختم کر دیا تھا۔ معاشی ماحول کی ایسی صورت غالباً دوبارہ ظاہر نہیں ہوئی!

اُس زمانے کے ادبی ذوق کے مطابق احسان دانش انسان کی معاشی زندگی کے شاعر تھے اور اُن کی نظموں کے مجموعے کی یہ نظمیں زیادہ پڑھی جاتی تھیں اور معاشی بدحالی کا شعری اظہار اُن کے شعری تاثر کا مرکزی رنگ تھا۔ اُن کے جو مجموعے اُس زمانے میں شائع ہوئے اُن کا موضوع انسان تھا۔ تاہم اُن کی وہ نظمیں بھی اِن مجموعوں میں شامل تھیں جو مسلمان اور ہندو قارئین کو الگ الگ مخاطب کرتی تھیں۔ قارئین کے حوالے

سے لکھی گئی نظموں میں سے ایک نظم کا بند غور طلب ہے:

برج بابیوں میں شام
بنسری بجائے بجا.....
مسکرا رہی ہے شام - تو بھی مسکرائے جا
برج بابیوں میں شام بنسری بجائے بجا!"

مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ پر لکھی گئی نظموں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن یہ دونوں موضوعات انسان کے معاشی وجود اور معاشی ماحول کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اور اہمیت کے حامل تھے۔ اُس زمانے میں اُن کی شہرت کی پہچان غالباً اسی حوالے سے کی جاسکتی ہے۔

اقبال کے عہد اور وفات کے بعد کسی شاعر کی شہرت کا مسئلہ بہت پیچیدہ صورت اختیار کر چکا تھا۔ تاریخ اور فلسفے کے پس منظر کے بعد انسان کا معاشی پس منظر ہی ایک ایسا موضوع تھا جہاں کسی شاعر کی نئی آواز گونج پیدا کر سکتی تھی اور اُردو شاعری میں سب سے پہلے ایسی آواز احسان دانش نے بلند کی اور اُن کی نظموں میں سنائی دی۔ تاہم پیچھے مُڑ کر دیکھنے سے احساس ہوتا ہے کہ جو شاعر احسان دانش کے نام سے اُس زمانے میں ظاہر ہوا وہ ہماری روایت کا شاعر تھا اور اُس کے ذریعے ہماری شعری روایت انسان کے معاشی تجربے سے روشناس ہوئی تھی اور اس طرح ہمارے اپنے زمانے کو ایک مستند اور اُستاد شاعر ملا تھا۔ علم العروض پر اور علم الفاظ پر اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ شاید اسی لیے بہت جلد احسان دانش انسان کے معاشی وجود سے گزرتے ہوئے غزل اور نعت گوئی کے میدانوں میں داخل ہوئے اور ہمارا اپنا زمانہ جو اپنے شاعروں کو بہت قریب سے پہچاننے کا عادی ہے اُن کو اُس حوالے سے پہچانتا ہے جو حوالہ احسان دانش کو اُن کی بزرگی نے بدلی ہوئی دنیا میں فراہم کیا تھا۔

احسان دانش ایک نووارد اور اجنبی کے طور پر تحریکِ خلافت کے شہر لاہور میں داخل ہوئے اور انھوں نے نہ صرف اس شہر کی تہذیبی سرشت کی دریافت کی بلکہ اپنی تخلیقی سرشت کی دریافت بھی کی اور اس طرح وہ اُس شہر میں اس شہر کے تہذیبی اور روحانی فرزند کے طور پر آباد ہوئے۔ شاعری کے ضمن میں شہروں کے عمل دخل کو بہت کم محسوس کیا گیا ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جو رشتہ احسان دانش کا لاہور کے ساتھ ظاہر ہوا ہے وہ بہت کم شاعروں کی سوانح عمری میں دکھائی دیتا ہے اور یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس میں سینٹ ہال کی پیشانی پر جو گہرے نیلے اور سنہرے رنگوں کا مونوگرام پی اور یو کی حروفی شکل میں دکھائی دیتا ہے وہ مونوگرام احسان دانش کے محنت کش اور جمالیاتی ذوق رکھنے والے ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے۔ سرخی اور چونے سے بنا ہوا پنجاب یونیورسٹی کا مونوگرام لاہور شہر کے ایک ایسے تہذیبی فرزند کی یادگار ہے جس نے اِس شہر میں اپنی پہچان کی، اپنے عہد کی پہچان کی اور اُردو شاعری کے مزاج کو انسان کے معاشی وجود کا موضوع دیا۔ احسان دانش کے ذریعے ہم ایک ایسے عہد کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں جو محنت کو علم کا اصول قرار دیتا ہے اور اس سچائی کی تصدیق کرتا ہے کہ محنت کے ساتھ علم کا جو درخت پھلتا پھولتا ہے اُس کے سائے میں حوصلے اور اطمینان کی تلاش کرنے والے مسافر کبھی تھکن محسوس نہیں کرتے اور نہ اُن کا سفر ہی ضائع جاتا ہے۔

احسان دانش

حافظ لدھیانوی

احسان دانش کا وجود ارد و ادب کی نصف صدی کے دور کا آئینہ دار تھا۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، ان کے کردار کا ایک ایک رُخ درس کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کی کتابِ زندگی کا ہر باب سبق آموز جدوجہد کی تفسیر تھا۔ احسان دانش کی عظمت کسی بڑے گھرانے میں پیدائش کی وجہ سے نہ تھی۔ ان کو اپنی زندگی تعمیر کرنے کے لیے مشقتیں اٹھانا پڑیں۔ مزدوری اور فاقہ کشی کو برداشت کرنا پڑا جس کی مثال اُردو ادب میں خال خال نظر آئے گی، وہ زندگی کی جدوجہد اور شاعری کی ریاضت دونوں میں عروج پر تھے۔ ایسا شخص معاشرے کے لئے، ادیبوں کے لئے انتہائی قابلِ ستائش ہے جس نے عسرت و تنگدستی کے باوجود، نامساعد حالات کے باوصف مادی سہولت یا اسباب کے بغیر اپنا نصب العین متعین کیا، اپنے لیے راہیں تراشیں، اپنی منزل کا خود سراغ لگایا۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ فلاں شاعر فلاں بزرگ کی تصنیف ہے یعنی اس بزرگ نے اس کو متعارف کرانے، اسے مادی وسائل بہم پہنچانے، اس کے جوہر کو نکھارنے، اس کی شخصیت کو ابھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، بہت سے ایسے خوش قسمت ادیب اور شاعر ہیں جن کو باکمال اساتذہ میسر آئے جن کو سازگار ماحول ملا۔ جن کو وادیٔ ادب میں قدم رکھتے ہی رہنمائی کرنے والے، ان کو منزل بہ منزل لے جانے والے مل گئے، ان کے جوہر کھلتے گئے ان کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے مربّی ان کے محسن بھی زندۂ جاوید ہو گئے، مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا نے ایک بار دورانِ گفتگو فرمایا تھا، آج کل جو نامور ادیب اور افسانہ نگار ہیں اگر میں ان کے شروع شروع کے افسانے آپ کو دکھاؤں تو سُرخ روشنائی زیادہ نظر آئے گی یہ مدیر، یہ بزرگ ادیبوں کے رہنما ہوتے تھے ـــــ مگر احسان دانش کا معاملہ جداگانہ تھا ان کی ساری زندگی ہر لحاظ سے منفرد تھی ان کو انگلی پکڑ کر منزلِ ادب پر چلانے والا کوئی نہ ملا۔ ان کو مدرسے کی تعلیم میسر نہ آئی، جس نے افلاس اور غربت میں آنکھ کھولی ہو اسے تعلیم کی سہولتیں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ناسازگار حالات کے باوجود وہ ابتدا ہی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے۔ اولوالعزمی، مستقل مزاجی مصائب برداشت کرنے کے حوصلے نے انھیں اس راستے سے ایک لمحہ کے لیے بھی بھٹکنے نہ دیا۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ ایک اَن پڑھ مزدور ایک بے مایہ انسان، معاشرے کا روندا ہوا ایک شخص قصرِ ادب کی آخری منزل تک پہنچ جائے گا جس کی رفعت جس کی بلندی جس کی عظمت کو دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے، غموں کی تیز دھوپ نے اس کے جسم کو تو جھلسایا مگر اس کی روح کو پژمردہ نہ کر سکی۔ وہ فاقوں کی آزمائش سے نکلتا ہوا۔ شب و روز کی مشقت سے نبرد آزما ہوتا ہوا، مصائب و آلام کا مقابلہ کرتا ہوا تنہائی میں نغمے الاپتا رہا۔ اپنے اندر کے نغمے کو، اپنے اندر چھپے ہوئے شاعر کو کھینچ کھینچ کر باہر نکالتا رہا، راتوں کی خاموشی اور تنہائی میں وہ فضا میں نغمے بکھیرتا رہا، اس کے نغمے اس کی دولت، اس کی روح کی شادابی کا سامان اس کی عزم و ہمت کا سرمایا بنے رہے، اس نے اپنے شعری ذوق کو مسلسل ریاضت اور کثرتِ مطالعہ سے جلا بخشی وہ اپنے اندر سے نکلے ہوئے شاعر کی پرورش کرتا رہا وہ شاعر احسان دانش کے رُوپ میں دنیائے ادب میں جلوہ گر ہوا۔ گویا احسان دانش

نے اپنی دوسری زندگی کا آغاز کیا۔

اگرچہ ان کی زندگی کا ایک باب ختم ہو چکا تھا مگر اس دوسرے باب کی تکمیل کے لیے انھیں جسمانی مشقت نہیں بلکہ ذہنی و فکری ریاضت کرنا پڑی، وہ احسان دانش جن کے نغمات ان کی ذات ہی کے گرد برسوں پھول کھلاتے رہے۔ اب کھلے میدان میں گونجنے لگے اس گلِ نغمہ کی خوشبو، لطافت اور رنگینی سے ادب کا ہر راستہ مہکنے لگا۔ شعر و ادب کا ہر راہی محظوظ ہونے لگا۔ ادبی ذوق رکھنے والوں کو ایک نیا آہنگ مل گیا۔ زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کرنے والے شاعر کی آواز ہندوستان کے کونے کونے میں گونجنے لگی، ان کی شاعری نے بہت ہی قلیل مدت میں ادب کی منزلیں طے کر لیں، ایک مزدور استادِ فن کہلایا، اس دور کے اساتذہ سے داد وصول کی، اس نے عظیم الشان مشاعروں میں اپنے فن، اپنے کلام اور اپنی انفرادیت کو اہلِ قلم حضرات سے منوایا۔ تمام مکاتبِ فکر کے شعرا، مختلف دبستانِ شاعری کے علمبرداروں سے یکساں طور پر خراجِ تحسین وصول کیا۔

مقبولیت کی اس منزل پر پہنچ کر، ادب کے بلند ترین مقام کو حاصل کر لینے کے باوجود احسان دانش کے مزاج، ان کے رہن سہن، ان کی بود و باش، ان کی طرزِ زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا، بلکہ سادگی کا حسن نکھرتا گیا۔ اسی طرح سادہ لباس پہنا، اسی طرح زمین پر بستر لگایا۔ مقبولیت اور شہرت کے ساتھ ساتھ مالی حالات بہتر ہوتے گئے، معاشی آسودگی میسر آئی، فکرِ معاش کا بوجھ کم ہو گیا۔ مشاعروں میں مانگ بڑھنے لگی، ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی مشاعرہ ہوا ہو جس میں احسان دانش نے شرکت نہ کی ہو، ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں احسان دانش کے نغمے سنائی نہ دیے ہوں۔ یہ معاشی آسودگی ادب کے لیے خوش آئند ثابت ہوئی، انہوں نے یکسوئی، دل جمعی اور سکون سے ادب کی خدمت کرنا شروع کر دی۔ سفر میں ہوں یا حضر میں وہ مسلسل فکرِ سخن کرتے رہے، ان کی کئی نظمیں سفر کی یادگار ہیں مشاعرے میں شرکت کی غرض سے سفر ہو رہا ہے۔ ریل کی رفتار کے ساتھ ساتھ فکر کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے، کھڑکی سے باہر مناظر نظر سے گزرتے ہیں اور شعر کے پیکر میں ڈھلتے جا رہے ہیں، مشاعرے کے مقام تک پہنچتے پہنچتے ایک خوبصورت نظم وجود میں آجاتی ہے صبحِ بنارس کے مناظر دیکھے تو ذہن میں محفوظ ہو گئے اودھ کی شام دیکھی تو ایک خوب صورت نظم وجود میں آگئی، احسان دانش کی قوتِ مشاہدہ اور قوتِ حافظہ قابلِ رشک تھی۔ کسی منظر کو دیکھتے ہی اس کے تمام نقوش ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ جب چاہتے ان نقوش کو نغمے میں شعری حسن میں تبدیل کر لیتے۔ یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ تھا۔ ایک دن فرمایا کہ اگر کوئی کتاب ایک بار میری نظر سے گزر جائے میں اگر چاہوں اسے حافظے کے زور پر تحریر کر سکتا ہوں غالباً اسی قوتِ حافظہ کی وجہ سے احسان دانش نے اپنی زندگی کے تمام واقعات بے کم و کاست "جہانِ دانش" میں درج کر دیے جس سے احسان دانش کی زندگی کے بے شمار پہلو سامنے آگئے۔ مشاعروں کی روداد، ادبی محفلوں کے نقوش مشاہیرِ ادب کے ساتھ ذاتی مراسم، تلخ و شیریں یادیں سب کچھ احسان دانش کو یاد تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا

دل کو از بر ہیں محبت کے مطالب سارے
بے تامل یہ بتائے گا کہیں سے پوچھو

لدھیانہ مسلم ادب کا مرکز تھا۔ عظیم الشان مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا، اس دور کے اساتذۂ فن اس میں شرکت کرتے، انہی مشاعروں میں جگر مرادآبادی، سائل دہلوی، حیدر دہلوی، حفیظ جالندھری اور دوسرے باکمال شعرا کو سنا۔ احسان دانش کو پہلی بار مشاعرے

میں دیکھا، ان کی شاعری فن کی بلندیوں کو چھو چکی تھی۔ گھٹے ہوئے جسم درمیانے قد کا نوجوان، عقابی آنکھیں، چہرے سے ذہانت آشکار تھی۔ کھدر کا لباس پہنے سر پر بالوں والی ٹوپی سجائے اساتذہ کی صف میں بیٹھا تھا۔ سب لوگوں کی نظریں احسان دانش پر جمی تھیں، وہ احسان دانش کا کلام سننے کے لیے بیتاب تھے۔ اس زمانے میں انقلابی شاعری کو سراہا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری رومانی فضا سے نکل کر انقلابی نعرہ بن گئی تھی۔ جوش کی گھن گرج صاف سنائی دیتی تھی۔ سامراج کے خلاف ادبی محاذ قائم ہو چکا تھا۔ معین احسن جذبی، علی سردار جعفری اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر انقلابی نغمے الاپ رہے تھے۔ فیض کی شاعری نے ادبی رجحان میں نمایاں تبدیلی کی، نوجوان شعرا فیض سے بے حد متاثر ہوئے، ساحر لدھیانوی، عارف عبدالمتین، ظہیر کاشمیری، الطاف مشہدی، گوپال متل اور دوسرے شعرا اسی کارواں میں شریک تھے۔ اختر شیرانی جیسا رومانی شاعر بھی انقلابی نظمیں لکھنے لگا، جگر مراد آبادی جیسے غزل گو نے بھی انقلابی جذبات نظم کئے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کا اظہار ادب کا حصہ بن چکا تھا۔ ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ احسان دانش کا اندازِ فکر اور اسلوب منفرد تھا۔ وہ کسی ہمعصر کے مقلد نہ تھے۔ اس مشاعرے میں احسان دانش نے مزدور کی بیوہ نظم سنائی۔ ان دنوں احسان دانش ترنم سے شعر پڑھا کرتے تھے۔ پنڈال میں سکوت کا عالم تھا۔ احسان دانش کا ترنم، ان کی محاکاتی شاعری، واقعہ کے اظہار پر کامل قدرت اور جذبات کا بہاؤ سامعین کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ کسمپرسی کی جیتی جاگتی تصویر نے رقت طاری کر دی۔

احسان دانش کو منظر کشی میں انتہائی قدرت حاصل تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ قلم کی جنبش سے واضح اور دلکش تصویریں بنانے کا فن جانتے تھے۔ ان کی نظموں کا ایک ایک مصرع مکمل تصویر ہوتا تھا۔ اتنی سچی عکاسی ہوتی تھی کہ بے جان تصویریں جان پڑ جائے۔ منظر کا کوئی گوشہ، مشاہدے کا کوئی حصہ ان کے قلم کی قلمرو سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ ان کی بے شمار نظمیں میرے اس دعوے کی تصدیق کریں گی، طوالت کے خوف سے ان کی نظموں سے اقتباسات پیش نہیں کر سکتا یہ ایک علٰحدہ مضمون کا عنوان ہے، احسان دانش کی ایک نظم "بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے" ان کی رومانی نظم ہے جو جوانی کے دنوں کی یادگار ہے۔ اس نظم میں فن کارانہ انداز میں کیفیات کو زبان عطا کی گئی ہے۔ انسانی نفسیات کو شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ محاکاتی شاعری میں احسان دانش کا کوئی ثانی نہیں مذکورہ بالا نظم کا ایک مصرع ہے ؎

چنری کے ملائم کونے کو دانتوں میں دبا کر بل دینا

یہ بظاہر ایک مصرع ہے مگر چند الفاظ میں ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے آنکھیں اس کردار کا مشاہدہ کرتی ہیں ——— رنگ اور برش سے بنائی ہوئی تصویر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مدھم ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ زمانے کے انقلابات اور دست برد سے نہیں بچ سکتی مگر شعر سے تخلیق کی ہوئی تصویر لازوال ہوتی ہے۔ وہ ہر دور، ہر زمانے میں اسی حسن، اسی دلکشی اسی رعنائی کے ساتھ سامنے آتی ہے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے قلم نے ابھی اس کو وجود بخشا ہے۔

احسان دانش کے ساتھ ایک روز یونیورسٹی سے گزر رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ جب یہ یونیورسٹی زیرِ تعمیر تھی تو وہ اس میں مزدور کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کا کام ایک تالاب کو پانی سے بھرنا ہوتا تھا۔ وہ پاؤں اور ہاتھوں سے رہٹ چلا کر پو پھٹنے سے پہلے ہی اس تالاب کو بھر دیتے تھے اس کے بعد لائبریری میں جا کر مطالعے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ پھر یونیورسٹی کی طرف دیکھ کر کہنے لگے اب

وہی مزدور اس عظیم الشان یونیورسٹی کا ممتحن ہے یہ بات کرتے ہوئے ایک فاتحانہ مسکراہٹ اُن کے چہرے پر بکھر گئی، اس مضمون میں مجھے احسان دانش کے حالاتِ زندگی بیان کرنا مقصود نہیں یہ بات تو ضمناً آگئی تھی۔ "جہانِ دانش" میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے حالاتِ زندگی قلمبند کر دیے جن میں کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ "جہانِ دانش" کو پڑھنے کے بعد احسان دانش کی عظمت کے مینارِ بلند سے بلند تر ہوتے دکھائی دیتے ہیں، عظمت و بلندی کے چند زینوں پر چڑھ کر انسان کا سانس پھول جاتا ہے انسان کے قوائے ذہنی و جسمانی جواب دینے لگتے ہیں، انسان مسلسل ادبی سفر سے تھک جاتا ہے۔ مگر احسان دانش نے اپنی پوری زندگی بلندی کے ان زینوں پر چڑھتے چڑھتے گزار دی وہ زینے جو سنگِ مرمر کے نہ تھے، جن کا راستہ زرق برق قمقموں سے روشن نہ تھا۔ جہاں جگہ جگہ سستانے کے لیے نشستیں نہ تھیں، جہاں باہر جھانکنے کے لیے دلفریب و نظر نواز منظر نہ تھے، احسان دانش کو عظمت کے آخری زینے تک پہنچنے کے لئے خستہ و شکستہ سیڑھیوں سے چڑھنا پڑا۔ وہ ان سیڑھیوں کے خود ہی معمار تھے اور ان سیڑھیوں پر پورے عزم، استقلال اور بلند حوصلگی سے چڑھنے والے بھی آپ ہی تھے آخر کار انہوں نے مسلسل جد و جہد روز و شب کی ریاضت اور ان تھک کوشش سے اس منزل کو پالیا جس کے حصول کے لئے بہت سے لوگ راستے ہی میں دم توڑ دیتے ہیں، ادب کی اس منزل کے ان کے کئی ساتھی تکان سے چور ہو کر راستے ہی میں بیٹھ گئے مگر احسان دانش کی نگاہیں ہمیشہ اپنے نصب العین پر اپنی منزل پر جمی رہیں۔

احسان دانش کو کتابوں سے عشق تھا، لوگ دوسرے شہروں میں جاتے ہیں تو بچوں کے لیے تحائف یا گھر کی آرائش کا سامان خریدتے ہیں احسان دانش جب بھی کسی مشاعرے میں ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں گئے تو نایاب کتابوں، قلمی نسخوں، پرانے دواوین اور علمی و تحقیقی کتابوں کی تلاش کی، جیسے بھی بن پڑا ان نوادرات کو خریدا، اردو کی نایاب لغات، نادر قلمی نسخے، نادر کتب متقدمین کے دواوین ہزاروں کی تعداد میں ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھے، شعر و ادب کے علاوہ علمِ طب، تاریخ، فقہ حدیث تفسیر اور دوسرے علوم کی کتابیں اُن کی ذاتی لائبریری کی زینت تھیں، پرانے ادبی رسائل اور پرانی کتب کی جلد بندی کرا کے نہایت احتیاط سے رکھتے یہ ان کا ادبی سرمایہ تھا۔ وہ شخص جو سکول کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہ کر سکتا تھا۔ آج اتنے بڑے علمی و ادبی خزانے کا واحد مالک تھا، تنہائی کے لمحات میں، فرصت کے اوقات میں یہ کتابیں احسان دانش سے ہمکلام رہتیں۔

احسان دانش کے ارد گرد کتابوں کے انبار ہوتے یہ کتابیں نمائشی نہ تھیں احسان دانش نے ان سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ احسان دانش کئی کتابوں کے مصنف تھے جو ان کے کثرتِ مطالعہ تخلیقی قوت، زبان دانی، وسعتِ علم اور اسلوبِ نگارش کی شاہد ہیں۔ فنِ عروض پر ان کی گہری نظر تھی، اس دور میں بہت کم بزرگ ایسے ہوں گے جن کو فنِ عروض پر کمال عبور ہو، عموماً دیکھا گیا ہے کہ عمدہ شعر گو عمدہ شعر فہم نہیں ہوتا شعر فہمی کا ملکہ خداداد ہے جب تک شاعر کی روح شعر کی لطافت، شعر کے تہ در تہ معانی سے واقف نہ ہو شعر فہم نہیں ہو سکتا۔ احسان دانش میں یہ کمال تھا کہ وہ عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عمدہ شعر فہم بھی تھے۔ خوب صورت شعر سنتے ہی کھل کر داد دیتے تھے اسی وجہ سے انھیں اشعار کا خوب صورت انتخاب یاد تھا۔ اساتذہ کے سینکڑوں اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ گفتگو کے دوران وہ اساتذہ کے اشعار کے حوالے دیتے تھے جس سے گفتگو کا حسن اور بھی نکھر جاتا تھا۔ راقم الحروف نے کئی مشاعروں اور نجی محفلوں میں احسان دانش سے سینکڑوں اشعار سنے، کسی مجلس کسی ادبی محفل میں ایسا عمدہ انتخاب کسی شاعر سے نہیں سُنا۔ اگر کسی کتاب

کا ذکر آ گیا تو احسان دانش نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ایسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی اس کتاب کے مطالعے سے فارغ ہوئے ہیں، یہ تمام باتیں احسان صاحب کے شعری ذوق، کثرتِ مطالعہ قوتِ حافظہ اور ذہانت کی مظہر تھیں۔

احسان دانش کی محفل میں زیادہ تر ادب ہی موضوعِ گفتگو ہوتا، گفتگو کے دوران کوئی لطیفہ یا کوئی مشاعرے میں گزرا ہوا دلچسپ واقعہ بیان کرتے تو محفل میں شگفتگی کی ایک لہر دوڑ جاتی، احسان دانش کو فقرہ چست کرنے میں بڑی مہارت تھی، شاعروں کی محفل میں بڑی متانت سے ایسا فقرہ چست کرتے جو ان کی ذہانت، حاضر دماغی اور جدتِ فکر کا آئینہ دار ہوتا احسان دانش کی مجلسی زندگی پرانے دور کی یادگار تھی۔ وہی اخلاق وہی وضعداری، وہی شرافت وہی بے لوث محبت ان کے کردار کا حصہ تھی۔ آغازِ صبح ہی سے احباب آنا شروع ہو جاتے اور یہ سلسلہ رات تک جاری رہتا۔ کیسی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو، کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں انہوں نے کبھی کوئی عذر پیش نہیں کیا، نہ اپنی عدیم الفرصتی کا ذکر کیا، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، ان کی محبت ہر ایک کے لیے تھی۔ ان ملاقاتیوں میں ادیب اور شاعر ہی نہ ہوتے بلکہ زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے، ان کے مداح ان کے معتقدین ان کے احباب شامل تھے۔ کوئی ادبی شخصیت ایسی نہ تھی کہ وہ لاہور آئے اور احسان دانش سے نہ ملے، اُن کی ذات میں عجیب کشش تھی، ان کی گفتگو میں عجیب جاذبیت تھی۔ لاہور کی وہ ایسی چند شخصیتوں میں سے تھے جن کے پاس بیٹھنے، جن سے ملنے جن سے نیاز مندانہ روابط قائم کرنے کی ہر ایک کو آرزو رہتی تھی۔ سید عابد علی عابد، مولانا صلاح الدین، غلام رسول مہر، صوفی تبسم، ایم ڈی تاثیر، پطرس بخاری ایسے ہی ذی علم محفل آرا بزرگوں میں سے تھے۔ سید عابد علی عابد کی محفل آرائی کون بھلا سکتا ہے ؎ وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھا۔ یہ بزرگ علم کے موتی بکھیرتے، نوجوانوں کی تربیت کرتے، مبتدیوں میں شعری ذوق پیدا کرتے، ان کے دامنوں کو علم کے رنگا رنگ پھولوں سے مہکاتے تھے، پرانے شاعر ان سے اکتسابِ علم کرتے تھے، اسی کاروان کے ایک بزرگ احسان دانش تھے، ایسے کسی بزرگ کی وفات ایک ادارے کے بند ہو جانے کا اعلان ہوا کرتی ہے۔

احسان دانش نے مجلسی زندگی میں کبھی گھریلو بات نہیں کی اس زندگی میں کس کو گھریلو پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، کس کو گھریلو مسائل پیش نہیں آتے مگر احسان دانش نے اشارے کنایے سے بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کیا وہ احباب کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی مجلس تو خالص ادبی مجلس ہوتی تھی۔ وہ اس کی لطافت کو کسی اور ذکر سے مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اتنی مصروفیت کے باوجود احسان دانش نے بہت کچھ لکھا، مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف موجود ہیں کئی دیوان ان سے یادگار ہیں، ان کو شعر کہنے کا قدرت نے ایسا ملکہ ودیعت کیا تھا کہ وہ جب چاہتے جس موضوع پر چاہتے شعر کہہ سکتے تھے۔ ان کی برسوں کی ریاضت ان کا کثرتِ مطالعہ، ان کی بزرگوں سے صحبتیں فن شعر گوئی میں مہارت کا موجب ہوئیں۔ انہوں نے تقریباً ہر صنفِ شاعری پر لکھا، ہر صنف میں ان کی انفرادیت قائم رہی، انکی سوچ کا انداز اپنا تھا جس کو اور کوئی اپنا نہ سکا۔

احسان دانش نے بہت سے شاعروں کو متعارف کرایا، قلیل مدت میں جن کا طوطی سارے ہندوستان میں بولنے لگا۔ ان میں ترنم سے پڑھنے والے زیادہ تھے۔ احسان دانش ان کے کلام کی اصلاح کرتے، ان کو مشاعروں میں لے جاتے۔ مگر جب تک ذاتی جوہر موجود نہ ہو کسی کو بقاء نصیب نہیں ہو سکتی اس لیے جلد ہی ان کے چراغ گل ہو گئے آج ان کا کوئی نام تک نہیں جانتا ؎

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

ایسے شاعر بھی ہیں جن کو احسان دانش کی صحبت نے بہت فائدہ پہنچایا۔ ان کا شعری ذوق نکھرتا چلا گیا، ان کی ریاضت نے انہیں صف اوّل کے شعرا میں شامل کر دیا۔

احسان دانش بزرگ شعرا میں شاید واحد شاعر تھے جن کی شاعری میں لچک، جن کے فکر میں تازگی، جن کے مزاج میں زمانے کے ساتھ ساتھ بدل جانے کی صلاحیت تھی۔ ان کے انداز نے بدلتی ہوئی شاعری کے نئے رنگ اور نئے اسلوب کو نہ صرف اپنایا بلکہ نوجوان شعرا کی رہنمائی بھی کی۔ جدید شاعری میں جو اہمال، رکاکت اور ابہام پیدا ہو چلا تھا، جو شاعری معنویت کے حسن سے کافی حد تک محروم ہو چکی تھی، جس میں فکر کا تسلسل اور معنوی ہم آہنگی باقی نہ رہی تھی اس کو احسان دانش نے قدیم و جدید کا حسین امتزاج عطا کیا۔ احسان دانش نے اس نئے رنگ، نئے آہنگ اور نئے اسلوب کو نئی نئی تراکیب، نئے نئے استعارات اور نئی نئی تشبیہات سے مالا مال کر دیا۔ جو اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ بن گئیں۔ ان کی اگر الگ فہرست مرتب کی جائے تو معلوم ہوگا کہ احسان دانش نے کتنا بڑا اور اہم کام کیا ہے۔ نئے نئے استعارات وہی تخلیق کر سکتا ہے، نئی نئی تشبیہات وہی وضع کر سکتا ہے۔ جس کو زبان و بیان پہ پوری قدرت ہو وہ جس طرح چاہے الفاظ کو معنوی حسن سے آراستہ کرے۔ جب بھی احسان دانش کو مشاعروں میں سنا تو جدّتِ افکار، سوچ کا نیا رُخ، معنویت کا نرالا پن اور اسلوب کا نیا انداز نظر آیا جس نے شعرا سے بے پناہ داد وصول کی۔ اس ضمن میں احسان دانش کے بہت سے اشعار کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں جو ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اس پر اگر کام کیا جائے تو اردو ادب کو، جدید شاعری کو ایک نئے اندازِ شاعری سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ اگر احسان دانش کی تخلیقات پر تحقیقی کام کیا جائے تو ادب کے بہت سے نئے گوشے بے نقاب ہوں گے اور اردو ادب کو انمول سرمایہ ہاتھ لگے گا۔ اگر حکومت کا کوئی وظیفہ خوار ادارہ اس کام کا بیڑہ اٹھائے تو یہ اُردو ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

شاعری میں احسان دانش کا انداز لطیف، خیال پاکیزہ، اور اسلوب دلکش تھا، منظم ہو یا غزل اُن کے قلم سے معیار سے گرا ہوا، سوقیانہ یا عامیانہ شعر نہیں نکلا۔ جیسی ان کی روح لطیف تھی ویسے ہی ان کی شاعری جذبے کی لطافت، فکر کی خوشبو اور اظہار کا حسن لیے ہوئے تھی۔

شاعری ہو یا نثر نگاری اس میں ہر شاعر یا ادیب کی اپنی زندگی کا پرتو، اپنے خیالات کا عکس، اپنے ضمیر کی آواز ضرور شامل ہونی چاہیے ورنہ شعر اور نثر پارہ بے جان ہو کر رہ جائے گا۔ احسان دانش نے ہر دور میں اپنے ماحول کی کھل کر عکاسی کی، تنقید کو شعری حسن کا لبادہ پہنایا۔ ضمیر کی آواز کو شعری قالب میں ڈھالا۔ انہوں نے بے خوف و خطر نتائج کی پروا کیے بغیر اربابِ حل و عقد کے غلط رویّے پر شدید نکتہ چینی کی، ان نظموں کو مشاعروں میں پڑھا۔ عوام تک اپنے خیالات اپنے نظریات کو پہنچایا۔ انہوں نے ظلم و استبداد کی ایسی ایسی نظمیں پیش کیں جن کا ایک ایک مصرع چیخ چیخ کر ماحول کے مظالم کے خلاف احتجاج کرتا معلوم ہوتا ہے۔ وہ غلط قسم کے رہبروں سے نالاں تھے ؎

مجھے نرغے کے چلو رہبروں کے حلقے میں
میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

ایسی نظموں سے اس دور کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ تقسیم ہند و پاک سے پہلے کی نظموں کو اگر ترتیب دیا جائے تو منزل تک پہنچنے کے لئے کئی سنگِ میل نظر آئیں گے، جس طرح شہرِ آشوب سے ایک دور کے خد و خال سامنے آجاتے ہیں اسی طرح احسان دانش کی نظمیں ایک پُر آشوب دور کی عکاس نظر آئیں گی۔

احسان دانش کو مذہب سے ذہنی لگاؤ اور قلبی وابستگی تھی، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ غیرتِ دینی اور حمیتِ قومی کے جذبات ان کی گفتگو کا محور اور ان کے افکار کا مرکز تھے، مشاعروں میں احسان دانش کا ساتھ رہا ان کے دینی معمولات میں کبھی فرق نہ آیا اسی دینی شغف کی وجہ سے انھیں بیت اللہ کی زیارت نصیب ہوئی، فریضۂ حج ادا کرنے کا موقعہ ملا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضری کی سعادت سے مشرف ہوئے جو خوش بختی کی معراج اور ہر مسلمان کا منتہائے مقصود ہے۔ ختمی مرتبت، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات سے احسان دانش کو بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ کئی واقعات اب بھی حافظے میں محفوظ ہیں جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ خیر سے احسان دانش کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

ایک دن میں احسان دانش سے ملنے گیا۔ ان کے چہرے پر اُداسی کے آثار نظر آئے۔ کہنے لگے نعت سنائیے۔ میں نے تازہ نعت سنائی، نعت سنتے ہی آبدیدہ ہوگئے ایک اور نعت کی فرمائش کی، نعت سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں نے احسان دانش کو پہلی بار اس طرح روتے ہوئے دیکھا تھا، یہ ان کی زندگی کا حسین رخ سامنے آیا۔ یہ ان کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور باطن کی صفائی کا مظہر تھا۔ کافی دیر خاموش رہے، پھر فرمایا اچھا ہُوا حافظ صاحب آپ آگئے، آنکھوں کا غبار دھل گیا، بہت دنوں سے گرہ جمی ہوئی تھی۔ روضۂ اطہر پر حاضری کے بعد یہ جذبہ خوبصورت انداز سے نکھر کر سامنے آیا۔ حضوری نے اس شیشے کو اور جلا بخشی جس کی نشاندہی ان کے نعتیہ کلام میں ہوتی ہے۔ اُن کے نعتیہ اشعار میں عقیدت و محبت کے بیشمار پہلو نظر آتے ہیں۔ احسان دانش کا ملجا و ماویٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تھی۔ ان کو یہی سہارا کافی تھا۔ انہوں نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا انہوں نے باوقار فاقہ مست کی طرح زندگی کے ابتدائی ایام بسر کئے، گدائے بارگاہِ رسالت دنیا کے ہر دروازے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مواجہ پر حاضری کے اشعار ان کی قلبی کیفیت کے ترجمان ہیں ؎

رُخِ خیر البشرؐ تو پھر رُخِ خیر البشرؐ ٹھہرا
ان آنکھوں سے درِ خیر البشر دیکھا نہیں جاتا

کھڑا ہوں کب سے محرابِ حرم کے سامنے دانش
نظر رہ رہ کے اٹھتی ہے مگر دیکھا نہیں جاتا

ان اشعار سے حضوری کے آداب احترام کے پہلو اور عجز و نیاز کے کئی انداز سامنے آتے ہیں اگر احسان دانش نے فریاد کی ہے، ملت کی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے، امت کی پریشانیوں کا حال بیان کیا ہے تو صرف سید المرسلینؐ کے حضور کیا ہے، انہی سے مدد چاہی ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس کے سوا کون امت کا غمخوار ہو سکتا ہے ؎

مسلسل ہو رہی ہے جانے کیوں امت کی رسوائی
دعاؤں میں یہ افلاس اثر دیکھا نہیں جاتا

احسان دانش پر فالج کا حملہ ہُوا۔ وہ وجود جس نے شکست و ریخت کے بے شمار منظر دیکھے تھے، جس نے جد و جہدِ زندگی میں نہایت عزم و استقلال کا ثبوت دیا تھا۔ وہ اب تھک چکا تھا اس کے جسم کی مضبوط دیواریں ہل چکی تھیں، گفتگو تک کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ احسان دانش کی آنکھوں میں یاسیت کی تحریر پڑھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پرانے مضبوط قلعے میں شگاف پڑ گئے ہیں، مغدوری نے ان کو ہلا کر رکھ دیا۔ جو شخص اپنے ہی بل بوتے پر جیا ہو جس نے اکیلے مصائب و آلام برداشت کئے ہوں، جو دوسروں کو سہارا دیتا رہا ہو وہ خود سہارے کا محتاج ہو گیا تھا۔ میں احسان دانش کی طرف دیکھ رہا تھا ان کی کتاب "جہانِ دانش" کا ایک ایک ورق، ایک ایک واقعہ نظروں سے گزر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کتنا عظیم انسان ہے، ان کی زندگی کتنی مثالی ہے ان کی جد و جہد کتنی سبق آموز ہے۔ ان کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب ان میں مزید تکالیف برداشت کرنے کی سکت نہیں رہی، اب یہ چراغ جس نے نصف صدی ایوانِ اردو میں اجالا کیا بجھنے کو ہے، یہ دانش کدہ جو ایک ادبی ادارہ تھا اس کے دروازے بند ہونے کو ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جلد ہی ایک حسین و جمیل دور کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا جائے گا۔

احسان دانش نے جو چاہا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انھیں ملا۔ جو منزل انہوں نے آغازِ زندگی میں متعین کی تھی انھیں ملی۔ روضۂ اقدس کی زیارت سے مشرف ہوئے، احسان دانش نے اپنی گھریلو زندگی، گھریلو ذمہ داریوں کو ایک شریف اور معزز انسان کی طرح پورا کیا۔ انہوں نے باوقار اور باعزت زندگی بسر کی، ان کی منزلِ زندگی میں بے راہ روی کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ انہوں نے ذاتی کاوش مسلسل تگ و دو اور روز و شب کی ریاضت سے شہرت اور مقبولیت کی آخری منزل تک پہنچ کے دم لیا۔ ان کو موت کا خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عدم کا راستہ ہر ایک کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ انہوں نے اس راستے کو بھی سنتِ رسولؐ سمجھ کر طے کیا ؎

دانش میں خوفِ مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضورؐ کی

نثرِ احسان دانش

کسریٰ منہاس

جناب احسان دانش کو جہاں اُردو کے ممتاز شعراء کی صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے وہاں وہ ایک خوش قلم نثر نویس بھی تھے۔ شاعری میں ان کے متعدد مجموعے ملتے ہیں جن سے ان کی نغز گوئی اور خوش گوئی کا پتا چلتا ہے۔ نثر میں بھی اُنھوں نے چند کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ نثر میں جو کام انھوں نے کیا ہے وہ مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے کار آمد ہے۔ لغات میں "اُردو مترادفات" کے نام سے ایک کتاب چھپوائی ہے جو خاصی ضخیم ہے۔ ہر زبان اپنے دامن میں مترادف الفاظ رکھتی ہے کسی میں یہ ذخیرہ کم اور کسی میں زیادہ ہوتا ہے۔ ایک ہی معنی کے ادا کرنے کے لیے کئی لفظ استعمال کرنے کا طریقہ مدتوں سے رائج چلا آرہا ہے۔ احسان صاحب نے اپنی اس تصنیف میں جس قدر الفاظ اکٹھے کیے ہیں۔ ان کے مقابل ہر لفظ کے لیے جتنے مرادف الفاظ مل سکتے ہیں، ان کو نہایت سلیقے سے مرتب کر دیا ہے۔ شاعروں اور انشا پردازوں کے لیے یہ ایک قیمتی سرمایہ ہے جس سے ضرورت کے وقت فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ تذکیر و تانیث کے عنوان سے بھی ان کی ایک کتاب ہے یہ کتاب بھی ضخیم ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے۔ ایک رسالہ خضرِ عروض کے نام سے لکھا ہے۔ اس سے نو آموز شعراء اپنی مشکلات کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ایک رسالہ دستورِ اُردو کے نام سے بھی ملتا ہے۔ اس میں بھی ان کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جو روزمرہ کی بول چال میں عوام ہی میں نہیں بلکہ خواص میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک کتاب اُنھوں نے لغات الاصلاح کے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ان کی ابتدائی نثری تصانیف میں سے ہے۔ بقول حضرت مصنف اس میں پانچ ہزار غلط الفاظ کی تحقیق و اصلاح کی گئی ہے"۔ اور ایک کتاب جہانِ دانش کے نام سے لکھی ہے جو ان کی دلچسپ اور حیرت ناک آپ بیتی ہے۔

احسان دانش ایک شاعر تھے اور ایک شاعر کا دل و دماغ لے کر پیدا ہوتے تھے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ جتنے بڑے شاعر اور ادیب گزرے ہیں ان کو زبان اور روزمرہ پر پوری پوری قدرت حاصل تھی، وہ زبان کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے اور الفاظ کے برتنے کا سلیقہ اُنھیں آتا تھا۔ جب ایک ایسا وقت آیا کہ ان کی شاعری کا ڈنکا بجنے لگا، اور ان کے مشاعرے لوٹنے کی شہرت عام ہوئی تو بہت سے نو آموز شعرا اُن کے ہاں اصلاحِ کلام کی غرض سے آنے لگے۔ تو پھر اُن کو شاعری کے ساتھ ساتھ متعلقاتِ شاعری کی طرف بھی دھیان دینا پڑا۔ مبتدی شعراء تو ہزار قسم کی غلطیاں لے کر آتے ہیں۔ "استاد شاعر" کو اُن کی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ وجہ اصلاح بھی بتانا پڑتی ہے۔ مختلف ضروری کتب سے استفادہ بھی کرنا پڑتا ہے تاکہ استفسار کے وقت شاگرد کو مطمئن کیا جاسکے۔ مذکورہ کتب اور رسالے جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے، بیشتر اسی صورت کے پیشِ نظر مرتب کیے گئے ہیں۔ احسان صاحب نے جن جن موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے یقیناً وہ کار آمد ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو کچھ ان میں ہے

وہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ فروگذاشتوں اور غلطیوں سے کوئی تصنیف معرا نہیں ہوتی۔

احسان صاحب کو کتابیں اکٹھی کرنے کا بھی خبط تھا۔ ان کے ہاں پاکستان اور ہندوستان کی بیشتر چھپی ہوئی کتابیں موجود رہتی تھیں۔ ان کا قول ہے کہ "روز پڑھو اور روز لکھو" وہ کتابوں کے کیڑے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق جنون کی حد تک تھا۔ شبانہ روز محنت کی اور نام پیدا کیا۔ جس بلند مقام پر وہ آج فائز ہیں انھیں چلتے پھرتے نہیں مل گیا، بلکہ یہ ان کی انتھک کوشش اور مسلسل فکر و ریاض کا ثمرہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک ایک انسان کو اپنے مطمح نظر سے عشق نہ ہو وہ کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ احسان صاحب کو ادب و شعر سے شغف تھا۔ وہ زندگی بھر اس کے حصول کی جدوجہد کرتے رہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا اوڑھنا بچھونا علم اور حصولِ علم تھا۔ ان کی محفل شعر و ادب میں علمی گفتگو ہوتی تھی۔ وہ لفظی موشگافیوں کے تذکرے میں بعض اوقات مروجہ الفاظ کو نئے نئے معانی سے روشناس کراتے رہتے تھے۔ اور جب غلط العام کی بات ہوتی تو کہتے کہ "جن الفاظ کو غلط العوام کی سند حاصل ہے انھیں غلط بتانا مشکل ہے۔" احسان صاحب نے چونکہ اپنے بل بوتے پر ترقی کی تھی اس لیے جب وہ نئی نسل کے شعرا و ادبا کی تحریروں میں نقائص دیکھتے تو انھیں دکھ ہوتا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ محنت نہیں کرتے۔ اردو صرف و نحو، عروض و علم بیان پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُن کو نہیں پڑھتے۔ مطالعہ علم کو وسیع سے وسیع تر کرتا ہے۔ اگر محنت کی جائے تو حصولِ فن کوئی مشکل چیز نہیں ہے جن بزرگوں نے یہ بڑی بڑی علمی کتب لکھی ہیں وہ بھی تو انسان ہی تھے۔ ہمیں ان کتابوں کا دلجمعی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ مطالعہ سے جی چرانے والے صاحبان ہمیشہ کورے رہتے ہیں۔ اور ان کی تحریروں میں زبان و فن کی غلطیاں عام ہوتی ہیں۔ احسان صاحب دوسروں ہی کو پڑھنے لکھنے کی تلقین نہیں کرتے تھے بلکہ خود بھی روزانہ لکھنے پڑھنے کے پابند تھے انہوں نے ذاتی کوشش سے ایک بڑا کتب خانہ جمع کیا جس میں عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں کی کمیاب اور نایاب کتابیں موجود تھیں۔ وہ کتابیں خریدتے بھی تھے اور بیچتے بھی تھے۔ جب کوئی نایاب کتاب ہاتھ آجاتی تو پھولے نہیں سماتے تھے بلکہ اس کے متن سے احباب کو روشناس کراتے۔ جن موضوعات پر وہ کام کرتے تھے ان سے متعلق کتابوں کی تلاش ہمیشہ جاری رہتی تھی وہ ان کتابوں سے اپنی تصانیف میں فائدہ بھی اٹھاتے تھے لیکن اس فیض کو وہ چھپا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ حوالہ دے کر ان کی بڑائی کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

احسان صاحب کی بزمِ ادب میں شاگردوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اُن سب سے مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے جب کوئی آتا طبیعت حاضر رہتی تھی۔ اصلاح دینے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ شاگرد غزل کا شعر سناتا فوراً شعر کی غلطی اصلاح سے دور کر دی جاتی۔ وجہ اصلاح بھی بتا دی جاتی تاکہ آئندہ اس قسم کی غلطی سے احتراز کیا جائے۔ بعض شعرا کے پورے کے پورے دیوان انھوں نے بنائے۔ لیکن افسوس ہے کہ احسان صاحب کی اصلاحوں کے نمونے اب کہیں سے نہ مل سکیں گے لیکن کسی سعادت مند شاگرد نے یہ ادبی خزانہ محفوظ رکھا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو منظرِ عام پر لائے تاکہ دوسرے بھی ان کی بتائی ہوئی اصلاحوں سے فیض حاصل کر سکیں۔ بہرحال اس "اُستاد شاعر" کی اصلاحوں کو ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

احسان صاحب کی نثر میں چھ کتابیں ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ جہانِ دانش تو ان کے سوانح حیات کا پہلا حصہ

ہے اور دوسری پانچ تصانیف ادبی، لسانی اور فنی ہیں جن پر ذیل میں اظہار خیال کیا جا رہا ہے:

تذکیر و تانیث

یہ کتاب مرکزی اُردو بورڈ لاہور نے مارچ ۱۹۷۶ء میں شائع کی۔ اس کے ۳۷۰ صفحات ہیں۔ کتاب کے موضوع ہی سے اس کا متن ظاہر ہے۔ احسان صاحب نے اس کتاب میں سیکڑوں الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی ہے۔ دیباچہ میں ایک 'دکھتی رگ' کو چھیڑا ہے، فرماتے ہیں:-

"اس میں شک نہیں کہ اس زبان (اُردو زبان) میں الفاظ و محاورات اور تذکیر و تانیث پر آئے دن ہنگامے برپا رہتے ہیں اور کوئی فیصلہ ہونے میں نہیں آتا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اِس بھیڑ بھڑ کا میں شور و غوغا مچانے والے کچھ تو متعصب ہوتے ہیں اور کچھ بے خبر، ورنہ تجویز پر تجویز اور اصلاح پر اصلاح کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال دیتی ہے مگر یہاں کے اہلِ ادب اور دانشوروں میں کہولت و سہولت کا مرض عام ہے اور وہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ علمی و ادبی، اصطلاحی و اصلاحی کتب کم اور بازار میں فحش افسانوں اور ناولوں کی بھرمار ہے اور اس سے علمی، ادبی اور فنی کتابوں کا مطالعہ کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے کسی کو یہ خیال نہیں کہ ہم اصولِ علم اور شرائطِ تحصیل سے کس قدر دُور ہوتے جا رہے ہیں اور اس میں کس قدر قصور ہمارے دانشور طبقے کا بھی ہے کہ وہ اصولِ علم اور مفادِ علم کو عام فہم کر کے نہیں پھیلاتے اور ہمارے لٹریچر میں روز بروز علمی کتابوں کا قحط پڑتا جا رہا ہے۔[1]"

اس موضوع پر اس سے قبل بھی چند کتابیں طبع ہو چکی تھیں۔ ان میں "دو پیکر" از ظہیر الدین احمد خان (۱۸۴۷ء) مجموعۂ مضامینِ صغیر مسمّیٰ رسالہ رشحات از صفیر بلگرامی (۱۸۷۶ء) رسالہ تذکیر و تانیث یعنی یہ مفید الشعراء" از جلال لکھنوی (۱۸۷۶ء) "تذکیر و تانیث" از جمیل مانکپوری (۱۹۰۸ء) قران السعدین مع مجمع البحرین" از راجہ راجیشور راؤ اصغر (رومانیہ) (۱۹۱۱ء) میں شائع ہو چکی تھیں لیکن یہ کتابیں کمیاب ہی نہیں نایاب بھی ہو چکی تھیں۔ اس لیے احسان صاحب نے محسوس کیا کہ تذکیر و تانیث پر ایک کتاب مرتب کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس مشکل کام کے کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور مسلسل کئی سالوں کی محنتِ شاقہ کے بعد اس کتاب کو مرتب کر کے پیش کیا۔ اُنھوں نے ابتدائیہ میں اچھی کتابوں کے نہ چھپنے کی وجہ بھی بتائی ہے اور اہلِ علم کو فنی کتابوں کے لکھنے کی تحریک بھی کی ہے اور اُنھیں سہل انگاری کا طعنہ بھی دیا ہے۔

احسان صاحب نے اس کتاب کو پینتیس ۳۵ ابواب میں مدوّن کیا ہے۔ اس میں سے آخری باب کتابیات کا ہے۔ ان ابواب کی

---

[1] تذکیر و تانیث از احسان دانش، طبع مرکزی اُردو بورڈ، لاہور۔ ص ۲

ترتیب میں اُنھوں نے جن اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ان کی وضاحت کی ہے۔ نظیر میں بہت کم شعر منتخب ہوئے ہیں۔ البتہ جس شعر سے کسی لفظ کی تذکیر و تانیث ثابت ہوتی ہے۔ خوب چھان پھٹک کر شامل کیا ہے۔ الفاظ کے مقابلے میں نظائر کی کمی محسوس ہوتی ہے، مثلاً اُنھوں نے ایک عنوان قائم کیا ہے "حروفِ تہجی کے لحاظ سے تذکیر و تانیث" (صد ۲۹۲)

الف تذکیر

اس عنوان کے تحت اُنھوں نے بہت سے الفاظ کی ایک فہرست دی ہے جو چار صفحوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان چار صفحوں میں سیکڑوں الفاظ دیئے ہوئے ہیں لیکن نظیر میں فقط چار شعر دیئے ہوئے ہیں وہ شعر یہ ہیں :-

لفظ	تمثیل	
اپیل ؎	یہاں نہ جرم ہو ثابت مگر بری ہو گی تو! عدالتِ محشر میں جب اپیل ہوا	(اختر میناوی)
استخوان ؎	واہ وا شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک استخواں میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہیں	(ذوق دہلوی)
اسرار ؎	یا خدا تھا اس جگہ یا احمدِ مختار تھے عاشق و معشوق میں کیا جانے کیا اسرار تھے	(شاعر کا نام نہیں دیا گیا)
اندھیر ؎	تعویذ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر آنگن میں پڑے گڑے ہیں ڈھیر یہ اندھیر	(ٹوک چند محروم)

راقم الحروف نے ایک دن ان سے پوچھا کہ آپ نے تذکیر و تانیث کے متعلق الفاظ تو سیکڑوں جمع کر دیئے ہیں لیکن ان کے مقابل نظیر میں اشعار نہ دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، حالانکہ اس موضوع پر جو کتابیں بھی چھپی ہیں اُن میں بیشتر مثالیں دی گئی ہیں تاکہ مصنفین کا دعویٰ بے دلیل نہ رہے تو فرمانے لگے کہ میں نے تو ہر لفظ کے مقابل نظیر دے دی تھی۔ لیکن ضخامت بڑھ جانے کے خوف سے ناشر صاحب نے ان کو نظر انداز کر دیا۔" (واللہ اعلم)

"الف تذکیر" کے بعد اُنھوں نے "الف تانیث" کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں بھی بیشتر منتخبہ الفاظ کو بلا تمثیل چھوڑ دیا گیا ہے اور ایسے الفاظ جو مؤنث بولے یا لکھے جاتے ہیں۔ ان کی فہرست دے دی ہے۔ اس عنوان کے آغاز میں اُنھوں نے لکھا ہے :

"آب (چمک۔ تیزی) آب جو، آبرو، آبشار، پہلے مؤنث لکھتے تھے لیکن اب مذکر بولا جا رہا ہے۔ اس لفظ کی ساخت اور شان مذکر ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔" (تذکیر و تانیث صد ۲۹۵)

'آب'[1] چمک کے معنی میں مؤنث ہے لیکن پانی کے معنی میں مذکر ہے۔ ؎

احمدؐ پاک کی میں نعت لکھوں کر کے وضو
آبِ کوثر مجھے مِل جاتے اگر تھوڑا سا (امیر مینائی)

اِسی طرح 'آبشار' کے متعلق جناب احسان کا یہ فرمانا کہ پہلے مؤنث لکھتے تھے اور اب مذکر بولا جاتا ہے۔ لیکن سند میں کوئی شعر پیش نہیں کیا گیا۔ استاد جلیل نے رسالہ تذکیر و تانیث میں اسے مؤنث کہا ہے ؎

خیالِ قامتِ بالا میں ہیں رواں آنسو
بڑی بلندی سے یہ آبشار گرتی ہے (نوازش لکھنوی)

قران السعدین معہ مجمع البحرین میں اصغر و رمانے ایک شعر اس لفظ کی تذکیر میں لکھا ہے ؎

طبع رواں ہے میری یا آبشار تیرا
یا ستائگیں قدرت انوار سے بھری ہے (مرور)

لیکن فٹ نوٹ میں یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ لفظ مختلف فیہ ہے۔ مذکر کو ترجیح ہے اور مؤنث میں نوازش لکھنوی کا وہی شعر پیش کیا ہے جو استاد جلیل نے اپنے رسالے تذکیر و تانیث کے صفحہ ۱ پر لکھا ہے۔ احسان صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ اس لفظ کی ساخت اور شان مذکر ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ کوئی غلط نہیں کہا ہے۔ پہلے کثرتِ استعمال مؤنث کے حق میں تھی اور اب اس لفظ کو مختلف فیہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ استاد جلیل اور نوازش لکھنوی کے مقابلے میں کیا سرور کے شعر کو سند کا درجہ دیا جا سکتا ہے کہ نہیں؟

حضرت احسان نے سید ضامن علی جلال لکھنوی کے رسالہ مفید الشعراء کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:-

"ضامن علی جلال کا یہ رسالہ تذکیر و تانیث میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور یہ انھوں نے بڑی ادبی خدمت کی ہے۔ لیکن زمانے کے ساتھ یہ اندازِ تحریر نامقبول سا ہو گیا ہے۔ اسی احساس کے تحت پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اس الجھن اور بھول بھلیاں سے نکلنے کے کچھ رستے صاف کئے ہیں اور اپنی کاوش کو اصول کی صورت میں پیش کیا ہے جس سے سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہے اور مستثنیات کی وسیع شاہراہیں پگڈنڈیاں بن گئیں فرماتے ہیں "مرکبات جو دو اجزا کے کتنے ہوں اور وہ اجزا مختلف الجنس ہوں یا نہ ہوں۔ وہ بھی اصول کے نیچے لائے گئے ہیں"

(تذکیر و تانیث از مصنف ص ۸۳-۸۲)

---

[1] آب کو آتش اور زبر نے مذکر بھی کہا ہے اس لیے اس کو مختلف فیہ کہہ سکتے ہیں۔ آتش عشق میں یا الٰہی یکسوں کو موت دے کیا گہر کی قدر جب آبِ گہر جاتا رہا
بحر ع ڈبوں گا میں ڈبوئے گا آبِ گہر مجھے (مفید الشعرا جلال ص ۱۱)

جناب کیفی دتانیہ کے اس اقتباس کے بعد جناب احسان نے چند الفاظ مذکورہ نظریہ کی تائید میں لکھے ہیں مثلاً اگر دونوں جزو ماضی ہوں تو مرکب مؤنث ہوگا۔ جیسے گفت وشنید، خرید وفروخت، آمد ورفت، شکست وریخت، نشست و برخاست وغیرہ۔

بعض مرکب قیاس پر بھی مبنی ہیں۔ مثلاً شیر برنج۔ اس میں دونوں جزو مذکر ہیں مگر استعمال مؤنث ہے۔ اس مرکب کو مؤنث اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کا مترادف کھیر ہے۔ جیسے ہم پہلے سے لکھ چکے ہیں مؤنث ہے۔

(منشورات از کیفی دتانیہ ص۹۴)

"اسی طرح نیشکر اور بھونچال کے دونوں جزو مؤنث ہیں مگر مذکر مستعمل ہے۔ غالباً یہ صوتی اثرات کے تحت آتے ہیں۔" (تذکیر وتانیث جناب مصنف ص۸۳)

"نیشکر مختلف فیہ ہے۔

؎ چاشنی دونوں کی چکھی ہے جو حق حق پوچھیے
ان لب شیریں سے شیریں نیشکر کوئی نہ تھا (آتش لکھنوی)

؎ تمھاری انگلیوں نے وصف پایا پتلی ہونے میں
نہیں تو عیب ہے ہو جائے جتنی نیشکر پتلی (رشک لکھنوی)

کثرت استعمال تذکیر کے ساتھ ہے چنانچہ ذوق کا شعر ہے۔

؎ خدنگ عشق کھا کر زخم دل فرہاد کے باہم
لگے کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے" (ذوق دہلوی)

(تذکیر وتانیث جلیل ص۳۴۸)

بھونچال یہ لفظ بھون اور چال سے مشتق ہے۔ بھون بھی مؤنث ہے اور چال بھی۔ خدائے سخن میر دہلوی کا ایک شعر ہے۔

؎ نہ پوچھو کہ لوگوں کا کیا حال تھا
جو رکھے قدم واں تو بھونچال تھا

جناب احسان نے اس کتاب کو بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ پہلے عنوان قائم کیے مثلاً تذکیر وتانیث کی قسمیں، دوسری زبانوں کی تذکیر وتانیث، بے جان اشیاء کی تذکیر وتانیث، جانداروں میں تذکیر وتانیث، جانوروں میں تذکیر وتانیث، تذکیر وتانیث میں پیچیدگیاں، واحد وجمع میں تذکیر وتانیث، حرف اضافت اور تشبیہ، جمع کی تذکیر وتانیث، دو جزوی الفاظ کی تذکیر وتانیث، حاصل مصدر فارسی و حاصل مصدر اردو کی تذکیر وتانیث، قواعد اردو میں تذکیر وتانیث کا مسئلہ، عربی الفاظ کی تذکیر وتانیث، محاورات میں تذکیر وتانیث، حرف کی تذکیر وتانیث اور وحدت وجمع، مختلف الجنس الفاظ، اخلاقی الفاظ وغیرہ ان عنوانات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب بڑی محنت، کاوش اور کثیر مطالعہ کے بعد ان لوگوں کے لیے

لکھی گئی ہے جو تحقیق و تدقیق کا شوق رکھتے ہیں۔ تذکیر و تانیث ایک جھگڑے بھرا مسئلہ ہے، ؎

مؤنث اور مذکر کی ہیں بحثیں
بڑا جھگڑا ہے یہ اُردو زباں میں (جلیل مانکپوری)

یہ کتاب عنوانات کے تحت مرتب کی گئی ہے۔ اس لیے ضرورت کے وقت ضرورت کے الفاظ تلاش کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے، ایسی کتابوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے پیش کرنا چاہیئے تاکہ قاری کی ضرورت فوراً پوری ہو جائے۔ ایسی کتاب کے لیے متداول الفاظ کے سامنے ان کی تذکیر و تانیث اور ہر لفظ کے لیے کسی مستند شاعر کی سند ڈھونڈ کر لکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ احسان صاحب نے جن الفاظ کے لیے ضروری سمجھا، اُن کے لیے ضروری سند بہم پہنچادی ہے اور "جو الفاظ بقول مصنف دریائے لطافت، کسی حرف یا حرکت کے سبب سے مؤنث یا مذکر پر دلالت کرتے ہیں۔ "پیاری" میں یائے معروف اور "پیارا" میں الف علامت تذکیر و تانیث ہیں۔ بالعموم یہ الف اور یائے معروف ہی اُردو میں زیادہ مذکر و مؤنث کا بار اُٹھائے ہوتے ہیں؟ ایسے الفاظ کے لیے سند بہم پہنچانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ (تذکیر و تانیث ص۲)

یہ کتاب مجموعی طور سے بہت مفید اور کار آمد ہے۔ چونکہ اس موضوع پر دوسری مطبوعہ کتب اب کمیاب بلکہ نایاب ہیں، اس لیے اب اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب غالباً اُنھوں نے اپنے شاگردوں کے لیے لکھی ہے تاکہ مذکر اور مؤنث کی بحثوں میں ان کے کام آتے۔

خضرِ عروض

فنِ عروض پر یہ رسالہ ذیشان بک ڈپو منرنگ سے شائع ہوا تھا۔ سالِ طباعت درج نہیں ضخامت ۶۴ (چوسٹھ) صفحات۔ اس کتاب کی تالیف میں انھوں نے دس کتابوں سے مدد لی ہے جن میں میرزا یگانہ کی چراغِ سخن بھی ہے۔ دیباچہ پاک و ہند کے نامور نقاد جناب کیفی دہلوی نے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"میں نے عروض پر آپ کا رسالہ دیکھا۔ اچھا ہے۔ اُمید ہے مبتدی اس سے بہت فائدہ اُٹھائیں گے۔ آپ نے اختصار سے کام لیا یہ اچھا کیا اور بہت سی فضول باتوں کو چھوڑ دیا۔ اصل یہ ہے کہ وہ عروض جس کے ہم اب تک پابند ہیں اور جس سے متعلق آپ نے یہ محنت اُٹھائی ہے سرے سے تبدیلی چاہتا ہے۔ ہماری اُردو اور جس زبان کا دراصل یہ عروض ہے۔ ڈھانچے اور نوعیت میں مختلف ہیں۔ عربی کا عروض اُردو پر کیونکر ٹھیک بیٹھ سکتا ہے۔"

یہ زمانہ ترمیم و اصلاح اور انقلاب کا ہے جس سے عروض اور ادب بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ مثلاً عروضیوں کا یہ حکم ہے کہ مثنوی کے لیے یہ سات وزن معین ہیں یعنی بحرِ متقارب مقصور محذوف، بحرِ ہزج مسدس، بحرِ ہزج مقصور، بحرِ رمل مسدس، بحرِ سریع مطول موقوف اور بحرِ خفیف مجنون۔ لیکن آج کل کوئی ان ہفتگانہ اوزان کا پابند نہیں۔ دوسرے اوزان

میں لوگ مثنویاں کہتے ہیں۔ جسے کوئی نہیں ٹوکتا۔ اسی طرح رزم و بزم کے مضامین سے متعلق مثنوی کے وزن کا لحاظ کوئی نہیں رکھتا۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ اس معاملہ کو چھیڑا ہی نہیں۔ چونکہ نیا عروض اُردو کا ابھی مکمل طور پر متعین نہیں ہوا ہے۔ اس لیے عموماً متداول قواعد کا علم ضروری تھا آپ نے خوب کیا کہ اسے اس مختصر اور سہل الفہم رسالہ میں قلم بند کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ متعلم کے لیے مفید ثابت ہوگا اور ترمیم و اصلاح کے لیے عمدہ مسالا پیش کرے گا۔" (خضرِ عروض صفحہ ۵-۶)

عروض کا جاننا ہر شاعر کے لیے لازمی ہے جس طرح زر و جواہر کو جوہری کانٹے پر تولتے ہیں، اسی طرح شعر کو تولنے کی میزان عروض ہے۔ فنِ عروض علم ادب کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس کا جاننا ہر شاعر کے لیے اشد ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ ہم تو موزوں طبع ہیں۔ ہماری طبع موزوں خود میزانِ شعر ہے۔ قدرت کی طرف سے ہمیں یہ عطیہ ودیعت کیا گیا ہے کہ جو مصرع بھی ہم کہتے ہیں وہ شعر کی میزان میں پورا اُترتا ہے۔ لیکن جب مشکل اوزان سے پالا پڑتا ہے تو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ طبعِ موزوں دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ایسے موقع پر عروضی بازی لے جاتے ہیں اور موزوں طبع کا دعویٰ کرنے والے اپنا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

زبان اُردو میں عروض کی دو چار ایسی کتابیں بھی ہیں جن کے مطالعہ سے علمِ عروض کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے قواعد العروض جناب منشی سید غلام حسین قدر بلگرامی کی دقیع تالیف ہے جو ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں مطبع شام اودھ لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں عربی، فارسی، اُردو کے عروض کے ساتھ پنگل سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب جامع بسیط اور مدلل ہے۔ اسی طرح ایک دوسری کتاب مقیاس الاشعار الموسوم بہ ارمغان مرزا سلامت علی دبیر کے فرزند مرزا محمد جعفر اوج کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں مطبع جعفری واقع نخاس جدید لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی عروض سے متعلق تمام مشکل مقامات کو آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخ گوئی سے متعلق ایک باب ہے جو بڑا قیمتی ہے۔ خضرِ عروض کی تالیف کے متعلق یہ دونوں کتابیں جناب احسان کے پیشِ نظر نہیں تھیں۔ اگر وہ ان سے بھی استفادہ فرماتے تو خضرِ عروض میں اور کئی مشکلات کی نشان دہی کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی یہ رسالہ بقول جناب کیفی "ناتربیہ اور مبتدیوں کے لیے بہت مفید ہے۔

اس رسالے میں ارکانِ عشرہ[1]، مفعولُن، فاعلُن، مفاعیلُن، فاعلاتُن، مستفعلُن، مس نفع لن، مفعولات (تابالا تنوین) مُتَفاعِلُن، مفاعلتُن۔ اصل میں رُکن تو آٹھ ہیں لیکن عروضی فاعلاتن اور مستفعلُن کو متصل اور فاع لاتُن و مس تفع لُن کو منفصل کہتے ہیں اور اسی حساب سے دس ارکان بنتے ہیں۔ ان ارکان کی تشریح اُنھوں نے اگرچہ مختصر کی ہے لیکن قاری انھیں آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے زحاف کی قسمیں بھی بتائی ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"زحاف کی قسمیں بعض نے ساٹھ لکھی ہیں، اور بعض نے چون ۵۴ اور بعض نے اس سے بھی زیادہ، ہمیں اس سے اتفاق نہیں کیونکہ ان میں عربی کے وہ وہ زحاف ہیں جن سے اب تک اُردو مطلق آشنا نہیں اس لیے ہمیں بحر العروض (از پنڈت کنھیالال صاحب دہلوی) سے اتفاق ہے وہ زحاف

---

[1] عروض کے ارکان جن سے بحریں بنتی ہیں دس ہیں ۱۲

کی قسمیں پینتیس[۳۵] لکھتے ہیں۔" (خضر عروض ص۱۷)

زحافات کی تعداد میں اختلاف ہے۔ قواعد العروض میں جناب قدر بلگرامی نے ان کی تعداد (۵۹) بتائی ہے اور ہر ایک زحاف کی تعریف کی ہے۔ اور جس جس بحر میں یہ واقع ہوتا ہے اس کی نشان دہی بھی کی ہے۔ یہ بحث قواعد العروض میں صفحہ ۴۴ سے صفحہ ۵۰ تک پھیلی ہوئی ہے۔ جناب شیخ امداد علی بحر کی ایک مثنوی جس میں نہایت اختصار سے ان زحافات کو نظم کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس کس بحر میں کس کس زحاف کا کیا عمل ہوتا ہے۔ جناب مرزا اوج لکھنوی نے تو زحافات پر طویل بحث کی ہے جن زحافات کا عربی اور فارسی میں عمل ہے اُن کی تعداد بھی بتائی ہے جو ایک سو اکسٹھ[۱۶۱] ہے (اصول و فروع عربی ایک سو گیارہ[۱۱۱] اور اصول و فروع فارسی پچاس[۵۰]) مرزا اوج صاحب نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے مقیاس الاشعار میں جو بحث کی ہے اسے غور سے پڑھنے کے بعد ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جناب یگانہ چنگیزی نے چراغ سخن میں جو بحث کی ہے اُس میں اُنھوں نے زحافات کی تین قسمیں بتائی ہیں قسم اوّل (زحافات عام) یہ ہر جگہ بیت میں آتے ہیں اور کسی خاص جگہ سے مخصوص نہیں۔ قسم دوم وہ زحافات ہیں۔ جو صدر و ابتدا سے مخصوص ہیں اور قسم سوم وہ ہیں جو عروض و ضرب کے لیے مختص ہیں۔ مؤخرالذکر دونوں قسموں کو خاص کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اہل عرب اور اہل فارس کے زحافات کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ان کی جملہ تعداد پینتالیس[۴۵] ہے۔ اُستاد جلیل نے "رسالہ اُردو کا عروض" میں زحافات کی تعداد (۵۳) بتائی ہے اور اُن کے نام بھی اپنے رسالے کے صفحہ ۳۷ و ۳۸ پر لکھ دیئے ہیں۔ زحافات کی ان ۵۳ قسموں کو علٰحدہ علٰحدہ بتانے کی اس مقالے میں گنجائش نہیں البتہ اتنا عرض کرتا چلوں کہ مصرع اولیٰ کے رکن اوّل کو صدر اور رکن آخر کو عروض اور مصرع دوم کے رکن اوّل کو ابتدا اور رکن آخر کو ضرب اور باقی درمیانی ارکان کو حشو کہتے ہیں۔ (اُردو کا عروض ص۳۸-۳۷)

جناب احسان نے زحافات کی تعداد پینتیس[۳۵] سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن اپنے رسالے میں انتالیس[۳۹] کی تعداد لکھی ہے اور ہر زحاف کی تعریف اور اس کے مختلف بحروں میں جہاں جہاں یہ واقع ہوتے ہیں، اس کے عمل کو جس قابلیت اور محنت سے سمجھایا ہے اس سے مبتدی آسانی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور جو مشکلیں اس فن کی بڑی بڑی کتابیں حل نہیں کر سکتیں ان کو پانی کر دیا ہے۔

تقطیع جو خضر عروض کا ایک اہم باب ہے اس کو پوری محنت سے مرتب کیا ہے۔ اس امر کا حوالہ دے دیا ہے کہ اُنھوں نے اس باب کے مرتب کرنے میں چراغ سخن سے مدد لی ہے۔ تقطیع شعر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ارکان بحر کے مطابق کرنے کو کہتے ہیں عروضی اپنی اصطلاح میں شعر کو بحر کی ترازو میں تولنے کو کہتے ہیں۔ تقطیع میں متحرک حرف کے بدلے متحرک حرف لیا جاتا ہے اور ساکن کے بدلے ساکن۔ حرکت خواہ زیر ہو یا زبر یا پیش ہو۔ اس کی قید نہیں۔ تقطیع کی بنا، چونکہ حروف ملفوظی پر ہے مکتوبی پر نہیں۔ اس لیے تقطیع میں ان ہی حروف کو لیا جائے گا جو لکھے بھی جاتے ہیں اور بولے بھی جاتے ہیں۔ اور جو حروف اپنی آواز نہیں دیتے ان کا شمار تقطیع میں نہیں کیا جاتا۔ مکتوبی غیر ملفوظی حرف کی یہ پہچان ہے کہ اس پر نہ حرکت ہوتی ہے نہ سکون مثلاً عربی کا الف، لام جو پڑھنے میں نہ آئے جیسے:

؎ کیا حال پوچھتے ہو غریب الدیار کا (الف لام پڑھنے میں نہیں آتا)

الف وصل جیسے ؎ وصال پر ہے جو وصل امتحاں کر دیکھو (امتحان کا الف)

واو معدولہ جیسے ع پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں (خوار کا واؤ اس قبیل میں خواب، خور، خود وغیرہ آتے ہیں)

اسی طرح دوبارہ، دوچار وغیرہ کا واؤ بھی محسوب نہیں ہوتا۔

واو عطف جیسے ع کیوں نہ اس زلف و رُخ کی بات کریں (زلف و رُخ کا واؤ)

ہائے مخلوط " ع میں سمجھتا تھا کہ آئینہ تجھے دے گا جواب (سمجھتا اور تجھے کی ہ)

یائے مخلوط " ع تم کو آتا ہے پیار پر غصہ (پیار کی یا)

تین حرف ساکن برابر آئیں تو آخر کا حرف جیسے

ع برداشت ساقیا نہیں مجھ کو خمار کی (برداشت کی ت)

حروف علت یعنی الف واؤ۔ یے جو الفاظ کے آخر میں ہوں اور دب کر آئیں جیسے

ع آیا جب وہ تو مجھے آپ سے جانا ہی پڑا (آیا کا الف تو کا واؤ اور ہی کی یا)

نون غنہ جیسے ع زمیں جس کی چہارم آسماں ہے (زمین اور آسمان کا نون)

ہائے مختفی جو دب کے آئے جیسے

ع پردہ داری کے عوض بدنام درسوا کر دیا (پردہ کی ہ)

بعض حرف ایسے بھی ہوتے ہیں جو لکھنے میں نہیں آتے مگر بولنے میں زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ایسے الفاظ کو ملفوظی غیر مکتوبی کہتے ہیں۔ ایسے حروف تقطیع میں محسوب کئے جاتے ہیں۔ مثلاً

الف ممدودہ کے دو حرف محسوب کئے جاتے ہیں جیسے

ع آفتاب اُونچا ہوا ایسا کہ تارا ہو گیا (آفتاب میں دو الف)

حرف مشدد جیسے ع موسم گل ہے نہ رکھ قید میں صیاد مجھے (صیاد کی یا)

اشباعی اضافت وہ اضافت جو کھینچ کر پڑھی جائے جیسے ع شعلۂ برقِ تجلّی نے جلایا طور کو (شعلہ اور برق کی اضافت)

آخر کے واؤ یا یے پر ہمزہ آنے سے اشباع پیدا ہو تو ایک حرف زائد لیا جائے گا۔ جیسے

ع لبوں پر نالے آئے جان آئی تم کب آؤ گے۔ (آئے اور آئی کی یا اور آؤ گے کا واؤ)

حروف کم ہو جانے اور بڑھ جانے کے متعلق جناب احسان نے قاری کو اچھی طرح سے سمجھایا ہے۔ حروف ملفوظ، حروف غیر مکتوبہ، حرف صحیح یا حرف علت، حروف ملفوظ غیر مکتوبہ کے اقسام مع تمثیل کے ضمن میں الف مدہ، واو مدہ۔ یائے بطنی، حروف علت بطنی، حروف مشدد، حروف منوّن، الف وصل، الف تنوین، الف ماقبل نون غنہ ہندی، واو معدولہ، واو اشمام، یائے لین، دو یائے تحتانی، یائے مخلوط وغیرہ کو مثالوں سے سمجھایا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے آسانی سے سمجھ جائیں۔

مروجہ مختلف بحروں کے نام ہی نہیں لکھے بلکہ تلاش کر کے ہر بحر کے ایک ایک مصرع کی تقطیع بھی کر دی ہے۔ اوّل بحر کا نام لکھا ہے۔ دوم اس بحر کا وزن اور سوم تقطیع۔

مثلاً : بحرِ متقارب مثمن سالم

متقارب کے معنی ہیں نزدیک۔ چونکہ اس بحر میں وتد[1] اور سبب[2] قریب قریب ہیں اس لیے اس کا نام متقارب رکھا گیا۔

وزن :- فعولن فعولن فعولن فعولن

مصرع :- جوانی گلستاں پہ آئی ہوئی ہے

تقطیع :- جوانی فعولن + گلستاں فعولن + پہ آئی فعولن + ہوئی ہے فعولن

بحر رمل مسدس محذوف

وزن :- فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

شعر :- عشق کو تقلید سے آزاد کر

دِل سے گریہ آنکھ سے فریاد کر (احسان دانش)

تقطیع :- عشق کو تق فاعلاتن + لید سے آ فاعلاتن زاد کر فاعلن

دل سے گریہ فاعلاتن + آنکھ سے فر فاعلاتن یاد کر فاعلن

اس نمونے سے اندازہ لگانا دُشوار نہیں ہوگا کہ ہر بحر کا نام بھی بتا دیا ہے۔ اُسی بحر کا وزن اور پھر مصرع یا شعر لکھ کر تقطیع بھی کر دی ہے تاکہ مبتدی بغیر کسی اُلجھن کے اس عمل کو سمجھ جائے۔ علمِ قافیہ پر بھی اختصار سے بحث کی ہے اور قافیے کے عیوب بھی سمجھائے ہیں۔

دستورِ اُردو

یہ کتاب مکتبۂ دانش مزنگ سے ۱۹۵۱ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کی تیاری میں جناب دانش نے آٹھ کتابوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ جن میں دریائے لطافت، کیفیہ، گنجینۂ تحقیق اور اختلاف اللسان ایسی بلند پایہ کتابیں بھی شامل ہیں۔ بابُ الکتاب کے عنوان سے پروفیسر محمد فیوض الرحمان عثمانی نے لکھا ہے :-

"ہمارے عزیز دوست احسان دانش نے دستورِ اُردو کے نام سے ایک مجموعہ مرتب فرمایا ہے، جس میں اُنھوں نے ان کوتاہیوں کی اصلاح فرمائی ہے جو ہماری روزمرہ کی بول چال اور مجلسی گفتگو میں پائی

---

[1] وتد۔ سہ حرفی کلمے کو کہتے ہیں اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ وتد مجموع اور وتد مفروق۔ وتد مجموع سہ حرفی کلمہ ہے جس کا پہلا اور دوسرا حرف متحرک اور تیسرا ساکن نبیؐ، علیؑ وغیرہ۔ وتد مفروق میں پہلا اور تیسرا حرف متحرک اور درمیانی ساکن جیسے جانِ من کا رِ نحو وغیرہ۔

[2] سبب۔ دو حرفی کلمے کو کہتے ہیں۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ سببِ خفیف و سببِ ثقیل۔ سببِ خفیف وہ ہے جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن جیسے دل۔ گل وغیرہ۔ سببِ ثقیل جس کا پہلا اور دوسرا حرف بھی متحرک ہو جیسے سرِ بزم۔ دلِ حزیں۔

جاتی ہیں اور جو نہ صرف عوام بلکہ خواص اور اہل علم کے یہاں بھی قابل اعتنا نہیں سمجھی جاتیں ——
بندۂ ہیچمدان نے کتاب موصوف کے اکثر مقامات کو بغور دیکھا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں،
کہ عزیز موصوف نے اپنی خداداد فراست ذہنی سے محاورات کے ہر گوشہ پر گہری نظر ڈالی ہے،
اور اپنے قیاس و تخیل سے نہیں بلکہ اصول و قواعد کی روشنی میں صحیح و فصیح کا امتیاز اور فصیح و غیر فصیح
کا فرق نمایاں کر دکھایا ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ چاروں طرف سے اُردو کی ترویج و اشاعت کی
آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور اُردو کو ہر لحاظ سے بام عروج پر پہنچانے کی کوششیں جاری ہیں میرے خیال
میں ممدوح کی یہ قابل قدر تالیف اس مبارک نصب العین کی تکمیل کے مرادف ہے، اور
اپنے افادی پہلو کے لحاظ سے نقش اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔" (دستور اُردو ص۴)

جناب احسان دانش نے جو اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔ وہ صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۱ تک محیط ہے۔ اس میں اُنھوں نے اس
تالیف کا پس منظر بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ۴۷ء و ۴۸ء اور ۴۹ء میں ادیب عالم کے پرچے کے ممتحن رہے۔ اُنھوں نے جب
اُمیدواروں کے پرچوں کو جانچا تو انھیں احساس ہوا کہ نہ اُن کی املا درست ہے نہ انشا، نہ زبان۔ کاپیوں میں بے ربط تحریروں
کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ نہ مضمون الفاظ سے مطابقت رکھتے ہیں نہ خیالات مافی الضمیر کو صحیح طور سے ادا کر رہے ہیں۔ ادبی قیود و
قواعد سے یہ لوگ نابلد ہیں اور اُنھیں کسی ایسی کتاب کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا جس سے یہ اپنے اغلاط درست کر سکتے۔ چنانچہ انھیں
خیالات نے ان کو "دستور اُردو" ایسی کتاب لکھنے کی تحریک کی —— اور چند اصول بھی بتائے۔

"مضمون نگار کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں ایک خیالات دوسرے الفاظ۔ بعض اوقات جب
خیالات بلند ہوتے ہیں تو الفاظ نہیں ملتے اور بعض دفعہ الفاظ کی بہتات ہوتی ہے تو
معمولی خیالات دستیاب ہوتے ہیں۔ خیالات کے ساتھ الفاظ بھی مطابق و موزوں ہوں،
تحریر و تقریر میں فصیح الفاظ، بلند معانی کے حامل ہوں اور خشک سے خشک مضمون شگفتگی
اختیار کرے۔ مطالعہ کا اصول یہ ہے کہ کتاب یا مضمون سے جو بات، خیال یا فقرہ پسند آئے
اس پر نشان لگا لیا جائے۔ اس طرح مطالعہ کرنے سے دماغ خیالات سے لبریز اور حافظہ
الفاظ سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ ہر وقت الفاظ صفیں باندھے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔
ادھر دماغ نے ایک خیال تخلیق کیا ادھر حافظے نے الفاظ کی آوازوں سے اس کی تصویر
بھیج دی۔ مطالعہ کرنے میں عموماً لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ جب خیالات کا ہجوم دیکھتے ہیں تو
مزے میں پڑھتے چلے جاتے ہیں یا صرف اپنی ہی معلومات کے محدود الفاظ میں ڈھالنے کی
کوشش کرتے ہیں جس سے مطالعہ میں کم اور تحریر میں زیادہ وقت صرف ہونے کے علاوہ دماغ

میں الفاظ کا ذخیرہ کم رہ جاتا ہے۔ اگر خیال خاطر خواہ الفاظ میں نہ ڈھل سکے تو خیال کو محفوظ کر لیا جائے۔ مشہور و معروف مصنفین کی تصانیف زیر مطالعہ رہیں۔ بعض عربی فارسی کے منتہی اپنے علم کے غرہ میں اپنے بلند خیالات کو مغلق الفاظ کی جھیل میں پھینک کر ڈبو دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض صاحب اپنی مخصوص ٹکسال کے زعم میں اچھے سے اچھے خیالات کو زبان بازاری کی طرح سوقیانہ الفاظ کا محتاج سمجھتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ مضمون نگار کے لیے نہ صرف علمی الفاظ سرمایہ بن سکتے ہیں اور نہ صرف روزمرہ اور ٹکسال بلکہ جو تصور ٹکسال سے ادا نہ ہو وہ علمی تراکیب سے نکلتا ہوا ہو وہ روزمرہ سے محفوظ کر لیا جائے۔ مشہور انشا پردازوں کے شاہکار پڑھتے وقت یہ خیال ضرور رہے کہ مصنف نے کس بات کو کس طریق سے یہ کہہ کر ہم کو بتایا ہے اور کس مسئلہ کو کس انداز سے بیان کر کے بے حقیقت کر دیا۔"

(دستور اردو ص ۵-۸)

جناب احسان نے یہ کتاب کیوں لکھی؟ اس کی وجہ انھوں نے دیباچے میں شرح و بسط سے یوں بیان فرمائی ہے۔ یہ کتاب تحفظ زبان کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔ عوام اور خواص تک جب عام گفتگو میں زبان کا صحیح استعمال نہ کریں تو ہر ادیب و شاعر کا فرض ہے کہ وہ اس کی حفاظت کے لیے مقدور بھر کوشش کرے اور بتائے کہ کون الفاظ فصحا کی اب زبان پر نہیں۔ کون محاورے ٹکسال سے باہر ہیں۔ ہر زبان میں نئے نئے الفاظ داخل ہوتے رہتے ہیں اور دیر پا رواج پانے کے بعد نابود ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اپنے زمانے میں وہ صحیح تھے اور فصحا کی زبان پر تھے۔ مثلاً نین۔ جگ۔ نت۔ ٹک۔ ستی وغیرہ، لیکن اب انھیں کوئی نہیں بولتا۔ اور نئے الفاظ جو زبان پر آئے دن شامل ہو رہے ہیں ان کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اور ان کو صحیح مقام پر رکھنا چاہیے۔ مولانا آزاد دہلوی نے آب حیات میں اردو شاعری کے مختلف دور قائم کیے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے زبان میں جو تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اس پر انھوں نے بحث کی ہے۔ نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ ادبا کو مرحوم الفاظ کو خیر باد اور نئے الفاظ کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ حاتم نے اپنے دیوان میں متروکات کو صراحت سے لکھ دیا ہے اور ناسخ نے محاورے، اصطلاحیں، مثلیں، غیر فصیح اور ثقیل الفاظ اپنے کلام سے دور کر کے زبان پر احسان عظیم کیا ہے۔ ہر دور میں زبان ترقی کے مدارج طے کرتی رہی لیکن "ہنوز منزل دور است" کے مصداق ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر مذکورہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ کتاب کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسان صاحب نے ان تمام عیوب کی ایک طویل فہرست اپنے دماغ میں بنا لی تھی۔ جن پر انھیں اظہار خیال کرنا ہے اور ان کا مطمح نظر یہ بھی تھا کہ کتاب میں وہ تمام باتیں آجائیں جو ابتدائی اور مکتبی غلطیوں کی بنیاد ہیں۔ ذیل میں چند عنوان لکھے جاتے ہیں جن سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے:۔

فہرست مضامین طویل ہے اور یہ فہرست ۱۰۱ عنوانات لیے ہوئے ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔ حروف ابجد، یائے معروف و یائے مجہول کا امتیاز، حروف شمسی و قمری، اصول تحریر روزمرہ اور قواعد، متروکات، غلط جمع کا استعمال، وہ الفاظ جن کے آخر میں الف یا ہائے مختفی نہ ہو۔ وہ الفاظ جن کے آخر میں الف یا ہائے مختفی ہو۔ اعلان نون، واو عطف غلط،

واو ہم معنی لفظوں میں 'اپنا' 'تئیں' 'ہاں' اور 'یہاں' ۔ کون اور کون سا' ہی ہی کی اور صورت ، لاحقوں کا غلط استعمال ، نہ ، سا ۔ ایسا اور ایسے ، ساتھ ، پر ، سے ، کو ، نا کا استعمال ، ہوا ، ہوئی ۔ ہوئے ، اُردو الفاظ میں فارسی ترکیب ، اضافت زائد سوائے ، اور بجائے ، موّرو الفاظ کی جمع ، مونث اسما کی جمع ، جمع بجائے واحد ، ضعف تالیف ، سلاست و فصاحت ، تعقید ، حشو و زوائد شتر گربہ ، عیب تنافر ، مخالفِ قیاس لغوی ۔

اس فہرست سے اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ہر ایک عنوان پر اظہارِ خیال کرنے کے لیے کتنی محنت شاقہ کرنا پڑی ہوگی اور کتنی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہوگا ۔ یہ کتاب مصنف کے ابتدائی ذوقِ جستجو کی آئینہ دار ہے ۔ پند شامیں ملاحظہ ہوں ۔ مثلاً :

متروکات

متروکات کا تحریر و تقریر میں لاناکم علمی اور بے پروائی کا ثبوت ہے لیکن تمام متروکات ایسے نہیں ہیں کہ انھیں ٹکسال باہر کر دیا جائے ۔ متروکاتِ قدیم تو واقعی اس قابل نہیں کہ اب اُنھیں استعمال کیا جائے اور فصحا میں ان کا استعمال معیوب قرار پاتا ہے لیکن وہ متروکات جو متروکات میں آنے کے باوصف اب تک زبان زدِ عوام و خواص ہیں ، انھیں ترک کر دینا زبان کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے ۔ مثلاً

پر	بمعنی	مگر ، لیکن	———	پہ	بمعنی	پر
بیچ	〃	درمیان	———	پرے	〃	دور ، ہٹ کر
امکان	〃	ممکن	———	تلے	〃	نیچے
جوں	〃	مانند	———	نت	〃	ہمیشہ
ڈھینا	〃	گرنا	———	زور	〃	زیادتی ، علاوہ معیاری
تلک	〃	تک	———	سمیت	〃	مع ، ساتھ
مارے	〃	سبب سے	———	لگ رہا ہے	〃	لگا ہوا ہے
دکھلانا	〃	دکھانا	———	بتلانا	〃	بتانا
جتلانا	〃	جتانا	———	سکھلانا	〃	سکھانا

(دستورِ اُردو صفحہ ۲۶-۲۷)

اس فہرست میں چند الفاظ ایسے ہیں جو متروکات کی فہرست میں آتے ہیں اور ان کو متروک بھی قرار دیا گیا ہے ۔ لیکن ان کا استعمال ہنوز جاری ہے اور شاید آئندہ بھی جاری رہے ۔ متروکات کی بحث بھی بڑی دلچسپ ہے ۔ چند متروکات ایسے ہیں جنھیں سب ادبا ، و شعرا نے ترک کر دیا ہے چند ایسے ہیں جن کو کچھ نے ترک کر دیا لیکن دوسرے انھیں بلا تکلف اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں اور

کچھ ایسے ہیں جن کو ایک مخصوص طبقہ ہی ترک کرتا ہے دوسرے اس کے پابند نہیں۔" رسالہ اصلاح مع ایضاح شرح اصلاح و ازحتہ الاغلاط" میں جناب شوق نیموی نے بحث کی ہے۔ یہ بحث مذکورہ رسالہ کے صفحہ ۱۰ سے صفحہ ۱۸ تک دیکھی جاسکتی ہے۔ پہ بمعنی پر کو جناب شوق نے متروکات کی فہرست میں جگہ نہیں دی ہے لیکن جناب خواجہ عشرت لکھنوی نے اصلاح زبان اردو کے صفحہ ۱۵ پر اس لفظ کو لیا ہے اور لکھا ہے کہ پہ کا استعمال اب اکثر فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ اس کے بدلے پر بولتے ہیں اور اسی طرح پر کا استعمال مگر اور لیکن کے معنوں میں قابلِ ترک ہے۔ آخر میں داغ اور جلال نے بھی ترک کر دیا ہے لیکن اس ضمن میں داغ کا یہ شعر بھی لکھا ہے: ؎

مشتاق بہت ہیں مرے کہنے کے پر اے داغ!
یہ وقت ہی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

صاحب نور اللغات کا اس لفظ کی نسبت یہ قول ہے "بعض فصحا نے اس کا استعمال نثر اور بول چال میں ترک کر دیا ہے۔" اس سے جناب کیفی کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ "نثر میں یہ کلمہ متروک نہیں[1]۔" پر، لیکن اور مگر کے معنوں میں بھی متروک نہیں۔ مولانا صفی کا ایک شعر ہے: ؎

لب پہ اک موجِ تبسم ہاتھ میں ہلکی سی تیغ
نیم بسمل سیکڑوں پر نیم جاں کوئی نہیں

مگر بھی اگر کے معنی متروک نہیں۔ استاد جلیل: ؎

یہی عالم ہے گر جوشِ جنوں میں خاک اڑانے کا
زمیں بھی سر پہ اک دن آرہے گی آسماں ہو کر

یہ شعر پہ اور مگر دونوں کے استعمال کی سفارش کرتا ہے۔

اسی طرح تک کا تلک کے معنی میں استعمال کرنے کا حال ہے

امیر مرحوم کا ایک شعر ہے: ؎

کعبہ نہ جائے جو وہ نہ پہنچے خدا تلک
زاہد خدا کے گھر کی یہی ایک راہ ہے

تلک کسی زمانے میں ضرور متروک تھا۔ لیکن اب دورِ حاضر کے شعرا کے کلام میں کثرت سے دیکھا جاتا ہے جب حضرت امیر مینائی رح اسے استعمال کر گئے ہیں تو اسے متروک کہنے کا اب کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

"دستورِ اردو" جناب احسان کی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اس کے مطالعہ سے مبتدی بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور منتہی بھی۔

---

[1] منشورات ص ۱۴۲

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن چھپنا چاہئیں تاکہ جس مقصد وحید کے پیش نظر ممدوح نے محنت شاقہ اٹھائی ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اگر اس کتاب کو سکولوں کے اساتذہ اپنے طلبار کو پڑھنے اور اسے سمجھنے کی تحریک کریں تو یہ اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اُردو مترادفات

اُردو زبان پاک و ہند کی دوسری ان گنت زبانوں میں جو اہمیت و مقبولیت رکھتی ہے اور جس کثرت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے، محتاج بیان نہیں۔ ادبار و شعرا نے اس زبان کو سنوارنے اور اس کے معیار کو بلند کرنے میں جو علمی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں۔ زبان و بیان، صرف و نحو، عروض و قوافی، فصاحت و بلاغت، محاورات اور مصطلحات تذکیر و تانیث پر جو کام ہوا ہے وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لغت نویسی پر بھی خاصی محنت کی گئی ہے۔ امیر اللغات، نور اللغات، فرہنگ آصفیہ، مصطلحات اُردو، سرمایہ زبان اُردو، عزیز اللغات، فرہنگ شفق، فیروز اللغات، فرہنگ اثر وغیرہ آج ہمارے سامنے ہیں جن سے علمی، فنی اور لسانی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں لیکن مدت سے اُردو کے لیے ایک ایسی لغت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں ہر لفظ کے مرادف، ہم معنی الفاظ موجود ہوں۔ احسان صاحب کو کیونکہ ایسے علمی کاموں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اس لیے انھوں نے اس مشکل کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور "اُردو مترادفات" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جسے مرکزی اُردو بورڈ لاہور نے مارچ ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

جناب اشفاق احمد ڈائریکٹر مرکزی اُردو بورڈ لاہور نے ابتدائیہ میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان سے کتاب کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے جس کا پہلا پیرا نذر ناظرین ہے:۔

"اُردو زبان میں ایک عرصہ سے ایسی لغت کی بے حد ضرورت تھی جس میں الفاظ کے معانی کے بجائے ان کے مترادفات درج ہوں اور جنہیں ادیب، شاعر، مقرر اور صحافی بالخصوص تقریر و تحریر سے دلچسپی رکھنے والے بالعموم ایک راہنما اور حوالے کی کتاب کے طور پر استعمال کر سکیں۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اُردو زبان میں اس نوعیت کی کوئی جامع اور مبسوط لغت آج تک شائع نہیں ہوئی اُنیسویں صدی کے اواخر میں شائع ہونے والے مترادف الفاظ کے ایک دو مختصر رسالے نظر آتے ہیں یا پھر بعد میں شائع ہونے والی ایک چھوٹی سی ڈکشنری ہے جو لغت مترادفات کے اصل تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔" (ابتدائیہ سے اقتباس)

جناب احسان نے "حرفے چند" کے عنوان سے لکھا ہے:۔

"جب اُردو پاکستان کی ایک قومی زبان قرار پائی تو میرے سامنے یہ سوال آیا کہ یہاں دہلی اور لکھنؤ کی اُردو سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی ایسا لغت مدوّن کیا جائے جس میں پاکستان کی تمام زبانوں کے اچھے، ملائم اور مترنم الفاظ آجائیں۔ چنانچہ پہلے تو میں نے محاورات کا ایک لغت، فرہنگ دانش، کے نام سے

شروع کیا لیکن دو ہزار صفحات لکھ کر نامکمل چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ضرب الامثال پر کام شروع کیا اور چھ سو صفحات میں مکمل کر دیا۔ لیکن میری تشفی نہ ہوئی۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ پاکستان کی تمام زبانوں کے علاوہ دنیا بھر کی زبانوں کے اچھے الفاظ یکجا ہو جائیں جو اُردو میں بلا تکلف استعمال کئے جائیں۔ ایک دفعہ جی میں آئی کہ اُردو مشتقات پر کام کیا جائے جس سے کسی اور لغت کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن اس کے لیے ایک مدت درکار تھی، اس لیے اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد مرکزی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر جناب اشفاق احمد کے ایماء پر اُردو مترادفات پر قلم اُٹھایا اور جیسا کچھ ہوا مکمل کر دیا۔"

(اقتباس از حرفے چند)

جناب احسان دانش کی مرتبہ "اُردو مترادفات" بڑے سائز کے ۲۶۷ صفحات پر محتوی ہے۔ اُنھوں نے اس کتاب کو حروف تہجی کے اعتبار سے مدوّن کیا ہے۔ ایک لفظ کے مقابلے میں جتنے الفاظ ان کو دوسری زبانوں کے مل سکے ہیں لکھ دیئے ہیں۔ ان میں آپ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، سندھی، بنگالی، پٹھواری، پشتو، ملتانی، سرائیکی وغیرہ کے الفاظ دیکھیں گے کہیں کہیں ترکی، روسی، چینی کے الفاظ بھی انتخاب میں آگئے ہیں۔ لفظ کے مقابل مترادف الفاظ کی تلاش کے علاوہ اُنھوں مرکزی الفاظ سے بننے والی تراکیب کی نشان دہی بھی ہے اور ان اصطلاحات، محاورات اور ضرب الامثال کو بھی درج کر دیا جن میں وہ مرکزی الفاظ استعمال میں آتے ہیں۔ یہ کام انتہائی کٹھن تھا جسے جناب احسان نے اپنی خداداد ذہانت اور محنت سے پورا کیا ہے۔

جیسا کہ جناب اشفاق احمد نے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ اس نوعیت کی کوئی جامع اور مبسوط لغت آج تک شائع نہیں ہوئی، اس سے کس کو انکار ہے۔ البتہ اُنھوں نے جن رسالوں اور ایک چھوٹی سی ڈکشنری کا حوالہ دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کام تو پہلے بھی کیا گیا۔ لیکن وہ موجودہ دور کے عملی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ 'مجمع الالفاظ' کے مصنف راجہ راجیشور راؤ اصغر (دہلوی) نے بھی اسی قسم کا اظہارِ خیال کیا ہے کہ مترادف یعنی ہم معنی الفاظ کا ایک مکمل مجموعہ شائع کیا جائے۔ جو چند کتابیں اس قسم کی اُنھوں نے دیکھیں ان کو مفید مطلب نہ پایا۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ ایک ایسی مکمل اور جامع کتاب کی ضرورت تھی لہٰذا اُنھوں نے اس کی تکمیل کر دی اور اس کی ترتیب انھوں نے اس طرح رکھی ہے۔ مجمع الالفاظ میں اُنھوں نے لکھا ہے:

"اُردو کے الفاظ حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کئے گئے ہیں اور ان کے مقابل وہ کل مترادف الفاظ فارسی اور عربی درج ہوتے ہیں جو تحریر و تقریر نیز کتب متداولہ میں رائج ہیں۔ ترتیب ہذا سے جس قدر سہولت اور فائدہ مقصود ہے وہ اس فن کی کتابوں سے جو اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں حاصل نہیں ہو سکتا۔" (مجمع الالفاظ ص ۳)

اب ہم ایک دو لفظ مجمع الالفاظ سے منتخب کر کے اُردو مترادفات سے مقابلہ کرتے ہیں۔

مجمع الالفاظ	اُردو مترادفات
انسان: البشر، انس، ناس، مردم، شخص، حیوانِ ناطق،	انسان:- حیوان ناطق، پیر چہل سالہ، پیر سرندیپ،

مجمع الالفاظ	اُردو مترادفات
آدمیت (مجمع الالفاظ ص۵)	شاہ دوپاس، شاہ نیمروز، بشر، آدمی، آدم زاد، مٹی کا کھلونا، اولادِ آدمؑ، مردم، کس، ناس، انس، کیومرث، گنج خاکی، خاک کا پتلا، خاکی منش، ہزار ہستی، موہوم ہستکہ، پورکھ، بندہ، مین، بنی نوع انسان۔ خدا پرست انسان، فہیم انسان، ذہین انسان، طالع انسان، جابر انسان، رحم دل انسان (اُردو مترادفات ص۳۵)
قسمت: سرنوشت، بخت، اختر، نصیب، تقدیر (مجمع الالفاظ ص۹۵)	پاک، نصیب، برات، تقدیر، مقدر، لیکھا، بخرہ، بھاگ، مقسوم، بصیبا، کرم لیکھا، بہرہ، مشیت، ایزدی، طالع، دتی بخت۔ قسمت آزمائی، قسمت بگڑنا، قسمت پلٹنا، قسمت کا چکر، قسمت پھوٹنا، قسمت جاگنا، قسمت بیدار ہونا، قسمت کا پھیر، قسمت کا دھنی، قسمت کا ہیٹا، قسمت لڑنا، قسمت کھلنا، قسمت والا۔ (اُردو مترادفات ص۲۰۳)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ لغت نویس ان ہی دو لفظوں انسان اور قسمت کے کیا معنی لکھتے ہیں۔

انسان ع:۔ آدمی۔ آنکھ کی پتلی (لغات کشوری ص۴۶)

بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ اِنس سے بنا ہے کہ انسان جن کے مثل پوشیدہ نہیں ہے اور اس خیال پر جن کا لفظ دلیل ہے جس کے معنی پوشیدہ کے ہیں۔

اُنس سے بنا ہے۔ اس اعتبار سے کہ آدمیوں میں بہ نسبت حیوانات یا اور مخلوقات کے انس کا مادہ زیادہ ہے۔

اس لفظ کی اصل نسیان ہے۔ اس لحاظ سے کہ انسان کے لیے خطا اور نسیان لازم ہے۔

مذکر ——— بنی آدم، آدمی، آنکھ کی پتلی، انسان بننا، انسان ہی تو ہیں (خطا کے موقع پر)

(اقتباس از نور اللغات حصہ اوّل ص۳۷۸)

انسان ع : مذکر۔ آدمی۔ بنی آدم ، مہذب ، اخلاق سے آراستہ ، آنکھ کی پتلی ، انسان بننا بنانا یا ہونا ،
انسان کیا پھیرو ہے (بہت سیر و سیاحت کرنے والا۔) (نسیم اللغات ص۱۳)
قسمت ع حصہ۔ نصیب (لغات کشوری ص۳۶۴)
" ع مونث : نصیب ، مقدر ، علاقہ ، صوبہ ، تقسیم۔
قسمت آزمائی ، قسمت اُلٹنا یا بگڑنا ، قسمت پلٹنا ، قسمت سے ، قسمت کا پھیر ، قسمت کا دھنی ، قسمت راہ پر آنا ، قسمت کا لکھا ، قسمت پھوٹنا ، قسمت کا ہیٹا ، قسمت کرنا (بانٹنا) قسمت کھلنا ، قسمت کے صدقے۔
قسمت کے ہاتھ بات ہے ، قسمت لڑنا ۔ (اقتباس از نسیم اللغات ص۹۵-۶۹۴)

مجمع الالفاظ اور اردو مترادفات کے تقابلی مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے مقابلے میں اصغر ورما صاحب نے آٹھ الفاظ تلاش کئے ہیں جب کہ احسان صاحب نے اسی لفظ کے مقابلے میں تین ۳۔ ان تین ۳ الفاظ میں مترادف الفاظ کے علاوہ مشتقات بھی ہیں جس سے اس لفظ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اسی طرح قسمت کے مرادف جناب اصغر ورما نے پانچ لفظ لکھے ہیں اور احسان صاحب نے انتیس ۲۹۔ ان انتیس الفاظ میں مترادف الفاظ ہی نہیں ، ان کے مشتقات سے بھی روشناس کرایا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جناب احسان دانش نے اس کتاب کی تدوین میں کتنی محنت کی ہوگی اور کس جانفشانی سے اس مشکل کام کو سرانجام دیا ہوگا۔ اس تقابلی مطالعہ میں ہم نے چند لغات سے بھی مدد لی ہے لغت کی ترتیب و تدوین اور ان کے طریق کار کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ لغت نویس کا کام دوسری قسم کا ہے۔ لغت نویس الفاظ کے مختلف معنی سمجھاتے ہیں۔ لفظوں کی تذکیر و تانیث بتاتے ہیں۔ ان کے مشتقات و مصطلحات و ضرب الامثال کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی اشارہ کرتے ہیں کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے اور اس کا مصدر کیا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے اساتذہ کی سندیں بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن مترادفات پر کام کرنے والوں کا مطمح نظر یہ نہیں ہوتا ، بلکہ ان کا یہ کام ہوتا ہے کہ ہر لفظ کے مقابلے میں اس کے ہم معنی الفاظ لکھ دیں۔ جیسا کہ اصغر ورما صاحب نے کیا۔ لیکن اسی کام کو اگر پھیلا کر کیا جائے تو اس میں لفظ کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ مشتقات ، مصطلحات ضرب الامثال بھی آسکتے ہیں۔ چنانچہ احسان صاحب نے یہی کیا۔ اگرچہ یہ کام پتا ماری کا تھا لیکن انھوں نے حتی الامکان اسے پورا کرنے کی سعی بلیغ کی۔ اہل لغات نے ان دونوں لفظوں انسان اور قسمت کے جو معنی اپنے اپنے لغت میں دیئے ہیں۔ اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لغت نویس کا کام اور ہے اور مرادف الفاظ کا لغت مدوّن کرنے والے کا کام اس سے بہت مختلف۔

اردو مترادفات بھی اگرچہ ایک لغت ہے اور احسان صاحب نے اس علمی کام کو جس فطانت و ذہانت سے سرانجام دیا ہے اس سے ان کی علمی استعداد پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فارسی عربی زبان بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انگریزی سے بھی نابلد نہ تھے انہوں نے اردو مرادفات میں کئی لفظوں کے مقابلے میں انگریزی لفظ بھی لکھے ہیں مثلاً بخشی ، پے ماسٹر ، گونج ، ایکو ، خدا ، گاڈ ، حسن ، بیوٹی ، خدمت ، سروس وغیرہ۔ اسی طرح انھوں نے حرفے چند میں دوسری زبانوں کے جاننے کے متعلق بھی لکھا ہے ایسے

علم کو ان کی علمی معلومات کی کمی کا طعنہ نہیں دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے ان میں علم کی کمی محسوس کی تھی، لیکن یہ کمی ان کو ۱۹۳۹ء میں محسوس ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۳۹ء کے احسان اور ۱۹۸۲ء کے احسان میں بہت فرق ہے۔ ان کی تصانیف دیکھتے ہوئے شاید اب انھیں کوئی بھی اس قسم کا طعنہ دینے کی جرأت نہ کر سکے۔

ہم آخر میں مرکزی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر جناب اشفاق احمد صاحب نے اس کتاب کے متعلق جو اپنی رائے گرامی کا اظہار کیا ہے درج ذیل کرتے ہیں[1]۔

"یہ لغت اپنی جگہ کس قدر مفید اور اہم ہے۔ اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھیں ایسی کتاب کی برسوں سے آرزو تھی۔ مرکزی اُردو بورڈ اس تالیف پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ لغت اپنی جگہ پر مکمل اور جامع ہے۔ اس میں ابھی بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں ہیں اور اُسے ایک جامع لغت بننے کے لیے پے در پے اشاعتوں کی کٹھالی سے گذرنا ہے لیکن اگر خود ستائی کا جذبہ اس قدر پست نہ ہوتا تو ہم اتنا ضرور عرض کرتے کہ مرکزی اُردو بورڈ نے اُردو مترادفات کے سلسلے میں ان تمام الفاظ کی بنیاد کی شیرازہ بندی کر دی ہے جو اس سے پہلے اس صورت میں کبھی نہ ہوئی تھی اور اس عظیم کام پر بورڈ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔"

(ابتدائیہ کا آخری پیرا)

لغات الاصلاح

یہ کتاب مکتبۂ دانش مزنگ (لاہور) سے شائع ہوئی ہے۔ ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ سالِ اشاعت درج نہیں کتاب کی لوح پر کتاب کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا ہے اور نام کے نیچے یہ عبارت ملتی ہے:۔

"اُردو زبان کے ان پانچ ہزار غلط الفاظ کی تحقیق و اصلاح جو روزمرہ محاورات اور تقریر و تحریر میں مستعمل ہیں۔"

اس سے کتاب کے متن کی صراحت ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اُردو زبان میں دوسری مختلف زبانوں سے جو الفاظ غیر ارادی طور پر وقتاً فوقتاً شامل ہوتے رہے ہیں، ان کا تلفظ پہلے کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہے۔ مختلف زبانوں سے آتے ہوئے الفاظ کے متعلق سید انشاء اللہ خان نے دریائے لطافت کے صفحہ ۲۴۱ پر لکھا ہے:

"مخفی نہ ماند کہ ہر لفظے کہ در اُردو مشہور شد۔ عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سریانی یا پنجابی یا پوربی، از روئے اصل غلط باشد یا صحیح، آن لفظ لفظِ اُردو ست۔ اگر موافق اصل مستعمل است ہم صحیح و

---

[1] ملک ادب کے شاہزادے صفحہ ۱۲

اگر خلاف اصل است ہم صحیح صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پزیر فتن در اُردو است۔ زیرا کہ ہر چہ خلاف اردو دست غلط است۔ گو در اصل صحیح باشد ہر چہ موافق اردو دست صحیح باشد گو در اصل صحت نہ داشتہ باشد۔"

اِس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو میں جو لفظ کسی غیر زبان سے آیا اور مشہور ہو گیا وہ اُردو ہے۔ خواہ وہ لفظ کسی بھی زبان کا کیوں نہ ہو، صحیح ہو یا غلط۔ اگر وہ لفظ اصل کے مطابق ہے تب بھی صحیح ہے اور اگر اس کے خلاف ہے اور اُردو میں مستعمل ہو گیا ہے تب بھی صحیح ہے۔ اس لفظ کی صحت اور غلطی اُردو میں اس کے استعمال میں آنے پر منحصر ہے کیونکہ جو اُردو کے خلاف ہے وہ صحیح نہیں خواہ اصل میں وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔

احسان صاحب نے اس کتاب کو سید انشاء اللہ خان کے بنائے ہوئے اس اصول کے تحت مرتب کیا ہے اور چھتیس[۳۶] کتابوں سے استفادہ کیا ہے جس کی فہرست انھوں نے "ماخذ" کے عنوان سے کتاب کے شروع میں دے دی ہے۔ "عرضِ مؤلف" کے عنوان سے چند گذارشات بھی کی ہیں:۔

"مجھے ایک زمانہ سے لغات الاصلاح کی ترتیب کا خیال تھا اور غالباً اب سے دس برس پہلے یہ کتاب مرتب ہو چکی ہوتی۔ اس کے کچھ حصص مولانا تاجور مرحوم، کچھ مولانا عبدالمجید سالک اور کچھ ضیاء الاسلام صاحب کی نظر سے گذرے اس کا کچھ مواد میرے پاس لاہور میں تھا اور کچھ میرے مکان کاندھلہ (ضلع مظفر نگر یوپی) میں تقسیم ملک سے پہلے میں نے اپنے عزیز دوست رفیق قریشی کو لکھا کہ میری کتابیں اور دیگر کاغذات احتیاط سے میرے نام لاہور روانہ کر دیں۔ اُنہوں نے وہ تمام ذخیرہ لکڑی کے ایک بکس میں محفوظ کر کے بلٹی کر دیا۔ جس میں کمیاب کتابیں تھیں۔ کچھ نایاب قسم کے قلمی نسخے اور فرہنگِ آنش کا مسودہ جو دو کاملی ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ کتاب "لغات الاصلاح" کے کچھ حصے جن پر لوگوں کی آرا بھی تھیں، لیکن افسوس وہ بکس مجھے موصول نہ ہوا۔ اِس زبردست خسارہ کے بعد مجھے اس کتاب کی تکمیل کا خیال رہا، اور مواد جمع کرتا رہا میرے خیال سے یہ کتاب ابھی مکمل نہیں، لیکن سید محبوب الرحمٰن صاحب کے اصرار پر طباعت کے لیے دے رہا ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ اس میں ہر ایڈیشن پر اضافہ ہوتا رہے گا۔ رہا "فرہنگِ آنش" کا معاملہ اسے زیرِ قلم کتاب "اساس الامثال" کے بعد شروع کروں گا۔" (لغات الاصلاح ص ۹-۱۰)

عنوانیہ کے تحت سید محبوب الرحمٰن صاحب دامتؔ عظیم آبادی نے ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے جس میں کتاب کی افادیت اور متن سے بحث کی ہے۔ کتاب کو زیادہ مفید بنانے کے لیے انھوں نے عربی الفاظ کی تذکیر و تانیث جانچنے کے لیے چند رہنما اصول بھی مرتب کر دیئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ضرورت کے الفاظ کو پرکھا جا سکے۔ یہ رہنما اصول کتاب کے صفحہ ۱۵ سے ۶۴ تک پھیلے ہوئے ہیں جو لوگ تحقیق و تدقیق کی آئے دن راہیں تلاش کرتے رہتے ہیں، وہ ان سے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ اصل کتاب ۶۵ صفحہ سے شروع ہوتی ہے۔ کتاب کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ الف کی تختی میں الف ممدودہ اور الف مقصورہ یک جا کر کے دِکھائے

گئے ہیں۔ کتاب میں عربی فارسی کے مروّجہ الفاظ ہی نہیں بتائے گئے بلکہ زبان اور قواعد کی رُو سے جو غلطیاں عام ہوگئی تھیں۔ اُن کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ اُردو زبان میں الفاظ کا ایک ایسا معتدبہ ذخیرہ بھی جمع کر دیا ہے جو آنے والی نسلوں کی ہمیشہ رہنمائی کرتا رہے گا۔ جن الفاظ کو مرتب کیا گیا ہے ان کی معنوی تشریح و تفصیل بھی کر دی گئی ہے جن سے تحفظ زبان اور حرکات و سکنات سے صحت لغت کا بھی اطمینان ہو جاتا ہے جس کا کھلا ہوا یہ فائدہ ہے کہ الفاظ کو غلط استعمال سے بچایا جا سکے گا۔ محاورہ اور روزمرہ کے استعمال کے ساتھ تذکیر و تانیث کی ان غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جو زبان میں گھر کر گئی ہیں۔ کیونکہ صحیح الفاظ ہی قابلِ تسلیم ہوا کرتے ہیں اس لیے اس کتاب کو تحفظ زبان کے سلسلے میں بھی ایک اعلیٰ مقام دیا جا سکتا ہے۔

اب ہم اس کتاب سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس طریقِ کار کو سمجھا جا سکے۔ جس کے تحت یہ کتاب مدوّن کی گئی ہے :-

آب و دانے کی فکر :

آب و دانہ کی ترکیب فارسی ہے اُردو والے "آب دانہ" کی فکر نہیں لکھتے بلکہ آب و دانے کی فکر استعمال کرتے ہیں۔ (صہ ۶۵)

توجیہ :

آب و دانہ کی ترکیب تو صحیح ہے۔ لیکن آب و دانے کی ترکیب درست نہیں، کیونکہ آب، فارسی اور دانے، اُردو۔ اس لیے فارسی اور اُردو کے لفظ کے ملانے سے ترکیب غلط ہوگئی۔ احسان صاحب نے یہ ترکیب تصحیح کے بعد اپنی کتاب میں شامل کی ہے۔

آتش :

"آتش" کسرۂ تائے سے جو کہتے ہیں ان کی دلیل ہے کہ قدیم فارسی میں "آتیش" تھا اور اس سے آتش ہوا۔ ؎

ہمہ کارشاں شرب و آتشگری
نگشتہ شبی گرد چالشگری

جو لوگ فتح کو ترجیح دیتے ہیں وہ کثرتِ استعمال سے اپنے دعوے کو قوت دیتے ہیں کہ سرکش اور رشش وغیرہ قافیوں میں پایا جاتا ہے۔ ؎

حریفِ جہاں سوز و سرکش مباش
زِ خاک آفریدند آتش مباش

ایک جگہ حضرت جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں ؎

نئی شکلیں ہیں سینے میں منقش
مُبارک اِمتیازِ آب و آتش (صہ ۶۶)

توجیہ : صاحب لغاتِ کشوری نے آتش میں تائے کو کسرہ سے لکھا ہے۔ صاحب نُور اللُغات نے بکسر تا و بکسر فتح لکھا

ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اساتذہ کے کلام میں عموماً بہ فتح دوم پایا جاتا ہے۔ قاموس الاغلاط سے بھی جناب احسان کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

آسامی

غلط ہے۔ اُسامی کہنا چاہیئے۔ یہ اِسم کی جمع الجمع ہے۔ بعض لوگ اُسے واحد قرار دے کر اسامیاں کہتے ہیں اور بعض نے ثائے تخذ سے لکھا ہے۔ اسامی اُردو میں بجائے واحد مستعمل ہے اور اس کی جمع اسامیاں لاتے ہیں ؎

باقی داروں میں سب سے نامی ہے
یہ بڑی نادہند اسامی ہے (مسرور)

دیگر: ؎ سُنتے مشرق میں ہیں گر کوئی اسامی خالی
قافلے ہوتے ہیں مغرب سے اُسی دم راہی (حالی)

بعض اوقات اسامی کہہ کر مراد مالدار سے لیتے ہیں۔" (ص۵)

توجیہ:

صاحب قاموس الاغلاط نے بھی الف ممدودہ کے ساتھ اس لفظ کو غلط کہا ہے۔ البتہ اس لفظ کے معنی نام شخص، آدمی، لین دین رکھنے والا، گاہک، عریضہ، خدمت، عہدہ، نوکری کی جگہ، رعیت، کسان، کاشت کار، مالدار، دولت مند بھی بتائے ہیں۔ صاحب لغاتِ کشوری نے اسے الفِ مقصورہ ہی سے لکھا ہے۔ مولوی نورالحسن نیّر صاحب نورالّلغات نے اس لفظ کی خاص تشریح کی ہے اور ظفر کا یہ شعر بھی لکھا ہے: ؎

رہ رو الفت پہ نہیں اس کی نگاہ
ڈھونڈتا ہے کوئی آسامی وہ رہزن اُونچی (بہادر شاہ ظفر)

لیکن اُنھوں نے اس لفظ کو الف مقصورہ کے ساتھ بھی اپنے لغت میں جگہ دی ہے اور لکھا ہے کہ جو لوگ الفِ مقصورہ کی جگہ الف ممدودہ اور سین کی جگہ ثاے مثلثہ یعنی آثامی کو صحیح جانتے ہیں ان کی غلطی ہے۔ جناب احسان نے اس لفظ کی تحقیق میں بھی اپنے موقف کی صحیح وضاحت کی ہے۔

زیادہ مثالیں دینا محض طوالت ہے۔ احسان صاحب نے جو محنت کی ہے اس کی داد وہی دے سکتے ہیں جنھیں کبھی ایسے علمی کام کرنے کا موقع ملا ہو۔

جہانِ دانش

یہ کتاب دانش آباد، ۳۷۔ انارکلی لاہور سے ۱۹۷۳ء میں چھپی ضخامت ۶۴۶ صفحات ہیں۔ اس کتاب میں جناب احسان دانش نے

اپنے زندگی کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اپنی ذات اور شخصیت کا تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے کہ پڑھنے والا مصنف کے ۱۹۴۰ء تک کے حالات سے واقف ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور عبرت کا مرقع بھی عبرتناک اس لیے کہ اس شاعر مزدور پر زندگی کس طرح بھاری رہی، کس طرح اس زندگی کو بہلایا گیا اور کس طرح منزل تک پہنچنے کے لیے گوناگوں مصائب کو شکست دی گئی۔ جن شخصیتوں سے انھیں پالا پڑا ہے اُن کے ساتھ ان کے کیسے روابط رہے ہیں اور اُن سے اُنھوں نے کیا کیا تجربے حاصل کئے ہیں۔ اگر اپنے حالات یہ خود نہ لکھ جاتے اور ان کے احباب میں سے کوئی ان ہی حالات کو قلم بند کرتا۔ تو عام قاری کے لیے اُسے یقین کرنے میں دشواری پیش آتی کہ وقت کے ایک عظیم شاعر کو اپنی زندگی میں مزدوری کرنا پڑی۔ اینٹیں ڈھونا پڑیں، چپڑاس تک کرنا پڑی لیکن اُنھوں نے اپنی زندگی کی کسی بات کو چھپایا نہیں۔ جس طرح دن بیتے ہیں اسی طرح اُن کو اپنے سوانح حیات کا جزو بنا دیا۔ یہ معمولی کام نہیں۔ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کوئی عالی ظرف ہی ایسے حالات لکھنے کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ جہاں ان کی نظم نگاری کی عظمت کا لوہا مانا گیا ہے وہاں جہانِ دانش کو دیکھ کر ان کی نثر نگاری کی تعریف بھی کرنا پڑتی ہے۔ ان کے اچھوتے اسلوب بیان کی داد بھی دینا پڑتی ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو کس دلکشی اور روانی سے حیطۂ تحریر میں لا رہے ہیں۔ اُنھوں نے غریبوں کی پریشان حالیاں دیکھیں۔ قریب سے ان کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ان کی ناداری اور مظلومیت کو دیکھا اور ان کے جذبات میں چھپے ہوئے درد کو محسوس کیا۔ پھر اُنھیں احساسات کی ترجمانی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم اور جہان دانش کی نثر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا ہے۔ سرمایہ داروں پر طنز کے تیر چلائے اور شدید احتجاجات کئے۔ وہ گوشت و پوست کے انسان بھی تھے۔ اپنی عشق ورزی کو بھی نہیں چھپایا۔ لیکن اس مرحلے کو بھی اُنھوں نے بڑے سلیقے سے طے کیا۔ افسوس انھوں نے جہان دانش میں واقعات کے ساتھ سنین نہیں لکھے۔ یہ کمی بُری طرح سے محسوس ہوتی ہے۔ اگر وہ واقعات کے ساتھ سنین بھی لکھ دیتے تو یہ آپ بیتی زیادہ مفید اور کارآمد ہو جاتی۔ اس کتاب کے آخری دو صفحوں پر ان کی تصانیف کی فہرست ملتی ہے جس میں نثر پر ان کی یہ پانچ غیر مطبوعہ کتابیں درج ہیں :-

۱۔	فرہنگ دانش (لغت)	۳ جلدیں	صفحات ۳۰۰۰
۲۔	فرہنگ قدیم	ایک جلد	۴۰۰
۳۔	دانش ابلاغ (علم معانی و بیان)		۷۰۰
۴۔	علم الامثال (ضرب الامثال پر مبسوط کتاب)		۷۰۰
۵۔	قاموس المحاورات (اُردو محاورات)		۸۰۰

اب آخر میں، میں یہ عرض کر دوں کہ ادبی اور علمی تحقیق مصنف کے ذہن کی بتدریج ترقی کا نام ہے۔ احسان صاحب کی نثری تالیفات کو ہم سنین وار اس لیے پیش نہیں کر سکے کہ ان کے تقدم و تاخر کو یہ مطبوعات نہیں بتاتیں۔ احسان صاحب کا درجہ نظم میں کیا ہے اور نثر میں کیا۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔ اپنی تصانیف میں اُنھوں نے جو امٹ نقوش چھوڑے ہیں وہ انشاء اللہ اُجاگر رہیں گے۔

شخصیتِ دانش

ذوقی مظفرنگری

۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء ریڈیو پاکستان نے صبح سات بجے کی خبروں میں جب حضرتِ دانش کی وفات حسرت آیات کی اندوہناک خبر سنائی تو بیالیس ۴۲ سال کی رفاقت کے نقوش دل سے اُبھرے اور آنسوؤں میں ڈھل کر مغموم آنکھوں سے بہ نکلے۔ حزن و ملال میں غلطاں دانش کدہ میں پہنچا تو دیکھا کہ مزدوروں کا دردمند، غریبوں کا غمخوار، اسلام کا پرستار، نظامِ مصطفےٰ کا طلب گار، لسان العصر اس دنیائے فانی کے ہنگاموں سے بے نیاز خاموش پڑا ہوا ہے۔ مرحوم کے اس شعر کے مطابق ؎

مجھے عادت ہے اپنے گھر نمازِ شام پڑھنے کی
مری میّت کو دفنانا غروبِ شام سے پہلے (دانش)

شام سے پہلے ہی آسمانِ ادب کے اس ستارۂ امتیاز کو میانی صاحب کے قبرستان میں زیرِ زمین دفن کر کے مدّتوں کے رفیقِ بادیدۂ تر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میں بھی تھکا ماندہ اپنے غریب خانہ پر آ گیا

مشفق اُستاد کی جُدائی کے غم کا اثر تھا یا میری نقاہت کا قصور کہ ہزار ضبطِ غم کے باوجود اشکوں کا سیلاب روکے نہ رُکا۔ تمام رات مرحوم کی یادوں کے ہجوم میں جاگتا رہا اور تا حال میرا یہی حال ہے۔ ؎

اشکِ غم و الم سے ہیں آنکھیں بھری ہوئیں
پھرتا ہوں کشتیوں میں سمندر لیے ہوئے (ذوقی)

ایسی حالت میں میرے لیے مقالہ لکھنا یا ایسا مضمون تحریر کرنا جو مرحوم کی زندگی کا کماحقہٗ احاطہ کر سکے، غیر ممکن ہے تاہم اظہارِ خیال کے طور پر ماضی کے دُھندلکوں میں بکھرے ہوئے کچھ واقعات کو حال کے اوراق پر سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

یوں تو مرحوم نے "جہانِ دانش" میں آپ بیتی لکھ کر اپنی زندگی کے تمام پہلو اُجاگر کر دیئے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ احسان دانش کے ایسے حالات واضح کیے جائیں جنھیں مرحوم نہ خود لکھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے ہیں۔

احسان دانش میرے مشفق اُستاد مخلص دوست، قابلِ اعتماد مشیر اور سچے غمگسار تھے۔ میں اُن کا رازداں ہوں وہ میرے رازداں تھے۔ مجھے جب کسی پریشانی کا سامنا ہوتا تو میں اُن کے پاس چلا جاتا۔ اُن کی مشفقانہ باتیں اور بذلہ سنجی تمام غم غلط کر دیتی۔ جب کوئی شخص اُن سے ملتا تو وہ سراپا عجز بن جاتے۔ اُن کے اخلاقِ حسنہ کی بدولت لوگ اُن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اُن کے پاس رات گئے تک عقیدت مندوں کا مجمع رہتا تھا۔ مرحوم کی تنہا ذات کسی انجمن سے کم نہ تھی۔

وہ محبِّ وطن، سچے مسلمان، راسخ العقیدہ حنفی تھے۔ پنجگانہ نماز ادا کرنے کے علاوہ نمازِ تہجد بھی پابندی کے ساتھ ادا

کرتے تھے۔ ان کے جمالیاتی ذوق نے انھیں عرفانِ ذات کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا تھا۔ وہ درویشوں کی عزت اور علماء کا احترام کرتے تھے۔ جب وہ عمرہ ادا کر کے حجازِ مقدس سے تشریف لائے تو آستانۂ رسالتؐ کی باتیں کرتے ہوئے اُن کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ مرحوم کی نعتیہ کتاب "دارین" ان کے عاشقِ رسولؐ ہونے کی روشن دلیل ہے۔

وہ بچوں سے بچگانہ، جوانوں سے برزگانہ، فاضلوں سے فاضلانہ، عالموں سے عالمانہ اور شاعروں سے شاعرانہ باتیں کیا کرتے۔ وہ رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی موت ایک ادارے کی موت ہے۔ ان کی موت ایک مکتبۂ فکر کی موت اُن کی موت طالبانِ علم و فن کے مرکز کی موت ہے۔ مرحوم طالب علموں کو داخلہ دلوانے اور لیکچررز کو پی۔ ایچ ڈی کرانے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن پر غزل کا ایک دَور ختم ہو چکا ہے اور اُن کے ساتھ ہی ادبی تاریخ کے ایک باب کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔

احسان دانش جہاں شاعروں کے اُستاد تھے وہاں وہ کبوتر بازوں کے بھی اُستاد تھے۔ جب کوئی کبوتر باز اُن کے پاس آتا تو گردان کبوتروں کے دلچسپ قصے بیان کرتے اور کبھی کبوتروں کے ڈوبنے اور تیرنے کی اصطلاحات پر تبصرہ فرماتے۔

عنفوانِ شباب میں بنوٹ کے بے حد شوقین تھے۔ ایک مرتبہ ڈیرہ دون (بھارت) سے بنوٹ کا ایک اُستاد آیا تو اس نے بتایا کہ احسان دانش بھی اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ایک دن میرے اصرار پر اُنھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ ایک چٹکی باجرہ لائے اور تخت کے نیچے بکھیر دیا۔ تین چار چڑیاں باجرہ چگنے کے لیے آ گئیں۔ احسان صاحب نے فرمایا کہ لے بھائی اب میرا فن دیکھ۔ اگر تُو کہے تو انھیں زندہ قید کر لوں اور اگر چاہے کہ ان کو مار دوں تو ایک چڑیا بھی بچ کر نہیں جا سکتی۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے سوا گز کا ایک ڈنڈا لیا اور چڑیوں کو گھیرنا شروع کر دیا۔ چاروں چڑیوں میں سے ایک چڑیا بھی تخت کی حد سے باہر نہیں نکلنے دی۔ جب کوئی چڑیا اڑنا چاہتی۔ اس کی گردن ڈنڈے کے نیچے ہوتی تھی۔ میں اُن کا یہ فن دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اپنا یہ کمال دکھانے کے بعد فرمانے لگے کہ اس سوا گز کے ڈنڈے سے ساٹھ ستر لٹھ ماروں کو زخمی کیا جا سکتا ہے۔

مرحوم نے مفلسی کے اندھیروں میں آنکھیں کھولیں۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو اُجالوں کی تلاش میں اپنی لوحِ تدبیر پر تقدیر کی نئی سطور رقم کرنے کی غرض سے دلّی جا کر ایک پریس میں سیاہی بیل کی حیثیت سے آٹھ روپے ماہانہ پر ملازمت کر لی۔ جب دلّی میں بھی تسلی بخش طور پر دو روٹیاں میسر نہ آئیں تو لاہور آ گئے۔ یہاں گورنر ہاؤس میں ہیڈ مالی رہے اور ریلوے ڈی، ایس آفس لاہور میں بطور چپڑاسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مال روڈ پر چوکیداری بھی کرتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں معماروں کے ساتھ پانچ آنے روز پر مزدوری کرتے رہے۔ کچھ عرصہ ایک کتب فروش کی دکان پر سیلز مین بھی رہے۔ اس کے علاوہ بھی انھیں جس قسم کی مزدوری ملی دیانت داری سے کی۔ غربت و ناداری کی تاریک آندھیوں میں بھی مرحوم نے عزم و ہمت کا چراغ روشن رکھا۔ مزدوری کرنے کے بعد جو تھوڑا بہت وقت میسر آتا اُسے مطالعہ میں گذارتے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں مشقِ سخن کیا کرتے تھے۔

مرحوم سے پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء کے اوائل میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے دوران ہی میں نے درویش میرٹھی مرحوم کی وساطت سے انھیں اپنی غزل دکھائی۔ اس کے بعد حضرتِ دانش کو اپنا کلام بھیجتا رہا۔ لیکن لاہور سے ایک شعر بھی اصلاح ہو کر واپس نہ آیا۔ تاہم میں نے اپنی مشقِ سخن جاری رکھی۔ جب پاکستان دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہوا تو میں دسمبر ۱۹۴۷ء میں بھارت سے ہجرت کر کے اپنی محبوب مملکتِ پاکستان میں آیا۔ احسان دانش کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ایک دن کاروانِ ادب انارکلی کے سامنے بیتھر کے کوئلے سے بھرے ہوئے ٹرک پر دسمبر کی خنک فضا میں انھیں کھدر کی چادر اوڑھے سوتے ہوئے پایا۔ میری آواز پر ہڑبڑا کر اٹھے اور بغلگیر ہو گئے۔ میرا حال پوچھا اور عزیزوں کی خیریت دریافت کی۔ پھر چپ کے سمندر میں ڈوب گئے۔ میں نے سکوت توڑنے کی غرض سے کہا کہ حضرت کیا آپ کا اپنا گھر نہیں۔ فرمانے لگے کہ بھائی میں تو دو ہفتے سے ان کوٹلوں کے ڈلوں پر بار بنا ہوا ہوں۔ میرے گھر میں تو مہاجر دوست بھرے پڑے ہیں۔ جو کچھ اب تک کمایا تھا ان پر خرچ کر چکا ہوں۔ جو لوگ میری دوستی کے تصور میں میرے پاس آئے ہیں۔ اُن سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ اس مختصر سی ملاقات کے بعد میں لاہور سے باہر چلا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں کچھ معاشی حالت سنبھلی تو اُستادِ مکرم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پھر حاضر ہوتا رہا، بلکہ اپنے کلام پر باقاعدہ مشورہ بھی کرتا رہا۔ مرحوم جب شعر کہتے تھے یا اصلاحِ سخن کرتے تھے تو الفاظ دست بستہ اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ اُن کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ باتوں باتوں میں تیس تیس، چالیس چالیس اشعار کہہ جاتے۔ مرحوم نے اُردو ادب کی تمام اصنافِ سخن پر اپنی عظمت کے لافانی نقوش چھوڑے ہیں۔

وہ بے حد مخلص، صاف گو اور شریف النفس تھے۔ سادہ غذا اور سادہ لباس اُن کی سادہ مزاجی کا عکاس تھا، وہ پرانی زبان میں نئے خیالات سمونے کے قائل تھے۔ وہ اپنے احباب کو مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ مطالعہ فکر کو جلا بخشتا ہے۔ جس نے ایک مرتبہ اُن سے پوچھا کہ آپ کو اس درجہ زود گوئی کیسے حاصل ہوئی۔ جواباً فرمایا کہ میاں میں نے شاعری کا ریاض کیا ہے۔ میں نے عرض کیا کیسے۔ فرمایا کہ میں نے مشکل ترین زمینوں میں ایک ایک قافیہ پر سو، سو شعر کہے ہیں۔ اُن کے پاس ایک غیر مطبوعہ "دیوانِ شہیدی" تھا، اس پر بھی انھوں نے اپنا ایک دیوان تخلیق کر کے خود ہی ضائع کر دیا تھا۔ ضائع کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ میں غیر معیاری چیز کے وجود کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ تو محض مشقِ سخن کے طور پر کہہ لیا تھا۔

احسان دانش نے بائیس کتابیں لکھی ہیں۔ اُن میں سے بعض کا ترجمہ روسی، چینی اور انگریزی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سیرت النبیؐ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن موت نے مہلت نہیں دی۔ جہانِ دانش کا دوسرا حصہ ماہِ فروری میں مکمل کر چکے تھے۔ اُردو لغت فرہنگِ دانش زیرِ قلم تھی۔ حال ہی میں میرے دریافت کرنے پر مرحوم نے بتایا تھا کہ لغت "ڑ" تک لکھی جا سکی ہے۔ میری اہل درخواست پر کہ لغت کی تکمیل ہونا نہایت ضروری ہے۔ تھکی تھکی زبان سے کہہ دیتے تھے کہ بھائی مجھ سے اب لکھا نہیں جاتا اور کوئی لکھنے والا بھی نہیں ملتا۔ تمھاری نظر بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اب تمھیں کہو کہ لغت کیونکر مکمل ہو سکتی ہے۔ افسوس کہ موت نے مہلت نہیں دی۔ اب ہم لوگوں کا فرض ہے کہ فرہنگِ دانش کو مکمل کر کے اپنا ادبی فریضہ انجام دیں۔

میری آخری مُلاقات اُن سے ۱۱ مارچ ۱۹۸۲ء بروز جمعرات ہوئی تھی۔ یہ مُلاقات دس بجے دن سے تقریباً دو بجے تک جاری رہی۔ دورانِ مُلاقات قافیہ مُتدارک اور قافیہ مُتقارب کے استعمال پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران ساہیوال کے رہنے والے ایک نوجوان شاعر ریاض نعمی اور ایک بزرگ شاعر خورشید فرید آبادی بھی آ گئے۔ ریاض نعمی نے مجھ سے بحرِ قریب کے بارے میں سوالات شروع کئے اور کئی مصرعوں کی تقطیع بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ جب ریاض نعمی مطمئن ہو گئے تو حضرتِ احسان دانش نے فرمایا کہ ذوقی مجھے تمہاری معلوماتِ فن پر بے حد خوشی ہے اب سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے میں تو اس کمبخت بیماری کی وجہ سے عروض کے باٹ ترازو بھول گیا ہوں میرا بایاں کان بہرہ ہو چکا ہے اور دماغ کا بایاں حصّہ بھی سُن ہو چکا ہے اس لیے بات کافی دیر کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ روانگی کی اجازت چاہی، لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر بٹھا لیا کہ میاں ابھی اور بیٹھو۔ چلا چلی کا میلہ ہے۔ کیا خبر پھر مُلاقات ہو یا نہ ہو۔ میں اُن کے اصرار پر احتراماً بیٹھ گیا۔ مجھ سے رازدارانہ انداز میں فرمانے لگے کہ بھائی ۲۳ تاریخ کو اپنی تیسری کتاب "توقیرِ ادب" لے کر ضرور آ جانا۔ میں نے ایک پبلشر سے تمہاری کتاب چھاپنے کا وعدہ لے لیا ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ مشفق اُستاد ۲۲ تاریخ ہی کو داغِ مفارقت دے کر مجھے ہمیشہ کے لیے غم دا ندوہ کے حوالے کر جائیں گے۔

مرحوم "پاکستان رائٹرز گلڈ" کے مرکزی رُکن اور اکاڈمی ادبیات پاکستان کے اساسی رکن تھے۔ اس لیے میں "پاکستان رائٹرز گلڈ" اور اکاڈمی ادبیاتِ پاکستان کے اربابِ اختیار کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اس عظیم المرتبت قادرالکلام شاعر کے باقی ماندہ کلام کی اشاعت کا بلا تاخیر بندوبست کریں۔

مجھے ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن کے اربابِ اختیار سے شکایت ہے کہ بین الاقوامی شاعر احسان دانش کے انتقالِ پُرملال کی خبر دینے اور جنازے کا جلوس دکھانے کے بعد سبکدوش ہو گئے۔ ان اداروں کو چاہیئے تھا کہ اس عظیم شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے اُن کے احباب کی مجالسِ مذاکرہ سُنواتے اور دکھاتے۔ اس وقت وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ بظاہر وہ مر گئے ہیں لیکن مرحوم اپنے فن کے حوالے سے زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ تعالےٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

احسان دانش

محمد اسحٰق خاں شور

مجھے حضرتِ احسان دانش کی خدمت میں حاضری کا شرف ۱۹۳۳ء میں حاصل ہوا جب میں ان کو کسی بھی حیثیت سے نہیں جانتا تھا، ایک ہفتہ وار رسالہ کے دفتر میں دورانِ گفتگو اس کے ایڈیٹر نے مجھ سے دریافت کیا، تم احسان دانش کو جانتے ہو، میں نے کہا نہیں، ایڈیٹر صاحب نے کہا تم ان سے ضرور ملو، وہ لوہاری گیٹ کے اندر گیلانی بک ڈپو میں منیجر ہیں، وہ تمہارے ہم وطن ہیں، شاعر ہیں۔ شاید وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے بے سہارا اور آوارہ وطن لوگوں کا اگر کوئی سرخیل ہے تو وہ احسان دانش ہے۔

وہی مجھے ان کے پاس لے کر آئے جیسے پاس پڑوس کے لوگ یتیم بچوں کو دارالاطفال میں چھوڑ جاتے ہیں، میری عمر شاید بائیس[۲۲] سال تھی۔

احسان صاحب نے چند ضابطہ کے سوالات کئے۔

احسان دانش : کیا نام ہے آپ کا؟

میں : محمد اسحاق خاں۔

احسان دانش : کہاں کے رہنے والے ہو؟

میں : قصبہ بابری ضلع مظفر نگر کا ہوں۔

احسان دانش : وہ تو بلوچوں کی بستی ہے۔

میں : میں بھی بلوچ ہوں۔ دہلی کے اردگرد بہت سی بستیاں بلوچوں کی ہیں۔

احسان دانش : ماں باپ ہیں؟

میں : جی بقید حیات ہیں۔

احسان دانش : کیا گھر سے بھاگے ہوئے ہو۔

میں : جی۔

احسان دانش : کیوں؟

میں نے جواب دیا وہاں جی نہیں لگتا تھا، کچھ پڑھے ہوئے ہو۔ میں نے کہا تھانہ بھون میں حضرت مولانا تھانوی کے یہاں پڑھتا رہا ہوں۔ پھر کام جانتے ہو۔ میں نے عرض کیا، لاہور ہی میں کتابت سیکھی ہے، ابھی تک کوئی کام نہیں ملا۔ کام کی تلاش میں ہوں، کہاں ٹھہرے ہو۔ میں نے کہا پیسہ اخبار میں میرے استاد منشی فضل الٰہی خوشنویس رہتے ہیں۔ ان کے یہاں عارضی قیام ہے۔ میرے اہل و عیال بھی میرے ساتھ ہیں۔

احسان دانش اُٹھے۔ شیروانی پہنی اور مجھ سے کہا میرے ساتھ آؤ، راستے سے تانگہ لیا۔ میرا سامان اور بیوی کو لے کر مزنگ آ گئے، احسان دانش کے مکان کی بالائی منزل پر ایک کمرہ خالی تھا، فرمایا یہ مکان تمہارا ہے۔ تین روپے اس کا کرایہ ہے، یہ میرے والد صاحب ہیں یہ میری والدہ صاحبہ یہ میری بیوی یہ میرا لڑکا ذیشان دانش۔ اب تم جہاں چاہو جاؤ اور جب چاہو آؤ۔

میری بیوی جو میری تنک مزاجی کی وجہ سے اپنے بہت بڑے خاندان کو چھوڑ کر گرد راہ کی طرح شریک سفر تھی۔ شاد باد منزل مراد کا نغمہ الاپنے لگی۔ احسان صاحب کی والدہ صاحبہ نے اُسے مادرانہ شفقتوں سے نوازا، ان کی مہر و محبت اور احسان صاحب کی بیگم صاحبہ کی مروت و عنایات نے غریب الوطنی کے احساس کو یکسر ختم کر دیا۔ میری اہلیہ ایسی مسرور نظر آ رہی تھی جیسے لڑکیاں اپنے میکے میں مسرتوں سے پھول نہیں سماتیں مجھ پر دن رات کی فکر مندی سے جو مظلومیت کا خول سا چڑھا ہوا تھا، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ وطن سے دوری، والدین کی شفقت، احباب کی دلنوازیاں سب کچھ ہی تو احسان صاحب کی معیت میں حاصل تھا۔

احسان صاحب کی عام زندگی پتھر کے زمانے سے ملتی جلتی ہے۔ استراحت فرمانے کے لئے لکڑی کے تختوں کا پلنگ، لکھنے پڑھنے کے لئے بوریئے کا فرش۔ اگر ذہن تکلف کی طرف مائل ہے اس پر دری بچھا لی جاتی، رات کو سونے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ مگر بیدار ہونے کا وقت ۴ بجے صبح۔ صبح صادق و کاذب کا امتیاز ان سب کے لیے نہایت ضروری تھا جو رات بسر کرنے کے لئے آ پھنسے، ۴ بجے صبح گریباں سے پکڑنے کا منظر قابل دید ہوتا۔ ان کے ساتھ سونے والے سب کے سب معمول اور جہاں احسان دانش صاحب عامل۔ پہلی کوشش یہ ہوتی کہ پہلا چھسلا کر اٹھایا جائے۔ ورنہ گدگدی کے داؤ پیچ کا استعمال اصولی بات تھی۔ صبح کی سیر صوم و صلوٰۃ کی طرح فرض کا درجہ رکھتی۔ لارنس گارڈن (حجاج گارڈن) سے واپسی پر وہ اشعار بیاض میں درج کئے جاتے جو لارنس گارڈن یا لارنس باغ میں وارد ہوتے۔ اکثر کئی کئی نظمیں ہو جاتیں۔

کالجوں کے نوعمر لڑکے اپنے اشعار کی اصلاح، شعر سُننے یا بالمقطع غزلیں لینے کے لئے۔ جیسے چاندی کے ورق بنانے والوں کے اڈوں سے ایک خاص ردھم میں ورق کوٹنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں، اسی طرح ردیف و قافیوں کو سنوارنے کا ٹھیا ان کی محفل میں لگا رہتا تھا۔

جناب احسان دانش پکی پکائی روٹی کے قائل ہیں۔ دس پانچ خواندہ و ناخواندہ مہمان ان کے رزق میں برابر کے حصہ دار ہوتے ان کے ہاں اللہ کے اس فرمان کو متشکل دیکھا کہ مہمان اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے دس پندرہ سال پہلے تک احسان صاحب شام کے کھانے کے سوا ہر کھانا بازار سے کھایا کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کبھی احسان صاحب نے اپنے اہل خانہ کو اپنے احباب کے لیے کسی بھی خدمت کی زحمت دی ہو۔ جتنے پیسے تکیہ یا فرش دری یا بستر کی کسی تہ میں ہوتے نکال لیے اگر کمی پڑ گئی تو فرمایا تھوڑے پیسے ملاؤ اور حلال کی کھاؤ۔

قیام پاکستان سے پہلے نخشب جارچوی احسان صاحب سے ملنے کے لیے لاہور آئے، ہم تینوں انارکلی سے گذر رہے تھے۔ احسان صاحب بولے، کیوں بے نخشب لسی پیئے گا، نخشب بولے ضرور، اچھا تو نکال پیسے! اس قسم کے سیکڑوں بطلغے قدم قدم ہوتے رہتے۔

غسل ہمیشہ حمام میں فرماتے، غسل سے پہلے وہ کپڑے دھو لینا غسل کے واجبات میں سے تھا۔ جو وہ اُس وقت پہنے ہوئے

ہوتے، اُس زمانے میں یہ بہت سے لوگوں کے پیر بھی تھے۔ مریدین بتاشے، میٹھی کھیلیں اگر بتیاں لئے چلے آرہے ہیں۔ محفل شعر و سخن یکایک ذکر خفی و جلی میں تبدیل ہو جاتی ہے لوگ سیدھے پاؤں آرہے ہیں اور اُلٹے پاؤں جا رہے ہیں۔ اکثر اس محفل کا رنگ ایسا ہوتا کہ مجھ پر خوف طاری ہو جاتا، اس وقت احسان صاحب میں ایسا صدق و صفا جھلکتا کہ بس اب یہ "انا الحق" کا نعرہ لگانے والے ہیں۔

بلاشبہ احسان صاحب کی پاکیزہ زندگی، درویشانہ خصلت اور قناعت باشعور لوگوں کے دلوں پر نقش چھوڑتی ہے۔ میں نے اتنی طویل رفاقت میں صوم و صلوٰۃ کا ایسا پابند پایا کہ حیرت ہوتی تھی۔ ہر قسم کے لوگ محفل میں موجود ہیں، اکل و شرب کا دور جاری ہے، ایسے ایسے احباب جو اپنے آپ کو روزہ و نماز کی ادائی سے آزاد سمجھتے وارد ہوتے اور احسان صاحب خود روزے سے ہوتے مگر ان کی تواضع نہایت فراخدلانہ انداز میں کرتے مجال ہے کسی کو اتنا بھی تاثر دیں کہ تجھے ماہ رمضان کے احترام کا بھی پاس نہیں۔

بزرگانِ دین کے مقابر پر حاضری ان کے مسلک میں شامل ہے۔ اپنی والدہ مرحومہ کے مزار مبارک پر ہر جمعرات کو حاضری ان کے معمول میں ہے۔ اس وقت ان کے قلب کی کیفیت عجیب ہوتی ہے: تلاوت قرآن اور درود ناغہ اس حضوری قلب سے پیش کرتے ہیں۔ جیسے انہوں نے دنیا بھر کی بیش قیمت چیزیں اور انواع و اقسام کی نعمتیں ان کی خدمت میں چن دی ہوں، اُن کے بشرے سے حزن و ملال کے بجائے ایک سرور و انبساط عیاں ہوتا ہے جیسے ان کی والدہ اس وقت ان کے روبرو ہیں۔

شام کا کھانا ہم اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ میں عموماً گھر پر ہی رہتا تھا۔ شام کو احسان صاحب گھر لوٹتے، دسیوں نوجوان ساتھ ہیں۔ گھر کے نیچے "پاسنگ آوٹ کیڈٹوں" کی سلامی سی لی اور زینے میں داخل ہو گئے۔ شاعر کی دردی اُتار شب باشی کا لباس زیب تن فرماتے۔ جو ایک تہبند اور ایک کرتا ہوتا، اوپر آکر مجھ کہہ کر بیگم صاحبہ کو آواز دی، کھانا اوپر لے آؤ، ادھر میری بیوی نے کھانا لا کر سامنے رکھ دیا۔ سالن عموماً معمولی ہوتا، ہاں بھس کی چٹنی کی کٹوری تو احسان صاحب کے پاس اس طرح رہی جس طرح بُت کے قدموں میں پوجا پاٹ کے لئے پیتل کی کٹوریاں رکھی رہتی ہیں۔

ایک شام احسان صاحب حسب معمول اوپر تشریف لائے اور کھانا لانے کے لئے بیگم صاحبہ کو آواز دی۔ میری بیوی کھانا اُتار کر پلنگ پر رکھ چکی تھی کسی نے زینے سے شاہ صاحب شاہ صاحب کہہ کر آواز دی، احسان صاحب یہ کہہ کر اُٹھے کہ میں ابھی آیا اس سے نبٹ لوں، پانچ منٹ کے بعد اوپر آئے اور یہ کہہ کر نیچے چلے گئے "اسحاق تم کھانا کھا لو میں ٹھہر کر کھاؤں گا"۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ احسان صاحب کو آنے دو پھر کھائیں گے۔ مجھے یاد نہیں میں نے اُس روز کھانا کھایا یا نہیں۔

احسان صاحب کے والد صاحب کی عمر شاید اسی سال ہو گی، ہر دس بیس منٹ کے بعد اوپر تشریف لاتے اور فرماتے اسحاق احسان کہاں گیا ہے اور کب آئے گا۔ آتا اسی طرح تمام شب اوپر اور نیچے آتے اور جاتے رہے۔ دامن نے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ احسان صاحب گرفتار ہو گئے ہیں اور رات ہی کو پولیس کی حراست میں کلکتہ روانہ ہو گئے۔ پولیس نے ہزار کوشش کی کہ آپ ضمانت کرالیں۔ مگر انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا اجتماع گھر پر اس طرح ہو گیا جیسے کسی شادی یا مرگ میں اعزہ و اقارب جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال والد صاحب کے لیے بیحد پریشان کن تھی لامحالہ والد صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا کہ آغا حشر کاشمیری

نے توہین عدالت کا مقدمہ کلکتہ میں دائر کیا ہوا ہے، اس کی پیشی پر پہنچنا تھا۔ اس لئے وہ فوراً روانہ ہو گئے، اگر وہ اوپر آتے تو انھیں گاڑی نہیں مل سکتی تھی اور غیر حاضری پر وارنٹ گرفتاری جاری ہو جاتے۔

ایک ہفتہ کے بعد خیریت نامہ کے بجائے "خادم کلکتہ" کا ایک شمارہ مجھے موصول ہوا جس میں ایک نظم "ریا و دنیا" کے عنوان سے چھپی ہوئی تھی۔ یہ نظم صورت حال کے تقاضوں کے پیش نظر ایسی تھی کہ احسان صاحب اسی طرح گرفتار ہی رہیں اور ایسی نظمیں مجھے بھیجتے رہیں اسی زمانہ میں میرے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے اور چند دنوں کے بعد ہسپتال ہی میں انتقال کر گئے میری حالت ایسی تھی جیسے کسی مسافر کا اسٹیشن پر زادراہ گم ہو جائے۔

احسان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، رندھی رندھی آواز میں نے کہا۔ "وہ دونوں بچے مر گئے ہیں"۔

احسان صاحب نے فرمایا۔ "اچھا چلتے ہیں"۔

میں نے کہا۔ "کسی اور کو بھی اطلاع کر دیں"۔

بولے "تشکر کی کیا ضرورت ہے"۔ وہ ایسے مطمئن نظر آرہے تھے جیسے انھیں بیکاری کے بعد مٹی کا ٹیلہ کھودنے کا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ اٹھے اور جوتا پہنتے ہوئے فرمایا۔ "تو یہ بتا تیرے پاس کتنے پیسے ہیں"۔ میں نے عرض کیا پانچ چھ روپے۔ پھر اپنی جیب ٹٹولی دو روپے کچھ آنے نکلے۔ بولے "بس کام ہو جائے گا"۔ لوہاری دروازے سے ۱۴ آنے کا ٹھاٹھ ریدا، پیسے احسان صاحب ہی نے دیئے مجھے اپنے بچوں کے انتقال کے رنج و غم کے ساتھ یہ خیال ستا رہا تھا کہ احسان صاحب پیسے خرچ کر رہے ہیں انھیں تو اس ماہ ابھی تک تنخواہ بھی نہیں ملی۔

دونوں مردہ بچے لے کر جنازہ گاہ پہنچے تو، گورکنوں نے گھیر لیا۔ ایک گورکن نے کہا، قبریں کہاں کھودی جائیں۔ احسان صاحب نے فرمایا۔ "جہاں جگہ ہو۔ ایک قبر کھود دیں"۔ گورکن بولا "جناب کبھی دو مردے ایک قبر میں دفن ہوئے ہیں"۔ احسان صاحب بولے۔ یہ بھائی بھائی ہیں ان میں کوئی نزاع پیدا نہیں ہوگا"۔ دیکھتے دیکھتے لوگ جمع ہو گئے۔ امام صاحب بھی آ گئے۔ انہوں نے فرمایا۔ "میاں دو مُردے ایک قبر میں دفن نہیں ہو سکتے، ہاں دو شیر خوار بچے اپنی ماں کے ساتھ دفن ہو سکتے ہیں"۔

احسان صاحب بولے۔ "لیجیے مسئلہ حل ہو گیا، ہم ان کی ماں کو مار کر ابھی لائے"۔

وہ لوگ جو اس وقت جمع ہو گئے تھے ایک ایک کر کے کھسک گئے۔ میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں کھڑا تھا۔ احسان صاحب نے فرمایا۔ "یار ایک بات سوجھی ہے، انھیں کسی قبر کے پہلو میں رکھ کر بھاگ چلو۔ یہ لوگ خود دفن کرتے پھریں گے، آخر لاوارث لاشوں کو بھی تو لوگ دفن کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے اگر وہاں ہمیں کوئی دیکھتا نہ ہوتا، وہ ایسا کر بیٹھتے، یکایک صفانوالہ چوک کے ایک صاحب جو اپنے آبائی قبرستان میں فاتحہ پڑھ رہے تھے، احسان صاحب کو دیکھ کر ہماری طرف آئے احسان صاحب کو سلام کے بعد بولے شاہ صاحب خیریت ہے کیا بات ہے، احسان صاحب بولے یہ میرے بھتیجے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں انھیں ایک ہی قبر میں دفن کریں۔ ہمارے پاس قبروں کی کھدائی اور زمین کے پیسے نہیں ہیں۔ یہ لوگ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے فتوے دے رہے ہیں۔ غالباً ان کا نام شفیع تھا۔ انہوں نے دونوں

بچے اُٹھائے اور اپنے خاندانی احاطہ میں دفن کرا دیے۔ میرے اس عزیز نے یہ کہانی میری اہلیہ کو سنا دی، وہ بیچاری روتے روتے بدحال ہوگئی۔ احسان صاحب کو دیکھتے ہی سر پیٹ پیٹ کر بین کر کے رونے لگی۔ ہائے میرے بچوں کو آپ نے کس طرح دفن کیا ہے احسان صاحب نے کہا خیر گذری میرے ایک جاننے والے نے اپنے خاندانی احاطہ میں دفن کرا دیا ورنہ ہم تو تمھیں مارنے کے لئے آرہے تھے۔ جنازہ گاہ کے امام صاحب کہتے تھے کہ بچے اپنی ماں کے ساتھ تو دفن ہو سکتے ہیں دو بھائی ایک جگہ دفن نہیں ہو سکتے۔ تمہیں معلوم ہے پیسے میرے پاس تھے نہ اسحاق کے، ہم ایک ہی قبر میں دفن کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں شمر اور یزید بنانے کی ضرورت نہیں ذرا اندھیرا ہونے دو انھیں کھود کر لادوں گا۔ پھر تم اپنی مرضی سے جس طرح چاہے دفن کر لینا۔ اب جب کبھی بھی میری اہلیہ کو ان بچوں کا خیال آتا ہے تو وہ رونے یا دلگیر ہونے کے بجائے مسکرانے لگتی ہے۔

شاید بیس روز بعد اپنی اہلیہ کی علالت کے باعث وطن لوٹ گیا۔ اُسے گھر چھوڑ کر دہلی مکتبہ جامعہ ملیہ سے وابستہ ہوگیا۔ احسان صاحب نے خط کے ذریعے بیڈن کلب دہلی کے مشاعرہ میں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل میں ملنے کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ مشاعرہ کی صدارت حسن نظامی صاحب فرما رہے تھے، جگر صاحب مسندِ صدارت پر حسن نظامی صاحب کو دیکھ کر عالمِ بیخودی اور خمار میں ڈوبے ہوئے اشاروں اور کنایوں کی زبان میں حاضرین مشاعرہ سے کہہ رہے تھے۔ یہ خضر صفت، یہ ہادی دین وملت ہم رندوں کی صدارت فرما رہے ہیں۔

مشاعرہ شروع ہوا، احسان صاحب کی باری آئی۔ احسان صاحب نے "سادھو کی چتا" نظم شروع کی ان کی پاٹ دار آواز مشاعرہ کے میدان سے گذر کر برابر کی عمارتوں سے ٹکرا رہی تھی، تین چار اشعار پڑھے ہی تھے کہ حسن نظامی صاحب مسندِ صدارت سے اُٹھے اور احسان صاحب کی نظم رکوا کر حاضرین سے مخاطب ہوئے حضرات "شیکسپیئر نے کیا کہا" ایک سر و تھا اس پر قمری بول رہی تھی وغیرہ" منظر میرے ہندوستان کے شیکسپیئر سے سُنیے۔ دو چار شعر اور پڑھے تھے کہ حسن نظامی صاحب پھر کھڑے ہو گئے اور حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ احسان صاحب کاندھلہ کے رہنے والے ہیں۔ کاندھلہ میرے کئی استادوں کا قصبہ ہے احسان صاحب نظم پڑھئے۔ اب آپکی نظم میں ایک شاگرد کی حیثیت سے سُن رہا ہوں"

نظم شروع حاضرین پر عجیب کیفیت طاری تھی معلوم ہوتا تھا کہ چتا اسٹیج پر جل رہی ہے اور اس کے ہیبت ناک شعلے حاضرین کے خدوخال جھلسا رہے ہیں۔ احسان دانش کا یہ وہ زمانہ ہے جب وہ ہندوستان کے ادب پسندوں کی آنکھوں کا تارا تھے۔

میرا مکان قرول باغ میں تھا۔ مکان کے ایک حصّہ میں مکتبہ دانش کا بورڈ آویزاں کر دیا گیا، احسان دانش کے لئے ایک کمرہ تو پہلے ہی مختص تھا جو ان کی آمد پر کھولا جاتا تھا۔ ان کے پرستاروں کو علم تھا کہ یہ کٹیا اسی وقت کھلے گی جب وہ کرشن مُراری آئے گا۔ چند قدم کے فاصلے پر جناب محمود علی خانصاحب کا دولت کدہ تھا۔ محمود علی خاں صاحب جگر صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ جگر صاحب دہلی میں ان ہی کے یہاں قیام فرماتے تھے۔ شہنشاہ تغزل کی آمد پر ان کے مداحوں اور پرستاروں سے قرول باغ میں کیف وسرور کے سوتے پھوٹ پڑتے تھے۔

قرول باغ ہند کا بغداد کہئے، دہلی کی زینت وآبرو، علم وادب کا گہوارہ، درس وتدریس کا مرکز، مذہب وسیاست کی پُربہار

وادیاں اسی کے پہلو میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دفاتر اور درس گاہیں "طبیہ کالج" "جامعہ طبیہ دہلی" ماہنامہ "رسالہ جامعہ"، "برہان دہلی"۔ "پیام دہلی"۔ "المسیح"۔ "مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ"۔ مدرسہ "صولتیہ مکہ" کے دفاتر اور رسالہ "حرم" جیسے مؤقر جریدہ اور دارالعلوم قرول باغ کی ہر گلی اور ہر موڑ پر "مکتبہ دانش کے قیام اور" دانش گاہ" سے قرول باغ میں ایک اور دبستان کھل گیا۔

یوں کہئے اس سرزمین پہ آسمان کے ستارے اترے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مولانا عبیداللہ سندھی، اسلم جیراجپوری سید وقار عظیم، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد سرور، علامہ کبیر الدین، بابائے طب فرید احمد عباسی حکیم رضوان احمد اور بہت سے استادان گرامی اور ہونہار طلبہ کی رہائش گاہیں اسی بگیہ پہلو بہ پہلو تھیں۔

احسان صاحب کی آمد پہ یہ خطہ ارضی اور مسرتوں سے لبریز ہوتا، صابر دہلوی، نخشب چارچوی، شمس زبیری اور اُن کے بہت سے شیدائی اُن کے قیام کے زمانے میں ان کے ساتھ ہی رہتے۔ اکثر ان کے احباب لاہور ہی سے ان کے ہم رکاب ہوتے تاکہ ہندوستان کے مشہور و معروف شہروں کی سیر کریں۔ یوسف ظفر بھی اسی نیت سے ایک بار احسان صاحب کے ہم سفر تھے۔ کافی عرصہ دہلی میں رہے۔ مجھے ان کی تھوڑی بہت خدمت کرنے کا شرف حاصل ہے۔ احسان صاحب نے مجھے ہدایت فرمائی تھی کہ اُن کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھنا۔

احسان صاحب کو شعر کہنے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی، یکسوئی کی فکر نہ مراقبہ کے لیے جگہ کی تلاش، صبح سے رات گئے تک ان کی محفل میں فاضل اور اجہل پہلو بہ پہلو نظر آئیں گے، مدبروں کے دوش بہ دوش بڑے بڑے ان گھڑ گھٹنے سے گھٹنا ملائے موجود ہیں، ان کی محفل میں اگر عامل حضرات جنوں سے کشتی لڑنے یا انھیں مطیع کرنے کے واقعات سنا رہے ہیں تو اسی وقت کوئی صاحب کسی چڑیل سے ہم آغوشی یا چشمک کی داستان داغ رہے ہیں۔ احسان دانش ہمہ تن گوش حیرت و استعجاب کے عالم میں سب کچھ سن رہے ہیں اگر خود بھی موڈ میں آگئے تو ایسی داستان کسی دوست کے حوالے سے سناتے لوگوں کی گھگی بندھ جاتی ایسی محفلیں کئی کئی گھنٹے جاری رہتیں۔

یہ جناتی دربار برخواست ہوا اور یکایک بول پڑے لو شعر سنو، نظم ہو گئی، یہ نظم کب ہوئی یہ اشعار کب کہے، غزل ہے تو مکمل، نظم ہے تو کہیں جھول نہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھا گیا اب شعر کا نزول ہے اور احسان صاحب پر پھلائے کسی گوشے کی تلاش میں ہیں۔

اگر کوئی صاحب اصلاح لینے کے لئے آگئے تو فوراً کہا سناؤ اور شعر پڑھتے پڑھتے اصلاح ہو گئی۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہوگا، چھوڑ جاؤ میں پھر دیکھ لوں گا۔ میں نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ کہیں طرحی مشاعرہ ہے ان کے ساتھ جانے والے اپنی غزلیں کہہ چکے ہیں یا ابھی سراب میں کانٹے ڈالے بیٹھے ہیں۔ احسان صاحب پر غنودگی کا عالم ہے دونوں ہاتھ سکڑ کر اُن کی بغلوں میں جا چکے ہیں اب نہ جانے یہ نیند کی کسی کم سن دیوی کے پہلو میں ہیں یا کسی عمر رسیدہ ماما کے آغوش میں سانس روکے پڑے ہیں اسی عالم میں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر شعر سناتے ہیں ذرا آنکھیں وا ہوئیں اور اصلاح ہو گئی کبھی فرمایا قافیہ کیا ہے قافیہ سنتے ہی کہا یوں کر لو یا اُسے چھوڑ دو۔ اسی طرح دو دو چار چار، پانچ پانچ آدمیوں کو اصلاح دیتے ہوئے دیکھا۔ مشاعرہ کا وقت قریب ہو گیا ہے، احسان صاحب اُٹھے اور یاروں کے ساتھ مشاعرہ میں پہنچ گئے۔

میرے گاؤں میں میرا ایک دوست جو فن بنوٹ میں میرا شاگرد تھا اس کے والد ضلع کے مشہور لوگوں میں سے تھے انھیں ایک سر پھرے سکھ نے قتل کر دیا۔ یہ میرے قریبی عزیز بھی ہوتے تھے احسان صاحب کو جیسے اطلاع ہوئی وہ دہلی ہوتے ہوئے میرے گاؤں پہنچے، دو چار روز قیام کے بعد دہلی جانے کے لئے اسٹیشن تک پانچ میل بیل گاڑی سے سفر کرنا پڑا۔ راستے میں کھیت، نہریں، پل چھوٹے چھوٹے گاؤں ان کی گرفت میں تھے، سیکڑوں مشاہدات بے تکلف کہے جا رہے تھے، درختوں میں لپٹی ہوئی بیلوں کو دیکھ کر نہ جانے کس محبوب کے گلے میں بانہیں ڈالتے، کھیتوں میں کسانوں کو مشقت کرتے دیکھ کر ماضی کی بھولی ہوئی صبحیں اور بڈھال شامیں ان کے اشعار میں ڈھل رہی تھیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت احسان دانش بیتے ہوئے دن "شام اودھ" "صبح بنارس" "پہلی ملاقات" جیسی نظمیں کہہ رہے تھے، ایسی ہی دیگر بہت نظمیں قرول باغ کی سڑکوں پر چہل پھر کر کہی جاتی رہیں۔ ایک بار احسان صاحب اکیلے رائے سینا تشریف لے گئے شاید بیس منٹ میں واپس آ گئے میری اہلیہ سے کہا آپا چائے بناؤ۔ مجھ سے پنسل اور کاغذ لیا چائے آنے سے پہلے قلم برداشتہ "عشق اور مجبوری کے دوراہے پر ایک حادثہ" نظم کہہ چکے تھے، لفافہ لیا اور عالمگیر لاہور کو پوسٹ کر دی۔ یہ نظم دس منٹ سے پہلے کہہ چکے تھے۔ ایسی ہی بہت سی نظموں کا خمیر میرے سامنے اٹھتا رہا ہے۔

احسان صاحب قرول باغ دہلی میں اکثر مجھے بنوٹ سکھاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے انھیں خود بھی اس فن سے بیحد دلچسپی تھی، ایک دن مجھ سے کہا چل آج ایک آدمی سے تجھے ملوا رہا ہوں مجھے ساتھ لے کر پل بنگش کے ایک محلہ میں پہنچے، ایک بیٹھک میں چند صاحبان ان کا انتظار کر رہے تھے، چائے اور شعر و شاعری کے بعد محفل برخواست ہوئی، ان حضرات میں سے ایک صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرمایا، اسے آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔

یہ صاحب بنوٹ کے استاد تھے۔ دبلے پتلے، نازک اندام، خطاط، شاعر اور فن سپہگری میں یکتائے روزگار احسان صاحب کی لاہور واپسی کے بعد میں نے ان کی خدمت میں جانا شروع کر دیا۔ دو روز کے بعد انھیں قرول باغ لے آیا۔ مرشدی و مولائی جناب حضرت احسان دانش کے کمرے کی طرح مکان کے دوسرے کونے میں ایک کمرہ سید مصطفےٰ علی اخضر کے لئے لاٹھیوں، تلواروں، تیروں، چاقوؤں اور چھریوں سے آراستہ کر دیا۔ اگرچہ ان سے پہلے میں کئی استادوں سے فن بنوٹ حاصل کر چکا تھا مجھے شاگرد بنانے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ دہلی میں بہت سے میرے شاگرد بھی تھے مگر اخضر صاحب سے مل کر معلوم ہوا کہ میں اس فن میں قطعی کورا ہوں۔ نو سال تک ان کی خدمت میں رہ کر حصولِ فن کی سعادت مجھے حاصل ہے۔

مشاعروں کے سلسلے میں ہندوستان کے کونے کونے سے احسان صاحب کو دعوت نامے وصول ہوتے رہتے تھے وہ جب بھی ان مشاعروں سے لوٹتے تو آتے ہی جہاں وہ اپنی کوئی تازہ نظم یا غزل اپنے احباب کو سناتے وہاں وہ کوئی نہ کوئی تازہ تازہ نبیشیں ضرب بھی ہم لوگوں پہ آزماتے اور بھرپور تنقید و تبصرہ اور عملی طور پر انھیں جانچا جاتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ہندوستان میں کہاں کہاں اس فن کے جاننے والے ہیں اور کس کس کو کس قدر دستگاہ حاصل ہے اور کس کس طرح لوگوں نے اس فن کی صورت مسخ کر دی ہے۔

احسان صاحب کو بچپن ہی سے ایسے فنون سے قلبی لگاؤ تھا۔ مگدر تو یہ ہمیشہ ہی لگایا کرتے تھے مگدر کے ہاتھ انھیں بہت یاد تھے اور مہارت تامہ بھی حاصل تھی۔ کشتی کے داؤ پیچ نہایت خوبی سے ادا کر جاتے تھے اب بنوٹ کا شوق غالب آگیا۔ مشاعروں سے بچا ہوا وقت بنوٹ کی تحصیل میں صرف کرتے۔ بانک کی مشق اس دھن اور لگن اور مداومت سے کرتے تھے میری عمر میں اتنی باقاعدگی سے مشق کرنے والا کوئی شخص نہیں ملا۔ مشق کی باقاعدگی اور زیادتی کی وجہ سے ان کی کلائیاں نیلی ہوگئیں۔ کلائیوں پر روئی گدیاں بنوائی۔ چھری کی مشق معیار بھی یہی ہے

علامہ کبیر الدین صاحب حیدر آباد میں نظام دکن کی خواہش پر یونانی طب کی احیاء کے لیے مامور تھے ان کی تجویز تھی کہ اختر صاحب اور میں طب پڑھ کر طبیب ہو جائیں اور ان کے ساتھ حیدر آباد چلیں۔ اس پروگرام کے تحت حکیم صاحب نے مجھے اور اختر صاحب کو طب پڑھانی شروع کر دی احسان صاحب بھی ہم سبق ہوگئے۔ محفل شعر و سخن برخواست ہو رہی تو مشق سیف و سناں جاری ہے۔ ابھی دم بھی نہیں لینے پائے تھے کہ علامہ کبیر الدین صاحب کے سامنے دوزانو بیٹھے ہیں، ہر شاگرد ایک دوسرے کا اُستاد اور ہر اُستاد پہلے کا شاگرد۔

بنوٹ کے مظاہرے مقامی طور پر مہینہ میں دو چار اور ہندوستان گیر سال میں دو تین ضرور منعقد ہوئے ان مظاہروں میں شرکت کے لیے احسان صاحب جہاں کہیں بھی ہوتے ضرور دہلی پہنچ جاتے ان مظاہروں کا اہتمام کتبہ جامعہ ملیہ کے ڈائریکٹر حامد علی خاں صاحب فرماتے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ ملیہ میں اس فن کی تدریس کے لئے ہدایات جاری فرمائیں ڈاکٹر صاحب اکثر اپنے غیر ملکی مہمانوں کو اکھاڑے سے قرولباغ بنوٹ کا مظاہرہ دکھانے کے لئے لے کر آتے مظاہرے کے دوران مہمانوں کو اس قدیم فن جنگ کی خوبیوں سے آگاہ فرماتے۔

دون اسکول ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد اسکول ہے تقسیم سے پہلے ہندوستان کے نوابین، راجا مہاراجوں اور روسا کے بچوں کے لئے مختص تھا۔ اس سکول کے اساتذہ اور پرنسپل احسان صاحب کو احسان دانش کے نام سے تو جانتے ہی تھے، حامد بلگرامی کو کسی طور یہ معلوم ہوگیا کہ احسان دانش فن سپہگری میں بھی شاعری فرماتے ہیں۔ پرنسپل نے بلگرامی صاحب کے توسل سے احسان صاحب کو بنوٹ کے مظاہرے کی دعوت دے دی۔ احسان صاحب نے منظور فرمائی۔ اختر صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ احسان صاحب کی قیادت میں دہرہ دون روانہ ہو گئے۔ دون اسکول نے ملٹری اکیڈیمی کے فوجی افسران کو بھی اس مظاہرے میں مدعو کیا۔ دون اسکول کا اسٹیڈیم طلبہ اساتذہ اور اسکول کے مدعوین سے کھچا کھچ بھر گیا۔ مظاہرے میں حصہ لینے والوں کے لئے فسٹ ایڈ کا معقول انتظام تھا۔ ڈاکٹر سائے کی طرح ساتھ ساتھ تھے۔ یکایک ایک مسعود کن گجر نے مظاہرین کو ناظرین کا مرکز نگاہ بنا دیا۔ فوجی افسران ہم لوگوں کی ایک ایک حرکت قلم بند کر رہے تھے کبھی کبھی کسی داؤ پیچ کو مکرر دکھانے کی فرمائش بھی کرتے۔ ان افسران نے دہرہ دون کے کسی فوجی سنٹر میں مظاہرہ دکھانے کی دعوت بھی دی۔ احسان صاحب نے کسی خاص مصلحت کے تحت منظور نہیں کی۔

احسان صاحب کا خیال تھا کہ ملک تقسیم ہوگا اور پاکستان ضرور بنے گا، لاہور اس کا صدر مقام ہوگا نیز بنوٹ کے لیے پنجاب کا علاقہ سازگار ہے۔ وہاں کے لوگوں کو ایسے فنون سے بھی لگاؤ ہے۔ پہلوانی کا ذوق وہاں کی گھٹی میں ہے یہ فن پنجاب ہی میں پنپ سکتا

ہے۔ یقیناً اسے وہاں فروغ حاصل ہوگا۔ سپہ گری مسلمانوں کا ورثہ ہے ہر نوجوان پہ لازم ہے فن بنوٹ حاصل کرے۔ اور تم پہ فرض ہے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دو ان کی اس خواہش میں تحریک کی روح کارفرما تھی میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو کھڑے کھڑے سلام کیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۲ء کو حضرت احسان دانش کی بارگاہ میں حاضر ہو گیا۔ پھر وہی لاہور کے شب و روز اور احسان صاحب کا بالاخانہ۔

اسٹیشن سے مزنگ پہنچتے ہی توقیر طاہر چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی غائبانہ نیازمندی کی سعادت اس قدر حاصل تھی اُسے پہلی ملاقات نہیں کہا جا سکتا۔ میں ان کو احسان صاحب ہی کی طرح جانتا تھا۔ چونکہ احسان صاحب کی بہت سی نظموں، کتابوں کے دیباچوں میں ہم ان سے بغل گیر ہوتے رہتے تھے۔ دہلی میں قیام کے دوران توقیر صاحب سے ان کی خط و کتابت، دہلی سے کہیں دوسری جگہ جانے کے لئے ایک طرح کی اجازت طلبی اور واپسی پر اپنی آمد کی اطلاع احسان صاحب کے شاید فرائض میں شامل تھا۔ شعر کہنے کے سوا کوئی نافرمانی توقیر صاحب کی وہ کر ہی نہیں سکتے تھے احسان صاحب کے دوست احباب اور شاگردوں پر ان کا اتباع لازم تھا۔ مزنگ میں چوک صفانوالہ کے قریب پنجاب کول کمپنی کے نام سے توقیر صاحب کی فرم تھی۔ اس پر ان کے بڑے بھائی چودھری محمد حنیف صاحب بیٹھتے تھے۔ احسان صاحب کی ڈاک، مکتبہ دانش کا حساب کتاب، مشاعروں کے دعوت نامے ان کی کتابوں کے آرڈر، منی آرڈر وغیرہ کی وصولی اور ترسیل بڑی خندہ پیشانی سے انجام دیتے تھے۔ احسان صاحب کی ذات سے ان کا لگاؤ اور وارفتگی کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ احسان صاحب کی پنجاب کول میں آمد و رفت، نشست و برخواست سے لوگوں کو کاروباری شرکت کا گمان ہوتا تھا۔ توقیر صاحب کی خدمت میں کورنش بجالانے کے بعد موچی دروازہ میں جناب منیر چغتائی صاحب کے دولت کدہ پر حاضری دی اس روز بسنت تھی، خلا میں پتنگوں کے کئی آسمان بنے ہوئے تھے (یو۔پی میں پتنگ بازی کو بسنت سے کوئی نسبت نہیں) ہر چھت رقص گاہ، جوابی بھنگڑے۔ منڈیروں پہ لڈی ڈالنے والوں کے کرتب، حدِ نظر تک کوٹھوں کی چھتیں بازی گاہ بنی ہوئی تھیں۔ آوازوں سے آوازیں گتھم گتھا، ایک نعرہ بلند ہوا سو للکار اس پر پل پڑی۔ منیر چغتائی صاحب اور ان کے برادران خورد و بزرگ احسان صاحب کو دیکھتے ہی مسرتوں سے آسمان پر اُڑنے لگے۔ میں یہ مسرتوں سے بھرپور لمحات کبھی نہیں بھولا چغتائی صاحب نہایت خوش خلق، خوش رو، خوش گل اور شیریں گفتار نوجوان تھے۔ تہذیب و شائستگی کا مرقع، سراپا سے اگر ملاقات کا حادثہ رونما ہو جاتا ہے۔ میری یادوں کے افق پہ بسنت کے خوش کُن لمحوں میں پیچ پڑ جاتے ہیں۔

مزنگ واپس آئے تو یاروں کی محفل آراستہ تھی توقیر طاہر صاحب گنگو ہی، راج بلدیو راج سرو پرکاش داعن، یوسف ظفر بقا نقوی، اکرم شامی، شہرت بخاری، مظفر احسانی اور بیسیوں خوش وضع و خوش اطوار نوخیز و نوعمر احباب سے دانشکدہ آئینہ خانہ بنا ہوا تھا۔ میرا تعارف ان حضرات سے فنِ سپہ گری کے واسطہ سے اس طرح کرایا جیسے میں سکندر اعظم کی فوجوں کا سپہ سالار ہوں ہندوستان ہی میں کہیں رہ گیا تھا اب احسان صاحب نے کسی کوہ کی غار سے نکالا ہے۔ شام ہوتے ہی یہ قافلہ عبدالمجید شاری کی کوٹھی پر جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ کوٹھی پہ پہنچ کر شاری صاحب والد بزرگ محترم فتح شیر خاں صاحب کے حضور بلوچ ہونے کے واسطے سے میرا تعارف کرایا۔ وہ لمحے میری زندگی کے یادگار ہیں حبیب خاں صاحب نے اپنے سینے سے لگایا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا، پانچ سو سال بعد مل رہے ہیں۔

دیکھتے دیکھتے نوجوان شعرا حضرت حفیظ ہوشیارپوری، ناصر کاظمی، شہرت بخاری، ساحر لدھیانوی، ایوب رومانی، رفتی ترمذی محمد خان مستانہ، یوسف ظفر اور بہت سے شعرائے کرام اور سامعین سے یہ محفل سج گئی۔ یہ مشاعرہ سالہا سال فتح شیر روڈ پر جناب مجید نشاری مرحوم کے زیر اہتمام جاری رہا۔

احسان صاحب کو مصوری سے میرے لگاؤ کا علم تھا۔ تعارف اور احباب سے ملاقاتوں کے بعد مجھے ایک دن متحدہ ہندوستان کے مشہور و معروف آرٹسٹ سرفراز صاحب کے اسٹوڈیو لے گئے اور ان کا شاگرد کرا دیا۔ اصلاح کے لیے شام کا وقت طے پایا، فارورڈ اسٹوڈیو میکلوڈ روڈ اصلاح کے لیے جا رہا ہوں۔ حضرت احسان دانش بھی قدم سے قدم ملائے میرے ساتھ ہیں۔ راستے میں ایسے ایسے لوگوں کے حالاتِ زندگی سنا سنا کر میرے شوق کو شعلہ بداماں بنا دیتے جنہوں نے ناسازگار حالات میں ایسے کارنامے انجام دیئے جو لوحِ جہاں پر محفوظ ہیں، احسان صاحب کا استقبال فارورڈ اسٹوڈیو میں بڑی شان و شوکت سے ہوتا۔ اور سرفراز صاحب ایک "قافلہ" کی شکل میں میکلوڈ روڈ کے کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے، چائے کے ساتھ ہی مسٹر مائیکل بھی پہنچ جاتے۔ مسٹر مائیکل درویش صفت لوگوں میں سے تھے اگر وہ آرٹسٹ نہ ہوتے تو مجذوب ضرور ہوتے آرٹ کے ہر شعبہ میں خداداد صلاحیتیں حاصل تھیں۔ مائیکل صاحب سرفراز صاحب کو دیکھتے ہی بپھر جاتے، شاہ کہہ کر مخاطب ہوتے، اور فرماتے میں تمہیں اس وجہ سے تمہاری عزت کرتا ہوں آرٹسٹ تو میں تمہیں سمجھتا ہی نہیں۔ مجھ سے پنسل اور ڈرائینگ پیپر لے کر مرغی، انڈے بنانے شروع کر دیتے۔ ٹوٹتے پھوٹتے انڈوں سے بچے نکلتے تازہ تازہ بچوں کو گرتے پڑتے، چوزوں کی چھینا جھپٹی دیسی پختہ کاری سے ڈرا (DRAW) کرتے، دیکھنے والے مبہوت رہ جاتے۔ اردگرد مجمع لگ جاتا۔ لوگوں کو محظوظ کرنے کے لیے پنسل کو دو انگلیوں میں دبا کر کہتے، دیکھ میرے ہاتھ میں پنسل ربڑ کی طرح ہو جاتی ہے اور اس طرح حرکت دیتے واقعی پنسل ربڑ کی طرح لچکنے لگتی۔ یہ معجز نمائی سرفراز صاحب کو اپنی استادی کا لوہا منوانے کے لیے کرتے، شاہ صاحب جگہ جگہ سے انھیں پکڑتے وہ پھسلائے ڈٹے رہتے جب ہم لوگ گھر لوٹتے احسان صاحب گھر میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر کھڑے ہو کر اعلان فرماتے، دیکھ دو دن بالکل شام تک ہم تم کوئی گفتگو نہیں کریں گے جو بات ہو اشاروں کنایوں میں ہوگی۔ بحمد اللہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہوتی، البتہ ہنسی پر ان کو قابو ہوتا اور نہ ہی میں ضبط کر سکتا تھا۔ معاہدے کی مدت ختم ہونے تک ہم ہنستے ہی رہتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک صاحب چغہ پہنے داڑھی اور سر کے بال بڑھائے وارد ہوئے کچی پکی اردو میں فرمایا میں احسان دانش سے ملنا چاہتا ہوں احسان صاحب نے کہا خیریت ہے، بولے میرا نام سلطان ہے میں آرٹسٹ ہوں، بنگال کا رہنے والا ہوں۔ گھر سے ایسے ہی نکل کھڑا ہوا۔ ریل میں ایک مسافر نے دریافت کیا کہاں جا رہے ہو۔ میں نے کہا۔ کوئی منزل نہیں ٹکٹ تو لاہور کا ہے اس نے پوچھا کسی کو لاہور میں جانتے ہو میں نے انکار کیا اس نے آپ کا نام لیا بستر اسٹیشن پر ہے جو پیسے دے کر لایا جا سکتا ہے۔ احسان صاحب نے کچھ پیسے مجھے دیئے میں ان کے ساتھ گیا اور اسٹیشن سے سامان لا کر مکتبہ دانش میں لا کر رکھ دیا۔ سلطان نے برش اور پنسل سنبھال میں نے لالٹین تھامی اور مزنگ کی گلیوں میں اسکیچ کرنے شروع کر دیئے، عموماً رات کو مزنگ کی تیرہ و تار گلیوں میں کھڑکیوں، جنگلوں سے چھنتی ہوئی روشنیوں اور ہیئت بدلے سایوں، گلیوں میں کھڑے ہوئے تانگوں، تھکے ہوئے گھوڑوں کو پینٹ کرنا شروع کر دیا۔ حضرت احسان دانش ان شہ پاروں کو مکتبہ دانش میں

آویزاں کرکے ایسے دوستوں کو بلاتے جو پینٹنگ خرید کرنے کی سکت رکھتے تھے سلطان ان پیسوں سے کاغذ اور رنگ وغیرہ لے آتے، پہننے کے لئے تو چغہ تھا۔ کھانے کے لئے احسان صاحب کے رزق میں ان کا حصہ قسام ازل نے پہلے ہی لکھ دیا تھا۔

ایک دن اتفاقاً حبیب اللہ خاں سعدی آ گئے احسان صاحب نے سلطان کو ان کے حوالے کر دیا وہ سالہا سال جالندھر میں رہے وہاں کام کرنے کے بعد لاہور اور کراچی میں انہوں نے بہت سی نمائشیں کیں۔ کراچی اور لاہور کچھ دن کے لئے آتے اور جدھر منہ اٹھتا چل دیتے امریکہ بھی گئے قیام پاکستان تک تو نظر آئے پھر نام بھی سننے میں نہیں آیا نہ جانے پاکستان کے کون سے حصہ پر قربان ہو گئے۔ یا زندہ ہیں۔

فن سپہ گری کے احیا کے لئے احسان صاحب کی سعی قابل ستائش ہیں۔ چالیس سالہ جدوجہد ضبط تحریر میں نہیں لائی جا سکتی شاعری کے بعد اس فن شریف کا ذکر والہانہ انداز میں ہر وقت ہر محفل میں اس طرح کرتے جیسے وہ اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ مزنگ کے علاقہ میں ایسی روح پھونکی پہلوان اور اسی قسم کے فنون سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ملنے ملانے اور بنوٹ کا مظاہرہ دیکھنے کے لئے آنے جانے لگے ان آنے والوں کو عملی طور پر بھی کچھ نہ کچھ دکھانے کے لیے احسان صاحب نے بانک (چھری) کی مشق شروع کر دی احسان صاحب کلائیاں مشق کی شدت اور مداومت سے نیلی ہو ہو گئیں مگر مشق میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۱۹۴۴ء میں قائداعظمؒ کو بنوٹ کا مظاہرہ دکھانے کے لئے جب ہمیں دہلی سے بلاوا آیا احسان صاحب نے پینترے کی اس قدر مشق کی کہ ان کے تلوں کی کھال تک اڑ گئی۔ احسان صاحب اس مظاہرے میں نہیں جا سکے۔ یہ مظاہرہ میری زندگی اور بنوٹ کی تاریخ میں یادگار کہا جا سکتا ہے ڈپٹی کمشنر دہلی نے اس مظاہرے کی اجازت نہیں دی تھی مگر ڈاکٹر عبدالغنی قریشی نے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے تقریباً سات سو زعما کو چائے پر مدعو کیا اور یہ مظاہرہ دکھایا تقریباً دو گھنٹے یہ مظاہرہ جاری رہا۔ قائداعظم بیحد متاثر ہوئے اور نیشنل گارڈ کو اس فن کی تربیت کیلئے حکم دیا۔ اس زمانے کے نیشنل گارڈ کے سالار اور میرے استاد اختر پریوی کی کسی حیثیت کی وجہ سے قائداعظمؒ کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکی۔

لاہور میں احسان صاحب نے اسلامیہ کالج میں بنوٹ کا دیگر فزیکل شعبوں کی طرح شعبہ قائم کرنے کے لیے مولانا عبدالمجید سالک صاحب، دل محمد صاحب اور دیگر استادوں کے ساتھ مذاکرات شروع کئے اور ان سب کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اس وقت پرنسپل عمر حیات خاں صاحب تھے۔ پرنسپل صاحب کو ان حضرات نے مظاہرہ دیکھنے کے لیے نہ جانے کس طرح آمادہ کر لیا۔ احسان صاحب نے دہلی سے میرے ایک استاد بھائی کو بلوایا آمد و رفت کے اخراجات خود برداشت کئے۔

پرنسپل صاحب نے اس مظاہرے کے لیے کالج کے تمام طلبہ کو شرکت کا حکم دیا اور اپنے احباب اور شہر کے کچھ معززین کو بھی مدعو کیا۔ پرنسپل صاحب نے مظاہرہ کے اعلان کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ میرے آدمی حملہ کریں گے۔ سالک صاحب، احسان صاحب، دل محمد صاحب نے پرنسپل صاحب کو لاکھ سمجھایا کہ اس فن کا عملی مظاہرہ ناممکن ہے۔ یہ فن صرف دشمن کے لئے ہے۔ یہ کھیل نہیں ہے۔ حملہ آور دشمن نہیں بن سکے گا۔ یا ہم اسے دشمن نہیں سمجھیں گے لہذا آپ مظاہرہ دیکھیں اور فیصلہ کریں۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ بالآخر احسان صاحب نے یہ ناقابل قبول شرط مان لی۔ پرنسپل صاحب کے منتخبہ تین لڑکوں نے یکے بعد دیگرے مجھ پر حملہ کیا۔ ہزار کوشش کے باوجود ناکام رہے۔ دو لڑکوں کو ضربیں بھی آئیں اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ تیسرا لڑکا مجمع سے باہر آیا اور پچیس تیس گز کے فاصلہ پر ٹھہر کر ہوا میں دو چار لاٹھیاں مار کر بھاگ نکلا۔ میں نے کام شروع کیا افسوس میرا استاد بھائی پہلے ہی سانس میں زخمی ہوا۔ احسان صاحب میدان میں آئے

وہ اپنی ہی لاٹھی سے میری لاٹھی روکتے ہوئے زخمی ہوگئے۔ ان کی پیشانی پر ہلکی ضرب آئی۔ اب سامنے کوئی نہ تھا۔ لامحالہ مظاہرہ بند کرنا پڑا۔ مگر ناظرین اس فن کی اہمیت تسلیم کر چکے تھے۔

اب احسان صاحب نے پرنسپل صاحب کو کالج میں رائج کرنے کے لئے فرمایا۔

پرنسپل صاحب نے فرمایا ہمیں انجمن ترقی اُردو دو سو روپیہ سالانہ 'گدکے' کے لئے دیتی ہے۔ یہ دو سو روپیہ آپ کو ہم دیئے دیتے ہیں کئی روز کی گفت و شنید کے بعد استادوں اور طلبہ سے میں نے کہا کہ اگر کالج اس فن کو اپنے جمناسٹک جتنا بھی درجہ دے دے تو میں عمر بھر بلا معاوضہ کالج کے لڑکوں کو سکھاؤں گا۔ اور ہر چھ ماہ کے بعد اپنے جیسے طلبہ کالج کو دے دوں گا۔

احسان صاحب نے اسے فن کی تحقیر اور عدم دلچسپی سمجھتے ہوئے معذرت چاہی اور اسی طرح بہت سے دیگر مقامات پر مظاہرے ہوئے مگر لوگوں کی ذہنی ناداری کے باعث یہ فن پنپ نہ سکا۔

اب غالباً فن بنوٹ ختم ہو جائے گا۔ اب نہ وہ داد دینے والا رہا اور ان کے حکم پر ناچنے والا بوڑھا ہو گیا۔

تنہائی

مجنوں گورکھپوری

شاہدہ کے جانے کے بعد ساری رات میں جگتی رہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایسی دنیا میں ہوں جو اس دنیا سے بہت دُور بہت مختلف اور لامحدود نئی کیفیتوں سے معمور ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا جسمانی وجود تو باقی ہے لیکن نجانے کتنے تنزیہی مدارج سے گذر کر اور تمام ارضی کثافتوں اور ظلمتوں کا کوتاہیوں سے پاک ہو کر روح سے بھی زیادہ لطیف اور نازک ہو گیا ہے۔ اس دنیا کا جوہر اصلی خالص جذبہ الفت تھا اور اس کے سب سے بڑے نمائندے، شاہدہ، پرویز اور کشور تھے۔

شاہدہ نے میرے حواس کو ایک نئی جلا دے دی تھی اور میرے اندر نئی بصیرتیں اور نئی آگاہیاں پیدا کر دی تھیں۔

میں اس سے پہلے کبھی کہہ چکی ہوں کہ پرویز کو جیسا میں نے جانا ویسا کسی دوسرے نے شکل ہی سے جانا ہوگا، اور پرویز نے اصلی اور ساری ہستی کو جس طرح میرے سامنے بے نقاب کیا کسی دوسرے کے سامنے نہیں کیا۔ میں اپنے الفاظ کو واپس لینا تو نہیں چاہتی لیکن ایک حقیقت کا اعتراف کرنا ہی ہے۔ شاہدہ نے یقیناً پرویز کو مجھ سے بہتر جانا اور پہچانا تھا۔ وہ اس کی ہستی کی تمام گہرائیوں سے اچھی طرح واقف اور مانوس تھی اور یہ وہ معرفت تھی جو صرف سچی اور بے لوث محبت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس احساس نے خود میری ہستی کو بدل کر رکھ دیا تھا، اب میں اپنے اندر رشک و رقابت کا ہلکے سے ہلکا کوئی شائبہ نہیں پا رہی تھی۔ اس وقت ہجر و وصل کے تمام عارضی اعتبارات اور امتیازات میری دُنیا سے مفقود تھے۔ جیسے مجھے یہ اطمینان ہو گیا ہو کہ پرویز ہمیشہ کے لیے مجھے مل گیا ہے۔ مجھ پر اب صرف ایک جذبہ چھایا ہوا تھا اور وہ یہ کہ پرویز زندہ رہے اور اچھی طرح اور بھرپور زندہ رہے۔ اسکو میں "جمال ہمنشیں" ہی سے تعبیر کر سکتی ہوں۔ شاہدہ کی صحبت میرے لیے ایک نئی بشارت ایک غیر متوقع سعادت تھی۔

دوسرے روز بڑے سویرے میں سیدھے پرویز کے پاس پہنچی بستی میں پرویز کا مکان یوں تو بہت پرانا تھا اور ویسا تھا جس کو غدر سے پہلے حویلی کہتے تھے لیکن اس کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس میں پرویز نے اپنے ذوق اور نئے زمانے کے میلان و معیار کے مطابق نمایاں تبدیلیاں نہ کرائی ہوں۔ ساری بستی میں "ایوان" تعیش قرینہ، آرام و آسائش اور کشادگی کے لیے مشہور تھا۔ "ایوان" کی ساخت اور اس کے مختلف حصوں کی تقسیم ایسی تھی کہ بورژوا معاشرت اس میں آرام اور فراغت کے ساتھ رہ سکتا تھا، اگرچہ اس وقت بہت کم لوگ اس میں رہتے تھے اور رکھنے کے لیے سارا مکان جو پورا قلعہ تھا پرویز کے قبضہ میں تھا۔ مگر پرویز دراصل پچھم کے اس حصہ میں رہتا تھا جس میں ایک بڑا کمرہ و اوسط درجہ کے کمرے۔ ایک لمبی دالان ایک کافی وسیع باہری احاطہ۔ ایک غسلخانہ، ایک باورچی خانہ اور دو نوکروں کی کوٹھڑیاں تھیں۔ مکان کے اور حصوں کی طرح یہ حصہ بھی ایسا تھا کہ جب جی چاہے اور حصوں سے دروازے کھول کر ملا دیا جائے اور جب جی چاہے دروازے بند کر دیئے جائیں اور کسی دوسرے حصے سے کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ بڑے کمرے میں جو پچھم کی طرف الگ احاطہ کے رخ تھا پرویز کا کتب خانہ تھا اور دراصل یہی کمرا اس کی نشستگاہ تھی۔ جب سے وہ بیمار پڑا تھا وہ بغل کی خوابگاہ چھوڑ کر اسی کمرے میں سونے بھی لگا تھا۔

لے مجنوں صاحب کے ناولٹ کی پہلے بھی نقوش میں قسطیں چھپی ہیں۔ یہ نئی قسط ہے۔ اللہ کرے یہ ناولٹ مکمل ہو سکے۔ (ادارہ)

مجھے پرویز سے ملنے اندر جانے کے لیے کسی قسم کی اجازت یا اطلاع کی ضرورت نہیں تھی، سب اس کو ایک اقلیدسی مفروضہ کے طور پر مان چکے تھے، کہ میں پرویز کی زندگی میں ناگزیر طور پر دخیل ہو چکی ہوں ــــ اور میرے آنے جانے پر کوئی بھی (پرویز کی بیوی بھی) اب علانیہ کسی قسم کی حیرت یا ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے امیر خان سے پوچھا کہ پرویز سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ امیر خاں پرویز کو بچپن سے کھلائے ہوئے تھا۔ اس کی عمر شاید اٹھاون سال کی تھی اور وہ زیادہ تر پرویز کی دیکھ بھال کے لیے رہتا تھا۔ جب جب وہ پردیس میں رہا، امیر خاں کو اس کی نگرانی اور آرام و آسائش کے لیے برابر اس کے ساتھ بھیجا گیا ــــ ہندوستان کا کونسا ایسا مقام تھا جہاں وہ اس کے ساتھ نہ ہو آیا ہو ــــ وہ اس کو ہر جگہ اور ہر حال میں دیکھ چکا تھا اور اس کے مزاج کا صحیح معنوں میں راز دار تھا۔ وہ اس کے بشرے سے اس کے جذبات و خیالات کا بڑی گہری تہوں کا پتہ لگا لیتا تھا ــــ میرے سوال پر امیر خاں نے کہا "وہ سوتے کب ہیں؟" اور اب تو روز بروز ان کی نیند اور بھی حرام ہوئی جا رہی ہے اور جب سے اس بیماری کا سلسلہ شروع ہوا ہے وہ اور بھی سونے سے محروم ہو گئے ہیں، میں بغل کے کمرے میں سوتا ہوں اور ساری رات ان کی کروٹیں لینے کی آہٹیں اور کراہیں سنا کرتا ہوں اور دم بخود رہتا ہوں۔ سرکار میں کچھ اور نہیں چاہتا، ان کی جان کی خیر منایا کرتا ہوں۔ میں یہ برداشت نہ کر سکوں گا کہ اپنی زندگی میں ان کا داغ دیکھنا پڑے۔ وہ دنیا سے نرالے آدمی ہیں۔ خود ان کے اپنوں نے ان کے اس راز کو نہیں سمجھا۔ ان کی شادی نہیں ہونا چاہیئے تھی اور اگر ہوتی بھی تو کہیں اور اتنا جلد نہیں ..... وہ کل شام ہی سے آپ کے آج صبح آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھ سے کئی بار رات ہی میں تاکید کر چکے ہیں کہ جیسے آپ آئیں میں ان کو اطلاع دوں اور آپ کو ان کے کمرے میں پہنچا دوں ــــ میں ابھی ان کو اطلاع کئے دیتا ہوں ....."

"نہیں نہیں!" میں نے امیر جان کو روکتے ہوئے کہا "پس پیچے سے یہ معلوم کر لو کہ وہ غسل خانہ سے باہر نکلے یا نہیں ــــ" اتنے میں بڑی پُرجم اور پُرتحکم لہجہ میں آواز آئی "امیر جان! ڈاکٹر کشور آ گئیں یا نہیں؟ اگر آ گئی ہوں تو فوراً بلا لاؤ"

میں نے امیر خاں کو پیچھے روک دیا۔ اور لپک کر پرویز کے کمرے میں پہنچی۔ وہ تولیہ سے اپنے ہاتھ منہ پونچھ رہا تھا میں نے کہا۔ پرویز کیا میں وقت سے پہلے پہنچ گئی ہوں؟"

اُس نے تیوریاں چڑھا کر کہا "تم وقت سے پہلے کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ تم نے صبح سورج نکلتے نکلتے آنے کا وعدہ کیا تھا اور میں تین بجے رات سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں ــــ"

میں نے کہا "پرویز ہر وقت ایک اندرونی گھٹی ہوئی کڑھن کے ساتھ باتیں کرنا تمہارے حق میں بہت مضر ہے۔ لاؤ پہلے تمہارا ٹمپریچر دیکھوں ....."

وقت بہت عزیز ہے۔ اس کو ضائع نہ کرو، مجھے ساری رات ٹمپریچر رہا اور کھانسی آتی رہی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کونسا مرض ہے لیکن میرا حشر کیا ہونے والا ہے؟ یہ میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ مجھے اس وقت بھی ٹمپریچر ہے۔ اگرچہ رات سے کم ہے۔ وہ چار روز سے آنتوں میں بھی مڑوڑ کے قسم کی تکلیف رہنے لگی ہے اور ہلکا ہلکا دست آ رہا ہے لیکن اس وقت کچھ پیار کی باتیں کرو اور میں کچھ اپنی زندگی کے بارے میں تم کو سمجھاؤں۔ ابھی شاید، شاہدہ اور ایوب آ جائیں تو موقع نہیں ملے گا۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ کل شام کو نہ وہ آئیں نہ ایوب۔ شاہدہ بیچاری بڑی آزمائش کی زندگی بسر کرتی رہی ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی خانگی زندگی کی تمام ذمہ داریوں کو بہترین طریقہ سے

انجام دینے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ دوسری طرف میں اس کی زندگی کی اذیت بنا ہوا ہوں۔ میری خیر منانے کی فکر میں دن رات اپنے کو ضائع کرتی رہتی ہے۔ مگر ان باتوں کو چھوڑو۔ آؤ اس وقت تم کو سر سے پاؤں تک جی بھر کر پیار کروں ..... مگر نہیں مجھے ٹائیفائڈ ہو یا کچھ اور، میں بہرحال بیمار ہوں۔ اور میری بیماری متعدی ہو سکتی ہے تم تو ڈاکٹر ہو۔ تم اس کو بہتر سمجھتی ہو۔ کل سے میں بڑی خلش میں ہوں۔ تم نے کل جی چھوڑ کر مجھے پیار کیا تھا اور دیر تک پیار کر کر کے روتی رہیں۔ تم نے یہاں سے جا کر کوئی DISINPECTANT استعمال کیا یا نہیں؟ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ زندگی کے مختلف پہلو ہیں۔ ہر پہلو کے جدا مطالبات ہیں۔ ان مختلف مطالبات میں ہم آہنگی اور توازن قائم کئے رہنا۔ زندگی کے فروغ اور صحیح نشوونما کے لیے ضروری ہے ورنہ زندگی سرتاسر سقیم ہے۔" اتنا کہہ کر وہ تکان محسوس کرنے لگا، اور لیٹ گیا۔

میں کرسی سے اٹھ کر اس کی چارپائی پر گئی اور اس کو سر سے پاؤں تک پیار سے ڈھکتے ہوئے کہا ہے "دیکھو اپنے اوپر کسی قسم کا زور نہ دو۔ نہ جسمانی نہ ذہنی۔ تم جو کچھ کہو گے میں آنکھ بند کر کے کروں گی۔ میں نے ابتک کوئی DISINPECTANT (مزبل جراثیم) نہیں استعمال کیا ہے۔ نہ اس کا مجھے خیال آیا اور نہ مجھے اس کا کوئی حوصلہ ہے۔ لیکن تم ٹھیک کہتے ہو تمھاری کوئی بات بھی تو آج تک غلط نہیں ہوئی، سوا جو فیتا والی بات کے (یہ کہہ کر میں مسکرائی) لیکن اس کو چھوڑو۔ تمھاری جھڑکی صحیح ہے۔ میں سب کو جو ہدایتیں دیتی ہوں ان کا خود مجھ کو خیال رکھنا چاہیئے۔ تھوڑے سے علم کے ساتھ بھی عمل کا ہونا ضروری ہے۔ مگر تم ڈاکٹری کے ایک اہم راز سے شاید واقف نہیں ہو۔ ڈاکٹر کو ہر قسم کے امراض سے روزانہ سابقہ پڑتا رہتا ہے اور وہ بہت جلد اپنے اندر ہر قسم کے امراض سے کافی حد تک اُنسیت IMMUNITY پیدا کر لیتا ہے لیکن تم کو امراض سے تو میں باقاعدہ DISINPECTANT استعمال کروں گی۔ بس اب تو تم کو کچھ کہنا نہیں ہے اس بارے میں؟"

پرویز نے مسکراتے ہوئے مجھے بھینچ لیا اور کہا "آخر کار پھر تمھیں جیتیں اور میں ہارا۔ دیکھو ناکشور، علم چاہے وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو اتنی بڑی طاقت ہے کہ تم نے مجھے شکست دے دی۔ اگرچہ علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ میں ان میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ دونوں ایک دوسرے کے مخلص غلام ہیں....."

"لیکن پرویز، تم تو اپنی زندگی کے بارے میں مجھے کچھ بتانے یا سمجھانے جا رہے تھے۔ یہ خطبہ کیسا شروع کر دیا؟" میں نے اس کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

پرویز نے مجھے جس طرح لپٹایا اس کی لذت کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ یہ لذت ابتک میری زندگی کی اصل کمائی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے احساس بھی نہیں رہا کہ میں کسی بیار سے لپٹی ہوئی ہوں۔ اور پھر اپنے خاص انداز میں مسکرا کر اُس نے کہا "کشور میں اپنی زندگی سے اس وقت سے بھاگتا رہا ہوں جب کہ میری شادی ہوئی۔ میں جب کبھی اپنی زندگی کا جائزہ لینا چاہتا ہوں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور میں خلق الٰہی اور کائناتی زندگی کی کھلی ہوئی ہوا میں بھاگ کر نکل آیا ہوں تاکہ ٹھیک سانس لے سکوں۔ میں اپنی گفتگو کے دوران میں جب جب بہکوں تو تم مجھے اسی طرح ٹوک دینا۔ شاید میں اس قابل ہو جاؤں کہ تم کو اپنے راز سے واقف کر سکوں۔"

پرویز نے جب اپنی اشتہا انگیز اور زندگی خیز گرفت سے مجھے رہا کیا تو میں اُس کو سر سے پاؤں تک چومنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ روح جسم کی محتاج ہے۔ پرویز نے بڑا خوبصورت اور نفیس بدن پایا تھا۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی میرا ایمان یہ ہے کہ

محبت لاکھ روحانی الاصل صحیح لیکن اس کی بقا کے لیے بدن اور بدن کے ہر حصے سے لذت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اس وقت پرویز ہی کا فقرہ یاد آ رہا تھا۔ "جسمانی بادشاہت" رُوح کا وطن ہے۔ اور "جسمانی بادشاہت" کی ترکیب میں پیشانی سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک ہر جزو بدن یکساں طور پر اہم اور ناگزیر ہے۔ رُوح یا خدا کی بادشاہت جسم یا گوشت و پوست کی بادشاہت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ جب میں جی بھر کر اس کو پیار کر چکی تو اُس نے کہا۔ "اچھا اب سنبھل کر بیٹھو تو میں اپنی رُوداد سنانے کی کوشش کروں۔"

میں سراپا گوش ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

پرویز کو مسکرانے اور ہنسنے کے علاوہ سب کچھ معلوم تھا۔ جب جب وہ میرے سامنے مسکرایا یا ہنسا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوا ہے، کہ وہ یا تو دوسروں پر طنز کر رہا ہے یا خود اپنے اُوپر ظلم۔ اُس نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا "کیوں کشور، کیا واقعی رجونتا کے معاملہ میں تم مجھ سے خفا ہو گئی تھیں؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کے لیے بھول گئی کہ پرویز بیمار ہے۔

"کہیں اس لیے تو نہیں کہ رجونتا نے بڑی پیاری صورت پائی ہے؟ وہ بڑی زاہد فریب لڑکی ہے۔ مجھے غصہ آ گیا لیکن ضبط کرتے ہوئے کہا۔ پرویز! تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اگر رجونتا اپنے وقت کی ہیلن یا کلوپیٹرا بھی ہوتی تو مجھے اپنے پرویز پر ناز اور اعتماد تھا۔"

پرویز نے پھر مجھے اس طرح لپٹایا گویا محبت کے خروش میں اپنا سب کچھ، یہاں تک کہ اپنی بیماری بھی مجھے دے دینا چاہتا ہے اور اس کو کچھ ہوش نہیں کہ وہ مجھے کیا دے رہا ہے اور مجھ سے کیا لے رہا ہے۔ لیکن میں اس کو کیا کہوں۔ میں خود بھی اس سے کم مدہوش نہیں تھی۔

پرویز نے میرے ہونٹوں کا بوسہ لیتے ہوئے مجھے چھوڑ کر کہا "شاباش کشور! اچھا اب میری زندگی کی داستان سنو جو دراصل کوئی داستان نہیں ہے..... مگر ایک بات تو سنو۔ اگر میں اس وقت تھوڑی سی شراب پی لوں تو کیسا رہے گا؟"

میں نے کہا تم کو معدہ اور آنتوں کی بھی تکلیف ہے اس لیے طبیب کی حیثیت سے میں تم کو اجازت نہیں دے سکتی۔"

"لیکن میرے ساتھ تمہاری یہی ایک حیثیت تو نہیں ہے۔" پرویز نے طنز کے ساتھ کہا۔

"ہاں لیکن دوسری حیثیت سے میں تم کو شراب کیا CYANIDES بھی پینے کی اجازت دے سکتی ہوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ تم جو کچھ پیو وہ مجھے بھی پلاؤ۔"

"واہ کشور!" اس نے مجھ کو پھر اپنی چارپائی پر بُلا کر لپٹاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب سنو" پرویز نے اپنے خیالات سمیٹتے ہوئے کہنا شروع کیا "تم کو اتنا تو معلوم ہی ہو گیا ہو گا کہ کم سے کم کرۂ ارضی پر مجھ سے زیادہ محبت کرنے والا جانور اب تک پیدا نہیں ہو سکا ہے....."

"ہاں پرویز۔ یہ تو میرا ایمان ہے" میں نے درمیان میں خلل ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب چپ چاپ سنو" پرویز نے مجھے روک کر کہا۔ "میں نے سب سے پہلے آسیہ کو چاہا جس کو اب میں بھابھی کہتا ہوں، تم ان سے مل چکی ہو نا؟"

میں نے کہا "ہاں، اور مجھے پہلے ہی دن اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ان کو چاہتے ہو یا نہ چاہتے ہو لیکن وہ تم کو واقعی چاہتی ہیں۔"

"تم بڑی ذہین ہو کشور!" پرویز نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "میری پہلی محبت کا مرکز آسیہ ہی تھی۔ میرے خاندان میں شاہدہ کے علاوہ وہی سب سے زیادہ پڑھی لکھی اور سوجھ بوجھ والی عورت ہے۔ اس نے بڑی نفیس اور پاکیزہ طبیعت پائی ہے۔ مجھے اُس کے ساتھ بچپن سے محبت تھی۔ میرے اندر جو شرافتیں تم محسوس کرو سمجھ لو کہ وہ سب آسیہ کی محبت اور صحبت کی دین ہیں۔ میں شادی کا کبھی قائل نہیں ہوں۔ میں شادی کو انسان کی بدویت PRIMISTIVENISS یا بربریت کی یادگار سمجھتا ہوں۔ ذرا سوچو تو عمر بھر کے لیے دو ہستیوں کا ایک دوسرے کا غلام ہو جانا کیسی وحشیانہ بات ہے! لیکن میرے دل میں خود اگر شادی کی آرزو پیدا ہوئی تو آسیہ کے ساتھ..... اور تم جانتی ہو میری یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ آسیہ کو مجھ سے زیادہ لائق آدمی کے ساتھ بیاہ دیا گیا..... اور پھر ابھی لڑکپن سے جوانی کی منزل میں قدم ہی رکھا تھا کہ میرا مقدر بھی باندھ دیا گیا۔ اب اگر میں شکایت کروں تو دنیا اُس کو میری زیادتی سمجھے گی۔ خورشید صورت شکل میں کسی سے بُری نہیں اور پھر بہ ظاہر بڑی معصوم اور بے ضرر ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم دونوں دو بالکل مختلف سطحوں پر ہیں۔ میں اس کی سطح کو سمجھ کر اس کے لیے درگذر کا ایک حاشیہ چھوڑے ہوئے ہوں۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ میری سطح کے لیے کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ اس کی بناء پر مجھ سے جلتی ہے۔ اس کو اس بات سے چڑ ہے کہ مجھے جھوٹ یا سچ یہ شہرت کیوں ملی۔ وہ مجھے حقیر اس لیے سمجھتی ہے کہ میں ادیب کیوں ہوں، بندگانِ خدا کا درد اپنے دل میں کیوں لیے ہوئے ہوں۔ لوگ میری اتنی قدر کیوں کرتے ہیں۔ وہ میرے ہر دوست سے نفرت کرتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ مرد ہے یا عورت سب کے سامنے وہ معصوم کی معصوم بنی رہتی ہے۔ وہ کوشش کر رہی ہے کہ میرے بچے کے اندر بھی میرے خلاف ابھی میلان پیدا کرے۔ میرا بچہ جس کو میں واقعی بہت چاہتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ ماں سے مانوس ہے۔ وہ مجھ سے گھبراتا ہے جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔ اور کشور میں نے خورشید کو آج تک کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ وہ خود میکے سے اپنے ساتھ بہت کچھ لائی ہے اور میری محتاج نہیں۔ لیکن میں نے بھی اپنی جائداد کا کافی حصہ اس کے لیے چھوڑ دیا ہے، اور اپنی ماہوار آمدنی کا بیشتر حصہ اس کو دے دیتا ہوں مگر اُس کو یہ شکایت ہے کہ میں نے زمینداری کا وہ جزو جو اپنے لیے الگ کر لیا تھا اس سے اجتماعی زراعت گاہ کیوں کھولی۔ اور کسانوں کے ساتھ مجھے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ غرضیکہ خورشید مجھے بدترین خلائق سمجھتی ہے۔ دنیا کے حقیر ترین انسان میں اس کو خوبیاں نظر آئیں گی۔ مجھ میں اس کو صرف بُرائیاں نظر آتی ہیں۔ میں نے آج تک اس کو کوئی دُکھ یا نقصان نہیں پہنچایا۔ لیکن اس نے مجھ کو سوا غم اور غصہ کے کچھ نہیں دیا۔ وہ خاندان میں بھی ہر اس شخص سے کدورت رکھتی ہے جس کو مجھ سے کوئی اُنس یا محبت ہے۔ وہ آسیہ سے چڑتی ہے۔ وہ شاہدہ کے ساتھ للہی بغض رکھتی ہے۔ لیکن یہ دونوں ثروت و مرتبہ کے اعتبار سے اس سے اس قدر برتر ہیں کہ اس کی ہمت نہیں پڑتی کہ کبھی اپنی تلخی کا اظہار ان کے منہ پر کر سکے..... دیکھا کشور میری زندگی کیا ہے! میں چار پانچ سال تک اپنی تمام تر توجہ اور قوت اس دھن میں صرف کرتا رہا کہ کسی طرح خورشید مجھ کو سمجھ لے۔ اور میری قدر کرے۔ میں نے اس کی بڑی دلجوئیاں کی ہیں کشور۔ لیکن میں اس کے دل میں کسی طرح اپنی جگہ پیدا نہ کر سکا۔ آخر کار تھک کر اس کی طرف سے وہ بے نیازی اختیار کر لی جو بے دلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کشوریوں تو میں "پیران پارسا" کے گروہ میں کبھی نہیں رہا۔ لیکن خورشید سے مایوس ہونے کے بعد شراب کی عارضی کشش زیادہ تواتر کے ساتھ محسوس کرتا رہا اور گاہے ماہے برابر شراب سے زندگی کے لیے وقتی تاب اپنے اندر پیدا کرتا رہا۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہو اور وہ شراب کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنا لے تو میں اس کو نہ صرف معاف کر دوں گا، بلکہ ہر لحاظ سے اس کو حق بجانب سمجھوں گا....."

پرویز تھک گیا۔ اس کا دم پھولنے لگا تھا۔ وہ خاموش ہو کر خلاء میں دیکھنے لگا۔ میں نگاہ جمائے ہوئے اُس کو دیکھتی رہی۔ جب وہ

پھر میری طرف متوجہ ہوا تو میں اُٹھ کر پھر اُس کی چارپائی پر گئی اور اس کو پیار کرتے ہوئے کہا "مگر پرویز تمھارے لیے تو یہ تصور زندگی کا بہت بڑا سہارا ہونا چاہیئے کہ ایک ہستی تم کو جی جان سے چاہتی ہے اور بالکل غیر مشروط طور پر اور شاید یک طرفہ چاہتی ہے اور جہاں تک میں اندازہ کر سکی ہوں، روزِ اوّل سے اب تک یکساں شدت کے ساتھ چاہتی رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اپنے جذبات کی شدت کا شدت کے ساتھ اظہار کرنا خود اپنے جذبات کے ناموس کے منافی سمجھا ہو....."

"تمھاری مراد شاہدہ سے ہے" پرویز نے بڑے تھکے ہوئے لہجہ میں میری بات کاٹ کر کہا "میں آسیہ کے بعد اگر کسی کی قدر کرتا ہوں اور کسی پر اعتماد رکھتا ہوں تو وہ شاہدہ ہے اور آسیہ اب اپنی زندگی میں کھو چکی ہے۔ میں کہوں گا کہ وہ ضائع ہو چکی ہے۔ اس کی تندرستی بھی اس کی نذر ہو چکی ہے۔ اس لیے تم سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو میری قدر کرنے والی اب صرف ایک شاہدہ ہے۔ لیکن کشور میں اب صرف اپنی قدر اور پرستش کرانا نہیں چاہتا۔ مجھے تو اب کسی ایسی ہستی کی تلاش ہے جو آزاد ہو اور اپنی آزادی کا میرے ساتھ سرفروشانہ بغاوت کے ساتھ زبانی اور عملی دونوں طرح سے اظہار کر سکتی ہو۔ اسی لیے میں تمھاری طرف جھکا..... مگر اتنی دیر ہو گئی۔ شاہدہ اب تک مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئی" یہ کہہ کر پرویز نے نوکر بلا کر پوچھا "بیگم ایوب نہیں آئیں؟"

"سرکار وہ تو بڑی دیر سے اندر آئی ہوئی بیٹھی ہیں۔ آپ کی والدہ کے پاس" پرویز نے عارفانہ تیور کے ساتھ کہا "ان کو بلا لاؤ" اور میں پانی پانی ہو گئی۔ میں سمجھ گئی کہ شاہدہ مجھے اور پرویز کو تنہا چھوڑے رہنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں کرائی۔ پرویز میرے بشرہ سے میرے احساسات کو سمجھ گیا اور مجھے جلدی سے لپٹا کر اور میرے گالوں کو چوم کر کہا "تم کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شاہدہ پر مجھ کو ترس آتا ہے لیکن تم اس کی خطاوار نہیں ہو۔ اور پھر وہ بڑی ہوشمند عورت ہے اور موقعوں کی نزاکتوں کو وہ خوب سمجھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اب میرے لیے جو تم ہو سکتی ہو وہ خود نہیں ہو سکتی۔ اور اس نے اس ناگزیر صورتِ حال کو تسلیم کر لیا ہے اور خوش ہے اور یہ صحیح ہے کشور، اب اگر میری زندگی میں کوئی عورت کچھ ہو سکتی ہے تو وہ تم ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم بھی آخر وقت تک ساتھ نہ دے سکو" یہ کہہ کر اس نے مجھے سر سے پاؤں تک بھرپور پیار کیا اور چھوڑ دیا، اور اس طرح تھک کر لیٹ گیا جیسے اُس کے سارے بدن کا ست نکل گیا ہو۔

شاہدہ مجھ سے اسی کشادہ دلی اور تپاک کا اظہار کرتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی اور پرویز کا حال دریافت کرنے میں کھو گئی۔ لیکن آج اس کے چہرہ اور اس کے انداز میں جو کیفیت محسوس ہوئی اس کا اس سے پہلے نہ تو مجھے کوئی تجربہ تھا اور نہ میں اس کا کبھی تصور کر سکتی تھی۔ میں اس کیفیت کو صرف سپید اور روشن افسردگی کے غیر مانوس محاورہ ہی سے ادا کر سکتی ہوں اور میں خود عجیب حالت میں گرفتار تھی جس کو کوئی کہنا چاہے تو رشک و رقابت کہہ لے۔ لیکن اصلیت یہ نہیں ہے۔ میں شاہدہ سے ہمیشہ خوش رہی اس لیے کہ وہ پرویز کو چاہتی تھی اور میں خود پرویز کو اپنا دیوتا مان کر اس کی پرستش کرنے لگی تھی۔ مگر پرویز کی محبت اور پرستش سے برطرف ہو کر مجھے شاہدہ کی تیز اور شگفتہ طبیعت پر ہمیشہ رشک آیا جس کو وہ ہر حال میں قائم رکھ سکتی تھی۔ وہ مجھ سے تعلیمی سند میں اور کچھ زیادہ صحبت یافتہ بھی نہیں تھی۔ کم تھی لیکن اگر وہ جاہل محض بھی ہوتی تو مجھ سے بالاتر انسان تھی۔ اور خدا کرے ابھی تک ہے۔ یہ بھی دل اور دماغ اور روح کی شرافت ہے کہ وہ مجھے اب تک اپنا رقیب اور زندگی کا ہم سمجھتی ہے۔ شاہدہ کو دیکھ کر اور اس کو جان کر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عورت ہو یا مرد فطری

معصومیت اور شرافت کو بڑی سے بڑی تعلیم اور وسیع سے وسیع تربیت کبھی نہیں پا سکتی۔ میرا آج تک ایمان ہے کہ آسیہ سے بچھڑ کر اگر پرویز شاہدہ ہی کو پا گیا ہوتا یعنی اگر شاہدہ اس کو پا گئی ہوتی تو اس کا وہ حشر نہ ہوا ہوتا جو ہوا۔ معلوم نہیں میری چارہ گری یعنی جراحی کی رگ حرکت میں آ گئی یا دم گھٹا دینے والی فضا کے احساس سے میں نے اپنے کو مجبور پایا اس لیے میں نے پورے قصد اور بڑی کوشش کے ساتھ کہا۔ شاہدہ ہر موقع پر اپنے کو روکے رہنا اور اندرونی خروش کو دبائے رہنا نہ صرف دماغی بے ایمانی اور روحانی فریب کاری ہے بلکہ اس سے مادی اور جسمانی زندگی میں بھی بڑی خرابی اور فساد کا اندیشہ ہے۔ تم میرے مزاج سے اچھی طرح شناسا ہو چکی ہو اور میں بھی تمہارے کردار کو بھرپور پہچان چکی ہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم اس وقت کیسے طوفان کو دبا کر زبردستی خاموش کئے ہوئے ہو۔ یہ تمہارے لیے زبردست خطرہ ہے اگر خدانخواستہ تمہارے اعصاب و جوارح پر اس کا کبھی کوئی ایسا اثر پڑا کہ تم پھر اپنے کو نہ سنبھال سکیں تو اس سے میرے بیمار اور تمہارے منظور بھائی بھی جانبر نہ ہو سکیں گے۔ اور میں بھی مر جاؤں گی اور میں اس وقت تک مرنا نہیں چاہتی جب تک میں مایوس نہ ہو جاؤں کہ میں اپنے بیمار کو بچا نہیں سکتی ——— اور شاہدہ میں اس وقت تک بھی زندہ رہنا چاہتی ہوں جب تک مجھے یقین ہے کہ میں تمہاری نگران اور چارہ گر رہ سکتی ہوں۔ اور تم کو بیماری اور موت سے محفوظ رکھ سکتی ہوں۔ مجھے اول تو چہرے پر نقاب ڈالے رہنے کا فن کبھی آیا نہیں اور میں پہلے ہی دن سے تمہارے سامنے بے نقاب تھی لیکن تم بھی میرے سامنے بے نقاب ہو چکی ہو۔ پھر اب "پردہ داری" سوا اس کے کہ تینوں متعلق ہستیوں کا دم گھٹتا ہم میں سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس کے علاوہ تم سوجھ بوجھ والی ہو اور تم میری اس فطری بات کو سمجھ سکتی ہو کہ ایک شخص کو بغیر رقابت اور رشک کے احساس کے بیک وقت ایک سے زیادہ لوگ چاہ سکتے ہیں اور ایک شخص بیک وقت انتہائی معصومیت کے ساتھ ایک سے زیادہ ہستیوں کو چاہ سکتا ہے۔

ایک دیوتا کو بیک وقت سینکڑوں آدمی مادی طور پر پوجتے ہیں اور ان میں کبھی رشک و رقابت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور ایک دیوتا اپنی ساری الوہیت اور بے لوثی کو قائم رکھتے ہوئے اور بغیر کسی قسم کے فرق امتیاز کے ایک پوری انسانی آبادی پر مہربان ہو سکتا ہے، آخر ہماری دنیا میں محبت کا جذبہ شخصی ملکیت اور بلا شرکت غیرے اختیار کلی کا مرادف کب تک رہے گا، اور انسان اتنا مہذب کب ہوگا کہ محبت اور دولت دونوں کو حق العباد سمجھا جانے لگے۔ میں کئی دن سے اپنے اندر یہ تحریک پا رہی ہوں کہ تم سے صاف صاف کہہ دوں۔ آج کہنے پر مجبور ہو گئی۔ اب تمہارے فیصلہ پر سب کچھ چھوڑتی ہوں۔ لیکن اس کو گرہ باندھ لو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسی میں تمہارے منظور بھائی اور میرے پرویز صاحب کی خیر ہے اور اسی میں میری اور تمہاری عافیت بھی ہے۔"

اس وقت شاہدہ کے چہرہ پر ایک تمکنت تھی اور اس کی آنکھوں میں اتھاہ گداز تھا جو ایک سوگ کا پتہ دے رہا تھا۔ اس نے ان تمام کیفیتوں کے ساتھ مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ کشور تم ڈاکٹر ہو یعنی اپنے فن کی ماہر میں ایک عامی ہوں۔ تمہارا کام نبض پکڑنا، مزاج پہچاننا اور کھلے چھپے امراض کی تشخیص کر کے دوا اور پرہیز تجویز کرنا ہے۔ سطح پر جتنی علامتیں نمایاں ہو سکتی تھیں وہ تمہارے سامنے ہیں ان علامتوں کی جڑیں پوشیدہ طور پر کہاں تک ہیں اور ان کے اسباب کیا ہیں؟ ان کا پتہ لگا کر تم دوا اور پرہیز تجویز کرو۔ مجھے ان مریضوں میں نہ شمار کرو جو اپنے مرض میں شرماتے ہیں یا جو دوا اور پرہیز سے جی چراتے ہیں۔ اگر تمہارا خیال صحیح ہے اور اس پر تم کو اعتماد ہے تو بتاؤ میں کیا کروں۔ تم مجھے کسی حال میں کوتاہ نہیں پاؤ گی۔ اس حد تک تو تم جان ہی چکی ہو، منظور بھائی کو کسی نہ کسی تدبیر سے جلد سے جلد اپنی صحت اور اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ یہ وہ حلال اور نیک کام ہے جس کے لیے حرام سے حرام طریقہ مباح ہے۔ اس سے

زیادہ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتی ہو کشور!"

شاہدہ نے بڑی ہموار پیشانی کے ساتھ اور بڑے تھمے ہوئے لہجے میں اپنی بات کہی۔ اس کے لہجہ میں ایک عنان گیختہ تکبر تھا جس کی بنیاد رشک و رقابت پر نہیں تھی بلکہ اس سے اس کے فطری جذبۂ خلوص و ایثار کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے انداز میں ایک والہانہ سپردگی تھی جو عجز و بیچارگی کے بجائے پندار اور وقار کا احساس لیے ہوئے تھی۔ میں کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی کہ پرویز جواب تک ہم دونوں کو بڑی غائر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ دونوں کی رُوح کی گہری سے گہری تہوں کو ٹٹول رہا ہو بول اُٹھا "اور ایوب کو کیا کروگی شاہدہ۔ ان کا کیا حشر ہوگا اگر نوبت یہاں تک آجائے؟"

اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ آپ نے صرف مجھے چڑانے کے لیے یہ سوال اُٹھایا ہے تو میں بھی کچھ جواب دیتی"، شاہدہ نے کہا۔ اس کے لہجہ میں متانت کے ساتھ ساتھ جانبازانہ محبت کا پندار بھی تھا۔ اگرچہ میں بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ پرویز شاہدہ کو چھیڑ رہا ہے اور اس چھیڑ سے اس کا مقصد یہ ہے کہ شاہدہ کے اعصاب و جوارح میں جو اندرونی تناؤ ہے اس کو ڈھیلا کردے اور اس کے دل و دماغ میں جو پوشیدہ ہیجان ہے اس میں سکون پیدا ہو جائے۔ لیکن لمحہ بہرحال نازک آگیا تھا جس کی ذمہ داری میں تھی۔ میری نگاہیں شاہدہ سے پرویز پر اور پرویز سے شاہدہ پر جا رہی تھیں۔ پرویز نے گفتگو مجھ سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور میں بھی مصلحت اسی میں دیکھ رہی تھی کہ کچھ دیر خاموش رہوں اور گفتگو کے رُخ کو دیکھتی رہوں۔ پرویز نے سنجیدگی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا "نہیں شاہدہ نہ میں تم کو چھیڑ رہا تھا اور نہ میرا مطلب یہ تھا کہ ہنسی مذاق میں اپنی زندگی کے ایسے تپ زدہ لمحوں کو ضائع کردوں....."

شاہدہ نے بات کاٹ دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "کشور تم ڈاکٹر ہو اور منظور بھائی تمہارے بیمار۔ لیکن تم نے ان کا ٹمپریچر نہیں لیا۔ ان کو اس وقت کتنا بخار ہے؟"

میں نے کہا "پرویز صاحب نے مجھے ٹمپریچر نہیں لینے دیا"

"تو تم کیسی ڈاکٹر ہو اور وہ کیسے مریض؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے طاق سے تھرمامیٹر اُٹھایا اور اس کو جھٹک کر پرویز کے منہ کے پاس لے جاتے ہوئے کہا "اس کو منہ میں لے کر چند منٹ کے لیے خاموش ہو جایئے۔ پھر باتیں کیجیے گا ——— اور پرویز نے ہنس کر تھرمامیٹر منہ میں لے لیا۔

دن کے دس بج چکے تھے۔ اس دوران میں پرویز نے میری زبردستی سے دو نارنگیوں کا عرق ایک بار پیا تھا۔ میں واقعی بھول گئی تھی کہ پرویز بیمار ہے۔ اب جو تھرمامیٹر دیکھا تو جی سنسنانے لگا۔ اس کو ایک سو ایک درجہ کا بخار تھا۔ شاہدہ نے میرا منہ دیکھا، اور میں نے اس کا۔ میں نے کہا شاہدہ آج پرویز صاحب نے مجھے کسی طرح نہ ٹمپریچر دیکھنے دیا نہ سینہ کا معائنہ کرنے دیا۔ میں کیا کروں؟ ان کو کیسے قابو میں لایا جائے؟"

میں نے دیکھا کہ شاہدہ کی پیشانی پر ہلکا سا پسینہ آگیا اور اس کی آنکھیں تری کا احساس پیدا کرنے لگیں۔ پرویز نے کسی کو اپنے تردد کے اظہار کا موقع نہیں دیا۔ شاہدہ کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا "شاہدہ میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ میں نے سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا تھا اور اس کا سنجیدہ جواب چاہتا ہوں"

میں نے شاہدہ سے اشارہ کیا کہ وہ اس وقت پرویز کی مرضی پر چلے اور اس کو بہلائے رہے۔

شاہدہ نے کہا "منظور بھائی" میں زندگی کی گتھیوں کو سلجھانا اور ان کو سلجھائے رہنا جانتی ہوں اور آج تک میں خود کبھی کسی گتھی میں اُلجھ کر نہیں رہی۔ آپ مجھے جانتے ہیں۔ دس برس کی عمر تک آپ مجھے کھلا چکے ہیں اور میرے ساتھ کھیل چکے ہیں۔ جب کہ آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اور آپ آسیہ باجی کا سوگ لیے ہوئے تھے جس کو میں ہی نہیں ساری برادری جانتی تھی اور میں آپ سے اس لیے اور بھی زیادہ خوش تھی کہ آپ آسیہ باجی کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ جن کمیوں بھی بے تحاشا چاہتی تھی، غرضیکہ آپ کو میرا مزاج آشنا چاہیئے۔ اور اپنے سوال کا جواب خود دے لینا چاہیئے، لیکن اگر آپ کو اصرار ہے کہ جواب دوں تو سُنیئے کہ ایوب کو کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہوگی اور آپ کا ضمیر کبھی مجرم نہیں ہوگا، اور آپ کی روح میرے یا ایوب کے لیے کبھی بے چین نہیں ہوگی اور میں ہمیشہ آپ کو اسی طرح چاہتی اور پُوجتی رہوں گی جس طرح اب تک چاہتی اور پُوجتی رہی ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے نہ کچھ کہنا ہے، نہ کچھ کہہ سکتی ہوں۔ مگر خدا کے لیے میری خلش چھوڑ دیجیے اگر آپ کو واقعی میری کوئی خلش ہو میں آپ کی محبت کو بہرحال دل میں پرورش دیتی رہوں گی مگر مجھ پر کوئی یہ الزام نہ لگا سکے گا کہ میں نے ایوب یا اپنے تین بچوں کے ساتھ کوئی دغا کی۔"

پرویز نے گھڑی دیکھی اور کہا "اچھا اب تم لوگ جاؤ میں تھک گیا ہوں۔ کل تم لوگ صبح کو ۸ بجے آنا۔ اس وقت بہت سی باتوں کو دو اور دو چار کی طرح واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ کاش تم دونوں جیسی ایک درجن ہستیاں مجھے مل سکتیں جو بہرحال میرا ساتھ دیتیں تو میں دنیا سے بہت سی ریاکاریاں اور بے ایمانیاں اور بہت سی خباثتیں دُور کر سکتا تھا مگر اس وقت جاؤ اور مجھے آنکھ بند کر کے پھر لیٹ رہنے دو۔"

ہم دونوں مجبور ہو گئے کہ اُٹھ آئیں۔ باہر آکر میں نے شاہدہ سے کہا "خدا کے لیے آج شام کو میرے پاس پھر آجاؤ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

"کیا تم شام کو منظور بھائی کو دیکھنے نہیں آؤ گی؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "پرویز صاحب کا لہجہ حاکمانہ تھا اور یہ ضروری ہے کہ ان کو راضی اور خوش رکھا جائے۔ اور ان سے کسی بات میں ضد نہ کی جائے تاوقتیکہ خود ان کی ضد ان کے لیے جان کا خطرہ پیدا نہ کر رہی ہو۔"

"کیا منظور بھائی کی حالت اس حد تک مایوس کن ہے کشور؟" شاہدہ نے پوچھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں ضبط نہ کر سکی اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے شاہدہ کو لپٹا کر کہا۔ "مایوس ہونا طبیب کی شریعت میں حرام ہے لیکن پرویز صاحب کی میں صرف طبیب نہیں ہوں۔ ایک طبیب کی حیثیت سے مجھے زعم ہونا چاہیئے کہ میں ان کو اچھا کروں گی مگر کشور کی حیثیت سے میرا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے اور پرویز صاحب جیسے خود سر مریض ہیں وہ کسی ڈاکٹر کے لیے بھی ایک عقدۂ مشکل ہو جاتے۔ شاہدہ میں روز بروز تمہاری قائل ہوتی جا رہی ہوں۔ کاش میں بھی اپنے اندر وہ ظرف پیدا کر سکتی جو بڑی ریاضت کے بعد پیدا ہوتا ہے مگر جو تمہارا مزاج ہو گیا ہے۔"

"اب ایسی باتیں نہ کرو کشور" شاہدہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "دیکھو آج کے امتحان میں کامیاب یا ناکام ہونے کے بعد اب صرف اس کی ضرورت ہے کہ میں جو تمہاری مدد کر سکوں کروں اور جو تم میری مدد کر سکو کرو۔ اور ہم دونوں اپنی متفقہ کوششوں سے اگر منظور بھائی کو بچا سکیں تو بچا لیں۔ میں آج مغرب کے وقت تک تمہارے پاس آؤں گی اور آدھی رات تک تمہارے ساتھ دونوں مل کر منظور بھائی کو بچانے کے طریقوں پر غور کریں گے۔ مجھے معلوم ہے کل دس بجے انہوں نے آسیہ بھابی اور خورشید کو اپنے بچے کے ساتھ بُلایا ہے،

معلوم نہیں وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ حالات کے آگے سر تسلیم خم کر کے ضبط و تحمل ہی سے کام لیتے تو زندگی کی ظاہری خرابیاں شاید دور ہو جاتیں لیکن وہ جھوٹ اور نمائش کے ساتھ مفاہمت کب گوارا کرتے ہیں یہ وہ تو سعدی سے صرف ان کے ضرب المثل فقرے "دروغ مصلحت آمیز" کی بنا پر سعدی کو تیسرے درجہ کا موقع پرست کہتے ہیں اگرچہ وہ سعدی کی غزلوں کے بڑے قائل ہیں۔

(۲۰)

شام کو شاہدہ نے بڑی راہ دکھائی۔ میں ۶½ بجے سے بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی اور وہ آئی ۸ بجے۔ آتے ہی میرے گلے میں باہیں ڈال کر اس نے کہا "کشور تم بڑی پیاری ہستی ہو۔ مجھے معاف کرنا۔ تم گھبرا گھبرا کر میری راہ دیکھتی رہی ہو گی۔ لیکن میں بالکل مجبور ہو گئی آج ۵ بجے سہ پہر میں منظور بھائی کو بلا رکھا تھا۔ نہ ایوب بھائی کو بلا رکھا تھا۔ مجھے کوئی علم نہیں تھا جب ایوب چلنے لگے تو مجھ سے بھی چلنے کے لیے اصرار کیا۔ میں نے کہا بھی کہ کشور کو وقت دے چکی ہوں، مگر ایوب نے کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ ذرا دیر کر کے پہنچنا۔۔۔۔۔"

مجھ سے صبر نہ ہو سکا میں نے گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے؟ اس وقت ان کی حالت کیا ہے۔ اگر مناسب سمجھو، تو چلو دیکھ آئیں۔"

شاہدہ نے ایک عجیب سپردگی کے لہجہ میں کہا "نہیں کشور منظور بھائی اس کو ناپسند کریں گے۔ اس کے علاوہ تم اس وقت جا کر ان کا کوئی بھلا نہ کر سکو گی۔ وہ بڑے ضابطہ کے ساتھ تمام دوائیں پی رہے اور حرف بہ حرف تمہاری طبی ہدایتوں پر عمل کر رہے ہیں۔ ابھی انکی حرارت ایک سو ڈھائی درجہ پر تھی جو خلاف امید نہیں لیکن میرا جی گھبرا رہا ہے کشور۔ انھوں نے ایوب کو اپنے وصیت نامہ کا قانونی مسودہ تیار کرنے کے لیے بلایا تھا جس کا خاکہ وہ خود بنائے ہوئے ہیں۔ میں قانونی اصطلاحیں نہیں سمجھتی۔ اس کے علاوہ ساری عبارت انگریزی زبان کی اصطلاحوں میں تھی۔ وہ ایک ایک لفظ کے مرادفات انھوں نے اردو میں بھی دہرائے جو انھیں کے بنائے ہوئے تھے، مگر میں اس کا لب لباب سمجھ گئی ہوں اور جہاں تک میرا حافظہ کام کر رہا ہے وہ سلسلہ وار یہ ہیں۔ انھوں نے اپنا گاؤں کا مکان جو پورا ایک قلعہ ہے اپنی ماں کے نام چھوڑا ہے۔ بستی کا مکان اپنے بچہ کے نام رکھا ہے اور اسی کے ساتھ ایک پورا گاؤں جو مکمل خود کاشت اور سیر ہے اور جس میں کئی باغ اور بہت سے جنگل کے ٹکڑے ہیں اپنے بچہ کو دیئے ہیں۔ اور تاکید کی ہے کہ جنگل دو سال کے اندر کٹوا کر کھیت بنا لئے جائیں اور ان کی لکڑیاں فروخت کر کے جو نقد حاصل ہو وہ بچے کے نام بنک یا ڈاکخانہ میں جمع کر دی جائے مختلف گاؤں میں جو سیر ہے اور جو ایک چھوٹی سی جائیداد ہے۔ اس کے دو حصے کئے جائیں۔ نصف بیوی کو دیا جائے اور نصف ماں کو لیکن اگر بیوی نے دوسری شادی کر لی جو اس کو کرنا چاہیئے تو سیر کا جو حصہ اس کو ملا ہے وہ پھر اس کا نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی زمینیں جو اب تک ان کے نام ہیں اور جن کی لگان وہ خود دے رہے ہیں اپنے ماموں کے کھیتوں کے ساتھ ملا کر بزعم خود ایک عوامی زراعت گاہ قائم کی ہے جو ایک خیالی منصوبہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ ان کے بعد انھیں کی ملکیت ہو گی اور اس وقت بھی قانوناً انھیں کی ہیں۔ اس ملکیت کو انھوں نے تین برابر حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ ان کے بچہ کا ہو گا، ایک تمھارا اور ایک میرا۔ بنک اور ڈاکخانہ میں جو روپے جمع ہیں اس کا نصف ان کے بچہ کو ملے گا۔ دوسرے نصف سے بیوی کا مہر ادا کرنے کے بعد جو رقم بچے گی

وہ ان کی ماں کو ملے گی۔ اپنا کتب خانہ تم کو دے رہے ہیں اور اپنی تمام تصنیفوں کا حق اشاعت مجھ کو اور تم کو برابر دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ جو کتابیں پھر سے چھپیں اور مضامین یا افسانوں کے جو مجموعے از سرِ نو کتابی شکل میں شائع ہوں، وہ تمھاری اور میری نگرانی میں یا تمھاری اور میری اجازت کے ساتھ شائع ہوں اور ان سے جو آمدنی ہو وہ تم کو اور مجھ کو ملے۔ وہ اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ اب ان کی کوئی کتاب کسی دوسری اشاعت گاہ سے نہ چھپے بلکہ میں اور تم مل کر ان کی ہر کتاب شائع کریں۔ وصیت کے اس حصہ کی سب سے اہم شرط یہ ہے کہ ان کی تمام تصنیفیں جو (خدانخواستہ) ان کے مرنے کے بعد شائع ہوں وہ سب کی سب آسیہ (باجی) کے نام معنون ہوں۔ وہ تصنیفیں بھی جو اس سے پیشتر دوسروں کے نام معنون ہو چکی ہیں۔ کشورا میں ان تمام باتوں کو برداشت کرے جاتی، لیکن ان کی وصیت کے آخری جزو نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ ان کی آخری وصیت یہ ہے کہ مرنے کے بعد اگر اس کی لاش مل جائے اور اس کو دفن کیا جائے تو زمین ہموار رکھی جائے، کہیں سے کوئی ابھرا ہوا حصہ نہ ہو جس سے ان کی قبر کا نشان مل سکے اور نہ کبھی ان کے مدفن کا پتہ لگا کر اس کو پختہ یادگار بنایا جائے اور نہ اس پر کوئی لوح نصب کرنے کی کوشش کی جائے لیکن اس خاص بارہ میں اگر آسیہ بھابی اس کے خلاف کوئی حکم دیں تو ان کی وصیت کے اس حرف کو منسوخ کر کے آسیہ بھابھی کے فیصلہ پر عمل کیا جائے۔ کل انھوں نے تمام متعلق لوگوں کو بلایا ہے۔ رشید الدین بھائی (آسیہ کے میاں) کو بھی بلایا ہے جن سے وہ سال میں مشکل سے دو چار مرتبہ ملتے ہیں۔ کل ہم سب کے لیے خاص کر میرے اور تمھارے لیے سخت آزمائش کا دن ہوگا۔" شاہدہ نے اپنی بات ختم کی تو وہ صوفے پر میری طرف ڈھلک کر آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس میں جان باقی نہیں ہے۔ میں نے گلشن کو بلا کر اس سے دو نارنگیوں کا عرق منگوایا اور اس میں گلوکوز اور اسپرٹ امونیا ایرومیٹ ملا کر شاہدہ کو زبردستی پلایا جس سے اس کا ڈوبتا ہوا دل سنبھل گیا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی حالت مجھ سے زیادہ نازک اور قابلِ رحم ہے۔ خود میرے دل میں اس احساس سے ہوکیں اٹھ رہی تھیں کہ میں اپنی زندگی کی مراد کو ابھی اچھی طرح پا بھی نہ سکی کہ وہ مجھ سے چھین لی جانے والی ہے۔ پرویز کی جو حالت تھی وہ کسی طرح قابلِ اطمینان نہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر جرم کا اس کا علاج کیا جائے تو اس کے مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے، مگر وہ خود اپنی ضدی طبیعت سے بڑے سے بڑے طبیب کے لیے ایک مشکل تھا۔ میں شاہدہ سے صاف صاف بات بھی کرنا چاہتی تھی اور اسکو ہلاسلی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اسلئے کہ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ اور ہلکی سے ہلکی جنبش میں چھلک جاتا تھا۔ کچھ دنوں سے مجھے اس کا مسلسل تجربہ ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے تمام وسوسوں اور اندیشوں کو چھپا کر شاہدہ کا سر سہلاتے ہوئے کہا "شاہدہ پرویز صاحب تو اس طرح کی باتیں اور حرکتیں کرتے ہی رہیں گے۔ ہمارا کام اس وقت یہ ہے کہ ان کو بچا لینے کی ہر ممکن کوشش کریں چاہے اس میں اپنے اصلی جذبات کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے ——— اور اس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کی کسی بات سے اختلاف نہ کیا جائے۔ وہ جو کچھ کہیں سنتی رہو اور جو کچھ کریں کرنے دو۔ اگرچہ آج دن بھر میں سوچتی رہی ہوں کہ ان کو ٹھکانا نہیں چاہیئے اور ان کو زیادہ بولنے بھی نہیں دینا چاہیئے۔ لیکن بولنے اور تھکتے رہنا کا تو ان کو سودا ہے۔ اس کو کیسے قابو میں رکھا جائے؟"

شاہدہ نے آنکھیں بند کئے ہوئے اور میرے بازو پر پیار کے ساتھ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ سب باتیں آج میرے ذہن میں بھی آتی رہی ہیں اور میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ تم ڈاکٹر کی حیثیت سے کل اپنی بے لاگ رائے دینا اور میں اس کی ضد کے ساتھ تائید کروں گی۔ وہ اب زیادہ بولنے نہ پائیں۔ ان کو جو کچھ کہنا ہو لکھ کر کہیں اور اگر میرا اور تمھارا کہنا نہ مانیں تو پھر میں آسیہ باجی سے کہہ دوں گی۔ وہ ان

کو حکم دے دیں گی۔ اب منظور بھائی اور آسیہ باجی کی ملاقاتیں بہت کم ہوتی ہیں لیکن جب کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ وہ کسی کے قابو میں نہیں آتے تو آسیہ باجی کو اُن کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے۔ وہ ان کی ہر بات مان لیتے ہیں۔ ان کے اپنے خیال سے وہ بات ماننے کے قابل ہو یا نہ ہو۔ میں خوب سمجھتی ہوں کشور کہ اب تک وہ آسیہ باجی ہی کا سوگ لیے ہوتے ہیں اور اسی کی نذر ہو جائیں گے۔"

میں نے شاہدہ کو پیار کرتے ہوئے کہا "مگر شاہدہ محبت میں ایسے استوار انسان کو بچانا ہر شریف انسان کا فرض ہے، اور جب کہ تم خاموش طور پر بچپن سے اپنے منظور بھائی کو اس والہانہ انداز کے ساتھ چاہتی رہی ہو، اور میں بھی بہت عرصہ تک ان کو غائبانہ پوجتی رہی ہوں اور کچھ دنوں سے ان سے مل کر اُن کو چاہنے لگی ہوں تو اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ درمیان سے ہر قسم کا پردہ اُٹھ جائے تم اور میں دونوں محبت میں ایک ہو جائیں اور اگر ہو سکے تو اپنی محبت کے بل بوتے پر تمہارے منظور بھائی اور میرے اپنے پرویز کو بچا لیا جائے۔"

"کشور! اب میرے اور تمہارے درمیان کیا پردہ رہا ہے؟" شاہدہ نے ایک عجیب سپردگی کے انداز میں کہا جس کو میں کبھی اس سے منسوب نہیں کر سکتی تھی۔

"شاہدہ میں پرویز کو بغیر پیار کیے ہوئے نہیں رہ سکتی یہ جانتے ہوئے کہ اُن کو شاید بڑی متعدی بیماری ہے اور ان کی زندگی کی میعاد بہت کم ہے۔ یہ جانتے ہوئے اب میں سب کے سامنے پرویز کو سر سے پاؤں تک چوم سکتی ہوں اور چومتی رہوں گی۔ کیا تم بھی یہ کر سکتی ہو؟"

"ہاں کشور!" شاہدہ نے سنبھل کر جواب دیا۔ "اگر مجھے اسی طرح یقین ہو گیا جس طرح تم کو ہے کہ منظور بھائی بھی صرف چند دنوں کے مہمان ہیں تو میں خورشید کے سامنے بھی اُن کو پیار کر سکتی ہوں اور ماتھے سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک چوم سکتی ہوں بغیر اس کا لحاظ کیے ہوئے کہ شرعی طور پر مجھے اس کا حق ہے یا نہیں ۔۔۔ میں نہ خورشید سے شرمندہ ہوں گی نہ ایوب سے۔

شاہدہ ہر موقع پر مجھ سے زیادہ جری نکلتی تھی۔ کچھ دنوں سے پرویز کی بیماری کی وجہ سے واقعی بڑا نازک وقت آ گیا تھا، میں ہی جانتی ہوں کہ کیسی کیسی ذہنی اذیتوں اور جذباتی آزمائشوں سے مجھے گذرنا پڑا ہے۔ اکثر پرویز کی ماں، اس کی بیوی اور اُس کے بچے اور اس کے دوسرے عزیزوں کے سامنے مجھے پرویز کے پاس بیٹھا رہنا پڑتا تھا اور پرویز کی ماں اور آسیہ کے علاوہ ہر شخص کی نگاہوں میں مجھے یا تو عناد محسوس ہوتا تھا یا حقارت۔ میں نے ان تمام لمحوں کو بڑے حلم کے ساتھ برداشت کیا اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں نے ان لمحوں کا اس تذکرہ میں بہت کم ذکر کیا ہے اس لیے کہ یہ ایک بڑی پیاری شخصیت کا تذکرہ ہے اور یہ لمحے بڑے گندے اور روح فرسا رہے ہیں، جن کی تفصیل کو میں اپنی توہین اور پرویز کی بے حرمتی سمجھتی ہوں۔ لیکن یہ لمحے میرے بہت تاب شکن رہ چکے ہیں اور میں اکثر مجبور ہو جاتی تھی کہ اپنے پیشہ کے بے لاگ تعلق کی دیوار کو اپنے اور دوسروں کے درمیان حائل کر لوں، لیکن شاہدہ بڑی جرأت کی انسان تھی۔ اُس نے اس طرح کی کوئی دھوکے کی دیوار کھڑی نہیں کی۔ وہ ہر شخص کی نگاہ کا جواب اپنی اُٹھی ہوئی نگاہوں سے دیتی تھی جو صاف یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کہ پرویز پر مجھے جو حق حاصل ہے وہ کسی کو نہیں ہے اور تم سب کے سب میرے اور پرویز کے مقابلہ میں نابدان کے کیڑے ہو۔ شاہدہ اگر کبھی بے قابو اور بے بس ہوئی ہے تو میرے سامنے، لیکن

میرے سامنے بھی وہ صرف چند لمحوں کے لیے لڑکھڑائی اور پھر سنبھل گئی ۔ میں شاہدہ کے ظرف، اس کے دل کی وسعت، اُس کی جذباتی ہمت اور اس کے کردار کی بے دریغ جرأت کی مخلصانہ رشک کے ساتھ ہر موقع پر پہلے سے زیادہ قائل ہوتی جاتی تھی۔ ایسی استقامت اور ایسی ہمواری مجھے کسی دوسرے کردار میں نہیں ملی۔ شاہدہ آج غیر معمولی سپردگی اور بے خودی کے عالم میں بڑی دیر تک میرے ساتھ بیٹھی رہی اور صرف پرویز کی باتیں کرتی رہی، مگر اس کی سپردگی اور بے خودی میں بھی اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ رات کافی جا چکی تھی۔ میرے مجبور کرنے پر اس نے میرے ساتھ چند لقمے کھا لیے اور یہی کہتی ہوئی رخصت ہوئی "کشور نہ جانے کیوں آج گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر بعض مصلحتوں اور مجبوریوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ساری رات تمہارے ساتھ رہ جاتی۔ میں تمہارے لیے کوئی سہارا ہوں یا نہ ہوں، تم میرے لیے بڑی طاقت ہو۔"

(۲۱)

دوسرے دن صبح کو میں ابھی اچھی طرح تیار بھی نہیں ہوئی تھی کہ شاہدہ آگئی۔ اس کے چہرے خاص کر اس کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی سو نہیں سکی ہے اور شاید ساری رات جی کھول کر روتی رہی ہے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "کشور جلدی سے ایک پیالی چائے پلاؤ اور ایک اُبلا ہوا انڈا کھلا دو اور فوراً میرے ساتھ چلی چلو۔ میں تمہارے ساتھ منظور بھائی کے پاس دوسروں سے پہلے پہنچنا چاہتی ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔" شاہدہ کی یہ تجویز بڑی مناسب ثابت ہوئی۔ ہم لوگ صبح کے بارہ بجتے بجتے پرویز کے پاس تھے۔

پرویز کا منہ آج پہلے روز سے زیادہ سنا ہوا تھا۔ شاہدہ نے میرے بیگ سے تھرمامیٹر نکال کر لگایا تو ۱۰۰ ٹمپریچر تھا۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ "پرویز صاحب رات بھر کیا حال رہا؟" پرویز نے کہا۔ "ڈاکٹر رات بھر پیٹ میں مروڑ ہوتا رہا ہے اور رات بارہ بجے مجھے ایک سو دو بخار رہا ہے اور ساری رات کھانستا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے خود اپنا حال معلوم نہیں ——— لیکن تم اب جبکہ وقت سے پہلے آگئی ہو تو میری زندگی کے لمحے فضول باتوں میں ضائع نہ کرو۔ یہ لمحے مجھے معلوم ہے بہت کم ہیں، اس لیے میرے نقطہ نظر سے بہت قیمتی ہیں۔ شاہدہ تم تو مجسم زندگی ہو اور دوسروں کے اندر زندگی کی نئی لہریں پیدا کر سکتی ہو۔ کچھ ایسی باتیں کرو جس سے میری زندگی بڑھے یا نہ بڑھے لیکن زندگی کی باقی سانسیں برداشت کرنے کی سکت میرے اندر بیدار ہو جائے۔ میں کشور سے بھی یہی کہتا لیکن اتنے دنوں میں مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ڈاکٹر ہوا کریں مگر دل کی بڑی کمزور ہیں اور تم ان کے لیے بھی طاقت بن سکتی ہو۔"

"مجھے اس وقت صرف ایک اچھی بات سوجھ رہی ہے۔" شاہدہ نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"وہ کیا ہے شاہدہ؟" پرویز نے فوراً سوال کیا۔

"آپ اچھے ہو جائیے اور ہم دونوں کو زندگی بھر سسکتے رہنے سے بچا لیجیے۔" یہ کہتے کہتے شاہدہ کا پیمانہ ضبط چھلک پڑا، اُس کی آنکھوں سے آنسو کے بڑے بڑے موتی ڈھلک پڑے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ آنسو بہانا بھی شعر، موسیقی اور مصوری کی طرح ایک الہامی فن ہے جو ہر شخص کی قسمت میں نہیں۔

"ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند"

"تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں خود مرنا چاہتا ہوں؟ ذرا تو میں اپنے آٹھ سال کے بچہ کو بے وارث چھوڑے جا رہا ہوں۔ خورشید اس کی

وارث نہیں ہوسکتی اور اس کے ہاتھوں میں بچہ کی زندگی ہمیشہ کے لیے بگڑ کر رہ جائے گی اور اگر رُوح مرنے کے بعد زندہ رہنے والی کوئی قوت ہے تو میں اس بچہ کے لیے قبر سے لے کر حشر تک تڑپتا رہوں گا۔"

شاہدہ بے اختیار ہوگئی اور پروین کی پٹی سے لگ کر نیچے بیٹھ گئی اور اس کے سینے پر سر رکھ کر رو رو کر کہنے لگی "منظور بھائی میں آپ کو خوب سمجھتی ہوں۔ خورشید کا تو ذکر ہی کیا میں شاید آسیہ باجی سے بھی زیادہ آپ کو سمجھتی ہوں۔ اور شاید ....." اس نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور آنسوؤں میں مسکرا کر کہا "اور شاید کشور سے بھی زیادہ آپ کو سمجھتی ہوں۔ آپ کی کوئی بات بھی تو جھوٹ نہیں ہوتی۔ آپ کا کوئی اندازہ بھی تو غلط نہیں ہوتا۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں وہ سب برحق ہی ہوتا ہے۔ کاش کبھی کبھی آپ جھوٹ کو سچ نہ سمجھتے تو کم از کم اس کے ساتھ مفاہمت گوارا کر لیتے! اس وقت آپ دنیا میں سب پر قادر اور مادی اور ظاہری نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ کامیاب انسان ہوتے۔ لیکن آپ نے اپنی روح کی دیانت اور دل کے کھرے پن کو قائم رکھا اور بجائے اس کے کہ دوسروں کو مٹائیں خود مٹ کر رہ گئے۔ دنیا آپ کو اس کا الزام دے۔ مگر میں اسی وجہ سے آپ کی اور زیادہ قدر کرتی ہوں۔ لیکن منظور بھائی اس وقت سب کچھ بھول جائیے۔ ساری باتیں طاق پر رکھ دیجئے اور اچھے ہو جائیے۔ اپنی فطری ضد اور بغاوت کو اس وقت صرف ایک کام میں صرف کیجئے اور وہ یہ کہ اپنے کو خود اچھا کر لیجئے اور اپنے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع نہ دیجئے اور اپنے چند چاہنے والوں کے ڈوبتے ہوئے دلوں کو سنبھال لیجئے۔" یہ کہہ کر شاہدہ پھر اپنی کرسی پر آگئی۔ اس کی آنکھوں سے ابھی آنسو جاری تھے اور وہ آنکھوں کو ہاتھ سے چھپائے ہوئے تھی۔

میں بھی چپ چاپ رو رہی تھی اور زبان سے کچھ کہتے نہیں بن پڑتا تھا، میری حالت ایک اعتبار سے زیادہ نازک تھی۔ پروین کی بیماری اور اس کے انجام کا جیسا صحیح مجھے اندازہ تھا کسی کو نہیں تھا اور اس کے خیال سے اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔

پروین ہم دونوں کو بڑی غائر اور پُرگداز نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ گاؤ تکیہ کا سہارا لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی ٹھنڈی سانسوں کو روکتے ہوئے کہا "میرے چاہنے والے کون ہیں؟ کشور اور تم ــــ اور تم بھی اپنے چاہنے کی وضع کب تک نباہ سکو گی؟ بڑی بیدرد قوتوں کا نام دنیا ہے....."

شاہدہ اپنے آنسو پونچھ چکی تھی اور اپنی آواز پر قابو پا چکی تھی۔ اُس نے ٹوکتے ہوئے کہا "خیر میری یا کشور کی محبت کا ٹھیکہ آپ کے سر نہیں ہے۔ ہم اپنی وضع محبت نباہ سکتے ہیں یا نہیں یا کب تک نباہ سکتے ہیں؟ اس کا فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑیئے۔ (باقی آئندہ)

ایک منزل، کئی راستے

میرزا ادیب

اس رات راشد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کئی بار کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کر چکا تھا مگر نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اِس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہُوا تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اسے ہر روز کم و بیش چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اِس کے بعد وہ اس قدر تھک جاتا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا تھا۔ اس رات بھی غنودگی کا غبار اس کے اعصاب پر چھا گیا تھا مگر معاملہ یہیں تک رہا تھا، اور تھوڑی دیر بعد یہ غنودگی بھی ختم ہو گئی تھی۔

راشد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا۔ عام ڈاکٹروں کی طرح صحت مند، توانا، قوی، کسی ہسپتال سے وابستہ ہونے کی بجائے اس نے پرائیویٹ پریکٹس ہی کو ترجیح دی تھی اور اِس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ جب سے ڈاکٹر بنا تھا معاشی مسئلہ گویا اس کی زندگی ہی سے نکل گیا تھا۔ مہینے میں تمام اخراجات پُورے کر کے بھی، اس کی بچت کبھی ڈیڑھ اور کبھی دو ہزار ہو جاتی تھی جو وہ بنک میں جمع کرا دیتا تھا۔

اُس کے پاس صرف اس کی ماں رہتی تھی، دونوں بھائی امریکہ میں تھے اور بہنیں بھی اپنے گھروں میں آباد ہو چکی تھیں اور لندن میں رہتی تھیں۔ ماں کی بڑی آرزو تھی کہ اس کے گھر میں بہو آئے، مگر وہ ابھی اس کے لیے تیار نہیں تھا، شاید وہ کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہا تھا یا کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جسے بخوشی اپنی رفیقۂ حیات بنا کر گھر میں لے آئے۔ ماں کا فقط یہ خیال تھا کہ وُہ خوشگوار مستقبل کے لیے روپیہ جمع کر رہا ہے اور یہ روپیہ ابھی کافی مقدار میں فراہم نہیں ہوا۔

دُور سے گھڑیال کی آواز آنے لگی۔ ٹن ٹن کی آواز دو مرتبہ گونجی۔ "دو بج گئے ہیں اور میں جاگ رہا ہُوں"۔ یہ احساس اسے عجیب سا لگا۔ وہ مریضوں کو بارہا سکون آور دوا دے چکا تھا اور اس رات وہ خود سکون سے محروم تھا۔

وہ خود بھی دوا استعمال کر سکتا تھا لیکن اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ اس کا جاگتے رہنا ہی ضروری ہے۔

"کہیں امی کو کوئی تکلیف تو نہیں"۔ اور یہ سوچتے ہی اس نے اپنی خوابگاہ کا دروازہ آہستہ سے کھولا، صحن کی بتی جلائی، اپنی امّی کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں مکمل سکوت تھا، جو ظاہر کر رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔

واپس کمرے میں آ کر اس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا اور کتابوں کے ریک سے ایک کتاب اٹھا لی۔ طالب علمی کے زمانے میں ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا تھا اس لیے اس کے یہاں میڈیکل کتابوں کے علاوہ کچھ شعر و ادب کے مجموعے بھی قرینے سے رکھے رہتے تھے جنھیں وہ کبھی کبھی فرصت کے اوقات میں کچھ دیر پڑھ لیتا تھا۔ اس وقت اس نے جو کتاب اٹھائی تھی وُہ 'بانگِ درا' تھی اس نے کتاب کھولی اور نظم کے عنوان پر اس کی نظر پڑی بھی نہیں تھی کہ یک لخت اسے یہ احساس ہُوا کہ کوئی دروازے پر آیا ہے

اور اس نے کال بیل پر اپنی انگلی رکھ دی ہے۔

رات کے وقت کسی مریض کے یہاں جاتے ہوئے اُسے خاصی تکلیف ہوتی تھی مگر وہ اسے ڈاکٹر کی ڈیوٹی سمجھ کر سہہ لیتا تھا کبھی اس نے اس معاملے میں شکوہ نہیں کیا تھا۔ اس کے کمرے کے دالان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ چمک اٹھا تھا۔ دالان کی بتی جلائی گئی تھی۔

"امی کے سوا اور کون جلا سکتا ہے!" اس نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے میں اس کی امی کی آواز آئی۔

"ڈاکٹر کو گوشت پوست کا نہیں لوہے کا آدمی سمجھتے ہیں ——"

"کوئی آیا ہے امی؟"

بوڑھی خاتون نے بیٹے کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا فقرہ مکمل کیا "جسے آرام کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"کوئی بات نہیں امی! مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"کیوں راشد بیٹا؟"

"پتہ نہیں امی! کیوں ——؟" اور وہ باہر جانے لگا۔ بیرونی دروازہ کھولا تو ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا اس کے چہرے سے مس کر کے کہیں چلا گیا۔ نیم روشن اور نیم تاریک فضا میں وہ آنے والے کا چہرہ نہ دیکھ سکا صرف آواز سن سکا۔

"جناب ڈاکٹر صاحب! مہربانی کیجئے۔"

"کوئی SERIOUS CASE ہے؟"

وہ رات کو آنے والے شخص سے یہ بات ضرور پوچھتا تھا۔

"جی ہاں —— مہربانی کیجئے۔"

دالان میں جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی میں اس وقت راشد اجنبی کے چہرے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ لمبی ناک، کشادہ پیشانی، سر پہ گھنگھریالے بال جن میں کوئی چیز چمک رہی تھی۔

"کہاں سے آئے ہیں؟" راشد نے سوال کیا

"پرانی انارکلی سے —— جناب! میں دوپہر آیا تھا، آپ نے سکون آور گولیاں دی تھیں —— مریضہ کے لیے —— اب اس کی حالت بڑی خراب ہے جناب! آپ کو یاد آ گیا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے —— دن میں بے شمار مریض آتے ہیں۔"

"جناب! ٹیکسی مل نہیں سکی ——"

"چلتے ہیں۔" راشد اندر گیا، اس کی امی دروازے پر کھڑی تھی۔

"امی! قریب ہی جانا ہے، پرانی انارکلی میں، آپ سو جائیں، غفور کو آواز دے کر جگا لیں، دروازہ کھول دے گا۔"

امی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ راشد نے میز کی دراز میں سے گاڑی کی چابی نکالی اور واپس جانے لگا۔

غفور کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی، وہ شور سُن کر بیدار ہو چکا تھا اور گیراج کے پاس کھڑا تھا۔ دو منٹ بعد گاڑی سانده روڈ پر چلی جا رہی تھی۔

ہوا میں تیزی اور تندی تھی، اور فضا میں بادل چھائے ہوئے تھے، بارش کا آغاز نہیں ہوا تھا، راہیں خاموش تھیں، کبھی کبھی کوئی رکشا یا گاڑی قریب دکھائی دیتی تھی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

اجنبی راشد کے پاس بیٹھا تھا، آگے کی طرف جھکا ہوا بار بار باہر دیکھ لیتا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر اس نے راشد کو رکنے کے لیے کہا۔ گاڑی پرانی انارکلی کے وسطی حصے میں ایک دو منزلہ مکان کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب۔" اس نے جلدی سے دوسری طرف جا کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

وہ جب راشد کا بکس اُٹھائے اس کے آگے آگے سیڑھیاں طے کر رہا تھا تو اس نے ذرا بلند آواز میں کہا: "ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔"

کمرہ کافی وسیع تھا۔ ایک طرف پلنگ کے اُوپر ایک لڑکی آنکھیں بند کیے نظر آ رہی تھی۔

"یہ ہے مریضہ، ڈاکٹر صاحب!"

یہ الفاظ اس آدمی نے نہیں ایک خاتون نے کہے تھے جو کرسی کھسکا کر مریضہ کے پلنگ کے قریب لے گئی تھی۔

راشد نے کرسی پر بیٹھ کر مریضہ کی طرف غور سے دیکھا۔ لڑکی کیا تھی سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی ایک گڑیا تھی۔ سیاہ زلفیں رُخساروں کو چھو رہی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی کہ تنفس کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

"کیا ہے اسے؟" راشد نے سوال کیا

خاتون نے جواب دیا: "معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب! دو تین گھنٹے ہوئے اسی طرح پڑی ہے، بولتی نہیں، آنکھیں بھی نہیں کھولتی۔"

راشد نے نبض دیکھی، بہت کمزوری سے چل رہی تھی، ہاتھ بڑا گرم تھا، شدید بخار میں مبتلا تھی۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"فاخرہ ——— میری چھوٹی بہن۔"

راشد نے دوبارہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے تین چار بار ہلایا۔ فاخرہ کہہ کر اسے پکارا بھی۔ مریضہ نے آنکھیں کھول دیں اور اسی لمحے وحشیانہ انداز میں بیٹھ گئی۔

"فاخرہ! یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔"

اس نے ایک بار گھور کر راشد کو دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

راشد اس سے اس کی تکلیف کے بارے میں دریافت کرتا، اور وہ خاموشی سے کبھی اس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لیتی تھی اور کبھی اپنا رُخ دُوسری طرف پھیر لیتی تھی۔ لگتا تھا وہ قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی ہے یا اس کے اندر ایک ایسی

کشمکش طاری ہے کہ کچھ کہنا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

راشد نے اسے چیک اپ کیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لڑکی بظاہر تندرست معلوم ہوتی ہے پھر اس کی ایسی کیفیت کیوں ہے!

"کیا اسے ذہنی صدمہ تو نہیں پہنچا؟" ڈاکٹر نے پوچھا، اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آدمی بھی خاموش تھا اور وہ خاتون بھی۔ مگر خاتون کی آنکھوں سے کچھ ایسا ناقابلِ تشریح تھا گویا دل کی بات کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

"خیر ——— یہ دوا دے دیتا ہوں ——— صبح ٹھیک ہو جائے تو اسے میرے کلینک میں لائیے ——— جلدی نہیں ——— بارہ بجے کے قریب رش کم ہوتا ہے اچھی طرح دیکھوں گا۔" راشد نے یہ الفاظ مرد سے کہے تھے جو خاتون کے پاس کھڑا تھا۔

"بہتر جناب!"

راشد نے نسخہ لکھ دیا۔

"میو ہسپتال کے پاس دو تین دکانیں کھلی ہوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے جناب!"

مریضہ اسی طرح خاموش، بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس کی لانبی لانبی پلکوں نے آنکھوں کے نیچے سائے سے ڈال رکھے تھے۔

راشد جب گاڑی میں بیٹھا تو وہ شخص پوچھ رہا تھا:

"فیس، جناب!"

راشد نے دائیں ہاتھ کے اشارے سے "جو مناسب سمجھو دے دو" کا اظہار کیا۔ اس آدمی نے جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور راشد کے سامنے پیش کر دیا۔ راشد نے بغیر کسی اندازے کے چار پانچ نوٹ نکالے اور جیب میں ڈال لیے، بکس گاڑی کے اندر رکھا جا چکا تھا۔ راشد نے خدا حافظ کہا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ آرام کرسی میں دھنس گیا۔ سامنے کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے بار بار آپس میں ٹکرا کر کمرے کے سکوت کو مجروح کر رہے تھے۔ اس کی امی آ گئی۔ وہ اس سے یہ نہیں پوچھتی تھی کہ مریض یا مریضہ کا کیا حال ہے، اس کی بجائے وہ چائے کے لیے پوچھتی تھی۔

"پیو گے؟"

"نہیں، امی! ذرا آرام کروں گا، باہر سرد ہوا چل رہی ہے۔"

"خود کو ڈھانپ لو نا ——— گرم چائے ٹھیک رہے گی"

امی کمرے سے باہر نکل گئی۔ راشد نے اپنے پاؤں آرام کرسی کے آگے تپائی کے اوپر پھیلا دیے۔ معاً اس کے سامنے مریضہ کی شکل آ گئی۔ وہ اس کا کوئی مرض تشخیص نہیں کر سکا تھا۔ "کیا بیماری ہے اسے؟" اس نے خود سے سوال کیا، کوئی جسمانی

بیماری تو نہیں ـــــــ پھر کیا نفسیاتی بیماری ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ اس کے بالکل قریب آگیا ہے۔ سفید رنگت، جس میں کہیں کہیں لہو کی بہت ہی ہلکی اور مدھم سُرخی، لانبی لانبی پلکیں، ہونٹ بھنچے ہُوئے۔

وُہ اپنے کلینک میں ہر روز کئی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ کئی بار گھروں میں جا کر بھی اس نے متعدد ایسے چہرے دیکھے تھے جو حسین اور دلآویز کہے جا سکتے ہیں مگر آج تک کوئی چہرہ بھی کلینک سے یا کسی گھر سے اُس کے ساتھ کمرے تک نہیں پہنچا تھا۔ چند منٹ آرام کرسی میں بیٹھ کر جب وہ گرم گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگتا تھا اور اس کی امّی گھریلو مسائل پر اُس سے کچھ گفتگو کرتی تھی تو وُہ دن بھر کی کارروائی بُھول جاتا تھا اور جب کھانا کھانے کے بعد کمرے سے چہل قدمی کے لیے نکلتا تھا تو خود کو ایک نئے ماحول میں پاتا تھا۔ جہاں نہ تو مریضوں کی مرجھائی ہوئی کربناک صورتیں ہوتی تھیں اور نہ مختلف دواؤں کے تصورات اس کے ذہن کو پریشان کرتے تھے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس رات اُس نے جو چہرہ دیکھا تھا وہ ابھی تک اس کے ساتھ تھا وہ اس چہرے کے تمام خدوخال واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

"ضرور اِس کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ ہوا ہے ورنہ اچھی خاصی صحت مند ہے" اس نے سوچا "کسی واقعے کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریضہ بنی ہے ـــــ یہ واقعہ کیا ہو سکتا ہے! نوجوان لڑکیوں کو عام طور پر ایک ہی بیماری ہوتی ہے ـــــ محبت میں ناکامی کے بعد کوئی نفسیاتی اُلجھن ـــــ شاید اِسے بھی ـــــ ہو سکتا ہے ـــــ عین ممکن ہے۔"

"راشد بیٹا! کیا معاملہ ہے؟"

اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا، اس کی امّی چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

"امّی! کیوں تکلیف کی آپ نے؟"

اس کی امّی نے زبان سے کوئی لفظ نہ کہا، پیالی اس کے ہاتھ میں دے دی۔

"SERIOUS CASE ہے؟"

یہ سوال خلافِ معمول کیا گیا تھا۔

"نہیں امّی! کوئی ایسی بات نہیں، ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کوئی عورت ہے؟"

راشد نے سر کے اشارے سے ہاں کہہ دیا۔

امّی وہیں کھڑی تھی۔

"آپ آرام کریں امّی! تھوڑی دیر کیلئے شاید میں بھی سو جاؤں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا، کھڑکی کے پٹ زور سے ٹکرائے۔ اُس نے اُدھر دیکھا۔ چاند ایک سیاہ بادل میں غائب ہو رہا تھا، اچانک پھر وہی چہرہ اُس کے سامنے آگیا۔ پیالی اس کے ہونٹوں کے قریب آتے آتے رُک گئی۔

"وہ آدمی اس کی حالت بتانے کے لیے کلینک میں آئے گا۔ اس کا مریضہ سے رشتہ کیا ہے، وہ خاتون تو اس کی

بڑی بہن ہے ۔ اس نے خود ہی بتا دیا تھا ———"

ہوا زیادہ تیز و تند ہو گئی تھی کیونکہ کھڑکی کے پٹ زیادہ زور سے ٹکرا رہے تھے ۔ اُس نے دیکھا کہ کھڑکی کی طرف ایک ہاتھ بڑھ رہا ہے ۔

"امّی! ابھی تک یہیں ہیں اور کھڑکی کے پٹ بند کر رہی ہیں ۔" وہ شرمندہ سا ہو گیا ۔

چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھی جو قریب قریب خالی ہو چکی تھی ۔ اس نے پیالی تپائی پر رکھ دی ، پاؤں سمیٹے اور کھڑا ہو گیا ۔

"امّی!"

"تم آج کچھ فکر مند ہو ——— ہاں یاد آیا ، کوکب کی ماں آئی تھی ———" یہ کہہ کر اس کی امّی نے بیٹے کے چہرے کو متجسس نظروں سے ٹٹولا ۔ مگر جس جذبے کی اُسے تلاش تھی وہ نظر نہ آیا ۔

"ٹھیک ہے امّی!"

ماں نے ایک بار پھر بیٹے کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولی :

"وہ امید باندھے بیٹھی ہے ۔"

"امّی!" راشد نے دو تین لمحے رُک کر جواب دیا " دنیا میں کیسی کیسی اُمیدیں باندھی جاتی ہیں ، کون کسی کو امید باندھنے سے روک سکتا ہے ——— نہ میں ——— نہ آپ ۔"

"سوچنا تو چاہیے ۔"

"سوچ لیں گے امّی! وقت آنے پر یہ بھی ہو جائے گا ۔"

"وقت کب آئے گا ؟"

"دیکھیے کب آتا ہے ———"

ماں چلی گئی آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر ، راشد نے محسوس کیا کہ وہ کچھ مایوس ہو کر گئی ہیں ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ماں کو روک دے اور کہے "امّی! ابھی مجھے کام کرنا ہے ، مجھے شادی کی زنجیر میں کیوں جکڑتی ہو!"

مگر وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ دروازہ بند ہو گیا اور وہ کرسی میں نیم دراز ہو گیا ۔

صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے شیشے چمک رہے تھے 'مائی گاڈ! اتنی دیر ہو گئی ۔" وہ کرسی سے اُٹھ بیٹھا ، غفور چائے کی پیالی لیے دروازے سے داخل ہو رہا تھا ۔

"تیسری بار آیا ہوں صاحب جی!"

"مجھے جگا دیا ہوتا بابا!"

"بی بی جی نے کہا تھا اگر صاحب سو رہے ہوں تو جگانا مت ۔"

راشد نے کلائی کی طرف دیکھا ۔ سات بج گئے تھے ۔ اس وقت تک تو وہ ناشتہ کر کے اخبار بھی دیکھ لیتا تھا ۔ اس نے

غفور سے چائے کی پیالی لے لی۔ چند گھونٹ لیے اور بولا:

"امّی کیا کر رہی ہیں؟"

"جی صاحب جی! وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"ابھی آتا ہوں۔"

راشد باتھ روم میں چلا گیا ——— اور جب ناشتے سے فارغ ہو کر گاڑی گیراج سے باہر نکال رہا تھا تو آٹھ بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے، وہ گرمیوں میں آٹھ بجے کلینک پہنچ جاتا تھا۔

اُس روز مریضوں کا ہجوم کچھ زیادہ تھا، وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کمپونڈر کو ہدایت دے رکھی تھی کہ اس کے پاس ایک مرد اور اس کے بعد ایک عورت کو بھیجے۔ کوئی مریضہ اُس کے سامنے سٹول پر بیٹھتی تھی تو وہ بے اختیار اُس کی طرف دیکھتا تھا اور پھر جیسے ——— اُس سے مرض کی کیفیت پوچھنے لگتا تھا۔

ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب کلینک مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔

"بس جناب!" کمپونڈر کی آواز آئی

"دیکھو کوئی آیا ہے۔"

"جی کوئی نہیں۔"

وہ کلینک سے نکل کر عقبی حصّے کی طرف جانے لگا جہاں وہ گاڑی کھڑی کیا کرتا تھا۔ اُس نے موڑ پر جا کر کلینک کی طرف دیکھا۔ کمپونڈر بیرونی دروازے پر تالا لگا رہا تھا۔

کھانے کی میز پر ایک بوجھل خاموشی طاری رہی۔ اس کی امّی ہر روز کوئی نہ کوئی نئی ڈِش بناتی تھی اور اصرار کر کے بیٹے کو کھلاتی تھی۔ مگر اُس روز اس نے کوئی نئی ڈِش نہ دیکھی۔

"امّی! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" اس نے پوچھا

"اللہ کا فضل ہے ——— ٹھیک ہے ——— آج میرا تجربہ ناکام ہو گیا ہے ڈِش خراب ہو گئی۔"

"تو آپ کی بجائے ڈِش کی صحت خراب ہوئی۔" وہ ہنس پڑا۔ ماں مسکرانے لگی۔

"راشد بیٹا! تمھیں مرض اور صحت کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا!"

راشد سمجھ گیا کہ امّی کیا کہنا چاہتی ہے۔ اس نے انجانے پن سے کہا:

"امّی! آپ نے مجھے ڈاکٹر جو بنا دیا ہے ——— اس لیے میرا تعلق انہی دو چیزوں سے ہے ———"

"ہاں بیٹا! ڈاکٹر کو دُنیا میں کسی اور چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیے درست کہتے ہو۔"

امّی کے لہجے میں ایک چھپا چھپا طنز تھا جسے راشد نے محسوس کر لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب چار بجے تک وہ فارغ تھا۔ پونے دو بج چکے تھے۔ دوبارہ

کلینک میں جانے سے پہلے آرام کرنا ضروری تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ سو کر اُٹھا۔ نہا دھو کر چائے پی تو کلینک میں جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

"امّی! جا رہا ہوں۔" اس نے معمول کے مطابق ماں کو اطلاع دی اور اس کی ڈھیر ساری دُعاؤں کے سایے میں باہر نکلا۔ کلینک جاتے وقت اُسے مریضوں ہی کا خیال ہوتا تھا۔ فیروز کی حالت زیادہ خراب تو ہو گئی ہو گی۔ فاطمہ نے شوہر کو باقاعدگی سے دوا دی ہے یا نہیں۔ ایسی ہی باتیں اس کے ذہن میں اُبھرتی اور دوڑتی رہتی تھیں۔ مگر اُس دن صرف اُس مریضہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے گزشتہ رات اس نے پرانی انارکلی کے ایک مکان میں دیکھا تھا۔

اُسے اپنے ہر مریض سے ہمدردی ہو جاتی تھی۔ یہ اس کا شروع ہی سے رویہ تھا۔ اُسے اس نئی مریضہ سے بھی ہمدردی تھی لیکن اِس ہمدردی میں ایک ایسا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا جو ابھی تک اس کے لیے غیر مبہم تھا ——— جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اُس شام بھی اُس نے اُس مریضہ کا انتظار کیا ——— وہ نہ آئی۔

آٹھ بج چکے تھے۔ کلینک مریضوں سے خالی ہو گیا تھا۔ "گھر جانا چاہیے، امّی منتظر ہوں گی ———" اور یہی فیصلہ کر کے وہ گاڑی میں بیٹھا۔ لیکن یہ دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی کہ اُس کی گاڑی پرانی انارکلی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

تین بار ہارن دینے کے باوجود کھڑکی میں سے نہ کوئی چہرہ جھانکا اور نہ کوئی نیچے آیا۔ چوتھی بار ہارن دیا تو وہی شخص نیچے آیا جو اُسے اِس گھر میں لے کر آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" اس کے لہجے سے بڑی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا

"میں نے سوچا آپ نے مریضہ کی حالت نہیں بتائی، زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔"

"بڑی تکلیف کی ڈاکٹر صاحب! آپ نے۔"

سیڑھیاں طے کرتے ہوئے راشد نے پوچھا:

"دوا پلائی تھی؟"

"میری بیوی نے پلائی ہو گی، میں بازار سے لے آیا تھا۔"

مریضہ کی بڑی بہن نے خیر مقدم کیا۔

"میں نہیں گیا تو ڈاکٹر صاحب خود فاخرہ کو دیکھنے کے لیے آ گئے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بڑی تکلیف فرمائی، تشریف رکھیے۔ خاتون نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ راشد بیٹھ گیا اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"وہ نظر نہیں آ رہی"

"جی وہ اُوپر ہے اپنے کمرے میں۔ وہاں اس نے ایک لائبریری بنا رکھی ہے۔ زیادہ وقت وہیں گزارتی ہے۔

بُلاتی ہُوں۔"

خاتون دائیں طرف پردے کے پیچھے چلی گئی۔

"ابھی نہیں"۔ راشد نے اسے واپس بلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے مجھے کچھ پُوچھنا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی بہن کی کیس ہسٹری بتائیے۔ میرا مطلب ہے یہ بتائیے کہ کب سے اُس کی ایسی حالت ہوگئی ہے۔ اس کا مرض شاید نفسیاتی ہے۔ بظاہر تندرست معلوم ہوتی ہے۔"

راشد نے دیکھا کہ خاتون کے چہرے پر ایسے تاثرات پھیل گئے ہیں جو اس کے دبے ہوئے کرب کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ مرد جو راشد کے پاس کھڑا تھا دروازے کی طرف جانے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ اس کی مرض کی تشخیص نہیں کر سکے۔"

"میں جسمانی مرض کی تشخیص کر سکتا ہوں۔"

"کیا اس کا مرض جسمانی نہیں ——— ! نہیں ہوگا ——— آپ بہتر جانتے ہیں۔"

وہ دُوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے کرب ناک اثرات شاید گہرے ہو گئے تھے یا راشد نے ایسا محسوس کیا تھا۔

"کل رات جب آپ کو زحمت دی اس کی حالت بڑی خراب ہوگئی تھی۔ آہستہ آہستہ سانس لینے لگی تھی چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی تھی، میں ڈر گئی۔ آپ نے جو دوا دی اُس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی بے چینی کم ہوگئی۔"

"کیا ممکن ہے کہ بے چینی عود کر آئے؟" راشد نے پُوچھا

وہ خاموش رہی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے درست کہا ہے اس کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ ہو چکا ہے جس سے وہ نفسیاتی مریضہ بن گئی ہے۔"

"کیا ہے وہ حادثہ؟"

○

وہ سر جھکا کر کرسی کے بازُو پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ راشد اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اپنی بہن کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے متذبذب ہے۔ اس نے دو چار لمحے انتظار کیا، پھر بولا:

"میں ڈاکٹر ہُوں، آپ کی بہن کا علاج کرنا چاہتا ہُوں۔"

"میں سمجھتی ہُوں۔ مگر فاخرہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ اس کی روداد کسی کو سُنائی جائے۔ وہ اُوپر ہے، مجھے خدشہ ہے کہ جلدی نیچے نہ آجائے۔ بُرا مانے گی۔ اور تو کچھ نہیں کرے گی تو زار و قطار رونا ہی شروع کر دے گی۔ ایسا دو مرتبہ ہو چکا ہے۔ ہمارے ایک عزیز حکیم صاحب ہیں وہ آیا کرتے تھے، دو سال ہُوئے کراچی جا چکے ہیں۔"

"وہ کچھ نہیں کر سکے؟" راشد نے پُوچھا

"جی نہیں ——— کچھ نہیں ——— بہرحال آپ سُنیے، ہم دو بہنیں ہیں، بھائی کوئی نہیں۔ میرا نام ناصرہ ہے اور اس کا نام تو آپ سُن ہی چکے ہیں۔ میری عمر چودہ برس اور فاخرہ کی سات برس کی تھی کہ جب ہمارے ابا جی دنیا سے چلے گئے تھے۔ ابا جی کے انتقال کے چھ سال بعد امّی بھی رخصت ہوگئیں۔ میری منگنی امّی اپنی زندگی میں کر چکی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے ایک برس بعد میری شادی مسعود سے ہوگئی جو ہمارا دُور کا رشتہ دار ہے۔ اس کے سارے رشتہ دار عزیز کراچی میں ہیں اور میں فاخرہ کو کسی کے حوالے کر کے جا نہیں سکتی تھی اور فاخرہ اپنا گھر چھوڑنے پر رضامند نہیں تھی، اس لیے مسعود یہیں رہنے لگا۔"

ناصرہ کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے اور اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ اُسے سُننے کے لیے راشد کو اس کی طرف جھکنا پڑا تھا۔

"مجھے اپنی بہن سے بیحد محبت ہے۔ شروع شروع میں مسعود اسے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ عموماً اس سے خفا ہی رہتا تھا کیونکہ فاخرہ بہت اچھے اخلاق کی لڑکی ہے مگر کبھی کبھی ضدی بھی ہو جاتی ہے۔ اُس وقت کسی کی نہیں سُنتی۔ جب وہ حاملہ ہُوا تو مسعود کا رویّہ بدل گیا اور وُہ اس سے اچھا سلوک کرنے لگا۔

"فاخرہ کا گھر بسانا ہمارا فرض تھا۔ ریاض مسعود کا دوست تھا اور اس کے دفتر میں ہی کام کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ سے رشتے کی بات چیت ہونے لگی۔ اور اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ فاخرہ ریاض کی دُلہن بن گئی اور اپنے نئے گھر میں چلی گئی۔

"میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ذمے داری پُوری ہوگئی۔ دونوں میاں بیوی میں ذہنی مطابقت پیدا ہو گئی تھی، اور یہ خوشگوار زندگی کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ مگر ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ فاخرہ اور اس کے شوہر میں کشمکش سی رہنے لگی۔

"میں سمجھتی تھی یہ کشمکش معمولی قسم کی ہے دُور ہو جائے گی خاص طور پر اُس حالت میں کہ فاخرہ ماں بننے والی تھی۔ لیکن میرا خیال درست نہ نکلا۔ ایک روز مَیں اس کے یہاں گئی تو وہ اپنے کمرے میں بُری طرح ہانپ رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی برس پڑی "باجی! آپ انھیں سمجھاتی کیوں نہیں، ہر وقت دوستوں میں گھرے رہتے ہیں، گھر کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ میرا کوئی خیال نہیں کرتے۔"

میں نے کہا: "فاخرہ! بات کیا ہے؟"

ریاض وہیں قالین پر بیٹھا تھا، بولا "آپا! میں بتاتا ہُوں بات کیا ہے، یہ چاہتی ہے کہ میں ہر وقت گھر میں بیٹھا رہوں، ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہ جاؤں۔ میں نے شادی کی ہے اپنے پاؤں میں زنجیر تو نہیں ڈلوائی۔"

فاخرہ کہتی تھی کہ وہ آدھی آدھی رات تک دوستوں کے پاس رہتا ہے اور ریاض گھر سے باہر رہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

میں نے بہن کو سمجھایا کہ بچہ ہو جائے گا تو تمھارے شوہر کی گھر سے دلچسپی خود بخود بڑھنے لگے گی۔ صبر سے کام لو۔

آنے والے وقت کا انتظار کرو۔

یہ اُسی بڑی کشمکش کی ابتدا تھی جس نے دونوں کی زندگیوں میں زہر گھول دیا اور وہ ایک دوسرے سے بیزار رہنے لگے۔

"بچہ ہوا اور یوں لگا جیسے حالات سُدھر جائیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں کا طوفان ختم ہو جائے گا ——— بظاہر میری توقع پوری ہو رہی تھی ——— سلیم نے اپنے ماں باپ کو ایک بار پھر ایک دوجے کے قریب کر دیا تھا ——— مگر طوفان جسے میں سمجھتی تھی کہ ختم ہو گیا ہے ——— ختم نہیں ہوا تھا صرف تھم گیا تھا۔"

ناصرہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی وہ سامنے پردے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے اُوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ پردے کو شاید جنبش ہوئی تھی یا ناصرہ نے ایسا محسوس کیا وہ کہنے لگی

"سلیم ایک سال کا ہو گیا تھا۔ دونوں کو اپنے بچے سے بے پناہ محبت تھی۔ دونوں اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ مگر فاخرہ یہ بات برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی کہ اُس کا شوہر تین چار گھنٹے اپنے دوستوں میں گزارے اور کبھی کبھی رات کو بھی دیر سے آئے ——— دوسری طرف ریاض بھی اپنی برسوں کی عادت چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"ایک رات وہ بڑی دیر سے آیا، فاخرہ نے کمرے کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔" دروازہ کھلا تو ان میں سخت لڑائی ہوئی۔ فاخرہ نے کہہ دیا کہ اگر وہ اپنی عادت نہیں چھوڑتا تو وہ اس کے گھر میں نہیں رہے گی اور ریاض کی انا بھی کسی طرح شکست ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔

ریاض کے گھر والوں نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے سُود ثابت ہوئی۔ فاخرہ صبح ہوتے ہی اپنی طرف سے شوہر کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر ہمارے یہاں آ گئی۔

ناصرہ اُٹھی، سیڑھیوں والے پردے کی طرف گئی اور دُوسرے لمحے واپس آ گئی۔

"معاف کیجئے۔ میں اپنی بہن کے مزاج سے اچھی طرف واقف ہوں۔ تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ فاخرہ بچے کو لے کر ادھر آ گئی۔ حالات اس قدر ناخوشگوار اور تلخ ہو گئے تھے کہ وہ ریاض کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ میں اس سے کہتی تھی دیکھو فاخرہ! یہ تمہاری بہن کا گھر ہے۔ تمہارا گھر وہی ہے جہاں تمہارا شوہر رہتا ہے۔ آخر تمہیں وہیں جانا ہے۔ کل کی بجائے آج ہی کیوں نہ چلی جاؤ! مگر وہ میری بات سُن کر جھنجھلا جاتی تھی اور کہنے لگتی تھی "باجی! اگر تمہیں میرا یہاں رہنا ناگوار ہے تو میں کہیں اور چلی جاتی ہوں۔ کوئی نہ کوئی چھت مجھے پناہ دے ہی دے گی۔" میں اس سے لپٹ جاتی۔ "ایسا مت کہو فاخرہ! یہ چھت تمہارے ہی گھر کی چھت ہے جس کے سائے میں تم پلی بڑھی ہو۔ لیکن میری بہن! شادی کے بعد لڑکی کا گھر میکے کا نہیں سُسرال کا گھر ہوتا ہے۔"

ناصرہ نے ایک لمبی آہ بھری "میری بہن نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور ریاض نے اپنی انا کی چار دیواری سے باہر نکلنا پسند نہ کیا۔ دن گزرتے گئے۔ ننھا سلیم بیمار ہو گیا۔ میں نے بہن سے بہ منت کہا، جس طرح سلیم تمہارا بیٹا ہے ریاض کا

بھی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" وہ تلخ لہجے میں بولی

"اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا بچہ بیمار ہے۔"

"تو کیا میں بیمار بچے کو گود میں لے کر، بے غیرت بن کر اُس کے دروازے پر دستک دُوں کہ اس کا علاج کراؤ۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے لیے دوا دارو کا انتظام کرنا مشکل ہے ——— باجی! کہیے آپ کی کیا یہی منشا ہے؟"

"نہیں، میری یہ منشا نہیں ہے۔"

"آپ کی جو منشا ہو، مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی، میں اپنی ساری چیزیں بیچ دُوں گی اپنے بچے کا علاج کرواؤں گی۔"

میں نے سمجھ لیا کہ اس موضوع پر گفتگو سے تلخی بڑھ جائے گی، خاموش ہو گئی۔

ریاض کو بچے کی علالت کی خبر مل گئی۔ وہ آیا۔ مجھے توقع تھی کہ اس موقع پر دونوں کے دل صاف ہو جائیں گے۔ وہ بچے کو اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا تاکہ اس کا باقاعدہ علاج ہو سکے۔ مگر فاخرہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

دونوں میں تلخ کلامی ہوئی۔ ریاض ذرا نرم پڑ جاتا، اگر فاخرہ ذرا تحمل سے کام لیتی۔ لیکن وہ تحمل کے اظہار سے باز ہی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض ایک ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے نسخہ لکھا۔ ریاض دوائیں خرید کر لے آیا۔ وہ اس وقت بھی کہتا تھا کہ یہاں بچے کو باقاعدگی کے ساتھ دوا دینا ممکن نہیں ہوگا۔ مگر فاخرہ نے اس کی ایک نہ سُنی۔ چنانچہ وہ سخت ناراض ہو کر چلا گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ آئندہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔

میرے لیے یہ صورتِ حال بڑی اذیت ناک تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔ بے بس تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ بچے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ فاخرہ اس کے لیے وہ سب کچھ کرتی تھی جو ماں اپنے بچے کے لیے کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی صحت گرتی ہی گئی۔

سلیم دن بھر خاموش رہا تھا۔ لگتا تھا اُس کا بخار اتر گیا ہے۔ اور وہ شام آ گئی جس نے میری بہن سے ساری خوشیاں چھین لیں۔ یہ شام عام شاموں سے مختلف تھی تیز و تُند ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ اندھیرا تیزی سے فضاؤں میں گھلنے لگا تھا فاخرہ اُوپر اپنے کمرے میں تھی یکایک اس کی بھرائی ہوئی آواز "باجی" کہتے ہوئے سُنائی دی۔

میں اُوپر گئی، فاخرہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر سے لہو بہہ رہا تھا اور سلیم پلنگ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

بچے کو مرتے دیکھ کر، گھبرا کر وہ نیچے آنا چاہتی تھی کہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی تھی اور اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ میں نے اور میرے شوہر نے فاخرہ کو سنبھالا۔ اس کے سر کے زخم پر پٹی باندھی لیکن اس کے دل پر جو زخم لگ چکا تھا اس پر پٹی باندھنا ہمارے بس سے باہر تھا۔

ریاض آیا اور بچے کو دفناتے ہی چلا گیا۔ نہ بچے کی زندگی اُن دونوں کو قریب لا سکی نہ موت۔

میری بہن اِس حادثے کے بعد کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ جس طرف دیکھتی تھی دیکھتی ہی چلی جاتی تھی۔
اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو حالات زیادہ نہیں بگڑ سکتے تھے۔ ریاض کینیا چلا گیا اور اس نے وہاں جاتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فاخرہ کو طلاق کا کاغذ بھیج دیا۔ رہی سہی اُمید بھی ختم ہوگئی۔
"ڈاکٹر صاحب! میری بہن کچھ ابنارمل ہوگئی ہے — اس کے شب و روز کا صرف ایک ہی مصرف ہے اور وہ ہے کتابوں کا مطالعہ ——— نئی نئی کتابیں خرید کر لاتی رہتی ہے اور اوپر بیٹھ کر مطالعہ کرتی رہتی ہے۔
زندگی کے معمولات ٹھیک طور پر نہ سہی — بہرصورت پُورے کر لیتی ہے — مگر شام کے وقت اُس کی حالت خراب ہو جاتی ہے خاص طور پر ایسی شام کو جو طوفانی ہو — کل ایسی ہی شام تھی۔ وُہ اوپر تھی — میں ایسے ماحول میں اسے تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ کل ایک ضروری کام کرتے ہُوئے جلدی اوپر نہ جا سکی۔ اُوپر گئی تو وُہ پلنگ پر لیٹی ہَولے ہَولے سانس لے رہی تھی — آنکھیں بند تھیں۔

⊙

ناصرہ خاموش ہوگئی۔ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ راشد نے آنکھوں سے عینک اتاری، جیب سے رومال نکال کر اس کے شیشے صاف کرنے لگا۔ یکایک ناصرہ اُٹھ بیٹھی۔ سیڑھیوں والے پردے کی طرف گئی۔ راشد نے رومال تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ عینک آنکھوں پر لگا ہی رہا تھا کہ ناصرہ کی آواز آنے لگی:
"فاخرہ، فاخرہ! نہ بہن، نہ بہن! دیکھو فاخرہ!"
راشد اُدھر جانے لگا۔ اُس نے پردہ ہٹایا۔ فاخرہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اپنی سسکیاں دبانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔
"فاخرہ!" راشد نے اپنے لہجے میں ممکن حد تک ملائمت پیدا کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ فاخرہ تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے لگی اور اُوپر سے زور کے ساتھ دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔
"دیکھا آپ نے؟" ناصرہ نے رندھے ہوئے گلے سے کہا
"پریشان ہونے کی بات نہیں، ابنارمل کیس ہے۔"
"نہ جانے کب سے یہاں کھڑی تھی، اپنے متعلق کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتی۔"
"بعض ابنارمل لوگوں کا یہی رویہ ہوتا ہے شاید اس نے دروازہ بند کر لیا ہے۔"
"جی ہاں! مشکل ہی سے کھولے گی۔"
راشد کا ذہن متذبذب ہوگیا تھا۔ اُوپر جا کر اُسے دروازہ کھولنے کے لیے کہے یا اس حرکت سے باز رہے۔ ناصرہ نے اس کے چہرے سے دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔
"ڈاکٹر صاحب! آئیے بیٹھ جائیے۔ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ بہت قیمتی وقت ہے آپ کا۔" اور ناصرہ

واپس آنے لگی۔ راشد بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"میرا ایک دوست ہے، دماغی امراض کا معالج، میرا خیال ہے ———"

راشد فقرہ مکمل نہ کرسکا۔ ناصرہ نفی میں اپنا سر ہلانے لگی۔

"انسان کو ہر طرح کوشش کرنی چاہیے ———"

"مگر یہ جائے گی نہیں ڈاکٹر صاحب!" ناصرہ کا حتمی جواب تھا

"میں ڈاکٹر سے وقت مقرر کرلوں گا، اس وقت آؤں گا ———"

"ڈاکٹر صاحب! آپ بڑی تکلیف کر رہے ہیں ——— آپ ———" ناصرہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے جذبات کا کس طرح اظہار کرے!

"ناصرہ! اگر میرے تکلیف کرنے سے کسی کی حالت سُدھر جائے تو میں اسے تکلیف نہیں کہوں گا۔"

راشد نیچے اُتر گیا۔

وہ کبھی دیر سے گھر آتا تھا تو ماں اس سے تاخیر کی وجہ نہیں پُوچھتی تھی صرف یہ پوچھ لیتی تھی:

"راشد بیٹا! مریض کی حالت اچھی ہے؟" وہ سمجھتی تھی کہ اس کا بیٹا ضرور کسی مریض کے گھر سے آرہا ہے۔ اس نے یہی سوال کیا۔

"نفسیاتی بیماری ہے اسے۔"

"کیوں؟"

"اس کی زندگی میں ایک حادثہ ہوا ہے ——— بلکہ دو حادثے ہوئے ہیں ——— بائیس تئیس برس کی لڑکی ہے۔"

"اللہ رحم کرے ———" اور وہ کھانا لانے کے لیے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

سونے سے پہلے اس نے ماں کو فاخرہ کی ساری روداد سنادی اور وہ اس کی صحت کے لیے دعا کرکے سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

راشد کے دماغ میں دو تین بار یہ سوال اُبھرا "اگر وہ جانے کے لیے آمادہ نہ ہوئی تو ———" اس سے وہ پریشان ہو جاتا تھا ——— مگر دوسرے روز کلینک میں جاکر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ڈاکٹر لطیف کو رنگ کیا اور اس سے تین بجے کا وقت مقرر کرلیا۔

کلینک سے فارغ ہوا تو پونا ایک بج چکا تھا۔ سوا دو بجے وہ کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ماں نے پُوچھا:

"خیر تو ہے بیٹا؟"

"امی! میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ اس لڑکی کو ڈاکٹر لطیف کے ہاں لے جانا ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگی "بتایا تھا۔"

مسعود ہارن کی پہلی آواز پر ہی نیچے آ گیا۔
راشد گاڑی سے نکلنے لگا۔
"ڈاکٹر صاحب! وہ نہیں جائے گی۔ بڑی ضدی لڑکی ہے۔ بہن نے بات کی تھی تو وہ زور زور سے رونے لگی تھی۔"
"چلیے تو سہی، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے!"
راشد مسعود کے ساتھ اُوپر آ گیا، ناصرہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مایوس دکھائی دیتا تھا۔ اِس مایوسی کے عالم میں وہ راشد کا خیر مقدم بھی نہ کر سکی۔ وہیں کھڑی رہی۔
"کہاں ہے؟" راشد نے پُوچھا
ناصرہ نے سر کے اشارے سے کہہ دیا "اوپر ہے۔"
"نیچے نہیں آئے گی؟"
"اس نے تو آج کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں نے صرف یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ بس بگڑ گئی۔ اور کہنے لگی "میرے ساتھ یہ مذاق کرنا چھوڑ دیں۔"
"کوئی بات نہیں، میں اوپر چلتا ہوں۔"
راشد پردے کی طرف جانے لگا۔ مسعود نے تیزی سے جا کر پردہ ہٹا دیا۔ چند سیڑھیوں کے بعد راشد اور ناصرہ فاخرہ کے کمرے میں تھے۔
کمرہ مختصر تھا۔ فرنیچر بھی مختصر تھا، مگر صاف سُتھرا معلوم ہوتا تھا کہ فاخرہ نے سامان رکھنے اور کتابوں کو ترتیب کے ساتھ سجانے میں بڑے اچھے اور صاف سُتھرے ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ کہیں بھی پراگندگی اور انتشار کا احساس نہیں ہوتا تھا۔
جب راشد اور ناصرہ کمرے میں پہنچے تو وہ کُرسی میں دھنسی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ راشد کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کُرسی سے اُٹھ بیٹھی۔ راشد اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:
"معاف کیجئے، آپ کے مطالعے میں مداخلت کی ہے۔ معاف کر دیا ہے نا آپ نے؟"
فاخرہ دو تین لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی:
"فرمائیے۔"
"فرمانا وانا کیا ہے فاخرہ! تمہارے پاس اس امید کے ساتھ آیا ہُوں کہ تم میری مدد کرو گی۔"
فاخرہ نے اُسے گھور کر دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں جُھکا لیں۔
"معاملہ یہ ہے کہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے، ذرا بے وقوف ہے۔"

راشد مسکرانے لگا۔

"یہ لڑکی اپنی بُرائی اور بھلائی سے بے نیاز ہے۔ میں چاہتا ہوں تم میری مدد کرو۔"

ناصرہ بڑی سنجیدہ تھی مگر راشد کے یہ الفاظ سُن کے مسکرا اٹھی۔

"مدد یوں کہ اسے ذرا باہر لے جانا ہے ڈاکٹر کے پاس۔ اس میں اس کی اپنی بھلائی ہے فاخرہ! کیا تم میری مدد نہیں کروگی ——— مجھے مایوس کر دوگی؟"

فاخرہ کا سر جُھکا ہوا تھا۔ راشد اور ناصرہ ——— دونوں اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے سر ذرا اُٹھایا اور کرب ناک لہجے میں بولی:

"یہ سب فضول ہے ——— بے سُود ہے ——— کچھ نہیں ہوگا ——— کچھ نہیں ہو سکتا۔"

راشد اس کے اور قریب ہو گیا۔

"تم درست کہتی ہو ——— مگر مستقبل کے متعلق کوئی شخص کوئی بات بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا ——— انسان کو بہرحال بہتری کی توقع رکھنی چاہیے۔ میں نے درست کہا ہے نا؟"

فاخرہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اب ٹکٹکی باندھ کتابوں کے ایک ریک کو دیکھ رہی تھی۔

"چلو فاخرہ!"

"چلیے، آتی ہوں۔"

ناصرہ کو یہ الفاظ سن کر اتنی حیرت ہُوئی کہ وہ راشد کے لیے دروازے کا پردہ بھی نہ ہٹا سکی۔ یہ کام راشد نے خود کیا۔

راشد کو گاڑی میں بیٹھے چھ سات منٹ گزرے ہوں گے کہ دونوں بہنیں آ گئیں۔ فاخرہ نے لباس بدل لیا تھا۔

"شکریہ! مجھے یہی امید تھی۔" یہ کہہ کر راشد نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ دونوں بہنیں اندر بیٹھ گئیں۔ راستے میں خاموشی رہی یہاں تک کہ گاڑی ڈیوس روڈ کی ایک کوٹھی کے پورچ میں جا رُکی۔

راشد نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا، پھر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ملازم نے انھیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

ڈاکٹر لطیف آیا۔ سن پچاس سے اُوپر۔ چہرے پر ملائمت۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک۔

تینوں کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر لطیف نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ مریضہ کون ہے۔ وہ فاخرہ سے مخاطب ہُوا۔

"بیٹی! آپ کا نام فاخرہ ہے شاید۔"

فاخرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو آپ آئیے ذرا میرے ساتھ۔"

فاخرہ سوالیہ نظروں سے بہن کو دیکھنے لگی۔

ناصرہ کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی۔ جب دو تین لمحے گزر گئے تو راشد نے فاخرہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"یہ ڈاکٹر ہیں ——— اور بڑے ہمدرد انسان ہیں۔"

فاخرہ اُٹھ بیٹھی اور ڈاکٹر لطیف کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

"ڈاکٹر صاحب کیا پوچھیں گے؟" ناصرہ نے سوال کیا

"جو مناسب سمجھیں گے پوچھیں گے، جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا۔"

ناصرہ مطمئن نظر نہیں آتی تھی، تاہم وہ خاموش ہوگئی مگر ہر ایک آدھ منٹ کے بعد دروازے کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

ڈاکٹر لطیف کا نوکر چائے کی ٹرالی لے کر آگیا اور ٹرالی ان کے قریب روک کر چائے بنانے لگا۔ جب چائے پی گئی، ڈاکٹر لطیف اور فاخرہ آگئے۔

"ڈاکٹر راشد صاحب! فاخرہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے ——— ماشاءاللہ بڑی ذہین، عقلمند۔" ڈاکٹر لطیف نے فاخرہ کو بہن کے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

راشد نے مسکرا کر جواب دیا:

"میں آپ کی تائید کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب!"

فاخرہ بُری طرح جھینپ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ بہن کے پیچھے چھُپ جاتی۔

"چائے؟" ڈاکٹر لطیف نے فاخرہ سے پُوچھا

"جی نہیں، میں چائے نہیں پیوں گی۔"

"نہیں جی چاہتا تو نہ سہی۔ ہاں ڈاکٹر صاحب! فاخرہ کو ابھی لانا ہوگا ——— آج کا کام ختم۔"

"بہتر۔" راشد نے کہا

فاخرہ گاڑی میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے وُہ اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہی ہے۔ سارا راستہ وہ اس طرح گم صم بیٹھی رہی۔

دُوسرے روز بھی راشد، ناصرہ اور فاخرہ ڈاکٹر لطیف کے ہاں وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔ یہ نشست پندرہ منٹ تک رہی۔ تیسرے روز بھی فاخرہ کو جانا تھا۔ ناصرہ تیار ہو رہی تھی کہ گھر میں مہمان آگئے۔

"ڈاکٹر صاحب! کل جائیں گے آج نہیں ———" ناصرہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا

"ناغہ تو نہیں ہونا چاہیے۔"

"پھر؟"

"میں لے جاؤں گا۔"

"اتنی تکلیف کریں گے!"

روز کر نہیں رہا۔"

راشد نے فاخرہ کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر لطیف کے ہاں لے گیا۔ وہ کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ڈاکٹر لطیف آ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب!"

"کہیے"۔

"یہ لڑکی فاخرہ آپ کی کوئی عزیزہ تو نہیں، جیسا کہ آپ نے ٹیلی فون پر بتایا تھا۔ بہرحال آپ اسے اپنے ساتھ لائے ہیں، میں اس سے جو کچھ پوچھ سکا ہوں اس سے میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہوں ——— یہ لڑکی محزونی کا بُری طرح شکار ہو چکی ہے۔ یہ محزونی دُور ہونی چاہیے۔"

"کس طرح ڈاکٹر لطیف صاحب؟"

"اِس کی گود میں بچہ ہونا چاہیے ——— یہی اس کا نفسیاتی علاج ہے۔"

راشد سوچ میں پڑ گیا۔

"بدقسمتی سے اسے طلاق مل چکی ہے ——— ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت کی شادی ایک بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔" راشد نے اس معاملے کی پیچیدگی واضح کرتے ہوئے کہا

"علاج بس یہی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے حتمی طور پر کہہ دیا

"اچھا ڈاکٹر صاحب! میں ذاتی طور سے آپ کا بیحد ممنون ہوں۔" راشد نے ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا

"چھوڑیے ڈاکٹر صاحب! اس FORMALITY کی کیا ضرورت ہے ———"

فاخرہ دروازے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔

"چلو فاخرہ!" راشد اس کی طرف جانے لگا

وہ اس کے پہلو میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گاڑی کدھر جا رہی تھی، یہ بات فاخرہ کو معلوم نہیں تھی۔ جب وہ رُکی تو اس نے سر اٹھایا۔ اُس کے سامنے دُور دُور تک درخت کھڑے تھے۔ پھولوں کے پودے تھے اور کوئی مکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"یہ کہاں لے آئے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" یہ سوال فاخرہ کے ہونٹوں پر آتے آتے رُک گیا۔

راشد نے اپنی جگہ سے اتر کر دُوسری طرف جا کر گاڑی کا دروازہ کھولا، فاخرہ نیچے اتر گئی۔

"شاید تم حیران ہو کہ میں تمھیں گھر میں پہنچانے کے بجائے باغِ جناح میں کیوں لے آیا ہوں۔"

"شاید نہیں یقیناً۔"

"میری مراد یقیناً ہی سے تھی۔" راشد نے مسکرا کر کہا "آؤ ذرا ادھر چلیں"۔ اور راشد فاخرہ کو ایک شاداب جگہ پر لے آیا اور بیٹھ گیا، فاخرہ کھڑی رہی۔ "بیٹھ جاؤ"۔ اور وہ بیٹھ گئی ——— بنچ پر ——— اس سے

کچھ دُور۔

"فاخرہ! میں ایک سوال کرنا چاہتا تھا۔"

"جی۔"

"ذرا یہ بتاؤ تمھارے خیال میں مَیں کیسا آدمی ہوں؟"

اِس عجیب سوال پر فاخرہ نے چونک کر راشد کو دیکھا۔

"جواب دو۔"

"آپ —— ڈاکٹر صاحب! بہت اچھے —— یعنی فرشتہ ہیں۔"

"نہیں بھئی نہیں، میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ میں فرشتہ نہیں انسان ہوں اور انسان ہی رہنا چاہتا ہوں، تم مجھے انسان یا زیادہ سے زیادہ ایک اچھا انسان کہہ سکتی ہو —— اگر پسند کرو تو —— کیا یہ پسند کرتی ہو؟"

"ہُوں۔"

"گویا میں ایک اچھا انسان ہُوں —— فاخرہ! کیا تم اس اچھے انسان کا ساتھ دو گی؟"

"جی؟" فاخرہ کے چہرے پر حیرت و استعجاب کا تاثر پھیل گیا اور پھر یہ تاثر شرم و حیا کی سُرخی میں ڈُوب گیا۔

"اسی سوال کا جواب سُننے کے لیے میں تمھیں یہاں لایا ہوں۔"

فاخرہ کو یہ آواز دُور سے آتی ہوئی محسوس ہُوئی۔ اُسے لگا جیسے یہ آواز ہوا کے ایک تیز جھونکے میں لپٹی ہُوئی آئی ہے اور دوسرے ہی لمحے میں جھونکا کہیں دُور نکل گیا ہے۔ وہ سامنے ایک پودے کو دیکھ رہی تھی جس کی پھُولوں بھری شاخیں لہلہا رہی تھیں۔

"مجھے جواب دو فاخرہ!" راشد کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔ اچانک اس کی نظریں پودے سے ہٹ کر اُس پر پڑیں۔ وہ بڑے غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے ایسا کیوں سوچا؟"

"اس لیے سوچا کہ تمھیں میں بہت پسند کرتا ہُوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ ——" فاخرہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں فاخرہ! اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری زندگی پُرمسرت ہوگی۔ ہم خوش رہیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" فاخرہ کچھ مضطرب ہوگئی تھی "باجی پریشان ہوں گی۔"

"یہاں سے سیدھا گھر جائیں گے —— مگر میں چاہتا ہُوں کہ جانے سے پیشتر میں نے جو بات سوچی ہے اس کے بارے میں تمھاری رائے معلوم کر لوں۔"

"میں —— کیا —— کیا —— کہوں؟"

"ٹھیک ہی تم نے جواب دے دیا ہے ——" راشد کے چہرے پر مسکراہٹ کی لہریں پھیل گئی تھیں۔

چائے کی میز پر راشد کی امّی فارغ ہوگئی تھی۔ مگر راشد ایک گھونٹ کے بعد دو تین لمحے توقف کرتا تھا پھر پیالی دوبارہ ہونٹوں تک لے جاتا تھا۔ ماں تین چار بار کنکھیوں سے اسے دیکھ چکی تھی بیٹے کا یہ انداز اس کے لیے خلافِ معمول تھا۔

پیالی شاید نصف کے قریب ہی خالی ہوئی تھی کہ راشد نے اُسے میز کے اُوپر رکھ دیا۔ نیپکن سے مُنہ پُونچھا، ماں اس وقت بھی اسے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

"راشد بیٹا!"

"کہئے امّی!"

"کیا ہُوا تمہارے اس کیس کا، وہ نا ——— نفسیاتی کیس۔"

راشد بے خیالی میں دوبارہ منہ پونچھنے لگا۔

"وہ ——— ٹھیک ہے، ڈاکٹر لطیف نے اپنا مشورہ دے دیا ہے ———"

وہ اپنی کُرسی سے اُٹھ بیٹھا۔ ماں اس سے پہلے اُٹھ بیٹھی تھی مگر اس روز بیٹھی رہی۔

"امّی!"

"کہو۔"

"مجھے کچھ ——— آپ سے کہنا ہے۔"

"میں جانتی تھی آج میرے بیٹے کو مجھ سے کوئی بات کہنی ہے، انتظار کر رہی تھی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوگیا؟"

"بیٹا! بعض باتیں بغیر کسی خاص وجہ کے معلوم ہوجاتی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ اطمینان سے کہو۔"

راشد بیٹھ گیا۔

"امّی! میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہُوں۔"

امّی نے کرسی پر پہلو بدلا۔

"کس لڑکی سے بیٹا؟"

"فاخرہ سے۔"

"فاخرہ ——— یہ وہی لڑکی تو نہیں جو نفسیاتی ——"

"جی امّی!"

امّی اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر پھیرنے لگی۔

"امّی! اس کے لیے میرے پاس صرف ایک ہی دلیل ہے ——— اور وہ دلیل یہ ہے کہ میں ایسا چاہتا ہوں، اس میں میری خوشی ہے ———"

بُوڑھی آنکھیں جو زندگی کے بے شمار رنگ دیکھ رہی تھیں اپنے بیٹے کا ایک ایسا رنگ دیکھ رہی تھیں جو اس کی توقع کے خلاف تھا لیکن اس کا کہن سالہ تجربہ بتا رہا تھا کہ بیٹے کے اِس رنگ کے پیچھے اُس کے دل کا عزم اور قوی ارادہ کارفرما ہے۔ بولی:

"تو تم نے اپنی رفیقۂ حیات کا انتخاب کر لیا ہے!"

"جی امّی!"

"میں یہ نہیں پُوچھوں گی کہ تم نے اِس لڑکی میں، جو بقول تمھارے اپنے ایک نفسیاتی مریضہ ہے کیا خوبیاں دیکھی ہیں— تم کیوں اس کی ذات سے متاثر ہو گئے ہو۔ ماشاءاللہ عقلمند ہو۔ اپنی بھلائی برائی خوب سمجھ سکتے ہو۔ فقط ایک سوال کروں گی میں کوکب کی ماں کو کیا جواب دُوں گی!"

ماں نے وہی سوال پُوچھ لیا تھا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ اس نے دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"یہ نہیں امّی! کہ میں نے اس پر غور نہ کیا ہو ——— غور کیا ہے ——— مگر دیکھیے نا کوکب کا بڑا خوشحال گھرانا ہے شادی ایسے گھرانے میں کوئی پرابلم نہیں بن سکتی۔"

"کچھ جذباتی باتیں بھی ہوتی ہیں بیٹا! دولت ہر مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔"

"جذباتی باتیں تو ——— امّی! جذباتی باتیں کیا ہوں گی ———" اس نے اپنی طرف سے نادان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"میں جانتی ہُوں تم نے اِن پر غور نہیں کیا ہو گا ——— بہرحال میرے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ اس میں میرے بیٹے کی خوشی ہے۔ اللہ بہتر کرے گا ——— ٹھیک ہے۔"

راشد کی نظر دیواری کلاک پر پڑی۔ پونے نو ہو چکے تھے۔ ابھی اسے لباس بدلنا ہے۔ وُہ اوپر جانے لگا۔ ماں وہیں بیٹھی رہی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد نیچے آیا اور بولا:

"امّی! آپ بات کریں گی وہاں ——— یعنی ——— فاخرہ کے گھر جا کر۔"

"یہ بات بھی تمھیں کہنا چاہیے تھی؟"

راشد کچھ محجوب ہو گیا۔

"میں جانتا ہُوں میری امّی بہت ہی پیاری امّی ہے۔" اور وہ بے اختیار ماں سے لپٹ گیا۔

○

ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کلینک کو معمول کے مطابق آدھ گھنٹہ پہلے بند ہو جانا چاہیے تھا مگر اس شام مریضوں کا رش کچھ زیادہ تھا۔ راشد تھک چکا تھا۔ اس نے اپنے کمپونڈر کو آواز دی:

"فیاض! کوئی ہے؟"

فیاض اندر آ گیا۔

"سر! ایک خاتون بیٹھی ہے۔"

"بھیج دو اسے۔"

فیاض ڈسپنسری میں واپس چلا گیا۔

راشد پیشانی دائیں ہاتھ سے لگائے اور بائیں کہنی میز پر ٹکائے مضمحل انداز میں بیٹھا تھا کہ اسے کپڑوں کی سرسراہٹ کا احساس ہوا۔

"فرمائیے کیا تکلیف ہے؟" اس نے مریضہ کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر کہا

"بہت تکلیف ہے ڈاکٹر صاحب!"

یہ آواز سنتے ہی راشد نے بے اختیاری کے عالم میں اپنے سامنے دیکھا۔ کوکب مریضوں کے سٹول پر بیٹھی تھی ——— ایک خوبرو، دراز قد، قیمتی ساڑھی میں ملبوس، نیلی آنکھیں جن میں بڑی گہرائی تھی۔

"کوکب ——— تم! یہ کیا مذاق ہے آخر۔ اس طرح آنے کی ضرورت کیا تھی؟"

"مریض اسی طرح ہی تو ڈاکٹر کے پاس آتا ہے، بتائیے اور کس طرح آتا ہے؟"

راشد نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے کوکب کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور کمپونڈر کو بلا کر کہا کہ وہ تالہ چابیاں میز پر رکھ کر چلا جائے ——— وہ یہ حکم سن کر چلا گیا۔

"آج آپ کی اتنی آؤ بھگت تھی ——— اور انھوں نے وہ کچھ بتا دیا تھا جس کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔" کوکب نے اپنی مترنم آواز میں یہ الفاظ کہہ کر ایک خاص توقع کے ساتھ راشد کو دیکھا۔

"کوکب! کیوں آخر اس کی توقع کیوں نہیں کی جا سکتی تھی؟"

"اس لیے نہیں کی جا سکتی تھی کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر کا کام مریض کا علاج کرنا ہے ———"

"کوکب! میں اس کا علاج ہی کر رہا ہوں۔"

"کیا اس طرح بھی علاج ہوتا ہے؟"

"کوکب! یہ مریض کے مرض پر منحصر ہے کہ اس کا علاج کس طرح ہو ——— تم نے درست کہا ہے کہ یہ خلافِ توقع علاج ہے ——— مگر بعض مرض بڑے ہی پیچیدہ ہوتے ہیں ——— ان مریضوں کی شفایابی کے لیے دوا دارو کی نہیں انسانی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔" راشد نے غیر جذباتی لہجے میں کہا

کوکب یہ الفاظ سن کر بے چین سی ہو گئی۔

"اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جائے!"

"غیر انسانی سلوک کس کے ساتھ کیا ہے میں نے؟" راشد نے فوراً استفسار کیا

"مثلاً ——— میرے ساتھ۔"

"غلط ——— میں نے کبھی تم سے شادی کا عہد و پیمان نہیں کیا ——— میں یہ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔"

"راشد صاحب!" کوکب نے اب اسے اس کے نام سے مخاطب کیا "عہد و پیمان صرف لفظوں ہی سے نہیں اشاروں، کنایوں اور رویوں سے بھی باندھے جا سکتے ہیں۔"

"یہ بھی نہیں ہوا۔"

"ہوا ہے ——— راشد! ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا ہے۔ یاد ہے آپا لندن سے آ رہی تھی اور ہم لوگ اسے ریسیو کرنے ایرپورٹ پر جا رہے تھے۔ میں تمھاری گاڑی میں بیٹھی تھی اور تم گاڑی بڑی تیزی سے چلا رہے تھے، میں نے کہا تھا آہستہ چلائیے۔ ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ اور تم نے کہا تھا تمھارے ساتھ مرنا بھی خوش قسمتی ہے ——— اور جب تم نے ایم بی بی ایس کا آخری پرچہ دیا تھا تو میرے پاس آئے تھے اور کہا تھا: کوکب! دعا کرو میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں نے کہا تھا: میری دعا سے بھلا کیا ہوگا۔ تم نے جواباً کہا تھا: میرے لیے تم جو بھی دعا کرو گی قبول ہو جائے گی ——— یاد ہیں یہ باتیں؟"

"یاد ہیں۔" راشد نے کہا

"اور تمھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ ایک بار میں اور تم آؤٹنگ کر کے گھر آئے تھے تو تمھاری امی نے کہا تھا: راشد بڑے خوش نظر آتے ہو۔ اور تم نے کہا تھا: آج میں بیحد خوش ہوں۔ تم مسکرانے لگے تھے اور میں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔"

کوکب دو لمحے رُک کر بولی "راشد! یہ سب کچھ کیا تھا، کیا تم نے سمجھ رکھا تھا کہ مجھ پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میرے اندر احساس کی کوئی قوت نہیں ہے ——— میں احساسات سے بے بہرہ ہوں ——— میں توقع نہیں باندھ سکتی ——— میں خواب نہیں دیکھ سکتی؟"

راشد نے کوکب کی جذباتی بات بڑے تحمل سے سُنی اور بولا:

"کوکب!"

کوکب نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

"یہ سب کچھ یک طرفہ ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کوکب! میں نے تم سے کوئی امید باندھنے، کوئی خواب دیکھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ یہ تمھارا اپنا معاملہ ہے میرا اس میں کوئی دخل نہیں"

"گویا یہ میری غلط فہمی تھی؟" کوکب نے پوچھا

"میں یہ بھی نہیں کہتا ——— فقط یہ کہتا ہوں کہ میرا اِس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے۔"

کوکب نے ان آنکھوں سے اسے دیکھا جن میں آنسو آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور "خدا حافظ" کہہ کر چلی گئی۔

راشد نے اپنے دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھ لیے اور تنہا بیٹھا رہا ——— دیر تک بیٹھا رہا۔

○

شادی کی تقریب ایک مقامی ہوٹل میں انجام پائی۔ راشد کے کچھ ڈاکٹر دوستوں نے شرکت کی اور دُلہن کی طرف سے اس کے چند عزیز آئے۔ اور جب دُلہن نے پہلی مرتبہ راشد کے مکان کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی ساس نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ فاخرہ کو ان بازوؤں میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔ یہ کیفیت وہ ان لمحوں میں محسوس کرتی تھی جب بچپن میں اس کی ماں اسے گود میں اٹھا لیتی تھی۔

فاخرہ کی حالت میں ایک واضح طور پر تغیر آ رہا تھا۔ پہلے اس کا صبح و شام کام یہ ہوتا تھا کہ اوپر اپنے کمرے میں جا کر چار دیواری میں خود کو مقید کر لے اور کتابوں کا مطالعہ کرتی رہے۔ گھر کے کاموں میں وہ بہت کم دلچسپی لیتی تھی ——— تفریحی مشاغل سے تو اُسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا لیکن اب وہ بڑے شوق سے اپنی ساس کا ہاتھ بٹاتی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ باہر جا کر بھی گھوم پھر آتی تھی۔

اور پھر وہ وقت آ گیا جب اس نے اپنے اندر کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی محسوس کی۔ راشد اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ کھڑکی میں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ شوہر کو آتے دیکھ کر جھینپ گئی تھی۔

راشد اس کے پہلو میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا دیکھ رہی ہو فاخرہ؟"

"کچھ نہیں"۔ وہ محجوب ہوئی جا رہی تھی

"شاید چاند کو دیکھ رہی ہو ——— عورت کی اپنی گود میں جب چاند آنے والا ہوتا ہے تو اسے آسمانی چاند سے بڑی دلچسپی ہو جاتی ہے"

فاخرہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

وقتِ مقررہ پر فاخرہ کی گود ایک بڑی پیاری اور خوب صورت بچی سے بھر گئی۔ اس ننھے وجود نے گھر کی رونق کو بہت بڑھا دیا تھا فاخرہ کا ماضی محض ایک خواب بن کر رہ گیا تھا اور راشد بڑا خوش تھا کہ اس کا ایثار رائیگاں نہیں گیا۔ اس نے اپنی قربانی سے ایک ایسی لڑکی کی اداسیوں کو دُور کر دیا ہے جو زندگی کی ساری خوشیوں سے مایوس ہو چکی تھی۔ اور جو اپنی زندگی کو زندگی کی سزا تصور کر رہی تھی۔

جیسے جیسے فاخرہ اور راشد کی بچی ثمینہ کی عُمر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اُس کی خوبصورتی بھی بڑھتی جا رہی تھی، وہ جب اپنی توتلی زبان میں کوئی بات کہنے کی کوشش کرتی تھی تو اُس کی ماں کا چہرہ وفورِ مسرت سے گلنار ہو جاتا تھا۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے یُوں چار سال کی مدت بیت گئی۔

ثمینہ خاصی صحت مند بچی تھی۔ کبھی کبھی اسے بچوں کی عام تکلیف ہو جاتی تھی اور ماں باپ کی توجہ سے تھوڑی دیر بعد

دُور ہوجاتی تھی۔ اور اس شام جب فاخرہ نے اس کا بدن ذرا گرم دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔ کیونکہ اس کے پہلے بچے کا جسم بھی اسی طرح گرم ہوگیا تھا۔ اس نے کلینک میں راشد کو فون پر اپنی بچی کی کیفیت بتائی اور اسے باصرار جلد آنے کے لیے کہا۔

راشد نے اسے تسلی دی۔

"فکر مت کرو فاخرہ! موسم بدل رہا ہے۔ یہاں بھی بہت سے بخار میں مبتلا لوگ آئے ہیں"۔

مگر فاخرہ نہ جانے دل میں کیسا خوف محسوس کر رہی تھی کہ اسے ثمینہ کے پاس بیٹھے ہوئے چین ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی ساس نے بھی ہر چند تسلی دی لیکن وہ مُصر تھی کہ راشد کو فوراً آجانا چاہیے، ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور ادھر راشد بیوی کے بار بار ٹیلی فون آنے پر صرف یہی کہے جا رہا تھا:

"فاخرہ! اتنے مریض چھوڑ کر میں کیسے آسکتا ہُوں اور پھر کوئی فکر کی بات ہو جب نا ———"

نو بجے راشد آیا۔ کھانا کھانے سے پہلے اُوپر کمرے میں گیا۔ فاخرہ ثمینہ کو گود میں لیے کمرے کے اندر ٹہل رہی تھی۔ اس نے بچی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پیشانی گرم تھی۔

"جلدی کیوں نہیں آئے؟" فاخرہ کا لہجہ تلخ تھا

راشد نے تحمل سے کام لیا۔

"تم تو خواہ مخواہ پریشان ہوجاتی ہو ———"

"خواہ مخواہ پریشان ہوگئی ہُوں ——— بدن کوئلے کی طرح نہیں جل رہا ——— مریض چھوڑ کر نہیں آسکتے تھے ——— انھیں دوسرے روز نہیں دیکھ سکتے تھے ——— میری بچی کی حالت ——— میں نے بتایا نہیں تھا کہ بیمار ہوگئی ہے ——— تمھیں اپنے مریضوں کی پڑی رہی ——— اس سے بے پروا ہوگئے ———"

"نہیں ایسی بات نہیں فاخرہ!" راشد نے بچی کو بیوی کی گود سے اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"شام سے نہ مسکراتی ہے نہ کھلونوں سے کھیلتی ہے۔" فاخرہ نے مضطربانہ کہا

"بس یہی بات ہے ———؟ کمال کرتی ہو۔ بچوں کی طبیعت نرم گرم ہوتی رہتی ہے۔ ابھی مسکرائے گی، کھلونے مانگے گی، ہنسے گی، قہقہے لگائے گی، دیکھتی جاؤ۔ کیوں گُڈیا، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!"

راشد ثمینہ کو "گُڈیا" کہا کرتا تھا۔ اور جب وہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا تو اُسے توقع تھی کہ ثمینہ ضرور کچھ نہ کچھ کہے گی، مگر وہ چُپ چاپ باپ کے کندھے سے اپنا سر لگائے نیم وا آنکھوں سے سامنے دیوار کو دیکھتی رہی۔

راشد نے اسے دوا پلائی۔ دوا کے بعد لگتا تھا کہ اس کی پہلی سی حالت عود کر آئی ہے ——— لیکن وہ پھر ویسی کی ویسی ہوگئی۔

فاخرہ نے اسے بار بار بلایا۔ اور وہ خوب صورت گڑیا اس کے پاس پلنگ کے اُوپر رکھ دی جسے وہ چند روز پیشتر اس کے لیے خرید کر لائی تھی اور جسے اس نے بیحد پسند کیا تھا۔

ثمینہ نے گڑیا کو آغوش میں لیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لٹا لیا۔

گیارہ بجے کے قریب اُسے قے آگئی اور جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ راشد نے اسے انجکشن لگایا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور قے آگئی۔

فاخرہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ مسلسل کانپے جا رہی تھی۔ راشد کی سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی امّی بھی اُوپر آگئی تھی۔ بچی کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ راشد نیچے گیا۔ اُس نے اپنے ڈاکٹر دوستوں کو فون پر جلد آنے کی تاکید کی اور دو ڈاکٹر آگئے۔

وہ جو کچھ کر سکتے تھے اُنھوں نے کیا ـــــ مگر صبح چار بجے ثمینہ کا جسم ہمیشہ کے لیے بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

فاخرہ کی حالت ایسی تھی کہ فرطِ مایوسی سے وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی جیسے قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی ہے وہ دیوار سے لگ کر کھڑی تھی۔

راشد نے آہستہ سے ماں کے کان میں کہا:

"امّی! اسے نیچے لے جاؤ۔"

ماں فاخرہ کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی:

"آؤ بیٹی!"

فاخرہ چلنے لگی۔ یکایک وہ رُک گئی۔ ثمینہ کے پلنگ کی طرف آئی اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ گڑیا کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس نے گڑیا اٹھا لی اور سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر خود بخود سیڑھیوں سے اُترنے لگی۔ اس کی ساس پیچھے پیچھے جانے لگی۔ فاخرہ ایک کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ساس چند منٹ دروازے پر رُک کر اُسے دیکھتی رہی۔ فاخرہ نے کوئی حرکت نہ کی تو وہ اُوپر آگئی۔

تجہیز و تکفین کا کام بڑی خاموشی کے عالم میں ہو گیا۔

ثمینہ کو گئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور فاخرہ کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں گرا تھا اور یہ صورتِ حال خطرناک تھی۔

سارے گھر میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فاخرہ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ گڑیا اس کی گود میں تھی۔ راشد دو تین بار اپنی ماں سے کہہ چکا تھا "امّی! اسے رُلاؤ۔" ماں نے جب آخری بار بیٹے سے یہ لفظ سُنے تو فاخرہ کے پاس آ بیٹھی۔

"فاخرہ! تمھاری ثمینہ مر گئی ہے۔"

فاخرہ نے ساس کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"فاخرہ بیٹی! ثمینہ مر گئی ہے ـــــ راشد کی گڑیا مر گئی ہے۔"

اِس کا بھی وہی ردِّ عمل تھا۔

اس کی ساس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ اس نے بہو کی گود سے گڑیا لینے کی کوشش کی۔ یکایک فاخرہ تڑپ اٹھی۔ اس نے

گڑیا ساس کے ہاتھ سے چھین لی اور "نہ نہ" کہتی ہوئی اسے گلے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ اب آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

آٹھ دن گزر گئے۔

فاخرہ معمول کے مطابق ساس کا ہاتھ بٹانے لگی اور جب بھی اُسے کاموں سے فرصت ملتی تھی وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ گڑیا کو گلے سے لگا کر کرسی میں بیٹھ جاتی تھی اور دیر تک اسی طرح بیٹھی رہتی تھی ——— خیالوں میں گم صم ——— کھوئی کھوئی سی۔

ساس نے موقعہ پا کر گڑیا چھپا دی تو وہ آنسو بھری آنکھوں کے سامنے اس کے پاس آ گئی۔

"اماں! وہ تو نہ چھینیں ———"

"وہ کیا فاخرہ بیٹی؟"

"وہ ——— میری گڑیا۔"

اماں نے اُسے گڑیا دے دی۔

اماں کو پوتے کی بڑی آرزو تھی اور ایک روز وہ اپنے بیٹے کو بتائے بغیر بہو کو ہسپتال میں لے گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیک کیا اور اسے یہ اذیت ناک خبر سنا دی کہ خالہ جان! آپ کی بہو کے اندر کچھ ایسی خرابی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر آئندہ بچہ ہوا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اماں نے یہ خبر بیٹے کو بتائی تو اس کی بھنک فاخرہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی اور اس پر گویا سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔

اس چھوٹے سے گھر میں اب ایک دوسرے سے الگ الگ اور کافی فاصلے پر دو جزیرے سے آباد ہو گئے تھے۔ فکر و اندیشہ کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر دم بدم ان سے ٹکراتی رہتی تھیں اور ان کے درمیان دوری کسی صورت بھی کم نہیں ہوتی تھی۔ راشد کے لیے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنی کشتی کبھی ایک جزیرے تک لے جاتا تھا اور کبھی دوسرے جزیرے تک، مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دوری جو پیدا ہو گئی ہے وہ کسی خاص واقعے کے بغیر ختم نہیں ہو سکتی۔

ماں دبے دبے لفظوں میں بیٹے سے کہہ دیتی تھی کہ گھر کی ویرانی کے تم خود ذمے دار ہو ——— راشد ماں کا اشارہ سمجھ لیتا تھا لیکن فاخرہ کو وہ اس کے حال پر چھوڑ کر از سرِ نو اپنا گھر بسانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

فاخرہ پہلے سے بھی کم بولتی تھی۔ ایک بار وہ شام کے وقت کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی تو راشد نے بڑی محبت سے پوچھا:

"فاخرہ! تم کیا فضاؤں میں دیکھتی رہتی ہو۔"

وہ اسی انداز میں کھڑی رہی اور کہنے لگی:

"دیکھو راشد! وہ چاند کا بیوٹی، وہ بادل، وہ افق کتنی دور ہے ——— اور انسان کے ہاتھ کتنے

چھوٹے ہیں ———"

"تمھیں ان سے کیا دلچسپی؟ ——— پکڑنا چاہتی ہو انھیں؟"

"ہاں"

"فاخرہ! پاگل ہوگئی ہو؟" راشد نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا

فاخرہ کی آواز گلوگیر ہوگئی، بولی:

"ہاں، میں پاگل ہوگئی ہوں ——— میں کہاں، وہ کہاں ـ جو چیز حاصل نہیں ہوسکتی اس کے لیے کوشش پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے ـ مجھے جو کچھ نہیں مل سکتا ـ وہ نہیں ملے گا ـ وہ نہیں ملے گا۔"

وہ زار و قطار رونے لگی۔

راشد اسے ہر طرح تسلیاں دیتا رہا اور وہ سسکیاں بھرتی رہی ـ ایک اندرونی ہیجان سے متواتر کانپتی رہی ـ اور پلنگ پر گر پڑی۔

○

کوکب کو اتنے برسوں بعد اپنے گھر میں دیکھ کر راشد حیران رہ گیا۔

وہ پہلے جیسی تھی ـ خوبرو، رنگ سُرخ و سفید، گہری نیلی آنکھیں۔

"راشد صاحب! آپ نے ہمیں اپنی شادی پر بلایا ہی نہیں تھا ـ ہم بھی ناراض ہو گئے تھے۔"

اس سے پیشتر کہ راشد کچھ کہے اُس کی ماں بولی:

"کوکب بیٹی! اتنی مدت کہاں رہیں؟"

"پشاور میں، خالہ جان! ان کا تبادلہ وہاں ہوگیا تھا۔"

شکوہ شکایت کی باتیں ہونے لگیں۔ کوکب فاخرہ سے مل کر بہت خوش نظر آتی تھی۔ مسکرا مسکرا کر اس سے گفتگو کرتی رہی۔ راشد کلینک چلا گیا اور فاخرہ باورچی خانے میں کھانے وغیرہ تیار کرانے لگی تو اس کی ساس نے کوکب کو سارے حالات سُنا دیے۔

"بیٹی! میری دلی تمنا تھی کہ اس گھر میں تُو آئے۔ مگر راشد کے سر پر ایثار کا جنون سوار تھا، میں کیا کرتی۔ اب گھر ویران ہوگیا ہے ——— ہر طرف وحشت برستی ہے ——— دن رات ایک سناٹا سا طاری رہتا ہے ——— میری سمجھ میں نہیں آتا ——— یہ ویرانی کیسے دُور ہوگی ——— یہ قبر کا سا سناٹا کیونکر ختم ہوگا ——— یہ زندگی ——— زندگی نہیں، موت سے بدتر ہے۔ لگتا ہے ہم کسی اندھے کُنویں میں گر پڑے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بُوڑھی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

کوکب نے ساری باتیں خاموشی سے سُنیں اور بولی:

"خالہ جان! مجھے راشد سے کوئی شکایت نہیں ——— میری زندگی مطمئن ہے۔"

"مگر ہماری حالت ——— بیٹی!"

کوکب کچھ سوچ میں پڑ گئی، چند لمحوں کے بعد بولی:

"ویسے خالہ جان! آپ کی بہو بڑی پیاری ہے۔"

"پیاری تو ہے۔ پر ———"

"خالہ جان! بعض چیزوں پر انسان کو اختیار نہیں ہے۔"

دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور جب کوکب جانے لگی تو فاخرہ سے کہنے لگی:

"اب آپ لوگوں کو ہمارے یہاں آنا ہوگا ——— میں راشد سے ٹیلی فون پر دن مقرر کر لوں گی۔"

○

جمعہ کی شام کو کلینک بند تھا اور یہ شام راشد کی اپنی تھی۔

وہ اور فاخرہ جب کوکب کے بنگلے پر پہنچے تو اس نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے دونوں کا خیر مقدم کیا۔ خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ فاخرہ کو خوب معلوم تھا کہ کوکب راشد کی کلاس فیلو تھی اور اس کی ذات میں بڑی دلچسپی لیتی رہی تھی۔ اُس کی اور اُس کے والدین کی بڑی خواہش تھی کہ وہ راشد کے ہاں دُلہن بن کر جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا تو فاخرہ کو توقع تھی کہ وہ دل ہی دل میں اس سے شاکی ہوگی لیکن ایسے رویّے کا اظہار نہ تو اس نے فاخرہ کے یہاں کیا تھا اور نہ اب اپنے گھر میں کر رہی تھی اور فاخرہ کو اس پر حیرت تھی۔

ساڑھے دس کا وقت ہو چکا تھا اور کوکب کے مہمان اپنے گھر جانے سے پہلے آخری بار چائے پی رہے تھے۔ کوکب سارا وقت خوب خوب چہکی تھی اب خاموش تھی۔

فاخرہ نے خالی پیالی میز کے اُوپر رکھ دی اور اُٹھنے لگی تو کوکب اس کے پاس آ گئی۔

"فاخرہ! کیا میں ایک اچھی بہن نہیں ہوں؟"

فاخرہ اس سوال پر گھبرا گئی۔

"یہ آپ کیوں پُوچھ رہی ہیں؟" اس نے اپنی طرف سے سوال کر دیا

"میں نے اس کی ضرورت محسوس کی ہے۔"

راشد اپنی بیوی سے مخاطب ہوا:

"فاخرہ! کوکب نے جو کچھ پُوچھا ہے اس کا جواب دے دو۔"

"کیا جواب دوں! ——— بڑی اچھی ہیں۔"

"بہن کی طرح نا؟"

"کیوں نہیں!"

"تو مجھے اپنی بہن سمجھتی ہو ——— اور ایک بہن اپنی بہن کو کچھ دے تو بہن خوشی سے قبول کر لیتی ہے ——"

یہ کہتے ہوئے کوکب کمرے سے نکل گئی اور جب لوٹی تو اس نے اپنے بازوؤں میں اپنی سوئی ہوئی ایک سالہ بچی کو سمیٹ رکھا تھا۔

"یہ آج سے تمھاری بچی ہے ——"

فاخرہ کوکب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ راشد اپنی کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔

"میرے شوہر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ——— کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

کوکب فاخرہ کے قریب ہوگئی ——— اور قریب ہوگئی اور بچی اس کی بانہوں کے حوالے کر دی۔

"کوکب! تمھارا یہ بہت بڑا احسان ہے لیکن ایسا ہوگا کیسے؟" راشد نے پوچھا

"کیا میں نے بتا نہیں دیا کہ میرے شوہر اور اس کے عزیزوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میرے دو بچے اُدھر سو رہے ہیں ——— میری یہ بچی میرے اپنے گھر میں رہے یا آپ کے گھر میں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے ——"

"کوکب! صرف یہی نہیں اور بھی کئی باتیں ہیں ———"

کوکب دو تین لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی:

"ٹھیک ہے کچھ اور باتیں بھی ہیں ——— مثلاً بچی ماں سے جُدا کیسے ہو سکتی ہے؟ اتفاق یہ ہے کہ یہ مجھ سے زیادہ مانوس نہیں ہے ——— مانوس ہے اپنی آیا سے، جو اس کا بہت خیال رکھتی ہے ——— یہ آیا بچی کے ساتھ ہی جائے گی۔"

فاخرہ چادر میں لپٹی ہوئی بچی کو گود میں لیے کھڑی تھی۔

"یہ میرا تحفہ قبول ہے؟" کوکب نے مسکرا کر پوچھا

"جی!" فاخرہ کے ہونٹوں سے صرف یہی ایک لفظ نکلا

"یہ آج سے آپ کی ہے ——— میں آیا نہیں کروں گی ———"

"کیوں نہیں آیا کریں گی، یہ آپ کی ہے ———" فاخرہ نے کہا

"میری نہیں فاخرہ بہن! آپ کی ———" کوکب نے فاخرہ کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

گاڑی میں بیٹھتے وقت کوکب نے بچی کی پیشانی چوم لی، جس سے وہ جاگ اُٹھی اور رونے لگی۔ جلدی سے آیا نے اُسے گود میں لے لیا، اور وہ چپ ہوگئی۔

"امّی! ہم ایک تحفہ لے کر آئے ہیں۔" راشد نے کمرے میں داخل ہوتے وقت ماں سے مخاطب ہو کر کہا

"تحفہ! ——— کیسا تحفہ؟"

"وہ تحفہ امّی! جو فاخرہ کے لیے ہے، میرے لیے اور آپ کے لیے بھی، جس سے اس گھر کی ساری بوریت دور ہو جائے گی، جس سے اِس گھر میں رونق آجائے گی۔"

آیا اندر آگئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" امّی نے پُوچھا

"دیکھ لیجئے امّی!"

آیا نے بچّی امّی کی طرف بڑھا دی۔ امّی اسے گود میں لے کر حیران نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگی

"امّی! یہ آج رات سے پہلے کوکب کی تھی، آج فاخرہ کی ہے۔ یعنی فاخرہ اس کی ماں ہے ـــــ میں باپ اور آپ مشفق دادی جان"

راشد نے اُسے سارا قصّہ سُنا دیا۔

"کتنی بڑی قربانی!" امّی کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا

"یہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے"

"بیٹا ـــــ" امّی بیٹے سے کہنا چاہتی تھی کہ تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس نے کیا کیا ـــــ مگر وہ خاموش ہوگئی۔

راشد نے بیوی سے کہا کہ بچّی کہیں جاگ نہ پڑے اسے اُوپر لے جائے۔ اور فاخرہ اسے گود میں لے کر اوپر جانے لگی۔ جب اس نے آدھی سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ امّی بولی:

"راشد! یہ تمھاری بیوی کچھ خوش نظر نہیں آتی۔"

"نہیں امّی! ایسی بات نہیں ہے ـــــ آپ اس کے دل کی کیفیت سمجھ نہیں سکتیں۔ کبھی کبھی خوشی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انسان اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔"

امّی مطمئن ہوگئی۔

بچّی فاخرہ کے پہلو میں سو رہی تھی اور راشد اپنے پلنگ پر لیٹ چکا تھا۔

"فاخرہ!"

"جی۔"

"کیا یہ معجزہ نہیں ہے ـــــ کتنا ایثار ہے یہ ـــــ"

"راشد صاحب! میرا خیال ہے اس وقت آپ کو بہت افسوس ہو رہا ہوگا ـــــ آپ بڑے پشیمان ہوں گے ـــــ"

"کس بات پر فاخرہ!"

"آپ ہنستے کیوں نہیں ـــــ آپ کی امّی بھی یہ کہنا چاہتی تھیں کہ تم نے کوکب کو نظر انداز کر دیا اور اس نے ـــــ بات بالکل ٹھیک ہے ـــــ ایک حقیقت ہے ـــــ"

راشد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جو ہو چکا سو ہو چکا ——— مجھے اس پر کوئی افسوس، کوئی شرمندگی نہیں ہے ——— میں نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا ——— سمجھ لیا ———"

"شکریہ۔"

"اِس کی ضرورت نہیں تھی ———" یہ کہتے ہوئے راشد کی نگاہ بچی پر پڑی جو اُسے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

"کتنی پیاری ہے، فاخرہ! معلوم نہیں کوکب نے اِس کا کیا نام رکھا ہے ——— ہم اسے 'ثمینہ' کہیں گے ———"

فاخرہ خاموش رہی، اس نے اپنی رضامندی یا غیر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔

○

راشد دیکھ رہا تھا کہ فاخرہ ثمینہ کی ذات میں بہت کم دل چسپی لے رہی ہے۔ اس کی ماں کا بھی یہی احساس تھا۔ دونوں اُس کے رویے پر پریشان تھے مگر صبر و تحمل کا ثبوت دے رہے تھے۔ امّی فاخرہ کی غیر موجودگی میں اپنے بیٹے سے بہو کے بچی کے ساتھ اس غیر مادرانہ سلوک پر کُڑھتی تو راشد اسے درگزر کرنے کا مشورہ دیتا بلکہ درخواست کرتا کہ وہ مزید انتظار کریں۔ فاخرہ کا رویہ آہستہ آہستہ درست ہو جائے گا۔

ثمینہ بیشتر وقت آیا ہی کے پاس رہتی، وہی اسے دُودھ پلاتی، نہلاتی دُھلاتی، کپڑے بدلتی، اپنے ساتھ سُلاتی، فاخرہ کبھی اسے گود میں لیتی بھی تو ناگواری کے عالم میں، اور اس کی کوشش یہی ہوتی کہ اسے جلد سے جلد اپنے آغوش سے نکال دے۔

اُس روز امّی کسی پڑوسن کے گھر سے واپس آئی تو دیکھا کہ بچی کمرے میں تنہا پڑی بُری طرح رو رہی ہے، آیا باورچی خانے میں ہے ——— اور فاخرہ غائب ہے۔ وہ اُوپر پہنچی تو دیکھا کہ فاخرہ کرسی میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہے اور اس کی گود میں گڑیا پڑی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر اس کے اندر یک لخت غصّے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ چیخ کر بولی:

"فاخرہ! تمھیں معلوم نہیں بچی نیچے بُری طرح رو رہی ہے؟"

"تو اس کی آیا کہاں ہے؟"

"اس کا خیال رکھنا صرف آیا ہی کا فرض ہے؟"

"ہاں اماں جان! کوکب نے اسے اسی غرض سے ساتھ بھیجا تھا" فاخرہ نے جواب دیا

"اور تمھارا کوئی فرض نہیں! ——— کیسی سنگدل ماں ہو! بچی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اور تم اوپر مزے سے کتاب پڑھ رہی ہو ——— کیا کوکب نے اپنے جگر کا ٹکڑا اس لیے تمھارے حوالے کیا تھا کہ اُس سے ایسی ظالمانہ بے نیازی برتو ——— اُس نے تو تم پر رحم کھا کر اپنی بچی دی تھی ———"

فاخرہ نے کُرسی سے اُٹھتے ہُوئے کتاب اور گُڑیا تپائی پر رکھ دیں۔

"اماں! میں نے اُس سے رحم کی درخواست نہیں کی تھی۔"

"احسان کا بدلہ یُوں چکایا جاتا ہے!"

"اس نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ——— کیا ہے تو آپ لوگوں پر کیا ہے۔"

"ماں تم ہو اس کی ———"

"میں ماں نہیں ہُوں۔" فاخرہ کی آواز بھی بلند ہوگئی تھی۔

امّی کا چہرہ اور سُرخ ہوگیا۔

"کیا کہتی ہو؟ ——— تم ماں نہیں ہو ——— کوکب نے تمھیں کیا سمجھ کر اپنی بچّی دی تھی ——— ؟"

"یہ میں نہیں جانتی ——— بہرحال میں اس کی ماں نہیں ہُوں ——— اِس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ اُس کی رگوں میں میرا لہو نہیں ہے ——— یہ میرے وجود کا حصہ نہیں ہے ——— میں اسے کیسے اپنی بچّی سمجھ کر گود میں لے لُوں ——— میں کیا لگتی ہوں اس کی۔ قسمت کو یہ منظور نہیں ہے کہ میری گود میں میرا اپنا بچّہ ہو ——— دونوں بچّے اس نے چھین لیے ——— کیا اب میں غیروں کے آگے بازو پھیلاؤں کہ خدا کے لیے میری گود بھر دو ——— مجھ پر رحم کھاؤ ——— اماں! میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

فاخرہ ان لمحوں میں بھُول گئی تھی کہ اس سے مخاطب کون ہے ——— جو کچھ دل میں آتا تھا وہ سوچے سمجھے بغیر کہے جا رہی تھی۔

"اور تم اس کے لیے تیار ہو کہ اس بے جان گُڑیا کو اپنی گود میں سجائے رکھو۔" امّی نے غضب ناک نظروں سے تپائی پر پڑی ہوئی گڑیا کی طرف اشارہ کرکے کہا

"ہاں ——— یہ میری بچّی کی تھی ———"

"اور وہ زندہ بچّی اِس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ——— ؟"

"یہی سمجھ لیں!"

"کیا؟" امّی کے غصّے کا پارہ بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھی، گڑیا کو اٹھایا اور اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

"اماں ———!" فاخرہ کا جسم لرزنے لگا۔ وہ دھم سے کرسی کے اُوپر گر پڑی۔

آیا بچّی کو گود میں اٹھائے اُوپر آچکی تھی۔ فاخرہ کو اس طرح گرتے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آئی اور "بی بی ——— بی بی" کہنے لگی۔

امّی یہ منظر دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔ اس نے فاخرہ کا ہاتھ پکڑ کر دو تین بار "فاخرہ! فاخرہ!!" کہا۔ فاخرہ بے ہوش چکی تھی۔

امّی نے آیا کو وہیں ٹھہرایا ——— سیڑھیوں سے نیچے اُتری ——— اور کلینک میں بیٹے کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا۔

راشد کے آنے تک فاخرہ کے سر سے کافی لہو بہہ چکا تھا۔ راشد نے اس کے سر پر پٹّی باندھی اور اسے پلنگ پر

لٹا دیا۔

دو گھنٹے کے بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوگئی۔ مگر اب وہ اصرار کر رہی تھی کہ اسے اس کی بہن کے گھر میں پہنچا دیا جائے وہ یہاں نہیں رہے گی — ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رہے گی — ایک بار وہ پلنگ سے اُٹھ کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بھی جا چکی تھی۔ اگر راشد بعجلت تمام اسے اپنی گرفت میں نہ لیتا تو وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر جاتی۔

امّی کا غصہ جو فاخرہ کو بیہوش دیکھ کر وقتی طور پر دب گیا تھا، پھر اُبھر آیا تھا۔ وہ بیٹے سے بولی:

"راشد! اسے چھوڑ آؤ اس کے گھر۔"

راشد نے ماں کو صبر سے کام لینے کی تلقین کی تو وہ بپھر گئی۔

"میں کہتی ہوں اسے چھوڑ آؤ۔"

فاخرہ نے ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا —— دروازے پر چلی گئی۔ راشد نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دیکھو فاخرہ! عقل سے کام لو۔" راشد نے اسے آخری سیڑھی پر پہنچ کر کہا

"نہیں — میں یہاں نہیں رہوں گی — میں دیوار سے سر پٹک پٹک کر جان دے دوں گی — کہے دیتی ہوں — میں یہاں نہیں رہوں گی — ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہوں گی ——"

راشد مجبور ہوگیا، اس نے اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔

امّی اور آیا — دونوں نیچے آگئیں۔

"آیا!" امّی نے آیا سے مخاطب ہو کر کہا "لے جاؤ اسے"۔

آیا کھڑی رہی۔

امّی کڑک کر بولی:

"لے جاؤ اسے جہاں سے لائی ہو۔"

آیا جانے لگی۔

○

پھر وہی کمرہ، وہی کتابیں، وہی کھڑکی اور وہی کرسی، اِس دُنیا سے نکل کر وہ جس دنیا میں گئی تھی وہ اسے ایک خواب محسوس ہونے لگی تھی۔ سب کچھ کتنی جلدی ختم ہوگیا تھا۔ جیسے ایک دم بلندی سے اسے نیچے دھکا دے دیا گیا ہو۔ جیسے وہ کسی اجنبی جزیرے کی سیاحت کے بعد پھر اپنے پرانے ساحل پر اُتر گئی ہو۔

اُس کی بڑی بہن ناصرہ اسے دیکھ دیکھ کر کُڑھتی رہتی تھی وہ اب اسے ایک طرح وبالِ جان سمجھنے لگی تھی۔ اُسے روتے ہوئے دیکھتی تھی تو کہتی تھی: "فاخرہ! تُو ہے ہی بدنصیب، کوئی تیرے لیے کیا کر سکتا ہے؛ یہ تیری بدنصیبی ہمیں بھی لے ڈوبی ہے"

بہن کا یہ سلوک اس کے لیے غیر متوقع تھا تاہم وہ کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔

یہی حالت تھی جب کوکب اس گھر میں آئی۔ ناصرہ گھر کے کام میں مصروف تھی اور فاخرہ اُوپر اپنے کمرے میں تھی۔

ناصرہ نے کوکب کا نام ضرور سُنا تھا مگر اسے دیکھا کبھی نہیں تھا۔ اُسے اپنے یہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آپ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی ہیں ——— میرا نام کوکب ہے، راشد بھائی کی دُور کی رشتہ دار ہوں۔

"آئیے ——— تشریف رکھیے۔"

کوکب بیٹھ گئی۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے فاخرہ کا حال پُوچھا۔ ناصرہ گویا پھٹ پڑی "کیا بتائیں اس کا کیا حال ہے! مصیبت میں جان ڈال دی ہے اس نے۔ میرے لڑکے نے دوبئی سے ہم دونوں کے لیے ٹکٹ بھیج دیے ہیں ——— کاغذات بھی تیار ہیں ——— پر اس کا کیا بنے گا! پریشان ہیں ——— بدنصیب سدا کی بدنصیب ہے ———"

کوکب اوپر چلی گئی۔

"معاف کیجئے گا۔ اجازت کے بغیر آپ کے کمرے میں آ گئی ہوں۔"

فاخرہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی اور اس نے اپنے اندر شرمندگی کے احساس کو سرایت کرتے ہوئے پایا ——— اور اس احساس کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں شکر گزار ہُوں کہ آپ نے میرا خیر مقدم کیا ہے ———" کوکب نے اس کے پاس پلنگ کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ فاخرہ نے اس کے لیے کُرسی خالی کر دی لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔

"فاخرہ! جو کچھ ہُوا ہے مَیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سُنوں گی، نہ کہوں گی، فقط یہ پُوچھنا چاہتی ہُوں کہ اب سوچا کیا ہے؟"

"کیا سوچنا ہے؟"

"تمھاری بہن اور بہنوئی تو باہر جانے والے ہیں ——— تمھیں خبر ہے نا!"

"مجھے معلوم ہے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ زندگی اپنے سارے دروازے بند کر لے جب بھی ایک دروازہ کھُلا رہتا ہے جہاں کوئی روک نہیں ہے۔"

کوکب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اپنی اس بہن کے ہوتے ہوئے تم اس دروازے کی طرف رُخ کرو گی؟"

"جب کوئی اور راستہ دکھائی نہ دے تو آدمی کیا کرے۔"

"فاخرہ! سُنو میری بہن! موت کا صرف ایک دروازہ ہے ——— مگر زندگی کے بے شمار دروازے ہیں، کہیں کہیں دروازے کو بند پاؤ گی۔"

"سب بند ہیں۔"

"تم نے کئی دروازوں پر تو ابھی دستک ہی نہیں دی۔"

فاخرہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ کوکب اپنی ساڑھی کے پلّو سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔ اُس وقت اُس کے ذہن میں خیال آیا، یہ عورت کون ہے! ——— یہ کیوں میرے آنسو پونچھ رہی ہے، اسے مجھ سے کیا ہمدردی ہے ——— کیوں ہے! ——— وہ اپنا چہرہ پیچھے ہٹانا چاہتی تھی کہ یک لخت اس کے ذہن میں آجاتا یہ عورت جو بھی ہے سو ہے مگر اس نے اپنی طرف سے مجھے دُنیا کی سب سے بڑی اور قیمتی چیز دی تھی ——— یہ وُہی تو ہے ——— وُہی ———

"معاف کیجئے۔ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟" فاخرہ نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا

"میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟ اس لیے کرتی ہُوں کہ تمھاری بہن ہوں ——— تم مجھے جو کچھ سمجھنا چاہو سمجھ سکتی ہو ——— لیکن میں تو تمھیں اپنی بہن ہی سمجھتی ہُوں ———"

"شکریہ!"

اُس روز کوکب شام تک فاخرہ کے پاس بیٹھی رہی اور جب جانے لگی تو وہ فاخرہ کو اپنے ہمراہ اپنے یہاں جانے کے لیے رضامند کر چکی تھیں۔

○

فاخرہ نے کوکب کے عالی شان بنگلے میں بڑی گھبراہٹ محسوس کی۔ اس کے شوہر کی کوٹھی بھی اس کے پرانے گھر کے مقابلے میں خاصی شاندار تھی مگر یہ بنگلہ تو کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ اُس کے زیادہ گھبرانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوکب اور اس کے شوہر کا رویّہ اس کے ساتھ ہمدردانہ تھا۔ کوکب اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ فاخرہ خود کو ایک طائرِ نو گرفتار تصوّر کرنے لگی تھی۔ وہ ہر رات کو اپنے دل سے عہد کرتی کہ صبح اُٹھ کر کہیں چلی جائے گی مگر صبح سویرے ہی کوکب اس کے لیے بیڈ لے کر آجاتی۔

آیا بچّہ گاڑی میں ثمینہ کو بٹھا کر باغ میں جانے لگتی تو کوکب فاخرہ کو بھی ساتھ بھیج دیتی۔ آیا کوکب کی ہدایت کے مطابق باغ میں جا کر کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتی ——— فاخرہ گاڑی کے پاس تنہا رہ جاتی، بچّی روتی تو وہ اسے اٹھا لیتی۔

کوکب بچّی کے لیے نئے کپڑے بنواتی تو فاخرہ سے کہتی کہ ثمینہ کے لیے کپڑا پسند کر لو۔

آیا تین روز کے لیے چھٹی لے کر چلی گئی تو کوکب نے فاخرہ سے کہا کہ اسے اپنے پاس سُلا لیا کرے۔

ان تین دنوں میں ثمینہ زیادہ فاخرہ ہی کے پاس رہی۔

کوکب کی ان کوششوں سے فاخرہ بچّی سے کسی قدر مانوس ہو گئی۔ بچّی بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جب اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر دیتی تو فاخرہ کو کچھ یُوں محسوس ہوتا کہ ماں کا وُہ پیار جو مایوسیوں کے ہجوم میں کہیں بھٹک رہا تھا ——— اُس کے دل کو سہلانے لگا ہے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں تھی۔ اور وہ بچّی سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہوتی گئی۔

○

ثمینہ دو روز سے نظر نہیں آ رہی تھی۔
فاخرہ نے گھر کے ایک نوکر سے پوچھا:
"ثمینہ کہاں ہے؟"
"میں کیا جانوں بی بی! ——— بڑی بی بی گاڑی میں بٹھا کر لے گئی تھی۔
"کہاں؟"
"خبر نہیں ———"
فاخرہ کوکب کے کمرے میں گئی۔
"کوکب بہن! وہ کہاں ہے ——— ثمینہ"
"کیوں پریشان ہو گئی ہو؟" کوکب نے سوال کیا
"ہے کہاں؟"
کوکب دو تین لمحے خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی:
"فاخرہ! اصل میں معاملہ یہ ہے کہ اسے ایک اندرونی بیماری ہو گئی تھی ——— چند روز علاج کے بعد لے آؤں گی اسے"
"کیا ہسپتال میں ہے؟"
"وہیں اس کا علاج ہو سکتا ہے؟"

○

وہ ایک طوفانی شام تھی۔
فاخرہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی اور کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔
بادل زور سے گرجا۔ کتاب اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اُس نے کتاب اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ——— اس کی نظر سامنے انگیٹھی پر ثمینہ کی تصویر پر پڑی۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ بادل پھر گرجا۔
وہ پلنگ سے اُتر گئی۔ تصویر کے قریب گئی ——— اور قریب گئی اور ایک جذبہ بے اختیار اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ دروازے میں سے نکلی اور کوکب کے دروازے پر آ گئی۔
"کوکب! کوکب!!" اس نے دروازے پر زور زور سے دستک دیتے ہوئے کہا
کوکب نے دروازہ کھول دیا۔
"وہ ——— میری ثمینہ ——— وہ بیماری ——— وہ ——— وہ۔ کوکب خدا کے لیے مجھے اس کے پاس لے چلو

——— مجھے لے چلو کوکب!"

کوکب کا شوہر بھی وہاں آ گیا۔

"ابھی رات ہے فاخرہ!" کوکب نے کہا

"یہ طوفانی رات ——— یہی تو اوہ ——— مجھے لے چلو ——— میں کہتی ہوں ———"

"لیے چلتے ہیں۔" کوکب کے شوہر نے کہا

چند منٹ بعد تینوں گاڑی میں بیٹھے تھے۔ فاخرہ نے اپنا سر گاڑی کی دیوار سے لگا دیا تھا۔ اُس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اُسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب گاڑی رُکی اور کب کوکب اس کا ہاتھ پکڑ کر کہیں لے گئی۔

ایک دم روشنی ہو گئی۔

فاخرہ نے سامنے پلنگ پر ثمینہ کو سوتے ہوئے دیکھا۔

"میری ثمینہ" کہہ کر اُس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔

یکایک اس نے اپنے سامنے ساس کو دیکھا ——— پھر اپنے شوہر کو ——— دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنے مکان کے کمرے میں تھی۔

○

اَن پُورنی

ممتاز مفتی

پتہ نہیں یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی۔ لیکن کایا پلٹ جب بھی ہوتی ہے ایسے ہی ہوتی ہے۔ کچھ پتہ نہیں دیتی کہ کیوں ہوئی کب ہوئی۔ اس گوری کی طرح دبے پاؤں آتی ہے جو بائل کی جھنکار کو بیرن سمجھتی ہو۔

اس کایا پلٹ کے تحت آنند کمار نہ کمار رہا نہ آنند رہا۔ پہلے وہ کمار بھی تھا آنند بھی۔ کمار اس لیے کہ ریاست انگاہ کے مہاراج کا پتر تھا۔ آنند اس لیے کہ کوئی چاہ نہ تھی جو پورن نہ ہوئی ہو۔ اِدھر چاہ کی، اُدھر پوری ہوئی۔ یہی آنند ہے نا کہ ہر آرزو پوری ہو جائے۔ نہ انتظار نہ محرومی نہ بے چینی، آنند کو پتہ ہی نہ تھا کہ ایسی آرزو بھی ہو سکتی ہے جو پوری نہ ہو۔

زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں ایسی آرزو پیدا ہوئی تھی جس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہ تھی یہ آرزو کوئی ایسی مشکل بھی نہ تھی۔ ایک پتلی دُبلی۔ سوئی سوئی کھوئی کھوئی۔ ڈولتی جھومتی مرئی۔ خود سے دور لے جانے والی گائیکا تھی۔ اَن پُورنی۔

اَن پورنی جب سے راجدھانی میں آئی تھی اک دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کا چرچا نہ تو رنگ روپ کی وجہ سے تھا نہ گائیکی کی وجہ سے، رنگ روپ میں کئی گانے والیاں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ گائیکی میں بھی وہ ایسی جاذب نہ تھی کہ سننے والے تڑپ کر رہ جائیں۔ الٹا وہ تو سنانے کے لیے گاتی ہی نہ تھی۔ ترہت بھانے کے لیے نہ کرتی۔ اپنے قریب لانے کے لیے نہیں الٹا دور لے جاتی۔ گائیکی میں تیرتی نہ تھی ڈوب جاتی تھی جیسے خود کی سدھ بدھ نہ رہے وہ دوجے کی سدھ بدھ کیا مارے گی۔ ان سب باتوں کے باوجود۔ ان پورنی کی دھوم مچی تھی۔

شاید بھید یہ تھا کہ اَن پورنی میں لوبھ نہ تھا۔ نہ کمانے کا نہ خود کو اچھلنے کا۔ نہ آپ چھلکتی تھی نہ دوجوں پر چھینٹے اڑاتی۔ جلتی ضرور تھی پر مدھم مدھم۔ نما نما گاتی۔ نما نما جیتی۔ جیون میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نمی نمیاں بھڑک کر جلنے والوں کو ماند کر دیتی ہیں۔ وہ تشنگی کا ایسا دریا بہا دیتی ہیں کہ بڑے بڑے تیراک ڈوب جاتے ہیں۔ آنند بہت بڑا تیراک تھا۔ ڈوبنا نہیں جانتا تھا۔ جسے دھن دولت اور مرتبہ مان کے مشکیزے حاصل ہوں۔ وہ بھلا کیوں ڈوبے!

آنند نے ان پورنی کی دھوم سنی تو شوق چرایا کہ چلو چل کر دیکھیں جس کی اتنی دھوم ہے۔ وہ ہے کیسی۔ یار دوستوں کی سنگت میں وہ چوبارے میں پہنچا تو اسے دیکھ کر اَن پورنی کی نائیکہ کنول نینی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بکی بکی رہ گئی ہوش آیا تو سواگت میں بچھ بچھ گئی۔ اتنی آؤ بھگت کی وہ امیدیں رچا کے بیٹھ گئے۔ پھر اَن پورنی آئی۔ ہاتھ جوڑ نمسکار کیا۔ سکائی لجائی بیٹھ گئی۔ پھر وہ ساز دل کی دھن میں کھو گئی۔ جے جے دنتی کی دھن تھی "پیاں پڑوں گی پلنگھا نہ چڑھوں گی"۔

ایک وہ جسم کی ادھ کلی تھی دوجے آنکھ ادھ کھلی تھی۔ وہ بھی دیکھنے والی نہیں دکھنے والی۔ اور پھر آدھی اوٹ میں۔

یوں جان لو کہ سامنے ایک ٹم ٹم ٹمٹمانے والا دیا جل رہا تھا۔

اَن پورنی ان کے پاس بیٹھی تھی۔ سامنے، پر پاس نہ تھی آدھی سامنے آدھی نہ جانے کہاں۔ گانے میں اتنا گداز جیسے واقعی پیاس پڑی ہو۔ ترہت میں اتنی دور ہی جیسے پلنگھاہ چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسا ہوتا ہے۔ جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی ہیں۔ وہ جسم کا جھنجھنا بجا دیتی ہیں۔ جو پاس ہو کر بھی آدھی نہ جانے کہاں ہوتی ہیں۔ وہ وجود کی سرتیاں چھیڑ دیتی ہیں۔ اَن پورنی نے آنند کے وجود کی سرتیاں چھیڑ دیں اک ان جانا نغمہ ابھرا جس سے وہ واقف نہ تھا۔ کیسے واقف ہوتا۔ وہ تو ایسیوں کا شیدائی تھا جو ساری کی ساری پاس آ بیٹھتی۔ وہ سمجھتا تھا پا لینا ہی دولت ہے۔ نہ پانے کی عظمت سے واقف نہ تھا۔

اس رات آنند کمار بھون" واپس پہنچا تو وہ اکیلا نہ تھا۔ اَن جانے میں اَن پورنی کو ساتھ لے آیا تھا۔ خود پر برہم تھا۔ یہ مجھے کیا ہوا بکھرا بکھرا کیوں ہوا۔ اس نے وہ رات ٹہل ٹہل کر کاٹی۔

پھر کئی ایک راتیں ٹہل ٹہل کر کٹیں۔ پہلے خود سے لڑتا رہا۔ نہیں نہیں۔ کوئی بات ہے کہ چوبارے بیٹھی دو ٹکے کی چھوری راج کمار کو الٹھ پلٹھ کر کے رکھ دے لیکن خود سے کوئی کب تک لڑے گا۔ آخر ایک رات اپنے خاص نوکر سیوک ناتھ کو بلایا۔ سیوک ناتھ جا ابھی جا۔ بند گاڑی جوت کر ساتھ لے جا۔ موتی بازار سے ہو کے دریے گاڑی کھڑی کر دیجیو۔ پیدل ان پورنی کے چوبارے میں جائیو۔ نائیکہ مرگ نینی سے کہیو راج کمار ان پورنی کی راہ دیکھ رہے ہیں — اور دیکھو گاڑی محل کے صدر دروازے پر نہ آئے۔ بات نہ نکلے مرگ نینی کو پتہ چلا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھاگی بھاگی ان پورنی کے پاس گئی۔ دھن بھاگ پتری جو تو آج کی رات جاگی جاگی کاٹے، سوئی سوئی نہ رہے تو کیا پتہ کل رانی بن جائے۔ بیچاری مرگ نینی کو کیا پتہ تھا کہ جاگی نے نہیں، ادھ سوئی نے جوت جگائی ہے جوانی میں مرگ نینی خود کٹورہ سی کھلی آنکھ والی تھی۔ مدھ بھری ادھ کھلی کے چمتکار سے واقف نہ تھی۔

اَن پورنی کمار بھون میں یوں داخل ہوئی جیسے سپنے میں کوئی آ جاتا ہے سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ اس نے ارد گرد کی جانب نہ دیکھا۔ محل کی سج دھج پر دھیان نہ دیا۔ کمار کی آنکھوں میں کھبنے کے بجائے اپنی آنکھیں جھکائے رکھیں۔ ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔ کمار بولا آؤ اَن پورنی بیٹھو۔ یہ سن کر وہیں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ کمار بھی اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا کمار بولا ان پورنی تو نیچے کیوں بیٹھ گئی

بولی مہاراج جہاں میری جگہ ہے وہیں بیٹھتی نا۔ آپ کے چرنوں میں ہم نے تو تجھے پلنگھاہ پر بیٹھنے کو بلایا ہے۔

بڑی کرپا ہے مہاراج پر میں اس جوگی نہیں۔

جوگی نہیں کہ پلنگھاہ چڑھنے کو اپمان جانتی ہے۔ کمار نے طعنہ دیا۔

نہ مہاراج وہ بولی جو مان ہی نہیں تو اپمان کیسے ہوگا۔ پلنگھاہ چڑھنا تو دنیا کا دھندا ہے مہاراج!

دھندا ہے تو گھبراہٹ کیوں؟

اس دھندے جوگی نہیں مہاراج!

کچھ کمی ہے کیا؟

پتہ نہیں مہاراج بت چڑھتا ہے۔ چت نہیں چڑھتا۔
کمار یہ سن کر ٹھٹکا پھر بولا چت کہیں لگا ہے کیا؟
نہ مہاراج!
یہ کیسے ہو سکتا ہے اَن پُورنی!
پتہ نہیں مہاراج کہ ایسے کیوں ہے۔ پر ایسے ہی ہے۔ مَیں نام کی اَن پورنی نہیں۔ جیو کی بھی اَن پورنی ہوں اپنے آپ میں پورن نہیں ہوں!
کیا مطلب؟ آنند نے پوچھا۔
ادھوری ہوں مہاراج۔ آدھی ہوں آدھی نہیں ہوں!
میں نہیں سمجھا وہ گنگنایا۔
میں آپ نہیں سمجھی مہاراج آپ کو کیسے سمجھاؤں!
وہ چپ ہو گیا۔
یوں سمجھ لیجئے مہاراج وہ گنگنائی کہ چھٹی کے چاند اسمان ہوں آدھی ادھر ہوں آدھی پتہ نہیں کدھر ہوں۔ پلنگھاہ پر وہ براجمان ہوتی ہیں مہاراج جو پورن ماشی کے چندا کی طرح پورن ہوتی ہیں۔ ان پورنی بیچاری پلنگھاہ پر کیا چڑھے۔ چڑھی نہ چڑھی برابر۔
وہ چپ ہو گئی۔ سیس نوائے نین جھکائے بیٹھ گئی۔ اس کی باتیں کمار کے ہردے پر چیونٹیوں کی طرح چڑھ گئیں۔ دل میں دھنس گئیں۔ اتنا پیسجا کہ جواب دینا بھول گیا۔ پتہ نہیں کس بات پر۔ لاج پر جوان پورنی کے مکھ پر گھٹا بن کر چھائی تھی اس کے بھولپن پر یا سیج کی باس پر جو اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں میں یوں رچی مچی تھی جیسے پیاز میں آنسو رچے ہوتے ہیں۔
آنند کو چپ لگ گئی ایسی چپ جو لگ جائے تو اتنی دُور لے جاتی ہے کہ واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے پھر پورن بندہ بھی ان پورن ہو جاتا ہے۔
کمار اور اَن پُورنی دونوں چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ بیٹھے رہے۔ سیوک ناتھ نے کئی بار باہر سے جھانکا۔ بیچارہ حیران اندر دو بت بیٹھے تھے۔ اک دوجے کے پاس۔ اِک دوجے سے دور۔ بہت دور جیسے اک دوجے کی خبر نہ ہو۔
سیوک ناتھ سمجھتا تھا کہ راج کمار جو کئی دنوں سے کھویا کھویا۔ آدھا آدھا تھا۔ ان پورنی کے آنے پر پورا ہو جائے گا اسے اپنا کھویا آدھا پھر سے مل جائے گا۔
پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ راج کمار پر بے چینی کے بادل چھائے تھے۔ پھر کوئی چترنینی آئی پلنگھاہ چڑھی پھلجھڑیاں چلیں ہوائیاں چھٹیں۔ زگدار چکر گھومے جھولے سارا کمرہ جگ مگ جگ مگ ہو گیا تھا۔ پر آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ دونوں ہی بت بنے بیٹھے ہیں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ جد توڑی بچاری نہ ہو بت کیسے بنے۔ پر یہ دو بت کیسے بن گئے بھگوان تیری لیلا تو ہی جانے!

جب آنند کمار واپس اپنے آپ میں آیا تو کایا پلٹ ہو چکی تھی وہ ۔ وہ آنند نہ رہا تھا جو چپ ساگر میں ڈوبنے سے پہلے تھا اور اس کی نظر میں اَن پورنی ۔ وہ اَن پورنی نہ رہی تھی جو پلنگھا چڑھانے بلائی گئی تھی ان پورنی آنند بولا ۔ سہمی سہمی کیوں بیٹھی ہے چنتا نہ کر جو تو چاہے گی وہی ہوگا ۔

اَن پورنی چاہے ادھوری تھی پر استری تھی ۔ اس نے دیکھا کہ کلف اتر گیا ہے ۔ نظر ڈھل گئی ہے ۔ آواز نچلے سروں پر گر گئی ہے سارے بلمپت ہو گئی ہے ۔ سر میں آنند کی جگہ براہ کی مینڈھ لگ گئی ہے ۔

ان پورنی وہ بولا جو میں تجھے اپنا بنانا چاہوں تو ۔

مہاراج میں ودھوا ہوں ۔

ودھوا! وہ چونکا ۔

وداہ ہوا تھا ؟ پھیرے ہوئے تھے ؟ خوشی میں ٹھاہ ٹھاہ بندوقیں چلیں اِک گولی چوک کر پران پتی کو لگی ۔ بھاگیہ کا لکھا پورا ہوا ۔ میں ان پورنی رہ گئی ۔

اوہ ——— کمار کو ٹھیس لگی ——— پھر ——— اس کے حق میں آواز نہ تھی ۔

پھر بھوبنی بنی ۔ ابھاگن بنی نحس گنی گئی ۔ اتنی نندا ہوئی کہ سہار نہ سکی ۔ گھر چھوڑ کر چلی آئی ۔

کمار کو پھر چپ لگ گئی ۔ پھر دربت بن گئے ۔ رات بیت گئی ۔ بھور سمے ہو گیا تو آنند جاگا ۔ اسے جاگا دیکھ کر وہ بولی مہاراج بھور سمے ہو گیا ۔

وہ اُٹھ بیٹھا ۔ ہاں ۔ جانے سے پہلے اک بات بتاتی جا !

جی مہاراج وہ بولی ۔

جیون میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کی تجھے چاہ ہے ۔ ڈھونڈ ہے ۔

ہاں مہاراج وہ بولی ۔ اک سُر ہے مہاراج جس کی مجھے چاہ ہے ڈھونڈ ہے ۔ جو مجھے اَن پورنی سے پورنی کر دیتی ہے ۔ ٹوٹ جوڑ دیتی ہے ۔ اسی سُر کے کارن میں چوبارے چڑھی ۔ دھندا اپنایا ۔

اس دن سے آنند کمار کو ڈھونڈ پڑ گئی ۔ سُر کی ڈھونڈ ۔ سر کیا ہوتی ہے ۔ کہاں ہوتی ہے ۔ کیسے حاصل ہوتی ہے ۔ ڈھونڈ ۔ کتنی بڑی دین ہے ۔ جو جوہڑ کو ندی بنا دیتی ہے ۔ جو گڑی کشتی کو پتوار دے دیتی ہے ۔ جو زندگی کو سمت بخش دیتی ہے ۔

کسی نے کہا ۔ کانتا ونتی سے پوچھو ۔ شہر میں وہی سر کی رانی ہے ۔

کانتا ونتی ہنسی بولی راج کمار کو کس نے کہا کہ میں سُر کی رانی ہوں ۔ نہ مہاراج میں تو سُر کی داسی بھی نہیں ۔ میں تو جیون بھر سر انجان رہی ۔ بول کے بندھن میں پھنسی رہی ۔ مہاراج چوبارے کی گائیک سر کو کیا جانے گی ۔ سننے والے تو بول کے متوالے ہیں سر کی سار نہیں جانتے وہ تو لفظ کے پجاری ہیں ۔ ایسے لفظ ہوں جو تن کو چنگاری دکھا دیں ۔ ہر دیئے کو پھلجھڑی بنا دیں ۔ یوں کہ شریر کی رنگ پچکاری میں بھیگ جائیں ۔ بس یہی ان کی چاہ ہے مہاراج وہ آنکھ نہیں دیکھتے اس کا مٹکنا دیکھتے ہیں ۔ شیشہ نہیں دیکھتے اپنی مورت

دیکھتے ہیں۔

تو پھر شہر میں کون ہے جو سُر کا پتہ دے سکے؟ انند کمار نے پوچھا۔

نہ مہاراج کانتا بولی۔ شہر میں نہیں۔ شہر تو مہاراج تن کا پن گھٹ ہے جہاں ہر دے کی جھجھریاں بھری جاتی ہیں۔ شہر تن کا بیوپاری ہے تن کا پجاری ہے اور سُر مہاراج وہ تو جگھٹ کی چیز نہیں۔ اکیلے کی چیز ہے۔ بن کا کوئی جھنڈ ہو۔ پہاڑ کی کوئی کھوہ ہو ویرانے میں کوئی مندر ہو۔ وہاں کوئی سُر کا پجاری مل جائے تو دھن بھاگ۔

کانتا سے ملنے کے بعد آنند کمار کی سُر لگن اور بڑھ گئی۔

اتفاق سے سوامی ہمیش چندر شہر آ گئے۔ ان سے جا ملا۔ سوامی بولے پتر یہ تو کس جھنجھٹ میں پڑ گیا۔ سُر کا تو کوئی انت نہیں یہ ساری رام لیلا جو ہے یہ سُر کا ہی تو چمتکار ہے۔ کرشن مہاراج بانسری بجا رہے ہیں اور ہمارے سامنے یہ تماشہ ہو رہا ہے۔ سُر کی رچنا جاننا چاہتے ہو پتر تو گوالکا پربت پر تلسی مہاراج کے مندر دا جاؤ۔ اگر تمہارے من کا کان کھلا ہے تو سارا بھید کھل جائے گا۔ آنند کمار سوچتا رہا سوچتا رہا اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ پھر وہ مہاراج سے جا ملا بولا پتا جی مہاراج! میں یاترا جانا چاہتا ہوں۔ آگیا دیجئے۔

یاترا۔ کیسا یاترا مہاراج نے پوچھا۔

مہاراج میں گوالکا پربت پر تلسی مہاراج کے مندر دا کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔

مہاراج کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ انگاہ کے راج کمار کو تلسی مہاراج کی لگن کیسے لگ گئی۔ اچھا وہ بولے۔ ہم وچار کر کے بتائیں گے۔

راج کمار کے یاترا جانے کی بات سارے محل میں گونجی۔ باتیں ہوئیں ہاتھ چلے سینے تھام لے گئے۔ انگلیاں ہونٹوں پر رکھی گئیں۔ راج رانی نے کہا مہاراج اس میں کوئی بھید ہے سیوک ناتھ کو بلایا گیا۔ بھید کھلنے کے بجائے اور الجھ گیا۔ سیوک ناتھ بولا مہاراج ساری شرارت اَن پورنی کی ہے اس نے راج کمار کو بت بنا دیا ہے۔ ان پورنی کو حاضر کیا گیا۔ وہ بولی۔ مہاراج میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ مہارانی بولی بس تو نے کچھ نہ کر کے راج کمار کا دل اچاٹ کر دیا۔ اب کوئی جتن کر کہ یاترا کی لگن ٹوٹ جائے۔

اسی رات ان پورنی راج کمار کے چرنوں میں جا بیٹھی۔ آپ میرے کارن جا رہے ہیں نا؟ اس نے پوچھا۔

ہاں تیرے کارن!

تو نہ جایئے میں آپ کی داسی بن کر رہوں گی۔

مجھے داسی نہیں چاہیے۔

اَن پورنی آپ کی سنگ ساتھن بن کر رہے گی۔

مجھے اَن پورنی نہیں پورنی چاہیے۔ وہ پورنی جسے میں نے سُر سے پورن کیا ہو۔ مہاراج کو پتہ چل گیا کہ راج کمار نہیں رکے گا۔ رد کا گیا تو ٹوٹ جائے گا۔ پھر لوٹ آنے کی صورت بھی نہ رہے گی اس لیے انہوں نے آگیا دے دی ساتھ چھ ایک نوکر کر دیے انھیں تاکید کر دی کہ ساتھ ساتھ وہیں نظر میں رکھیں۔

اَن پورنی راج کمار کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو دفعتاً اس نے دیکھا کہ وہ تو پورن ہوگئی ہے اس کا کھویا آدھا اسے مل گیا ہے۔ پہلے دھاڈھس لگتی تھی کھوئی تھی پر بے کل نہ تھی۔ اب وہ بے کل رہنے لگی۔

ایک سال بیت گیا اس کی بیکلی بڑھتی ہی گئی۔

پھر ایک دن راج کمار کے ساتھ گئے ہوئے پانچ نوکر واپس آ گئے۔ بولے مہاراج ہم نے تو بڑا دھیان رکھا پر اک رات اچانک سیوک ناتھ کو ساتھ لے چلے گئے ہم سوتے ہی رہ گئے۔ پھر ہم نے بڑی ڈھونڈ کی۔ آس پاس کو چھان مارا پر کوئی بھولا ہوتا تو گھر آتا۔

اَن پورنی نے سنا تو دل دھک سے رہ گیا۔ چار ایک دن ٹھنڈی برف پڑی رہی پھر اٹھی۔ اب میں یہاں کس لیے بیٹھی ہوں۔ اب یہاں کون آئے گا۔ بس ڈھونڈ پر میں خود نہ نکلی تھی دوجے کو اس ڈھونڈ پر لگانے کا مجھے کیا ادھیکار تھا۔ اس نے دھندے کو سمیٹا اور چل نکلی۔ جگہ جگہ گھومی مندر مندر ٹھکانا کیا۔ میگھ مندر میں شری ہمیش چندر مل گئے۔ بولے پتری تو یہاں میگھ مندر کے دیرانے میں کیا کر رہی ہے؟

اَن پورنی بولی مہاراج سُر کی ڈھونڈ میں نکلی ہوں۔

نہ پتری وہ بولے۔ تو سُر کی ڈھونڈ کیسے کرے گی تو تو صرف دکھ سے واقف ہے۔ سُر کی ڈھونڈ تو وہ کر سکے ہے جو دکھ کے ساتھ سکھ سے بھی واقف ہو۔ جو لوبھ لگن بیت چکا ہو۔ رنگ رلیاں منا چکا ہو جیون کی موم بتی دونوں سروں پر جلا کر دیکھ چکا ہو۔

نہیں مہاراج وہ بولی میں صرف دکھ کی تو نہیں ہوں میں تو دیپ اٹھی پلنگھاہ پر بیٹھتی رہی۔

آدھوں وہ مسکائے دیشیا خالی تن کی نہیں ہوتی تن من دونوں کی ہوتی ہے۔ تیرا چیت تو بت میں نہیں ہے۔ تو کیسے دیشیا بنتی نہ پتری پہلے اپنے آپ کو جا تو پھر ڈھونڈ پر نکلو۔ اور پھر اپنا آپ تیاگ کر پالو۔ یہی ڈھونڈ کا بھید ہے۔ اور پتری تو استری ہے۔ استری سُر کی ڈھونڈ پر نہیں نکلتی سُر والے کی ڈھونڈ پر نکلتی ہے۔ اَن پورنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے گردن لٹک گئی۔ یہ دیکھ کر سوامی بولے تو ریاست انگاہ کی ہے۔ ہاں مہاراج اَن پورنی گنگنائی۔ وہ بولے تو نے ہی راج کمار کو سُر کی ڈھونڈ پر لگایا تھا۔ وہ چپ ہوگئی۔ وہ مسکائے بولے جا پتری اس کی ڈھونڈ کر جس کی ڈھونڈ پر نکلی ہے۔ خود کو دھوکا نہ دے۔ خود ساتھ نہ دے تو ڈھونڈ کبھی پورن نہیں ہوتی۔

اس رات اَن پورنی سوچوں میں پڑی رہی۔ رو رو کر بے حال ہوگئی ہے بھگوان۔ میں کیا کروں۔ کس کی ڈھونڈ کروں۔

پھر وہ مندر مندر پھری۔ دیوی دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ کر روئی۔ ہاہاکار کی ہے دیوتا مجھے بھگوان کی ڈھونڈ دے دو۔ نہ سُر رہے نہ سُر والا رہے لیکن سیس نوا کر جب وہ سُر اٹھاتی تو دیوتا کی جگہ سامنے آنند کمار کا مکھ مسکاتا۔ وہ جگہ جگہ پھری استھان استھان گھومی بھگوان کی لگن کیلئے بھجنوں کے بہانے روئی پیٹی لیکن ہر دیوی دیوتا کے بت پر آنند کمار کا مکھ لگا تھا۔ آخر وہ ہار گئی۔

ڈھونڈ چھوڑ کر مادھوری کے ویران مندر میں اک کوٹھڑی میں پڑ رہی ہے۔ بھگوان جو تو چاہے دے نہ چاہے نہ دے۔ پر میرے راستے کا پتھر تو ہٹا دے پاؤں کی بیڑی تو کاٹ دے۔

ایک روز مادھوری مندر کی بوڑھی پجارن دوڑی دوڑی آئی بولی پتری دو سوامی آ رہے ہیں۔ تو دو بڑی کوٹھڑیاں صاف کر دے

وہ کچھ دن یہیں رہیں گے۔

کون آرہے ہیں پجارن ان پورنی نے پوچھا۔

ایک تو سوامی آنند کمار ہیں جو اوتر بلسی مہاراج سے آئے ہیں۔

اَن پورنی کا دل دھک سے رہ گیا یا جو کانپا جھاڑو گر گیا۔

پجارن نے دیکھا ہے بھگوان ہردے میں اتنی بھیڑ۔ وہ دیکھ نہ سکی۔ منہ پھیر لیا ان دیکھا کر دیا۔ بات جاری رکھی تاکہ دیکھن کا بھید نہ کھلے۔

دوجے سوامی ہمیش چندر ہیں نیچے نارائین نگر سے پدھاریں گے۔

جب سوامی آنند کمار پہنچے تو مندر کی ساری پجارنوں نے باہر نکل کر اُن کا سواگت کیا لیکن اَن پُورنی اپنی کوٹھڑی سے نہ نکلی۔ وہ کواڑ کی درز سے دیکھتی رہی — ہاں، وہی۔ وہی ناک نقشہ، وہی روپ سروپ لیکن جیسے ہوا بدلی بدلی ہو — ان کے پیچھے پیچھے وہی ان کا سیوک ناتھ۔

جب شام پڑی تو وہ سیوک ناتھ کے پاس گئی ہاتھ جوڑ نمسکار کیا۔ سیوک ناتھ نے جواب دیا۔ بولی تو نے مجھے پہچانا — میں اَن پورنی ہوں۔ مجھے سوامی سے ملا دے۔

سیوک ناتھ بولا اَن پورنی کوئی اور مانگ مانگ یہ مانگ میرے بس کی نہیں۔ سوامی راہ چلتے مل لیں تو مل لیں ویسے کسی سے نہیں ملتے تو اک بار کہہ کر تو دیکھ کہ اَن پورنی آئی ہے۔ جو در کہوں گا وہ بولا۔

سیوک ناتھ نے ایک بار کہا دو بار کہا تین بار کہا۔ پر کچھ نہ ہوا۔

کچھ نہیں ہوا۔ اَن پورنی نے پوچھا۔ اونہوں سیوک ناتھ نے سر ہلا دیا۔

سوامی جی نے سنا نہیں وہ بولی۔ ٹھہر میں پتر پر موٹا موٹا لکھ کر لاتی ہوں۔ تو ہاتھ میں پتر تھما دیجو۔ سیوک ناتھ پتر اندر لے گیا۔ باہر نکلا تو ان پورنی نے پوچھا کیوں کچھ ہوا۔

ہاں ہوا۔ وہ بولا۔ اَن پُورنی کا مکھ کھل گیا۔ سوامی جی نے پتر کو دیکھا بولے۔ کون اَن پورنی۔ ان پورنی پہ سن کر وہیں گھاس پر وہیں ڈھیر ہو گئی۔

اگلے روز وہ پھر سیوک ناتھ کے پاس آئی بولی بس اک بار اور سیوک ناتھ اک بار۔ آخری بار۔ سوامی سے جا کر کہو۔ وہ اَن پورنی جسے تم نے چلتے سمے کہا تھا۔ اَن پورنی میں تجھے آپ سُر سے پورن کروں گا۔

اس نے بات پوری کر کے سر اٹھایا تو دیکھا کہ سیوک ناتھ کے پیچھے سوامی ہمیش چندر کھڑے مسکا رہے ہیں۔ بولے اَن پورنی اَب بیکار ہے پتری اب تیرے لئے وہاں کچھ نہیں دھرا۔ پہلے وہ پورن تھا۔ پر تو نے اسے سُر کی ڈھونڈ دے دی۔ وہ تیری خاطر سُر ڈھونڈتا رہا۔ جو پانے سے پہلے تو اسے اپنا لیتی تو اپنا لیتی پر تو اس نے سُر کا بھید پا لیا اور سُر نے اسے اَن پورن کر کے کسی اور ڈھونڈ پہ لگا دیا۔ اب وہ اپنی خاطر ڈھونڈ میں لگا ہے اب وہ کیا جانے کہ اَن پورنی کون ہے۔

اَن پُورنی کی چیخ نکل گئی۔

مندر کی پجارن باہر نکل آئی۔ کیا ہُوا۔

کچھ نہیں سوامی مہیش بولے۔ اس پتری کے راستے کا پتھر ہٹ گیا۔ اُسے راستہ مل گیا۔ یہ جا رہی ہے پجارن اسے وداع کرو

لیکن پجارن نے اَن پورنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ آنسو؟

سوامی مہیش مسکرائے بولے یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ جاؤ پتری اب تم آزاد ہو۔ پاؤں کی بیڑی کٹ گئی۔ دھن بھاگ تمہارے!

روندے نین نمانے

منظور الٰہی

وہ بہت سرد رات تھی، وقفے وقفے سے بُوندا باندی ہو رہی تھی، چھوٹے چھوٹے گڑھے پانی سے بھر گئے تھے، سڑکوں پہ پھسلن تھی، ہم بانو اور خلیل کے منتظر تھے، وہ آئے تو آتشداں میں آگ بھڑک اُٹھی، کمرے کا حُسن جگمگا اٹھا، باتوں کے سوتے اُبل پڑے، قہقہوں سے در و بام گونجنے لگے، بے تکلف، خندہ زن، فکر سے آزاد، بانو اور خلیل سے رشتہ ہی کچھ ایسا تھا، دفعتاً خلیل نے کہا:

"ہم نے ایک خوب صورت کافی سنی ہے، کسی کو ماڈل ٹاؤن بھجوا کے وہ ٹیپ منگوا لیں۔"

"میاں! ہوش کے ناخن لو، اِس موسم میں؟ آپ ابھی یہیں ہیں، ٹیپ پھر سُن لیں گے۔"

"جناب سُنیں گے تو ہمارے انتخاب کی داد دیں گے۔"

ہم ٹال گئے مگر خلیل میاں نے ضد پُوری کی، چپکے سے فون کر دیا اور وہ ٹیپ آگئی۔ کھانے کے بعد ٹیپ کیا لگائی کہ ایک طوفان بپا ہو گیا۔

اُچّیاں تے لمّیاں لال کھجوراں
تے پتّر جنہاں دے سادے
ننگے پنڈے مینوں چھمکاں مارن
تے میرے روندے نین نمانے

آواز کا جادو، لَے کا زیر و بم، لفظوں کا چناؤ، آواز اور آہنگ یک جان ہو گئے، لفظ اور لَے گلے ملے، اُچّیاں تے لمّیاں کھجوراں' کا اتار چڑھاؤ، رگِ ساز میں صاحبِ ساز کا لہو رواں تھا۔ ع

مہجور چناں حورے نالد بہ رباب اندر

پھر یہ درد بھرا مصرع فضا میں گونج گیا:

سُرخ گلاباں دے موسم وچ پھُلّاں دے رنگ کالے

محبوب کے ہجر میں دنیا اندھیر تھی، سُرخ گلاب اپنا رنگ و بُو کھو چکے تھے، پھر اصل دُنیا تو دل کے اندر آباد تھی۔ ع

حُسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حُسن

صاحبِ دل تجلیات دل میں سمیٹ لیتا ہے

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگِ مئے بیروں نشست از بس کہ مینا تنگ بود

کوئی بیدل کی وسعتِ قلبی اور عالی ہمتی کہاں سے لائے، یہ جامِ جہاں بیں روزِ ازل سے ارزاں ہوا، مگر دنیاوی آلائشوں سے مکدر ہو کے رہ گیا۔

کافی کا سوز و گداز ہمیں بہا کے لے گیا، اُسے سُنتے اور چپ ہو جاتے، پھر سنتے اور چُپ ہو جاتے، ایک ایک مصرع داد طلب تھا:

ساڈیاں عُمراں تو وِیر! لمّی عُمر وے تیری

تو عتیق ہے، تو قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۚ

جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحبِ جلال و عظمت ہے باقی رہے گی۔

معلوم نہیں خلیل اُس رات یہ گراں بہا تحفہ دینے پہ کیوں مُصر تھے، مسلسل تیس برس اس نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا، عزت و تکریم، پیار، خلوص کا برگِ سدا بہار،

برسوں پیشتر ایک دفعہ مری سے لوٹتے ہوئے دیر ہو گئی۔ جہلم ریسٹ ہاؤس میں جگہ نہ ملی، خیال آیا کہ خلیل گجرات میں ہیں، کیوں نہ اُن کے ہاں شب باشی ہو۔ رات گئے اطلاع دیے بغیر پہنچ گئے۔

"صاحب اور بیگم صاحبہ تو سینما دیکھنے گئے ہیں"۔ اردلی نے کہا

"تو بھئی! بُلا لاؤ، کہو گھر پہ مہمان آئے ہیں"۔

تواضع میں بانو ہمیشہ پیش پیش رہیں، ہمیں بتلائے بغیر اُنھوں نے فوراً ملازم بھجوا دیا کہ مُرغ لے آئے۔ وہ کب ذبح ہُوا، کب تیار ہوا، کھانا میز پہ آیا تو مُرغ کی بوٹیاں قطعاً تعاون نہیں کر رہی تھیں، بس اتنی سی بات پہ دیر تک ہنستے رہے، دل صاف ہوں، تکلف کا حجاب نہ ہو، ایک دُوسرے کے لیے دل میں محبت کے جذبات ہوں تو چھوٹی چھوٹی باتیں پُر لطف ہو جاتی ہیں۔ رشتۂ مودّت و اخلاص کا یہ مقام سب کو نصیب نہیں ہوتا۔

وحدتِ مغربی پاکستان کے اوّلین برسوں میں ہم لاہور سیکریٹریٹ میں تھے۔ سردیوں میں دوپہر کا کھانا اکٹھا کھاتے۔ اربابِ ثلاثہ کے تیسرے رُکن مفتی صاحب تھے، ہر لنچ کیریئر میں انواع و اقسام کی نعمتیں ہوتیں اور سرما کی خوشگوار دوپہر بسیار خوری، لان میں ٹہلائی اور ہنسی مذاق کی نذر ہو جاتی۔ اگلے سال سرکاری ملازمت کے سلسلے میں خلیل کوئٹہ پہنچ گئے، دَورے پہ وہاں جانا ہُوا، خلیل کے ہاں ٹھہرا، وہی تلطّف اور خاطر مدارات، ناشتے سے لے کر رات گئے تک خوش گپیاں، چند ماہ بعد پھر کوئٹہ جانے کا پروگرام بنا تو مجھے وہاں ٹھہرتے ہوئے جھجک محسوس ہُوئی۔

آخر مہمان کے لیے صاحبِ خانہ کو تردّد کرنا پڑتا ہے، ایک حد تک گھریلو زندگی کا سکون متاثر ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے سرکٹ ہاؤس میں رہائش کا انتظام کر لیا، وہاں پہنچ کے سامان کھولا، کھانا کھا کے ذرا سستا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، خلیل فون پہ تھے۔

"بھائی! ایک ضروری کام ہے، جلدی آجائیے۔"

"ملنے کے لیے شام کو آ ہی رہا تھا ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ فوراً آجائیے۔"

خلیل کا مکان قریب ہی تھا، چند منٹوں میں میں اُن کے درمیان موجود تھا، باتیں شروع ہوئیں، چائے آگئی، آدھ پون گھنٹہ گزرا ہوگا کہ خلیل میاں کہنے لگے:

"جناب کا سامان مہمان کمرے میں رکھوا دیا ہے، آئندہ ایسی حرکت نہ کریں!"

خلیل کو ہمارے امریکہ آنے کی بڑی خوشی تھی، اُن کی جگہ ہمارے شہر سے دو سو میل دُور تھی، بلال کو ہدایت تھی کہ ہم جونہی پہنچیں اُن سے فون پر رابطہ قائم کریں، بڑی گرم جوشی سے ہمیں خوش آمدید کہا گیا، دوسرے روز وہ سانتا فے میں موجود تھے، دو ماہ پلک جھپکتے گزر گئے کوشش ہوتی کہ زیادہ وقت اکٹھے گزاریں، ایک جگہ نہ ہوتے تو روز فون پہ بات ہوتی۔

دوستوں کے پاس روڈ و سو جانے کی تیاری ہو رہی تھی، فون پہ بانو نے دو تین مرتبہ دُہرایا کہ ۲۲ تاریخ کو ضرور پہنچ جائیں۔

"آخر ۲۲ تاریخ کی کیا اہمیت ہے؟"

"اُس شام یہاں دوستوں کو دعوت دے رکھی ہے تاکہ آپ سے مل سکیں۔"

"دس روز کا قیام ہے، بعد میں کسی روز بلوا لیتے۔"

"اتنے لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنا ہے، دو دن خاصی مصروفیت رہے گی، آپ کے آنے کے بعد کام کرنا پڑا تو آپ کے ساتھ وقت کیسے گزاریں گے!"

تین گھنٹے کی مسافت کے بعد اُس پہاڑی مقام پہ پہنچ گئے جہاں خلیل کا گھر تھا، سورج غروب ہونے کو تھا، استقبال کے بعد خلیل نے کہا:

"آج چائے یہاں نہیں پئیں گے بلکہ 'اپنے گھر' میں۔"

دو تین فرلانگ کے فاصلے پر یہ گھر کوہ میں تھا، وہاں پہنچ کر خلیل نے نشست گاہ کی کشادہ فرانسیسی کھڑکیاں کھول دیں اور بچوں کی طرح خوش ہو کر کہنے لگے:

"اب نظارہ دیکھیں۔"

خوبصورت جھیل ہمارے قدموں میں تھی جس میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ لبِ آب ایک نوکا ڈول رہا تھا، پہاڑ اور جھیل کا حسین امتزاج بھلا معلوم ہو رہا تھا۔

"اچھے موسم میں آپ باہر بیٹھ کر لکھ پڑھ سکتے ہیں"۔ خلیل نے کہا

روڈوسو میں جو ہماری آؤ بھگت ہوئی وہ بہت اہم شخصیت سے کچھ سوا تھی، فرازِ کوہ پہ یہ کشادہ مکان ٹیکساز کے ایک امیر کبیر کی ملکیت تھا، ذاتی تعلقات کی بنا پر اس کا انتظام و انصرام خلیل کے ذمے تھا، جھیل میں سورج ڈوبنے کا منظر

غرقِ دریا مہر کی ہو دلربا افسردگی

مگر شفق کا لال گلابی عکس منظر کو بالیدگی بخش رہا تھا، غم ناک ہونے کی بجائے طربناک، اونچی چھتیں، پرانی وضع کا آتشدان، ضرورت کی سب چیزیں قرینے سے دھری تھیں مگر حکم تھا کہ یہاں صرف ناشتہ کرنا ہوگا، باقی وقت اُن کے ساتھ گزاریں۔

دعوتِ شبینہ ایک یادگار دعوت تھی، مسز میچل کے متعلق بہت کچھ سُن رکھا تھا مگر شنیدہ کے بُود مانند دیدہ' تعارف ہوتے ہی اس نے دونوں گالوں پہ پرجوش بوسہ دیا، سانس میں شراب کی تیز مہک۔

"تم بانو اور خلیل کے دوست ہو تو میرے بھی دوست ہوئے نا، یہاں کتنا قیام ہوگا؟ میرے ہاں کب آؤ گے؟ میرا مکان پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، وہاں سے طلوع و غروب کا منظر دیدنی ہے"۔ اس نے بہت سی باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں "تمھارے ہاں بھی کرسمس ایسے تہوار ہوتے ہیں؟ پاکستان کے لوگوں کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟" بانو نے صحیح کہا تھا "اس کی شراب نوشی پہ نہ جائیں، دل کی بہت اچھی ہے"۔ میں نے زیادہ وقت اُس کے میاں کی صحبت میں گزارا، میاں ٹیکساز کا ٹیپیکل (سکہ بند) لکھ پتی، تیل کی تکنیک میں یونیورسٹی سے اعلیٰ سند حاصل کی، تیس پینتیس برس جگہ جگہ کام کیا، عمر بھر سخت محنت کی، اب چند تیل کے کنوئیں اس کی ملکیت ہیں، مکانات، شاپنگ پلازا اور دفاتر اِس کے سوا، کام کی وجہ سے چین سے ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا، وقت کی بچت کے لیے زیادہ سفر ذاتی جہاز میں کرتا ہے، البتہ بیوی پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسے مکان میں موسمِ گرما گزارتی ہے جہاں سے گرد و پیش کی ساری زمین ان کی ملکیت ہے۔

اٹھتے ہوئے مسٹر میچل نے ایسی بات کہہ دی جو ہم سب کے لیے باعثِ فخر تھی "خان اور مسز خان کی آمد سے روڈوسو کے حلقے میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے، ان کا یہاں رہائش اختیار کرنا ہمارے لیے باعثِ عزت ہے"۔

تیسرے روز مسز میچل نے ہمیں چائے کی دعوت دی، امیرانہ ٹھاٹھ، گھر شیشے کی طرح صاف مگر کوئی ملازم نہ تھا، مچھلی اور پیسٹری بیحد لذیذ تھی۔ مسز میچل کا کہنا تھا کہ سب چیزیں اس نے خود بنائی ہیں، سورج غروب ہونے کا منظر دیکھنے کے لیے ہم سب باہر آ گئے۔ اردگرد کے نشیب و فراز، وادی اور پہاڑ میچلز کی ملکیت تھے۔ "گھروں کا ایک دوسرے میں پیوست ہونا مجھے پسند نہیں"۔ مسز میچل نے کہا۔ جی ہاں، سب روپے کا کھیل ہے، تمھیں کیا معلوم ہمارے لوگ کس حال میں رہتے ہیں، اندرونِ شہر بہت سے مکان ایسے ہیں جہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں، رخصت ہوتے وقت مسز میچل نے ہم سے وعدہ لیا کہ آئندہ اس کے ہاں قیام کریں گے! وہاں سے اُٹھ کے شبینہ کے لیے روہولو کے

ہاں جا پہنچے، روہولو خاندان کا تعلق میکسیکو سے ہے، عقیدہ کے لحاظ سے رومن کیتھولک، ماں جوان بیٹیوں پہ کڑی نظر رکھتی ہے خلیل نے متنبہ کر دیا تھا کہ کھانا واجبی ہوگا اور ہسپانوی شراب کا خانہ ساز کاک ٹیل بڑے تکلف سے پیش کیا جائے گا۔ میوزک کا شور ہوا تو روہولو کی بیٹیاں اور نوجوانوں کا ایک دستہ حرکت میں آ گئے، بالکونی میں لکڑی کا فرش رقص کی گردش تلے چیخنے لگا، چگی ڈاڑھی والے پاکستانی نوجوان نے سب سے چھوٹی بیٹی کے ساتھ رقص کرنا شروع کیا، اور وہ بھی یوں کہ ایک کے بعد دُوسرا رقص ختم ہونے پر بھی اس کا ہاتھ چھوڑنے کا نام نہ لیا،

تو جو چاہے تو مجھے چھوڑ کے جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں میرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا، جیسے نوجوان زبانِ حال سے کہہ رہا ہو "ہاتھ چھڑا کے جا سکتی ہو تو زور آزمائی کر لو"۔ خلیل نے یہ حرکت بھانپ لی اور نوجوان کو 'بیرن' کا خطاب دے دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ کمرے کی بتی گُل کر دو تاکہ ہم پہ کسی کی نظر نہ پڑے 'بیرن' کا سٹائل واقعی ایسا تھا جیسے مغربی یورپ کا خطاب یافتہ امیر زادہ ہو، اُس کی بچگانہ حرکتوں سے دیر تک محظوظ ہوتے رہے، ساری شام وہ اپنے 'حقِ ملکیت' سے دستبردار نہ ہوا۔

ایک سہانی سہ پہر کو خلیل نے کہا "آج آپ کو INN OF MOUNTAIN GODS لے چلتے ہیں۔ یہ کیسا نام ہے 'خدایانِ کُہسار کا مسکن'! اُونچے پہاڑوں کے دامن میں، ایک حسین وادی کی آغوش میں ہوٹل کی عمارت ایک لجائی ہُوئی دلہن کی طرح سمٹ کے رہ گئی تھی، فطرت کے بہت سے مناظر یہاں یکجا ہو گئے تھے، بلند و بالا پہاڑ، بوٹنگ کے لیے جھیل، گھاس کے زمردیں قطعوں کو نشیب و فراز سکھاتا ہوا گاف کورس، ہوٹل ایک ریڈ انڈین قبیلے کی ملکیت تھا، دو سو برس پہلے یہاں انہی کا راج تھا، یونانی دیوتاؤں کی طرح اِن کے دیوتاؤں کا استھان بھی پہاڑ کی چوٹیوں اور بادلوں میں ہوتا ہوگا۔ آخر مجازی خدا بھی عام لوگوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور رہنے کے لیے ایسے حسیں مقام کا انتخاب کرتے ہیں جہاں عام انسان کا گزر نہ ہو، کم و بیش دو سو برس پہلے سفید فام باشندے اس قبیلے اور اس کے خداؤں پہ غالب آ گئے، صدیوں پرانا روایتی نظام تہہ و بالا ہو گیا، جنگیں ہوئیں، صُلح ناموں پہ دستخط ثبت ہوئے، پھر ان صلح ناموں کا وہی انجام ہوا جو ایک طاقتور اور کمزور فریق کے مابین صلح نامے کا ہوتا ہے۔ اب یہ درماندہ اقلیت چند مخصوص علاقوں میں محصور ہو کے رہ گئی ہے جہاں اسے حقوقِ ملکیت حاصل ہیں اور اپنے رسم و رواج کے مطابق زندگی گزارنے کا حق، یہ لوگ اب گزرے دنوں کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں، سیاحوں کو محظوظ کرنے کے لیے پروں والی ٹوپیاں پہن کے بیٹھ جاتے ہیں، گرد و پیش ترقی کی رفتار بہت تیز ہے، ریڈ انڈین اس کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر پاتے۔ اِس ماحول میں اِن کا نوجوان طبقہ ایک گھٹن محسوس کرتا ہے، وہ سوچتا ہے نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے، نوجوانوں میں کثرتِ شراب نوشی اور خودکشی کا تناسب قومی تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔

بچوں نے بوٹنگ شروع کی تو ہم ہری ہری دوب پہ لیٹ گئے، یہ بڑی پرسکون اور آرام دہ تھی، گھاس پہ

لیٹے ہوئے مجھے خیال آیا کہ بے لوث پیار کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے، اسی سے تلخابۂ حیات شیریں ہے اور زیست کی دشوار گزار گھاٹیاں سہل ہو جاتی ہیں، دوستوں کے ساتھ بزم آرائی یاد آئی، جن سے فون پہ لمبی بات ہوتی، جن کی ہم نشینی کا لطف برس ہا برس پہ محیط تھا، ہم مذاق ہم مشرب دوست جو دل کی بات بھانپ لیتے،

تو سخن نگفتہ باشی بہ سخن رسیدہ باشد

طویل صحبتیں، جب ساعتوں کو پر لگ جاتے، ربودگی کے وہ لمحے جب نیند عنقا ہو جاتی، دوست پھر بھی تنگیِ داماں کی شکایت کرتے، "اس شہر کے لیے اتنا تھوڑا وقت لے کے آئے ہو"۔ دلوں کی باہمی کشش ایک دوسرے کے قرب کے لیے بیتاب رکھتی..... وقت گزر جاتا ہے، البتہ وقت کے بہاؤ میں اٹکے ہوئے کچھ ساکت لمحے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ہمیشگی پا کے جیون کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دوستوں کی کرم فرمائی اور مروت دل پہ نقش ہے۔ اُن کے احسانات کی یاد سے دل سراپا سپاس ہے، حسابِ دوستاں در دل؛ دوستوں نے مجھے بہت کچھ دیا، حسابِ دوستاں کے ضمن میں میں ہی دین دار ہوں..... رات گئے گجرات پہنچنا یاد آیا اور بانو اور خلیل کے چہروں کی بشاشت اور اُن کی گرم جوشی یاد آئی، مگر لمحۂ گریزاں نشتر کی چبھن بھی تو دے سکتا ہے، جیسے ہماری آمد کی اطلاع پا کر ایک صاحب نے دروازے بند کر دیے تھے اور بتیاں گُل کر دی تھیں، دل کا دروازہ تو وہ بہت پہلے بند کر چکے تھے، خلیل کے گھر میں تکلف اور تصنع سے عاری مہمان نوازی یاد آئی، ہنسی خوشی کی باتیں، سادگی سے مملو۔ وقت کے اُس پار ماضی کے چوکھٹے میں آویزاں پُرپیچ باتیں، جہاں تواضع تابعِ تدبیر تھی، گفتگو میں طنز کی گھلاوٹ تھی اور بناوٹ کا غازہ، کچے رنگ کی مانند ڈھل جانے والا، اقربا کی بے اعتنائی یاد آئی۔ اُن بے مروت لوگوں کے چہرے نظروں میں گھوم گئے جنھوں نے پے در پے کچوکے دیے تھے، تلبیس اور ریاکاری کا لبادہ اوڑھے ہوئے لوگ جن کی نظر میں ذاتی مفاد دُنیا کی ہر شے پہ مقدم تھا۔ انصاف اور حق رسی ایسے الفاظ اُن کی لُغت میں نہ تھے۔

گر دہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالبؔ
رسمِ امیدِ ہمانانِ جہاں برخیزد

قیامِ لاہور کے دوران خلیل کے ساتھ کئی مرتبہ صنعت کے منصوبے زیرِ بحث آئے تھے، ملازمت چھوٹ جانے کے بعد اُس نے اِس میدان میں کافی تگ و دو کی تھی، مشورہ دینے میں وہی دریا دلی کارفرما ہوتی۔ خلیل نے یہ بھید پا لیا تھا کہ اُس کے تجربے سے مستفید ہونے سے اُس کے اپنے اثاثے میں کوئی کمی نہیں ہوگی بلکہ ربِّ جلیل کی بے پایاں برکتیں شاملِ حال ہوں گی۔ فیاضیِ طبع کا یہ رُخ دُوسروں سے حیران کُن حد تک مختلف تھا، زید کبھی اپنی محدود انا سے بلند نہ ہو سکا، کاروباری ذہن رکھنے کے باوجود وہ اس قابل نہ تھا کہ کوئی اس سے فیض پا سکے، اس کا یہی جی چاہتا کہ ہر روز محفل سجی ہو اور احباب اس کے کارناموں کو سراہیں، کاروبار میں اس کی 'فتوحات' کی داد دیں۔ دنیا کو اتنی فرصت کہاں، ایسے احباب بتدریج چھٹتے جاتے ہیں اور بالآخر انسان تنہا ہی رہ جاتا ہے، زید نے لاکھوں کمائے، دولت کے انبار لگ گئے، اس کا ذکر کر کے وہ خوش بھی ہوتا مگر یہی فکر دامن گیر رہتی کہ کسی اور کو چار پیسے ہاتھ لگ گئے تو وہ خوشحال

ہو جائے گا۔ اچھی کار خریدے گا۔ کیا معلوم اس دوڑ میں آگے نکل جائے، جہاں دھن دولت کا سوال ہوتا دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ معاہدۂ شکنی میں اُسے کوئی عار محسوس نہ ہوتی، ایسے حالات میں غلط بیانی کرنا جائز بلکہ عین ثواب تھا، جلبِ زر ہی زندگی کا محور تھا، ہر وہ شخص جس سے مفاد وابستہ ہو اہم شخصیت بن جاتی، پٹے ہوئے مُہرے بساط سے ہٹا دیے جاتے، میں سوچنے لگا کہ ؏

گو زر بھی ہے دنیا میں قاضی الحاجات

اقدار کو بالائے طاق رکھ کے رشتوں کا تقدس پامال کرنا دنیاوی لحاظ سے بھی کیا دانشمندی تھی؟ اس کھیل میں اس نے کیا کھویا کیا پایا؟

خلیل کو شاپنگ کا چسکا تھا، ہم بھی اُسی رَو میں بہہ گئے، ؏

تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

بے ضرورت شاپنگ بھی ایک دیوانگی سی ہے۔ یہ لے لو، وہ لے لو، جانے کب ادھر آنا ہو، مبادا بعد میں حسرت دل پہ شبخوں مارے۔ خلیل کہتے یہ کوٹ یہ جُوتا پہن کے تو دیکھیں کتنا بھلا لگ رہا ہے، بس یونہی مال، پلازا اور نہ ختم ہونے والی غلام گردشوں میں گھومتے پھرتے جہاں دُنیا کی ہر جنس موجود ہوتی، بعض اوقات چیزوں کا تنوّع دیکھ کے امریکنوں پہ بھی غصہ آتا۔ عیش و آرام کے سامان کی یہ بھرمار اقتصادی لحاظ سے ضیاع نہیں تو کیا ہے؟ مگر امریکن معیشت کی بنیاد صارفین کو متوجہ کرنے پہ ہے۔ وہ لوگ محنت کرتے ہیں، خوب کماتے ہیں اور بے دریغ خرچ کرتے ہیں، ہم عینک لگا کے مطلوبہ چیز پہ درج اصل قیمت پڑھتے، سیل میں قیمت کتنی کم ہوئی، کمی دیکھ کے آنکھوں میں چمک آجاتی، دیکھو میں نے کتنا بچا لیا، میں کتنا سمارٹ ہُوں، میری پرکھ کی داد دو، موسم اور فیشن بدلنے کے ساتھ ساتھ پندرہ ڈالر کی قمیص کی قیمت دس ڈالر ہوئی، پھر پانچ ڈالر بالآخر دو ڈالر میں بکی، بچے ٹی شرٹ، ویسٹرن شرٹ اور جین کے انبار کھنگالتے، زہرا باورچی خانے میں کام آنے والی چیزوں کا جائزہ لیتیں، کچھ آرائش کا سامان ہو جائے اور دیوار پہ آویزاں کرنے کے لیے آئینہ اور گھڑیال ؏

آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

سب کے پیشِ نظر انا کی جھوٹی تسکین ہوتی، اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہونے کی خواہش، میرے ذوق کی داد دو، آرائش کی ایسی چیزیں کسی کے پاس ہیں؟ ہم ایک غیر حقیقی، طلسماتی ماحول میں اسیر تھے، ہم وطنوں کی غربت، محرومی اور بیماری سے بہت دُور، کچی آبادیوں کی غلاظت سے دُور، بس اور ویگن ڈرائیوروں سے دُور جن کے لب پہ ایک ہی نعرہ ہوتا ہے "راستہ دو ورنہ جان سے مار دُوں گا"، جو واقعی لوگوں کی جان لے کر یا تُولا لنگڑا کر کے رُکے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں، ہاں اُن چمکدار کاروں سے بھی دُور جو فراٹے بھرتی ہُوئی راہگیر کی آنکھوں میں خاک جھونکتی ہوئی گزر جاتی ہیں، بارش ہو تو گدلے پانی کے چھینٹے اڑاتی ہیں اور تیز موٹر چلانے والے اپنے آپ سے بیحد مطمئن ہوتے ہیں،

بس کے انتظار میں لمبی قطاروں سے بے نیاز..... تھکے ہارے گھر پہنچتے تو پاکستانی نعمتیں یاد آتیں، آلو گوشت کا سالن، تنور کی روٹی، رائتہ اور پودینے کی چٹنی، شامی کباب، مسور کی دال، دنیا بھر کی نعمتیں موجود تھیں مگر یہ چیزیں نہ تھیں، بکرے کے گوشت کا وہاں رواج نہیں، مُرغ بے ذائقہ، دو ماہ اچھی چائے نصیب نہ ہوئی، پتی مختلف تھی یا پانی میں کلورین کی آمیزش تھی، ہزار جتن کیے مگر بے سُود،

ہمارے دوست ہمیشہ سے متواضع تھے مگر امریکہ میں احساس ہوا کہ قدم قدم پہ آنکھیں بچھا رہے ہیں، میں تنہا تو نہ تھا زہرا اور بچے ساتھ تھے، سب کے آرام کا خیال، سب کی تواضع، صبح و مسا تواضع. صبح و شام کی مہمان نوازی اور دلداری، خلیل نچلے نہ بیٹھتے، آج لبِ جھیل پکنک ہے، پھونکنی سے کوئلوں کا الاؤ روشن ہو رہا ہے، باربا کیو پہ کباب بن رہے ہیں۔ بڑے اور بچے ہنسی مذاق میں برابر کے شریک ہیں، دوسرے روز ال موگوڈو کے سپید ریگزار دیکھنے جا رہے ہیں، اردو ادب میں 'نور کا کھیت' ہونا پڑھ رکھا تھا، واقعی تا حدِ نظر نور کا دریا تھا۔ دودھیا ریت کا بحرِ بیکراں دوپہر کے کھانے کے لیے خلیل ایک چینی ریستوراں میں لے گئے، دام مقرر تھے، کھانا مزے کا تھا، سیر ہو کے کھایا مگر خلیل کو افسوس رہا کہ آتے آتے دیر ہو گئی اور پھل والی آئس کریم ختم ہو گئی" وہی تو ان کی خاص چیز تھی" اس شام خور و نوش کا ایک بل میں نے ادا کر دیا تو خلیل برہم ہو گئے" آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، آپ یہاں مہمان ہیں!" پھر میکسیکو کی سرحد پر آل پاسو کا چکر، خوب صورت شاپنگ پلازا میں رواں دواں فوّارے اور دیواروں پہ نیلگوں مینا کاری اُندلس کی یاد تازہ کر رہی تھی، موروں نے آبِ رواں اور مینا کاری کا تحفہ ہسپانیہ کو دیا، ہسپانوی فاتح یہ روایت میکسیکو لائے، ٹیکساز اور ملحقہ ریاستوں کا وسیع علاقہ بھی میکسیکو کے زیرِ نگین تھا جو آہستہ آہستہ امریکنوں نے ہتھیا لیا۔

دس روز کے قیام کے بعد ہم نے اجازت مانگی تو میاں بیوی یک زبان ہو کر بولے" سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کم از کم چار یا پانچ روز اور ٹھہریں، یہاں آ کر لوگ پندرہ بیس روز سے پہلے نہیں جاتے۔" آخر مجھے دل کی بات کہنا پڑی، میں نے خلیل کو کہا کہ تمہاری بے لوث محبت مجھے پریشان کر رہی ہے، تمہارا حُسنِ سلوک دیکھ کر چند ایسے لوگ بے وقعت نظر آنے لگے ہیں جو کبھی چاہت کا دم بھرتے تھے، وہ وقت کی کسوٹی پہ پُورے نہیں اُترے۔ انہی حالات میں ان کا رویّہ کیا تھا؟ کیا اُن کی مہمان نوازی بے لاگ تھی یا کوئی مطلب برآری مقصود تھی؟ سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات ہے جس سے کھرے کھوٹے کی پرکھ ہوتی ہے، سُچّا آدمی کائنات کا عظیم ترین تحفہ ہے، ربِّ کریم کا بہترین انعام۔

یہ فیاضانہ رویّہ، محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا خلیل نے کہاں سے پایا؟ باپ اُس وقت گزر گیا جب وُہ شکمِ مادر میں تھا، ایک بے آسرا بچّہ جو ماں کی گود میں پلا، گھر میں سخت ڈسپلن، خود ماں نظم و ضبط کی پابند، عابدہ اور پرہیزگار، اُس ماں کا ہی حوصلہ تھا کہ انیس برس کی عمر میں بیٹے کو خدا حافظ کہہ کے فوج میں بھیج دیا، وہاں سے مقابلے کا مرحلہ طے کر کے سول انتظامیہ کے لیے منتخب ہوا، بچپن کی محرومیوں کے باعث وہ خود غرض اور خود نگر بھی ہو سکتا تھا،

اس پُر آشوب دَور میں پُرانی قدریں دم توڑ چکی ہیں، مادہ پرستی ہمارے رگ وریشہ میں سرایت کر چکی ہے، ذرا ذرا سے فائدے کے لیے لوگ مقدس رشتوں کی دھجیاں کر ڈالتے ہیں، تو خلیل نے یہ دریا دلی کہاں سے پائی؟ اُس کی جبلّت میں ودیعت ہوئی تھی یا بیوہ ماں کی دُعا تھی جو عمر بھر شب بیدار اور عبادت گزار رہی، یا یہ فطرت کا انعام تھا کہ جسے چاہے نوازے جسے چاہے سیاہ باطن اور سنگدل بنا دے، اگر یہ پیار صرف ہمارے لیے مخصوص تھا جب بھی کتنی عظیم بات تھی۔ تیس برس کے طویل عرصے میں کسی وقت بھی تو ایسا نہیں ہُوا کہ اس نے شکایت کا موقع دیا ہو یا رُوکھائی سے پیش آیا ہو۔

کل تک باپ اور بیٹے میں بحث جاری تھی، حبیب دونوں بچّوں کو چند برس کے لیے پاکستان بھجوانا چاہتا تھا، خلیل کی رائے تھی کہ امریکہ میں معیارِ تعلیم بہت بہتر ہے، حبیب چاہتا تھا کہ بچّے اُس مٹّی کی بُو باس سے آشنا ہوں جس سے اُن کی اٹھان ہُوئی، وہ ایک پاکستانی سکول میں چند برس گزاریں، اُنھیں معلوم ہو کہ پاکستان میں ایک عام شخص کن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ بات بڑھی تو حبیب کو کہنا پڑا "ابّا! میں چاہتا ہُوں کہ میرے ساتھ بچّوں کا رویّہ ایسا ہی ہو جیسا میرا آپ کے ساتھ رہا، شاید آپ اتفاق کریں کہ میں نے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

بچّوں کی سعادت مندی مثالی تھی، شادی شدہ بیٹوں کو خلیل سخت سُست کہہ لیتے، چھوٹی چھوٹی بات پہ ٹوک دیتے، گاہے بگاہے سرزنش کر دیتے مگر بیٹے اُف نہ کرتے، جواب بھی دیتے تو بہت تمیز کے ساتھ، ابّا کا غصّہ فرو ہو جاتا تو اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیتے، حبیب بہت ہونہار طالب علم تھا، چند برس پہلے اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کا خیال آیا، خلیل میاں نے اپنا اثاثہ پیش کر دیا کہ بزنس کر لو یا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر چلے جاؤ۔ حبیب نے خاندانی مفاد کو ترجیح دی اور مزید تعلیم کا خیال ترک کر کے والد کی زیرِ نگرانی کام شروع کر دیا، پہلے پاکستان میں پھر انگلستان اور امریکہ میں اللہ کا کرم شاملِ حال تھا، محنت کا پھل ملا۔ چند برسوں میں وارے نیارے ہو گئے۔

بانو کو اتنا مطمئن، اتنا خوش مَیں نے کبھی نہ دیکھا تھا، ہر وقت چہکتی، پاؤں زمیں پہ نہ ٹکتے، بیٹوں پوتوں میں گھری ہوئی، دوستوں کی رفاقت حاصل، اُدھر خلیل میاں اُس کے قدموں میں تحفوں کا ڈھیر لگا رہے تھے، جڑی ہوئی انگوٹھیاں، بریس لٹ، جُوتے، کپڑے، سمور کے کوٹ اور کیا کیا کچھ، وہ کہتی رہتی "یہ سب چیزیں میں کب پہن سکوں گی"۔ مگر خدا معلوم کیا بات تھی وہ متواتر اُس ذخیرے میں اضافہ کرتے رہتے۔

رات کا کھانا گھر میں ہوتا یا باہر باتوں کا سشن طویل ہوتا، اجازت لیتے لیتے ساڑھے گیارہ بارہ بج جاتے، بچّے دیکھ کر ہنستے کہ آنٹی بانو ہر رات امّی کو گلے مل کے رخصت کرتی ہیں حالانکہ اگلی صبح پھر ملنا طے ہوتا ہے۔

میں بانو سے پُوچھتا "سردیوں میں بہت برف پڑتی ہو گی، دنوں سورج نظر نہ آنے سے آپ اُکتا نہیں جاتیں"۔

"ہر چیز کو برف کی سفید چادر ڈھانپ لیتی ہے، پھر رُوئی کے گالوں کی طرح برف پڑتی رہتی ہے، کھڑکی سے میں یہ نظارہ پہروں دیکھا کرتی ہوں، چاروں اور نور ہی نور ہوتا ہے، اس نظارے سے جی نہیں بھرتا۔" بانو اب بھی وہیں ہے، برف کا سیلِ نور اب بھی ہو گا مگر اُس کے لیے زمین و آسمان بدل چکے۔

بیوی بچوں کو سب دنیاوی آسائشیں میسّر تھیں مگر خلیل اپنی والدہ اور بہن بھائی کو نہ بھولتے۔ پاکستان میں تعلیم و تدریس کا ذکر چل نکلا تو میں نے ایک تعلیمی ادارے کی تعریف کی کہ چند برسوں میں اسے بجا طور پر اچھی شہرت حاصل ہوئی ہے، معیارِ تعلیم بہت اچھا ہے، نظم و ضبط بھی عمدہ ہے، خلیل فوراً بولے:

"بھائی جان! وہاں کام کر رہے ہیں، انھیں تنخواہ کم ملتی ہے، بچہ میڈیکل کالج میں نہ ہوتا تو وہ اس تنخواہ پہ کام نہ کرتے۔"

شاپنگ کرتے ہوئے خلیل اپنی امّی اور بہن کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لے لیتے۔

یہ گرگابی امّی کے لیے موزوں ہے، نماز کے لیے علی الصبح اٹھتی ہیں انھیں سویٹر اور گرم موزوں کی ضرورت ہوگی، یہ کپڑے، یہ چادریں بہن کے کام آجائیں گی، جب سے میاں کی ملازمت گئی وہ مشکلوں میں گھری ہوئی ہے، میاں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا ناکامی ہوئی، دوست دغا دے گئے، بھانجے کی طبیعت اچھی نہیں رہتی، کتنا ذہین اور ہونہار بچہ تھا قسمت کی بات ہے....."

ہم پاکستان آرہے تھے تو امّی اور بہن کے لیے پرانے کپڑے کا ایک پشتارہ متفرق چیزوں سے بھر دیا کہ لاہور جا کے اُن کے حوالے کر دینا، لاہور میں زہرا دونوں کو مل تکے آئیں، امریکہ کی سب باتیں خوشی خوشی بتائیں، معتبر ماں سُن سُن کے نہال ہوتی تھی، بہن کے چہرے سے شگفتگی کی شعاعیں پھوٹتی تھیں، کسے معلوم تھا کہ چند ہفتوں میں کیا خبر ملنے والی ہے۔

خلیل کے انتقال کی خبر بجلی بن کے گری، آناً فاناً یہ کیا ہوگیا چوبیس گھنٹے کے لیے سوچ بچار مفلوج ہو کے رہ گئی، اُسے خدا حافظ کہے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا، میں نے اپنے آپ کو ایک شدید احساس کی گرفت میں پایا، میں غریب ہوگیا ہوں، بہت غریب، سالہا سال اس نے دوستی کے بے بدل تحفے سے ہماری زندگی کو سینچا تھا، زیست کو ایک نئی جہت عطا کی تھی، تلطّف اور مدارات کے مفہوم سے آشنا کیا تھا، قیامِ امریکہ کے دوران میں وہ ایک نئے رُوپ میں آشکار ہُوا تھا، قدرت کو یہی منظور تھا کہ کچھ عرصے کے لیے وُہ اپنی محبت کی تمام توانائیاں ہمارے لیے وقف کر دے، اب وہ دولت چھن گئی تھی اور مَیں تنہا رہ گیا تھا، بے سہارا۔

اُس روز میں اسلام آباد میں تھا اور زہرا لاہور میں، صبح چھ بجے فون کی گھنٹی بجی، کسی صاحب نے اطلاع دی کہ دل کا دَورہ پڑنے سے خلیل جاں بحق ہوگئے، میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، زہرا کی چیخ سُن کے بچے بھاگتے ہوئے آئے "امّی! کیا ہوا؟" جب انھیں پتا چلا تو رو رو کے دُہائی دینے لگے: "امّی! یہ نہیں ہوسکتا، یہ نہیں ہوسکتا" بچے خلیل کا مشفقانہ سلوک کیسے بھول سکتے تھے! وہ کیسے باور کر لیتے کہ انکل ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئے، جو چیز بڑوں کے لیے ایک معمّا تھی چھوٹے کیسے سمجھ پاتے، تیسرے روز طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ اپنی امّی سے پُوچھنے لگے "انکل سے ابّو کی دوستی کب ہوئی تھی؟"

"بیٹے! مجھے نہیں معلوم، میری شادی سے پہلے کی بات ہوگی، جب میں بیاہی آئی تو میں نے انھیں دوست کی حیثیت سے موجود پایا۔"

وہ کہتی بھی کیا، غالباً ۱۹۵۲ء کا اواخر تھا، خلیل بڑے بھائی کو ملنے کے لیے کیمبل پور آئے ہوئے تھے، ملازم نے آکر اطلاع دی کہ مشرقی پاکستان سے ایک ایڈیشنل ایس پی ملنے کے لیے آئے ہیں، بانو اور خلیل سے وہ پہلی ملاقات تھی، کچھ دیر ٹھہرے، دو روز بعد میں نے کھانے پہ بلایا، چند اور احباب بھی مدعو تھے، خوب رونق رہی، تیس برس تک وہ رشتہ استوار رہا۔

کہتے ہیں روز کا آنا جانا قدر کھو دیتا ہے، حالی نے تنبیہ کی تھی کہ آپس میں اُلفت کا بڑھانا نفرت پہ منتج ہوسکتا ہے مگر خلیل کی دوستی سدا بہار تھی، اُس دوستی میں بہار کے پھولوں کی مہک اور نیلے آسمان پہ چمکدار ستاروں کی چمچی ضو تھی، خدا جانے دوستی کا بھرم رکھنا خلیل نے کہاں سے سیکھا تھا، روڈو سو میں اُن کا رہائشی مکان آرام دہ تھا اور ضروری سامان سے آراستہ، صوفہ چھوڑ کر انجانے طور پر میں ایک ایسی کرسی پہ بیٹھ گیا جس کی نشست قدرے سخت تھی، خلیل پریشان ہوگئے "بھائی! آپ کمال کر رہے ہیں، یہاں آکر میرے پاس بیٹھیں، میں نے کہا بھی تھا کہ یہ کرسی یہاں سے اُٹھوا دیں۔"

یاد آیا کہ پاکستان کی ایک نجی محفل میں تصویر کھنچواتے وقت چند احباب اُس جگہ جم کے بیٹھے رہے جو خلیل کی رائے میں اُنھیں میرے لیے خالی کرنی چاہیے تھی۔ مجھے تو احساس نہ ہُوا مگر خلیل سٹپٹا کے رہ گئے، دوسرے روز بانو نے بتلایا کہ رات گئے تک برہم رہے، بار بار کہتے کرسی دماغ خراب کر دیتی ہے، یہی لوگ کل تک سرسر کرتے تھے، بھائی پیچھے کھڑے ہوگئے مگر ان لوگوں نے پہلو بدل کے نہیں دیا۔"

خلیل کو ہماری ہر پرابلم کی فکر رہتی،

"وراثت کی جائیداد بیچ ڈالی تو اب آمدنی کی کیا صورت ہوگی؟"

"بلال نے بینک کی ملازمت چھوڑ دی، اب کیا ارادے ہیں؟ امریکہ میں قسمت آزمانا ہے تو اسے میرے پاس بھجوا دو۔"

بلال اُن کے ہاں چلا گیا اور بچوں کی طرح مہینوں اُن کے پاس رہا، اُس کے لیے فون کر رہے ہیں، لوگوں سے ملوا رہے ہیں، اتنا تو میں سمجھ سکتا تھا مگر جب بلال نے یہ کہا کہ "کھانے کے وقت آنٹی اور انکل کو کبھی یہ گوارا نہ ہُوا کہ کھانا میں خود ڈال لوں، ہمیشہ خود ڈال کے دیتے اور اچھی چیزیں کھلانے پہ اصرار کرتے۔" تو مجھے بھی تعجب ہوا تھا، ایک دن مہمان، دو دن مہمان ..... ع

یاراں باجھ محمد بخشا کون کرے غمخواری

ایک برس قبل بلال پاکستان سے امریکہ پہنچا تھا، لندن اور نیویارک ہوتے ہوئے ایل پاسو ——— امریکہ کا جنوب مغربی حصہ، ہوائی اڈے پہ طارق موجود تھا، روڈو سو تک تین گھنٹے کا سفر تھا، راستے میں دونوں کھانے کے لیے

رُک گئے، روڈ ڈسو پہنچے تو دیکھا کہ مضطرب ہو کر خلیل مکان کے باہر ٹہل رہے ہیں، بچوں کو دیکھتے ہی خلیل نے نعرہ لگایا "بلال آگیا"۔ اہل خانہ خوش آمدید کہنے کے لیے جمع ہو گئے "بیٹا! آپ نے دیر کر دی، میں پریشان ہو گیا تھا۔" اکتوبر کی پانچ تاریخ تھی، شام کے چھ بج رہے تھے،

آخر ستمبر میں خلیل کے دونوں بیٹے چھٹیاں گزارنے کے لیے پاکستان آ رہے تھے، حبیب نے دو تین مرتبہ کہا:

"ابا! آپ کی طبیعت اچھی نہیں تو میں رُک جاتا ہوں۔" واشنگٹن سے بھی فون پہ یہی بات کہی مگر خلیل مُصر تھے کہ وہ تندرست ہیں، پروگرام ملتوی کرنے کی ضرورت نہیں البتہ بلال کو دو دفعہ تاکیداً کہا کہ گیارہ اکتوبر کو روڈ ڈسو پہنچ جائے "اُس روز مجھے چیک اپ کے لیے ہسپتال داخل ہونا ہے، تمھاری آنٹی اکیلی ہوگی، تم اُس کے پاس رہنا۔" شروع اکتوبر میں بلال کو کام سے تلسا جانا پڑا، لوٹتے ہوئے راستے میں سوچا فون کر کے خیریت پوچھ لوں۔ معلوم ہوا خلیل ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں اور حالت نازک ہے، وہیں سے روڈ ڈسو کا رُخ کیا، خلیل کا فرنچ کٹ ڈاڑھی والا وجیہہ دوست ڈاکٹر سٹالزر اُسی جگہ کھڑا تھا جہاں ایک برس قبل خلیل کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے اتنا کہا:

"عزیزِ من! تم دیر سے پہنچے، تمھارا انکل اب اس دُنیا میں نہیں"۔

اکتوبر کی پانچ تاریخ تھی، شام کے چھ بج رہے تھے۔

ذہن میں تصویریں اُبھرنے لگیں، ہم ایک بڑے سٹور کے مختلف گوشوں کی چھان پھٹک کر رہے تھے کہ خلیل نے زہرا کو اشارے سے بُلا کر کہا کہ ٹیبل لیمپ کے چناؤ میں اُنھیں مشورہ دیں، زہرا نے ایک خوب صورت جوڑا منتخب کیا اور اپنے لیے اسی قسم کا بڑے سائیز کا لیمپ پسند کیا "بہت خوب! میں نے تحفہ دینا تھا، اب یہ تینوں لیمپ آپ کی نذر ہیں"۔ ہم نے بار بار کہا کہ بہت تکلف ہو چکا اب یہ زیادتی نہ کریں مگر خلیل ٹس سے مَس نہ ہوئے، گھر پہنچ کے لیمپ روشن کیے گئے، سب کو بیحد پسند آئے، خلیل نے اتنا کہا "نشست گاہ میں رکھنے کے بجائے انھیں خواب گاہ میں رکھیے تاکہ جب ان پہ نظر پڑے تو میری یاد آئے، ظالم! کیا خبر تھی کہ بہت جلد عہدِ وفا کی یاد موجبِ آزار ہوگی۔ طویل راستہ طے کر کے نازک لیمپ صحیح سالم پہنچ گئے مگر جس نے بڑی چاہ سے تحفہ دیا تھا انجانے راستوں کا راہی ہوا۔

بہ یزداں روزِ محشر بہمن گفت — فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نرنجی با تو گویم — صنم از آدمی پائندہ تر بود

اور کیا کہوں، میں نے ایسا حیادار، بامروت اور صادق القول انسان نہیں دیکھا، اب اُس کا پرتو دوسروں میں دیکھنے کا متمنی ہوں۔

آخر جدائی کی ساعت آن پہنچی، دونوں بچے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگے "ابا! ہم آپ کے پاس آنے والے ہیں، ہم جلد ملنے والے ہیں"۔ انجانے طور پر وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کی تفسیر بن گئے تھے۔ بالآخر ہم سب کو خالقِ حقیقی کے پاس لوٹ جانا ہے، اُس کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ ایک دوسرے کو چاہنے والی رُوحیں وہاں

یکجا ہو جائیں اور جُدائی کی کُلفت دُھل جائے۔ ایمبولینس روانگی کے لیے تیار تھی، مَیں حسرت کے ساتھ اُسے تک رہا تھا کہ طارق نے روتے ہوئے یہ کہہ کر کلیجہ شق کر دیا:

"انکل! آپ بھی خدا حافظ کہہ لیں۔"

میں بھی ساتھ بیٹھ گیا، رفاقت کا یہ آخری سفر تھا، ختم السفر۔

وہ آنکھیں بے نُور ہوئیں جو ہر ملاقات میں چمک اُٹھتی تھیں، وُہ لب سِل گئے جن سے مہر و وفا کے سوتے پھُوٹتے تھے، وہ دلفریب مسکراہٹ منجمد ہو کے رہ گئی جو چہرے پہ بار بار پھیل جاتی تھی، ماڈل ٹاؤن سے پرے خاک کے لاکھوں ذرّوں نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خلیل گیارہ تاریخ کا تذکرہ بار بار کیوں کر رہے تھے، اس روز چیک اَپ کے لیے ہسپتال میں داخل ہونا ہے، قدرت اُن کی زبان سے کیا کہلوا رہی تھی، اُس روز تو ہم اُ[illegible]حاکی لحد میں اتار رہے تھے، ہائے کتنی حسرتیں اُن کے ساتھ دفن ہو گئیں!

آخری مرتبہ خلیل اسلام آباد آئے تو مَیں اُنھیں جھیل کی سَیر کو لے گیا تھا، بارش سے برگ و بار دُھل گئے تھے، ہوا گرد سے پاک تھی، خلیل نے اتفاق کیا تھا کہ جھیل کی رعنائی سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں سے کسی صورت کم نہیں، برف پوش پہاڑوں میں گھری ہُوئی یہ جھیل میری ہمدم اور دمساز ہے، سطحِ آب جو کل محوِ خواب تھی آج متلاطم ہے، کیا اِس کو بھی میرے دوست کے جانے کی خبر مل چکی؟ برف پوش چوٹیوں کے اُس پار ایک دُنیا ضرور ہو گی جہاں رسمِ جُدائی نہ ہو گی، ابدی راحتوں کی دُنیا،

جب شفق لال بھبھوکا ہو کر جھیل میں منعکس ہوتی ہے تو سطحِ آب گلگوں ہو جاتی ہے، اس دلکش منظر پہ سے پھسلتی ہوئی نظر پہاڑوں پہ تازہ گری ہُوئی برف کی طرح اُٹھتی ہے تو میں حیرت و استعجاب کی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں، جب انجام کار مٹی میں مل کے مٹی ہونا ہے تو غبارِ راہ کو ذوقِ جمال کیوں بخشا گیا؟ جو خاک سے پیدا ہوا وہ خاک میں مستور ہو گا، یہ ازلی دستور ہے، ع

مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا؟ کیا ہے؟

جب چاند کی عماری رات کے صحرا میں نکلتی ہے اور اُس کے راستے میں لاکھوں تاروں کی افشاں ٹمٹماتی ہے تو میرا دل تھکے ہُوئے مسافر کی طرح ڈانوا ڈول ہوتا ہے، یادوں کے دُھندلے نقوش چمک اُٹھتے ہیں، بیتے ہوئے لمحے اَن گنت جگنوؤں کی طرح جلتے بجھتے ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی مسرتیں کہاں رہ گئیں جن سے زندگی شاداب تھی، گزری ہوئی ساعتیں ماضی کے غرفے سے آواز دیتی ہیں، مگر آواز دینے سے عمرِ رفتہ لَوٹ تو نہیں آتی، وہ فردوسِ گم گشتہ کہاں سے لاؤں!

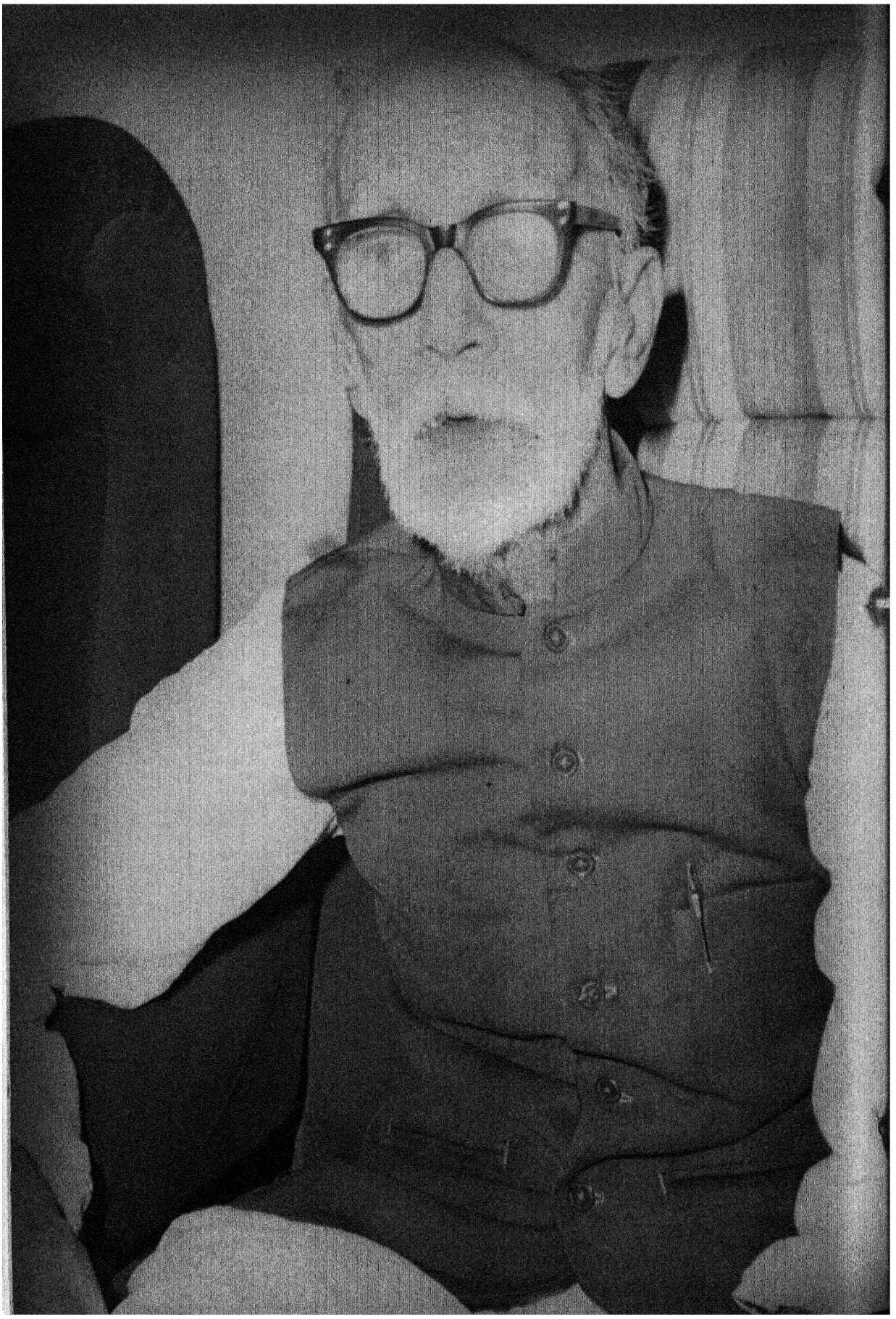
ع

شہرِ غزنیں نہ ہماں است کہ من دیدم پار

ایک سہانا خواب جس کی دلفریبی ہاتھ میں آ کے نکل گئی، اک صدائے بازگشت جو حیات و ممات کی سرحد سے خالی ہاتھ لوٹ آتی ہے۔

اُچّیاں تے لمّیاں لال کھجوراں
تے پتّر جنہاں دے ساوے
ننگے پنڈے ہینوں چھمکاں مارن
تے میرے روندے نین نمانے

اب یہ کافی سننے کا حوصلہ نہیں ہوتا "ننگے پنڈے چھمکاں" مارنے کے لیے یاد کا تازیانہ کتنا بے رحم ہے۔



بوم رینگ

بانو قدسیہ

شیشے جڑے پلنگ پر ملتانی کمیس اور ڈھے چودھرائن آنگن میں پڑی تھی۔ بریتی پر دھوپ میں سوکھتے ہوئے مگرمچھ کی طرح اس نے اپنا وجود چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن اس کا دل ٹکریں مار رہا تھا۔ ایسے ہی کبھی کبھی شام کے وقت جب کوئی چمگادڑ کمروں کے اندر آ جاتی تو بار بار دیواروں سے ٹکرا کر راستہ تلاش کیا کرتی۔ لیکن چودھرائن کو علم تھا کہ اس بار کوئی راستہ کہیں ہے ہی نہیں ملے گا کیا؟ اسے تو آج تک پتہ ہی نہ چلا تھا کہ وہ بھی گوشت پوست کی بنی ہے وہ بھی اندر یا باہر زخمی ہو سکتی ہے۔ آج تک جو بھی مصیبتیں اس نے دیکھی تھیں ان کا علاج بہت ہی آسانی سے دولت یا پستول نے کر دیا تھا۔ سارا دن گاؤں کی عورتوں سے لدے پھندے آنگن میں بیٹھی کبھی اسے احساس تک نہ ہوا تھا کہ وہ اور دوسری عورتیں ایک جیسی ہیں۔ ان کی مصیبتیں سانجھی ہیں ـــــ اور وہ انسانی بدی میں برابر کی شریک بھی ہو سکتی ہے اپنے ساتھ کسی برائی یا بدی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ہر فعل اس کا ہر قول سچا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ باقی گاؤں والوں کی طرح اس میں یا اس کے خاندان میں کبھی کوئی خرابی پیدا ہوئی تھی یا ہو سکتی تھی! وہ لوگ تو صدیوں سے دولت کے سہارے ایسی بے داغ زندگی بسر کر رہے تھے کہ انھیں شبہ بھی نہ تھا کہ انسانی دکھ سارے سانجھے ہوتے ہیں اور ان دکھوں سے پیدا ہونے والی برائیاں ایک ہی کنوئیں کی ٹنڈوں سے نکلتی تھیں ـــ انسان جب بھی روتا ہے کسی نہ کسی طرح انسانی برادری کے کچھ لوگ کہیں نہ کہیں اور بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس سانجھی قسمت کا چودھرائن کو علم نہ تھا! شاید وہ انسانی برادری میں سے اپنے آپ کو نہ سمجھتی تھی۔

یوں تو چودھرائن پلنگ پر لیٹی تھی لیکن اس کا دل حویلی کی پچھلی کوٹھڑی کے قفل کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ اس کوٹھڑی کو اس نے اپنی شادی شدہ صباتی کے بائیس سالوں میں بمشکل تمام تین چار دفعہ دیکھا تھا۔ ویسے بھی نانک چندی اینٹوں کی اس پختہ حویلی کے پچھواڑے اُن گنت گودام، آنگن، دالان کوٹھڑیاں ایسی تھیں، جو بند تہہ خانوں کی طرح مکینوں کے انتظار میں رہتی تھیں۔ جن کی چھتوں سے دیواروں سے فرشوں سے آہستہ آہستہ کلر اور نمی آنسوؤں کی طرح رستہ رہتا، پچھلی کوٹھڑی کو آخری بار چودھرائن نے اس روز دیکھا تھا جب ان کا مزارعہ خدا بخش اپنی فالج کی ماری ہوئی ماں کو چودھرائن کے پاس چھوڑ گیا۔ یہ دیوانی، غموں کی کھائی ہوئی، بیوہ کچھ عرصہ پلنگ پر لیٹی چھت کو تکتی رہی اور پھر اللہ کو پیاری ہو گئی جس وقت خدا بخش کی ماں نے فجر ریے دم دیا چودھرائن اپنے یکے گئی ہوئی تھی اس لئے کوٹھڑی میں جھاڑو بہارو پھیر کر پھر اس میں قفل ڈال دیا گیا۔ جتنی دیر ماں نذیراں اس میں بیمار پڑی رہی چودھرائن اسے تمام وقت دودھ، مکھن روٹی بھجواتی رہی لیکن اسے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ پچھلی کوٹھڑی میں خود جا کر بوڑھی عورت کا حال دیکھ لیتی۔

اس کوٹھڑی کی بھی عجب قسمت تھی۔ اس میں جب بھی کوئی آ کر ٹھہرا راندۂ درگاہ ہی ٹھہرا جب بڑے موکلے سے غیر قانونی طور پر آدھی رات کے وقت پانی توڑ کر چوہدری صاحب کی زمینوں کی لگایا جا رہا تھا اور آدھی رات کے وقت پوہ کی ٹھنڈی ہوا میں حیدر کے ہاتھ

کسی پر جھوٹے پڑ رہے تھے اس وقت جب چھاپا پڑا تو حیدر کو کئی دن اسی کوٹھڑی میں بند رہنا پڑا ——— لیکن اس واقعے کا چودھرائن کو علم نہ تھا۔ چودھرائن اور چودھری صاحب کو تو یہ بھی علم نہ تھا کہ مزارع رحیم چاچا کا بیٹا جب چک ۱۳۲ میں قتل کر کے بھاگا تو مفرور ہو کر اس نے بھی اسی کوٹھڑی میں دو راتیں کاٹی تھیں لیکن ایک واقعہ ابھی تک چودھرائن کو یاد تھا ——— جیسے اپنی زندگی میں مائیکے سے پہلی بار وداعگی ابھی تک اس کی آنکھوں کے آگے فلم کی طرح چلتی تھی۔

ابھی عصمت چودھرائن کی گود میں تھی۔ شادی کے چوتھے سال جب اللہ نے بیٹی دی تو چودھرائن نے قسم کھائی کہ وہ اُسے ہمیشہ باوضو رہ کر دودھ پلائے گی ——— ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ بڑے لوگوں کی یہ پکی نشانی ہے کہ وہ کچھ ایسے مشکل کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں جنھیں عام ہما شما نہ کر سکیں ——— جب وہ وضو کر کے جھولی میں عصمت ڈالے پھلکاری کی بکل مار کر دودھ پلانے بیٹھتی تو گاؤں کی عورتوں پر دبدبہ پڑ جاتا۔ گوہے کوڑے میں لتھڑی عورتیں، ننگ و ناموس کی کھیتیاں اجاڑ کر گزرنے والی دیہاتنیں، قدم قدم پر اپنے ماحول اور لوگوں سے سمجھوتے کرنے والی سادہ ارن زنانیاں چودھرائن کو کسی کرشمہ سے کم نہ سمجھتیں۔ وہ انھیں اولیاء اللہ لگتی۔

سردیوں کی رات تھی:

باہر بڑے کھلیانوں میں مونجی کے ڈھیر تھے۔ دن کے وقت چودھری صاحب اور ان کے منشی اپنے سامنے جھڑے چاولوں کو بڑے کانٹے پہ تلوا کر بوریوں میں بند کرواتے رہتے رات کو سلی اُن سلی اور منہ کھلے ننگے ڈھیروں پر اوس پڑتی رہتی۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ رضائی کے اندر بھی چھوٹی عصمت کی ناک برف کی تراش جیسی سرد رہتی۔ حویلی کے کواڑ پرانے مضبوط تھے لیکن پتہ نہیں کن درزوں سے ہوا ٹھنڈی ناٹ ٹھنڈی کی گولیوں کی طرح آ رہی تھی۔ اتنی سردی کے باوجود چودھرائن نے بڑی چوکی پر بیٹھ کر وضو کیا اور دوشالے میں عصمت کو تھپکا کر کے دودھ پلانے لگی۔ شادو رات گئے تک چودھرائن کو دبانے میں مشغول رہتی تھی اس لیے چودھرائن کو احساس نہ ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ وہ پلنگ کی پائینتی کھڑی ململ کے میلے دوپٹے میں لنڈے کے سوئٹر کتنا رادھیڑ رہی تھی ....

"اب تُو جا شادو آج مجھے نہیں دبوانا ———"

شادو ویسے ہی کھڑی رہی۔ جیسے آستانوں پہ مجذوب کھڑے رہتے ہیں پاؤں پہ پاؤں دھرے شادو کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا دھرتی کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ مٹیالہ تھا۔ ہاتھ پاؤں سردیوں میں اتنے پھٹ جاتے کہ لہو بہنے لگتا۔ کانوں میں برسوں پرانی چاندی کی ڈنڈیاں تھیں جو اب شادو کے کان ناک آنکھوں کی طرح اس کے جسم کا حصہ ہو گئی تھیں۔ آٹھ سال پہلے جب اس کا خاوند مرا اُسے اس وقت بھی ان ڈنڈیوں کو اتارنے کا خیال نہ آیا۔ وہ کھاتی پیتی خدمت کرتی غائب رہتی اس کے پاس جیسے کہنے کو برسوں سے کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھتیں ضرور تھیں لیکن دل تک کوئی شبیہ نہ اترتی تھی کوئی بات وہاں تک پہنچ نہ پاتی تھی وہ کھیتوں کھلیانوں میں چلتی ہوئی یوں نظر آتی جیسے بوڑھی پھنڈر گائے ہو جسے گاؤں والوں نے رقم کھا کر شام لات میں چرنے چگنے کے لئے چھوڑ دیا ہو ———

"جا تو شادو ——— بڑی ٹھنڈ ہے مریں اور ایک گلاس گرم گرم دودھ پی کر جائیں کاڑھنی میں سے" چودھرائن کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ شادو نے کبھی دودھ مکھن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب بھی چودھرائن اسے کوئی اچھی چیز کھانے کو کہتی وہ چیز ضرور لے لیتی لیکن کبھی کھاتی

نہیں تھی۔

"کھڑی کیوں ہے دیکھتی نہیں کتنی ٹھنڈ ہے جا شادآں ——— تیری مریاں انتظار کر رہی ہوگی۔"

شادو کی آنکھ سے آنسو نکلا ——— ایک چھوٹا سا کمینہ آنسو۔ مدت کا رکا ہوا پہلا آنسو۔

"مریاں تو چودھرائن جی ——— وہ چپ ہو گئی۔

"ادھر آ مرن جوگی ——— کیا ہوا ہے مریاں کو ———"

شادو پلنگ کے پاس ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ گئی۔

"مریاں کو کیا ہونا ہے ———" آہستہ سے شادو نے کہا۔

شادو تو اچھے وقتوں میں کبھی نہ بولی تھی۔ اب کیا بولتی۔ ایسی روحیں تو ازل سے چپ ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری باتیں جیسے روز قیامت کے لیے روک رکھی تھیں۔

"پھر بھی کوئی تو بات ہے ——— بتا ناں!"

"مریاں کے بچہ ہونے والا ہے ——— پانچواں مہینہ ہے ———!"

"مریاں کے بچہ؟ ——— کیسے؟ بچے کبھی ہوا ہے ایسے؟"

شادو ابھی تک سوئیٹر کے پھوٹے کھینچ رہی تھی۔ شاید جتنے الفاظ اس نے آج تک سیکھے تھے ان سب کو ملا کر بھی اس کی بپتا بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔

"مجھے کیا پتہ چودھرائن جی ——— میں تو دن بھر یہاں مری رہتی ہوں پتہ نہیں وہاں کیا کھے سواہ کھاتی ہے ———"

"پھر ——— اب! ——— اب کیا کریں؟"

شادو نے اٹھ کر چودھرائن کے پاؤں پکڑ لیے۔

"بس جی عزت بچ جائے میرے مرے ہوئے یاسین کی ——— دائی بیگاں چار سو روپیہ مانگتی ہے ——— میں روپیہ بھی دے دوں گی شاہنی جی پر ——— یہ کام کرواؤں کہاں ———؟ پردے کی بات ہے جو آپ اسے حویلی میں رکھ لیں اپنے پاس ——— تو عزت بچ جائے میری ———

شادو ہاتھ سینے پر ملتی ہوئی دیر تک کہتی رہی ہائے عزت بچ جائے میری ——— ہائے عزت بچ جائے یاسین کی۔"

چودھرائن کو شادو پر دل ہی دل میں بڑی ہنسی آئی۔ بلکہ اُسے تعجب ہوا کہ شادو بھی اپنے آپ کو عزت دار سمجھتی ہے؟ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ؟ ——— اگر مریاں نے حرامی بچے کو جنم دے بھی دیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ چودھرائن کو یہ ضرور معلوم تھا کہ غریبوں پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں لیکن یہ کہ انھیں کوئی عزت وغیرہ کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے یہ اس کے لئے نئی بات تھی۔

خواہ مخواہ بچہ ضائع نہ کروا شادو ——— گناہ سر نہ لے ——— اپنے یہاں حویلی میں پل پلا جائے گا ———"

"نہ جی نہ ——— اللہ رسول کا گناہ سر آنکھوں پر ——— دنیا کی رسوائی ہم دونوں برداشت نہیں کر سکتیں ——— ایک ہی چیز تو کمائی ہے

ساری عمر ——— لے دے کے عزت اور ہم لوگوں کے پاس ہے کیا؟"

ان دنوں چودھرائن کا اونچے بانسے والا ناک تھا۔ اس میں بڑا لونگ ابھی ڈھیلا نہ ہوا تھا۔ رنگت ایسے تھی جیسے بلاری نے گلابی رنگ میں چٹکی بھر موتیا کی بھی ملا دی ہو۔ چوہدری جب سیاہ عربی گھوڑے سے اتر کر اندر آتا تو چودھرائن گھوڑے کے سر سے اونچی نظر آتی۔ چودھرائن تو شالے کے نسرے ہوئے کھیت کی طرح ہریالی ہی ہریالی تھی۔ پھر ایسی بے داغ زندگی ——— نماز روزے کی ایسی پابند ——— کمان سے نکلے ہوئے نشانے پر لگنے والے تیر کی طرح اس کی ساری زندگی بے خطا تھی اسے یہ ضرور علم تھا کہ غریبوں کی زندگی مشکل گزرتی ہے لیکن اس ذلت آمیز زندگی میں بھی وہ اپنے آپ کو عزت دار سمجھتے ہیں۔ اس کا اسے علم نہ تھا! بھلا جو پلا ہی دلدر میں ہو اس کا عزتِ نفس سے کیا تعلق؟

"بچالیں چودھرائن مجھے میری مریاں کو بچالیں ———"

"اس کا باپ کون ہے؟ ——— چودھرائن نے کڑک کر پوچھا ——— اس کا قیمہ کروا دوں گی ٹوکے سے۔"

چودھرائن نے یہ بات کچھ اس خیال سے نہ کی تھی کہ کسی نوجوان نے مریاں کی زندگی برباد کر دی تھی بلکہ چودھرائن کا خیال تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ کون خود سر تھا جس نے سرحدیں پار کرنے کی کوشش کی تھی؟ بھلا وہ کون تھا جو حویلی کی مہر حاصل کئے بغیر اپنا قانون آپ بنانے لگا تھا۔ رسہ گیری کا حکم حویلی سے ملتا تھا۔ موکھا توڑنے کی اجازت یہاں سے حاصل ہوتی تھی۔ گاؤں کی بہو بیٹیاں ان کی ایما پر خورد برد ہوتی تھیں پھر یہ کون تھا؟ جس نے ان سے پوچھا تک نہیں۔

"کون ہے وہ بول شادو ——— اتنی خودسری؟ اتنی خودداری؟"

"مریاں اس کا نام نہیں بتاتی سائیں۔"

"اتنی ہمدردی ہے اس سے ———"

"کہتی ہے مر جاؤں گی لیکن اس کا نام نہیں بتاؤں گی ———"

"پھر تو شادو مدد کرنا مشکل ہے۔ میں تو کل شام سے پہلے پہلے اس کا نکاح پڑھوا دیتی مریاں سے ———"

"مریاں کہتی ہے چودھرائن ——— وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا وہ پہلے سے گھر والا ہے ایک سوانی کا ———"

گاؤں کے سارے بیاہے ہوئے نوجوان چودھرائن کی نظروں میں گھوم گئے۔

بڑی دیر شادو چودھرائن کے پاؤں دباتی رہی۔ جب اٹھی تو صبح خیز مرغ کہیں کہیں بانگیں دینے لگے تھے۔

دوسری شام مریاں کال کوٹھڑی میں منتقل کر دی گئی۔ یہ کام بڑے خفیہ انداز میں منجر سے بہت پہلے کیا گیا پھر حسبِ معمول باہر قفل ڈال دیا گیا اور شادو پھرکی کی طرح دالان اور کوٹھڑی میں پھرنے لگی۔ پولتی چالتی تو وہ پہلے بھی کم تھی اب وہ کسی جگہ ٹکتی ہی نہ تھی جیسے وہ تمام شامیں ٹوٹ چکی تھیں جن پر وہ اپنی مشقت کے دوران پل دو پل آرام کر لیا کرتی تھی۔ رات گئے چودھرائن اور شادو پچھلی کوٹھڑی میں گئیں۔ پچھلے کچے دالان میں بڑی خاموشی تھی۔ کسی زمانے میں یہاں چوری کے گھوڑے باندھے گئے تھے اس رات بارش ہو گئی دالان میں اب بھی زمین پر کہیں کہیں ان کے سموں کے سوکھے ہوئے گہرے نشان تھے۔ کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا اس عرصے میں شادو نے کئی بار سوچا کہ

اس کی اکلوتی چاند سی مریاں کچھ کھا کر مر چکی ہے جس وقت مریاں نے دروازہ کھولا چودھرائن نے لالٹین اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا آنکھوں میں تازہ نیند کی لالی تھی۔

"سو رہی تھی؟ ——"

"جی ——"

"تجھے نیند آ گئی کم بخت —— تیرا ستیاناس مارا جائے ہلکائی ہوئی ماں کی تو پکار ... نہیں جھپکی سارا دن" مریاں چپ رہی۔ وہ بھی ماں کی طرح چپ رہنا سیکھ گئی تھی۔ شادو اور چودھرائن دونوں کمرے میں داخل ہو گئیں اور دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ لالٹین کی روشنی میں سارے کمرے کی شکل آسیب زدہ ہو گئی۔ ڈھیلی چارپائی پر کھدر کی پھولدار سرخ رضائی پڑی تھی۔ نیچے ایک پرانی چٹائی پر کپڑوں کی گٹھڑی تھی جسے شاید مریاں نے سرہانے کے طور پر بھی استعمال کیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں گھڑے پر چھاپہ اور ایک طرف ایک پرانا لوٹا پڑا تھا۔

"کون ہے وہ مرجانا ... اوترانکھرا۔" چودھرائن غرائی۔

مریاں چپ رہی۔

پورے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ چودھرائن نے مریاں کے منہ پر ایسے مارا کہ شادو کے دانت بجنے لگے اس نے آج تک مریاں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔ ویسے بھی پوہ کی سردی میں اس کا گھسا پٹا سویٹر ناکافی تھا۔

"کون ہے بتا بول مر —— پھٹ!"

مریاں چپ رہی۔ گھنٹہ بھر کی چیخ چیخ کے بعد منہ کھولا تو اتنا کہا۔ "وہ اپنے گھر میں راضی ہے چودھرائن جی۔ میں اس کا گھر تباہ نہیں کر سکتی۔ اس کا بھی کیا قصور —— ہونی ہی پکڑ لیا ——"

"اور تو اپنی ماں کو تباہ کر سکتی ہے ——"

"جو اللہ کی مرضی —— میں تو کسی کو بھی تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی چودھرائن جی۔"

"اچھا ابھی دائی آئے گی۔ صبح تک اللہ نے چاہا تو صفائی ہو جائے گی۔ میں نے لسے بلا بھیجا ہے۔ اور کان کھول کر سن لے مریاں اب اگر تو نے اس سے کوئی غرض رکھی تو جان سے مار دوں گی ——"

"نہیں جی —— وہ خود ہی بہت ڈر گیا ہے —— وہ کیوں مجھ سے کوئی غرض رکھے گا اس نے آخر گاؤں میں رہنا ہے کہ نہیں"

رات بھر چودھرائن جاگتی رہی۔ دل اس کا بھی عورت کا تھا ایسی عورت جو دودھ بھی پلا رہی ہو اپنی رضائی گدا دری سب مریاں کو دی یکھن دودھ شکر بادام سب کا منہ کھول دیا۔ دوسری رات عشاء کی اذان کے بعد شادو بھائی بھائی اندر آئی لیکن چودھرائن کی بڑی نند عصمت کو گود میں لیے بیٹھی تھی شادو کچھ دیر چودھرائن کو بلانے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چپ چاپ واپس چلی گئی۔ آدھی رات کے قریب بصری دائی نے آ کر چودھرائن کو جگایا۔

"پیچھے چلیں شادو کو کچھ ہو گیا ہے ——"

چودھرائن ہڑبڑا کر اٹھی مریاں کو کچھ ہو جانے کے امکان تھے لیکن شادو کی خبر کے لیے وہ تیار نہ تھی۔

"بچے کو ہم نے دالان ہی میں دفن کر دیا ہے ——— لیکن ———"

چودھرائن اور بصری دائی جب پچھلے کمرے میں پہنچیں تو مریاں آخری دم لے رہی تھی۔ کونے میں شادو لوٹے میں ٹھنڈا پانی بھرے اپنے کپڑوں سمیت نہا رہی تھی۔ وہ سر پر لوٹا لے جاتی اور پانی کی ٹونٹی سے دھار گراتی آہستہ آہستہ پانی اس کی چھاتی پیٹ اور کولہوں پر رستے لگتا۔ چودھرائن نے مشکل سے اس کے ہاتھ سے لوٹا چھینا لیکن مریاں کا سانس اس وقت اکھڑ چکا تھا۔ شادو نے مریاں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا وہ کچے دالان میں بھاگ گئی اور کوٹھڑیوں کے آگے آگے چکر لگانے لگی۔ شادو اپنی عزت تو بچا چکی تھی لیکن اب اس کے پاس ایسا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا جس کی ٹیک لے کر وہ زندگی بسر کرتی۔ وہ سارا سارا دن دیواروں کے ساتھ ساتھ دالانوں کے اندر گاؤں کے باہر گول گول چکر کاٹنے میں مشغول رہتی جیسے چمگادڑیں شام کے وقت راستہ بھول کر اندرون میں آ جاتی ہیں اور ایک دیوار سے دوسری تک چکر لگاتی رہتی ہیں کہتے ہیں جس رات چوری کے گھوڑے پچھلے دالان میں باندھے گئے ان میں سے ایک سفید گھوڑی ساری رات ایسے ہی دالان میں چکر لگاتی رہی تھی اور بارش میں اس کے سموں کے نشان کچی مٹی پر پڑ گئے تھے ———

مریاں کے مرنے کے پورے ایک ہفتے بعد مسجد کے پچھواڑے ہرے دروازے والا مکان خالی ہو گیا اس میں جان محمد رہتا تھا۔ اس نے اپنی ساری زمینیں اونے پونے بیچ دیں۔ ڈاڑھی رکھی اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا جانے سے پہلے اس نے اپنے کپڑے گاؤں والوں میں بانٹ دیے ساری ٹسر کی چادریں بوسکی کی قمیصیں ملتانی کھسے۔ جس وقت وہ گدے پر بیٹھ کر گاؤں سے رخصت ہوا اس کے جسم پر صرف ایک چارخانہ کھیس تھا۔ اسکی لاڈلی بیوی نے نیلوی بلوریں قمقمے کا نقاب اٹھا کر کئی دفعہ اس کی طرف دیکھا لیکن جان محمد نے گلے سے وہ چاندی کا تعویذ بھی اتار پھینکا جو کئی سالوں سے اس کے گلے میں تھا۔

مریاں کے جانے کے بعد اس کوٹھڑی میں صرف ایک اور مہمان ٹھہرا چودھرائن کو ادھر سے ہول آتا تھا۔ وہ کسی کو پچھلے دالان میں جانے تک نہ دیتی تھی لیکن اسی اکتوبر میں چودھری کا بڑا بیٹا سائکل پاگل ہو گیا۔ چودھری صاحب کتے کو شہر سے لائے تھے لیکن پاگل پن کا ٹیکہ لگوانے میں غفلت ہو گئی۔

سنہرے بالوں والا چھوٹا سا پلا اسے تو رکابی میں سے دودھ بھی پینا نہ آتا تھا عصمت کو تو کتا دیکھتے ہی اس سے عشق ہو گیا۔ سارا دن گھولی میں چھپائے پھرتی۔ چودھرائن لاکھ کہتی۔ "دیکھ عصمت تیرے کپڑے ناپاک ہوتے ہیں ———"

"ہونے دیں امی ——— میں ناپاک ہی اچھی ———"

عصمت نہ صرف لاڈلی تھی بلکہ ایک حد تک چودھرائن اس سے ڈرتی بھی تھی۔ کالج میں پڑھنے والی لڑکی کا ان پڑھ ماں پر قدرتی رعب ہوتا ہے جیسے دانشور کے بول بانٹ سے معمولی آدمی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ چودھرائن سب کو ڈانٹ ڈپٹ لیتی تھی۔ حتیٰ کہ چودھری صاحب بھی اس کی آمد پر گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے لیکن عصمت کے سامنے چودھرائن ایسے پھرتی جیسے ڈرا ہوا کتا ٹانگوں کے اندر دم دبائے پھرتا ہے ——— آواز بھی چودھرائن کی نرم پڑ جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ کم از کم وہ اپنے کھردرے ہاتھ تو کہیں چھپا ڈالے بغل کے اندر ہاتھ ڈال کر جب وہ بات کرتی تو بات میں زور باقی نہ رہتا ایک بے بسی سی آ جاتی۔

کتا دیکھتے دیکھتے شیشے جڑے پلنگ جتنا اونچا ہو گیا۔ عصمت نے اس کا نام جمی رکھا تھا۔ مزارع لکمی کمین مسلی سارے جمی کو لیے پھرتے تھے کیونکہ وہ چودھری جی اور عصمت کی گودیوں میں پلا تھا اور جیسے یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ بچہ کن گودیوں میں پرورش پاتا ہے ایسے ہی اگر پالتو جانور بھی بڑے لوگوں کی گودیوں کا مزہ چکھ چکے ہوں تو ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور پھر ان سے پاکی پلیدی وابستہ نہیں رہتی ویسے گاؤں کے دوسرے کتوں کو وہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے لیکن جمی تو انھیں انسان لگتا جو ساری باتیں چودھری صاحب کو بتانے کا اہل تھا۔

گرمی جا چکی تھی سردی ٹھیک طور پر آئی نہ تھی جس روز بی اے کا امتحان دے کر عصمت گھر آئی اسی رات کا واقعہ ہے کہ جمی نے رات کے اول وقت مزارع خدا بخش کو پنڈلی پر کاٹ کھایا۔ اس سے پہلے جمی حویلی میں آنے والوں کو بھونکا ضرور کرتا تھا لیکن اس نے کبھی کسی پر حملہ نہ کیا تھا۔ مزارع خدا بخش کو تو اسی وقت ہسپتال روانہ کر دیا گیا لیکن خود جمی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پہلے تو چودھری صاحب نے خیال کیا کہ شاید خوفزدہ ہو کر کہیں چھپ رہا ہے لیکن جب پورا دن نہ ملا۔ رکابی میں اس کا راتب اور آنگن میں اس کی سنگلی خالی رہی تو اس کو تلاش کرنے کے لئے کمی کمین نکلے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ چودھری صاحب کا جمی پاگل ہو گیا ہے لیکن کوئی اونچی آواز میں یہ بات کرنے جوگا بھی نہ تھا۔ گاؤں والے دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں بڑے بڑے لٹھ لے کر جمی کی تلاش کو نکلتے تھے۔ حالانکہ عصمت کو یہی بات بُری لگتی تھی ۔ ۔ ۔

"بزدل کہیں کے ۔ ۔ ۔ کتا ڈھونڈنے جاتے ہیں اور لاٹھیاں ساتھ لے کر جاتے ہیں وہ بیچارہ کسی کو کیا کہتا ہے اسی لئے تو ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ مردوں میں ہمت ہی باقی نہیں رہی۔"

سرکاری سوئے سے لے کر مائی بھاگی کی جھگی تک رات گئے تک لالٹینیں لے کر سب تلاش کرتے رہے لیکن جمی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاند کی آخری راتیں تھیں اور موسم میں ایک خاص قسم کی مستی تھی۔ مالٹے کے درختوں پر کچے مالٹوں پہ ہلکا ہلکا غبار مٹی کا چڑھا تھا۔ اونچے اونچے گنے کے کھیتوں میں رات گئے تک ٹیٹری بولتی تھی۔ آسمان بے داغ تھا اور کہیں کوئی بادل نہ تھا۔ کہیں کوئی بارش کے آثار نہ تھے۔

پھر خشک سوئے میں بھاگتا ہوا جمی رات کے پچھلے پہر بلے سارج نے دیکھا وہ نہ تو رات کو تہجد پڑھتا تھا نہ صبح فجر لیکن ایک عرصہ سے وہ تہجد کے وقت اٹھتا اور یہ گاتا ہوا سوئے کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔

"جیہڑے ادب نہیں کردے ماواں دا

منہ کالا بے حیاواں دا

کہو لا الہ الا اللہ ۔ ۔ ۔ پڑھو لا الہ الا اللہ ۔ ۔ ۔"

جس وقت گھیر گھار کر جمی کو حویلی میں لائے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ لیکن بھاگ دوڑ کی وجہ سے وہ نڈھال بھی ہو چکا تھا۔ کسی کمی میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ چودھری صاحب کے حکم کے بغیر جمی کو گولی مار دیتا۔ اس لیے صبح کے وقت سب نے مل کر جمی کو حویلی کے پچھلے کمرے میں مقفل کر دیا اور اس بات پر خدا کا شکر کیا کہ کسی کو جمی نے کاٹا نہیں۔

جس وقت چودھری صاحب صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے مقفل کمرے میں جمی بھونک کر دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس نے وہ گھڑا توڑ

دیا تھا جس سے آخری بار شادو نے اشنان کیا۔ چارپائی کے اوپر کھدر کی رضائی بوئی ہوئی تھی اور خود دروازے اور کھڑکی سے ٹکریں مار مار کر جمی کی سنہری پوستین لہولہان ہو چکی تھی۔ چودھری صاحب تو شاید خود بندوق سے جمی کو نشانہ بناتے لیکن عصمت شہر کی پڑھی لکھی تھی وہ جمی کو مارنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ چارپائی پر اوندھے لیٹ کر اس نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی تھیں۔ چودھرائن نے تو پہلے ہی حکم صادر کر دیا تھا کہ بندوق کھڑکی کی سلاخوں میں سے نکال کر جمی کا صفایا کر دو لیکن عصمت کی آنکھیں دیکھ کر دوبارہ حوصلہ نہ پڑا۔

سارا دن جمی کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر مغرب کے قریب یہ آواز بالکل بند ہو گئی۔ چودھری صاحب خود کئی بار مقفل کمرے تک گئے اور بند دروازے کی درزوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندر اتنی چپ چپین تھی کہ ہر بار وہ دروازے کی چوکھٹ سے لوٹ گئے .....

عصمت کو نونٹ کی پڑھی لکھی فیوڈل لڑکی تھی۔ اس کے ماحول نے اسے ہاٹ ہاؤس کے پھول کی طرح پالا تھا کالج کی تعلیم نے اس پھول کو کٹ گلاس کے گلدان میں سجا دیا تھا۔ عصمت کو آرام دہ آسائش بھری زندگی نے بڑا IDEALISTIC بنا دیا تھا۔ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ حویلی کے باہر یا کالج کی دیوار کے اس پار چور، بدمعاش، زنا فریب ہوتا ہے اس کا خیال تھا کہ غریبی اور اس سے متعلقہ تمام جرائم اس لیے ہوتے ہیں کہ حکومتیں ادھر کافی توجہ نہیں دیتیں۔ وہ گناہ کو انسان سے وابستہ کر ہی نہ سکتی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دل میں جیسے گندہ اور صاف لہو ساتھ ساتھ بہتے ہیں ایسے ہی ہر انسان کے اندر نیکی اور بدی ساتھ ساتھ پٹڑی کی طرح بچھی ہے جس پر پڑے توازن کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ کچھ اللہ کے نیک بندے نیکی کی پٹڑی ایسی پختہ بنا لیتے ہیں کہ ان کی گاڑی ایک پہیے پر چلنے لگتی ہے لیکن ایسا ہونا کچھ سہل کام نہیں۔

اتنی آدرشی لڑکی کو یہ سمجھ نہ آئی کہ جمی کو مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے پورا دن اور رات جمی کو دیواروں سے سر مارنے کے لیے چھوڑ دیا۔ صبح فجر کے وقت جب موذن نے اذان دی تو عصمت دبے پاؤں پچھواڑے گئی۔ کہیں بھی کھدر کا ڈر کا نہ تھا۔ پچھواڑے آنگن میں ابھی تک سفید گھوڑی کے سموں کے نشان پکی مٹی میں دھنسے ہوئے تھے پتہ نہیں عصمت کو کیوں یقین تھا کہ اگر جمی زندہ ہے اور دیوانہ بھی ہو چکا ہے تب بھی وہ عصمت کو نہیں کاٹے گا۔ آدرشی لوگوں کی یہی بات ہوتی ہے کہ وہ نارمل کو بھی نارمل نہیں سمجھتے۔ عصمت نے بیچوں والے مہاجنتر جنتر رے میں گول چابی پھرائی۔ تالا کھل گیا تو وہ مامتا سے بھری آواز میں جمی جمی پکارتی دیوانہ وار کوٹھڑی کے اندر داخل ہوئی لالٹین کے باوجود تھوڑی دیر تک اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا پھر اچانک اس نے دیکھا سلاخوں والی کھڑکی کے عین نیچے وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس نے تھنوں سے خون بہہ بہہ کر دور تک جم گیا تھا اور اس کی خوبصورت آنکھیں نیم وا تھیں عصمت بے خوف جمی کے پاس جا بیٹھی۔ اس نے جمی کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اپنے شفون کے دوپٹہ سے اس کے چہرے کو صاف کرنے لگی۔ پتہ نہیں کیوں اسے کونونٹ کی انگریزی اسکول کی ارسولہ اور گھر کی پنجابی بھول گئی اور وہ اپنی دادی کے ریاستی لہجے میں بولنے لگی "مرد بچن شہدے ۔۔ علاج نہ کر سک دے ہن ایس غریب دا ۔۔"

جب دن چڑھے چودھرائن اسے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی تو وہ ابھی جمی کے آدھے دھڑ کو گود میں لیے ہوئے اپنی دادی کے لہجے میں بین کر رہی تھی۔ جب چودھرائن منت سماجت کر کے عصمت کو ساتھ اندر لے گئی تو اسے ایسے ہلہلا کر بخار چڑھا کہ کئی ہفتے

علاج کراتے رہے پھر آب وہوا کی تبدیلی کے لئے چودھری صاحب خود عصمت کو کراچی لے گئے ——

جمی کے پاگل ہونے کے بعد عصمت کو گاؤں کی حویلی سے پتہ نہیں کیوں ڈر آنے لگا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ ماں سے پوچھتی ——

"اماں میں پاگل تو نہیں ہو جاؤں گی؟" چودھرائن پہلے تو اسے لاڈ سمجھتی رہی پھر اس نے چودھری صاحب سے بات کی کہ عصمت شہدی کو شہر بھیج دیں جب تک اس کی شادی کا بندوبست ٹھیک طور پر نہیں ہوتا اگر یہ اپنے چچا شیر محمد کے گھر رہے تو اچھا ہے۔ ایم اے میں داخلہ دلوانا چاہیں تو دلوا دیں لیکن پڑھی لکھی لڑکی کا گاؤں میں یوں ڈولتے پھرنا اچھا نہیں ....

عصمت کچھ عرصہ چچا شیر محمد کے پاس رہی پھر اس نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور ماں باپ کی اجازت کے بغیر یونیورسٹی کے ہاسٹل میں شفٹ کر گئی۔ چودھری صاحب جلد از جلد بیٹی کو نکاح میں دینا چاہتے تھے لیکن جوں جوں عصمت کی تعلیم بڑھ رہی تھی ماں باپ کا حوصلہ اس کے سامنے کم ہو رہا تھا۔ اب وہ کئی باتیں انھیں بتائے بغیر کر لیتی انھیں پتہ بھی چلتا لیکن وہ درگزر کرتے وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے؛ عمر کے ایسے حصے میں داخل ہو چکے تھے جب اندر باہر آدمی ڈھیلا پڑنے لگتا ہے۔

شادی تو عصمت کی بڑی آسانی سے ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ عین مین چودھرائن کی جوانی کا نقشہ تھا۔ لیکن چودھری اور چودھرائن اس کے لئے کسی نسلی گھوڑے کی تلاش میں تھے۔ کسی کے سم میں نقص نکلتا کسی کی ایال درست نہ نکلتی کوئی دلکی چال میں نہیں تھا کوئی پویا میں —— عصمت کی ذاتی جائیداد کا یہ عالم تھا کہ شہری اور دیہاتی جائیداد اور دولت دس خاندانوں کو رئیسانہ زندگی گزارنے کی کفیل ہو سکتی تھی۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہی درپیش تھی کہ کہیں لالچی چالاک فریبی لوگ عصمت کو محض اس کی دولت کی خاطر نہ بیاہ کر لے جائیں۔

عصمت نے فقط وقت کٹی کے لئے ایم اے میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن وہ ایم اے فائنل میں پہنچ گئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا لمبے نوکدار ناک سانولی رنگت خوب صورت ہونٹوں والی لڑکی کو کوئی بر نہ مل سکا۔ پھر جب وہ امتحان دے کر گھر لوٹی تو ہر وقت کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ ابھی تک ماں باپ عربی نسل کا گھوڑا تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔ کسی کا خاندان پیٹا تھا تو کسی کی جائیداد معقول نہ تھی۔ یہ رواڑ چنیں تو تھیں ہی لیکن اب سب سے بڑی پھلانگ یہ تیار ہوئی کہ لڑکا پڑھا لکھا بھی ہو کیونکہ لڑکی ایم اے کا امتحان دے چکی

ادھر عصمت چپ کے دروازے بڑھاتی جا رہی تھی۔ ماں بیٹی میں واجبی سی بول چال رہ گئی تھی۔ ماں اسے بلاتی ڈرتی کیونکہ عصمت اگر انگریزی میں جواب دے دیتی تو پھر چودھرائن کو بات آگے بڑھانے کے لئے مشکل درپیش ہوتی۔ گاؤں کے معاملات میں عصمت کو کوئی دلچسپی نہ تھی وہ سارا دن اپنے کمرے میں بھاری بھاری پردے برابر کئے بیڈ لیمپ جلائے ایسے ناول پڑھتی رہتی جو شہر سے وہ اپنے ساتھ لائی تھی ان رسالوں سے چھٹی ہوتی تو وہ ڈیک پر ڈسکو میوزک سننے میں مشغول ہو جاتی۔ اس سے پہلے اسے غزلیں سننے کا شوق تھا اور اس کی ماں گو غزلوں کو سمجھتی نہیں تھی لیکن وہ موسیقاروں کی آوازوں کے سحر میں ضرور گم ہو جاتی تھی اس نئی موسیقی کی لے چال سے تو چودھرائن بالکل ناواقف تھی۔ اس کے علاوہ چودھرائن کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ اس کی پڑھی لکھی لڑکی اس کی صحبت میں فوراً اچاٹ ہو جاتی ہے اور پڑھتے پڑھتے اٹھ کر الماریاں ٹھیک کرنے اپنے بال برش کرنے یا پھر خط لکھنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ اسی لئے چودھرائن نے عصمت کے کمرے میں آنا جانا قریب قریب چھوڑ دیا تھا۔ پھر سب سے

بڑی اور اکلوتی وجہ یہ بھی تھی کہ چودھرائن اپنے اور بیٹی کے طور طریقوں میں کوئی مماثلت نہ پاتی تھی ۔ عصمت چھری کے ساتھ ٹھوا سا مکھن ٹوسٹ پر لگانے کے بعد سارا دن مکھن کی شکل نہ دیکھتی ۔ چودھرائن بل دار پراٹھے کو بھی مکھن کے ساتھ کھانے کی عادی تھی ۔ عصمت کے لئے کوک کے کریٹ شہر سے آتے تھے ۔ چودھرائن ان بوتلوں کو دوا سمجھتی تھی ۔ پہناوا بھی عصمت کا چودھرائن کو عجیب لگتا نہ ڈھنگ کی جوتی نہ حساب کا دوپٹہ نہ شرع سے ڈرنے والی قمیص ۔ رفتہ رفتہ عصمت اور چودھرائن دو الگ الگ کیمپوں میں بٹ گئیں ۔

لیکن جس روز عصمت کا اصلی دل پسند دولہا تلاش کر لیا گیا اور منگنی کی رسم ادا ہو گئی اس رات بڑے زور کا گڑا برسا ۔ ہزار تلاش کے بعد چودھری صاحب کی پھوپھی کا بیٹا ملا تھا ۔ یہ پورے برسوں سے امریکہ میں تھا اور ایم بی اے کرنے کے بعد وہیں ملازم ہو گیا تھا ۔ اچانک ان کی واپسی سے چودھرائن کا مسئلہ طے ہو گیا ۔ یہ منگنی کی رات کا واقعہ ہے جب خاندانی زیورات کے ساتھ ساتھ نئے ماڈرن ہیروں کے سیٹ عصمت کے پلنگ پر بے جوڑ پڑے تھے کہ چودھرائن کو عصمت نے بڑے سادہ الفاظ میں بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے ۔

"تو پھر تو منگنی پر کیوں مانی ۔۔۔ بدبخت میں ان سب کو ۔۔۔ میں چودھری جی کو کیا منہ دکھاؤں گی ۔"

عصمت کے جسم پر ابھی منگنی کا جوڑا تھا اور اس کے چہرے پر کئی دنوں کے بعد لپ سٹک کی چمک تھی ۔

"منگنی ٹھیک ہے ماں مجھے منگنی پر تو کوئی اعتراض نہیں ۔۔۔"

"لیکن اگر لڑکے کو پتہ چل گیا ۔۔۔"

"وہ اتنے برس امریکہ رہا ہے وہاں ایسی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتا آپ فکر نہ کریں ۔"

"تو ۔۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔ تو اس شہدے کے ساتھ نہیں کر سکتی ۔ جب اتنا بڑا قدم اٹھا ہی لیا تھا تو اللہ رسول کے حکم کی پابندی بھی ہو جاتی ۔"

عصمت نے منہ پھیر کر آہستہ سے کہا ۔ "اس کی پسلی نہیں ہے اماں ۔۔۔ وہ شادی نہیں کر سکتا ۔"

"ہائے میرے اللہ تو نے تو ہمیں دو کوڑی کا نہ چھوڑا عصمت ۔۔۔۔ جو پھوپھی کو پتہ چلا تو کیا وہ منگنی رہنے دیں گی ۔"

"آپ مجھے ایک بار اعجاز صاحب سے ملنے دیں وہ منگنی نہیں توڑیں گے ۔۔۔ آپ فکر نہ کریں ۔"

پتہ نہیں کیوں چودھرائن سناٹے میں آ گئی اس نے ایک زناٹے دار پورے ہاتھ کا تھپڑ عصمت کے منہ پر مارا اور چلائی "بول کون ہے وہ کمبخت ۔۔۔۔ بول بتا ۔۔۔ تیری جرأت کیسے ہوئی ، تجھے ہمت کیسے پڑی ۔۔۔"

چودھرائن کے سامنے اس کی ساس کھڑی تھی ۔ عصمت ویسے ہی ڈانگ کی ڈانگ کھڑی رہی نہ اس کا چہرہ بدلا نہ تھپڑ کے کوئی آثار اس کے چہرے پر آئے ۔ وہ انگریزی اردو اور پنجابی اچھی طرح جانتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ایسے لمحوں میں وہ اپنی دادی کی زبان بولنے لگتی ۔

"کدی توں کسے شہدے نال پیار کیتا آئی اماں تینکو کی پتہ ۔۔۔ اپنا آپ وار نا کی ہندا آئی ۔۔۔"

چودھرائن کی اپنی بولی یہ نہ تھی۔ وہ اپنی ساس کو سامنے کھڑا پاکر خاموش ہوگئی ۔ بڑی دیر کے بعد بولی۔
"تجھے پتہ نہیں تھا کہ تیرے باپ کا اونچا شملہ ہے اور وہ کسی حرامی پلے کو پال نہیں سکتا۔"

عصمت ویسے ہی کھڑی تھی۔ کندھوں پر سرخ پھلکاری اوڑھے ۔ ہونٹوں پر باسی پپ شک جمائے اس کی آنکھوں کے دیئے بڑے روشن تھے جیسے وہ زندگی سے ہر قسم کی آس لگائے ہو۔ اسکے چہرے سے ذرا سی بھی شکستگی ظاہر نہ تھی ۔

"میرا تو خیال تھا اس گھر میں اتنے گھوڑے ، اتنے کتے اور اتنی بھینسیں پل رہی ہیں میرا بھی بچہ پل جائے گا ۔ لیکن ۔ ایک اور لاوارث سے کیا فرق پڑتا ہے" عصمت نے جملہ مکمل نہ کیا۔ . . . . .

پچھلا کمرہ خود بڑی رازداری کے ساتھ رات کے پچھلے پہر چودھرائن نے تیار کیا۔ اور بصری دائی کے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے عصمت کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔

جس وقت عصمت اور بصری نے اندر سے دروازہ بند کیا اور چودھرائن نے باہر تالا ڈالا۔ اس کے بعد جیسے چودھرائن پر شادو کی روح طاری ہوگئی۔ وہ کچے آنگن میں گول گول چکر کاٹنے لگی اس کے ہونٹوں پر ایک ہی دعا تھی ۔ "یا اللہ میں تجھ سے ایک ہی دعا مانگتی ہوں میری عزت بچ جائے ۔"

پچھلا آنگن بالکل کچا تھا۔ لیکن موسموں نے اس کی کچی مٹی کو مضبوط اور پکا کر دیا تھا۔ صرف اس پر ایک سفید گھوڑی کے سموں کے گہرے نشان تھے۔ ان نشانوں میں اونچے نیچے پاؤں دھرتی دونوں ہاتھ کبھی آسمان کی طرف اٹھاتی کبھی سینے پر مارتی چودھرائن ایک ہی دعا مانگے جا رہی تھی۔ کہتے ہیں دعا مانگنے کا سلیقہ بھی کسی کسی کو ہوتا ہے۔

جب دعا پوری ہوگئی اور بچہ اور عصمت پار جالگے تو یکدم چودھرائن کو پتہ چلا کہ وہ غلط دعا مانگتی رہی ہے۔

سنتے ہیں جب عصمت کو نہلا دھلا کر میت کی چارپائی پر ڈالا۔ تو چودھرائن پچھلے آنگن میں پرانے گھڑے سے کپڑوں سمیت نہانے میں مصروف تھی! پتہ نہیں کب چودھری صاحب اسے اپنے کھیس کی بکل میں لپیٹ کر اندر لائے اور کب ان کی عصمت ہمیشہ کے لیے حویلی سے رخصت ہوگئی ؟

کہتے ہیں کہ اس روز ایسی بارش ہوئی ایسی بارش ہوئی کہ پچھلے آنگن سے پرانے سموں کے تمام نشان ہمیشہ کے لئے صاف ہوگئے . . . . . اور پچھلی کوٹھڑی پتہ نہیں کیوں آپی آپ ڈھے گئی!

طوفان

رحیم گُل

شیر باز اٹھارہ برس کا ہوا تو اُس کی دستار بندی ہوئی ——
آج اُس کی ماں شاہ بانو بہت خوش تھی، اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے تھے اِس انتظار میں، کہ بیٹا جوان ہو اور وُہ اپنے شوہر کا انتقام لے سکے۔
شیر باز ایک معصوم نوجوان تھا۔ ماں نے اُسے انتقام کی بھٹی میں کندن بنا دیا تھا۔ ایسا کندن، گویا اُس کا وجود محض ماں کے حسرتِ انتقام سے عبارت ہوا۔
یہ اس کے خام جذبوں کا ایک پہلو تھا ——
دوسرا پہلو دینی تھا، پابندی سے نماز پڑھتا تھا قرآن وحدیث کا عاشق تھا اور زندگی کا تیسرا پہلو حُجرہ تھا جہاں وہ سماجی قدروں اور روایات کی باتیں سُنتا تھا ——
گھر کا ماحول حجرے سے مختلف، حجرے کا ماحول مسجد سے مختلف، وہ ایک ایسے سہ راہے پر کھڑا تھا جہاں سے ایک راستہ گھر کو، دُوسرا حجرے کی طرف اور تیسرا مسجد کی طرف جاتا تھا ——
ماں —— جس کے بطن سے پیدا ہوا تھا، جس کی ممتا نے روز و شب اُس کی بلائیں لی تھیں وہ اسے غلط راستے پر کیسے ڈال سکتی تھی ——
حجرے کے بزرگ، جن کی باتیں تجربوں سے بھرپور، جن کے مشاہدے قطعی، اور جن کے معیار حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے، اُن کی رائیں بھی غلط نہیں ہو سکتی تھیں؛
اور مسجد ——، مسجد کے مولوی کی سیدھی سادی باتیں، جن میں کوئی پیچ نہیں ہوتا تھا، جو سیدھی دل میں اُتر جاتی تھیں، اور جن سے محبت، ایثار اور انکساری کی خوشبو پھوٹتی تھی ——
ظاہر ہے کہ یہ راستہ بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا ——؟
آخر اس کی زندگی میں وہ رات آگئی —— جسے آزمائش کی گھڑی کہتے ہیں اور امتحان کا لمحہ —— !
وہ طوفانی رات، وہ برفانی رات،
کہ تینوں میں سے اِک راہ کا انتخاب کرے؟
آدھی رات کو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، جنوری کی یخ بستہ رات، بادو باراں کی طوفان خیزیوں میں کوئی بھولا بھٹکا

مسافر پناہ کی تلاش میں تھا ———

شاہ بانو جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، صبح تک طوفان تھم جائے گا تو وہ اٹھارہ سال بعد سسرال لوٹے گی ——— شیر خوار شیر باز کو گود میں لے کر نکلی تھی اور اب جواں سال تنومند شیر باز کو ساتھ لے کر واپس جائے گی۔

گاؤں کے لوگ حیران ہوں گے کہ وہ جو معدوم تھے، پھر وجود ہو گئے، وقت اٹل ہوتا ہے، یہ ہوا کی طرح چلتا ہے، پانی کی طرح بہتا ہے مگر ختم نہیں ہوتا، اٹھارہ سال بعد آئے یا ایک صدی بعد آتے ہوا کی طرح وقت بھی خلا کو پُر کرتا رہتا ہے۔

اور پھر گاؤں کے لوگ اُس وقت شدید حیران ہوں گے جب اسلم خان کا سر میری ٹھوکروں میں ہوگا!

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تو شاہ بانو کی سوچوں کی لڑی بکھر گئی، وہ اٹھی، لالٹین جلائی، بیٹے کو جگایا۔

شیر باز آنکھیں ملتا ہوا اٹھا تو ماں نے کہا:

"کوئی مسافر ہے بیٹا! دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، طوفان میں گھر گیا ہے شاید۔"

"دیکھتا ہوں ماں!" وہ اٹھا

"کوئی چیز اوڑھ لو اور لالٹین لے لو ساتھ۔"

شیر باز نے چادر اوڑھ لی، لالٹین لے کر دروازے کی طرف گیا کنڈی کھولی تو سینے سے پار ہونے والی یخ طوفانی ہوا کی پھوار اندر آ گئی ———

دروازے میں ایک ادھیڑ عمر اجنبی چادر میں لپٹا ہوا پانی میں شرابور تھر تھر کانپ رہا تھا

"مسافر ہوں بیٹے! تین گھنٹوں سے طوفان میں گھرا ہوا ہوں۔"

"اندر آ جاؤ کاکا! اندر آ جاؤ۔" شیر باز نے رستہ دیتے ہوئے کہا

"اُف خدایا!" اجنبی نے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ایسی خوفناک رات میری زندگی میں کبھی نہیں آئی۔"

شیر باز نے لالٹین تپائی پر رکھتے ہوئے کہا: "آپ کھاٹ پر بیٹھیں میں آپ کے لیے خشک کپڑے لاتا ہوں اور بستر لگاتا ہوں۔"

شیر باز دوسرے کمرے کی طرف لپکا ——— ماں پہلے ہی ٹین کے صندوق سے مرحوم شوہر کے کپڑے نکال چکی تھی ماں سے کپڑے لیتے ہوئے وہ بولا:

"جب تک وہ کپڑے بدلے ماں تم اُس کے لیے دودھ گرم کر دو، سردی سے کانپ رہا ہے بے چارہ۔"

"روٹی کا بھی پوچھ لو، بھوکا ہو تو روٹی پکا دوں۔"

"ٹھیک ہے ماں!" وہ تیزی سے چلا گیا

اجنبی اپنی چادر نچوڑ رہا تھا وہ اب بھی کانپ رہا تھا۔ شیر باز نے کپڑے دیتے ہوئے کہا: "لو کاکا! میرے ابا کے

کپڑے ہیں کچھ تنگ ہوں گے مگر گزارہ ہو جائے گا اس وقت۔"

"گزارے کی بات! اِس وقت یہ ریشم و کمخواب میرے لیے۔"

"ماں کھانے کے لیے پُوچھ رہی ہیں سب کچھ ہے گھر میں، روٹی بھی پک جائے گی۔"

اجنبی نے ایک دو لمحے سوچا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، رہنے دو اس وقت یہی کیا کم ہے اِس چھت کے نیچے پناہ مل گئی۔"

"تو پھر جب تک آپ کپڑے بدلیں میں آپ کے لیے بستر لاتا ہوں اور گرم گرم دُودھ۔"

"مہربانی، بہت مہربانی"۔ اجنبی جذبے سے بولا

ماں چُولھے پر دودھ گرم کر رہی تھی، شیر باز نے ایک صاف ستھرا بستر نکالا، ماں اُسے دیکھ رہی تھی ——— واپس آیا تو ماں دودھ کٹورے میں ڈال رہی تھی، دُودھ سے ہوا اُٹھ رہی تھی اور دودھ کی مخصوص خوشبو، کٹورہ دبتے ہوئے شاہ مانو نے مشکوک لہجے میں کہا:

"ایسا محسوس ہوا شیر باز! جیسے اس شخص کی آواز پہلے بھی کہیں سُنی ہو!"

"آہستہ بولو ماں!" وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولا "سُن لے گا، ایک سی آوازیں اور ایک سی شکلیں دنیا میں ہوتی ہی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد جب شیر باز دُودھ لے کر آیا تو وہ لحاف پیٹے بستر میں بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی آنکھوں میں تشکر کی چمک تھی شیر باز سے دودھ کا کٹورہ لیتے ہوئے وہ جذبے سے بولا:

"میرے پاس الفاظ نہیں ہیں بیٹا! کہ تمہارا شکریہ ادا کروں، میں تو آج زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا مگر ایک بات بتاؤ اِس ویرانے میں کیا اس لیے گھر بنایا تھا کہ ایک دن مجھے موت کے منہ سے بچاؤ گے؟"

شیر باز ہنس پڑا "نہیں کاکا! ہم تو خود دشمنوں سے چھُپ کر یہاں بس گئے تھے، ایک سال کا تھا جب میرا باپ قتل ہوا تھا مجھے تو یاد بھی نہیں جب ماں یہاں آن بسی تھی ———"

"اوہو ———!" اجنبی افسوس کرتے ہوئے بولا، "کیا نام تھا تمہارے باپ کا؟"

"جی میرے باپ کا نام اکرم خان تھا۔"

"اکرم خان!" اجنبی بے طرح چونکا مگر پھر سنبھل کر بولا "کہاں کے رہنے والے ہو تُم؟"

"یہاں سے بہت دُور ہے ہمارا گاؤں، تقریباً دو سو میل، سپین ٹپہ!"

"سپین ٹپہ!" اجنبی زیرِ لب بڑبڑایا ———

اُس کی نظریں شیر باز پر جم گئیں ——— لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ غور سے شیر باز کو دیکھ رہا تھا، نوجوان لڑکے کی آنکھیں بالکل مرحوم باپ کی طرح تھیں اور اکرم خان کی طرح اُس کے بُشرے پر حیا اور شرافت کی چھاپ نظر آ رہی تھی ———

شیر باز نے بات جاری رکھی ———

"اب میں جوان ہوگیا ہوں ، نشانہ بازی میں بھی تاک ، ماں کی شدید خواہش ہے میں باپ کے قتل کا انتقام لوں۔"
اجنبی نے اثبات میں سر ہلایا "ٹھیک کہتی ہے تمھاری ماں۔"
"مگر میں نے باپ کے قاتل کو نہیں دیکھا ، بس اُس کا نام جانتا ہوں ، اسلم خان ہے نام اُس کا!"
"اگر تم پسند کرو تو تمھاری مدد کروں اس سلسلے میں؟"
"نہیں ——!" شیر باز معصومیت سے بولا "ماں پسند نہیں کرے گی اس کی آرزو ہے میں اپنے ہاتھ سے اس شخص کو قتل کروں!!"
"بے چاری نے بہت انتظار کیا ہے واقعی اب اس کی آرزو پوری ہوجانی چاہیے۔"
"لیکن جب تک طوفان تھم نہیں جاتا آپ یہیں رہیں طوفان گزرنے کے بعد میں اُس کی تلاش میں نکلوں گا!"
"طوفان جو کرنا تھا کر بیٹھا!" وہ ذو معنی لہجے میں بولا "تھم جائے گا طوفان ، کامیابی ہوگی تمھیں۔"
"آپ کیسے جانتے ہیں؟" اُس نے خوش ہوکر پوچھا
"قدرت کے کھیل ہیں یہ ، میں نے اکثر دیکھا ہے ، قدرت جزا بھی دیتی ہے ، سزا بھی دیتی ہے۔ اب یہی دیکھو اس طوفانِ بلاخیز کی ستم ظریفی ، کتنا ستایا ، کتنا دُکھ دیا ، کتنا سُکھ دیا ، تمھاری محبت ، یہ شہد کی طرح شیریں دُودھ ، اِس لحاف کی آغوشِ مادر کی طرح گرمی ، اور تمھارے مرحوم باپ کے کپڑوں کی حرارت اور آسودگی ، یہ صعوبتیں ، یہ نعمتیں سب اُس کے کھیل ہیں بیٹے!"
"آپ کی باتیں سُن کر مجھے اپنے اُستاد کی باتیں یاد آگئیں ، وہ بھی اسی طرح دل کو گداز کر دینے والی باتیں کرتا ہے —— آپ شاید یقین نہ کریں میرے اندر دو قسم کے آدمی بستے ہیں ، ایک وہ جسے ماں نے بنایا ہے ، دُوسرا وہ جسے استادِ مکرم کی محبتوں نے سجایا ہے ، میں ابھی تک فیصلہ نہیں کرسکا ، کس کی بات مانوں ، کس کی بات نہ مانوں ——!"
"تم بہت معصوم ہو۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا "عنایت ہے اِس طوفان کی کہ تم سے ملاقات ہوگئی ، کوشش کروں گا تمھارے سینے میں جو دو آدمی بستے ہیں ان میں سے ایک کا وجود باقی نہ رہے ، صبح کا انتظار کرو ، انشاءاللہ طوفان تھم جائے گا اور تمھارا ذہن بھی صاف ہوجائے گا۔"
شیر باز کو اجنبی کی باتیں اچھی لگیں وہ خالی کٹورہ لے کر واپس جانے لگا تو اجنبی نے کہا:
"قلم کاغذ کی ضرورت پڑ گئی ہے بیٹا!"
"ابھی لاتا ہوں۔"
باہر زور کی ہوا چل رہی تھی طوفانی تھپیڑے کھڑکیوں اور دروازوں سے بار بار ٹکرا رہے تھے ——
اجنبی کے سینے میں ایک ایسا طوفان برپا ہوچکا تھا جو باہر کے طوفان سے زیادہ شدید تھا ——
شاہ بانو منتظر اور مضطرب بیٹھی تھی ، شیر باز واپس آیا تو اس نے متجسس نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔
"کچھ معلوم ہوا کون ہے ، کہاں سے آیا ہے ، طوفان میں کیسے گھر گیا؟"

"یہ سب تو میں نے نہیں پوچھا ماں۔ مگر وہ شاندار آدمی ہے خوب صورت باتیں کرتا ہے، اُس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اُس کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ تیار ہے!"

"ہوں ——!" شاہ بانو گہری سوچ میں پڑ گئی

"آپ کیا سوچ رہی ہیں ماں ——؟" شیر باز نے پوچھا

"کچھ نہیں، سو جاؤ تم بہت رات گزر گئی ہے۔"

شیر باز لیٹ گیا، وہ بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، اجنبی کی باتوں میں بہت اثر تھا مگر شاہ بانو کی نیند اُڑ چکی تھی، اُس کے من میں شک کا بیج اُگ چکا تھا اور وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی ———

صبح کاذب کا وقت تھا، شیر باز سو چکا تھا، شاہ بانو سے نہ رہا گیا وہ دھیرے سے اُٹھی، لالٹین اُٹھائی اور دبے قدم اُس کمرے کی طرف چلی گئی جہاں مہمان سو رہا تھا ———

اُس کا دل بُری طرح سے دھڑک رہا تھا، خوف اور تجسس نے اُس کے اعصاب کو جکڑ رکھا تھا ——— مہمان دُنیا و مافیہا سے بے خبر تسلی سے سو رہا تھا ———

شاہ بانو مزید آگے بڑھی لالٹین کی بتی اُوپر اٹھائی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا! اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ——— !!

اُس کے شوہر کے کپڑوں میں ملبوس اُس کے شوہر کا قاتل اسلم خان سو رہا تھا!

وہ تیزی سے پلٹی، دوسرے کمرے میں پہنچ کر ٹین کا صندوق کھولا اور پستول نکال کر شیر باز کی طرف لپکی ———

"اُٹھو شیر باز!" اُس نے بیٹے کو کندھے سے جھنجھوڑا

"کیا بات ہے ماں ——؟" شیر باز نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا

"اُٹھ، کہ تیرا نصیبا جاگ اُٹھا ہے۔" ماں نے سرگوشی میں کہا "تم جس کی تلاش میں جا رہے تھے تقدیر نے خود اُسے تمھاری چوکھٹ پر پھینک دیا ہے!"

"کیا کہہ رہی ہو ماں؟" وہ حیرت سے بولا

"تمھارے باپ کا قاتل تمھارے گھر میں سو رہا ہے۔" وُہ دانت بھینچتے ہوئے نفرت سے بولی

شیر باز ہکا بکا ماں کو دیکھ رہا تھا ——— یہ سب کچھ ایسا غیر متوقع تھا کہ وہ ایک طرح سے بوکھلا گیا تھا ———

"یہ لو پستول"۔ ماں نے پستول آگے کرتے ہوئے کہا "یہی ہے اسلم خان، اسی نے تجھے یتیم اور مجھے بیوہ بنا دیا تھا"

شیر باز چند لمحے غیر یقینی انداز میں ماں کو تکتا رہا پھر ہولے سے بولا:

"وہ ہمارا مہمان ہے ماں!"

"تو کیا ہوا، ہم نے میزبانی کا فرض پُورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"وہ ہماری چھت کے نیچے سو رہا ہے ماں! ہم نے اسے پناہ دی ہے۔"

"یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا شیر باز!" وہ غصہ دباتے ہوئے بولی "تقدیر اسے خود موت کے پھندے میں لے آئی ہے۔"
"وہ میرے باپ کے کپڑے پہنے ہوئے ہے میں باپ کے کپڑوں کو ایک بار پھر لہو رنگ کر دوں ماں؟"
"تمھیں اسے قتل کرنا پڑے گا۔ تمھارے باپ کے کپڑے پہن کر وہ اسلم خان سے اکرم نہیں بن گیا۔"
"میں اسے قتل کر دوں گا ماں!" وہ یقین سے بولا "مگر کسی اور موقع پر، کسی دوسری جگہ، اپنی چھت کے نیچے اپنا مہمان بنا کر میں یہ کام نہیں کر سکتا!"
"یہ میرا حکم ہے شیر باز!" وہ حتمی لہجے میں بولی
شیر باز خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھتا رہا۔
"شیر باز!" وہ شدید غصے سے بولی "تم یہ کام نہیں کرو گے تو میں خود اس پر گولی چلاؤں گی۔ لاؤ پستول ——— !"
"صبر سے کام لو ماں!" اس نے پستول بچاتے ہوئے کہا "ذاتی مقصد دین کے مقصد سے بڑا نہیں ہوتا۔ میرے رسولؐ کا حکم ہے معاف کر دو اگر تمھارے بس میں ہے کیونکہ معاف کرنا انتقام لینے سے زیادہ افضل ہے۔"
"شاباش بیٹے!" اسلم خان اندر آ گیا "جس شخص نے تمھیں تعلیم دی ہے اس کے پاؤں چومنے کو جی چاہتا ہے۔"
"قاتل ——— !" شاہ بانو نے اسے للکارا "ان باتوں سے تم میری نفرت ختم نہیں کر سکتے۔"
"میں تمھارا گنہگار ہوں خاتون! اور اس پر شرمندہ ہوں۔ مجھے رات ہی کو معلوم ہو گیا تھا کہ تقدیر مجھے کہاں کھینچ لائی ہے میں رات کو یہاں سے بھاگ سکتا تھا اور یا تم دونوں کو ختم کر سکتا تھا مگر اس گھر کا سلوک اور تمھارے بیٹے کی باتیں سن کر میری ہمت ہار گئی ———"
شیر باز نے ماں کی طرف دیکھا مگر وہ اٹل کھڑی تھی۔
"میں سمجھتا ہوں" اس نے بات جاری رکھی۔ "قسمت مجھے جان بوجھ کر یہاں کھینچ لائی یہ بتانے، یہ باور کرانے کہ مکافاتِ عمل ضروری ہے۔ انسان اپنے کیے کے انجام سے بچ نہیں سکتا، اس دنیا میں بچ جائے تو اس دنیا میں پکڑا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ضمیر کی آواز پر رک گیا یہ دیکھو (اس نے ریوالور نکال کر سامنے کیا) ریوالور میرے پاس بھی ہے اور مجھے اس سے کام لینا بھی آتا ہے، اور ایسا رات سوچا بھی، اگر تمھارا کام تمام نہیں کر سکتا تو اپنا سینہ ہی چھلنی کر دوں مگر پھر خیال آیا میری خودکشی سے شاید تمھارا اٹھارہ انیس سال کا چلّہ ادھورا رہ جائے کہ تم نے اپنے شوہر کا انتقام نہ لیا ——— !"
شیر باز نے ٹھنڈا سانس لیا وہ اجنبی کو عجیب و غریب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔
"شیر باز بیٹے!" اسلم خان نے عقیدت کے لہجے میں کہا "میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں اور تمھاری باتوں سے میرا سینہ روشن ہو گیا ہے میرا ایمان زیادہ مضبوط ہو گیا ہے ——— اب مجھے موت بھیانک چیز نہیں لگتی، خدا حاضر و ناظر ہے تم باپ کا انتقام لے لو، میں تمھیں اپنا خون بخشتا ہوں!"

شیر باز نے ایک بار پھر ماں کی طرف دیکھا، ماں بھی تصویرِ حیرت بنی اُس شخص کو دیکھ رہی تھی جو اُس کے لیے دُنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرین تھا اور جس کے قتل کا وہ اٹھارہ برس سے سامان کر رہی تھی

اسلم خان نے جیب سے کاغذ نکالا اور شیر باز کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

"مجھے یقین تھا یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے اس لیے میں نے تم سے کاغذ قلم مانگا تھا ——— یہ میرا وصیت نامہ ہے میں نے اپنی ساری جائداد منقولہ اور غیر منقولہ تمھارے نام لکھ دی ہے میری ایک جوان خوب صورت اور خوب سیرت بیٹی بھی ہے میں نے اُسے بھی تمھارے عقد میں دے دیا ہے ——— باقی رہا میں، تو ہر سانس کی پشیمانی اور ندامت سے اچھی ہے وہ موت، جو صرف ایک بار آئے گی!"

شاہ بانو خاموش تھی ——— وہ خالی خالی نظروں سے اسلم خان کو دیکھ رہی تھی، ان خالی نظروں میں کوئی معنی نہیں تھے ——— نہ فتح کے، نہ شکست کے، اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شیر باز اور اسلم خان میں کون ہارا، کون جیتا، اور خود اس نے کیا کھویا کیا پایا ———!

گھوڑے کا کرب

ہرچرن چاولہ

"تُو تو گھوڑا ہے۔ تیرا کام تو دوڑنا اور بوجھ ڈھونا ہے" میرے دل نے سوچا۔

دُور سامنے اُن پہاڑیوں پر سبزی بھری گھاس آنکھوں کو کتنی سُہانی لگتی ہے۔ اُس کی ہریالی آنکھوں کی راہ پیٹ میں بھوک جگا دیتی ہے۔ پیٹ تو یہاں کی سُوکھی مٹری گھاس سے بھی بھر جاتا ہے۔ مگر کچھ اور قسم کی بھوک اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے۔

وہاں اگر میں پکڑا گیا تو یہی ہوگا نا کہ جو بھی میرا نیا مالک ہوگا مجھ پر بوجھ ڈھوئے گا یا کوئی چھکڑا، یکہ یا گاڑی کھچوائے گا۔ یہاں کونسا آرام ملتا ہے۔ روز ٹھوں ٹھوں تانگہ کھینچنا پڑتا ہے۔ اس مالک کو تو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ نمبر تک سواریوں سے لاد دیتا ہے اور گالیاں بھی میرے سر پر بے شمار لادتا رہتا ہے۔ سواری نہ ملے تو غصہ مجھ غریب پر۔ بیوی سے جھگڑا تو چھانٹا میری پیٹھ پر۔ ساتھی تانگے والوں سے تُو تُو مَیں مَیں تو سزاوار ہیں۔ کوئی ڈھنگ ہے جینے کا بھلا۔ یہ نہیں کہ میری سُنو اپنی کہو۔ بس ہر وقت گالی گلوچ۔ ہائے دُہائی۔ کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ پھر وقت بھی یہاں کوئی نہیں بندھا ہوا کام کا۔ ابھی آنکھ بھی پوری طرح نہیں کھلتی کہ لگام منہ میں اور نمبر دونوں کمر پر۔ شہر سٹیشن، سٹیشن شہر۔ رات گئے تک ایک چکر سا بندھا رہتا ہے پاؤں میں۔ پھر نہ اتوار چھٹی نہ تہوار چھٹی۔

نئی جگہ شاید اچھی نہ ہو مگر اس سے بُری کیا ہوگی۔ چل منا اُسے بھی دیکھ۔

کتنی دُور نکل آیا ہوں۔ آدھا رستہ تو آچکا ہوں گا۔ وہ جو آنکھوں کو برماتی تھی۔ وہ ہریالی جانے اور کتنی دُور ہے۔ وہ جو نظروں کے قریب تھا قدموں سے کتنا دُور ہوتا جا رہا ہے۔ کیا واپس چلوں یا آگے بڑھوں۔ یہاں تک مالک ڈھونڈتے پہنچے گا ہی۔ پھر تو وہ پٹائی ہوگی کہ بس خدایاد آجائے گا۔ کئی چھانٹے میری کمر پر توڑ دے گا ظالم۔ جتنا پیچھے جانا ہے اتنا آگے کیوں نہ بڑھوں۔ شام تک ضرور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔ بس ذرا رستے کے گھوڑا چوروں سے خود کو بچانا ہے۔

اُف خدایا کتنا دُور ہے وہ دیس۔ وہی جو سامنے نظر آتا ہے۔ جس کی طرف میں سرپٹ پانچ دن سے دوڑ رہا ہوں اور وہ سرپٹ میرے آگے آگے دوڑتا مجھ سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ خیر چل منا۔ اب تو نہ پیچھے جانے کا یارا ہے نہ رُکنے کا چارا ہے۔

لے بھئی کچھ تو نزدیک پہنچے۔ واہ کیا خوبصورت ندیاں ہیں۔ پہاڑ ہیں۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ بس کوئی مناسب اور شریف سا مالک مل جائے تو باقی زندگی یہاں گزار دوں۔ کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ بھاگتا چلوں۔ آگے اور آگے، اس سے آگے، اس سے خوبصورت بھلا اور کیا ہوگا۔

اس سے پہلے کہ کوئی شیر بھگیاڑ چیر پھاڑ ڈالے۔ چل منا۔ خود ہی خود کو کسی کے حوالے کر دے۔

میرا نیا مالک تو ٹھیک آدمی ہے۔ بس ذرا ساتھی گھوڑے سے مختلف ہیں۔ میں ہنہناتا ہوں وہ ہیں ہیں کرتے ہیں۔ اپنے ہاں تو

کتے بھونکتے تھے یہاں تو بس ذرا سا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے بُڑبُڑا لیتے ہیں۔ شریف اتنے ہیں کہ بلیاں اور مرغیاں تک اُن کے اُوپر سے نکل جاتی ہیں تو اُف تک نہیں کرتے۔ مرغے اپنے ہاں کے مرغوں کو کی آواز سے بانگ دیتے تھے تو سارا محلہ جاگ اٹھتا تھا۔ یہاں کُکڑوں کی بولتے ہیں۔ جیسے کوئی ہلکا پھلکا راگ گا رہے ہوں۔ خیر جو بھی ہے ٹھیک ہے۔ میرا دل یہاں خوب لگ گیا ہے۔ مالک بھی اچھا ہے۔ بس کبھی کبھی ایک گاڑی سی مجھ سے کھچواتا ہے۔ سامان اس میں کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ پہیے اتنے ہلکے پھلکے ہیں کہ گاڑی کشتی کی طرح پانی پر تیرتی محسوس ہوتی ہے۔ شہر جاتا ہوں تو لوگ حیرانی اور خوشی سے میری طرف دیکھتے ہیں۔ ذرا سی دُمکی پکڑتا ہوں تو بڑے خوشی سے نعرے مارنے لگتے ہیں۔ بچے تالیاں بجاتے ہیں اور میرا مالک بڑی شان سے ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ جیسے وہ کسی بہت بڑی کار کا اکیلا مالک ہو جو بازار میں نایاب ہو۔ یہ بوجھ بھی بس ذرا کھلے موسم میں ڈھونا پڑتا ہے۔ سردیوں میں تو بس اندر کھڑے رہنا ہوتا ہے۔ اور ساتھی گھوڑوں سے گپ شپ کرنی ہوتی ہے۔ باہر برف میں نہ کھیتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی گاڑی چلائی جا سکتی ہے۔ اس لیے بڑی چھٹی مل جاتی ہے۔ بس کھاؤ پیو اور مزے اُڑاؤ۔ اپنے ساتھی گھوڑوں کی زبان سمجھنی ذرا مشکل لگتی ہے۔ مگر میں بھی ایک گھاگ ہوں۔ ان کی ہر بات پر یوں مسکراتا ہوں جیسے مجھے سب کچھ سمجھ آتا ہو۔ زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے تھوڑی سی اداکاری تو کرنی ہی پڑتی ہے۔

میرے پُرانے مالک یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے مجھ پر اپنی ملکیت جتانے کی کوشش کی ہے۔ مگر میرے مالک نے پروں پانی تک نہیں پڑنے دیا۔ کہا ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ یہ تمہارا گھوڑا ہے۔ کوئی رسید ہے؟ وہ بھلا کیا رسید پیش کرتے۔ ان کی رسید تو میں اٹھا لایا ہوں۔ ایک نہیں کئی۔ میری پیٹھ پر اُن کی مار کے نشان۔ کئی تو مندمل ہو گئے ہیں مگر کچھ ابھی باقی ہیں مگر ڈرتا ہوں کہیں میری فریاد خود ہی میری مصیبت کا کارن نہ بن جائے۔ چھوڑ یار۔ تجھے کیا پڑی ہے۔ مست رہ۔

میرے پُرانے مالکوں نے بھی میرے نئے مالک کے ہاں مال ڈھونے کا کام شروع کر دیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ وہ بھی اب میری طرح گھوڑے ہی بن گئے ہیں۔ بوجھ ڈھوتے ہیں اور مالک کے لہراتے ہوئے آنکھ کے چھانٹے سے ڈرتے ڈھینچوں ڈھینچوں بھاگتے رہتے ہیں۔ ——— میرا کیا ہے میں تو گھوڑا ہوں مگر انھیں بوجھ ڈھوتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے ارے بھئی تکلیف ہوتی ہے تو چھوڑ دو اور واپس جاؤ میرے جیسے گھوڑوں کی روزی کیوں کھوٹی کرتے ہو۔

میرے کچھ گھوڑے بھائی اور بھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ بھی میری طرح سنگھوڑے ہی لگتے ہیں۔ مگر کہتے سب یہی ہیں کہ وہ وہاں کسی راجہ یا نواب کی سواری میں تھے۔ پانچ کو میرے مالک نے اپنے ہاں پناہ دے دی ہے۔ کچھ آس پاس کے گھروں اور کسانوں کے ہاں ٹک گئے ہیں۔ کبھی کبھی کھیتوں اور پہاڑوں پر چرنے نکلتا ہوں تو ان سے دُعا سلام ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے سب ہی یہاں خوش ہیں۔ اللہ شالا ہمارا یہ سلسلۂ روزگار قائم رکھیو اور ہمیں نظرِ بد سے بچائیو۔

اب آپ سے کیا چھپانا شروع شروع میں یہاں کا کام تھوڑا مشکل لگتا تھا یعنی سمجھ نہیں آتا تھا۔ میں مشکل کہہ رہا ہوں۔ بھاری نہیں۔ بس یہ بات ذرا ذہن میں رکھیے گا۔ ہولے ہولے سب ٹھیک ہوتا گیا۔ گھاس کا ذائقہ بھی کچھ اور سا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ بھی اچھی لگنے لگی۔ کچھ ہم بدلے کچھ مختلف رہے۔ گاڑی چل پڑی۔ زندگی کی گاڑیاں تو بیچ کے راستے سے ہی چلا کرتی ہیں نا۔

ایک دن ہمارے پُرانے مالکوں نے کہا کہ ہم مختلف قسم کے گھوڑے ہیں۔ اس لیے ہمیں دوسرے گھوڑوں سے الگ رکھا جائے۔

مگر ہمارے مالک نے یہ بات نہیں مانی۔ اسے تو ہم میں کوئی بہت بڑا اختلاف نظر نہیں آیا۔ وہ کیا کرتے بچارے چپ مار گئے۔

"دکھ سکھ تو رب نے ہر جاندار کے ساتھ رکھا ہے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک بار ہم بیمار پڑ گئے۔ بچانے یہ کیسی بیماری تھی کہ جو صرف ہمارے ہی بھائیوں تک محدود رہی بس آنکھوں سے پانی بہتا جاتا تھا رکتا ہی نہیں تھا۔ ہمارے مالکوں نے ہمیں دوسرے گھوڑوں سے الگ ایک اور اصطبل میں رکھ دیا اور اپنے طور پر علاج کرنے لگے۔ مگر ہمیں کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ہم خود حیران کہ کیا کریں۔ کہاں جائیں مگر یقین کی ایک چمک سی دل میں موجود کہ چند روز کا دکھ ہے آپ ہی آپ دور ہو جائے گا۔

ہمارے پرانے مالکوں کو بہانہ ہاتھ لگا۔ بولے "دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ یہ مختلف قسم کے گھوڑے ہیں۔ اب آپ کو انہیں الگ رکھنا ہی پڑا نا بہتر یہی ہے کہ ان کے لیے ایک الگ اصطبل بنوا دیجیے۔"

"اور ہمیں ان کا وارڈ غلام اسپاں بنا دیجیے" یہ بات وارڈ غلام اسپاں والی ان کے دل میں تھی، مگر ہم تاڑ ہی گئے آخری آدھی زندگی ان ہی کے ساتھ تو گزاری تھی۔

ہمارا مالک بولا "ہم تو اپنے ہاں ہر بیمار گھوڑے کو الگ ہی رکھا کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر سب کو ایک ساتھ رکھ دیں گے۔"

ہمارے پرانے مالک بچارے کیا کرتے۔ بس چپ مار گئے ——— ادھر ہماری بیماری طول پکڑنے لگی تو ہمارا مالک گھبرایا۔ پرانے مالکوں نے پھر کہا "دیکھا ہم نہ کہتے تھے۔"

مگر خود نہیں پتہ تھا کہ یہ وقتی بیماری ہے موسم بدلتے ہی اپنے آپ دور ہو جائے گی۔ اسی بیچ ہمارے پرانے مالک جانے کہاں سے جھوٹے سارٹیفکیٹ لا کر خود کو "گھوڑا اسپیشلسٹ" ظاہر کرنے لگے اور مالک ہماری خیر خواہی کے بہانے ہمیں الگ اور اپنی زیر نگرانی رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے۔

ہمارا مالک ان کے مطالبات پر غور کر رہا ہے اور ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم اسے کیسے سمجھائیں۔ کہ یہ لوگ کچھ بھی سپیشلسٹ نہیں محض ہماری طرح کے ہی گھوڑے ہیں۔ اگر یہ سپیشلسٹ ہوتے تو ان کی پریکٹس کا میدان تو وہاں زیادہ وسیع تھا، جہاں سے یہ اور ہم لوگ آئے ہیں بہرحال زیادہ تعداد ہم جیسے گھوڑوں کی وہیں ہی تو رہتی ہے۔

خدایا۔ تو تو سب کچھ جانتا ہے۔ ہمیں ان گھوڑا اسپیشلسٹوں سے محفوظ رکھیو۔ ہماری بولی ہمارے مالک کو سمجھ آتی تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ اب ہم یہ سب اسے کیسے سمجھائیں۔ ہم تو گھوڑے ہیں۔

(۲)

میں تو گھوڑا ہوں اور گھوڑے کا کام کرتے ہوئے مجھے کچھ برا تھوڑے ہی لگے گا۔ ہاں گھوڑے سے گدھے کا کام لیا جائے تو دکھ تو ہوگا ہی۔

جب میں وہاں سے بھاگا تھا تو میں نے سمجھا تھا کہ میرے دکھوں کا انت ہو گیا۔ میں ناشکرا نہیں ہوں۔ واقعی میرے وہاں کے

کئی دکھ ختم ہو گئے۔ دراصل وہ دکھ یہاں تھے ہی نہیں۔ وہ تو وہیں پیچھے ہی رہ گئے تھے۔

یہاں آکر وہاں کے دکھوں سے تو چھٹکارا مل گیا، مگر یہاں اور قسم کے دکھ جاگ اٹھے۔ یہ کیسے دکھ ہیں، ان کا مجھے پہلے احساس تک نہ تھا۔ مگر وہ درکہیں وہ میرے ذہن کے ڈھکے چھپے کونے میں دبکے پڑے تھے۔

بات یہ ہے کہ اب جب کہ یہاں رہتے ہوئے مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ مجھے کئی نئی باتوں کی جانکاری ہوئی ہے۔ پہلے میں ہر سمجھ یا ناسمجھی بات پر مسکراتا تھا، سر ہلاتا تھا اور اداکاری کرتا تھا۔ بھائی کوئی آپ کو گالیاں بھی دے رہا ہو اور بات آپ کو سمجھ نہ آئے تو آپ ہنس سکتے ہیں مگر سمجھ آجانے کے بعد منہ توڑ جواب آپ بھلے ہی نہ دے سکیں مگر کم از کم مسکرا تو نہیں سکتے۔ سیدھی بات ہے۔ اتنا عرصہ یہاں رہنے کے بعد اب میں سائقی گھوڑوں کی زبان سمجھنے لگا ہوں۔ بس ساری بات یہیں سے بگڑتی ہے۔ میرے سارے دکھوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

باہر جاکر دوسرے گھوڑوں سے ملنے کے بعد مجھے کئی باتوں کے سننے کا موقعہ ملا ہے۔ ہم بڑے گھوڑے ہیں۔ ہمارا رنگ صاف ہے۔ جلد سنہری ہے، بال گھنے ہیں، نسلیں بڑی اچھی ہیں۔ ہم نے بڑی بڑی جنگوں میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ ہمارے بزرگ ڈربی کی ریسیں دوڑتے اور جیتتے رہے ہیں۔ ہم ہیک (HACK) ہیں۔ ہنٹر (HUNTER) ہیں۔ ہیکنی (HACKNEY) ہیں۔ ہم نے ریس کورسز کے فرنچ ٹرافیز کو جیت لیا ہے۔ ہمارے وطن عالیشان ہیں۔ جانے کون کون سے ملکوں کے وہ لوگ نام لیتے ہیں مگر ان ملکوں کا ذکر وہ بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر گول کر جاتے ہیں جن کے گھوڑوں کے ملاپ سے گھوڑوں کی کئی نسلوں کو سدھارا گیا ہے اور جنھوں نے کیا سواری، کیا سپورٹس اور کیا دوڑوں کے مقابلہ میں کمالاتِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ فرانس کی تاریخ اب بھی اس بات کی گواہ ہے۔

میں طعنہ نہیں دے رہا ہوں اور نہ ہی طعنہ زنی سے کوئی بات بنی ہے۔ بات کام کرنے اور کچھ کر کے دکھانے سے بنتی ہے۔ ایک دن میں نے سوچا۔ نخلے گھوڑے۔ اب کچھ کر کے ہی دکھا۔ اگر تیرے اندر کچھ بات ہوگی تو سامنے آجائے گی۔ ورنہ گھوڑا ہو کر بھی گدھا بنا رہے گا۔ میں گدھا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے گھوڑا بننے اور ڈینگیں مارنے کا کوئی شوق نہ ہوتا مگر دکھ تب ہوتا ہے۔ جب گدھوں کو بھی گھوڑا بنے دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ سوچتا ہوں۔ کیا میری آنکھوں کی غیرت مر گئی ہے کہ میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی شناخت نہیں دے سکتا۔

وہ جو میں ہلکے پھلکے پہیوں کی گاڑی کھینچتا ہوں اور جو کشتی کی طرح پانی پر تیرتی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل ایک ایسی گاڑی ہے جس میں ایک گھوڑا لدا ہوا ہوتا ہے۔ میرا فرض ہے اسے گھوڑوں کی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے ریس کورس پہنچانا۔ ایک بار میرے دل نے سوچا کہ میں دوڑ کر ہی نہ دوں اور گھوڑے کو ریس میں لیٹ پہنچا کر اسے دوڑ میں حصہ لینے سے محروم کر دوں مگر پھر میرے ذہن نے مجھے سخت ملامت کرنی شروع کر دی۔ ارے بھلے گھوڑے۔ اپنی ورتھ ہی دکھانی ہے تو کسی مثبت طریقے سے دکھا جو تیرے بھی کام آئے اور تیرے مالک کے لیے بھی مفید ہو۔ تو بس میں ایسے موقعے کی تلاش میں رہنے لگا، اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ یہ موقعہ جلدی ہی میرے ہاتھ لگ گیا۔ ہوا یوں کہ میرے مالک اور اس کی بیٹی میں کسی بات پر تکرار ہو گئی۔ دراصل وہ آج کل گھوڑوں پر کئی مشہور مصنفوں کی کتابیں مثلاً گھوڑے، گھوڑوں کے بادشاہ،

سواری قدم بہ قدم۔ گھوڑسواری۔ تصاویر میں۔ نئے نئے سوار۔ گھوڑوں پر کتاب۔ گھوڑسواری کے طریقے وغیرہ وغیرہ پڑھ رہی تھی اور کبھی کبھی مجھے باہر گھمانے کے بہانے لے جاتی تھی تو مجھ پر سواری بھی کرلیا کرتی تھی۔ وہ مجھے کئی قسم کے کھیل تماشے اور پھلانگیں وغیرہ لگانی بھی سکھاتی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں گھوڑوں کے کمالات ہی نہیں سیکھ سکتا تو پھر اور کیا سیکھوں گا۔ بس میں نے اس کا دل خوش کرنے کو بہت کچھ سیکھ لیا۔ آج وہ مجھے کسی مقابلے میں لے جانا چاہتی تھی اور ادھر میرے مالک کو اچانک ریسز میں شمولیت کی دعوت مل گئی تھی شاید کوئی دوڑنے والا گھوڑا بیمار پڑ گیا تھا یا خدا جانے کیا بات تھی کہ اسے اچانک ہی جانا پڑ گیا۔ باپ بیٹی کی تکرار نے میرے مالک کو کافی لیرٹ کر دیا اور جب واپس آکر اس نے چابک لہرا کر مجھے تیز دوڑانا چاہا تو میں نے دل میں کہا۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔ سیدھی طرح چابک ایک طرف دھر دے اور دیکھ کہ میں تجھے تیری منزلِ مقصود پر دس منٹ پہلے پہنچاتا ہوں کہ نہیں۔ مالک نے میری چال دیکھی تو اس کے ہاتھ کا چابک ہاتھ میں ہی رہ گیا اور اس کی زبان سے واہ اوئے شیرا اور یلے یلے کے تعریفی الفاظ نکلنے لگے۔ اپنی تعریف سُن کر ایک بار تو میرے دل میں غرور کی ایک لہر جاگی مگر میں نے دل کو سمجھا لیا کہ ابھی تو میں اپنے مقصد کے پاس آدھا قدم بھی نہیں پہنچا ہوں اور تُو خواہ مخواہ پھولنے لگا ہے۔ قدرت خدا کی۔ اُس دن ہمارا گھوڑا ریس میں بُری طرح ہار گیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے مالک کی اُداسی کو نوٹ کر لیا جو آہستہ آہستہ غصّے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نہیں جانتا اسے یہ غصہ اپنی بیٹی پر تھا، اپنے ہارنے والے گھوڑے پر، یا اپنی قسمت پر مگر میں نے سوچا کہ میں اس کی قسمت بدلنے میں ضرور ایک اچھا پارٹ بحسن و خوبی انجام دے کر دکھاؤں گا۔ واپسی پر جب اُس نے چابک لہرایا تو میں نے چال پکڑی اور دکھا دیا کہ چال کیا ہوتی ہے تب قسم خدا کی اگر ریل کا انجن بھی مقابلے پر ہوتا تو اُسے بھی ایک قدم آگے نہ جانے دیتا۔

اُوپر والے کی نظر سیدھی ہو تو راستے بنتے جاتے ہیں۔ موقعے آتے ہی رہتے ہیں اور میرے لیے بھی اللہ تعالےٰ نے یہ موقعہ جلد ہی فراہم کر دیا۔ غرور کا سر نیچا۔ بڑی بڑی ڈینگیں مارنے والا اور مجھے اور میرے جیسے دوسرے گھوڑوں کو منہ نہ لگانے والا گھوڑا، ایک کے بعد ایک ریسیں ہارنے لگا۔ مگر نجانے میرے مالک کو کیا مسئلہ درپیش تھا کہ اس نے مجھے نہیں دوڑایا۔ میں ٹھہرا غیرت مند گھوڑا۔ میں کیوں منہ چڑھ کر کہتا کہ بھلے آدمی۔ ایک چانس مجھے بھی دے دیکھ۔

ہمارے دوڑنے والے گھوڑے کا نام گولڈن ایرو ہے۔ ایک دن گولڈن ایرو نے شام کی ریسز میں حصّہ لینا تھا مگر اُس دن اُس کی طبیعت صبح سے ہی ناساز ہوگئی۔ مالک نے اُس کی بہت مُٹھی چاپی کی، ٹانگوں کو سہلایا۔ اس کے جسم پر قسم قسم کے بُرش رگڑے ہلکی پھلکی ورزشیں کرائیں۔ بڑھیا دوائیاں اور ٹانک دیتے مگر دوپہر تک وہ اور بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ اب تو میرے مالک کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھی چُپ کہ دیکھ اُوپر والا کیا کرتا ہے اور اُوپر والے نے جانے کیا اس کی کھوپڑی میں بٹھا دیا کہ اس نے میری مُٹھی چاپی شروع کر دی۔ اب تک سب کچھ جو اس کے ساتھ کیا تھا، میرے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔ اب میں ہوں اور میرا مالک اور اس کے تین نوکر ہیں۔ دے سیوا پہ سیوا۔ دے رگڑائی پہ رگڑائی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ کر سیوا رکھا میوہ۔ میں نے کہا بھیا سیوا کا پھل میٹھا ہی ملے گا تجھے۔

جب وہ سب کچھ کر چکا جو اُسے کرنا تھا تو اسے اچانک پھر کچھ یاد آگیا اور وہ پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر جانے کچھ دیر بعد اُسے کیا سوجھی کہ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور قریب ہی کے کھیتوں سے ایک جڑی بُوٹی کے پتے توڑ لایا اور اُنھیں پیس کر اور اس کا لیپ بنا کر

میرے جسم پر تھوپنے لگا۔ اسی بیچ اس نے گھڑی دیکھی تو وہ گھبرا گیا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے جلدی جلدی نہلایا، اور لیپ دھویا اور گاڑی کی طرف لے چلا۔ راستے میں اصطبل کے ایک کونے میں ایک قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ بس میں گھوڑے اپنا منہ دیکھتے تھے۔ میں نے جب اس میں اپنا عکس دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سچ میں اب ایک مختلف گھوڑا تھا۔ مجھے گاڑی پر چڑھا کر اس نے دروازہ بند کیا اور جب گاڑی چلی تو ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اب میں گاڑی میں سوار تھا اور میرا ہی کوئی بھائی اسے کھینچ رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ واہ رنگی تیرے رنگ۔

دوڑ کے میدان میں پہلی ہی دوڑ میں میری باری تھی۔ اس لیے ریس کھیلنے والوں کو دکھانے کے لیے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ میری پیٹھ پر میرا آٹھ نمبر لکھا ہوا کپڑے کا بورڈ سا لگا کر مجھے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ ایک پنکچر میں گھمایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ جنگلے کے باہر کھڑے لوگ میری پُروقار چال دیکھ دیکھ کر نعرے لگا رہے ہیں۔ مجھے شاباش دے رہے ہیں۔ میرے نمبر پر ٹکٹیں خرید رہے ہیں۔ پیسہ لگا رہے ہیں اور آٹھ نمبر آٹھ نمبر کی دھوم مچی ہوئی ہے ——— تھوڑی دیر بعد ہمیں [illegible] ایک مستطیل خانے میں ٹھہرایا گیا جس پر ہمارے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ کل دس نمبر تھے۔ میں اپنے آٹھویں نمبر کے خانے [illegible] ہمارے خانوں کے دروازے ہٹ گئے اور جب میرے جاکی نے ایڑ لگائی تو میں تیسرے نمبر پر [illegible] تھا۔ میں نے سوچا [illegible] ہار گیا تو مر جائے گا۔ زندگی بھر گدھگی ہی کرنی پڑے گی۔ اگر تجھ میں کچھ بھی گھوڑا پائی ہے تو دکھا دے کہ تجھ میں بھی کچھ ہے ——— یہ سوچتے ہی میری غیرت ایک دم جاگ اٹھی اور پھر میں نے جو چال پکڑی ہے تو ہوا چھپے اور میں آگے۔ دوسرے گھوڑوں کو تو میری خاک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور باہر سے تو بس بک اپ آٹھ نمبر اور بک اپ کولڈن ایرو اور واہ وا اور شاباش کے علاوہ اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا ——— ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا۔ جب ہم گھر سے چلے تھے تب کالے کالے بادل گھرے ہوئے تھے۔ اب دوڑ کے میدان میں ابھی ہم آدھا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی حالانکہ کل ہی ریڈیو پر بادلوں کے گھر آنے مگر بارش نہ ہونے کا اعلان ہوا تھا۔ خیر مجھے کیا۔ کیا بارشوں سے گھوڑے رُکتے ہیں یا شہسوار پیچھے ہٹا کرتے ہیں ——— نیت صاف تھی۔ ہمت جوان تھی اور سامنے چیلنج تھا۔ میں فرسٹ آگیا۔ پھر وہ شور مچا کہ آسمان پھٹنے لگا۔ وہ عزت ملی مجھے کہ میرا سینہ خوشی سے پھول گیا۔

تماشہ گاہ میں جنتا کے عین درمیان ایک گول گھاس کے خطے کے آس پاس ایک جنگلہ لگا ہوا تھا جس میں جیتنے والے گھوڑے کو معہ جاکی لایا جاتا تھا تاکہ حاضرین اپنے فاتح کو قریب سے دیکھ سکیں۔ مجھے وہاں لایا گیا تو بہت شور مچا۔ اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگ خوشی سے چیخ رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ ٹوپیاں ہوا میں اُچھال رہے تھے اور میں اندر ہی اندر خوش تھا کہ لے بھائی اب تیرے دن بدلے۔ کوئی ایک کام کسی ایک کے لیے ریزرو تھوڑے ہی ہو جاتا ہے۔ دوسرے کو موقعہ دیا جائے تو دوسرا بھی اپنی ورتھ دکھا سکتا ہے۔ مگر یہ کیا وہ خوشی کی چیخوں اور نعروں میں غصے کا عنصر کیوں در آیا ہے۔ یہ تو آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! میرے مالک کی آواز کافی اونچی ہے مگر دوسرے لوگوں کی آوازیں اس سے کہیں زیادہ کرخت اور اونچی ہیں۔ کچھ لوگ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور ایک کتابچہ دکھا دکھا کر میرے مالک سے تُو تُو مَیں مَیں کر رہے ہیں۔ کچھ الفاظ جو میرے پلے پڑ رہے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

یہ گولڈن ایرو نہیں ہے۔ بارش نے اس کا نقلی رنگ اُتار دیا ہے۔ کنستر پر میں گولڈن ایرو کا رنگ چمک دار سنہری لکھا ہے۔ اسے اندھا بھی دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ پھیکا سنہری ہے جسے بڑی بوٹی کے لیپ سے چمکدار سنہری بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت دیر کے بعد میرے مالک کی آواز دھیمی پڑتی جا رہی ہے اور جج لوگ فیصلہ سنا رہے ہیں۔ جو سیکنڈ آیا ہے۔ اسے فرسٹ کر دیا جائے، جو تھرڈ آیا ہے اسے سیکنڈ اور اسی طرح آگے۔ میں سب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں۔ میں دوڑایا گیا ہوں اور میں نے دوڑ جیت کر دکھائی ہے۔ اس سے رنگ کا کیا تعلق ہے۔ نسل کا کیا واسطہ ہے مگر میں کس سے کیا کہوں۔ کیسے کہوں۔ کون سنے گا۔

ترمورتی

جمیلہ ہاشمی

وہ عجیب ٹھہری ہوئی سی شام تھی جب میں اور مونیک پچھواڑے باغ میں سے ٹوٹی ہوئی باڑ کے راستے اندر آئیں۔ بنواری دادا پرانے کنوئیں کی جگت پر بیٹھے تھے۔ جب بھی رجنی دادی برت رکھیں گھر میں کوئی پوجا ہو کوئی تیوہار ہو وہ اسی جگہ الگ تھلگ آن بیٹھتے ہیں کہتے ہیں میرا جی الجھتا ہے مجھے بھیڑ بھاڑ اچھی نہیں لگتی رنگ اور پکوان کی باس اور چمکتے کپڑے میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے دادا کو کسی دیوی دیوتا پر وشواس نہیں بڑے پکے ناستک ہیں۔ رجنی دادی کی اور ان کی جھڑپ بس اس بات پر ہوتی ہے۔

"اے بھاگوان تجھے اب ایشور سے کیا لینا ہے جو تو اتنے پریم سے اس کے لئے ہلکان ہوتی رہتی ہے۔" وہ اپنی پرانی گڑگڑی لیکر اونچے دالان کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ "جب سنو برت جب دیکھو پوجا آرتی اتاری جا رہی ہے پھول چڑھائے جا رہے کیا لینا ہے تجھے اس سے۔"

"رام رام"۔ دادی کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتی ہیں۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم تو ناستک ہو ناستک اس سے ڈرتے بھی نہیں۔"

"میں اور ناستک" وہ بے آواز سا قہقہہ لگاتے ہیں۔ "اری بھاگوان میں اور ناستک اری مجھ سے زیادہ کون اس سے پریم کر سکتا ہے مگر میں اس سے ڈرتا نہیں مجھے اس پر وشواس ہے۔ تم تو بس اس کی خوشامد درآمد میں لگی رہتی ہو۔ ڈرتی کانپتی پرچھائیں سے خوف کھاتی ہو۔ پر تمہیں یہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ہونا ہے ہو کر رہتا ہے کیا تو ہوا سے لڑ سکتی ہے کیا تو اپنی پوجا اور برت سے ہونی کو ٹال سکتی ہے۔

ایسی باتیں شاگرد پیشے کے دالانوں میں اکثر سنی جاتی ہیں اور اس لیے جب میں نے دادا کو وہاں بیٹھے دیکھا تو رک کر کہا۔

"آج کون برت ہے بھلا؟"

دادا نے اپنی گڑگڑی پر سے چلم اتار کر ہاتھ میں لی اور انگاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا ہونی ہو کر رہتی ہے تیری دادی بیکار پوجا میں لگی ہے۔"

"کیا ہوا ہے آخر" میں نے اچک کر دادا کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اے ساوتری پوجا ہونے والی ہے" اور پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگے "بیٹا اب میں تھک گیا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں ان بوڑھی چندھی بجھتی آنکھوں نے اتنا بہت کچھ دیکھا ہے کہ جینے سے ڈر لگنے لگا ہے اب اور ہمت نہیں رہی۔"

"مگر دادا تمہارا کیا جاتا ہے" میں نے شرارت سے کہا۔

تم بھی یہ کہتی ہو اچھا مگر تم بھی یہ باتیں سمجھ نہ پاؤ گی جاؤ اپنی سکھی کی خاطر داریاں کرو"۔ انہوں نے مونیک کی طرف دیکھ کر کہا۔

پھر چلم کو کریدا اس میں زور سے پھونک ماری اسے گڑگڑی پر جمایا اور تمباکو کے دھوئیں میں گم ہو گئے۔

مونیک نے تالی بجا کر ہنستے ہوئے کہا "یہ تمہارے دادا ہیں کیا؟"

ایک طرح سے تو نہ جانے کون کون ان کی گودوں میں کھیلا ہے کس کس کو انہوں نے کھلایا ہے سارے بڑے بوڑھے جن کی کمریں جھک گئی ہیں اور آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہے ان کے سامنے کے بچے ہیں۔ سبھی ان کا بہت مان کرتے ہیں۔ کسی کو ڈانٹ دیں کسی کو کچھ ہی کہہ دیں کوئی برا نہیں مانتا کہتے ہیں بھی ان کا بھرا پرا کنبہ تھا کھیت کھلیان بڑی گھرداری پھر جانے کیسے سب ختم ہو گیا کچھ بھی تو باقی نہ رہا۔ اب دادا دادی یہاں رہتے ہیں۔ شاگرد پیشے کے برابر میں لڑکے بالے سب ان کے گرد جمع رہتے ہیں اور ایک طرح سے تو یہ سب طرف پھیلے ہیں۔

مونیک اور میں اب بہت دھیان سے چل رہے تھے اس پگڈنڈی کو کھوجتے جو پرانی گھاس سے اٹی گہرے اندھیروں میں سانپ کی طرح لیٹی ہے اور جو مرجھاتے پتوں تلے ہولے ہولے سانس لیتی ہے لوٹ پوٹ کر کبھی سر نکالتی ہے اور کبھی آنکھ مچولی کھیلتی چھپ کر دم سادھ لیتی ہے۔

اس باغ کی دیکھ بھال کی اب کسی کو فرصت نہیں۔ پیڑ کبھی پھلوں سے لدے ہوئے ہوں گے مگر اب وہ اپنے پرانے دنوں کے گہرے سبز پتوں کے سائے بس ٹھہرے ہوئے ہیں اور برکھا کے دنوں میں بھولی بسری یاد کی طرح کبھی کوں کو ہو کو ہو بولتی ہے اور پانی پڑتا ہے تو شاخیں ٹپکتی چرچراتی ہیں کوے بے وقت کائیں کائیں کرتے شور مچاتے ہیں اور بوندوں کے ایک سا رپتوں پر پڑنے سے جلترنگ سا بج اٹھتا ہے یہ سب سننے کا کسی کے پاس وقت ہی نہیں گھٹا کی وجہ سے ڈراؤنا سیاہ اندھیرا ہی دکھتا ہے جس سے جانے کیوں ہول آتا ہے؟

سنیاسس پر وہ لکچر بہت بور تھا اور مونیک کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ تیاگ اور جوگ۔ تپ اور مارگ اور دھرم کے لفظ بار بار سن کر میرا تو سر دکھنے لگا تھا میں شاید چند منٹوں کیلئے اونگھ گئی تھی اس لئے کہ ہڑبڑا کر جب میں نے آنکھ کھولی ہے تو مونیک میرے کندھے پہ ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی چلو اچلا چلیں پھر بہت بھیڑ کی وجہ سے نکلنے میں دیر لگے گی۔

دل ہی دل میں میں نے سوچا تھا مونیک میں ابھی وہ گمبھیرتا نہیں آئی جو آدمی کے تن اور من کو اس کے گیان اور اس کی سوچ کو ایک سیدھی لکیر بنا دے۔ یہ تو اس طرح جلدی مچانے والی ہر شے پر موہت ہو جانے والی ہر رنگ پر مر مٹنے والی لڑکی ہے یہ جس کے پاس ابھی کچھ ہے ہی نہیں کیا تجے گی؟ کیا تجے گی بھلا؟

گھر میں گھسے ہیں تو اونچے دالان میں بڑی گہما گہمی تھی رحمنی دادی کا شنگار ہو رہا تھا۔

"رمادی اور رما کنتی بھابی نے پکارا کہیں سے تھوڑی سی لالی تو لا ہونٹوں کی لالی۔

"میرے پاس تو وہی بدیسی لپ اسٹک ہے" رما نے شرارت سے کہا۔

ارے نہیں بابا مجھ پر تو دیا ہی کرو جانے اس میں کیا رہتا ہے کھوٹ اور چربی اور جانے کیا کیا؟

کنتی بھابی نے کہا "دادی ذرا ہلو نہیں تو میں تمہارے بال باندھ لوں" وہ نئے اسٹائل سے یہ سب کر رہی تھیں اور منہ میں پکڑے پنوں کی وجہ سے ان کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دادی کا چہرہ چرمرایا ہوا لکیروں اور جھکوروں سے بنا تھا گردن

ہلتی تھی سفید بھنویں آنکھوں پر ڈھکی تھیں اور سنہید ور کی لکیر بالوں کے اُجلے پن کو اور بھی اُجال رہی تھی جیسے برسے ہوئے بادلوں کے بیچ بجھتے سورج کی گلابی رنگ کرن کہیں سے بھول پڑے۔

"دیکھو جو کرنا ہو جلدی کرو۔" دانتوں کے تہ ہونے سے دادی کے منہ سے بات بھک بھک آدھی آدھی نکل رہی تھی۔ "برت کا سمے ہو گیا ہے اور وہ سب دوسرے آنگن میں برگد تلے میری راہ دیکھ رہی ہیں۔"

رما نے پلو منہ میں ٹھونس رکھا تھا اور ہنسی کے مارے دوہری ہوتی بڑھتے دھندلائے شام کے سایوں تلے دادی کے ہونٹوں کو لالی سے لت پت کر رہی تھی۔

"بس اب رہنے دو دادی نے اُسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا یہ سب شگن کے لیے ہوتا ہے سوکھے لکڑی کے سے بازوؤں کو انہوں نے میری طرف پھیلایا ہے تو سہاگ کی چوڑیاں بج اٹھیں میں نے آگے بڑھ کر پکڑا۔

"اچھا چل بیٹا ذرا سہارا دے۔ یہ رما تو بڑی نٹ کھٹ ہے مجھے گرا ہی نہ دے۔"

سر پر پلوؤں کو ڈھکے پوجا کے تھال ہاتھوں پر ٹکائے دیوں کی دیوال لئے وہ اس گہری شام میں پچھم سے لگنے والے اکیلے تارے کا انتظار کر رہی تھیں۔ چڑھاوے کے پکوانوں اور پلوؤں میں بندھے پھل کی میٹھی باس سے لگتا تھا ستاروں کی جوت مہک اٹھی اور اندر اُتر رہی ہے بے چین ہو کر ڈول رہی ہے۔ پھر تارا ڈرتا کانپتا چھوٹے منے کی طرح چپا چھپ شام کے نیلے پن پر جھانکنے لگا گہری لہو رنگ لال اندھیرے میں گم ہونے لگی شرمائی لجاتی بہو کی طرح اس نے ستاروں بھرا پلو دھیرے دھیرے اپنے چہرے پر کھینچ لیا ہو سب کے ساتھ مل کر گیت گانے لگی اور برگد کے پتے سہاگ گان پر تال دینے لگے شاخیں جھکیں جیسے ساوتری کتھا سننے میں رجنی دادی کی آواز تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ اور دادی کا چہرہ لو دیتا تیز تیز چمک رہا تھا جیسے بس ساری ہمت کے ساتھ انتم بار پورے کا پورا جل جانے والا دیا ہو۔

کیا ساوتری کتھا سچ ہے لیٹنے سے پہلے مونیک نے مجھ سے پوچھا۔ نیچے آنگن میں سارے شور بیٹھ چکے۔ روتے بچوں اور بھجن کیرتن گانے والوں کی ٹولیاں سہاگنوں کا ڈر سمیٹ کر جا چکیں اور برگد کے گرد اگرد دیوں کی دیوال جل کر سو یکسار ہو چکی۔ یہ سوال مونیک کی طرف سے مجھے بڑا عجیب لگا۔ وہ تو سنیاس لینے جا رہی ہے دُور دیس سے اپنا پہلا دھرم تیاگ کر یہاں آئی ہے اپنے پریم اور وشواس سے وہ مکتی کی کھوج میں نکلنے والی ہے۔ اگر وہ ابھی ایسے سوال اپنے دل میں لئے پھرتی ہے۔ تو اس کا کرم دھرم تو ادھورا رہ جائے گا۔ اگر بہت تک کر دسوچ ہر چیز کو جاننے کی کوشش کرو بھیدوں کو کھولنے اُن کی اتھاہ تک جانے میں وقت لگاؤ تو کرم دھرم ادھورا رہ جاتا ہے۔ آدمی اور بھگوان کا سمبندھ کمزور پڑ جاتا ہے۔" یہ سب ماں کہا کرتی ہے۔"

ماں کتنی سندر ہے یا ہو سکتا ہے وہ مجھے ہی ایسی دکھائی دیتی ہو۔ کبھی مکھ بھور کا سا رہا ہوگا اور وہ نگاہ جیسے شیتل جل کی دھندلائی ہوئی ندی میں شعلوں کا عکس لہراتا ہو جیسے دھارے میں آکاش دکھائی دے۔ ایک پیار کا مہاساگر سا اُمنڈتا جان پڑتا ہے دھیرج سے بات کرنے والی ہم سے بہت پریم کرنے والی۔ پچھلنے میں ماں رامائن پڑھ رہی ہیں اور ہم پیچھے سے باہیں ڈال دیتے اُن کے گلے میں جھول جاتے بال الجھا دیتے۔ پر ماں ہمیں گود میں اُٹھا لیتیں غصے کی جگہ ہنس کر پیار کرتیں ماتو ہم ہی بھگوان ہیں تیوہاروں

پر ماں کا چہرہ دیوں کے اُوپر جگمگاتا اور بہت اچھا لگتا جیسے جوت کا بنا ہو۔ ماتھے پر بڑی سی بندیا سجائے۔ مانگ میں سیندور بھرے وہ لگتا آپ مورتی ہے اور آپ مندر جیسے بھگوان اُس کے من میں اُترا ہو۔

میں سوچا کرتی ماں کا اور بھگوان کا رشتہ بہت پکا ہے وہ سب کو سدا سکھی رکھے گا پھر یوں ہُوا کہ بابا نہ رہے ماں کی لُٹی پٹی صورت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگتا۔ ڈوبتا رہتا جیسے میرے اندر میں سمندر اترے ہوئے ہوں۔ بھگوان کا اور ماں کا سمبندھ کیسا رہا مگر میرا اور ایشور کا ناتہ دھندلا گیا اُس کے اور میرے درمیان ایک اوٹ ہو گئی۔ زبان سے ہم اب بھی اُس سے پرارتھنا کرتے مورتی پر پھول چڑھاتے مندر کی سیڑھیاں دھوتے ہر جگہ اس کا نام تھا مگر دل شام کے سونے پن میں خالی خالی لگتا ایک سانس اندر چکر لگایا کرتی جیسے خالی گھروں میں اندھیرے میں ہوا دبے پاؤں گھومتی ہے بنا کسی باس کے بنا کسی سوگندھ کے اچلا او بھئی اچلا میری بات کا جواب تو دو کہاں کھو گئیں۔

لگا کسی نے مجھے الٹے ہوئے ہنڈولے کے پیندے تلے سے نکالا ہو۔

باغ میں کوئل کو ہو کو ہو بولی۔ جانے وہ اُن پرانے گھرے ہرے اور اُجاڑ درختوں میں چھپی کیا چاہتی تھی۔ ماں نے یہ پکار سنی ہوگی جانے اُسے کیسا لگا ہوگا۔ ماں جو کم سونے کم ہنسنے اور کم بولنے والی بیراگن تھی اُس چہرے کی جوت جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ آنسوؤں سے دھندلی آنکھیں جھکائے وہ ٹوٹے سپنوں کی رکھوالی کرتی تھی۔ اُن کرچیوں کو چننا نہیں چاہتی۔ وہ ایک آدمی جس کے ہونے سے سنسار کی سندرتا تھی سچ اور سکتی تھی اُس ایک کے نہ ہونے سے کتنا اندھیار تھا ہمارے چاروں اور۔ میں چیزوں کا اصل روپ اُن کا اُجلا پن اُن کا نیا پن دیکھ نہ پاتی تھی۔ ہماری راہیں اُلجھ گئی تھیں جانے ماں کو کیسا لگتا ہوگا ماں کسی سے کچھ کہتی بھی تو نہیں۔ کہنے کے لئے رہا ہی کیا تھا؟

"اچلا سو گئی ہو کیا مجھے کتھا نہیں سناؤ گی" اُس نے میرا کندھا ہلا کر کہا۔

"میرا کندھا اکھاڑے کیوں دے رہی ہو بھائی" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"سوری" مونیک نے ہاتھ ہٹا لیا۔

"سنو کتھا تھوڑا سچ ہوتی ہے تھوڑا خیال" میں نے کہانی کہنے والے کی طرح شروع کیا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ تو دھرم کی بات ہے اس میں سب ایسے ہی ہونا چاہیے جیسے ٹھیک ہُوا تھا" مونیک نے بحث کرنے والے کی طرح کہا۔

"بھئی دیوی دیوتاؤں کا زندگی سے اپنا ایک ناطہ ہوتا ہے اور آدمی اس ناطے کے خیال کے گرد اگرد اپنی اپنی اوٹیں کھڑی کر کے اپنے دل کے رنگ اُس میں بھر لیتے ہیں اور اس لئے ایک دیوتا کے کئی روپ ہوتے ہیں ذرا سا سوچو تو سارے دھرم ایک ہی طرح کی سوچ اور سپنوں کے تانے بانے سے ڈھکے ہیں۔

"نہیں" مونیک نے کہا ہمارے دھرم میں میرا مطلب ہے میرے پچھلے دھرم میں تو کوئی دیوتا نہیں ہوتے صرف خُدا کے تین روپ ہیں تین خُدا جیسے ایک مورتی کو تین طرف سے دیکھا جائے جیسے دکن میں غاروں میں بنی ترمورتی اور بس۔

یہ تو صرف اک کتھا ہے بھئی سن کر اس کا سچ جھوٹ خود معلوم کر لینا ماں یہ کتھا یوں سنایا کرتی ہیں۔

"ست یگ کی بات ہے جب ابھی دنیا بھلے آدمیوں سے خالی نہیں ہوئی تھی کسی دیس میں ایک راجہ تھا اشوپتی نام اُس کی ایک بیٹی تھی ساوتری بہت ہی سندر اور بڑی گن وتی جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اُسے تیرتھ یاتراؤں پر جانے کا خیال آیا"۔

مگر مشرق میں لڑکیوں کو اتنی آزادی کہاں ہوتی ہے انھیں گھومنے نہیں دیا جاتا جھٹ بیاہ ہو جاتا ہے۔ مونیک کے سوالوں کا پہلا راؤنڈ شروع ہو گیا تھا جی میں تو میں نے سوچا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے پر اسے کتھا کے بیچ گھڑی گھڑی بولنے سے روکنے کے لئے میں نے کہا۔

ایسا ہوا ہو گا تب ہی تو یہ بات کہی گئی۔

"اچھا۔" وہ میرے پلنگ کی پائینتی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ "پھر"

راجکماری کی سواری چلی رتھوں کا ایک لمبا شکر ہاتھیوں کے پیچھے تھا بہلیوں میں ساوتری کی سکھیاں اور اُن کی باندیاں۔ مہامنتری کی کنیائیں اور دوسرے منتریوں کی بیٹیاں اور اُن کی داسیاں بھگوان کی اُستتی گانے والوں کی سواریاں اور دیو داسیاں اور بھجن کہنے والے لوگ اور پجاری مندر کا ایک الگ رتھ جس میں آسن سمیت مورتی اور اس سارے لمبے قافلے کے بیچوں بیچ سنہرے پردوں والا اونچا رتھ جس میں ناگوری بیل جُتتے ہوئے یوں تیز دوڑنے والے مانو اندر دیوتا کی سواری میں جُتتے ہوں مست آنکھوں سیاہ بالوں والے بانکے رتھ بان۔

"اندر دیوتا وہی بارش کرنے والے"۔ مونیک نے پوچھا۔

"وہی" میں نے جلدی سے کہا "وہی" ساوتری کے ماتا پتا کی اشیرواد اُس کے ساتھ تھی مہینوں کا سفر دنوں میں کٹ رہا تھا۔ وہ کئی راجوں میں سے گزرے ایسے راج جہاں دھرتی سونے کی بنی لگتی تھی۔ پربت بادلوں میں کھوئے ہوئے اور برف سے جھم جھماتے ہوئے ساگر اُبلتے ہوئے اور دریا بہت آنند سے بہتے ہوئے۔ ایسے راج جہاں کھیتوں میں ہریالی تھی کھلیان بھرے ہوئے تھے دکانیں سامان سے اٹی ہوئی تھیں بازاروں میں پھرتے ہوئے لوگ خوش تھے بھکشا پانے کے لئے کوئی بھکاری نہ ملتا تھا۔ کوئی بھوکا نہ تھا دھرم شالوں میں مہمانوں کی دھوم تھی اور برہمنوں کو بھوجن کرانے والے پُن کرنے والوں کا ایک شور تھا۔ مندروں میں ہیرے اور جواہرات کے سفید قیمتی پتھروں کے چڑھاوے، مورتیوں پر چڑھائے جاتے تھے۔ لگتا تھا ساری دھرتی سے دیوی دیوتا خوش ہیں۔

"اگر بہت پیسہ ہو اور بازار بھرے ہوں تو کیا دیوی دیوتا خوش ہوتے ہیں؟ دیوتاؤں کی خوشی صرف اس بات سے ظاہر ہوتی ہے"

"بہت سے بہت سے"۔ اُس نے بازو کھول کر پھیلاتے ہوئے کہا۔

مونیک کتھا سننے کا یہ طریقہ نہیں بس تم چپکی بیٹھی سنتی رہو میں تمہاری اس کمنٹری کا جواب دینے لائق دویا پراپت نہیں کر چکی۔ زیادہ سے زیادہ تم یہ کر سکتی ہو کہ ہنکارہ بھر سکتی ہو۔

"وہ کیا ہوتا ہے"۔

"تم صرف ہاں کہہ سکتی ہو اپنے سنتے ہونے اور جاگتے رہنے کا ثبوت"۔ میں نے چڑ کر کہا۔

مگر میں تو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ اُس نے کہنیاں بستر پر ٹیک کر ہاتھوں پہ چہرہ سجا لیا بستیوں سے گزرتے ندیوں کو پار

کرتے بنوں میں ڈیرہ لگاتے وہ جانے کتنے زمانوں یونہی گھومتے رہے دیس کی ساری یاتراؤں پر ہر چھوٹے بڑے مندر میں انہوں نے ماتھا ٹیکا ہر دیوتا کے استھان پر ہر دیوی کے دوار پر انہوں نے پریم بھگتی کے گیت گائے۔ سارے پوتر مندر انہوں نے دیکھے گنگا اور جمنا اور گومتی اور کرشنا میں اشنان کر کے پاپوں سے مکت ہوئے۔ ساوتری بہت خوش تھی اُس کا من گیان اور دھیان سے یوں چمک اُٹھا تھا کہ اُس میں بیتے دنوں کی یادیں اور آنے والے دنوں کی پرچھائیں دکھائی دیتی تھی پہلے جنموں کے سارے کرم اُسے ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے جیسے نرم باس بھری ہوا کے ساتھ پردے ہولے ہولے اُڑیں اور اندر جو کچھ ہے اس کی ایک جھلک دیکھی جا سکے۔

"کیا ایسا ہونا ممکن ہوتا ہے۔" گویا مونیک نے اپنے آپ سے کہا۔

ست یُگ میں ایسا ہو سکتا تھا۔ بھگتی سے آدمی کے اندر اتنی شکتی پیدا ہو ہی جاتی ہے اب تمہیں تو خود معلوم ہے کہ جاپ کرتے رہنے سے اُسے پکارتے رہنے سے گائیتری مندر کا پاٹھ کرنے سے تم بھگوان کے اتی سندر روپ کو دیکھ سکتے ہو۔ دیکھ سکتے ہو نا؟" اور دل ہی دل میں میں سوچ رہی تھی کہ کیا آدمی بھٹک گیا ہے؟ دولت کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے کیا روشنی بجھ سی نہیں گئی کہ اب پچھلے جنم کی باتیں یاد آنا تو ایک طرف رہا ایک دن کی بات دوسرے دن یاد نہیں رہتی اور پھر زندگی گزارنا کتنا کٹھن ہوتا ہے شاید ست یُگ میں لوگوں پر یہ روز روز کے بوجھ نہ ہوتے ہوں گے انھیں فرصت ہوتی ہو گی کیا ان دکھوں سے تھوڑی آزادی ہی تو ست یُگ نہیں۔ بس یہ آزادی ہی تو ست اور بھگتی اور پریم ہو گا۔ بھول گئی ہوا چلا کہ آگے کیا ہوا تھا۔" مونیک نے مجھے خیالوں کی بند کوٹھری سے نکالا۔ پھر اُس نے تپ وَن کے گہرے سایوں اور شام کے مدھم پڑے اُجالے میں ایک سجیلے جوان کو دیکھا کلہاڑی کو کندھے پر دھرے اُس کا ایک قدم ندی کے بیچ تھا اور ایک دوسرے کنارے پر وہ جانے کس پار جانا چاہتا تھا کہاں سے آیا تھا وہ اُسے دیکھتی رہی اُس کا من اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ وہ اُسے پہچاننے یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی سینے پر پڑی مالائیں ہل رہی تھیں جیسے اندر طوفان آیا ہو۔ ڈوبتے سورج کی لالی میں اُس کے نتھنے گلابی ہو رہے تھے سانس تیز دھونکنی کی طرح چل رہا تھا وہ آنکھیں بند کرتی اور کھولتی تھی یہ کوئی سپنا تو نہیں؟ مگر بن کے اندھیارے اور ندی کے لال شعلوں کے رنگ۔ کے یانی کے سنگھم پر وہی تھا ہاں یہ وہی تھا اُس کے پچھلے جنم کا ساتھی۔ ساوتری نے پلو اپنے سر پر ڈھکا اور اپنے اُونچے رتھ کی اور چلی اب یاتراؤں اور بنوں اور راہوں اور گھومتے رہنے سے چھٹکارا پانے کا سمے آ گیا تھا مگر اُس نے اُس جوان سے بات کیوں نہ کی اُسے پہچان کر اُس سے کچھ کہا کیوں نہیں؟ مونیک کی آواز گھمبیر سایوں کے پار سے سنائی دی۔ یہ شاید پہلی نظر میں محبت ہو گی۔

"نہیں یہ محبت نہیں تھی یہ اُس کے ماتھے کا لکھا تھا یہ اُس کا نصیب تھا جس تک وہ اُس تپ وَن میں پہنچی۔" میں نے جو سنا تھا کہہ دیا۔

مونیک نے گردن کے قریب اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں یہ بات اس کی سمجھ سے قطعی باہر تھی۔ راج محلوں میں ساوتری کھوئی کھوئی سی لوٹی۔ رانی ماں نے اُس کا اُڑا ہوا رنگ اور اُداس چہرہ دیکھا کچھ سوچتی اور دُور دیکھتی آنکھیں دیکھیں مگر نہ باندیوں میں سے کوئی اور نہ ہی کوئی سکھی بتا پائی کہ کیا ہوا تھا کوئی کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اماوس کی راتوں میں اور پُورنماشی کی پھیلی چاندنی میں وہ راج بھون کے باغوں میں اور اندھیاروں میں اکیلی ڈولتی۔

"مائی ڈیئر اس نے اپنے ماتا پتا سے کیوں نہ کہہ دیا کیا یہ کہنا اتنا مشکل ہوتا ہے۔" مونیک کا بیہودہ سوال پھر بیچ میں آ گیا۔

مونیک یہ یونہی ہوا تھا اگر ساوتری ساری اَن کہی باتیں کہہ پاتی تو پھر کتھا کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے تیزی سے جواب دیا۔ آئی ایم سوری اچھلا اُس نے بازو اپنے سینے پر باندھ کر سر کو جھکا لیا۔

رشیوں منیوں راج جوتشیوں کی ایک بیٹھک ہوئی بہت فکرمند راجہ اشوپتی کو بھی آنے کی تکلیف دی گئی نارد منی کے سیدھی طرف بیٹھ کر راجہ نے ہاتھ اپنی گود میں رکھ لئے وہ انتظار کرنے لگا ستیہ وان اور ساوتری پچھلے جنم کے ساتھی ہیں مہاراج" نارد منی نے کھنکار کر تمہید نکالتے ہوئے کہا مگر یہ ساتھ ہونا نہیں چاہیے اس لئے کہ ستیہ وان پر ایک شراپ ہے وہ اس بندھن کے ایک سال کے اندر اندر پرلوک سدھار جائے گا۔

کیا ہوا اب کیا ہو سارے میں ایک گمبھیر چُپ چاپ چھا گئی۔

ستیہ وان کے ماتا پتا سے راج پاٹ چھن چکا ہے اور آنکھوں کی روشنی بھی وہ تپ وَن میں رہتے ہیں لکڑیاں کاٹ کر گزارہ ہوتا ہے ساوتری ماتھے تک پلو کھینچے دھیرے دھیرے چلتی راجہ کے پاس آن کر بیٹھ گئی جو گیا ساڑھی میں وہ تپسوِنی لگتی تھی چہرے پر شانتی اور ماتھے پر تیج ہونٹوں پر مدھر مُسکان بھورا سی آنکھوں پر لمبی پلکیں گرائے جن کا سایہ کالے بادل کے ٹکڑے کی طرح اُس کے گالوں کی لالی کے کنارے ٹھہرا تھا میں نے ستیہ وان کو دیکھا ہے اس نے راجہ باپ کے پیر چھو کر کہا۔

نارد منی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "مگر وہ ایک سال سے اوھک جی نہ سکے گا۔"

"کوئی سدا جیا ہے کیا؟" اس نے مضبوطی سے سیدھا نارد جی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ساری سبھا کے سانس رُک سے گئے۔

پتا جی مجھے آشیرواد دیں اُس نے اپنا سر راجہ باپ کے پاؤں پر رکھ دیا۔

"کمال ہے بھئی" مونیک نے پہلو بدلا پلنگ چرچرایا تو وہ وہیں رُک گئی۔ کہیں دُور پرے بادل گڑگڑایا باغ میں کوئل بولی چاند کھلی کھڑکی میں سے جھانکا اور ہوا کے زور سے پٹ یوں بجے جیسے بچھڑی آتمائیں گلے مل رہی ہوں پھر تیز تیز بگولوں کی بھاگ دوڑ سنائی دی دھول بھرا ایک بگولا اندر آیا۔

"پھر راجکماری ساوتری کا کیا ہوا"۔ مونیک نے اُٹھ کر کھڑکی بند کی رنگ برنگ شیشوں کا سایہ دھنک کے ملے کی طرح فرش پر لہرایا اور کمرہ جادو نگری کا ایک ٹکڑا لگنے لگا۔

وہ راج محل چھوڑ کر بن میں آن بسی۔ ستیہ وان لکڑیاں کاٹ کر لاتا وہ ندی سے پانی بھر کر لاتی۔ ساس سُسر کی سیوا کرتی۔ جنگل کے پنکھ پکھیرو سب اُس سے پیار کرتے تھے۔ کُٹیا کے آس پاس پھول اُسے دیکھ کر کھل اُٹھتے جب تک ستیہ وان اُس کے پاس رہتا وہ خوش رہتی پر جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو آنے والے دکھ کا سایہ اُس کے چہرے کو کلونس دیتا۔ پل پل گھڑی گھڑی دن بیت رہے تھے وہ سونے سے گھبرا کر اُٹھ جاتی۔ کھڑے سے بیٹھ جاتی ایک بیکلی تھی جو اُس کی جان کو قید کئے ہوئے تھی جیسے رات کے سمے پھول کے اندر بھونرے سے بند ہو جانے والی شہد کی مکھی اکھلے آکاش تلے پھیلی ہوئی دھرتی پر وہ سورگ میں نہیں نرگ میں تھی۔

"اچھا نہ ہوتا اگر نارد منی اُسے وہ سب نہ بتلاتے۔" مونیک نے آہ بھر کر کہا "اگر آدمی بہت جانتا ہو تو وہ بھی دُکھی ہوتا ہے اگر دُور تک دیکھ سکے تو تب بھی سکھی نہیں رہ سکتا۔ آدمی سارا وقت موت کے سائے میں جیتا ہے کیوں اچلا کیا وہ اس ڈر سے مکت نہیں ہو سکتا؟"

اوم شانتی شانتی شانتی۔

مونیک نے ماتھا جھکا کر اپنے جُڑے ہوئے ہاتھوں پر رکھ کر کہا۔

مونیک او مونیک میں نے اپنے سر پر ہاتھ مار کر کہا "اگر تم یہ کمنٹری نہ کرو تو کتھا جاری رہ سکتی مگر اچلا وہ کہانی ہی کیا جو آدمی کے اندر سوال پیدا نہ کرے اُس کے اندر سوچ پیدا نہ ہو اس کو دُکھی اور پریشان نہ کرے۔ کہانیاں آدمی کے اندر ہلچل مچاتی ہیں سوالوں کا جواب پانے کے لیے آدمی اِدھر اُدھر بھاگتا ہے اور پھر کتھا تو ست یگ کی ہے تم مجھ سے اس سلسلے میں سوال کرنے کا حق نہ چھینو بھئی۔

میں بُرا مان کر چپ ہو بیٹھی۔ رات بیتی جا رہی تھی ہوا کا شور بڑھ رہا تھا جیسے بادلوں کی گھن گرج اُڑی چلی آ رہی ہو۔

"بھگوان شاید اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ آدمی جھکا ہوا روتا ہوا پرارتھنا کرتا ہوا کسی نہ کسی مانگ کیلئے اس کے سامنے ماتھا ٹیکتا اور ساوتری کیا مانگ سکتی تھی۔ بھلا جب بھگوان کا لکھا اٹل ہوتا ہے" وہ چپ ہو گئی جیسے اپنے سوالوں کے جواب کھوج رہی ہو۔

"اچلا بھئی سناؤ نا تم چپ کیوں ہو اچھا مجھ سے ناراض ہو اُس نے منت کرنے والے کی طرح ہاتھ۔ میری طرف پھیلایا۔

نارد جی کی بات پوری ہونے کا سمے قریب آ رہا تھا اور ساوتری کا ستیہ وان کو دیکھ کر یونہی ہنس دیا۔ اُس کا اپنے آپ سے باتیں کرنا مٹھیاں بھینچ کر جیسے وہ بھگوان سے لڑنے کے لیے تیار ہوتی لگتا وہ پُورے پُورے شکتی اکٹھا کر رہی ہے حوصلہ جمع کر رہی ہے جیسے بوند بوند شہد کو جمع کیا جاتا ہے اس کی چڑھی ہوئی بھنویں پسینے کے ستاروں تلے دوج کے چاند کی کمان کی طرح تنی ہوئیں اکیلے میں وہ شیرنی کی طرح ہر سائے پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھی ہواؤں کا رُخ پھیرنے کا مان لئے اگر کوئی دیوتا بھی اُسے دیکھ لیتا تو گھبرا کر لوٹ جاتا۔ مگر جانے کیوں ان لمحوں وہ کسی کو نہ پکارتی ساگر کی انتم لہروں کی طرح چپ چاپ اپنے جذبوں کو سمیٹنے میں لگی تھی ایک جگہ جمع کرنے میں۔ اپنے آپ سے بھی وہ کچھ نہ کہتی اس کی نگاہیں ستیہ وان تک بھٹکتی ہوئی ملتی۔

بھی سر اونچا کئے کٹیا کے آس پاس جلد جلد پھرتی جیسے دھرتی کو اپنے پاؤں تلے سمیٹ لے گی سمے۔ ادھر کیا تو رُک نہیں سکتا!

پھر دیکھتی ستیہ وان سر پر لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے آ رہا ہے اور راج ہنس اُس کے پیچھے آ رہے ہیں چڑیاں چوں چوں کرتی پھدک کر گیندوں کی طرح اس کے آگے لڑھک رہی ہیں۔ ندی کا پانی اچھل اچھل کر اُس کے پاؤں میں لوٹ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے دل کو سینے میں دبائے وہ سوچتی جو پچھلے جنم میں بچھڑا تھا کیا وہ اب بھی بچھڑ جائے گا۔ ملنے اور بچھڑنے کے ان چکروں سے جانے وہ کب چھوٹے۔ ایک سے دوسرے جنم تک موت جانے کب سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ کیا وہ موت سے مکت نہیں ہو سکتی؟

اُسے زندگی اچھی لگتی تھی وہ ان ہواؤں اور چمکتے دھاراؤں میٹھے جھرنوں اور تاروں سے جڑے اس آکاش سے پریم کرتی تھی ستیہ وان کے بنا ساری چیزوں میں کوئی مطلب نہ تھا کیا اُس کے کُرید جھلملاتا جیون موت کے اندھیکار میں چھپ جائے گا وہ کیا کرے ہاں کیا کرے بھگوان سے کبھی کوئی جیت سکا ہے کیا؟ کون ایسا بلوان ہے؟

پھر ہوا ایک دم رُک گئی شور مچاتی ندیاں اور اُن کا پانی اُڑتے ہوئے پنچھی اور اُن کے گیت پتوں کی سرسراہٹ اور شاخوں کا ہلنا

ایک دھندلکے نے ساری دھرتی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ساوتری نے اُس مدھم پڑتے اُجالے میں دو گھپاؤں کی سی آنکھوں کو دیکھا جو ستیہ وان کو دیکھتی تھیں۔ یہ اُس کے برت کا چوتھا دن تھا اور صرف وہی جانتی تھی کہ یہ ستیہ وان کے جیون کا آخری دن تھا۔ وہ اُن تناؤں کو باندھ کر بنائی ہوئی کٹیا میں بیٹھی تھی جو صبح ستیہ وان نے اُس کے سر پر اوٹ کرنے کے لئے کھڑی کی تھی پھولوں کی پتیوں کے فرش پر بیٹھے اُس نے دیکھا ستیہ وان جھوما تھوڑا لڑکھڑایا اور کلہاڑا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا پڑا یہ اُس کے سکھ کا انت تھا تو انت آن پہنچا تھا۔ اب اس کی مانگ کا سیندور دُھل جائے گا اور تپ دن کی ندیاں اُس سے گدلی رنگ ہو جائیں گی۔ سارے ساگر اس رنگ سے دگ جائینگے ستیہ وان نہ ہو گا اور یہ سب کچھ ویسا ہی رہے گا چاند اور سورج اور آکاش اور ستارے اُس کے گرد ناچتی گاتی ہوائیں اور زندگی بھرے گیت سب یونہی رہیں گے کچھ نہیں بدلے گا صرف وہ نہیں رہے گا ساری چیزیں اُس کے خلاف بڑے لشکر کی طرح جمع ہو گئی تھیں پھر اُس نے اپنے اندر ایک عجیب بل اور شکتی محسوس کی۔ آکاش اور دھرتی اور ہواؤں سے وہ جو اپنا تھا اُسے چھین لینے کی عظیم خواہش یم دیو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لینے کا حوصلہ۔ اس نے دیوتا کو پرنام کیا ہاتھ جوڑے اور چپکی کھڑی ہو گئی۔

یم راج نے اُسے دیکھا مگر وہ اُسے لینے تو نہیں آیا تھا۔ ستیہ وان کو اُس نے اپنے جال میں باندھ لیا جس میں وہ اپنے ہر شکار کو باندھ لیتا ہے۔ پھر لہروں نے اُچھلنا اور کنارے کی طرف ناچ کے چکروں میں بکھرنا شروع کیا بھنور اپنے اپنے چکروں میں مگن گھومنے لگے پرندوں نے شام کے نیلے بن میں اپنے پروں کو جھٹکا جیسے وہ نیند سے جاگے ہوں۔ جھونکے اونچے درختوں کی پھننگوں اور چوٹیوں پر آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ پتے اور پھول اور پھل اور گھاس پر چرتی گائیوں نے سر اٹھا کر اپنے گرد اگرد مچلتی ہوئی ہوا کو سونگھا۔

"کوئی موت کی شکل دیکھ سکا ہے کیا؟ مونیک کی آواز میں ڈر تھا۔ "ناممکن"۔

"یہ تمہاری اور میری بات نہیں ہو رہی بہن"۔ میں نے سوچا اب کتھا سُناتے رہنا بیکار ہے جب وہ کسی بات پر وشواس ہی نہیں رکھتی۔ ڈرے ہوئے دُکھوں کے مارے لوگوں کی سی اُس کی سوچ ہے جو کسی اچھی بات کی اُمید ہی نہیں رکھتے جو بھگوان کی شکتی کو اور خود آدمی کی شکتی کو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہر روز زندگی میں اُن کے کام آتی ہے جن کے من کے اندر گھور اندھیارا ہوتا ہے جو بس جیئے جاتے ہیں کہ اُن کا سانس آتا جاتا ہے۔ جو جیتے ہیں کہ مر نہیں سکتے جو بڑی باتیں سمجھ نہیں سکتے اس لیے کہ اُن کی آنکھ اپنے آگے کے سوا کچھ دیکھ نہیں سکتی۔

"اچھا سنو اندھا وشواس کوئی شے نہیں آدمی سمجھنے کی کوشش تو کرتا ہے"۔ یہ اندھا وشواس نہیں ہوتا مونیک ہر بات آدمی کی ذرا سی عقل میں اُس کے چھوٹے سے دماغ میں کیسے آسکتی۔ ہاں جب تک وہ بھگوان پر وشواس نہ رکھے۔ اب مجھے یہ بات بتاؤ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ دھنک میں اتنے رنگ کیوں ہیں وہ کمان کی طرح کیوں ہوتی ہے پھر وہ بارش والے دنوں میں ہی کیوں دکھائی دیتی ہے۔ پرندوں کو سورج کے پرکاش کا وقت کون بتاتا ہے وہ کیوں جاگ جاتے ہیں؟ سائنس اپنی ساری سمجھ کے ساتھ بھی کائنات کے سارے راز جان نہیں سکی جان سکی ہے کیا؟

ہولے ہولے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں لوگ مونیک نے دھیرے سے کہا۔

ارے رہنے دو آدمی بس جہاں سے چلا تھا وہیں ہے بندھے ہوئے جانور کی طرح بس اپنے گرد اگرد گھوم لیتا ہے۔

"تم تو اچھا خاصہ لکچر دے لیتی ہو۔" ہنس کر مونیک نے کہا۔ "چلو بتاؤ پھر کیا ہوا۔"

مجھے آج تک کسی نے نہیں دیکھا پھر ساوتری نے کیسے دیکھ لیا دیوتا سوچتا ہوا اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

یم پوری کا راستہ کٹھن تھا اور دور تھا الجھا ہوا تھا اور اندھیارے سے ہو کر جاتا تھا بیچ میں مہا ساگر تھے جن کا نہ کوئی اور تھا اور نہ چھور پھر آکاش تھے ساتوں کے ساتوں دھوئیں میں لپٹے ہوئے پھیلے ہوئے۔

ساوتری یوں کیوں کھڑی ہو گئی تھی جیسے وہ بس میری ہی راہ دیکھ رہی ہو اُسے مجھ سے ڈر کیوں نہیں لگا کتنی عجیب بات تھی۔ ایک کمزور سی لڑکی جو ساج محلوں میں پلی بڑھی تھی تپ دن میں بھی یوں دکھائی دیتی تھی جیسے راج بھون کے سفید چکنے فرش پر چلتے چلتے ابھی رکی ہو۔ گلاب کی پتیوں کے سے اُسکے نازک پاؤں اور جب وہ خشک پتوں اور کانٹوں بھری ہریالی یا درختوں تلے ٹہلتی تو ایڑیاں یوں دکھائی دیتیں جیسے جھونکے جھونکے سوگندھ ان پتیوں کو اُڑا رہی ہو۔ پھر دیوتا نے اپنے پیچھے چاپ سُنی کون اُس کا پیچھا کر رہا تھا؟

گھوم کر اُس نے دیکھا اور اُس کے ماتھے پر ریکھائیں گہری خندقیں اور بھی گہری ہو گئیں۔ پہلی بار وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ساوتری اُس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ بکھرے ہوئے بال بھنچی ہوئی مٹھیاں پاؤں لہولہان اور وہ آنکھیں جنھیں برسات کے بادلوں کی طرح اُمنڈ گھمڑ برسنا چاہیے خشک تو میرے پیچھے کیوں آ رہی ہے لڑکی۔ دیوتا نے بڑے گمبھیر مگر میٹھے لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"اور کہاں جاؤں دھرم راج میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

تو اپنے گھر جا۔

جہاں ستیہ وان ہیں وہیں میرا گھر ہے مہاراج اُس نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

تو یم پوری نہیں جا سکتی۔

تو انھیں بھی نہ لے جائیے اُس نے ہاتھ جوڑ کر ہولے سے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا ہاں اور جو تیرا جی چاہے مانگ سکتی ہے۔" دیوتا نے کندھے پر لٹکے جال کو تھپتھپایا۔

تو میرے سسر کی کھوئی ہوئی آنکھیں اور گیا ہوا راج لوٹا دیجئے۔

ٹھیک ہے دیوتا نے لمبے لمبے قدم اُٹھائے سرد گپھاؤں جمے ہوئے سمندروں اور ایسی سب جگہوں پر سے جہاں ہوا کا گزر بھی نہیں ہوتا وہ اُڑا چلا جا رہا تھا۔

مگر اس کی الجھن بڑھ رہی تھی چاپ اب بھی اُسے اپنے پیچھے سنائی دے رہی تھی دھرتی اور آکاش جہاں ملتے دکھائی دیتے ہیں اُس سے بہت آگے دلدلوں پر سے بھی وہ چاپ اس کا پیچھا کر رہی تھی وہاں جہاں شیش ناگ کا ٹھکانہ ہے چار آنکھوں والے کتے پہرہ دیتے ہیں اور کالے دریا اُبلتے ہیں۔

"ساوتری اب کیا ہے جس کے لئے تو میرا پیچھا کر رہی ہے لوٹ جا۔"

بھگوان آپ سورج دیوتا ہیں میرے جیون کو کیوں اندھیارا کر چلے ہیں میں کیسے جیوں گی۔

کیسی ناممکن باتیں کرتی ہے لڑکی ستیہ وان کو چھوڑ کر اور جو تیرا جی چاہے مانگ لے۔

پہلی بار ساوتری نے بکھرے بالوں کو ہاتھ پھیر کر پرے کیا اور کہا۔

بھگوان میں سو بیٹے چاہتی ہوں جو شور بیر اور بلوان ہوں

تیری اِچھا پوری ہوگی دیوتا پلٹ کر اپنے راہ پر جانے کے لیے تیار ہوا مگر ساوتری اُسی طرح ہاتھ جوڑے آنکھیں جھکائے کھڑی رہی

" بھئی معاف کرو اچلا کیسی راجکماری تھی اکٹھے سو بیٹے مانگ لئے" مونیک کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ "اوہ خدا ایک دم سو۔" وہ پیٹ پکڑے دوہری ہوئی جاتی تھی اس کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی مونیک تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ مونیک میں نے قطعی بُرا مان کر کہا۔

" ایک دم سو بیٹے کیوں مانگے بچوں کو سنبھالنا تو یونہی بہت مشکل ہوتا ہے"۔

" مونیک تم کسی قابل نہیں ہو تمہیں اپنے دیس لوٹ جانا چاہیے تم سنیاس لینا چاہتی ہو؟ ساری عمر بنوں میں ماری ماری پھرو گی مندروں میں ماتھا ٹیکو گی مگر کچھ سمجھ نہ پاؤ گی میرا اس بات پر پورا وشواس ہے۔"

" اچلا یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو صرف یہ بتاؤ کیا کوئی راجکماری جیسا کہ تم کہتی ہو ساوتری تھی اپنے ہوش وحواس میں ایسی بات کہہ سکتی ہے"۔ وہ پھر بحث پر اتر آئی تھی۔

تو مت سنو یہ کتھا اس میں تو سب ایسی ہی باتیں ہیں اور پھر ساوتری کوئی معمولی عورت نہ تھی کیا تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتی ہو؟

مونیک بہت دیر چُپ رہی تو میں نے کہا" ہم اور تم تو ہر آنے والے دن ہر ہونے والے عام دُکھ سے گھبرا جاتے ہیں پر ذرا سی تکلیف ہمیں پہاڑ دکھائی دیتی ہے۔ ہا ہا کار مچا کر ہم لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرتے ہیں مونیک نے شرمندہ سا ہو کر سر جھکا لیا پھر آگے۔

دیوتا نے ساوتری سے پوچھا اب تم کیوں کھڑی ہو۔

ساوتری نے دیوتا کے پاؤں چھو کر کہا۔" دھرم راج بیٹوں کے لئے ستیہ وان کو بھی تو لوٹا دیجئے نا؟

پہلی بار اس سارے سفر میں یم دیوتا کی آنکھوں نے ساوتری کے ماتھے پر اس جوت کو دیکھا جو جلتی ہے۔ تو اندھیارے میں سورج پرکاش کرتا ہے چاند تارے اُس کی روشنی سے روشن ہوتے ہیں جو زندگی کی جگمگاہٹ ہے جو یم کی شکتی ہے اور موت سے بھی بڑی ہے اور اس لیے امر ہے جس کو خالی ہاتھ لوٹایا نہیں جاسکتا۔

ستیہ وان نے آنکھ کھولی سر جھٹک کر ادھر اُدھر دیکھا ساوتری کو دیکھ کر ہنسا۔ ہاتھ سے اپنی آنکھوں کو ملا۔

میں نے بہت بھیانک سپنا دیکھا ہے پتہ نہیں وہ سپنا تھا کہ میں سچ میں مر کر جی اُٹھا ہوں۔

شام درختوں کی شاخوں پر جھرنوں اور ندیوں پر اُتر رہی تھی پتوں اور پھولوں پر گلال رنگ سے ہوا کے نوپور باندھے ناچ رہی تھی۔ اور پرندے اپنی چھوٹی تانوں والے راگ گاتے شور مچاتے کہیں نہ کہیں اُس سبھا میں گھسے جاتے تھے جب وہ دونوں کٹیا کو لوٹے ہیں۔

ستیہ وان کے پتا نے پہلی بار اپنی بیچ رلی بہو کو دیکھا اور اُس کے شبھ ہونے کو پرنام کیا۔

پھر راج پاٹ کے واپس ملنے کی خوشخبری دینے لوگ تپ ون میں انھیں کھوجتے ہوئے آن پہنچے۔ راجہ کی سواری سجے ہوئے ہاتھیوں

کے ساتھ چلی اور یہ ایسا نظارہ تھا جس کو چاند تاروں نے بھی پہلی بار دیکھا تھا پھر وہ سب اُج محلوں میں آن بسے تو دُھتہ ہے پُرھو۔

"وہ سو بیٹوں کی ماں کا کیا ہُوا" مونیک نے پُوچھا۔

جیسے بھگوان نے اور ساری مانگیں پوری کر دیں وہ بھی کی ہوگی" میں نے بڑے جوش سے جواب دیا۔

مونیک چُپ تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ کھڑکی کے باہر آندھی اور بگولوں نے شیشوں کے رنگ دُھندلا دیئے تھے یا چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپا تھا ہوا جیسے روتے روتے چُپ ہو کر پھر سسکیاں بھرنے لگے دیوانی بنی لوگوں کو ڈرانے کے لیے سیٹیاں بجاتی کواڑوں کو دھڑدھڑاتی یہاں وہاں تیز قدموں سے مست ہتھنی کی طرح چنگھاڑتی بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔

طُوفانوں بھری رات جیسے آخری لڑائی کے لئے ہتھیاروں کو سمیٹا جا رہا ہو۔

"ستیہ وان اور ساوتری اب بھی کہیں ہوں گے" مونیک نے بہت دیر کے بعد پُوچھا۔

"کیوں؟ ست یُگ ختم ہو گیا یُگ بیت گئے صرف دیوتا امر ہوتے ہیں آدمی کیسے اتنی دیر ٹھہر سکتا ہے"؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔

بات تو تب ہوتی کتھا کے قابل اگر وہ دونوں اب تک ہوتے۔ وہ ایک بار موت کے سمندروں کو پار کر چکے تھے۔ واپس آ چکے تھے یم دیوتا کے ساتھ انہوں نے لمبی مسافت طے کر لی تھی پھر انھیں مرنا نہیں چاہیے تھا اور میں بھی سوچنے لگی میں نے پہلے اسے کیوں نہیں سوچا وہ امر ہو گئے ہوں گے انھیں ہونا ہی چاہیے تھا۔

"ممتا، موہ، مایا کا تیاگ آدمی کو امر بناتا ہے" سنیاس کے لکچر میں یہ لفظ بار بار میرے کانوں سے ٹکرائے تھے۔

"وہ کیوں امر نہیں ہوئے" مونیک کا سوال پھر سنائی دیا۔

"تم بھی تو امر ہونے چلی ہو بھائی۔ موہ کا تیاگ مایا کا تیاگ ممتا کا تیاگ ہو رہا ہے" میں نے تلخی سے کہا۔

"نہیں تیاگ کا راستہ بہت ملبا ہے اپنے آپ کو سمیٹنا اپنے آپ کو بھولنا بہت مشکل کام ہے" مونیک کا من ڈول رہا تھا۔

تم ہر وقت دوسری راہ پر چل سکتی ہو نبوں میں جا تو رہی ہو کسی ستیہ وان کی کھوج بھی کر لینا۔

ہنستے ہوئے اُٹھ کر مونیک نے کہا "ٹھیک ہے پہلے ستیہ وان کی کھوج اور پھر تیاگ" ٹھہر کر پھر اُس نے اپنے آپ سے بات کرنے والے کی طرح کہا "مگر ستیہ وان کے ملنے کے بعد تیاگ تو رہ جائے گا"۔

کیوں بھئی تیاگ تم میں وہ بل اور شکتی بھی تو پیدا کر دے گا جو ستیہ وان کو واپس لانے کے لئے ضروری ہے تاکہ تم اسے دیوتاؤں سے چھین سکو۔

نہیں اچھا جب آدمی امر نہیں ہو سکتا جب موت بار بار اُسے چھو جاتی ہے تو پھر بچنے سے کیا ملے گا۔ تم کتھا سنا رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی وہ دونوں اب بھی ہوں گے پر جب تم کہتی ہو وہ نہیں، تو چند دنوں کے لیے موت کو ٹالنے سے فائدہ۔ سب سے بڑی شکتی جب دھرم راج کی ہے تو یم پوری تک اُس کا پیچھا کرنے سے بھی کیا ملتا ہے جسے بچا کر لاؤ۔ وہ پھر لوٹ ہی تو جاتا ہے۔

میں بھی سوچ رہی تھی مونیک کے دل میں کتنے سوال پیدا ہو گئے ہیں ان کے جواب دینے کی میں اپنے میں ہمت نہیں پاتی۔ مجھے خود

ان سوالوں کی سمجھ بھی تو نہیں آپاتی۔ بنواری دادا جانتے ہیں اُن سے پوچھا جاسکتا ہے۔ مونیک سیناس کیوں لے رہی تھی؟ شاید آدمی زنگارنگ زندگی اور بہت سے گھبرا کر اپنے آپ کی کھوج میں نکلتا چاہتا ہے۔ ساری عمر گھات لگا کر اپنے آپ کو پکڑنا چاہتا ہے۔ پاپ سے مکت ہونا چاہتا ہے۔ جاننے کا ہے کی کھوج اسے لئے لئے پھرتی ہے؟

مونیک کی سمجھ میں کیا آیا ہے؟

کیا اُسے سیناس لینا چاہیے۔

پاپ اور پُن کی سمجھ کسی کو آسکی ہے بیا۔ اور آدمی ساری عمر کس سے لڑتا رہتا ہے؟

وہاں کوئینز میں بنے اتی سُندر اوم کے مندر میں ——— ماتھا ٹیکتے مونیک نے ایک دم سوچا ہوگا کہ بندرابن میں مُرلی منوہر کے سنگ راس رچاتی گوپیوں اور کنہیا کے درشن سے اُس کا جنم سپھل ہو جائے گا۔ نئی نسل بھٹکی ہوئی آتما کی طرح اڈیں اور شرن تلاش کرتی پھرتی ہے بھلا کاہے سے ڈرتی کانپتی مونیک موہ اور تیاگ کے بیچ کوئی راہ چلنے کے لئے تیار ہے کیونکہ

"سب کرموں میں آتما کا گیان افضل ہے اس سے موکش ہوتا ہے۔"

وہ بھرگ سنگھتا میں لکھے اس منتر کو منہ ہی منہ میں دہراتی رہتی ہے۔

موکش کے چکر میں ہوسکتا ہے کبھی اگیان سے گیان سے بھی دُور کوئی روشنی پا سکے۔ مجھے تو اس سبب کی سمجھ نہیں آتی۔ میں سمجھنے کی کوشش میں بھی نہیں ہوں مجھے ایک کزن چاہیے جو اس دھند میں لپٹے ہوئے اُداس جیون کو مجھے دے۔ مجھے آتما کا گیان نہیں چاہیے کیونکہ اس کے لئے تو ساکی منی گوتم نے اپنا راج پاٹ تج دیا تھا جو انہوں نے پایا سب کوئی تو نہیں پا سکتا۔ وہ شانتی جو اُن کی مسکان میں ہے سارے گیان سے اُونچی ہے وہ مسکان جو آنکھوں کے آس پاس سے شروع ہوتی ہے اور اُس نہایت مکمل چہرے کو احاطہ کئے ہے آنند بھری بکھری ہوئی دھرتی اور آکاش کا پُورا علم لئے ہوئے جس میں مان نہیں بس آگاہی ہے زندگی کی اور موت کی۔

"کیوں مونیک تمہیں مسکان چاہیے" میں نے چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لی۔

"پتہ نہیں کیا چاہیے بل اور شکتی کا انت بھی جب موت ہے یم پوری تک بھی بکھرے بالوں اور لہولہان پاؤں سے جب کوئی امر نہیں ہوسکتا پھر؟

مونیک بہت الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

چلو پھر سو جائیں اور اگر اس طوفان نے کچھ بچایا تو سویرے بنواری دادا سے پوچھیں گے۔

بادلوں اور بگولوں اور اولوں کے شور کے باوجود نیند نے ہمیں آلیا۔

پچھواڑے باغ میں کوئل بھیگے پتوں میں چھپی کو ہو کو ہو بول رہی تھی اور دن کے قریب ہونے کی وجہ سے سوتے جاگتے کوؤں نے ایک ایک دو دو کائیں کائیں کرنا شروع کیا تھا جب ماں نے مجھے بہت ہولے سے پکارا۔

اچلا بنواری دادا کا دیہانت ہوگیا ہے ذرا رجنی دادی کو سنبھالو۔

وہ باہر ہی سے لوٹ گئیں۔

دونوں ارتھیاں ایک ساتھ اُٹھیں ۔

یم راج نے رجنی دادی سے بھی ہار مان لی ہوگی اُسے بھی لوٹایا نہ جا سکتا ہوگا ۔

جب بھی میں ٹوٹی باڑ سے اندر آتی ہوں تو گھنے درختوں کے گہرے اندھیرے میں لگتا ہے کنوئیں کی جگت پر بنواری دادا بیٹھے ہیں جنھیں کسی دیوی دیوتا پر وشواس نہیں تھا مگر جو بھگوان سے پریم کرتے تھے جو اُس سے ڈرتے نہیں تھے مگر جنہیں اس پر وشواس تھا جو کہا کرتے تھے کہ مرنے اور جینے کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ ہے جو اُس راستے کو پھلانگ کر اتھاہ بے کنارہ موت سے مکت جیون میں ہنسی خوشی داخل ہو گئے اور مجھے مونیک بھی یاد آتی ہے جانے کہاں گھوم رہی ہوگی جانے اُسے کس شے کی کھوج تھی کیا اُس نے موت سے مکت ہونے کا گر سیکھ لیا ہوگا ۔

جانے آدمی موت سے مکت ہونا کیوں چاہتا ہے جانے کیوں ؟

آج — ۱۸

انور سجاد

اس کا باپ کس بات پر غصّے میں دیوانہ ہو جاتا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔
ماں برتن مانجھنے کے بعد ذرا دم لینے کو رُکتی ہے کہ باپ چنگھاڑتا ہے
——— باورچی خانے کی صفائی کرو۔
دہشت اس کے جانگیے میں بہہ جاتی ہے۔ ماں اس کے باپ پر خالی سی ایک نظر ڈال کر صاف باورچی خانے کو پھر صاف کرنے لگتی ہے۔
اس نے اپنے باپ کے چہرے پر ہمیشہ تناؤ ہی دیکھا ہے، اس کی زبان سے اُبلتی ہمیشہ جھاڑ جھنکار ہی سنی ہے۔ بات بات پر پٹائی۔ غصّے کا جواز نہ بھی ہو تو بھی وہ دیوار پر، میز پر، فرش پر مکّے برسانے لگتا ہے۔
صحن میں گڑیا کا کھیل چھوڑ کر وہ آہستہ آہستہ، پنجوں کے بل چلتی دروازے کے پیچھے آجاتی ہے۔ خوف زدہ نظروں سے باورچی خانے میں دیکھتی ہے۔
باپ پیڑھی پر بیٹھا جلدی جلدی ناشتہ کرتا ہے۔ ماں ایک ہاتھ سے سُڑسُڑاتی ناک کو دوپٹّے سے پونچھتی دوسرے ہاتھ سے فرش پر تپڑی پھیرتی ہے۔ تپڑی کی سرسر اور نوالہ چباتے جبڑوں کی چپک چپک کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں۔ غیر ارادی طور پر باپ کی نظریں اس دروازے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں جس کی اوٹ میں وہ کھڑی ہے۔ دہشت اس کے جانگیے میں بہہ جاتی ہے۔ باپ کی نظریں کھانے کی طرف پلٹ جاتی ہیں وہ اسے دروازے کی اوٹ میں نظر نہیں آتی۔
پھر وہ ٹفن کیریئر اٹھا کر فرش پر پاؤں پٹختا فیکٹری چلا جاتا ہے۔
ماں اس کی غیر موجودگی میں بھی روبوٹ۔ وہ دہشت ناک خواب میں ملفوف مسکرانے، ایک دوسرے سے دل کا حال کہنے کی جرأت نہیں مبادا باپ کسی اوٹ سے نکل آئے اور چنگھاڑنے لگے۔
زندگی گڈی کاغذ ہے جس پر پانی کی ایک بوند بھی ٹپک جاتی ہے تو آبلہ سا بن جاتا ہے جسے اس کا باپ یا تو زبان کی نوک سے پھوڑ دیتا ہے یا اپنے میل خوردہ ناخنوں سے نوچ لیتا ہے۔
وہ برآمدے میں ستون کی اوٹ میں سہمی کھڑی صحن میں دیکھتی ہے جہاں اس کا باپ چنگھاڑتا گالیاں دیتا اس کی ماں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اسے اپنی ماں کا پیٹ پھولا پھولا سا لگتا ہے اور مرغی کی طرح چیختی چلّاتی بھاگتی پھرتی ہے۔ اس کے باپ کے پنجوں سے بچنے کے لیے جھکائیاں دیتی کبھی رکتی ہے، لڑکھڑاتی ہے، پہلو بچا کر پھر بھاگ اُٹھتی ہے۔

صحن کے وسط میں اس کا باپ، ماں کے بھاگتے پیروں میں پیرا رادیتا ہے۔ ماں لڑکھڑا کر گر جاتی ہے، بُری طرح ہانپتی رونے لگتی ہے۔ پاس کھڑے باپ کے مُنہ سے ہنسی کا فوارہ اُبل پڑتا ہے۔ ماں روتی ہُوئی اُٹھنے کی کوشش میں پرے ہٹتی ہے۔
صحن کے کچے فرش پر جہاں سے اُٹھنے کی کوشش میں ماں پرے ہٹتی ہے وہاں اس کی قمیض کے دامن اور شلوار کے نیفے سے نیچے لہو نچڑنے کے باعث مٹی میں سُرخ پھول سا کھل جاتا ہے۔
اس پھول کو دیکھ کر ماں روتی، چیختی چلاتی اُٹھتی ہے۔
اس کے باپ کو جانے کیا سوجھتی ہے، وہ اسی طرح ہنستا ہُوا لہو اور مٹی سے گندھے اس پھول پر پیشاب کرنے لگتا ہے۔
ماں دیوانہ وار برآمدے کی طرف بھاگتی ہے۔ اسے کندھے سے پکڑ کر باہر گلی میں کھلتے دروازے کی جانب ہانکتی ہے۔
دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی، سر پر رکھی کپڑوں کی گٹھڑی کو تھامے ہاتھ اچانک ماں کے پیٹ پر آجاتے ہیں۔
گٹھڑی سر سے لڑھک جاتی ہے۔ ماں دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو تھامے دوہری ہو جاتی ہے۔
وہ بیحد پریشان، ماں کو تھامنے کی کوشش کرتی ہے۔
ماں اسی طرح دوہری، میں ابھی آئی کہہ کر، پلٹ کے بھاگتی، گرتی اُٹھتی، گھر کی سیڑھیاں چڑھتی غائب ہو جاتی ہے۔
چند منٹ بعد اُوپر کی منزل سے چیخ کی آواز آتی ہے پھر پانی بہتا ہے۔ وہ نالی کی طرف دیکھتی ہے۔ نالی کا پانی گدلا سُرخ جس میں تیرتا جامنی رنگ کا لوتھڑا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔
صدیاں بعد ماں لرزتے قدموں سے گلی میں آتی ہے۔ کانپتے ہاتھوں سے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے نالی میں دیکھتی ہے۔ آہ بھرتی ہے۔
——— میرا بیٹا۔
وہ حیران و پریشان، ماں کو دیکھتی ہے۔ ماں کا چہرہ زرد ہے۔ اس کا پیٹ اب اتنا پھولا ہُوا نہیں۔ اس کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آتا۔ وہ ماں کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ لیکن کیسے؟
وہ چُپ چاپ، ماں کے ساتھ ہو لیتی ہے،
اُسے دُور تک باپ کے قہقہے پیچھا کرتے سنائی دیتے ہیں
اٹھارہ برسوں پر محیط
وہ چونک کر، گوٹا لگے سُرخ دوپٹے کے گھونگھٹ سے قہقہے کی جانب دیکھتی ہے،
وہ اپنی ہی کسی بات پر ہنستا اس کی طرف بڑھتا ہے۔
ماں کی منت سماجت کے باوجود نہ کرتے اس نے نکاح کے وقت گواہوں کے سامنے آخری نہ، نفی میں سر ہلا کر کی تھی،
تو وہ یہاں تازہ سُرخ گلاب کی لڑیوں کے گھیراؤ میں کیسے آگئی؟

وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ اُلٹ دیتا ہے۔
اس کی نظریں فوراً بستر پر جھک جاتی ہیں جہاں گلاب کی پتیاں بکھری ہیں۔
بستر کی مٹی میں لہو سے گندھے سرخ سرخ پھول،
دہشت میں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں، پھیپھڑوں کی پوری قوت اس کے حلق میں سمٹ آتی ہے۔
وہ آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر حلق میں سمٹی اس قوت کو داغ دینا چاہتی ہے۔
لیکن وحشیانہ بوسہ اس کے حلق سے اُبھرتی چیخ کو وہیں دبا کر
اسے مٹی میں گندھی، لہو اور پیشاب کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے،
تڑپنے، ڈوبنے، تڑپنے کے لیے،
دلدل سے باہر نکلنے کی جدوجہد کے لیے!

*

سالگرہ کا کیک

اختر جمال

ایک سال ہونے کو آیا مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک قبر کے اندر لیٹی ہوں اس طرح کہ میں بول نہیں سکتی سن نہیں سکتی مگر دیکھ سکتی ہوں — میں دیکھ رہی ہوں —!

میرے جسم پر مٹی کا ڈھیر ہے میری قبر سنگ مرمر کی ہے قبر کے وسط میں کوئی پتھر نہیں صرف گھاس ہے سرسبز گھاس۔ سنگ مرمر کے کتبہ پر تجریدی آرٹ کے ایک ڈیزائن کے ساتھ ساتھ کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈیزائن میری بچی نے اسکول میں اپنی ڈرائنگ کاپی پر بنایا تھا اور اسے پسند تھا! قبر میں آسودگی اور ٹھنڈک ہے۔ میرے آنگ آنگ میں میٹھی نیند اترتی جا رہی ہے اور اس میٹھی نیند نے میرے تمام حواس جکڑ لئے ہیں زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو میرے اندر سما گئی ہے۔

میرا منہ قبلہ کی طرف ہے! اور ایک روشن دریچہ اس طرف کھل گیا ہے جس میں سے چھن چھن کر نور کی پھوار زمین کی گہرائیوں میں اجالا کر رہی ہے۔

قبر وجود کے فانی نقطہ کا آخری نشان ہے! ایک پردہ ہے!! جب تک قید حیات سے رہائی نہ ملے پردے کے دوسری طرف نہیں دیکھا جا سکتا اور جسم کی قید سے نکلنے والے کے لئے پھر کوئی قید باقی نہیں رہتی۔ زمان و مکان کے فاصلے اور وقت ایک اکائی بن جاتے ہیں!

مجھے آسمان میں ہر طرف دروازے ہی دروازے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور ان دروازوں — دراز قد خوب صورت فرشتے قطار در قطار صفیں باندھے محو عبادت نظر آتے ہیں۔ زمین کی بدی، ظلم، ہوس اور خود غرضی کے قدم یہاں نہیں آ سکتے۔ یہاں صرف بے غرضی، سچائی علم اور نیک عمل کا اجر ہے اور وہی لوگ ان دروازوں کے اندر دیکھ سکتے ہیں جو یہ توشہ لائے ہیں۔ جب فرشتوں کو خدا کے نیک بندوں پر سلام بھیجتے دیکھتی ہوں تو میں بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی ہوں!

منکر اور نکیر ابھی کچھ دیر پہلے گئے ہیں جب نیکی رقم کرنے والے فرشتے نے پوچھا تھا تو میں نے کہا تھا نیکی خدا کی دی ہوئی توفیق ہے جسے کر کے بھول جانا چاہیے! جب بدی رقم کرنے والے نے پوچھا تو میں نے کہا تھا گناہ سے بچنا بھی اس کی توفیق تھی۔ ورنہ میں تو اتنی نا سمجھ جاہل اور جلد باز تھی کہ شاید اپنے ملبوس پر چند چھینٹے پڑ جانے کا مجھے پتہ بھی نہ چلتا مگر اس کا شکر ہے اس نے اپنی پناہ میں رکھا اور میری نیت اور میرے عمل کا حال مجھ سے زیادہ میرے رب کو معلوم ہے۔ پھر میں نے کراماً کاتبین کی طرف اشارہ کیا ان سے پوچھو میں نے جھوٹ بھی ضرور بولا ہوگا اور غیبت کے بغیر آدمی محفل میں "بور" کہلاتا ہے۔ لوگوں سے میں نے سدا یہی جملہ سنا کہ "تم کوئی مزیدار اور چٹ پٹی بات نہیں سناتیں —!"

کراماً کاتبین مسکرائے —! پھر بولے ہمیں اس نے لکھنے کی مہلت ہی نہ دی قلم سدا اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ ہمارے سارے

رجسٹر اس نے ہی خود بھر دیئے ہم تو میٹھی نیند سوتے رہے یہی لکھتی رہی ——!

منکر اور نکیر نے کہا پھر اس کے لکھے اوراق ہی حضورِ یزداں میں پیش ہوں گے ——! وہ سب چلے گئے —— اور نور کی پھواری چھوڑ گئے ——!

میں نے اپنی قبر کے اردگرد نظر ڈالی میرے بائیں جانب ایک سترہ سالہ لڑکی کھڑی تھی اس کے ماتھے پر چاند روشن تھا۔ میرے برابر ہی ایک پندرہ سالہ لڑکا کھڑا تھا اس کے ماتھے پر ستارہ تھا سرہانے اور پائنتی دو ننھے ننھے بچے کھڑے تھے اور چاروں یاقوت اور مرجان معلوم ہوتے تھے!

میرے دائیں طرف راستہ ہے۔ جہاں سے آنے والے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ آنے والے قدم جو قرآن کے مقدس اور اُجلے حرفوں کے پھول لاکر چڑھا جاتے ہیں اور ان پھولوں کی بھینی بھینی مہک زمین کی کہرائیوں میں اجالا بن کر پھیل جاتی ہے!

ٹن ٹن ٹن ٹن ..... ٹن ٹن ٹن .....!

گھنٹے کی آواز سے میری سماعت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ جیل کے گھنٹہ کی آواز ہے!

قبر سے میں باہر نکل آتی ہوں پھر پیار سے سنگِ مرمر کو چھوتی ہوں اور دوبارہ کتبہ پڑھتی ہوں۔

اس پر میرا نہیں میری بیٹی کا نام ہے!

تو یہ میرا نہیں اس کا گھر ہے۔ وہ جو ایک برش اور کورے اجلے کاغذ ساتھ لے گئی ہے —— وہ تو کوئی تصویر نہیں بنا پائی تصویر بنانے کی آرزو ساتھ لے گئی ہے اسے اسکیچ بنانا بہت پسند تھا۔ اب وہاں حوریں اسے گھیرے ہوں گی —— جانے سے پہلے کتنی مشق کی تھی ضرور اب سب کاغذوں پر خوب صورت پکچر بنا لیے ہوں گے۔ مگر اپنا اسکیچ کیوں ادھورا چھوڑ گئی ——؟ لیکن ادھورا کہاں، بہت خوب صورت اسکیچ ہے —— اس چہرے پر صرف خوشی ہے! عمر میں اسے TEERS بہت پسند تھے کہا کرتی تھی SWEET TEERS —— اور شاید اس سے آگے سفر کرنے میں غم، کرب، درد، محرومی اور جانے کن کن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے —— اس نے دنیا میں خوشی کی منزل تک ہی سفر کیا ——!

میں قبر کو دوبارہ دیکھتی ہوں تو یہ میرا نہیں اس کا گھر ہے! مگر کیا وہ میرا جسم یہاں چھوڑ کر میری روح بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ساری مٹی مجھے ہر دم اپنے وجود پر کیوں محسوس ہوتی ہے؟

ٹن ٹن ٹن .... جیل کے گھنٹہ کی آواز مجھے یاد دلاتی ہے کہ آج ملاقات کا دن ہے۔ پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ زمین بھی میرے ساتھ قبر سے باہر نکل آئی ہے۔ اتنا خوب صورت لباس کہ میں ٹھٹک کر اسے دیکھتی ہوں وہی خوب صورت چہرہ —— اور چمکدار بڑی بڑی آنکھیں اور بیحد خوب صورت اسٹائل سے بنائے ہوئے بال —— وہ مجھے یاد دلاتی ہے۔ "امی آج بھائی کی سالگرہ ہے! آج تو آپ کو اس کے لئے کیک لے کر جیل جانا ہے ——!"

بھائی کی سالگرہ وہ کتنی خوشی خوشی مناتی تھی۔ جب بھائی پڑھنے دور دیسوں میں گیا تھا تو اس کی غیر حاضری میں کیک اپنے ہاتھ

سے کاٹ کر تقسیم کرتی۔ اس کے ہونٹوں پہ بھائی کے لیے دعائیں ہوتیں اور آنکھیں دور دیس میں اس کا اس کے دوستوں کے ساتھ تصور کرتیں اور وہ مجھے دلاسا دیتی اور کہتی "وہ تو کنیڈا میں اپنے دوستوں کے ساتھ سالگرہ منا رہا ہے اور شاندار کیک اڑا رہا ہے"

"تمہیں کیا پتہ ——؟"

"امی وہ اتنا اچھا ہے اس کے دوست ضرور اس کی سالگرہ پہ اچھے تحفے لاتے ہوں گے۔ اسے بہت پیار ملتا ہوگا"

میں اس کے ساتھ ساتھ تصور میں چل پڑتی —— جہاں وہ رہتے جاتی!

"امی بہت اچھا سا کیک لے کر جائیے گا"

"تم نہیں چلو گی میرے ساتھ ——"

"امی ہم جدا تو نہیں ہیں۔ بس میرے اور آپ کے درمیان آپ کے فانی لباس کا پردہ حائل ہے۔ جب آپ یہ بوجھل ڈھیر الگ کر دیتی ہیں تو میرے پاس آجاتی ہیں"۔ وہ میرے آنسو پونچھتی ہے مگر آنسو پونچھنے والے ہاتھ میرے اپنے ہیں۔ وہ بھی تو میری اپنی تھی۔ میرے جسد کا حصہ —! میرے دل کا ٹکڑا ——!

اس لمحہ میرا دل اپنے دوسرے ٹکڑے کے لیے تڑپتا ہے!

ٹن ٹن ٹن —! مجھے گھنٹے کی آواز پھر سنائی دے رہی ہے اور میں سوچتی ہوں۔ ملاقات کا وقت ختم نہ ہو جائے!

تیز بارش شروع ہو گئی! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آسمان میرے آنسوؤں سے اتنا بیقرار ہو جائے گا۔ میں اپنے اردگرد پھیلے ہوئے سنگ دل پہاڑوں کو دیکھتی ہوں —! وہ بالکل چپ سادھے ہیں پھر میں اپنے آنسو پونچھ کر آسمان کو چپ کرانے کی کوشش کرتی ہوں مگر آسمان کے موٹے موٹے آنسو مجھے بھگو دیتے ہیں۔

میں قبرستان سے نکلتے وقت یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں زندوں کی اس بستی میں ہوں جہاں اس زندگی سے اعلیٰ اور ارفع زندگی ہے جو بقا کی وہ منزل ہے جو صرف فنا کی منزل چھوڑ کر ہی حاصل ہوتی ہے! میں بڑے ادب سے محترم اور مکرم لوگوں کے درمیان سے نکل آتی ہوں ——!

قبرستان سے باہر آکر لگتا ہے کہ لاشوں کے شہر میں آگئی!

بے ضمیری، بے حسی، ظلم، بدی، نفسانفسی۔ کوئی کسی کو نہیں جانتا یا نہیں جاننا چاہتا —— ہر آدمی صرف اپنے پیٹ کو جانتا ہے ——! اور ہر طرف بڑے بڑے پیٹوں والے لوگ ہیں ——!

مجھے لگتا ہے میں اتنی چھوٹی سی چیونٹی ہوں اگر سنبھل کر نہیں چلی تو کوئی مجھے روند کر گذر جائے گا۔ دھکم پیل میں بانات سے باہر آتی ہوں!

گھر آکر ٹوکری میں کپڑے کتابیں کھانے کی چیزیں اور کیک کا ڈبہ سنبھال کر رکھتی ہوں! پہلی دفعہ اٹھاتی ہوں تو ٹوکری بھاری لگتی ہے —— رکھ دیتی ہوں دوسری دفعہ اٹھاتی ہوں تو ہلکی لگتی ہے۔

"امی آپ کی گردن میں درد رہتا ہے مجھے دیجئے"۔ وہ مجھے بوجھ نہیں اٹھانے دیتی تھی شاید ٹوکری اب اس نے پکڑی ہے جو

بوجھ مجھے محسوس نہیں ہو رہا عجیب بات ہے ہاتھ میرا ہی ہے اور بوجھ وہ اٹھائے ہے۔ میں اسے سینکڑوں دعائیں دیتی ہوں۔ زمین والے آسمان والوں کو صرف دعائیں ہی دے سکتے ہیں۔

تنگ کوٹھری میں جب ملاقاتی جمع ہو جاتے ہیں تو اُسے باہر سے تالا ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر دوسری جانب سلاخوں کے پیچھے قیدی اور حوالاتی لائے جاتے ہیں چھوٹی سی تنگ کوٹھری میں قسم قسم کے گھٹیا سگریٹوں کا دھواں بھرا ہوتا ہے ملاقاتیوں کی بھیڑ میں اگر چند لوگ بھی سگریٹ پیتے ہیں تو ان کا دھواں سب کی آنکھوں اور حلق میں دھنسنے لگتا ہے۔ میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ حلق میں محسوس کی اور آنکھوں سے پانی صاف کرنے لگی۔ گیلی لکڑیاں نظر نہیں آ رہی ہیں مگر جیسے ہر وجود ایک گیلی لکڑی ہے۔

ملاقاتیوں میں چند برقع پوش عورتیں بہت سے مرد بچے اور بچیاں شامل تھے۔ میں لکڑی کی بنچ پہ ایک طرف ٹوکری لے کر بیٹھ گئی اور اپنے بیٹے کا انتظار کرنے لگی۔

میرے سامنے سلاخوں کی دوسری جانب ایک انیس سالہ لڑکا ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے کھڑا تھا اس کی آنکھوں میں چراغوں کی جوت تھی ان آنکھوں سے اس کی بوڑھی ماں اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں کی شمعیں منور کرنے آئی ہے۔ ماں کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔

اس کے قریب ایک قیدی جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ تھیں اپنے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالتے اپنی چار سالہ ننھی بچی کو ہاتھوں پر اٹھائے کھڑا تھا بچی نے اپنا ننھا سا خوب صورت چہرہ سلاخوں سے لگا رکھا تھا۔ اور سلاخوں کے دوسری جانب اس کے باپ کے ہونٹ تھے۔ وہ اسے شدت سے چوم رہا تھا۔ "میری بیٹی کو تکلیف نہ ہونے دینا۔ اس کا دودھ بند نہ کرنا سنا ہے ڈبے مہنگے ہو گئے؟" وہ اندر سے چند نوٹ پکڑاتا ہے۔

"نہیں نہیں یہ جیل کا بھتہ تم اپنے پاس رکھو ہمارا اللہ مالک ہے۔"

وہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک دس کا نوٹ تھما دیتا ہے اور کہتا ہے "اللہ ہی مالک ہے۔ دس روپے میں کیا آتا ہے"

ایک پچیس سالہ خوب صورت لڑکی برقع کے نقاب کو ہٹا کر آنے والوں میں بار بار کوئی چہرہ ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کے قریب کھڑی ہوئی عورت اس کی ماں یا ساس ہو گی وہ اسے دلاسہ دیتی ہے۔ "آتا ہی ہو گا"

میں نے پوچھا "آپ کی بیٹی ہے؟"

وہ عورت بولی "بیٹی ہی سمجھو بہو ہے۔ ایک ماہ شادی کو ہوا۔ اور اس کے خاوند کو چودہ سال کی سزا ہو گئی"

"اوہ ——؟"

ساس پھر کہتی ہے "ابھی اس نے گھر والوں سے گھونگھٹ بھی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ یہاں چلا آیا ہمارے ہاں سال بھر دلہن کوئی کام نہیں کرتی مگر اب یہ بیچاری ماری ماری پھر رہی ہے آج اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا ہے"

میں نے کونے میں ایک چھوٹا سا ناشتہ دان رکھا دیکھا۔ نئی نویلی دلہن کی پلکیں نم تھیں اور ہونٹوں پر بھی آنسوؤں کے قطرے تھے —— وہ بولی مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسے کیا پسند اور کیا ناپسند ہے —— کیا چیز شوق سے کھاتا ہے۔ کیسے رنگ پسند کرتا ہے اور

عادت مزاج کیسا ہے۔"

پہلے تو میں کیوں؟ کیسے؟ اور کیا ہوا تھا ——؟ کے سوالات لوگوں سے کر لیا کرتی تھی مگر اب یہ سوال مجھے غیر اہم لگنے لگا ہے بس سب کسی نہ کسی طرح یہاں ہیں۔

اچانک دھوئیں سے بھری وہ تنگ کوٹھری ایک کشتی بن گئی۔ چاروں طرف سمندر کی شور مچاتی موجیں اور طوفان کا مہیب شور سنائی دینے لگا۔ میں نے سالگرہ کا کیک حفاظت سے پکڑ لیا اور اپنی پوری قوت سے اپنا سر اور ہاتھ بلند رکھا۔ ! میں نئی نویلی دلہن کو دیکھنے لگی اس نے بھی ناشتے دان ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور سر اونچا اٹھائے تھی۔ سب لوگوں نے چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں سروں کے اوپر رکھ لیں ——!

مجھے اپنا بیٹا نظر آیا اس نے سلاخوں کے پاس آ کر پوچھا "امی کیسی ہیں؟ ابو کیسے ہیں؟ ہم دونوں نے جواب میں ہاتھ ہلائے۔ وہ بولا اتنی بارش میں آپ لوگ کیوں آئے پھر کسی دن آ جاتے ——"

"آج تمہاری سالگرہ ہے نا ——"

"جیل میں کیسی سالگرہ ——"

میں کیک کا ڈبہ اسے پکڑاتی ہوں اور اس کی صحت اور سلامتی کی دعائیں کرتی ہوں۔ اس لمحہ مجھے وقت کے پُرشور سمندر میں خوبصورت لمحوں کی شمعیں روشن نظر آئیں ——!

اس نے ڈبہ کھول کر ہماری طرف بڑھایا "آپ بھی چکھئے" جب میں نے ننھا سا ٹکڑا منہ میں رکھا تو مجھے وہ نمکین معلوم ہوا۔

ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ "خدا حافظ" کی آوازیں بار بار سنائی دے رہی تھیں۔ خدا حافظ!

میں تالا کھلنے پر ملاقاتیوں کے ساتھ باہر نکل آئی اور سامنے کھڑے ہوئے سپاہی نے جس کے ہاتھ میں بندوق تھی مجھے شناختی کارڈ واپس کیا۔

شناختی کارڈ ہاتھ میں لے کر میں نے سوچا یہاں میری کوئی شناخت نہیں ہے۔ ایک استاد کی حیثیت سے میں اپنی شناخت کالج کی چہار دیواری میں چھوڑ آئی ہوں اور لکھنے والی کی حیثیت یہاں بیکار ہے۔ یہاں میں صرف ایک حوالاتی کی ماں ہوں اور تیرے ساتھ جو عورتیں کھڑی ہیں وہ بھی مائیں ہیں اور یہ حیثیت ہی مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے۔ میرا ایک نہیں بہت سے وجود ہیں بہت سے دل ہیں اور سب دل پھوڑے کی طرح پک رہے ہیں۔ ! کوئی غیبی طاقت سنبھال لیتی ہے اور کہتی ہے تم اپنے رب کے سامنے ہو۔

اور اس وقت مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اس بچے کی طرح ہوں جسے ماں اپنی کوکھ میں اٹھائے پھرتی ہے اور بچے کو نہیں معلوم کہ ماں کہاں لے جا رہی ہے —— ! بالکل اسی طرح کشتی اور طوفان میں مجھے زمین اور آسمان کی گولائی ایک بڑی سی کوکھ معلوم ہو رہی تھی۔

تنگ کوٹھری سے باہر آ کر میں نے اپنے میاں سے پوچھا "کیک نمکین کیوں تھا"

"نہیں تو کیک تو بالکل میٹھا تھا"

تب اس لمحہ مجھ پر یہ بات آشکارہ ہوئی کہ میری نم آنکھیں جو آنسو محترم سمجھ کر گرنے نہیں دیتیں وہ سارے آنسو میرے حلق کو سدا نمکین رکھتے ہیں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ نمک سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے مگر اب انہیں یہ کیسے سمجھایا جائے کہ یہ نمک بہت قیمتی ہے۔ انمول ہے! یہ کسی زمین سے نہیں دل کی کان سے نکلتا ہے۔

جیل کے آہنی پھاٹک سے باہر آ کر یوں محسوس ہوا جیسے سلاخیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں اور زیادہ بڑی ہو گئی ہیں۔ !

دل کا نوحہ

سائرہ ہاشمی

جیراں میراثن مرگئی ——

زینا روتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور مجھ سے اجازت لے کر چلی گئی ——

"جیراں میراثن مرگئی ——" میں چپ چاپ اپنے پلنگ پر بیٹھی کھڑکی سے باہر لان میں دیکھنے لگی۔ عشق پیچاں کی بیل لان کی دیوار سے دور تک چمٹی ہوئی تھی اور اس کے پھولوں پر شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور لان میں کھلے پھول مٹی کی گرم ہوا میں مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔

عشق پیچاں کے پھول، شہد کی مکھیاں، گرم ہوا، اور جیراں میراثن۔ کیا ان سب میں کوئی مناسبت تھی —— مجھے جیراں کے ساتھ ان سب چیزوں کا ایک تعلق سا کیوں لگ رہا ہے —— میں اُس کے بارے میں سوچ رہی تھی، جیراں مرگئی اور اُس کے ساتھ وہ آواز بھی تھم گئی جو سال میں کئی راتوں ہماری بستی کے گھروں سے اُٹھ کر سیاہی میں ملتی فضاؤں میں ڈولتی رہتی تھی —— بستی کے لوگ اُس کی آواز کے عاشق تھے اور کسی گھر کی خوشی کی محفل اس کی موجودگی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔

پچیس برس پہلے اپنے پہلوٹھی کے بچے کی پیدائش پر مَیں نے اُسے دیکھا تھا —— اور اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ شاید وہ نیلی بار کی خوب صورت ترین عورت تھی۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس اُس کا لانبا قد، سیاہ چمکیلے بال، روشن بڑی بڑی آنکھیں، گیہواں رنگ، خوب صورت ترین ہونٹ اور سفید دانت —— اُس کے کھڑے ہونے کے انداز میں ایک وقار تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ایک میراثن تھی —— امیر لوگوں کے بیٹوں کی ودھائیاں اور مبارکیں گانے والی کمین عورت، دوسروں کی خیرات پہ پلنے والی!

میری حویلی کے باہر کے بڑے بڑے لان مبارکباد دینے والوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ ڈھول بجاتے، دھمالیں ڈالتے، گروہ در گروہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کے پوتے کی پیدائش پر خوشیاں منا رہے تھے۔ گیندے اور گلاب کے پھولوں کے ہاروں کی باس سے بھری ہوا۔ رشتہ دار عورتیں اندر باہر پھرتی کام کرتی کاہیاں اور صحن میں اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ مبارکبادیوں کے گیت گاتی جیراں —— جیراں جس کو دیکھ کر نامعلوم طور پر دل خائف ہوجاتا ہے —— عورتیں بڑے آنگن میں بیٹھی جیراں کی آواز سے مسحور ہوکر بڑھ بڑھ کر ویلیں دے رہی تھیں —— اور میں اندر لیٹی اُس کے حُسن اور آواز دونوں کے بارے میں سوچ رہی تھی —— یہ آواز بھی تو ہماری خوشی کا ایک رُوپ تھی

لیکن وہ تو دلوں پر حکومت کر سکتی ہے پھر وہ کیوں بیٹھی ڈھولکی بجاتی ہمارے معاشرے کی ایک معمولی عورت تھی ——— قسمت کے اندھے ہاتھ ——— پورے آٹھ دن میرا آنگن ڈھولکی کی تھاپ، جیراں کی آواز اور کھانے کی مہک سے بھرا رہا ——— میرا جی چاہتا وہ گاتی رہے اور میں سنتی رہوں ——— شاید میں بیٹے کی پیدائش پر بہت خوش تھی۔ آہستہ آہستہ سب کچھ ایک یکسانیت میں ڈھل گیا۔ خوشیوں کے کئی روپ تھے جن میں ڈوب کر میں جیراں کی آواز کو بھول گئی۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا رات کو جب تارے آسمان کی پہنائیوں میں چمکتے۔ میرا بیٹا سو رہا ہوتا اور جھینگروں کی تیز آوازیں وسیع لان سے اٹھ کر دروازے کی چوکھٹ کے اندر کسی درز میں بولتے جھینگر کی آواز سے ملتی ہوئی اندر آنے لگتیں تو سونا مشکل ہو جاتا ——— دل فضل داد کی دوری کو شدت سے محسوس کرتا ——— تب میرا جی چاہتا اگر اس وقت جیراں کوئی گیت گا رہی ہوتی تو شاید میرے جذبات کو آواز مل جاتی۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگتا تھا کہ اس کی آواز محض اس کے لبوں سے ادا ہوتے لفظ ہی نہیں، اس کے دل کے اندر سے اٹھتی ایسی لے ہے جو بہت سی سچائیوں سے مل کر بنتی ہے، محبتوں میں گوندھی گئی ہے ——— چاہتوں سے سنواری گئی ہے ——— یا شاید اس کے پیشے نے اس کو بہت ہی مکمل کر دیا تھا ——— لیکن پھر بھی وہ ہماری بستی کی ایک میراثن تھی، اور لوگ کہتے کہ گاؤں کے آدھے سے زیادہ مرد اس پر مرتے ہیں ———

فضل داد کو زمینوں پر گئے کتنے دن ہو چکے تھے ——— میرا دل پریشان تھا ——— میں نے ایک خادمہ کے ہاتھ جیراں کو بلا بھیجا ——— جیراں آ گئی۔ میرے پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا:

"بی بی جی! دوسرے بیٹے کے آنے کی خبر تو گاؤں میں نہیں پھیلی، پھر آپ نے مجھے کیوں بلوا بھیجا ہے۔" اس کا جوان سراپا لَو دیتا لگ رہا تھا۔

میں ہنسی "جیراں! مجھے کچھ گا کر تو سناؤ، بڑے دن ہو گئے ہیں تیری آواز سنے۔" میں ہمیشہ کی طرح اس کے سراپا کی خوبصورتی کو سراہتے ہوئے بولی۔ اس کا حسن جو سیاہ کپڑوں میں کچھ اور بھی اجاگر ہو جاتا تھا۔

"نہیں بی بی! میری آواز اتنی اچھی تو نہیں۔ آپ کی مہربانی ہے جو ہم غریبوں کو آپ جیسے اونچے لوگ یاد کر لیتے ہیں۔ اللہ نے آپ کے دروازوں سے ہی ہماری روزی جو لکھی ہے ——— لیکن میں ڈھولکی تو لائی ہی نہیں" ———

میں نے کہا: "جیراں! ایسا گیت گاؤ جو تمہارے جی کو سب سے اچھا لگتا ہو جیسے تمہارے جی کے اندر سے اٹھا ہو۔ ایسا گیت جو محبت کرنے والی تمہارے جیسی جوان لڑکی گاتی ہو ———" وہ سر جھکا کر ہنسی "ایسا گیت بی بی جی! آپ کیوں سننا چاہتی ہیں؛ جیتے رہیں آپ کے سر کے سائیں ——— آپ کی زندگی جیسی سکھی سب کی زندگی ہو"۔ اور اس کی آنکھیں کسی اندرونی سوچ سے روشن ہو گئیں۔ جیسے کسی خوشگوار یاد نے اسے اجلا دیا ہو۔

اور پھر وہ ہولے ہولے گیت گانے لگی ——— محبت میں ڈوبے ہوئے لوک گیت ——— گھوڑوں پر سوار خوب صورت جوانوں کی محبتوں کے گیت ——— انتظار کرتی دوشیزاؤں کے فراق کی آہوں سے زخمی گیت ——— چاند میرے کمرے کے دروازے سے جھانک رہا تھا اور مجھے فضل داد یاد آ رہا تھا۔ "نہ جانے مرد اپنی وسیع دنیا میں

گھرے اُس عورت کو کتنا یاد کرتے ہیں جن کی ساری کائنات اُن کی اکیلی ذات ہوتی ہے" ——— میں لان میں کھلے بادام کے گلابی پھولوں کو دیکھ رہی تھی جو ہوا سے ہل رہے تھے ——— اور جیراں کے گیتوں کے بول بھی شاید اندر باہر گھومتی ہوا کے ساتھ اڑتے پھر رہے تھے ——— پھر جیراں نے آخری گیت گایا اور اپنا سر گھٹنوں میں دے کر چپ چاپ بیٹھ گئی ——— میرا دل اُس کے گیتوں کی خوب صورتی اور انتظار کے کرب سے بوجھل ہو رہا تھا ——— شاید کوئی سسک رہا تھا۔ نہ جانے ہوا کسی پودے میں اُلجھی ہوک رہی تھی یا میرے ہی دل کی آواز تھی۔ میں خیالوں سے چونکی۔ جیراں کا وجود سسکیوں سے ہل رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھی وہ رو رہی تھی۔

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ——— اُس نے سر اُوپر اٹھایا۔ ہنڈولے کی روشنی میں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس کی آواز کے اندر درد کی سچائی اُس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ وہ میری ہم عمر ہی ہوگی یا شاید اس سے دو تین سال بڑی تھی ———

"بی بی! آپ نے کہا تھا نا محبت کرنے والی اپنے جیسی لڑکی کا گیت گاؤں۔ اور محبت تو ایک عذاب ہے، ایک بوجھ ہے ——— دل کتنا بھاری ہو جاتا ہے قابو میں ہی نہیں آتا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا: "جیراں بیٹھ جاؤ۔ تم تو اتنی خوب صورت ہو کہ کوئی بھی مرد تمھارے اشاروں پر ناچ سکتا ہے ——— تم جیسے چہرے کو دیکھ کر تو خدا یاد آتا ہے۔ تمھاری آنکھوں میں یہ آنسو جچتے نہیں۔ لوگ تو کہتے ہیں گاؤں کے سارے مرد تم پر عاشق ہیں۔"

وہ بے بسی سے ہنسی "بس بی بی! چہرہ ہی اگر قسمت ہوتا تو اور بات تھی۔ لیکن یہ سینے میں دل اُس نے کچھ اُلٹا ہی ڈال دیا ہے۔ بی بی جی! نور دین بھی یہی کہتا ہے، کہتا ہے جیراں! تم گاؤں کی سب سے بانکی عورت ہو، لیکن کیا کروں میں دل کو مجبور نہیں کر سکتا، مجھے صرف فاطمہ پسند ہے۔" اور وہ پھر رونے لگی، وہ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور نظر آ رہی تھی۔

فاطمہ کا نام سُن کر میں حیران رہ گئی ——— فاطمہ اور جیراں کا کیا مقابلہ ——— لیکن وہ اس سے مات کھا رہی تھی بدقسمتی شاید اسی کو کہتے ہیں۔

آہستہ آہستہ اُس کی چاہت کا قصّہ بستی کی گلیوں میں سب کی زبان پر سنائی دینے لگا ——— لوگوں کی شادیوں پر، بیٹوں کی پیدائش پر اُنھیں کے گیتوں کے بول سب سے اُونچے اُٹھتے ——— دیگیں پکاتا رحمان نائی کا بیٹا نور دین اُس کے گیت میں چھپے پیغام کو سُنتا تو ہنس پڑتا۔ اُس کے دوست اُسے چھیڑتے لیکن وہ لاپروائی سے سر جھٹک کر کہتا "اگر مجھے چھیڑنا ہی ہے تو فاطمہ کے نام سے چھیڑو، جیراں سے میرا کیا واسطہ! وہ تو خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرتی پھر رہی ہے۔"

"جلتی ہو گئی ہے۔ بی بی جی! کیسا اُلٹا رواج ہے۔ لوگ جیراں کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں اور وہ ہے کہ نور دین کی

لاپروائی پر مرمٹی ہے، سونے جیسی چند کو خاک کر رہی ہے۔ یہ عشق بھی کیا کیا رُوپ دھارتا ہے۔" نوراں رات کو میرے پاؤں دباتے ہوئے بتانے لگی۔

میں نے کہا: "نوراں! بستی میں جیراں پر تو بڑے اچھے اچھے مرد فدا ہوں گے۔" میرے اندر عورتوں کا فطری تجسس جاگ رہا تھا۔

"وہ تو ہے ہی اس قابل جی! اس پر تو عورتیں بھی فدا ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اُسے گانے کے لیے بلا بھیجتی ہیں۔ پیسوں سے اس کے سامنے بچھی دری کو بھر دیتی ہیں۔" نوراں کی آواز میں اپنی قسمت پر اَن کہا گلا تھا۔

"کون؟ کون ہیں وہ مرد؟ بھلا بتاؤ تو سہی۔"

"جی، ایک تو وہ بڑی حویلی والوں کا بڑا لڑکا احمد علی ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ آئے دن جو شہر کی پڑھائی چھوڑ کر آجاتا ہے تو اس کا جی جیراں پر آیا ہوا ہے ——— لیکن جیراں اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔ اور ساتھ والے گاؤں کا نمبردار رشید راٹھور ہے ——— جی اور نہ جانے کون کون ہیں ——— نوراں کی آواز میں بیزاری سی تھی ——— جی وہ بھی تو گیت گاتے ہوئے مسکرا مسکرا کر مردوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے، میراثن جو ہوئی جی۔"

ایک روز جب فضل داد ہمیشہ کی طرح زمینوں پر گیا ہُوا تھا اور ساری حویلی انسانوں سے بھری ہونے کے باوجود مجھے تنہائی کا عجیب سا احساس پریشان کر رہا تھا کہ جیراں اندر آکر خاموشی سے میرے پاس بیٹھ گئی۔

میں نے کہا: "جیراں! اچھا کیا تم چلی آئیں ——— میرا دل نہ جانے کیوں تمہارے گیت سننے کو چاہ رہا تھا ——— تم مجھے یاد آرہی تھیں ———"

وہ بیٹھی مجھے دیکھتی رہی، کچھ دیر بعد بولی: "بی بی! کیا آپ نے کبھی معلوم کیا ہے کہ آپ کے سائیں کہاں جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

میں ہنس پڑی "بھلا مردوں کے کام کا کون حساب رکھ سکتا ہے۔ اور پھر میں ان کے ساتھ تو نہیں پھرتی ——— بھلا میں کیا جانوں!"

"نہ بی بی ——— کھوج رکھنی چاہیے ——— گھر والا اتنی بے وقعت چیز تو نہیں ہوتا!" اس کی آواز میں فکر سا تھا۔ میرے دل میں شک سا اُبھرا۔ جیراں کوئی ایسی بات جانتی تھی جو اچھی نہ تھی ——— میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"جیراں! بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟ ——— پریشان نہ کرو۔" میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی

اُس نے اپنے لاچے کا پلّو کھول کر نوٹوں کی ایک گڈی اپنے سامنے زمین پر ڈال دی "یہ آپ کے سائیں نے میری قیمت بھیجی ہے جی!"

اور مجھے لگا جیسے کوئی چیز میرے پیٹ کے اندر ہی اندر گرتی جا رہی ہو۔ میں اگر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی تو وہ یقیناً سفید نظر آتا۔ مجھے اپنے گرد سب چیزیں گھومتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ میرا جی چاہا میں کہوں کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

لیکن میں اُس کی آواز اور آنکھوں کی سچائی جھٹلا نہیں سکتی تھی ——— میں اُسے کیا کہتی۔

"بی بی! اِس میں میرا کوئی قصور نہیں، آپ جانتی ہیں میں گھر گھر جا کر گانے والی ہوں ——— مردوں کی نظریں پہچانتی ہوں۔ لیکن میں نے تو اپنا آپ نوردین کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے ——— نوردین جو کسی نہ کسی روز تو میرا سائیں بنے گا" اور وہ روپے وہیں چھوڑ کر کھڑی ہو گئی "بی بی! میں بکاؤ مال نہیں ہوں، اگر بکنا چاہوں تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پاؤں۔"

"جیراں مت جاؤ۔" میرا دل چاہا میں اُس کے کندھے پر سر رکھ کر زور زور سے روؤں، لیکن ساری برادری میں مجھے اپنی آن کی حفاظت کرنی تھی، میں ایک عام عورت کی طرح آنسو نہیں بہا سکتی تھی۔ میں اپنا بھرم گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

"بی بی! آپ مجھے معاف کر دیں، کوئی اور ہوتا تو میں شاید اُس کو بازار میں کھڑے ہو کر بدنام کرتی یا گالیاں دیتی۔ لیکن زیب بی بی! وہ آپ کے سائیں ہیں، اور آپ تو مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں!"

اور وہ چلی گئی ——— غصّے سے بھری ہوئی ——— خود اعتمادی سے قدم رکھتی ہوئی ———

میں اُس بڑے کمرے میں یوں کھڑی تھی جیسے آسمان سے زمین کی تہوں میں مسلسل گرتی جا رہی ہوں ——— جیراں مجھے برباد بھی کر سکتی تھی۔ میرے اعتماد کو دھوکا بھی دے سکتی تھی۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا تھا ——— لیکن فضل داد ——— میرا پہلا بچہ تو ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا تھا ——— لیکن کچھ دیر بعد میں بے بسی سے بیٹھ گئی۔ امیر زمینداروں کی عادات، مجھے کبھی نہ کبھی تو اس حادثے سے دوچار ہونا ہی تھا۔ ہمارے باپ دادا، بھائی، بہنوئی سب اپنی اپنی بیویوں کے دلوں پر پاؤں رکھتے گزرتے رہے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔ میں کوئی خاص تو نہ تھی۔ اور شاید میں اِس حادثے کی منتظر بھی تھی۔ یہ سب کچھ ہماری قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ اس رات کہیں بستی کے کسی گھر میں شادی تھی، جیراں اور اُس کی ساتھیوں کی آواز ہمیشہ کی طرح رات کی سیاہی میں مل کر اندھیری راہوں پر سرپٹک رہی تھی۔ آج پہلی بار وہ آواز میرے دل میں نہیں اُتری تھی ——— کیوں ——— حالانکہ اس کا کوئی قصور نہ تھا ——— لیکن مجھے اُس سے خوف آنے لگا تھا۔ اگلے روز فضل داد آیا تو اس کے رویّے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں تھی۔ لیکن جب وہ رات بڑے کمرے میں آیا تو میں نے نوٹوں کی گڈی اس کے سامنے رکھ دی اور کہا:

"تمھارے روپے جیراں واپس کر گئی ہے۔ کہتی تھی مجھے صرف نوردین کے روپے خرید سکتے ہیں۔"

فضل داد نے روپوں کو دیکھا اور ایک لفظ کہے بغیر باہر جانے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن پھر فضل داد نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا:

"زیب! مرد ایسی غلطیاں کرتے ہی رہتے ہیں، بیویوں کو دل بڑا رکھنا چاہیے، یہ صرف طبیعت کی موج ہی ہے، موجیں اترتی چڑھتی رہتی ہیں، تمھاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

اور میں جانتی تھی میرے دل پر ایسے نہ جانے کتنے چرکے لگیں گے۔ مجھے خاندان کی دوسری عورتوں کی طرح اپنے دل کو بڑا کرنا ہی پڑے گا۔ اور میں نے فضل داد کو معاف کر دیا، حالانکہ اس نے مجھ سے معافی نہیں مانگی تھی۔

ہم امیر زمینداروں کی امیر عورتیں ——— میں طنز سے ہنس پڑی اور آنسو پونچھ لیے۔

"بی بی! نوردین نے جیراں سے شادی کر لی ——— معلوم نہیں یہ سب کچھ کیسے ہوگیا حالانکہ وہ تو فاطمہ کا عاشق تھا، اُس کا تو بڑا جی تھا فاطمہ پر۔" نوراں نے ایک روز آکر مجھے اطلاع دی، وہ حیران ہو رہی تھی۔

جیراں اور نوردین ——— جیراں کے سامنے تو کوئی بات بھی ناممکن نہیں تھی ——— اُسے تو جیتنا ہی تھا ——— میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی ——— کچھ دنوں بستی کی فضا خاموش رہی ——— شاید شادی رچانے کا کوئی ہنگامہ نہیں تھا یا جیراں نے شادی کے بعد گانا چھوڑ دیا تھا۔ ایسے لگتا جیسے بستی کی راتیں زیادہ سیاہ اور اُجاڑ ہوگئی ہوں ——— میں اکثر اُس آواز کی کمی بڑی شدت سے محسوس کرتی لیکن پھر نوٹوں کی گڈی کہیں سے آکر میرے خیالوں میں اٹک جاتی اور میرا اپنے آپ پر سارا مان مٹی میں مل جاتا ——— میں فضل داد یا جیراں سے ناراض نہیں تھی۔ لیکن ایسے لگتا جیسے میرا کچھ کھو گیا ہو، جو ہزار ڈھونڈنے پر بھی نہ ملتا ——— خوبصورت کپڑوں کے ڈھیر، زیوروں کے نت نئے ڈیزائن، وسیع برادری میں ملنا ملانا ——— یہ سب کچھ اس کے اندر اُٹھتی ہلکی سی ٹیس کے مقابلے میں بڑا بے وقعت لگتا ——— ہم عورتیں صرف جیتی ہیں، نہ ہی عشق کرتی ہیں نہ عشق کا اظہار، خواہ وہ شوہر سے ہی کیوں نہ ہو۔

"سلام بی بی!"

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا، جیراں کھڑی تھی نئے رنگین کپڑوں میں کھلکھلاتی ہوئی۔ رنگین چوڑے سے کہنیوں تک بازو ڈھکے ہوئے تھے۔ چاندی کی ہنسلی، پاؤں میں پازیب اور کانوں میں سونے کی بالیاں ——— اُس کے چہرے پر ایک روشنی سی تھی جو اُس کی جلد سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ بیحد خوش تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھو لیے۔ "بی بی! میں آپ کے پاس آنے سے ڈر رہی تھی، معلوم نہیں آپ کو میرا آنا اچھا لگے یا نہ لگے ——— لیکن بی بی! اب تو ڈر کی کوئی بات نہیں، عورت جب کسی مرد سے بندھ جائے تو وہ باقی سب کے لیے بے ضرر ہو جاتی ہے کیونکہ اُسے دوسرا کوئی نظر ہی نہیں آتا۔" اور وہ زور سے ہنس پڑی بے اختیار ہو کر۔

"لیکن مجھے تو تم پہلے سے بھی زیادہ خطرناک لگ رہی ہو۔" میں نے اُسے چھیڑا

وہ سر جھکا کر ہولے سے ہنسی اور بولی:

"بی بی! خدا بھی کبھی کبھی مذاق کرتا ہے، جیسے میرے ساتھ ——— بھلا مجھے ایسا بنانے کی کیا ضرورت تھی! غریب کی بیوی، صورت بھی غریب ہی دیتا تو آسانی رہتی۔"

"لیکن میں نے تو سنا تھا نوردین تو راضی نہ تھا۔"

"ہاں بی بی! لیکن میرے بھاگ تھے۔ فاطمہ کے باپ نے اُس سے اتنا زیادہ روپیہ مانگا تھا جو وہ دے نہیں سکتا تھا، چاہے ساری عمر جمع کرتا رہتا ——— اور بی بی! میں تو بے مول بک گئی ہوں، میرے باپ نے بھی نوردین سے دو ہزار مانگا تھا، لیکن میں اڑ گئی، میں نے کہا ساری عمر میں نے بڑا کما کر دیا ہے، اگر میرے بدلے

میں روپیہ لیا تو میں زہر کھالوں گی۔ میرا باپ ڈر گیا، جی!" اور وہ پھر ہنسنے لگی
"نوردین کیسا سلوک کرتا ہے تمھارے ساتھ؟"
مجھے جیراں کی بے وقعتی اچھی نہیں لگی تھی۔ اُس کے معاشرے میں بے قسمت عورت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔
وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ اُس کی خوب صورت آنکھیں دھندلا گئی تھیں "ابھی تک تو وہ فاطمہ کو پوری طرح بھولا نہیں، لیکن کبھی نہ کبھی تو وہ اس کے من سے اُترے گی، اور پھر نوردین کہیں نہ جاسکے گا' جی! اُس کی آواز میں انتظار کا کرب اور امید کی روشنی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے چُپ ہوگئی۔ میں نے کہا:
"جیراں! آج مجھے گانا نہ سناؤ گی؟ کتنے دن ہو گئے ہیں تمھاری آواز سُنے، اب تو تمھاری لَے اور بھی سُریلی ہوگئی ہوگی!"
اور اس نے میری بات کا جواب دیے بغیر دھیمے سُروں میں گانا شروع کر دیا۔ اور مجھے لگا جیسے میرا اور اس کا دل بھاری ہوکر ہمارے سینوں میں لٹک گیا ہو، جیسے ہم دونوں ہاتھ پکڑے کھیتوں کی ہریاول پر، بہتی ندیوں پر، درختوں کی ٹونگیا چھاؤں تلے کسی چیز کی کھوج میں بھٹک رہی ہوں ——— دو عورتیں ——— شاید کوئی کمی تھی ہمارے اندر جو ہمیں دُکھ دے رہی تھی۔
اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، دُکھ سے گدلائے ہوئے۔ مایوسی میں ڈوبے ہوئے۔ اور پھر اس کی لَے ایک سسکی میں ڈوب گئی ——— وہ رو رہی تھی، ہولے ہولے بین کر رہی تھی ——— اور مجھے لگا جیسے اُس کا گایا ہوا گیت بھی رو رہا ہو ——— اور میں بھی رو رہی ہوں اور یہ ساری کائنات۔ وہ کہہ رہی تھی:
"اے میرے ماہی! تیری آنکھیں مجھے کیوں نہیں دیکھتیں۔ تُو اُس کو کیوں یاد کرتا ہے جو تیری نہیں۔ میں نے اپنا تن من تجھ پر وار دیا۔ میں تیری راہ کی دُھول بن گئی ہوں۔ آکر اس دُھول کو اپنے قدموں کی دھمک سے سُہاگن بنا۔ دیکھ میلی بار کے بانکے! میں تیری راہ دیکھ رہی ہوں۔"
میں نے یہ گیت اُس سے پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ شاید وہ اس کو گانا ہی بھول جاتی تھی یا اُس کے دل کے اندر بھرے دُکھ کا سُر تھا جو اس نے خود ایک لَے میں ڈھالا تھا۔ اُس کا دل ایک نئے درد سے آشنا ہو رہا تھا۔ گانا تھم گیا اور ہم دونوں چُپ چاپ بیٹھی رہیں، اور رات میرے بڑے سے کمرے کی دیواروں سے لگی۔ سبزے پر پاؤں دھرتی دُور درختوں کی شاخوں میں اُلجھ رہی تھی۔ گیس کے ہنڈولے کی تیز سُوں سُوں برآمدے میں سے آنے لگی۔ کامیاں جگہ جگہ گیس کے ہنڈولے رکھ رہی تھیں۔ پتا نہیں رات اس روشنی سے کبھی مات بھی کھاتی ہے یا نہیں۔ لیکن دل کے اندر بھی تو روشنی چاہیے، زندہ رہنے کے لیے، خوش رہنے کے لیے۔

○

بستی میں زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتی جا رہی تھی۔ میں نے تین بیٹوں کو جنم دیا، اور ہر بیٹے کی خوشی پر جیراں کی

آواز فضاؤں میں گونجتی، لوگ روپے وارتے، جیراں کی جھولی روپوں سے بھر جاتی۔ کچھ عرصہ جیراں کا حُسن نکھرتا رہا۔ لیکن پھر ایسے لگا، جیسے وہ اندر سے ڈھے گئی ہو۔ آٹھ دس سال کے اندر وہ اپنے حُسن کا سایہ سا نظر آنے لگی۔ اُس کے بچوں نے اس کا حسن نچوڑ لیا تھا۔ اُس کے کپڑے میلے اور بال بھوسلے ہو گئے۔ جب کبھی بھی وہ آتی مجھے دیکھ کر رنج ہوتا۔ اب وہ کبھی کبھار کوئی نہ کوئی چیز مانگنے کے لیے آجاتی۔ میں اُس سے کچھ نہ پوچھتی۔ اپنے اور بچوں کے پرانے کپڑے زیادہ تر میں اس کو دیتی۔ نوراں کی شادی ہو گئی تھی۔ اُس کی جگہ دوسری نوکرانی آگئی تھی۔ بچے سکول جانے لگے تھے۔ وقت ہولے ہولے مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا لیکن اس طرح نہیں جس طرح اُس نے جیراں کو بدل دیا تھا۔ کوئی غم تھا جو اُسے چاٹ رہا تھا۔ اب اُس کے گائے گیتوں کی لے اتنی اونچی نہ اُٹھتی کہ ساری بستی اس سے بھری ہوئی لگتی۔

پھر اُس کے بارے میں ایک نئی افواہ بستی میں پھیل گئی۔ کرم دین اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ کرم دین جو اس کی برادری کا ہی تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس کے پڑوس میں رہتا تھا وہ بستی کے بازار میں پھرتا اور کہتا کہ وہ ہر حالت میں جیراں سے شادی کرے گا۔ وہ جیراں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جیراں کا شوہر جب ایسی باتیں سُنتا تو گھر آکر اسے مارتا اور گندی گندی گالیاں دیتا۔

میں ان چھوٹے لوگوں کے بارے میں خوب جانتی تھی، اُن کے نزدیک عورت مرد کا تعلق جسمانی ہی تھا جسے وہ عشق کا نام دیتے تھے ——— عورتیں اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ جاتیں اور پھر واپس آجاتیں ——— لیکن وہ جیراں تھی ——— لوگ کہتے انھوں نے کرم دین اور جیراں کو فلاں راہ پر دیکھا تھا، فلاں کنویں پر ساگ توڑتے ہوئے کرم دین اور وہ ہنس رہے تھے ——— میرا دل ان باتوں پر یقین کرنے کو نہ چاہتا ——— جیراں کئی ماہ سے نہیں آئی تھی، اور مجھے اُسے بلوانے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی۔ میرے تینوں بیٹے سکول جاتے تھے اُن کی ضروریات کا خیال رکھتے اتنا وقت ہی نہ ملتا کہ میں نوکرانیوں کی کہی ہوئی باتوں پر غور کر سکوں۔ وہ تو معمولی عورت تھی، ہمارے گھروں کی کمی کمین۔

اپنے چھوٹے بھائی کی شادی پر میں نے جیراں کو دیکھا، اُس کا سراپا ایک بار پھر نکھر رہا تھا، اُس کی آواز پھر سُریلی ہو گئی تھی۔ وہ گاتے ہوئے مسکرانے لگتی۔ اُس کی کمر کا لوچ، اُس کے سیاہ کُرتے میں زیادہ ہی واضح ہو گیا تھا، اُس پر نکھار کی ایک نئی رُت اُتری تھی۔

جانے سے پہلے وہ مجھے ملنے آئی۔ میں نے کہا:

"جیراں! لوگ بڑی باتیں کرتے ہیں، کیا بات ہے؟"

وہ زور سے ہنس دی۔ وہی پُرانی ہنسی۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کا چھینٹ کا گھاگھرا صاف سُتھرا تھا۔ وہ بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں اُداسی سی اُتر آئی۔

"بی بی! یہ مرد عاشق کسی پر ہوتے ہیں اور بیاہ کسی سے کرتے ہیں۔ پہلے نوردین نے برباد کیا اور اب یہ کرم دین۔ نوردین کا جی میری طرف کبھی نہ پلٹا۔ اور بی بی! شاید میں بے مول تھی نا۔ اُس نے مجھے پاؤں کی دھول جانا،

میں نے اتنے برس اُس کے پلٹنے کی راہ دیکھی ہے۔ میرا دل کتنا تڑپا ہے کہ وُہ بھی میری ویسی ہی چاہ کرے۔ مجھے اپنے من میں جگہ دے۔ میں نے مزاروں پر جا کر دھاگے باندھے، منتیں مانیں، لیکن پتا نہیں اس کے دل کو کیا ہوا ہے!"

○

"میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں، بی بی! جب دل ویران ہو تو جینے کو بھی جی نہیں کرتا۔ نور دین کا تو دل پتھر کا ہے، نہ جانے فاطمہ نے کتنے تعویذ پلائے ہوں گے اُسے، جو وہ میری طرف کبھی بھی پُورے دل کے ساتھ نہ مُڑا، میں کب تک اس کا انتظار کرتی۔ انتظار کرتے کرتے تو جگ بیت گئے بی بی!"

اُس کے سبز دوپٹے میں اُس کا چہرہ ایک دم بُجھ گیا اور آنکھوں میں ویرانی سی چھا گئی ——— یاد کی پرچھائیں سی ——— "بی بی! میرا جی کتنا چاہا کہ نور دین بھی میری قیمت لگائے۔ بی بی! میں اتنی بے مول نہ تھی۔ بستی کے کیسے کیسے لوگوں نے میرا مول ڈالا، لیکن میں نے ہمیشہ ان کو رَد کیا، دل بھی کبھی بِکا ہے! اور آج میں سوچتی ہُوں میں نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو خود برباد کیا ہے۔ کسی کا کیا قصور! میں کسی حویلی والی کہلا سکتی تھی لیکن میں نے کوٹھڑی میں بھی سُکھ نہ پایا ——— میرے نصیب!" وہ برآمدے میں خاموش کھڑی تھی، لُٹی سی ——— پھر اُس کی بیٹی اُس کو بُلا کر لے گئی اور وُہ یوں پاؤں رکھتی چل رہی تھی جیسے تھک چُکی ہو۔

چند دنوں کے بعد حویلی کے باہر میرے سُسر کی بیٹھک میں نور دین اور کرم دین فیصلہ کروانے کے لیے آئے تھے۔ کرم دین نے روپوں کو میرے سُسر کے سامنے ڈھیر کرتے ہوئے کہا:

"چودھری جی! نور دین نے کہا تھا اگر میں اسے پانچ ہزار روپے دے دُوں تو وہ جیراں کو طلاق دے دے گا۔ اور چودھری جی! میں نے پُورے دو سال اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں۔ اب اِسے کہیں کہ یہ اپنا وعدہ پُورا کرے۔"

نور دین للچائی نظروں سے روپوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں نور دین! تم کیا کہتے ہو؟" میرے سُسر بولے

"جی! مَیں اُس عورت کو اپنے گھر میں کیوں رکھوں جو غیر مردوں کو بھرماتی پھرے۔ میں طلاق دینے کے لیے تیار ہُوں۔" اس کی آواز میں ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔

"سوچ لو۔"

"جی! کیا سوچنا۔ پُورے اٹھارہ سال سوچ سوچ کر ہی تو گزارے ہیں۔" نور دین کی آواز میں بیزاری تھی

جیراں بیٹھک کے دروازے کے باہر بیٹھی تھی ——— شاید وہ خوش تھی ——— شاید حیران تھی ——— میں صحن کے بڑے دروازے کی اوٹ سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس عورت کی زندگی کے سارے اُتار چڑھاؤ میرے سامنے تھے، اور آج وہ اپنی زندگی کے ایک اور موڑ پر کھڑی تھی اور اس کی قیمت پانچ ہزار تھی۔

نوردین نے طلاق کے کاغذ پر انگوٹھا لگا کر روپے لے لیے اور جیراں کے پاس سے ہوتا ہُوا باہر جانے والی راہ پر مُڑ گیا ——— جیراں اُسے جاتا دیکھتی رہی ——— شاید وُہ رو رہی تھی۔

کرم دین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور بولا: "دیکھ لو، میں نے تمھیں بستی کی سب سے مہنگی عورت بنا دیا ہے۔ آج تک کسی عورت کی اتنی قیمت نہیں پڑی۔ میں نے بڑی محنت سے یہ روپیہ اکٹھا کیا ہے۔"

جیراں ہولے سے مُسکرائی اور پھر اُٹھ کر اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی ——— آج بھی کوئی اُس سے اتنی شدید محبت کرتا تھا کہ سب کچھ چھوڑنے کو تیار تھا ——— میں وہیں خاموش کھڑی سوچوں میں اُلجھ گئی۔ کیا زندگی میں چاہا جانا ہی سب کچھ ہے۔ اگر یہی سب کچھ ہوتا تو نہ جانے زندگی کتنی بار ٹوٹتی اور بنتی۔

تین ماہ بعد کرم دین نے اُس سے شادی کر لی ——— لیکن میں جانتی تھی چار بچّوں کی ماں کے چہرے پر ویسا حُسن تو نہیں ہوگا جو پہلی شادی کے وقت میں نے اُس کے چہرے پر دیکھا تھا، جو مجھے آج بھی یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے ——— جیراں شاید نیلی بار کی ہیر تھی ——— نہ جانے کتنے دلوں کو اس نے برباد کیا تھا۔ معلوم نہیں کرم دین رانجھا تھا بھی یا نہیں ——— لیکن اب لوگ پھر کہہ رہے تھے کہ جیراں برباد ہوگئی ——— آتی جاتی کام کرنے والی عورتیں اس کی جوانی کی بربادی پر ماتم کُناں تھیں۔ کرم دین نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا، بدلہ لیا تھا، وہ اب اسے پُوچھتا بھی نہیں، اپنی پہلی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اور وہ دُوسری کوٹھڑی کے سامنے سر جھکا کر کام کرتی رہتی ہے۔ اب وہ شادی بیاہ پر بھی گانے نہیں جاتی ——— ایسے جیسے وہ جیتے جی مر گئی ہو۔

جیراں جو نیلی بار کی خوب صورت عورت تھی ایک بار پھر لُٹ گئی۔

میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ پر اُسے بلایا لیکن وُہ نہ آئی۔ اب اس کی بیٹی گانے گاتی تھی، رنگین شامیانوں تلے۔ بجلی کی تیز روشنی میں مَیں گانے والی عورتوں کو دیکھ رہی تھی۔ جیراں کی بیٹی سُر کے اتار چڑھاؤ پر پُورا قابو رکھتی تھی لیکن اس میں جیراں جیسی بات نہ تھی۔ ڈھولک کی تیز تھاپ کے ساتھ فلمی گیتوں کی چلتی طرزیں ——— ملی جلی آوازیں ——— نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ ——— بچّوں کی چیخ پُکار ——— کتنا وقت گزر گیا تھا ——— دھیرے دھیرے ہمارے جسموں کو روندتا، ہمارے خیالات کو بدلتا، لیکن جیراں کے ساتھ تو اِس وقت نے بڑی بے انصافی کی تھی ——— مجھے اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی ——— لیکن اپنی زندگی کی مصروفیتوں میں اس کو پھر بھُول گئی ——— اب نئی نئی جوان ہوتی لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ شادی بیاہ کی محفلوں میں فلمی گیت بڑی پاٹ دار آواز میں گاتی تھیں، گھنگھرو باندھ کر ناچتی تھیں، کھُل کر مذاق کرتی تھیں۔ بستی بدل گئی تھی۔ پھیل گئی تھی۔ نئے نئے قصّے جنم لیتے، افواہیں پھیلتیں، لیکن پھر نئی افواہیں اُن کی جگہ لے لیتیں۔ میں نے بڑے بیٹے کی شادی کر دی۔ بہو اور بیٹے نے شہر میں جا کر گھر بنا لیا، منجھلا بیٹا انگلینڈ چلا گیا، چھوٹا بیٹا بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو گیا، گھر بہت سے بزرگوں سے خالی ہو گیا۔ دل پُرانی یادوں اور آوازوں کو یاد کرتا رہتا۔ محبت کے سُنے ہوئے بول ——— شدید آرزوئیں ——— فضل داد ہمیشہ کی طرح زمینوں کی دیکھ بھال میں لگا رہتا، مجھے اس سے کوئی شکایت

نہ تھی، اُس نے ہمیشہ میرا بڑا خیال رکھا تھا لیکن اس کی دُوسری محبتوں کے قصّے کوئی نہ کوئی آکر مجھے سنا جاتا تو میں ہنس پڑتی۔ فضل داد نے ٹھیک کہا تھا یہ مردوں کے دل کی موجیں ہوتی ہیں، آتی جاتی رہتی ہیں۔ لیکن ہر قصّہ ایک گہرا سا گھاؤ دکھو دجاتا جو بظاہر مندمل ہوجاتا ——— شاید میرا دل ان کا عادی ہوچکا تھا۔

لیکن کبھی کبھار جب رات میرے کمرے کی دیواروں کے ساتھ لگی بوگن بیلیا میں اترتی ——— رات کی رانی کی تیز مہک ہر جھونکے کے ساتھ کھڑکیوں کی جالی سے ٹکراتی تو مجھے جیراں کی آواز میں گائے گیت یاد آنے لگتے، میرے دل میں اترتے ہوئے۔ کچھ کہتے ہوئے ——— یادیں ہی یادیں۔

ایک روز میں نے اسے بلوا بھیجا۔ جب وہ آئی تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا ——— اُس کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہوچکے تھے اور چہرے کا سونا نہ جانے کہاں لُٹ گیا تھا ——— وہ ہمیشہ کی طرح آکر میرے پلنگ کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے کہا "جیراں! اُٹھو پیڑھے پر بیٹھو۔" وہ مضمحل سی ہنسی ہنس کر بولی "بی بی جی! میں یہیں ٹھیک ہوں" لیکن میں نے اُسے زبردستی اٹھا کے اُوپر بٹھایا ——— کیا میں بھی اتنا ہی بدل چکی ہوں، میں نے دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا ——— نہیں، وقت نے اتنی بے رحمی سے اپنے نشان میرے جسم پر ثبت نہیں کیے تھے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوگئی۔ اُس میں اور مجھ میں بڑا فرق تھا۔ میں نے کہا:

"جیراں! تم نے گانا کیوں چھوڑ دیا؟ شادی بیاہ میں کیوں نہیں آتی ہو؟"

اس نے اپنے سر کو دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپتے ہوئے کہا:

"بی بی! میرے جیسی بُوڑھی میراثن کیا گائے گی! اور پھر مجھے فلمی گیت گانے بھی نہیں آتے۔ آجکل لوگ وُہ گیت پسند کرتے ہیں۔ کیا کروں گی آکر، آواز ہی نہیں اُبھرتی۔ دل ہی نہیں چاہتا۔"

میں اس سے بہت کچھ پُوچھنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیا چیز رُکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ایسا نہ ہو کوئی ایسا لفظ کہہ دُوں جو اسے رنجیدہ کردے۔ وہ تو دیکھنے میں ہی بربادی کی ایک داستان لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش بیٹھی تھیں، وُہ ہولے سے ہنسی اور بولی:

"بی بی جی! جو بات آپ پُوچھنا چاہتی ہیں پُوچھ کیوں نہیں لیتیں، ڈر کس بات کا ——— آپ یہی تو پوچھنا چاہتی ہیں کہ میں اتنی جلدی بُوڑھی کیوں ہوگئی ہُوں! ——— تو بی بی! دُکھ کی چھوٹی سی تو داستان ہے ——— کرم دین نے بھی اپنی جوانی میں میری چاہ کی ہوتی۔ لیکن مجھے تو نور دین کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اُس نے نور دین کی لاپروائی کا سہارا لے کر اپنے دل میں بھرے کینے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک راہ نکالی ——— اور بس ——— بی بی جی! کرم دین سے نکاح کی رات ہی میری سہاگ رات تھی اور وہی میری بربادی کی رات تھی۔ اُس کے بعد میری حیاتی میں کبھی بھی صبح نہ ہوئی۔ کرم دین نے منہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن پھر اس نے پلٹ کر میری طرف نہ دیکھا، وہ دو قدم کے فاصلے پر اپنے بیوی بچوں میں بیٹھا ہنستا بولتا رہتا لیکن آنکھ اُٹھا کر ایک بار بھی مجھے نہ دیکھتا، اور اب تو دل میں کوئی آس ہی نہیں، بس جی رہی ہوں،

جس دن اللہ کا بلاوا آجائے گا چلی جاؤں گی۔" اور وہ رونے لگی ، اُس کے مرجھائے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ان کو پونچھ بھی نہیں رہی تھی۔ شاید اس نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اب اُن کی نمی کا احساس بھی باقی نہیں رہا تھا ——— میں کیا کہتی، اس نے خود ہی آنسو پونچھے اور بولی :

"بی بی ! کوئی گیت سناؤں۔ آپ کو دیکھ کر بھلا وقت یاد آرہا ہے۔ آپ کو بھی تو یاد ہوگا۔"

"ہاں جیراں ! مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی بار تمھیں دیکھا تھا تو تمھارا حُسن دیکھ کر حیران رہ گئی تھی ——— اور تمھاری آواز ——— وہ تو آج بھی میرے کانوں میں گونجتی لگ رہی ہے۔"

"معلوم نہیں بی بی ! میں تھی ہی رُوپ وتی یا لوگوں کو ایسے ہی نظر آتی تھی۔ اگر میرا رُوپ ایسا ہوتا تو نور دین اور پھر کرم دین کو بھی تو نظر آتا۔ میرا دل بھی تو کبھی آباد ہوتا۔ میں تو شاید بکنے کی چیز تھی۔ کوئی دس ہزار مول ڈالتا تھا ، کوئی دو ہزار ، اور کرم دین کی طرح کوئی پانچ ہزار ——— دل کا مول کسی نے نہ ڈالا ——— کسی نے میرے دل کا مول نہ لگایا

میں اپنی بولی خود ہی لگاتی رہی ——— کوئی خریدار ہی نہ تھا ——— چھوڑیں بی بی ! میں آپ کو گیت سناؤں ! میرا بھی جی آج گانے کو کر رہا ہے ، کتنے برسوں سے میں نے کبھی نہیں گایا۔" اور پھر وہ لرزتی ہوئی لَے میں برسوں پہلے کا وہی گیت گانے لگی :

"اے میرے سجن ! تیری آنکھیں مجھے کیوں نہیں دیکھتیں۔"

وہ ایک ہی بول کو بار بار دُہرا رہی تھی جیسے وہ میرے سامنے نہ بیٹھی ہو بلکہ اپنے آپ کے ساتھ اکیلی ہو ، اپنے دُکھ کے ساتھ اکیلی ——— اُس کے جانے کے بعد میں کتنی دیر اداس بیٹھی اُس کے بارے میں سوچتی رہی۔

ایک روز زینا نے بتایا کہ جیراں کو بڑا بخار رہتا ہے۔ وہ سارا دن چارپائی پر بیٹھی کھانستی رہتی ہے۔ اُس کی بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور بیٹے مزدوری کے لیے کبھی کہیں چلے جاتے کبھی کہیں۔ میں نے اُسے کچھ روپے بھجوائے، اور اس نے مجھے اپنی دُعاؤں کے ساتھ سلام بھجوایا تھا۔ وہ کرم دین سے اُتنے ہی فاصلے پر بیٹھی کھانستی رہتی لیکن کرم دین کے دل کی گرہ کبھی نہ کھُلی۔ اور اب زینا کہتی ہے کہ جیراں میراثن مر گئی۔

میں اب بھی بیٹھی عشق پیچاں پر منڈلاتی شہد کی مکھیوں اور مٹی کی گرم لُو میں مرجھائے پھولوں کو دیکھ رہی ہوں۔ اور میرے ذہن میں ایک دُکھ سے بوجھل لرزتی گیت کی لَے گونج رہی ہے :

اے سجن ! تیری آنکھیں مجھے کیوں نہیں دیکھتیں

اے سجن ——— اے سجن ———

مٹی کی گرم لُو پھولوں میں گھومتی پکار رہی ہے۔ اے سجن ——— اے سجن ——— شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کہہ رہی ہے اے سجن ——— میں نے اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی ہے ، لیکن آواز پھر بھی گونجتی ہی جا رہی ہے۔

خوابوں کے جزیرے (وادیٔ کیلاش)

پروین عاطف

کافرستان میرے بچپن کا سب سے پراسرار خواب، سنو وہائٹ، سندریلا اور گل بکاؤلی جیسا۔ جسے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہر ایک سے چھپ کر روز رات کو سونے سے پہلے اپنی رنگین چنیوں میں لپیٹ کر پروں والے نرم نرم تکیوں کے نیچے رکھ کر سوتی ہیں۔ پورنماشی کی راتوں میں بہت پہلے، جب میں اور میرے ہم عمر خالہ زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد، صبح کے ستارے کی پہلی کرن پھوٹنے تک سمرگنوں میں فرنچ رائیویراز (RIVERAS) ہوائی آئی لینڈ راوو دے شنکر اور چغتائی آرٹ کے تانے بانے بنا کرتے تھے۔ میں وقفے وقفے سے سوال اٹھایا کرتی تھی۔ "تم سب جواب برسوں سے ایک دوسرے کے نظریات ایک دوسرے کے خواب کسی اَن کہی COMMITMENT کے ذریعے سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہو۔ وعدہ کرو بڑے ہو کر اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے بعد اپنی اپنی الجھنیں اپنے اپنے گھر چھوڑ کر جب میں کہوں میرے ساتھ کافرستان چلو گے۔ پر وہ ہمیں مانتے تھے۔ ہنستے تھے مذاق اڑاتے تھے۔ "محترمہ آپ جارج ایلیٹ (GEORGE ELIOT) کی ہیروئن بننے کی کوشش نہ کریں۔ یہ جو مغرب کی عورتیں ہیں نا، چھ چھ فٹ کی افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں شیروں اور ہاتھیوں کا شکار کرنے والی اور صحراؤں میں چھپے خزانوں کی مہموں پہ جانے والی۔ کافرستان جانے کی جرأت نہیں کریں اور آپ ذرا اپنی شکل دیکھیں۔ مرا ہوا کروچ دیکھ کر محلہ اکٹھا کر لیتی ہیں۔ کیلاش جائیں گی۔ کاندھے پہ بوجھ لادے چودہ ہزار فٹ کی چوٹیوں پہ چل کر۔۔۔۔۔ یہ باتیں فلموں میں اچھی لگتی ہیں یار۔۔۔۔"

یہ میری بھی ایک کمزوری ہے۔ بڑی برملا۔ جسے حاصل کرنے کے امکانات کم سے کم تر ہوتے جائیں اس کی خواہش ایٹم کے ذروں کی طرح بکھر بکھر کر میرے اندر اتنی طاقتور ہو جاتی ہے کہ توبہ! اندر باہر خلیتے سے سلگتے رہتے ہیں۔ لازوال قسم کے ہیں چودہ پندرہ برس کی تھی۔ کن رس کا شدید چسکا تھا۔ اپنے سے بڑوں کی باتوں سے اسرار، تحیر اور انوکھے پن کی خوشبو آتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی بات ذہن دل پر یوں نقش ہو جاتی تھی جیسے کورے میز پوش پر ڈائی کے چھینٹے۔ بٹھا بٹھ۔ بڑا دلچسپ عمل تھا۔ کئی کئی دن پیٹ درد کے بہانے سے سکول نہیں جاتی تھی کہ گھر میں لیٹ کر بڑوں کی باتیں سنوں۔

اور وہ میری ماں اور خالہ انھیں باتوں کے بیل بوٹے کاڑھنے کا اتنا ہی شوق تھا جتنا کہ مجھے سننے کا۔ سردیوں کی وہ چمکیلی دوپہریں میرے ذہن میں ابھی تک ہو بہو زندہ ہیں جب میری ماں اور خالہ علاقہ کافرستان کے بارے میں کوئی کتاب پڑھ پڑھ کر لال گلال ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک دوسرے کو ٹھوکے دیا کرتی تھیں اور منہ میں دوپٹے ٹھونس ٹھونس کر ہنسا کرتی تھیں۔ میں کن رس کی ماری پاس جاتی تھی تو کھرک کر واپس بھیج دیتی تھیں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ لیکن ان دونوں نے میرا ذہن جلتی چنگاریوں سے بھر دیا۔ شوق کے آرے اور بھی تیز ہو گئے۔

وقت کے جگنو مزے مزے اُڑتے رہے کافروں کی کوہستانی وادیوں کے خواب میری چھوٹی سی چُنی میں لپٹے میرے تکیے کے نیچے کلبلاتے رہے۔ حتیٰ کہ میرے اپنے پنڈے سے زعفران کی مہک آنے لگی۔ اور میں نے ویسی ہی سردیوں کی ایک گھمی دوپہر اپنی ماں سے ممتاز مفتی اور منٹو کی کتابوں کے بارے میں بات کرتے کرتے پوچھ لیا۔

"اچھا امّی کافرستان کے بارے میں وہ کتاب کہاں ہے جسے آپ اور خالہ مجھ سے چھپا چھپا کر پڑھا کرتی تھیں"۔

"کتاب کا نام مجھے یاد نہیں تمہاری خالہ کی تھی کسی انگریز کی کتاب کا ترجمہ تھا۔ پتا نہیں کہاں گئی؟"

"پر آپ اُسے مجھ سے چھپا کر کیوں پڑھتی تھیں"۔

"جنگلی قبیلوں کی وحشیانہ رسمیں تمہاری عمر میں پڑھنے والی نہیں ہوتیں"۔ ماں نے ذرا پکا منہ کر کے کہا۔

"دیکھئے نا امی! سوشیالوجی پڑھتی ہوں۔ کوئی بات ایسی نہیں جو سوشیالوجی کے طالب علم کو بتائی نہیں جاتی اور جنگلی قبیلوں کے حالات تو ہمارے مضمون کا لازمی حصّہ ہیں۔ بتائیے نا!" میں نے ماں کے تقریباً اوپر گرتے ہوئے اصرار کیا۔

"تم تو خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئی ہو۔ ایسا کوئی دنیا سے ڈھکا چھپا راز تو نہیں۔ سبھی جانتے ہیں ٹرچ میر پاٹ کے پیچھے کافروں کا ایک قبیلہ ہے۔ صدیوں سے وہ لوگ وہاں ہی رہتے ہیں۔ بے حیائی بہت ہے۔ دین مذہب کوئی نہیں خدا رسول کا کچھ پتا نہیں مذہب بھی ہے تو نری حرام کاری کہتے ہیں۔ ایک دیوتا ہوتا ہے۔ پورے قبیلے میں سے چُنا ہوا۔ سب سے مکڑا، چرکٹا۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر چھوڑ دیا جاتا ہے اُسے۔ بہترین خوراک دی جاتی ہے اُسے۔ کام کوئی نہیں کرنا صرف پلتا جاتا ہے۔ قبیلے کی ہر کنواری شادی کی پہلی رات بطورِ تقدس اس کے پاس بھیج دی جاتی ہے۔ بلکہ دولہا بے غیرت خوشی خوشی خود چھوڑ کر آتا ہے۔ ظلِ خدا کا۔"

میری ماں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں بات سُنا دی۔ ریت کے ذروں پہ کھلی دھوپ کی طرح میری ماں کا چہرہ کئی رنگ بدل چکا تھا۔

"پھر امّی۔ پھر۔ پوری بات سنائیے نا!"

میں امی کو یہ بات نہ سمجھا سکی کہ جو مضمون انہوں نے مجھے لے کر دیا تھا۔ اس نے میرے اندر سے ماں کے دودھ کے ساتھ لئے ہوئے تمام عقیدوں کی جڑیں پولی کر دی تھیں۔ میرے اندر دوسروں کو اپنے معیار سے ناپنے کے سارے گز چور چور ہو چکے تھے

"پھر کیا"۔ میری ماں رک کر بولی۔

"اگلی صبح وہ لڑکی کا یوں سواگت کرتے ہیں۔ جیسے کسی مقدس کام سے فارغ ہو کر آئی ہو۔ نعوذ باللہ!"

رقص و سرود کی محفل سجائی جاتی ہے۔ دعوتیں پکتی ہیں۔ گھر والے سمجھتے ہیں۔ لڑکی کا وجود برکتوں سے بھر گیا۔ گھر بھر کا جنم سپھل ہوا۔ توبہ استغفار۔"

ہائے کیسے پیارے لوگ ہوں گے وہاں کے۔ کیسا دلربا سا کلچر ہوگا۔ گناہ کے کرب سے آزاد۔ ثواب کے لالچوں سے آسودہ۔ کاش کبھی مارگریٹ میڈ مل جائے۔ یا قرۃ العین حیدر۔ ان کو ساتھ لے کر جاؤں امی کو کیا پتا؟؟ میں نے چپکے سے ماں کا ماتھا

چوما اور تکیے کے نیچے چڑی میں پلٹے کافرستان جانے کے خواب میں ایک اور گرہ لگادی۔ اسے جکڑ لینے کو۔
پر وہ جس کی سنگت ملی۔ وہ خود بگولا تھا۔ در بدر اڑتا ہوا۔ ابھی تک بھاگ رہا ہے۔ اپنی ہی ذات کے پیچھے اپنی ہی تلاش میں۔ ہنگاموں میں، ہجوموں میں تالیوں کے شور میں۔ اخباروں کے کالموں میں۔ لمحہ بھر ستانے کو نہیں رکتا۔ اسے کس منہ سے کہتی۔ نورستان کی وادیوں میں کوئی خواب میرا راستہ دیکھ رہا ہے ..... پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ نورستان کا خواب تکیے کے نیچے محفوظ سویا رہا۔
انکیوبیٹر (INCU BATOR) میں پری میچور (PRE MATURE) بچہ اور میرے لیے دنیا بھر کے درد اہو گئے۔
اوپر والی منٹری میں بھی کچھ اڈنگ بڑنگ ہو گیا۔ مانگا ریگریشن الاؤنس مل گیا۔ (INCRENENT) انکریمنٹ۔
بس بالکل ایسا ہی ہوا۔ پریوں کے دیس سے ایک طلسمی گاڑی آئی آگے ہرنوں کی جوڑی جتی تھی۔ میں نے پاؤں دھرا تو اس نے اڑنا شروع کر دیا۔ شاید اوپر والے کو پتا تھا۔ شہر شہر پھرنا میری سہاگ رات تھی۔ جنوبی فرانس کے RIVERAS احرام مصر، جاپان کے پگوڈے۔ گیشا ہاؤسز۔ ہندوستان کے کلاسیکی رقص، ایفل ٹاور، دیوار چین، تھائی لینڈ کے بدھا کے مندر نگر نگر۔ بستی بستی۔ ڈال ڈال۔ چڑی میں سارے رنگ بھر گئے۔ صرف کافرستان کی فائل ہینڈنگ کی دراز میں دھری رہ گئی۔
اور کوئی ایسا نہ ملا جو PUMPKIN کی طلسمی گاڑی کا دروازہ کھول کر کہتا میرے ساتھ چل۔ میں تو ان کو بھی کھوجتی رہی۔ آوازیں دیتی رہی۔ ان سب کو جو بچپن میں روز رات چڑیوں کی چہکار تک ساتھ ساتھ بیٹھے خواب بنا کرتے تھے۔ طاہرہ۔ ارشد۔ جاوید، فری، نیلو، افتخار ..... ارشد اور افتخار پیسوں کے طلائی انبار میں دب چکے تھے۔ قارون کے حواریوں کی طرح۔ ماضی کی کوئی آواز جس میں پیسوں کی کھنک شامل نہ ہو۔ ان کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتی ..... جاوید کی بیوی کو میری شکل سے الرجی تھی۔ اسے میرے وجود سے وحشت ہوتی تھی کہ میں نے گھر والیوں کی طرح کبھی ڈھنگ کی بات ہی نہیں کی تھی۔ نیلی اور طاہرہ پُر پیچ سنگ ریلے راستوں میں اپنے اپنے دکھوں سے لہولہان۔ اپنے سارے خوابوں کی کرچیاں سینے سے لگائے۔ اور فری وہ مجتوں اور اطمینان کی افراط کے نشے سے چور .....
کون ایسا ملتا۔ جان جوکھوں میں ڈالنے والا۔ پھر خبر آئی۔ چترال سے آگے سڑک بن گئی۔ جیپیں چلنے لگیں۔
دنیا بھر سے لوگ اُمڈنے لگے۔
اور ایک روز اچانک میری نظر پڑی وہ میرے ہی تکیے پر سو رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ گچھاؤں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ کندھے چوڑے اور مضبوط ہو چکے تھے۔ قد سرو کے بوٹے سے اُوپر نکل گیا تھا ..... میرا بیٹا۔ میرا ساتھی .... میرا دوست ..... وہ تو ہے بھی نری سوں سوں۔ پاؤں میں سے بیٹھے بیٹھے LAZERBEAMS نکلتی ہیں۔ نچلا۔ اس کا جی چاہتا ہے۔ واسکوڈی گاما کی طرح کوئی ایسی جگہ دریافت کرے۔ جہاں پہلے کسی کا گذر نہ ہوا ہو ..... میں نے کہا "نظلے کیلاش چلو گے یعنی کافرستان۔ ؟
"امی ابھی اسی وقت"۔ وہ اچھل پڑا۔
"پر یار ہم دو اکیلے۔ سعید کو بلا لو۔ ڈر لگتا ہے"۔

سعید نے کا پھوپھی نہ رہے۔ ذمہ دار صحت مند۔ انتہائی مفید اسے دوسروں کی بیماری اور سفر کی صعوبتیں اپنے سینے پر جھلنے کا بڑا چسکا ہے ..... میں بھی اسے اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ سفر میں اس پر ذمہ داریاں نہ لادیں تو وہ کچھ تنہا تنہا اداس سا محسوس کرتا ہے۔" سعید بستر صاف لگوانا۔ کوکا کولا لیتے آنا۔ ذرا گاڑی کا پہیہ چڑھا دو پلیز۔"

سعید آئیوڈیکس خریدنا بہت ضروری ہے۔ پیسے بھی خرچتا ہے اور جان ماری کے کاموں سے کچھ کھلا کھلا بھی رہتا ہے۔ میں اور غلام دن بھر منصوبے بناتے رہے۔ پردیوانی مقدمے کی طرح میری تاریخ پھر آگے پڑ گئی۔ عاطف کے والد کو اچانک دل کا دورہ پڑ گیا۔ اسپتال۔ ڈاکٹر۔ بھاگ دوڑ۔ برادری۔ رش۔ ..... پر نکلے اور سعید کو چھوٹے چھوٹے راکٹوں کی طرح کافرستان کے سفر کی تیلی لگ چکی تھی ..... وہ ٹورزم والوں سے ایسی تصویریں دیکھ چکے تھے۔ جہاں حوران کافرستان، یونانی دیویوں کے لبادے زیب تن کئے سنہرے، لاجوردی پہاڑوں کی چھاؤں میں محو رقص و سرود تھیں اور آنے جانے والوں کے لئے چشم براہ اک ٹک ہونے کو تیار نظر آ رہی تھیں ..... دادا خطرے سے باہر ہوتے۔ تو بالکل "چور نالوں پنڈ کالی" کے مصداق۔ وہ دونوں پانچ چھ دوستوں کی عجب اڑنگ بڑنگ پارٹی لئے میرے پاس آئے۔ میرے والے کی آنکھوں سے شرارت کے بارودی انار چھوٹ رہے تھے۔

"ماتا جی اشیرباد۔ منڈلی کافرستان جا رہی ہے۔ آپ کی آگیا سے۔ اور آپ ہی کے دیئے ہوئے اشتیاق کو ساتھ لئے۔"

مجھے زندگی میں جتنی بار بھی غلط پر غصہ آیا میں اُسے ڈانٹ نہیں سکی۔ میں جب بھی سنجیدہ ہونے لگتی ہوں۔ اس کی آنکھیں شرارت اور محبت کے ایسے سگنل بھیجتی ہیں۔ سارے قصے کا فلوس اڑ کر رہ جاتا ہے اور وہ میری اس کمزوری کو اپنے چلتے میں ہی جان گیا تھا۔ اسے پیدا کرتے وقت شاید میرے منہ میں پنجاب کی چھوٹی لال مرچ تھی۔ اس کی بڑی بڑی شرارتوں سے پسینے بھی آئے ہیں اور اندر اندر سے مزا بھی آتا ہے۔ چاٹ مسالے کی طرح ..... ایک بار رشتے کے ایک کزن کے پیچھے پڑ گیا۔ دو سیال والے بڑے معترف تھے اس کے کردار کے .....

اپنے دادا کو لڑکی کی آواز میں روتے روتے ٹیلیفون کر دیا۔

"جی میں ایک بدنصیب لڑکی ہوں۔ بے سہارا۔ بے آسرا۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔" میرے سسر نے درشتی سے جواب دیا۔

"جی آپ بزرگ ہیں۔ میری بات دھیان سے سُنیں ... میں کرموں جلی .... (سسکیاں) آپ کے بھتیجے کھارو نے آپ سب سے چھپ کر مجھ سے شادی کر لی تھی۔ پچھلے سال ..... کہتا تھا۔ آپ سے اجازت لے کر مجھے گھر لے جائے گا۔ اب پانچ مہینے کا بچہ ہے میری گود میں۔" (دوسرا وہ مست ٹیلیفون پر بچے کی آواز میں رو رہا تھا) "یہ وہ اچانک ہم دونوں ماں بیٹوں سے منہ موڑ گیا ہے۔ یہ بچہ آپکے خاندان کی امانت ہے میں اکیلی مفلس نادار اسے نہیں پال سکتی ..... آپ کا بیٹا بریگیڈیئر ہے میں بچہ اس کے حوالے کر دوں گی۔ مہربانی سے بتائیے بچہ کس وقت آ کر آپ کی جھولی ڈال جاؤں۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا۔"

"گھر میں طوفان آ گیا۔ لڑکے کی اور اس کے ماں باپ کی طلبی ہوئی۔ لڑکا نہ نہ کرتا جاتا تھا۔ دادا جان پھڑکتے جاتے تھے۔ میں خوف سے بیزار بیزار پھر رہی تھی۔ اور وہ کھانے کی طرح کھڑکھڑ کھلتا جا رہا تھا۔

میں نے بغور اس ٹوٹے کو دیکھا۔ سارے اخروٹ کی لکڑی کے گیلے ڈھوں کی طرح خام ناتراشیدہ۔ بے ڈھنگے۔ کوئی لمبا گٹھا، کوئی یونہی بڑھا ہوا بے معنی سا۔ ڈرے ڈرے نروس..... سوائے ظلے اور سعید کے۔

یہ سارا گروہ ان وادیوں کو پار کرے گا۔ جہاں بڑوں بڑوں کے چھکے چھوٹتے ہیں؟؟

امی ان کی شکلوں پہ نہ جائیں۔ یہ چاہیں تو آپ کو کشمیر فتح کر دکھائیں۔ پورے DARE - DEVI ہیں اور یہ ۲۴ سال کا سعید۔ یہ کس مرض کی دوا ہے..... اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں..... بس اسی طرح وہ سارے ٹین ایجر بھی ہنسی ہنسی میں مجھے ڈنڈی مار گئے۔ اور میں بقول شخصے اپنی UNSUNG میلوڈی کو ایک بار پھر سینے سے لگائے انتظار کے دریچوں پہ لٹک گئی..... وہ سارے سات روز کے لئے گئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی جب وہ آئے تو وہ وہ نہیں تھے، جو گئے تھے..... سات روز میں کئی برس ناپ آئے تھے۔

ہر ایک کا اپنا آپ وہیں کہیں، نورستان کی چمکیلی چوٹیوں، جھرجھرتے جھرنوں اور یونانی دیویوں کی مسکراہٹوں میں چھوڑ آئے تھے۔ صرف ہائے گونی ہائے تاشی ہائے آبِ گل کی آوازیں رہ گئی تھیں۔ مار دھاڑ والا بھاگ بن گیا تھا۔ موسیقار نے گانا چھوڑ دیا تھا۔ بانسری والے کی بانسری ٹوٹ گئی تھی۔ کھانے کے شوقین کو خوراک سے الرجی ہونے لگی تھی۔ بس کھوٹر ہی کھوٹر تھے۔ واکو کوئی بھی نہیں تھا..... ظلے کا اپنا ہی ردِ عمل تھا وہ AGGRESSIVE ہو گیا تھا۔ زندگی کی ہر اس نہج سے جہاں ماڈرن لیبل لگا ہو۔ سڑکیں، عمارتیں، سینما، کھیل تماشے، کالج، سکول، لڑکیاں.....

ایسا دلچسپ انقلاب صرف سات روز میں.....

پر راستے کی دل دہلانے والی کٹھنائیوں کے قصے۔ میرا جون آف آرک بننے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ شاید وہ اپنے آپ سے کافرستان نہ جا سکنے کا احتجاج تھا۔ میں نے انہی گرمیوں میں چاروں بچوں کو ساتھ لیا اور سوات چلی گئی کہ شہرہ اس وادی کے دیو مالائی حسن کا بھی چار دانگ عالم میں پھریرا ہوا بھی ایسے ہی وادی میں قدم دھرتے ہی ایک جھٹکے سے ذہن پہ جمی برسوں کی دھول چھٹنے لگی۔ میرے بچپن کے پہلے دس سال۔ اس رشکِ فردوس وادیٔ کشمیر میں گزرے تھے۔ آج بھی اس کی یاد کے ورق پلٹوں تو ذہن کے ہر گوشے سے زعفران نرگس اور چنبیلی کی مہک اٹھتی ہے۔ نگاہوں میں لمحہ لمحہ کنول کے گلابی کھیت کھلنے لگتے ہیں۔ ہائے ہوش سنبھلنے سے پہلے ہی اغوا ہو کر غیر کی جھولی میں جا پڑا..... کلام میں پتا نہیں کیا تھا؟؟

پیرس کی قومی آرٹ گیلری میں۔ میں نے ریمبرانٹ، وین گاف اور پکاسو کی بنی ہوئی تصویریں دیکھیں۔ ایک اناڑی طالب علم کی طرح مجھے ان کی تیکنیک اور سٹائل کا کچھ علم نہیں۔ بس اتنا پتا ہے ان فن کاروں کا ہر شاہکار کچھ دیر کے لیے روح کی روح نچوڑ لیتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ لمحوں کے لئے آپ کی روح اور اس فن پارے کا حسن ایک ہو جاتے ہیں..... اور اس فن پارے کا حسن سیال بن کر آپ کی روح میں دھڑکنے لگتا ہے۔ بس ایسے ہی کالام پہنچتے ہی۔ مدت مدید کے بعد وادیٔ کشمیر کا بھولا بسرا حسن میری روح میں دھڑکنے لگا تھا۔ برش بھی ایک تھا زنگ بھی کینوس بھی ایک۔ فرق صرف FINISHING کا تھا۔ میں نے سوچا کسی لارڈ میو یا سر لارنس کا دھیان ہماری ان شاداب وادیوں پر پڑ جاتا تو ہمارے بھی وارے نیارے ہو جاتے تب ہمارے

دریاؤں میں بھی کبوتروں جیسے سفید سفید ہاؤس بوٹ تیرتے پھرتے۔ پانچ پانچ ستاروں والے ہالی ڈے ان (HOLIDAY INN) اور شیراٹن (SHARATON) ہوٹل جگمگاتے روشن۔ دش فوارے ہوتے۔ باغ کھیل تماشے۔ سیاحوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ۔ بے چارے سواتیوں پر من برستا۔ پرلارڈ میو، سرلارنس، سارے سرینگر چلے گئے۔ اور ہم۔

ہم آزاد تھے۔ اور آزاد قومیں بس احتساب کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ صرف دیتی ہیں لیتی کچھ نہیں۔

ہوٹل جو ہمیں ملا۔ ہوٹل کیا تھا ——— ایک پہاڑی نالے کے کنارے، کچھ کمرے سے تھے۔ جنرل مرچنٹ کی دکانوں کی طرح ایک ہی لائن میں ساتھ ساتھ جڑے ہوئے۔ باہر نکلیں تو ساتھ والا اور اس کے ساتھ والا اور اس کے ساتھ والا سب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آمنے سامنے کمرہ پچاس روپے روز بستروں کی بسانہ ایکسٹرا۔ جیسے انٹر کانٹینٹل میں، میں ساتھ پھلوں کی ٹوکری ملتی ہے۔ اندر جاتے ہی میری بیٹی نے ٹھیک کہا تھا۔ امی حکومت کو چاہیے سیاسی قیدیوں کو دلائی کیمپ کی بجائے اب یہاں بھیجے۔ پہلی رات توجوں توں کر کے بسر ہوئی۔ اگلے روز مشورہ چہار درویش میں باہم یہی ہوا کہ صبح سے شام جنگل جنگل وادی وادی اتنا گھومو کہ جسم تھکن سے ریزہ ریزہ ہو جائیں اور شام کی تاریکیاں گہری ہونے کے بعد علی بابا چالیس چور کی طرح۔ چپکے سے ناک منہ بند کر کے اپنے اپنے جسموں کو اس سیلن چرس، بڑا گوشت، پان، بیڑی اور جانے کس کس چیز کی مرکب بدبو میں گرا دو۔ حواس باختہ۔

دکھ اس بات کا تھا کہ گزرے ہمارا تھائی لینڈ فلپائن وغیرہ ایسے ممالک سے بھی ہوا۔ جن کی معیشت کا پورا ڈھانچہ ٹورزم پہ کھڑا ہے۔ نگری نگری چرچے ہیں۔ ہائے تھائی لینڈ ہائے فلپائن ..... بس وہی بسانہ مارا چھاتا کراچی والا سمندر اور پائن اور ناریل کے درخت۔ لینڈ سکیپ میں سے کوئی بجلیاں نہیں لپکتیں اور اپنے ہاں۔ سوات اور کالام، ہائے روش روش رنگوں کے فوارے پھوٹتے ہیں۔ پانیوں کی پھلوں کی پھولوں کی مہک۔ وہاں سے چلے آنے کے بعد بھی مدتوں ایک ESSENCE بن کر زندگی میں رچی رہتی ہے۔ فرق صرف والی وارثوں کا ہے۔ وہاں کی حکومتیں سگھڑ گھر والیوں کی طرح اپنے آنگن کی نوک پلک یوں سنوار کے رکھتی ہیں کہ آنکھ دیکھتی رہ جائے۔ ہماری طرح اپنے گھر کو رنڈی کا ڈیرا کوئی نہیں سمجھتا۔

ستمبر کا آخر تھا۔ سردیاں وادی میں مارا مار چلی آ رہی تھیں۔ دن چمکیلے خوشبودار۔ شاموں کو خنک ٹھنڈی ہوائیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں گھر کرنے والی۔ وادی کی عام اٹھان میں تو بھیرویں کے الاپ کا دھیما پن گھمبیرتا تھی۔ شور۔ بھاگ دوڑ اودھم کچھ بھی نہیں تھا۔

——— بس ایک دریا تھا۔ شہر کے گرداگرد، ہٹیلا، کٹیلا، چنچل، مشکی گھوڑے کی طرح دولتیاں مارتا۔ بہتا چلا جاتا تھا۔ شاں شاں۔ شوں شوں اور دریا کے ساتھ ساتھ پہاڑ کے ساتھ ساتھ گھومتی بل کھاتی، بڑی چمکیلی سی ایک سڑک تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے چنار اور سفیدے کے گھنے جھنڈوں میں کہیں غائب ہو جاتی تھی۔

دو چار بار ہم گھومتے گھومتے دریا کے پار پہاڑ کے ساتھ ساتھ اس سڑک کی کھوج میں نکلے۔ لیکن بچے آدھے راستے میں تھک کر بیٹھ جاتے اور وہ سڑک ریڈ رائڈنگ ہڈ کی طرح درختوں کی گپھاؤں میں کھو جاتی۔

تیسرے چوتھے روز میں نے بچوں سے کہا "آج پیدل نہیں چلیں گے کار نکالو۔ دریا پار والی سڑک نے کھجا کر رکھ دیا ہے۔ جہاں جہاں سڑک جائے گی ہم بھی جائیں گے۔ دیکھی جائے گی۔" بس چل سو چل۔"

پہاڑ کی چوٹی کے عین اوپر جب وہ پُراسرار سڑک درختوں کے گھنے سال جھنڈوں کے بیچوں بیچ چلی تو ہم بھی پیچھے پیچھے چل دیئے۔ ... سڑک کے دونوں طرف عمیق گھاٹیاں۔ پتھر پتھر پھوٹتے پانی کے چمکیلے سنگریزے ... گھاٹیوں کے پہلوؤں پر گٹھے ہوئے بدنوں کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں سرخ سرخ چمکیلے بیروں سے جڑی۔ اخروٹ اور ناشپاتی کی روح افزا مہک ..... بس پریوں کی کہانیوں میں کچھ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کہ ان کے بادشاہ شکار کھیلتے کھیلتے آپ ہی کہیں ان جانی راہوں میں گم ہو جاتے ہوں گے ..... کیلاش کی وادیاں سوات سے کسی طور خوب صورت نہ ہوں گی۔ میں بڑی خوش تھی کافرستان کی جگہ سوات چلی گئی ۔ .....

پھر اڑن طشتری اچانک ایک نہایت وسیع سرسبز باغ نما خطے میں رُکی۔ سب کچھ اتنا اچانک اتنا جادوئی تھا کہ کسی نے آپس میں کچھ پوچھا بھی نہیں۔

سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک نہایت خوب صورت لان کے ایک طرف ایک کھلونا نما گلابی عمارت کھڑی تھی ..... ارد گرد لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ۔ کاریں، ویگنیں۔ رش۔ دنگ ... بھاگ دوڑ ..... فن موسیقی سے لبریز۔ طربیہ سُر ٹوٹے پتے پتے سے بہہ رہے تھے ..... میں نے بچوں سے کہا۔ شاید یہاں جنگل میں کوئی شادی ہو رہی ہے۔ بس غیر ارادی طور پر ہم بھی کار سے اتر کر ہجوم میں شامل ہو گئے۔ پھر ایک عجیب سی صدا آئی۔ خاموش! — ساتھ ہی اچانک پائن کے گھنے درختوں کے پیچھے سے سنہری بالوں والی ایک گڑیا نما لڑکی سفید قمیص اور سفید مکھن جین میں ملبوس لاٹو کی طرح گھومتی گھومتی آئی اور بادلوں اور ہواؤں کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر والہانہ انداز میں رقص کرنا شروع کر دیا ..... سب مبہوت سے کھڑے تھے۔ پھر نظلے نے زور سے سعید کو جھنجھوڑا "بھائی جان بابرا شریف"۔ ان دونوں کی آنکھوں میں قمقمے جل اُٹھے۔ ابھی رقص کلائمیکس (CLIMAX) پر نہیں پہنچا تھا کہ جنگل کے دوسرے کنارے سے، ایک نوجوان خوبرو خوش لباس، خوش اطوار گاف کھیلنے کی چھڑی ہوا میں لہراتا آیا اور اس پری وش کو یوں البیلی ہواؤں اور مستانے بادلوں کے ساتھ آزادانہ اٹھکیلیاں کرتے دیکھ کر حواس باختہ سا ہو گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے دونوں معصوموں کی جگر سوز آہوں کی پروا کئے بغیر آگے بڑھا اور بڑی سرعت سے اس چنچل بیلی کافرادا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں پیوست کر کے بقیہ رقص کے ذریعے پیغام محبت سنانے لگا ..... پہاڑی کے پیچھے سے وہی روکھی سی صدا گونجی۔ کٹ! — اوئے چھوٹے حرامی، مجھے کہا تھا۔ اس شاٹ میں پہلے بے بی پر دھواں چھوڑنا تھا۔ اور آخر میں راحت صاحب پر دُھنہ۔ ستیاناس کرا دیا بنے بنائے شاٹ کا۔ چلو اب دوبارہ — ریڈی۔

وہ فلم صائمہ یا آسما ہ کی شوٹنگ تھی۔ جنگل میں منگل۔ شاٹ دوبارہ شروع ہوا۔ سب کچھ پہلے والا ہوا۔ صرف چھوٹے نے باربرا کے میدان میں آتے ہی کپڑے دھونے والی لوہے کی باٹی میں اُپلوں اور لکڑی کے چھوڑوں کی دھونی لگا کر کیمرے کے آگے سے بھاگ بھاگ کر گزرنا شروع کر دیا۔ ہیما سابن کر ..... عشقیہ سین چلتا رہا۔ ہماری ہنسی چھوٹتی رہی اور راحت کاظمی کی بیوی سائرہ پھنسی ہوئی پتلون اور بڑا سا نیکسی ہیٹ پہنے۔ کونے میں کھڑی گڑیا جیسی باربرا کو کاظمی کے سینے سے لپٹا دیکھ کر کھسیانی سی مسکراتی رہی۔

میرا تو تھوڑی دیر میں جی الجھ سا گیا کیسی مصنوعی رونق تھی۔ لگتا تھا وادی کی شفاف جلد پہ (ACNE) اکنی نکل آئی ہو۔

ہم لوگ آہستہ آہستہ گلابی عمارت کے برآمدے کے ساتھ لکڑی کے بڑے بڑے مڈوں پر جم گئے۔ جھمبسوں نے قدم قدم اترنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ سارا غل غپاڑہ اپنی چھوٹی سی کائنات وگینوں اور کاروں میں لاد کر نیچے آبادی کی طرف چل دیا۔ اب اس کھلونا نما ریسٹ ہاؤس کے گلابی برآمدے میں صرف ہم تھے اور بڑی بڑی مونچھوں والا چوکیدار۔ سناٹے نے ایک دم پوری وادی پہ تنبو تان لئے تھے۔ ایسی مہذب جگہ دیکھ کر بچے مچل گئے وہ اس سڑے بسے ہوٹل میں واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔

سعید نے چوکیدار سے پوچھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس کس کا ہے۔

فارسٹ والوں کا۔ سرخ آنکھوں اور چھدری ڈاڑھی والے چوکیدار نے بے رُخی سے جواب دیا۔

عجیب سا آدمی تھا۔ کھڑا تڑا لمبا تڑنگا گہرا سانولا رنگ۔ کمر میں کارتوس کی پیٹی کندھے پہ رائفل۔ بڑی بڑی سرخی مائل آنکھوں میں کُبک سرمہ۔ لگتا تھا علاقے کے سارے ڈاکو اسی کے ماتحت ہوں گے۔

"انچارج کون ہے؟" میں نے بھی ذرا رعب سے پوچھا۔

"فارسٹ آفیسر"۔

"ادھر ہی ہیں"۔

"جی" اُس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"ہمیں ان کے پاس لے چلو"۔

عمارت کے پچھلے حصے کی طرف بوگن ویلیا اور انگور کی زردی مائل بیلوں میں چھپی لکڑی کے کندوں کی بنی ایک چھوٹی سی انیکسی تھی۔

..... آگے جنگل بیابان یہ فارسٹ آفیسری بھی عجب بدروحوں جیسی نوکری ہے۔ میں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

چوکیدار مجھے باہر کھڑا کر کے اندر چلا گیا۔

"میں صاحب کا پتا کروں"۔

ہرے سمندروں کے رنگ کی ہوائیں جنگل میں سے لہر در لہر اٹھ رہی تھیں۔ پتے غول در غول شاید میری طرف اڑے چلے آ رہے تھے۔ ماحول پڑا "ایڈ گر ایلن پو" قسم کا تھا۔ مجھے لگا بس ذرا سی دیر میں۔ لکڑی کی انیکسی شق ہو گی اور کوئی لمبے لمبے دانتوں اور میلی جٹوں والی جادوگرنی، مجھے ہمیشہ کے لئے پتھر کا بنا کر چل دے گی۔ یا وہ چوکیدار دیکھتے دیکھتے آسمان جتنا لمبا ہو جائے گا اور ہر طرف سے مانس گند مانس گند کی آوازیں آنا شروع ہو جائیں گی۔

"اندر آ جائیے" ایک مہذب سی کھرج دار آواز سنائی دی۔

"جی۔ شکریہ"۔

وہ ایک چالیس بیالیس کا کریو کٹ بالوں اور ذہین سی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں والا مدبر سا آدمی تھا۔ مونچھیں فکسو سے جمی۔ بل دار۔ چہرہ لمبوترا۔ پر بیزار۔ اندر جاتے ہی میرے منہ سے ایک عجیب چیخ نما، اوئی نکلی۔ دروازے کے بالکل پاس ایک لگڑ بگا۔ یا شیر کی کوئی بگڑی ہوئی نسل جیسا چوپایہ۔ بے جان۔ ممی بنا، کانچ کی بے نور آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔ ڈریئے نہیں یہ STUFF کیا ہوا ہے"۔

"جی دراصل ہم شہری لوگ جنگلی جانوروں سے بڑا ڈرتے ہیں"۔ میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے کہا۔

"آبادیوں سے دور گھنے جنگلوں میں چوپایوں اور چرند پرند کے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں کی سوچ کی پھر کی ہم سے بہت مختلف نہج پہ پھر جاتی ہے۔ اس فارسٹ آفیسر کا کمرہ بھی کئی ملین بی سی کے کسی عجیب و غریب کیو (CAVE) سے کم نہ تھا۔

اَن دیکھے ناپید، نئے پرانے، جانور پرندے، چوپائے۔ بھوسلے کرم خوردہ چہروں پہ مُردنی، آنکھوں میں کانچ کے بے نور ٹکڑے STUFF کئے ہوئے، کمرے کے ہر کونے میں اپنے اپنے انداز سے کھڑے تھے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ بغیر کمرے کی بات کئے بھاگ جاؤں۔ پر وہ بچے؟؟

"میں مسز بریگیڈیئر عاطف ہوں" میں نے لفظ بریگیڈیئر پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر"۔ اُس نے اپنے ایک عقاب نما جانور کی کمر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا کر سکتا ہوں آپ کے لئے"۔

جو لوگ چوکڑیاں بھرتے، کلیلیں کرتے خوب صورت جانوروں کو گولی کا نشانہ بنا کر لال سرخ خون کی جگہ گھاس پھوس بھر کر مُردہ حالت میں اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ مجھے ان سے بات کرتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔ اسی ایک وہم سے اگر انہی لوگوں میں سے کسی کو کسی روز مجھ سے محبت ہو گئی تو؟؟

اوہ خدا! بھوسے سے STUFF ہو کر میں کتنی خوفناک لگوں گی۔

"وہ دراصل جس ہوٹل میں ہم آ کر ٹھہرے ہیں۔ وہ بہت ہی گندہ"۔۔۔

اس نے جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی چوکیدار سے کہا۔

"چوکیدار بیگم صاحبہ کو ریسٹ ہاؤس کی چابی دے دو۔ بستر وغیرہ چک کر دو"۔

"جی اور کچھ؟!"

"ہونہہ! چابی تو ایسے دی ہے۔ جیسے حاجی کیمپ میں لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ نک چڑھا"۔

بچے خوش تھے، اس (SLUM) سلم نما ہوٹل سے چھٹکارا مل گیا تھا۔

رات جمبو جیٹ کی طرح پر پھیلائے چاروں طرف لینڈ کر رہی تھی۔ درخت جو دھوپ میں سکڑے سکڑے سنہرے سنہرے نظر آ رہے تھے۔ تاریکی پھیلتے ہی سیاہ۔ بے ہنگم، آوارہ سے لگنے شروع ہو گئے تھے۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ پہاڑ کی اس طلسماتی نما چوٹی پہ کئی میل کے ریڈیس میں میرے اور میرے بچوں اُس فارسٹ افسر اور چوکیدار ڈاکو نما کے سوا کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔۔۔ مجھے ایک جھرجھری سی آ گئی۔

ریسٹ ہاؤس کے ایک طرف لامتناہی جنگل دوسری طرف عمیق گھاٹیاں۔ گہری اندھی۔ ان دیکھی۔ ٹھنڈی ٹیالی ہوائیں۔ اکیلی۔ بے رونق۔

میرے اور میرے چھوٹے بچے شیکو کے سوا باقی سب کی عمریں ایسی تھیں جب خطرے رومان میں رنگے ہوئے ہیں۔
ظلا، لان میں کھڑا، سعید سے کہہ رہا تھا "بھائی جان اگر اس وقت زور کی آندھی چلے۔ درختوں کے نیچے سے بجلی کے کوندے لپکیں۔ ریسٹ ہاؤس کی ساری بتیاں بجھ جائیں۔ ہاہا! آپ نے انگریزی فلم "اومن" دیکھی۔ سُنا ہے ایسی راتوں میں چڑیلوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی چڑیل نے آپ کو دلہا چُن لیا تو؟"
"بکواس بند کرو ظلے"۔ میں نے اسے زور سے ڈانٹا۔ دراصل خوف سے میری اپنی گھگھی بندھنے والی تھی۔
میری نانی نے بچپن میں کئی بار بتایا تھا کہ بھوت پریت، شیر چیتوں کو ڈرانے کا سب سے مؤثر ذریعہ آگ ہوتی ہے۔ میں نے سب تحفظ کا انتظام کرنا چاہا۔ جلو میں کہہ آگ کا الاؤ جلائیں۔ باہر لان میں
خانہ بدوش قافلوں کی طرح سب اپنی اپنی لکڑیاں اکٹھی کرو۔
تھوڑی دیر خاصا اُدھم مچا۔ الاؤ نے واقعی وادی کا رنگ بدل کر رکھ دیا۔
لڑکیوں نے کیسٹ ریکارڈر پر لوک گیت لگا کر آگ کے اردگرد ٹڈی شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ سارے شامل ہو گئے۔ مجھے انگریزی فلم "LITTLE HOUSE ON PRAIRI" یاد آنے لگی۔ پتا نہیں یہ خوف، خوشیاں۔ غم غصے، ہمارے اپنے ہی اندر کیوں بستے ہیں؟؟ آگ کی آنچ میں خوب صورت سے اس نوجوان گروہ نے، اپنے اندر کلبلاتے زندگی کے انتھاہ جذبوں سے ریسٹ ہاؤس، جنگل پہاڑ۔ وادیاں۔ سب پر ہولی کے رنگ چھڑک دیے۔ اُن کے نوجوان جسموں سے نکلتی شعاعیں میرے اندر بھی تھرکنے لگیں۔ وقت کی دھول جھڑ گئی اور میں نے اُن کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ناچنا شروع کر دیا۔
کوئی کمروں میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ کھانا، مٹھائیاں، پھل بچوں نے وہیں آگ کے گرد بیٹھ کر کھایا۔
تب جنگل اور فضا اور وقت ہمارے تابع ہو گیا تھا۔
پتا نہیں رات کے کتنے بج چکے تھے۔ کمروں میں جانے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔۔۔۔
ہوائیں، تیز اور یخ بستہ ہوئی جا رہی تھیں ہم درختوں کی خشک ٹہنیوں سے الاؤ کو بڑے سے بڑا کئے جا رہے تھے۔
اچانک درختوں کے جھنڈ میں سے فارسٹ افسر مٹھو کا لمبا چغہ پہنے نمودار ہوا۔ "میں آپ لوگوں کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا لیکن رات بہت ہو گئی ہے۔ آپ لوگ اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں"۔
"جی جی! بس آپ تو جانتے ہیں یہ لڑکپن کی عمر۔ یہ لوگ ماحول کے انوکھے پن کو بڑا ENJOY کر رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ چائے پی لیجیے۔ چائے کے بعد میں ان سب کو اندر لے جاؤں گی۔ کیا یہاں کوئی خاص خطرہ ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی یہاں چیتا وغیرہ آ جاتا ہے۔ پچھلے برس بستی سے ایک بچی اٹھا کر لے گیا تھا۔ پھر کئی بار یہاں سڑک پر سے ٹرک گذرتے ہیں دیر دیر سے غیر آباد علاقوں میں مال وغیرہ لے جانے کو۔ اُن میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ ویسے سوائی بنیادی طور پر مار دھاڑ کرنے والے نہیں۔ آپ گھبرائیے نہیں

شاید وہ عجیب سا آدمی، خوا مخواہ ہم میں شامل ہونا چاہتا ہو۔ اور خود بھی اچھا آدمی نہ ہو۔ میں چپ سی ہو گئی۔ پھر وہ چپکے سے اٹھ کر کے ایک بڑے سے ٹہنے پر بیٹھ گیا۔ بچے چائے بنانے میں مشغول ہو گئے۔

آپ شروع ہی فارسٹ کی نوکری کرتے رہے۔ یہ بھی عجیب لائن ہے۔ بس جنگل ہی جنگل۔ انسانوں سے پرے۔ اس سے پہلے آپ کی پوسٹنگ کہاں تھی۔ میں نے بات کی خاطر بات کی۔

"وادیٔ کلاش میں"۔ اُس نے مختصر جواب دیا۔

"وہی جسے کافرستان کہتے ہیں۔ چترال والا"۔ میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں وہی"۔ وہ پھر چپ ہو گیا۔

"اُف آپ تو اسے بہت جان گئے ہوں گے مجھے وہاں جانے کا بڑا شوق ہے"۔

"چلی جائیے۔ اب تو وہاں سڑک بن گئی ہے۔ ہم لوگ تو گھوڑوں پر جایا کرتے تھے"۔

"جی۔ بڑی دلچسپ بات ہے جی"۔

"میرا نام منظر ہے" اس نے بات کاٹ کر جواب دیا۔

"جی۔ کیسا لگا آپ کو کلاش"۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔

"بس میں کوئی ایک سال رہا وہاں۔ پھر خود ہی لڑ جھگڑ کر پوسٹنگ کروا لی" اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ایسی، اللہ میاں کے پچھواڑے، جگہ اور ایسے انوکھے کلچر میں کوئی رہے بھی کیسے؟ سال گذار لینا بھی بڑی ہمت کا کام ہے"۔

یہ بات نہیں تھی۔ میں نے تو تبدیلی بھی وہاں رضا کارانہ طور پر کرائی تھی۔ اس علاقے کو جان لینے کا مجھے خبط تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ انسان کا اگر پچھلے جنموں سے کوئی تعلق ہے۔ تو پھر میرا کوئی دادا، پڑدادا ضرور اسی وادی کا ہو گا۔ اسی لیے۔ اگر سال کے اندر اندر میں وہاں سے بھاگ نہ آتا تو شاید پھر کبھی واپس نہ آ سکتا۔

"وہ کیوں؟" ہم سب نے یک زبان ہو کر حیرت سے پوچھا۔

وہ عجیب جگہ ہے..... عجیب لوگ ہیں۔ چند مہینوں کے اندر اندر جیسے پکا ہوا سیب کششِ ثقل سے زمین پہ گرے بنا نہیں رہ سکتا۔ آپ مقناطیسی قوت سے وادی کے چپے چپے میں دھنستے جاتے ہیں۔ ایک روحانیت سی وارد ہونے لگتی ہے آپ کے اندر..... محبتیں برف کے گالوں کی طرح آہستہ آہستہ نرم روی سے آپ کے اردگرد پرے باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور آپ کسی جوگے نہیں رہتے۔ بس اسی لئے۔ جب مجھ پر یہ کیفیت شدت سے طاری ہونا شروع ہوئی۔ اور میں نے انگور کا سیاہ رس پی کر لکڑی کے فرش پہ ننگا سونا شروع کر دیا تو میں نے پوسٹنگ کرا لی۔ میرے بہن بھائی ہیں۔ ماں باپ ہیں۔ ملک ہے۔ اس پہ کچھ جذب کی کیفیت طاری تھی۔ وہ الاؤ کے اندر بہت دور گھورے جا رہا تھا۔ بولتا چلا جا رہا تھا۔

"چائے پی لیجئے انکل"۔ میری چھوٹی بیٹی نے پیالی آگے بڑھائی۔

اسے جھٹکا سا لگا۔ "اللہ تیری شان"۔ کہہ کر اس نے پیالی تھام لی۔

"انکل وہ ہیں کون لوگ"۔ میری بڑی بیٹی نے تجسس سے پوچھا۔

شعلے آگ کے اندر چھوٹے چھوٹے ستونوں کی طرح اُٹھ رہے تھے۔ سردی پل پل شب خون مارنے والی فوج کی طرح بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم سب نے آگ کے گرد گھیرا تنگ کر لیا۔

فارسٹ افسر نے آتے ہی ہمیں جو کمروں میں چلے جانے کی تلقین کی تھی۔ اب وہ اسے مکمل طور پر بھول چکا تھا۔ اُس نے آگ کے نیلے نیلے شعلوں سے پرے خلاؤں میں کچھ ڈھونڈھتے ہوئے کہا۔

"کئی سو برس پہلے مشرق وسطےٰ اور یوروپی اقوام میں ہندوستان کے سوداگروں، راجوں مہاراجوں کی شان و شکوہ، پہاڑوں کی کھوہوں اور جنگلوں کی پہنائیوں میں سچ تلاش کرنے والے یوگیوں تیکھی چتون اور سیاہ بالوں والی رقاصاؤں اور چتکبرے سانپ گلے میں ڈال کر وجدان حاصل کرنے والے پیروں کے بارے میں بڑی تحیر ناکہانیاں مشہور تھیں۔

واقعی وہ تہذیب تھی بھی بڑی نادر۔ مونجو ڈاڑو، ہڑپہ ٹیکسلا کی عورتیں لعل و یاقوت کے نازک زیور پہنتی تھیں۔ بادشاہوں نے اپنا رسم الخط ایجاد کر لیا تھا۔ تجارت کا بول بالا تھا۔ یورپ کی بیشتر قوموں نے ابھی نہانا بھی نہیں سیکھا تھا۔ بہتوں کی معیشت کا ڈھانچہ صرف بحری قزاقی پہ کھڑا تھا۔ اس خطہ کائنات کی خوشحالی تہذیب تمدن، علم و ہنر کی ایسی دھوم تھی کہ مشرق وسطےٰ اور یورپ میں جب بھی کوئی افتاد پڑی۔ یار لوگوں نے اِدھر ہی کا رخ کیا۔

مجھے کچھ کوفت سی ہونے لگی تھی۔ شاید وہ ہمیں اپنی علمیت سے متاثر کرنا چاہتا تھا۔ بچے بالکل محو تھے۔ "سُنا ہے کئی سو برس پہلے۔ سکندر اعظم سے بھی پہلے یونان کا ایک بہادر جرنیل ہراڈٹس کہ اس کی شجاعت کے چرچے چار دانگ عالم تھے۔ ایک لشکر جرار ساتھ لے کر ایشیا فتح کرنے نکلا۔" پر میں کئی بار سوچتا ہوں اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ خود یونان جیوپیٹر کی وینس کی HLYSSES کی سرزمین کہ جس کے آگے کائنات سرنگوں تھی۔ فہم و ادراک کا سرچشمہ۔ شیروں اور ہاتھیوں کی پیٹھ پہ سواری کرنے والے جری نوجوان۔ اپنی الوہی مسکراہٹوں سے کائنات کی تقدیر بدل ڈالنے ——— والی دیویاں۔ دولت کی، افراط یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ وہ شیر افگن جنگل جنگل صحرا صحرا کیا فتح کرنے نکلا تھا۔ تاریخ بالکل مبہم ہے۔

ہراڈٹس کے بہادر سپاہی۔ کتنے برس کتنے مہینے، خوفناک جنگلوں، لق و دق صحراؤں پرشور دریاؤں اور فلک بوس پہاڑوں سے لڑتے رہے۔ راستوں میں کتنوں نے کتنوں کے خون کئے۔ کتنوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ کس کس نے کس کس کی عورتوں اور بچوں کو لوٹا تہ تیغ کیا کیسی کیسی دشمنیاں ہوئیں۔ کیسی کیسی دوستیاں۔ اسلوب سفر کیا تھا۔ پڑاؤ کیا کیا تھے۔ کوئی بھی تفصیل سے نہیں جانتا ہاں کچھ لوگ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ جرنیل کے لشکر سے جو بچ نکلے تھے۔ ٹرج میر کی سنگلاخ پہاڑیوں کا سلسلہ پار کرتے ہی وادی چترال کی کومل ہواؤں، سرسبز لہلہاتی کھیتیوں اور شفاف پانیوں کے چشمے دیکھ کر فتح و شکست کے سارے کھیل بھلا بیٹھے تھے۔ خود جرنیل ہراڈٹس کی حالت بھی سپاہیوں سے کچھ مختلف نہ تھی شکستہ بدن خجستہ پا۔ چترال کی پہاڑیوں کے عقب سے چڑھتی سورج کی لاجوردی کرنوں، دودھیا چاندنیوں اور سارے میں رچی جنگلی پھولوں کی مہک نے اسے ایسا مسحور کر دیا کہ اس نے اس کے آگے سفر کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ کسی اور منزل کی تلاش ہی نہ رہی۔" الاؤ کے اوپر سے ایک تیز رفتار جھونکا گذرا اور بہت سے روشن چنگاڑے ہمارے آس پاس پھیلا کر تاریکی میں گم ہو گیا۔ سرخ آنکھوں والا عصیلا چوکیدار

اپنے باس کے ڈر سے رائفل گلے میں لٹکائے برآمدے میں اکڑوں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بچے اسی طرح مسحور تھے اور فارسٹ افسر شاید کسی ٹرانس میں تھا۔ الاؤ کے ادھ بجھے مدھم شعلے اس کے چہرے کو عجب مافوق الفطرت قسم کا رنگ دے رہے تھے۔ میں نے مصلحتاً بازو پھیلا کر اپنی گھڑی دیکھی۔ "آف رات کے دو بج گئے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

انکل آپ نے وہاں کی اس وقت کی لوکل آبادی کے رویے میں کوئی بات ہی نہیں بتائی۔ میری بڑی بیٹی گل نے مزید ٹانکا لگایا۔

"میں ابھی اسی طرف آ رہا تھا۔" اُسے ٹوکنا اچھا نہ لگا۔ اڈی اڑائی سے یہی پتا چلتا ہے کہ اس وقت چترالی وقت کی نزاکت کے تحت یونانیوں سے ماتھا لگانے کو تیار نہ تھے۔ یوں فطرتاً بھی یہاں کے لوگ ہمیشہ امن پسند رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ لوگ چترالیوں کے ساتھ ایسے ضم ہوئے نہ حریر و دیبا میں لپٹی یونانی دوشیزائیں یاد رہیں۔ نہ وہاں کے شہرہ آفاق فیلتاؤں کی خدائی برقرار رہی۔ وقت کے انمٹ دھارے بہتے رہے۔ اور چترال کے مضافات کی ساری وادیاں سیاہ انگور کی بیلوں، دیوقامت گھوڑوں سبز آنکھوں اور ستواں ناکوں والے یونانی بچوں اور ان کی محنت کش ماؤں سے آباد ہو گئیں۔ یہ یونان والوں کو سرزمین ہند و پاک کی جاذبیتوں نے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔

ہرا ڈٹس کے جتھے نے جب چترال کی مٹی کو اپنا گھر مان لیا۔ تو یونان سے ایک اور طوفان اٹھا۔ پہلے سے بہت تند بہت تیز۔ سکندر اعظم۔ کہ ہندوستان تو کیا اسے کائنات بھی اپنے ارادوں کے آگے ہیچ نظر آتی تھی۔ اس نے دنیا اپنے سینگوں پر اٹھائی وسط ایشیا تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔

چترال کے گرد و نواح سے گذرا تو کسی نے خبر دی کہ ہرا ڈٹس کے سپاہیوں کی نسل نے انہی پہاڑیوں میں کہیں چھوٹا سا یونان بسا رکھا ہے۔ وہ آپ کے منتظر ہیں۔ اس طوفان کی (VELOCITY) ولاسٹی اتنی شدید تھی راستوں میں رکنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی کچھ سپاہی ایسے تھے زخمی، ٹوٹے پھوٹے شکست و ریخت سے دل برداشتہ۔ اُن میں آگے بڑھنے کی ہمت پسپا ہو چکی تھی۔۔۔ کہتے ہیں وہ یونانیوں کی دوسری ٹکڑی تھی جو کافرستان میں آباد ہوئی۔۔۔۔۔ سب سے چھوٹا دس سال والا کھسکتا کھسکتا میری گود میں سو چکا تھا۔ ڈھانی بجنے والے تھے۔ باتیوں کے چہرے بھی یوں تھے جیسے یونان سے پیدل چل کر آئے ہوں۔ میں اس آدمی سے اندر اندر سے بری طرح متاثر تھی۔ کوئی ٹرک نیچے وادی سے ہمارے والی پہاڑی کی طرف چڑھ رہا تھا۔

اس پس منظر کی محققانہ سچائی کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ویسے وہ علاقہ یوں ہی میرے جی میں بس گیا ہے۔ اس کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا۔ آپ کے گوش گذار کر دیا۔" اس نے کھڑے ہوتے کہا۔ میرا خیال ہے اب آپ کو یوں جنگل میں ایک لمحہ بھی مزید نہیں رکنا چاہیے۔ ٹرک قریب آنے سے پہلے اندر چلے جائیے۔

ہم سب کچھ لمحے سحر زدہ سے اس کی بات سنتے رہے۔ لگتا تھا وہ کسی دوسری دنیا کا باشندہ ہے۔ جو کبھی کبھی کوئی خاص مشن لے کر تھوڑی دیر کو ہماری دنیا میں آ نکلتے ہیں۔ اور پھر اچانک اپنی فلائنگ ساسر کا بٹن دبا کر پیچھے دھوئیں کی سفید لکیر چھوڑ کر گم ہو جاتے ہیں۔

ٹرک کی گھوں گھوں اب بہت قریب آ چکی تھی۔ ہم نے ہڑبڑا کر اپنے کمروں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ چوکیدار کے چہرے پہ بڑی کمینی سی مسکراہٹ تھی۔۔۔۔

اگلی صبح اچانک سوات سے میرا جی اُچاٹ ہو چکا تھا۔ پر بچے وادی میں کچھ تصویر کشی کرنا چاہتے تھے۔ ریسٹ ہاؤس مانگ لینے

کی لاج بھی رکھنا تھی - اس روز واپس چلے آنے کا خیال کسی کو بھی اچھا نہ لگا۔ . . .

میرا جی چاہتا تھا کسی ایسی جگہ چلیں "۔ بکنارا" وغیرہ بدھ کے سٹوپا اور وہ عبادت گاہیں دیکھنے جہاں صدیوں پہلے ان پہاڑی کھوہوں میں علم کے چراغ روشن ہوئے تھے۔ جہاں ایک عظیم انسان نے مشرق کی ساری سائیکی کی نبیوں رکھی تھیں پر وقت کم تھا اور بچوں کے ذہن مردہ شہروں میں اپنی تہذیب کی جڑیں ڈھونڈھنے کو تیار نہ تھے۔ ہم ریسٹ ہاؤس کی مخالف سمت پہاڑی گھاٹیوں کی طرف نکل گئے۔

موسم بہت خوشگوار تھا۔ پچھلی رات کی یخ بستہ ہوائیں تر و تازہ کومل جھونکوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ خوش الحان پرندے سیبوں، ناشپاتیوں آلوچوں کے درختوں کی ڈالیوں پہ بیٹھے چہچہا رہے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں دور تک مخصوص پہاڑی گھر نظر آ رہے تھے۔ ان کے آگے چھوٹی چھوٹی کھیتیوں میں کچھ لوگ کام کرنے میں مشغول تھے۔

" امی ہم نے ایسے گھر کبھی قریب سے نہیں دیکھے ہمیں ادھر لے کر چلئے "۔ میری چھوٹی بیٹی نے اصرار کیا۔ لوگوں کو قریب سے جان لینے کا خبط تو مجھے بھی اتنے ڈھیر سارے سفروں نے ڈال دیا ہے۔

ہم پاس پہنچے تو کھیت کے کنارے سیاہ فرغل والی ایک عورت ہمیں دیکھ کر یوں بھاگی جیسے ہم کسی اور دنیا کے باشندے ہوں ہم نے ہنس کر سب کو سلام کیا۔

" وعلیکم سلام "۔ مردوں نے اپنے اپنے پھاوڑے ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہنس ہنس کر پشتو میں پتا نہیں ایک دوسرے سے کیا کہنے لگے۔ اُن کی آنکھوں کے تحیر اور تجسس سے لگتا تھا۔ وہ اچانک ڈزنی لینڈ میں پہنچ گئے ہیں۔ ایک اردو جانتا تھا۔ وہ بڑے اخلاق سے بولا " آؤ آؤ بیٹھو۔ کدھر سے آیا؟؟

" خان صاحب، آپ کے گھر سے پانی پی سکتے ہیں۔ ذرا پیاس لگی ہے "۔ میں نے اس کے گھر جانے کا بہانہ بنایا۔

" کیوں نہیں پیا جا سکتا ہے جی۔ پانی پیو۔ چائے بھی پیو۔ چلو چلو۔ پر صرف زنانہ۔ مردانہ نہیں "۔

" مارے گئے "۔ ظلے نے آہستہ سے کہا۔

وہ کافی کشادہ اور مقابلتہً صاف ستھرا سا گھر تھا۔ بڑا سا صحن، برآمدہ اور دو کمرے۔ برآمدے میں رنگین پائیوں کا پلنگ دو پیڑھے اور لکڑی کی ایک کرسی رکھی تھی۔

پاس ہی دو پٹھانیاں پشواز نما سیاہ چغوں میں ملبوس بڑی بڑی چادریں لپیٹے زمین پر بیٹھی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر بجلی کی رفتار سے دونوں اٹھ کر اندر بھاگ گئیں . . . . خان جلدی جلدی اندر سے کڑھائی سے لتھڑی ایک بڑی سی چادر لایا اور چارپائی پر بچھا کر اوپر ہمیں بٹھا دیا۔

" خان صاحب آپ کی بیگم ہم سے کیوں پردہ کرتی ہے۔ ہم تو عورتیں ہیں "۔ میں نے ہنس کر خان سے پوچھا۔

" یہ پردہ مردہ نہیں کرتا ہے جی۔ جنگلی ہے۔ کبھی شہر نہیں دیکھا۔ آپ کے بال مال کپڑے دیکھ کر شرم کھاتا ہے "۔ پھر اس نے پشتو میں سختی سے بیوی کو باہر آنے کے لئے ڈانٹا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہچکچاتی ہچکچاتی ہمارے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئیں۔

چادروں کے تنبو تانے ہوئے۔ ہاتھوں سے پتا چل رہا تھا۔ ایک بہت بوڑھی تھی اور ایک بہت جوان۔

"ایک میرا ماں ہے جی ایک بی بی"۔ خان نے تعارف کروایا"۔ بیوی کو ایک اور ڈانٹ پلائی تو اس کی زور سے ہنسی کی آواز آئی اور اُس نے چہرے سے چادر ذرا پرے سرکائی۔

سوات کی مختلف وادیوں میں کئی قبیلوں اور کئی ذات پات کے لوگ بستے ہیں۔ یوسف زئی۔ گجر۔ پٹھان۔ سید اور جانے کیا کیا؟؟ لیکن سید و شریف، منگورا، کالام کے عام سڑکوں بازاروں پہاڑی راستوں میں جتنی آبادی دیکھی۔ رنگ روپ شکل و شباہت میں بالکل غیر معمولی نہ تھی۔ سکندرِ اعظم سے اب تک پتا نہیں کیا کیا قومیں آئیں اور کیسے کیسے انٹرکس ہوئیں پتا نہیں خالص آریہ نسلیں کیا ہوتی تھیں؟ پرخان کی بیوی کا چہرہ دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ سکندرِ اعظم کی محبوبہ رخسانہ ضرور اسی لڑکی کے خاندان سے ہوگی۔ دودھیا رنگ، بڑی بڑی چمکیلی سیاہ آنکھیں ہنستی ہوئی گھنیری پلکیں۔ ستواں سی کھڑی ناک گول گول سا گلابی دہانہ اور ٹھوڑی پر تین نیلے تِل۔ خود ساختہ۔

"آپ کی بیوی کیسی خوبصورت ہے خان۔ کہاں سے آئی ہے یہ؟" ہم تینوں نے اکٹھے سوال کیا۔

"خوب صورت کو کیا کرے گا جی" خان نے ذرا شرماتے ہوئے جواب دیا۔ جو کمایا تھا اس کے ساتھ شادی بنانے میں خرچ ہوگیا۔ بہت پیسہ لیا اس کے باپ نے اس کا۔ ہم نے بھی ضد میں آکر اس کو لے لیا جی!

عجب سلسلہ تھا وہاں۔ بہت سارے قبیلوں میں سب سے مہنگی صنف بیوی ہے۔ ایک طرف رسم و رواج دوسری طرف مذہب۔ لڑکی کی قیمت، پوری بارات کا خرچ، پھر حق مہر، لڑکیاں پیدا ہوتے ہی گھر والوں کے تو بھاگ کھل جاتے ہیں۔ اور مردوں کو آدھی عمر لگ جاتی ہے کوڑی کوڑی کرنے میں۔ پائی پائی جمع ہو تو عزت سے گھر بسے۔ وہاں پنجابی بابوں کی طرح بیٹی کا ہاتھ تن من دھن وار کر دوسروں کو نہیں دیا جاتا۔

گل نے اس زہرہ جبیں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اپنے کانوں سے موتیوں کی بالیاں اتار کر پہنائیں۔ اس کے میل سے رگیدے چہرے کو پیار کیا اور عش عش کرتے ہم وہاں سے باہر نکل آئے۔ میں نے باہر آکر لڑکوں سے پنجابی میں کہا۔ شکر ہے تم دونوں اندر نہیں گئے۔ نہیں تو مصری عورتوں کی طرح تمہاری بھی انگلیاں کٹ جاتیں۔

باقی وہ سارا دن ہم نے کالام کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر بسر کیا۔ دراصل ریسٹ ہاؤس کے پراسرار سناٹے نے میرے قویٰ تو ایک ہی دن میں ڈھیلے کر دیئے تھے۔ لڑکیاں سوات کے روایتی زیوروں کے پیچھے ماری ماری پھرتی رہیں اور لڑکے اپنے ریکارڈر کے بیٹری سیلوں کے پیچھے۔ شہر میں اس کے سوا کچھ بھی انوکھا نہیں تھا کہ ہم باہر والیوں کے سوا عورت کہیں تھی ہی نہیں۔ اگر کہیں تھی تو بند دروازوں تنگ کھڑکیوں کی دراڑوں کے پیچھے سے جھانکتی۔ سہمی سہمی زرد زرد۔ بھلا ہو محمود غزنوی اور اس کے حواریوں کا جو ایسا کٹر نظام چھوڑ گئے کہ سارے کا سارا الٹ کر بے چاری عورت پر پڑ گیا۔

شہر بھی بس ایسا ہی تھا۔ ٹھیپکل پہاڑی سا۔ ساتھ ساتھ جڑے ہوئے نیم پختہ مکان۔ تنگ تنگ بازار۔ دُکان نما ہوٹلوں کی قطاریں کوٹے کرکٹ سے اَٹی سڑاند ماری گلیاں۔ فرلانگ فرلانگ پر مسجدیں اور موٹے پہاڑی مُلا۔

لڑکے بیزار تھے۔ وہ کسی طور اپنے ساتھ کسی سواتی عورت کی تصویر لے کر آنا چاہتے تھے۔ واپسی پر شہر سے باہر نکلے نے ایک ادھیڑ عمر عورت کو لکڑیاں جمع کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کار میں سے کیمرہ نکال کر چوری سے اس کی تصویر لینا چاہی۔ بڑھیا نے عین وقت

پر پہلو بدلا۔ کیمرے پر نظر ڈالی اور آناً فاناً بڑا سا پتھر اٹھا کر کار پر دے مارا۔ کیمرہ اور ظلے تو بچ گئے۔ پر واپس آ کر کار کے ڈنٹ پر سوا قی معاشرے کے نام تین سو روپے کا چڑھاوا چڑھانا پڑا۔

اس شام ریسٹ ہاؤس جلدی جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ سب کو لوکل موسیقی سننے کا شوق تھا۔ مارے مارے پھرتے رہے۔ پتا چلا۔ موسیقی تو موجود ہے۔ لیکن صرف مردوں کے لیے۔ ان حجروں میں بند جو محلوں سے باہر مردانہ تفریح کے خصوصی مقامات کے طور پر بنائے جاتے ہیں۔ عورت کسی حال میں وہاں سے گذر بھی نہیں سکتی۔

ہم میلے کچیلے عام شام لوگ۔ تیاگ کے فلسفے سے دور۔ اسلام کی مروجہ قدروں سے ناآشنا۔

صبح اٹھتے ہی میں نے سب کو جگایا۔ سامان کار میں لادا۔ فارسٹ افسر کا جو دورے پر جا چکا تھا۔ لکھ کر شکریہ ادا کیا۔ اللہ کا نام لیا اور رُخ کیا اسلام آباد کا۔۔۔۔

فارسٹ افسر سوات نے میرے تکیے کے نرم نرم پروں تلے سوئے ہوئے کافرستان جانے کے خواب میں پٹرول چھڑک دیا تھا۔ دھنی لگا دی تھی۔ پیرس۔ روم لنڈن کے پانچ ستاروں والے ہوٹلوں میں بھی انگور کے کرمزی خوشوں اور نکی کے سرسبز کھیتوں کی مہک چین نہیں لینے دیتی تھی۔

گرمیاں اسلام آباد میں مرگلہ پہاڑیوں کے ذرا عقب میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ وہاں کے گلی کوچے ابھی تک جانے والی بہار کے لٹنے سے اینٹھ رہے تھے اسلام آباد کی بہاریوں بھی نتھ کھلانے والی نوبچی کی طرح بڑی کافر ادا اور توبہ شکن ہوتی ہے۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ، لٹکیں لیتی، کولھے مٹکاتی، اِٹھلاتی۔ کہنیاں مارتی، توبہ توبہ۔ اندر باہر رگوں سے پنجڑ جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ ایسا کر ڈالیں جو پہلے کبھی نہ کیا ہو۔

جس روز میں اسلام آباد کلب گئی تھی بہار میں سے پچھلی رات کی دلہن کی باسی مہک شروع ہو چکی تھی۔ پھر بھی کچھ کر ڈالنے کا جذبہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔

پھر اچانک ایک کنیڈین ملنے والی کے ہاں کچھ ایڈونچر پسند امریکن عورتوں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ جن کے شوہر تیسری دنیا کے افلاس زدہ شہروں کی بہبود کا درد سینے میں لئے سی آئی اے کا کام کرتے اور امریکن ایڈ کے ڈالروں کا بھاری حصہ تنخواہوں میں وصولتے ہیں۔ وہ سب بڑے جوش و خروش سے کافرستان جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ ذرا گپ شپ ہوئی تو ایک نے رُک رُک کر پوچھا۔ آپ چل سکیں گی ہمارے ساتھ؟؟

دوسری نے آہستہ سے کہا "مشکل ہوگا۔ ان کے لئے" پھر سب ہمدردی سے میری طرف تکنے لگیں۔۔۔۔ جیسے میرے اردگرد زنجیروں کا جال تنا ہے۔ اور مغربی عورت کی یہ اپروچ مجھے اسی طرح تبلی لگاتی ہے۔ جیسے کانے کو کانا کہنے پر۔

"کون روکے گا مجھے؟" میں نے ذرا غصے سے کہا۔

"کب چلنا ہے؟"

"منگل کو۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ میرا نام لکھ لیجئے۔"

"ہمارے لیے ان کا جانا واقعی بہت سود مند ہوگا۔"

امریکہ کبھی نفع نقصان کی سطح سے آگے نہیں سوچتا۔

اور وہاں کے بہت سے لوگ ہمیں ابھی تک پتوں سے جسم ڈھانپنے والے وحشی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے یقیناً یہی سوچا ہوگا کہ نٹیو (NATIVE) عورت ساتھ لے جائیں۔ کیا پتا۔ شہروں سے دور ننگے پاؤں چلنے والے جنگلی پٹھان، دولتمند حسین گوریاں دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائیں اور اُن کے بھوکے پیٹ انھیں اُن کی دولت چھیننے پہ مجبور کر دیں۔ پھر ہو سکتا ہے رات ہوتے ہی وہ اُن کے گورے گورے ریشمی بدن تیل کے کڑاہے میں ابال کرنا چتے ہوئے وہ اپنے بڑے بڑے سینگوں والے چیف کو پیش کر دیں اور پاکستانیوں کی محبت سے لبریز امریکن سفارت خانے کا ست سری اکال بول جائے اور یہ کالی پیلی مقامی عورت جنگلیوں کو کچھ تو قابو میں رکھے گی۔

غیر زبان غیر کلچر کے ساتھ ایسے دل پسند سفر پہ جانا مجھے دردِ زہ سے کم نہیں لگتا تھا۔ بس مرتا کیا نہ کرتا والی حالت تھی۔

امریکن میموں کے خاوند بیویوں کے سفر کی تیاری میں یوں مشغول تھے جیسے وہ ایورسٹ کی چوٹی پہ امریکن جھنڈا گاڑنے جا رہی ہوں۔ پیراشوٹ نما ٹنٹ، جنگل میں چلنے والے آٹومیٹک چولھے، ٹارچیں، کھانوں کے منہ بند ڈبے رسے، چاقو، کیلوں والے بوٹ۔ دوائیوں کے ڈبے جانے کیا کیا۔ ٹیلیفون اور تاروں کا ایک جال بچھ چکا تھا۔

چترال کا کمشنر، ڈی سی۔ پی آئی اے۔ پولیس چوکیاں، پولیٹیکل ایجنٹ، پورا سفارت خانہ الٹ کر رہ گیا۔ مجھے تو لگتا تھا۔ واپسی پہ یہ لوگ ہم سے کافرستان کو BASE بنانے پہ زور دیں گی۔

میری تیاری پہ تو پہلے ہی گیلا کمبل پڑا تھا۔ بھلا ہو جنگ اخبار والوں کی سنسنی خیز خبروں کا۔ چترال سے کافرستان کے راستے میں ایک جیپ بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے گر گئی تھی۔ سب لوگ جاں بحق ہو گئے تھے۔ جاں بحق ہونے کا یہ طریقہ میرے سینے میں کانٹے کی طرح چبھ گیا۔ مرنے کا بھی آج کوئی سلیقہ ہونا چاہیے۔ یہ کیا کہ آپ کے مرنے کے بعد لوگ تین تین چار چار دن پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں میں سر مارتے رہیں کہ آپ کا مقدس جسم ان کے ہاتھ لگے۔ اور عین اس وقت جب وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگیں، کسی شوریدہ سی لہر یا کسی جھاڑ جھنکار کے اندر سے آپ کا کوئی ٹوٹا پھوٹا ہاتھ یا مسخ شدہ چہرہ اٹکا نظر آجائے۔۔۔۔ گھر والے بدنصیب لٹھے کا تھان اور تابوت لئے رشتہ داروں کو آلو گوشت اور نان کھلاتے رہیں، مولوی حلوہ کھا کھا کر بینے بنتے رہیں اور آپ کی کوئی ٹانگ دریائے کابل میں ہو اور کوئی کوہِ ٹرچ میر پہ۔۔۔۔۔

میں نے تو اسی وقت امریکنوں کو صاف صاف کہہ دیا "I AM NOT WELL, I CAN NOT GO" میری طبیعت اچھی نہیں میں نہیں جا سکتی۔ آجا کے بس ظلے اور سعید رہ گئے تھے۔ جو عمروں کے تضاد کے باوجود۔ اَن گنت مسافتوں میں میرے رفیق رہے۔ سفر جنت کا ہو یا جہنم کا بات تو ساری فریکوئنسی کی ہے۔ تار نہ ملے تو سارے پینڈے کھوٹے۔

شروع شروع جب ہم نے اکٹھے سیاحت کی تو ناراضگیاں، تلخ کلامیاں، بے حسیاں سب کچھ ہوتا رہا۔ پھر جیسے گھڑائی چھلائی کے بعد کسی ہار میں کنڈے پہ کنڈا برابر بیٹھتا ہے۔ ہم تینوں بھی ایک دوسرے کی اچھی بری عادتوں میں پرفیکٹ گیئر کے ڈھکنے کی طرح فٹ ہو گئے۔

جب امریکنوں کی ٹولی کافرستان گئی وہ دونوں سالزبری یونیورسٹی میں قانون پڑھ رہے تھے۔ پردیس کی دوری کی وجہ

سے یہاں کے چپے چپے کے لیے جدائی سے اُن کی ہوکیں اُٹھ رہی تھیں ..... تبھی انہوں نے مجھے وہاں سے تار دیا کہ چھٹیاں قریب آ رہی ہیں - کافرستان کی تیاری کریں۔" پھر ہُوا بھی ایسے ہی - چھٹی پر آتے ہی انہوں نے مجھے پوچھے بنا ہی چترال کی سیٹیں بک کروا لیں - میں بوکھلا گئی - مجھے خود جاپان سے لوٹے صرف دو تین روز ہوئے تھے - لڑکیوں کی ہاکی اور جاپان میرے رگ وپے پر بری طرح طاری تھا - اپنی لڑکیوں کی ٹیم کو عین وقت پر جہاز سے اتار لینے کا زخم ابھی تک تازہ تھا - پر ان دونوں نے میری ایک نہ سُنی - وہ جانتے تھے - کافرستان ایک ایسا خواب تھا جو میرے ساتھ ساتھ پل کر جوان ہُوا تھا -

آخری نذرانہ

حفیظ احسن

جیب کتروں کا بادشاہ اپنی آنکھوں میں بڑی معصوم اور خوبصورت قسم کی عیاری اور مکاری کی موم بتیاں روشن کئے چوکڑی مارے اپنے سنگھاسن پر بیٹھا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں اگر بتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر کچھ باسی پھولوں کی پتیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ ایک میلے سے بوسیدہ قالین پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ سنکھا بادشاہ ابھی ابھی چائے کی دسویں پیالی پی کر فارغ ہوا تھا اور صبح سے دوپہر تک چند لمحے پہلے اس نے بیسواں سگریٹ سُلگایا تھا۔ دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی تو اس نے ادھ پیا سگریٹ اگالدان میں پھینکا اور "رحق اللہ" کا نعرہ لگایا۔ ایک آنکھ میچ کر اُس دروازے کی طرف دیکھا سانول ہی تھا، اس کی باچھیں خوشی سے کھل اُٹھیں۔ آخر اس کا ہونہار شاگرد اپنے وعدے پر پہنچ ہی گیا تھا، یہ سانول جو تھا تاجیب کتروں کی ٹولی میں نیا نیا شامل ہوا تھا، لیکن ایک ماہ میں ہی اس نے شاندار کامیابیوں کے وہ جھنڈے گاڑ دیئے تھے کہ سنکھا بادشاہ ہی نہیں دوسرے جیب کترے، چور اُچکے اور نوسرباز بھی دانتوں میں اُنگلیاں دبائے اُسے رشک اور حسد سے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے اس کے پاس کوئی جادو ٹونا اور منتر ہے۔ ادھر بھیڑ اور ہجوم میں کوئی لٹکتی ہوئی جیب نظر آئی ادھر سانول کے ہتھیلے میں پکے ہوئے آم کی طرح کٹ کر ایسے گری جیسے کوئی موٹا سا پرندہ اُڑ کر گھنی جھاڑیوں میں گھس جائے۔ اس کے چہرے پر غضب کی معصومیت تھی اور اُستاد سنکھا کہتا تھا کہ اس کی موجودگی میں سانول کو کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں تھی کیسی چاقو بلیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ دیکھنے والا اس کی مسکراہٹ میں دمکتی ہوئی معصومیت کی کرنوں کا مطلب ہی سمجھنے میں مصروف ہوتا کہ سانول کی اُنگلیاں اُس کے مال کا تیہ پانچہ کر کے رکھ دیتیں۔ طبیعت میں ایسی خود اعتمادی تھی کہ بڑے سے بڑے شکار پر بیچ کمیت ہاتھ ڈالتا تھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے کی آنکھوں میں ایسی دھول جھونکتا تھا جیسے وہ پیدائشی اندھا ہو۔

"باشاجی!" وہ جوتیاں اُتار کر سفید بے داغ چاندنی پر پاؤں دھرتے ہوئے بولا: "آج میں نے اپنی سو واردا تیں نہایت کامیابی سے مکمل کر لی ہیں۔ یہ سب آپ کی دُعا اور برکت کا نتیجہ ہے، ایک سو ایکویں واردات ابھی چند منٹ پہلے کی ہے۔ واردات کامیاب تھی لیکن کوئی مال ہاتھ نہیں لگا۔ پھر بھی خیر و برکت کی نشانی کے طور پر یہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے سانول نے اخباری کاغذ میں لپٹا ہوا ایک بہت ہی چھوٹا سا بنڈل اُستاد کے سامنے رکھ دیا۔

"اس میں کیا ہے بچہ؟" اُستاد سنکھا بولا۔ پھر شاگرد کے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے بے چین اُنگلیوں سے اس بنڈل کی ڈھیلی سی گرہ کھولی "ابے! یہ کیا!" اُستاد کی بھویں حیرت سے ماتھے کے اُوپر سیدھی مانگ سے اُلجھنے لگیں۔ "یہ تو چولی ہے ــــ سب چولیاں ہیں!!" سانول اپنی مخصوص معصوم مسکراہٹ چہرے پر پھیلاتا ہوا بولا: "اُستاد صاحب میں کیا کرتا، اس لڑکی کے

ہینڈ بیگ میں تمہارا یہی کچرا!"

"تو چھوڑ دیا ہوتا اُسے!"

اگر چھوڑ دیتا تو ایک سو ایکویں واردات کیسے مکمل کرتا، میرے خیال میں یہ واردات ہر لحاظ سے کامیاب ثابت ہوگی! سانول بولا۔

"وہ کیسے! ——— بنا مال اسے کامیاب کس طرح کہہ سکتے ہیں بھلا!"

"سرکار! مال اس کے بعد ملے گا ——— بلکہ مال ہی مال ملے گا، اگر تھوڑی بہت نقدی ہاتھ آجاتی تو منحوس ثابت ہوتی، سب سے ضروری بات جو ہوتی ہے نا اُستاد وہ واردات کی کامیابی ہوتی ہے۔"

اُستاد سنکھا کچھ دیر شاگرد کی اس فلسفیانہ بات پر غور کرتا رہا، پھر جیسے بات اس کی سمجھ میں آگئی "کوئی بات نہیں، میں لڑکوں کے لیے ان کی نیکریں بنوالوں گا، پر تُو نے مُرغے اور مٹھائی کا وعدہ بھی تو کیا تھا، کمبخت کام کی بات تو تیرے کان سننے سے انکاری ہو جاتے ہیں، ہم نے اس مٹھائی کے انتظار میں آج صبح سے ناشتہ بھی نہیں کیا!"

"مٹھائی حاضر ہے اُستاد!" یہ کہہ کر سانول نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر چکنائی میں رستا ہوا لفافہ نکالا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُسے اتنی صفائی سے چاک کیا کہ ایک پلیٹ کی شکل اختیار کر گیا، وہ یہ لفافی پلیٹ اُستاد کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ مٹھائی بھی وہ ہے اُستاد کہ کھاتے ہی آپ کو وہ سویٹ ڈش یاد آجائے گی جو مرنے کے بعد بہشت میں حوریں آپ کے سامنے رکھیں گی۔

"بڑے الفتے ہو یار ——— لفافے میں مٹھائی اُٹھا لائے، کوئی ڈبہ نہیں ملا۔؟"

"اُستاد! یہ مٹھائی تو آپ جانتے ہیں وارداتی مٹھائی ہے اور آپ جانتے ہیں۔ ڈبے مٹھائی کے ساتھ نہیں دکان کے اندر پچھلی دیواروں کے ساتھ ہوتے ہیں ——— وہاں تک اُنگلیاں نہیں پہنچتیں، پر آپ یہ نہ سمجھئے کہ یہ لفافہ میں نے اپنی گرہ سے خریدا ہے!"

"ایسا سوچ کر ہم اپنے اُستادانہ دماغ کو بٹہ نہیں لگانا چاہتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ بھی آپ کے دستِ کرشمہ ساز کا ہی ایک ادنیٰ سا کارنامہ ہے۔"

"ادنیٰ سا کارنامہ نہیں ——— ایک بہت بڑا کارنامہ!!"

"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ لفافے کی چوری ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔!"

"جی ہاں"

"وہ کیسے؟"

یہ لفافہ حضور کا ہے ——— ابھی ابھی ایک آدمی آپ کو مٹھائی کا لفافہ دے کر نہیں گیا، جو آپ نے اپنے پیچھے ٹوکری میں رکھا تھا۔؟"

"ارے ہاں یاد آیا ——— مگر تم نے یہ کیسے اُڑا لیا بھئی ———!" پھر وہ اپنے عقب میں رکھے ہوئے

لفافے کو ٹٹولتے ہوئے بولے ——— واہ واہ واہ شاگرد ہو تو ایسا ہو!"

لیکن سانول نے اُستاد کی اس بات کو نظر انداز کر دیا اور سرگوشیانہ انداز میں اُستاد کے کان کے قریب منہ پہنچا کر بولا "استاد آج ایک بہت بڑی واردات کا پروگرام ہے۔ مجھے شام کو تیری دُعا اور راہنمائی کی ضرورت ہے؟"

"ابے تو کیا اتنی موٹی آسامی ہے؟"

"آسامی ہے تو جبھی کہہ رہا ہوں، کروڑپتی ہے۔"

"ایسے آدمی کو ہاتھ مت لگائیو، اگر کوئی ان کے ہتھے چڑھ جائے تو حوالات کی ہوا کھائے بغیر نہیں رہتا۔"

ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں اُستاد، پورے بیس دن ہو گئے اس واردات کے ایک ایک پہلو پر غور کرتے ہوئے!"

"مگر ہے کون؟"

"ایک بہت بڑا اسٹیٹ ہے! کروڑپتی ——— ارب پتی!"

"میں نے تو سُنا ہے کہ یہ لوگ پیسے گھروں میں رکھنے کے بجائے بنکوں میں رکھتے ہیں۔"

"اُستاد تم جانو دیگ کی تو کُھرچن بھی مان نہیں ہوتی۔ دراصل میں ترقی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ترقی! یہ لفظ تو ہم نے کہیں سُنا ہوا ہے۔ ہاں دیکھ لے کہیں ترقی کرتے کرتے نور محمد تو رکنی نہ بن جانا ——— ابھی ہمیں تمہاری بڑی ضرورت ہے۔ تیرے شاندار کام کو دیکھ کر سارے آرٹسٹ بڑی اچھی طرح کام کر رہے ہیں۔ تو ہاتھوں سے نکل گیا تو اپنا جھگا چوڑ ہو جائے گا، اس لیے ابھی تو ترقی نہ کر بیٹا!"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اُستاد، مجھے انسان کی فطرت کے خلاف سبق نہ دے، تو ایک دن دال سبزی کھائے تو دوسرے دن تیری طبیعت مرغی کھانے کو چاہنے لگتی ہے۔ میں سینکڑوں ہزاروں سے آگے لاکھوں کے خواب دیکھنے لگا ہوں تو مجھے اس راستے پر آگے بڑھنے کی اجازت دے۔ اِدھر اُدھر میں لہر بہر کر دوں گا۔"

"پر یہ راستہ کانٹوں سے جو پُر ہے بیٹا، میرا جی نہیں مانتا، خیر اگر تو نہیں مانتا تو جا قسمت آزما کے دیکھ لے ہم تیرے حق میں دُعا کریں گے، ایک کالا مُرغا اپنے سر سے وار کر مجھے بھجوا دینا، میں ڈنر میں اُسے تناول کر کے تمہارے حق میں وظیفہ کروں گا۔"

سانول نے اُستاد شکھے کے پاؤں چُومے اور پھر اُلٹے پاؤں چاندنی پر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا جُوتی بغل میں داب باہر نکل آیا۔ باہر رُدو خاں اس کا منتظر کھڑا تھا، چوک شتال کی مصنوعی پہاڑی پر کھڑے ہو کر دونوں نے سامنے والی بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ سورج مغرب میں غروب ہوتا نظر آ رہا تھا، آسمان صاف تھا اور ہوا میں سردی کی کاٹ دمبدم بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ فضا کی سرمئی تیرگی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

"چھیمے کو اپنے آنے کا ٹیم بتا دیا تھا نا؟" اس نے رُدو سے پوچھا۔

"بتا دیا تھا ——— وہ کہتا تھا کہ آج سیٹھ عشاء کی نماز کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلے جائیں گے اس لیے عشاء کی اذان کے ساتھ ہم لوگ وہاں پہنچ جائیں۔"

"لیکن ساتھ والی بلڈنگ میں جس کی دیوار پھلانگ کر ہم نے سیٹھ کے فلیٹ میں داخل ہونا ہے اُس وقت بھی اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ اگر کسی نے کھمبے پر چڑھتے دیکھ لیا تو اُستاد اسی وقت دھر لیے جائیں گے۔"

"کیا بات ہے سانول اس وقت گھپ اندھیرا ہوتا ہے، تمہیں معلوم ہے آجکل چاند کی پہلی تاریخیں ہیں، ادھر سڑک پر تو بتیاں بھی نہیں ہیں۔

سُنا ہے تھوڑے دنوں کے بعد لگ جائیں گی، اس لیے اس موقعے کو غنیمت سمجھو۔"

سانول خاموش کھڑا سوچتا رہا، سردی سے اس کا جسم سُن ہو رہا تھا، پھر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگایا، اور لمبے لمبے کش لیتا ہوا بولا "رُدو نے سیف کی چابیوں کا گچھا تو سنبھالا ہوا ہے نا!"

"وہ بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا!" سانول نے دیکھا دُور درختوں کے ایک طویل جھنڈ کے اُوپر سُورج غروب ہو گیا تھا اور افق پر شفق کی سرخیوں کے اُوپر سلیٹی رنگ کی ایک چادر سی چڑھ گئی تھی۔

"رُدو نے!" سانول نے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو پانی کی موٹر کے پاس پہنچ کر بجلی کا میٹر اُڑا دینا، گھبرانا ہرگز نہیں ٹیلیفون کی تاروں کو چند منٹ میں کاٹنے کا بندوبست بھی میں نے کیا ہوا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

"لیکن واردات کا سارا دارومدار سیٹھ کے اپنے کمرے میں چلے جانے پر ہے، اس سے پہلے ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔" رُدو نے بولا۔

"وُہ تو چھیمے نے کہا ہے کہ وہ آج رات تقریباً نو بجے اپنے کمرے میں چلا جائے گا۔"

اُس وقت تک ہم ٹیلیفونوں والے کمرے میں بند دروازے والی بالکونی میں بیٹھ کر سیٹھ کے جانے کا انتظار کریں گے۔ تم نے وہ جگہ دیکھ لی ہے نا! وہی جہاں ایئر کنڈیشنر لگا ہوا ہے اور اس کے قریب ایک بہت بڑا ہیٹر بھی۔"

"فکر نہ کرو ——— میں نے فلیٹ کا چپّہ چپّہ دیکھ لیا ہے اور تمام راستے ذہن نشین کر لیے ہیں۔"

اب اس کھلی جگہ میں اندھیرا بالکل چھا گیا تھا۔ سانول نے دیکھا شتال کی مصنوعی پہاڑی سے کچھ فاصلے پر دُور درختوں کی قطاروں میں چمکتی ہوئی کوٹھیاں روشنی سے جگمگانے لگی تھیں۔

"جگہ ہے واقعی پُرسکون اور سنسان!" رُدو نے بولا۔

"اچھا چل رہنے دے، تو تو ایسے بول رہا ہے جیسے ابھی یہاں زمین خرید کر کوٹھی بنوا لے گا۔"

"کوٹھی ایسے تو نہیں بنتی اُستاد، جسم کی کھال اُدھڑتی ہے تو دیواروں پر پلستر ہوتا ہے۔"

"بات تو تُو نے ٹھیک کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تُو خواب دیکھنے لگا ہے!"

"پیارے خوابوں پر کونسی لاگت اُٹھتی ہے، دن میں کئی مرتبہ پاکستان کا صدر اور بادشاہ بنتا ہوں۔" دونوں ہنسنے لگے۔

"اچھا اب چل ——— یہ بلڈنگ یوں تو نزدیک نظر آرہی ہے پر یہاں سے کم از کم دو فرلانگ کا فاصلہ ہے۔" دونوں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے اٹے ہوئے ڈھلانی راستے پر احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے اترنے لگے۔

پراڈائز بلڈنگ کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بلندی کو دیکھ کر رُوفا بولا "اندھیرے میں تو یہ پہاڑ کی پہاڑ لگ رہی ہے کیا یہ پوری بلڈنگ سیٹھ کی ہے!"

"ارے یہ بلڈنگ کیا سیٹھ نوکا لوہیں کا مالک ہے۔!"

"تو پھر وہ کوٹھی میں کیوں نہیں رہتا!"

"کئی کوٹھیوں میں رہتا ہے۔ پر سونا یہاں ہے، یہ جگہ زیادہ محفوظ ہے۔"

"اچھا آج ہم ثابت کر دیں گے کہ یہ جگہ کتنی محفوظ ہے!"

"ارے واہ میرے گرگے طبیعت خوش کر دی، لیکن رُوفے! زیادہ خوش فہمی بھی ٹھیک نہیں ہوتی ——— لے اب پیر اُستاد کا نام لے کر چڑھ جا کھمبے پر ——— ٹیم بالکل ہو گیا ہے ——— تیرے ساتھ میں بھی چڑھتا ہوں۔"

وہ گھپ اندھیرے میں لنگوروں کی طرح کھمبے پر چڑھتے ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بالکونی میں اُتر گئے جہاں ایئر کنڈیشنر کی پُشت نظر آرہی تھی، ان کے بیٹھتے ہی ایک طرف سے مُعلق سیٹی سُنائی دی، یہ چھیے کی مخصوص نشانی تھی جس سے انھیں پتہ چل گیا کہ چھیے نے انھیں بالکونی میں اُترتے دیکھ لیا ہے۔ یہ بالکونی ساتھ والی ایک بلند عمارت کے عقب میں چھپی ہوئی تھی اس لیے وہ یہاں بالکل محفوظ تھے۔ بالکونی کے دروازے سے اِدھر جنگلے کو اینٹوں سے بند کیا ہُوا تھا اور اس کے اُوپر سے نظر آنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔

اور پھر ایک دم اُنھیں کمرے میں چلنے پھرنے کی آہٹ سُنائی دی ٹیلیفون کی گھنٹی کی آوازیں مسلسل آنے لگیں۔

"اُستاد! ذرا دروازے کی کوئی درز تلاش کر کے اندر تو جھانک سیٹھ کیا کر رہا ہے!"

"کیا دیا سلائی جلاؤں!" سانول بولا

"نہیں اس کی روشنی سامنے والی بلڈنگ میں کسی کو نظر آسکتی ہے۔"

اِس وقت اُدھر چھت پر کون ہوگا؟"

"پر تجھے روشنی کی کیا ضرورت پڑ گئی! ——— اِدھر ہٹ میں دیکھتا ہوں!"

یہ کہہ کر رُوفے نے موٹے کواڑوں پر ہاتھ پھیرا جیسے اُس کی گرد صاف کر رہا ہو، پھر نظریں اُن کے قریب لیجا کر کواڑوں کا ایسے معائنہ کرنے لگا جیسے محدب شیشے سے اُنھیں دیکھ رہا ہو۔ ایک جگہ اُس کی نظر ٹک گئی، اس کے ساتھ ہی اندر سے ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سُنائی دی۔

سانول نے رُوفے کو الگ ہٹا کر خود اس سوراخ پر نظر جما دی۔ اس سوراخ سے اندر کے کمرے کا منظر صاف نظر آرہا تھا "ارے

یہاں تو سین ہی اور ہے!" سالوں سرگوشیانہ آواز میں بولا "بڑا خوبصورت کمرہ ہے اور سیٹھ کے سامنے ایک بڑی ہی خوبصورت عورت بیٹھی ہے۔!"

"ذرا میں بھی دیکھوں!" رُوفا بولا۔

"نہیں تو چپکا بیٹھا رہ۔ مجھے ذرا کمرے کا جائزہ لے لینے دے" لیکن رُوفا خاموش نہ بیٹھ سکا، اس نے دوسرے کواڑ کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہاں اُسے سوئی کے ناکے جتنا ایک سوراخ نظر آیا ——— اس نے اس سُوراخ میں سے دیکھا تو اس کی طبیعت نہال ہوگئی۔ یہ سیدھا اس خوبصورت عورت کے چہرے پر کھُلتا تھا۔ اُسے بس اس کا چہرہ ہی نظر آرہا تھا۔

"یار کتنی حسین عورت ہے!" وہ بیٹھی ہوئی سرگوشیانہ آواز میں بولا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی اور اس دفعہ سیٹھ نے چونگا اُٹھایا۔

"ہیلو ——— کون بول رہا ہے!"

"ہاں ہاں سیٹھ رمضانی! یار میں آپ کے فون کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ بانکے سیٹھ کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ چلو اپنے راستے کا ایک بڑا کانٹا تو صاف ہوا، پر سیٹھ یہ سالا مُصیری پیسے بڑے مانگ رہا ہے۔ پانچ لاکھ روپیہ تو ایک اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔ اس میں کم از کم پانچ قتل ہونے چاہئیں۔ جواب میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ اس دوران سالوں نے ایک لمحے کے لیے نظریں ہٹا کر رُوفے کی طرف دیکھا، جو کواڑ کے سُوراخ سے اس طرح چپکا ہوا تھا جیسے اس کی پُشت پر کوڑے بھی لگانے شروع کر دیئے جائیں تو ادھر سے نہیں ہٹے گا۔ اس نے دوبارہ کمرے کے اندر دیکھنا شروع کیا۔

"جی بالکل ——— یہ تو بلیک میلنگ کا ایک بنیادی دروازہ اپنے آپ پر کھُلوانے والی بات ہے اس لیے میں نے آج اس کمبخت مُصیری کو بھی ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ کل صبح سمندر کی تہ میں کسی چھوٹی موٹی شارک مچھلی کا ناشتہ بنے گا!" پھر تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔

"بھئی سیٹھ رمضانی، میرا تو ایک اُصول ہے زندگی میں، یا تو مکمل طور پر شریف بن کر رہو، یا پھر مکمل شیطان ——— اس وقت اس دنیا میں شیطان راج کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے نیک اور شریف بنو گے تو یہ تمہیں روسٹ کر کے کھا جائیں گے، اس سے پہلے کہ یہ تمہیں روسٹ کر کے کھائیں، آدم خوروں کی طرح انھیں زندہ نگل جاؤ، میں تو کہتا ہوں، تم بھی اس غیر یقینی کیفیت کی پراگندگی سے اپنے آپ کو نکالو، اور اس سالی بیگم سالار کا تعفنہ پاک کر کے کروڑوں کی جائیداد کے مالک بنو، عیش کرو، جس طرح میں نے کیا ہے ——— بھئی آواز ٹھیک طرح سے نہیں آ رہی ——— ہاں ہاں دوسرے نمبر پر کر لو ——— ہیلو! اب ٹھیک ہے ——— کیا؟ ——— یار آج کل تو نہ یہ چاندی اور نہ سونا ——— نہ کوئی اور چیز ——— دہشت کی سمگلنگ میں یاروں نے کروڑوں روپے بنا لیے، تین لانچیں میری بھی اُتر رہی ہیں آج! ——— تم مچھلیوں کو ڈبوں میں بند کرتے رہنا، ذرا کچھ سوچو تو زمانہ کس طرف دوڑ رہا ہے۔"

سانول نے دیکھا اُس عورت نے مسکراتے ہوئے اُٹھ کر پہلے تو ایک ادا کے ساتھ سیٹھ کی طرف دیکھا، پھر میز پر پڑی ہوئی شراب کی بوتل میں سے چاندی کے منقش گلاس میں مشروب انڈیلا اور اپنی مرمریں اُنگلیوں میں گلاس تھام کر سیٹھ کی کرسی کی پشت پر اس کے گلے میں ایک بازو حمائل کر کے کھڑی ہو گئی۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے پیگ سیٹھ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سیٹھ نے ایک چُسکی لے کر اس حسینہ کی طرف گردن موڑ کر بڑی فریفتگی سے دیکھا، پھر ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں ہاں دیوالیہ ہو گیا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد پاگل ہو جائے گا سالا، مجھ سے ٹکر لے رہا تھا، اس کا خیال تھا میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گا، نہیں کروڑ کا LOSS معمولی LOSS نہیں ہوتا۔ مجھے میرے حصّے سے محروم کرنا چاہتا تھا، اِسے اپنے اثر و رسوخ پر زیادہ ہی گھمنڈ تھا۔" یہ کہتے ہوئے سیٹھ نے ایک وحشیانہ ساقہقہہ اس طرح لگایا کہ اس نوجوان حسینہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے جام کی بہت سی شراب چھوارے کے پانی کی طرح اُچھلی اور اس کے چھینٹے صاف شفاف میز پر نظر آنے لگے۔ لیکن اس نے اس بات کی ذرہ برابر پروا نہ کی۔

دراصل بات یہ ہے (معانی سیٹھ! کو اسے میری طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ اسے اتنا پتہ نہیں تھا کہ بندرگاہ پر کھڑے ہوئے جہاز میرے حکم کے بغیر جنبش نہیں کر سکتے۔

معانی! ——— کیا؟ ——— ایک یہی تو وہ لفظ ہے جو ایک مُدت پہلے میں اپنے اُصولوں کی لغت سے خارج کر چکا ہوں، بھیک منگواؤں گا بھیک اُس چُوہے کو ——— فٹ پاتھ پر بٹھاؤں گا سمجھے! پھر ٹیلیفون بند ہونے کی آواز آئی۔ سانول نے دیکھا سیٹھ نے اپنی وہیل چیئر ٹھیک اُس سُوراخ کی طرف موڑ لی اور وہ حسینہ بھی گھوم کر اب بالکل اس کے پہلو میں اس طرح کھڑی ہو گئی کہ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس لڑکی نے جُھک کر اپنا چہرہ سیٹھ کے بالکل قریب کر لیا تھا اور پھر اس نے از سرِ نو اپنے کندھوں تک عُریاں بازو سیٹھ کے گلے میں حمائل کر دیئے۔ سیٹھ نے بڑی مخمور نظروں سے حسینہ کی طرف دیکھا۔ حسینہ نے بھی جیسے اپنے پورے جسم کا سُرور کشید کر کے آنکھوں میں انڈیل لیا تھا۔ پھر اس نے ایک جام اور بھرا اور کھلی مسکراہٹ کے ساتھ سیٹھ کے جامنی رنگ کے ہونٹوں سے لگا دیا پھر وہ انگریزی دھن گنگنانے لگی۔ سیٹھ نے اپنے سامنے پڑے ہوئے ایک خوبصورت رنگین ٹائپ شدہ کاغذ کو سرسری نظروں سے دیکھا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی ایک بار پھر کھڑکی۔

"جی بول رہا ہوں ——— ہیلو ——— اخاہ، کرامت سیٹھ! ..... کرامت سیٹھ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں، مگر تم جانتے ہو کہ اس اُلّو کے پٹھے نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ شکر کرو اُس کی ایک ٹانگ ہی ٹوٹی ہے، بچ گیا۔ ورنہ اُس نے چمبہ پولیس کے ہاتھوں کُتّے کی موت مرنا تھا، سیٹھ میری مخبری کرنا کوئی خالہ جی کا باڑہ ہے! اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ میرے آدمی اُس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہے تھے۔ مجھے وُہ تو سمجھ لیا تھا اس نے کہا تھا اس وقت شہر کا سب سے بڑا بدمعاش میں ہوں۔ میں نے تو آج تک کسی بدمعاش کو ایک پائی تک ادا نہ کی۔ کنوئیں کی مٹی کنوئیں پر لگاتا ہوں۔ بس یہی انوسٹمنٹ ہی کام آ رہی ہے۔ پہلی مرتبہ ایک دادے کو ایک لاکھ روپیہ دیا تھا، بس اسی رقم سے بدمعاشوں

کی فصل کاٹ رہا ہوں، ادھر کام لیا ادھر جھٹکا کرا دیا، تم اس بارے میں مجھ سے کچھ نہ بولو ——— بھئی ڈرتے کیوں ہو، میں اپنی برادری کے لوگوں کا خادم ہوں اس وقت تک انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتا جب تک مجھے کسی کی دشمنی اور بدباطنی کا مکمل یقین نہ ہو جائے۔"

سانول نے دیکھا اس کے بعد تقریباً پانچ منٹ کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سیٹھ اور حسینہ ایک دوسرے کو اپنی خمار آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔ ٹیلیفون کا ریسیور بدستور سیٹھ کے کان سے لگا ہوا تھا۔ "ہیلو یہ میں کیا سن رہا ہوں کرامت سیٹھ راجہ کے گھر میں موتیوں کا کال ——— ارے ایک معمولی سی لڑکی کے لیے اتنا پریشان ہو، جی چاہتا ہے ابھی تیری پھولی ہوئی توند پر ایک زبردست مکہ رسید کردوں۔ لے میرے شہزادے وہ حور پری جس کی یاد میں تم اس وقت بیٹھے آہیں بھر رہے ہو وہ اس وقت میرے پہلو میں بیٹھی مجھے جام پر جام پیش کر رہی ہے۔" یہ کہتے کہتے سیٹھ نے بیٹھے بیٹھے اس حسینہ کے سرین پر ایک کراری سی دھول جمائی کہ ایک لمحے کے لیے تو وہ تلملا اُٹھی پھر سیٹھ کی اس والہانہ حرکت نے اُسے سیٹھ کو پیار سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ سانول کو سیٹھ کی باتوں کا بڑا مزہ آ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی دیر کے بعد اُسے ایسے محسوس ہونا جیسے دل کی دھڑکنوں میں چند لمحوں کے بعد ایک آدھ دھڑکن غائب ہو رہی ہے۔ یہ شاید اس خوف کا اثر تھا جو لاشعوری طور پر سیٹھ کی باتیں سن کر اُس کے دل و دماغ پر غالب آتا جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد سیٹھ کی آواز پھر اُبھری "ارے یار کیوں مرے جا رہے ہو، کل شام تک پہنچ جائے گی تمھارے پاس، اور ہاں دیکھو وہ مہ رُخ ہے نا ——— ارے بھئی سن رہے ہو، وہ مہ رُخ ہے نا چوڑی والی ——— مجھے یوم آزادی کی رات ۲۳ مارچ کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے ایک روز پہلے مجھے خبر کر دینا تاکہ میں گاڑی بھیج کر اُسے منگوا لوں ——— ہاں ہاں ابھی لو ——— کوئی بات نہیں کرامت سیٹھ ابھی بھجوائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر سیٹھ نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر اس حسینہ کی طرف دیکھ کر بولا "تمھیں ابھی کرامت سیٹھ کے ہاں جانا ہوگا، پھر اس انٹرکوم پر اپنے سیکرٹری کو ضروری ہدایات دیں، وہ خوبصورت لڑکی اپنا پرس سنبھالتی ہوئی نیچے اُتر گئی، دوسرے لمحے ایک اور خوبصورت لڑکی جو پہلی لڑکی سے بھی زیادہ طرح دار اور شوخ نظر آ رہی تھی سیٹھ کے کمرے میں داخل ہوئی دونوں نے مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔ نئی حسینہ نے آگے بڑھ کر ٹرے میں سے سنہری سیال پیگ میں انڈیلا اور سیٹھ کے پہلو میں آ کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سیٹھ نے اس کے گال پر ایک ہلکی سی چٹکی بھری تو وہ ہنسنے لگی۔

"ارے تیری جلد تو ٹرانسپیرنٹ معلوم ہوتی ہے۔" سیٹھ اس کے رخسار پر مرتسم چٹکی کے دھبے کو قدرے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کہیں شیشے تو نہیں چباتی!" وہ حسینہ کھل کر مسکرائی اور پھر پیار سے سیٹھ کے گلے میں اپنے بازو حمائل کر دیئے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ سانول نے ذرا اپنی آنکھ اُونچی کر کے دیکھا تو میز پر ٹیلیفونوں کا جال بچھا ہوا تھا، وہاں کوئی درجن بھر ٹیلیفون رکھے ہوئے تھے، اور کمرہ اندر سے اس طرح سجا ہوا تھا جیسے کسی مہاراجہ کے محل کا کمرہ ہو، حالانکہ باہر سے وہ ایک معمولی کمزور دکھائی دے رہا تھا۔

ہیلو! بات کرو ——— ارے! میں نے اس حرامی چھپکلی کی جان بخشی ایک دفعہ پہلے اس شرط پر کی تھی کہ وہ بے ایمانی اور غداری سے باز آ جائے اس نے ایک دفعہ حق سیٹھ کے یہاں کھانا بھی کھایا تھا اور انھیں یہ بھی بتایا تھا کہ پچھلے دنوں میرا کاغذ کا ایک

بندرگاہ پر اُترا ہے، میں اسے اس لیے معاف کرتا رہا ہوں کہ ایک دفعہ بالکل اتفاقیہ طور پر ایک حادثے میں اس کے ہاتھوں میری جان بچی تھی۔ یہ چاہتا تھا کہ اس کے عوض میں اس سالے کو اپنے سر پر بٹھالوں، مجھے پرلوں بھی اطلاع ملی تھی کہ یہ چند لفنگوں سے میل جول رکھتا ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ یارڈ میں لاکھوں روپے کا مال پڑا رہتا ہے اور اس کے سپروائزر کوٹھیوں اور گوداموں کی دیکھ بھال کا ذمہ تھا۔ میں نے دو ہفتے پہلے اس سے چابیاں لے کر اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا تھا، اب بڑکیتوں کے ساتھ مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی سوچ رہا ہے تو سالے کو ابھی لیجا کر سمندر میں پھینک آؤ ——— ہاں کہہ جو رہا ہوں پہلے بیہوش کر کے کسی بوری وری میں بند کر لینا۔ قصہ پاک کرو حرامی کا!" پھر دھڑاک سے ٹیلیفون بند کرنے کی آواز آئی، نئی حسینہ نے سیٹھ کے گلے میں اپنی مرمریں باہوں کا حلقہ اور بھی تنگ کر دیا۔ پھر اس نے نہایت ہی محبت اور پیار سے سیٹھ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ایک تازہ جام بھر کر اُسے پیش کیا۔

باہر دروازے کے ساتھ لگے ہوئے سائول اور رُدفے کی رُوحیں اس لمحے شاید فنا کے گھاٹ اُتر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ رُدفا بھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھ رہا تھا،

"اب کیا ہوگا سائول! چیما تو اس وقت سمندر کی تہ میں اُتر رہا ہے۔" "ہونا کیا ہے" سائول کی آواز کانپ رہی تھی، یکایک اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے ایک ایک مسام میں گھنٹیاں لگی ہوئی ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اگر اسی لمحے وہاں سے نہ بھاگے تو اگلا ٹیلیفون اُن کی موت کا پروانہ لے کر کھڑکے گا۔ "ہونا کیا ہے پیارے! اگر ہم چاہتے ہیں کہ سمندر کی تہ کے بجائے اللہ کی اس زمین پر کچھ دن اور نظر آئیں تو ہمیں ابھی اس کھیجے سے اُتر کر بھاگ لینا چاہیئے" اور انھوں نے یہی کیا۔ پہلے وہ سائول اُترا اس کے پیچھے رُدفا۔ لیکن اتنی احتیاط سے کہ معمولی کھٹکے کی آواز خود اُن کے کانوں میں بھی نہ پڑی۔

جیب کتروں کا بادشاہ اپنی آنکھوں میں معصوم اور بڑی ہی خوبصورت قسم کی عیاری اور مکاری کی موم بتیاں روشن کئے چوکڑی مارے اپنے سنگھاسن پر بیٹھا تھا، کمرے میں اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سفید چاندنی پر تازہ پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اُستاد نے دیکھا سائول لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سلام کیا اور پھر اُستاد کے پاؤں پکڑ لیے۔

"اُستاد! مجھے معاف کر دو ——— میں اپنے آپ کو بڑا فنکار سمجھنے لگا تھا، اور خود کو کیڑے مکوڑوں کی برادری سے خارج کر دیا تھا۔ یہ نہیں پتہ تھا کہ یہاں تو فن کے سمندر ہیں سمندر ——— اژدہے بیٹھے ہیں جو اگر سانس کھینچیں تو مجھ ایسے سینکڑوں چوہے اپنے پیٹ میں بھر لیں۔ میں نے اس کام سے توبہ کر لی ہے، کل صبح سے میں اپنی شریفانہ زندگی کا آغاز کر رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے اُستاد! تمہیں نذر کرنے کے لیے اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے سائول کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے، وہ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا، اُستاد بھی خاموش رہا۔ شاید اس نے سائول کا یہ آخری نذرانہ قبول کر لیا تھا۔

یقین

حفیظ احسن

"اے ماں، اُونٹ آگئے ہیں" بھوری مٹی کی پتھریلی چٹان پر کھڑے ہوئے رتّو نے چلّا کر کہا۔ شانو ایک لمحے کے لیے تو کشتی میں ڈول سی گئی اور بانس اُس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے کشتی ٹھہرا کر بانس کنارے کی نرم نرم مٹی میں نیزے کی طرح گاڑ دیا۔ پھر اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی ہوئی چٹان کی طرف بڑھی جس کے دوسری طرف اس کے لڑکے نے اُونٹ دیکھے تھے۔

"وہ رہا چاچا راکھی ماں!" اپنی ماں کو دیکھ کر رتّو نے اُنگلی سے اُونٹوں کی طرف اشارہ کیا "ہونہہ" شانو کیچڑ بھرا پاؤں زمین پر پٹختے ہوئے بولی "یہ تو کہتا تھا فجر نال آئے گا، اب تو کشتی بھی آدھی لد چکی، بوڑھا راکھی اُونٹوں کی مہار پکڑے تیزی سے بڑھا چلا آرہا تھا، گھنگھروؤں کی جھنکار صبح کی سجری سجری فضا میں مترنم لَے آہنگی کے ساتھ بلند ہوتی پھر جیسے دریا کی ابرک کی طرح چمکتی ہوئی لہروں کے ساتھ گلے ملتی ہوئی دور نکل جاتی، سورج بھوری چٹانوں سے اس طرف آموں کے جھنڈ کے اُوپر بالشت بھر بلند ہو چکا تھا۔ شفق کی نارنجی روشنی میں پرندوں کی ڈاریں اُبھر اُبھر کر دریا کے کناروں پر منتشر ہو رہی تھیں۔ چٹان کے اُوپر کھڑی شانو کا جسم بھی آگ کے شعلوں کی طرح لو دیتا نظر آرہا تھا، راکھی قریب آیا تو وہ بولی "چاچا یہ تو غلط بات ہے۔ تمھارے کہنے پر میں مرغ کی بانگ کے ساتھ کشتی کنارے پر لے آئی تھی، اور تو اس وقت آیا ہے جب اسباب لد چکا اور مسافر تیار بیٹھے ہیں۔"

"معاف کر دے بیٹی، شام کو فوتگی کی وجہ سے پھل نہ توڑا جا سکا، بڑی مشکل سے دو اُونٹوں کا بوجھ تیار کر کے لایا ہوں۔ اتنی سی جگہ تو تم کشتی میں پیدا کر ہی لو گی۔"

"مشکل ہے، لاد پہلے ہی بہت ہے۔ دریا میں آج پانی زیادہ ہے۔ تم خود دیکھ لو آسمان پر بادل بھی ہیں"

"اچھا چھوڑ ان باتوں کو، دریا میں تو روز ہی پانی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، تو ملاحوں کو بلا، میں اُونٹوں کو بٹھاتا ہوں۔" راکھی بولا۔ پھر اس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمی کو اُونٹوں کو دریا کے کنارے تک لانے کے لیے کہا۔

"دیکھ لو چاچا، کشتی بھٹک کر ریت کے اُبھار میں جا دھنسی تو اللہ ہی حافظ ہے۔"

وہ پلٹ کر کشتی کے قریب آکھڑی ہوئی، اتنے میں راکھی کا ساتھی اُونٹ بھی وہیں لے آیا، ملاحوں نے کھجور، آم اور انار کی ٹوکریاں اُتار لیں، کشتی کا سامان سمیٹ کر جگہ بنائی، درمیان میں بوریاں اور ٹوکریاں جما دیں، آس پاس مسافروں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا دی، ملاحوں نے کنارے کے پانی میں بانس گاڑ دیئے۔ شانو آم، انار اور کھجوروں سے بھری ہوئی ٹوکری اپنے بیٹے کو دیتی ہوئی بولی "لے گھر لے جا ہاں دیکھ فضلے کو ساتھ رکھنا اور بکریاں دوپہر تک ضرور گھر لے آنا جب تک میں بھی آجاؤں گی۔ تیرا بابا تو اب تھوڑی دیر میں گھر پہنچ ہی جائے گا۔" لڑکا ٹوکری اُٹھا کر چلتا بنا۔ شانو چپو سنبھال کر کشتی کے اگلے حصّے میں آکھڑی ہوئی۔ تینوں ملاحوں نے

دائیں، بائیں اور عقب میں اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں، کشتی چلتے چلتے دو ایک مسافر دوڑتے بھاگتے ہوئے اور آ گئے۔ ایک بوڑھا حقہ لیے کھڑا کانپ رہا تھا، یہ دوسرے چوتھے کا مسافر تھا "آبا بابا بیٹھ جا" پر تو یہ حقہ لانا بند نہیں کرے گا کسی دن حقے سمیت دریا کے پیٹ میں چلا جائے گا" پھر وہ ہنسنے لگی، بابا کشتی کے بائیں پہلو میں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا تو وہ دوسرے مسافر کی طرف متوجہ ہوئی "معاف کرنا بھئی اب تو چپہ بھر جگہ بھی نہیں بچی کشتی میں"

"ضروری پہنچنا تھا شہر، بٹھالو تو مہربانی ہوگی۔" مسافر اپنی بھاری بھرکم پگڑی کے پلو سے ہونٹ صاف کرتا ہوا بولا۔

"مشکل ہے" اس نے نگاہیں پھیرتے ہوئے کورا جواب دیا "یہ ریل گاڑی تو ہے نہیں کہ جگہ ہیں آدمیوں کی ہو اور سو آدمی لد جائیں، شام تک....." پھر جیسے اس کی نظریں پانی کے اوپر پھیلی ہوئی فضا میں لٹک کر رہ گئیں، منہ کھل گیا اور آنکھیں ایسے باہر نکل آئیں جیسے اس نے دریا کی لہروں کو چیرتا ہوا مگرمچھ کا منہ دیکھ لیا ہو۔ اس کا پورا وجود گھوم کر اس نئے مسافر کے سامنے آ گیا اور وہ اس کے چہرے کو تکتی رہ گئی۔ پھر اس کے دماغ کے سارے تار جیسے یکبارگی جھنجھنا اٹھے، ایک طویل سانس کھینچ کر اس نے مسافر کے چہرے سے نظریں ہٹالیں پھر اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس کے کانوں میں بھی سناٹے کی سیٹی سی بجنے لگی۔ اسے مسافر کی آواز جیسے بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی "تو میں بیٹھ جاؤں شانو!"

شانو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کشتی دونوں پہلوؤں اور پچھاڑی سے لبالب بھری ہوئی تھی، صرف اگلے حصے میں جہاں شانو کی جگہ تھی، ایک دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ شانو کی خاموشی نے مسافر کو جرأت دلائی اور وہ مسافروں کے سروں اور کندھوں کو پھلانگتا ہوا وہاں ٹوکریوں کے انبار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ملاح نے بانسوں کی مدد سے کشتی کو حرکت دینا شروع کی۔ شانو نے بڑھ کر اپنی جگہ سنبھال چپو اٹھالیا۔ آج خلافِ معمول دریا کی لہروں میں غیر معمولی تیزی اور تندی تھی۔ آس پاس کہیں تیز بارش ہوئی تھی۔ دائیں پہلو والا ملاح شرفو بولا "شانو مائی آج کشتی سیدھی نہیں جائے گی، ترچھے رُخ ادھر نئی کے کھیت کے پاس پار اُتریں گے" شانو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کنارے کے سُست نشیبی پانی سے کشتی کو نکالنے کے لیے کافی زور لگانا پڑتا تھا، اس لیے تینوں ملاح اور شانو پوری قوت سے چپو چلا رہے تھے۔ چند منٹوں کی جان توڑ مشقت کے بعد کشتی گہرے تیز پانی کو چیرتی ہوئی دریا کے پاٹ کے اولین حصے میں داخل ہوگئی اور اس کی رفتار میں سُست لیکن ہموار اور متوازن کیفیت پیدا ہوگئی۔ شانو کا چپو چونکہ زیادہ تر سمت نمائی کا فریضہ انجام دیتا تھا اس لیے کشتی کی متوازن روانی میں اس نے چپو پانی سے باہر کھینچ لیا۔ اس کی نظریں پاس بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف اُٹھ گئیں۔ یہ صورت اس نے سولہ برس کے بعد دیکھی تھی اُف کتنی تبدیلی آ گئی تھی اس صورت میں، کبھی اس جوان چہرے کے حُسن کی تاب نہیں لی جاتی تھی، وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ اتنے عرصے کے بعد وہ کبھی امیرے کو یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھے گی۔ آموں کے باغوں کے مشہور ٹھیکیدار کریم بخش کا بیٹا امیر بخش جو کبھی اس علاقے میں جوانی، حُسن اور مردانگی کا طوفان بن کر اُترا تھا۔ سرکش، ہٹیلا، منہ زور امیرا، جس کی چاپ مٹیاروں کے دل میں ہلچل مچا دیتی تھی، خود غرض، مطلبی اور بے وفا امیرا جس نے کبھی اس سے پیمانِ وفا باندھا تھا، جس نے بیٹ کے علاقے کی کتنی ہی مٹیاروں میں سے اُسے پسند کیا تھا، وہ بھی نہ جانے کیسے اس کی محبت کے آگے سرنگوں ہو گئی تھی، حالانکہ خود اس کی طبیعت کے غرور کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ تو ایسے ویسے مردوں کو دور سے دیکھ کر نظریں

پھیر لیا کرتی تھی، کسی کو اس کے سامنے ڈھب سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس کے اپنے رشتہ دار جانے کتنے نوجوان اُسے اپنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے، لیکن نہ جانے امیرے کی صورت، اس کی باتوں اور سبھاؤ کی کونسی خوبیوں نے اس کا دل موہ لیا کہ وہ اس کے سامنے دل کی بازی ہار گئی، اس نے دل کی گہرائیوں سے اُسے چاہا تھا، وہ تنہائیوں میں سوچا کرتی تھی کہ شانو تو بھی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی، اب تیرا وجود اس طرح کیوں تیرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ تجھے اپنی موجوں پر اختیار رہا ہے نہ خیالوں پر، دن بھر امیرے کے سپنے دیکھا کرتی ہے۔ حالانکہ تو جانتی بھی ہے کہ امیرے اور تیری ذات برادری میں کتنے لمبے چوڑے فاصلے ہیں، لیکن امیرے کی ذات میں حُسن اور جوانی کا وہ جادو تھا، اس کی باتوں میں ایسی شہد کی سی مٹھاس تھی، نظروں میں ایسی دل میں اُتر جانے والی معصومیت تھی کہ اُسے بے اختیار اس پر پیار آگیا اور پھر یہ پیار اس کی رُوح کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا، وہ بھی کیسا وقت تھا، امیرے کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں ایک دم پیار کے سچے موتیوں جیسے آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ جب بھی اُسے ملتا وہ بس اُس کی صورت کو تکتی رہ جاتی۔ دل کی دھڑکنیں شہ زور گھوڑے کی طرح بے قابو ہو جاتیں۔ سانسوں کی گرمی جیسے ہونٹوں کو جلانے لگتی، چہرہ تانبے کے تھال کی طرح سُرخ ہو جاتا۔ وہ کہا کرتی امیرے تیری صورت چاند سے بھی بڑھ کر حسین ہے، تو مجھے اتنا اچھا کیوں لگتا ہے، شاید ہماری روحیں ایک ہی کھٹولے میں بیٹھ کر آسمان سے اُتری تھیں، ہم اس دُنیا میں آنے سے پہلے ضرور ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ امیرا اس کی ایسی تعریفی باتیں سُن کر جھینپ سا جاتا پھر کہتا، بھئی شانو تُو تو میری اس طرح تعریف کرتی ہے کہ تو نہیں میں تیری معشوق ہوں، دیکھ مجھے اتنی چھوک نہ دیا کر مجھے ایسے لگتا ہے جیسے مرد سے عورت بنتا جا رہا ہوں۔" وہ امیرے کی اس بات پر جی بھر کر ہنستی تھی "تو پھر کیسی باتیں کیا کروں۔" اس نے پوچھا۔ "ویسی ہی شوخ، تیز اور چٹپٹی باتیں جو تو پہلی مُلاقاتوں میں کیا کرتی تھی، جب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، اس وقت تیری باتوں میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی موجوں جیسی تڑپ اور شوخی ہوتی تھی، اب تو تُو بالکل موم ہو گئی ہے۔" اُس نے خوب سوچ کر دل سے سچی بات نکالی تھی۔ "امیریا، ایسی باتیں میں سوچ کر تھوڑا ہی کرتی ہوں، یہ تو خود بخود میرے منہ سے نکل جاتی ہیں۔ میں کوئی تیری جھوٹی تعریف کرتی ہوں، ان باتوں میں تُو میرے دل کی آواز نہیں سُنتا؟"

"سُنتا تو ہوں ——— تیری آنکھوں میں تیرے دل کی آواز کی تصویر بھی دیکھا کرتا ہوں، پھر محبت ایسی باتوں سے بلند ہوتی ہے، میں جانتا ہوں تو مجھے بہت چاہتی ہے تو آخر ایسی خوشامدانہ باتوں کی ضرورت کیوں محسوس کرتی ہے۔"

"خوشامدانہ باتیں! ——— کیا کہا تُو نے، چل پرے ہٹ، بڑا آیا کہیں کا پھنے خاں" اور وہ اتنے زور سے ہنسا تھا کہ پاس والے درخت پر بیٹھی ہوئی فاختائیں بھی ڈر کر اُڑ گئی تھیں، پھر اس نے کتنی منتیں اور خوشامدیں کی تھیں، خدا کے واسطے دیئے تھے، کتنی ہی بار جھک جھک کر اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں شریر نظروں سے جھانکا تھا، پھر جب امیرے نے اُسے منا لیا تو کہا تھا "ہاں، اس طرح میں چاہتا ہوں، تو اس طرح مجھے جھڑک دیا کرے، جھٹک دیا کرے تاکہ میں تجھے منایا کروں، تیری خوشامدیں کیا کروں، مجھے اس میں کتنا مزہ آتا ہے، مجھے تیری تعریفوں کی ضرورت نہیں، تعریف کے قابل تو تُو ہے یا وہ خدا جس نے اتنی پیاری پیاری صورت خود اپنے ہاتھوں سے بنائی۔" امیرے کی یہ بات سن کر وہ کتنا خوش ہوئی تھی۔

"ایسی باتیں جان پڑتا ہے، میرے منہ سے اس لیے نکلتی ہیں کہ کہیں تیرے دل میں میری محبت کم نہ ہو جائے۔"

"تو فکر نہ کر شانو، تیری محبت میرے دل میں پھول کی خوشبو کی طرح زندگی کے آخری دم تک بسی رہے گی۔ میں تجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔" لیکن پھر بھی جانے کیوں اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا، اتنے قرب کے باوجود اُسے یقین نہ آتا کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب امیرا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا ہو جائے گا۔"

اور ہوا بھی یونہی، اس سال دریا میں بڑے زور کا سیلاب آیا تھا، تیز بارشوں اور آندھیوں کی وجہ سے آم، خربوزوں، کھجوروں اور اناروں کے باغوں میں بہت پہلے ہی اُجاڑ پڑ گئی تھی۔

ٹھیکے کی مدت پوری ہوتے ہی امیرا اپنے باپ کے ساتھ ایسا غائب ہوا کہ پھر کہیں نظر نہ آیا۔ وہ حیران تھی کہ آخر یوں پر جھاڑ کر اُسے بیوفا پنچھی کی طرح اُڑ جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، امیرے کی طرح اس کے باپ نے بھی پھر کبھی اس علاقے میں قدم نہ رکھا، حالانکہ امیرا کہا بھی کرتا تھا کہ دریا کے مغربی سمت ان کی چند کلے زمین بھی ہے۔ وہ ایک مدت اس کی راہ تکتی رہی، اس نے اس کی یاد میں اتنے آنسو بہائے کہ آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے۔ مہینوں بخار کی دھیمی دھیمی آنچ میں سُلگتی رہی، پھر جیسے اُسے صبر آ گیا۔ طبیعت کی اعتدالی کیفیت میں جب اُس نے اپنی محبت اور امیرے کی بے وفائی کے ایلیے پر غور کیا، تو اُسے یقین ہو گیا کہ امیرے کو شاید اس سے کبھی محبت نہیں تھی، اس نے وقتی طور پر اس سے دل بہلانے کا سامان کیا تھا۔ اُسے دکھ تو بہت ہوا، پشیمانی کا احساس اس کے دل کو کاٹتا رہا کہ اس نے امیرے کو چاہا ہی کیوں تھا، لیکن وہ سوچتی امیرا تو ایک بھونرا تھا، ہرجائی تھا، لیکن میں نے اُس سے سچا پیار کیا تھا، وہ پلٹ کر کبھی ایک بات ہی کہہ جاتا کہ شانو میں مجبور ہوں، لیکن وہ ایسی بات تو جب کہتا اگر اُسے مجھ سے محبت ہوتی، پھر وہ سوچتی یہ محبت یک طرفہ ہی تھی، صرف اس کے خیالوں، اُس کی سوچوں کی محبت، وہ حُسن، وہ سُلگتے ہوئے جذبے، وہ قوس قزح کے رنگ جو اُس کے چہرے اور آنکھوں میں بکھرا کرتے تھے۔ وہ اس کے اپنے وجود کا حُسن تھا، آدمی پھول کو دیکھ کر بھی ایسی چاہت اور پسندیدگی محسوس کرتا ہے، یہ محبت بس ایسی ہی کوئی چیز تھی، اس کے باوجود شانو کے دل میں امیرے کے لیے کبھی نفرت پیدا نہ ہوئی، وہ سوچتی بکھرے ہوئے پھولوں سے نفرت تو نہیں ہوتی، اس پر میرا کیا اختیار تھا، وہ چلا گیا، خدا اُس کا بھلا کرے۔

"ارے بچو بچو" اچانک شرفو ملاح کی زوردار آواز نے اُس کے ذہن میں گونجتی سوچوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ کشتی کے بائیں پہلو میں ایک بوری مسافروں کے سروں پر لڑھک آئی تھی، چاچا راکھی اور دوسرے ملاحوں نے اُٹھ کر بوری اُٹھائی، اس مختصر سے ہنگامے میں کشتی کا توازن بگڑ گیا۔ شانو اور ملاح بے تحاشہ چیخ چلانے لگے۔ کشتی اب قریباً دریا کے وسطی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بصد تگ و تاز کی تمازت سے شانو کا چہرہ سُرخ اور پسینے میں شرابور تھا، بڑی مشکل سے کشتی کو صحیح سمت پر ڈالا جا سکا، مسافروں کے تعاون سے اسباب کو متوازن طریقے پر جمایا گیا۔ کشتی موجوں کے تھپیڑوں کو کاٹتی ہوئی دوبارہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ دائیں پہلو میں شانو سے ذرا ادھر ہٹ کر بیٹھے ہوئے چاچا راکھی نے ایک دو مرتبہ اُٹھ کر شانو کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر کو بھرپور نظروں سے تاکا پھر خاموشی سے بیٹھ گیا اور حقے والے مسافر کے ساتھ تمباکو نوشی میں شریک ہو گیا۔

شانو کی نظریں ایک بار پھر اس پگڑی والے مسافر پر پڑیں، اس کے دل کو دھکا سا لگا، وقت نے اس صورت کی صحت،

خوبصورتی اور تروتازگی کو کتنی بیدردی سے پامال کر دیا تھا، چہرے کی رنگت زردی مائل سیاہ ہوگئی تھی، آنکھیں چمک سے خالی اور اندر کو دھنس گئی تھیں، کنپٹیوں کے بال سفید تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سر کے بال بھی سفید ہوں گے، سُتا ہوا چہرہ اور آنکھوں کے گرد بھرلوں کی گہری سیاہ لکیریں ایسے آپس میں اُلجھی ہوئی تھیں جیسے جلد کے اس حصے پر چیونٹیاں چپکی ہوئی ہوں۔

"کیا یہ وہی امیرا ہے جو کبھی مردانہ حُسن کی اتنی دلکش تصویر تھا، جن راہوں سے گذرتا تھا، مٹیاروں کے دل کی دھڑکن بن جایا کرتا تھا"۔ شانو نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر گردن جھکا لی۔ پھر کسی فوری خیال نے جیسے اس کے ذہن میں فولادی پنجہ گاڑ دیا۔

کرب کی ایک لہر اُس کی رُوح کو چھلنی کرتی ہوئی گذر گئی، وہ سوچنے لگی کاش امیرا آج اُسے نظر نہ آیا ہوتا، کاش، وہ اُسے زندگی بھر پھر کبھی نہ دیکھتی، اُس نے نگاہیں اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جس کے مغربی حصّے میں کالے کالے بادل سر اُٹھا رہے تھے۔

"تم اچھی تو ہو شانو؟" امیرے نے جھجکتے ہوئے مدھم سی آواز میں اس سے پوچھا۔

اس کے ہونٹ چند لمحوں کے لیے پھڑپھڑائے اور آنکھوں میں نمی کی ایک تہہ پھیل گئی۔ پھر اس کی نظریں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں پر ٹھہر گئیں۔

"شانو" میں تم سے سخت شرمندہ ہوں، تم سے معافی مانگنے آیا ہوں، میں جانتا ہوں، ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں ہیں تم سے یہ باتیں کرتے ہوئے بھی ڈر رہا ہوں، لیکن جب تک تم مجھے معاف نہیں کر دو گی مجھے سکون نہیں ملے گا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے روپوشی اختیار کرنا پڑی۔ یہاں سے جانے کے بعد میں سخت بیمار ہو گیا تھا، اس بیماری نے میری صحت کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ کئی سال بستر پر پڑا رہا لیکن ہزاروں روپے خرچ کر کے بھی میری صحت نہ لوٹ سکی۔ میرے دونوں پھیپھڑے خراب ہو گئے ہیں دنیا میں کسی کام کا اہل نہیں رہا۔ اب بھی ٹیکوں اور دوائیوں کے سہارے زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں، ڈاکٹروں نے کہا شادی کرو گے تو مر جاؤ گے، چنانچہ اب تک میں نے شادی بھی نہیں کی، پھر بھی میں سمجھتا ہوں میں تمھارا مجرم ہوں، مجھے تمھیں ان سب باتوں کی خبر ضرور کرنی چاہیے تھی، مجھے معاف کر دو ——" شانو خاموش دریا کی شفاف لہروں کو تکتی رہی۔ اس کے پاس امیرے کی ان باتوں کا بھلا کیا جواب ہو سکتا تھا، اُس نے محسوس کیا کہ امیرے کی ان باتوں نے اس کے دل کا خون کر دیا ہے۔ بعض دفعہ قدرت انسان سے کتنا سنگین مذاق کرتی ہے، وہ سوچنے لگی، ایک وہ وقت تھا کہ وہ اسی انسان کے لیے، ایک معمولی سی خوشی کے لیے وہ اپنی زندگی قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرتی، لیکن آج وہ اس سے دو باتیں کرنے کے لیے بھی اپنے روئیں روئیں میں جُرم کے احساس کی بجلیاں کوندتی ہوئی محسوس کر رہی ہے۔ جب وہ کافی دیر تک خاموش رہی تو امیرا بھی سہم کر خاموش ہو گیا۔ اُسے مزید بولنے کی جرأت بھلا کیونکر ہوتی، پھر شانو کے چہرے پر سکون اور فیصلہ کُن کیفیت کی ایک لہر دوڑ گئی، اس نے پلٹ کر امیرے کی طرف دیکھا، امیرے کی رُوح جیسے سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی۔

"میں نے تو تمھیں اُسی روز ہی معاف کر دیا تھا جس دن مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب تم لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ بس اب اس سے آگے مجھے کچھ نہ کہنا۔ تم نے ٹھیک کہا ہے کہ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ انھیں زبان پر لانا تو درکنار دل سے بھی نکال دینا چاہیئے۔

دفعتہً بجلی کی چمک کے ساتھ بادل زور سے گرجا اور اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش ایک زناٹے کے ساتھ اُتر آئی۔ دریا کی اچھلتی اُبھرتی موجوں پر بلبلوں کی دُنیا آباد ہوگئی۔ کشتی کے مسافروں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ اسباب کے نیچے سمٹنے سکڑنے لگے۔ ملاحوں نے بڑی جدوجہد سے ڈولتی ڈگمگاتی کشتی کو سنبھالا۔ اس دوران کشتی دریا کے وسیع پاٹ کے عین درمیان پہنچ چکی تھی۔ اچانک پانی کے ایک زبردست ریلے نے اُسے اُچھال کر پانی کے ایک بھنور نما حصّے میں پہنچا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بوریوں کے نیچے دبی ہوئی ٹوکریاں کھسک کر پانی میں گر گئیں۔ اس کے ساتھ ہی بوریوں کی ترتیب درہم برہم ہوگئی۔ پانی کے دوسرے زبردست ریلے سے بوریاں اور ٹوکریاں مسافروں پر ڈھیر ہوگئیں۔ کشتی میں چیخ و پکار مچ گئی۔ بوریوں اور گٹھڑیوں کے نیچے دبے ہوئے آدمیوں نے اس بوجھ سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو کشتی کا توازن باقی نہ رہا اور پانی کے زبردست تھپیڑوں میں خشک ٹہنی کی طرح لرزنے لگی۔ ملاح اور شانو پوری قوت سے کشتی کو اُلٹنے سے بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے، چند منٹوں میں ہی کشتی پر لدا ہوا نصف سے زائد بوجھ خود بخود دریا کی پھنکارتی ہوئی لہروں کی نذر ہوگیا۔ پانی کی تُندی اور تیزی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور کشتی دریا کے بھنور نما حصّے سے ایک لمحے کے لیے نکلتی تو دریا کی بپھری ہوئی موجیں اُسے دوبارہ بھنور کے منہ میں پھینک دیتیں، ساکن ہوا میں موسلا دھار بارش کی شدت نے قیامت برپا کر دی۔

"کشتی کو فوراً سامان سے خالی کر دو۔" کسی نے چیخ کر کہا۔ اس آواز کے ساتھ ہی سب مسافروں نے بوریاں، گٹھڑیاں، ٹوکریاں اور گٹھے اُٹھا اُٹھا کر پانی میں پھینکنے شروع کر دیئے۔ امیرا دو تین گٹھڑیوں کے عقب میں دُبکا بیٹھا تھا۔ ایک بوری اُس کے پہلو میں گری تو اُٹھتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ دوسرے لمحے وہ ایک خلک شگاف چیخ کے ساتھ بپھری ہوئی موجوں کی آغوش میں چلا گیا۔ شانو نے چیخ چلاتے ہوئے دیکھا کہ وہ بھنور کے نیم دائرے کے بالکل کنارے اُبلتی ہوئی موجوں میں ڈبکیاں لے رہا ہے۔ "کشتی کا سارا سامان پھینک دو ——— سب لوگ کشتی میں بھرا ہوا پانی نکالیں۔" پھر دوسرے لمحے اس نے ایک طویل جست کے ساتھ پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اپنے اور امیرے کے درمیان حائل بھنور کے حصار کو توڑتی ہوئی وہ امیرے تک جا پہنچی اور اُسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ ڈولتی ہوئی کشتی نے بھنور کو شدید سے شدید تر بنا دیا تھا، بڑے نامکمل بھنور کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بھنور دلدلی گڑھوں کی طرح اُبل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھنوروں کے اس سلسلے میں امیرا پھنس کر رہ گیا تھا اور شانو اپنی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود اُسے بھنور سے نکال نہیں سکی تھی۔ امیرے کے مُنہ کا پیشانی والا حصّہ پانی سے باہر تھا اور اس کے بال شانو کی مضبوط گرفت میں تھے۔ ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اس نے امیرے کو پانی کی سرگرمیاں موجوں سے چھڑانے کی آخری بھرپور کوشش کی، لیکن اس کا دم ٹوٹ گیا اور امیرے کے سر کے بال اس کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ بے ہوش امیرے کے تیزی کے ساتھ بہتے ہوئے جسم کی چند جھلکیاں کچھ دُور تک دکھائی دیں، پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس دوران کشتی کا سارا سامان دریا بُرد کیا جا چکا تھا، شانو اپنی ٹوٹی ہوئی سانس کے ساتھ بمشکل کشتی تک پہنچ سکی پھر اُسے ملاحوں نے کشتی میں کھینچ لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

بارش کی شدت میں کمی کے ساتھ اس میں رچاؤ کی سی آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔

نصف گھنٹے کی جان لیوا جدوجہد اور کشمکش کے بعد ہلکی پھلکی کشتی دریا کے وسطی پاٹ سے نکل کر میدانی وسعت میں داخل ہو

چکی تھی، اس جگہ پانی کے بہاؤ میں نسبتاً کافی سکون تھا، اس لیے آسانی کے ساتھ کنارے کی طرف بڑھنے لگی، شانو کو گھڑے پر اوندھا لٹا کر اس کے پیٹ کا پانی نکالا گیا۔ کشتی کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے اُسے ہوش آگیا، مسافر کشتی سے نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔
شانو نے وحشت میں ڈوبی ہوئی نظروں سے آس پاس دیکھا

"امیرا ڈوب گیا؟" وہ چیخی،

بوڑھا راکھی اس کی سُرخ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا "ہاں ڈوب گیا، تم نے اُسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ڈوب گیا، اُس کا ڈوب جانا ہی بہتر تھا۔"

"کیوں؟" اُس نے اس بڈھے کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"ہاں اس کا ڈوب جانا ہی بہتر تھا، بلکہ وہ ایک عرصے سے ڈوبا ہوا تھا ——— شراب، چرس اور ٹیکوں کے نشے میں، وہ بڑا پست آدمی تھا، اس نے باپ کی ساری جائیداد عیاشیوں میں اُڑا دی۔"

"وہ بڑا پست آدمی تھا؟"

"ہاں شانو! میں اُسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کے باپ نے یہاں باغوں کے ٹھیکے لیے تھے۔
مجھے معلوم ہے اس نے تمھیں بھی اپنے فریب کا نشانہ بنایا تھا، میں نے کشتی میں تم لوگوں کی باتیں سُن لی تھیں، وہ اس وقت بھی تم سے جھوٹ بول رہا تھا، وہ بال بچوں والا تھا۔ اس کے بچے اُس کے سُسر کے گھر پتہ نہیں کیسے زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ وہ بہت گرا ہوا انسان تھا، شاید وہ تمھارے ساتھ کوئی نیا فریب کرنے آیا تھا، اُس کی موت اُسے کھینچ کر اُسی مقام پر لے آئی جہاں اس نے دھوکے اور مکاری کا جال بچھا کر خیں برباد کرنے کی کوشش کی تھی، اچھا ہوا اس کی نجات ہوگئی۔"

شانو ٹکر ٹکر بوڑھے راکھی کا منہ تکتی رہ گئی۔ پھر اُس کی سُرخ سُرخ، پانی کے تھپیڑوں سے زخمی شل آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، چاچا "یقین نہیں آتا کہ امیرا اتنا بُرا آدمی تھا۔"

آبلہ پا

ریاض تاثیر

شیریں کی آمد کی خبر میرے لیے اتنی ناقابلِ فہم نہیں تھی جتنی غیر متوقع۔ اس بات کے علاوہ کہ پچھلے قریب بیس برس کا عرصہ میں نے اس کی قربت یا ذہنی رفاقت میں گذارا تھا، میری بیوی رقیہ اس کی سگی بھتیجی تھی۔ لیکن اس کے باوجود کہ شادی کے پہلے آٹھ برس کے عرصہ میں رقیہ نے اور خود میں نے کئی دفعہ اس بات کی خواہش کی اور اصرار بھی کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ہمارے پاس آجائے۔ شیریں نے ہمیشہ بڑی خوبصورتی سے ہمیں وعدۂ فردا پر ٹال دیا۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو دسمبر میں آنے کا وعدہ کر لیا۔ اور موسم سرما کی چھٹیاں آئیں تو اپریل میں آنے کے وعدہ پر ٹال دیا۔ اور اب رقیہ نے مجھے دفتر سے آنے کے بعد جب یہ بتلایا کہ پھپھو نے نہ صرف اپنے آنے کے متعلق لکھا ہوا تھا، بلکہ یہ تک تحریر کر دیا تھا کہ وہ کس ریل گاڑی سے آرہی ہے تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما یا ہوا تھا اور اس کی زبان بات کرتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی۔ یہ خبر پاکر ایک دفعہ مجھے بھی زندگی جھومتی اور کائنات رقص کرتی محسوس ہونے لگی۔ میں اور رقیہ ابھی شیریں کے لیے کمرے کے انتخاب پر باتیں کر رہے تھے کہ اتنی دیر میں ہمارا سب سے بڑا لڑکا ڈار لگے اور پاؤں سے ننگا صرف نیکر پہنے ہوئے بھاگتا ہوا آگیا۔ اُس کے ہاتھ میں شیریں کا خط تھا۔

"ابّا ابّو" اس نے قریب قریب ناچتے ہوئے کہا۔ "ابّو وہ سکول والی مائی آرہی ہیں" ——— شیریں کا خطاب خود اس کی اور ڈار کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ تھا۔

شیریں کو میں نے جب پہلی دفعہ دیکھا تو اُس وقت میری عمر مشکل سے گیارہ برس تھی اور میں ابھی پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میری ماں قصور کے زنانہ مڈل سکول میں پڑھاتی تھی اور ہم دونوں ماں بیٹا اُسی سکول کے ملازموں کے لیے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ میرا والد کچھ عرصہ قبل ایک عورت کو ساتھ لے کر کہیں چلا گیا تھا جو میری ماں کی نسبت بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ اس لیے میری ماں کو اپنی ملازمت کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی وہ اس مکان کا سہارا تھا جس کے لیے وہ ہر ہیڈ مسٹریس کی جا و بے جا خوشامد کے لیے تیار رہتی تھی۔

شیریں بھی اس سکول میں ہیڈ مسٹریس بن کر آئی تھی اور میری ماں کو مکان کا سہارا قائم رکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں میں مجھے سب سے کامیاب مہرہ تصور کرتی تھی۔ شام کو مجھے ہمراہ لے کر شیریں کے پاس بھی پہنچ گئی تاکہ اُسے بتلا سکے کہ میں اُس کے بہت سے چھوٹے موٹے کام کر سکتا تھا۔

اُس وقت شیریں برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی، لیکن میں نے اُس کی طرف توجہ نہ دی اور حسبِ معمول برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔ میری ماں کی ساری باتیں سُن کر اُس نے صرف اتنا کہا۔

"خالہ ——— بھلا اس بالو کا نام کیا ہے۔"

اتنی میٹھی اور مترنم آواز میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کی رنگت بہت ہی سفید تھی اور آنکھیں اتنی کالی تھیں کہ جیسے سُرمہ لگائے ہوئے ہو۔ اُس کی عمر مشکل سے بائیس برس تھی، لیکن جسم بھرا ہُوا اور صحت مند۔ میں کیا شیریں کو کوئی بھی دیکھتا تو مٹ جاتا اور مجھے تو ویسے ہی میری ماں ایک شدید حُسن پرست کا بیٹا ہونے کا طعنہ دیا کرتی تھی۔

"زاہد کریم" ——— میری ماں نے مختصر سا جواب دیا۔ اور پھر کچھ توقف سے کہنے لگی۔ "لیکن میں اُسے صرف زاہد ہی کہتی ہوں کیونکہ کریم اس کے باپ کا نام ہے جو مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا۔"

اور اس کے ساتھ ہی میری ماں کی زبان کے سارے بند بند ٹوٹ گئے اور وہ شیریں کو اپنے دُکھوں کی رام کہانی سُنانے لگی۔ اور اس دوران اس نے شیریں کی یہ بات بھی سُنی اَن سُنی کر دی کہ "ہم تو اسے بابو ہی کہا کریں گے۔" لیکن میرے کانوں میں یہ الفاظ اور بہت سی مٹھاس گھول گئے۔

اُس روز گھر آکر میری ماں نے ایک دفعہ پھر مجھے ڈانٹا۔

"یہ تم بڑوں کی طرف کیا آنکھیں پھاڑے پھٹ پھٹ دیکھ رہے تھے، وہ کسی بھی ہیڈ مسٹریس کا نام لینے کی بجائے یا ہیڈ مسٹریس کہنے کی نسبت ہمیشہ "بڑے" کہہ کر بات کرنے کو ترجیح دیتی تھی۔

رات سونے سے قبل ایک دفعہ پھر میری ماں نے یہی بات دُہرائی اور اپنے دل کی خلش مٹانے کی غرض سے یہ بھی کہہ دیا "آخر ہو کس کے بیٹے!"

اُس رات جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے شیریں نے مجھے اپنی گود میں بھر لیا ہو، اور میں ساری رات بیٹھے بیٹھے ہچکولے کھاتا رہا۔ اگلے روز سکول میں بھی کچھ دیر تک اُس کی شخصیت گذری رات کے خواب کی طرح غبار بن کر میرے ذہن پر چھائی رہی لیکن پھر کتابوں ——— اُستادوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور کھیل کُود میں اُلجھ کر میں اُس حلقے سے آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔

اُس کے بعد تین چار روز تک میں اپنی ہی محدود سی مختصر سی دُنیا میں اُلجھا رہا کہ ایک شام میری ماں پھر مجھے شیریں کے پاس لے گئی۔ اس یاددہانی کی غرض سے کہ اس نے میری خدمات کی پیش کش سے چنداں استفادہ نہیں کیا تھا۔

"ارے نہیں خالہ آپ بابو کو دھیان سے پڑھنے دیا کریں،" شیریں نے سب باتیں سن کر کہنا شروع کیا "جب یہ بڑا ہو جائے گا تو میں خود ہی اسے بہت سے کام بتایا کروں گی۔" اُس نے مختصر سی بات کی اور اس کے بعد میری ماں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئی۔

شیریں کی یہ پہلی ملازمت تھی اور غالباً اُسے ہم جیسے مجبوروں اور ناداروں سے فائدہ اُٹھانے کا ڈھنگ ابھی نہیں آیا تھا، سو اسلف وہ سکول کے چپڑاسی سے منگوا لیتی تھی اور کام خود ہی کر لیا کرتی تھی، ورنہ اس سے پہلی ہیڈ مسٹریس تو میری ماں سے سوئیٹر بنوانے کے علاوہ اس سے سر میں تیل بھی لگواتی تھی اور کبھی کبھی جیلے بہانے سے کپڑے بھی دھلوا لیتی تھی۔

کئی روز بعد ایک شام میری ماں نے بتلایا کہ سکول کا چپڑاسی کچھ دنوں کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا اور یہ بھی کہا کہ "بڑے کہہ رہے

تھے کہ اُن کا بازار کا کام کر دینا۔"

میں ہمیشہ کی طرح بڑی مستعدی اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ شیریں کے پاس چلا گیا۔ بازار سے سودا لانا اتنی اہم بات نہیں تھی جس قدر یہ کہ میں ساری چیزیں بہت کم داموں پر خرید لایا تھا۔ شیریں سارا حساب کرنے کے بعد تقریباً چیخ پڑی۔

"ہائے میں اِس دین کے بچے کو اتنا ایماندار سمجھتی رہی۔ لیکن کتنا داؤ لگاتا ہے۔"

اُس روز کے بعد شیریں کے لیے بازار سے سودا سلف لانے کا کام محض میری ذمہ داری بن کر رہ گیا۔ میں بڑی مستعدی سے سکول سے آنے کے بعد اپنا سکول کا سارا کام ختم کرتا اور اس کے بعد شیریں کے پاس پہنچ جاتا۔ اس کی رہائش سکول کے اندر ہی اُس کے دفتر سے ملحق ایک کمرے میں تھی جس کے ساتھ ہی ایک غسلخانہ اور ایک مختصر سا باورچی خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ عرصہ سے میں یہ کمرہ ہیڈ مسٹریس کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا دیکھتا چلا آیا تھا۔

بازار سے واپس آکر میں تھوڑی دیر شیریں کے پاس رہتا، اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا اور کبھی کبھار اس کے بعض کاموں میں اس کا ہاتھ بھی بٹا دیتا کہ میری ماں سے مجھے یہی تربیت ملی تھی۔

ایک روز بازار سے واپس آتے ہوئے بڑے دروازے کے پاس میں بندر کا تماشہ دیکھنے کے لیے رُک گیا، اور جب میں شیریں کے پاس دیر سے پہنچا تو اُس کا چہرہ پریشان سا لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہو گئی تھی بالو؟" اُس نے بڑی رسان سے کہا۔ "میں تو تمھیں دیر ہو جانے کی وجہ سے گھبرا رہی تھی کہ خدا خیر کرے۔"

پھر میں نے اسے نہ صرف دیر سے آنے کی وجہ بتلا دی بلکہ اپنی بساط کے مطابق اُسے بندر کے کھیل کی نقلیں بھی اُتار کر بتلایا۔ میری ایک ایک حرکت پر شیریں کھل کھلا کر ہنستی رہی۔ اُس کی ہنسی اتنی میٹھی اور مترنم تھی کہ جی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح ہنستی رہے اور میں اُس کے سامنے اسی طرح باتیں کرتا رہوں۔"

اُس روز کے بعد شیریں سے میری رفاقت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گئی اور آہستہ آہستہ میرا کھلنڈرا پن جاگ پڑا، جو اب تک میری ماں کے حالات کی وجہ سے میرے اندر ہی دبا ہوا تھا۔ میں ہر روز شیریں کو اپنے دن بھر کی مصروفیت کی تفصیلات سناتا۔ اُسے چھوٹے چھوٹے لطیفے اور چٹکلے سناتا۔ جن پر وہ دل کھول کر اپنی میٹھی مترنم ہنسی کا رس میرے کانوں میں گھول دیتی۔

اپنے ذہن سے گھٹن کا غبار چھٹ جانے سے میں پڑھائی میں بھی بہتر ہو گیا، اور آئندہ سالانہ امتحان کا نتیجہ جب میری ماں نے دیکھا تو اُس نے ایک دم میرا منہ چوم لیا۔ یہ شاید پہلا موقعہ تھا کہ میرے ہوش میں آنے کے بعد میری ماں نے مجھے پیار کیا تھا۔ اس شام جب میں تام چینی کی تھالی میں چار لڈو رکھ کر شیریں کے پاس پہنچا تو وہ اپنے بستر پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، میں نے کروشیا کے رومال سے ڈھانپی ہوئی تھالی اُس کے قریب رکھی تو وہ ایک دم چونک پڑی۔

"یہ کیا لائے ہو بالو؟" اس نے ہمیشہ کی طرح بڑی رسان سے کہا۔

"لڈو ہیں" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ لیکن پھر اُس کی سوالیہ نظروں کو دیکھ کر وضاحت کرنے لگا۔ "میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہوں، ماں نے کہا تھا کہ یہ لڈو بڑوں کو دے آؤ۔"

شیریں جیسے بوکھلا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے کتاب ایک طرف پھینک دی۔ اُس کا چہرہ جیسے خوشی سے دمکنے لگا۔
"ہائے اللہ کیسی خوشی کی بات ہے" اس نے بڑے جوش سے کہا، لیکن کس قدر کمینے ہو۔ یہ تم مجھے بڑے کیوں کہتے ہو۔ باجی نہیں کہہ سکتے۔ اور خالہ سے بھی کہنا کہ آئندہ مجھے یہ گالی نہ دیا کریں"۔ شیریں کہتے کہتے رُک گئی، اور پھر ذرا توقف کے بعد بولی "میں تو اتنی حقیر اور کم تر ہوں"
اُس کی ان باتوں کا اگرچہ میرے پاس ہونے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے اچھی لگیں۔
آہستہ آہستہ شیریں سے میری رفاقت بڑی گہری ہوگئی۔ اور میں نے اپنے ذہن میں جو سارے خوبصورت لوگوں کو اکٹھا کر کے خیالات کی ایک بڑی حسین دنیا آباد کر رکھی تھی شیریں کا مقام اُن سب سے جُدا تھا۔
اُن دنوں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ شیریں کے کہنے پر جب میں اُس کے نازک نازک سے سینڈل بازار سے مرمت کرا کے لایا تو وہ اپنے بستر سے نیچے پاؤں لٹکا کر اُنھیں پہن کر دیکھنے لگی۔ میں نے چھوٹی چھوٹی ایڑیوں اور گلابی رنگت کے تلووں والے اتنے سفید اور خوبصورت پاؤں دیکھے تو ایک دم میرا جی چاہا کہ اِن سے لپٹ کر میں خود اُسے سینڈل پہنا دوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے گلے سے لے کر سینے تک ایک عجیب سی خلش محسوس ہونے لگی۔
میں ابھی وہیں کھڑا تھا کہ اتنی دیر میں باہر کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی قریب چالیس برس کی عمر کا ایک درمیانہ قد کا آدمی اندر داخل ہُوا، اس کی رنگت بھی گندمی سی تھی۔ اور اس کے بڑے سے سر پر بال اس حد تک اُتر چکے تھے کہ اُسے آسانی سے گنجا کہا جا سکتا تھا۔
شیریں نے مجھے بتایا کہ وہ اس کا ماموں زاد تھا۔ اس کا نام واصف تھا اور وُہ محکمہ امداد باہمی میں بطور انسپکٹر ملازم تھا اور اب تبادلہ پر تصور میں ہی آگیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد شیریں رسوئی میں جا کر چائے بنانے لگی، اور میں اس کے کہنے پر واپس اپنے گھر آگیا۔
اُس رات جب میں سکول کا کام کرنے کی غرض سے بیٹھا تو کتاب کے الفاظ میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور میں دیر تک کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ پھر تنگ آکر میں نے بتی بُجھا دی اور بے دلی سے سو گیا۔ اُس روز میں باقی دنوں کی نسبت زیادہ اطمینان سے نہیں سو سکا تھا۔ مجھے متعدد بار اُس گنجے واصف کا خیال آیا جس نے آتے ہی شیریں کی ساری توجہ حاصل کر لی تھی اور مجھے اس نے دو ٹوک الفاظ میں گھر سے چلے جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ جیسے کوئی مچھلی کی مڑی ہوئی قاش اپنے برتن سے اُٹھا کر باہر پھینک دے۔ مجھے دو ایک دفعہ شیریں پر غصہ بھی آیا۔ لیکن اس کی شخصیت اتنی مسحور کن تھی کہ میں زیادہ دیر تک اپنا غصہ بحال نہ رکھ سکا۔ رقابت کا یہ پہلا احساس بڑا عجیب اور جان لیوا تھا، لیکن اس سے اگلے روز ہی جب شیریں سے میں پھر ملا تو اس میں اپنائیت کے سارے عنوان اسی طرح موجود تھے۔
اس کے بعد بھی میں نے واصف کو تین چار دفعہ شیریں کے پاس دیکھا۔ بڑی تگ و دو کے بعد میں اسی قدر جان سکا کہ اس کا نام محمد حسین اور واصف تخلص تھا۔ جو شاعری سے کسی شغف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے نام کی صوتی قدامت کے بوجھ کو کم کرنے کی غرض سے چنا گیا تھا۔ چنانچہ اب دفتر اور سرکاری کاغذات میں اس کا نام ایم، ایچ واصف تھا، لیکن شیریں جب کبھی بھی بے تکلفی

کے مُوڈ میں ہوتی اُسے ہمیشہ حُسینا بھائی۔ یاسین بھائی کہہ کر پکارتی۔

واصف نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ کسی مرحلہ پر ان دونوں کی شادی قریب قریب طے ہو چکی تھی، لیکن بعد میں کچھ گھریلو الجھنوں کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور اب یہ محض ایک اتفاق تھا کہ وہ دونوں ایک ہی مقام پر اکٹھے ہو گئے تھے اور جب شیریں نے دو ایک دفعہ دبے لفظوں میں اس بات کا اظہار کیا کہ وہ واصف کے زیادہ قریب نہیں رہنا چاہتی تو میرے ذہن سے رقابت کا سارا غبار ایک دم اُتر گیا۔

قصور میں واصف کی آمد کے قریب پانچ چھ ماہ بعد جب میں ابھی نیا نیا دسویں جماعت میں ہوا تھا، شیریں کا تبادلہ چیچہ وطنی ہو گیا۔ تبادلہ کے احکامات آنے سے تین چار روز قبل ہی شیریں نے جس طرح چوری چوری اپنا سامان اکٹھا کرنے کی تیاری شروع کر دی تھی، اس سے میری ماں نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا۔

"بڑوں نے اپنا تبادلہ خود کرایا ہے"، اُس نے شام کو بڑی رازداری کے انداز میں مجھ سے کہا۔ اور پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ "یا کم از کم اس تبادلہ کا علم اُنھیں پہلے سے ضرور تھا"

بہر حال دو تین روز کی مزید تیاری کے بعد شیریں صبح کی ریل گاڑی سے روانہ ہو گئی۔ ریلوے اسٹیشن پر میری ماں اور دیگر اُستانیوں کے علاوہ شہر کی کچھ بیگمات اور اُن کے شوہر بھی موجود تھے۔ اور ان سب سے الگ تھلگ واصف ایک عجیب تھکے تھکے سے انداز میں سامان اِدھر اُدھر رکھنے میں مصروف تھا، اس کے چہرے پر ایک واضح قسم کی اُداسی موجود تھی۔ شیریں کے چہرے کے تاثرات کی نسبت میں اس لیے بے خبر رہا کہ اس نے نقاب اوڑھ رکھا تھا۔

شیریں کے چلے جانے کے بعد کچھ دنوں تک تو مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں اچانک روشنی کے ہالے سے نکل کر ایک شدید تاریکی میں داخل ہو گیا ہوں، لیکن پھر آہستہ آہستہ میں پڑھائی میں زیادہ مصروف ہو گیا۔

نئی ہیڈ مسٹریس سے میری باضابطہ ملاقات نہ ہو سکی، کیونکہ اب میں اپنی ماں کی نظروں میں بھی کافی بڑا ہو گیا تھا، البتہ دو ایک دفعہ میں نے اسے اِدھر اُدھر جاتے ضرور دیکھا تھا۔ نصرت عابدی اس کا نام تھا۔ لیکن وہ شیریں کی سی بات کہاں۔

دسویں کا امتحان میں نے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس لیے اپنا آئندہ پروگرام بنانے میں مجھے بہت سہولت ہو گئی۔ انہی دنوں گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران شیریں ایک دفعہ قصور میں آئی اور شہر میں اپنی ایک دوست کے پاس کچھ دنوں کے لیے ٹھہری جس کی ابھی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ میں اور میری ماں وہیں جا کر شیریں سے ملے۔ کیونکہ اس نے آتے ہی کچھ دوسرے لوگوں کے علاوہ میری ماں کو بھی اپنی آمد کی اطلاع دی تھی، شام کو جب ہم واپس اپنے گھر آئے تو میری ماں کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

"ہائے اللہ بڑوں نے آتے ہی سب سے پہلے مجھے اطلاع دی ہے" وہ بار بار کہہ رہی تھی "خدا انھیں سلامت رکھے"

پھر ایک شام ہم نے شیریں کو اپنے مختصر سے گھر میں کھانے کی دعوت دی۔ وہ اس سے پہلے بھی دو ایک دفعہ ہمارے گھر میں آئی تھی لیکن اس رات تو مجھے اپنے گھر کی دیواریں اتنی روشن لگ رہی تھیں۔ کھانے کے دوران ہی جب میرے مستقبل کا ذکر آیا تو شیریں نے مجھے لاہور کے گریگ انسٹی ٹیوٹ سے الیکٹریکل میں ڈپلومہ لینے کا مشورہ دیا کہ اس کے نزدیک آئندہ اس لائن میں بہت گنجائش تھی۔ کھانے کے بعد میں

اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں لیکن شیریں کی کسی بات کو ماننے کے لیے تو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں تھی محض اس لیے کہ اسے اُسی کے ہونٹوں کی سند حاصل تھی۔

قصور میں شیریں کے اس تین چار روز کے قیام میں سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ واصف اس سے ملنے کے لیے ایک دفعہ بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی غالباً اس نے اپنی آمد کی نسبت اُسے اطلاع دی تھی۔ میں نے یہاں تک بھی محسوس کیا کہ ایک آدھ مرتبہ اس کے تذکرہ پر شیریں کے چہرے سے باقاعدہ ناگواری کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے پر میں نے لاہور میں داخلہ لے لیا۔ جس کے لیے مجھے کوئی تگ و دو نہ کرنا پڑی تھی انسٹی ٹیوٹ چونکہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی تھا اس لیے مجھے روزانہ قصور سے آنے جانے میں کوئی دقت نہ تھی، اس موضوع پر میں نے اور میری ماں نے بہت سوچ بچار کی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچ سکے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے کی نسبت قصور سے ریل گاڑی میں روزانہ آنے جانے پر کم خرچ ہوتا تھا۔

اب میری مصروفیت کی نوعیت یکسر بدل گئی تھی۔ ریل گاڑی کے سفر کے لیے میں نے پاس بنوا لیا تھا۔ تین سال کے عرصہ میں میرا معمول یہی رہا کہ صبح سویرے اُٹھ کر رات کی باسی روٹی لسّی یا اچار کے ساتھ کھا کر روانہ ہو جاتا اور گہری شام ڈھلے گھر واپس آتا جہاں میری ماں مستقبل کے ہزاروں خواب اپنی آنکھوں میں سجائے میری منتظر ہوتی۔ اب اس نے مجھے طعنے دینا چھوڑ دیئے تھے، اور ہمیشہ زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے میری حوصلہ افزائی کرتی رہتی؛ اُس کی آنکھوں پر عینک سج گئی تھی اور اس کے بالوں پر سفیدی نے ڈیرے ڈالنا شروع کر دیئے تھے، اور جب کبھی لاڈ سے وہ میرے چہرے پر اپنے ہاتھ پھیرتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ کام کی وجہ سے ان کا کھردرا پن بڑھتا جا رہا تھا۔

اسی دوران چیچہ وطنی سے شیریں کا تبادلہ پہلے خوشاب پھر سرگودھا اور بالآخر خانیوال ہو گیا۔ عام حالات میں کبھی کبھی لیکن اپنے تبادلہ کی اطلاع دینے کی غرض سے شیریں ضرور خط لکھتی۔ اس کا خط آجانے سے کچھ عرصہ کے لیے یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارے گھر میں بہار آگئی، کیونکہ وہ غالباً اِس بھری پڑی دُنیا میں واحد شخص تھی جس کو میری ماں سے ہمدردی کے علاوہ میرے مستقبل سے دلچسپی تھی۔

اس عرصہ میں جو خاص بات ہوئی وہ واصف کی شادی تھی۔ آخر اکتوبر کی ایک شام میں انسٹی ٹیوٹ سے فارغ ہو کر قصور واپس آ رہا تھا کہ ریل گاڑی میں میری واصف سے ملاقات ہو گئی۔ وہ لاہور میں اپنے کسی محکمانہ کام کے لیے گیا تھا۔ راستہ میں واصف نے مجھے بتلایا کہ اگلے مہینے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے بڑے اصرار سے شادی میں شرکت کی دعوت دی۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ اُس کے آئندہ منصوبوں میں ملازمت چھوڑ کر کاروبار اُستوار کرنا شامل تھا۔ اُس کے سُسر نے قصور میں بجلی سے چلنے والی کھڈیاں لگا رکھی تھیں جن پر وہ کینوس بناتا تھا اور بقول واصف کے خوب مال کما رہا تھا۔ میں اس کی شادی میں تو ضرور شامل ہوا، لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس کے آئندہ منصوبوں کے بارے میں زیادہ نہ جان سکا۔

انسٹی ٹیوٹ سے آخری امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے ملتان میں ملتان الیکٹرک سپلائی کمپنی میں چھ ماہ کے لیے رخصت پر گئے ہوئے ایک لائن سپرنٹنڈنٹ کی جگہ ملازمت مل گئی۔ اس عرصہ میں میں تقریباً ہر اتوار اور چھٹی کے دن شیریں کے پاس خانیوال چلا جاتا۔ ہفتہ کی دوپہر سے ہی شیریں میرا انتظار شروع کر دیتی، اور اکثر و بیشتر دوپہر کا کھانا بھی میرے پہنچنے پر کھاتی۔ شام کو کھانے سے فارغ ہو کر

ہم دونوں اپنے اپنے بستروں میں بیٹھ کر خوب باتیں کرتے۔ باتیں کرنے کے لیے ہمیں کسی موضوع کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، جہاں سے جی چاہا کوئی بات شروع کر لی اور جہاں جی چاہا ختم کر دی۔ اپنے اپنے کام اور دفتر کے قصے ساتھیوں سے اٹھکھاؤ اور سلوک کی باتیں۔ گھر گرہستی چلانے کے طریقے اور دنیا جہان کی الابلا۔ میں شیریں سے ہر قسم کی باتیں کر لیتا۔ اب بھی وہ میری باتوں پر اُسی طرح کھل کر ہنستی اور اب بھی میرا جی یہی چاہتا کہ میں اُس کے سامنے بیٹھا باتیں کرتا رہوں اور وہ اپنی مسیحی متبسم ہنسی کا رس میرے کانوں میں گھولتی رہے۔ لیکن اب کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ اس کی ہنسی جیسے آہستہ آہستہ بکھرنے لگی تھی اور کئی دفعہ اس کی ہنسی جیسے راستے میں ہی ٹوٹ جاتی۔

دسمبر میں سکول بند ہوئے تو میرے اور شیریں کے اصرار پر میری ماں شیریں کے پاس آ گئی۔ ان دس دنوں میں تو میں اکثر و بیشتر رات کی ٹرین سے خانیوال چلا جاتا اور صبح سویرے ملتان لوٹ آتا۔ ساری رات جاگتے رہنے کے باوجود بھی مجھے دن میں کبھی نیند کا بوجھ محسوس نہ ہوا۔

ایک روز اپنے حالات کے علاوہ میری ماں نے اپنی عمر اور صحت کی شکایت کی تو شیریں اچانک سوچ میں پڑ گئی۔

"خالہ اب بس کرو۔" اُس نے قدرے توقف سے کہا۔ "کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ کے بالو کے ہاتھ پیلے کر دو اور بس اب آرام کرو۔" اُس کا بات کرنے کا انداز ہمیشہ اپنا ہوتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میری ماں جیسے کہیں دُور سے بول رہی تھی۔ "میں اب کہاں ماری ماری پھروں گی۔ تم خود ہی کوئی لڑکی تلاش کر دو۔" اُس نے شاید ذمہ داری کا بوجھ ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ لڑکی اتنی خوبصورت ہو کہ اس بدذات کو اس سے زیادہ حسین لڑکی کہیں نہ مل سکے۔ میں نے اس کے باپ کے لچھن دیکھے ہوئے ہیں۔" میری ماں کی آواز جیسے ایک دم ٹوٹ گئی اور اس کے بعد اس نے کوئی بات نہ کی اور معلوم نہیں کہ کچھ سوچتے سوچتے بالآخر سو گئی۔ کیونکہ آہستہ آہستہ اُس کے چھوٹے چھوٹے خراٹوں کی آواز آنے لگی تھی۔

دس روز کے بعد جب میری ماں واپس جانے لگی تو میں نے پچھلے تین ماہ کی ساری بچت اس کی جھولی میں ڈال دی۔ ایک لمحہ کے لیے میں نے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک دیکھی جیسے اُسے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہو یا جیسے ایک دم اس کے سارے دُکھوں کا مداوا ہو گیا ہو۔ لیکن اس کے بعد اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معلوم نہیں یہ اس بے پایاں خوشی کی وجہ سے تھا جو میری تکمیل نے اُس کے دل میں بھر دی تھی، یا اس بے بسی کا بند ٹوٹ جانے کی وجہ سے جو ایک عمر سے اُس کا مقدر بن چکی تھی۔ ریل گاڑی پر سوار کراتے وقت میں نے محسوس کیا کہ میری ماں جیسے ایک دم بہت کمزور ہو گئی تھی، جیسے برسوں کے سفر نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی اس دھان پان سی عورت کو غور سے دیکھا۔ اس نے اپنے نحیف کندھے ایک سفید سی شال میں چھپائے ہوئے تھے جو کثرت استعمال سے اپنی رنگت کھو چکی تھی۔ معاً خیال آیا کہ وہ ایک عظیم عورت ہے اور ایک دم میرا سر اُس کی عظمت کے سامنے جھک گیا۔

اخیر جنوری کی ایک بہت ہی سرد شام میں جب شیریں کے پاس پہنچا تو وہ انگیٹھی کے پاس بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھی اور بہت اُداس نظر آ رہی تھی۔ میں نے اُس کی اُداسی کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ ٹال گئی، پھر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ابتدا میں اُس نے بڑی بے دلی سے میری باتوں کا جواب دیا۔ لیکن پھر وہ سنبھل گئی اور اُس کی خوش دلی بھی آہستہ آہستہ

لَوٹ آئی۔ اُس نے سوئیٹر ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر کھانا گرم کیا۔ کھانے سے فارغ ہو دونوں نے مل کر ہی چائے بنائی اور بالآخر اپنے اپنے بستروں میں سو گئے۔ آدھی رات کے قریب میں نے شیریں کے بستر سے دبی دبی سسکیوں کی آواز سنی۔ غالباً میری آنکھ بھی اُس کی آواز سے کھُل گئی تھی۔

پہلے میں نے سوچا کہ اُس نے شاید کوئی بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔ لیکن پھر کمرے میں پھیلی ہوئی ہلکی سی روشنی میں مَیں نے محسوس کیا کہ شیریں کا لحاف ہل رہا تھا۔ میں اُٹھ کر اُس کے بستر پر چلا گیا، اور دونوں ہاتھوں سے اُس کے کندھے پکڑ لیے۔

"باجی! کیا ہُوا ہے باجی!" میں تقریباً چیخ پڑا۔

"کچھ نہیں" اُس نے بڑی دیر کے بعد بڑی ہی کمزور سی آواز میں کہا۔ "زاہد خدا کے لیے تم کبھی اپنے باپ کریم یا میرے محبوب واصف کے نقشِ قدم پر نہ چلنا" اس نے مزید آہنگی سے کہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

میں نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام لیا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اُسے دلاسے دینے لگا۔ بڑی دیر کے بعد جب اُس کی سانس ذرا ہموار ہوئی تو اس کی جیسے کہیں بہت دُور سے مدھم سی آواز آئی "کتنے کٹھور ہوتے ہو تم مرد بھی۔ کسی کو صورت پسند نہیں آتی اور کسی کو لالچ اندھا کر دیتا ہے" پھر جیسے آنسوؤں کا طوفان گذر جانے پر وہ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گئی اور آہستہ آہستہ نیند نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اُس رات میں صبح تک نہ سو سکا، اور ساری رات میں اُس کے سرہانے بیٹھا اُس کے بالوں میں آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ اگلے روز جب وہ سو کر اُٹھی تو اُس کے چہرے پر طمانیت کا ایک عجیب سا نکھار تھا۔

اُس روز سارا دن ہم دونوں میں سے کسی نے اس موضوع پر بات نہ کی اور غالباً سارا دن اس بات سے سہمے رہے کہ کہیں ہم ایک دوسرے کے خیالا : پڑھ لیں۔ دوسری رات میں نے شیریں کے پاس معمول کی طرح گذاری اور اگلے روز صبح کی ریل گاڑی سے میں حسبِ معمول اپنے کام پر واپس ملتان آ گیا۔ لیکن وہ پُورا ہفتہ میں نے نہایت کرب اور بے چینی کے عالم میں گذارا۔ اُن دنوں میں نے شیریں کے لیے پہلی دفعہ ایک عجیب سا جذباتی لگاؤ محسوس کیا۔

ابتدائی معاہدہ کے مطابق میری ملاز: وسط مارچ میں ختم ہو رہی تھی لیکن پھر اس میں مزید چار ماہ کی گنجائش نکل آئی، اور اس طرح اخیر جولائی میں فارغ ہو کر میں اپنی ماں کے پاس قصور واپس آ گیا۔ میری ماں اور زیادہ کمزور اور بوڑھی ہو گئی تھی۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ میری جُدائی اس کی صحت کے لیے قاتل بن رہی تھی۔ پھر میں سوچنے لگا کہ مجھے کوئی ڈھنگ کی مستقل ملازمت مل جائے تو میں اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

اگلے روز جب میں نے ماں کی جھولی میں اپنی ساری بچائی ہوئی رقم ڈھیر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ ایک دم جیسے سہم سی گئی۔

"زاہد" اُس نے بالآخر بڑی دیر کے بعد بڑی نحیف آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "بیٹے شادی کے باوجود مجھے کبھی تمھارے باپ نے سہارا نہیں دیا ——— اور اس موضوع پر ہر عورت کی طرح فطری کمزوری اور خواہش کے باوجود میں تمھارے لیے ایک تناور

درخت بنی رہی ہوں کہ تمھیں میرے سہارے کی ضرورت تھی ۔۔۔ ماں خاموش ہو گئی۔ میں بھی اُس کی بات سُن کر مبہوت سا رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر مجھے مخاطب کیا: "زاہد تم نے یہ آج کیا کیا ہے بیٹے۔ مجھے یہ احساس کیوں دلا دیا ہے کہ تمھیں اب میرے سہارے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ خود میرا سہارا بننے لگے ہو۔"

اُس رات میں ایک پل کو بھی نہ سو سکا۔ مجھے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے مکمل ہوتے دیکھ کر میری ماں کی ساری ہمت اور حوصلہ جس نے مجھے کبھی باپ کی کمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا، اس طرح بکھر جائیں گے۔

ایک روز شیریں کا خط آیا تو میری ماں سارا دن اُسے چھپ چھپ کر پڑھتی رہی، شام کو اُس نے بتلایا کہ شیریں نے میری شادی کے لیے اپنے بھائی کی بیٹی رقیہ کی نشان دہی کی ہے۔ رقیہ کو میں نے بہت عرصہ پہلے ایک دفعہ شیریں کے پاس ہی دیکھا تھا، اُس وقت اس کی عمر مشکل سے دس برس تھی اور میں خود ابھی نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بڑی بڑی کٹورا ایسی آنکھیں ۔۔۔ ڈھیلے ڈھالے رِبن میں بندھے ہوئے بال اور اتنی گوری کہ دیکھنے سے بھی میلی ہو جاتی۔ رقیہ اس وقت اپنی عمر کی تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ اب اس نے میٹرک پاس کر لیا تھا، معلوم نہیں بڑی ہو کر اُس پر کس قیامت کا نکھار آیا ہوگا۔ میں نے کئی دفعہ ذہن میں اُس کا سراپا بنانے کی کوشش کی لیکن خیالات میرا ساتھ نہ دے سکے۔

اس کے کوئی چھ ماہ بعد اس اصرار کے باوجود کہ مجھے پہلے ملازمت مل جانی چاہیئے، میری شادی کر دی گئی۔ رقیہ کو جب میں نے پہلی دفعہ دُلہن بنے دیکھا تو میں دھک سے رہ گیا۔ میں نے اُس کا گھونگھٹ اُلٹا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شیریں کئی جلوہ سامانیاں لے کر میرے سامنے آن بیٹھی ہو ۔۔۔ بالکل وہی آنکھیں، وہی چہرہ، وہی ہاتھ اور پاؤں اور وہی آواز اور ہنسی کا میٹھا مترنم جادو۔ لیکن ہر چیز میں ایک عجیب سا نکھار۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے شیریں کے سراپا کو ایک دفعہ پھر پہلے سے کہیں زیادہ ہنرمندی سے ترتیب دے کر رقیہ کے رُوپ میں پیدا کر دیا ہو۔

اگلے روز میں صبح کے وقت اپنے کمرے سے باہر نکلا تو شیریں کو اپنا منتظر پایا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی طمانیت کا نکھار جھلک رہا تھا۔ میں اُس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے پاس بالکل تنہا تھا۔ ایک عجیب سے جذبۂ تشکر سے میرا سر جھکا جا رہا تھا کہ مجھے شیریں کی آواز آئی۔ "بابو میں نے خالہ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ رقیہ نہ صرف یہ کہ بہت خوبصورت ہے بلکہ اُس کے سارے خدوخال میں میرا عکس جھلکتا ہے" ۔۔۔ وہ خاموش ہو گئی اور قدرے توقف سے پھر کہنے لگی۔ "میں نے تمھاری آنکھوں میں وہ روشنی دیکھی ہے جس کے پیچھے میرے قریب رہنے کی خواہش جھلک رہی تھی۔"

میں اُس کی بات سُن کر ششدر رہ گیا۔ اس نے میرے خیالات کس وقت پڑھ لیے تھے۔ میں سوچنے لگا۔ لیکن شیریں کے قرب کی خواہش کی جوت تو ہمیشہ ہی میری آنکھوں میں رہی ہوگی۔ اُسی روز سے لے کر جب میں نے اُسے پہلی دفعہ دیکھا ۔۔۔ آج تک۔

اُس کے بعد تین چار ماہ کا عرصہ پلک جھپکنے میں گذر گیا۔ میں نے اور رقیہ نے خوب خوب سیریں کیں۔ راولپنڈی میں رقیہ کے والدین کے پاس، مری میں اُس کے ایک ماموں کے پاس، کوئٹہ میں اُس کے چند عزیزوں کے پاس اور پھر خانیوال میں شیریں کے پاس۔

خانیوال سے ایک روز میں اپنے پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے ملنے ملتان چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو میرے سر میں

شدید درد ہو رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹا تو شیریں میرا سر سہلانے لگی۔ اُس روز میں اپنی برسوں کی آرزو کو کوشش کے باوجود دبانے سے قاصر رہا اور آہستہ آہستہ اُس کے قدموں کی طرف سمٹ کر اس کے پیروں سے کھیلنے لگا۔

"بابو" اچانک شیریں کی آواز آئی "کتنے عرصہ سے خواہش تھی کہ تم ایک دفعہ ننھے سے بن کر میری گود میں سمٹ آؤ۔ اور اب لگتا ہے کہ خدا نے میری آواز سُن لی ہے۔"

اس کے بعد جب اُس نے رقیہ کی طرف دیکھا تو وہ پریشان سی ہو کر چائے بنانے کے بہانے سے رسوئی کی طرف چل گئی اور میں اس بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ شیریں نے مجھے بتلایا کہ رقیہ کی طبیعت صبح سے خراب تھی اور اُس کا جی متلاتا رہا تھا۔ پھر خود ہی میری ناتجربہ کاری کا اندازہ کر کے شیریں نے وضاحت کر دی کہ "رقیہ ماں بننے والی ہے۔"

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر سے سارا درد ایک دم کافور ہو گیا ہے۔ میں قدرے سنبھل کر اُٹھ بیٹھا۔ اور ابھی رقیہ کے پیچھے رسوئی میں جانے کے خیال سے بستر سے اُترنا چاہتا تھا کہ شیریں ایک دم بول پڑی۔ "رقیہ عمر میں مجھ سے کتنی کم ہے لیکن کتنی جلدی تکمیل کے سارے مراحل طے کر گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ مجھے ایک عرصہ کے بعد شیریں کے ساتھ ایک نئے موضوع پر بات کرنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔

"تم اس بات کو نہیں سمجھ سکتے زاہد" شیریں نے کہنا شروع کیا۔ "تخلیق قدرت کی سب سے عظیم صفت ہے اور اس مرحلہ پر عورت خدا کی سب سے بڑی رفیق ہے۔"

"صرف عورت ہی یا ہر چرند پرند اور حیوان کی مادہ"۔۔۔ اس قسم کے موضوعات پر ہم نے بارہا بلا جھجک کئی کئی گھنٹے تک باتیں کی ہوئی تھیں۔ اس لیے میں جلد ہی شیریں کے ساتھ بحث کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

"نہیں صرف عورت" شیریں نے بڑے اطمینان سے دوٹوک جواب دیا۔ "اس لیے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کی تخلیق کے لیے خدائے بزرگ و برتر کو عورت اور صرف عورت کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"اور گاڑی کا دوسرا پہیہ" میں نے بھی اُسی اطمینان سے کہا۔

"وہ بھی اپنی جگہ پر ہے لیکن ناگزیر نہیں" شیریں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور میری دلیل کا سب سے بڑا ثبوت مریم کا وجود ہے جس کے ان چھوٹے کمزور سے بدن سے خدا نے اُس بطلِ جلیل کو پیدا کیا، جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین انسانوں میں ہوتا ہے۔" شیریں خاموش ہو گئی اور کچھ دیر کے بعد اُس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ اسی لیے مریم عورت کی تکمیل کی آخری منزل ہے۔"

معاً میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ میں نے شیریں کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے مریم کے چہرے کا سارا نور و تقدس وہاں منجمد نظر آیا۔ میں بات کو آگے بڑھانے کے لیے ذہن میں الفاظ ڈھونڈنے لگا اور ابھی میں کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا، کہ شیریں پھر بول پڑی۔

"ایک وجود میں دوسرے وجود کا احساس عرفان کی منزل ہے، لیکن ایک وجود سے دوسرے وجود کا جنم کتنا بڑا رتبہ ہے۔"

شبیریں کی بات ابھی ادھوری تھی کہ رسوئی سے کسی برتن کے گرنے کی آواز آئی اور ہم دونوں اُس طرف بھاگ پڑے۔
رقیہ کے ہاتھ سے چائے کے پانی والا پتیلا گر پڑا تھا۔ اُس کے چہرے کی رنگت پریشانی اور حیا کی آمیزش سے تمتما رہی تھی اور اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"کیا بات ہے رقیہ" میں نے بڑی رسان سے اُس سے دریافت کیا اور پھر اُس کے کپڑوں پر پانی کے چھینٹے دیکھ کر اچانک پریشان ہوگیا۔ "جانو پانی گرم تو نہیں تھا" کسی بھی دوسرے شخص کی موجودگی میں اتنی اپنائیت اور پیار سے میں شاید پہلی دفعہ اُس سے مخاطب ہوا تھا۔

"نہیں" اُس نے بڑی آہستہ آواز میں کہا "ابھی تو میں نے دُودھ گرم کیا تھا، پانی تو چُولھے پر بھی نہیں رکھ پائی تھی"
میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خود دل سے پانی بھر کر چُولھے پر رکھ دیا اور خود ہی ٹرے میں چائے کے برتن لگانے لگا۔
میری ماں نے رقیہ کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں ساری دنیا کی روشنیاں سمٹ آئیں اور وہ پہلے ہی اس کا اتنا خیال رکھتی تھی اور بھی نہال ہونے لگی۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ رقیہ چارپائی سے بھی اُٹھنے لگتی تو ماں اُسے بازوؤں میں تھام لیتی۔ ایسے لمحوں میں رقیہ محض شرما کر رہ جاتی۔

اپنے پہلے بچے کی پیدائش سے قریب تین ماہ قبل مجھے رقیہ کے والد کی کوشش سے کراچی میں ایک کپڑے کی مل میں ملازمت مل گئی جہاں میں نے کوئی پانچ ماہ تک ملازمت کی اور پھر مجھے اپنے ایک پرانے دوست کی وساطت سے کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ جتنا عرصہ میں نے کپڑے کی مل میں کام کیا میرا زندگی کا شاید سخت ترین دور تھا، میں رات اور دن کی مختلف شفٹوں میں کام کرتا، اور تنور سے روٹی کھاتا رہا۔ پھر بھی مشکل سے وقت گذرتا۔ اسی دوران قصور سے ایک روز میری ماں نے تار سے مجھے اطلاع دی کہ خدا نے اُسے پوتا دیا ہے۔ اُس روز بھی میں نے معمول کے مطابق ایک تنور پر بیٹھ کر روٹی کھائی تھی اور ٹھنڈا پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا تھا، لیکن اس روز دُنیا ایک دم بہت حسین ہوگئی تھی اور ایک دم ہی میرے دل میں گنگناہٹ اور آشا بھونسلے کے گائے ہوئے گیت سُننے کی بڑی شدید خواہش جاگ پڑی۔ اُس رات بڑی دیر تک میں اپنے بستر میں لیٹا کراچی سے قصور تک کے کرائے کا حساب کرتا رہا، اور باوجود اس بات کے کہ واپسی کا کرایہ مجھے ماں سے ملنے کی بھرپور توقع تھی، میں اپنی مجبوریوں کے ہالے کو توڑنے میں قطعاً ناکام رہا اور قصور جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ اس کے تین چار روز بعد ماں کی طرف سے مجھے ایک طویل خط ملا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا کہ "تمہارے بیٹے کا نام میں نے مُراد رکھا ہے۔" ماں کا سارا خط مجھے موسیقی کی ہلکی میٹھی تانوں کی طرح گنگناتا محسوس ہوتا تھا۔

کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی میں ملازمت مل جانے کے ساتھ ہی میرے حالات آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے کمپنی کی طرف سے ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی مل گیا، میں نے بازار سے دو چارپائیاں اور ایک چھوٹے سے میز کے علاوہ چار کرسیاں بھی خرید لیں۔ پھر ایک روز میرے پُرانے مالک کو ہماری کمپنی میں کوئی کام آن پڑا جو میں نے محض حقِ نمک ادا کرتے ہوئے کروا دیا۔ شام کو سیٹھ میرے مختصر سے مکان پر میرا شکریہ ادا کرنے آیا میں اپنی جگہ پر کٹ رہا تھا کہ اتنے بڑے آدمی کو چائے کی پیالی

بھی پیش کرنے سے قاصر تھا کہ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر خود ہی کہا "بھئی کیا بات ہے، گھر خالی خالی سا لگ رہا ہے۔ اس میں کوئی ڈھنگ کا فرنیچر لا کر رکھو۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اگلے روز بیٹھو نے خود ہی ایک صوفہ سیٹ خرید کر میرے ہاں بھجوا دیا۔ اس کے بعد اور بھی چھوٹی موٹی چیزیں مجھے اِدھر اُدھر سے مل گئیں۔ ویسے بازار سے بھی میں نے جتنی اشیاء خریدیں وہ مجھے سستے داموں مل جاتیں دراصل لوگوں کی اپنی ضرورتیں ہی اس قسم کی تھیں کہ میری ضروریات پوری ہو جانے کا بہانہ بن جاتا۔

بالآخر میں نے رقیہ، مراد اور ماں کو اپنے پاس لے آنے کا فیصلہ کر لیا۔

قصور جانے سے ایک ہفتہ قبل میں ایک روز صدر بازار سے مُراد کے لیے ربڑ کے بنے ہوئے منّے منّے سے کھلونے خرید رہا تھا کہ اچانک مجھے واصف مل گیا۔ وہ بڑی عجلت میں تھا۔ اُس نے بتلایا کہ اس نے ملازمت چھوڑ دی تھی، لیکن وہ کھڈیاں نہیں لگا سکا تھا، کیونکہ اس کے سُسر نے اُس کی کسی قسم کی بھی امداد کرنے سے یکسر انکار کر دیا تھا، اور چاہتا تھا کہ وہ اس کے گھر میں ہی رہ کر اس کے اپنے کام میں ہاتھ بٹائے۔ جو واصف کے خالص پٹھان خون کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ اسے بیرون ملک ایک فرم میں ملازمت مل گئی تھی اب وہ اپنی فرم کی طرف سے پاکستان میں سے خشک پھلوں کے نمونے حاصل کرنے آیا ہوا تھا۔

میرے اس اصرار کے باوجود کہ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کی پیالی پر باتیں کرتے ہیں، واصف میرے لیے کوئی وقت نہ نکال سکا۔ اُس نے بتلایا کہ اُس کے ساتھی ایئرپورٹ پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

قصور جاتے ہوئے میں راستے میں خانیوال اُتر گیا۔ اُس وقت سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں شیریں کے پاس پہنچا، تو وہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مصلّے پر بیٹھی سسک رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی راتوں سے جیسے سوئی نہ ہو۔

میری دریافت پر شیریں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اُسے سنبھالنا چاہا تو وہ میرے بازوؤں میں سمٹ کر اور بھی بے بسی سے بلکنے لگی۔ بہت دیر کے بعد اس کی حالت سنبھلی تو اس نے بتلایا کہ واصف اپنے ایک اور ساتھی کے ہمراہ پاکستان سے چرس سمگل کرتے ہوئے لندن کے ہوائی اڈے پر رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

یہ خبر میرے لیے تو محض حیرت کا باعث ہوئی، لیکن شیریں کی پریشانی اس سے بھی زیادہ حیران کُن تھی۔

"دولت کی ہوس ہی آخر اُسے لے ڈوبی ہے۔" شیریں نے تڑپ کر بڑے ہی دُکھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنی ماں کی طرح اس منحوس کی بھی سب سے بڑی کمزوری دولت ہی رہی ہے۔ ورنہ مجھے بھی آج شاید یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی، اور تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اُسی طرح دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سو گئی تھی۔

شیریں کو میں اصرار کر کے اپنے ہمراہ قصور لے گیا جہاں دو تین روز ہم سب اکٹھے رہے۔ بہت سا وقت وہ مراد کے ساتھ مصروف رہتی، اُس وقت مُراد کی عمر قریب ایک برس تھی اور وہ اپنے اردگرد رہنے والوں کو بخوبی شناخت کرنے لگا تھا۔ شیریں اُسے اپنی گود میں بھر کر عجیب عجیب سی آوازیں نکالتی اور جب اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو ہمارے مختصر سے گھر میں اُس کی

میٹھی مترنم ہنسی کی پھل جھڑیاں چھوٹنے لگتیں۔ ایسے ہی کسی موقعہ پر شیریں نے بڑی فراخدلی سے میری ماں سے شکایت کی تھی "خالہ دیکھیے آپ کا پوتا ہے بڑا بدمعاش۔ ہائے وہ دیکھو کس طرح مجھے بٹر بٹر گھور رہا ہے۔ کیا عاشق مزاج ہے دیکھو تو"

معلوم نہیں ماں یہ بات سُن کر اتنی پریشان کیوں ہوگئی تھی۔

پھر ہم نے گھر کا مختصر سا اثاثہ بند کیا۔ ماں نے اسکول سے طویل رخصت لے لی تھی۔ ہم لوگ جب کراچی آئے تو خانیوال تک شیریں نے بھی ہمارے ساتھ ہی سفر کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے ماں کو حرائی صحت کا سرٹیفکیٹ بنوا دیا اور اس نے ملازمت سے پنشن لے لی۔ اُس کے بعد خدا نے مجھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی عطا کئے اور ضرورت کی کم و بیش ہر چیز۔ جن میں ریڈیو کے علاوہ ایک درمیانہ سا فرج بھی شامل تھے میں نے دفتر اور کام پر جانے کے لیے ایک سکوٹر بھی خرید لیا جس پر کبھی کبھار شام کو میں اور رقیہ بازار اور سیر کے لیے بھی جا سکتے تھے لیکن اوقات بچوں کو ہم گھر پر ماں کے پاس چھوڑ جاتے اور کئی دفعہ انھیں اپنے ہمراہ بھی لے گئے۔ ہر ماہ جب ماں کی پنشن آتی تو ہر سب ایک روز کے لیے اُس کے مہمان بن جاتے۔ ماں ہمیں سیر پر لے جاتی۔ فلم دکھاتی اور بازار میں بچوں کے علاوہ میری اور رقیہ کی بے تحکم قسم کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کر کے اتنی خوش ہوتی کہ جیسے ساری دنیا اس کے اشاروں پر چل رہی ہو۔

شیریں آئی تو بہاروں کے سارے تصور اُس کے ہمرکاب تھے۔ میں اُسے لینے کے لیے خود اسٹیشن پر گیا تھا۔ میں نے اُسے ریل گاڑی سے اُترتے دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ میں نے اُسے قریب چار سال سے دیکھا تھا۔ اس عرصہ میں جسم کچھ اور گداز ہو جانے کی وجہ سے اُس کی شخصیت زیادہ نکھر آئی تھی۔ لباس کی سادگی برقرار تھی، لیکن اُس کی اپنی سج دھج تو ویسے ہی کسی سہارے کی محتاج نہیں تھی۔ ہم دونوں قریب ہوئے تو بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ گلے مل لینے کے بعد میں نے شیریں کا مختصر سا سامان اُٹھایا اور ٹیکسی لے کر ہم دونوں گھر آ گئے۔

شیریں کی آمد سے میرے معمولات میں اگرچہ کوئی فرق نہیں آیا تھا، لیکن گھر کی رونق میں یقیناً اضافہ ہوا تھا۔ شیریں کا زیادہ وقت ماں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں گذرتا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف رہتی۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اُسے اُن ساری باتوں اور اُلجھنوں کا بخوبی علم تھا جن پر بچے بڑی آسانی سے ضد کر سکتے ہیں۔ وہ بڑی مہارت سے بچوں کے ساتھ لڑتی جھگڑتی، روٹھتی اور پھر من جاتی۔

اتوار کا سارا دن ہم نے گھومنے میں گزار دیا۔ میں نے اپنے ایک جاننے والے سے کار مانگ لی تھی۔ ہم نے کھانے پینے کا بہت سا سامان ہمراہ لیا اور ٹھٹھہ چلے گئے۔ شام کو تھکے ہارے واپس آ گئے۔ اس کے علاوہ بھی ایک دو شامیں ہم نے اِدھر اُدھر سیر میں گزاریں۔ ایک دفعہ شیریں کو فلم دکھانے بھی لے گئے۔ عام حالات میں تو ہم لوگ بچوں کو ماں کے پاس چھوڑ جایا کرتے تھے۔ لیکن شیریں کی موجودگی میں ایسا مشکل ہو گیا۔ بلکہ جواد کو تو یہ خیال ہو گیا تھا کہ وہ اگر شیریں کی گود میں نہ بیٹھ سکا تو شائد اُسے سینما ہال سے ہی نکال دیا جائے گا۔ جواد ویسے بھی اس کی شخصیت سے سب سے زیادہ مسحور ہوا تھا۔ مُراد سے عمر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اُسے گھر میں وہ حیثیت حاصل نہیں تھی جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق گردانتا تھا، لیکن شیریں چونکہ اس کی موجودگی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی تھی اس لیے وہ بھی سارا دن اُسی سے چمٹا رہتا۔

رقیہ کی ایک عرصہ سے یہ خواہش چلی آ رہی تھی کہ کسی طرح پوری رات سمندر کے کنارے گذاری جائے۔ سمندر سے اس کا لگاؤ ویسے ہی جنونی کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ دفتر کے کاموں سے جب کبھی بھی شام کو ذرا دیر فرصت ملی ہم دونوں سکوٹر پر بیٹھ کر کلفٹن چلے جاتے، اور کتنی ہی دیر تک ساحل کے ساتھ بچھی ہوئی ریت پر گھومتے رہتے۔ شیریں کے آجانے سے رقیہ کو کچھ اور حوصلہ مل گیا، اور اس نے پھر سمندر کے قریب رات گزارنے کی خواہش کا اظہار کیا، بلکہ شاید ہماری ازدواجی زندگی میں پہلی دفعہ اس نے کسی بات پر اصرار بھی کیا، ماں نے تو خیر ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کی طرفداری کی، لیکن اس دفعہ بچوں نے جو شور اٹھایا وہ الگ۔ بالآخر ہم لوگوں نے اس پروگرام کو عملی صورت دینے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے ایک جاننے والے کی وساطت سے سمندر کے کنارے بنا ہوا ایک بنگلہ ایک دن کے لیے حاصل کر لیا۔ طے یہ ہوا کہ ہفتہ کو ہم لوگ پہلے پہر وہاں پہنچ جائیں گے اور شام کا کھانا بھی وہیں تیار کر کے کھایا جائے گا، اور اس کے بعد رات جتنی دیر تک جی چاہے سمندر کے کنارے گھومیں گے اور رات اور اگلا دن وہیں گزارنے کے بعد اتوار کی شام کو کسی وقت واپس آجائیں گے۔

دو تین روز ہم لوگ اپنے اپنے طور پر اس مرحلہ کی تیاری میں مصروف رہے کہ جمعہ کی صبح کو اچانک رقیہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس سے پہلے بھی دو بچوں کی پیدائش سے قبل رقیہ کی طبیعت متواتر اس قدر خراب رہی کہ بعض اوقات وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو جاتی تھی، شام تک اس کا جی اس قدر متلاتا رہا کہ سارا پروگرام ہی قریب قریب ختم ہو گیا۔ لیکن ہفتہ کی دوپہر کو اچانک رقیہ کہنے لگی کہ "آپ پھپھو اور امی کو ہمراہ لے جائیں اور کلفٹن کی سیر کرا لائیں ——" اس نے خود ہی کہا کہ بچوں کے ہمراہ وہ گھر پر ہی رہے گی۔

شیریں نے تو اس پروگرام کو بالکل ہی ناقابلِ عمل قرار دے دیا، لیکن ماں نے صرف اس قدر اعتراض کیا کہ وہ رقیہ کو اس حالت میں چھوڑ کر گھر سے نہیں نکل سکتی تھی۔ بہت لے دے کے بعد بالآخر میں اور شیریں محض ایک شگون پورا کرنے کی غرض سے کلفٹن جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اپنے پہلے پروگرام کے مطابق میں نے اپنے ایک ملنے والے سے کار مانگ لی تھی کہ ہفتہ کی شام کو ہمیں کلفٹن پر چھوڑ آئے، اور اتوار کی شام کو اپنی سہولت کے مطابق کسی وقت ہمیں وہاں سے لے آئے لیکن موجودہ حالات میں ہم نے فیصلہ کیا کہ اسی گاڑی سے میں اور شیریں واپس آجائیں گے۔

شیریں کے ساتھ سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی لبِ پایاں ریت پر پھرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کو کوئی بات نہیں تھی، اس سے پہلے بارہا شیریں کے ساتھ مجھے تنہائی ملی تھی اور ایسے موقعوں پر ہم نے ہمیشہ عجیب عجیب موضوعات پر بلا تکان گھنٹوں متواتر باتیں کی تھیں لیکن آج صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ ہم نے پچھلے پانچ سال کی اپنی اپنی مصروفیات کی نسبت ایک دوسرے کو مختصراً بتلایا۔ پھر ہم مراد، جواد اور لینا کے متعلق باتیں کرنے لگے کہ اس موضوع پر زیادہ آسانی سے باتیں کی جا سکتی تھیں لیکن پھر معلوم نہیں کس طرح ہماری گفتگو واصف پر آ کر اٹک گئی۔

شیریں نے بڑے دکھے ہوئے لہجے میں بتلایا کہ واصف کو لندن کی کسی عدالت نے تین سال قید کی سزا دی تھی اور یہ کہ کچھ عرصہ قبل جب وہ لندن سے واپس آیا تو اس نے آتے ہی اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور اب راولپنڈی میں تمباکو کا کاروبار کر رہا تھا۔

باتیں کرتے کرتے شیریں اچانک رک گئی اور اس کے بعد معلوم نہیں اسے کیا خیال آیا کہ اس نے جوتے اتار کر ایک طرف پھینک

دیئے اور اچانک ریت پر ننگے پاؤں بھاگنے لگی۔ پھر کافی دیر تک وہ کنارے کے چھوٹے چھوٹے پانی میں گھومتی رہی۔ وہ اس انداز سے بھاگتی ہوئی واپس آ رہی تھی کہ اچانک اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ تیورا کر گر پڑی۔ میں نے خود دوڑ کر اُسے سہارا دے کر اٹھایا اور پھر اُسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے بنگلہ تک لے آیا۔ جہاں ہم نے ابتداً رات گزارنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔

معاً شیریں کے یاد دلانے پر میں اُسے بنگلہ میں تنہا چھوڑ کر اُس کے جوتے اٹھانے کے لیے باہر چلا گیا اور جب میں اس کے نازک نازک سینڈل اٹھائے ہوئے واپس کمرے میں آیا تو وہ غسلخانے سے اپنے پاؤں دھو کر اب کرسی پر بیٹھی آہستہ آہستہ تولیے سے پونچھ رہی تھی۔ میں نے اس کے چھوٹی چھوٹی ایڑیوں اور گلابی رنگت کے تلوؤں والے اتنے سفید اور خوبصورت پاؤں دیکھے تو میرے دل میں پندرہ سال قبل کا وہ لڑکا جاگ پڑا جو ایک روز اسی طرح شیریں کے جوتے مرمت کرانے کے بعد اس کے کمرے میں آیا تھا اور ایک دفعہ پھر بڑی شدت سے میرا جی چاہنے لگا کہ میں اس کے پیروں سے لپٹ جاؤں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے گلے سے سینے تک ایک عجیب سی غلش محسوس کی۔ میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر کپکپانے لگے۔ میرے ہاتھ سے شیریں کے سینڈل نیچے گر پڑے اور میں نے ایک دم اُس کے دونوں پیر تھام لیے۔

پھر ایک ایسا طوفان اُمڈا کہ میں اور شیریں اور اُس کے ساتھ ہی ہماری برسوں کی رفاقت کا محل تنکے کی طرح بہہ گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد جب میں نے شیریں کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی طمانیت ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ کچھ دیر کے بعد ہم دونوں واپس آ گئے۔

اس کے بعد کئی روز تک شیریں ہمارے گھر رہی۔ لیکن میں کوشش کے باوجود بھی اس کے ساتھ تنہائی کا ایک لمحہ بھی حاصل نہ کر سکا۔ میں اُس سے معافی مانگنا چاہتا تھا، لیکن مجھے کبھی حوصلہ نہ ہو سکا کہ دوبارہ اُسے کسی روز کسی بھی بہانے سے باہر لے جاؤں اور اس سے معذرت کر سکوں۔ لیکن میں اگر اُس سے کچھ کہتا بھی تو آخر کیا؟

خود رَو

عذرا اصغر

وہ جا چکی ہے ـــــ جانے کہاں ـــــ شاید اپنے ہاسٹل کے خالی کمرے میں یا کہیں اور ـــــ میں دیر سے میز کے سامنے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا بے ربط سوچوں میں اُلجھا ہُوا ہوں۔ میں نے میز سے پیپر ویٹ اٹھایا ہے اور یونہی میز کے سپاٹ تختے پر گھمانا شروع کر دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوشرنگ پھول اس پیپر ویٹ میں بڑی نفاست سے مقید کیے گئے ہیں۔ جانے کیسے۔ میں نہیں جانتا اور میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ ہاں ـــــ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہاں بیٹھی تھی۔ میز کے اُس طرف۔ بالکل میرے سامنے اور اپنا داخلہ فارم پُر کر رہی تھی۔ زردی مائل، اُجلی رنگت اور قدرے چپٹی ناک والی فلورا ـــــ فارم بھر کر اُس نے مجھے پکڑایا اور میرے چہرے کو بغور دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے دیکھنے کا مطلق اثر نہیں لیا اور اس کا پُر کردہ فارم دیکھتا رہا۔ حالانکہ مجھے بخوبی علم تھا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں لحظہ بہ لحظہ میرے چہرے کا جائزہ لے رہی ہیں مگر میں اس کا عادی ہوں اور جانتا ہوں کہ طالب علم اس عادت کا شکار ہوتے ہیں وہ اپنی قابلیت، اپنی صلاحیت استاد کے چہرے سے بھانپ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے ایک شیر خوار بچے کی ماں کو پتہ ہوتا ہے کہ کب بچے کو کسی چیز کی حاجت ہوئی ہے یا وہ رو دیا ہے تو کیوں رو دیا ہے۔ ہاں، بالکل اسی طرح طالب علم اپنے استاد کے چہرے کے اَدلتے بدلتے تاثرات سے اپنی ہونہاری یا نااہلی کے اثرات ڈھونڈ لیتے ہیں ـــــ مگر اس فارم کے سلسلے میں مسئلہ اہل اور نا اہل کا نہیں تھا۔ پھر نہ جانے وہ میرے چہرے پر کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کو کس چیز کی تلاش تھی۔ میں نے فارم پر سرسری نظر ڈال کر اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے فادر نیم نہیں لکھا۔ شاید بھول گئیں ....."

میرے چہرے پر گڑی اس کی نگاہیں یکایک جھک گئیں اور لرزتے ہاتھ سے اُس نے فارم پکڑ لیا۔

"لکھ دیجئے اپنے والد کا نام" میں نے دھیمے۔ شائستہ لہجے میں کہا۔

ہم مردوں کی بھی خواتین سے گفتگو کرتے ہوئے بہت نرم، بیحد با اخلاق اور حد درجہ شگفتہ مزاج ہو جاتے ہیں اور میرا تو پیشہ بھی ایسا ہے کہ جس میں تحمل اور بُردباری کا ہر لحظہ خیال رکھنا پڑتا ہے اور اب تو اتنے برس گذر چکے ہیں کہ یہ سب عادت بن گیا ہے۔ پھر میں نے جس آغوش میں پرورش پائی ہے وہ بھی ایسی بھٹی تھی جس میں سونا کُندن بن کر نکلتا ہے۔ آہ! مگر وہ آغوش جاتے جاتے مجھے ایک ایسا زخم دے گئی جو تا دمِ مرگ بھر نہ سکے گا۔

اَبّو نے مجھے اپنے بیحد قریب بلا کر کہا تھا۔

"بیٹا اب جبکہ میں دنیا سے جا رہا ہوں تو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تم میری اولاد نہیں ہو۔ بیشک تمہیں میں نے پرورش کیا مگر تمہیں

وجود میں لانے کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابو۔؟" سراسیمہ ہو کر میں نے ان کا ٹھنڈا، کپکپاتا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں بیٹے۔ غور سے میری بات سنو! شاید میں اب بھی یہ بات نہ بتاتا مگر بیٹے دنیا بڑی سنگ دل ہے۔ ہو سکتا ہے میرے بعد کسی اور طرح تم پر یہ راز کھلے اور تم مجھی کو مجرم سمجھنے لگو اس لئے ضروری ہے کہ میں وہ سب تمہیں بتا دوں جو آج تک تمہارے لئے راز رہا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے تعلیم و تدریس کی ابتدا کی تھی میں ایک بڑے انگلش سکول کا ہیڈ تھا، ایک لڑکی سے محبت بھی کرتا تھا اور بہت جلد شادی کر لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب ایک خوش شکل، نوجوان لڑکی، ایک تین چار سال کے بچے کی انگلی پکڑے میرے دفتر میں داخل ہوئی۔

"فرمایئے؟" میں نے اُسے کرسی پیش کرتے ہوئے تعظیم سے کہا تھا۔

"جناب یہ میرا بچہ ہے۔" اس نے شستہ لہجے میں کہا۔

"جی! دیکھ رہا ہوں۔۔ بہت پیارا بچہ ہے۔ فرمایئے!"

"اس کو داخل کر لیجئے۔"

"ضرور ——— یہ بھر دیجئے۔" فارم میں نے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب اس کو ہاسٹل میں جگہ مل جائے گی؟" اس نے پوچھا۔

"معاف کیجیے ہم اتنے چھوٹے بچے کو ہاسٹل میں نہیں رکھتے۔"

"پھر تو بڑی مشکل ہو گی۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا آپ یہاں نہیں رہتیں؟"

"نہیں۔" اس نے سیدھا میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"چلئے آپ فارم تو بھر دیجیے۔ رہائش کا پھر سوچیں گے۔" میں نے جانے کس موڈ میں کہہ دیا۔

"اُس نے فارم بھرا تو باپ کی جگہ اپنا نام لکھا تھا۔

"یہ کیا ——؟" میں نے فارم پر انگلی رکھ کر اس سے پوچھا۔

"جناب میں ہی اس کا باپ ہوں اور میں ہی ماں۔۔۔۔۔ اس کے انداز میں بیحد جرأت تھی جس سے میں متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

"مطلب ——— کیا یہ۔۔۔۔۔"

"نہیں جناب یہ قطعی میری جائز اولاد ہے۔" وہ میرا مطلب سمجھ کر بولی۔

"اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ مگر اس آدمی کا، جس نے میرے بچے پر، خود مجھ پر زیادتی کی ہے، ظلم کیا ہے، میں اپنے بچے پر اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی، یوں بھی قیامت کے دن انسان باپ کے نہیں ماں کے نام سے پکارے جائیں گے جب اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور ان کا بھرم رکھتا ہے تو ہم اپنے بچوں کو اپنے نام سے موسوم کیوں نہیں کر سکتے جناب۔"

آپ کا کہنا بجا سہی محترمہ مگر یہ بھی اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کے عین مطابق ہے کہ ہم باپ کے نام سے دنیا میں پہچانے جائیں اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں بے راہ روی عام ہو جائے۔"

"مگر میں اس شخص کا نام اپنے بچے کے نام کے ساتھ ہرگز نہیں آنے دوں گی جس نے مجھے اور میرے بچے کو ٹھکرایا اور رات کی تاریکی میں گھر سے بے گھر کیا۔"

"پھر ——!؟" میں سوچ میں پڑ گیا۔ "اصول تعلیم اس کی اجازت نہیں دیتا۔"

"تو پھر آپ اپنا نام لکھ لیجئے۔" بے ساختگی سے اس نے کہا اور جانے کس جذبے کے تحت میں نے اپنے ہی قلم سے اپنا نام تمہارے باپ کے نام کی جگہ لکھ دیا —— علی احمد سید۔"

"پھر تو ننھا شجاعت ہمارے ہی پاس رہے گا۔" میں اپنی کرسی سے اٹھا اور تمہیں گود میں اٹھا کر اپنے پاس لا کر بٹھا لیا۔

"جناب میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھول پاؤں گی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں اور میں آسانی سے مر سکوں گی۔" تمہاری ماں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے جنہیں میں نے اپنے تسلی آمیز لفظوں سے خشک کرایا۔ اس کے بعد تمہاری ماں چند بار تمہیں ملنے آئی پھر وہ کسی باہر کے ملک چلی گئی۔ وہ ایک عظیم، باہمت عورت ہے اور تم سمجھتے ہو وہ مر چکی ہیں مگر نہیں بیٹا وہ آج بھی زندہ ہیں۔ میری ڈائری میں ان کا پتہ درج ہے اور میرے اس بیان کی تصدیق تمہیں اس خاتون سے بھی ہو جائے گی میں جس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر تمہاری پرورش کی ذمہ داری کے سبب نہ کی۔ میں چاہتا تھا تم خوب لکھو پڑھو اور بڑے آدمی بنو۔ شکر ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اب یقیناً میں اطمینان سے مر سکوں گا۔"

ابو اس ایکسیڈنٹ سے جانبر نہ ہو سکے اور مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر میں نے ان کے پیشے کو اپنا لیا کہ ان سے بے پناہ محبت نے مجھے یہیں سکون بخشا مگر میرے پاس پرائمری کلاس کے بچے نہیں، غیر ملکی طلبا و طالبات اردو پڑھنے آتے ہیں۔ میں ایک بڑے کالج میں پروفیسر ہوں۔

"معاف کیجئے گا سر! فادر نیم کی جگہ کچھ اور نہیں لکھا جا سکتا کیا۔؟"

"مثلاً کیا اور کیوں؟" میں جانے کن خیالوں میں بھٹک گیا تھا۔ بے دھیانی میں میں نے کہہ دیا اور اس کے زرد رو چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں بدستور فارم پر جھکی تھیں اور قلم ہاتھ میں پکڑے وہ خاموش بیٹھی تھی۔

"سر میں ویت نام کی رہنے والی ہوں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"جانتا ہوں۔"

"ہمارے ملک میں عرصے سے جنگ ہو رہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"ہم غیر ملکیوں کی بربریت کا شکار ہیں۔"

"مجھے یہ بھی معلوم ہے۔"

"اور سر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ویت نام میرے جیسے بچوں سے بھرا پڑا ہے ۔ ہم وہ بدنصیب بچے ہیں جنہیں اپنے باپ کا علم نہیں ہوتا۔ ہم دشمن کی بربریت کا نشانہ بنے ہیں سر۔" اس کی چھوٹی چھوٹی، چمکیلی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے یکے بعد دیگرے گر کر فارم میں جذب ہو گئے جس پر وہ جھکی بیٹھی تھی ۔ میں نے آہستہ سے قلم اس کے ہاتھ سے پکڑا اور فارم اپنے آگے کھسکا کر اس پر لکھ دیا ۔ فلورا بنت شجاعت علی احمد۔"

"سر ۔ یہ؟" حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں ۔

"ہاں بیٹی ۔ یہ میرا نام ہے ۔ ہماری بڑی بڑی علمی کتابوں میں لکھا ہے کہ استاد کا درجہ باپ جیسا ہوتا ہے ۔ اس رشتے سے تم میری بیٹی ہی تو ہو ۔"

اُس کے اُبھرے ہوئے سفید پیلے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ گیا میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے پھر کہا ۔

"یہ تمہارا اکیلی ہی کا مسئلہ نہیں ہے فلورا میری بچی ۔ یہ ان مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کا ایک بڑا المیہ ہے جو ترقی کے نام پر اپنے سے چھوٹے ملکوں کو زندہ رہنے کے گُر سکھاتے ہیں اور پھر ان کی زندگی سلب کر لیتے ہیں ۔۔۔ ان کو اناج مہیا کرتے ہیں اور منہ تک گیا لقمہ اُچک لیتے ہیں ۔۔۔ زندگی کی حفاظت کے لیے اسلحہ دیتے ہیں اور اسی اسلحے سے ان کی زندگی چھین لیتے ہیں ۔ انھیں آزادی کا مفہوم تو بتاتے ہیں مگر زندہ رہنے کا حق اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں ۔ متحدہ ہندوستان میں جب ایک بڑی قوم فتح کے ڈنکے بجاتی داخل ہوئی تو اپنے پیچھے ایک کھیپ ٹامی بچوں کی چھوڑتی چلی گئی ۔ یہ المیہ صرف تمہارا نہیں فلورا بی بی! یہ المیہ تو ہر محکوم قوم کا ہے اور ہر حاکم قوم محکوم قوم کو اپنی بربریت، اپنے جبر و تشدد کا نشانہ بناتی آئی ہے اور سنو فلورا بی بی! ہر قوم میں عورت محکوم ہے اور جب تک عورت محکوم رہے گی ۔ مرد کی بربریت کا نشانہ بنتی رہے گی ۔ ہمت کرو فلورا بی بی ہمت کرو ۔ تم تو بہادر و نامی ماں کی بیٹی ہو ۔ جرأت اور بے خوفی تمھیں ماں کے دودھ سے ودیعت ہوئی ہے ۔۔۔ ہمت کرو اور غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالو جو تہذیب کے نام پر تمھیں پہنائی گئی ہیں ۔"

وہ چلی گئی ہے اور میں بے ربط سے خیالات میں الجھا، پلیر ویٹ سے بیٹھا کھیل رہا ہوں ۔ پلیر ویٹ میں چھوٹے چھوٹے، رنگ برنگے، خوبصورت پھول بڑی نفاست اور چابکدستی سے مقید کیے گئے ہیں اور میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھا بے ربط سوچوں میں الجھا ہوں ۔

بلاشبہ دنیا ایک ایسی گردش کرتی کرسی ہے جو اپنا چکر برسوں میں پورا کرتی ہے مگر مسلسل گردش کرتی رہتی ہے ۔ اس پر بیٹھنے والے بدل جاتے ہیں مگر کرسی وہی رہتی ہے ۔"

کاسنی

قیوم راہی

پھوار کا سماں تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔

لگتا ہے نوری اب بھی میرے سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ ابھی ابھی جب وہ یہاں سے جانے کے لیے کھڑی ہوئی تھی تب بھی مسکرا رہی تھی۔ ہائے یہ کیسی مسکراہٹ تھی، میرا دل گھائل ہو کر رہ گیا تھا ـــــ نہ جانے کیوں میں نے جلتا ہوا سگرٹ ایش ٹرے پر رکھ دیا تھا اور کئی پل بنا پلک جھپکائے سگرٹ کو ہی تکتا رہا تھا جو دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا CONSUME ہو رہا تھا ـــــ پھر میں نے نوری کو دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا تھا نوری بھی زندگی کی "ایش ٹرے" پر پڑی ہوئی آہستہ آہستہ سُلگ رہی تھی، CONSUME ہو رہی تھی۔

میرا کچھ عجب حال رہا ہے۔

میں کافی طویل عرصے تک اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کرتا رہا ہوں۔ بیوی، بیٹے اور بعد میں بہو کی رفاقتوں اور آسائشوں کے باوجود جیسے کوئی کمی رہ گئی ہو۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ اس کو واضح طور پہ بیان بھی نہیں کر سکتا۔ شاید کوئی الفاظ ہی نہیں ہیں اس کی وضاحت کے لیے۔ اب سوچتے نا، بیوی کے ساتھ میں نے ایک طویل اور بھرپور زندگی گزاری ہے۔ معاشی اعتبار سے اور سماجی رُتبے میں میں نے خاصی پیش رفت کی ہے۔ کرائے کے مکان سے اُٹھ کر اپنی ذاتی کوٹھی میں آگیا ہوں۔ بیٹا بنک میں افسر بنا تو ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر "غلامی" سے بھی نجات حاصل کر لی ہے (ملازمت میں میرا کبھی دل جو نہیں لگا تھا) اب میں تھا اور میرے دل پسند مشاغل۔ تو ایسے میں یہ احساس ناآسودگی، یہ خالی پن کی کرید، یہ نامعلوم سا اضطراب، یہ انجانی سی بے کیفی کے کیا معنی؟ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

لیکن اب کچھ عرصے سے میرے اندر کی وادی پر سکون سا مسلط تھا اور میں اس سکون، یکسانیت اور جمود سے بُری طرح اوب گیا تھا۔ کبھی کبھی تو پسپا ہو کر رہ جاتا تھا۔ لگتا تھا جیسے زندگی کی تصویر کے سارے رنگ پھیکے پڑتے پڑتے اپنی آب و تاب کھوتے جا رہے ہوں۔ میرے سارے کس بل نکل چکے ہوں۔

لیکن آج بہت دنوں کے بعد نوری نے آکر .....

کچھ دیر قبل میں گھنی بیلوں، شاداب پودوں اور رنگ برنگے تر و تازہ پھولوں سے گھرے ہوئے اپنے سرسبز لان میں بیٹھا نوری کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ شام کی زرد دھوپ میری کوٹھی کے درختوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا دھیرے دھیرے

سرسرا رہی تھی، سرگوشیاں سی کرتی ہوئی۔ لیکن نوری کے جانے کے بعد نہ جانے کہاں سے ایک دم بادلوں نے دھاوا بول دیا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ تب میں دونوں کرسیوں اور چھوٹی میز کو اٹھا کر برآمدے میں لے آیا۔ اور اب بیٹھا سگرٹ پر سگرٹ پھونک رہا ہوں ——— کچھ بتا نہیں سکتا، وضاحت نہیں کر سکتا، کیا واردات قلبی ہیں، کیا کیفیت ذہنی ہے۔ نہ جانے کیا ہو رہا ہے میرے اندر۔ جیسے مدتوں سے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ایک دم تلاطم برپا ہو جائے۔ ایسا شور ہے کہ باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔

میری بیوی اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی ہوئی ہے۔ میں اس کے آنے سے پہلے ایش ٹرے کو خالی کر دوں گا کیونکہ میری CHANE SMOKIN G اس پر بجد ناگوار گزرتی ہے۔ اور میں اس کے جذبات کا خاص خیال رکھتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اُسے چاہا ہے۔ اُس کا احترام کیا ہے۔ اُس نے میری غریبی میں بھی میرا ساتھ نبھایا ہے۔ وہ مجھے بیحد عزیز ہے، وہ جو پیکرِ وفا ہے۔ صحیح معنوں میں رفیقۂ حیات کہلانے کی مستحق۔ نوری بھی اس کے حسنِ سلوک سے بیحد متاثر تھی۔ ادب و لحاظ کو اس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا تھا۔

اُس دوپہر کو بھی ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔

اچانک میرے مکان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کواڑ کھولے تو سامنے ایک چھ سات برس کی سانولی سی معمولی ناک نقشے کی لڑکی لجائی لجائی سی کھڑی تھی۔ پہلے وہ کچھ جھجکی، پھر جلدی جلدی پلک جھپکا کر بولی: "خالو! آپ کے ہاں بتی آ رہی ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں ——— آ رہی ہے۔"

معصومیت سے بولی: "ہمارے گھر میں تو نہیں آ رہی!"

"اچھا ——— کب سے؟"

"ابھی تھوڑی دیر سے۔"

وہ جانے لگی تو ساتھ والے کمرے سے میری ماں بولی: "اندر آ جاؤ بیٹی!"

اُسے کچھ تامل ہوا، میں نے سہارا دیا "آ جاؤ نا، اماں بلا رہی ہیں تمھیں۔"

اس بار وہ کچھ کھل سی اُٹھی۔ صحن میں داخل ہوئی۔ تیزی سے اماں کے کمرے میں چلی گئی

یہ میری پہلی ملاقات تھی نوری سے۔

وہ ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتی تھی۔ اس کا باپ انشورنس کمپنی میں ملازم تھا۔ خاصا ملنسار آدمی تھا۔ نوری بہت بھولی تھی ——— نادان، ——— بس جو مُنہ میں آیا کہہ دیا بلا سوچے سمجھے ——— اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خالو تو میں جب ہوتا جب میری شادی ہو گئی ہوتی۔

وہ اماں سے خوب گھل مل گئی۔ خاصا وقت ہمارے گھر میں گزارنے لگی۔ طرح طرح کی باتوں سے اماں کا دل

بہلاتی، ان کے کام کاج میں اپنی بساط بھر ہاتھ بٹاتی۔ لیکن مجھ سے ذرا لیے دیے ہی رہتی ——— کترائی کترائی سی ——— شرمائی شرمائی سی۔

نہ جانے کیوں اپنے سانولے رنگ، معمولی سی شکل وصورت، دُبلے پتلے جسم کے باوجود وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کے اپنے ہاں آنے سے مجھے ایک خاص قسم کی انجانی سی خوشی کا احساس ہوتا۔ جی چاہتا اسے اپنے پاس بٹھا کر اس سے باتیں کروں ——— میں جب بھی اسے دیکھتا اُس کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ جاتی۔ وُہ مجھ سے ہمیشہ نیچی نگاہیں کیے ہی بات کرتی۔

میری شادی ہُوئی۔ چند ماہ بعد اماں کا انتقال ہوگیا۔ لیکن نوری کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ میری بیوی کو خالہ کہنے لگی۔ اُس سے بھی جلد مانوس اور بے تکلف ہوگئی۔

بہت عرصے بعد ایک دن میں نے دیکھا نُوری جوان ہوگئی تھی۔ اب وُہ مجھ سے ہنسی مذاق بھی کرنے لگی تھی۔ ایک دن میں نے سُنا، نوری میری بیوی سے کہہ رہی تھی: "خالہ! مجھے آپ لوگ، یہ گھر بہت اچھا لگتا ہے، آپ کا ذیشان اگر جوان ہوتا تو میں اس سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں چلی آتی۔"

بات بظاہر ہنسی کی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا نوری کا چہرہ جذبات کے تموّج سے دمک رہا تھا۔

وہ ان دنوں غالباً ایف ایس سی کی طالبہ تھی۔

ایک دن بولی:

"خالو! آپ تو بہت پڑھتے رہتے ہیں ہر وقت، مجھے بھی کچھ پڑھا دیا کریں نا۔"

"کیا پڑھنا چاہتی ہو مجھ سے؟"

"جو میرا دل چاہے گا پڑھ لوں گی، پہلے آپ ہاں تو کریں۔"

"اچھا بھئی کر دی "ہاں" ——— اب بولو۔"

"یہ ہوئی نا بات۔"

"چلو، بات بھی ہوگئی۔"

"تو پھر ———؟"

"تو پھر یہ کہ مضمون کون سا پڑھو گی مجھ سے؟"

"انگریزی۔"

"خیریت ہوگئی۔"

"کیسے؟"

"ایسے کہ اگر تم فزکس کہہ دیتیں تو میں کیا کر لیتا تمھارا!"

وہ روز مجھ سے انگریزی کی کتاب پڑھنے لگی۔

ایک دن وہ کاسنی رنگ کی شلوار قمیص پہن کر آئی۔ سر پر دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا۔ اس لباس میں وہ مجھے اور زیادہ اچھی لگی، شاید اس لیے کہ یہ رنگ ہمیشہ سے ہی میرا پسندیدہ رنگ ہے۔

میری بیوی بولی: ارے نوری! تم جو اس سوٹ میں بہت ہی اچھی لگ رہی ہو۔"

"سچ؟" نوری کو شاید یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں ـــ اور تمھیں معلوم ہے یہ رنگ تمھارے خالو کو بھی پسند ہے۔"

اچھا!"

ہاں۔"

اور میری بیوی میرے چہرے کا رنگ دیکھنے لگی۔

سوچتے ہوئے بولی: نوری! تم اتنی سویٹ لگ رہی ہو اس لباس میں کہ جی چاہتا ہے تمھارا نام بدل کر کاسنی رکھ دوں۔"

"کاسنی؟"

"ہاں ـــ آج سے میں تمھیں کاسنی ہی کہا کروں گی۔"

نوری کے سوچنے کا انداز ایسا تھا جیسے بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی ہو۔

میں کچھ دنوں سے نوری کے رویے میں ایک خاص تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ میرے قریب آنے کے بہانے تلاش کرتی رہتی تھی۔ یہ پڑھنے کا معاملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

ایک دن وہ وقت مقررہ پر نہیں آئی۔ بتا نہیں سکتا کیا حال تھا میرا! میرے اندر کے ایک آدمی نے سوانگ رچائے ہوئے اس شخص کو میرے سامنے لا کھڑا کیا جسے نوری خالو کہتی تھی۔ اور مجھے پہلی بار نوری سے غیر معمولی تعلق اور وابستگی کا ادراک ہوا۔ یہ احساس دھیمی دھیمی آنچ بن کر میرے جسم میں پھیلتا چلا گیا۔ دشتِ انتظار میں گھوم گھوم کر میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ سُونا سُنسان سا گھر ـــ کُہر آسا در و بام ـــ پُراسرار سناٹا ـــ گراں بار خواب ـــ

دفعتاً میری بیوی نے چائے کی پیالی میرے آگے بڑھائی "بہت کھوئے ہوئے ہو، کیا کہانی بہت ہی دردناک ہے۔"

میں جاگا، ہڑبڑا کر بولا: "ہاں!" گویا میں واقعی رسالے کے مطالعے میں غرق تھا۔ میں نے رسالہ میز پر رکھ دیا۔

میری بیوی میرا بنور جاٹزہ لے رہی تھی۔ میں بظاہر مزے لے لے کر چائے کے گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔ جیسے مجھے چائے واقعی مزیدار لگ رہی ہو۔

بیوی بولی: "ایسی کہانیاں کیوں پڑھتے ہیں آپ کہ بس اسی میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں۔"

"پڑھ کون رہا تھا بھاگوان! ـــ میں تو خود اس وقت ایک کہانی کے ریگ زار سے گزر رہا ہوں۔"

"اچھی لگتی ہے۔" میں نے بیوی کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔
وہ چُپ ہوگئی۔ باورچی خانے کی طرف جاتے ہُوئے بولی: "کاسنی تو اپنے ماموں کے گھر گئی ہے آج نہیں آئے گی۔"
ایک دم میرا دل دھک سے ہوکر رہ گیا۔ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے چور کی مانند۔ میری پیشانی پسینے سے بھیگ گئی تھی۔
یہ نوری نے مجھے کس بندھن میں جکڑ رکھا ہے۔ ایک عجیب احساسِ بے بسی تھا۔
ایک دن مجھے نہ جانے کیا ہوگیا۔ پڑھانے کے دوران میں نے نوری کا ہاتھ پکڑ لیا "یہ ..... جو تم نے ناخن اس قدر بڑھا رکھے ہیں بُرے نہیں لگتے تمھیں ——— بوجھ نہیں معلوم ہوتا تمھیں ان کا؟"
نوری نے بوکھلاہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور نگاہیں نیچی کرلیں، جواب نہیں دیا۔
اور دبی دبی، سہمی سہمی، خفتہ سی ایک خواہش نے مجھے بے کل کر ڈالا۔ پاگل کر ڈالا۔
پھر برسوں بعد وہ مسکرائی، آہستہ سے بولی: "آپ کو بُرے لگتے ہیں۔"
اور میں نے اپنے جسم کو تپتا ہوا محسوس کیا۔
اور میں نے برسوں بعد جواب دیا "ہاں ——— بالکل اچھے نہیں لگتے۔"
اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔
دُوسری شام کو وہ نہیں آئی۔ میرے حواس پر ایک خوف سا طاری ہوگیا اُسے شاید میری یہ حرکت ناگوار گزری تھی۔
مگر اور رُتبے کا بھی میں نے خیال نہیں کیا تھا۔ میں اندیشوں کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔
تیسرے دن میں جوالا مکھی پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ شام کو بیوی اس کے گھر گئی۔ میری حالت قابلِ رحم تھی۔
میری سوچوں کی کشتی تردّد کے بھنور میں بُری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ کیا مُنہ دکھاؤں گا اب بیوی کو۔ سرزنش کے پتھر مجھ پر برس رہے تھے۔ اسی دوران بیوی نے آکر بتایا کہ نوری تیز بخار میں مبتلا ہے ——— اطمینان تو ہُوا لیکن وہ جو ایک شک پیدا ہوگیا تھا دل میں، بدستور مجھے کُریدتا رہا۔
نوری کئی دن بعد آئی۔ کمزور سی لگ رہی تھی۔ رنگ بھی کچھ اُترا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے بڑھے ہوئے ناخن کٹے ہوئے تھے۔
چند دن بعد میرا لاہور تبادلہ ہوگیا۔ میں اس شہر اور نوری سے کٹ گیا۔
شروع شروع میں تو نوری میرے تصوّر پر بُری طرح چھائی رہی ——— خیالوں اور خوابوں پر حکمرانی کرتی رہی۔
لیکن وقت کی برشگال نے یادوں کی چنگاریوں کو آخر سرد کر ہی ڈالا۔ میں مصروفیات میں گھِرتا چلا گیا۔ اور وہ میرے لیے ایک بھُولا بسرا خواب بن گئی۔
ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد میں لاہور کا ہی ہوکر رہ گیا۔ یہیں رچ بس گیا۔
کتنے ہی یُگ بیت گئے ——— کتنے ہی زمانے گزر گئے۔

چند گھنٹے قبل بیوی، بیٹے اور بہو کے چلے جانے کے بعد دفعتاً خالی پن کے احساس نے مجھے ہلکان کر ڈالا۔ اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کافی دیر تک ٹیپ ریکارڈر پر نغمے سنتا رہا۔ پھر ایک رسالہ اٹھا کر لان میں جا بیٹھا۔ پڑھتے پڑھتے ایک ویرانی سی میرے دل میں اُترتی چلی گئی۔ بلا کی دلدوز کہانی تھی۔

اچانک کال بیل بجی۔ خاموشی اور سوچوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں رسالہ میز پر رکھ کر تیزی سے گیٹ کی طرف لپکا۔ دروازہ کھولا، دیکھا تو جنگل میں آگ لگ گئی۔ سامنے نوری کھڑی تھی کاسنی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس ——— سر پر دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا۔

"ارے تم!" میں نے خوش آمدید کہا

اس نے مسکرانے کی کوشش کی، وہی مُسکراہٹ تھی جس کے پیچھے میں نے کئی بار اسے روتا ہوا دیکھا تھا۔ وُہ گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔ میرے دوش بدوش چلتے ہوئے بولی:

"آپ نے کبھی بھولے سے بھی خبر نہ لی کہ نوری جیتی ہے یا مر گئی۔"

میں خاموش تھا، شاید اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب ہی نہ تھا۔

ہم دونوں خواب میں چل کر لان میں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے پُوچھا: "تم یہاں کیسے ——— میرا پتا کیسے معلوم ہُوا تمھیں؟"

"میرا گھر جو ہے اسلام پورہ میں۔"

"تمھارا گھر؟"

"ہاں ——— میرا گھر ——— دو سال ہو گئے میری شادی کو۔" اُس نے ایک نگاہِ تشنہ سے مجھے دیکھا

"اچھا، تو یہ بات ہے!" افسوس کا ایک دشنہ سا میرے دل میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہوا "لیکن تم یہاں پہنچیں کیسے؟"

"پرسوں ایک سہیلی کے گھر یہاں آئی تھی، راستے میں گیٹ پر آپ کا نام پڑھا، یقین نہیں آیا، قریب آکر جھانکا تو آپ کو اور خالہ کو لان میں بیٹھا ہوا دیکھا۔"

"اندر کیوں نہیں آئیں؟"

وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگی جیسے میں نے کوئی مشکل سوال کر ڈالا ہو۔

بولی: "بس ———" اس نے جلدی جلدی پلک جھپکائے "کچھ ہمّت نہیں ہوئی اس وقت، دیر بھی ہوگئی تھی۔"

وہ پھر انگلیاں چٹخانے لگی۔ میں نے دیکھا اس کے ناخن ذرا بھی تو بڑھے ہُوئے نہیں تھے۔ اس نے ان پر نیل پالش بھی نہیں لگائی تھی۔ وہی دلبرانہ من موہنی سادگی تھی۔ لیکن چہرے پر ایک مغموم سی ملائیت ——— اور بالوں میں کہیں کہیں سفیدی ——— یہ اتنا لمبا سفر تم نے اتنی جلدی کیسے طے کر لیا نوری!

سُورج اب سامنے والی کوٹھی کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔
میں نے پُوچھا: "تم خوش تو ہو نوری؟"
"ہاں!" اس نے عجیب بے چارگی کے ساتھ مجھے دیکھا "اور آپ؟"
"میں ——— میں بھی ——— خوش ہُوں۔" مجھے لگا جیسے میں کسی ڈرامے کا مکالمہ ادا کر رہا ہوں۔
"کوئی ....." میں کہتے کہتے رُک گیا
اس نے مجھے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا
"میں پُوچھ رہا تھا کوئی بچّہ ہے تمھارا؟"
"نہیں۔"
ایک دم اس نے اِدھر اُدھر متلاشی انداز میں دیکھا۔ بولی: کمال ہے ——— حد ہوگئی خالہ، اور ذیشان کے بارے میں تو پُوچھنا بھُول ہی گئی ——— کہاں ہیں وہ لوگ؟ نظر نہیں آئے اب تک۔"
"تمھاری خالہ، ذیشان اور اس کی دُلہن کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہیں، وہاں سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے گھر جائیں گی۔"
"تو ..... ذیشان کی شادی کر دی آپ نے؟" وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی
"ہاں ——— ظاہر ہے اس فرض سے سبکدوش ہونا ہی تھا آخر۔"
اور میں نے دیکھا، بھولی بھالی کمسن نوری اپنی خالہ سے کہہ رہی تھی "آپ لوگ، یہ گھر مجھے بہت اچھا لگتا ہے، اگر ذیشان جوان ہوتا تو میں اس سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آجاتی۔"
"کیسی ہے اس کی دُلہن؟" اس نے بڑے اشتیاق کے ساتھ پوچھا
"آئے گی تو خود ہی دیکھ لینا۔"
اس کی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ ایک اضطراری کیفیت، ایک بے کلی اس کی گفتگو اس کے بیٹھنے کے انداز میں نمایاں تھی۔
پھر وہ رسالہ اٹھا کر بولی:
"یہ شوق اب بھی جاری ہے آپ کا؟"
"ہاں"
اس نے رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ میں جانتا تھا وہ کچھ نہیں دیکھ رہی، کچھ نہیں پڑھ رہی، محض وقت گزار رہی ہے۔
وہ رسالہ میز پر رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ "آپ بیٹھے رہیے میں چائے بنا کر لاتی ہُوں۔"

وہ میرا جواب سُنے بغیر برآمدے کی طرف چلی گئی جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔
میں رسالہ اٹھا کر غزلوں کا مطالعہ کرنے لگا۔
نوری چائے کی ٹرے لیے میرے سامنے کھڑی تھی اپنائیت اور وابستگی کا پیکر بنی ہوئی۔ چائے پینے کے دوران وہ بولی: "میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کیسی لگی آپ کو؟"
"بہت اچھی ——— مزہ آگیا۔"
(وہ اکثر مجھے شام کی چائے خود بنا کر پلاتی رہی تھی)
"سوچ رہی تھی اتنے دنوں کے بعد شاید....."
"شاید کیا؟"
"شاید کسی خاص ذائقے کے آپ عادی ہو گئے ہوں گے۔" اس نے پیالی خالی کر کے میز پر رکھ دی۔
ٹرے میں پیالیاں رکھ کر وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ واپس آئی تو کہنے لگی: "میں نے پیالیاں دھو کر اُسی جگہ رکھ دی ہیں جہاں سے اُٹھائی تھیں۔"
بیٹھنے کے بعد وہ پھر بار بار ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگی۔ نہ جانے کیا تذبذب تھا ——— کیا ہچکچاہٹ تھی ——— پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے ——— میں نے تو بس اتنا اندازہ لگایا تھا کہ وہ کسی خاص جذبے کے زیرِ اثر ایک حالت بے قراری سے گزر رہی تھی۔
ایکا ایکی مجھ پر انکشاف ہُوا کہ میں بھی اس سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہا ہُوں۔ زبان پر میرا اختیار نہیں رہا ہے۔ بے بسی کا عجب عالم تھا۔
ہم دونوں ایک ہی کش مکش سے دوچار تھے۔
میں نے نوری کے گھر کا پتا نوٹ کر لیا تھا۔ نوری نے بھی دوبارہ آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن واپسی پر جب میں اُسے گیٹ تک چھوڑنے گیا تو اُس نے کچھ ایسی حسرت سے مجھے اور میرے گھر کے در و دیوار کو دیکھا تھا جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔
نوری کے جانے کے بعد میں نے خود کو ایک ویرانے میں بیٹھا ہُوا پایا۔ میں تھا اور ایک خلش، سناٹا اور ایک دلسوز آشفتگی ——— یہ کیسا سنجوگ تھا۔
ایک انوکھی سی حدّت میں پگھلتے ہُوئے میٹھی میٹھی کسک کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ ہم دونوں جو کچھ ایک دوسرے سے کہنا چاہتے تھے کہہ چکے ہیں۔ ہمارے جذبات کی ترسیل ہو چکی ہے ——— کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف بند لبوں سے ہی کہی جا سکتی ہیں۔
پھوار بدستور پڑ رہی ہے۔

میں نے اب ڈبیا کا آخری سگرٹ سُلگا لیا ہے۔

تو کیا یہ غلط تھا کہ نُوری میرے لیے ایک بھولا بسرا خواب بن چکی تھی اور میں نے اس کو یکسر بُھلا دیا تھا اور اُس نے بھی مجھے فراموش کر ڈالا تھا۔ اور اس کا میری زندگی میں اور میرا اس کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں رہا تھا —— یہ کیسا تعلق ہے، کیسی وابستگی ہے، کیسا رشتہ ہے، کیسا بندھن ہے —— جو نہیں تھا لیکن ٹوٹ بھی نہ سکا، ٹوٹ سکتا ہی نہیں۔

لان کے شوخ و شنگ پھُول، گھنی بیلیں، پودے اور درخت دُھل دُھلا کر صاف شفاف ہو گئے ہیں، نکھر گئے ہیں، میری نگاہیں کاسنی رنگ کے پھُولوں پر جم کر رہ گئی ہیں۔ یہ گملا میرے نزدیک ہی برآمدے کی سیڑھی پر رکھا ہے۔ میں نے کاسنی کو دیکھا ہے۔ وہ کاسنی رنگ کی شلوار، قمیص اور دوپٹے میں ملبوس میرے رُوبرو مسکرانے کی کوشش کر رہی ہے۔

جدھر دیکھتا ہُوں کاسنی ہی رنگ ہے۔

اداسی کا کاسنی پھیلاؤ ہے اور میں ہُوں۔

اور پھوار جاری ہے۔

ارے یہ کیا —— پھوار میرے اندر بھی پہنچ گئی .....

بڑھاپا

ارشد میر

ایک مغربی مفکر کا قول ہے چالیسواں سال جوانی کا بڑھاپا ہے اور پچاسواں سال بڑھاپے کی جوانی۔ ذاتی حیثیت سے ہمیں اس کی صداقت میں رتی بھر شبہ نہیں اگر ہو بھی تو کوئی غائقہ نہیں آخر اس سے کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی۔ اجتماعی سطح پر ہم اقوال مغرب پر دل و جان سے فریفتہ ہیں۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ اس جفا دری قول پر آج تک نہ ہی کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہے اور نہ ہی کوئی کان دھرنے کو تیار ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہمارے ہاں جوانی اور بڑھاپے میں کوئی خطِ متارکہ نہیں کھینچا گیا اور نہ ہی کسی حدِ فاصل کی جمع بندی تیار کرنے کی زحمت گوارا کی گئی ہے۔ اکثر دھان پان جوان بوڑھے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ بعض کڑیل جوان بزعم خویش بوڑھا بننے کے شوق میں چہرے پر ایسی رقت طاری کر لیتے ہیں۔ جس سے ملتی جلتی کسی زمانے میں قتیل شفائی نے ستاروں سے ہم کلامی کے موقع پر اپنے اوپر مسلط کی تھی یا پھر اس نوع کی جو اکثر ٹی وی کے مزاحیہ پروگرام دیکھتے وقت ناظرین کے چہروں کی چغلی کھاتی ہے کئی بوڑھے کھوسٹ محض جوان کہلانے کی ترنگ میں مضحکہ خیز حربے برتنے سے بھی نہیں چوکتے بلکہ میک اپ کے مختلف النوع طریقوں کو سر دھڑ کی بازی لگا کر جانچنے، پرکھنے، اور اپنانے کی لگن میں مگن رہتے ہیں حالانکہ بخوبی جانتے ہیں۔

خود فریبی ہے ضعیفی کو جوانی کہنا،

لیکن یہاں ایک نظری سا سوال پیدا ہوتا ہے کہ بوڑھے اگر کسی تہوار کے موقع پر اپنی بیٹر ہاف کا دل جیتنے کے لئے یا محض اپنا راستجھا راضی رکھنے کی خاطر خضاب کا پلستر کر لیں تو ہدف تنقید بننے سے چھٹکارا نہیں پاتے۔ لیکن شعرائے عظام چلتی کا نام گاڑی قسم کی شاعری عرصہ دراز سے کرتے چلے آئے اپنے شعروں کو خضاب کے کوٹ چھوڑا اور کوٹ پہنانے پھریں۔ ان کی جانب میلی نگاہوں سے دیکھنا تو کجا بڑے بڑے دبنگ حضرات نیچی نظروں سے دبے الفاظ میں بھی کچھ کہنے کی جسارت نہیں کرتے ہو سکتا ہے ان سے زیادہ ان کے سکہ بند حاشیہ برداروں کے جن چھپا سے خوف کھاتے ہوں۔ رفع شر کی خاطر اصل موضوع کی طرف لوٹیں تو اہل الرائے کی اس منطق میں بھی تھوڑا بہت وزن نظر آتا ہے کہ انسان اور گھوڑے کو پسند کی نہاری کا کوٹہ ملتا رہے تو بڑھاپا انہیں چھونے کی جرأت نہیں کر سکتا کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پیرانہ سالی کا دل سے بھی گہرا تعلق ہے اگر کسی بندۂ خدا کا دل جوان ہو۔ باغ و بہار مرنجان مرنج اور بلبل ہزار داستان ہو۔ دماغ کی سوچ مثبت راہوں پر گامزن رہے تو پھر بڑھاپا اس سے اسی طرح کنی کتراتا ہے۔ جیسے کو اغلیل سے، یہی نہیں ڈلہ سنج بوڑھے تو جھرلیوں کے جھرمٹ میں بھی بڑی خود اعتمادی سے یوں نغمہ سنج ہوتے ہیں۔

بوڑھا ہوں مگر طبع جواں رکھتا ہوں
صورت پہ نہ جا حسنِ بیاں رکھتا ہوں

اس میں شک نہیں۔ عجیب بات ہے کہ شک کا فائدہ ہمیشہ سے ہی ملزموں کے کھاتے میں درج ہوتا آیا ہے جب کے بوڑھے پیری کے "کھوہ کھاتے" میں پہنچ کر بھی شکی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایام پیری میں بھی ان کے ٹھاٹھ باٹھ روایتی پیروں سے ملتے جلتے تھے۔ اور اہل خانہ کو مریدان باوفا کی طرح ان کے آگے دم مارنے یا چون و چرا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ مرورِ ایام سے ان کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی حتیٰ کہ اب یوسفِ بے کارواں ہو کر رہ گئے ہیں۔ ویسے اس مقام تک پہنچنے میں وہ ایک حد تک خود بھی تو ذمہ دار ہیں جنہوں نے بدلے ہوئے حالات سے دانستہ یا نادانستہ چشم پوشی کی اور اپنی ہی لے میں بے وقت کی راگنی الاپنے اور کے لئے راست اقدام پر اتر آئے۔ جس پر انہوں نے بھینچی ہوئی آنکھیں قدرے وا کیں تو صورت حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے خود ہی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور نئی نسل بڑے طمطراق سے مادر پدر آزاد ہو کر بلا شرکت غیرے من مانی کرنے لگی بلکہ آج تک بلا روک ٹوک دندناتی پھر رہی ہے۔ البتہ اس گئے گذرے دور میں خال خال بوڑھوں کا دم غنیمت ہے جو رہی سہی ساکھ کو ڈنکے کی چوٹ برقرار رکھے ہوئے ہیں وگرنہ یورپ جیسے متمدن معاشرے میں بوڑھے کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہیں اور وہاں کی رعنائیوں اور شہنائیوں میں خود کو یکہ و تنہا محسوس کرتے ہیں اگر کہیں بھولے بھٹکے تنہائی کی جاں گسل گھڑیوں سے پریشان ہو کر افتاں خیزاں اپنے ہی کسی بچے کے ہاں پدری شفقت کے بل بوتے پر پہنچ جائیں تو اکثر مایوس و نامراد ہی لوٹتے ہیں کیونکہ ان کی نام نہاد اولاد فخریہ انداز میں پالتو کتوں کو چمکارتی ہے لیکن انہیں بڑی ڈھٹائی سے دھتکارنے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ ذرا فراخ دل ہو تو انہیں پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں کی ایک جھلک دیکھنے یا تحفے تحائف دینے کی اجازت مل جاتی ہے بچوں کو ویسے بھی پٹی پڑھائی جاتی ہے کہ ان کے قریب نہ جائیں مبادا ان کے پلے پلائے جراثیم کی لپیٹ میں آجائیں یوں محض چند لمحات کی تفریحی سہولت کے بعد ننھے منے بچے ہیلو ہیلو کہہ کر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں غالباً یہی سبب ہے کہ یورپ کے اخبارات میں اکثر اس انداز کے اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں کہ جو کوئی مرد خدا بوڑھوں کی حالتِ زار کے پیش نظر ان سے گھٹ میٹھی باتیں کرنے کے لئے چند قیمتی گھڑیوں کی قربانی دے گا۔ اُسے دعا کے ساتھ ساتھ حتی المقدور حقِ خدمت کا نذرانہ بھی پیش کیا جائے گا اور یوں OLD is COLD کا نعرہ مستانہ لگانے والے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑا مار رہے ہیں اور بوڑھوں کی کھیپ کو چلے ہوئے کارتوس اور پیر تسمہ پا جیسے القابات سے نوازنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بڑھاپا ہمارے ہاں عطیہ خداوندی کے زمرے میں آتا ہے۔ جہاں بوڑھے اپنی رہائش گاہوں میں کبھی ہوا کے گھوڑے پر سوار منظر آتے ہیں اور کبھی گھوڑے بیچ کر اور لمبی تان کر سوتے ہیں یہی نہیں۔ بچوں کو جھڑکیاں دینے میں مختار کل ہیں۔ انہیں نہ صرف بچوں سے ہمہ وقت کھیلتے، ناچنے کودنے، کمر پر سوار کرانے کی آدھی نہیں کھلی چھٹی ہے بلکہ وہ اکثر بچوں کو چند پیسوں کا لالچ دے کر اپنی اوٹ پٹانگ رام کہانی سنانے کا بے تابانہ چسکہ بھی پورا کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی بچہ بوڑھا ایک برابر ہوتے ہیں۔ بلکہ

بوڑھا تو ایک ہی جنم میں دوسری مرتبہ بچہ بنتا ہے اس لئے کہ ہم جنس یا ہم جنس پرواز والا مسئلہ بھی محل نظر ہے لیکن وہ بوڑھے جو بچوں پر اپنے تجربات کے نچوڑ کا چھڑکاؤ کریں بچے اُن کا نام سنتے ہی نو دو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ وہ بوڑھے جو خواہ اپنے کڑوے کسیلے منہ کو شیریں دہن بنانے کے لئے ان کے ساتھ مل کر ٹافیوں، ٹکیوں اور چیونگم کی جگالی کریں۔ ان کی آنکھوں کا تارا بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی بوڑھا پند و نصائح کا دفتر کھول کر جوانوں کو اقبالؒ کے کلام سے ہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی' کی طرف رجوع کراتے تو وہ منہ دوسری جانب موڑ لیتے ہیں۔ البتہ اگر جوانوں کو پیروں کا استاد کرا اور' ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات' کی نشاندہی کرے تو جھوم اٹھتے ہیں بلکہ مکرّر مکرّر کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں۔ جدید نسل اپنے بزرگوں سے جو چاہے رویہ اختیار کرے اپنے تئیں جو چاہے اعلان کرتی پھرے اس کھلی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ بوڑھے نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔ یہ نہ ہوں تو دعاؤں کے دروازے بیسر نہیں تو ایک حد تک ضرور بند ہو جاتے ہیں۔ یہی خاندانی مرکزیت کے ملجا و ماوٰے قرار پاتے ہیں انہی کے قدومِ میمنت لزوم سے عبادت گاہیں بارونق ہیں جنازوں میں شمولیت اور بارانوں کے وقار میں بھی ان کا اچھا خاصا عمل دخل ہے یہی نہیں لاشعوری طور پر فی سبیل اللہ آٹومیٹک کھانسی سے تمام شب "ٹھیکری پہرہ" دینے کا فریضہ بھی انہی کے سپرد ہے جس سے چوری چکاری کا کھٹکا نہیں رہتا اور یوں اہل خانہ رہزن کو دعا دینے کی زحمت سے صاف بچ جاتے ہیں۔ پھر بڑھاپا چڑچڑیوں کے حلقوں میں وارد ہو کر خوبصورتی اور بدصورتی کا خاتمہ بالخیر کر دیتا ہے اور یوں احساسِ کمتری اور احساس برتری کے دیرینہ مسائل کو بطریق احسن حل کرنے میں ید طولےٰ رکھتا ہے

مغربی دنیا میں بڑھاپے نے ایک اور ستم یہ ڈھایا کہ خاصی لمبی جست لگا چکا ہے جو سرکاری سطح پر دردِ سری کا موجب بن گیا ہے ہم تقلید مغرب کے شیدائی ہیں اس لئے بھلیکھا ڈالنے کے لئے کہ ہمارے ہاں بھی طویل العمری کا رجحان پنپ رہا ہے ریٹائرمنٹ کی عمر ساٹھ بلکہ بعض محکموں میں پینسٹھ برس تک بڑھا دی ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ اس عمر تک پہنچنے والے اولاً برائے نام ہی دکھائی دیتے ہیں جو افتاں خیزاں پہنچ بھی جائیں ان کی اکثریت حواس خمسہ سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اس وقت قریب بلکہ عقیقب بیٹھے ہوتے بوڑھوں کو بھی ایک دوسرے کی باتیں کم ہی پلے پڑتی ہیں غالباً اس لئے کہ

زپیری چناں گشتہ ام ناتواں
کہ دنداں بجفد بجائے زباں

ترقی پذیر ممالک میں اور کچھ ہو نہ ہو بیماریوں کا انداز خاصا ترقی یافتہ ہے خاص طور پر دل گردے تو بے وفا محبوب کی طرح ریٹائرمنٹ سے پہلے یا فوراً بعداً کا مکا' منہ موڑ لیتے ہیں اور اگر کوئی سخت جان ان سے وقتی طور پر رسم و راہ بڑھا کر وقت کٹی کر بھی لے پھر بھی اس کا حواسِ باختہ ہونا قرین قیاس ہی نہیں یقینی حد تک درست نظر آتا ہے اور یوں بڑھاپے میں جب انسانی عقل پر دبیز پردے پڑ جاتے ہیں تو افراد کنبہ کو ان سے زیادہ ڈرائینگ روم کے پردوں کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے جہاں ان کا اور کتے بلیوں کا داخلہ ممنوع قرار پاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات بوقت ضرورت "بڈھرے وارے چلم دارے" کا بندوبست استمراری بھی کر دیا جاتا ہے اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے چند جبر جنگ بوڑھے مقاماتِ آہ و فغاں کا سلسلہ جاری و ساری رکھتے ہیں

اور ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق پر قوی ایمان رکھتے ہوئے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ بلکہ ڈپلومیٹک خوشبو اور ارسٹوکریٹ خو سے لیس ہو کر موقع محل کے مطابق کریمانہ اداؤں یا بہیمانہ مزاج سے نئی نسل کو چھٹی کا دودھ پلاتے ہیں یا ہلکے پھلکے انداز سے اپنا مقصد پورا کر لیتے ہیں۔ بلکہ وہ بوڑھے جو زندگی زندہ دلی کے پرستار ہیں وہ عام طور پر نسل نو کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کرتے بلکہ شگفتہ موڈ سے ہر ایک کا دل موہ لیتے ہیں جب وہ پیر فرتوت جو عہد پیری میں عاقبت سنوارنے کی بجائے عہد شباب کی طرح گیسو سنوارنے کے رسیا ہوتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے وقیانوسی گاڑیوں کی مانند اپنی ویڈنگ کرانے میں جٹے رہتے ہیں یا پرانے سائیکلوں کی طرح اوور ہال کرانے کے خبط میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کی عزت و توقیر کم ہی دیکھنے میں آتی ہے بلکہ اس طرز کے بوڑھے تو اکثر نئی شادی کا ناٹک بھی رچا لیتے ہیں اور بڑی بے دریغی سے اپنی اور بزرگوں کی حرام حلال سے جمع شدہ پونجی گلچھرّے اڑانے میں صرف کر دیتے ہیں بڑھاپے کی شادی میں نئی نویلی دلہن کی پانچوں انگلیاں گھی اور بوڑھے کھوسٹ خاوند کا سر مبارک کڑاہی میں نظر آتا ہے۔ حد یہ ہے کہ نوبیاہتا زوجہ اسے تکنی کا ناچ نچائے غلط سلط ہیٹی پڑھائے اس کی ہر ادا پر دل و جان سے فدا اور اس کے ہر کلمہ کو کلمہ حق تصور کرتا ہے لیکن جب بڑے میاں کی اللے تللوں میں کاروباری لٹیا ڈوب جاتی ہے یا ریٹائرمنٹ کے بعد جملہ اثاثہ ختم ہو جاتا ہے تو اکثر جدید واٹف بوریا بستر سمیٹ کر رفو چکر ہو جاتی ہے۔ جس پر آنکھیں کھلتی ہیں لیکن پانی سر سے گذر چکا ہوتا ہے۔ دوسری جانب وہ حساس بوڑھے جو گھر کی چار دیواری میں مقید ہوتے ہیں۔ وہ بزعم خود دور دراز کے قرابت داروں سے بھی آس لگا لیتے ہیں کہ وہ ان کی بارگاہ میں ملزموں کے رنگ یا کم از کم وکیلوں کے ڈھنگ سے پیشیاں بھگتیں۔ یہی نہیں سر جھکائے، ہونٹ لٹکائے اور چپ سادھے ان کی جوانی مستانی کے خود ساختہ الف لیلوی قصے بھی سنیں اجل طبیبوں سے حاصل کردہ نسخہ جات کے گر پلے باندھیں اور پھر داد کے ڈونگرے برسانے کا فریضہ بھی ادا کریں۔ کبھی کبھار پیر نابالغ طرز کے بوڑھے طوطے فرفر اپنے معاشقے بھی چٹخارے لے لے کر سناتے ہیں، عام لوگ ان کی مضحکہ خیز حرکات کے بارے میں جان کر تمسخر اڑاتے ہیں جب کہ باشعور سامع ان کی کمزوری کو بھانپتے ہوئے ان کی ہاں سے ہاں ملا کر اپنی گلو خلاصی کرا لیتے ہیں کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں۔

گلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"

ہم سخن فہم ہونے کے دعویدار تو نہیں لیکن غالب کے طرفدار ضرور ہیں جنہوں نے فتوے صادر کرنے کی بجائے محض اپنی ثقہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے بڑی پتے کی بات بتائی تھی کہ قویٰ مضمحل ہو جائیں تو عناصر میں اعتدال کہاں۔ اس لئے سرکار عالی مدار اگر تجربہ کار ملازمین کو پنشن یافتہ کرتی ہے تو اس میں یہی حکمت کارفرما ہے لیکن عجیب بات ہے کہ سیاست دان، وکلا اور پرائیویٹ ڈاکٹر اس کلیئے سے مستثنیٰ ہیں سیاست دانوں کا معاملہ تو کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جنازے کی رونق کو دوبالا کرنے کے دلدادہ ہوتے ہیں اس سے ایک تو جنازہ دھوم دھام سے نکلتا ہے۔ دوسرے اخبارات میں جلی حروف سے مرگ کی خبر شائع ہو کر ہیرا پھیری سے کمائی گئی منقولہ غیر منقولہ جائیداد کی پردہ پوشی ہو جاتی ہے یوں پس ماندگان کو مفت میں پبلک کی ہمدردیاں میسر آجاتی ہیں جس کا حافظہ روز ازل سے کچھ زیادہ ہی کمزور چلا آرہا ہے۔ لیکن خدا جانے ان وکیلوں اور ڈاکٹروں کو کیا ہو گیا ہے جو بندگان خدا کے مال و جان کے پیچھے عمر کے آخری حصہ میں لٹھ لئے پھر رہے ہیں۔ حالانکہ اس وقت انہیں خود لٹھ پکڑنے اور علاج معالجہ کرانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے

بڑھاپا اور عصا دیسے بھی لازم و ملزوم ہیں کیونکہ

عصا نہ ہو تو بڑھاپا ہے کارِ بے بنیاد

لیکن عہد حاضر کے بوڑھے اس سے بھی الرجک دکھائی دیتے ہیں اور اسے تھام کر چلنے میں سبکی سی محسوس کرتے ہیں کیونکہ بڑھاپے کی آخری منزل میں زندگی کا آخری سانس لینے تک بوڑھے کہلانے کو تیار نہیں ہوتے۔ ویسے دیکھا جائے تو جوان اور بوڑھے میں فرق ہی کتنا سا ہے ایک کی اگر رال ٹپکتی ہے تو دوسرے کی بہتی ہے ایک احسان جتانے کا رسیا ہے تو دوسرا بھلانے کا عادی ہے۔ البتہ بڑھاپے میں جب نقاہت چھکے چھڑا دے اور دو قدم چلنے سے سانس پھول کر یوں محسوس ہو جیسے دم برابر ہونے کو ہے یا بعض فیشن ایبل بیماریوں کی منظر التفات سے پھول کر کپا بن جائیں تو پھر "ایک بڑھاپا سو سیاپا" کا ورد حرز جان بنا کر اللہ سے لو لگانے کی کوشش کرتے ہیں اس زمانے میں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے پھوڑوں کا تذکرہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ فی زمانہ لحد میں پھولوں کے جلو میں جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں بلکہ یہ تو الا ماشاء اللہ بہت بڑی عیاشی متصور کی جاتی ہے۔

بوڑھوں کی سرشت عقل کل سے عبارت ہے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ جوانی کی دلیرانہ للکار کو قومی ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر ہر بوڑھا خود کو سیاہ و سفید کا مالک سمجھتا ہے اور اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے مشوروں سے سرمو انحراف نہ کیا جائے لیکن وہ اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص پرانے ٹائم ٹیبل کو دیکھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچے گا تو لامحالہ گاڑی پر سوار نہیں ہو سکے گا۔

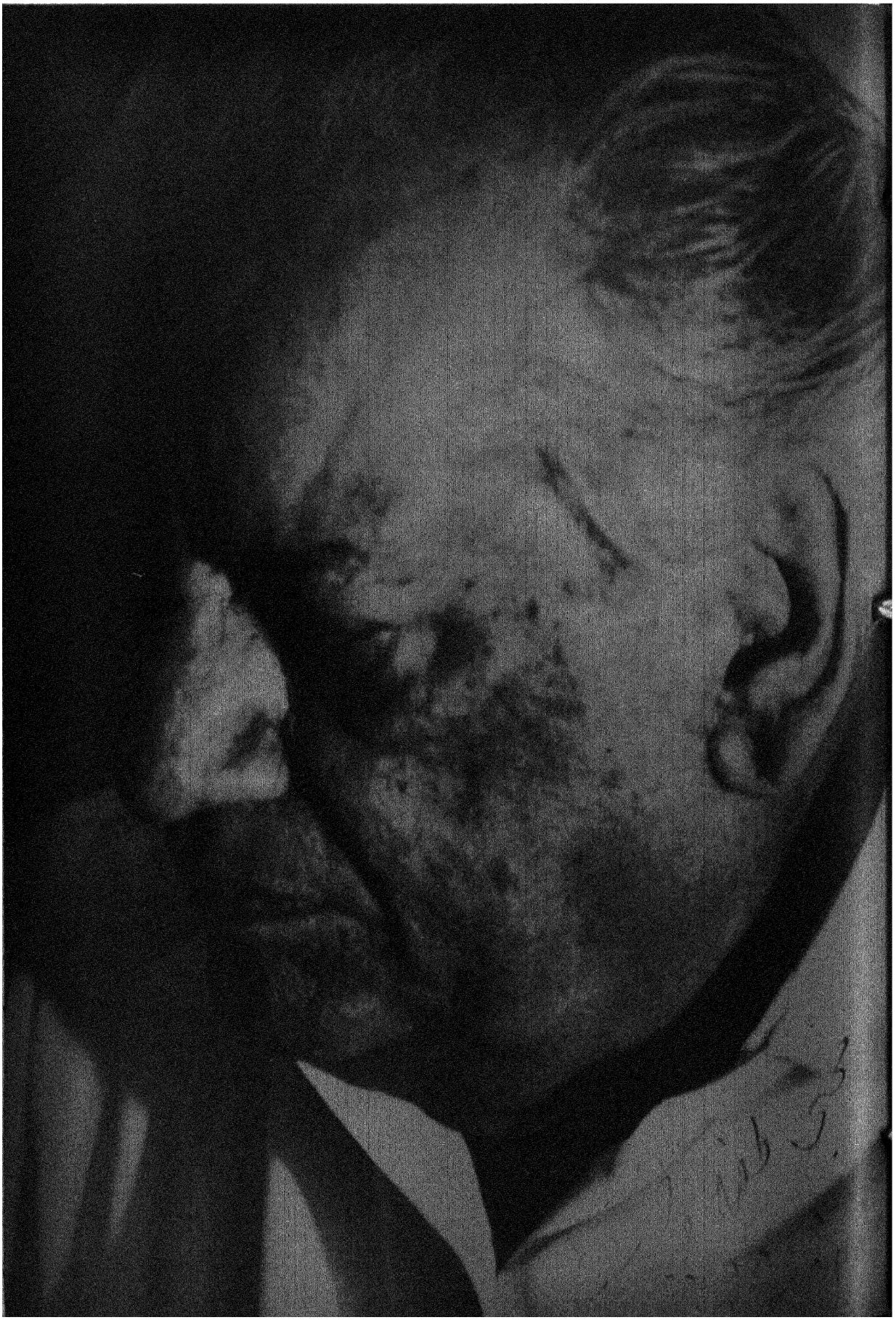
(چشم بد دور پاکستان ریلوے اس سے مستثنیٰ ہے۔)

خدانخواستہ کہیں تو بوڑھوں کو خوش و خرم رکھنا کار دارد نہیں معمولی سی توجہ سے رام ہو جاتے ہیں آپ آسانی سے انہیں ایک ہی فقرے کی ادائیگی سے ہنسا یا رلا سکتے ہیں۔ ان کا اپنا یہ حال ہے کہ موڈ آن ہو تو دادی اور نانی اماں تک کو بڑی عقیدت سے یاد کرتے ہیں جو ان کے لئے دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو کی دعائیں خلوص دل سے مانگا کرتی تھیں اور کہیں شومئی قسمت سے موڈ آف ہو جائے تو انہیں بھی جلی کٹی سنانے سے باز نہیں آتے شاید اس لئے کہ خالص دودھ پینے کی بجائے چائے میں چند قطرے ڈالنے کے لئے بھی نہیں ملتا اور پوتے چھوڑ بچے بھی انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ جب کہ یہ سپر پاور بننے کے جنون میں جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اب وہ محض سپر ہی سپر ہو کر رہ گئے ہیں اور اصل پاور اہل و عیال کے قبضۂ قدرت میں ہے جو ملی بھگت سے انہیں ایک طرح کا لگا بھگت بنا کر وعدۂ فردا پر ٹرخاتے رہتے ہیں بلکہ کئی دفعہ یہ شعر گنگناتے ہوئے موقع پر پکڑے گئے ہیں۔

ان پہ آیا جو بڑھاپا تو لیا ہم نے قصاص
صبح کو وعدے کئے شام کو ٹالے ہم نے

یہ سب کچھ اپنی جگہ درست ہو یا غلط لیکن اس کے باوجود بڑھاپے کا اپنا کروفر اور جاہ و جلال ہے جس کے سامنے جوانی فی الواقع بے بسی کا مرقع نظر آتی ہے شاید اسی لئے ایک نوجوان شاعر کو اس حقیقت کا برملا اعتراف کرنا پڑا۔

دیکھا ہے جوانی نے بڑھاپے کو حسد سے
لگتا ہے کہ انسان نہیں عمر حسیں ہے



میموریل

شوکت صدیقی

شام ہوتے ہی ٹوٹو نے پھر وہی حرکت کی۔ نہ جانے اس بچّہ کو کیا ہو گیا تھا۔ اِدھر اندھیرا ہُوا، اور ٹوٹو غائب۔ ڈھنڈیا پڑی۔ دیکھا، میلے کپڑوں کی ٹوکری کے اندر پڑا گہری نیند سوتا ہے۔ اس کی اس عجیب و غریب عادت نے مجھے خواہ مخواہ الجھن میں مبتلا کر دیا۔

پچھلے مہینے اُس نے بچّوں کی نفسیات کے بارے میں کچھ کتابیں خریدی تھیں۔ ان سے استفادہ کیا کئی کتابوں کے مطالعہ کے بعد مشہور ماہر نفسیات کارل ژنگ کی کتاب "بچّوں کی انوکھی عادتیں" کارآمد نظر آئی۔ اس میں بچّوں کی بعض حیرت انگیز عادتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً ایک بچّے کی یہ عادت تھی کہ رات کو جب تک مُرغ کی بانگ نہیں سُن لیتا، اس وقت تک اس کو نیند نہ آتی، دوسرے کو لکڑی کترنے کا عارضہ تھا، اُس نے گھر کا سارا فرنیچر کتر کتر کر ستیاناس کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور بچّے کی عادت تھی کہ چراغ جلے اُس پر اچانک غنودگی طاری ہو جاتی۔ جب تک ریڑھ کی ہڈی پر ہلکی سی ضرب نہ لگتی اس کی غنودگی ختم نہ ہوتی، غرضیکہ بچّوں کی ایسی ہی اور عادات اور اطوار کا کتاب میں ذکر تھا۔ ان کا علاج معالجہ بھی تجویز کیا گیا تھا۔

مگر ٹوٹو نے جو انوکھی عادت اختیار کی تھی، کارل ژنگ کی تصنیف میں اس کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ البتہ کارل ژنگ نے یہ ضرور بتایا تھا کہ بچّوں میں اور بھی ایسی انوکھی اور دلچسپ عادتیں پائی جاتی ہیں، جن کا ہنوز تجزیہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کا خیال ہے کہ بچّوں میں ایسی عجیب و غریب عادتیں اس لیے پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان کے دماغ کی بعض رگیں ضرورت سے زیادہ حسّاس ہوتی ہیں۔ اس کا علاج اس نے یہ بتایا تھا کہ رات کو سونے سے قبل روغن زیتون میں شورا ملا کر بچّے کے تمام جسم کی مالش کی جائے تو افاقہ ہو جاتا ہے۔

میں نے کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد سوچا، کارل ژنگ نے تو بہت مہنگا نسخہ تجویز کیا۔ اس لیے کہ چند برس پہلے جب میرے سر کے بال پت جھڑ کی مانند تیزی سے گرنے لگے تھے تو کسی نے روغنِ زیتون استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت روغنِ زیتون کی ایک شیشی کی قیمت نو روپے تھی۔ اب سنا ئیں نہیں تو کم از کم بیس بائیس روپے ضرور ہو گی۔

اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ بیوی نے قریب آکر پوچھا "کس سوچ میں بیٹھے ہیں؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

سوچ رہا تھا یہ اپنا ٹوٹو روزانہ شام کو جس طرح میلے اور گندے کپڑوں میں جا کر سو جاتا ہے۔ یہ تو بڑی بُری عادت ہے۔" میں نے اپنی ذہنی پریشانی کا اظہار کیا۔

لیکن میری پریشانی کو سمجھنے اور اس پر ہمدردی سے غور کرنے کے بجائے وہ بگڑ کر بولی: "آپ نے مکان ہی ایسی خراب جگہ لیا ہے۔ دن بھر تو گلی کے گندے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے، اب اس کی عادت گندے اور میلے کپڑوں میں سونے کی نہ پڑے گی تو کیا صاف ستھرے بستر پر نیند آئے گی۔ جیسا ماحول ہوگا ویسی ہی بچے کی اٹھان ہوگی۔"

بات تو اس نے بڑی پتے کی کہی، مگر نیک بخت کو یہ نہیں معلوم کہ اب وہ زمانہ لد گیا جب کہیں رہائش اختیار کرتے وقت اور سہولتوں کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ پاس پڑوس کیسا ہے۔ اس وقت تو گھوڑے اصطبل میں اور انسان مکانوں میں رہتے تھے۔ اب تو انسان اور گھوڑے ایک ساتھ باندھے جاتے ہیں۔ جس کو سر چھپانے کی جہاں جگہ مل جاتی ہے وہیں ڈیرا ڈال دیتا ہے۔ اگر گرکے پھیر میں پڑا تو گیا کام سے۔

ایسی باتیں میں اکثر سوچتا ہوں، لیکن بیوی سے کبھی ان کا اظہار نہیں کرتا۔ حالانکہ اسے "نور نامہ" اور "دعائے گنج عرش" منہ زبانی یاد ہیں۔ "بہشتی زیور" اور میلاد شریف کی کتابیں وہ فر فر پڑھ لیتی ہے اور قرآن شریف کا ناظرہ تو چھٹپن ہی میں ختم کر لیا تھا۔ سنا ہے آمین کی خوشی، جسے عرف عام میں نشرہ کہتے ہیں، بہت دھوم دھام سے منائی گئی تھی، مگر یہ ساری تعلیم گھر کی چار دیواری کے اندر ایک نابینا حافظ جی اور بوڑھی استانی سے حاصل کی ہے۔ کبھی اسکول نہیں گئی۔ ماں باپ نے اس ڈر سے نہ بھیجا کہ زیادہ پڑھ لکھ کر محلے کے حاشق مزاج لونڈوں سے آنکھیں ملانے کے ساتھ ساتھ پرچے بازی نہ کرنے لگے۔ ان کے ناموس پر حرف آئے اور رسوائی کا باعث بنے۔

میں چونکہ اخبار کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں اور انگریزی رسائل اور جرائد بھی پڑھتا ہوں لہٰذا زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے معاملہ میں خاصہ روشن خیال واقع ہوں۔ لیکن آپ اس مغالطہ میں ہرگز مبتلا نہ ہوں کہ میں یہ رسائل اور جرائد مقررہ قیمت ادا کر کے مزید تا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مہینے کی آخری تاریخوں میں جب جیب میں اتنی رقم بھی نہیں ہوتی کہ کسی اچھے ریستوراں میں بیٹھ کر یار دوستوں کے ساتھ شام گذاری جائے یا مار دھاڑ سے بھرپور ہالی وڈ کی نئی فلم دیکھی جائے۔ تو اس کڑاکے کے عالم میں کسی کباڑیئے سے نہایت سستے داموں پر راتوں کی نیند حرام کر دینے والا انگریزی کا کوئی ناول یا "نیوز ویک"، "ٹائم"، "پوسٹ"، "لائف" اور اسی قبیل کے دوسرے جرائد کے پرانے شمارے خرید لیتا ہوں۔ ان میں ایک آدھ سنسنی خیز کہانی، کوئی حیرت انگیز فیچر، کچھ پھڑک دار اسکینڈل، کچھ ہلنگ توڑ تصاویر، غرضیکہ اتنا چٹ پٹا مسالہ ہوتا ہے کہ رات کو سونے سے قبل کے وہ لمحات، جو کبھی کبھی دوبھر ہو جاتے ہیں، مزے سے کٹ جاتے ہیں۔ ان جرائد کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، انگریزی کی استعداد بڑھتی ہے جو میرے ایسے لازم پیشہ آدمی کے لیے ترقی کا پاسپورٹ ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر بیوی نے تنک کر کہا: "آپ الٹی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر خواہ مخواہ اپنا دماغ خراب کرتے ہیں۔ میرا کہا مانئے تو فوراً ٹوٹو کو اسکول میں داخل کرا دیجئے۔ ماشاء اللہ اب وہ پانچویں برس میں لگ گیا ہے۔ اسکول جانے لگے گا تو سارا دن بھر کھیل کود کے بہانے جو آوارہ گردی کرتا ہے، سب ختم ہو جائے گی۔" اس نے ایک ہی سانس میں تمام باتیں کہہ ڈالیں۔

میں نے بھی بلا عذر اس کی ہر بات مان لی۔ مسکرا کر کہا: "اب یہی کروں گا۔"

"یہی کروں گا نہیں۔ کل ہی جاکر اسکول میں بٹھا دیجئے۔" وہ اسی تیکھے لہجے میں بولی "وہ آپ کے غزنوی صاحب نہ جانے کب دورے سے واپس آئیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی اسکول میں جگہ بھی نہ رہے۔"

میں نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی "غزنوی صاحب کسی لمبے دورے پر نہیں گئے ہیں، جلد ہی لوٹ آئیں گے۔"

مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی "ذرا سوچئے تو کب غزنوی صاحب آئیں گے۔ کب وہ سفارش کریں گے۔ کب بچہ اسکول میں پڑھنے بیٹھے گا۔ پھر سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ آپ جو دُور دور انگریزی اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، ان میں سے کسی ایک اسکول میں داخل کرانے سے کیا حرج ہے۔ یہ تو سب سے اچھا ہے کہ بچہ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رہے۔"

بیوی نے ٹھیک ہی کہا۔ میں بیک وقت دو اسکولوں میں پڑھاتا ہوں اور دونوں ہی انگلش میڈیم اسکول ہیں مگر میں اپنے بچے کو ان اسکولوں میں تعلیم دلانا نہیں چاہتا اور اس کا سبب بیوی کو بھی بتانا نہیں چاہتا، اس وقت بھی میں نے اُسے کسی نہ کسی طرح ٹال دیا، اور صاف بات گول کر گیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ میں صبح کی شفٹ میں جس اسکول میں پڑھاتا ہوں۔ اس کا نام "گرین وُڈ مونٹیسوری اسکول" ہے۔ مگر نہ یہاں ہریالی ہے۔ نہ جنگل میں منگل بنانے کا سماں ہے۔ یہ کبھی روئی کی گانٹھیں رکھنے کا گودام تھا۔ ہمارے پرنسپل صاحب بھی کسی زمانے میں روئی کے آڑھتی تھے۔ خدا بُرا کرے سٹہ بازی کا کہ ان کا نام کا روبار ایسا چوپٹ ہوا کہ اس گودام پر جھاڑو پھر گئی۔ اس عبرت ناک حادثہ نے ان کے دل میں ایسا خوفِ خدا پیدا کیا کہ سر میں خدمتِ خلق کا سودا سمایا۔

اسی خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار ہو کر انھوں نے اپنے گودام میں نئی نسل کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اسکول کھول دیا۔ اسکول کے کیبن نما چھوٹے چھوٹے کمروں میں سویرے سویرے ہی لگ بھگ تین سو بچے ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ تمام دن بجلی کے مدھم بلب روشن رہتے ہیں اور اکثر موسم سرما میں بھی پنکھے چلانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسکول کی سب سے دلچسپ شخصیت پرنسپل صاحب ہیں جو مالک ہیں اور منتظمِ اعلیٰ بھی۔ حالانکہ وہ غلط انگریزی بولتے ہیں۔ نہایت دھڑلے سے بولتے ہیں اور مونٹیسوری کے ہجے ہمیشہ غلط لکھتے ہیں۔ مگر ان کا دعویٰ ہے کہ اگر وہ بچوں کو پڑھانا شروع کر دیں تو دور دور تک کوئی اسکول باقی نہیں رہے گا۔ جگہ چونکہ کم ہے لہٰذا وہ زیادہ بچے اسکول میں داخل کرنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے درس و تدریس کی جانب ابھی تک سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔

البتہ وہ ہفتہ میں ایک دو بار ٹیچروں کو سبق ضرور دیتے ہیں۔ طلبا کے سامنے ہی وہ اکثر غیظ و غضب کے عالم میں اس طرح گرجتے برستے ہیں کہ کبھی کبھی تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بے چارے کلاس ٹیچر کو چیڑ کے بکسوں کی لکڑی سے بنی ہوئی کسی میز پر مرغا بنا کر بٹھا دیں گے۔ یہ ڈانٹ ڈپٹ وہ اس لیے روا رکھتے ہیں کہ ملازمین کو ہمیشہ تنبیہ کرتے رہنا چاہیئے، خواہ وہ اسکول کے اساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔

پرنسپل صاحب کے اسی سخت گیر رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبا نہایت ڈھٹائی سے اساتذہ کے ساتھ ٹھٹھول بازی کرتے ہیں،

چنانچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین اس وقت جب کوئی استاد کسی طالب علم کو اس کی نازیبا حرکت پر فہمائش کرنے میں مصروف ہوتا ہے اچانک کلاس روم کے کسی گوشے سے آواز بلند ہوتی ہے "پرنسپل صاحب آرہے ہیں"۔ یہ سنتے ہی اُستاد کی سٹی گم ہوجاتی ہے۔ وہ پریشان ہوکر دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ تمام طلباء مٹھی مار کر زور زور سے ہنستے ہیں۔

سو روپے ماہوار کی مستقل آمدنی اور عزت دار کہلوانے کا ارمان نہ ہوتا تو اس اسکول میں پڑھانے سے کہیں بہتر تھا کہ میں کباب پراٹھے کی دکان کھول لیتا۔ بیمار اور مردہ مویشیوں کے گوشت کے ساتھ پھیپھڑے ملا کر قیمہ بناتا۔ طرح طرح کے تیز مسالے ڈالتا اور ٹھاٹھ سے گرما گرم چٹ پٹے کباب بیچتا۔ اور اپنی مہینہ بھر کی تنخواہ چند روز میں کھری کر لیتا۔ ویسے اللہ توفیق دے تو اسکول قائم کرنے کا دھندا بھی بُرا نہیں۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ عزت بھی ہے اور کمائی بھی ٹنگڑی ہے۔

پرنسپل صاحب نے سٹہ بازی میں جتنا لُٹایا تھا، اسے مع سود، بلکہ سُود در سُود، وصول کر چکے ہیں۔ عالیشان بنگلے میں رہتے ہیں اور کار میں اُڑے اُڑے پھرتے ہیں۔ مگر اسکول کھولنے کے لیے گانٹھ میں رقم ہونا بنیادی شرط ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، پیسہ، پیسہ کو کماتا ہے اور وہی اپنے پاس نہیں۔ ساتھ ہی کاروباری ذہنیت رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ پیدائشی کا فن ہے، جو اللہ کسی کسی کو ودیعت کرتا ہے۔ یہ ہر کس و ناقص کے بس کی بات نہیں۔ میں اس صلاحیت سے قطعی محروم ہوں۔ جب ہی تو گریجویٹ ہونے کے باوجود آئے دن پرنسپل صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ سُنتا ہوں اور اُف نہیں کرتا۔

دوسرا اسکول، جس میں دوپہر کے بعد پڑھاتا ہوں، شہر کے ایک گنجان بازار میں واقع ہے۔ یہاں رات گئے تک شور و غل رہتا ہے۔ اسکول ایک ایسی دو منزلہ عمارت کے نچلے حصے میں قائم ہے جس کے ایک گوشہ میں دن چڑھے تک قصائی کی دکان بھی لگتی ہے۔ اس وقت صدر دروازے پر ایک بورڈ آویزاں ہوتا ہے جس پر یہ عبارت درج ہے "یہاں بڑا گوشت فروخت ہوتا ہے"۔ دس گیارہ بجے تک دکان چلتی ہے، پھر قصائی گوشت کاٹنے کی چھری، قیمہ بنانے کا بغدا اور دوسرا ساز و سامان ایک کوٹھڑی میں رکھ دیتا ہے۔ عمدہ اور چکنا گوشت، اپنے کھانے کے لیے پوٹلی میں باندھ کر گھر چلا جاتا ہے۔

قصائی کی دکانداری ختم ہونے کے بعد صفائی ہوتی ہے۔ کُتوں کو دھتکار کر بھگایا جاتا ہے اور دروازے پر لٹکا ہوا بورڈ پلٹ دیا جاتا ہے۔ اب اس پر انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں "ہیپی پیراڈائز اسکول" لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسکول لگا ہے، کلاسوں میں پڑھائی ہو رہی ہے۔ ناگہاں ہوا کے تیز جھکڑ سے بورڈ پلٹ گیا۔ ہر چند کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے، مگر جب ایسا ہوتا ہے تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی گھبرایا ہوا شخص کلاس کے اندر ہکا بکا کھڑا ہے اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گوشت کہاں فروخت ہوتا ہے۔

سُنا ہے رات کو اسکول کی عمارت قمار بازوں کا اڈہ بن جاتی ہے، کہنے والے کہتے ہیں کہ اس وقت بھی "ہیپی پیراڈائز" کا بورڈ دروازے پر لٹکا ہوتا ہے۔ اس اسکول کے مالک (جن کا پرنسپل ہونا لازمی شرط ہے) ذات کے قصائی نہیں ہیں، مگر

اساتذہ کی کھال ادھیڑنے کے معاملہ میں کسی قصائی سے کم ماہر نہیں۔ وہ مجھے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ دیتے ہیں۔ مگر تنخواہ کے رجسٹر میں پورے چار سو درج کرتے ہیں اور رسیدی ٹکٹ لگا کر باقاعدہ دستخط بھی کراتے ہیں۔ موسم گرما کی دو مہینے کی تعطیل شروع ہوتے ہی دوسرے اساتذہ کی طرح میری ملازمت بھی ختم کر دی جاتی ہے۔ حالانکہ وہ تمام طلباء سے تعطیل کی پوری مدت کی پیشگی فیس وصول کرتے ہیں۔

اسکول جب دوبارہ کھلتا ہے تو ہر ٹیچر کی ملازمت بھی از سر نو شروع ہوتی ہے۔ نہ وہ کبھی تقرری کا پروانہ دیتے ہیں نہ ہی مہنگائی الاؤنس یا کوئی دوسرا مروجہ الاؤنس دیتے ہیں، ترقی بھی نہیں دیتے، گریڈ بھی نہیں بڑھاتے مگر ہر سال طلباء کی فیس بڑھا دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خوش حالی کا یہ عالم ہے کہ بڑا بیٹا میڈیکل کالج سے ایم، بی، بی، ایس کرنے کے بعد لندن میں ایف آر سی ایس کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ دوسرا انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے۔ لیکن امریکہ کی مشہور درسگاہ ایم آئی ٹی میں اسے داخلہ دلانے کے لیے انھوں نے ابھی سے بھاگ دوڑ شروع کر دی ہے۔ ویسے ان کی تمام ہی اولادیں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ دراں حالیکہ وہ خود میٹرک ہیں۔ سنا ہے میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی جعلی ہے۔

یہ بات اس حیثیت سے درست معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ میرٹھ میں تھے تو ثقہ راویوں کے بیان کے مطابق چنگی کے محکمہ میں چپڑاسی تھے۔ اس وقت ان کا نام منور خان تھا۔ مہاجر بن کر کراچی پہنچے تو سید انور علی ہو گئے اور محکمہ آبکاری میں لوور ڈویژن کلرک بھرتی ہو گئے۔ رشوت خوری کے الزام میں ملازمت سے نکالے گئے تو اتنا کما چکے تھے کہ لارنس روڈ پر کرانہ کی دکان کھول لی مگر اس میں منافع کی شرح کم تھی، لہٰذا اسکول کھولا۔

یہ کاروبار ایسا راس آیا کہ دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ نہایت ٹھاٹھ باٹ سے رہتے۔ حکومت میں بھی اوپر تک اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ہر سال اسکول کی جانب سے سالانہ تقریب منعقد کرتے اور ہمیشہ کسی وزیر یا بہت بڑے افسر کی بیگم کو مہمانِ خصوصی بناتے۔ ایسی تقریبات میں جو سپاسنامہ پیش کرتے اُسے لکھنے کا فرض بھی عام طور پر اس خاکسار کو انجام دینا پڑتا۔ سپاسنامہ پڑھتے وقت وہ بار بار اٹکنے کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ اور اصطلاحات کے تلفظ کو کنکھی سے اس بیدردی کے ساتھ ذبح کرتے کہ تمام اساتذہ کے سر ندامت سے جھک جاتے۔

ایسی صورت میں آپ ہی بتائیے، میں اپنے بچے کو کس طرح ان دونوں اسکولوں میں تعلیم دلوا سکتا تھا۔ دیکھتی آنکھوں تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔ پھر ٹوٹو تو میرا پہلوٹی کا بچہ ہے۔ اس کے بارے میں تو میں یوں بھی بہت حساس ہوں۔ معاف کیجیے گا میں نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ ٹوٹو کا اصل نام محمد علی ہے۔ ویسے انگریزی رسالہ "لک" میں ایک خوبصورت ہسپانوی بچہ کی تصویر دیکھ کر ایک عرصہ تک میں اسے لازیرو کہتا رہا۔

اس کا نام محمد علی ماں نے رکھا ہے۔ حالانکہ میری خواہش تھی کہ اُسے بلند اختر کہا جائے، مگر اس کی ماں نہیں مانی، کہتی تھی کہ محمد علی بڑے آدمیوں کا نام ہوتا ہے اور چونکہ ہم دونوں اُسے مستقبل میں بڑا آدمی دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا مجھے بھی اس کی بات ماننا پڑی۔ یوں بھی ٹوٹو میں عام بچوں سے ہٹ کر بعض ایسی عادتیں پائی جاتی تھیں جو بڑے آدمیوں کے

بچپن سے منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کہیں گے اپنی اولاد اور عقل کے بارے میں ہر شخص کو مغالطہ ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ آپ میری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ جو ٹو ٹو میں مستقبل کے ایک بڑے آدمی کی علامتیں دیکھ رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میاں بیوی اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ٹو ٹو کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ اس سلسلہ میں ہمارے درمیان سخت بحث بھی ہوتی۔ بیوی کہتی کہ وہ ٹو ٹو کو ڈاکٹر بنائے گی اور اپنی بات کی تائید میں کہتی "ڈاکٹروں کی آمدنی کو آپ کیا جانیں کسی روز ڈاکٹر کریمی کے مطب میں جاکر دیکھئے، خدا کی قسم نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں"۔ میں مخالفت کرتا تو وہ اپنی رائے اس شرط پر بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاتی۔

"اچھا تو پھر اسے انجینیری ہی پڑھوا دیجئے۔ خالو فیاض کے پڑوس میں ایک انجینیر رہتا ہے۔ تنخواہ تو ہزار بارہ سو ہوگی مگر اوپر کی آمدنی اس قدر ہے کہ ایک چھوڑ، دو دو تو موٹریں ہیں۔ جس شہر میں تبادلہ ہوتا ہے، سال بھر کے اندر وہاں اس کی کوٹھی بن کر تیار ہو جاتی ہے۔ انجینیری میں بھی کم ٹھاٹھ نہیں۔ مگر میں تو یہی کہوں گی کہ ٹو ٹو کو تو ڈاکٹر ہی بنایا جائے۔ آئے دن تو میں بیمار رہتی ہوں۔ وہ ڈاکٹر بن گیا تو میری ہر مرض کا علاج ہو جائے گا۔ نہ اسپتال جانے کی ضرورت پڑے گی، نہ ڈاکٹروں کو لمبی لمبی فیس دینی پڑے گی"۔

آخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ایک بچے کو ڈاکٹر، دوسرے کو انجینیر اور سب سے چھوٹے کو پروفیسر بنایا جائے۔ بیوی کو پروفیسری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ میری تمنا تھی اور اس تمنا کے پس منظر میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ میں تعلیم کے میدان میں مار کھا گیا۔ پھٹیچر اسکولوں کا پھٹیچر ٹیچر ہی رہا۔ پروفیسر نہ بن سکا۔ اپنے بیٹے کو پروفیسر بنا کر میں اپنی کچلی ہوئی خواہش کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

(۲)

بیوی نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال ٹو ٹو کے داخلہ کے بارے میں ہوتا۔ کوئی حیلہ بہانہ کارگر نہ ہوا۔ اس کی بات مجھے ماننی ہی پڑی۔ رات کو منصوبہ بنا، صبح ہوئی تو بیوی سر پر کھڑی تھی۔ زور زور سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا ٹو ٹو میاں نہائے دھوئے، آڑی مانگ نکالے، نئی پتلون اور جیکٹ ڈالے، اسکول جانے کے لیے چاک و چوبند کھڑے تھے۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ خود میں نے بھی اسی اہتمام سے تیاری کی۔ جب میں ٹو ٹو کے ہمراہ گھر سے روانہ ہوا تو اس کی ماں کی خوشی کا عالم نہ پوچھئے۔ بات بات پر باچھیں کھل جاتی تھیں۔

راستہ میں ایک بار خیال بھی آیا کہ غزنوی صاحب دورے سے واپس آجاتے تو اچھا تھا۔ وہ بارسوخ آدمی ہیں، ان کی کوشش سے کوٹہ میں داخلہ ملنا آسان ہو جاتا۔ مگر یہ سوچ کر دل مضبوط کیا کہ آخر میں بھی تو اسکول ٹیچر ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو پیشہ کا لحاظ رکھا ہی جائے گا۔

سینٹ پیٹرز اسکول کا راستہ، میرے گھر سے بس کے ذریعہ مشکل سے پندرہ منٹ کا ہوگا۔ میں جس وقت وہاں پہنچا، اسکول لگ چکا تھا۔ پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے وسیع میدان تھا۔ اس کے تین طرف اسکول

کی دو منزلہ عمارت تھی۔ میدان کے ایک حصے میں بڑا خوشنما باغیچہ تھا۔ اس میں چھوٹے بچوں کے لیے جھولوں کے علاوہ کھیل کود کے طرح طرح کے لوازمات تھے۔ صاف ستھرا ماحول تھا۔ ضرورت کی ہر چیز قاعدے قرینے سے اپنی جگہ موجود تھی۔

پرنسپل کے دفتر کے سامنے پہنچا۔ چپڑاسی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے چپڑاسی سے کاغذ کی چٹ لی۔ سوچا اس وقت اپنے نام سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ سید محمد باقر کے بجائے میں نے ایس، اے بیکر، ٹیچر گرینڈ وڈ اسکول، لکھ کر چٹ اندر بھیجی، تیر نشانے پر بیٹھا۔ ذرا ہی دیر بعد پرنسپل نے اندر بلایا۔ وہ ادھیڑ عمر کا پادری تھا۔ خوبصورت بھوری ڈاڑھی، سفید براق لباس، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، سینہ پر لٹکتی ہوئی چمکتی دمکتی صلیب، بڑا پُر وقار آدمی تھا۔

وہ خندہ پیشانی سے ملا۔ بیٹھنے کو کرسی پیش کی۔ مسکرا کر انگریزی میں پوچھا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔ اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ تھا۔

"اس بچے کو آپ کے اسکول میں داخل کروانا چاہتا ہوں" میں نے قریب کھڑے ہوئے ٹوٹو کی جانب اشارہ کیا۔

پرنسپل کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ "میرا خیال ہے غالباً آپ نے دروازے کے باہر لگا ہوا بورڈ نہیں دیکھا"۔

مجھے یاد آیا کہ دروازے پر ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر یہ عبارت درج تھی "تمام کلاسوں میں داخلہ بند ہو چکا ہے"۔ لیکن پرنسپل سے ملاقات کرنے سے قبل میں نے اس بورڈ کی اہمیت جس طرح نظر انداز کی تھی اسی طرح اس کی بات سن کر بھی کی۔ مسکرایا اور لہجہ میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"بورڈ تو میں نے دیکھا ہے لیکن میں گرین وڈ اسکول میں....."

اس نے میری پوری بات بھی نہ سنی، ترش روئی سے بولا "یہ بورڈ دروازے پر صرف اس لیے لگایا گیا ہے تاکہ لوگ نہ اپنا وقت برباد کریں، نہ میرا"۔

میں نے ڈھٹائی اختیار کرنے کی کوشش کی، بولنے کے لیے منہ کھولا مگر اس نے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ سُرخی بن کر دوڑنے لگی۔ اس نے مجھے تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔ بیزاری یہ اسے نہایت شاق گزرا تھا۔ فوراً چپڑاسی کو بلانے کے لیے زور سے گھنٹی بجائی۔ میں گھبرا کر جھٹ کھڑا ہو گیا، اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں چپڑاسی کو بلا کر کمرے سے باہر نہ نکلوا دے۔ برائیگی کے عالم میں پرنسپل سے ہاتھ بھی نہ ملا سکا، معذرت بھی نہ کی۔ مڑا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ اسی وقت چپڑاسی بھی اندر داخل ہوا، اس زور سے چپڑاسی سے ٹکرایا کہ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

اسکول کے پھاٹک سے باہر نکلا تو اس قدر کوفت تھی کہ دل بیٹھا جاتا تھا۔ ٹوٹو ساتھ ساتھ تھا۔ وہ بھی حیران و پریشان نظر آتا تھا۔ نہ اس نے بات کی نہ میں نے۔ چپ چاپ گھر کی جانب چلا۔ مگر یہ فکر دامنگیر تھی کہ بیوی کے سامنے کیا عذر پیش کیا جائے۔

خدا خدا کر کے راستہ کٹا۔ گھر میں داخل ہوا، بیوی بے چینی سے منتظر تھی۔ میں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صاف جھوٹ بولا۔ "ایک ہفتہ بعد بُلایا ہے۔"

اس نے شاید میرے چہرے کی پریشانی کو تاڑ لیا تھا۔ جھٹ اپنے شبہ کا اظہار کیا "صرف بُلایا ہی بُلایا ہے۔ داخلہ بھی ملے گا کہ نہیں؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ بیوی کو باور کرایا "داخلہ کیوں نہیں ملے گا۔ آخر بُلایا کس لیے ہے۔" بات آئی گئی ہوگئی۔ اسی پریشانی میں ڈوبا اسکول پہنچا۔ دوسرے اساتذہ سے تذکرہ کیا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ڈائرکٹر تعلیمات کے دفتر میں کسی سے جان پہچان پیدا کرو۔ کسی نے بعض بڑے افسروں کا نام لیا، ان سے ملنے پر زور دیا۔ کسی نے سیاسی لیڈروں کے ذریعہ سفارش پہنچانے کا نسخہ بتایا۔ سب نے ایسے افراد کا ذکر کیا۔ جن کے پاس پہنچنے کے لیے علیحدہ رسائی پیدا کرنے کی ضرورت تھی اور وہ میرے بس میں نہ تھی۔

اسی پریشانی میں غلطاں و پیچاں تھا کہ ایک روز والد کے پرانے شناسا محمد نواز مل گئے۔ وہ فوج میں صوبیدار رہ چکے تھے۔ اب پنشن لیتے تھے۔ دیکھتے ہی ہمدردی سے بولے "کچھ پریشان نظر آرہے ہو، برخوردار بات کیا ہے؟" میں نے حال دل بیان کیا۔ اپنی الجھن بتائی۔

وہ بے نیازی سے بولے۔ تم اس عیسائیوں والے اسکول کا ذکر تو نہیں کر رہے ہو، جو صدر میں ہے؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں اسی اسکول میں بچہ کو داخل کرانے کا خواہشمند ہوں۔"

نہایت اطمینان سے گویا ہوئے "وہاں تو کام بن سکتا ہے، ابھی چلو۔ نیک کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔"

میں گھبرا گیا۔ سوچا، ان سے تو بات کر کے مُصیبت مول لے لی۔ وہ تو سچ مچ سر ہو گئے۔ اصرار کر کے اُسی وقت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ فوجی وردی پہنی۔ سینہ پر خدا معلوم کتنی قسم کے فیتے اور تمغے سجائے سرٹیفکیٹوں کا پلندہ سنبھالا، باہر نکلے، میرے گھر کی جانب چلے۔ میں ساتھ ساتھ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح ان سے پیچھا چھڑاؤں۔ وہ سینہ تانے، گردن اُٹھائے نہایت آن بان سے چل رہے تھے اور بہت مطمئن نظر آرہے تھے۔

ہم دونوں گھر پہنچے۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ ٹوٹو کو ساتھ لیا اور سینٹ پیٹر اسکول پہنچ گئے۔ مجھے پرنسپل کے رُوبرو جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ مگر محمد نواز بضد تھے کہ میں بھی اندر چلوں۔ چپڑاسی نے چٹ بڑھائی۔ اس نے اس کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلا۔ ٹوٹو بھی ہمراہ تھا۔ صوبیدار صاحب نے کھٹاک سے جُوتوں کی دونوں ایڑیاں جوڑیں۔ ایک ہاتھ اُٹھا کر خالص فوجی انداز سے سیلوٹ مارا۔ پرنسپل نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مگر صوبیدار صاحب بدستور کھڑے رہے۔ اُنھوں نے پلٹ کر ٹوٹو کی جانب دیکھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کیا۔ بلا کسی تمہید کے مدعا بیان کیا۔ "صاحب، اس بچے کو آپ کی سپردگی میں دینے لایا ہوں۔"

صوبیدار صاحب تمغوں سے سجا ہوا سینہ اُٹھائے اٹینشن کھڑے تھے۔ میں اُن کی آڑ میں اس طرح سکڑا سکڑایا کھڑا تھا کہ پرنسپل کی نظر نہ پڑے اور مجھے ایک بار پھر خفت اُٹھانا نہ پڑے۔ میں گومگو کے عالم میں تھا۔ سوچ رہا تھا۔ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

پرنسپل گُم صُم بیٹھا تھا۔ گردن جھکائے کسی گہری فکر میں غرق تھا۔ صوبیدار صاحب نے اسے خاموش دیکھا تو زیادہ دیر ضبط نہ کر سکے۔ کڑک کر بولے "صاحب، ہم نے زندگی بھر ہز مجسٹی گورنمنٹ کی خدمت کی ہے۔ اس کے ہمیشہ وفادار رہے، سرکار کے حکم پر ہر قربانی دی۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑائیاں لڑی ہیں۔" اُنھوں نے سینے پر سجے ہوئے چمکتے دمکتے تمغوں کی جانب انگلی سے اشارہ کیا "یہ بہادری پر ملے ہیں۔"

"ٹیک اے، ٹیک اے" پرنسپل نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

صوبیدار صاحب نے اسی جوش و خروش سے کہا "پچھلی جنگِ عظیم میں میرے دو بھائی برما میں بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔" انھوں نے سرٹیفکیٹوں کا پلندہ پرنسپل کے سامنے ڈال دیا۔ "یہ سرٹیفکیٹ دیکھئے۔ میں نے بھی ہز مجسٹی گورنمنٹ کے لیے جاپانیوں کے خلاف جنگ کی۔ زخمی بھی ہوا۔"

پرنسپل مسکرا کر بولا "ول، ول صوبیدار، تُم گھبراؤ نہیں۔ ہم تُمارے بچے کے لیے ضرور کچھ کریں گے۔"

"صاحب اسے تو آج ہی داخلہ ملنا چاہیئے اور ابھی ملنا چاہیئے۔" صوبیدار صاحب اڑ گئے۔ اُنھوں نے پتلون چڑھائی۔ گھٹنے کے پاس زخم کا نشان دکھایا۔ "دیکھئے یہ گولی کے زخم کا نشان ہے، جو نرسیپلی کے محاذ پر ترک فوجوں سے لڑتے ہوئے لگی تھی۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کی بات ہے۔ میں اس قدر زخمی ہوا تھا کہ دو مہینے اسپتال میں رہا۔ میری رجمنٹ کی کمان کیپٹن اکبر خان کر رہے تھے۔ جو بعد میں نواب سر اکبر خان آف ہوتی کہلائے۔ اُنھوں نے مجھے بہادری کا سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا۔" صوبیدار صاحب نے اپنے کاغذات کے پلندے کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ "ان سرٹیفکیٹوں میں سب کچھ لکھا ہے۔ اُنھیں ذرا پڑھ کر تو دیکھئے۔ آپ کو ہماری وفاداری کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔"

پرنسپل نے سرٹیفکیٹ الٹ پلٹ کر سرسری نظر سے دیکھے۔ گردن اُٹھائی۔ صوبیدار صاحب کو مخاطب کیا "وُل صوبیدار، تُمارے بچے کو ضرور ایڈمیشن ملے گا۔"

صوبیدار محمد نواز نے مُڑ کر میری جانب داد طلب نظروں سے دیکھا۔ اُن کی خضاب لگی مونچھیں اس وقت زیادہ ہی بارعب نظر آ رہی تھیں۔ گردن بھی تنی ہوئی تھی۔ میں ان کی شخصیت سے سخت مرعوب ہوا۔ پرنسپل نے نہ میری طرف توجہ کی، نہ اُسے یہ یاد آیا کہ میں اس کے پاس پہلے بھی آ چکا تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی، کلرک کو بلایا۔ ہدایت جاری کی کہ ٹو ٹو کے جی میں داخل کر لیا جائے۔

میں کلرک کے ہمراہ اُس کے دفتر میں گیا۔ اُس نے فارم داخلہ دیا۔ میں نے اُسے پُر کیا مگر جب اس نے فیس بتائی تو میں چکرا گیا۔ تیس روپے ٹیوشن فیس، پچاس روپے ماہانہ بس کا کرایہ، پندرہ روپے فیس داخلہ۔ اس کے علاوہ کھیل کُود،

یونیفارم اور اسی قسم کے دیگر اخراجات تھے۔ لگ بھگ ڈیڑھ سو روپے کا نسخہ تھا۔ اسی وقت گھر گیا۔ روپے لایا اور اللہ کا نام لے کر ٹوٹو کو اسکول میں داخل کرا دیا۔

صوبیدار صاحب کی وردی اور تمغوں کے سامنے نہ میرا گریجویٹ ہونا کام آیا، نہ ڈبل ٹیچری۔ ٹوٹو کا داخلہ اس قدر آسانی سے ہو گیا کہ میں ششدر رہ گیا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر بااثر اور کام کے آدمی تھے۔

اب صبح ہی صبح گھر کے سامنے سنٹ پیٹرز اسکول کی بس ہارن بجاتی۔ پڑوسیوں پر بڑا رعب پڑتا۔ ٹوٹو میاں کندھے پر خوبصورت بستہ لٹکائے، جھومتے جھامتے گھر سے نکلتے اور بس میں بیٹھ کر اسکول روانہ ہو جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی اُسے اسکول جاتے دیکھتے تو خوشی سے سیروں خون بڑھ جاتا۔ دروازے سے لگے اسکول کی بس جاتے ہوئے دور تک دیکھتے رہتے۔

دوسرا مہینہ شروع ہوا تو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ٹوٹو کی تعلیم کے اسّی روپے ماہانہ یعنی تیس روپے ٹیوشن فیس اور پچاس روپے بس کا کرایہ، گھر کے اخراجات کی کس مد سے نکال کر مہیا کئے جائیں۔ پنشن کی آمدنی تھی۔ جتنی ماہانہ یافت تھی، خرچ اس سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ کسی نہ کسی طرح غریبانہ مگر شستہ گذر بسر ہو رہی تھی۔ سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بچت کا یہ طریقہ نکالا۔ روزانہ گھر سے اسکول جاتے ہوئے دو کے بجائے ایک روپیہ جیب میں ڈال کر نکلتا۔ صبح بس سے جاتا۔ اس لیے کہ وقت پر اسکول پہنچنا ضروری تھا۔ تاخیر سے پہنچنا تو گرین وڈ مونٹیسوری اسکول کے پرنسپل آدھے دن کی تنخواہ کاٹ لیتے۔ ہیپی پیراڈائز اسکول بھی بس ہی سے جاتا۔ وہاں بھی مقررہ وقت پر پہنچنے کی سخت پابندی تھی۔ البتہ واپسی پر پیدل گھر آتا۔ وقت اپنا تھا، ٹانگیں اپنی تھیں، نہ کسی کا ڈر تھا نہ خوف۔

سگرٹوں کی تعداد بھی کم کر دی اور سستے برانڈ کے سگریٹ پینے لگا۔ کرتا بھی کیا ایک روپے یومیہ جیب خرچ میں سستی اور گھٹیا ہی سگریٹ پی سکتا تھا۔ صرف کم کرنے کا دوسرا نسخہ یہ آزمایا کہ صبح جو عورت برتن دھونے آتی تھی اسے علیحدہ کر دیا، حالانکہ بیوی نے احتجاج کیا، اپنی مجبوری کا رونا رویا۔ کہنے لگی "میں ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالتی ہوں، تو چھوٹے بچے کا سینہ جکڑ جاتا ہے۔ نمونیہ ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ جتنی بچت نہ ہو گی اس سے زیادہ دوا دارو پر خرچ ہو جائے گا۔"

لہٰذا یہ ذمہ داری مجھے اپنے سر لینا پڑی مگر اس کفایت شعاری سے بھی کام نہ چلا۔ نظر کپڑوں کی دھلائی کی طرف گئی۔ طے کیا گیا کہ صرف بڑے کپڑے دھوبی کو دیئے جائیں۔ بچوں کے کپڑے گھر ہی پر دھوئے جائیں۔ کچھ اس طرح بچت ہوئی۔ گھی ہر مہینے تین سیر خرچ ہوتا تھا، دو سیر کر دیا گیا۔ دودھ سیر بھر کے بجائے تین پاؤ آنے لگا۔ گھر میں سوا درجن ۶۰ کینڈل پاور کے جتنے بلب لگے تھے سب اُتار لیے گئے اور پچیس کینڈل پاور کے لگا دیئے گئے۔ اس طرح گھر کا بجٹ از سرِ نو تیار ہوا اور ٹوٹو کی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کی سبیل نکلی۔

ٹوٹو میاں روز اُجلی یونیفارم پہنے، آڑی مانگ نکالے، ٹھاٹھ سے اسکول جاتے۔ میں تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر

رات کے برتن صاف کرنا، بچوں کے کپڑے دھونا، مزے سے بگلا مارکہ سگریٹ پینا اور دوسروں کو تلقین کرنا کہ یہی سگریٹ پیا کرو۔ کم خرچ بالانشیں۔ نہ گلا پکڑتا ہے، نہ کش لگاتے وقت ٹھسکا لگتا ہے۔

ایک سال اسی طرح لشتم پشتم گذر گیا۔ نہ پوچھئے اس عرصہ میں کیا کیا جتن کرنا پڑے، کس کس طرح خواہشات کا گلا گھونٹ کر ٹوٹو کی تعلیم کے اخراجات پورے کئے۔ اسّی روپے تو ہر مہینے بہرحال دینے ہی پڑتے۔ اس کے علاوہ کبھی بک نک کا چندہ جاتا، کبھی میجک شو کا، کبھی سالانہ تقریب کا۔ کبھی اس کا کبھی اُس کا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی چکر چلتا طرح طرح کے مطالبات ہوتے اور ہر مطالبہ پورا بھی کرنا پڑتا۔

دوسرے سال ٹوٹو کا چھوٹا بھائی فی فی بھی بقول میری بیوی کے پانچویں سال میں لگ گیا۔ اسے بھی اسکول میں داخل کرانے کا سوال سامنے آیا۔ ایک بار پھر صوبیدار صاحب کا دامن پکڑا۔ اُن کے ہمراہ سنٹ پیٹرز اسکول کے پرنسپل کے پاس پہنچا۔ صوبیدار صاحب خاکی وردی پہنے، تمغوں سے سینہ سجائے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ فوجی بوٹوں کی ایڑیاں ایک دوسرے سے ملائیں اٹینشن ہوتے، ایک ہاتھ اُٹھا کر کھٹاک سے سلیوٹ کیا اور کھٹاک سے فی فی کو بھی داخل مل گیا، میں نے اسکول سے باہر نکلتے ہی فرطِ عقیدت سے صوبیدار صاحب کا ہاتھ چوم لیا۔

اب میں سگریٹ کے بجائے چاند تارا مارکہ بیڑی پینے لگا۔ اسکول بھی پیدل جاتا۔ واپس تو سال بھر سے پیدل ہی آتا تھا اور اس کا عادی بھی ہو چکا تھا۔ گوشت ہفتہ میں صرف ایک بار آتا۔ دالوں اور سبزیوں پر گزارہ ہوتا۔ بناسپتی گھی کے بجائے سرسوں کا تیل استعمال ہونے لگا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کر دیا گیا۔۔۔ دودھ آدھ سیر آتا۔ پانی میں ملاوٹ کے باوجود اس میں اور پانی ڈال کر مقدار پوری کی جاتی۔ بجلی کے بلب صرف مہمانوں کی آمد پر روشن کئے جاتے۔ ورنہ اپنا کام تو لالٹین سے چل جاتا تھا۔ مہینہ میں ایک بار بیوی بچوں کے ساتھ کوئی فلم ضرور دیکھتا تھا۔ اس سے بھی توبہ کر لی۔

کرتا بھی کیا ٹوٹو کے ساتھ فی فی کی فیس اور طرح طرح کے چندوں کی صورت میں لگ بھگ دو سو روپے ماہانہ پابندی سے ادا کرنا پڑتا۔ ٹوٹو اب کے جی سے پہلی میں آگیا تھا۔ لہٰذا اس کی فیس میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور میری آمدنی دو سو روپے کم ہو گئی تھی۔ تنخواہ میں صرف دس روپے اضافہ ہوا تھا۔ وہ بھی ہیپی پیرا ڈائز اسکول کے مالک یا پرنسپل نے اپنے منجھلے بیٹے کے انجینئر بن جانے کی خوشی میں کیا تھا۔

البتہ تیسرے بچے کوکب کا اسکول میں داخلہ مجھے گراں نہیں گذرا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ چونکہ تینوں بھائی ایک ہی سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ لہٰذا ایک کی فیس معاف ہو گئی۔ اس میں بھی صوبیدار صاحب کی کوشش کو بڑا دخل تھا۔ کوکب کو داخل کرانے میں بھی انھوں نے ہی دست گیری کی تھی۔ اب وہ اس دُنیا میں نہیں رہے، اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ میرے لیے تو وہ رحمت کا فرشتہ تھے۔ ان کی وردی میں عجب تاثیر تھی۔ اِدھر اُنھوں نے اٹینشن ہو کر پرنسپل کے سامنے سلیوٹ مارا اُدھر غیب سے آواز آئی کھل جا سم سم! سنٹ پیٹرز اسکول کا دروازہ اس طرح پاٹوں پاٹ کھل جاتا

کہ میرا ہر بچہ بے دھڑک اندر داخل ہو جاتا۔ کسی میں اتنی مجال نہ تھی کہ اُسے داخلہ دینے اور تعلیم حاصل کرنے سے روکے۔

(۳)

میرے تینوں بچے ذہین اور ہونہار تھے۔ ہر سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے اور نیچے سے اُوپر کے درجوں میں پہنچتے رہے۔ ان کی فیسیں اور چندے بھی بڑھ کر اُوپر اور اُوپر پہنچتے رہے۔ مگر میں ترقی کر کے اُوپر نہ جا سکا جہاں تھا وہیں جما رہا۔ اخراجات بڑھے۔ مہنگائی بڑھی اور تیزی سے بڑھی اور میری تنخواہ اس طرح بڑھی، جیسے آٹے میں نمک۔ لہٰذا دُودھ بند کر دیا، گھی بند کر دیا، گوشت بند کر دیا۔ بیڑی پینا بھی چھوڑ دی اور صرف حُقہ گڑگڑانے لگا۔ رکشا اور بس کا سفر بھی چھوٹ گیا۔ میں سڑکوں پر جُوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ ملنے جُلنے والوں کو نصیحت کرتا، پیدل چلو، جان بناؤ اور ڈاکٹروں کے چکّر سے محفوظ رہو۔ نہ بیماری کا ڈر، نہ علاج معالجہ کی فکر۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ مزید بحث کے لیے کھانا دو وقت کے بجائے ایک وقت کر دیا جائے۔ اسی اثنا میں مجھے ایک نائٹ اسکول میں ملازمت مل گئی۔ ٹیچنگ کا کورس میں پہلے ہی مکمل کر چکا تھا، اور ایک سیکنڈ ہینڈ ٹائپ رائٹر بھی خرید لی تھی۔ چنانچہ نائٹ اسکول سے فارغ ہوتا تو آدھی رات تک بعض وکیلوں کی قانونی دستاویزات ٹائپ کرنے کا کام انجام دیتا۔ سویرے ہی سویرے گھر سے نکلتا، رات کے گیارہ بجے واپس آتا۔ اور بارہ بجے تک بلکہ اکثر و بیشتر رات کے پچھلے پہر تک ٹائپ رائٹر پر کھٹ پٹ کرتا رہتا۔

لیکن یہ محنت شاقہ ذرا نہ کھلتی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرے یہ تینوں بچے اعلیٰ اور معیاری اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کا مستقبل روشن تھا اور میں ان کے روشن مستقبل میں اپنا مستقبل روشن اور تابناک دیکھ رہا تھا۔ اب اُن سے میری مُلاقات اتوار کے اتوار ہوتی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جس وقت میں گھر سے نکلتا وہ سوئے ہوتے اور جب واپس آتا تو وہ اپنے بستروں پر گہری نیند سو چکے ہوتے۔

آمدنی میری اب اتنی ہو گئی تھی کہ کسی نہ کسی طور گزر بسر ہو رہی تھی نہ کسی کا قرض تھا نہ اُدھار۔ مگر مسلسل شب بیداری کے باعث ایک بُری عادت یہ پڑ گئی تھی کہ کلاس میں اکثر کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عادت ہیپی پیراڈائز اسکول سے پڑی تھی۔ اسکول میں جب جی چاہتا اُٹھ کر چلا جاتا۔ بغیر درخواست دیئے چھٹی کرتا، طبیعت راغب ہوئی تو سبق پڑھا دیتا۔ ورنہ میز پر ٹانگیں پھیلائیں، آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ اسکول کے پرنسپل سید انور علی، جو منتظم اعلیٰ بھی تھے، دوسرے ہی بکھیڑوں میں اُلجھے ہوتے تھے۔ بہت کم اسکول آتے اور جب آتے تو گھڑی دو گھڑی سے زیادہ اپنے دفتر میں نہ ٹھیرتے، کلاسوں کی طرف رُخ ہی نہ کرتے۔

ان دنوں وہ سخت مصروف نظر آتے۔ اس مصروفیت کی نوعیت یہ تھی کہ اُنھیں اچانک علامہ اقبالؒ کے افکار سے عشق ہو گیا اور اس کا مظاہرہ پہلے پہل اس طرح دیکھنے میں آیا کہ ایک روز اُنھوں نے تمام اساتذہ کی میٹنگ بُلائی، ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر فرمائی، جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی تعلیمات اور اپنے افکار سے کس طرح

اسلام کو سربلند کیا۔ اپنی شاعری سے برِصغیر کے مسلمانوں کو کیونکر خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ اُنھیں وہ عزم اور حوصلہ دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے پاکستان کی صورت میں موجود ہے۔ پرنسپل صاحب نے اساتذہ پر زور دیا کہ وہ نئی نسل کو اقبالؒ کے افکار سے اس طرح لیس کریں کہ آگے چل کر وہ ملک و قوم کی خدمت کا فرض خلوص اور ذمہ داری سے انجام دیں۔

اُن کے ارشادات پر دوسرے ہی روز سے عمل درآمد بھی شروع ہوگیا۔ یہ نہایت رُوح پرور منظر تھا ہیپی پیراڈائز کے طلباء جھوم جھوم کر نہایت والہانہ انداز میں اقبالؒ کی مشہور نظم "دعا" ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ پھر تو یہ معمول ہوگیا کہ ہر صبح کورس میں یہ نظم گائی جاتی، حالانکہ انگلش میڈیم اسکول کے لیے جہاں "بابا، بابا بلیک شیپ"، "ٹونکل، ٹونکل لٹل اسٹار" یا اسی قبیل کی دوسری انگریزی نظموں کا رواج عام ہے، یہ قطعی نئی بات تھی۔ مگر پرنسپل صاحب مطمئن تھے اور نہایت فخر سے فرماتے تھے کہ اُنھوں نے ایک صحت مند اسلامی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔

علامہ اقبالؒ کے ساتھ اُن کا والہانہ عشق اس قدر بڑھا کہ یومِ اقبالؒ پر نہایت اہتمام سے ایک جلسہ منعقد کیا۔ شمالی ناظم آباد کے ایک کھلے میدان میں شاندار پنڈال لگایا گیا۔ جلسہ کے لیے مہمانِ خصوصی کے طور پر کمشنر کو بُلایا گیا۔ اُنھیں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، وہ حسبِ معمول اس ناچیز نے لکھا۔ پرنسپل صاحب کی ہدایات پر اس میں بار بار ترمیم کی گئی۔ جلسہ کی کارروائی تلاوتِ کلامِ پاک سے شروع ہوئی۔ پرنسپل صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا۔ جس میں علامہ اقبالؒ کے افکار اور ان کی تعلیمات کو عوام میں پھیلانے اور فروغ دینے کے لیے "اقبالؒ میموریل لائبریری" قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ لائبریری کے قیام کے لیے کمشنر سے جگہ مہیا کرنے کی اپیل کی گئی۔ جس میدان میں جلسہ منعقد ہوا تھا وہ دراصل دو ہزار سے بھی زیادہ مربع گز پر مشتمل ایک کمیونٹی پلاٹ تھا۔ یہ پلاٹ پبلک لائبریری کے لیے مختص تھا۔ سپاسنامہ میں کمشنر صاحب بہادر کی خدماتِ جلیلہ کا ایسا شاندار قصیدہ تھا کہ وہ پھڑک اُٹھے۔ درباداری اور خوشامد کے عادی افسر تھے۔ سپاسنامہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت پلاٹ کے الاٹمنٹ کے احکامات جاری کر دیئے۔

"انجمن محبانِ اقبالؒ" کے نام سے پہلے ہی ایک تنظیم قائم ہو چکی تھی۔ جلسہ بھی اسی کے زیرِ اہتمام ہوا تھا۔ انجمن کے تاحیات صدر، ہیپی پیراڈائز اسکول کے پرنسپل سید انور علی تھے۔ ارکان میں ان کے چار بیٹے، دو بھتیجے اور ایک بھانجے شامل تھے۔ سید انور علی جوڑ توڑ والے آدمی تھے۔ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی یعنی کے، ڈی، اے کے حکام کو کھلا پلا کر وہ پہلے ہی رام کر چکے تھے لہٰذا جلد ہی ضروری خانہ پُری مکمل ہوگئی۔ اور پلاٹ کا الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ الاٹمنٹ ملتے ہی چار دیواری بنائی گئی اور "اقبال میموریل لائبریری" کا بورڈ بھی آویزاں کر دیا گیا۔ سید انور علی نے لائبریری کی عمارت کی تعمیر کے لیے بھاگ دوڑ کی۔ سرکاری گرانٹ کے علاوہ مخیر صنعت کاروں اور دوسرے اہلِ ثروت سے چندہ حاصل کیا۔ اس فنڈ سے عمارت کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ ان دنوں وہ عمارت کی تعمیر میں اس قدر انہماک اور سرگرمی سے مصروف تھے کہ ہیپی پیراڈائز اسکول کی طرف توجہ دینے کے لیے بھی ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

ذکر تھا میری اس بُری عادت کا، جس کے باعث میں اکثر کلاس میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا تھا۔ گرین وُڈ کے پرنسپل کی خصوصیات تو میں بیان ہی کر چکا ہوں۔ اُنھوں نے کئی بار مجھے غنودگی کے عالم میں دیکھ لیا۔ سخت برہم ہوئے۔ طلباء

کے سامنے بے عزت بھی کیا۔ لیکن ایک روز تو انھوں نے حد کر دی۔ میں طلبا کو سبق دے کر حسبِ عادت کرسی پر سو گیا۔ اسی اثنا میں پرنسپل صاحب وارد ہوئے۔ بنیادی طور پر تو وہ روئی کے آڑھتی ہی تھے۔ غصہ ضبط نہ کر سکے۔ کان پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ حواس باختہ ہو کر آنکھ کھولی۔ دیکھا، کلاس کے تمام طلبا قہقہے لگا رہے تھے اور پرنسپل صاحب فرشتۂ اجل کی مانند سر پر کھڑے نہایت قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

ڈپٹ کر بولے "اس دفعہ تو میں نے چھوڑ دیا۔ آئندہ کلاس میں سوتے ہوئے پایا تو اسی روز نوکری سے برخاست کر دوں گا۔"

وہ ڈانٹ پھٹکار کر چلے گئے۔ بڑی کرکری ہوئی۔ طلبا سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر نہ میری شب بیداری میں فرق آیا اور نہ نیند نے مجھ پر رحم کھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ بعد کلاس میں سوتے ہوئے پھر پکڑا گیا۔ پرنسپل صاحب اس قدر غضب ناک ہوئے کہ مجھے زور سے دروازے کی جانب دھکا دیا۔ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔ اسی وقت تنخواہ کی رقم ہاتھ میں رکھ کر، اسکول سے چلتا کیا۔

گرین وڈ اسکول کی ملازمت ختم ہو جانے کا مجھے شدید صدمہ ہوا۔ سو روپے ماہانہ آمدنی کا ایک لخت بند ہو جانا معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں ہیپی پیراڈائز اسکول کے مالک اور پرنسپل کی جانب نظریں اٹھیں، چاہا کہ ان سے مدد حاصل کی جائے۔ اپنی پریشان حالی بیان کی جائے۔ اور اس کی بنیاد پر تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی جائے۔ ان دنوں وہ خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار تھے اور علامہ اقبالؒ کی تعلیمات سے شدت کے ساتھ متاثر تھے۔ لہٰذا توقع پیدا ہوئی کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ مدد فرمائیں گے۔

یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ وہ اسکول میں بہت کم آتے تھے۔ مگر جتنی بار آئے، ہر بار میں نے اُن سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس قدر عجلت میں آتے اور اتنے کم وقت کے لیے آتے کہ ملاقات بھی ہوئی تو بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک روز ہمت کی۔ اقبال میموریل لائبریری پہنچا۔ سید انور علی اُس وقت اپنے دفتر میں تھے اور تنہا بھی تھے۔ لائبریری کی پہلی منزل کی تعمیر کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ بہت بڑی عمارت تھی۔ بارہ کمرے تھے۔ کشادہ اور طویل ہال تھا۔ برآمدے تھے، راہداریاں تھیں، وسیع لان تھا، غرضیکہ سب ہی کچھ تھا۔

انور علی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مسکرا کر پوچھا۔ "آج اِدھر کیسے نکل آئے؟"

"لائبریری دیکھنے آیا تھا۔" میں نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے عرض کیا۔ "بہت شاندار لائبریری ہے۔ واقعی آپ نے بہت بڑا کام کیا۔"

خوش ہو کر بولے "میں نے اس کے لیے کتنی جانفشانی کی ہے، اس کے بارے میں اپنی زبان سے کیا بتاؤں، سب کچھ تمھارے سامنے ہے۔" وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ٹھنڈی سانس بھری "چاہتا ہوں زندگی میں ملک و قوم کے لیے ایسا کام کر جاؤں کہ آنے والی نسلوں کی قسمت بدل جائے۔"

میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ بہت قابلِ قدر جذبہ ہے۔ لوگ تو صرف باتیں کرتے ہیں، آپ نے کر کے دکھا دیا۔"

کہنے لگے "علامہ اقبالؒ کا پاکستان پر احسان ہے۔ اسے ہم ان کی ایسی ہی یادگاروں کے ذریعہ چکا سکتے ہیں۔"

وہ اقبالیات پر باقاعدہ درس دینے لگے اور میں کان دبائے سنتا رہا۔ ان کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ انھوں نے علامہ اقبالؒ کے بارے میں دو چار کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ کچھ اشعار بھی ازبر کر لیے تھے جنھیں وہ اس طرح سناتے کہ مفہوم خبط ہو جاتا۔ نظم پر نثر کا گمان ہوتا۔ فلسفہ خودی کی انھوں نے ایسی توجیہہ اور تشریح کی کہ وہ اقبالؒ کی فکر سے بھی زیادہ بلندی پر پرواز کرنے لگے۔

ان کا جوش و خروش ذرا ٹھنڈا پڑا، تو میں حرفِ مطلب پر آیا۔ "آپ کو شاید علم نہیں۔ مجھے گرین مڈ اسکول سے علٰحدہ کر دیا گیا ہے۔"

اظہارِ ہمدردی کے بجائے چہک کر بولے "یہ بھی اچھا ہی ہوا، تم کو اس واہیات اسکول سے نجات مل گئی۔ اماں وہ بھی اسکول ہے اور اس کا مالک تو صورت سے کان میلیا نظر آتا ہے۔ اس قدر اَن پڑھ اور جاہل ہے کہ اسکول چلانے کے بجائے اسے گدھا گاڑی چلانی چاہیے۔"

"درست فرمایا آپ نے،" میں نے ان کی تائید کی۔ "میں تو بدرجۂ مجبوری وہاں پڑھا رہا تھا۔ مگر اس اسکول سے علٰحدہ ہونے کے بعد میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہوں، گذر بسر مشکل ہو گئی ہے۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔" انھوں نے نصیحت فرمائی اور میں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کھل کر بات کی۔ میں اس لیے بھی حاضر ہوا تھا کہ آپ سے درخواست کروں گا کہ میری تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے۔ آپ نے وعدہ بھی کیا تھا۔ میں نے لہجے میں عاجزی اور رقت پیدا کی۔ "آپ سے بتا نہیں سکتا کس قدر پریشانی میں پڑ گیا ہوں۔"

"فی الحال تو بھئی میں کچھ نہیں کر سکتا۔" انھوں نے ٹکا سا جواب دیا۔

میں اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

مجھے خاموش اور منفعل دیکھ کر انھوں نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ کسی قدر نرم لہجے میں بولے "کچھ دن صبر کر لو۔ پھر نہ صرف تمھاری تنخواہ بڑھا دوں گا، بلکہ اور بھی بہت کچھ دوں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ تم نہایت محنتی ٹیچر ہو۔" وہ زیرِ لب مسکرائے۔ "یہ عمارت تو تم نے دیکھی ہے۔ لائبریری کے لیے کہاں اتنے کمروں کی ضرورت پڑے گی، اس کے لیے دو کمرے کافی ہوں گے۔" ان کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ "بقیہ عمارت تو اپنے اسکول کے کام آئے گی۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ گئے نا؟"

میں ان کی بات کا مطلب بالکل سمجھ گیا اور علامہ اقبالؒ سے ان کے عشق کا راز بھی اس طرح عیاں ہو گیا کہ چاروں طبق روشن ہو گئے۔ انھوں نے چھپانے کی کوشش بھی نہ کی۔ صاف گوئی سے کام لیا۔ "ابھی تو علامہ اقبالؒ کے بارے میں مہینے کے مہینے جلسے ہو رہے ہیں۔ لیکن ہر مہینے حاضرین کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب بالکل ختم ہو جائے گی تو میں اسکول اس عمارت میں منتقل کر دوں گا۔"

"نام تو علامہ اقبال ہی کے تعلق سے رکھا جائے گا" میں نے قیاس آرائی کی۔

اُنھوں نے میری بات کو پسند نہ کیا۔ قدرے تیکھے لہجے میں بولے "اِن کے نام پر لائبریری تو موجود ہی ہے ویسے بھی ان کے نام پر اسکول، کالج، ادارے، انجمنیں، سڑکیں، اسپتال، کیا نہیں ہے؟ انھوں نے مجھے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ "اسکول کا نام تو میں فہیم چلڈرن اکیڈمی رکھوں گا" نام کی وضاحت بھی خود ہی فرمائی۔ فہیم میرا چھوٹا بیٹا ہے۔ کیا بتاؤں کتنا ہونہار ہے۔ اقبالؒ سے تو بس پوچھو نہیں اسے کتنی محبت ہے۔ ویسے بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی پود کو اقبالؒ کی عظمت سے باخبر رکھا جائے۔ اور میں یہی کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ آپ یقین جانیں، میں نے اپنی پریشان حالی ایک بار پھر بیان کرنا چاہی، مگر اُنھوں نے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ صرف وعدہ فردا پر ٹرخا دیا۔ کہنے لگے "بھئی سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میں خود پریشان ہوں۔ مگر اسکول اِدھر منتقل ہوتے ہی تمھاری تنخواہ فوراً بڑھا دوں گا۔ تم محنت سے پڑھاتے رہو۔ میں تمھارا پورا پورا خیال رکھوں گا۔"

مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ ان کا شکریہ ادا کیا، اُٹھا اور واپس ہیپی پیراڈائز اسکول آگیا۔

سید انور علی کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد میں نے ملازمت کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی۔ اسی عالم میں ایک مہینہ گذر گیا، دوسرا بھی کسی نہ کسی طور کٹ گیا۔ ملازمت کی تلاش میں اسکولوں اور دفتروں کے چکر کاٹ ہی رہا تھا کہ بچوں کی فیس جمع کرانے کا وقت آگیا۔ اب میں قلاش ہو چکا تھا۔ کئی روز تک فیس کی رقم مہیا کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی۔

فیس بروقت نہ پہنچی تو حسبِ دستور جرمانہ لگا اور بچوں کو کلاس میں خفت بھی اُٹھانی پڑی۔ انہی دنوں کا ذکر ہے جس کلاس کا میں کلاس ٹیچر تھا، اس کے طلباء کی فیس ہنوز میری ہی تحویل میں تھی۔ اکاؤنٹنٹ رخصت پر تھا فیس کی پوری رقم میں گھر لے آیا۔ بچوں نے بار بار فیس کا تقاضا کیا۔ میں نے پریشان ہو کر سوچا، اس رقم میں سے بچوں کی فیس دے دوں، چند روز میں نائٹ اسکول سے تنخواہ مل جائے گی رقم پوری کر کے اکاؤنٹنٹ کے پاس جمع کرا دوں گا۔ یہی سوچ کر میں نے بچوں کو فیس دے دی۔

مگر نائٹ اسکول کا انتظام، خیراتی اسپتال کی مانند تھا۔ تنخواہ کا معاملہ آج اور کل پر ٹلتا رہا۔ غلطی یہ ہوئی بعض گھریلو ضروریات کے لیے بھی فیس کی رقم میں سے خرچ کرتا رہا۔ ایک تہائی سے بھی زیادہ رقم کم ہو گئی۔ سوچا اسکول جاؤں گا تو تقاضہ ہوگا۔ لہٰذا ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی۔ ہفتہ گزر گیا۔ مگر رقم پوری ہونے کے بجائے اور کم ہو گئی۔ نائٹ اسکول سے تنخواہ ہی نہ ملی۔ مل بھی جاتی تب بھی کمی پوری نہ ہوتی۔

دو بار ہیپی پیراڈائز اسکول کا چپڑاسی میرے گھر آیا اور ہر بار اس سے نہ ملا۔ گھر میں چھپا بیٹھا رہا۔ میری مسلسل غیر حاضری نے پرنسپل صاحب کو سخت برگشتہ کر دیا۔ اُنھوں نے میرے خلاف پولیس میں رپٹ درج کرا دی۔ رات گئے میں نائٹ اسکول

سے واپس ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں، دروازے پر پولیس موجود تھی۔ گھر کے اندر جا کر بیوی بچوں کی صورت دیکھنا بھی نصیب نہ ہوئی، اسی وقت حراست میں لے لیا گیا اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔

پولیس نے غبن اور دھوکہ دہی کے الزام میں میرے خلاف مقدمہ قائم کیا اور عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ نہ فیس کی رقم پوری کرنے کا کوئی وسیلہ تھا نہ کوئی مقدمے کی پیروی کرنے والا تھا۔ لہٰذا ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ میری بیوی بیچاری روتی دھوتی ہیلپی پیراڈائز اسکول کے مالک سید انور علی کے پاس بار بار گئی، گڑگڑائی، آہ وزاری کی، مگر ان کا دل نہ پسیجا۔ ان کے پاس دل تھا ہی کہاں تھا۔ وہ تو ننانوے کے پھیر میں الجھا ہوا تھا۔

کئی ماہ تک مقدمہ چلتا رہا، پیشیاں پڑتی رہیں۔ استغاثہ کے پاس گواہ بھی تھے اور ثبوت بھی موجود تھا۔ عدالت نے خورد برد کرنے کے جرم میں ایک سال قید بامشقت کے ساتھ ساتھ پانچ سو روپے جرمانہ بھی عائد کیا۔ جرمانہ ادا کرنے کی توفیق نہ تھی لہٰذا مزید تین ماہ کی قید کاٹنی پڑی۔ جیل میں کیسے گذری، یہ سن کر کیا کیجیے گا۔ وہ ایک علیحدہ داستان ہے، المناک ہے اور عبرتناک بھی۔

(۴)

جیل سے رہا ہو کر گھر آیا۔ دیکھا تینوں بچے طاعون زدہ چوہوں کی طرح مرگھلے ہو گئے تھے۔ چہرے مرجھا کر مٹیالے پڑ گئے تھے۔ بیوی کے پاس زیورات کی صورت میں جو ٹوم چھلا تھا وہ بک کر پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ گھر کے اخراجات کچھ عرصے تک برتن بھانڈے اور گرہستی کا دوسرا سامان بیچ کر پورے کیے گئے۔ بیوی نے پڑوسیوں کے کپڑوں کی سلائی شروع کر دی۔ سلائی سے اتنی یافت بھی نہ ہوتی کہ گذر بسر ہو سکے۔ اکثر فاقہ پڑتا۔ بچوں کے جسم پر لباس کے بجائے چیتھڑے رہ گئے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی تعلیم کیسے جاری رہ سکتی تھی۔ وہ ان کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی، بات بات پر روتی۔ جیل میں ملاقات کے دن مجھ سے ملنے آتی تو اس کی حالت زار مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ بھی آنسو بہاتی۔ میں بھی روتا، اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، جسم لاغر اور کمزور پڑ گیا تھا۔ روتے روتے بینائی بھی کم ہو گئی تھی۔

اس قدر بدنام اور رسوا ہو چکا تھا کہ کسی اسکول میں ملازمت ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا مدرسی کو خیرباد کہا۔ ٹائپنگ کا پیشہ اختیار کیا۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد ایک معمولی فرم میں سوا سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ مگر وہاں تنخواہ کئی کئی ماہ نہ ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر ٹائپسٹ نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ ملازمت مل جانے کے باوجود کپڑوں کی سلائی پر گزارہ تھا۔

میں نے نوکری نہ چھوڑی۔ البتہ دوسری کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ ایک روز اقبال میموریل لائبریری کے سامنے سے گزرا، حیرت سے دیکھا۔ پھاٹک کے اوپر "یتیم چلڈرن اکیڈمی" کا اتنا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا کہ دور سے صاف نظر آتا۔ مگر اقبال میموریل لائبریری کا بورڈ کہیں نظر نہ آیا۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک گوشہ میں چھوٹا سا بورڈ دکھائی دیا۔ اس پر دھندلے حروف میں "اقبال میموریل لائبریری" لکھا تھا۔ میں بورڈ کی عبارت پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عین اس وقت اسکول کے بڑے پھاٹک سے ایک چمکتی دمکتی کار برآمد ہوئی۔ اس میں سید انور علی نہایت شان سے براجمان تھے۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی

زن سے میرے قریب سے گزر گئی۔

فرم کی ملازمت برائے نام تھی لہٰذا ایک ہوٹل میں رات کو بیرا گیری کرنے لگا۔ یہ ہوٹل نائٹ کلب بھی تھا۔ شام ہوتے ہی زندگی کے ہنگامے بیدار ہونے اور آدھی رات تک جاری رہتے۔ شراب کا دور چلتا۔ ارکسٹرا کی تیز مغربی دھنوں پر ملکی اور غیر ملکی رقاصائیں ایسے اشتعال انگیز عریاں اور نیم عریاں رقص پیش کرتیں کہ پسینہ آجاتا۔ مگر اس ہوٹل کی نوکری میں ایک فائدہ ضرور تھا۔ تنخواہ تو بہت کم تھی، مگر بخشش کی صورت میں اچھی خاصی یافت ہو جاتی۔ بچا کھچا کھانا بھی مل جاتا۔ جان پہچان یا پاس پڑوس کا کوئی نظر نہ آتا۔ روزگار سے بھی لگا ہوا تھا، اور محلہ میں سفید پوشی کا بھرم بھی قائم تھا۔ البتہ ایک رات، ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ یہ سید انور علی کا چھوٹا بیٹا فہیم تھا۔ یہ اُن کا وہی بیٹا تھا جسے علامہ اقبال سے اس قدر محبت تھی کہ اس سے متاثر ہو کر سید انور علی نے پہلے اقبال میموریل لائبریری قائم کی اور پھر فہیم چلڈرن اکیڈمی کے نام سے نیا اسکول کھولا تھا۔ وہ اس وقت نشہ میں دھت تھا اور ایک مصری کیبرے ڈانسر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ فحش اور رسوا کن حرکات کا دھڑلے سے مظاہرہ کر رہا تھا۔

اُدھر میرے تینوں بچوں کا حال یہ تھا کہ دن بھر گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ اودھم دھاڑ مچاتے، کشتم کشتا کرتے، لڑائی جھگڑے کرتے، آئے دن محلے والے میرے پاس آتے اور ان کے خلاف شکایتیں کرتے۔ آخر ایک پڑوسی کے مشورے پر میں نے ٹوٹو کو موٹر مکینک کا کام سیکھنے کی غرض سے ایک ورکشاپ میں لگا دیا۔ فی فی اور رکو کب چھوٹے تھے۔ لہٰذا فی الحال انھیں اودھم دھاڑ مچانے کے لیے چھوڑ دیا۔

سوچا تھا ٹوٹو کچھ عرصہ بعد کام سیکھ لے گا۔ اس کی تنخواہ مقرر ہو جائے گی۔ کچھ مالی امداد کی سبیل پیدا ہو جائے گی لیکن ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ وہ باورچی خانے کے ایک کونے میں دبکا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ غصہ تو بہت آیا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس میں اس کا کیا قصور تھا، یہ تو اس ماحول کا اثر تھا، جس میں وہ ان دنوں رہتا تھا، ورنہ یہ وہی بچہ تھا، جو ہر روز سویرے ہی سویرے بیدار ہوتا تھا، منہ ہاتھ دھوتا تھا، برش سے دانت صاف کرتا تھا اور اُجلی یونیفارم پہن کر کندھے پر بستہ لٹکائے، ہنستا مسکراتا اس شان سے سکول جاتا تھا کہ بقول میری بیوی کے کسی بڑے گھر کا بچہ نظر آتا تھا۔

میں نے اسی روز ٹوٹو کو ورکشاپ جانے سے روک لیا۔ موٹر مکینک بنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور چند ہی روز بعد ایک پرچون کی دکان پر بٹھا دیا۔ ٹوٹو پابندی سے صبح ہی صبح دکان پر چلا جاتا۔ دو ڈھائی مہینے بعد ایک شام دفتر سے لوٹتے ہوئے میں دکان کے مالک شیخ حمید کے پاس پہنچا۔ سوچا کہ ٹوٹو اب تک کام سیکھ گیا ہوگا۔ اس کی کچھ تنخواہ لگنا چاہیئے۔ شیخ حمید کے پاس اسی ارادے سے گیا تھا۔ دکان پر پہنچا۔ شیخ حمید سے ملا تو یہ عقدہ کھلا کہ ٹوٹو تو کئی روز سے دکان پر نہیں گیا تھا۔ میں بہت چکرایا۔ چکرانے کی بات ہی تھی۔ ٹوٹو میرے سامنے صبح دکان پر جاتا تھا اور رات کو گھر واپس آتا تھا۔

گمان گذرا کہ شاید گھر پر موجود ہو۔ کہیں کھیل کود میں بچوں کے ساتھ لگ گیا ہوگا، اس لیے دکان نہ پہنچا۔ خاموشی سے گھر واپس آیا۔ بیوی سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ٹوٹو تو حسب معمول سویرے ہی سویرے گھر سے نکل گیا تھا۔ مجھے غصہ بھی آیا دکھ بھی ہوا۔ میں ہوٹل بھی نہ گیا۔ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا مگر وہ رات گئے تک نہ لوٹا۔ غالباً اسے پتہ چل گیا تھا کہ

اس کی چوری پکڑی گئی۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح ہوگئی، سورج نکل آیا۔ دھوپ منڈیروں پر جھلملانے لگی، لیکن ٹوٹو کا کہیں پتہ نہ تھا۔

میں دفتر چلا گیا۔ لیکن ذہن اس قدر پراگندہ تھا کہ ٹائپنگ کرتے ہوئے بار بار غلطی ہوتی۔ شام کو گھر واپس پہنچا، دروازے سے داخل ہوتے ہی بیوی سے پہلا سوال ٹوٹو کے بارے میں کیا۔ مگر وہ اب تک نہ آیا تھا۔ ہوٹل گیا، وہاں دل نہ لگا۔ جلد ہی لوٹ آیا۔ آنکھیں ٹوٹو کو ڈھونڈتی تھیں اور اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔

دفتر سے چھٹی لی اور ٹوٹو کی تلاش میں دن بھر مارا مارا پھرتا رہا۔ کہیں اس کا سراغ نہ ملا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ اخبارات میں "تلاشِ گم شدہ" کا اشتہار چھپوایا۔ ریڈیو سے بھی گم شدگی کا بار بار اعلان کرایا مگر کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ ٹوٹو کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ بیٹے کی یاد میں ماں کا یہ حال ہوا کہ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ہر وقت مصلے پر بیٹھی سجدے پر سجدے کرتی، گڑگڑا، گڑگڑا کر دعائیں مانگتی، روتے روتے آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے۔ خود میرا عالم یہ تھا کہ بیوی کو تسلی دیتے دیتے بے ساختہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔

ہفتہ بھر سے بھی زائد عرصہ اسی عالم میں گزر گیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ لیکن ایک رکشا والے نے مشکل کشائی کی۔ اس نے ٹوٹو کے حلیہ کے ایک لڑکے کو زندہ پیر کے مزار پر دیکھا تھا۔ رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ میں اسی وقت ٹوٹو کی تلاش میں روانہ ہوا۔ ریلوے لائن کے اس پار اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا، زندہ پیر کی خانقاہ پہنچا۔

اس وقت خانقاہ کا عجب رنگ ڈھنگ تھا۔ ہر طرف شور اور ہنگامہ برپا تھا۔ نیم برہنہ، چیتھڑے لگائے ملنگ، ٹولیوں میں جگہ جگہ سلفہ پر دم لگا رہے تھے۔ فضا میں چرس کی بو رچی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دیکھا کہ ملنگوں کی ایک ٹولی کے ساتھ ٹوٹو میاں بیٹھا تھا۔ ہاں وہی تھا۔ لباس سڑے ہوئے چمڑے کی مانند گندہ اور غلیظ ہو گیا تھا۔ چہرہ خاک سے اٹا، بال وحشیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ دم بخود رہ گیا۔ بڑے دکھ کے ساتھ سوچا، کیا یہ وہی بچہ ہے۔ جس کا نام میں نے ایک خوبصورت ہسپانوی بچہ کی تصویر دیکھ کر لازیرو رکھا تھا جس کی شکل و شباہت اور طور طریقوں میں بڑے آدمیوں کی تمام علامتیں پائی جاتی تھیں۔ جو ہر صبح کندھے پر بھاری بھرکم بستہ لٹکائے جھوم جھوم کر چلتا ہوا اسکول جاتا تھا تو ماں باپ فخر سے ایک دوسرے کو یوں دیکھتے جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہے ہوں۔

"دیکھو، یہ میرا لعل ہے۔ میں اس کا باپ ہوں"

"دیکھو اسے میں نے جنا ہے۔ میں اس کی ماں ہوں"

آج وہ خوبصورت بچہ، لازیرو، وہ مستقبل کا بڑا آدمی جسے ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں اور ماہر تعلیم بنانے پر ماں باپ کے درمیان گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ان بن بھی ہو جاتی تھی۔ ملنگوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھا چرس پر دم لگا رہا تھا۔ نشہ سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ دھواں دھواں تھا اور وہ خود غلاظت کی پوٹ بن گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر جب میں نے جھپٹ کر اس کی گردن

دبوچ لی تو وہ زخمی پرندے کی طرح میرے قابو میں آگیا۔ میں غم و غصہ سے کانپ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ ٹوٹو کو گھرلایا۔ سوچا اب کیا کیا جائے۔ لیکن میں کچھ نہ کر سکا۔ خاموشی سے بستر پر جاکر بیٹھ گیا۔ البتہ ماں نے بڑھ کر اُسے سینے سے لگایا، اور بلک بلک کر رونے لگی۔ جب دل کا غبار ذرا کم ہوا، تو اسے چمکارا۔ دل جوئی کی۔ منہ ہاتھ دھلایا، کھانا لاکر سامنے رکھا۔

مگر ٹوٹو نے کھانا نہ کھایا۔ جھنجھلا کر ٹھوکر ماری۔ کھانے کی پلیٹ دُور جاکر گری۔ ماں کو ذرا بھی غصہ نہ آیا وہ پھر بھی اُسے پیار سے چمکارتی رہی۔ روٹی کا نوالہ بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ یہ نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ ہر دونوں نے بچپن ہی سے ٹوٹو کی ایسی ہر ضد ہنس ہنس کر برداشت کی تھی، لیکن اس وقت تو وہ چرس کے نشے میں جھوم رہا تھا۔ ماں چمکارتی تو وہ ایسی خونخوار نظروں سے گھورتا، جیسے کھا جائے گا۔ وہ جس قدر لاڈ پیار کا مظاہرہ کر رہی تھی، وہ اسی قدر سرکشی پر اُتر آیا تھا۔ بار بار نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔

میں خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ٹوٹو نے ایک بار پھر سالن کی پلیٹ پر لات ماری۔ پلیٹ لڑھکتی ہوئی دُور چلی گئی۔ فرش پر سالن پھیل گیا۔ اس کی سرکشی اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ میں تڑپ کر اُٹھا۔ بستر بند کا تسمہ نکالا اور سڑاک سے ٹوٹو کی پیٹھ پر لگایا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اُسے مارا تھا۔ لیکن اس وقت تو میں غصہ سے پاگل ہوگیا تھا۔ میں سڑاک، سڑاک چمڑے کا تسمہ مارتا رہا۔ وہ بلبلا کر زمین پر لوٹنے لگا۔ بیوی نے ٹوٹو کو بچانے کی کوشش کی تو میں نے اس کو بھی زور سے دھکا دیا۔ وہ پلنگ سے ٹکرا کر گری۔ میں ٹوٹو کو مارتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ مارتے مارتے ہانپنے لگا۔ جسم لرزنے لگا۔ میں بے سُدھ ہو کر فرش پر گر پڑا۔

یہ بڑی ہولناک رات تھی۔ ٹوٹو درد سے تلملا رہا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا۔ بیوی بلک بلک رو رہی تھی۔ دونوں بچے خوف زدہ ہو کر چیخ رہے تھے۔ میں تانگہ کے گرے ہوئے گھوڑے کی طرح بے حال پڑا تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ تمام آوازیں اسقدر لرزہ خیز معلوم ہوئیں جیسے کوئی جان کنی کے عالم میں آخری ہچکی لے کر دم توڑ چکا تھا۔ مر گیا تھا۔

میں نے فرش پر پڑے پڑے خواب ناک نظروں سے دیکھا۔ بیوی نے چمکار کر دونوں بچوں کو بستر پر سلایا۔ گلاس میں پانی لا کر مجھے پلایا۔ مجھے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی، میں نے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ باورچی خانے میں گئی، انگیٹھی سُلگا کر لائی اور کپڑے کی گدی بنا کر ٹوٹو کے بدن کی چوٹوں کو سینکنے لگی۔ ٹوٹو کا چہرہ۔ قبر سے نکلے ہوئے مُردے کی طرح ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔

میں نیم بیداری کے عالم میں فرش پر پڑا ہوا سوچتا رہا۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا یہ میرا ہی گھر ہے؟ یہ سامنے بستر پر میرے بچے لیٹے ہیں۔ وہ انگیٹھی کے قریب ٹوٹو بیٹھا ہے۔ میرا پہلوٹی کا بچہ، جسے میں نے دیوانوں کی طرح مارا ہے۔ اس کے بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے ہیں، جن سے خون رِس رہا ہے۔ اور اس کے برابر جو عورت بیٹھی ہے، وہ میری بیوی ہے۔ اس کے رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کے پیچھے دھندلی دھندلی آنکھیں ہیں۔ وہ رو رہی ہے۔ سسکیاں بھر رہی ہے۔ یہ سب کہاں سے آگئے؟ میں نے ان کو کیوں اکٹھا کیا؟ میں نے یہ گھر کیوں بسایا؟ کیوں بیاہ کیا؟ کیوں بچوں کا باپ بنا؟ کیا ہی اچھا

ہوتا کہ میں یہ سب کچھ نہ کرتا۔

میں ٹھیک ہی سوچ رہا تھا۔ مجھے وہ شب و روز یاد آرہے تھے جب میں صرف ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کماتا تھا، بے فکری کی نیند سوتا تھا۔ مزے سے سستے ہوٹلوں میں مردہ خچروں اور کتوں کے گوشت کا سالن اور لکڑی کا برادہ ملی روٹی کھاتا تھا۔ مہینہ کی پہلی تاریخ کو بیس پچیس روپے جیب میں ڈال کر قحبہ خانے جاتا۔ کسی بیوہ کے ساتھ منہ کالا کرتا۔ کبھی کبھار رہزنجنا کا ادھا چڑھا کر سڑکوں پر آوارہ کتوں کی طرح جھومتا پھرتا۔ زندگی یونہی گذر رہی تھی۔ کسی روز ہوٹل کا کھانا کھاتا اور ہیضے میں مبتلا ہو کر مر جاتا یا کسی قحبہ خانے میں قتل کر دیا جاتا۔

مگر قحبہ خانے میں میرا قتل نہ ہوا۔ البتہ سستے ہوٹلوں کا کھانا کھا کھا کر ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ہفتوں اسپتال کے جنرل وارڈ میں لاوارثوں کی طرح بستر پر پڑا رہا۔ وہیں میں نے سوچا کہ میرا بھی گھر ہو، میرے لیے بھی کوئی انتظار کرنے والا ہو۔ کوئی میرا دامن پکڑ کر ضد کرے اور مامتا کے جذبے سے سرشار ہو کر میں اسے سینے سے لگالوں، پیار کروں، سر پر شفقت سے ہاتھ پھیروں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں نے یہ سب کچھ نہ سوچا ہوتا۔ خدایا! میں نے بہت بڑا جرم کیا۔ میں بدنصیب ہوں، بہت بڑا گنہگار ہوں۔

میں دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ مجھے اپنی آواز بڑی بھونڈی اور بے ہنگم معلوم ہوئی مگر میں روتا رہا۔ آنسو بہاتا رہا۔ پھر میں نے اپنے شانوں پر بیوی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اُسے سسکیاں بھرتے دیکھا۔ میں چپ رہا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں اور بے خبر ہو کر سو گیا۔

ٹوٹو تو مل گیا۔ مگر اُسے تلاش کرنے کے چکر میں نائٹ کلب کی بیراگیری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ البتہ فرم کی ملازمت برقرار تھی۔ تنخواہ بھی ہر مہینے مل جاتی تھی مگر نہ کبھی وقت پر ملی اور نہ یک مشت۔ ٹوٹو کا بیشتر وقت اب گھر ہی میں گزرتا۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ دھینگا مشتی کرتا، شور کرتا، اودھم دھاڑ مچاتا۔

سوا سو روپے ماہانہ آمدنی میں پیٹ بھی نہ بھرتا تھا، تینوں بچوں کو تعلیم کیسے دلاتا، کہاں سے فیس کی رقم لاتا، کیونکر ان کی کتابیں اور کاپیاں خریدتا۔ اُن کے پیٹ بھی روز بروز پھیلتے جا رہے تھے۔ ایک ہی وقت میں کئی کئی روٹیاں چٹ کر جاتے۔ اگر ان کے پیٹ کا دوزخ نہ بھرتا تو روتے، ضد کرتے، گندی گندی گالیاں بکتے۔ جب تک میں گھر میں رہتا، وہ آنکھوں کے سامنے رہتے، میرے باہر نکلتے ہی، وہ بھی ماں کی آنکھ بچا کر سٹک جاتے۔ ویسے وہ ماں کو خاطر ہی میں کب لاتے تھے، وہ ڈانٹتی ڈپٹتی تو منہ زوری کرتے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ آنکھیں نکال کر کھڑے ہو جاتے۔ گلی کے آوارہ اور بدقماش لڑکوں کے ساتھ رہتے۔ مار دھاڑ کرتے، طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے۔

میں ان کی شکایتیں سنتا تو دل ہی دل میں کڑھتا، جھنجھلا کر سوچتا، یہ بچے تو جونک کی طرح چمٹ گئے ہیں۔ میرا خون پی پی کر مسٹنڈے ہوتے جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے تو دن کا چین چھین لیا ہے۔ راتوں کی نیند اُڑا دی ہے۔ گھر کو جہنم بنا دیا ہے، کبھی کبھی تو ایسا عاجز ہو جاتا، جی چاہتا کہ خواب آور گولیاں لا کر تینوں کو کھلا دوں۔ سوتے کے سوتے ہی رہ جائیں۔

مگر میں ان کو خواب آور گولیاں نہ کھلا سکا۔ ایک روز جنون کے عالم میں تینوں کو "محافظِ اسلام" نامی یتیم خانے لے گیا۔

یتیم خانے کا مہتمم تینوں کو داخل کرنے پر راضی ہو گیا۔ لیکن جب اس نے دریافت کیا "ان کے باپ کو فوت ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟" تو میں برداشت نہ کر سکا۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

مہتمم جہاں دیدہ اور سن رسیدہ آدمی تھا۔ فوراً اصل حقیقت کو تاڑ گیا۔ اس نے اپنی کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرا آنکھوں پر لگا ہوا چشمہ درست کیا۔ تسلی دیتے ہوئے نرم لہجے میں بولا "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے یتیم خانے میں ایسے بھی بچے آتے ہیں۔"

میں اس کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ ہونق کی طرح اس کا منہ تکنے لگا "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

زیرِ لب مسکرا کر بولا "آپ ان بچوں کے والدین ہیں نا؟"

میں نے عین موقع واردات پر پکڑے جانے والے ملزم کی طرح خوف زدہ ہو کر انکار میں گردن ہلائی "نہیں، میں ان کا باپ نہیں ہوں۔ یہ تو یتیم ہیں، لاوارث ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔" کہنے کو تو میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ مگر اس دفعہ میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگا۔

مہتمم نے مردم شناسی کا ثبوت دیا۔ فوراً بات کا رُخ بدلا کہنے لگا "اچھا اب اس قضیہ کو چھوڑیئے۔ کام کی بات کیجئے۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا "دیکھیے ایک بچہ تو ابھی چھوٹا ہے لیکن دوسرے دونوں بچوں کے عوض یتیم خانے کی جانب سے آپ کو پچیس روپے فی کس کے حساب سے پچاس روپے ماہانہ ملیں گے۔"

میں رونا دھونا بھول کر حیرت سے مہتمم کو دیکھنے لگا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے گویا ہوا "آپ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو آ کر یہ رقم یتیم خانہ سے لے جایا کریں۔ ساتھ ہی میں یہ بھی واضح کر دوں، یتیم خانے کے رجسٹر میں ان کو یتیم ہی لکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس خانہ پُری پر اعتراض نہ ہوگا۔"

ظاہر ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوراً حامی بھر لی "بہت بہتر ہے۔"

مہتمم نے مجھے مزید اطمینان دلایا "آپ مطلق پریشان نہ ہوں۔ آپ کے بچے یتیم خانے کی تحویل میں رہیں گے۔ ان کو دونوں وقت کھانا ملے گا، پہننے کو کپڑے ملیں گے، تعلیم بھی دی جائے گی، دستکاری بھی سکھائی جائے گی، اچھی طرح دیکھ بھال ہوگی، مناسب تربیت ہوگی، بہت آرام سے یہاں رہیں گے۔"

میں خاموش رہا۔ مہتمم میری دلجوئی کی غرض سے کہتا رہا "کیا کیا جائے بھائی صاحب، بڑا خراب زمانہ ہے، لوگ خود اپنی اولاد کو یتیم بنا کر یتیم خانے میں داخل کراتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کوئی بُرائی بات نہیں ہے۔ وقت ہی کچھ ایسا ہے کہ اب میں آپ سے کیا عرض کروں۔"

خاصی دیر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتا رہا۔ معاشرے کے بگڑے ہوئے حالات کا رونا روتا رہا۔ یتیم خانے کی فی سبیل اللہ خدمات کی توصیف و تعریف کرتا رہا۔ غرضیکہ جب میں اپنے تینوں بچوں کو داخل کرانے کے بعد یتیم خانے سے لوٹا تو ایسا لگا، گویا میرے سر کا بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا، میں خود کو مطمئن اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ہم میاں بیوی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یتیم خانہ، محافظِ اسلام کے دفتر جاتے، مہتمم سے پچاس روپے ماہانہ وصول کرتے اور

تینوں بچوں سے بھی مل لیتے۔ وہ بے پھندنے کی ترکی ٹوپیاں اور ایک ہی سے کپڑے کی سلی ہوئی ڈھیلی ڈھالی شیروانیاں پہنے۔ ہمارے سامنے آکر مؤدب کھڑے ہو جاتے، ان کے چہروں پر اب یتیموں کی سی لاوارثی برسنے لگی تھی۔ وضع قطع سے بھی وہ بالکل یتیم یسیر نظر آتے تھے۔ شروع شروع میں تو ماں ان کو دیکھتے ہی رو پڑتی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ بھی میری طرح ان باتوں کی عادی ہو گئی۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یتیم خانے سے ملنے والی رقم میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اب ٹوٹو اور فی فی کے عوض اسّی روپے ماہانہ ملتے تھے۔ کوکب کا بھی بیس روپے معاوضہ ملنے لگا۔ ہر مہینے سو روپے ملتے تھے۔ میں بھی خوش تھا اور بیوی بھی۔ اطمینان اور یکسوئی سے گذر بسر ہو رہی تھی۔ بچوں کی طرف سے بھی اطمینان تھا۔ وہ آوارہ گردی اور بے راہروی سے محفوظ تھے۔ یتیم خانے کے مکتب میں دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے، گھریلو صنعت اور دستکاری کی تربیت پا رہے تھے۔

مجھے فرم کے ایک کام کے سلسلے میں حیدرآباد جانا پڑا۔ بس کا سفر تھا۔ آگے کی نشست پر دو نوجوان، جو صورت شکل سے تعلیم یافتہ نظر آتے تھے، مشرقی پاکستان کی سنگین صورتِ حال کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے بات چیت کر رہے تھے۔ ایک اسٹاپ آیا۔ بس ٹھہر گئی۔ کچھ مسافر اُترے، کچھ سوار بھی ہوئے۔ بس آگے روانہ ہوئی۔ اچانک عقب سے گھسی پٹی لے میں وہ دُکھڑا شروع ہوا جو بس اور ریل گاڑی کے سفر میں عام طور پر سنائی دیتا ہے۔

یتیموں کی فریاد سن لیجئے گا۔

گئے ہم سے ماں باپ ہمارے بچھڑ۔

بحث کرنے والے نوجوان کو یہ دخل درمعقولات نہایت شاق گذری۔ انھوں نے کنڈکٹر کو بُلا کر کہا "یار نکالو، ان سالوں کو۔ خواہ مخواہ شور مچانا شروع کر دیا۔" کنڈکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ اس طرح منع کیا کہ خاموشی چھا گئی۔

ذرا دیر بعد پچھلی نشستوں سے زور زور سے بولنے اور تکرار کرنے کی آوازیں اُبھریں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کنڈکٹر دو بچوں کو غصّے سے ڈانٹ رہا تھا "تم بس کے اندر سگریٹ نہیں پی سکتے۔" مگر وہ دونوں سگریٹ نوشی پر بضد تھے۔

میں نے دونوں کو غور سے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ٹوٹو اور فی فی تھے۔ ٹھاٹھ سے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے اور ڈھٹائی سے ہنس رہے تھے، کنڈکٹر سے ٹھٹھول بازی کر رہے تھے۔

کنڈکٹر نے جھنجھلا کر بس رُکوائی، دونوں کو نہایت گندی گالی دی۔ ٹوٹو کو کان پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ فی فی نے مداخلت کرنا چاہی تو اس کے گال پر تڑاخ سے طمانچہ رسید کیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا، بے قرار ہو کر اُٹھا۔ ان کی جانب بڑھا۔ دونوں نے مجھے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ٹوٹو تو چُپ رہا مگر فی فی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا "ابّا"۔ مجھے سخت دھچکا لگا۔ دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ لپک کر قریب پہنچا۔ پہلے تو دونوں کی اچھی طرح مرمّت کی۔ پھر دھکّے دے کر بس سے باہر نکال دیا۔ کنڈکٹر کے ہاتھوں مار کھلوانے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ خود ہی اُن کی گندی کر دوں تاکہ نہ ذلّت اُٹھانی پڑے، نہ دل کو چوٹ لگے۔

میں نے بیوی سے اس المناک واقعہ کا ذکر نہ کیا، اسے ویسے ہی کم دکھائی دیتا ہے، یہ بات سُنتی تو رو رو کر بالکل اندھی ہو جاتی، سوچا، پہلی تاریخ کو تنہا جاؤں گا۔ یتیم خانے کے مہتمم سے کھل کر بات کروں گا، زور دُونگا کہ یتیم خانے کے لیے چندہ

جمع کرنے کا کام میرے بچوں سے نہ لیا جائے، انھیں کوئی ہنر سکھایا جائے۔ اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوا تو گھر واپس لے آؤں گا، اس طرح تو وہ آگے چل کر پیشہ ور گداگر بن جائیں گے۔ آوارہ اور بدقماش ہو جائیں گے۔

مگر میں پہلی تاریخ کو فرم کی بعض مصروفیات کے باعث نہ جا سکا۔ پورے مہینے نہ جا سکا۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا۔ دوسرے مہینہ کی پہلی کے بجائے تو تاریخ کو یتیم خانے پہنچا۔ مہتمم کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر پہلی سی تری اور شگفتگی نہ تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ بے رُخی سے بولا۔

"اب کیا لینے آئے ہیں؟"

اس کی بات سُن کر میں سخت چکرایا۔ ہچکچاتے ہوئے پوچھا "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

اُس نے ٹوہ لگانے والی نظروں سے مجھے دیکھا "آپ اپنے بچوں ہی سے ملنے آئے ہیں نا؟"

میں نے صاف دلی سے کہا "جی ہاں۔ بالکل ان ہی سے ملنے آیا ہوں اور پہلی بار نہیں آیا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔"

"مگر آپ کے بچے پچھلے ڈیڑھ ماہ سے بھی زیادہ عرصے سے یہاں نہیں ہیں۔"

"یہاں نہیں ہیں؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"تو گویا آپ کو کچھ پتہ نہیں؟" اس بار اس کے لہجہ میں بھی حیرت کا عنصر شامل تھا۔

میں نے پریشان ہو کر کہا "خدا بہتر جانتا ہے، مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

مسکرا کر بولا "بھائی صاحب، وہ تو میرے بھی اُستاد نکلے" اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے، اُنھوں نے اپنا یتیم خانہ کھول لیا ہے۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ یقین نہ آنے کے انداز میں بولا "انھوں نے یتیم خانہ کھول لیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسے ہی جیسے میں آپ سے بتا رہا ہوں" وہ بدستور مسکراتا رہا۔

عرض کیا "صاف صاف بتائیے۔ میں اب تک کچھ نہیں سمجھ سکا۔"

اس دفعہ اس نے دھماکہ سے بتایا "اُنھوں نے ایک نہیں کئی یتیم خانے کھول رکھے ہیں۔ مگر ان کا کہیں وجود نہیں، صاف بات یہ ہے کہ وہ جعلسازوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئے ہیں جس نے مختلف یتیم خانوں کے نام سے جعلی رسید بکیں چھپوا رکھی ہیں۔ ان کے نام پر چندہ جمع کرتے ہیں اور مل بانٹ کر کھا جاتے ہیں۔ ملک میں ایسے جعلسازوں کے نجانے کتنے گروہ ہیں۔ وہ یتیم خانوں کے بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ شہر شہر گھومتے پھرتے ہیں۔ طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے یتیموں کے نام پر مخیر اور خدا ترس لوگوں سے چندہ اینٹھتے ہیں اور بغیر ڈکار لیے نگل جاتے ہیں۔ یتیم خانوں کے نام پر یہ دھندا بہت عام ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری "مصیبت یہ ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں ہوتی۔"

یقین مانئے، مجھے اس سلسلہ میں کچھ بھی خبر نہیں" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"مجھے آپ کی بات پر پورا یقین ہے۔" اس نے مجھے اطمینان دلایا۔

میں نے تڑپ کر پوچھا۔ "آپ کو پتہ ہے کہ وہ کہاں ہیں؟"

اس نے بتایا۔ "ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پچھلے مہینے تینوں کو ملتان اور لاہور میں دیکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ پنجاب کے کسی شہر میں ہوں گے۔ اُن کا کوئی مستقل ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ کچھ روز جعلی یتیم خانوں کے نام پر کمائی کرتے ہیں۔ پھر کسی دوسرے شہر چلے جاتے ہیں۔"

مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ گم صم بیٹھا رہا۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مہتم نے میری آزردگی کو تاڑ لیا۔ دل جوئی کرتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھ سے ملتے رہیں، جوں ہی ان کے بارے میں صحیح اطلاع ملی، آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ انھیں واپس لانا چاہیں اور جعل سازوں کے چنگل سے چھڑانا چاہیں تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ جیسے وہ آپ کے بچے ہیں، ویسے ہی میرے بھی ہیں۔ میں اُن کو تباہی و بربادی کے گڑھے سے نکالنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔"

اس کی دل جوئی اور یقین دہانی سے میں بہت متاثر ہوا۔ دل شکستہ اور دل گرفتہ، یتیم خانہ محافظِ اسلام کے دفتر سے باہر نکلا۔ نڈھال اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ بیوی سے اپنی بے قراری چھپا نہ سکا، اور سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ کچھ دیر وہ سکتہ کے عالم میں بیٹھی رہی، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسے تسلی دیتے دیتے میں بھی اُمڈتے جذبات کے ریلے میں بہ گیا۔ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ ایک روز کا نہیں، اب تو یہ جنم جنم کا رونا ہو گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جمعہ کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت تھا۔ میں اپنی فرم کے منیجر سے ملنے نکلا تھا۔ وہ ان دنوں علیل تھے۔ دفتر نہ آتے تھے۔ گھر پر بلایا تھا۔ ٹائپنگ کا کچھ کام کرانا تھا۔ ان کے مکان کا مجھے صحیح پتہ معلوم نہ تھا۔ پہلی بار آنا ہوا تھا۔ مکان تلاش کرتا ہوا ایک سڑک سے مڑا تو دُور سے سید انور علی کے اسکول کا بورڈ نظر آیا۔ قریب پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ ایک نیا عجوبہ دیکھا۔ فہیم چلڈرن اکیڈمی کا بورڈ غائب تھا۔ "اقبال میموریل لائبریری" کا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا۔

عمارت بالکل سنسان تھی، نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز، پھاٹک بند تھا۔ صرف اس کا چھوٹا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ سوچا اندر جا کر اس تبدیلی کا راز معلوم کیا جائے جس نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی تھی۔ آگے بڑھا جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ وسوسوں نے سر اُبھارا، انور علی مل گئے تو کیا ہوگا؟ مگر یہ سوچ کر خود کو مطمئن کیا۔ نیس خورد برد کرنے کا واقعہ بہت پُرانا ہو چکا تھا۔ انور علی اسے بھول بھال چکے ہوں گے اور اگر اُنھوں نے اس کا ذکر نکالا بھی تو معذرت کر لوں گا۔ قصور بہرحال میرا ہی تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، کوئی نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عمارت کے قریب پہنچا۔ سیڑھیاں طے کیں۔ برآمدے میں پہنچا۔ ایک کمرے پر سید انور علی کے نام کی تختی لگی تھی، مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ باہر سے تالا لگا تھا، البتہ برابر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ بے دھڑک اس میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے عین سامنے میز تھی۔ میز کے پیچھے کرسی پر خلیل احمد بیٹھا تھا۔ اس سے پرانی شناسائی تھی۔ وہ ہیلپی پیرا ڈائز اسکول میں کلرک تھا۔

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا، اُٹھ کر ہاتھ ملایا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پوچھا، "بافر صاحب، آج آپ اِدھر کیسے

بھول پڑے ؟"

میں نے مسکرا کر کہا "ادھر سے گذر رہا تھا۔ سوچا انور علی صاحب سے نیاز حاصل کر لوں۔ مگر وہ تو اس وقت موجود نہیں۔ یہاں آتے تو ہوں گے ؟"

خلیل احمد نے بتایا "کبھی کبھار آتے ہیں۔ مگر آج نہیں آئیں گے۔"

میں نے قیاس آرائی سے کام لیا۔ "ہیپی پیراڈائز اسکول گئے ہوں گے۔"

"وہ تو کب کا ختم ہو گیا۔" خلیل نے مطلع کیا۔ "اس کا نام بھی بدل دیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو اس عمارت میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے تو یہاں فہیم چلڈرن اکیڈمی کا بورڈ بھی دیکھا تھا۔ مگر وہ بورڈ اب نظر نہیں آیا۔ اسکول کہاں چلا گیا ؟"

"اس سال موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوتیں تو اسکول بند کر دیا گیا۔" خلیل احمد نے بتایا۔ "تمام ٹیچروں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ اسکول کا فرنیچر اور دوسرا سامان کچھ تو فروخت کر دیا گیا، کچھ انور علی صاحب اپنے گھر لے گئے۔"

مگر انھوں نے اسکول کیوں بند کر دیا ؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اسکول تو بہت اچھا چل رہا تھا۔"

کہنے لگا "انور علی صاحب کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں، ہمیشہ بہت دور کی سوچتے ہیں۔" اس نے کھل کر بات نہ کی، مگر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ انور علی سے خوش نہ تھا۔ اس کے لہجے میں گلہ تھا۔

میں نے کرید کر پوچھا۔ "اسکول بند کرنے کا کوئی تو سبب ہوگا ؟ بلا سبب تو اسکول بند نہیں کیا جا سکتا۔"

دبی زبان سے بولا۔ "آپ سے کیا چھپانا۔ اصل بات یہ ہے کہ پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کو قومی ملکیت قرار دے کر سرکاری تحویل میں لیا جا رہا ہے۔ انور علی کا اثر و رسوخ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کہاں نہیں ہے۔ انھیں کسی نہ کسی طور پیشگی اطلاع مل گئی۔ سرکاری تحویل میں جانے سے پہلے پہلے سب کچھ صاف بچا لے گئے۔"

"کیا بچا لے گئے۔ اسکول کا فرنیچر ؟ وہ کتنے کا ہوگا ؟" میں نے قدرے تیکھے لہجہ میں کہا۔ "فرنیچر کی خاطر انھوں نے چلتا چلاتا اسکول بند کر دیا۔ سارے ٹیچروں اور عملے کے دوسرے افراد کو بے روزگار کر دیا۔"

باقر صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ انھیں کسی کے بے روزگار ہونے سے کیا سروکار رہا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے گرمی کی تعطیلات کے ساتھ ہی ٹیچروں کی ملازمت ختم کر دی جاتی تھی۔" خلیل احمد کھل کر بات کرنے لگا۔ "اجی انھوں نے تو اس عمارت کو بچا لیا۔ یہ تو ان کے قبضے میں رہے گی۔ سنا ہے اب تو اس زمین کا الاٹمنٹ بھی انھوں نے اپنے ہی نام کرا لیا ہے۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ اسکول قومی ملکیت قرار دیا جاتا تو اس کے ساتھ یہ زمین اور جائداد سب ان کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں ؟"

"بھئی اپنے انور علی صاحب بھی بڑی چلتی رقم ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "پہلے سے پیش بندی کر لیتے ہیں۔ لائبریری کا بورڈ بھی انھوں نے کسی مصلحت سے لگا رکھا ہے۔"

"یہ بورڈ تو ان کے لیے بہت بڑی ڈھال ہے۔ جب تک یہ موجود ہے ان پر ذرا آنچ نہیں آئے گی۔"

میں نے پوچھا "تم کیا کر رہے ہو؟"

"فی الحال تو میں آفس سیکریٹری ہوں" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "مگر آثار نظر آ رہے ہیں کہ مجھے بھی دوسروں کی طرح جلد ہی نکال باہر کیا جائے گا۔ صرف لائبریری کا بورڈ رہ جائے گا اور سید انور علی صاحب"

"مگر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ انور علی صاحب کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

خلیل احمد نے بتایا۔ "ہو سکتا ہے۔ وہ پھر یہاں اپنا اسکول کھول لیں۔ انور علی صاحب کو تو یہی اُمید ہے۔ آپ جانتے ہیں، اُمید پر تو دنیا قائم ہے"

وہ ہنسنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

وقت نے نہ جانے کتنی کروٹیں بدلیں۔ کیسے کیسے انقلابات آئے، کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ خلیل احمد نے بالکل سچ کہا تھا، اُمید پر دنیا قائم ہے۔ سید انور علی کی اُمید بار آور ثابت ہوئی۔ ملک میں ایک بار پھر مارشل لاء لگا، پرانی حکومت ختم ہوئی، نئی حکومت قائم ہوئی۔ نت نئے قوانین اور آرڈی ننس نافذ ہوئے۔ نجی تعلیمی ادارے قائم کرنے کے بھی احکامات جاری ہوئے۔

میں نے ایک بار پھر دیکھا "اقبال میموریل لائبریری" کا بورڈ مختصر ہو گیا تھا، اور اس پر لکھی ہوئی عبارت کے حروف بھی دھندلے پڑ گئے تھے۔ پھاٹک کے اُوپر فہیم چلڈرن اکیڈمی کا لمبا چوڑا بورڈ آویزاں تھا، انور علی کی چمکتی دمکتی کار نہایت شان سے پھاٹک میں داخل ہوئی، وہ کار سے اُتر کر خراماں خراماں اپنے دفتر کی جانب بڑھتے۔ چپڑاسی ادب سے سلام کرتا۔ بڑھ کر دروازہ کھولتا اور وہ اندر داخل ہو جاتے۔ چپڑاسی، اس تختی کے عین نیچے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ جاتا، جس پر خوبصورت حروف میں "پرنسپل" لکھا تھا۔

انور علی کا اسکول اب دو شفٹوں میں چلتا ہے۔ فیس بھی تگڑی وصول کرتے ہیں یعنی ساٹھ روپے ٹیوشن فیس اور سو سے ڈیڑھ سو روپے تک، فاصلے کے مطابق بس کا کرایہ۔ اسکول کی اپنی بسیں ہیں، جن میں ہر صبح بچوں کو بوریوں کی طرح ٹھونس دیا جاتا ہے۔ جس کلاس میں تیس بچوں کی گنجائش ہے، ساٹھ پینسٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہر سال طلباء کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور اس اضافہ کے ساتھ ساتھ اسکول پر من برس رہا ہے۔ یوں سمجھئے سید انور علی دولت میں کھیل رہے ہیں۔ لکشمی ان کے قدم چومتی ہے۔

ان کے چھوٹے بچے اور بچیاں، گھوڑا گلی اور مری کے شاندار اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ پر فضا مقامات پر رہتے ہیں۔ اپنے مستقبل کے گیسوئے تابدار کو تابدار بناتے ہیں۔ بڑا لڑکا ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کرنے کے بعد واپس آ گیا ہے۔ اس کا ذاتی کلینک ہے۔ نامور سرجن ہے۔ ایک آپریشن کے پانچ ہزار نقد سکہ رائج الوقت وصول کرتا ہے۔ ایک ایکڑ سے بھی زیادہ بڑے قطعہ اراضی پر بہت عالیشان اسپتال تعمیر کر رہا ہے۔ دوسرا انجینئر ہے۔ اور کسی امریکی تحقیقاتی ادارے میں ملازم ہے۔ ملک کو زرمبادلہ بھی کما کر نہیں بھیجتا۔ اُس نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ گرین کارڈ حاصل کر لیا ہے۔ امریکہ ہی میں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے۔

میرے بچّوں کا حال احوال بھی سُن لیجئے : ٹوٹو اور نی نی، ملتان سنٹرل جیل میں ہیں۔ پہلے جعل سازی کے جرم میں قید ہوئے، جیل میں عادی مجرموں کے ساتھ رہ کر طاق ہو گئے۔ رہا ہوئے تو ڈکیتی اور رہزنی کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے، جرائم کی دنیا میں خوب نام کمایا۔ نہایت دیدہ دلیری سے ڈاکے ڈالتے تھے۔ پکڑے گئے اب قید بامشقت کاٹتے ہیں۔ کوکب نے جیب کاٹنے کے فن میں مہارت حاصل کی۔ ایک بار جیب کاٹنے کے بعد چلتی بس سے کُود کر فرار ہونے کی کوشش کی۔ مگر دونوں پیر پہیّوں کے نیچے آ کر کٹ گئے۔ وہ حیدر آباد میں ہے۔ اپاہج ہونا اس کی کمائی کا وسیلہ بن گیا۔ ہاتھوں کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے۔ دردناک صدا لگاتا ہے۔ فقیروں کا بھیس بنا کر تماشائے اہلِ کرم دیکھتا ہے۔ وہ ایک منجھا ہوا گداگر بن چکا ہے۔

میرا عالم یہ ہے کہ بیکار اور ناکارہ ہوں۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ بیوی کماتی ہے اور میں کھاتا ہوں۔ وہ پڑوسیوں کے کپڑے سیتی ہے۔ دن رات کھٹا کھٹ مشین چلاتی ہے۔ اس کی بینائی کمزور اور کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ چشمہ کا نمبر بڑھتے بڑھتے آخری حد تک پہنچ گیا ہے۔ پھر نمبر بڑھ سکے گا، نہ وہ دیکھ سکے گی، اندھی ہو جائے گی۔ میں پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر رہ گیا ہوں۔ سید محمد باقر کے بجائے اس کا جیتا جاگتا میموریل بن گیا ہوں۔ لوگ مجھے خبطی اور دیوانہ کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مجھے جہاں اور جس جگہ ایسا بورڈ نظر آتا ہے، جس پر اس قسم کی عبارت درج ہوتی ہے۔

بچّے قوم کی امانت ہیں۔
بچّے نئے پاکستان کے معمار ہیں۔
اپنے بچّوں کا مستقبل درخشندہ بنائیے۔

مجھ پر فوراً ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دیوانگی کا ایسا شدید دورہ پڑتا ہے کہ میں سرِ ایسے بورڈ پر پان کی پیک تھوک دیتا ہوں۔ کیچڑ، غلاظت، گھوڑوں کی لید۔ جو کچھ ہاتھ میں آتا ہے کھینچ مارتا ہوں، کسی نہ کسی طور بورڈ کا ستیاناس کر دیتا ہوں۔ اس کی عبارت مٹا دیتا ہوں۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔

میری اس دیوانگی پر راہ گیر ٹھٹک جاتے ہیں، ہنستے ہیں، نفرت سے منہ بگاڑتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ پچھلے ہی مہینے، میری ایسی ہی حرکت پر ایک شخص نے غصّہ سے مجھے اس بیدردی سے مارا کہ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ بایاں رخسار پھٹ گیا۔ اس کا نشان ہلال کی صورت میں اب تک موجود ہے۔ لیکن میری دیوانگی میں پھر بھی فرق نہ آیا۔ جی چاہتا ہے، کوئی سر پر جوتا مار کر کہے "ابے گھر بسائے گا" کوئی ٹھوکر مار کر کہے "اوّل کے پٹھے باپ بنے گا" کوئی میرے منہ پر تھوک کر کہے "کیوں بے، اپنے بچّوں کا مستقبل روشن بنانے کی کوشش کرے گا"

لوگو! خدا کے لیے مجھے اس طرح قہر آلود نظروں سے نہ دیکھو۔ میرے حال پر یوں نہ ہنسو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ میں انسان کے ہاتھوں ستایا ہوا ایک انسان ہوں۔ ایک باپ ہوں، لو، میں نے تمہارے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔ دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے۔

خُدائی فیصلہ

ھائنز رِسّے

جرمن سے ترجمہ : منیر الدّین احمد

کلابریا کے ایک پہاڑی شہر ف کے نزدیک جون ۱۴۱۲ء کی ایک صبح ایک مرد کی لاش ملی۔ جسے واضح طور پر رات کے دوران لوٹا اور قتل کر دیا گیا تھا۔ چونکہ مرنے والے کے پاس کوئی چیز نہ پائی گئی جس سے پتہ چل سکتا کہ وُہ کون تھا۔ اس لیے اُسے شہر میں پہنچایا گیا اور لاش خانے میں رکھ دیا گیا۔ چند آدمیوں نے، جنھوں نے اسے وہاں پڑا دیکھا، پُورے وثوق سے اس شخص کو قتل ہونے سے قبل شام کے وقت دیکھنا بیان کیا، مہمان سرائے میں، انھوں نے کہا۔ اُس نے بتایا تھا کہ وہ تاجر تھا اور اپنی تجارت کے سلسلے میں سفر پر تھا۔ سرائے کے مالک نے، جسے جج نے اس پر بلوا بھیجا، اس امر کی تصدیق کی۔ اُس نے مزید بتایا کہ اجنبی نے لمبے چوڑے کھانے کے بعد بھیگتی شام کے وقت مہمان سرائے کو یہ کہتے ہُوئے چھوڑا تھا کہ وہ آگے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو نوجوان بھی رخصت ہُوئے جو کھانے کے دوران اس کی میز پر بیٹھے تھے اور اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔ ہاں اُن کا بِل بھی اجنبی نے ہی ادا کیا تھا۔ کیا وہ دونوں نوجوان ف میں رہتے ہیں؟ جج نے جاننا چاہا۔ جی ہاں، سرائے کے مالک نے یقین دلایا اور ان کے نام بتائے۔ ایک کو اُربینی کہتے ہیں اور دُوسرے کو ویجیلیو۔

جج نے دونوں کو اپنے سامنے حاضر کروایا۔ باوجود اس امر کے کہ ان کے بیان کے مطابق وہ تاجر سے مہمان سرائے کے دروازے پر جُدا ہو گئے تھے اور فوری طور پر ان کے گھروں کی تلاشی، جن میں وہ رہتے تھے، ان کے نتیجے میں ان کے خلاف کچھ نہ مل سکا۔ جج نے حکم دیا کہ انھیں حراست میں رکھا جائے۔ آئندہ دنوں میں اس نے ان سے کئی بار پُوچھ گچھ کی۔ وُہ اپنے سوالات کو چاہے کتنی ہی ہوشیاری سے کیوں نہ کرتا تھا۔ اُسے جُرم کے ایک سائے کے برابر بھی ثبوت تلاش کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ حتّٰی کہ اُسے خود یہ یقین ہو گیا کہ نہ تو ویجیلیو تاجر کا قاتل ہو سکتا تھا نہ ہی اُربینی۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ان کی حراست کے حکم کو منسوخ کرنے پر آمادہ نہ کر پایا۔ ایک رات اُسے اپنی سوچ و بچار کی کشمکش میں فیصلے کو خدا پر چھوڑنے کا خیال آیا۔ دُوسرے روز اس نے پہلے اُربینی کو اپنے پاس لانے کا حکم دیا۔ اُس سے اُس نے پُوچھا کہ آیا اُسے اپنے قید خانے میں قیام کے دوران کسی رات کو کوئی خواب آیا تھا؟ اُربینی نے حیرت سے جج کی طرف دیکھا: جی ہاں، اُس نے جواب دیا، بلکہ بہت عجیب قسم کا۔ اُس نے اپنے آپ کو خواب میں ایک سڑک پر لیٹے ہوئے دیکھا بلا حس و حرکت، اور بغیر اُس کے کہ اُس کے اندر قوّت ہوتی حرکت کرنے کی۔ یہ اندھیرے کا سماں تھا۔ اور کسی اتفاقیہ طور پر اس سڑک پر آنے والی گاڑی کے نیچے آجانے کے ڈر نے اُسے بہت ستایا تھا جب کہ کہیں دُور سے گاڑی کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مگر کوئی گاڑی اس کے نزدیک تک نہ پھٹکی۔ آنکھ کھُلنے کے وقت وُہ پسینے میں شرابور تھا اُس ڈر کے سبب جو اُسے خواب میں لاحق رہا تھا۔

جج نے لمحہ بھر سوچا۔ پھر اُس نے حکم دیا کہ اگلے روز پو پھٹنے کے وقت اُربینی کو ہاتھ اور پاؤں سے جکڑ کر شہر سے باہر اُس سڑک پر ڈالا جائے، جس پر اُس وقت گردونواح کے کسان اپنی اشیائے منڈی میں لانے کے لیے آتے ہیں۔ وہاں پر اُسے دو گھنٹے تک رکھا جائے۔ کسانوں کو سزا کی تحدید دے کر حکم دیا جائے کہ اپنی گاڑیوں کو یوں چلائیں گویا سڑک خالی ہو۔ اگر اُربینی اس امتحان سے زندہ بچ نکلے تو اُسے آزادی بخشی جائے۔

جج خود بھی دوسرے روز اُس جگہ پر پہنچا، جہاں اُربینی کو لٹایا گیا تھا اُس نے سپاہیوں سمیت اُس مدت کے ختم ہونے کا انتظار کیا جو اُس نے فیصلے کے لیے مقرر کر رکھی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی کہ مقررہ وقت گزارے بغیر اس کے کہ کوئی گاڑی آئی ہو۔ قیدی کے بندھے ہاتھوں کھولنے کے بعد اُس نے اپنے دو آدمیوں کو حکم دیا سڑک پکڑ کے پہاڑ کے دامن میں آباد گاؤں میں جا کے یہ معلوم کرنے کا کہ کسان اس روز کس وجہ سے شہر کی منڈی میں آنے سے باز رہے تھے۔ ایلچی جلدی لوٹ آئے۔ انھوں نے بتایا کہ اس جگہ، جہاں اُربینی کو لٹایا گیا تھا، سے کچھ ہی نیچے رات کو ایک چٹان گر گئی تھی۔ پتھروں اور مٹی کے تودوں نے سڑک کو بند کر دیا تھا۔

جج نے، جسے اس قصے میں اس بات کا ثبوت نظر آیا کہ کسی نے فی الواقعہ اس سے فیصلے کا بوجھ لے لیا تھا، اسی وقت ویجیلیو کو منگوایا اور اس سے سوال کیا کہ آیا اُس نے اپنی قید کے دوران کوئی خواب دیکھا تھا۔ قیدی مسکرایا: "مجھے خواب آیا ہے" اُس نے جواب دیا کہ "میں نے بلدیہ کے دروازے والے پتھریلے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالا۔"

یہ بھی بے گناہ ہے، جج نے سوچا

"شیر نے کاٹ کھایا" ویجیلیو نے مزید بتایا

"پتھر کے شیر نے؟" جج نے حیرت سے پوچھا اور سر کو ہلایا

"یہ خواب جو تھا" قیدی نے جواب دیا

"خوب" جج نے کہا "ہم بلدیہ کو چلتے ہیں اور تمھیں اپنا ہاتھ پتھریلے شیر کے منہ میں ڈالنا ہوگا۔ اگر وہ تمھیں نہیں کاٹے گا تو میں حکم دوں گا کہ تمھیں بھی رہا کر دیا جائے۔"

اُس نے قیدی اور دو محافظوں سمیت بلدیہ کا رُخ کیا سڑکوں میں سے گزرتے ہوئے۔ ایک ہجوم ان کے پیچھے ہو لیا۔ کیونکہ اُربینی کے بچنے کی خبر جلد پھیل گئی تھی۔ اس معجزے نے بہتوں کے اندر خواہش پیدا کر دی تھی ویجیلیو کے امتحان کے وقت حاضر ہونے کی۔ مگر قہقہے بلند ہوئے جب ہجوم کو سپاہیوں کے اشاروں کنایوں سے پتا چلا کہ ویجیلیو کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کیا کرنا تھا۔ بلدیہ کے گیٹ کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے منڈی کے میدان میں کھڑے لوگوں کے تمسخر بھرے چہروں کو دیکھتے ہوئے قیدی خود بھی مسکرا رہا تھا۔ واضح طور پر بچ نکلنے کی اُمید لیے اُس نے اپنا دایاں ہاتھ پتھریلے شیر کے منہ میں ڈالا۔ مگر ایک دردناک چیخ کے ساتھ اُسے واپس کھینچا۔ قریب کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ ویجیلیو کی اس حرکت سے ایک بچھو بلدیہ کی سیڑھیوں پر آن گرا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جانور نے شیر کے منہ کی تاریکی میں پناہ لے رکھی تھی اور اس نے اپنے

ڈنک سے اندر گھسنے والے ہاتھ کے خلاف اپنا دفاع کیا تھا۔

جج نے حکم دیا کہ قیدی کو فوراً قید خانے میں پہنچایا جائے۔ اُس نے یہ ہدایت بھی کی کہ کوئی شخص اس کے زخم کا علاج نہ کرے۔ اُسے اب اس قدر ویجیلیو کے مجرم ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ جو چند گھنٹوں کے بعد سخت کرب کی حالت میں مرا۔ اس کے باوجود جج کا یقین، جہاں تک تاجر کے قتل کا تعلق ہے، غلط تھا۔ حقیقت میں نہ تو اُربینی نے اور نہ ہی ویجیلیو نے تاجر کو قتل کیا تھا بلکہ ایک شخص جس نے بیس برس بعد مرض الموت میں ناپولی میں اپنے اس گھناؤنے فعل کا اعتراف کیا۔ مگر اس بات کا علم ف میں کسی کو نہ ہُوا، جج کو بھی نہیں۔ بلکہ اگر وہ اس بات کو سُن بھی لیتا تب بھی کسی صُورت میں بھی شک وشبہ اس کے قریب نہیں پھٹکنا چاہیے تھا اس انصاف کے بارے میں جو اس کے ذریعے طے پایا تھا ——— کیونکہ کون کہہ سکتا ہے کہ سزا ایک ایسے جُرم کے نتیجے میں نہ تھی جسے جج نہیں جانتا تھا؛ روابط جنھیں انسان دیکھ سکتا ہے اکثر درست نہیں ہوتے ——— وہ اصل روابط کو چھپانے کا باعث بنتے ہیں ——— انسان اسی رنگ میں، جیسے جج نے کیا، محض سوال کر سکتا ہے۔ اس بات کو وہ شاذ و نادر ہی جان پاتا ہے کہ کیا وہ اس معمے کو حل کرنے میں کامیاب ہوا ہے جو اُسے جواب کے ذریعہ ملتا ہے۔

منٹو کے شاعر دوست

طارق عزیز

منٹو کی ذات اور افسانہ نگاری پر اُن کے دوست اور دشمن ادیبوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کی شخصیت شاید اب ہمارے لیے کوئی مکمل راز نہیں رہی۔ لیکن جس طرح اُن کے افسانوں کی پرتیں پیاز کا چھلکا بن گئی ہیں، اُسی طرح اُن کی شخصیت بھی کئی زاویوں میں بٹ گئی ہے یا ادبی سازشوں کے تحت بانٹ دی گئی ہے تاہم ان میں سے بعض زاویے ایسے ہیں جن پر شاید اُن کے شاعر دوستوں ہی کی نظر گئی ہے۔

منٹو کے بارے میں مجید امجد، راجہ مہدی علی خاں اور مصطفیٰ زیدی سے لے کر بلراج کومل، شہریار، کمار پاشی، سرمد صہبائی، نادان، محمد علوی اور سارا شگفتہ تک ہمیں جتنی نظمیں ملتی ہیں اُن میں منٹو کی ذات اور افسانہ نگاری سے متاثر ہونے کا شدید احساس موجود ہے لیکن مجید امجد، مصطفیٰ زیدی اور راجہ مہدی علی خاں کی نظمیں اس اعتبار سے زیادہ اہم ہیں کہ اُن میں منٹو کی ذات کا تجزیہ اس سطح پر کیا گیا ہے جہاں نہ صرف منٹو کے ساتھ ان شاعروں کی بے پناہ وابستگی کا احساس ہوتا ہے بلکہ اُس کے فن کا مکمل ادراک بھی موجود ہے۔ منٹو مالی اعتبار سے کبھی بھی آسودہ حال نہیں رہے جس کی بڑی وجہ اُن کی بلا نوشی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر انھوں نے شراب نہ پینے کا پکا ارادہ کر لیا اور اس پر کچھ عرصے تک کاربند بھی رہے۔ ترکِ مے سے اُن پر ایک ایسی بیزاری طاری ہو گئی جس نے بعد میں کئی نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیا۔ یہ زمانہ منٹو پر بڑا سخت تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دوران میں وہ تین ماہ تک پاگل خانے میں بھی رہے۔ ترکِ مے نوشی کے ارادے کے بعد منٹو کے جی میں ایک عجیب دُھن سمائی۔ وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں سے اپنے ہی بارے میں رائے طلب کرنے لگے۔ انھیں جہاں بھی کوئی واقف مل جاتا اُس سے فرمائش کرتے کہ وہ ان کے بارے میں دو سطریں لکھ دے۔ اپنے بارے میں ان آراء کو وہ کتابی شکل میں چھاپنا چاہتے تھے جس کا نام اُنھوں نے "ناخن کا قرض" رکھا (لیکن یہ کتاب شائع نہ ہو سکی)۔ یہ بڑے حوصلے کا کام تھا۔ اپنے بارے میں سب کچھ سہار جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ وہ شخص جو ہمیشہ دُوسروں کی ضد رہا، ایک دن خود لوگوں کے سامنے آ گیا اور بولا: لو بھائی! اپنا قرض اتار لو ——

مجید امجد کی نظم "منٹو" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے:

میں نے اُس کو دیکھا ہے
اُجلی اُجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں
پھیلتی بھیڑ کے اندھے اوندھے کٹوروں کی طغیانی میں

جب وہ خالی بوتل پھینک کے کہتا ہے
"دنیا تیرا حُسن یہی بدصورتی ہے"
دنیا اُس کو گھورتی ہے
شورِ سلاسل بن کر گونجنے لگتا ہے
انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال
کون ہے یہ جس نے اپنی بہکی بہکی سانسوں کا جال
بامِ زماں پر پھینکا ہے
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پُرپیچ دُھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہراندوز محلکوں میں
لے آیا ہے ، یُوں بن پُوچھے ، اپنے آپ
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ ؟
کون ہے یہ گستاخ ؟
تاخ ! تڑاخ

ترکِ مے نوشی کے بعد منٹو پر جو کیفیت اور بیزاری طاری ہوگئی تھی اُس کے پس منظر میں لکھی گئی یہ نظم ، کوئی معمولی نظم نہیں۔ راجہ مہدی علی خاں نے اپنی نظموں کے مجموعے "اندازِ بیاں اور" میں تین جگہ یعنی نظم "ادیب کی محبوبہ" "جہنم میں غنڈے" اور "مثنوی قہرالبیان" میں منٹو کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں نظم "منٹوازم" سب سے زیادہ اہم ہے۔ منٹو ہر اس چیز کا نیگیٹو طلب کرتے تھے ، دنیا جس کے پوزیٹو کی قائل تھی۔ ساغر صدیقی کا ایک شعر ہے : ؎

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھُولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

منٹو کا دامنِ دل بھی بس ایسا ہی تھا۔ منٹو سے قطعِ نظر ، تضاد یا CONTRAST کی انسانی عقاید میں کیا اہمیت ہے ، یہ بحث طویل بھی ہے اور ہمارے موضوع سے خارج بھی۔ بعض اشیاء کے ادراک کے لیے بعض دُوسری اشیاء کا تصور ہمیشہ ضروری رہا ہے۔ کانٹے کے بغیر پھُول ، اندھیرے کے بغیر اجالا یا بدی کے بغیر نیکی کے وجود یا عدم وجود کی مثالیں اگرچہ اب ذرا فرسودہ خیال کی جاتی ہیں لیکن اپنی تمام تر فرسودگی کے باوجود زندگی کی بڑی حقیقتوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ منٹو نے تمام عمر انہی حقیقتوں کی تلاش کی ہے۔ اور راجہ مہدی علی خاں نے "منٹوازم" میں حقیقتوں کی اسی تلاش کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ چند شعر دیکھیے : ؎

دنیا ہر گز گول نہیں ہے
ڈھول میں بالکل پول نہیں ہے
اُلو رات کو سو جاتے ہیں
طوطے گلابی ہو جاتے ہیں

چور کو چوری سے مت روکو
شعر کہے شاعر تو ٹوکو

منٹو کی وفات پر لکھی گئی مصطفےٰ زیدی کی نظم "ایک علامت" منٹو کی ذات اور فن کے بارے میں ایک نہایت اہم نظم ہے۔ نظم کا آغاز جس شعر سے ہوتا ہے اُس میں اُسی نظریہ کی تائید ملتی ہے راجہ مہدی علی خاں نے جسے "منٹوازم" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن بعد کے شعروں میں طنز آ گیا ہے:

گھاس سے بچ کے چلو، ریت کو گلزار کہو
نرم کلیوں پہ چڑھا دو غمِ دوراں کے غلاف
رات کو اس کے تبسم سے لپٹ کر سو جاؤ
صبح اُٹھو تو اسے شاہدِ بازار کہو

بعد میں نظم آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور شاعر منٹو کے مخصوص موضوعات کو عالمی حوالوں کے پس منظر میں دیکھنے لگتا ہے:

خطِ سرطان سے آتی ہے ہلر کی آواز
اور امریکہ کے بازار میں کھو جاتی ہے
جائس کی فکر نے تعمیر کیا ہے جس کو
وہ زمیں حسرتِ معمار میں کھو جاتی ہے
کبھی منٹو کا قلم بن کے دمکتی ہے حیات
کبھی سرمائے کی تلوار میں کھو جاتی ہے

زیدی منٹو کو پیمبر کا درجہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

ہر پیمبر پہ ہنسا ہے یہ زمانہ لیکن
ہر پیمبر نے جھکائی ہے زمانے کی جبیں

منٹو کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کچھ تو ہو وجہِ دل آزاری و آہنگ و ستیز
ورنہ یہ طبع خوش اخلاق و کم آمیز بھی ہے

شہر کی تیرہ و تاریک گزرگاہوں میں
داستاں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا
زیست قانون و فرامینِ قفس کے آگے
بے زباں ہو گی تو منٹو کا قلم لکھے گا

زیدی نے اپنی نظم میں منٹو کے بعض اہم کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے اور آخر میں منٹو کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

اے نئے عصر کی رگ رگ کو سمجھنے والے
فہم و ادراک بدی ہیں تو بدی تیری ہے
چند لمحوں کی خدائی ہے روایات کے ساتھ
فن کے آدرش کی روحِ ابدی تیری ہے
موت یہ صرف سعادت کی ہے، منٹو کی نہیں
یہ شب و روز ترے ہیں، یہ صدی تیری ہے

کچھ عرصہ پہلے رسالہ "شعور" نئی دہلی نے منٹو کے افسانہ "ہتک" سے متعلق ایک خاص نمبر شائع کیا۔ اس میں شامل زیادہ نظموں کا تعلق 'ہتک' کے اہم کردار سوگندھی سے ہے۔ ان نظموں کے پس منظر کے طور پر میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ آپ سب نے منٹو کا افسانہ 'ہتک' پڑھا ہے اور سوگندھی کے کردار سے واقف ہیں۔ 'ہتک' میں منٹو کا فکر و فن تمام نفسیاتی حوالوں کے ساتھ اس سطح پر پہنچا ہوا ہے جہاں اُس کی حدیں اردو افسانے کے انتہائی امکانات کو چھونے لگتی ہیں۔ سوگندھی محض ایک کردار ہی نہیں بلکہ ایک ایسی علامت بھی ہے جو اپنے طبقے کے اتھاہ دُکھوں، سماج کے رویّے اور شدید نفسیاتی ردِ عمل کی ترجمان ہے۔ بلراج کومل، شہریار، کمار پاشی، سرمد صہبائی اور ناداں کی نظمیں سوگندھی سے متعلق ہیں اور ان سب نظموں کا نام بھی سوگندھی ہی ہے۔ ان میں کمار پاشی کی نظم خصوصی توجہ کی حامل ہے کہ اس میں سوگندھی کے کردار کا نہایت نزدیکی مشاہدہ کیا گیا ہے۔

اِک موسم مرے دل کے اندر
اک موسم مرے باہر
اک رستہ مرے پیچھے بھاگے
اک رستہ مرے آگے
رستے بیچ میں کھڑی اکیلی
پیا نہ سنگ سہیلی
کیا جانے مجھ جنم جلی نے

کیا اپرادھ کیا ہے
آخر کیوں دنیا کا میں نے سارا زہر پیا ہے
ساری عمر نہ جانے اپنے بدن میں کیسے جیا ہے
میرے ساتھ زمانے
تُو نے اچھا نہیں کیا

محمد علوی کی نظم 'خارش زدہ کُتا' نے اُس شدید ردِ عمل سے جنم لیا ہے جو افسانہ نگار کے ہاں پیدا ہوا ہے نہ سوگندھی ہی کے ہاں، بلکہ صرف اور صرف ایک ایسے حساس قاری کے ہاں پیدا ہو سکتا ہے جسے سوگندھی کے سب غموں کا عرفان ہو گیا ہے جو اُس کے سب دُکھوں کو پہچان گیا ہے۔ سوگندھی جب شدید ذہنی تشنج کا شکار ہو کر مادھو کو گھر سے نکال دیتی ہے تو اُس کی کیفیت اور بھی غمر ہو جاتی ہے۔ ایک طرف اُس پر مردوں کی دنیا کی ہزاروں حقیقتیں آشکار ہو رہی ہیں دُوسری طرف اُس کا ذہن خالی ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا اُس لمحے کی طرف آیئے جب افسانے کا اختتام ہوتا ہے۔

"بہت دیر تک وہ بید کی کُرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

یہ وہ لمحہ ہے جب سوگندھی تمام انسانی تعلقات سے کُلی طور پر بے نیاز ہو گئی ہے کہ وہ ان کی حقیقت کو جان چکی ہے۔ مادھو کو گھر سے نکال کر جب وُہ اپنے خارش زدہ کُتے کو پہلو میں لٹا کر سو جاتی ہے تو جاگتے قاری کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا یہ ایک ایسے خالی الذہن انسان کی حرکت ہے جس کے معاملے پر نظر رکھنے والا خدا کے علاوہ اب پُوری کائنات میں کوئی اور نہیں؟

۲۔ کیا کُتا انسان کی تلافی کرنے اُس سے ارفع ہو گیا ہے؟

۳۔ کیا اُس کے نزدیک اب کُتے اور انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں رہا؟

محمد علوی نے اپنی نظم "خارش زدہ کُتا" میں اس آخری امکان کو بنیاد بنایا ہے:

کُتے نے آنکھیں کھولیں ———
——— لمبی زباں سے
سارے بدن کو پیار کیا
اک اک زخم شمار کیا
کان مروڑے،

دُم پھٹکاری ،
کروٹ بدلی
اور پہلو میں
اک بے حال سی عورت کو
سوتے دیکھا !
اِدھر اُدھر سے سُونگھا
——— پھر سُونگھا ——— ———
پھر ٹانگ اُٹھائی
اور مُوتا ———
پھر کھاٹ سے کُود
اور کھولی سے بھاگ گیا !!

سارا شگفتہ کی پنجابی نظم " میں نئی چنگی " میں بھی سوگندھی ہی کا حوالہ ہے تاہم اس میں سوگندھی کے کردار کو زیادہ بہتر طور پر نہیں سمجھا گیا اور نظم اکثر جگہوں پر بے معنویت کا شکار ہو گئی ہے۔

مسجدِ قرطبہ

منظور الٰہی

دسمبر کی ایک خنک رات کو میں جانے بوجھے راستوں پر چلتا ہوا لارنس باغ سے نیو ہاسٹل کی طرف جا رہا تھا۔ چیرنگ کراس سے گول باغ تک فضا میں لاہور کی یُو باس تھی۔ وہ یُو باس جس کی یاد اجنبی ملکوں میں آزُردہ کر دیتی ہے، رگوں میں جوان اور گرم خون تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے بھیگے چہرے کو مَس کرتے تو سینہ اور کُشادہ ہو جاتا، لبوں پہ 'مسجدِ قرطبہ' کا زمزمہ تھا، اُس عظیم تخلیق کا سرور دھیرے دھیرے رُوح کی گہرائیوں میں اُتر رہا تھا مگر اسے ایک زمانہ بیت گیا، تب لاہور کی فضا گرد سے پاک تھی۔ شفاف نیلے آسمان پہ تاروں کی چمک باقی تھی۔ یُوں بھی جوانی میں مطلع غبار آلود نہیں ہوتا، ہر شے حسین نظر آتی تھی، ہر متنفس دمساز تھا اور ہر نظارہ منتظر، وہ ایک یادگار رات تھی۔

شبے خوش ہمچو صبحِ زندگانی
نشاط افزا چو ایامِ جوانی — جامی

صدی کی چوتھائی دہائی اِس لحاظ سے یادگار رہے گی کہ اس دہے میں اقبالؒ نے دنیائے ادب کو بالِ جبریل کا تحفہ دیا، عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑا، بالِ جبریل تھا کہ صورِ اسرافیل، کلامِ اقبالؒ کی رعنائیاں اللہ اکبر، عقل کا چیل چراغ، اس پہ مستزاد الہام کا سراجِ منیر، ظلمتِ شب میں بھٹکتے ہوئے راہی کے لیے شاعر کا فکرِ بلند آسمانوں پہ چمکا۔ گمان آباد ہستی میں ایک مردِ مسلماں کا یقین شکست خوردہ معاشرے کے لیے سربلندی کی نوید تھا۔ ایک انقلاب آفریں دعوت، احساسِ کمتری کا جوا اتار پھینکنے کی دعوت، اِک پُرسوز لَے میں اس نے اندلسی نظموں کا نغمہ چھیڑا، اُن نظموں کا تموّج مجھے بہالے گیا، چالیس برس ہونے کو آئے مگر اُس طلسم سے نہیں نکل سکا، شاید نکلنا چاہتا بھی نہیں،

بچپن میں شکوہ، شمع و شاعر، طلوعِ اسلام اور خضرِ راہ سے شناسائی ہوئی تھی تو اس قافلۂ شوق کا سالار اقبالؒ تھا، لڑکپن کی دہلیز سے گزر کر اوائلِ شباب کی سنہری وادی میں قدم رکھا تو اقبالؒ نے ہی نہاں خانۂ دل میں اِک جوت جگائی تھی، جو بھڑک کے شعلۂ جوالہ بنی، اندلسی نظموں کے طلسم رفتہ رفتہ مجھے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی ہم نشینی حاصل ہوئی، وقت کی طنابیں کھنچ گئیں، بیتی ہوئی صدیاں میری مٹھی میں سمٹ آئیں۔ اُن کی سربلندی پہ نازاں، اُن کی کوتاہیوں پہ دل گرفتہ، اُن کی بے بسی پہ اشک افشاں، آخری المیہ کے لیے سوگوار، میرے اللہ! اُنھیں کہاں ڈھونڈوں؟ آتشِ رفتہ کا سُراغ کہاں سے لاؤں؟ مسافتیں بے نشاں ہوئیں، منزلیں دُھندلا گئیں، ناقے بے زمام ہوئی،

آں حُدی کو ناقہ را آرد بہ وجد

وہ کارواں گذر چکا جس کے حُدی خواں دلوں کو برماتے تھے اور وہ راستہ جھاڑ جھنکار سے اَٹ گیا۔ اب لُٹے ہوئے قافلوں کا نام لیوا کوئی نہیں، وہ الاؤ سرد ہوا جس نے شبِ تاریک کا دل چیرا تھا۔ وہ شمع جل بجھی جس سے یورپ نے اکتسابِ نور کیا تھا۔ جب مسلمان نے میدانِ وغا میں شہادت کی بجائے مقتل اور مذبح خانہ کو ترجیح دی (محکمۂ احتساب INQUISITION کو یہی نام دیا جاسکتا ہے) تو اُمید غمگساری عبث تھی۔ اس خونیں ناٹک کا پہلا ایکٹ ابوعبداللہ اور فرڈیننڈ اور ازابیلا کے درمیان وہ عہدنامہ تھا جس میں نصرانی حکمرانوں نے فیاضانہ شرائط پیش کی تھیں مگر فاتح اور مفتوح کے درمیان کیسا عہدنامہ؟ شرائط کی تختی سینے پہ سجائے وہ عہدنامہ آج بھی موجود ہے، فرڈیننڈ اور ازابیلا اپنے وعدوں سے منحرف ہوئے۔ مساجد مسمار کردی گئیں، حمام ہموار کر دیئے گئے۔ جسم کی تطہیر شیطانی کام ٹھہرا، صدیوں کا علمی اندوختہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ نادر مخطوطات کے ساتھ 'کافر' مور بھی سوختنی ٹھہرے۔

وہ دور جو طارق بن زیاد کی فتوحات سے شروع ہوا تھا ابوعبداللہ کی حسرتناک مراجعت پہ جاکر ختم ہوا، ابوعبداللہ اپنے وطن میں اجنبی ٹھہرا۔ قوس کے ایک کنارے پر ذوقِ خدائی سے سرشار وہ صحرانشین تھے جن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا دونیم ہوئے۔ عبدالرحمٰن الداخل اور عبدالرحمٰن الناصر تھے اور دوسری طرف طاؤس و رباب کا دلدادہ معتمد، میدانِ جنگ میں شہامت کا پیکرِ معتمد، نازک حسیات رکھنے والا عظیم شاعر جو ہوا و ہوس کے پھندے میں اسیر ہوا بالآخر اس کی اپنی شمشیرِ آبدار زنجیرِ پا بنی۔

سات صدیوں میں چشمِ فلک نے کیسے کیسے انقلابات دیکھے،

ہسپانیہ کے ساحل پہ غازیوں کی پہلی لہر کا ورود، عبدالرحمٰن الداخل کی قوتِ ارادی، عبدالرحمٰن الناصر کا پُرشکوہ دربار، المنصور کی مسلسل فتوحات جس سے نصرانی حکمرانوں کا زہو آب ہوا، پھر طوائف الملوک کا آپس میں دست بہ گریبان ہونا، نصرانی حکمرانوں کے ساتھ ساز باز کرکے اپنوں کے خلاف صف آرا ہونا، جلال و جمال اور جوشِ نمو سے نسلی تعصب اور قبیلہ پرستی تک، مئی وحدت سے ملت کی قبا چاک ہونے کا سفر بڑا اندوہناک تھا۔

اُندلس میں امارتِ اُمیہ کا بانی عبدالرحمٰن بمشکل بیس برس کا تھا جب اُس کے عم زاد مروان نے بنوعباس سے شکست کھائی اور اُمیہ خاندان کا چراغ گُل ہوگیا۔ ہوسِ زر اور آرام طلبی کے باعث ایک عرصے سے زمامِ سلطنت پہ اُن کی گرفت ڈھیلی چلی آرہی تھی۔ خارجی تحریک کی وہ لہر جس نے شمالی افریقہ میں بے اطمینانی پیدا کی تھی بغداد تک آن پہنچی تھی۔ بنو اُمیہ اس کا تدارک نہ کرسکے اور دربار میں قیسی اور یمنی اُمرا کے مابین توازن قائم نہ رکھ سکے۔ اُموی خاندان کا قتلِ عام ہو رہا تھا، بنوعباس کا پہلا خلیفہ ابوالعباس ہر فرد کو تہ تیغ کرنے کا عزم کرچکا تھا۔ عبدالرحمٰن عباسی سپاہیوں کے نرغے سے جان بچاکے بھاگا۔ فلسطین، شام اور مصر سے ہوتا ہوا شمالی افریقہ پہنچا اور بربری قبیلے نفزہ میں جہاں اس کی ننھیال تھی، پناہ گزین ہوا۔ وہاں قبائلی سردار رد کھائی سے پیش آئے۔ افریقہ کا والی بھی امویوں کے خلاف ہوگیا۔ عبدالرحمٰن چار برس صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھانتا رہا مگر موجِ حوادث سے نہ گھبرایا، جِلا وطنی کے اس دور میں اس کا سابق غلام بدر ہی اس کا تنہا

رفیق تھا۔ اس کا عزم آہنی جب شمالی افریقہ میں پذیرائی نہ ہوئی تو وہ اندلس جانے کا منصوبہ بنانے لگا، جہاں وفادار جنود نے ان کی ہمت بڑھائی، اندلس کے اُموی امراء کی اعانت سے وہ ایک اجنبی ملک میں داخل ہوا، اور والیٔ قرطبہ کو شکست دے کر وہاں کا حکمران بنا۔ موروں کو ہسپانیہ فتح کئے پچاس برس ہونے کو آئے تھے۔ شورشوں کے بعد اولین زمانے کی بدامنی کا دور ختم ہو رہا تھا۔ عبدالرحمٰن نے ایک ایسا ملک فتح کیا تھا جس کی حدیں موجودہ سپین اور پرتگال سے ہم کنار تھیں۔ اموی کے زیر نگیں اُندلس میں خوشحالی اور ثقافت کا ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔

لفظ مور کو ہ اطلس کے بربر اور شمالی افریقہ کے قبائل کے لیے مستعمل ہوا جو طارق بن زیاد کی معیت میں ہسپانیہ کے ساحل پر اُترے تھے۔ غازیوں کی پہلی جماعت جس نے چند ہفتوں میں جنوبی ہسپانیہ کا بیشتر حصہ فتح کر لیا تھا اور طلیطلہ تک پہنچ گئی تھی، بربروں پہ مشتمل تھی۔ بعد میں آنے والی فوج میں بھی عرب نسبتاً کم تعداد میں تھے، گو وقت گذرنے کے ساتھ عرب اُمراء کاروبارِ سلطنت میں دخیل ہو گئے۔

دشمن بھی عبدالرحمٰن کی شجاعت، اولوالعزمی اور حُسنِ تدبیر کے معترف تھے، عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور عبدالرحمٰن کا سب سے بڑا حریف اور مدّاح تھا۔ اور ان خوبیوں کے باعث اسے "قریش کا شاہین" قرار دیتا تھا۔ عبدالرحمٰن ایک حساس شاعر بھی تھا۔ اس کی شاعری میں شروع دور کی تلخی جھلکتی ہے، [illegible] کی روایت کے مطابق وہ اپنی کامرانی پہ فخر و مباہات کا اظہار بھی کرتا ہے:

سوزِ دروں سے سُلگتا ہوا وہ میں ہوں تھا تنِ تنہا
جس نے دو دھاری شمشیر برہنہ کی
صحرا کو عبور کیا اور سمندر کو چیرتا چلا گیا
بیابان اور لہریں سخر کر کے ایک سلطنت بزور حاصل کی
اور صلوٰۃ کے لیے ایک مسجد کی بنا رکھی
لشکر جو تتر بتر ہو چکا تھا، از سرِ نو منظم کیا
اور اُجڑی بستیوں کو پھر سے بسایا

عبدالرحمٰن کے دادا ہشام نے دمشق کے قریب ایک نزہت گاہ بنوائی تھی جس کا نام الرُصافہ رکھا تھا۔ عبدالرحمٰن نے قرطبہ کے نواح میں ایک پُرفضا باغ لگوایا اور اُس کو بھی رُصافہ ہی نام دیا۔ گلشنِ رُصافہ کو اُجڑے صدیاں بیت گئیں، رُصافہ ہسپانوی زبان میں ارایزافہ ہوا۔ سان فرانسسکو ارایزافہ نام کی ایک مسیحی خانقاہ اسی جگہ تعمیر کی گئی جس کے کھنڈرات باقی ہیں، وقت کا سیل رُصافہ اور ارایزافہ دونوں کو بہا لے گیا، ایک روز اُسی رُصافہ میں ٹہلتے ہوئے عبدالرحمٰن کی نظر کھجور کے ایک درخت پر پڑی، غریب الوطنی میں تنہا اور اُداس، اور اس کی نگاہوں میں شام کے صحرا میں ہجومِ نخیل کا نقشہ کھنچ گیا۔ بچھڑے دوستوں اور عزیزوں کی یاد میں مضطرب ہو گیا اور شدتِ جذبات سے بے اختیار ہو کر رودرد کے یہ اشعار کہے:

نشأت بارض انت فیہ غریبۃ
تو ایسی سرزمین میں پل رہا ہے، جہاں تو اجنبی ہے
فہا انت فی الاقصاء والمنتہائی مثلی
وطن سے دُوری میں تو میری مانند ہے

سوزِ آرزو اور اہل وعیال سے دُوری میں تُو بھی میری طرح ملول ومہجور ہے۔
تجھے ابرِ بہار اس بارانِ رحمت اور آبِ زلال سے سیراب کرے جس کے جل تھل سے زمین شاداب ہوتی ہے۔

مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حُور ہے تُو
پردیس میں نامبور رہوں میں — پردیس میں نامبور ہے تُو
مغرب کی ہوا میں بارور ہو
ساقی ترا نم سحر ہو

یہ تو تھا عبدالرحمٰن کے اشعار کا آزاد ترجمہ مگر جس طور نظم کے دوسرے بند میں شاعر نے عبدالرحمٰن کی علو ہمتی کا احاطہ کیا اور وہ بھی اس کی زبانی وہ اقبالؒ ہی کا حصّہ تھا:

عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مُبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوزِ دروں سے زندگانی — اُٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا جہاں ہر کہیں ہے

اس شعر کا حق دار عبدالرحمٰن الداخل کے سوا کون ہو سکتا تھا،

ہمت کو شناوری مُبارک
پیدا نہیں بحر کا کنارہ

عبدالرحمٰن الداخل کا عہد قرطبہ کی عظمت کا نقطۂ آغاز ہے، قرطبہ صدیوں تک اسلام کا علمی اور ثقافتی مرکز رہا، اندلس سے موروں کے انخلا کے بعد بھی یہ شہر ہسپانوی زندگی پر اثر انداز رہا ہمندر پار کر کے ۱۱۰۱ء میں مور قرطبہ پہنچے تھے، پانچ سو برس تک یہ شہر ایک دمکتا ہوا دارالحکومت رہا، مگر عظیم مسجد کے علاوہ اس زمانے کے آثار نہیں ملتے، سقوطِ قرطبہ کے اڑھائی سو برس بعد تک مور ہسپانیہ میں رہے مگر طلیطلہ اور سلمانکا ایسے شہروں میں بھی بہت کم نشان ہیں جن سے ظاہر ہو کہ وہاں کبھی اسلام کا دور دورہ تھا۔ بلکہ اسلامی آثار کی بجائے رُومی کھنڈرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہسپانیہ کے طول وعرض میں ایسے آثار بیدردی سے مسمار کر دیئے گئے۔

اپنے عروج کے زمانے میں قرطبہ دنیا کے اہم ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ محلات اور باغات کے اس شہر میں بے شمار کتب خانے اور مکتب تھے۔ عالم اسلام اور یورپ میں علم اور طب کے مرکز کی حیثیت سے ممتاز تھا۔ قرطبہ کے اپنے چھاپہ خانے تھے جن میں بیسیوں عورتیں قرآن کریم کی تزئین میں مصروف رہتیں، اس شہر میں لکھے ہوئے اشعار کی گونج تمام عرب ممالک میں سنائی دیتی تھی۔

اُمویوں کے دور میں اُندلس کی علمی اور ادبی زندگی اپنے شباب پر تھی، قرطبہ کے اہلِ ثروت، مہذب، متمدن اور جویائے علم تھے۔ دورِ خلافت کے ادبی کارنامے ایک عظیم سرمایہ ہیں۔

ہسپانوی عرب مصنفین میں شاعر اور مؤرخ بھی ہیں، فلسفی، طبیب، صوفی اور مہندس بھی، جہاں جہاں عربی زبان کا چرچا ہے اُن کے نام جانے پہچانے ہیں۔ الحکم خود بڑا عالم تھا اور علم کی جستجو میں مدام سرگرم رہتا، اس کے کارندے نادر مخطوطات کی تلاش میں دُور دراز کا سفر کرتے اور بھاری قیمت ادا کر کے نایاب کتابیں حاصل کر لیتے، الحکم علماء کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتا اور طرح طرح سے اُن کی مدارات کرتا، بیرونی دنیا کے دانشوروں کے لیے ہسپانیہ ایک مقناطیسی کشش رکھتا تھا، نویں صدی عیسوی میں عباسی خلیفہ مامون نے بغداد میں ایک مشہور جامعہ کی بنیاد رکھی تھی جہاں یونانی کتابوں کے ترجمے کئے جاتے اور اُن پر حاشیے لکھے جاتے تھے۔ علم کا یہ سیل اسلامی ممالک سے گذرتا ہوا ہسپانیہ تک جا پہنچتا اور وہاں کے دانشوروں کو دعوتِ فکر دیتا، یورپ کے ہر حصے سے تشنگانِ علم قرطبہ آتے اور واپس جا کر علم کی ضو اپنے ملک میں پھیلاتے۔ سقوطِ قرطبہ کے بعد بھی دنیائے علم و ادب کی یہ خدمت جاری رہی۔ طلیطلہ میں دارالترجمہ قائم ہوا جہاں ہسپانوی اور یہودی مترجمین نے اہم عربی کتب کا ترجمہ کیا، سکاٹ لینڈ سے مائیکل اور جرمنی سے ہرمان برسوں وہاں مقیم رہے۔

رومیوں کے زمانے میں بھی قرطبہ نے عظیم شخصیتوں کو جنم دیا تھا۔ ٹریجن، ہارڈیان اور فلاسفر سینیکا جس نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا:

"دنیا پیشہ ور تیغ زنوں کی تربیت گاہ ہے جہاں لوگ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں"

"جب وقار کی پرکھ دولت سے ہونے لگے تو اصل اقدار طاقِ نسیاں کی زینت ہو جاتی ہیں"

سینیکا کی نگارشات میں مسئلہ جبر و قدر پہ مباحثے ہیں، وہ جھوٹی نمود و نمائش سے احتراز کرنے کا سبق دیتا ہے، نامساعد حالات میں صبر کرو، دورِ ابتلا میں متانت کا دامن نہ چھوڑو اور اظہارِ جذبات سے گریز کرو، خوشی اور غم سے بے نیاز رہو۔

زندگی در گردنم افتاد بدیں چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، عبدالرحمٰن الناصر کا جگمگاتا ہوا الزہرا زمانے کے تند و تیز جھکڑ نے نگل لیا، پچاس برس ہوئے محکمہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے اُس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ کینیرا، اور برازیلا کی طرح الزہرا اور الزہیرا ایسے محلات بیک وقت دارالسلطنت بھی تھے اور مدنی زندگی کی تمام ضروریات سے آراستہ بھی۔ اُمیہ عہد میں قرطبہ موجودہ شہر کے مقابلے میں بہت وسیع

تھا۔ مضافات دُور دور تک چلے گئے تھے۔ سڑکوں پہ روشنیاں نصب تھیں، جانبِ شمال دامن کوہ خوبصورت مکانوں اور زرخیز باغوں سے پٹا پڑا تھا، الشقندی کے الفاظ میں "قرطبہ حکومت کا دارالخلافہ، سائنس کا مرکز، اسلام کا روشن مینار اور رؤسا اور عمائدین کی آماجگاہ تھی، اس کے باشندے قانون کا احترام کرتے تھے، حکمران علماء کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے۔ انھیں جلیل القدر عہدے دیتے اور ان کی رائے کو وقعت دیتے تھے۔"

الفقیہ یہ کی شاہی منڈی میں بازاروں کی تقسیم پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے مطابق تھی، کتب فروش، کپڑوں کے سوداگر، قصاب اور ماہی فروش، زین ساز، پاپوش ساز اور چٹائی بُننے والوں کے بازار علیحدہ تھے، درزی، بافندے، جوہری، اسلحہ ساز، لوہار اور رنگریز بازار میں کام کرتے تھے۔ البتہ ظروف سازی اور چمڑے کی رنگائی شہر سے باہر ہوتی تھی۔ ایسے کام کے لیے وسیع پیمانے پر بھٹے بنانے اور گڑھے کھودنے کی ضرورت تھی، عرب اور خوشحال مولدین کو نفیس چیزیں خریدنے کا شوق تھا۔ کانیں ساز و سامان سے پُر تھیں۔ اعلیٰ قسم کے کپڑے المیریا اور ملاغہ سے، ریشم بلنیسیا اور غرناطہ سے، سامانِ حرب طلیطلہ سے، قالین بانی اور چمڑے کے کام کے لیے قرطبہ کی شہرت دُور دور تک تھی۔ مشرقی ممالک کے علاوہ جرمنی اور شمالی ملکوں سے بھی سامانِ تعیش درآمد ہوتا تھا۔ یہودی سوداگر دُور دراز ملکوں کا سفر کر کے گراں اور نایاب اشیا لاتے تھے، خلیفہ کے ایک معتمد کا نام صاحبِ طراز تھا۔ سفیروں کے لیے خلعت ہائے فاخرہ اس کی نگرانی میں تیار ہوتی تھیں، اُس کا چناؤ فنونِ صنعت سے آگاہی اور پیشہ وارانہ مہارت کی بنا پر ہوتا تھا۔

مدنی زندگی میں قرطبہ کی ترقی قابلِ رشک تھی، شہر کی صفائی، پانی کی بہم رسانی، مکانات کی کشادگی، راستوں کی پختگی، حمام اور کتب خانے، قرطبہ کے عام گھر یورپ میں بہترین تھے، وہ ایسے ہی گھر تھے جیسے آج بھی جنوبی ہسپانیہ اور پرتگال میں نظر آتے ہیں۔ بیرونی حصہ سپاٹ، بے رنگ، مکان میں داخل ہونے کے لیے ایک طرف چھوٹا سا دروازہ، باہر سے پتہ نہ چلتا تھا کہ آنگن میں سیماب بار فوارے اور پھولوں سے گھری ہوئی آرام دہ نشست گاہ صاحبِ خانہ اور مہمان کی منتظر ہے، رواں فوارے کے گرد پھولوں کی بہار ہوتی، اخفا، رقابت کی حد تک اخفا، ہر گھروں کا خاصہ تھا، اسی لیے وہ مستطیل شکل کا ہوتا اور ساری توجہ اندرونی صحن پر مرکوز ہوتی، گھر کیا ایک سربستہ راز تھا جس کے پوشیدہ امکانات اہلِ خانہ کے لیے تھے۔

قرطبہ کی ایک خاص شخصیت ہے، دو شاعروں نے اس کی رُوح تک پہنچنے کی کوشش کی، ایک نے اسے "باوقار اور خلوت پسند" کہا اور دوسرے نے "خاموش قرطبہ" "نیم مُردہ" اہلِ قرطبہ اپنے مورِ اجداد کی نسبت پہ نازاں ہیں، دوسری جگہوں کی طرح اس شہر کا حُسن عام نہیں متجسس آنکھ اس کی مستور رعنائیوں سے لطف اندوز ہو سکتی ہے، ایک نظر دیکھنے سے گمان تک نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کے زمانے کے بل کھاتے ہوئے کوچوں میں کیا حُسن پوشیدہ ہے، جگہ جگہ اہلِ ثروت کی حویلیاں ہیں۔ پیچ و خم کھاتی ہوئی گلیاں مُنتہی سے چوک پہ جا ختم ہوتی ہیں، چوک کے بیچ فوارہ، اردگرد پھول ہی پھول، نارنگی، گلاب اور حنا کی خوشبو سے مہکے ہوئے پیارے پیارے دالان اور سہ دریاں جالی کی اوٹ میں بیک وقت مستور اور عریاں، طرفہ تماشا یہ کہ پائیں باغ محض گھر کی ملکیت نہیں بلکہ لڑکھتے ہوئے کوچے تک جا پہنچے ہیں۔ سرِ شام مطرب اور نے نواز کی صدا بلند ہوتی

ہے، نامانوس کانوں کو یہ آواز عجیب معلوم ہوتی ہے، ہسپانیہ یورپ کا حصہ ہے مگر یہاں ماحول مشرقی ہے۔ قرطبہ میں سفید دیواروں کے پس منظر میں نیلگوں گنبدوں کی بہتات ہے، گہرا نیلا رنگ جو اسلامی مشرق وسطیٰ میں نظر آتا ہے، پھولوں کی نمائش موروں کی وراثت ہے جو فنِ باغبانی میں ماہر تھے۔ ہسپانیہ میں ایسے پائیں باغ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتے۔

عبدالرحمٰن اور اس کے جانشینوں کے عہد میں قرطبہ مسلم ہسپانیہ کا دل تھا اور قرطبہ کا دل جامع قرطبہ تھی۔ صقلیہ کے ساحل سے گذرتے ہوئے اقبالؒ کی چشمِ خونبار نے جس مزار پہ اشکفشاں ہوئی تھی، برسوں بعد اُن کا اس سرزمین میں جانا ہوا جو عربوں کے لیے ارضِ موعودہ تھی، جہاں شمگاروں نے ایک عالیشان تہذیب کے آثار ریگ و خس سے اُگھاڑ ڈالے تھے، داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اِک شمع رہ گئی تھی اور وہ تھی مسجدِ قرطبہ۔ بے چراغ مسجد دیکھ کر شاعر کے دل پر قیامت گذر گئی۔ چشمِ زدن میں حیرتناک عروج اور حسرتناک زوال کی طویل صدیاں نظروں میں گھوم گئیں۔ اس کا دل رو رہا تھا ؎

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں ، جانے عزم نصیب اقبالؒ کا کتنا لہو پانی ہوا ہوگا تا آنکہ اس کی آہیں خونی نغموں میں ڈھل گئیں، اُس لمحۂ عالیہ میں شاعر کو جو رفعت نصیب ہوئی اس کی سرمستی 'مسجدِ قرطبہ' کے حرف حرف میں لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ نظم کے انگ انگ میں ایک دردمند دل دھڑک رہا ہے، حرمِ قرطبہ کی زیارت شاعرانہ تخیل کے لیے مہمیز تھی اور وہ ہیئتِ وقت کی گتھی سلجھانے کے لیے اپنے من میں ڈوب گیا۔

سلسلۂ روز و شب نقشِ گرِ حادثات

زمانِ مسلسل کے آئینے میں حادثات کی تشکیل ہوتی ہے۔ کارزارِ زیست میں محو و اثبات کا عمل جاری ہے، وقت کی میناکاری نت نئے نقش اُجاگر کرتی ہے۔ اقوام اور تہذیبیں مدوجزر سے آشنا ہوتی ہیں۔ سلسلۂ روز و شب کی مترنم تکرار میں لیل و نہار کی آویزش ہے، حیات و ممات کا رازہے، خیر و شر کی چشمک ہے، قہاری و غفاری کا تار و پود ہے، دن اور رات کا تانا بانا باری تعالےٰ کی قبائے صفات کے لیے تارِ حریر دو رنگ ہے کہ وہ الاوّل بھی ہے الآخر بھی، المنتقم بھی ہے، المُہیمن بھی، المُعزّ بھی ہے المذلّ بھی،

ہمارے وہم و قیاس سے ماورا وہ ذاتِ اقدس تخلیقِ ارتقا کی مظہرِ اتم ہے، اس عالمِ رنگ و بو میں اس کی صفتِ خلاقی کا ظہور وقت کے ذریعے سے ہے، روز و شب کے تواتر سے ہمیں صفاتِ باری تعالیٰ کا عرفان ہوتا ہے:

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

اللہ رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے، اِس میں اہلِ دانش کے لیے استدلال ہے (سورۃ نور)

کاروانِ وجود میں لحظہ بہ لحظہ شانِ وجود کی جھلکیاں اور نوع بنوع تبدیلیاں اس ذات کو پہچاننے کا ایک ذریعہ ہیں۔ بطنِ گیتی میں خوابیدہ امکانات اُس تصویر کے اُبھرتے ہوئے خدوخال کی مانند ہیں جو مصوّر کے ذہن میں محشر بپا کیے ہوتے ہیں۔ وقت کے وسیلے اور سعیِ انسان سے وہ قرطاس پہ منتقل ہوگی اور اس میں رنگ بھرے جائیں گے، سازِ فطرت تشنۂ مضراب ہے، مرِ یدی نغمے تاروں سے نکلنے کے لیے زخمہ گر کے منتظر ہیں، صاحبِ عزم و ہمت کے لیے ان گنت امکانات کے دروا ہیں

کم عیار قومیں قعرِ مذلت میں دھنستی چلی جاتی ہیں مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انسان تسخیرِ کائنات کا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے اور یہی اس کا مقدر ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ (سورۃ رحمٰن)

اے گروہِ جن و انس اگر تمھیں قدرت ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ (اور) زور کے سوا تم نکل سکنے ہی کے نہیں۔

سلسلۂ روز و شب عرصۂ محشر بھی ہے، زمانے کی کسوٹی برابر پرکھتی رہتی ہے، زرِ کم عیار کی حیثیت خس و خاشاک سے بیش نہیں، انسانی کاوش کی بے ثباتی اور ناپائیداری چشمِ بینا پہ عیاں ہو جاتی ہے۔ وقت کا سیل بے اماں تخلیقاتِ ہنر کو بہالے جاتا ہے۔ جملہ موجودات فنا کی زد میں ہیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۚ

جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے اور تمھارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحبِ جلال و عظمت ہے باقی رہے گی۔ (سورۃ رحمٰن)

دوام و بقا کی بشارت ہے۔ ایسے فن پارے کے لیے جس کی اساس عشق پر استوار ہو کہ اس کے سنگ و خشت میں ایمان و ایقان کی آمیزش ہے، وقت کا سیل سیلِ عشق کے سامنے بے بس ہے۔

اگر سلسلۂ روز و شب زمانِ مسلسل ہے تو حقیقی زماں کیا ہے؟

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

ماضی امروز گذشتہ ہے اور مستقبل امروزِ آئندہ، امروز کے سامنے دی و فردا بے حقیقت ہیں حقیقی زماں کی اصل صفت مسلسل تخلیق ہے۔ اقبالؒ کو یقین تھا کہ عمیق فکر کی تہ میں جب شعوری کیفیتیں ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں ہمیں دورانِ حقیقی کا سراغ ملے گا، وجدانی طور پر دوران کے مختلف لمحوں کو بیک وقت گرفت میں لینا ممکن ہے۔ ایک آنِ واحد جو کُل پر طاری و ساری ہو، اس عصری کُل میں ماضی، حال اور مستقبل یوں مربوط ہیں کہ انھیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ دورانِ حقیقی کے اس عصری کُل کو قرآنِ حکیم نے تقدیر کہا ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ وَمَا اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝

"ہم نے سب چیزوں کو ایک مقررہ تقدیر پر پیدا کیا ہے، ہمارا حکم ایک تھا، آنکھ کی جھپک کے مانند تیز۔"

دورانِ حقیقی ازلی اور ابدی ہے، مرورِ ایام کے علی الرغم یہ گذرنے کی خاصیت سے مبرا ہے اور تقسیم و ترتیب سے بے نیاز۔

زمانے کی حقیقت کو سمجھے بغیر حیاتِ جاوداں کا راز پانا ناممکن ہے کیونکہ اس میں خود زندگی اور تقدیر مضمر ہیں۔

من حیاتم، من مماتم، من نشور　　من حساب و دوزخ و فردوس و حور　　(اقبالؒ)

یہ وقت لمحات کی تکرار نہیں بلکہ اس کا ہر لمحہ جداگانہ ہے، ہر آنے والا لمحہ اَن گنت امکانات کا حامل ہے، اسی لیے اس کے متعلق پیشگوئی نہیں کی جاسکتی، کائنات تکمیل شدہ شے نہیں جو خدنگِ جستہ کی طرح تیر اندازکے ہاتھوں بہت پہلے نکل چکی بلکہ ہر لحظہ ارتقا پذیر ہے اسی لیے دمادم صدائے کُن فیکون آرہی ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ

"وہ (ذاتِ مطلق) ہر لحظہ ایک نئی حرکتِ ارتقائی میں ہے۔"　　(سورۃ رحمٰن)

ع　ہر نفس صد رنگ می گیرد عنانِ جلوہ اش　　بیدلؔ

زندگی کی تگ و دو میں منہمک ہو کر ہم سلسلۂ روز و شب کو اصل وقت سمجھتے ہیں اور یوں زماں کی اصل حقیقت سے اغماض برتتے ہیں۔

اصل وقت از گردشِ خورشید نیست　　وقت جاوید است خود جاوید نیست
زندگی از دہر و دہر از زندگی است　　لَاتَسُبُّوا الدَّهْرَ فرمانِ نبیؐ است　　(اقبالؒ)

حقیقی دوران کو ہم پیمانۂ امروز و فردا سے نہیں ناپ سکتے۔

ماحول کو گرفت میں لینے کے لیے ہم نے زمان کو ساعتوں اور ثانیوں میں تقسیم کرلیا تھا حتیٰ کہ یہ ہماری فطرتِ ثانیہ بن گئی اور اس پہ حاوی ہونے میں ہمیں دقت پیش آنے لگی، یہ مصنوعی جبلتیں خود ساختہ ہیں جن میں خرد ٹامک ٹوئیاں مارتی ہے، اور تسلسلِ وقت کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پاتی۔

ع　خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه　　(اقبالؒ)

قیود سے آزاد ہو کر عالمِ وجدان میں اقبالؒ کو حقیقی دوران کا ایک لمحہ ارزاں ہوا جہاں مکاں تھا نہ زماں، درد و کرب، لذت و آسودگی کا ایک لمحہ جو بیکراں ہو کر برسوں، قرنوں پہ محیط ہو گیا، ایک غیر منقسم لمحہ جس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک اکائی میں ضم ہو گئے۔ ایک لمحۂ منزہ جو اپنے دامن میں اسلام کے عروج و زوال کی داستان سمیٹے ہوئے تھا۔

مسجد کی سطوت و شوکت، رعنائی و زیبائی ایک دردمند دل پہ یلغار کر آئی کہ وہ بیک وقت جلیل بھی ہے اور جمیل بھی۔

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

ایک فنی شاہکار دیکھ کر اقبالؒ کا ذہن مسجد کی بنا رکھنے والوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس شعر کو پڑھتے ہی عبدالرحمٰن الناصر کا شعر یاد آتا ہے جس نے مسجد کی توسیع میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

اِن البناء اذا تعاظم قدرہٗ اضحیٰ یدلُّ علیٰ عظیمِ الشّان

کسی عمارت کا عالیشان ہونا اشارہ کرتا ہے۔ اس امر کی جانب کہ اس کا بنانے والا عالیشان ہے۔

مسجد کی بنیادیں سادہ مجاہدوں نے پُر کیں، اس کی بلند و بالا توسیں اور محرابیں 'مہذب دیووں' کا کارنامہ ہے حُسن کے دو مظاہر ——— جلال و جمال ——— مسجد کا حُسن دوبالا کرنے کے لیے یکجا ہو گئے ہیں، جلال سطوت و جبروت، کا آئینہ دار ہے اور جمال رحمت اور لطافت کا، "دلبری با قاہری" کا عکسِ جمیل،

مسجد کا جلال و جمال دیکھ کر اقبالؒ کو مردِ مومن کی یاد آئی کہ وہ بھی جلال و جمال کا ایک حسین امتزاج ہے اور مادی تشبیہات سے ماوراء، کس وثوق سے اقبالؒ کہتے ہیں:

ہے تہِ گردوں اگر حُسن میں تیری نظیر،
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

مسجد کی وجاہت اور تمکنت دیکھ کر اقبالؒ وجد و مستی کی رَو پہ بہہ نکلے ہیں،

؎ تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیلؑ

اللہ اللہ خشت و سنگ کے یہ نصیب! اور پھر

ع کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مُبیں

عروس البلاد قرطبہ اور جامع قرطبہ کی کشش کیسی کیسی عظیم ہستیاں کھینچ لائی تھی، کس حسرت سے اقبالؒ نیاگانِ کہن کو یاد کرتے ہیں۔

ع آہ وہ مردانِ حق، وہ عربی شہسوار

"خُلقِ عظیم" کے وارث، یقینِ محکم کی تجسیم، پاک دل و پاکباز، شاعر کو اس دورِ نشاط افزا کی یاد نے ستایا، اُسے احساس ہے کہ وقت کا دھارا تیزی سے بہتا رہا ہے، گردشِ ایام پیچھے کی طرف نہیں لوٹ سکتی۔ شاعر کی علو ہمتی ماضی میں استقبال کی تصویر دیکھتی ہے اور سوزِ عشق سے اپنا چراغ جلاتی ہے، اس کی چشمِ بصیرت دیکھ رہی ہے کہ

رُوحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

پھر جیسے اقبالؒ بحرِ ظلمات کی تہ تک پہنچ کے اُبھر آئے ہوں اور اُمید کی شعاعیں اُن کی جبیں سے پھوٹ رہی ہوں وہ والہانہ انداز میں ملتِ اسلامیہ کو احیا کی بشارت دیتے ہیں، اس آن شاعر کو القا ہونے والا پیام عین الیقین کی صورت اختیار کر گیا، مردِ مسلماں کبھی نہ مٹ سکے گا کہ اس کی خارا شگاف اذانوں سے سحر لرزہ براندام ہوئی، دُوئی کا پردہ چاک ہوا، اور چار دانگ عالم میں توحید کا ڈنکا بجا، وُسعتِ افلاک میں اُس کی تکبیر کی گونج ابھی باقی ہے۔ اس کے سجدوں کے نشاں نقشِ خاتم کی طرح سینۂ زمیں پہ ثبت ہیں، خشکی اور تری پہ اُس کی کامرانیاں تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں، اُس کے سمندر کی موج

دجلہ و فرات و نیل تک پہنچی، اربابِ ذوق کا ندیم، میدانِ شوق کا شہسوار، نظامِ نو کا نقیب۔ کہنہ روایات کے حق میں تیغ بے رحم، مصافِ خیر و شر میں، اس کی پناہ ایک اللہ پہ کامل یقین ہے اور بس، وہ آہنگ میں سورۂ رحمٰن کی مانند یکتا ہے۔ وہ عقل کی منزل اور عشق کا حاصل ہے۔ اس کا رختہ ایک ایسے گروہ کے ساتھ استوار ہے جو لذت آشنائی چشیدہ ہے اور جو خیر و نظر میں اس کا ہمنوا ہے۔ اقبالؒ کو اسی قافلے کی جستجو ہے۔ شاعر کے دل میں ایک ہوک اٹھی، اس نے فانوسِ خیشق سے شکوہ کیا کہ وہ قافلہ کہاں رہ گیا؟ عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں کس وادی میں بھٹک گیا۔؟

مسجد کی زیارت سے اقبال کو بہجت نصیب ہوئی، درخشاں ماضی سے رجائیت کا ارمغاں ملا اور وجدان میں عالمِ اسلام کی آزادی اور سرخروئی کی نوید ملی۔

فطرت کے اصول لازوال ہیں۔ انفرادی و اجتماعی محاسبہ ناگزیر ہے۔ خودبیں و خودنگر قوم دست قضا میں صورتِ شمشیر ہے، کہ عیار کا مقدر موت ہے۔ یہ شاعر کتنا عظیم تھا کہ بدترین ایام میں قنوطیت کو پاس نہیں پھٹکنے دیا اور یاس کی غلام گردشوں میں اُمید کی مشعل جلائے رہا، اپنی خیالات میں سرگرداں، "جنتِ گم گشتہ" کا احساسِ زیاں دل میں لیے میں نے مسجد کے صدر دروازے پر دستک دی۔

تہذیب اور ثقافت کے اعتبار سے الاندلس کا دور بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک عجیب دور ہے۔ چند مورخ عمارات کی رعنائی آج بھی محفوظ ہے۔ ایک بدیع اور دلکش فن پارے میں ہمہ گیری کا عنصر ضرور ہوتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عظیم تہذیب ہی ایسا شاہکار تخلیق کر سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک معجزۂ فن اس تمدن کا احاطہ کرنے میں مدد ہوتا ہے بلکہ اس کے اثبات کی دلیل بھی ہے۔

مسجد کی بنا ۷۸۵ء میں رکھی گئی، بمرورِ ایام اس میں متعدد اضافے کئے گئے، ابوفراس ہمدانی نے کہا تھا۔

صنائعِ فاق صانعُہا ففاقت
وغرس طاب غارسہا فطابا

جن صنائع کا صانع فائق ہو وہ صنائع بھی فائق ہوتی ہیں، جس پودے کو بیجنے والا پاک ہو وہ پودا بھی پاک ہوتا ہے۔"

اس عظیم الشان مسجد کی پہلی اینٹ عبدالرحمٰن الداخل نے رکھی، دودمانِ اُمیہ کی آخری شمع وفات سے دو برس قبل عبدالرحمٰن نے مسجد کی تعمیر شروع کی تھی، اندلس میں حالات سازگار تھے، بغاوتیں فرو ہو چکی تھیں، سپہر بے ملال تھا، اس مقدس عمارت کی تعمیر خدائے بزرگ و برتر کے حضور جذبۂ تشکر کا اظہار بھی تھا کہ سب کامرانیاں اس کا عطیہ تھیں، تکمیل اس کے نیک دل، عدل پرور فرزند ہشام کے ہاتھوں ہوئی جو خود مزدوروں کے دوش بدوش تعمیر میں حصہ لیتا تھا۔ بنی اُمیہ کے حکمران مسجد کی توسیع، تزئین و آرائش مذہبی فریضہ سمجھتے تھے، کوہ مورینا کی چٹانوں کو کاٹ کر الحاکم نے ایک سڑک بنوائی جس کے ذریعے مسجد کے چار بڑے حوض پُر کرنے کے لیے تازہ پانی مہیا کیا جاتا تھا، رعایا کے لیے

پانی کی فراہمی سلطان کا ایک اشرف تحفہ شمار ہوتا تھا، وسعت اور زیبائی کے لحاظ سے عبدالرحمٰن الناصر اور ہمہ مقتدر وزیر المنصور نے گرانقدر اضافے کئے۔ پانچ سو برس بعد جب نصرانیوں نے قرطبہ پہ قبضہ کیا تو ڈیڑھ سو ستون شہید کر کے مسجد کا وسطی حصہ کلیسا میں تبدیل کر دیا مگر آج بھی قرطبہ کی خیرہ کن دھوپ باہر چھوڑ کر مسجد میں داخل ہوں تو احساس ہوتا ہے جیسے موروں کے اوّلین دور کی صدیاں لوٹ آئی ہوں۔ متناسب ستونوں کی قطاریں اور اُن پر محرابوں کا ماہی جال کھجوروں کے خنک جھنڈ کے مشابہہ ہے، جیسے جھٹپٹے کے عالم میں اُن کے کشادہ پھیلے ہوئے پتوں سے مدھم روشنی چھن چھن کے آئے، یوں بھی کھجور کے پودے کے ساتھ عربوں کو ایک جذباتی لگاؤ ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد صحرائی خانہ بدوش تھے اور لق و دق صحرا کے تپتے ہوئے سینے میں نخلستان کی جستجو ہر راہی کی منزلِ مقصود تھی۔ عملی نقطۂ نظر سے سُم ایسی محراب استعمال کرنے کا فیصلہ صائب تھا، ایک وسیع رقبے پہ چھت ڈالنے کا مسئلہ درپیش تھا، رُومی کھنڈرات سے سنگِ مرمر کے چھوٹے ستون بکثرت دستیاب تھے، یہ ستون مضبوط تھے مگر زیادہ اُونچے نہ تھے، نہ ہی ان کو استعمال میں لانے سے وسعت اور کشادگی کا احساس ہوتا، پائیداری کا تاثر دینے کے لیے معمار کو دوہری محرابوں کا سہارا لینا پڑا۔ ستونوں سے کمان کی طرح اُبھرتی ہوئی قوسیں ایسے پشتوں کو سہارا دیتے ہیں جو قوسوں کی بالائی تہ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ انداز فنِ تعمیر میں ایک نئی جہت کی نشان دہی کرتا ہے جس کی نظیر عرب ممالک میں نہیں ملتی، صحنِ نارنج سے صحنِ نخیل کی طرف آتے ہوئے اس طلسمی منظر سے نظر دوچار ہوتی ہے تو معمار کی چابکدستی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، ستونوں اور قوسوں کی اکائی جھٹپٹے کا وہ سماں نہ پیدا کر سکتی، جو دوہرے ستون اور کمانیں کرتی ہیں اور نہ بکراں فراخی کا احساس ہوتا، ان کی کثرت مل جل کر ایک عجیب کیفیت کو جنم دیتی ہے، مسجد کی حدیں دھندلکے میں گم ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شے رواں دواں ہو، بے ثغور اور فراخ، ہر جانب پھیلے ہوئے خیابان بیک وقت پُرسکون ہیں اور پُراسرار، بلند و بالا چھت، ہر سُو ستونوں کی بے پایاں تکرار، ہر ستون پر ایک ستون، ستونوں کی دوسری صف پہ محرابوں کا نثار، غیر متوقع گوشوں سے دھیمی خنک روشنی کا نفوذ، قوسوں پر پیازی اور زرد رنگ دھاریاں، رقص کناں تھرتھراتی دھاریاں، نتیجۃً نگاہ ایک نقطے پہ مرتکز نہیں ہو پاتی بلکہ لمحہ بہ لمحہ بھٹکتی ہے۔ بنانے والے جو وسعت اور فراخی کا تصور رکھتے تھے خود کتنے عظیم ہوں گے، کیا اُن کی چشمِ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ تیرہ سو برس گذر جانے پر بھی اُن کے عشق کی تجسیم زندہ و تابندہ ہوگی۔

مسجد کیا ہے ایک دلفریب نخلستان ہے جس میں صدہا سرو قد نخل ایستادہ ہیں، جیسے کسی ساحر نے ژولیدہ شاخوں اور تنا ور درختوں کو سحر سے ساقط کر دیا ہو مگر یہ طلسم کدہ آج بھی ربِّ ذوالجلال کی عظمت کا اعلان کر رہا ہے۔ تہ در تہ والانوں کی دل فروز فضا میں صلوٰۃ و درود کے پاک کلمات منجمد ہو کے رہ گئے ہیں، قرأت کی نغمگی کا ارتعاش آج بھی محسوس ہوتا ہے۔ آخر سال ہا سال ایک عالی ہمت قوم یہاں سجدہ ریز رہی۔

ستونوں اور محرابوں کا پھیلاؤ کسی عظیم گاتھک کلیسا کے مقابلے میں منتشر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ صاحبِ ایمان کے لیے مسجد کا کوئی خاص حصہ عبادت کے لیے وقف نہ تھا، بلکہ وہ تو کہیں بھی نماز ادا کر سکتا تھا۔ مسجد کا

درمیانی حصہ عدالت اور مدرسے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اسلام میں دین اور روزمرہ کی زندگی میں بُعد نہیں، یہاں علم و فضل کے باب کھلتے تھے۔ یورپ بھر سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بُجھانے آتے تھے۔ ایک گوشے میں قاضی القضاۃ مسلمانوں کے مابین قضیے چکاتا تھا، منصب کے لحاظ سے قرطبہ کا قاضی پورے طور پر خود مختار تھا۔ اُس کے فیصلے قرآن اور حدیث کی روشنی میں ہوتے تھے۔ اس عہدۂ جلیلہ سے سلطانِ وقت بھی خم کھاتا تھا، قاضی کی عدالت میں امیر و وزیر اور ایک عام شخص کے حقوق مساوی تھے۔ جب منارے سے اذان کی صدا بلند ہوتی۔ عدالت اور مدرسے کا کام عارضی طور پر رُک جاتا، جامع قرطبہ اسلام اور قدامت پسند مذہبی رُجحانات کی محافظ رہی، مسلم ہسپانیہ میں عمران کو ہمیشہ فقہا اور مُلّاؤں سے واسطہ پڑتا تھا، فلسفہ، سائنس، شاعری اور قدامت پسندی میں بسا اوقات چپقلش بھی ہوتی۔ مگر علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی جاری رہی۔ حتیٰ کہ یورپ مسلم ہسپانیہ سے اکتساب کرنے لگا۔

۱۲۳۵ء میں قسطیلیہ کا فرماں روا فرڈیننڈ قرطبہ پر قابض ہو گیا اور مسلمانوں کے لیے مسجد کا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ مسجد میں سب سے پہلا چیپل سقوطِ قرطبہ کے فوراً بعد بنایا گیا۔ کلیسا کی تعمیر کے لیے مرتبع چیست جگہ جگہ سے اُکھاڑ دی گئی جالیاں توڑ دی گئیں اور ستون گرا دیئے گئے۔ سنگِ سماق اور زبرجد کے ستون، سنگِ مرمر کے ستون، سپید، سیاہ، سبز اور مے گوں ستونوں کی چند قطاریں منہدم کر کے ایک چھوٹے کلیسا کے لیے جگہ بنالی گئی تھی مگر ہیئت کے لحاظ سے ایک وسیع رقبہ اب بھی مسجد کے مماثل تھا۔ سولہویں صدی عیسوی تک یہی کیفیت رہی، کارلوس تخت نشین ہوا تو خداوندانِ کلیسا کو ایک ایسا موقعہ ہاتھ آیا جس کے وہ ایک عرصے سے منتظر تھے، کلیسا کو قطعی طور پر مسجد سے علیحدہ کرنے کے لیے انھوں نے مزید ردّوبدل اور تعمیرات کی اجازت مانگی۔ فرڈی نینڈ اور ازابیلا مورخِ تعمیر کے قدردان تھے وہ اس دخل اندازی کی اجازت نہ دیتے مگر کارلوس جنوب کے حالات سے قطعاً بے خبر تھا اور اسی لاعلمی میں اس نے اجازت دے دی۔ نصرانی معمار تیزی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور مسجد کے عین درمیان میں ایک بے ہنگم عمارت کھڑی کر دی۔ عبدالرحمٰن الناصر کے بنائے ہوئے منار کی چوٹی پر شمنت رافیل کا بُت نصب کیا گیا، پھر گرجا کے گھنٹے لٹکانے کے لیے ایک درجہ ایزاد کیا گیا، اتنا غیر متناسب جیسے دو گنا بنا کر دونوں طرف سے پچکا دیا گیا ہو۔ یہ تو کانٹھ کلیسا کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ نہ ہی اس میں مینار مسجد کی رعنائی ہے۔ جب کارلوس کا گزر قرطبہ سے ہوا، اور پہلی بار اسے دیکھنے کا موقعہ ملا کہ اس کے ایما پر کیا حرکت کی گئی ہے تو اُسے اپنے کیے پر ندامت ہوئی اور اُس نے کہا "جو چیز تم نے یہاں بنائی ہے وہ اور جگہ بھی موجود تھی مگر جو چیز تباہ کر دی وہ اور کہیں نہیں ملے گی"۔

کلیسا ایک بدنما عمارت ہے۔ ایک لحاظ سے یہ متوقع تھا مسلمانوں کے انخلا کے بعد نصرانیوں نے جو کچھ بنایا وہ کم تر اور بدتر تھا۔ کلیسا کی تعمیر سے ہیکل سجانے کا جواز نکل آیا، چار دیواری کے ساتھ ساتھ اینٹوں کی چنائی کر کے افسردہ اُطاق بنا دیئے گئے۔ یہ تجاوزات حسِ لطیف کو مجروح کرتے ہیں، قربان گاہوں کی تعمیر سے کھُلی فضا مسدود ہو کے رہ گئی ہے۔ اصل حالت میں فرزندانِ توحید ہر سمت سے مسجد میں داخل ہو سکتے تھے۔ اندر داخل ہو کر ستونوں کے خیابان سے اُن کی

اُچٹتی ہوئی نظر اُندلس کے نیلگوں آسمان کی بے پایاں وسعتوں پہ پڑتی ہو گی ، اپنے تخیل کے مانند آزاد ،

ایک مغربی مؤرخ رقمطراز ہے " بلاشبہ جو ہوا قابلِ افسوس ہے مگر دیکھا جائے تو مطرانی کلیسا کی بیجا مداخلت اتنا بڑا المیہ نہ تھا ، سرسری نگاہ ڈالنے سے نظر ہوادار ، فراخ دالانوں میں یوں گم ہو جاتی ہے کہ کلیسا کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا ، ممکن ہے اس تعمیر سے ایک فن پارہ محفوظ ہو گیا ہو ، کون کہہ سکتا ہے کہ اصل حالت میں یہ شاہکار غارت گروں کی دستبرد سے محفوظ بھی رہ سکتا "

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے موروں پہ غلبہ پاکر بھی نصرانی عنصر مطمئن نہ ہوا ہو اور مزید داد و ڈ لینے کا خواہاں ہو ، جیسے اسلام کی روح ماضی کے غرفوں میں سے جھانک کر اُسے پریشان کر رہی ہو ، یہ ایک نصرانی ملک ہے ۔ جہاں مسلم اثرات کو شعوری طور پر دبایا گیا ہے مگر جو بظاہر بظاہر ہو کر اس دور کی یاد دلاتے ہیں ۔ یہ ایک ذی حس قوم ہے جس نے دلِ انسان کے سوا شکست خوردہ موروں کو ہر جگہ سے نکال باہر کیا ، ایک ایسی سرزمین جس نے موروں کی یاد محو کرنے کی پوری کوشش کی مگر جو ان کی شوکتِ رفتہ پہ ماتم کناں بھی رہی ، ایک ایسی تہذیب جسے یقین نہ آتا کہ آخری معرکہ جیت لینے کے بعد وہ ہور پہ غالب آگئی ہے مگر جو جانتی ہے کہ فنون لطیفہ ، فلسفہ ، طب ، ریاضی ، تاریخ ، جغرافیہ اور زراعت میں میدان موروں کے ہاتھ رہا ۔

محراب کے قریب ستونوں کی رعنائی کچھ سوا ہے ۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

دودھیا ، سپید اور گہرے پیازی رنگ ستون ، قوسین کھدائی کے باریک کام سے مزین ، محراب کا اسلوب بے نظیر ہے جس کی مثال اسلامی ممالک میں نہیں ملتی ۔ نیلگوں سطح پر قرآنی آیات کے سنہرے حروف چمک رہے ہیں ، مشرقی شکوہ کا یہ منظر یورپ کے لیے اجنبی ہے ، مؤذن کی اذان کی طرح اجنبی ، جگہ کا حسن مسحور کن ہے ، گزرے ہوئے واقعات دل پہ ہجوم کرتے ہیں ، المیہ کا ایک ایک باب نظر کے سامنے آجاتا ہے ، یہ سب کیونکر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ؟ یہ انسان کی بے تدبیری تھی یا تقدیر کی ؟ اس کی مشیت کیا تھی ؟ عمل کی آگ سرد ہوئی ، اندلسی مسلمانوں نے اپنی تقدیر اغیار کے حوالے کر دی ، انجام معلوم تھا ، جس روز تلوار نیام میں چلی گئی ، اس پاک گھر کی حرمت خطرہ ہو گئی ۔ حیف اُس قوم پہ جو سوزِ آرزو سے محروم ہو کر اپنا نصب العین کھو بیٹھے جو خون دے کر اُس کی حفاظت نہ کر سکے ، زندہ قومیں لحظہ بہ لحظہ انقلاب سے دوچار ہیں ، سوزِ آرزو سے اُن کی رگ رگ نبضِ تپاں ہے ۔

فطرت لہو ترنگ ہے ظالم نہ جلترنگ

پانچ سو برس تک مسجد کی زمیں اہلِ ایماں کے سجدے سمیٹتی رہی اور یوں دیدۂ انجم میں آسمان جاہ ہوئی ، وہی زمیں اب سیاحوں کے جوتوں تلے روندی جا رہی ہے سقوطِ قرطبہ کی جانگداز ساعت سے لے کر آج تک یہی ہوتا چلا آیا ہے ۔ پانسہ کب کا پلٹ چکا ۔ ایک فاتح ہے دوسرا مفتوح ، ایک غالب ہے دوسرا مغلوب ، شوکتِ رفتہ کا ایک نشان باقی ہے ، اللہ بس باقی ہوس ، آج بھی سیاح پوچھتے ہیں :

کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر ؟ (اقبال رح)

اقبالؒ اور ہماری ثقافتی تشکیلِ نو[1]

فتح محمد ملک

اقبال کا نظریۂ ثقافت قرآنِ حکیم سے ماخوذ ہے مگر اقبالؒ کے عہد کی دنیائے اسلام کی ثقافت ملوکیت کی پروردہ ہے:

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

تصور اور حقیقت میں اس روحِ فرسا تضاد نے اقبال کی تخلیقی شخصیت کو ہمیشہ ایک اضطرابِ مسلسل میں مبتلا رکھا۔ اقبالؒ کی فکری اور فنی سرگرمی کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ اسلام کے مثالی تصورات کے تخلیقی انکشاف سے عبارت ہے، تو دوسرا رُخ ان مثالی تصورات کو عملی زندگی کے متحرک قالب میں ڈھالنے کی جدوجہد کا آئینہ دار ہے۔ اقبالؒ کے نظریۂ ثقافت کے بھی دو رُخ ہیں۔ اپنے فلسفہ و شعر میں اقبالؒ نے اسلامی ثقافت کے مثالی تصورات کی بازیافت کا بھی حق ادا کیا ہے اور ان مثالی تصورات کے عملی ظہور کی تمنا کو بھی معجزۂ فن بنایا ہے چنانچہ پہلے میں مثالی تصورات کی بات کروں گا اور بعد ازاں ان تصورات کے عملی ظہور کے باب میں لب کشائی کروں گا۔

نظریۂ ثقافت کا خیال کرتا ہوں تو مجھے "ضربِ کلیم" کی ایک چھوٹی سی نظم "مدینۂ اسلام" یاد آتی ہے:

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں!
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

اقبالؒ نے یہاں مسلمان کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اقبالؒ کے عہد کی دنیائے اسلام میں کہیں نظر نہیں آتا۔

---

[1] اقبالؒ کے نظریۂ ثقافت پر سیمینار منعقدہ اسلام آباد میں پڑھا گیا۔

ہاں اُس اسلامی ریاست میں اس کا ظہور ممکن ہے جو ابھی تک کہیں قائم تو نہیں ہو سکی مگر "جاوید نامہ" میں جمال الدین افغانی نے جس کے محکمات کا بیان یوں شروع کیا ہے :

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز
عالمے در انتظار قم ہنوز

عالمے بے امتیاز خون و رنگ
شام او روشن تر از صبح فرنگ

نو عالمے پاک از سلاطین و عبید
چوں دلِ مومن کرانش ناپدید

عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر
تخم او افگند در جانِ عمرؓ

لایزال و دارد اتش نو بہ نو
برگ و بارِ محکماتش نو بہ نو

باطنِ او از تغیر بے غمے
ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

اندرونِ تست آں عالم نگر
می دہم از محکماتِ او خبر

نہ ہم سے ایسی دنیا پیدا ہو سکی جس کے باطن کو تغیر کا غم نہ ہو مگر جس کا ظاہر ہر آن ایک تازہ تر انقلاب سے عبارت ہو اور نہ اس دنیا میں رہنے والا وہ آدم پیدا کر سکے جو عجم کے حسنِ طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں کے ساتھ ساتھ روح القدس کا ذوقِ جمال بھی رکھتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ ہم ایسی زندگی اور ایسی ثقافت کیوں تخلیق نہ کر پائے ؟ ——— اس سوال کے جواب کی تلاش میں نکلتا ہوں تو مجھے اقبال کا وہ خط یاد آتا ہے جو انھوں نے ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کو "اسرارِ خودی" کے انگریز مترجم ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں اقبال مسلمانوں کے ابتدا ہی میں برق رفتاری کے ساتھ اقصائے عالم میں پھیل جانے کو اسلامی ثقافت کی نشو و نما میں ایک زبردست رکاوٹ قرار دیتے ہیں :

"مجھے یقینِ کامل ہے کہ کشور کشائی اسلام کے حقیقی نصب العین کا حصہ نہ تھی۔ درحقیقت علاقائی فتوحات اور ملک گیری نے اسلام کو نقصان پہنچایا۔ کشور کشائی کی اس دھن کے باعث سوسائٹی کی اقتصادی اور جمہوری تنظیم کے وہ اصول بروئے کار نہ آ سکے جو قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ میں یہاں وہاں روشن ہیں۔ بلاشبہ مکی فتوحات کی بدولت مسلمان ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں

کامیاب ہو گئے مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کے سیاسی نظریات بڑی حد تک، دوبارہ جاہلیت کے سانچوں میں ڈھل گئے اور ان کی نگاہیں، اسلام کے اہم ترین امکانات سے ہٹ گئیں[1]"

اسلامی معاشرے کی اقتصادی اور جمہوری تنظیم اور اسلام کے سیاسی نظریات میں پوشیدہ امکانات پر اقبالؒ نے "مسلم کلچر کی رُوح" کے عنوان سے اپنے مشہور خطبے میں فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے۔ اسلام کے سائنسی مزاج اور اسلام کی حرکی رُوح کے زیر اثر یونانی فلسفے کے خلاف مسلمانوں کی علمی بغاوت اور رد یونانیت کے فکری اور عملی میلان پر روشنی ڈالنے سے پہلے اقبال عقیدۂ ختم نبوت کی ثقافتی اہمیت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"اسلام میں ملائیت اور خاندانی بادشاہت کا خاتمہ، قرآن کریم میں استدلال اور تجربے سے بصیرت اندوز ہونے کے مسلسل احکامات اور فطرت اور تاریخ انسانی کو علم کا سرچشمہ قرار دینے پر زور ـــ یہ سب اسی عقیدۂ ختم نبوت کے مختلف پہلو ہیں۔"

اقبالؒ پیغمبر اسلامؐ کو قدیم اور جدید دنیا کے درمیان حدِ قائم دیکھتے ہیں۔ اُن کے استدلال کی رُو سے رسول کریمؐ کا سرچشمۂ الہام دنیائے قدیم کی چیز ہے مگر رُوح الہام دنیائے جدید سے تعلق رکھتی ہے۔ اپنے آخری حج کے بعد محمد مصطفےٰؐ نے لوگوں کو گواہ بنا کر جاہلیت کی تین رسموں کو پامال کر دینے کا اعلان فرمایا تھا اُن میں نمایاں ترین رسومات شہنشاہیت اور ملائیت کا شاخسانہ تھیں۔ اقبال بھی عقیدۂ ختم نبوت میں شہنشاہیت اور ملائیت کی نفی دیکھتے ہیں، مگر ہماری تاریخ کیا منظر پیش کرتی ہے؟ ـــ افغانی کی زبانی اقبالؒ کا جواب سُنیئے:

در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفےٰ در سینۂ او زندہ نیست
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او از نقشِ از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر!
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر!

اسلام کو دوبارہ جاہلیت بنا دینے کا یہ عمل دنیائے اسلام میں کیونکر پنپ سکا؟ ـــ اس کا جواب اقبال سعید حلیم پاشا کی زبانی یوں دیتے ہیں:-

دینِ حق از کافری رسواتر است — زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است!
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملّت از قال و اقولش فرد فرد!

---

[1] تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال، صفحہ ۱۰۰، مرتبہ ایس، اے واحد

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب کورِ ما در زاد و نورِ آفتاب!

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

شہنشاہیت اور مُلّائیت[1] کے اس گٹھ جوڑ سے اُن لوگوں کے ہاں پھر سے قیصریت قائم ہوگئی، جن کے آباؤ اجداد نے لا قیصر و لا کسریٰ کا نعرہ لگا کر عالمِ انسانیت کو عہدِ قدیم کے دھندلکوں سے نکال کر عہدِ جدید کی روشنیوں میں لا کھڑا کیا تھا۔

دنیائے اسلام میں دورِ ملوکیت کو اقبال عرب ملوکیت ARABIAN IMPERIALISM کہتے ہیں تو مولانا مودودی جاہلیتِ خالصہ کا نام دیتے ہیں۔ گویا عہدِ حاضر کے اسلام میں دائیں اور بائیں بازو کے مفکر ملوکیت کو اسلام کی نفی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اسلام کا نظامِ حیات ہی نہیں تو اسلامی ثقافت کہاں سے آئے گی؟ —— اسلامی ریاست نہیں تو اسلامی نظامِ حیات کہاں قائم ہوگا؟ —— تو آیئے پھر ایک ایسی مثالی اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد شروع کریں جس میں ملوکیت کی بجائے محمد مصطفےٰ کا نظامِ سیاست رواج پا سکے، وہ نظامِ سیاست جس میں قاہری اور دلبری یکجا ہوں، جس میں بندہ و آقا اور رنگ و نسب کی تمیز نہ ہو، جس میں الارض للہ کا عملی ظہور ممکن ہو اور جس میں انسان کے غیر مختتم تخلیقی امکانات بروئے کار آسکیں۔

خواتین و حضرات! اب ہم ۱۹۳۰ء میں ہیں اور اقبالؒ کو پاکستان کا تصور پیش کرنے کے بعد اپنے فلسفہ و شعر میں اُس مثالی قرآنی ریاست کی صورت گری میں مصروف پاتے ہیں جو ہماری منزلِ مقصود ہے اور جس میں اقبالؒ کا نظریۂ ثقافت برگ و بار لا سکتا ہے۔

یہ کہنے کے بعد کہ پاکستان کا قیام مقدر ہو چکا ہے اقبالؒ جاوید نامہ سے لے کر ارمغانِ حجاز تک پاکستان کے نظامِ سیاست و معیشت اور نظامِ معاشرت ثقافت کے خدوخال اُجاگر کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ میں اپنی آسانی اور آپ کی نجات کی خاطر یہاں اقبالؒ کی شاعری کے صرف دو گوشوں سے اعتنا کروں گا۔ پہلا گوشہ 'جاوید' کے نام کے سلسلۂ منظومات پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں اس اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہیں کہ ان میں اقبال اپنے بعد آنے والی نسلوں یعنی ہم آپ سے ہمکلام ہیں:-

اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر سوختن در لا الٰہ از من بگیر
لا الٰہ گوئی بگو از روئے جاں تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

---

[1] فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

ان نظموں میں اقبالؒ درویشی کا ایک ایسا تصور پیش کرتے ہیں جو آب و گل سے مہجوری نہیں بلکہ تسخیرِ خاکی و نوری سے عبارت ہے، جس میں عزت ہے طریقتِ حقیقی اور جس کی رُو سے :

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام　　دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

اور

شاخِ گل پر چہک و لیکن　　کر اپنی خودی میں آشیانہ

کا مسلکِ حیات اپنانا لازم ہے۔

درویشانہ زیست کا یہی مسلک اقبالؒ کی اُن نظموں میں جلوہ گر ہے جن میں اقبالؒ براہِ راست بات کرنے کی بجائے پاکستان کے مختلف علاقوں سے خیالی کردار پیدا کر کے خودنگری، خودگری اور خودشکنی کے تصورات پیش کرتے ہیں۔ ان نظموں میں اقبالؒ کُشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری کو خوابِ گراں سے جگانے اور تسخیرِ ذات و کائنات کے صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ محرابِ گل افغان ہو، ملّا بلوچ ہو، مُلّا زادہ ضیغم لولابی یا جنابِ خضر سب اپنے اپنے دائرۂ اثر میں درویشی کا یہی تصور عام کرتے نظر آتے ہیں :

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

اے مرے فقرِ غیور، فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعتِ انگریز یا پیرہنِ چاک چاک

(محرابِ گل)

عزت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دِلّی نہ بخارا

(ملّا بلوچ)

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مُدّت سے وہ درویش ہے نایاب

یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ (ضیغم لولابی)

یہ درویشی، ملوکیت و استبداد کی نفی سے پیدا ہوتی ہے :

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیشِ نمرودان بزن

اور

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

اقبالؒ کے تخلیقی کرب کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ درویشی کا یہ مثالی تصور جن مسلمان معاشروں میں جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں وہاں کے عوام 'صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک' ہیں تو خواص لُرّوان فرنگی کے مُرید۔ چنانچہ تصور اور حقیقت کے درمیان اس تضاد کو ایک کربناک بے چینی کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے اقبالؒ مرقعِ چغتائی کے دیباچے میں اگر یہ قرار دیتے ہیں کہ کاملاً اسلامی فنونِ لطیفہ ابھی وجود میں نہیں آئے تو ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے خط میں اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ کاش مسلمان کشور کشائی کی دھن میں دنیا میں پھیلتے چلے جانے کی بجائے کسی ایک خطۂ زمین میں مرتکز ہو کر اسلامی ثقافت کی تخلیق کر ڈالتے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت بھی اقبالؒ نے یہی کہا تھا کہ :

"بحیثیت ایک کلچرل قوت کے ہندی مسلمانوں کی بقا کا انحصار ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرنے پر ہے۔"

ہندی مسلمانوں نے اقبالؒ کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت تو قائم کر لی مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس پر مجھے حضرت عمر فاروقؓ یاد آتے ہیں جو مسجدِ نبویؐ کے صحن میں ایران سے لائے گئے مالِ غنیمت کے انبار دیکھ کر بے ساختہ رو پڑے تھے۔ شاید اُنھیں درویشانہ زیست کا مسلک معرضِ خطر میں دکھائی دیا تھا اور ان ہی عمر فاروقؓ نے دمِ واپسیں عامۃ المسلمین کو یہ پیغام دینا ضروری سمجھا تھا کہ میرے بعد میرے بیٹے کو ہرگز خلیفہ نہ بنانا۔ شاید اُنھیں اسلامی انقلاب کے خلاف ملوکیت کی صورت میں ردِّ انقلاب کا اندیشہ لاحق تھا، سو، خواتین و حضرات! پہلے ہمیں عرب ملوکیت ARABIAN IMPERIALISM یا جاہلیتِ خالصہ سے تائب ہو کر مسلمان بننا ہوگا تب کہیں جا کر ہم اقبالؒ کے نظریۂ ثقافت کے عملی ظہور کا منظر دیکھ پائیں گے :

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

رحیم گُل

محمد طفیل

رحیم گُل صاحب! کوہاٹ میں، شکردرہ کے رہنے والے ہیں۔ شکردرہ کا اصلی نام شکردرہ تھا۔ شکردرہ اس لیے کہ دشوار گذار مقام پر واقع ہے۔ چاروں طرف پہاڑ ہیں۔ بیچ میں ان کا گاؤں، جیسے چاند کے گرد ہالہ، جیسے جھیل میں کنول!

شکردرہ کے مغرب میں بنوں ہے۔ جنوب میں میانوالی، مشرق میں کیمل پور، شمال میں کوہاٹ۔ اِن میں سے ہر ضلع دس دس، بارہ بارہ کوس پر ہے۔ اتنی قربتیں کسی گاؤں کو نصیب نہ ہوں گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر ضلع ان کا اپنا ہے، ہر صوبہ اپنا ہے۔ یہ باتیں، اُن کے فن کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں کہ پاکستان کے ہر شہر میں ان کے فن کے جھنڈے گڑے ہیں۔ یہ اعزاز فن ہی کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ گاؤں سے شہر پہنچتا ہے، شہر سے ملک میں اور ملک سے دوسرے ملکوں میں۔!

ان کی مادری زبان پشتو ہے۔ بے شک اِن کی اُردو میں پختونی نہیں ہے مگر لہجہ میں پختونی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص پٹھان ہے مگر دنیا دی رکھ رکھاؤ میں، تکلفات میں یہ، اجی حضرت پہلے آپ، کے علاقہ کے معلوم ہوتے ہیں یعنی ساری نزاکتیں، ساری شائستگیاں نثار!

پہلے پہل جب یہ گاؤں سے کوہاٹ پہنچے تو ریل دیکھی، سینما گھر دیکھے، بڑے بڑے بازار دیکھے، بڑی بڑی بلڈنگیں دیکھیں، بھیڑ بھاڑ دیکھی تو ششدر رہ گئے۔ ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ لندن میں ہوا تھا۔ تفصیل نہ اِنھوں نے مجھے بتائی تھی، نہ میں آپ کو بتاؤں گا۔ جب ممدوح محتاط ہو تو مداح کو اُس سے بھی زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ مگر یہ وصف بھی اِن میں ہے کہ سب کچھ بتانے کے باوجود بہت کچھ چھپا لیتے ہیں۔

جب میرا کسی نے اِن سے تعارف کرایا کہ یہ رحیم گُل ہیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اچھا یہ ہیں جو مخالفین میں سے ہیں۔ میں نے اِن کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا، کیونکہ ذہن سیاسی نوعیت کا نہیں۔ اِس لیے کہ اس زمانہ میں لوگ مخالفین سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اِس دور نے نقلی آدمی بہت پیدا کیے۔ اصلی آدمی ڈھونڈنا بہت مشکل ہو گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ رحیم گُل صاحب نہ صرف میرے مخالف تھے۔ بلکہ میرے لیے دشمنی کی بھی ٹریننگ لے رہے ہیں۔ دشمنی اِن کی یک طرفہ تھی یعنی ہدف کو کچھ علم نہیں۔ دشمنی کی بنیاد بڑی معقول تھی۔ یعنی یہ کہ میں جس رسالہ کا ایڈیٹر ہوں۔ اُس میں اِن کا افسانہ نہیں چھپ رہا۔ ایسے دشمنوں کی تعداد میرے حصہ میں وافر آئی ہے۔ اس کے باوجود زندہ ہوں۔ اِس لیے کہ زندگی اور موت کا تعلق افسانہ نگاروں، مضمون نگاروں اور شاعروں سے مطلق نہیں ہوتا۔

ویسے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہر دشمن سے ڈرنا چاہیے۔ اگر ہر دشمن سے نہ بھی ڈرا جائے تو بھی پٹھان دشمن سے ضرور ڈرنا

چاہیے۔ اس لیے کہ یہ لوگ سچے ہوتے ہیں۔ دشمنی میں بھی مخلص ہوتے ہیں۔ پٹھان مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے ہیں اور ذرا سی بات پر گولی چلا دیتے ہیں۔

بہرحال دونوں حریفوں کا آمنا سامنا ہو چکا تھا یعنی محمد طفیل اور رحیم گل کا۔ مگر بزن کی نوبت نہیں آئی تھی، چنانچہ میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ رحیم گل اصلی پٹھان نہیں ہے۔ اس لیے کہ درگذر کا فن جانتا ہے۔ بخش دینے کا ہنر جانتا ہے۔

ایک دن دیکھا کہ یہ میرے خیر خواہوں میں موجود! میں نے پوچھا "خیریت؟" کہنے لگے۔

"دشمنی ختم ہو گئی!"

وجہ پوچھی تو بتایا "آپ نے میرے فلاں مضمون کی تعریف کر دی اس لیے!"

بہرحال میں انھیں کافی عرصہ تک مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس لیے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روٹھا ہوا پٹھان اتنی آسانی سے من بھی سکتا ہے۔ غرض انھوں نے مجھے حیران کر دیا۔ اس لیے کہ پٹھانوں کی دشمنیاں تو الم نشرح ہیں۔ ایسی معصومیتیں زبان زد عام نہیں!

جب رحیم گل صاحب کا پشاور میں جلسہ ہونا طے پا گیا تو میرے پاس تشریف لائے۔ کہنے لگے "پشاور میں جلسہ ہو رہا ہے منتظمین نے پوچھا ہے۔ لاہور سے کون کون آئے گا؟

میں نے گھبرا کر پوچھا "کون کون جا رہا ہے؟"

ان کا جواب "ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔"

چنانچہ یہ میرے پاس گھنٹہ بھر تک بیٹھے ہوں گے مگر ان کی زبان پر حرفِ مدعا نہ آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی خواہش ہے کہ پشاور چلوں مگر زبان سے نہیں کہہ رہے۔ اسے خود داری کہہ لیجئے۔ حجاب کہہ لیجئے یا کوئی بھی نام دے دیجئے۔ مگر مجھے ان کی یہ ادا پسند آئی۔ ورنہ پٹھان بن کر کہہ سکتے تھے۔ ایڈیٹر صیب پشاور چلنا ہو گا۔ ہیچ مچر نہیں چلے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ایسے لوگوں میں سے ہیں۔ جو بات کئے بغیر باتیں کرتے ہیں۔

انھیں اسکیچ نگاری میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ یہ خاکہ لکھ بھی سکتے ہیں۔ خاکہ اڑا بھی سکتے ہیں۔ ابھی انھوں نے بین بین چلنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ جس دن یہ اپنی آئی پہ آ گئے تو لوگ سودا کو بھول جائیں گے۔ انشا کو بھول جائیں گے۔ ایسے کٹیلے اور خوفناک فقرے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنی پڑیں گی۔ یہ تو ان کی شرافت ہے کہ ابھی تک انھوں نے اپنے اصلی فن کا مظاہرہ نہیں کیا۔

میں کچھ اور نہیں لکھ سکتا۔ اس لیے خاکہ نگاری کی طرف رجوع کیا۔ یہ اور کچھ بھی لکھ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود خاکہ نگاری کی طرف بھی راغب ہیں۔ یہ ان کی زیادتی ہے۔ جس طرح ایک شہر میں دو قطب نہیں رہ سکتے، اسی طرح میرے نزدیک ایک شہر میں دو خاکہ نگار نہیں رہ سکتے۔ مگر رہ رہے ہیں۔ یہ سب قربِ قیامت کے آثار ہیں۔

انھیں بچپن ہی سے شوق تھا کہ فلمیں بنائیں۔ چنانچہ اس پر سوچ بچار کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا۔ بیس پچیس فلمیں بنا ڈالیں۔ پانچ چھ کے بطور ڈائریکٹر فرائض سرانجام دیئے۔ چھ فلموں کے پروڈیوسر بنے۔

فلمیں بنانا ان کی زندگی کا ایک مقصد تھا۔ مقصد یہ تھا کہ پختونوں کو فلموں میں جو رول دیا جاتا تھا، وہ مناسب نہ ہوتا تھا مثلاً چوکیدار ہے تو پٹھان، کسی سخت گیر انسان کا رول ہوتا تھا تو وہ پٹھان کا۔ غرض پختونوں کو غلط انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے جو پہلی فلم "عجب خان" بنائی تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ پٹھان جو نسوار کی ڈبیا جیب سے نکال کر دانتوں اور ہونٹوں کے درمیان رکھا کرتا تھا یا چوکیدار کے فرائض مع اپنے ڈنڈے کے ادا کیا کرتا تھا۔ وہ پختون "عجب خان" میں نسوار کی ڈبیا اور ڈنڈا چھوڑ کر ہاتھ میں پستول لہراتا ہوا سامنے آیا۔ غیرت و حمیت کا نمونہ بن کر سامنے آیا۔ یعنی اُنھوں نے فلموں میں پختون معاشرہ کو پہلی دفعہ پیش کیا۔

اِن کی پہلی فلم 'عجب خان' تھی اور پہلی کتاب "تن تارارا"، فلم شاید ۱۹۶۰ء میں بنی۔ کتاب ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ یعنی یہ فلم میں پہلے گئے۔ کتاب میں بعد میں آئے۔ جیسے فلم متعدد ہفتے چلی۔ ویسے کتاب کے متعدد ایڈیشن چھپے۔ یعنی رحیم گل ادب کے بھی ہیرو بنے اور فلم کے بھی، ہیرو اِن معنوں میں کہ پہلے ہی مرحلوں میں دھاک بٹھا دی۔!

یہ شخص جس کا نام رحیم گل ہے۔ دُھن کا پکا ہے۔ منصوبے سوچ سمجھ کر بناتا ہے۔ پھر ڈٹ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے مقدر میں، خدا نے بھی ناکامی کا لفظ نہیں لکھا۔

۱۹۵۴ء میں یہ شخص، جو لاہور فلم پروڈیوسر یا ادیب بننے آیا تھا۔ اس کی جیب میں کُل چار سو روپے تھے۔ بعد میں انھوں نے خوب آسودہ زندگی گذاری۔ مکان بھی بنوایا، اور اپنے سارے ارمان بھی پورے کیے۔ میں سارے ارمانوں کی تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ ایک پنجابی ہر معاملے میں پٹھان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہاں میں اس پر گفتگو ضرور کروں گا کہ چار صد اور لاکھوں روپوں کے درمیان جو بڑا فاصلہ ہے وہ انھوں نے کیسے پاٹا! اس کی تفصیل شاید ان کی گوناگوں شخصیت کو سمجھنے میں کار آمد ہو۔

یہ چار سو روپوں سمیت لاہور پہنچے۔ تو اپنے ایک کیپٹن دوست کے پاس ٹھہرے۔ کرایہ نہ دینا پڑا۔ روٹی کا بھی بندوبست ہو گیا۔ سائیکل ان کے پاس تھی۔ چنانچہ اپنی فلم ہی کے ضمن میں حکیم احمد شجاع کے پاس پہنچے۔ اِنھوں نے کہا "حکیم صاحب! میرے پاس کچھ کہانیاں ہیں۔ وہ سُن لیں"

حکیم صاحب نے کہا "فلمیں میں تو نہیں بناتا۔ میرا لڑکا بناتا ہے۔"

رحیم گل نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ مگر میں آپ کی وساطت سے ملنا چاہتا ہوں"

انور کمال پاشا نے کہا۔ آئیڈیا کیا ہے؟ بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ چاروں طرف سے تنقیدی نگاہیں اُٹھیں۔ ٹیکنیک کا انہیں علم نہ تھا۔ ادبی انداز کی کہانی تھی۔ کہانی سُنی تو پاشا رو پڑا۔

چنانچہ پاشا کی رفاقت میں انھوں نے فن کو سمجھا۔ پاشا نے ملازمت کی آفر دی۔ ایک سال تک اسٹوری ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ اسی ایک سال میں ان کا خاصا چرچا ہو گیا۔ کئی سین فلمائے گئے جو پسند کیے گئے۔ اس کے بعد مانگ بھی ہوئی۔ پھر انڈیپنڈنٹ کام کرتے رہے۔ ازاں بعد ڈائرکشن کا بھی چانس ملا۔ پارٹنر پروڈیوسر بھی بنے۔ نام کمایا۔ روپیہ کمایا۔

قصہ یہ ہوا کہ یہ گاؤں سے آئے تو سیدھے ٹھیک ٹھاک ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل میں جو غلط روشی کا موڑ

آتا ہے۔ اس سے بچ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی معاملہ صرف جد و جہد کا تھا۔ اس کے لیے یہ شخص صد فی صد فٹ تھا۔ کیونکہ یہ شخص قوتِ ارادی کا پہاڑ ہے۔

۱۹۶۲ء میں جب یہ "بارات" نامی فلم بنا رہے تھے تو مالسہرہ میں انھیں سینے کا درد اُٹھا۔ واپس لاہور آئے تو یُوسی۔ ایچ میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ آپریشن ہوگا، چنانچہ ان کی دو پسلیاں نکال دی گئیں۔ اس کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ مزید دو پسلیاں نکالنی پڑیں گی۔ چنانچہ وہ بھی نکال دی گئیں۔

اس عرصے میں یہ اتنے کمزور اور لاغر ہو گئے کہ دیکھنے والے انھیں چند دنوں کا مہمان سمجھنے لگے۔ اس لاغری پر بھی ڈاکٹروں کا یہ فیصلہ تھا کہ اگر ان کی مزید دو پسلیاں نکالی نہ گئیں تو یہ دو تین ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں گے۔

چنانچہ ان کے رشتہ دار دوڑے آئے کہ آدمی مالدار ہے۔ مرنے والا ہے لہٰذا اس سے یہ تو پوچھ لیا جائے کہ کتنا روپیہ ہے اور کہاں رکھا ہے؟ مگر بات کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ آخر رشتہ داروں نے ان کے ایک دوست کو، اس کام پر مامور کیا کہ ایک تو اس بات کی ٹوہ لگائی جائے کہ مال کہاں ہے؟ دوسرے یہ پوچھا جائے کہ آپریشن کرانا ہے کہ نہیں؟

جب دوست نے ان سے پوچھا تو انھوں نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔ میں آپ کی دونوں باتوں کا جواب دوں گا۔ وہ یہ کہ میرا آپریشن جلد سے جلد کراؤ۔ مرنا ہے تو مرنے دو۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ روپیہ میرے پاس ہے۔ جو میں صحت مند ہو کر اپنے منصوبوں کی تکمیل پر لگاؤں گا۔ جو میرے رشتہ دار کسی لالچ کی خاطر یہاں آئے ہیں، انھیں واپس گاؤں بھجوا دیا جائے۔

یہ شخص جو اب صرف اٹھارہ پسلیوں کا مالک ہے۔ اس نے بعد میں شادی بھی کی۔ آٹھ، دس کتابیں لکھیں، متعدد فلمیں بنائیں۔ دیکھ لیجیے یہ شخص کتنے ہولناک عزائم کا مالک ہے۔

ان سے برسوں ملاقات نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو کرکٹ کے میدان میں، جہاں یہ بھی ہوتے ہیں۔ میں بھی ہوتا ہوں۔ یہ مرض مجھے بچپن سے ہے جو اب تک چلا آ رہا ہے۔ ان کا بھی یہی حال ہے، کہ ہر میچ میں موجود ہوں گے۔ یہ کرکٹ کے لیے کراچی تک پہنچ جاتے ہیں اور میں ہندوستان تک!

یہ کرکٹ کیوں دیکھتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم، اس لیے کہ اچھا خاصا وقت ضائع ہوتا ہے مگر میں اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں کہ انسان میں کوئی نہ کوئی خامی بہت نمایاں ہونی چاہیے۔ چنانچہ کرکٹ میری ایسی کمزوری ہے کہ میں اُن دنوں خاصا بے حال ہوتا ہوں۔ یہی ان کا حال ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کا حال مجھ سے زیادہ خراب ہے۔ یہ ادب میں بھی چوکے اور چھکے مارنے کے قائل ہیں اور میں اپنی پنچری ایک ایک رنز سے مکمل کرتا ہوں۔

ایک دفعہ یہ زیارت گئے ہوئے تھے۔ وہی زیارت جہاں کہ آخری دنوں قائداعظمؒ فروکش تھے۔ وہاں انھیں اچانک رات کے دو بجے درد گردہ نے آن گھیرا۔ درد ناقابلِ برداشت تھا۔ اُدھر سردی بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ مگر یہ کیا کرتے۔ بیکل ہو رہے تھے۔

ہوٹل کا ایک ایک کمرہ کھٹکھٹایا۔ ہر ایک نے ٹکا سا جواب دیا۔ ہم کیا کریں؟ جب انھوں نے پانچواں دروازہ کھٹکھٹایا تو اس سے

ایک ہپتی برآمد ہوا۔ اس نے اپنے کمرے میں بٹھایا۔ ایک گولی کھلائی۔ پہاڑ کے دامن میں سڑک کے ساتھ ہسپتال ہے۔ وہ وہاں اس سردی میں، مختصر سے لباس کے ساتھ پہنچا۔ ڈاکٹر موجود نہ تھا۔ کمپونڈر کو لے آیا۔ اس نے انجکشن لگایا۔ ایک منٹ میں قرار آ گیا۔

وہ ہپتی جو دنیا سے بیزار تھا۔ دنیا سے متنفر تھا۔ وہ اُن کے کام آیا۔ جو اُن کے ہم وطن تھے۔ جن کے مذہب نے یہ سکھایا ہے کہ پڑوسی کی مدد ایمان کی نشانی ہے۔ انھوں نے کوئی مدد نہ کی بلکہ ناگواری کا اظہار کیا۔

اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جیسے پہلے کمرے سے نفرت حصہ میں آئی تھی، اُسی طرح دوسرے، تیسرے اور چوتھے دروازے سے تو وہ وہیں دم توڑ دیتا۔ مگر ایک کے بعد دوسرا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ مگر یہ تو عزم کے پہاڑ تھے۔ یہ زیارت سے دروازہ کھٹکھٹاتے اپنے گاؤں تک پہنچ سکتے تھے مگر ہار نہیں مان سکتے تھے۔

اسی طرح یہ ایک پادری کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں۔ اُن دنوں کہ جب اُنھیں پسلیاں نکلوانے کا شوق چرایا تھا، وہاں ہسپتال میں انھیں ایک پادری ملا۔ اُس نے ان سے اجازت لی کہ میں ہر روز آپ سے آدھ گھنٹہ باتیں کیا کروں گا۔ بشرطیکہ منظور ہو ———!

وہ پادری بڑا خوبصورت تھا۔ تکلم کا بھی انداز خوبصورت تھا۔ پہلے دن کی گفتگو پر پادری نے کہا۔ میں آپ کے لیے دعا کروں گا کہ آپ کو صحت ہو۔

انھوں نے سوچا کہ ایک میرے رشتہ دار تھے جو میرے بیمار ہونے کی خوشی میں آئے تھے۔ ایک یہ شخص ہے جو اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہا ہے۔ مجھ سے کوئی مالیح بھی نہیں۔ صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ وہ میرے لیے دعا کرتا ہے کہ صحت یاب ہو! اُدھر میرے رشتہ دار دعا کر رہے ہیں کہ گاؤں سے آ گئے ہیں مگر یہ مر نہیں رہا۔ غرض انھوں نے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے واقعات سے زندگی کو مزین کر رکھا ہے۔

ان کی زندگی تجربات سے اتنی سجی ہے کہ یہ اگر اپنی زندگی کے اہم واقعات ہی بتاتے چلے جائیں، تو بھی زندگی کا لطف آ جائے۔ سرحد اور قبائلی علاقے کے باسیوں کے مزاجوں کو سمجھنے کے لیے بھی ان کی تحریریں اور ان کی گفتگوئیں، حد درجہ مسحور کن ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک روز، قبائلی اور سرحدی زندگی کے کئی واقعات سننے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک عرض کرتا ہوں:

قیام پاکستان سے پہلے ایک سکھ ایک ہندو عورت پر عاشق ہو گیا۔ وہ اُسے بھگا کر کوہاٹ لے آیا۔ ایک سید خاندان کے ہاں پناہ لی۔ بہتیری کوششیں اُن کے واپس لے جانے کے سلسلے میں ہوئیں۔ سید زادے کا جواب یہ تھا کہ اگر یہ دونوں جانا چاہتے ہیں تو لے جاؤ۔ زبردستی کوئی نہیں لے جا سکتا۔ غرض وہ وہاں برسوں رہے۔!

وہاں، جہاں کہ یہ بھاگا ہوا جوڑا پہنچا تھا، جن کی پناہ میں تھا۔ اس کا لڑکا بھی جوان ہو گیا۔ وہ لڑکا لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔ ایک روز جب کہ گھر میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس نے اس لڑکی کو پکڑا، اور اس کی عصمت کو داغدار کر دیا۔ لڑکی نے اس کا بڑا اثر

لیا۔ اس نے ایک رقعہ اپنے خاوند کے نام لکھا اور چھت سے رسّا لٹکا کر خودکشی کر لی۔ جب وُہ سکھ گھر پہنچا تو بیوی کو لٹکا ہُوا پایا۔ ساتھ ہی اُسے رقعہ ملا، تو اُس نے وہ رقعہ اُس کے والد کو دے دیا۔

جب رقعہ اُس کے والد نے پڑھا تو اُسے بڑا طیش آیا۔ اُس نے لڑکے کو طلب کیا اور اُسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور یہ کہا کہ یہ لڑکی ہمارے پاس بطور امانت تھی۔ اِس کی دیکھ بھال ہمارا فرض تھا۔ جب فرض میں کوتاہی ہوئی تو کوتاہی کا مرتکب ہونے والا کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

سکھ لڑکے پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ گو اُس کی محبوبہ مر چکی تھی مگر اُسے اُس کے والد کی فرض شناسی نے متاثر کیا۔ وُہ سکھ مسلمان ہو گیا اور ساری عمر اُن کے گھر رہا۔ وہ صاحب بڑے امیر تھے۔ ساری جائیداد اس لڑکے کے نام لکھ دی۔ اب وہ لڑکا اس تمام جائیداد کا مالک ہے اور وہیں رہتا ہے۔

رحیم گل صاحب بڑے بھلے آدمی ہیں۔ بھلے ہی بھلے، مگر یہ اُن کی طبیعت کا ایک رُخ ہے، اُجلا اُجلا، اچھے لوگوں میں بیٹھے ہوں گے، اچھی باتیں ہو رہی ہوں گی تو یہ اُن میں صدفی صد فٹ ہوں گے۔

اگر وُہ اچھے آدمی اصول اور مسلّمات سے گری ہوئی باتیں کریں گے تو یہ ایک دم رحیم گل بن جائیں گے۔ رحیم گل اِن معنوں میں کہ آگ بگولا ہو جائیں گے۔ اپنا نفع نقصان کچھ نہ سوچیں گے۔ ایک دم پھٹ پڑیں گے۔ بزرگوں کے عمامے ان کے قدموں میں ہوں گے۔

ان کی اصول پرستی نے انھیں زندگی کی دوڑ میں زیادہ قدم جمانے کا موقع نہ دیا۔ اُنھیں سود و زیاں سے غرض ہے بھی نہیں اگر غرض ہے تو اعلےٰ اقدار سے، اِن کے علاوہ سب کچھ ہیچ۔ یہ اپنی فقیری میں بھی بادشاہ ہوں گے۔ اگر اِنسان، انسان سے محبت کرے۔

غالباً بیماری کی وجہ سے، اُنھیں غصہ بہت جلد آتا ہے، بلڈ پریشر کے مریض ہیں، اس کے بعد فالج کا بھی حملہ ہُوا، یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست، نقصان انھیں اِن کی ذہانت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ جس کسی سے ملتے ہیں، جس سے گفتگو کرتے ہیں، اُسے چند لمحوں میں پہچان جاتے ہیں، کہ یہ شخص جو مجھ سے مخاطب ہے کس انداز کا ہے یا کس قماش کا ہے یعنی انھیں دوسرے شخص کی اندر کی کھوٹ کا علم ہو جاتا ہے۔

اُردو کی ڈکشنری میں ایک لفظ مصلحت ہوتا ہے، مگر ان کی زندگی کی لُغت میں مصلحت نام کا کوئی لفظ نہیں۔ کتابِ زندگی سے اس لفظ کو ربڑ کے ساتھ نہیں مٹایا۔ بلکہ بلیڈ کے ساتھ کاٹ کے پھینک رکھا ہے۔

یہ اتنا بڑا افسانہ نگار اور ناول نگار ہے۔ مگر ان کے ڈرامے ریڈیو یا ٹیلیویژن پر نہیں آسکتے کہ یہ اُن آداب سے ناواقف ہیں، جو نالائقوں کو لائق بناتے ہیں۔

اوّل تو میرا خیال ہے کہ یہ کبھی ٹیلیویژن اسٹیشن نہ گئے ہوں گے، اگر گئے ہوں گے تو نقشہ کچھ یُوں سامنے آتا ہوگا۔

میرا نام رحیم گل ہے، میں آپ کے لیے ڈرامے لایا ہوں۔"

"ڈراما؟"

"جی ہاں"

"اس سے پہلے کوئی ڈراما لکھا؟ ریڈیو کے لیے، اسٹیج کے لیے، ٹیلی وژن کے لیے!"

"جی نہیں"

"پھر آپ نے ڈراما کیسے لکھ لیا؟"

"جیسے لکھا جاتا ہے۔ میری سات کتابیں چھپ چکی ہیں جن کے متعدد ایڈیشن چھپے!"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر آپ میری بات کا جواب نہیں دے رہے!"

"آپ کی بات کا کیا جواب دوں، کوئی معقول بات پوچھیں تو جواب دوں گا!"

"کیا میں معقول باتیں نہیں کر رہا؟"

"ہرگز نہیں!"

"دیکھیے غصہ نہ کیجیے، میری بات کو درمیان سے سنیں، ہماری کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں، کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں، کچھ فنی تقاضے ہوتے ہیں اور ———"

"اور وور میں نہیں جانتا۔ سیدھی بات کرو، سیدھی بات یہ ہے کہ میرے ڈراموں کو فنی نقطۂ نظر سے دیکھیں، ملکی نقطۂ نظر سے دیکھیں، ناظرین کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے دیکھیں کسی بھی نقطۂ نظر سے دیکھیں، میرے ڈرامے پورے اتریں گے۔

"لیکن، لیکن ———"

لیکن ویکن چھوڑو، خدا سے ڈرو، یہ کہہ کر رحیم گل صاحب اپنی چھڑی اٹھا کر دروازے کی سمت چل دیتے ہیں، پروڈیوسر صاحب کہتے ہی رہتے ہیں "اجی سنیے، اجی سنیے!"

اور یہ دروازے سے نکلتے ہوئے کہتے ہیں، آپ کے پاس بیٹھ کر کون اپنا وقت ضائع کرے۔ جب تک آپ ایسے لوگ موجود رہیں گے، نہ ادب پنپے گا، نہ فن اور نہ اس ملک کی تعمیر میں کوئی حصہ ٹیلی وژن اور ریڈیو کا ہوگا!

میں زندگی کے ہر معاملے میں، رکھ رکھاؤ کا قائل ہوں، مگر جب اسکیچ لکھنے بیٹھتا ہوں تو مجھے دقتی طور پر کچھ سینہ زوری بھی بننا پڑتا ہے۔ اس لیے نہیں چاہتا ہوں کہ میں اپنے ممدوح کو ہر رنگ میں پیش کروں۔ اچھے اور برے رنگ میں، تاکہ وہ انسانیت کے زمرے سے نہ نکلے، فرشتے اللہ بناتا ہے، میں نہیں بناتا یہی وجہ تھی کہ میں نے ان سے ایک دن پوچھ لیا "کبھی عشق بھی کیا؟"

"بہت کئے"

مجھے اس جواب کی توقع نہ تھی، میں نے تو محض اس لیے پوچھ لیا تھا کہ کہیں میری تحریر کا یہ پہلو دبتا ہوا نہ رہ جائے۔ ادھر سے یہ جواب سنا تو ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے اس وقت چاہا تھا کہ یہ کہہ دیں کہ وہ ذرا سا شغل تھا۔ اور کچھ نہ تھا تاکہ میں آگے بڑھ سکوں، مگر انھوں نے کہا:

"جس طرح باغ میں طرح طرح کے پھول ہوتے ہیں، خوشبو سب کی الگ الگ، پسندیدگی کا پہلو ہر پھول میں ہو سکتا ہے۔ یہی حال میرے عشقوں کا ہے، میں ان سب پھولوں کی خوشبو سونگھنا چاہتا تھا، جتنے کہ دسترس میں ہوں۔ افلاطونی عشق کا قائل نہیں ہوں، کہ ناکامی کی صورت میں ہائے وائے کرتا پھروں، یا ناکامی کی صورت میں خودکشی کر لوں، یہ دنیا اتنی خوبصورت ہے کہ جو خودکشی کرتا ہے وہ خدائی فیاضیوں کی توہین کرتا ہے۔"

دیکھ لیجئے انھوں نے کتنی صفائی سے سب کچھ بتا ڈالا۔ حالانکہ میں تو صرف ہاں اور نہیں بات کرنے موضوع کو لپیٹ دینا چاہتا تھا، مگر یہ عشق کا فلسفہ بیان کرنے لگ گئے۔ میں وہ فلسفہ آپ سے بیان نہ کروں گا۔ ورنہ جنھوں نے اب تک عشق نہیں کیا۔ وہ بھی عشق کرنے کا تہیہ کریں گے۔

غرض یہ شخص خوبصورتی کا اسیر ہے، بلکہ غلام ہے، یہ زندہ بھی خوبصورت لوگوں کے لیے ہے، ورنہ ان کے بغیر اُن کا جینا کوئی معنی نہیں رکھتا، بالآخر ——— بالآخر لو میرج کر کے ٹھنڈے ہو گئے!

گفتگو عشق کے معاملات پر ہو رہی ہو تو انسان اتنا فرفر ہوتا ہے کہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے پوچھ لیا۔ "خان صاحب! اگر میں آپ پر خاکہ لکھتے ہوئے اُن میں سے ایک آدھ بات کا ذکر کر دوں، تو آپ پٹھان تو نہیں بن جائیں گے؟"

پوچھنے لگے "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "گولی وولی تو نہیں مار دیں گے؟"

کہنے لگے "میرا شمار جھوٹے لوگوں میں کبھی نہ ہوگا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ زندگی کو خوبصورت انداز میں گذارنے کے لیے کیا۔ میں نے عشق میں بھی کمینہ پن کو پاس پھٹکنے نہیں دیا، عشق تو دو دلوں کی طہارت کا نام ہے۔"

میرا خیال ہے کہ اب میں اس طہارت پہنے سے نکلوں، ورنہ ہم بے طہارت ہو جائیں گے۔ رحیم گل صاحب کا کیا ہے، یہ تو اس فن میں ماسٹر کی ڈگری پا جائیں گے۔

یہ اپنے علاقے میں یعنی کوہاٹ میں مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ضلعی سطح پر ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ دن رات کام کیا، لوگوں کو منظم کیا اور لوگوں کو اس سازش سے آگاہ کیا کہ یہ انگریز اور ہندو مل کر کرنا چاہتے تھے۔

اس کے لیے انھیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ کیونکہ سرحد کے لوگ خاص طور پر دیہاتوں کے رہنے والے جری اور بہادر سہی، مگر وہ ملکی سطح پر سیاست کو سمجھتے نہ تھے۔ پھر ان دنوں سرحد میں حکومت بھی کانگرس کی تھی۔ لہٰذا اور بھی دشواریاں تھیں۔

۱۹۴۲ء میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو یہ اپنے گاؤں سے تیس پینتیس آدمیوں کا جتھہ لے کر کوہاٹ پہنچ گئے۔ جب کوہاٹ کے لوگوں نے یہ جذبہ اور ایثار دیکھا تو آفرین کہا۔ ساتھ ہی یہ کہا، سول نافرمانی کی تحریک شہر سے اُٹھے گی۔ ابھی کوہاٹ مر نہیں گیا، گاؤں کی باری بعد میں آئے گی۔

چنانچہ انھوں نے بھی اپنے علاقے کو ریلیز نڈم کے لیے تیار کیا۔ ووٹنگ کے وقت بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ کیونکہ حکومت کانگرس کی تھی۔ وہ قدم قدم پر روڑے اٹکاتی تھی اور یہ قدم بہ قدم آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

انھوں نے انہی دنوں اضلاعی لیڈروں کو تقریریں لکھ لکھ کر دیں، جوش و جذبہ ان کے کام آیا اور وہ تقریریں جان دار ثابت ہوئیں۔ وہیں سے لکھنے کی رہبرسل ہوئی۔ وہ لگن وہ جذبہ بعد میں ان کے ادیب بلکہ نامور ادیب بننے میں ممد و معاون ہوا، اس لیے تو کہتے ہیں، کہ نیت بخیر ہو تو انجام بھی بخیر ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نیت بخیر کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، مگر خلوص کی کمی کی وجہ سے اُن کی آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتی ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی آواز شروع میں مدھم ہوتی ہے، مگر خلوص پر مبنی ہوتی ہے، اس لیے چار دانگ سُنائی دیتی ہے۔

ان کی عمر چھپن (۵۶) سال ہے۔ کام سارے جوانوں والے، بلکہ نوجوانوں والے، آپ خود ہی دیکھ لیں کہ انھوں نے جو ناول لکھا "جنت کی تلاش" اسے کوئی نوجوان ہی لکھ سکتا تھا۔ مگر اسے لکھا ایک ادھیڑ عمر شخص نے، معلوم ہوا کہ نوجوانی عمر کے کسی حصہ کا نام نہیں، نوجوان ساٹھ برس کا بھی ہو سکتا ہے اور بوڑھا پچیس برس کا بھی۔

بات سچے جذبہ اور ماحول کی ہوتی ہے۔ اگر یہ اپنے گاؤں میں پڑے رہتے ——— انسانی جنگل میں داخل نہ ہوتے، یعنی شہروں کی جانب رُخ نہ کرتے، مطالعہ اور مشاہدہ کا موقع نہ ملتا تو انھوں نے بھی اپنے ضلع کے کسی اسکول میں بیٹھ کر آج کل سٹرائیک میں حصہ لیا ہوتا۔ مگر انھوں نے شہر کا رُخ کیا، جہاں انسان کا انسان سے رابطہ زیادہ وسیع ماحول میں استوار ہوا۔ مایوسیاں بھی ہوئیں اور اُمیدوں کے بھی دیئے روشن ہوتے دکھائی دیئے۔

چونکہ ان کے مزاج میں سیر و تفریح کو زیادہ عمل دخل ہے اس لیے اس چسکے نے "جنت کی تلاش" میں بھی پس منظر کا کام دیا اور یہ رویہ اس ناول کا جان دار پہلو ہے پھر اس ناول کے جتنے کردار ہیں، وہ بول رہے ہیں، چل رہے ہیں، محسوس ہوتے ہیں، دکھائی دیتے ہیں، یہ کمال کوئی معمولی کمال نہیں، اگر یہ پلاٹ مصنوعی ہے، تو بھی پیش اس انداز سے کیا گیا ہے کہ وہ بتاتا ہے کہ واقعی کوئی امتل تھی۔ جو کہ رہی ہے کہ انسان میں بنیادی طور پر نیکی نہیں ہے، تہذیب نے مذہب میں نیکی ڈالی، ورنہ انسان اندر کے شر کو فتح نہیں کر سکا۔

دو برس پہلے کی بات ہے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ کہنے لگے، فالج نے بُرا حال کر دیا ہے۔ مگر مجھے ابھی کچھ کام کرنے تھے۔ اب کیا ہوگا؟

میں نے تسلی دی، اگر آپ کچھ کرنے کا اِرادہ رکھتے ہیں تو صحت یاب ہو جائیں گے کیونکہ موت بھی صرف اُن سے معانقہ کرتی ہے جو خود مرنے پر راضی ہوتے ہیں۔

اور

جو لوگ کبھی نہیں مرتے۔ وہ زندگی میں بار بار مرتے ہیں۔

جلوۂ گزراں

عطاءاللہ سجّاد

یہ بھی اک خواب تھا اے دل، یہ بھی اِک دام ہی تھا
یہ بھی اِک واہمۂ الفتِ ناکام ہی تھا
یہ بھی اِک حُسنِ جفا پیشہ کی تھی طرزِ جفا
یہ بھی اِک جلوۂ گزرانِ سرِ بام ہی تھا
یہ بھی اِک خندۂ تقدیر تھا اہلِ دل پر
یہ بھی اِک شعبدۂ گردشِ ایام ہی تھا
سایۂ زلف رہا ابرِ گریزاں کی طرح
التفاتِ نگہِ یار بھی الزام ہی تھا
میں جسے ساعتِ آغازِ وفا سمجھا تھا
وہ بھی میرے سفرِ شوق کا انجام ہی تھا
میں درِ دل پہ جسے دستکِ جاناں سمجھا
وہ بھی ناکامیٔ اُمید کا پیغام ہی تھا
یہ الگ بات کہ صیّاد کو احساس نہ ہو
ورنہ سجّاد سا نخچیر تہِ دام ہی تھا

نشانِ منزل

عطاءاللہ سجاد

یہ ملاقاتِ سرِ رہگذر میرے لیے
بن گئی آج نشانِ منزل
آج اُس دشت نوردی سے ملی مجھ کو نجات
سالہا سال سے جس کا کوئی انجام نہ تھا
جس میں جز آبلہ پائی کوئی انعام نہ تھا

میں تیری زُلف کی چھاؤں میں جو بیٹھا تو یہ محسوس ہوا
کہ میں سرخیل ہوں اُس قافلۂ عشق و وفا کا جس نے
زیست کی راہوں کو بخشی ہے تب و تاب و تپش
جس میں لیلےٰ بھی ہے مجنوں بھی ہے فرہاد بھی ہے
جس میں ہے سوہنی بھی اور مہینوال بھی ہے
جس میں سسّی بھی ہے پنّوں بھی ہے کچھ اور بھی ہیں
داستانوں میں مگر جن کا کوئی نام نہیں
جن کے مرقد رہے بے نام و نشاں
تذکرہ جن کا کسی بزم میں بھی عام نہیں

بے ستوں،

بے ستوں

ضربتِ تیشۂ فرہاد سے جاگ اُٹھا ہے
قصرِ شیریں کے مزامیر سے راگ اُٹھا ہے
جرسِ ناقۂ لیلیٰ کی صدا آتی ہے
نجد کے دشت سے مجنوں کی نوا آتی ہے
عشق مجنوں کا ہو فرہاد کا یا میرا ہو
حُسنِ لیلیٰ کا ہو شیریں کا ہو یا تیرا ہو
اس بیابانِ محبت میں نہ منزل ہے نہ حد
اُن میں اِک ربطِ مسلسل ہے ازل ہو کہ ابد

آج جب تیرے شبستاں میں چراغاں ہوگا
لمسِ لب سے تیرے جب جامِ غزل خواں ہوگا
کتنے میخوار پرانے جو ہمیں یاد نہیں
کتنے موہوم فسانے جو ہمیں یاد نہیں
کتنے عشاق جو محروم و جگر تشنہ رہے
جو ہجومِ گل و لالہ میں نظر تشنہ رہے
آسمانوں سے زمینوں پہ اُتر آئیں گے
سلسلے صدیوں کے اس لمحے سے مل جائیں گے
سب اِسی بزمِ گہہ ناز میں یک جا ہوں گے
کون کہتا ہے کہ ہم تم یہاں تنہا ہوں گے

غزل

عطاءاللہ سجّاد

گلیم و خرقہ، عبا و قبا سے لگتے ہیں
کہ اہلِ دل بھی اب اہلِ ریا سے لگتے ہیں

وصال و ہجر کے موسم کچھ ایسے بدلے ہیں
کہ وہ قریب ہیں لیکن جدا سے لگتے ہیں

ڈسے گا اُن کو پشیمانیوں کا سانپ ضرور
کہ سب حسین قلوپیٹرہ سے لگتے ہیں

کسی سے چارہ گری کی اُمید کیا رکھئے
کہ اب تو تیر سے دل پر دُعا سے لگتے ہیں

نظر میں جن کی زمانہ نہیں سماتا تھا
جو تو نہیں ہے تو بے آسرا سے لگتے ہیں

نگاہِ دوست نہ جانے کی سیر چشمی پر
یہ تشنہ لب تو زمانوں کے پیاسے لگتے ہیں

جو طے کرو تو یہ لگتا ہے عمر ساری لگے
وہ فاصلے کہ بظاہر ذرا سے لگتے ہیں

نہ التفات نہ بیگانگی مگر پھر بھی
کچھ اجنبی سے، تو کچھ آشنا سے لگتے ہیں

جو دُور سے نظر آتے ہیں بے ستوں کی طرح
قریب جا کے جو دیکھو ذرا سے لگتے ہیں

مسافرانِ رہِ دل کہیں بھی ہوں سجّاد
یہ دل گرفتہ بہم آشنا سے لگتے ہیں

چاند، بڑھیا اور پتھر

قتیل شفائی

اے طرب خانۂ مشرق سے اُبھرتے ہوئے چاند
میں نے بچپن میں سُنا تھا کوئی بڑھیا تجھ میں
اَن گنت صدیوں سے بیٹھی ہوئی چرخہ کاتے
اس روایت سے بہت دیر نہ چھوٹا دامن
بن گئی ایک حقیقت یہ ترے ہی ناتے

جب ذرا ہوش سنبھالا تو یہ سوچا میں نے
سُوت کے ڈھیر لگے ہوں گے تری وادی میں
سُوت — ہاں جس سے بنا کرتا ہے مفلس کا لباس
ہوگا تقسیم کروڑوں کی اس آبادی میں

لیکن اے چاند ترے شہر میں جب میں پہنچا
کوئی بڑھیا تھی وہاں، اور نہ چرخہ کوئی
سُوت پھر سُوت ہے پانی تھا وہاں اور نہ ہوا
بے حسی اوڑھ کے سب تیری فضا تھی سوئی

رائیگاں جا نہیں سکتا تھا سفر میرا کبھی
چاند پر سُوت کا اک تار بھی گر مل جاتا
یہ ندامت مرے حصّے میں نہ آئی ہوتی
پتھروں سے کوئی ملبوس اگر سِل سکتا

اے طرب خانۂ مشرق سے اُبھرتے ہوئے چاند

غزل

قتیل شفائی

آہٹیں کام آئیں گی، پرچھائیاں کام آئیں گی
خود فریبی کے لیے تنہائیاں کام آئیں گی

دوستو! کیوں اتنے سنجیدہ ہو؟ پاگل مت بنو
عشق میں تو صرف بے پروائیاں کام آئیں گی

وہ ملے تو اُس سے پوچھوں، کب بھلائے گا مجھے
کب تری آنکھوں کی یہ گہرائیاں کام آئیں گی

عشق لامحدود شہرت کا وسیلہ بن گیا
ہم جہاں بھی جائیں گے رسوائیاں کام آئیں گی

کٹ رہے ہیں اب بھی اپنے دن جوانی کی طرح
کیا خبر کس عمر میں دانائیاں کام آئیں گی

ان حسینوں میں کوئی اچھا تاثر چھوڑنا
پھر ہمیشہ حسن کی رعنائیاں کام آئیں گی

اُڑ رہا ہوں میں غزل کے آسمانوں میں قتیلؔ
اور کیا اُس شخص کی انگڑائیاں کام آئیں گی

غزل

قتیل شفائی

رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں
ہم نے خوش ہو کے بھنور باندھ لیے پاؤں میں

اُن کو بھی ہے کسی بھیگے ہوئے منظر کی تلاش
بوند تک بوند سے جو کبھی صحراؤں میں

اے مرے ہمسفر! تم بھی تھکے ہارے ہو
دھوپ کی تم تو ملاوٹ نہ کرو چھاؤں میں

حوصلہ کس میں ہے یوسف کی خریداری کا
اب تو مہنگائی کے چرچے ہیں زلیخاؤں میں

وہ خُدا ہے کسی ٹوٹے ہوئے دل میں ہو گا
مسجدوں میں اُسے ڈھونڈو نہ کلیساؤں میں

ہم کو آپس میں محبت نہیں کرنے دیتے
اِک یہی عیب ہے اس شہر کے داناؤں میں

مجھ سے رکھتے ہیں قتیلؔ اس لیے کچھ لوگ حسد
کیوں مرے شعر ہیں مقبول حسیناؤں میں

زندگی

قتیل شفائی

بڑی حسیں ہے زندگی ——
فدا ہے جس پہ ہر بشر، وہ نازنیں ہے زندگی
بڑی حسیں ہے زندگی ——

یہ زندگی وہ چیز ہے —— جو حُسن کی کنیز ہے
خزاں میں رُک کے بھی اسے —— بہار کی تمیز ہے
فلک فلک ہے زندگی —— زمیں زمیں ہے زندگی
بڑی حسیں ہے زندگی ——

کبھی گلوں کے رس میں ہے —— کبھی خزاں کے بس میں ہے
کبھی کسی کی بزم میں —— کبھی کسی قفس میں ہے
ہواؤں میں فضاؤں میں —— جہاں کہیں ہے زندگی
بڑی حسیں ہے زندگی ——

نئے صنم تراش کر —— اسے نہ پاش پاش کر
جو اس میں ہے چُھپا ہوا —— وہ بانکپن تلاش کر
جسے کوئی بُھلا سکے —— وہ شے نہیں ہے زندگی
بڑی حسیں ہے زندگی ——

یہ دلفگار بھی ملے —— یہ نغمہ بار بھی ملے
جو عاشقوں کے دل میں ہو —— تو بے قرار بھی ملے
جو ہر لباس میں سجے —— وہ مرجبیں ہے زندگی
بڑی حسیں ہے زندگی ——

غزل

شاذ تمکنت

ہزار چاہا، طبیعت مگر نہیں لگتی
کہاں ہو تم کہ مجھے کچھ خبر نہیں لگتی

وہ خواب دیکھا کہ تعبیر جس کی پا نہ سکے
وہ آنکھ پائی کہ جو رات بھر نہیں لگتی

یہ اور بات کہ بابِ اثر کھلے نہ کھلے
کوئی دُعا ہو مجھے بے اثر نہیں لگتی

حکایتِ غمِ جاں کیا سُناتیں دُنیا کو
طویل تو نہیں پر مختصر نہیں لگتی

نگر نگر سے مرے واسطے تم آئے ہو
تمہارے چہرے پہ گردِ سفر نہیں لگتی

یہ اور بات کہ گھبرا کے آدمی مر جائے
مگر حیات کبھی دردِ سر نہیں لگتی

سحر کا نام شفق بھی ہے اور سُورج بھی
مگر یہ کون سحر ہے سحر نہیں لگتی

لگی ہے چوٹ تو اس کو سنبھال کر رکھنا
یہ چوٹ وہ ہے جو بارِ دگر نہیں لگتی

وہ اپنا عکس یہیں چھوڑ کر گیا جیسے
فضائے خانہ تو بے بام و در نہیں لگتی

زہے وہ شاخ کہ جس کے تلے کوئی دم لے
وہ بے ثمر ہی سہی بے ثمر نہیں لگتی

وہ راستہ تو مہکتا ہے اُس کی خوشبو سے
وہ کُنجِ گُل ہے، مجھے رہگذر نہیں لگتی

کہو حسینوں سے آجائیں بے حجابانہ
مری نظر سے کسی کو نظر نہیں لگتی

وہ پیاس کیا کہ فریبِ سراب کھا نہ سکے
مجھے وہ پیاس تو کچھ معتبر نہیں لگتی

ملا ہے خلعتِ دشنام، شاذ کیا کیجے
کُلاہ پائی مگر زیبِ سر نہیں لگتی

○

حافظ لدھیانوی کے نعتیہ قطعات

ڈاکٹر سید عبد اللہ

حافظ لدھیانوی اب کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ میں اس سے پہلے ان کی کتاب (مجموعہ نعت) ثنائے خواجہؐ پر دیباچہ لکھ چکا ہوں اور اس کے بعد کی کاوشوں سے بھی خود کو آگاہ رکھتا رہا ہوں۔

اب وہ ایک بار پھر میرے سامنے آئے ہیں مگر اس دفعہ انفرادیت کا پیکر بن کر۔ انفرادیت کی بنیاد یہ ہے کہ ان کی یہ سب نعتیں قطعہ کی صنف میں جلوہ گر ہوئی ہیں یہ التزام جہاں تک مجھے معلوم ہے ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔

کہا جاتا ہے کہ فریاد کی کوئی لے نہیں لیکن حافظ لدھیانوی نے صرف فریاد نہیں کی شاعری کا کمال بھی دکھایا ہے اور اپنی فریاد یا نالۂ درد کو ایک لے کا پابند کر دیا ہے۔ یعنی امواجِ عقیدت کو شعوری طور پر ایک دھارے کے ضبط و نظم میں ڈھال دیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے اس نئے مجموعۂ نعت میں خودی اور بیخودی دونوں کا اجتماع ہو گیا ہے۔ خودی اس استغراق سے نمودار ہوئی ہے جو ان کے قلب کی گہرائیوں میں قلزم بے کراں کے مانند اپنے اندر گم ہے اور بے خودی اس شعور سے ابھری ہے جس نے حافظ کو بیدار کر کے اس سے کہلوایا ہے کہ نعت گوئی میں گم ہوں مگر شاعر بھی ہوں اس آگہی نے حافظ کو مداحانِ رسولؐ میں نامور اور شعرائے عصر میں ممتاز بنا دیا ہے، پہلی صورت میں قلب کی سرشاری و شادابی کام کر رہی ہے اور دوسری صورت میں تخلیقی کاوش کی جاں گدازی کا منظر سامنے آتا ہے۔ بیخودی و ہشیاری کے اس مجموعے کا نام حافظ ہے۔

حافظ کی ہشیاری صرف اس بات سے عبارت نہیں کہ اس نے نعت کو قطعے کا پابند کر دیا ہے بلکہ مجھے ان کے اس مجموعے میں ایک گہری شے بھی نظر آتی ہے اس کے لیے میں کسی صحیح لفظ کا انتخاب نہیں کر سکا البتہ اس کیفیت کے قریب قریب ایک لفظ ہے عرفان، جو محض فکر کی سوغات نہیں شاعری اور بے خودی دونوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں فکر کی جھلک بھی ہے اور جذبے کی گہرائی بھی، جس کا اعتراف وہ خود بھی کبھی کبھی کرتے ہیں ؎

فکر کو نعت کا دیا آہنگ
ذوق کو نغمگی عطا کی ہے
تیرے قربان رحمتِ عالم
لذتِ آگہی عطا کی ہے

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان نعتوں کی ساری فضا پُرسکون ہے، سکون و اطمینان کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ میں اس کا سبب نہیں معلوم کر سکا مگر کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ نعت گوئی کے لیے جہاں درد کی اہمیت کا شناسا ہے وہاں عبادت

عبودیت کے سرور سے بھی آگاہ ہے اور یہ سرور خلوت کی خاموشیوں سے اُبلتا ہے۔ جہاں اس کے بقول ؎

خامئ بات کرے اشک زباں ہو جائے
خوبیِ بخت سے یہ طرزِ بیاں ملتا ہے
پیشِ دربار نہیں صوت و صدا کی حاجت
ایسا اندازِ سخن اور کہاں ملتا ہے

واقعی ایسا اندازِ سخن خال خال ہی کہیں اور ملے گا جس میں وقت کا ہر لمحہ اور فکر کی ہر موج نغمات میں خود بخود ڈھلتی چلی جاتی ہے جہاں خاموشی بھی کلام کرتی ہے جہاں درد کی لذتیں بھی ہیں اور فکر کی کاوشیں بھی۔

حافظ کے اس کلام میں وہ مصنوعی بھرائی ہوئی آواز نہیں جس کے ذریعے بعض لوگ تکلف و تصنع کی مدد سے خود کو مادحِ رسولؐ بناتے ہیں، حافظ کو اس کی ضرورت نہیں پڑی، عشقِ رسولِ پاکؐ اب اس کے رگ و پے میں رچ بس گیا ہے جس کے طفیل نعت کے مروّج موضوعات سے آزاد ہو کر شاعر نے خلقِ محمدیؐ اور تعلیمِ محمدیؐ کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے جس کا پہلا سبق ہے ؏

مانگنا جو بھی ہے خدا سے مانگ

خدا تعالیٰ سے اس تعلق کے لیے دُعا اور عبادت کی ضرورت ہوتی ہے شاعر اس شعاع کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتا ہے اور آنحضورؐ کے اقوالِ شریف پر مبنی اخلاقِ فاضلہ کی روشنی پھیلاتا جاتا ہے۔ نیکی، احسان، محبت، وفا اور حیا ——— جو ایک سچے مسلمان کی صفاتِ امتیازی میں آنحضورؐ کی تعلیمات کے حوالے سے (مگر درد کی زبان میں) شاعر نے ہمارے سامنے شرافت کے وہ سب چراغ روشن کر دیے ہیں جن کی ہمیں اس وقت ضرورت ہے مگر گہرے اندھیروں میں دُوسرے لوگ حوصلہ نہیں کر پاتے، یہ حوصلہ خداوند تعالیٰ نے حافظ لدھیانوی کو عطا کیا ہے کہ وہ اندھیروں میں ایسے چراغ روشن کر دے۔ مجھے امید کامل ہے کہ یہ چراغ ہمیشہ فروزاں رہیں گے اور حافظ کو عمرِ ابد بخشیں گے۔ فقط

جستجو

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

ڈاکٹر سلیم اختر

اگر میں یہ کہوں کہ مشفق خواجہ کے "تخلیقی ادب" کا سب سے دھماکہ خیز مقالہ اگر کوئی تھا تو وہ تحسین فراقی کا "اُردو تنقید کے دس سال" تھا تو اُسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ نہایت محنت سے لکھے ہوئے اس مقالے نے ناقدین اور ادب و نقد کے سنجیدہ قارئین کو فوراً اپنی طرف جو متوجہ کر لیا تو اس کی وجہ بادی النظر میں تو یہ بنتی ہے کہ تحسین فراقی نے متنوع تنقیدی نظریات اور ادب و تخلیق کی پرکھ کے مروّج سانچوں کو مسترد کر دیا تھا، لیکن میں اسے اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ کیونکہ بیشتر لکھنے والے ذہین اہلِ قلم اپنے پیشروؤں کو مسترد کرتے آئے ہیں مسترد کرنے کے اس رویّہ کو محض سنسنی خیزی پر محمول نہ کیا جائے اور نہ ہی اسے اصولِ توجہ کے لیے ایک آزمودہ نسخہ سمجھا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر نئی نسل مسلّمات سے انحراف نہ کرے تو پھر اپنے وجود کا اثبات کیسے کرے گی۔ یہی نہیں بلکہ کلیشے بن جانے والے نظریات کی فرسودگی اور منفیت کی طرف کیسے توجہ دلائے گی؟ اسی لیے ہر عہد پرانے عہد سے ٹکراتا رہا ہے اور یہ ٹکراؤ ادب و نقد کے ارتقاء کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ اسی تصادم سے قدیم کی قوّت اور جدید کی توانائی ثابت ہوتی ہے۔

تو ہوا گر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار

موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

میری طرح جن لوگوں نے اس رمز کو سمجھا انھوں نے تحسین کی تحسین کی مگر جن لوگوں کے کان میں شیطان نے یہ پھونک ماردی کہ مستند ہے تیرا فرمایا ہوا! تو وہ تحسین فراقی کے پیچھے پڑ گئے۔

تحسین فراقی نے ڈاکٹر وزیر آغا سے لے کر مجھ ناچیز تک بیشتر ناقدین کی آرا سے کُلی یا جزوی اختلاف کیا تھا۔ میں کیونکہ تنقید میں آزادیٔ رائے کے اظہار کا حامی ہوں اس لیے اس مقالہ پر تحسین فراقی کو شگفتہ دلی سے مبارکباد دی۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تحسین فراقی ڈاکٹر وزیر آغا کے سلبی تصوّرات سے اختلاف کی جرأت کرتا اور اُسے اس کی سزا نہ ملتی۔ چنانچہ دشنامی دبستان کی روایت کے عین مطابق غلیل میدانِ عمل میں آگئی اور یوں اچھا بھلا بے ضرر انسان مُفت میں متنازعہ فیہ نقاد بن گیا۔ حالانکہ اور نہیں تو صرف جرأتِ اظہار کی بنا پر ہی معاصر ناقدین میں تحسین کی تنقید قابلِ توجہ بن جاتی ہے۔

تحسین اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جس نے مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب کا بھی مطالعہ کیا۔ چنانچہ دینی کتب کے ساتھ وہ کیسیرر (CASSIRER) کا حوالہ بھی دے سکتا ہے۔ مگر اس نے اس مطالعہ سے وابستہ مضمرات کو آنکھیں بند کر کے اپنی تنقیدی شخصیت کا جزء نہ بنایا بلکہ ان پر غور کرنے کے بعد جب انھیں اپنی موجودہ صورتِ حال پر پرکھا تو اس سے ہم آہنگ نہ پا کر انھیں مسترد کر دینے میں کسی طرح کی بھی جھجک محسوس نہ کی۔ گزشتہ دو دہائیوں سے ہمارے یہاں اپنی تہذیبی جڑیں تلاش کرنے اور بین الاقوامی تناظر میں اپنے

کلچر کے مروّجہ کے لیے خود اپنے پاکستانی رنگ مہیا کرنے کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک انتہا پر اندھی مغرب پرستی ہے تو اس کے ردِّ عمل میں اندھی مشرق پرستی کا رجحان بھی شدید سے شدید تر بلکہ بعض امور میں تو متشدد سے متشدد تر ہوتا جا رہا ہے دونوں ایک دوسرے کو مسترد کر دینے پر تلے بیٹھے ہیں حالانکہ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ DOGMATIC ہونا بذاتِ خود ایک طرح کی انتہا پسندی ہے ——— ایسی انتہا پسندی جو ایک رُخی نظر کی بنا پر مثبت کا اقرار کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے اسی لیے اگر ترقی پسندوں، مغرب پرستوں کا یا DOGMATIC ہو کر ایک ہی زاویئے سے ادب اور زندگی کا مشاہدہ کرنا غلط تھا تو دوسری انتہا پر ان سب کو مسترد کر کے ایک نئے DOGMIS کا بت بنا لینا انتہائی خطرناک ہے ——— یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ تحسین فراقی میں بھی مجھے اس نوع کے جراثیم دکھائی دے رہے ہیں کسی بھی نقاد اور بالخصوص ایک اُبھرتے ہوئے نقاد کے لیے اس سے زیادہ خطرناک بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ صرف مخصوص تصوّرات کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو کر رہ جائے۔ نقاد اگر مچھلی ہے تو اسے گہرے سے گہرے پانیوں میں اُترنا چاہیے، اگر وہ پرندہ ہے تو اُسے بلند سے بلند ترین پرواز کرنی چاہیئے۔ گہرائی میں اُترنا یا بلندی کو چھُونا دراصل ایک ہی عمل کی منقلب صورتیں ہیں۔ دونوں صورتوں میں نقاد کا علم اور بصیرت اس کے لیے لانچنگ پیڈ کا کام کرتی ہے۔ نقادوں کی اکثریت اور اس اکثریت میں بھی ایم اے اُردو نقادوں کی کثیر تعداد متوازن علم اور جدید نظریات سے سطحی واقفیت رکھتی ہے اس لیے بالعموم کلاس نوٹس پر گزارا کرتی ہے لیکن تحسین فراقی ان ناقدین میں سے نہیں۔ وہ کم از کم اتنی محنت ضرور کرتا ہے کہ جس نظریئے کے خلاف لکھتا ہے اس کے بارے میں کتابیں پڑھتا ہے۔ اس لیے اس کی تنقید بے وزنی کے عالم میں لکھی گئی تحریروں کے برعکس ٹھوس اور وزنی نظر آتی ہے چنانچہ "جستجو" کے کسی بھی مضمون کا مطالعہ کر لیجیے وہاں آپ کو اس کی محنت اور مطالعہ شانہ بشانہ ملیں گے اور ان سب پر مستزاد اسلامی تصوراتِ حیات سے اس کی گہری وابستگی! بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اسلام اس کی تنقید میں بُنیادی حیثیت رکھتا ہے تو یہ کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ اس ضمن میں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ تحسین فراقی اسلام کو محض عقائد اور معتقدات کے مجموعے تک محدود نہیں سمجھتا بلکہ اس سے بلند ہو کر اسلام آفاقی اقدار کا تناظر قرار دیتا ہے اور یہ وہی تصوّر ہے جو علامہ اقبالؒ سے مخصوص ہے۔ تحسین نے اس نقطۂ نظر سے اُردو ادب کا جو عہد بہ عہد مگر مجمل جائزہ پیش کیا ہے وہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس نے علامہ اقبال کی مانند اسلام کی حرکی توانائی اور تخلیقی قوتوں کو جمالیاتی اقدار اور معاشرتی معیاروں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے دیکھا ہے۔ اسی لیے تو اسے مسلمانوں کے ساتھ بعض ہندو اہلِ قلم میں بھی "اسلامی اثرات" دکھائی دیتے ہیں۔ سو اس کے بقول:

> "کبیر داس کی ہندی شاعری پر اسلامی اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کو نرگن بھگتی کے فلسفے پر بھی اسلامی تصوّف کی چھاپ دکھائی دے سکتی ہے۔ اصل قصّہ یہ ہے کہ کوئی بھی ادب اپنے اعتقادی یا نظریاتی معاشرے کے اساسی اقدار سے منہ نہیں موڑ سکتا اور اس کے تہذیبی تشخص سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔"

اگرچہ آخری سطروں کی عمومی صداقت تسلیم لیکن ایک بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ بھگتی تحریک کی اساس انسان دوستی پر استوار تھی ——— وہ انسان دوستی جو مذہب و ملّت سے بلند اور عقائد سے ماورا ہوتی ہے جس میں "ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم"

کا تصور کارفرما ہوتا ہے اور جس میں "ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں" پر مبنی ذہنی رویے کو تخلیقی منصب اور تہذیبی کردار قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے اگر تحسین فراقی کو اس میں "اسلامی تصوف" کی چھاپ دکھائی دی تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ جس طرح ہم پاکستان میں اسلام کے حوالے سے اپنے تہذیبی خد و خال نکھارنے اور ادب و نقد کی تفہیم کے لیے اپنی مابعد الطبیعیات کے سوتوں تک رسائی کا عمل شروع کر چکے ہیں، بھارت میں بھی اس کے برعکس صورت نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہاں اقبال اور غالب کی نئی اور بعض امور میں تو ہمارے نقطۂ نظر کے برعکس توجیہات کی جا رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اب وہاں اساطیر، سنسکرت اور ہندی ادبیات کی روشنی میں اردو ادب کے مسلمات کی تشکیلِ نو کا رجحان بھی قوی تر ہوتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں بھارت کے ایک مسلمان دانشور کا مقالہ نظر سے گذرا جس میں انھوں نے میر انیس اور تلسی داس کی رامائن میں نہ صرف لفظی و معنوی مشابہتیں تلاش کی تھیں بلکہ حضرت امام حسین اور رام میں لاتعداد کردار کی مماثلتیں بھی "دریافت" کر رکھی تھیں۔ درحقیقت DOGMATIC ہونے کا یہی وہ طرزِ عمل ہے جس کی طرف مضمون کی ابتدا میں ہم نے اشارہ کیا تھا اور جو اچھے بھلے نقاد کی نظر کو MYOPIC بنا دیتا ہے۔ کلی صداقت شاید کہیں نہ ہو، لیکن جزوی صداقت ہر جگہ اور ہر روپ میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے اسے ہر قیمت پر نہیں گنوانا چاہیے۔ عظیم مقصد، عظیم تصور یا عظیم نظریہ کلی وحدانیت ہوتا ہے جس میں چھوٹی سے چھوٹی صداقتیں چشموں کی مانند پھوٹتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ہر بالغ نظر انسان کو آخری افق THE ULTIMATE کی تلاش ہوتی ہے لیکن عشق کی وہ تخلیقی جست بہت کم لوگوں کو میسر ہوتی ہے جو تمام فاصلے طے کر دیتی ہے۔ ہمارے یہاں حسن عسکری ایک ایسا ہی نقاد تھا جو اپنی تمام تر نزاعی شخصیت اور متنوع نظریات کے باوجود ایک خاص سمت میں قدم قدم سفر طے کرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ تحسین کا مضمون "محمد حسن عسکری اور جدیدیت" اس متنازعہ فیہ مفکر کے فکر و فن کا ایک متوازن جائزہ پیش کرتا ہے۔ یہ مقالہ اگرچہ بنیادی طور پر "جدیدیت" کے تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے لیکن میں اسے محمد حسن عسکری پر رینے گینوں کے اثرات کی نشاندہی اور ان سے وابستہ فکری مضمرات کی تلاش کی خصوصی کاوش قرار دیتا ہوں۔ چنانچہ بقول تحسین فراقی :-

"عسکری کو گینوں سے بے حد عقیدت تھی، اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ گینوں سے خاصے متاثر تھے۔"

ایک اور موقعہ پر بھی اس نے یہی لکھا ہے :-

"عسکری گینوں سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے بیشتر مضامین میں انھوں نے گینوں سے استشہاد کیا ہے۔"

آخری عمر میں عسکری گینوں سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا گینوں نے عسکری کے لیے وہی حیثیت اختیار کر لی تھی جو علامہ اقبال کے لیے رومی نے اختیار کر لی تھی، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ علامہ اقبال نے مولانا رومی سے مشرق کے اثبات کا درس لیا، لیکن عسکری نے اپنے مولانا رومی سے نفی کا درس لیا، لیکن یہ نفی مغرب کی منفی اقدار کے لیے تھی، اس لیے نتائج کے اعتبار سے یہ بھی مثبت ہی قرار پاتی ہے اور اسی نکتہ کو تحسین فراقی نے کمال محنت سے اجاگر کیا ہے :

جب تحسین فراقی کی اسلامی تنقید اور پاکستانی نقطۂ نظر پر مبنی مقالات پڑھنے کے بعد انتظار حسین پر لکھے گئے مقالہ :

"بشنو از نے چوں حکایت می کند" پر آتے ہیں تو ذہن کو عجیب احساس ہوتا ہے۔ مقالہ انتظار حسین کی تخلیقی شخصیت پر اس اتہام کے خلاف ردِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے جس نے کلیشے کی صورت اختیار کر لی ہے اور جس کی بنا پر انتظار حسین جدید اُردو فکشن کی قدآور شخصیت ہی نہیں بلکہ سب سے نزاعی شخصیت کے طور پر بھی اُبھرا ہے۔ مجھے یہ مقالہ بے حد پسند آیا۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں تحسین نے ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے انتظار حسین کا بہت کامیاب دفاع پیش کیا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس لیے کہ یہ مضمون اس کے مخصوص مسلک کے اگر برعکس نہیں تو کم از کم اس سے انحراف کی حیثیت تو ضرور ہی رکھتا ہے۔

مجھے اس مضمون میں تحسین اپنی مخصوص مابعد الطبیعیات کی بوجھل فضا سے باہر نکل کر اور عربی کی بڑی بڑی کتابوں کے نیچے سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لیتا محسوس ہوا ہے۔ اس لیے یہ مقالہ "جستجو" میں تازہ ہوا کا دریچہ ثابت ہوتا ہے اور تازہ ہوا ایسی نعمت ہے کہ اس کا ہمیشہ خیر مقدم کرنا چاہیے خواہ وہ انتظار حسین کے "ساتویں در" ہی سے کیوں نہ آئی ہو۔ بقول تحسین فراقی "انتظار کی شخصیت کا "قفل ابجد" یاد اور خواب کی شاہ کلید سے کھلتا ہے۔ یہ "قفلِ ابجد" اس کی شخصیت کا ساتواں در ہے، اس کی چوتھی کھونٹ ہے"، اور اس یاد اور خواب کے عمل کو بنیاد بنا کر تحسین نے انتظار حسین کے بعض معروف افسانوں اور "بستی" کا مطالعہ کیا ہے۔ اپنی یاد کے سفر کو انتظار حسین جنگِ بدر اور معرکۂ کربلا سے شروع کرتا ہے جب کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور ۱۹۴۷ء کی ہجرت اس سفر کی اہم منزلیں قرار پاتی ہیں۔ چنانچہ اسی سفر کے حوالے ہی سے تحسین نے انتظار پر نوسٹیلجیا کے معروف الزام کو غلط ثابت کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ معترضین اسی یاد کی بنا پر ہی اس پر نوسٹیلجیا کا الزام عائد کرتے رہے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ الزام یا اس کا ردِ عمل اتنا اہم نہیں جتنا اہم تحسین کا یہ کہنا:

> "انتظار کا تاریخی، تخلیقی اور تہذیبی تصور اپنے اظہار کو کسی ایک سانچے میں مقید نہیں کرتا۔ زمینوں اور زمانوں پر حاوی یہ شعور متنوع اسالیب کو جنم دیتا ہے۔ شاید یہ دعوے غلط نہ ہوگا کہ اُردو فکشن کو جتنے متنوع اسالیب اکیلے انتظار حسین نے دیئے ہیں وہ ہمارے تمام افسانہ نگاروں کی مجموعی پونجی سے بھی زیادہ ہوں گے۔"

یہ درست ہے البتہ اس میں اتنا اضافہ کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ مسلم کلچر کا اسلوب ان میں ایک رنگ بھرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انتظار حسین نے "کشتی" میں ہندی اساطیر اور "کچھوے" میں گوتم بدھ کے مختلف رُوپ میں جنم لینے پر مبنی جاتک کہانیوں سے بھی روشنی حاصل کی ہے۔ یہ سب کچھ تو دیکھ کر تو بعض اوقات انتظار حسین کے بارے میں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے:

قلبِ او مومن و ما غش کافر است

اور یہی کچھ میں "جستجو" کے ذہین نقاد کے لیے بھی مانگنا چاہتا ہوں۔

مُجتبیٰ

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

بعض لکھنے والوں کا نام کچھ اصناف کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جیسے مسدس کے ساتھ حالی، مرثیے کے ساتھ انیس، ڈرامے کے ساتھ آغا حشر، مثنوی کے ساتھ مولانا رُدم وغیرہ وغیرہ۔ کچھ یہی نسبت خاکہ نگاری کی صنف کے ساتھ محمد طفیل کی ہے۔ جس طرح مسدس، مرثیہ، ڈراما، مثنوی اور دیگر اصناف بے شمار لکھنے والوں کے قلم سے نکلی ہیں۔ اسی طرح خاکہ لکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اُردو کے قدیم تذکرہ نگاروں کے سوانحی اشاروں سے لے کر محمد حسین آزاد کے شخصی مرقعوں تک اور فرحت اللہ بیگ کے جدید شخصیوں سے لے کر محمد طفیل کے مجموعوں تک ہزاروں خاکے لکھے گئے ہیں مگر اس صنف میں جو حیثیت اور اہمیت محمد طفیل کو حاصل ہوئی وہ اُردو میں کسی اور کے حصّے میں نہیں آئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محمد طفیل صنفِ خاکہ نگاری کا عاشق ہے اور عاشق بھی ایسا کہ جس کا عشق اُسے کسی دوسری صنف کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی مہلت نہیں دیتا۔

نظر بخویشِ چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست

محمد طفیل کے خاکوں کے مجموعے صاحب، جناب، آپ، محترم، مکرم، معظم اس سے قبل چھپ چکے ہیں۔ مجتبیٰ ساتواں مجموعہ ہے۔ اُردو میں کوئی دوسرا لکھنے والا اب تک نہیں ہوا جس نے محض خاکے لکھے ہوں اور اتنی بڑی تعداد میں لکھے ہوں۔ 'مجتبیٰ' کے آغاز میں اعتراف کے عنوان سے طفیل لکھتے ہیں:

"یہ میری ساتویں کتاب ہے۔ میں نے خاکہ نگاری کو الف سے شروع کیا تھا۔ یعنی میری ابتدائی کتابوں کے نام حروفِ تہجی کے ابتدائی حروف تھے مثلاً آپ، جناب، صاحب وغیرہ۔ خاکہ نگاری کے کام کو میں جس حد تک نبھا سکتا تھا اُسے شاید نبھا ہی ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو کچھ لکھنا تھا، جس پیرائے سے لکھنا تھا، وہ کچھ اور ویسا کچھ لکھ چکا ہوں۔ اسی سوچ نے مجھے مجبور کیا کہ آپ سے عرض کروں کہ جناب میں نے جس کام کو الف سے شروع کیا تھا اُسے 'می' تک پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میری اس کتاب کا نام "مجتبیٰ" ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مجموعہ اور "مخدومی" کے نام سے بھی سامنے آ سکے۔"

ان سطروں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ محمد طفیل اب خاکہ نگاری کو بہت دُور تک نہیں لے جانا چاہتے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی جانی پہچانی شخصیات کے خاکے لکھ چکے ہیں اور اب زیادہ سے زیادہ ایک اور مجموعے کی گنجائش پاتے ہیں،

اگرچہ قیاس یہ ہے کہ بزرگ شخصیات پر بیشتر خاکے لکھے جا چکے ہیں۔ بلکہ اب تو محبی میں سلسلہ نوجوانوں تک آ پہنچا ہے۔ اس لیے شاید اب انھیں 'مخدومی' کی بجائے 'عزیزی' کے نام سے نیا مجموعہ مرتب کرنا پڑے۔ 'مخدومی' کے لفظ میں جو عقیدت و احترام موجود ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں فقط قابلِ احترام بزرگوں کے خاکے ہوں جب کہ نوجوانوں کے خاکوں کے لیے "عزیزی" کا عنوان بہت مناسب رہے گا۔ البتہ "محبی" ایسا لفظ ہے جس میں لازمی چیز "حُب" ہے۔ جو بزرگ سے بھی ہو سکتی ہے، جوان سے بھی اور نوجوان سے بھی۔ یہی سبب ہے کہ 'محبی' میں ایسی بزرگ شخصیتیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ایسے اشخاص بھی تشریف فرما ہیں جو طفیل کے ہم عمر ہوں گے۔ جیسے قتیل شفائی اور ایسے لوگ بھی رونق افروز ہیں جنھیں وہ برخوردار کہہ کر پکارتے ہوں گے۔ مثال کے طور پر عطاء الحق قاسمی وغیرہ۔ گویا طفیل صاحب ان لکھنے والوں میں نہیں ہیں جو اپنے موضوع سے یہ مطالبہ کریں کہ "پہلے بال سفید کر کے آؤ"

اس کتاب کے تمام خاکے ادبی تقریبات میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے ہیں یعنی انھیں 'فرمائشی خاکے' بھی کہا جا سکتا ہے۔ طفیل نے اس بات کو چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کتاب میں جگہ جگہ اس قسم کے فقرات نظر سے گذر جاتے ہیں:

"یاروں کی اس محفل میں چودھری صاحب کی شخصیت پر مجھ سے بہتر مضمون آرائی کرنے والے دوست موجود ہیں" (چودھری نذیر احمد)

"یہ تقریب میرزا ادیب کے ڈراموں کے مجموعے خاک نشیں کے سلسلے میں برپا ہے۔"

(میرزا ادیب)

"میری کتاب "باردی سار" کی تقریب ہے مضمون بھی لکھیں۔ صدارت بھی کریں۔ پہلے تو میں مضمون لکھنے پر راضی نہ تھا۔ اس پر صدارت کی پخ نے مجھے مزید بدمزہ کیا۔"

(اقبال صلاح الدین)

"خاکوں کو حسبِ فرمائش لکھنے یا بوقتِ ضرورت تحریر کرنے کا اعتراف ہر خاکے میں بار بار کیا گیا ہے۔ میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ طفیل صاحب اس نکتے سے آگاہ ہیں کہ لکھنے والے کا مشاہدہ اگر تیز ہو اور اس کے قلم میں قوت ہو تو تحریر خواہ اندرونی احساس کی پیداوار ہو یا بیرونی فرمائش کی دونوں صورتوں میں مؤثر ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس کتنے ہی خاکہ نگار ایسے ہیں کہ وہ محض اپنے داخلی جذبے کو شخصیت نگاری کا محرک قرار دیتے ہیں مگر ان کی پیش کردہ شخصیات زندہ نہیں ہو پاتیں طفیل نے جس شخص کا بھی خاکہ لکھا ہے ——— خواہ وہ برسی کے موقعہ پر پڑھنے کے لیے لکھا گیا ہو یا کتاب کی تقریب رونمائی پر پیش کیا گیا ہو ——— وہ شخص چلتا پھرتا، بولتا چالتا، ہنستا مسکراتا اور روتا بسورتا ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ ہو کر آ جاتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ "محبی" کے آٹھ خاکوں کا موضوع بننے والی آٹھ شخصیات میں سے سوائے "موجد" کے باقی ساتوں کو میں بھی قریب سے جانتا ہوں۔ چودھری نذیر احمد کے فرزند اکبر میرے دوست ہیں۔ میں چودھری تدبیر سے نیا ادارہ کے علاوہ ان کے گھر پر بھی ملا ہوں اور ان کے خاندان کی متعدد تقریبات کے موقع پر بھی ان کی گفتگو سنی ہے۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

کے ہاں بھی متعدد دفعہ گیا ہوں اور طلبا کے تحقیقی مقالات کے سلسلے میں ان سے مدد چاہی ہے۔ سید وقار عظیم میرے اُستاد تھے اور پھر ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۱ء تک میرے سینئر رفیق کار اور صدر شعبہ بھی رہے۔ میرزا ادیب کے ساتھ ۱۹۵۸ء سے لے کر آج تک مسلسل رابطہ رہا ہے۔ قتیل شفائی سے بھی علیک سلیک کا سلسلہ کئی برسوں پر محیط ہے۔ اقبال صلاح الدین سے دوستانہ ملاقاتیں بھی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ 'ہندی کلاس' میں میرے ہم جماعت بھی رہے۔ عطاء الحق قاسمی اور بیٹل کالج کے ذہین طالب علم تھے اور اب میرے عزیز دوست ہیں۔

یہ ساری تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ سوائے "موجد" کے میں اس کتاب میں شامل کی جانے والی تمام شخصیات سے فرداً فرداً واقف ہوں اور یہ جان پہچان برسوں پر محیط ہونے کی وجہ سے سرسری نہیں ہے۔ جب میں نے اس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھا تو بعض شخصیات کے بارے میں طفیل صاحب کے تاثرات کی تائید میرے دل نے بھی کی مگر بعض جگہ یوں بھی ہوا کہ شخصیت کے بارے میں میرا تاثر کچھ مختلف تھا، تو کیا یہ کہا جائے کہ خاکہ نگاری کے فن میں "موضوع" کے متعلق لکھنے والے اور پڑھنے والے کا نقطہ نظر ایک ہی ہونا چاہیئے؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ دنیا میں ایک ہی شخص کے بارے میں مختلف لوگوں کی آرا مختلف ہو سکتی ہیں اور بڑی دیانت داری اور نیک نیتی سے۔ ایک ہی شخص کو میں ایک زاویے سے دیکھتا ہوں اور آپ دوسرے زاویے سے۔ مجھے اس کی ایک خصوصیت دیکھنے کا موقع ملا، آپ کو دوسری خصوصیت سے واسطہ پڑا۔ مجھے ایک خامی سے پالا پڑا، آپ کو دوسری خامی کا مشاہدہ ہوا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے اُسے کسی زمانے میں دیکھا ہو میں نے کسی اور زمانے میں۔ آپ نے جوانی میں دیکھا، میں نے بڑھاپے میں۔ جوانی کی تندی بڑھاپے کی متانت میں بدل جانے سے آپ کے اور میرے مشاہدے میں فرق ہو جانا ضروری تھا۔ غرض اس قسم کے سیکڑوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ 'خاکہ' بھی تخلیقی ادب کی دوسری اصناف کی طرح اپنے داخلی معیاروں سے جانچا پرکھا جانا چاہیئے نہ کہ ذاتی مشاہدوں کے اختلافی تاثرات سے۔ اس نقطہ نظر سے خاکہ نگاری کی صنف کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جاتی ہیں۔

ہمارے خاکہ نگاروں میں سے بعض ایسے ہیں جن کا کام "مدحیہ قصیدے" لکھنا ہے اور بعضوں کا کام ہجو نگاری ہے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ میں نے زندگی میں ایسی شخصیات دیکھی ہیں جو سراپا ستائش کی سزاوار ہوتی ہیں، اور ایسے لوگوں سے بھی ملا ہوں جن کی محض ہجو ہی لکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے اگر خاکہ نگار کو زندگی میں ایسی "غیر معمولی" شخصیات سے واسطہ پڑا ہو تو بیشک انھیں "غیر معمولی" بنا کر پیش کرے لیکن زندگی میں بہت سے لوگ میری اور آپ کی طرح خوبیوں اور خامیوں کی ایک عجیب معجونِ مرکب ہوتے ہیں اس لیے شخصیات کو اس انداز میں پیش کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ نہ تو یہ معلوم ہو کہ لکھنے والا اس سے کسی پرانی دشمنی کا حساب چکا رہا ہے اور نہ یہ لگتا ہو کہ کسی پرانے احسان کا بدلہ اتار رہا ہے۔ اس لحاظ سے طفیل صاحب کے خاکے بڑے "متوازن" ہیں۔ "مجتبیٰ" میں ایسی شخصیات کے خاکے بھی موجود ہیں جو طفیل کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں اور اُن لوگوں کی شخصیت نگاری کا حق بھی ادا کیا گیا ہے جو ان کے حلقے کے لوگ

شمار ہوتے ہیں، لیکن نہ تو ان پر سراپا تنقید کی گئی ہے اور نہ ہی ان پر سراسر تحسین۔ ان خاکوں کا موضوع بعض خاردار شخصیات بھی ہیں، لیکن محض خارکشی کی بجائے خاروں کے ساتھ گلوں کو بھی خوبصورتی سے سجا دیا گیا ہے۔ ایک آدھ خاکے سے قطع نظر کوئی خاکہ ایسا نہیں جس میں شخصیات کی کوتاہیوں کی طرف بلیغ اشارے نہ کئے گئے ہوں۔ بعض جگہ تو اشارے خاصے واضح ہو گئے ہیں، لیکن جہاں اندازِ بیان کی باریک نقاب چہروں کے داغوں پر ڈال دی گئی ہے۔ وہاں قاری کو زیادہ احتیاط سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ سرسری گذر جائیں تو تعریف معلوم ہوتی ہے، غور کریں تو تعریفی لگتی ہے۔ مثلاً چودھری نذیر احمد کی جز رسی کی وضاحت کے لیے ساحر لدھیانوی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ کس طرح ساحر کو چودھری صاحب نے بمشکل پانچ روپے کا نوٹ دیا اور پھر کس طرح وہ پانچ روپے ملاں حسین حلوائی کی دکان پر گاجر کا حلوہ کھا کر برابر کر دیئے۔ یہاں طفیل صاحب نے ایک بڑا ہی سہل جملہ لکھا ہے، جو بڑا تیکھا ہے:

"مگر صورت یہ تھی کہ دونوں خوش تھے۔ دونوں نے یہ سمجھا کہ حلوہ مفت میں کھا لیا۔"

اس جملے میں غضب کی کاٹ ہے۔ چودھری نذیر احمد اور ساحر لدھیانوی دونوں کے مزاج کو بڑی خوبی سے ایک ہی جملے نے ظاہر کر دیا ہے۔ خصوصاً چودھری صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو تو پوری طرح نمایاں ہو گیا ہے، مگر بظاہر جملہ بڑا بے ضرر لگتا ہے۔

شیخ اسمٰعیل پانی پتی پر لکھتے ہوئے آخر میں بتایا ہے کہ اُن کی والدہ نے سالہا سال تک بازار سے پُرلیوں پر لپیٹ کر آنے والے دھاگوں کو اکٹھا کر کے اس سے ایک گز لمبا تولیہ بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ یہاں سے گریز آتی ہے، لکھتے ہیں:

"اُنھوں نے جتنا کام کیا وہ بھی ادب کی پٹڑیوں پر سے دھاگے ہی اکٹھے کرنے کا کام ہے۔"

بظاہر بڑا تعریفی جملہ ہے مگر شیخ صاحب کے تحقیقی کام میں جانکاہی کے باوجود جو کم مائیگی ہے اس کی طرف کیسا بلیغ اشارہ ہے!

اقبال صلاح الدین کے خاکے میں لکھتے ہیں:۔

"اپنی مرغوب چیز کو بارہ تیرہ برس تک اس لیے نہ کھایا کہ کسی نے سامنے لا کر نہیں رکھا، کچھ طلب کرنا چونکہ اُن کی سرشت میں شامل نہ تھا..... میں اُن کی ایسی اُوٹ پٹانگ عادتوں کو دیکھتا ہوں تو پریشان ہوتا ہوں۔ بھاگ بھری بھی پریشان ہو گی (یہ بیوی کو پیار میں بھاگ بھری کہتے ہیں) ان کی عدم طلب کا مسئلہ بڑے گُل کھلاتا ہو گا۔"

آخری جملہ ایسا ہے کہ قاری ذرا سا بھی غیر متوجہ ہو تو فارسی ترکیب اور اُردو محاورے کی وجہ سے سمجھے بغیر آگے بڑھ جائے گا لیکن غور کیجئے کتنا خطرناک جملہ ہے۔ تعریفی انداز دیگر خاکوں میں بھی بکثرت موجود ہے لیکن عطاالحق قاسمی والا خاکہ اس سلسلے میں سب سے آگے ہے۔ اس تعریفی انداز کو ذہن نشین کر کے "محبی" کے خاکوں کا مطالعہ کیجئے تو ایک نئی دُنیا جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جس طرح محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں بظاہر ہر شاعر کی تعریف کی ہے لیکن تعریفی انداز ہر جگہ اپنی جھلک دکھا جاتا ہے یہی کیفیت

ان خاکوں کی ہے۔ تعریف کے ساتھ بشری کوتاہیوں کی طرف بلیغ اشارے ایک دوسرے کے ساتھ گتھ متھ اور مِل جُل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اسی انداز میں ہر شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے کہ عیب و ہنر میں خط فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی فطری انداز بھی ہے۔ یوں تو شخصیت نگاری اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ پہلے خوبیوں کا ڈھیر لگا دیا اور پھر توازن پیدا کرنے کے لیے خامیوں کی طرف اشارے کر دیئے لیکن یہ طریقہ غیر حقیقی ہے۔ اکثر لوگوں سے ملتے ملاتے عمریں گذر جاتی ہیں آپ ان کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اکثر ایک عجیب تماشا ہوتا ہے۔ ایک شخص کی خامی قدرے نرم ہو کر خوبی بن جاتی ہے اور دوسرے کی خوبی ذرا سی کھنچ جاتی ہے تو خامی کا روپ دھار لیتی ہے۔ ایک نرم خو اور متحمل مزاج افسر بہت اچھا ہوتا ہے لیکن جب وہ خراب عملے کو بہت زیادہ ڈھیل دے دیتا ہے تو کوئی اس کی تعریف نہیں کرتا۔ ایک غصیلا آدمی ناپسندیدہ ہوتا ہے لیکن بسا اوقات وہ بعض ٹیڑھے مسائل بہت جلد حل کروا لیتا ہے۔ اسی طرح ذہانت حد سے بڑھ کر تخریب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور قوت بعض اوقات ظلم میں بدل جاتی ہے۔ گویا خوبی کب خامی بن جاتی ہے اور خامی کب خوبی ہو جاتی ہے؟ بعض اوقات اس کا تعین آسان نہیں ہوتا اس لیے انھیں "زمرات" میں تقسیم کر کے ان پر الگ الگ لیبل لگانا خطرناک ہوتا ہے۔ طفیل کی خاکہ نگاری 'مکمل شخصیات' کا مطالعہ ہوتی ہے شخصیت کی زمرات میں تقسیم کا عمل نہیں ہوتی۔

نقوش کے وہ نمبر جو موجود ہیں

۱ ——— ادبی معرکے نمبر	قیمت	۹۰	روپے	لائبریری ایڈیشن ۱۵/=
۲ ——— انیس نمبر	قیمت	۶۰	روپے	〃 ۱۰/=
۳ ——— افسانہ نمبر	قیمت	۹۰	روپے	〃 ۱۵/=
۴ ——— خطوط نمبر	قیمت	۱۵۰	روپے	
۵ ——— سالنامہ	قیمت	۵۰	روپے	
۶ ——— منٹو نمبر	قیمت	۵۰	روپے	

نقوش کے وہ نمبر جو کتابت کے مراحل سے گزر رہے ہیں

۱ ——— میر نمبر	(غیر مطبوعہ کلام)	تیسری جلد
۲ ——— غالب نمبر	(نادر مضامین)	تیسری جلد
۳ ——— تنقید نمبر	(نئے زاویوں سے)	پہلی جلد
۴ ——— شعر نمبر	(تمام اہم اشعار یکجا)	پہلی جلد

نقوش کے وہ نمبر جو پریس کے حوالے کئے جا چکے ہیں

۱ ——— رسولؐ نمبر	ابتدائی دو جلدیں
۲ ——— اقبالؒ نمبر	تیسری جلد

خدیجہ مستور نمبر

ادارۂ نقوش نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اُردو کی نامور افسانہ نگار **خدیجہ مستور** کے بارے میں بھی ایک قابلِ ذکر شمارہ پیش کرے جو اپنے مواد کی وجہ سے ناقابلِ فراموش ہو۔ جسے مدتوں بھلایا نہ جا سکے۔ جیسے قبل ازیں منٹو نمبر، شوکت تھانوی نمبر اور پطرس نمبر پیش کئے تھے۔

افسانہ نمبر

یہ نمبر سنہ ۱۹۵۵ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ داستانوں سے لے کر موجودہ دور کے اہم افسانہ نگاروں تک کی نمائندہ تخلیقات اس نمبر میں موجود تھیں۔ اس نمبر کی برابر مانگ رہی مگر یہ نمبر ۲۷ برس کے بعد دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے۔ عام ایڈیشن بھی موجود ہے اور لائبریری ایڈیشن بھی،

تنقید نمبر

ہمارے ادبی منصوبوں میں تنقید نمبر کا منصوبہ بھی شامل رہا ہے۔ جس پر تیزی سے کام ہو رہا ہے یہ نمبر نئے زاویوں سے پیش کیا جائے گا علاوہ دیگر خصوصیات کے اس نمبر میں ملک کے نامور نقادوں افسانہ نگاروں اور شاعروں سے ادب کے جملہ موضوعات پر مذاکرے کرائے گئے ہیں۔ جو ہمیشہ قابلِ ذکر ٹھہرائے جائیں گے!

ادارۂ نقوش، لاہور